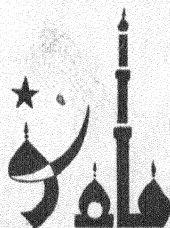
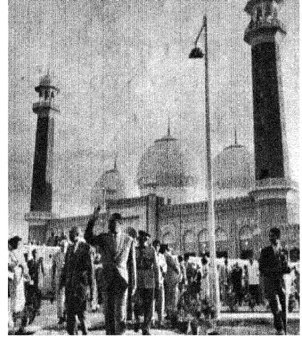
TIGHT BINDING BOOK

Duplicate

جون ۱۹۵۹ء





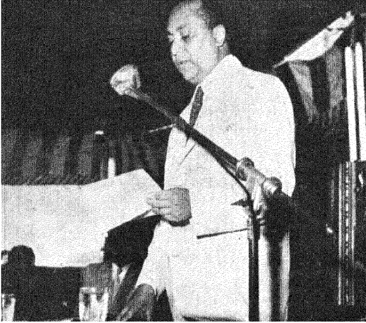
جنرل محمد ایوب خاں ، صدر پاکستان :
جامع مسجد ، واہ چھاؤنی کا افتتاح



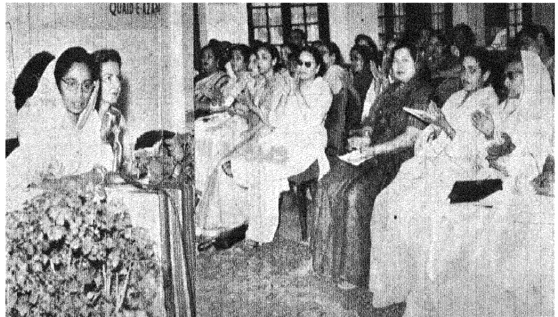
صدر پاکستان اور صدر انڈونیشیا ، ڈاکٹر سوئیکارنو ، کی ملاقات



مشن کانفرنس بین‌الاقوامی ادارہ‘ تعاون (آئی - سی - اے)
کے اراکین کو صدر پاکستان کی طرف سے استقبالیہ



فلم لیبارٹری حکومت پاکستان (کراچی)
افتتاح : وزیر اطلاعات و نشریات ، جناب حبیب الرحمن

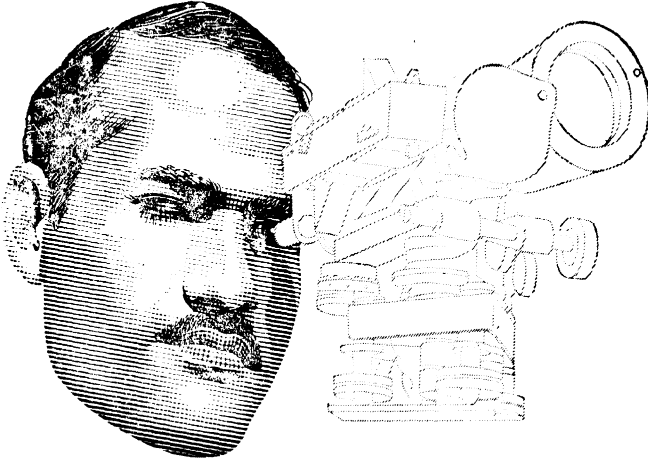


سالانہ کانفرنس
انجمن بہبودیٔ اطفال میں
بیگم حبیب الرحمن کی تقریر



ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا ۔ مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس میکلوڈ روڈ ۔ کراچی
مدیر: رفیق خاور

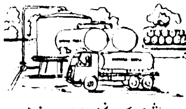
قومی منصوبہ؟
برماشیل
جائے تعمیر پر



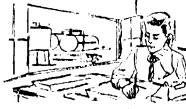
ہر منصوبہ ملک کی خوشحالی کا ضامن ہے۔ جتنے زیادہ منصوبے مکمل ہوسکیں ملک اتنا ہی زیادہ خوشحال ہوگا۔
بڑھتے ہوئے اخراجات کی پروا کئے بغیر برماشیل نے ہمیشہ اسی نظریہ کے ماتحت جائے تعمیر کے متصل اپنے ڈپو قائم کئے ہیں۔ جن میں کمپنی کا تربیت یافتہ عملہ رات دن اسی کوشش میں رہتا ہے کہ مزلتات کی خاطر خواہ مقدار ہر وقت موجود رہے تاکہ مشینیں برابر چلتی رہیں اور منصوبہ وقتِ معینہ پر مکمل ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اگر تیل مصنوعات ہر وقت مہیا نہ ہوسکیں تو نہ صرف منصوبہ کی تکمیل میں تاخیر ہوگی بلکہ اخراجات میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔



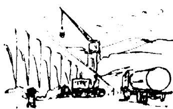
برماشیل کے نمائندے منصوبہ بندی کے افسران سے مشورہ کر رہے ہیں۔



بھاری مشینوں کے پہونچنے سے پہلے ہی عارضی ڈپو مکمل ہوچکا ہے۔



رسد کا انتظام کیا جاچکا ہے اور اس سلسلہ میں انجینیروں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

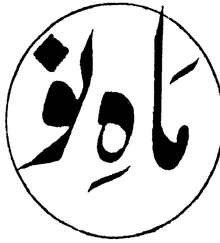


جائے تعمیر پر تیل کی فراہمی کا مناسب انتظام ہے۔

برماشیل ترقیٔ پاکستان کا حصہ ہے

BSP—4—59

جلد ۱۲



شمارہ ٦

جون ۱۹۵۹ء

مدیر: رفیق خاور — نائب مدیر: ظفر قریشی

سرورق: "مزارِ محبوبہ" بیرون مقبرہ میر کرم علی خاں (حیدر آباد سندھ) رنگین عکس ..... انور سعید

سالانہ چندہ: ساڑھے پانچ روپے — شائع کردہ: ادارۂ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی — فی کاپی: آٹھ آنے

فروغِ صبحگاہی

(آمدِ بہار کا ایک تاثر)

سیّد جعفر طاہر

عجیب سی روشنی نظر آ رہی ہے ہیمانۂ نظر میں
مہ و نجوم و شہاب کا حسن ہے مرے حجلۂ سحر میں
وہ نور کی چھوٹ ہے کہ دھرتی دلہن بنی مسکرا رہی ہے
وہ بادلوں کے جوان بارانیوں سے گویا لجا رہی ہے

وہ درد کے دام ہائے تیرہ کے سخت جان تار کٹ رہے ہیں
گلی گلی میں حسین شعاعوں کے نقرئی ہار بٹ رہے ہیں
وہ موت کی ڈائنیں کہ بیٹھی ہوئی ہیں خاموش سر بہ زانو
وہ جوہرِ خاک خاک ابھرا، وہ بام و در ہیں کہ آئینہ رو

سسکتی دم توڑتی ہوئی لاکھ آرزوئیں سنبھل رہی ہیں
نظر نظر میں غزل سرا ساعتوں کی پریاں مچل رہی ہیں
دلوں میں اٹکی ہوئی تھیں جو مدتوں سے پھانسیں نکل رہی ہیں
وہ آسمانوں کی گردشیں ہیں کہ آج محور بدل رہی ہیں

دو رنگیٔ بخت ہرزہ کردار ختم ہے، آس ہو چلی ہے
جو زندگی دردِ سر بنی تھی وہ زندگی راس آ رہی ہے
نہ آہ و زاری نہ اشکباری نہ شورِ فریادِ ناتواناں
چمن چمن فرشِ سبزہ و گل، روش روش سیلِ خوش عناناں

مہک اٹھے سیسبان و صفصاف کے سبہ بخت سرو ملئے
یہ آ رہی ہے کوئی سمن بر سحر نوائے، گہر لٹائے
رخِ حیا آفریں سے بزمِ طرب نشاں میں نقاب اٹھائے
زہے جمالِ نظر فزائے، زہے ادائے وفا سمائے

حیات کی یہ حسینۂ سوختہ نظر مسکرا رہی ہے
یہ بانوئے غم نصیب اپنے دکھوں پہ اب گنگنا رہی ہے
خدا نے اس دردمند و حرماں زدہ کی سن لی ہیں التجائیں
اور آج اس کے جلو میں رقصاں ہیں آسمانوں کی اپسرائیں

وہ دن بھی تھے جب غموں کی چھائی ہوئی تھی ناپاک شام ہر سو
ستم کے ہر سمت جال پھیلے ہوئے تھے، نفرت کے دام ہر سو
اور آج سلمائیاں، دلآرائیاں ہیں محوِ خرام ہر سو
یہ ساقیٔ خوش ادا، یہ ٹپکتی ہوئی مئے لعل فام ہر سو

جہاں جہاں کوئی کشتِ ویراں ہے ابرِ نیساں گہر فشاں ہے
غبارِ خاطر کی آندھیاں ہیں نہ دل پہ بارِ غم گراں ہے
حزیں جوانوں کی سونی پیشانیاں خوشی کسے چمک رہی ہیں
جٹور سے ٹیلوں پہ ناچتے ہیں تو گوریاں بھی گنگنا رہی ہیں

حنائی ہاتھوں کی انگلیاں ہیں کہ شادیوں کے چراغ روشن
فضاؤں میں گیت گونجتے ہیں، نگاہ روشن دماغ روشن
گھڑوں پہ گاؤں کی چھوریاں چھیڑتی ہیں نغمے، نئے ترانے
لبوں پہ جاری ہیں بزمِ ہستی کے حسنِ الطاف کے فسانے

فضا کو مسموم کر سکے گی نہ خوئے دشنامِ سر فرازاں
نہ وہ فسونِ فریب کاراں نہ دامِ تزویرِ چاپلوساں
وہ کھیتیاں سرسرا رہی ہیں، زبوں زمینیں بھبک رہی ہیں
ستارۂ صبح کی تب و تاب سے جبینیں دمک رہی ہیں

زہے یہ دورِ طرب، یہ عہدِ کرم، یہ آغازِ جشنِ مستی
اجل کے طوفاں سمٹ گئے ہیں، چھڑا ہوا ہے ربابِ مستی
یہ کوچہ و کو میں نکہت و نور و نغمۂ سرمدی کے جھالے
دلوں میں جینے کے ولولے، حوصلے، امیدیں، جگت اُجالے

نوائے افلاکیاں یہی ہے جہاں جہاں مستنیر ہو گا
بشر بشر خود نگر، ستارہ شکار، خورشید گیر ہو گا
یہ ریگ زاروں کی گود میں سیلِ نور کی لہر لہر دیکھو
یہ کوہ و صحرا، یہ دشت و دریا، یہ نو بہ نو شہر شہر دیکھو

یہ ابرِ بہاراں قطرہ زناں، یہ شمع و چراغاں نور فشاں
یہ لالہ و گل، یہ ساغرِ دل، یہ سرو و سمن، یہ آبِ رواں
یہ جلوۂ آتشِ دیرِ مغاں، یہ نائے نشاطِ امن و اماں
یہ مطرب و ساقی نغمہ سرا، یہ غلغلۂ عیسیٰ نفساں
یہ مومن و ترسا عیش کناں، یہ شاعر و صوفی زمزمہ خواں
نے وہم و گمانِ سود و زیاں، نے خوفِ نگاہِ محتسباں
اللہ یہ بساطِ ناز و نعم، نے صرصرِ غم، نے بیمِ خزاں
یہ طورِ طرب، یہ قافِ کرم، یہ انجمنِ صاحب نظراں
صیادِ اجل ترساں ترساں، جلادِ فلک لرزاں لرزاں
یہ بارگہِ صد اہلِ ہنر، یہ محفلِ پاکِ دیدہ وراں
یہ اہلِ ہمم، یہ اہلِ قلم، بہزادِ رقم، استادِ زماں
مکتوبِ وفا، منشورِ دعا، یہ معجزۂ زرّیں قلماں
یہ اہلِ سخن، یہ صاحبِ فن، یہ لطفِ زباں، یہ حسنِ بیاں
یہ منزلِ عیش و سرورِ ابد، یہ جلوہ گہِ حورانِ جواں
یہ کوئے بتاں، یہ برقِ جمالِ ماہ وشاں، آئینہ بر اں
وہ شبنمی ٹیلوں کے دامن میں دخترِ صحرا نازکتاں
پلکوں پہ ستاروں کی لڑیاں، پاؤں میں سمر یکا کہکشاں
کانوں میں ہرن کے پھول بڑے، پوروں پہ حنائے لعل چکاں
زلفوں میں حسیں کھیتوں کی مہک، سانسوں میں نسیمِ خلد رواں
ہونٹوں پہ غزل شیرافضل کی پہنائے بغل میں چاند نہاں

صحرا صحرا سامانِ طرب، وادی وادی رنگیں طوفاں
ہر منزلِ غم آغوشِ کرم، ہر دشتِ جنوں گہوارۂ جاں
افسانۂ دولتِ گلشنیاں، ہر خارِ الم کو نوکِ زباں
یہ زمزمۂ آہو نظراں، سیمیں ذقناں، زرّیں کمراں
پیلو کے مہکتے سایوں میں یہ رقصِ بہارِ گلبدناں
یہ لطفِ کلامِ گل نفساں، یہ طرزِ خرامِ خوش قدماں
یہ میکدۂ صد مخملیاں، یہ کنجِ حریمِ سرخ لباں
ہر فرد یہاں شاداں شاداں، دہقان و گدا و جواں فرحاں
نگری نگری اذکارِ طرب، پیمانِ وفا ایوان ایواں
خورشید بکف مہتاب جبیں، سیماب قدم زاد و رمشاں
یہ ذوقِ سماعت جلوتیاں، یہ طرز و طرازِ نغمہ گراں
اک تازہ غزل، اک تازہ غزل، اد شعلہ زباں او برقِ جہاں:

وہ جن کو موت پہ تھا اختیار ہم نفسو
ہیں آج موت سے خود ہمکنار ہم نفسو
یہ اپنی شامتِ اعمال کی سزا پائی
کہاں کی گردشِ لیل و نہار ہم نفسو
جو سر جھکا کے چلیں اور روگ ہوتے ہیں
نہیں یہ شیوۂ مردانِ کار ہم نفسو
حضورِ یار بہ اندازِ والہانہ چلو
مثالِ ابرِ سرِ کوہسار ہم نفسو
یہ صبحِ نو کی تجلّی، یہ حسنِ لالہ و گل
وہ ڈھل گئی ہے شبِ سوگوار ہم نفسو
امیرِ قافلۂ رنگ و بو تمہیں تو ہو
تمہیں سے حسنِ عروسِ بہار ہم نفسو
تمہیں ہو مملکتِ دل کے شہریار تمہیں
تمہیں کو ڈھونڈتی ہے چشمِ یار ہم نفسو
تمہیں ہو شہرِ نگاراں کی آبروئے یار دو
تمہیں کو ڈھونڈتی ہے چشمِ یار ہم نفسو
اسی سے پرچمِ زلفِ بتاں بلند ہوا
اڑا جو راہِ جنوں میں غبار ہم نفسو

تمہیں سے لطفِ غزل حسنِ شعر شانِ کلام
مزاجِ دہر کے آئینہ دار ہم نفسو
جلو میں لے کے زمانے کو پھر بڑھو کہ جہاں
پکارتا ہے تمہیں بار بار ہم نفسو

گئے وہ دن کہ لبِ ناز پر تھی مہرِ سکوت
بساطِ کون و مکاں پر جمود چھایا تھا
روش روش تھی گذرگاہِ آتشیں زنداں
کہیں پہ دیوِ اجل نے پرا جمایا تھا
گئے وہ دن کہ ترستے تھے عیشِ گلشن کو
جبینِ اہلِ جہاں پر غموں کا سایا تھا

کہاں کا شانۂ بادِ سحر، کہاں کی صبا
نفس بلرزہ، خمِ زلف زلف ترساں تھا
کہاں کی روشنیٔ روشناں، کہاں کا نور
متاعِ دیدہ و دل صرفِ خونِ مژگاں تھا
ہوس کو پردگیانِ حرم سے شکوہ، اُدھر
مجھے گمانِ مہِ کنعاں بھی جنسِ ارزاں تھا

وہ دن کہ نوحہ کناں تھی شمیمِ لالہ و گل
سمومِ وصرصرِ سوزاں، ہوائے راہگزار
بہ کنج کنج دبہر گوشہ صد ہجومِ بلا
وہ نے سوار نہ وہ مطربانِ زمزمہ کار
صدائے ابرِ تنک مایہ تند و غیظ آلود
ادھر کچھ ایسی لگی جل بجھا نشیمِ بہار

نہ کوئی بزم نہ سبزانِ سبز بخت کی بات
نہ جوشِ محفلیاں تھا نہ رنگِ محفل تھا
فصیلِ شہر پہ رقصاں نہ تھا کوئی طاؤس
نہ گلستاں میں کہیں نغمۂ عنادل تھا
سیہ شبوں کی خموشی میں دل کی دھڑکن پر
گمانِ صلصلۂ طوق و صد سلاسل تھا

حیاتِ نخلِ سراسیمہ و فسردہ تھی
نہ برگ و بر نہ وہ شاخوں کے سبز پوش ہلال
ہوائے گرم نے سنولا دئے تھے سرو و سمن
صریرِ سبزہ و گل تھا نہ رقصِ بادِ شمال
نہ کوئی گیت سرِ شاخ لہلہاتا ہوا
نہ پائے موج میں بجتا ہوا کوئی خلخال

نہ فکرِ شعر نہ آرائشِ غزل کی لگن
نہ تابِ عرضِ تمنا نہ شرحِ غم کا جنوں
ندیم و ہمنفساں دلفگار و رنداں تنگ
علاجِ خستگیٔ دل پیالہ پُر از خوں
شراب و شاہد و شیر و شکر ہوس کے لئے
وفا ہلاکِ فریبِ فسانہ و افسوں

نصیبِ اہلِ نظر دودِ شامِ حوصلہ سوز
نہ صبحِ عارضِ تاباں نہ جلوۂ رخسار
نہ کوئی عیش کا عنواں نہ کوئی تازہ نوید
نہ لطفِ بزم نہ وہ حسنِ شاہدِ گفتار
کہاں کا یوسفِ دل اور کہاں کا مصرِ خیال
نہ وہ ادائے زلیخائے کلکِ گوہر بار

فضائے عرضِ جہنم کہ سایۂ دیوار
کبھی جگر، جرسِ غنچہ چیر جاتی تھی
ورق ورق پہ سفیدی رہی کفن کی سی
صریرِ خامہ سے آوازِ تیر آتی تھی
نہ پوچھ نزع میں جب ہچکیاں کسی نے لیں
انہیں گمان یہ گذرا کہ ہیر گاتی تھی

قدم قدم پہ بھٹکتا تھا کارواں اپنا
کوئی ستارہ سرِ رہگذر نہ کوئی چراغ
طرف طرف وہ ابھرتی ہوئی سیہ دیوار
بجھے بجھے سے ادھر سینۂ جنوں کے داغ

نہ حوصلے ہی رہے تھے نہ ولولے باقی
نہ راستہ نہ کوئی منزلِ یقیں کا سراغ

گئے وہ دن کہ بہائے ہنر تھی قیدِ گراں
عطائے ظلِّ الٰہی —— قبلۂ زہر آلود
نظر نظر میں سلگتے ہوئے شرارے سے
نفس نفس میں رچی تھی ہوائے زہر آلود
گئے وہ دن کہ بُنِ مُو سے آگ اٹھتی تھی
اور اس پہ تھی —— جہاں کی فضائے زہر آلود

خدا کا شکر کہ وہ دورِ مرگ بیت گیا
خدا کا شکر کہ اب ہر طرف بہاراں ہے
کہیں یہ چشمے کہیں آبشار گاتے ہیں
کہیں یہ رقصِ نگاراں، ہجومِ یاراں ہے
یہ سحر کاریٔ خوباں یہ ہمنشینیٔ گل
غریبِ شہر بھی ہمدوشِ شہر یاراں ہے

یہ برف پوش، چمکتے ہوئے حسیں کہسار
یہ مرغزار یہ چشمے یہ مطرب و مہتاب

جو اہرِ جگر پارہ پارہ کیا کہیئے
کہ ذرّہ ذرّہ ہے الماسِ دلبراں کا جواب
یہ دورِ امن واماں یہ زمانِ راحت و عیش
یہ شبنمیں یہ ستارے یہ پھول خواب ہی خواب

کشودِ کارِ جہاں آج ہے نسیمِ بہار
ضمیرِ دہر پہ فطرت کے راز کھل کے رہے

غزل سرا ہیں یہ کلیاں کہ محرمانِ عروس
خوشی کے گیت فضاؤں میں آج گھل کے رہے
ملا ہے فرقِ بشر کو جلالِ نو کا پیام
جبینِ زیست کے دیرینہ داغ دھل کے رہے

غبارِ تلخیٔ غم ہے نہ دودِ شامِ بلا
نہ اب کرے گا جہاں میں کوئی بھی ماتمِ نور
دھوئیں کے تیرہ و تاریک دائرے جو چھٹے
فضا کے دوش پہ لہرا گیا ہے پرچمِ نور
سسکتے ہونٹوں پہ نغموں کے نقرئی لہرے
اجل گرفتہ جبینوں پہ آج عالمِ نور



اصلاح و تجدید:

اُردو ادب کی تشکیلِ نو

رفیق خاور

ہماری تاریخ ایک عرصہ سے دوراہے پر ہے۔ اور ایسا ہونا لازمی ہے کیونکہ جب کبھی ایک نظام ٹوٹتا اور اس کی جگہ دوسرا ابھرتا ہے یا دو نظام ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں تو کچھ ایسی ہی کیفیت رونما ہوتی ہے۔ زندگی نہ ادھر ہوتی ہے نہ ادھر، بلکہ دوراہوں کے مابین ڈانواں ڈول ہوتی ہے۔ ایک طرف وہ کسی منزل کی طرف بڑھنا چاہتی ہے اور دوسری طرف پھر پیچھے کی طرف لوٹ جانا چاہتی ہے۔ اس میں مسلسل شکست و ریخت کے باعث تبدیلیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور اس وقت تک جاری رہتا ہے۔ جب تک ان کا تقاضہ پورا نہ ہو جائے اور زندگی تمام تر ایک نئے سانچے میں نہ ڈھل جائے۔ درمیان کا وقفہ ایک کشمکش، انتشار، تردد، افراتفری اور خلفشار کا وقفہ ہوتا ہے جس میں بگڑنے اور بننے کا دوہرا عمل برابر جاری رہتا ہے۔ عقیدے، عقل، عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ آپس میں خلط ملط ہو کر نئے نئے روپ بھی دھارتے ہیں۔ جوں جوں پرانے عناصر چھٹتے جاتے ہیں ان کی جگہ نئے عنصر نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔ یہ ردعمل اور اختلاط کے گھٹتے بڑھتے جوار بھاٹے کا سلسلہ ہر ہر نقطے پر ہر مقام پر دکھائی دیتا ہے۔

اس قسم کی ایرا پھیری جس کو "جدلی مادیت" کی بھاری بھرکم اصطلاح کا نام دیا جاتا ہے، کچھ ہمیں سے مخصوص نہیں، ایسا تو شروع ہی سے ہوتا چلا آیا ہے۔ یونانی رومی تمدن، مصر، ایران، فلسطین، جہاں جہاں یہ پہنچا وہاں اس نے مخلوط تہذیبوں کو جنم دیا، نصرانیت نے کل یورپ میں ایسی ہی تہذیبوں کی بنیاد ڈالی، اسلام نے مشرق و مغرب کے تمدنی دھاروں کو نئے سرے سے آمیز کیا، مغربی نشاۃ الثانیہ نے، جو دراصل یونانی رومی تمدن کے احیاء اور اسلامی اثرات کے مجموعہ اور قرونِ وسطیٰ کے کلیسائی نظام کی ضد تھی، اس سے دست و گریباں ہو کر نت نئی چپقلشوں کا دروازہ کھول دیا جو آگے چل کر سائنسی ترقی کے سبب صنعتی انقلاب کا باعث ہوا۔ وہ انقلاب جو اپنے ساتھ دورِ جدید کے بے اندازہ مسئلے، نئے نئے تصورات اور طرح طرح کے نصب العین لایا جن کی ایک صورت اشتراکیت ہے۔ یہی کیفیت مشرق و مغرب کے اختلاط سے مشرق میں بھی رونما ہوئی۔ چنانچہ جب سے یہ دونوں ایک دوسرے سے دوچار ہوئے ہیں، مشرق برابر بدل رہا ہے۔ مغرب میں جو شکست و ریخت ایک داخلی تحریک کے باعث رونما ہوئی تھی وہ مشرق میں ایک خارجی حملہ سے رونما ہوئی۔ ہم نے اس کو رد کرنے کی پوری پوری کوشش کی لیکن ساتھ ہی اس کا اثر بھی قبول کرتے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ آج فرنگ ہی نہیں مشرق بھی رہگذرِ سیلِ بے پناہ میں ہے اور اس سے مفر کی کوئی صورت نہیں۔

سن ستاون کا ہنگامہ مغرب کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کی سر توڑ کوشش تھی۔ اس کے بعد مغرب سے قریب تر آنے اور مغربی تمدن کو اپنانے کی رفتار اور بھی تیز ہو گئی۔ روایت کی گرفت جو پہلے ہی کمزور پڑ چکی تھی اور بھی کمزور پڑ گئی۔ اور انقلاب ذہنی روشنی۔ درمع الدار کیف دار (ا) کا زور اور بھی بڑھ گیا۔ چنانچہ اصلاح و تجدید کے پردہ میں سرسید اور ان کے ہمنواؤں نے اس کا علم بلند کیا۔ غور سے دیکھا جائے تو علی گڈھ کی تحریک میں روایت سے انحراف اور نئی روشنی کو لبیک کہنے کا پہلو ہی زیادہ نمایاں ہے۔ اس کی حیثیت بنیادی ہے اور روایت صرف ایک بتدریج محو ہوتے ہوئے ضعیف عنصر کے طور پر محفوظ ہے۔ صرف اس لئے کہ اس کو یکلخت کلیتہً محو کر دینا نہ ممکن تھا نہ قرینِ مصلحت۔ اس کی حیثیت ایک زیریں دھارے کی تھی جس کا آگے چل کر اور بھی دھیما پڑ جانا لازمی تھا۔ سرسید پر "نیچری" اور "ہوا خواہِ فرنگ" ہونے کا الزام لگایا گیا تھا وہ اسی "کج بینی" پر مبنی تھا۔ سرسید اور ان کے رفقائے کار کے اقدامات صاف بتا رہے تھے کہ ان کا رخ کس طرف ہے۔ حالی نے تو برملا "پیرویٔ مغربی" کا اعلان بھی کر دیا تھا۔

ظاہر ہے کہ ہماری ادبی تحریک اس عظیم تر تحریک کا ایک حصہ بلکہ بڑی حد تک آلۂ کار بھی تھی۔ جب سن ستاون کے حادثۂ خونیں کی

تباہی و بربادی سے قوم کی آنکھیں کھل گئیں تو بیدار مغز افراد نے سوچنا شروع کیا کہ یہ کیا ہوا اور کیونکر ہوا، ان کی فلاح و بہبود کس بات میں ہے۔ کیا وہ اپنے ماضی کی لاش سے لپٹے رہیں یا زندگی کی اصلیتوں اور تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی اور قدم اٹھائیں؟ اس کا ایک اور صرف ایک ہی فیصلہ ممکن تھا۔ پرانے ادب، اس کے تصوّرات، اس کے نظریات نئے دور کے لئے موزوں نہ تھے۔ وہ ایک ایسے دور کی یادگار تھے جس میں ادب فن اور اس کے لوازمہ، تنقید نے کچھ اور ہی روش اختیار کر لی تھی۔ اب ہمارا ادب، ہمارے تصورات دوراہے پر کھڑے تھے اور سوچ رہے تھے کہ وہ کون سا رخ اختیار کریں۔ حالی کا "مقدمہ شعر و شاعری" محض ایک تنقیدی مرقع ہی نہیں بلکہ ادب جدید کا منشور، اس کا دستور العمل ہے۔ یہ ایک انقلابی تحریک کا نقیب اور اصلاح و تجدید کی پہلی آواز ہے۔ ایسی ہی آوازیں اپنے اپنے طور پر دوسروں نے بھی بلند کیں گو اُن میں وہ گھمبیر تا نہ تھی۔

"مقدمہ" قدیم ادب اور فن تنقید کا پہلا بھرپور جائزہ بھی تھا اور محاسبہ بھی۔ اس میں تغیر پر زور تھا نہ کہ انقلاب پر، اگرچہ اس کا حقیقی مقصود بالآخر انقلاب ہی تھا۔ اس کی حیثیت بڑی حد تک ایک اہم، دوررس ترمیم کی سی تھی۔ صرف رخ نئے رجحان کی طرف تھا اور زور معنویت پر۔ ساتھ ہی ساتھ "دیوان" کے دیباچہ میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ اس میں ادب و تنقید کے نئے نظام کی داغ بیل رکھی گئی ہے۔ اس پر نئی عالیشان عمارتیں تعمیر کرنا بعد میں آنے والے معماروں کا کام ہے۔ چنانچہ طرحِ نو کی اس پہلی دستاویز میں قدیم تصورات، اصناف، تخلیقات، مشاہیر وغیرہ پر تبصرہ بھی ہے اور محاکمہ بھی ـــــ غرض قدیم و جدید کے دوراہے پر کھڑے ہوئے ایک سمجھدار انسان جو معقول لائحہ عمل پیش کر سکتا تھا وہ پیش کر دیا گیا۔ اور اس کے ساتھ نقد و ادب کے کئی نمونے بھی۔ ادب اور زندگی یا ادب کی مقصدیت کے بارے میں جو کچھ کہا گیا تھا وہ صریحاً اضطراری حالات کا نتیجہ تھا۔ جو سن ستاون کے قومی حادثے سے رونما ہوئے تھے۔

زندگی اور آرٹ دونوں میں تفنن و تفریح کو بھی دخل ہے اور فن، ٹھوس افادیت کے علاوہ جمالیاتی و نفسیاتی کیف و حظ کا بھی حامل ہے۔ قومی اصلاح کے افادی نقطۂ نگاہ نے اس اہم عنصر کو پس پشت ڈال دیا۔ اس افادی میلان کا احساس اقبالؒ تک پوری شدت سے قائم رہا اور ان کے بعد بھی مختلف صورتوں میں برقرار رہا۔ اب ہم اضطراری طور پر نہیں بلکہ ٹھنڈے دل سے ان مسائل پر غور کر سکتے ہیں۔ ان پر نظر ثانی اشد ضروری ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اصناف سخن، خصوصاً غزل، قصیدہ، مرثیہ اور نظم وغیرہ کے متعلق جو کچھ نئے دور کے بصروں نے کہا اور ان کے جو نمونے پیش کئے گئے ان میں بھی توسیع کی ضرورت ہے۔

اگر ہمارا ادب اسی نہج پر آگے بڑھتا رہتا جس کی نشاندہی ابتدا میں کی گئی تھی اور ہم پیچ در پیچ تقاضوں کے جھمیلے میں سوجھ بوجھ سے کام لیتے ہوئے اپنی سمت کا تعین کرتے جو برجستہ اقدامات کی ضامن ہوتی تو آج ہمارا ادب کہیں کا کہیں ہوتا لیکن پرشور، اتھاہ و خیزاں موجوں کے تلاطم میں ہم اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے۔ ہم کچھ نہ کچھ کرتے ضرور رہے ہیں، لیکن سوال محض کرنے کا نہیں بلکہ مکمل شعور کا ہے۔ اور اس کے فقدان کا نتیجہ انتشار۔ اس کے کئی وجوہ ہیں۔ سب سے پہلے ذہنی دھارے کو لیجئے، کیونکہ ادب، کام اسی کا ظہورہ ہیں۔ سن ستاون کے بعد تمدنِ فرنگ کے خلاف ردعمل نے ذہنی و ادبی شکل اختیار کر لی اور جس شدت سے علیگڑھ کی تحریک میں صرف مادّی حد تک اس کو اپنایا گیا تھا، اسی شدت سے اکبر الہ آبادی اور اقبالؒ نے اس کی مخالفت کی ـــــ ان کے موقف بظاہر مختلف معلوم ہوتے ہیں لیکن درحقیقت یہ دونوں اسلام اور روحانی اقدار کی بنا ہی پر اس کو درخور اعتنا خیال نہیں کرتے ـــــ اگر خودی وہی خودی ہے جو اخلاقی و مذہبی حیثیت سے مستحسن ہو تو یہ "روح" ہی کا دوسرا نام ہے۔ اور عمل بھی ایمان کی بدلی ہوئی صورت۔ لہٰذا مغرب کے متعلق اکبر اور اقبال کا رویہ یکساں ہے۔ اگرچہ اقبال نے اپنے طور پر دانش فرنگ کو قبول کیا جس سے بظاہر ان کا رجحان آگے کی طرف معلوم ہوتا ہے لیکن جن اخلاقی، روحانی اور مذہبی شرائط کے ماتحت وہ اس کو قبول کرتے ہیں، اس سے ظاہر ہے کہ ان کا کعبۂ مقصود حال و مستقبل کے بجائے ماضی میں ہے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ دیکھتا ہوں دوش کے آئینہ میں فردا کو میں، ان کی کوشش مغرب کی نئی اقدار کو رد کرنے اور پرانے نظام کو، جو ان کی رائے میں صحیح اقدار پر مبنی تھا، برقرار رکھنے کی آخری کوشش تھی۔ لیکن سیل بے پناہ ہر بند توڑ کر آگے نکل گئی۔ سائنس کے جدید افکار، اس کی دریافتوں، اس کی ایجادات، جدید معاشری، نفسیاتی اور فنی نظریوں اور آئینی تصورات نے روایتی تصورات کو پیچھے ہٹا کر اور ہی میلانات پیدا کر دئے۔ قدیم نظام فکر و تمدن کی جو بے روک کچھ اس طرح چھٹ کر پریشان ہو گئی کہ قدم قدم پر نئی نئی ندیاں ملتے بہتے

دکھائی دینے لگے۔ چنانچہ اقبال کے بعد دنیائے فکر و فن پر نیرنگی ہی نیرنگی اور بوقلمونی ہی بوقلمونی چھا گئی۔ ساز ایک نہیں رہا بلکہ ہزاروں ساز بن گئے، راگ ایک نہیں رہا بلکہ بے شمار راگ راگنیاں پیدا ہو گئیں، مغنی چند ایک استاد ہی نہ رہے بلکہ سنگت سنگت، محفل محفل نئے نئے مغنی تھے اور نئے نئے الاپ جن کا آپس میں کوئی تال میل، کوئی ربط نہ تھا۔ افکار، انداز، اصناف، پیرائے، طور و طریق، ذوق، لہجے سب کے سب الگ الگ۔ نظامِ کہن ٹوٹ چکا تھا، اس کے اجزا جا بجا منتشر تھے اور انہوں نے مل جل کر نئی نئی صورتیں اختیار کرنی شروع کر دیں۔ کہیں انقلاب کے نعرے تھے، کہیں بازگشت کا شور و غل، کہیں ترقی پسندوں کے چرچے تھے، کہیں فرائیڈ کے پیروؤں کی موشگافیاں، کہیں رومان کے پرستار تھے اور کہیں قوم و وطن کے شیدائی، کہیں فن برائے فن کے دلدادہ اور کہیں مقصدیت اور افادیت کے علمبردار، کہیں غزل اور پابند شاعری کے حامی تھے اور کہیں نظمِ آزاد کے نقیب۔ ایسے میں کسی قدرِ مشترک، کسی معین روش، کسی ہم آہنگی کی تلاش بے سود تھی۔ جب ایک جانی پہچانی شاہراہ کھو گئی تو پھر ہر طرف راستے ہی راستے تھے، تلاش ہی تلاش تھی، تجربے ہی تجربے تھے۔ جنوں جولانیاں ہی جنوں جولانیاں تھیں۔ جو لوگ پرانی ڈگر کے خوگر تھے وہ پرانی ڈگر پر ہی چلتے رہے اور اگر انہوں نے نئی طرح کو اپنایا بھی تو اس طرح کہ اس پر ایک عجیب قسم کی قدامت کا سایہ غالب رہا۔ جو لوگ قدیم روش سے مطمئن نہ تھے وہ دانستہ یا نادانستہ نئے راستوں پر نکل گئے۔ اب اپنے آپ ہی پر انحصار کرنے کی کوئی قید نہ رہی تھی۔ سب دنیا اپنی دنیا بن گئی تھی اور اس کا تجربہ اپنا تجربہ ـــ روشنی جہاں سے بھی ملے اپنی ہی روشنی تھی۔ گویا نیا مسلک ہر چیز کو اپنانے اور اپنے اندر سمونے کا مسلک تھا۔ جیسا کہ ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔ نوعِ انسان کا میلان اسی طرف تھا کہ دوسروں سے جوت جگائی جائے تاکہ تہذیب و تمدن کا دائرہ اور بھی وسیع ہو اور اس سے بالآخر ایک زیادہ جامع اور پائیدار نظام رونما ہو۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا، ہم ایک برزخ ہی میں رہیں گے۔ ہمارا دور ایک طویل عبوری دور ہی رہے گا۔

ان حالات میں صحیح اقدام یہی ہو سکتا ہے کہ ہم پھر اپنے گرد و پیش کا احتیاط سے جائزہ لے کر انتشار کو دور کرنے کی شعوری یعنی بالقصد ارادہ کوشش کریں۔ ہم بےبسی کے عالم میں مختلف رَووں میں بہتے ہی نہ جائیں بلکہ ان پر غالب آ کر کسی بھرپور دھارے میں بہیں۔ خودی کو ترقی دینے کی ایک صورت یہ ہے کہ ہم اس کو دوسروں کے اثر سے آزاد رکھیں اور اپنی محدود دانائی کو سب کچھ سمجھیں۔ اس سے وہ محفوظ تو رہے گی لیکن اس میں وسعت یا ترقی نہیں ہوگی۔ دوسری صورت اوروں کا اثر قبول کر کے ایک زیادہ وسیع اور مرکب شخصیت پیدا کرنا ہے اور پھر اسی کو اپنی خودی بنا لینا ہے۔ ایک صورت میں سمٹنا ہے اور دوسری میں پھیلاؤ۔ ایک میں کلاسیت ہے دوسری میں رومانیت، ایک طرف زیس کی سکونیت ہے اور دوسری طرف ڈائیونیسس کی حرکیت ـــ

ادب کی حیثیت زندگی سے مختلف نہیں۔ اس کی توسیع و ترقی بھی دوسرے اثرات کو اپنانے ہی پر موقوف ہے۔ اس کے سامنے دو ہی راستے تھے اور ہیں: یا وہ اپنے پرانے حدود میں ہی رہے ـــ وہی تصورات، اسالیب، مضامین، موضوعات، تکنیک، پیرائے، لب و لہجہ، ذوق، اصناف، ہیئت، تمثیلات وغیرہ۔ یا وہ دوسروں کا اثر قبول کر کے نت نئی جوت جگائے، اپنے حدود میں بیش از بیش وسعت پیدا کرے۔

ہم یہ دوسرا راستہ پہلے ہی اختیار کر چکے ہیں اور بجا طور پر۔ اب ہم اس کو چھوڑ کر پھر پرانے راستے کی طرف نہیں لوٹ سکتے۔ اگر ہم پرانی شاعری، پرانی اصناف، پرانی غزل، پرانے علم البیان، پرانے عروض ہی میں گھرے رہے تو آواگون کا چکر کبھی ختم نہ ہوگا۔ مغربی ادب، فن، تنقید اور جمالیاتی نظریات نے ہمیں نئے نئے حقائق اور تصورات سے روشناس کر دیا ہے۔ اس کے پیشِ نظر قدیم تصورات کو اپنانا خود کو دیدہ دانستہ ایک تنگنائے میں محدود کر دینے کے مترادف ہے۔ اس وقت تمام دنیا کا تخلیقی سرمایہ ہمارا سرمایہ ہے اور ہم اس سے اپنے ادب و فن میں زیادہ سے زیادہ وسعت، تازگی اور توانائی پیدا کر سکتے ہیں ـــ کیا یہ روش زیادہ سودمند ہے یا یہ کہ ہم پرانی روایت یا اب تک کے جانے پہچانے، آزمائے ہوئے طریقوں کو دہراتے جائیں؟ ہمارا مطمحِ نظر اپنی تخلیقات کو معنویت سے حتی الامکان قریب تر لانا ہے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم آرٹ کی ماہیت اور لوازمات کو سمجھیں۔ آرٹ کا جو نظریہ بھی کسی معقول تصور یا توجیہہ سے بلند ہوتا ہے، معنی اور ہیئت کی مطابقت اور مزید جدت کا ضامن ہے۔ اس لئے ہم ہر نظریے میں کسی نئی روشنی کا سراغ پائیں گے۔

ظاہر ہے کہ ہماری قدیم انشا اور تنقید میں ادب و فن کے کتنے ہی پہلو نمایاں نہ تھے اور نہ ان کے کتنے ہی مظاہر ہمارے سامنے تھے۔ پہلے

ہماری بنیادی ضرورت یہ ہے کہ ہم بار بار اپنے سابقہ ادب (کلاسیکی و جدید) اور اس کی تنقیدی و نظریاتی اساس کو پرکھیں، ان پر محاکمہ کریں، اور اگر ان میں ترمیم، اصلاح، تجدید، توسیع کی بدستور ضرورت اور گنجائش ہے، تو اس کا وسیع تر پیمانے پر اہتمام کریں۔ کیا ہم نے فی الحقیقت ایسا کیا ہے یا نہیں، یا قدیم و جدید کی کم و بیش اسی ابتدائی مفاہمت پر قانع ہیں جو آج سے برسوں پہلے سرسید کے عہد میں ہوئی تھی؟ ظاہر ہے کہ جدید ادب کے بانیوں نے ہمیں جو نمونے، جو تصورات، جو خاکے دئیے تھے، وہ صرف سلسلۂ کار کو جاری کرنے کے لئے تھے، صرف اس قدر کہ وہ قدیم سے جدید ادب کی صورت سے معنی کی طرف رخ بدل دیں تاکہ بعد میں آنے والے اپنی فکر و بصیرت اور جدوجہد سے اس عمل اصلاح و تجدید کو اور بھی نمایاں کریں، اور اس رخ کو برابر بدلتے چلے جائیں تا آنکہ یہ درجۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔ اس کے یہ معنی نہیں تھے کہ ان کا نقش اوّل ہمیشہ نقش اوّل ہی رہے۔ اور ہم ہمیشہ بسم اللہ کے گنبد ہی میں رہیں۔ 'من نتوانستم پسرم برداشت'۔ ان کے اقدام میں بالطبع یہ احساس جاگزیں تھا کہ بعد کے ارباب فکر و نظر اس مہم کو اور بھی آگے لے جائیں گے۔ کیا ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا ہے؟

بلاشبہ آج ہم پہلے سے کہیں آگے نکل چکے ہیں۔ ادب و فن کی عالمی سطح کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم نے بھاگم بھاگ اس تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ شاعری نے پہلے دور کے کوچے سے نکل کر کتنے ہی مقامات طے کئے ہیں اور صرف پابند نظم ہی میں غیر معمولی تنوع نہیں پیدا کیا بلکہ آزاد نظم کو بھی فروغ دیا ہے جس کے ہر نمائندہ شاعر کا ایک جداگانہ انداز ہے۔ شعری اصناف میں اضافہ ہوا ہے جس کا ثبوت سانیٹ، غنائیے، اوپرا، منظوم ڈرامے (یک بابی و پنج بابی) ڈرامائی مانولاگ، طویل نظمیں، بیلڈ، کینٹو وغیرہ ہیں۔ شعری تکنیک میں بھی نئے طریقے برتے گئے ہیں۔ شعری موضوعات اور تصورات بھی کافی بدلے ہیں۔ یہ سب کچھ ہے پھر بھی بعض اہم اور بنیادی امور میں ایک کمی محسوس ہوتی ہے۔ جیسے یہ تمام فریب نظر ہے۔ جو بات ہونی چاہئے تھی وہ ابھی تک نہیں ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے بعد ہماری شاعری کچھ خالی الذہن سی معلوم ہوتی ہے۔ اور ہنگامی حالات یا میلان کے مطابق ایک موضوع سے دوسرے موضوع اور ایک لے سے دوسری لے کی طرف جست کرتی رہی ہے۔ 'رست از یک بند تا افتاد در بندے دگر'۔ کبھی انقلاب، کبھی حب وطن، کبھی ترقی پسندی، کبھی رومانیت، کبھی فسادات، کبھی "کشمیر چلو"۔ کبھی "یہ وہ سحر تو نہیں"۔ اور کبھی ایک خلا! اس افتاں و خیزاں قسم کی شاعری میں، کسی بھرپور بات کی توقع بیکار ہے۔ اُس مسلسل دقیانوسی وضع سے قطع نظر جو بعض غزلیات اور بعض اسی قسم کی قدیم و جدید "پیوندی" نظموں میں دکھائی دیتی ہے۔ اور آج بھی نظم و نثر اور نقد و نظر میں ہماری دنیائے ادب پر کافی حد تک حاوی ہے، ایک خاص قسم کی سہل بلکہ سہل انگار شاعری بھی رائج ہو گئی ہے جو اپنی مقبولیت اور سرسری اپیل کی وجہ سے ایک سدِّ گراں بن گئی ہے۔ کیونکہ ہمارے اذہان اس سے ہٹ کر زیادہ وقیع کوششوں کی طرف مائل نہیں ہوتے۔ بالخصوص ہم غزل میں ٹکسالی بندھے مضامین کو لگے بندھے پیرایوں میں ادا کر دینا ہی کافی سمجھتے ہیں۔ اپنی شعری حیثیت سے قطع نظر غزل ہمارے نزدیک ایک علاماتی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ ایک مقدس حیثیت کیونکہ یہ ہمارے ماضی اور قدیم ثقافت کی سب سے بڑی یادگار ہے۔ یہاں اس صنف کے مثبت یا منفی پہلوؤں پر بحث کا موقع نہیں تاہم اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ یہ اپنی طرف خصوصی توجہ دیگر اصناف اور تازہ بہ تازہ نو بہ نو دریافتوں، اعلیٰ خصوصیتوں اور دوسری زبانوں کے اچھوتے اوصاف۔ نیز شعر و ادب کے باب میں اقوام عالم کے گوناگوں سیر حاصل تجربوں اور خیال افروز پیرایوں، بیانی، تکنیکی، فنی وغیرہ ـــــ سے اغماض کی ترغیب دلاتی ہے کیونکہ اس کے مخصوص انداز اور شاعری کی آزاد وضع میں منافات ہے۔ یہ اب تک ہماری قوم کے دل و دماغ پر بری طرح حاوی ہے۔ ہمارے اسی فیصدی شعرا اسی کے دلدادہ ہیں، اور بہت فرسودہ انداز میں یہاں تک کہ معروف شعرا بھی اسی قدامت نوازی کے ذیل میں آتے ہیں۔ ہماری ادبی پیداوار کا اسی فیصدی یا اس سے زیادہ غزلیات پر مشتمل ہے جس میں اعلیٰ درجہ کی غزلیں بہت کم ہیں، اور پرانے غزل گوؤں کے مقابلے میں نہیں جچتیں، شاید اس لئے کہ اس کی صلاحیتیں ماند پڑ چکی ہیں اور اس کا دورِ کمال ختم ہو چکا ہے۔ عاشقانہ، رسمی اور سستی وضع کے باعث اس صنف کا بیکار سرمایہ دنیا بھر کی شعری اصناف سے کہیں زیادہ ہے۔ بدقسمتی سے اس کے موافق یا مخالف جتنی بھی بحثیں ہوتی ہیں ان میں دکھتی رگوں کو چھیڑنے سے پہلوتہی کی گئی ہے۔ اسی لئے اس پر صحیح قسم کا محاکمہ نہیں کیا جا سکا۔ اور جب تک ایسا نہ ہوگا ہمارے راستے سے ایک بنیادی رکاوٹ دور نہیں ہو سکے گی۔ ہم کھل کر پوری جمعیتِ خاطر سے نادر تخلیقی کوششوں اور تجربوں کی طرف مائل نہیں ہو سکیں گے۔

اس وقت ہمارے سامنے سب سے بڑا سوال یہی ہے کہ شاعری میں وسعت کیسے پیدا کی جائے۔ ہمارے سامنے ترقی کے کیا کیا راستے ہیں مختلف

مغربی ممالک میں کتنی ہی تحریکیں جاری ہوئی ہیں اور شاعری نے کتنے ہی رنگ بدلے ہیں: امیج ازم (Imagism) دادا ازم (Dadaism) سرریل ازم (Surrealism)' سمبل ازم (Symbolism) - یوں بھی اوّل سے آخر تک شعرا کا ایک بے پایاں سلسلہ ہے جن میں سے ہر ایک ہمیں شعر و فن کا ایک نیا تصور دیتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور ہم اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں مثلاً جدید عہد میں ہاپ کنس اور ایلیٹ شاعری کے دو بڑے اہم سرچشمۂ اثر ہیں اور ان سے ہیئت اور مادے کے متعلق کتنے ہی تصورات ابھرتے ہیں - مگر ہم نے ایک کی حزنیہ نے اور طرز بیان کی بعض اوپری خصوصیتوں کے بغیر مغربی تصورات سے کچھ زیادہ حاصل نہیں کیا۔ اس لئے ہماری کوششیں بڑی حد تک ایک تنگنائے ہی میں محصور ہیں۔ نثر ہو یا نظم، فکر و خیال ہو یا نقد و نظر، تصور ہو یا پیشکش، موضوعات ہوں یا شخصیات، ہم نے چند ایک راہیں منتخب کر لی ہیں اور ہماری جولانیاں کم و بیش ایک ہی انداز رکھتی ہیں، تمام تر ان ہی میں کھپ جاتی ہیں۔

ادھر مشرق میں شعر و شاعری کا ایک وسیع سرمایہ پڑا ہے جسے ہم نے چھوا تک نہیں۔ عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی، چینی، جاپانی، سب میں ایسے نمونے اور فنی مثالیں موجود ہیں جن سے ہم بے انتہا استفادہ کر سکتے ہیں۔ مگر بدقسمتی سے یہ ہمارے لئے بڑی حد تک اچھوتے جام ہیں — دیگر زبانوں کی طرح ہندی کا مطالعہ بھی ہمارے لئے بڑا مفید ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ پنگل اور اس کے ساتھ ساتھ کلاسیکی موسیقی کی تالیں عروض میں تنوع اور لچک پیدا کرنے کے لئے اشد ضروری ہیں۔ عظمت اللہ مرحوم نے اس طرف توجہ دی تھی اور انگریزی عروض کو بھی اردو میں لانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے بلکہ آخر میں بات پرانے عروض ہی پر آ ٹھہری اور نتیجہ لگھوؤں اور گُروؤں کے ہیر پھیر کے سوا اور کچھ نہ ہوا جن سے کہیں کہیں کوئی انوکھی بات تو پیدا ہوتی ہے، لیکن یہ واضح نہیں ہوتا کہ اس کی بنیاد کیا ہے۔ یہ کوشش ٹھٹھر گئی ہے اور اب ہمیں پھر سے زیادہ آگاہی اور واقفیت کے ساتھ اس طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ عبدالعزیز خالد نے "تسکین اوسط" سے اس عقدہ کو حل کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ بڑی جزوی قسم کی کوشش ہے۔ سوال تو سارے عروض میں لوچ اور تنوّع پیدا کرنے کا ہے، نہ کہ ایک آدھ گر برتنے کا۔ جو لوگ اس مسئلہ سے شناسائی رکھتے ہیں، کچھ وہی اس کی اہمیت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ وہ محسوس کریں گے کہ یہ ہماری شاعری کا ایک بہت ہی اہم اور بنیادی مسئلہ ہے۔ چونکہ ہم ابھی تک پرانے عروض کی جکڑ بند سے آزاد نہیں ہوئے۔ اس لئے جب کوئی شاعر بجا یا بیجا عروض میں آزادی سے کام لیتا ہے تو اس پر شدت سے لے دے کی جاتی ہے۔ اگر ہم پرانے عروض کو سند سمجھ کر روایت پرستی کی بنا پر ایسا کرتے ہیں تو یکسر غلط ہے۔ اگر مسئلے کی وسعت کو سمجھتے ہوئے پوری معلومات کے ساتھ فراخ نظری سے گرفت کرتے ہیں تو یہ اور بات ہے۔ تاہم عروض میں لچک پیدا کرنے کا مسئلہ اپنی جگہ پر ہے۔

جو کچھ ہم نے اوپر کہا ہے اس سے لازماً شعر و فن کے تصور کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ یعنی ہم شاعری میں عروض کے علاوہ کس قسم کے پھیلاؤ، کس قسم کی تبدیلیاں، کس قسم کی گہرائیاں تلاش کریں۔ ہمارا مسلک کچھ بھی ہو، اتنا ظاہر ہے کہ ہمیں محض بیان یا حسنِ نگارش سے بلند تر اوصاف کا سراغ لگانا پڑے گا۔ اور تکنیک کے نئے نئے گر، بیان کی نئی نئی حدیں تلاش کرنی ہوں گی۔ چند ایک برتے ہوئے گر یا معلوم عوام پیرائے ہی کافی نہیں۔ کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے۔ یہ ضرورت اس لئے اور بھی اہم ہے کہ جو طریقے یا طرحیں پہلے پہل اختیار کی گئی تھیں یا بعد میں بروئے کار آئیں وہ دور از کار ہو چکی ہیں۔ مثلاً "نشاط امید" "برکھارت" ایسی طویل نظمیں اب خارج از بحث ہیں۔ جس سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ جن نظموں میں اطناب سے کام لیا جاتا ہے، ان کی تکنیک متروک ہو چکی ہے۔ ان کی خصوصیت تشریح ہے اور اب فن کی روح اُس بلیغ قسم کے ایجاز کو تصور کیا جاتا ہے جو اشاریت کے نام سے موسوم ہے اور جسے ایبر کرامبی نے (Incantation) قرار دیا ہے۔ اب ہمارا تمام تر زور ایمائی ایجاز (Epitomization) پر ہے۔ جس کی ایک نمایاں مثال (Waste Land) ہے۔

مختصر غنائی نظموں میں بھی وہی کیفیت نمایاں ہے، لہٰذا طویل قسم کی فکاہیہ یا بیانیہ، قدرتی اور تشریحی نظمیں، جو اب بھی بڑی کثرت سے لکھی جا رہی ہیں، فن کے تحت شمار نہیں ہوتیں۔ اب شاعری کی طرح خاصی پیچیدہ اور مرکب ہو چکی ہے۔ لہٰذا شاعری میں پرانی قسم کی بحثیں مثلاً صحت لفظی، محاورہ، سرقہ وغیرہ بے کار ہیں۔ ایلیٹ نے اپنی نظم (Waste Land) میں دوسرے شاعروں کا کچھ کچھ اس طرح بے چراغ کیا ہے کہ ان کو بجنسہ اٹھا کر اپنے کلام میں لے آیا ہے۔ یہ اس لئے کہ اپنے کلام میں اور ہی مرکب قسم کا اثر پیدا کرے۔ یہ اہتمام یہاں تک ہے کہ اس نے مضمون یا تشبیہیں تو درکنار

ترتیب قوافی کو بھی اڑا لیا ہے لیکن ہمارے یہاں ایسی روش "سرقہ" کے رسوا کن نام سے تعبیر کی جاتی ہے! یہ ضرورت پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے کہ ہم اپنے معیار کو زیادہ وسیع اور فراخدلانہ بنائیں اور شاعری کی نادر خصوصیات اور اعلیٰ عناصر پر زور دیں مثلاً لب و لہجہ، ذوق، اٹھان، حشرِ معانی، سماں، صوتی اثرات، مسلسل محاکات، وغیرہ ــ بالفاظِ دیگر ہمیں شعر و فن کا پورے کا پورا تصور بدلنا ہوگا۔ تاکہ ہمارا معیار رسا تر اور جلیل تر ہو۔

ہمارے بعض شعراء مثلاً شیر افضل جعفری، جعفر طاہر اور عبدالعزیز خالد نے کچھ نئے رنگ اُجالنے کی کوشش کی ہے۔ خصوصاً شیر افضل کا یہ تجربہ بہت اہم ہے کہ اس نے مقامی رنگ کو اُردو میں سمو دیا ہے اور ایک نیا سنجوگ پیدا کیا ہے۔ اس کی روش کو مختلف سمتوں میں ترقی دی جا سکتی ہے۔ یعنی بنگلا، سندھی، ملتانی، پشتو کی آمیزش سے ایسے ہی کئی اور سنجوگ۔ علاقائی تراجم نے ہمارے سامنے بعض نئی راہیں کھول دی ہیں، اور ہم اپنی علاقائی زبانوں سے نئے نئے تصورات حاصل کر سکتے ہیں جن سے ہماری ادبی روایت میں نہایت اہم اضافے ہو سکتے ہیں۔ اور ہم ایک محدود چکر سے نکل کر نئے طور پر اونچی سوچ سوچ سکتے ہیں۔ یہ اسی صورت میں مفید ہو سکتا ہے کہ ہم ان سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں اور اپنی پچھلی میراث کی بھول بھلیاں ہی میں گم نہ رہیں۔

نثر میں بھی کچھ ایسی ہی کیفیت نظر آتی ہے۔ لگ بھگ ایک صدی کے عرصہ میں نثر نے پرانی قسم کی مقفیٰ نگاری سے لے کر موجودہ ادیبوں کی بے تکلف تحریر تک بڑے اہم مدارج طے کئے ہیں لیکن اس میں بھی دبی اُلجھی سلجھی سی کیفیت نظر آتی ہے مثلاً ایک طبقہ اب بھی محمد حسین آزاد یا ابوالکلام آزاد کے اسلوب کو میکالے کے اسلوب کی طرح اُردو کا مثالی اسلوب قرار دیتا ہے۔ دورِ حاضر کے کتنے ہی ادیب اسی طرح الفاظ سے کھیلتے اور کھوکھلی قسم کی عبارت آرائی یا رنگیں بیانی میں دلچسپی لیتے ہیں۔ دوسری طرف بعض تحریروں پر آج سے سو برس پہلے کی تحریر کا گمان ہوتا ہے۔ شاعری کی طرح یہاں بھی نئے پرانے کا بے ہنگم، انمل، بے جوڑ پیوند نظر آتا ہے۔ عبوری دور اب بھی اپنے ایک پہلو میں پائمال قدامت اور دوسرے میں کچھ سلجھی کچھ بگڑی ہوئی جدت کو لئے ہوئے ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ نثر کے اسالیب پر کڑی نظر ڈالی جائے اور اُس مبتدیانہ مبہم قسم کے تصور سے آگے قدم بڑھایا جائے جس میں کھو کر انداز بیان کے اونچ نیچ کا شعور زائل ہو جاتا ہے۔

جو بیداوار نظم میں غزل کی ہے وہی نثر میں افسانہ کی ہے جس میں زیادہ تر مختصر افسانے شامل ہیں اور اس کا نتیجہ بھی وہی ہے۔ رطب و یابس کی بھرمار جس سے آبروئے شیوۂ اہلِ نظر بھی جاتی رہتی ہے۔ لامحالہ اس صنف میں بھی خوب و زشت، ادنیٰ و اعلیٰ میں تمیز کے لئے ایک کڑے معیار کی ضرورت ہے۔ ہمارے یہاں افسانہ کی نشو و نما بھی زیادہ تر ذہنی آوارگی کی مرہونِ منت ہے یعنی اس کی مختلف صورتیں، راہیں، طریقے، مقاصد کسی واضح شعور کے بغیر ہی اُبھرتے رہے ہیں اور افسانے من مانے طور پر تشکیل پاتے رہے ہیں۔ اس میں بھی لکھنے والوں کو ایک کے بعد دوسرا موضوع ہاتھ آتا رہا ہے اور وہ اس کی رو میں بہتے چلے گئے ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں جنس ہے جس کا سلسلہ دوسری افسانوی اصناف، ڈراموں اور ناولوں میں بھی اکثر و بیشتر بازارِ حسن تک پہنچتا ہے۔ اچھی خاصی تعداد ایسے افسانوں کی ہے جن کا مقصد پردہ دری، کھلا طنز یا تضحیک ہے۔ ایک عرصہ فسادات کے افسانوں کی گرم بازاری رہی۔ اس سے دو نتیجے نکلتے ہیں۔ ایک تو ہمارے افسانہ نگار چند کوچوں ہی میں گھرے ہوئے ہیں اور دوسرے وہ کسی نظامِ فکر یا واضح تصور کے ماتحت موضوعات تلاش کرنے کے بجائے، جن کا دائرہ بے حد وسیع ہو سکتا ہے، ہنگامی حالات ہی سے اشارہ پاتے ہیں۔ ان کا مشرب سیلانی ہے۔ اس طرح ہمارا مطلعِ نظر کبھی کشادہ نہیں ہو سکتا اور نہ ہمارے افسانوں میں وسعت یا تنوع پیدا ہو سکتا ہے۔ فنی حیثیت سے ہم بڑی حد تک قصہ پن کے تصور میں اسیر ہیں اور واقعات کے جوڑ توڑ سے خواہی نخواہی کہانی مرتب کرتے ہیں۔ یا پھر واقعات کو کھینچ تان کر ایک مضمون بنا دیتے ہیں۔ جن کی صحت پر یقین نہیں آتا ــ اگر ہمارے افسانہ نگار یہ جان لیں کہ جستہ جستہ تاثرات کے علاوہ، جو اپنی جگہ پر برمحل ہیں، ایک جامع فکر کے تحت بھی زندگی، ماحول اور انسانی فطرت پر نظر ڈالی جا سکتی ہے۔ تو اس میں زیادہ بھرپور اور متنوع اثر کا امکان ہوگا اور ہم عام مشاہدات سے ہٹ کر نادر نکات اور مسائل کو بھی اچھوتے پیرایوں میں بروئے کار لا سکیں گے۔

اس سلسلہ میں تنقید کا فرض سب سے اہم ہے۔ اور ہم اسی کے فیضان سے محروم ہیں۔ ایک طرف قدما کا علم انتقاد ہے جس کو علم البیان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یا اس کی وہ عملی صورت جس میں عہدِ ماضی کے تصورات کو عملی و ادبی مظاہر یا شخصیتوں پر منطبق کیا گیا۔ اس کا مرقع تذکرے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان سب میں نقد و نظر کی کوئی ایسی سلجھی ہوئی صورت نہیں ملتی جس کو ہم آج کل شمعِ راہ بنا سکیں۔ مغربی علم ادب و تنقید اور جدید تصورات

نے ان کو ساقط از اعتبار کر دیا ہے۔ البتہ علم البیان کے بعض حصے جن میں معنویت کو تھوڑا بہت دخل ہے، اب بھی کار آمد ہیں۔ صنائع و بدائع، قافیہ و ردیف، عروض، شعری تصور، سرقہ و توارد، اسالیب، اقسام نظم و نثر وغیرہ کے سلسلہ میں بے حد چھان بین، ردو قبول اور اصلاح و تجدید کی ضرورت ہے۔ مگر ہمارے شعور پر اب تک قدیم مبادیاتِ تنقید کا گہرا سایہ ہے اور ہم سکّہ بند تصورات سے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ علم البیان کی ابجد تین دلالتیں ہیں: لغوی، تضمنی اور التزامی۔ صریحاً ایماو اشارہ، طنز (Irony) اور تمثیلیت بھی ایسی ہی دلالتیں ہیں، یہاں تک کہ ایہام بھی بعض اوقات ایک خاص دلالت رکھتا ہے۔ ادھر استفہام انکاری، معہود ذہنی اور فجائیہ (!) بھی واضح دلالتیں ہیں۔ لہٰذا دلالتوں میں توسیع لازم ہے۔ علم البیان میں صنائع و بدائع کو نہایت بھونڈی شکل میں جگہ دی گئی ہے۔ ان کی اعلیٰ ترقی یافتہ صورت صوتی اثرات ہیں جن سے فن اور معنی دونوں کا اثر دوبالا کرنے میں مدد ملتی ہے۔ علم البیان کا ایک اہم نظریہ یہ ہے کہ کلام مقتضائے حال کے مطابق ہو جس کی ادنیٰ و اعلیٰ کتنی ہی صورتیں ہیں۔ اس سے تحقیق و تلاش کے لئے ایک بہت وسیع میدان کھل جاتا ہے۔ ایسے ہی اول تا آخر بے شمار مسئلے ہیں جن کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات بہم پہنچانے اور وسعت نظر کو شمع راہ بنا کر ایک نیا علم البیان مرتب کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ ہم نے یہاں چند جستہ جستہ مثالوں ہی پر اکتفا کیا ہے۔

زندگی کی طرح ادب اور تنقید بھی متحرک ہیں۔ نئے حالات اور نئے انکشافات کے ساتھ ساتھ ان کو بھی بدلنا چاہیئے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہم محض بدلنے ہی کے لئے بدلیں اور اپنے قدیم ادبی و تنقیدی سرمایہ کو لازماً از کار رفتہ خیال کریں۔ سوال صرف بے لاگ تحقیق کا ہے جس میں حسنِ تناسب کو پورا پورا دخل ہونا چاہیئے۔ یہی روش "مقدمۂ شعر و شاعری" میں اختیار کی گئی تھی جو قدیم و جدید کے جائزہ اور مفاہمت کی بڑی معقول اور سنجیدہ صورت تھی اور یہی روش ہمیں اس نئے وسیع تر اور بسیط تر جائزہ اور مفاہمت میں اختیار کرنی چاہیئے جو ادب و فن اور نقد و نظر کا مرقع نو ہوگا۔ اس کی بنیاد استقراء پر ہوگی۔ مشرق و مغرب کے ادب و تنقید سے محرمانہ شناسائی اور حکیمانہ بصیرت پر، تاکہ جو قدم اٹھایا جائے وہ زیادہ سے زیادہ موثر اور زیادہ سے زیادہ ارتقائی امکانات کا ضامن ہو۔ جن تنقیدی و ادبی تصورات کی نشاندہی نظری و عملی طور پر دورِ اول میں کی گئی تھی، خصوصاً "مقدمہ" میں، وہ حتی الامکان اپنا اثر طاری کر چکے ہیں۔ جو حرکت ان میں بالقوۃ موجود تھی وہ عمل میں آ چکی ہے۔ اس لئے جس افادیت کی اب بھی اس میں گنجائش ہے، اس حد تک وہ بدستور مفید ہے لیکن وہ مزید توانائی وہ حرکی قوت جو ایک ولولۂ تازہ، ایک پر زور تحریک کو جنم دے۔ جو زندگی، ادب اور انتقاد کے سلسلے کو اور بھی آگے بڑھائے اس میں موجود نہیں۔ یہ بات صرف تازہ نگاہ، تازہ بصیرت، تازہ دریافتوں، تازہ محرکات ہی سے ہاتھ آ سکتی ہے۔ اور ہمارے عہد میں جو اضمحلال سا محسوس کیا جا رہا ہے۔ اس کا سبب اس روشنی کا فقدان ہے۔ ایک نیا جائزہ، ایک نیا محاسبہ، ایک نئی روزن کشائی، یہ ہے وہ کام جو نئی نسل کے دیدہ وروں کے ذمّہ ہے۔

ہم نے نئی تحریک کے آغاز سے لے کر اب تک اپنے تنقیدی مشرب میں کیا ترقی کی ہے۔ اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ ہماری آراء، ہمارا مسلک، ہمارے تصورات تقریباً وہی ہیں جن کی داغ بیل ہمارے بزرگوں نے رکھی تھی۔ مشاہیر ـــــــ ولی، میر، درد، غالب وغیرہ، ادبی تخلیقات اور مظاہر تحریکات، ادوار، اصناف، سب کے متعلق ہماری رائیں کم و بیش وہی ہیں۔ جو تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ کچھ ایسی وقیع نہیں۔ اسلوب تنقید کا کینڈا ابھی وہی ہے جو "شعر العجم" ۔ "یادگارِ غالب" اور "مقدمہ" میں اختیار کیا گیا ہے۔ سارا زور تفسیر و تشریح پر ہے جس کی اعلیٰ پیمانے پر مثالیں محاسنِ کلامِ غالب اور افکارِ غالب ہیں۔ صحیح جائزہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم نئی معلومات کی عینک لگا کر دیکھیں اور نئی نگاہوں سے پرکھیں۔ اس سے یقیناً نمایاں فرق پیدا ہوگا۔ یہی روش دورِ جدید کے سلسلہ میں بھی لازم ہے۔ صورتِ حالات کچھ اس وجہ سے اور بھی الجھ گئی ہے کہ فکر و نظر میں پرانی اور نئی روئیں مسخ ہو کر بری طرح گڈمڈ ہو گئی ہیں جس سے بسا اوقات حسنِ تناسب برقرار نہیں رہتی اور ہماری تنقیدات میں، خواہ وہ کتنی بلند ہی کیوں نہ ہوں عجیب شتر گربگی پائی جاتی ہے۔ فیصلوں میں، آراء میں، نظریات میں، انداز بیان میں۔ یہی وجہ ہے ہمیں ادب و انشاء و تنقید کے ایسے نمونے برابر نظر آ رہے ہیں جن میں تحریر اور فکر کی بوالعجبی بُری طرح کھٹکتی ہے۔ اس سے مربوط و منظم فکر کا شیرازہ پریشان ہو جاتا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ افراتفری کو کھل کھیلنے کے لئے اذنِ عام مل جائے۔ اور کسی پُر وقار آواز کے برعکس، جو زندگی اور ادب میں ربط و ضبط پیدا کرے، گوناگوں آوازوں سے ٹر لونگ کی سی کیفیت پیدا ہو۔ یا "کھل سم سم" یا موت! اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ اگر شدتِ اندیشہ مناسب چارۂ کار پیدا کر لے تو ہماری آئندہ نشو و نما کی راہیں خود بخود وا ہو جائیں گی۔ ایسے موقعوں پر انسانی فکر کشودِ کار کے ذریعے پیدا کر ہی لیتی ہے۔ ہم کسی نہ کسی طرح اُس طلسمی حلقے سے باہر نکل جاتے ہیں جس نے ہمیں چاروں

طرف سے گھیر رکھا ہوا اور آگے بڑھنے کی راہیں مسدود کر رکھی ہوں۔ اس سے پہلے کبھی ہم اپنی تاریخ کے ایک بے ڈھب موڑ پر ایسی ہی افتاد سے دوچار ہوئے تھے، لیکن دلِ زندہ کی تڑپ اور شعور کی کسک نے اس کا سامنا کیا اور اُس پر غالب آئی۔ آج بھی ہم ان اجالوں سے مدد لیں جو ہمارے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں اور فکرِ کارساز کو کام میں لائیں تو موجودہ افتاد سے بھی بخوبی عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ ادب و صحافت میں زندگی کی دھڑکن اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ زندہ مسائل کا سامنا کریں اور ان کا مناسب حل تلاش کریں۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہمارے مسائل اور ضروریات کا واضح تصور لازم ہے اور اس کے بعد ہوشمندانہ منصوبہ بندی تاکہ ہماری کوئی چال بیکار نہ جائے، کوئی وار اوچھا نہ پڑے۔ سب سے بنیادی بات جدید علم البیان یعنی علم انتقاد کی تدوین ہے۔ کیونکہ یہی ہمارے نئے ادب کا سرچشمہ ہوگا۔ ہمارے سامنے ایک طرف مشرقی قوموں کے فنی نظریئے اور دستور العمل ہیں اور دوسری طرف یورپ و امریکہ کے ارسطو اور افلاطون سے لیکر آئی۔ اے رچرڈس، ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ، ہربرٹ ریڈ، سکاٹ اے جیمز، راجر فرائی وغیرہ کی خیال افروز توضیحات۔ ان سب کا کڑی نظر سے جائزہ لیکر، ان کو اپنے ذہن میں پوری طرح رچا کر، آپس میں آمیز کیا جا سکتا ہے تاکہ ہمیں ایک نیا تعمیری و تخلیقی دستور العمل ہاتھ لگے۔ ہمیں لازم ہے کہ پرانے اور نئے رجحانات کی کشمکش کو دور کر کے مکمل یکسوئی پیدا کریں تاکہ ہم اپنی تخلیقی قوتوں اور سرگرمیوں کو پوری شدت اور ہم آہنگی سے ایک ہی نہج پر کام میں لائیں یہی ہماری آئندہ ترقیات میں بہترین رہنما ثابت ہوگا۔ اور اسی کی روشنی میں ہم اپنے قدیم و جدید مشاہیر، ادب و فن کے مظاہر، تخلیقی کارناموں، تحریکات، ادوار، اقدار اور اصناف پر نظر ڈالتے ہوئے ان کی صحیح تشخیص کریں گے، اپنے فکر، ادب، فن، تنقید کی دکھتی رگ پہچان سکیں گے، ان کا صحیح علاج کریں گے اور پھر پوری صحت و توانائی کے ساتھ آگے بڑھ سکیں گے جو اپنے ساتھ روز افزوں ترقی کی نوید لئے ہوئے ہو۔

رسائی

ڈاکٹر تصدق حسین خالد

تا بہ امکانِ نگاہ،
نرم و نازک بازوؤں پر
دن کی یادوں کو سمیٹے
دور سے اڑتے چلے آتے ہیں
اپنے گھونسلوں کی گود میں
طائروں کے قافلے،
روح کو تسکینِ جنت مل گئی
میں اسیرِ فکر ہائے بیش و کم
تیری یادوں کو سمیٹے
اڑ کے جا پہنچا ہوں تیری بارگاہِ ناز میں

اقبال کا ایک شعر

فیض الرحمن اعظمی

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اس شعر کے متعلق جناب شورش کشمیری نے مولانا نیاز فتحپوری سے رجوع کیا اور انہیں لکھا کہ یہ شعر احباب میں اختلاف کا موضوع بن گیا ہے. ایک خیال یہ ہے کہ مہمل ہے، دوسرا خیال یہ ہے کہ محض شاعرانہ اُپج ہے. نیاز صاحب نے 'نگار' بابتہ مارچ ۵۹ء کے 'باب الاستفسار' کے تحت اس شعر پر یوں روشنی ڈالی ہے :

" ہر شاعر کے کلام میں بعض مصرعے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو دیکھکر ہم بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ وہ ذہن شاعر میں دفعتاً القا ہوئے ہوں گے اور نظم اور غزل لکھنے کی تحریک انہیں سے پیدا ہوئی ہوگی. اقبال کے اس شعر کا دوسرا مصرع 'بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا' اسی نوع کا الہامی مصرع ہے جو بغیر کسی کاوش کے ذہن شاعر میں آیا ہوگا. ظاہر ہے کہ اس مصرع میں دو لفظ بنیادی حیثیت رکھتے ہیں : چمن اور دیدہ ور. اس لئے جب مصرع اول کی کاوش انہوں نے کی ہوگی تو مصرع دوم کے ان دو بنیادی الفاظ کے پیش نظر فوراً لفظ نرگس ان کے ذہن میں آیا ہوگا جو بالکل سامنے کا لفظ ہے اور اس طرح یہ مصرع تیار ہو گیا کہ

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

لیکن افسوس یہ ہے کہ شاعر نے یہ غور نہیں کیا کہ ہر چند دونوں مصرعے لفظاً اپنی اپنی جگہ بہت خوبصورت ہیں، مگر معنوی حیثیت سے ان دونوں میں کوئی ربط نہیں. دوسرے مصرع میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ : 'بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا'. اس لئے پہلے مصرع میں اس کا ثبوت پیش کرنا چاہیئے تھا اور وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے کیونکہ نرگس کی بے نوری تو ظاہر ہے لیکن اس کی دیدہ وری کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا. اگر نرگس ہزاروں سال کیا لاکھوں سال بھی اپنی بے نوری پر روئے تو بھی وہ دیدہ ور نہیں ہو سکتی .... اس شعر کو مہمل کہنا یا محض شاعرانہ اُپج قرار دینا دونوں ایک ہی بات ہے کیونکہ حقائق کے خلاف شاعرانہ اُپج کوئی معنی نہیں رکھتی ......"

اس شعر کے حسن وقبح اور صحت اور عدم صحت سے قطع نظر، اس کی افہام وتفہیم کے سلسلے میں جناب نیاز نے چند ایسے مفروضے تراشے ہیں. جن کی تشریح وتوضیح ضروری معلوم ہوتی ہے، اول یہ کہ نیاز صاحب نے تخلیق شعر اور تخلیقی طریق کار کے سلسلے میں ذہنی اعمال کو ملحوظ نہیں رکھا، ورنہ وہ ہرگز یہ نہ کہتے ہیں کہ اچانک کسی جذبے کے ماتحت کوئی بنا بنایا شعر یا مصرع ذہن شاعر میں القا ہوتا ہے. اس شعر کے سمجھنے میں پہلی غلطی انہوں نے یہی کی ہے کہ الفاظ ونقوش کو حسب دلخواہ معنی پہنا کر نتائج کا استخراج کرنے کی کوشش کی ہے، حالانکہ تخلیقی عمل اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا وہ سمجھتے ہیں. یہ ضرور ہے کہ یہ کوئی پُراسرار یا ناقابل فہم عمل نہیں ہے لیکن عام آدمیوں کی بہ نسبت فنکار کی جذباتی اور تخلیقی کائنات میں ایک زبردست تموج اور ہیجان، طوفان اور تہلکہ برپا رہتا ہے. اس کے تحت الشعور میں ہزاروں قسم کے خیالات، احساسات، یادیں اور تجربے موجود ہوتے ہیں، اس کا تخیل ایسے تاثرات کی تخلیق بھی کرتا رہتا ہے جو بادی النظر میں کسی محسوس اور مادی شے کا نتیجہ نہیں. تخلیق کی خواہش فنکار کو اظہار پر اکساتی ہے. اظہار وابلاغ کیلئے وہ ایسے الفاظ کا استعمال کرتا ہے جن کے نازک اشاروں، لطیف استعاروں، معنی خیز ایجاز واختصار سے وہ اپنے اصل مقصد یعنی ابلاغ میں کامیاب رہے. ظاہر ہے ابلاغ کے لئے صحیح الفاظ ونقوش کا استعمال کس حد تک ضروری ہے. شاعری میں الفاظ بے جان اور منفعل نہیں ہیں بلکہ ہر لفظ بجائے خود

ایک مختصر خیالات، و تاثرات ہے۔ ہر لفظ اپنے اندر ایک دنیا پوشیدہ رکھتا ہے۔ یہ دنیا محض اس لفظ کے لغوی معنی تک محدود نہیں، الفاظ اور شاعری میں اس ناگزیر ربط کے ساتھ ساتھ اس چیز کو بھی ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ محض الفاظ کی الٹ پھیر بھی شاعری نہیں ہے۔ شاعری میں الفاظ اظہارِ خیالات و جذبات کا ذریعہ ہیں۔ اگر انہوں نے تجربات سے زیادہ اہمیت اختیار کرلی تو پھر شاعری ممکن نہیں۔ کامیاب شاعری کے لئے تجربے میں اصلیت، جذبات میں شدّت اور اسلوب (الفاظ، نقوش اور اوزان) پر قدرت یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔

فنکار یا شاعر کے ذہن میں کوئی خیال یا جذبہ پیدا ہونے کے نقطۂ آغاز سے فن یا شعری جامے کے درجۂ کمال تک پہنچنے کے لئے اسے مختلف مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ ہمارے یہاں اسے یعنی شعری تخلیق کے عمل کو بڑی سہل انگاری کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔ اور ان مختلف خارجی اور داخلی، نفسیاتی اور حیاتیاتی، انسانی اور آفاقی عوامل پر کڑی نظر نہیں ڈالی گئی ہے لیکن مغربی ناقدین نے شعری تخلیق کے عمل کو بڑی دقتِ نظر اور سائنسی طریق پر سمجھنے کی کوشش کی ہے اور ہر فنکار کے تخلیقی فکر کے ہر ہر گوشے میں جھانکنے کی کوشش کی ہے۔ اقبال کا یہ خیال:

از نوا بر من قیامت رفت و کس آگاہ نیست
پیشِ محفل جز بم و زیر و مقام و راہ نیست

یا غالب کے یہ اشعار:

اے ذوقِ نواسنجی بازم بخروش آور | غوغائے شبیخونے بر بنگۂ ہوش آور
گر خود نہ جہد از سر از دیدہ فرو بارم | دل خوں کن و آں خوں را در سینہ بجوش آور

محض یونہی نہیں ہیں۔ ان میں فنکار کی اس جانکاہی اور جاں پژوہی کا ثبوت ملتا ہے جس کے یہاں قلم سے الفاظ اس طرح ٹپکتے ہیں جس طرح انگلیوں سے خون ٹپکتا ہے۔

اگر ہم تخلیقی عمل کے اس طریقِ کار کو مانتے ہیں تو ہمیں یہ تسلیم کرنے میں تامل نہیں ہونا چاہیئے کہ "طلوعِ اسلام" اقبال کی اُن چند نظموں میں سے ہے جن میں تجربات کی اصلیت، جذبات کی شدّت اور اسلوب یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔ "طلوعِ اسلام" نظم ہے، غزل نہیں ہے۔ ہماری بدقسمتی یہ بھی رہی ہے کہ ہم ہر شعر کو مفرد انداز میں سوچنے اور دیکھنے کے عادی ہیں۔ غزل میں تو یہ بات ایک حد تک صحیح ہو بھی سکتی ہے لیکن نظم ایک پیچیدہ شے ہے۔ اس میں ہر شعر یا ہر سطر بجائے خود زیادہ اہم نہیں بلکہ مکمل نظم کی ترقی کا سبب ہے۔ اس نقطۂ نظر سے بھی دیکھئے تو بھی اقبال کے اس شعر میں کوئی خامی نظر نہیں آتی۔ نیاز صاحب کا یہ مفروضہ کہ پہلے مصرعِ دوم ذہنِ شاعر میں اچانک القا ہوا ہوگا، پھر اس کے بنیادی الفاظ کی روشنی میں مصرعِ اوّل کی جستجو ہوئی ہوگی، اس کو باور کرنے کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اقبال کی نظم کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ قومیں سخت مصیبت اور ابتلاء کے بعد ابھرتی ہیں۔ اقوام و ملل کی زندگی میں مستقل آلام و آفات کے بعد کوئی ایسا دیدہ ور انسان پیدا ہوتا ہے جس کی مسیحا نفسی ملک و قوم کے عروقِ مردہ میں روحِ تازہ پھونکتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس مقصد کے ابلاغ میں فنکار نے جن الفاظ و نقوش اور رموز و علائم کا انتخاب کیا ہے۔ اس میں وہ کہاں تک کامیاب ہوا ہے۔

نیاز صاحب کے مفروضے کا منطقی نتیجہ تو یہی نکلتا ہے کہ اقبال نے مصرعِ اول کی تخلیق محض مصرعِ دوم کے بنیادی الفاظ (چمن اور دیدہ ور) کی رعایت سے کی ہے، اس لئے نرگس اور اسی کی رعایت سے اس کی بے نور آنکھوں کا ذکر کیا ہے۔ دونوں مصرعوں میں کوئی معنوی ارتباط نہیں، اس لئے کہ دوسرے مصرع میں جو دعویٰ کیا گیا ہے پہلے مصرع میں اس کا ثبوت ہونا چاہیئے تھا، لیکن شاعر نرگس کی دیدہ وری کا کوئی ثبوت نہیں پیش کرسکا ہے۔ مجھے اس اعتراض کی سطحیت پر تعجب ہے۔ نیاز فتح پوری جیسا فاضل اجل نقاد بھی دعویٰ اور دلیل کی بے معنی الجھنوں میں پھنس کر رہ گیا اور اس شعر کے حسن، تاثیر اور شاعرانہ صداقت پر اس کی نظر نہیں گئی۔ اردو شاعری میں یہ بڑا پرانا طریقہ رہا ہے اور اب بھی ہے کہ شاعر ایک مصرع میں کوئی دعویٰ کرتا ہے اور دوسرے مصرع میں اپنے دعویٰ کی توثیق کے لئے ثبوت و دلیل فراہم کرتا ہے ــــ اقبال کے اس شعر کو پرکھنے کے لئے مروجہ طریقِ کار ہی کو استعمال کیا جائے تو بھی کوئی پیچیدگی یا بے ربطی نہیں نظر آتی۔ دونوں مصرعے اسلوب اور معنی دونوں لحاظ سے باہم مربوط ہیں۔ نرگس کا لفظ محض یونہی چمن اور دیدہ ور کی رعایت ہی کو ملحوظ رکھکر نہیں استعمال کیا گیا ہے بلکہ اس شعر کی لفظیات میں وہ ایک اہم اشارے اور علامت کا حامل ہے۔ اقبال نے نرگس کا لفظ محض ایک شاعرانہ علامت کے طور پر استعمال

کیا ہے۔ نیاز فتح پوری کا یہ کہنا کہ اگر ہزاروں کیا لاکھوں برس بھی نرگس روتی رہے تو وہ دیدہ ور کیسے ہوسکتی ہے" سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا قرآن پاک میں بارہا گمراہ انسانوں کے بارے میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ وہ آنکھیں رکھتے ہیں اور دیکھتے نہیں کان رکھتے ہیں اور سنتے نہیں۔ دل رکھتے ہیں اور سوچتے نہیں؟ تو کیا نعوذ باللہ ان جملوں اور ان الفاظ میں کوئی حقیقت اور ربط نہیں؟ نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ بات کو موثر انداز میں کہنے کا یہ ایک فصیح و بلیغ انداز ہے۔

شاعری کی دنیا منطق کی دنیا سے الگ ہے۔ جب شاعر اپنی دنیا آباد کرتا ہے تو اس میں سورج اور چاند، صبح و شام، موت اور زندگی، جنت اور دوزخ سب کو ایک ساتھ جلوہ گر کرتا ہے۔ شاعر کی تخیلی دنیا میں تو خوابوں کی دنیا کا نقشہ ہوتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے دیکھئے تو اقبال کے اس شعر میں کوئی خامی نہیں۔ شعر پڑھتے ہی فوراً ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ یہ تو ایک استعارہ ہے۔ نرگس کو ایسے انسانوں سے تشبیہ دی گئی ہے جو آنکھیں رکھنے کے باوجود بھی دیدۂ بینا نہیں رکھتے۔ پھر کہیں ہزاروں برس کے بعد ان میں کوئی دیدہ ور اور صاحب نظر پیدا ہوتا ہے لیکن نیاز صاحب اسے نہیں مانتے۔ ان کے خیال میں یہ محض شاعرانہ اپج یا مہمل ہونا ایک ہی بات ہے کیونکہ حقائق کے خلاف شاعرانہ اپج کوئی معنی نہیں رکھتی۔ نیاز صاحب کا یہ کہنا صحیح ہے کہ (سچی) شاعری میں حقائق سے گریز ممکن نہیں۔ لیکن شاعرانہ اپج کی اگر انہوں نے تشریح کردی ہوتی تو بات سمجھنے میں آسانی ہوجاتی۔ اگر شاعرانہ اپج سے ان کی مراد شاعر کی تخئیل ہے تو ہمیں اعتراض کی سطحیت پر اور بھی تعجب ہوتا ہے۔ حالی بھی تخیل پر واقعیت کی بندش لگاتے ہیں اور خیال کے لئے اصلیت کو ضروری جانتے ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

"اصلیت پر مبنی ہونے سے یہ مراد نہیں ہے کہ ہر شعر کا مضمون حقیقت نفس الامری پر مبنی ہونا چاہیئے، بلکہ یہ مراد ہے کہ جس بات پر شعر کی بنیاد رکھی گئی ہے وہ نفس الامر میں یا لوگوں کے عقیدہ میں یا محض شاعر کے عندیہ میں فی الواقع موجود ہو یا ایسا معلوم ہوتا ہو کہ اس کے عندیہ میں فی الواقع موجود ہے۔ نیز اصلیت پر مبنی ہونے سے یہ بھی مقصود نہیں ہے کہ بیان میں اصیت سے سر مو تجاوز نہ ہو بلکہ یہ مطلب ہے کہ زیادہ تر اصلیت ہونی ضروری ہے۔ اس پر اگر شاعر نے اپنی طرف سے فی الجملہ کمی بیشی کردی تو کچھ مضائقہ نہیں"

ظاہر ہے اصلیت اور حقیقت پر لکھتے وقت حالی کے پیش نظر شاعری کی سب سے مقدم اور ضروری چیز یعنی قوتِ متخیلہ یا تخیل رہی ہوگی۔ تخیل کی بے اعتدالیوں پر ٹوک تو سب نے کی ہے لیکن اسے مہمل کہنا شاعری اور تنقید دونوں کے اُصولوں کے منافی ہے۔ شاعری تو تخیل ہی سے عبارت ہے۔ شاعر کے تجربے میں جذبہ بھی اپنے آپ کو تخیل کے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔ اس کی قوت کی کوئی انتہا نہیں۔ یہ وہ طاقت ہے جو شاعر کو وقت اور زمانہ کی قید سے آزاد کرتی ہے۔ وہ آدم اور جنت کی سرگزشت اور حشر و نشر کا بیان اس طرح کرتا ہے گویا اس نے یہ تمام واقعات اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں "رُوحِ اقبال" میں تخیل کی یوں تعریف کرتے ہیں:۔

"تخیل کی قوت کی کوئی انتہا نہیں۔ وہ عقل سے زیادہ قدیم اور قوی ہے۔ وہ اشیا کی تعریف و تحدید نہیں کرتا بلکہ انہیں محسوس کرتا ہے اور یہی احساس اس کے معانی و تصورات کا جوہر ہے۔ یہی احساس جب خواہش بن جاتا ہے تو اس میں ایسی دلکشی آجاتی ہے کہ شاعر اس کی خارجی صورت دیکھنے کے لئے خود بیتاب ہوجاتا ہے ۔۔۔۔ سوائے تخیل کے جذبات کی دنیا کا کوئی محرمِ راز نہیں ہوسکتا۔ اس کی بصیرت کے آگے فکر ششدر و حیران رہ جاتی ہے جسے عقل ادھورا دیکھتی ہے اسے تخیل مکمل دیکھ لیتا ہے۔"

یہی تخیل کی کارفرمائی ہے جس سے شاعر اپنی تخلیق کی ہوئی دنیا میں محیر العقول اور باہم متضاد اشیاء ایک ساتھ جلوہ گر کرتا ہے۔ یہی شاعری کا ذریعۂ ابلاغ اور یہی آرٹ کا طریقِ کار ہے۔ فن کار اور شاعر فن کے اسی طریقِ کار کے ذریعہ حقائق کے چہرے سے نقاب کشائی کرتے ہیں اور انسانی فہم و آگہی میں اضافہ۔ مومن کا ایک مشہور شعر ہے ؎

وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب
تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

ظاہر ہے یہ شعر اصلیت اور واقعے کے خلاف ہے۔ مرنے کے بعد سوچنے اور تمنا کرنے کی صلاحیت کیونکر باقی رہ سکتی ہے، لیکن آپ اس شعر کو محض اس بنا پر مہمل قرار نہیں دے سکتے، اسی طرح فیضی کا یہ شعر ؎

سخت است سیاہیٔ شبِ من
لختے ز شب است کوکبِ من

(باقی صفحہ ۵۲ پر)

ماہِ نو، کراچی - جون ۱۹۵۹ء

حسرت موہانی ـ منفرد غزل گو

منیر فاروقی

ایک عرصے تک یہ خیال عام رہا بلکہ بعض حلقوں میں اب بھی اس امر کا اظہار کیا جاتا ہے کہ غالب کے عہد تک اردو غزل نے تمام تکمیلی مراحل طے کر لئے تھے۔ غالب کی غزل اردو غزل کی تاریخ کا نقطۂ عروج ہے، ان کے بعد اردو غزل میں ارتقا نہیں ہوا۔ وہ جہاں غزل کو چھوڑ گئے تھے یہ ابھی تک وہیں قائم ہے۔ لیکن اس رائے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا ـــ اس میں شک نہیں کہ غالب جیسا عظیم غزل گو اردو میں اور کوئی پیدا نہیں ہوا لیکن حالی، حسرت، اقبال اور چند ایک دوسرے غزل گو شعرا کی غزلیات کو دیکھ کر یہ بات بے جھجک کہی جا سکتی ہے کہ اردو غزل غالب کے بعد بھی ارتقا پذیر رہی ہے۔ اس میں ہر دور کی زندگیاں پورے طور پر نمایاں نظر آتی ہیں۔ اور جذبے کی ادائیگی باقاعدہ طور پر نکھرتی اور سنورتی رہی ہے۔

حالی بہت اچھے غزل گو تھے اور غالب ان کے مداح تھے لیکن حالی کے نزدیک غزل کچھ بے وقت کی راگنی تھی۔ انہوں نے شہر میں سب سے الگ دکان کھول لی، یہ خیال کئے بغیر کہ اکثر گاہک بے خبر ہیں لیکن اس یقین کے ساتھ کہ ان کا نایاب مال ضرور ایک دن گاہکوں کو اپنی طرف متوجہ کرے گا۔ حالی نے سرسید تحریک سے متاثر ہو کر اور مغربی ادبیات کا بالواسطہ مطالعہ کرنے کے بعد غزل کو مردود قرار دیا، اپنے ہمعصر شعرا کو پیغام دیا کہ اب بلبل کی چمن میں ہمزبانی چھوڑ دو، آؤ پیروئ مغربی کریں، بس اقتدائے مصحفی و میر کافی کر چکے۔ لیکن عین اسی دور میں داغ، امیر اور جلال کی غزل کی مقبولیت اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ ہرچند غزل زوال پذیر ہے لیکن سامعین کے مزاج اور مذاق سے زیادہ تعلق غزل ہی کو ہے۔ لیکن حالی، عظمت اللہ خاں اور دوسرے غزل کے مخالفین کی زوردار آوازسے اتنا ضرور ہوا کہ غزل کی اصلاح کا راستہ کھل گیا اور وہ مضامین جن کے لئے "پچھڑی ہوئی ہڈی" جیسے الفاظ استعمال ہونے لگے تھے یا تو یکسر ختم کر دئے گئے یا ان کی پیشکش کا انداز یکسر بدل گیا اور وہ سطح جس پر سستی جذباتیت تھی یا لفظی شعبدہ بازی وہ قطعی طور پر بدل گئی اور یہ احساس ہونے لگا کہ غزل کا نیا دور شروع ہوا ہے۔

غزل کے اس احیا میں حسرت موہانی کا بڑا ہاتھ ہے۔ حسرت نے غزل کا انتخاب سوچ سمجھ کر اپنے موضوع اور طرزِ اظہار کی مناسبت سے کیا تھا۔ اس کی روایات کو سمجھا تھا، مختلف اصناف اور اسالیب بیان کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اس وسیع مطالعے کے نتیجے میں غزل ہی ان کو اپنے مزاج کے حسبِ حال نظر آئی، چنانچہ خود بھی اپنے دیوان کے حصۂ اول (طبع ثانی) متعلق بہ ضمیمہ الف ۱۹۱۶ء میں لکھا تھا:

"۱۸۹۳ء اور ۱۹۰۲ء تک کی شاعری کا ایک بڑا مجموعہ نظموں، قصیدوں، قطعوں، غزلوں اور منظوم انگریزی کے ترجموں کی شکل میں راقم الحروف کے پاس موجود ہے جس کی نسبت گمان یہ تھا کہ نظرثانی کے بعد قابلِ اشاعت ہو جائے گا لیکن بعد میں کچھ تو اس خیال سے ابتدائی کلام کی اصلاح و ترقی کی یہ کوشش کوہ کندن و کاہ برآوردن کی مصداق قرار پائے گی اور کچھ اس لحاظ سے کہ رفتہ رفتہ راقم الحروف کی طبیعت نے اپنے لئے اصنافِ سخن میں غزل کو اپنے حسبِ حال پاکر منتخب کر لیا ہے اس کل مجموعۂ خرافات کو یک قلم نظرانداز کر دیا البتہ چند غزلیں ضرور رہنے دیں لیکن ان کو بھی اپنے ابتدائی لباس میں بلا اصلاح چھوڑ دیا تاکہ اہلِ نظر کو ان کے مطالعہ سے راقم الحروف کے مذاقِ سخن کی تدریجی ترقی کا اندازہ ہو سکے گا ..."

اشعار میں بھی اس کا اظہار کیا ہے کہ ؎

عشق حسرت کو ہے غزل کے سوا
نہ قصیدے نہ مثنوی کی ہوس

ایک نقاد کا کہنا ہے "حسرت کی شاعری یکسر جذبات کی شاعری تھی جو عمر کے مختلف حصوں کے ساتھ ساتھ ابھری اُٹھی اور ختم ہو گئی۔"
معلوم نہیں جذبات کی شاعری سے ان کی کیا مراد ہے لیکن اتنا تو ماننا پڑتا ہے کہ ۲۴-۱۹۲۳ء کے بعد کی بہت کم غزلیں ایسی ہیں جو حسرت کے اپنے مرتبے کی ہیں، بڑھاپے میں ان کی غزل بھی روبہ زوال رہی تھی۔ صرف قافیہ پیمائی والی بات محسوس ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے حسرت کی غزل کا زمانہ اواخر انیسویں صدی سے ربع اول بیسویں صدی تک ہے حسرت کی ایک ابتدائی غزل کے چند اشعار دیکھئے "دنیا زنتح پوری اسے ان کی اولیں غزل قرار دیتے ہیں؛

میں تو سمجھا تھا قیامت ہو گئی　　　خیر پھر صاحب سلامت ہو گئی
مسجدوں میں کون جائے واعظا　　　اب تو اک بت سے ارادت ہو گئی
ان کو کب معلوم تھی طرزِ جفا　　　غیر کی صحبت قیامت ہو گئی

نومشقی، فنی ناپختگی اور رسمی انداز کے علاوہ ان کی اول دور کی شاعری میں احساس کی وہ شدت، لہجے کی وہ نرمی، گداز اور دھیما پن کہیں بھی محسوس نہیں ہوتا جو ان کی غزل کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غزل کا بنیادی عنصر یعنی محبوب کی شخصیت ابھی ان پر سوار نہیں ہوئی۔ ابھی وہ حسن نہیں ملا تھا جس میں گم ہو جانے کی بات ہو، ابھی وہ موضوع نہیں ملا تھا جس کو وہ اپنے اندر جذب کر لیتے، ابھی وہ زندگی نہیں ملی تھی جس کو وہ اپنا لیتے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کے مطالعے میں بھی اتنی وسعت نہیں آئی تھی جس سے بعد میں ان کو بہت سہارا ملا اور جس کا اظہار بارہا خود بھی کیا ہے ؎

غالب و مصحفی و میر و نسیم و مومن
طبعِ حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض

اول دور کے ذکر کے ساتھ ہی ان کے آخر دور کا ذکر بھی دیا جائے تو محسوس ہو جائے گا کہ اس دور میں کتنا پھیکا پن پیدا ہو گیا تھا، ان کے جذبات کس قدر سرد ہو گئے تھے ؎

اس شوخ کا شکوہ کیا حسرت یہ تو نے کیا کیا
اس سے تو اے مردِ خدا بہتر تھا مرجانا ترا
دل ان سے مل کے اب ان کو بھلا نہیں سکتا
مگر یہ کیوں ہے میں خود بھی بتا نہیں سکتا

اس لئے ہماری زیادہ تر بحث ان کے اس دورِ شاعری سے ہے جو ۲۴-۱۹۲۳ء تک ختم ہو جاتا ہے۔ ایک نہایت نمایاں بات یہ بھی ہے کہ حسرت کے مزاج کا تلون اور انتشار، ان کی طبیعت کی بے باکی، بے ساختگی اور لطیفہ سنجی، ان کے مزاج میں انسانیت اور انسان پرستی کا جو جذبہ تھا اس سے بھی ان کی غزل کو بڑی مدد ملی جس سے اس صنف میں ایک آفاقی رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ غزل کے مزاج کی نفاست اور لطافت، روایتی ایمائیت، رمزیت و رعنائی کیفیت یہ سب باتیں جس طور پر ان کی غزل میں ۲۴-۱۹۲۳ء سے پہلے نظر آتی ہیں، دورِ آخر میں محسوس نہیں ہوتیں۔

حسرت کی غزل کا موضوع عشق و معاملاتِ عشق اور حسن و متعلقاتِ حسن ہے کہا جا سکتا ہے کہ حسرت ہی پر کیا موقوف ہے پوری غزل اسی سے عبارت ہے لیکن غالب اور اقبال کی غزلیں اس اعتراض کا جواب بن سکتی ہیں۔ ایک عظیم غزل گو کے نزدیک زندگی صرف حسن و عشق ہی نہیں۔ خود حسرت کی زندگی گواہ ہے کہ ان کا محبوب ہی سب کچھ نہیں ہے بلکہ اور بھی مسائل ہیں جو ان کے محبوب رہے لیکن ان کی غزل میں ان کا کہیں پتہ نہیں چلتا اور اگر کہیں تذکرہ آ بھی گیا ہے تو تغزل کا عنصر غائب رہتا ہے۔ اس میں وہ رس، وہ نکھار اور چاشنی نہیں جو محبوب کے بیان کے وقت محسوس ہوتی ہے۔ حسرت اپنے اور اپنے محبوب کے ذکر کو کئی کئی پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں۔ اس میں کبھی کبھی وہ اساتذہ کا رنگ بھی اختیار

کر لیتے ہیں لیکن مجموعی طور پر ان کا کردار کچھ اس انداز سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک سچے عاشق کی طرح وہ اپنے محبوب ہی کے ہو کر رہ جاتے ہیں، وہ اس کو مادی اور روحانی طور پر اپنے قریب ہی دیکھنا چاہتے ہیں، اس کی ایک ایک ادا سے واقف ہیں۔جب وہ ان کی طرف سے نظر التفات ہٹا لیتا ہے تو یہ انہیں دھمکی بھی دیتے ہیں کہ ہم کسی اور کو پسند کرلیں گے جس سے اس میں پھر سے توازنِ عمل پیدا ہو جاتا ہے۔

حسرت کی غزلوں سے ان کے عشق کی داستان مرتب کی جاسکتی ہے یعنی کامیابی سے پہلے اور کامیابی کے بعد ساری داستان ان غزلوں میں موجود ہے۔عشق کی ابتدا کے سلسلے میں ان کی ایک مشہور غزل ہے۔اس میں انہوں نے جزئیات نگاری سے اپنے ان ایام کی تصویر کشی کی ہے جب وہ متوسط مسلم گھرانے میں رہنے کی وجہ سے کھل کھیل نہیں سکتے تھے۔جب ان پر بہت سی سماجی بندشیں تھیں اور وہ ان بندشوں کو توڑ نہ سکتے تھے۔اور نہ ان کو توڑنے کی ضرورت ہی محسوس کرتے ہوں گے ؎

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے — ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے
باہزاراں اضطراب وصد ہزاراں اشتیاق — تجھ سے وہ پہلے پہل دل کا لگانا یاد ہے
بار بار اٹھنا اسی جانب نگاہِ شوق کا — اور ترا غرفے سے وہ آنکھیں لڑانا یاد ہے
تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بے باک ہو جانا مرا — اور ترا دانتوں میں وہ انگلی دبانا یاد ہے
کھینچ لینا وہ مرا پردے کا کونا دفعتاً — اور دوپٹے سے ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے

یہ انداز بالکل نیا ہے۔اس سے پہلے ایسی فضا اردو غزل میں نظر نہیں آتی۔یہ محاکاتی انداز پہلے کہیں نہیں ملتا۔یہ آپس میں روٹھنا، پھر خود ہی صلح پر آمادہ ہو جانا اور اس طرح کی دوسری "رسم پابندیٔ اوقات" کی باتیں اردو غزل کے لئے نئی ہیں لیکن یہ خالص مقامی اور واقعاتی ہیں اس لئے مانوس ہیں۔

شاعری کو تخیل اور محاکات کا مجموعہ کہا گیا ہے۔حسرت کے ہاں زیادہ رنگ محاکات کا ہے۔ان کے اشعار سے بہت خوبصورت اور متحرک تصویریں بنتی ہیں ؎

جان کر سوتا تجھے وہ قصدِ پا بوسی مرا
اور ترا ٹھکرا کے سر وہ مسکرانا یاد ہے

اور واقعیت کا اظہار یوں ہوتا ہے ؎

غیر کی نظروں سے بچ کر سب کی مرضی کے خلاف — وہ ترا چوری چھپے راتوں کو آنا یاد ہے
آ گیا گر وصل کی شب بھی کہیں ذکرِ فراق — وہ ترا رو رو کے مجھ کو بھی رلانا یاد ہے
دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لئے — وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

حسرت اپنے اس پہلو کے بیان میں بہت بے باک ہیں جس کو وہ اپنے "عہد ہوس کے فسانے" کا نام دیتے ہیں وہ اس عہد کو "باوجودِ ادعائے اتقا" یاد رکھتے ہیں، اپنے آغازِ الفت کے قصے مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں، انہیں ان قصوں میں بہت رنگینیاں نظر آتی ہیں۔اور وہ دوسروں کو بھی ان رنگینیوں میں جھانکنے تاکنے کی اجازت دیتے ہیں ؎

یاد ہیں وہ سارے عیشِ بافراغت کے مزے
دل ابھی بھولا نہیں آغازِ الفت کے مزے
حسن سے اپنے وہ غافل تھا میں اپنے عشق سے
اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے
صحتیں لاکھوں مری بیماریٔ غم پر نثار
جس میں اٹھے بارہا ان کی عیادت کے مزے

ماضی کو یاد کرتے وقت ان کے لہجے میں غم، یاس اور شکست کا احساس کہیں بھی نہیں ہوتا جیسے وہ اپنے عشق میں کامیاب رہے ہوں۔وہ ان یادوں کو اس لئے تازہ رکھتے ہیں کہ ان میں حسن ہے اور حسن کو پانے کی آرزو ہے لیکن اظہار میں جو شائستگی اور توازن ہے اس سے بھی یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کو اپنی محبت میں ناکامی نہیں ہوئی۔اس لئے بھی کہ ان کے ہاں رقیب کا کوئی ایسا کردار نہیں۔

اب ان کا محبوب ان کے قریب ہے، اس لئے اس کا ہر رنگ دیکھنے کا انہیں موقع ملتا ہے۔وہ اس کے حسن سے ہر رنگ میں کیف اٹھاتے ہیں ؎

رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا ــــــ طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا

یا مثلاً ؎

رونق پیرہن ہوئی خوبیٔ جسم نازنیں　　　اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا

کیا کیجئے بیاں اس تن نازک کی حقیقت　　　خوشبو میں ہے گل تو تو لطافت میں ہے سب رنگ

اور کبھی کبھی یہ رنگ بھی اختیار کر لیتے ہیں ؎

یاد بھی دل کو نہیں صبر و سکوں کی صورت　　　جب سے اس ساعدِ سیمیں کو کھلا دیکھا ہے

حسرت جب بھی اپنے محبوب کے حسن ظاہری کا ذکر کرتے ہیں تو کبھی کبھی تو ان کی عملی زندگی کو پیش نظر رکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان کا محبوب ان کے پاس ہی کہیں سو رہا ہو اور وہ پاس بیٹھے اپنے ادبی سیاسی کام میں مشغول ہوں۔حسرت نے جہاں کہیں بھی اپنے واردات عشق بیان کئے ہیں وہاں ان کی سادگی، خلوص اور واقعہ نگاری کا معتقد ہونا پڑتا ہے۔جیسے وہ صرف انہی واقعات و کوائف کو بیان کرتے ہیں جو ان کے عینی مشاہدہ میں آچکے ہوں۔اس عہد میں کئی ایسے واقعات بھی رونما ہوتے ہیں جب محبوب سے ناخوشگواری بھی پیدا ہو جاتی ہے، جب یہ ان سے یا وہ ان سے ترک تعلق تک کی سوچتے ہیں لیکن ایسا ہونا ان کو ممکن نظر نہیں آتا ؎

توڑ کر عہد کرم ناآشنا ہو جائیے　　　بندہ پرور جائیے اچھا خفا ہو جائیے

میرے عذر جرم پر مطلق نہ کیجے التفات　　　بلکہ پہلے سے بھی بڑھ کر کج ادا ہو جائیے

چھیڑ تنہائی میں گر بیٹھے تو دیجے گالیاں　　　اور بزم غیر میں جانِ حیا ہو جائیے

جی میں آتا ہے کہ اس شوخ تغافل کیش سے　　　اب نہ ملیے پھر کبھی اور بے وفا ہو جائیے

بھول کر بھی اس ستم پرور کی پھر آئے نہ یاد　　　اس قدر بیگانۂ عہد وفا ہو جائیے

لیکن آخر میں بات یہاں پہنچتی ہے ؎

ہائے ری بے اختیاری یہ تو سب کچھ ہو مگر　　　اس سراپا ناز سے کیوں کر خفا ہو جائیے

اس ساری غزل کی نارضامندی میں جو اپنائیت کا انداز ہے اور عاشق کا متوازن ذہن نظر آتا ہے وہ اردو غزل میں اس سے پہلے کہیں محسوس نہیں ہوتا۔خصوصیت حسرت کی ایک عام خصوصیت ہے۔چند اشعار اور بھی دیکھئے ؎

روشِ حسن مراعات چلی جاتی ہے　　　ہم میں اور ان میں وہی بات چلی جاتی ہے

اس ستمگر کو ستمگر نہیں کہتے بنتا　　　سعیِ تاویلِ خیالات چلی جاتی ہے

لہجے میں توازن اور ٹھہراؤ اور پھر جذبے اور ذہن میں کامل ہم آہنگی، ان کے ہاں ہر جگہ موجود ہے ؎

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن وہ اکثر یاد آتے ہیں　　　الٰہی ترکِ الفت پر وہ کیوں کر یاد آتے ہیں

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی　　　مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

ہر اچھے غزل گو شاعر کے ہاں ایک مخصوص فضا بنتی ہے۔اس فضا میں ایک خاص کردار جنم لیتا ہے جو یا تو شاعر کی شخصیت ہوتی ہے یا اس کا نصب العین جس تک وہ خود پہنچ کر اس کا ہمسفر بننا چاہتا ہے۔حسرت کے ہاں دیسی معاشرے کے متوسط مسلم گھرانے کا ایک شریف زادہ نظر آتا ہے جو بنتِ عم سے محبت کرتا ہے، اس سے چوری چھپے ملتا ہے اور والہانہ محبت کرتا ہے، جسے ہجر کی طویل راتوں سے کم ہی سابقہ پڑتا ہے اور جو بالآخر اپنی محبت

میں کامیاب رہتا ہے۔ اس کی زندگی نارمل طریق پر گذرتی ہے۔ وہ نہ جنگلوں میں مارا مارا نہ گلیوں میں پاگلوں کی طرح آوارہ پھرتا ہے جس پر غالب کی یہ بات صادق آئے ؎

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ　　سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

وہ ایک اوسط گھرانے میں باسلیقہ اور ہوشمند انسان کی طرح دن گذارتا ہے۔ وہ اپنی محبوب کو رفیقۂ حیات بناتا ہے اور اس پر مطمئن رہتا ہے۔ اس کردار میں اعتدال ہے، توازن ہے، ٹھہراؤ ہے۔ وہ سکوں ناآشنا نہیں البتہ اس کے پاس دھڑکتا ہوا دل ضرور ہے۔ اس پر جنونی کیفیت طاری نہیں ہوتی۔ وہ اپنے ہوش و حواس قائم رکھتا ہے۔ وہ جو قدم بھی اٹھاتا ہے سوچ سمجھ کر اٹھاتا ہے۔ وہ سماج کے خلاف بغاوت نہیں کرتا اور نہ اسکو بغاوت کی ضرورت ہی پیش آتی ہے۔

اسی طرح حسرت کی شاعری میں محبوب کا تصور بھی نیا ہے۔ وہ بھی معاشرے کے متوسط گھرانے کی ایک عورت ہے جو حسرت سے بے پناہ محبت کرتی ہے، وہ دوپہر کی دھوپ اور ننگے پاؤں کا خیال کئے بغیر عاشق سے ملاقات کو آتی ہے۔ وہ آغازِ الفت میں سامنے سے ہونٹ کاٹ کر نکل جاتی ہے، وہ حنا لگاتی ہے، زیور پہنتی ہے۔ آغاز میں پردہ کا خاص خیال رکھتی ہے لیکن اس دوران میں بھی کبھی کبھی غرفے یا چلمن سے باہر نظر آجاتی ہے۔ اس کو اپنی رسوائی کا ڈر ہے لیکن ایسا بھی نہیں جیسا کہ مثلاً "زہرِ عشق" کی ہیروئن کو۔ اس میں اعتدال پسندی اور وفاداری ہے۔ اس کا کردار اس طوائف کے کردار سے کتنا زیادہ دلکش ہے جو حسرت سے پہلے ہمارے ہاں غزل میں نمایاں حیثیت اختیار کئے ہوئے ہے اور اکثر جس کا مقام ہیروئن کا ہے، یا پھر حسرت کی یہ ہیروئن عورت کے اس کردار سے کتنی زیادہ جاندار ہے جو پہلے غزل کے پس منظر میں پڑی رہی ہے اور پردے سے کبھی باہر نظر نہیں آتی۔ جس کا کوئی عملی پہلو نمایاں نہیں ہوتا لیکن اس کے برعکس حسرت کی یہ ہیروئن کتنی ہی باتوں میں اس کی معاون ثابت ہوتی ہے۔

حسرت کی غزل کے یہ کردار ایک دوسرے پر مکمل بھروسہ رکھتے ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے لئے جیتے ہیں جبکہ اس سے پہلے کے کردار ایک دوسرے کے لئے زندہ رہنے کی بات شاذ ہی کرتے تھے۔ یہ نارمل انسان جو عاشق کے روپ میں حسرتؔ کی غزل کا ہیرو ہے عاشق کے اس تصور سے کتنا مختلف ہے جس کی خصوصیت بے اعتدالی اور بے راہ روی ہے، جو سینکڑوں ہزاروں رقیبوں ہی پر بات ختم نہیں کرتا بلکہ بسا اوقات خدا کو بھی رقیب تصور کر لیتا ہے۔ اس غیر عادی (Abnormal) انسان کے لئے صحت مند نظریات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جو ہر وقت "عشق" میں غرق رہتا ہے، جس کو وسیع تر زندگی اور اس کے امکانات سے قطعی طور پر کوئی غرض نہیں، جس کو ہر وقت شکوہ رہتا ہے۔ محبوب سے، رقیب سے، خدا سے، آسمان سے، حتیٰ کہ اپنے آپ سے بھی وہ ہر وقت بیزاری کے عالم میں رہتا ہے اور جس پر ہر وقت شکست خوردگی کا عالم طاری رہتا ہے۔ اس کے برعکس حسرت کے ہاں ایک صحت مند اور کشادہ فضا کا احساس ہوتا ہے جس میں صحت مند کردار زندگی گذارتے ہیں۔

اوپر جو اشارات کئے گئے ہیں ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اردو غزل میں حسرت کی انفرادیت کیا ہے، اور اس کی غزل کے امتیازی نشانات کیا ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ حسرت موہانی عظیم شاعر نہیں تھے۔ ممکن ہے وہ اپنی پوری زندگی کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے تو عظیم شاعر بن جاتے اور ہم میر، غالب اور اقبال کی صف میں حسرت کا نام بھی لے سکتے۔ لیکن اس سے حسرت کے مقام پر کوئی حرف نہیں آتا۔ وہ ایک منفرد غزل گو ہیں۔ انہوں نے زندگی کے بوقلموں پہلوؤں کو اپنا موضوع نہیں بنایا، اپنی وسیع زندگی کے صرف جمالیاتی پہلو کو ہی اپنی شاعری میں جگہ دی۔ ان کی غزل میں ہمیں اس زندگی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں جو بیسویں صدی کے نصف اول کی مسلم سوسائٹی کے گھرانوں سے مخصوص ہے جس میں بیمار ذہنیت کام نہیں کرتی، جس میں زندگی کا نشاطیہ پہلو ملتا ہے، جس میں مشقِ سخن بھی جاری رہتی ہے اور چکی کی مشقت بھی۔

حسرت کی غزل کی صحت مند فضا کے یہ دونوں کردار مثبت ذہنیت کے مالک نظر آتے ہیں۔ اسی لئے ان میں جاذبیت بھی ہے۔ ان میں بلند نصب العین یا عظمت نہ سہی لیکن ان کی صحت مندی، خوش سلیقگی اور اچھے شہری ہونے پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نہ خلاؤں میں رہتے ہیں نہ تحت الثریٰ میں ان کی سطح ارضی ہے، اس لئے کہ یہ متوازن ذہنیت کے حامل ہیں۔ حسرت کی غزل کا یہی پہلو ان کو انفرادیت بخشتا ہے ؛

غزل

جمیل الدین عالی

ایک نگاہ بے حضور ایک نگاہ باریاب
یا دوام ہو سکوں یا دوام اضطراب

آج بھی مرے خیال بے حصول و بے مآل
آج بھی مرے سوال نا قبول و بے جواب

بجھ گئی ہے آرزو تھک چکی ہے جستجو
کتنے گل ہیں بے نمو کتنے جام بے شراب

اس کے ساتھ عمر بھر اپنی یوں ہوئی گذر
ایک آہ بے اثر ایک نماز بے ثواب

مے بھی جب کبھی ملی ساتھ تشنگی ملی
ایک زندگی ملی وہ بھی یوں رہی عذاب

تا بکے رہیں گی یاد چند مہربانیاں
میری بد گمانیاں بے شمار و بے حساب

اب وہ شوخ عشوہ گر کچھ نہیں رہا مگر
میں تمام اشتیاق وہ تمام اجتناب

کوئی جانتا نہیں کوئی مانتا نہیں
تیرے ساتھ رہ کے بھی ہم ہوئے بہت خراب

مثنویاتِ ہیر و رانجھا

قاضی یوسف حسین صدیقی

مغربی پاکستان خصوصاً مغربی پنجاب و سندھ میں علی العموم ایک ہم رنگ متجانس قسم کی ثقافت کا رواج رہا ہے۔ جو درحقیقت اس علاقے کی مشترکہ اسلامی زندگی اور تہذیب و معاشرت کا لازمی نتیجہ اور ثمرۂ شیریں ہے۔ چنانچہ مذہب و ایمان ہو یا سلوک و عرفان، فلسفہ و حکمت ہو یا علوم و فنون، تصورِ حیات ہو یا عملی زندگی۔ کشمیر اور خیبر سے لیکر کراچی تک جہاں سندھ کی موجیں اپنا سفر ختم کرتی ہیں، یکرنگی کی ایک خوش آیند، ہمہ گیر کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ اور یہی اُن بے شمار قصے کہانیوں اور رومانوں میں بھی منعکس ہے جو سندھ کی اس وادیٔ کبیر کی روحِ رواں ہیں۔ یہ قصے کہانیاں اور رومان یہاں کی تندرست و توانا اور ولولہ انگیز زندگی کا ایک نہایت ہی شاندار پہلو ہیں اور ان کی کثرت بھی اتنی ہی حیرت آفریں ہے جتنی ان کی افسانوی دلکشی و دلآویزی۔ یہ رومان اس کی بھرپور زندگی کے سینے سے ابھرتے ہیں۔ اسی لئے ان میں وہ سوز، وہ حرارت، وہ کیف و رنگ، وہ شانِ دلربائی اور ہر چہ از دل خیزد بر دل ریزد' والی کیفیت بھی ہے جو تمام انسانی طربیوں اور المیوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہ یہاں کی آب و ہوا اور اس کے سراپا حیات ساکنوں کا جبلی فیضان ہی ہے جس نے گوناگوں اثر انگیز و معنی خیز داستانوں کی شکل اختیار کی ہے۔ جن کو سالہا سال گزر جانے کے باوجود ہم اپنے دل و دماغ میں جگہ دیئے ہوئے ہیں اور اپنے سینوں سے لگائے پھرتے ہیں۔ سرحد ہو یا پنجاب سندھ ہو یا بلوچستان، ان داستانوں کی مقبولیت یکساں ہے۔ اور سب نے ان کو اپنے اپنے رنگ میں رنگنے، اپنے دل و جان میں سمونے اور مختلف طریقوں سے مختلف مقصد کے لئے برتنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی گونج ہمالہ کی برفانی چوٹیوں سے لیکر دور دور تک پھیلے ہوئے میدانوں اور متموج سمندروں تک سنائی دیتی ہے۔

ان داستانوں میں سے ہیر رانجھا کی داستان خاص طور پر مقبول ہے اور ہم اس کو بجا طور پر سارے مغربی پاکستان کی داستان کہہ سکتے ہیں اور اسکے قبولِ عام اس کے نفوذ و تاثیر کا یہ عالم ہے کہ یہ اپنی زاد بوم سے گزر کر برصغیر میں بھی دور دور تک پہنچ چکی ہے۔ مغربی پاکستان کے لوگ جہاں جہاں گئے، اس پُرلطف اور رُلا دینے والی داستان کو اپنے ساتھ لیتے گئے۔ اور اپنی سحر نوائی سے اس کو سب کی داستان بنا دیا۔ اس تاثیرِ عام ہی کا اعتراف کرتے ہوئے تو انشاؔ نے کہا تھا کہ ؎

سنایا رات کو قصہ جو ہیر رانجھے کا
تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

یہاں تک کہ عوام سے گزر کر اس کا سلسلہ خواص تک جا پہنچا۔ چنانچہ شاہ ظفرؔ نے بھی غالباً ہیر رانجھا کی حرماں نصیبی سے کلام میں سوز و گداز پیدا کیا ہے۔ شاید اس قبول اثر کا سب سے دلچسپ پہلو اور بھی زیادہ دور پورب کے قصبات و دیہات میں نظر آتا ہے۔ جہاں اس کا میٹھا جادو کچھ اور ہی رنگ رس پیدا کرتا اور دلوں کی گہرائیوں میں اتر کر وجدانی کیف و سرور اور سکون و راحت کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ دو آبے کی نچلی جاتیوں میں سادتی خون کو گرمانا اور بھڑکانا ہو تو آلہٰ اودل کی مخصوص رسیلا کا دھن ہی کام آتی ہے اور وہ پرانے پشتینی لڑیت راٹھور اور چوہان جوش کے مارے اچھل اچھل کر ایک دوسرے پر لپکنے کو تیار ہوتے ہیں یہاں تک کہ اکثر سر پھٹول تک بھی نوبت پہنچ جاتی ہے۔ ایسے میں یکبارگی دفعتاً ٹھاٹھ بدل دیتا ہے اور 'ڈھولا' یعنی ہیر رانجھا کا سریلا درد بھرا راگ رگ رگ میں مستی اور جادو بھرا نشہ پیدا کرتا ہے اور اس رومانوی کیف کا اچرج اثر دیکھئے کہ وہی لوگ جو تھوڑی دیر پہلے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، محبت کے نشہ میں جھوم جھوم کر ایک دوسرے سے محبت کے مارے اٹھ اٹھ کر گلے ملتے ہیں اور سرمستانہ رہ وادیٔ خیال طے کرتے ہوئے خبر نہیں کہاں کے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔

اگر ہیر رانجھا کی داستان اپنے اصلی دیس سے دُور ایسا جادو جگا سکتی ہے۔ تو خیال کیا جا سکتا ہے کہ اس کا اپنے دیس کے باسیوں پر کیا اثر ہوگا۔ وہی جو ہیر وارث شاہ کے رسیلے اور رچیلے کلام سے گاؤں گاؤں، شہر شہر گونجتی تانوں اور میٹھے الاپوں سے ظاہر ہوتا ہے اور جس کے متعلق ایک شاعر نے کہا ہے کہ ؎

وہ جنہیں کچھ ہیر کا حصہ زبانی یاد ہے
ان کی پُرتاثیر تانوں سے فضا آباد ہے

اور یہی وجہ ہے کہ جب سے ہیر رانجھا کا قصہ سننے میں آیا ہے، کتنے ہی شاعروں نے اس کو اپنے اپنے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس کا سلسلہ داستانی یا غنائیہ شکلوں میں آج بھی جاری ہے۔ اور ایسے کتنے ہی لوک گیت یا باریں ہوں گی جن میں بڑے پُر لطف طریقے سے ہیر رانجھا کی البیلی مگر ناکام 'حسرت انجام محبت' کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔ پنجاب تو خیر اس کا اصلی وطن ہے' اس لئے وہاں اس کا نئے نئے پیرایوں میں ابھرنا اور پروان چڑھنا قدرتی بات ہے ہی، اور دامودر، بھائی گوردداس بھلا، گوبند سنگھ، احمد، گوردداس، شاہ چراغ اور مقبل نے یکے بعد دیگرے اس قصہ کو نظم کا جامہ پہنایا ہے' اور آخر میں وارث شاہ نے اس کو ایسے طمطراق سے نظم کیا کہ اس کے سامنے دوسری سب کوششیں گہنا گئیں اور اس کا نقش لوگوں کے ذہن پر کچھ اس طرح جم گیا کہ صرف اسی کی ہیر ہی کو ہیر سمجھا جانے لگا۔ اس کے باوجود قصہ کی دلکشی کم نہ ہوئی اور وارث شاہ کے بعد بھی پنجاب کے کتنے ہی شاعروں' جن میں سے احمدیار، سید فضل شاہ، اور میاں مولا بخش کشتہ زیادہ مشہور ہیں' نے اس کا سلسلہ بصد ذوق و شوق جاری رکھا۔

ہوتے ہوتے بات دوسری بولیوں تک بھی پہنچی۔ بلوچی میں تو خیر صرف ہیر رانجھا کے بارہ میں ایک مختصر سی روایت ہی بیان کی جاتی ہے لیکن سندھ کا دیس پنجاب سے جہاں اور باتوں میں سانجھا ہے' وہاں قصے کہانیوں میں بھی سانجھا ہے۔ چنانچہ سسی پنوں' سوہنی مہینوال وغیرہ سندھ اور پنجاب کا مشترکہ ورثہ ہیں اور سرائیکی اور سندھی میں ہیر رانجھا کا تذکرہ عام ہے۔ چنانچہ بلھا شاہ اور خواجہ غلام فرید ان کا خیالی یا روحانی عشاق کے طور پر بار بار ذکر کرتے ہیں۔ ادھر خالص سندھی شعراء مثلاً سچل سرمست اور فقیر حمل کے ہاں بھی ان کا ذکر عام ہے۔ ایسے اشعار کو اصطلاحاً "کافی" کہتے ہیں۔ ایک شخص حاجی احمد بخش خادم نے سندھی میں ہیر کا ایک "نمائش نامہ" لکھا ہے' اور سید حیدر شاہ اور فقیر غلام نے تو اس کی پوری داستان نظم کر ڈالی ہے۔ ادھر خلیفہ نبی بخش نے ان کے بارہ میں ایک "سی حرفی" بھی تصنیف کی ہے۔

یہ ممکن نہ تھا کہ ہیر کی داستان کسی نہ کسی طرح سے اردو، فارسی، انگریزی اور دوسری زبانوں تک نہ پہنچے۔ یہ ایک طویل داستان ہے لیکن سندھ میں جو مثنویاتِ ہیر و رانجھا فارسی میں لکھی گئیں۔ وہ مغربی پاکستان میں ذہنی و ثقافتی اشتراک کے اعتبار سے خاص اہمیت رکھتی ہیں اور ایک ایسے قصہ کو پیش کرنے کی بنا پر جو مغربی پاکستان میں اس قدر مقبول ہے اور اب اردو میں تمام و کمال ترجمہ ہو کر مشرقی پاکستان اور کل برصغیر میں پہنچنے کو ہے، ان کی دلچسپی و اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ خوش قسمتی سے یہ تمام مثنویاں ایک مجموعہ کی شکل میں منظر عام پر آچکی ہیں جس کو "سندھی ادبی بورڈ" نے بڑی خوش اسلوبی سے ترتیب دیا ہے۔ اور ایک مبسوط مقدمہ میں "ہیر رانجھا" کے عہد بعہد مظاہر کے بارہ میں مفصل معلومات بہم پہنچائی ہیں۔

اس جگہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ ان مثنویات کا کسی قدر وسیع فنی و معنوی جائزہ لیا جائے۔ تاکہ ہم اپنے مشترکہ ثقافتی ورثہ کا زیادہ کامیابی سے اندازہ لگا سکیں۔

ان مثنویوں کا سلسلہ لوٹ پھر کر اس دیس تک ہی پہنچتا ہے جہاں قصہ کا آغاز ہوا۔ فارسی مثنویات کے جائزہ کو زیادہ بھرپور بنانے اور ان کے پس منظر اور خدوخال کو اجاگر کرنے کے لئے ان ابتدائی فارسی مثنویوں اور نثری داستانوں پر ایک سرسری نظر دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔ ڈاکٹر محمد باقر کی رائے میں قصہ اس قدر دلفریب اور مشہور تھا کہ فارسی شعراء نے پنجابی شعرا کی بہ نسبت اس کی طرف پہلے توجہ کی اور بہت سوں کا دعویٰ ہے کہ سب سے پہلے انہوں نے یہ قصہ تحریر کیا یا یہ ان کا طبعزاد ہے۔ تعجب یہ ہے کہ ان میں سے اکثر اس کو کسی نہ کسی کی فرمائش پر ہی تحریر کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ وارث شاہ نے بھی کسی مینہ بھاگ بھری کے عشق سے مجبور ہو کر نہیں بلکہ احباب کی فرمائش پر یہ قصہ جوڑا ہے اور کسی راوی کے بیان کا سہارا لیکر۔ یہ اُن تمام نظریوں کی نفی کرتا ہے جو تخلیقِ فن میں ذاتی تجربہ یا خلوص کو ضروری قرار دیتے ہیں۔

حفیظ ہوشیارپوری کی رائے میں' جنہوں نے سندھ کی فارسی مثنویات ہیر رانجھا کو تصحیح و مقدمہ کے ساتھ ترتیب دیا ہے، گوردداس کی پنجابی تصنیف ۲۱-۱۱۱۲ھ مطابق ۱۷۰۹ء سے پہلے فارسی میں کم از کم چار مثنویاں یا منثور داستانیں لکھی گئیں۔ ابتدائی مثنویات کی تفصیل یہ ہے:-

(۱) مثنوی باقی: ۱۰۴۱ - ۹۸۸ھ (۱۶۰۵ - ۱۵۸۰ء)

(۲) افسانۂ دلپذیر۔ سعید سعیدی مابین ۶۸ - ۱۰۳۷ھ (۵۷ - ۱۶۲۷ء)

(۳) عشقیۂ پنجاب یا قصۂ ہیر و راہی۔ میتا پسر درویش چنابی۔ ۱۱۱۰ھ (۱۶۹۸ء)

(۴) راز و نیاز۔ فقیر اللہ آفریں۔ ۱۱۴۳ھ (۱۷۳۰ء)

(۵) داستان ہیر و رانجھا از نواب احمد یار خاں یکتا۔ ۴۷-۱۱۱۸ھ (۳۴-۱۷۰۶ء)۔
(۶) مثنوی ہیر رانجھا۔ میر قمر الدین منت دہلوی۔ ۱۱۵۶ھ (۱۷۴۲ء)
(۷) مثنوی گلشن راز عشق وو فا منشی سندر داس آرام پنجابی ۱۱۷۳ھ (۱۸۵۹ء)
(۸) مثنوی لائق۔ جس کے خاتمہ پر اس کو امیر خسرو کی تصنیف قرار دیا گیا ہے۔ لیکن در اصل اس کا مصنف ہمت خان، اس کا بیٹا خان جہان درباری شاعر محمد مراد جونپوری یا محمد عاشق میں سے کوئی ایک تھا۔

محض نثر میں، یا مخلوط داستانیں یہ ہیں:-

(۱) اولیں منثور فارسی قصہ مصنفہ گوردا س کھتری ۲۱-۱۱۱۲ھ (۱۷۰۹ء) جو دمودر کے پنجابی قصہ پر مبنی ہے۔
(۲) قصہ ہیر رانجھا، نثر و نظم میں۔ منسا رام خوشابی ۔ ۱۱۵۷ھ (۱۷۴۴ء)
(۳) سراج المحبت (نثر) عبرتی عظیم آبادی۔ ۱۲۵۲ھ (۱۸۳۶ء)

ان کے علاوہ ایک مثنوی "نگارین نامہ" ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۱ء) جو وارث شاہ کے بعد لکھی گئی، ایک ایسے شخص کنھیا لال ہندی کے قلم سے ہے جو آگرہ کے ایک قصبہ جلیسر میں پیدا ہوا لیکن اس کی عمر پنجاب ہی میں بسر ہوئی۔ جیسا کہ سجان رائے مصنف "خلاصۃ التواریخ" (۱۱۰۷ھ) نے لکھا ہے۔ "اہلِ پنجاب .... در محبت و آشفتگی ایں ہر دو (رانجھا و ہیر) نقش ہائے بدلیعہ و اشعارِ عجیبہ بستہ سرود و نغمۂ دلفریب می کنند"۔ اسی وجہ سے بارہویں صدی ہجری میں پنجاب میں خصوصاً اور ہندوستان میں عموماً یہ قصہ بہت ہر دلعزیز تھا۔ منت دہلوی، لائق اور عبرتی کی تصانیف اس غیر معمولی مقبولیت کی بیّن شہادت ہیں۔

سندھ میں فارسی تصانیف کا سلسلہ ان کے بعد شروع ہوا اور چار مثنویاں، دو نثری داستانیں اور ایک طویل قطعہ فارسی میں لکھا گیا جن کی تفصیل یہ ہے:-

نظم:
(۱) مثنوی عظیم الدین ٹھٹوی۔ ۱۲۱۴ھ (۱۷۹۹ء)
(۲) مثنوی ضیاء الدین ضیاء۔ ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۰ء)
(۳) مثنوی آزاد۔ ۲۶-۱۲۱۶ھ (۱۱-۱۸۰۱ء)
(۴) مثنوی نواب ولی محمد خاں لغاری ۔ مابین ۱۲۲۷-۱۲۲۶ھ (۲۰-۱۸۱۱ء)
(۵) طویل قطعہ: فقیر قادر بخش بیدل ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۶ء)

نثر:
(۱) محبت نامہ (نثر مسجع) از منشی شیوک رام عطار د ٹھٹوی۔ مابین ۹-۱۱۸۵ھ (۷۶-۱۷۷۱ء)
(۲) داستان نثر: علی بیگ۔ ۱۲۳۰ھ (۱۸۰۵ء) سے پہلے۔

ان تصانیف کا سب سے حیرت انگیز پہلو ان کی تعداد ہے اور پھر داستان کے اصلی وطن سے دور، دوسری زبانوں میں! صرف پنجابی ہی کو لیا جائے تو مستقل کتابوں کی تعداد ساٹھ کے لگ بھگ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "ہیر رانجھا" نے شعراء کے لئے ایک شاہراہِ عام کی حیثیت اختیار کرلی ہے اور ایک نہیں دور و نزدیک کتنے ہی "ہیر دوست" موجود ہیں جو اس دلنشیں لَے کے رسیا بھی ہیں اور اس کو اور بھی آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔ سب لکھنے والوں نے اس ہر دلعزیز داستان کو اپنے اپنے طور پر بیان کیا ہے، اس میں نئے نئے نکتے بڑھائے ہیں، واقعات میں رد و بدل کیا ہے، ان کو نئے نئے انداز سے ترتیب دیا ہے، نوک پلک پیدا کی ہے، بنایا ہے سنوارا ہے، تصویر میں اپنی اپنی پسند اور شوق کے مطابق طرح طرح کے رنگ بھرے ہیں، طبع آزمائی کی بنیاد قرار دے کر اپنے طبعی جوہروں سے مالا مال کیا ہے اور اس قدر تنوع پیدا کیا ہے کہ انسان ششدر رہ جاتا ہے۔ یہ گوناگوں رنگ آمیزی اور ندرت کاری اپنی مثال آپ ہے۔

ایک ہی موضوع پر مسلسل طبع آزمائی میں تصنع اور نقالی کا احتمال ہے، لیکن شاید یہ بھی ہیر رانجھا جیسے عاشقانِ صادق کی لولیائی یا ان کے

طالبانِ صادق کے خلوص اور قدرتی استعداد کا نتیجہ ہے کہ اکثر تصانیف اپنے اپنے طور پر تازگی وجدت کی حامل ہیں۔ اور ہر شاعر نے اپنا رنگ برقرار رکھا ہے۔ یہ بھی اندیشہ تھا کہ داستانِ پنجاب کی فضا میں ڈوبی ہونے کی وجہ سے یہیں کی زبان میں ادا کی جا سکتی تھی لیکن ہیر ہر لباس میں ہیر ہی رہتی ہے۔ اس لئے فارسی میں بھی اس کا رنگ روپ کم و بیش برقرار رہا ہے۔ شاعر چاہے نظامی اور خسرو کے نقشِ قدم پر ہیں لیکن داستان کا سحر اس بدیسی وضع کو اپنا لیتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہیر رانجھا کا فارسی میں لکھا ہوا کوئی قصہ وارث شاہ کی معروف پنجابی بحر نے یا وضع میں نہیں، حالانکہ ایک اور تصنیف "وقائع پنون" میں ان سب کا التزام کیا گیا ہے، ملاحظہ ہو:۔

چوں در غم یار نزار بدم، خوں خوار و دل افگار حیراں

بظاہر یہ اسی لئے ہے کہ فارسی میں نظامی ہی کی روش پر گامزن ہونے کا دستور تھا۔ جو بحریں بالعموم برتی گئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ خفیف سالم مخبون محذوف —— یکتا۔ عظیم۔ آزاد۔ لغاری

۲۔ ہزج مسدس محذوف
مفاعیلن مفاعیلن فعولن —— منت دہلوی، آرام، کنھیالال ہندی، ضیا

۳۔ ہزج مسدس اخرب مقبوض محذوف
مفعول مفاعلن فعولن —— سعید سعیدی

صرف آفریں نے بحر متقارب سالم مقصور (فعولن فعولن فعولن فعول) اور بیدل نے بحر مضارع سالم اخرب مکفوف محذوف (مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن) استعمال کی ہے۔ جہاں تک کردار نگاری، فضا، واقعات، تصور، اسلوب اور زبان کا تعلق ہے، شعرا کی راہیں بڑی حد تک الگ الگ ہیں۔ سعید سعیدی میں بیانِ واقعہ زیادہ اور شاعری کم ہے۔ بیان اور بندش بھی درمیانہ ہے۔ سستی بندش کی یہ علامت کہ مصرع ثانی بھرتی کا ہو یا قافیہ پر مبنی، شدت سے نمایاں ہے اور اس کے ساتھ تسکینِ اوسط کی بھرمار بھی ؏

بشنو ز سعید تمام ایشاں — شیریں ز شکر کلام ایشاں
عالم ہمہ مبتلائے آں شخص — خوبانِ جہاں فدائے آں شخص
حرفے عجب میانِ مردم — افتادہ چو در زبانِ مردم

بعض الفاظ کا استعمال بھی عجیب آزادانہ ہے:۔

کشتی بچلاں بآں کنارہ — در عشقِ خود اضطراب کردی
با چند سہیلیانِ خوش خو

اس نظم کا بہترین پارہ وہ خط ہے جو ہیر، رانجھا کو لکھواتی ہے:۔

بنویس فراقِ من بصد درد — صد قصہ ز رنگِ چہرۂ زرد
بنویس کہ ایں چنیں خرابم — دور از رخِ تو بصد عذابم
بنویس کہ لے جوانِ بیباک — در ہجرِ تو باد بر سرم خاک

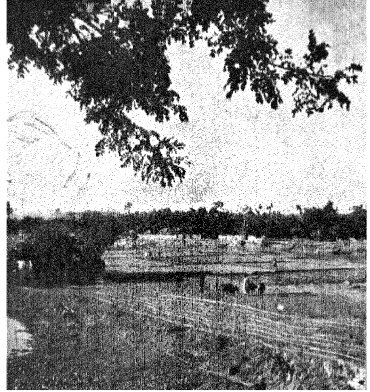
قصے کا انجام یہ ہے کہ رانجھا بیمار پڑ کر مر جاتا ہے اور ہیر بھی صدمۂ فراق کی تاب نہ لا کر راہیٔ عدم ہو جاتی ہے۔ اور دونوں ایک دوسرے کے پہلو میں دفن کر دیئے جاتے ہیں۔

لائق کی مثنوی میں چند الفاظ بہت دلچسپ ہیں۔ مالیدہ کے لئے "لقمۂ چرب"۔ کیدو کے لئے "بلائے یک پا" اور کاتب کے لئے "قلمزن" سہتی کا نام شہدی نظر آتا ہے۔ اور پھر رانجھا کا بہ فراغتِ خاطر "زہرِ عشق" اتارنے کا منتر پڑھنا بڑا پر لطف چٹکلہ ہے۔ انجام اس کا بھی دونوں کی وفات ہے۔ صرف پہلو بہ پہلو دفن ہونے کی بنا پر سچے عاشقوں کی طرح دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کر دیا گیا۔



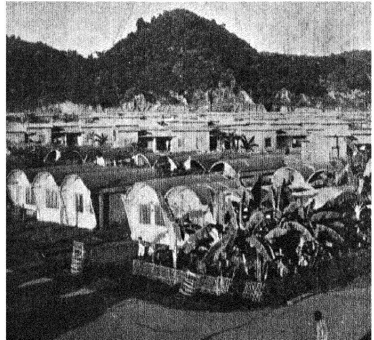
ہیرورانجھا : عمل : حنیف رامے

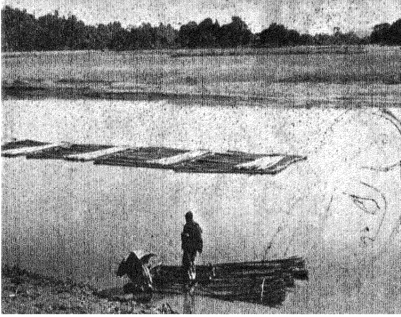
مشرقی پاکستان



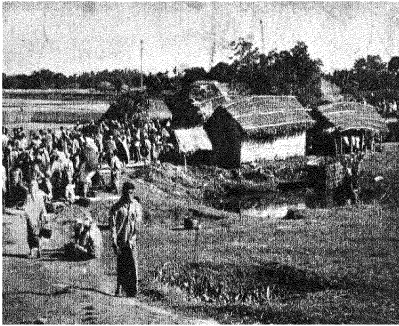
دیہی نظارہ

بستی



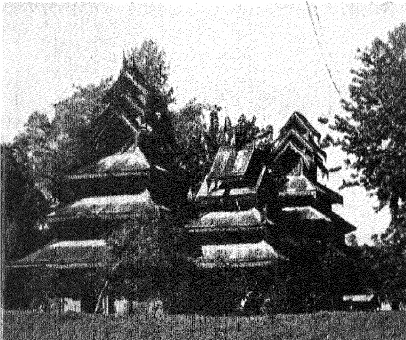


دریائے کرنافلی (رامو گاؤں کے پاس)



بازار

خاص وضع کے مکانات



چناؔبی کا قصّہ "ہیر وماہی" بہ وجوہ سب سے نرالا ہے۔ شاعر ایک دیہاتی تھا اور دیہی فضا میں رسا بسا ہوا۔ اس کی فکر بھی اسی طرح سیدھی سادی ہے۔ اسی لئے اس کو خیال بندوں اور ان کی موشگافیوں سے سخت نفرت ہے۔ وہ اصلیت کا دلدادہ ہے۔ اس لئے اس کی نظم میں بھی اس کا بھرپور چاؤ ہے اور قصّے کا پنجابی پن، اس کی فضا، مقامی رسمیں، رتنیں، طور طریق، رنگ ڈھنگ، پوری طرح ابھرتا ہے۔ چناؔبی بدیسی قصّے کہانیوں سے نفور ہے۔ کردم نہ تتبع نظامی ——— اور اسی طرح وہ قیس و فرہاد کے قصوں سے گریزاں ہے۔ اُسے اپنے ہی دیس کی خانہ زاد چیزوں سے رغبت ہے۔ اور اس کے لئے ہیر جیسی مٹیار سے بہتر اور کون ہوگا؟ اس نے اپنا مسلک خوب بیان کیا ہے:۔

گفتند دگراں فنش چہ گویم   برگ گل یاسمن چہ بویم
مشغول شدم بہ ہیر وماہی   چوں خلق بہ وردِ صبحگاہی

خبر نہیں یہ شاعر کی روستائیت کا نتیجہ ہے یا نقل نویس کی فروگزاشت کہ نظم میں جا بجا مسامحات ہیں۔ غور سے نظر کرنے پر آخر الذکر احتمال قوی معلوم ہوتا ہے، پھر بھی بعض مصرعوں میں وزن سے زیادہ لَے کی طرف میلان نمایاں ہے، جو بندش میں عجیب کھلنڈرا پن پیدا کر دیتا ہے یعنی پابندی اور قواعد سے فرار کی بے تکلف کوشش جو تسکینِ اوسط سے کچھ آگے ہے اور پنجابی شعرا کی روش کے مطابق:۔

دشوار پسند مردِ کامل   جامع دو صفت رئیس و فاضل
گفت ایں سبب بہر زن و مرد   تفتیش برئے کودکے کرد
ملّا طلبید و طفل را بنشاند   ہر چیز کہ بود خواندنی خواند

چناؔبی کے یہاں نفسِ قصّہ اور اس کی طرح دوسروں سے کافی مختلف ہے۔ وہ پنجاب' ہزارہ یا رانجھا کے حسب و نسب سے آغاز نہیں کرتا بلکہ ایک دن خوش و خرم چلتا پھرتا ایک مرغزار کی طرف جا نکلا اور پوچھا کہ یہ کس کی ملکیت ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ چوچک کا گاؤں چوچکانہ ہے جو اب ایک عبرتناک خرابہ ہے اور کبھی سوادِ ہیر وماہی تھا۔ جن کی داستان اس نے ہر کسی سے سنی تھی۔ خلافِ معمول وہ پہلے ہیر کا ذکر کرتا ہے جس کے جوان ہونے پر اُس کا باپ مناسب بر کی تلاش میں ایک برہمن کو ملتان روانہ کرتا ہے اور وہ رشتہ ٹھہرا کر آتا ہے۔ اس کے بعد دفعتہً رانجھا کی نوبت آتی ہے جس کی تعریف یہ ہے کہ ؎

مقبولِ بتاں بہ نَے نوازی   نَے نَے کہ فسونِ عشقبازی
ہر دخترِ دلکش فرایش   از خویش تہی پُر از ہوایش
از عشقِ رُخش خراب بیتاب   بیروں شدہ با بہانۂ آب

چنانچہ ان ہی عاشقانہ اللّے تللّوں کی وجہ سے بھائی اُسے گھر سے راندہ دیتے ہیں۔ راستے میں لوگوں کے کہنے پر وہ چوچکانہ کی طرف چل نکلا۔ جہاں ہیر اور اسکی سہیلیاں دریا کی سیر کر رہی تھیں۔ ایسے ہی عام نہج سے مختلف واقعہ میں سے واقعہ نکلتا آتا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے قصّہ خالصتاً جدید وضع کی واقعیت میں ڈوبا ہوا ہے۔ افسانہ انسانی عشق و محبت کی داستان ہے، افرادِ گوشت پوست کے پیکر اور واقعات روزمرہ کے مانوس واقعات:۔

مے دید قطارِ گاومیشاں   شب رنگ بہارِ گاومیشاں
آتّی بادلئے رسمِ پنجاب   شُستہ تنِ خویش را بہ گرم آب
دستارِ مہینِ ارغوانی   از بہرِ عروسیش نشانی
پیچیدہ بسر زجائے جستہ   مرپوشِ گلیں بپا شکستہ
پیشِ ہر یک سلام می کرد   در دل زادبش مقام می کرد

ایسے ہی اور بھی بہت لطیف اور واقعاتی قسم کے جزئیات ہیں۔ صرف ایک جگہ اس ٹھیٹ واقعیت کا دامن چھوڑ کر جوگی کا کرشمہ اور اس کا کراماتی اثر دکھایا گیا ہے۔ کھیڑے خود ہی اپنے مال سے دستکش ہو جاتے ہیں اور ہیر اپنے ہی گھر شاد آباد۔ یہاں تک کہ رانجھا وطن جا کر وہیں فوت ہو جاتا ہے۔ اُدھر ہیر

نے بھی مرنے میں دیر نہ کی اور چوچکانہ میں دفن ہوئی۔ آخر ایک حاکم نے خواب میں ہیر سے اشارہ پاکر اس کو جھنگ میں لا دفن کیا اور اس کے مزار پر ایک روضہ تعمیر کیا ــــــ لیکن سراُو بہ سانِ درباز ؛ آخری دم تک وہی واقعیت کہ رانجھا اور ہیر جدا جدا مدفون ہیں۔ اور رانجھا کا مزار :-

شانند بر د مجاور آنگاہ　　　　دردست نیش بوضعِ دلخواہ

شاعری کی بعض طرّاحیاں قابلِ دید ہیں :-

ہمسال سوار دوش بادوش　　　　مانندِ بہار بادلہ پوش

غلطید بہ فرش آں پری روی　　　　از پہلو مے شدی بہ پہلوی

زد ہیر چو ایں حدیث بشنید　　　　پالش بلبِ نگاہ بوسید

القصہ گذشت شب سحر شد　　　　خورشید بہار بام و در شد

باہم بہ بہانۂ طبیبی　　　　کردند گلی وعندلیبی

آفرین نے مثنوی میں خیال بندی کا حق ادا کیا ہے اور عجیب و غریب شاعرانہ نکتے پیدا کئے ہیں۔ موجو کی جگہ اس کے یہاں معزی یا معزالدین نظر آتا ہے اور تین یا آٹھ بیٹوں کی بجائے اس کے چار بیٹے ہیں۔ چوتھا ایک سر پھرا نوجوان تھا جو ہر آنے جانے والے سے قصے کہانیاں سنا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے ایک مسافر کی زبانی ہیر کی تعریف سنی اور اس طرح داستان کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے۔ استعارات اور تراکیب کی آن بان دیکھئے :-

شفق بیز از تابِ رویش نقاب　　　　بخونی جگر گوشۂ آفتاب

بتے رنگِ بتخانۂ چیں شکن　　　　شکرآب کن قدرِ شیریں شکن

خزاں معجز آں صبح رخ مے کشود　　　　کہ بود از شفق پنبۂ تار و پود

ظاہر ہے کہ آفرین کی زبان میں معنوی اور لفظی آفرینش اور موشگافیوں کو بہت دخل ہے۔ اسی لئے بیان بہت ژولیدہ ہے۔

یکتا کی مثنوی کا نسبتہً زیادہ شہرہ رہا ہے۔ اور اس کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ ہے کہ یہ شعرائے سندھ کے لئے کشش کا باعث ہوئی۔ لیکن اس پر بھی، خیال بندوں کی کاوش کا کچھ کچھ سایہ ہے اور بیان میں صفائی، روانی یا بھرپور شعریت نہیں :-

سخن ابرِ بہار نیرنگ است[1]　　　　صفحہ گل موجِ جلوۂ رنگ است

لفظ گلدستہ بندِ نقطۂ نور　　　　سطر سنبل طرازِ طرۂ حور

گلدستہ بند، یوسفستان اور گل ہمیشہ بہار جیسی ترکیبیں اور الفاظ بے اختیار متاخرین شعرائے فارسی کی یاد دلاتے ہیں۔

آرام کی مثنوی میں ہیر و رانجھا کے "زبانِ عشق" سے نکاح ہونے کے علاوہ پانچ پیروں کا کراماتی کردار اور نگارگذاری قصہ پر چھائی ہوئی ہے۔ آخر میں ایک حاجی کا عجیب واقعہ درج ہے کہ کس طرح جہاز غرق ہونے پر وہ ایک تختہ سے چمٹ کر کنارے پر آلگا۔ سامنے ایک محل تھا جس میں ایک حور آسا عورت تھی اس نے اس کے شوہر نے مہمان کی کھیر سے تواضع کی۔ جب حاجی چلنے لگا تو مرد نے کہا آنکھیں بند کرو۔ اس نے آنکھ کھولی تو وہ پنجاب میں تھا۔ یہ دونوں عورت مرد ہیر و رانجھا ہی تھے! مثنوی میں بعض قلم کاریاں خوب ہیں :-

چناں آمد رطوبت بر سر کار　　　　کہ شد کلکم رگِ ابرِ گہربار[2]

چو کشتی جملہ آغوشِ تمنا　　　　بشوقِ وصلِ معشوقانِ رعنا

ہلالِ عید عیش جملہ مردم　　　　لبش وا ماندہ از موجِ تبسم

چو گازہ پائے تا سر فرحت انگیز　　　　بمعشوق شجر زلفِ دلآویز

---

[1] غالب: نفس زخوئے تو گلدستہ بندِ نیرنگی۔　　[2] غالب: ہے رگِ ابرِ گہربار سراسر سہرا۔ (مدیر)

کنہیالال ہندی کی مثنوی "نگارین نامہ" وارث شاہ کے معروف قصّے اور پنجاب کی مقبول روایت کا چربہ ہے۔ اس میں ہیر وارث شاہ کی طرح اور فارسی کے دیگر قصّوں کے برعکس سہتی اپنے محبوب مراد کے ساتھ فرار ہوتی دکھائی گئی ہے۔

سندھ میں اس داستان کی مقبولیت کا آغاز یکتا کی تصنیف سے ہوا جو تالپوروں کے عہدِ حکومت میں یہاں پہنچی اور اس کو نظم کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ کچھ عرصہ پہلے ایک شخص منشی شیوک رام عطارد نے "محبت نامہ" کے نام سے اس کو فارسی نثرِ مسجع میں پیش کرنے کی ناتمام کوشش کی تھی۔ تالپوروں کی حکومت کے تیس سال بعد فقیر قادر بخش بیدل نے اس کو ایک طویل قطعہ کی شکل میں نظم کیا۔ مگر اس دور کی زیادہ وقیع کوششیں جو اس داستان کو ذوق و شوق کے نقطۂ عروج پر لے گئیں، مثنوی ہی کی شکل میں ظاہر ہوئیں۔ اور وہ بھی سندھی فرمانرواؤں کی ذاتی دلچسپی اور حوصلہ افزائی کے باعث۔ اس میں شکر اللہ کے معروف عالم و فاضل خاندان کو خاص دخل ہے جس نے میر علی شیر قانع ٹھٹوی، میر عظیم الدین عظیم، میر ضیاء الدین ضیا اور ایسے ہی کئی اور جوہر قابل پیدا کئے۔ میر عظیم الدین عظیم نے پہلی بار اس قصّہ کو شاہی فرمائش پر شاعری کا آب و رنگ عطا کیا اور بڑے اہتمام سے۔ اسی طرح ضیاء الدین ضیا نے اپنے طور پر ایک مثنوی لکھی۔ آزاد اور لغاری دو اور شاعر تھے جنہوں نے اس موضوع پر طبع آزمائی کی۔ غرض چراغ سے چراغ جلا اور خوب جلا اور یہ چاروں مثنویاں اس کی روشنی کو تیز تر کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان مثنویوں میں بھی بعض جزئیات دوسروں سے مختلف ہیں۔ لیکن طرح اور سلسلۂ واقعات مشابہ ہے۔ روحانی عشق اور اولیائی کرامات کی چھاپ کافی گہری ہے۔

عظیم نے چند اشعار میں یکتا کی پیروی کی ہے لیکن اندازِ پیشکش اور مذاق میں دونوں کے مابین زمین آسمان کا فرق ہے۔ یکتا کا اسلوب بوجھل اور اس کی رفتار سست ہے عظیم کے یہاں روانی، صفائی، لوچ، گھلاوٹ اور قصّہ کے بڑھاؤ میں تیزی ہے۔ گو حفیظ ہوشیارپوری کی دانست میں فوقیت آزاد کو ہے مگر ہماری رائے میں جو بات عظیم کی مثنوی میں ہے وہ اور کسی میں نہیں۔ آزاد میں تمثیلوں کے جملہ ہائے معترضہ بیانِ قصّہ میں جھمیلہ پیدا کرتے ہیں۔ گو مثنویٔ رومی سے مشابہت اپنی جگہ ایک قابلِ لحاظ خصوصیت ہی سہی۔ اور پھر اس کی عربیت منجھی ہوئی ہونے کے باوجود فارسی میں کچھ اجنبی معلوم ہوتی ہے عظیم کو زبان و بیان پر زیادہ قدرت ہے۔ اسی لئے اس کے یہاں دلکش اشعار اور فصیح و بلیغ منتخب پاروں کی کثرت ہے:۔

جرسم من نہ این و آں دارم — من ہمیں دل ہمیں زبان ام
در رہ تو نہ دست و پا دارم — چوں جرس من ہمیں صدا دارم
در رہت منزلِ جرس دارم — کہ بجز نالہ دسترس دارم
جرسِ کاروانِ وادیٔ شوق — کہ کند ہر نفس منادیٔ شوق

برجستہ ترصیع نے کلام میں جا بجا غیر معمولی چستی اور زور اور قادر الکلامی پیدا کر دی ہے:۔

نامِ او شد چراغِ محفلِ عشق — نامِ او شد سراغِ منزلِ عشق
نامِ اوے زجامِ عشق دہد — گوشِ دل را پیامِ عشق دہد

اس سے ظاہر ہے کہ شاعر کے اپنے ولولہ نے کلام میں والہیت پیدا کر دی ہے۔ ایک بہت بڑی بات یہ ہے کہ اس نے اپنے تصورِ عشق کی بہت ہی جامع تشریح کر کے اس کو ساری داستان پر حاوی کر دیا ہے۔ اس طرح نظم سے سالمیت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

ضیا کی مثنوی اس درجہ پر نہیں۔ وکی نے اپنے پیشرووں پر سبقت لے جانے کی کوشش کی۔ اور گو انہوں نے مثنوی میں بہت زور مارا ہے، مگر اس میں وہ آن بان نہیں پیدا ہو سکی۔ بہرحال اس کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بیدل کے قطعہ میں محض واقعات قلمبند کر دیئے گئے ہیں۔ اس لئے اس کی حیثیت بھی واجبی سی ہے۔

ان مثنویات کی فہرست کو مکمل کرنے کے لئے یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتابخانہ میں اس موضوع پر فارسی کی ایک نامکمل مثنوی موجود ہے جس کو ایک شاعر فدائی یا ساقی نے نظم کیا ہے۔ اسی طرح مقبول احمد بن مولوی قدرت احمد فاروقی گوپاموی نے اس داستان کا کچھ حصّہ فارسی میں منظوم کیا ہے۔ اور اس کے علاوہ اردو نثر میں بھی قصّہ ہیر رانجھا تحریر کیا ہے۔ اگر ان فارسی مثنویات کا متن بھی دستیاب ہو جائے

(باقی صفحہ ۶۱ پر)

غزل

شبیر افضل جعفری

خلد زاروں کی راہ بھولا ہے
آدمی چیت کا بگولا ہے
دل گلوں کی تلاش میں اکثر
پھولتی سولیوں پہ جھولا ہے
زیست کے زہر زہر ساغر کو
عشق نے چوم کر تبولا ہے
ہم نے آہوں سے چاندنی لے کر
شامِ ہجراں پہ نور ڈھولا ہے
خونِ دل کے حسین قطروں سے
شاخِ غم پر گلاب پھولا ہے

★

پھول پیتا ہوں شعر کہتا ہوں
چیت بھر مست مست رہتا ہوں
زندگی ہے چناب رنگ میری
گھوم کر رقص رقص بہتا ہوں
جی، وہ منصور تھا جو رویا تھا
میں تو ہنس ہنس کے پھول سہتا ہوں
سرزمینِ غزل ہے میرا وطن
آسماں سے بلند رہتا ہوں

★

عبدالمجید بھٹی

اپنے پرائے سب ہیں بھلے
چپ چپ جب تک ساتھ چلے
آہِ سحر تک بات گئی
دیپ جلے تھے شام ڈھلے
شوقِ حیا کے پردوں میں
دھوپ سی مچلے چھاؤں تلے
وصل میں لذت ہے تو مگر
ہجر میں جب تک جان جلے
ذوقِ سفر ہے ذوقِ سفر
منزل بھی جب ساتھ چلے
دل جب تک اپنا دل تھا
وہ دن بھی تھے کتنے بھلے

★

رفعت سلطان

محبت میں ہزاروں دکھ سہیں گے
مگر پھر بھی ہمیشہ چپ رہیں گے
میں اُن کو بھول تو بیٹھا ہوں لیکن
وہ جب سن پائیں گے تو کیا کہیں گے
کرم فرما ہیں جب تک وہ نگاہیں
زمانے کے ستم ہنس کر سہیں گے
ابھی خوشیاں مقدر میں نہیں ہیں
ابھی وقفِ غمِ دنیا رہیں گے
ہنسے گا کوئی ہم اہلِ جنوں پر
کسی کی آنکھ سے آنسو بہیں گے
مجھے مرنا بھی ہے منظور، لیکن
تجھے اہلِ زمانہ کیا کہیں گے

★

خواتینِ مشرق!

صہبا اختر

خواتینِ مشرق! جو یوحنّا ہوتا تو تم سے یہ کہتا
بس اب آسماں سے برسنے کو ہے روشنی کا سمندر
بس اب سیمیائی دریچوں سے اُترے گا کوئی پیمبر
ہوائیں سرِ تختۂ سبز قالین تو بُن رہی ہیں
شعاعیں اُفق تا اُفق ایک دیبائے ضو بن رہی ہیں
کہ ساقیِ آبِ حیات و خرابات ہُو آرہا ہے
مسیحائے زیب و آرائشِ کاخ و کُو آرہا ہے
خواتینِ مشرق! میں کوئی بشارت نہیں دے سکوں گا
کہ تم پاک مریم کے انفاس سے خود کو مہکا چکی ہو
کہ تم فاطمہ اور خدیجہ کے نقشِ قدم پا چکی ہو
تمہیں ہر جبینِ محبّت کے مسجود کی روشنی ہو
تمہیں خلدِ مفہوم و فردوسِ موعود کی روشنی ہو
ہلال و ستارہ کی روشن فضاؤں کی ہمراز تم ہو
کہ دراصل شعلہ نوایانِ مشرق کی آواز تم ہو
خواتینِ مشرق! میں دیوانہ شاعر یہی کہہ سکوں گا
کہ اب آنے والا زمانہ اندھیروں کی یلغار ہوگا
جب انسان دامِ ہلاکت میں از خود گرفتار ہوگا
تمہاری جبینوں پہ تقدیس کا ماہتابی تبسم
تمہارے لبوں پر محبت بھری آیتوں کا ترنم
اسے موت کے تیرہ و تار غاروں کے منہ سے ہٹا لے
اِسے جنگ کی آگ میں راکھ ہونے سے شاید بچا لے

غزل

جمیل نقوی

جنوں فریبِ خرد کھا گیا تو کیا ہوگا
غمِ حیات سے ٹکرا گیا تو کیا ہوگا

کسی کی یاد سے مہکی ہوئی ہے محفلِ غم
اگر یہ پھول بھی مرجھا گیا تو کیا ہوگا

نشاطِ جور مبارک مگر خیال رہے
مقامِ نقد و نظر آ گیا تو کیا ہوگا

دل و نظر کی ہم آہنگیٔ دوام کے بعد
نظامِ عشق جو بدلا گیا تو کیا ہوگا

میں اس کی سادگیٔ دلربا سے ڈرتا ہوں
وہ عرضِ حال پہ شرما گیا تو کیا ہوگا

یہ سوچتا ہوں کہ احساس کے اندھیرے میں
ترا خیال بھی گھبرا گیا تو کیا ہوگا

فسانۂ غمِ الفت میں میرے نام کے بعد
تمہارا نام اگر آ گیا تو کیا ہوگا

وہ ایک داغ کہ روشن ہے جس سے دل کی فضا
وہ ماہتاب بھی گہنا گیا تو کیا ہوگا

وہ شخص جس کے تصور سے دل دھڑکتا ہے
وہ بے نقاب اگر آ گیا تو کیا ہوگا

چلے ہو لے کے کہاں ساتھ آبگینۂ دل
کوئی نگاہ سے چھلکا گیا تو کیا ہوگا

ہو چراغ جلاؤ کہ روشنی پھیلے
افق کچھ اور بھی دھندلا گیا تو کیا ہوگا

بڑھے چلو کہ زمانہ ہے سازگار ابھی
کسے خبر کوئی موڑ آ گیا تو کیا ہوگا

جمیلؔ خیر مناؤ کہ کوئی رمز شناس
شباہتِ غمِ دل پا گیا تو کیا ہوگا

سکھر بیراج کی ایک شام

سعید احمد اختر

شام کی سرد ہوا
اور گرمی کے مہینوں کا لبالب دریا
ڈوبتے دن کی شعاعوں میں تڑپتی ہوئی ضو پاش روپہلی موجیں
شورِ دریا میں کنارے کی خموشی کا فسوں
اپنے نظارے سے مدہوش ہے مرطوب فضا
تیری آنکھوں کی طرح
دور اُس پار گھنے پیڑوں پہ
کس طرح تیرتے پھرتے ہیں گلابی بادل
اور شفقائے ہوئے پانی کو
چومتا یوں نظر آتا ہے سمٹتا سورج
شام کو آگ کی دیوی جیسے
غسل کرنے کے لیے
اپنی جلتی ہوئی رتھ چھوڑ کے تاروں کے قریب
بال کھولے ہوئے چاندی کے سمندر پہ اتر آئی ہو
اور ادھر جھک کے ذرا دیکھ کہ شہ رگ کا لہو
کس طرح جسم کی نس نس میں بہا جاتا ہے
سنگ و آہن کے دریچوں سے گذرتا پانی
اور چشموں کی طرح
پُل کے نیچے سے یہ بھنورایا اُبھرتا پانی
جا کے صحراؤں کے سینوں کو کرے گا آباد
اور ویرانوں کو پھولوں کے چمن بخشے گا
راہِ دریا میں عجب شان سے بازو پھیلائے

بے نیازی سے کھڑا ہے بیراج
پورے اک میل کی لمبائی میں
کھُردرے پتھر کے ستونوں پہ یہ اُٹھتی ہوئی جھکتی ہوئی قوسوں کی قطار
جیسے دریا نے لرزتے ہوئے سینے پہ بچھا رکھا ہو
مہ جبینوں کی کماں ایسی بھنوؤں کا کنٹھا
لہلہاتے ہوئے کھیتوں کا زمرد ڈھیر
وسعتِ آب میں چھوٹے سے جزیرے دو چار
جیسے صحرا میں کوئی نخلستاں
جیسے دوشیزۂ کہسار کے ماتھے پہ خال
اور وہ دور بہت دور کھجوروں کے گھنے جھنڈ کے پاس
ہر طرف دور تلک پھیلے ہوئے سبزے میں
جگمگاتے ہوئے سیماب کی جھیل
سبز برقعے کے نقابوں سے بغاوت کر کے
جیسے آ جائے نظر
گردن و رخ کے چمکتے ہوئے سنگم کی تکون
اور اُدھر دیکھ وہ بیراج کی محرابوں میں
غٹغٹاتے ہوئے مسرور کبوتر کیسے
شام کے رنگ میں بجھتے ہی چلے جاتے ہیں
کتنا پُرکیف ہے ساحل کا سماں
کتنے دلکش ہیں حسیں نظارے
اور اس جنتِ منظر میں ترے قرب کی باس
تیرے بالوں میں مہکتے ہوئے پھول

نیم وا آنکھوں کی جھیلوں میں سہاگن خوشیاں
حلق کے نیچے یہ چاندی کی کٹوری سا گڑھا
اور تری مرمریں گردن پہ مچلتی ہوئی نازک سی طلائی زنجیر
جس میں جنت کی ابھرتی ہوئی سرحد کے قریب
قید ہے کب سے نہ جانے کوئی ہنستی ہوئی گھائل تصویر
اور وہ شیشے لگی منقوش سبک رو کشتی
کیسے انداز سے لہروں پہ سفر کرتی ہے
جیسے اِندر کے اکھاڑے کی کوئی بھول پری
شبنمیں راہوں میں چپکے سے گذر کرتی ہے
اور کشتی کو چلانے والی
خود بھی اک رنگ بھری ڈولتی کشتی ہی تو ہے
جس کو عرصے سے ہے شاید کسی ملاح کے مضبوط سہارے کی تلاش
اس کے ابھرے ہوئے سینے کا خم
آسماں رنگ چُنریا کی اڑان
بھورے بادل کا سنہری گھیرا
شورِ دریا کے ترنم کا فسوں
تیرے ماتھے پہ مچلتی ہوئی لٹ
ڈوبتی دھوپ کا سایوں سے ملاپ
سب دلآویز مناظر ہیں یہاں ہم آہنگ
جیسے اک قوس میں پھیلے ہوں قزح کے سب رنگ
ڈوبتے ڈوبتے دن ڈوب گیا
کھو گئیں شام کی چادر میں سنہری لہریں
سو گئی دن کے نظاروں کی بہار
اور بیراج پہ اک کھینچ کے رکھی ہوئی مالا کی طرح
کتنی دلکش ہے دمکتے ہوئے بجلی کے چراغوں کی قطار
آؤ اب لوٹ چلیں
چاند کی بارھویں ہے
اور ذرا دیر کے بعد
اپنی بکھری ہوئی زلفوں میں ستارے ٹانکے
رات آجائے گی آغوشِ محبت لے کر

غزل

قیوم نظر

چھڑ گئی وہ راگنی — عشق کی جاں پر بنی
حُسن کے شانوں پہ ہیں — شام کی زلفیں گھنی
رنگ و بو میں تیرتی — مشعلیں ہیں دیدنی
آرزو کے سلسلے — گفتنی ناگفتنی
اس سے پہلے تھی کہاں — اتنی عریاں چاندنی
لاکھ ہنگاموں کی اصل — ایک دل کی رہزنی
بے ضرورت دوستی — بے ارادہ دشمنی
جوئے خوں لاتی ہوئی — بے محل صید افگنی
چھا گئیں تاریکیاں — لے اُڑی کیا روشنی
لطف دیتی تھی ابھی — زندگی کی جانکنی

اہلِ دل تڑپیں نہ اور
پھیلتی ہے سنسنی

افسانہ :

شاہیا

احسان ملک

اکہرے لانبے اور لچکیلے مضبوط بدن کا چھیلا جوان شاہیا جب اپنی ہی برابر کی شہرت یافتہ گھوڑی "سسی" پر سوار "یا علیؑ" کا نعرہ لگا کر نیزہ بازی کے میدان میں آتا تو اپنے نیزے کی چمکتی انی پر لوگوں کے دل پرو لیتا۔ اس کی گھوڑی کے ٹاپوں کی ڈگر ڈگر کرتی متوازن صدا، اس کے آگے پیچھے جھومنے کا البیلا انداز اور نیزہ تھامنے کا وہ بانکپن لوگوں کے جی میں سما گیا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ محبت کے جذبے سے سرمست ہو جاتے۔ انہیں یوں لگتا جیسے شاہیا، شاہیا نہیں، ان کا اپنا گاؤں ہے۔ انہیں اپنی زندگی شاہیا کی شخصیت کے اندر دھڑکتی نظر آتی۔ شاہیا بڈھوں کا بیتا شباب، دیہاتی بالک کا مستقبل، اور عورت کا خواب تھا!

وارث شاہ کی ہیر اسے زبانی یاد تھی۔ وہ گاتا تو جوان مست اور بڈھے اشکبار ہو جاتے۔ چاندنی کی لمبی راتوں میں اس کی آواز کی لہروں کے میٹھے تیر گوریوں کے دل میں ترازو ہو کے رہ جاتے جن کی کھٹک سے وہ ساری ساری رات چپکے چپکے رویا کرتیں۔

شاہیا کی بہن نوراں اپنے حسن میں شاہیا کی گھوڑی کی طرح مشہور تھی۔ شاہیا کی جوانی اگر سیلاب تھی تو نوراں کا حسن چاند کا نور تھا جو اس سیلاب کی مانند ہر سو پھیل چکا تھا جس کے اسی نور سے شاہیا کی جان سوکھی رہتی۔ وہ چاہتا تھا کہ بستی بستی پھیلی ہوئی یہ روشنی اب سمٹ کر کسی گھر کا دیا بن جائے۔ کپاس کی فصل پر شاہیا کے مرحوم باپ کا سارا قرضہ اتر گیا تھا، گندم کی فصل کے بعد شاہیا نے نوراں کے ہاتھ پیلے کر کے باپ کا یہ قرضہ بھی چکا دینے کا ارادہ کیا۔

★

اور جب فصل پکی تو شاہیا بھی دن رات کی محنت سے پک گیا تھا۔ کاشتکار شاہیا اور اس کی فصل دونوں کو دیکھنے آتے تھے۔ فصل تن کر کھڑی تھی جیسے گاؤں کی مٹیار پانی بھری مٹکی سر پہ رکھے سینہ ابھارے چلتے چلتے رک کر آسمان پر اڑتی ہوئی کونجوں کو دیکھنے لگ گئی ہو۔

اب کی بار فصل اس قدر اونچی، اتنی خوبصورت، اتنی شاندار تھی کہ گاؤں کی ساری مٹیاروں کا جوبن بھی اس کے سامنے ماند پڑتا تھا۔

پھر ایک دن نور کے تڑکے گاؤں والوں کے کانوں میں ڈھول کی تال کی بھنک پڑی۔ یہی آواز رفتہ رفتہ قریب تر آتی گئی حتیٰ کہ لوگوں نے باہر نکل کر دیکھا کہ شاہیا کی فصل ایک زور دار تال پر جھوم رہی ہے۔ آواز کے زناٹے تیز سے تیز ہوتے چلے گئے، جھومتی ہوئی فصل لہرا کے اٹھی اور شیر جیسے جوانوں کی چمکتی تڑپتی مچھلیوں والے بازوؤں میں لشکارتی درانتیوں پر رقص کرنے لگی۔

کئی دن تک لوگوں نے یہی رقص دیکھا، وہی فصل دیکھی، وہی لشکارتی درانتیاں دیکھیں، وہی شاہیا دیکھا۔

اور پھر جب ایک روز سورج آدھا ادھر تھا آدھا ادھر اور جب ہر چیز لال گلال ہو رہی تھی اور آسمان نے رنگ بدل لیا تھا اور اس بدلے ہوئے رنگ میں نہاتی پکھیروؤں کی ڈاریں بسیروں کی تلاش میں چل نکلی تھیں تو لوگوں نے اس بھیگی ہوئی شام میں دیکھا کہ شاہیا تھک کر گر پڑا ہے، جوان تھک کر گر پڑے ہیں، درانتیاں تھک کر گر پڑی ہیں اور ساری فصل تھک کر گر پڑی ہے۔ انسان تھک کر چور ہو چکے تھے۔ درانتیاں تھک کر بے حرکت ہو گئی تھیں اور شاہیا کی گلابی جاڑوں کی محبوبہ، گندم کا بے حس ڈھیر ہو کر گر پڑی تھی۔

صبح کو شاہیا اٹھا، جوان اٹھے، فصل اٹھی اور یہ بارات بیل گاڑیوں میں شہر تک پہنچی۔ یہاں وہی فصل کھری چاندی بنی اور سکڑ سمٹ کر شاہیا کی دھوتی کی ڈاب میں جا چھپی۔

رات کے وقت دوستوں نے ٹھرا پی کر گلے میں موتیے کے ہار ڈالے اور شہر کی سیر کو چل نکلے۔ شاہیا کی پتلی مونچھیں بکلے کی طرح تنی ہوئی تھیں۔ وہ سینہ تانے گھوم رہا تھا۔ بل دار سیندوری پگڑی بوسکی کی قمیص پر چمکیلی گوٹے دار نسواری صدری اور ریشمی تہبند پہنے وہ دیہاتی چھیلا بنا ہوا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں چھوی چمک رہی تھی اور دوسرے میں سگریٹ۔ شہر کی جھمجھماتی جگمگاتی دکانوں سے پھل مٹھائیاں لیتے، پان کھاتے، سگریٹ پھونکتے، شاہیا اور اس کے ساتھی چلے جا رہے تھے کہ کیا دیکھتے ہیں وہ لوگ رنگین بازار کے اندر گھس آئے ہیں۔ شاہیا جو آج بالکل ماہیا نظر آ رہا تھا، یہ معاملہ دیکھ کر ٹھٹھا مار کے ہنسا اور پھر سگریٹ کا بھرپور کش لے کر مذاق ہی مذاق میں سینہ تانے آگے آگے چلنے لگا۔ اس کے یار پیچھے پیچھے کھسر پھسر کرتے، شرماتے، آنکھیں چراتے چلے آ رہے تھے "کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا شاہیا؟" اور شاہیا نے بتایا کہ یہاں سوائے سجیلی نار کے اور کوئی آنکھ نہیں ملاتا، دو بھائی پاس سے گزر جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو دیکھ نہیں پاتے۔ ان کو بھلا کوئی کیونکر دیکھ سکتا ہے۔

شاہیا اکڑ اکڑ کر چلتا رہا، کھڑکیوں سے مسکرا مسکرا کر تاکنے والیوں پر فقرے چست کرتا رہا اور زور دار قہقہے لگاتا رہا حتیٰ کہ سارے بازار کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اس نے ٹپے گائے، لڈی ناچا اور مستانہ وار ہلڑ بازی اور تماشبینی کا شغل کیا۔ ابھی یہ لوگ دوسری نکڑ پر پہنچے ہی تھے کہ اوپر کی کھڑکی سے پھولوں کا ایک ہار شاہیا پر آن گرا، اس نے پیچھے مڑ کر اوپر تاکا، ایک الھڑ البیلی جوانی اسے ہنس ہنس کر اشاروں سے اپنے پاس بلا رہی تھی۔ اس کے جواب میں شاہیا نے ایک برمحل اور خود ساختہ ٹپہ بلند آواز سے گایا جس کا مطلب تھا کہ ہم سچے عاشق ہیں، جو ایک بار ہمارا ہو گیا وہ پھر کسی کا نہیں ہو سکتا۔ اور تیرا کیا اعتبار؟ تو تو ہرجائی ہے۔ کیوں ایک غریب جوان کی پاک دامنی کو داغ لگاتی ہے۔ یہ سن کر ہرجائی نے ایک پل بھی صبر نہیں کیا، اس پر ایک پھول اور پھینکا اور طنز کا ایسا تیکھا تیر مارا کہ شاہیا تلملا کے رہ گیا: "میں مجبور تو وفا کر لوں گی۔ جوان تو مجھے یہاں سے نکال لے جائے تو جانوں"۔ ایک منچلا اوباش اس پر حقارت سے ہنسا: "چوڑیاں پہن لے چھوکرے" اور شاہیا کو یہ بات بہت بری لگی، اس نے تیوری پر بل ڈال کر اس آدمی کو گھور کے دیکھا اور اس نے استہزا کے ساتھ شاہیا کو کندھا مار کر دھکیل دیا۔ شاہیا کو یوں محسوس ہوا جیسے ایک آگ سی اس کے تلووں سے اٹھ کر سارے بدن کو شعلہ بناتی ہوئی سر تک چلی گئی۔ اس کو پھر اپنا ہوش نہ رہا اس کی چھوی بجلی کی طرح کوندی اور ہاتھ میں اس کا سرخ پھل ہلال کی طرح ہوا میں لہرا گیا۔

اب شاہیا دیوانہ ہو چکا تھا، اس کی منہ زور مردانگی زنجیریں توڑ کر آزاد ہو گئی تھی۔ دروازے کی میخ ٹوٹ کر گر چکی تھی اور اوپر کھڑکی میں وہ اس نوجوان لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈالے کڑک رہا تھا، گونج رہا تھا اور کھلے بندوں چھوی لہرا لہرا کر اس خوبصورت عورت کو اٹھالے جانے کا اعلان کر رہا تھا۔

بازار میں ہلڑ مچ گیا، دروازے بند ہونے لگے، بتیاں گل ہو گئیں اور ذرا سی دیر میں سارا علاقہ سنسان ہو گیا!

★

شاہیا کو شاہیا ہونے کی سزا ملی۔ انصاف نے اس کی سفید مست گھوڑی کو پتھر کی چکی بنا دیا، اس کی لگامیں لوہے کی زنجیروں میں تبدیل کر کے شاہیا کے ہاتھوں میں تھما دیں اور کالی کالی سنگین دیواریں اس کی پہرہ دار بن گئیں۔

★

ایک صاف تاروں بھری رات تھی کہ شاہیا اپنے گاؤں کے سٹیشن پر اترا، گاڑی کوکتی ہوئی آگے چل دی، شاہیا نے اس چھوٹے سے سٹیشن کی ٹمٹماتی روشنیوں کو پیچھے چھوڑا اور اپنے گاؤں کی پگڈنڈی پر ہو لیا۔ گاڑی کی گڑگڑاہٹ کتنی ہی دیر تک اس کے کانوں میں گونجتی رہی، کتنی ہی دیر تک وہ اسے پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا رہا، پھر اندھیرے میں اس کی ٹمٹماتی روشنیاں غائب ہو گئیں اور جگمگاتی قندیلیں سی بجھ گئیں۔ اب ریل کی آہنی پٹری تاروں کی روشنی میں چمک رہی تھی اور آس پاس کا سارا جنگل خاموش تھا۔ وہ چپکے چپکے آگے چلتا گیا، آس پاس جھنڈ اور کریر کی وہی جانی پہچانی جھاڑیاں تھیں، کیکر کے اکا دکا پیڑ بھی وہی تھے، اور دور نہر کے کنارے کا آموں کا جھنڈ بھی جانا پہچانا تھا۔ نرم نرم زمین پر چلتے وقت شاہیا کو ایک نئی لذت اور بے پایاں آزادی کا احساس ہوا۔ وہ برسوں پہلے کی خوشبو اس کے نتھنوں میں پہنچی جو کہ زمین پر پانی پڑنے اور پودوں کی ہریالی سے پیدا ہو کر مشام جاں کو تازہ کر دیتی ہے۔ فضا میں ٹھنڈک تھی اور نم، اور شاہیا کو یہ سارا سماں اپنی کھوئی ہوئی آزادی کو دوبارہ پا لینے سے غیر معمولی طور پر بھلا لگ رہا تھا۔ اس کا

جی چاہ رہا تھا وہ آسمان پر چکور کی طرح اڑنے لگے اور آزادی کا یہ نیا احساس اس کے رگ و ریشے میں سما جائے۔

یہ مہینے اور یہ سال اس نے چلتے چلتے سوچا، یہ کپاس اور گندم اور دھان کی بھرپور فصلیں اب کی بار قسمت کا دار وغنے گیا۔ جانے اس کی گھوڑی مستی کا کیا بنا، اس کے دو دھیا بیل کیا ہوئے، اس کی بہن نوراں کیسی ہے اور اس کی بوڑھی ماں۔ وہ تو بیچاری اس غم میں مر ہی گئی ہوگی۔ شاھیا چلتا رہا چلتا رہا اور جب دور سے اپنا مٹی کا کچا گھر نظر آیا تو اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ وہ دوڑ پڑا لیکن جب وہ اپنے کھیت کی پرانی بیری کے قریب پہنچا تو ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کی ساری زمین پر گندم کی پکی فصل لہرا رہی تھی۔ یہ گندم کس کی ہے؟ شاھیا کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ پلٹا اور گھر کی طرف چل دیا۔

گھر کی چار دیواری کا چوبی دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے دیوار پھاندی اور چپکے سے اندر کود گیا۔

★

چاند اب کافی اوپر آ گیا تھا۔ چھٹکی ہوئی چاندنی میں اس نے دیکھا تھان پر دو چتکبرے بیل کھونٹے سے بندھے جگالی کر رہے ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ان بیلوں کے پاس آ گیا۔ مست بیل اسے اجنبی جان کر پھنکارنے لگے۔ شاھیا کو یہ بات بہت بری لگی۔ اس نے ان میں سے ایک کے ماتھے پر ہاتھ پھیرنا چاہا تو اس نے سینگ دکھا دئے۔ پھر دونوں بیل گھبرا کے اٹھ بیٹھے۔ ان کے گلے میں بندھے گھنگرو بجنے لگے۔ شاھیا رونکھا سا ہو کر وہاں سے ہٹ آیا۔ تب اس کی نظر کونے میں بندھی ہوئی مشکی گھوڑے پر جا پڑی۔ اس نے قریب جا کر اس گھوڑی کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ دیا، وہ اچھلی۔ بری طرح سے ہنہنائی اور خوف سے نتھنے پھڑپھڑانے لگی۔ شاھیا وہاں سے بھی گھبرا کے پلٹ آیا۔ اس نے گھوم کر سارے گھر کو دیکھا۔ سب کچھ بدل گیا تھا۔ وہ نہ بیل رہے تھے جو اسے دیکھ کر بلاتے، نہ وہ مستی ہی تھی جو اسے دیکھ کر خوشی سے اچھلنے لگتی۔ آنگن میں دو نئے پیڑ اگ آئے تھے اور پرانے سوہانجنے کے بھاری سایہ دار درخت کا تنا اب لنڈ منڈ ہو کر کٹا ہوا گھر کے پچھواڑے دیوار کے ساتھ رکھا تھا۔ اپنا گھر اسے بالکل اجنبی معلوم ہو رہا تھا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ گھر کے اندر کے دروازے کی طرف بڑھا اور اپنا ایک ہاتھ بند دروازے کی کنڈی پر رکھ دیا۔ اس کا دل اب زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ کنڈی کھٹکھٹانے سے پہلے اس نے دروازے کی جھری سے آنکھ لگا کر اندر تاکا: ایک لیمپ مدھم مدھم جل رہا تھا۔ اس کی ماں کا چرخہ سامنے رکھا تھا۔ دوسری طرف دودھ بلونے کی پرانی مٹکی پڑی تھی اور اوپر طاق پر بدستور تانبے کے برتنوں کی قطار تھی۔ اور ان برتنوں کے پاس روشن دان کے نیچے اس کی چھوی دیوار میں دو کیلوں کے درمیان ٹکی تھی۔ شاھیا کی نظر اپنی رنگدار ہتھے کی خوبصورت ہلکی پھلکی چھوی پر جم کر رہ گئی جس کا پھل اس مدھم روشنی میں آدھے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ چھوی کے رنگدار ہتھے پر سے ہوتی ہوئی شاھیا کی نگاہیں دھیرے سے نیچے کود پڑیں اور فرش پر سوئی ہوئی ایک عورت کے چہرے پر آ کر ٹھٹک گئیں —— نوراں اب دوشیزگی کے دور سے گزر کر ایک بھاری بھرکم عورت بن چکی تھی، جیسے گندم کی ہری بھری فصل دھوپ میں پک جائے۔ اس کا ننھا اس کی چھاتی سے چمٹا دودھ چبک رہا تھا، دوسرا اس کے ساتھ لپٹا نیند کے گہرے سانس لے رہا تھا۔ تھوڑی دور ادھر کو ایک بڑی مونچھوں والا بلونت جوان اپنے بھاری خراٹوں سے گھر بھر کو ہلا رہا تھا۔

وہ دیر تک اندر دیکھتا رہا۔ اس چھوٹے سے گھر میں اسے اپنی مہربان بوڑھی ماں کہیں بھی نظر نہ آئی۔ شاھیا کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، حلق گھٹ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ نوراں کی بھری گود دیکھ کر ہنس دے یا ماں کی جدائی میں رو دے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اسے پتہ نہ تھا یہ مسرت ہے یا غم۔ اپنی آنکھوں کو ہتھیلیوں سے پونچھتے ہوئے وہ گھوم کر مکان کے پچھواڑے چلا آیا، اور بلی کے سے بے آواز قدموں سے سوہانجنے کے کٹے ہوئے تنے پر کھڑے ہو کر اپنا چہرہ روشن دان کے قریب لاتے ہوئے چوری چوری ایک بار اور اندر جھانکا۔ لیمپ کی مدھم روشنی میں نوراں سو رہی تھی، اس کے بچے سو رہے تھے، ان کا رکھوالا سو رہا تھا۔ وہ دم سادھے ان سب کو دیکھ رہا تھا کہ نوراں کا دودھ پیتا ننھا جاگ اٹھا۔ شاھیا نے گھبرا کر جلدی سے روشن دان کے اندر ہاتھ ڈالا اور انتظار کی گھڑیاں گنتی ہوئی چھوی کو آہستہ سے اوپر کھینچ کے جلدی سے پیچھے کو مڑا لیکن اس کا دامن سوہانجنے کے ٹھنٹھ کی سوکھی ساخ میں الجھ گیا اور وہ دھڑام سے زمین پر آ رہا۔ اس کی چھوی دور جا پڑی۔ ابھی وہ اٹھ کر سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ قریب ہی

آہٹ ہوئی اور اس کی آنکھیں لیمپ کی روشنی سے چندھیا گئیں اور پھر لیمپ کی روشنی میں اس نے نوراں کو بال بکھرائے ٹوٹی نیند کی تھکی آنکھوں سے اپنی طرف گھورتے دیکھا۔ نوراں کے منہ سے بے اختیار ایک حیرت زدہ چیخ نکلی اور وہ جذبات سے کانپتی آواز میں "بھائی" پکارتی ہوئی شاھیا سے دیوانہ وار لپٹ کر رونے لگی۔ شاھیا نے پیار سے نوراں کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا، اس کا دل پھر بھر آیا، آنکھیں پھر نمناک ہوگئیں۔ نوراں کا خاوند آنکھیں ملتا ہڑبڑا کے باہر نکلا اور اپنی دھوتی کے پلو کمر سے کستے ہوئے بڑی حیرانی سے یہ ماجرا دیکھنے لگا۔

"خوش رہو، آباد رہو نوراں" شاھیا گلوگیر آواز سے بولا۔ "تمہیں سہاگن دیکھ کے میری زندگی کا سارا بوجھ ہلکا ہوگیا ہے"۔ یہ کہتے کہتے شاھیا نے نوراں کے تنومند شوہر کو الفت بھری نظروں سے دیکھا "تو سلامت رہے، جوان آباد رہے"۔ رقت بھری آواز میں یہ دعائیہ کلمات کہتا، آنکھیں پونچھتا، وہ باہر کے دروازے کی طرف بڑھا۔ نوراں نے جھپٹ کر اس کے کرتے کا دامن تھام لیا "کہاں جا رہے ہو؟"

"اپنے گاؤں کے کھوج میں"۔ شاھیا بدستور اداسیوں اور مسرتوں میں گڈمڈ ہو کے بولا "اپنی جھولی میں دانے لے کر آؤں گا تمہارے گھر۔ اللہ بیلی!" اس نے اپنا دامن چھڑایا اور پیٹھ موڑ کے آگے چل دیا۔ نوراں نے اپنی بھیگی پلکیں پونچھ ڈالیں اور دیر تک دروازے پر کھڑی ایک سایہ کو دور درختوں کے پیچھے اوجھل ہوتے دیکھتی رہی۔

گاؤں سے باہر آنے والی پگڈنڈی پہ سے اجنبی راہگیروں کی طرح گزرتے ہوئے وہ ذرا کی ذرا اپنے پرانے کھیت کے قریب رکا اور اپنی زمین کے اس ٹکڑے کو جہاں بیری کا پرانا درخت کھڑا تھا ایک بار مسکرا کر الوداعی نظروں سے دیکھا۔ بیری کا درخت شاھیا کو پہچان گیا، اس کی ٹہنیاں یوں ہلنے لگیں گویا شاھیا کے خاموش سلام کا جواب دے رہی ہوں۔ سوتے ہوئے گاؤں پر اچٹتی ہوئی سی نگاہیں ڈال کر وہ مڑا اور آگے کو ہو لیا۔

آم کے بور کی بھینی بھینی خوشبوئیں رچے ہوئے گھروندوں کو پیچھے چھوڑ کر وہ تیز تیز قدموں سے چلتا لاہور کی پکی سڑک پر آن کھڑا ہوا، سڑک بالکل سنسان تھی۔ سڑک کے دونوں کناروں پر ٹاہلی کے درختوں کی قطاریں اونگھ رہی تھیں اور شاھیا گم سم کھڑا تھا۔ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے شاھیا کو دور سرے پر ایک لالٹین کی روشنی دکھائی دی اور پھر روشنی کے اس ہیولے سے بتدریج ایک گڈے کے پہیوں اور بیلوں کے گھنگرؤوں کی صدا آنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی کسی جوان کے ماھیا گانے کی بھنک اس کے کان میں پڑی۔ گڈا قریب آگیا تو اس نے دیکھا کہ اس پر کنک کے بورے لدے ہیں اور جوان لہک لہک کر گاتے ہوئے چلتے چلتے بیلوں کو بلا وجہ ہنکائے جاتا ہے۔ شاھیا کو ہنسی آگئی۔ جب گڈا کنک کے بوروں سے لدا ہو اور کنک شہر لے جا کر بیچنی ہو تو بیلوں پر خواہ مخواہ سست چلنے کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ "شہر چلے گا جوان؟" پاس سے گزرتے ہوئے جوڑی پر بیٹھا آدمی للکارا اور شاھیا غیر ارادی طور پر اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔

★

گڈے والے جوان نے شاھیا سے کوئی بات نہ کی۔ وہ اپنی ترنگ میں لہکتا چلا گیا۔ شاھیا نے اپنی گٹھڑی کھول کے سر کے نیچے رکھ لی جیسے کوئی محبوبہ کی طرح پیار سے اپنے ساتھ لٹا لیا اور دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھ کے تازہ کنک سے مہکتے ہوئے بوروں پر لیٹ کر آسمان پہ تاروں کا جھرمٹ دیکھنے لگا۔ تاروں کا جھرمٹ دیکھ کر نہ جانے کیوں شاھیا کو عورت کے ماتھے کا جھومر یاد آگیا۔ اس نے آنکھیں موند لیں، گیلی گیلی شبنم بھری ہوا میں ماھیا کی سریلی تان تھی۔ بیلوں کے پیروں میں بندھے گھنگرؤوں کی جھنکار تھی آسمان پہ تاروں کی دھنک۔ زمین پر ٹاہلیاں سو رہی تھیں اور شاھیا ماضی کی داستان بن کے کہیں کھو گیا تھا!

اپنی منزل پہ پہنچ کر گڈے والے جوان نے بیل کھولے اور ان کے آگے چارہ ڈال کر خود حقہ گڑگڑانے لگا۔ شاھیا کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے پھر اس گڈے والے جوان کی طرف دیکھا جس کے گیتوں کی لے ختم ہو چکی تھی اور چہرہ لیمپ کی مٹیالی روشنی میں سوچوں کی پکار بن گیا تھا۔ شاھیا سب کچھ سمجھ گیا۔ یہ اس کی اپنی ہی کہانی کی تمہید تھی۔

★

شہر کی سنسان گلیوں میں بے مقصد چلتے چلتے بجلی کے کھمبوں کی اداس روشنیوں کے دائرے لانگھتے، شاھیا ایسی جگہ آ نکلا جو اسے جانی پہچانی سی معلوم ہوتی۔ دکانیں بند، مکان خاموش اور گلیاں ویران تھیں۔ جگہ جگہ باسی پھول اور پھولوں کے ہار بکھرے تھے۔ مٹھائی کے

خالی دونے تھے، پھینکے ہوئے بجھے ہوئے سگریٹ تھے، پانوں کی پیک تھی، خوانچے والوں کی غلاظت تھی۔ اور سامنے وہی جگہ تھی جہاں سے کبھی شاھیا پھولوں کی چوٹ کھا کر پاگل ہو گیا تھا۔ وہ خواہ مخواہ مسکرانے لگا اسے پھر ایک عجیب سا خیال آیا اور اس نے کپڑے جھاڑ کر پگڑی کو ٹھیک کر لیا۔ دونوں ہاتھ منہ پر ملے اور مونچھوں کو بل دیکر زمین سے گلاب کا ایک پھول اٹھا کر پگڑی میں ٹانک لیا دو ڈگ بھر کے اس نے گلی پار کی اور سامنے کی ڈیوڑھی لانگھ کر اوپر دروازے پر زور سے دستک دی۔ "کون؟" رات کی جاگی ہوئی ایک نسوانی آواز پکاری۔ "دروازہ کھولو" شاھیا نے پہلے سے تیز تر شور پیدا کر کے قدرے تحکمانہ لہجے میں کہا اور ذرا سے توقف کے بعد دروازہ چوپٹ کھل گیا۔ شاھیا اندر داخل ہوا تو سب سے پہلے اسکی نظر لیمپ کی بڑھائی ہوئی بتی پر پڑی جس کا تیل غالباً ختم ہو چکا تھا۔ ساتھ والے کمرے سے کسی مرد کے خراٹوں کی آواز آرہی تھی۔ شاھیا نے لالٹین کی گھٹتی بڑھتی روشنی میں ایک گورے گورے حسین چہرے پر ٹھوڑی اور ہونٹوں کے درمیان وہی تل دیکھا جسے وہ اتنے عرصے کے بعد بھی نہیں بھولا تھا۔

"تم نے مجھے پہچانا؟" شاھیا دونوں ہاتھ پیٹھ پیچھے باندھ کر نظریں چراتے ہوئے کمرے میں گھوم کر بولا۔

"ہاں ...." اس نے قدرے توقف کے بعد یوں کہا جیسے شاھیا کو پہچان کر اس سے کوئی قصور ہو گیا ہو۔ "تمہیں معلوم ہے میں یہاں کیوں آیا ہوں؟" شاھیا نے لاتعلقی کے انداز میں دیوار پر ایک تصویر دیکھتے ہوئے ایک نمایاں احساس برتری کے ساتھ پوچھا جیسے کوئی ہنس کوے کا مہمان بنا ہو۔

"نہیں" اس نے ایک احساسِ جرم سے دبی آواز میں جواب دیا۔

جیسے ایک عظیم راز کا انکشاف کرتے ہوئے شاھیا نے سنجیدگی سے کہا "اس لئے کہ تم نے میرے لئے پیشیاں بھگتیں اور جھوٹ بول کر میری جان بچائی، عدالت میں تم نے ایک حرف بھی سچ نہیں کہا۔ ورنہ شاید میں آج یہاں نہ ہوتا...." شاھیا بدستور تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا اور کمرے میں پھر تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔

"اور سنو ...." شاھیا پلٹ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہوا، اپنی چھوی کو ہاتھوں میں جھلاتا ہوا، پولیس انسپکٹروں کے سے انداز میں کہنے لگا "آئندہ کبھی کسی پر یوں پھولوں کے ہار نہ پھینکنا، ان چلتے ہوئے لوگوں میں کبھی کبھی کوئی مرد جوان بھی آہی نکلتا ہے"۔ شاھیا نے کٹیلے طنز کے ساتھ مسکرا کر اس کو دیکھا۔ اس نے مہندی رنگے ہاتھوں سے منہ چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی جیسے شاھیا نے کسی رستے ہوئے زخم پر اچانک زور سے نشتر مار دیا ہو۔ کچھ نادم کچھ حیرت زدہ سا ہو کر شاھیا نے چھوی کونے میں رکھ دی اور آگے بڑھ کر اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھنے لگا۔

"اچھا تو اب میں چلتا ہوں ....." وہ اس کی دل آزاری کے خیال سے ڈر کے کونے سے اپنی چھوی اٹھائے پشیمانی سے بولا اور جلدی سے باہر نکل آیا۔ مبادا سسکیوں کی آواز سے کوئی جاگ اٹھے اور اس کے ساتھ ہی شاھیا کے اندر کا شاھیا بھی..... اندر سے بدستور سسکیوں کی آواز آرہی تھی۔ شاھیا باہر بت بنا کھڑا تھا۔

بڑی مشکل سے اس نے اپنے آپ کو دروازے سے ہٹایا اور شاھیا کو گھسیٹتا ہوا باہر سڑک پر لے آیا۔ وہ مردہ سی چال چلتا ہوا شہر سے باہر آگیا، وہ دل ہی دل میں پچھتا رہا تھا کہ وہ وہاں گیا ہی کیوں؟

آہستہ آہستہ چلتے وہ شہر کے باہر بہنے والی بڑی نہر کے کنارے نکل آیا۔ آس پاس کی بستیوں میں مرغ اذان دینے لگے تھے، گائیں ڈکارنے لگی تھیں، کتے بھونکنے لگے تھے، صبح کا وقت قریب تھا۔

نہر کے کنارے چلتے چلتے اسے یوں لگا جیسے اس کے کان گونج رہے ہیں، جیسے دور کہیں کوئی "شاھیا" "شاھیا" پکار رہا ہے۔ یہ آواز دھیرے دھیرے قریب آتی جارہی تھی حتیٰ کہ شاھیا کو ایک بار پیچھے مڑ کر دیکھنا ہی پڑا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ کوئی عورت چادر اوڑھے وحشت کے ساتھ اس کے پیچھے پیچھے بھاگتی چلی آرہی تھی۔ جیسے شاھیا اس کی کوئی انمول شے لئے جاتا ہو۔ وہ ٹھٹک گیا، وہ بہت حیران تھا۔ اگر اس کی گھوڑی مستی کہیں سے ہنہناتی آجاتی یا اس کے سفید بیل کہیں سے گھنگرو بجاتے بھاگتے ہوئے یکلخت اس کے سامنے آجاتے تب بھی شاید اس کو اتنی حیرت نہ ہوتی۔

وہ عورت پاگلوں کی طرح دوڑتی اس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ اس کا رواں رواں پسینے سے تر تھا اور آنکھیں نمناک۔ وہ کانپ رہی تھی اور اس کے ساتھ اس کی آواز بھی: "مجھے بھی ساتھ لے چلو شاھیا" شاھیا مسکرانے لگا۔ پھر نہ جانے کیوں اسے اس گاؤں کا خیال آیا جس کی تلاش میں وہ نکلا تھا اور جہاں سب کچھ اسی کا اپنا تھا۔

دو رُخ

غلام الثقلین نقوی

گفتگو گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی ہے!

سانپوں کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ننھے سے سنپولئے سے بات شروع ہوئی جو اتفاقاً ایک دن اشرف کے پاؤں تلے کچلا گیا تھا اور ایک اژدہے پر ختم ہو گئی جسے برما کی جنگ میں اشرف اور اس کے ساتھی سپاہیوں نے برین گن کی گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا۔ پھر نہ جانے کیسے موضوع یکدم بدلا اور ٹھگوں اور گرہ کٹوں کی لذیذ حکایات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

نذر نے کہا: "مجھے دو بار ٹھگوں سے پالا پڑا ہے۔ ایک بار مجھے میری دیانت اور فطرتی شرافت نے بچا لیا اور کافی دنوں کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میں ٹھگوں کے پلے پڑ گیا تھا۔ دوسری بار مجھے پورا پورا احساس تھا کہ میں ٹھگا جا رہا ہوں لیکن میں اُس پرندے کی طرح جسے سانپ کی آنکھ نے مسحور کر لیا ہو اور وہ چیختا چلاتا اور پھڑپھڑاتا ہوا آخر بے بس ہو کر سانپ کے منہ میں چلا جاتا ہے، دامِ فریب میں پھنس کر رہ گیا اور ستم ظریفی تو یہ ہے کہ بعد میں اپنے کئے پر پچھتا بھی نہ سکا۔"

سب نذر کی طرف متوجہ ہو گئے۔ نذر سب کی توجہ ایک مرکز پر مرکوز دیکھ کر کھنکھارا اور کہنے لگا:۔

"یہ آج سے تین سال پہلے کا واقعہ ہے۔ مجھے ایک کام سے ملتان جانا پڑا۔ ملتان چھاؤنی کے اسٹیشن پر گاڑی سے اترا۔ ابھی پوری پوری روشنی نہ ہوئی تھی۔ میں نے باہر نکل کر ہاتھ منہ دھوئے اور پھر اٹیچی کیس اٹھا کر اس سڑک پر ہو لیا جو چھاؤنی میں سے گزرتی ہوئی شہر کی طرف جاتی ہے۔ سڑک کے دو رویہ سایہ دار درخت تھے اور صبح کی ہوا خنک تھی۔ میں نے تانگہ لینے سے پیدل چلنا بہتر سمجھا۔ رات جاگتے گزری تھی۔ رات بھر گاڑی کے ڈبے میں اُمس اور گرمی تھی۔ پسینے پر پسینے آتے رہے تھے لیکن یہ صبح کی لطیف ہوا کا معجزہ تھا کہ چند قدم چلنے کے بعد طبیعت ہشاش بشاش ہو گئی اور بند بند سے تھکن شبنم کے قطروں کی مانند اُڑ گئی۔

میں نے اٹیچی کیس زمین پر رکھا، ایک سگریٹ ہونٹوں میں دابا، دیا سلائی رگڑی لیکن وہ آگ نہ پکڑ سکی۔ رات بھر پتلون کی جیب میں رہ کر دیا سلائی پسینے میں بھیگ چکی تھی۔ میں مایوس ہو کر سگریٹ ہونٹوں سے نکالنے والا ہی تھا کہ شرر کی آواز آئی اور پیالی کی صورت میں بند دو ہاتھ میرے ہونٹوں تک آ پہنچے جن کے اندر ننھا سا شعلہ روشن تھا۔ میں چونک گیا، لیکن سگریٹ کو آگ لگ چکی تھی اور پہلا کش فضا میں نیلا دھواں بن کر منتشر ہو چکا تھا۔ میں نے شکریے کے الفاظ کہے۔ نووارد نے مسکرا کر کہا: "کوئی بات نہیں صاحب!" میں نے نووارد کو بڑے غور سے دیکھا۔ شلوار، قمیص اور اس کے اوپر خاکی کوٹ۔ آنکھوں پر رنگین چشمہ، نفیس ترشی ہوئی مونچھیں، بڑی صفائی سے منڈی ہوئی ڈاڑھی۔ میں اٹیچی کیس اٹھانے کے لئے جھکا۔ معاً وہ ہاتھ اٹیچی کیس کی طرف لپکا۔ پھر میں نے کہا: "صاحب آپ تکلیف نہ کیجئے۔" نووارد جواب میں محض مسکرا دیا۔ بڑی دلکش میٹھی مسکراہٹ جیسے کہہ رہی ہو: اس میں تکلف کی کونسی بات ہے دوست! میرے لئے یہ تکلیف عین راحت ہے۔

پھر ہم دونوں روانہ ہو پڑے۔ راستے میں اُس نے بڑے میٹھے انداز میں باتیں کیں۔ لاہور کی باتیں، پشاور کی باتیں، لندن اور نیویارک کی باتیں۔ اخبار کی باتیں۔ لیڈروں کی باتیں۔ جناح اور لیاقت کی باتیں۔ وہ باتیں جو بڑی معمولی معمولی تھیں لیکن کہنے والے کا انداز بہت نرالا تھا۔ اس نے پاکستان کا کونہ کونہ کھنگال ڈالا تھا۔ سیر و سیاحت اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ میں نے یہی سمجھا کہ وہ صبح کا ناشتہ لاہور میں کرتے ہیں۔ دوپہر کا کھانا ملتان میں کھاتے ہیں، سہ پہر کی چائے کراچی میں پیتے ہیں اور رات بلوچستان کے کسی صحرائی ٹیلے پر بسر ہوتی ہے جہاں رات رات بھر پریاں ناچتی گاتی اور ہوا ٹھنڈے سانس بھر کر

لوریاں دیتی رہتی ہے اور سمندر کی لہریں نغموں کی بارش کرتی ہیں۔ آبشار گنگناتے ہیں۔ ندیاں مستی کے عالم میں پتھروں پر سے رقص کرتی پھسلتی چلی جاتی ہیں۔"
میں نے گھبرا کر کہا: "بلوچستان کے صحرا میں لہروں کے نغمے۔ آبشاروں کی گنگناہٹ، ندیوں کا رقص!"
"واہ صاحب!" اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا: "سمندر تو کراچی کے پاس ہے اور آبشار اور ندیاں مری اور ایبٹ آباد کے پہاڑوں پر لیکن ان کا صحیح لطف ریت کے ٹیلوں پر ہی آتا ہے۔ یہ اس کی قدرت کا ایک کرشمہ ہے۔ ہاں صاحب! سبحان اللہ۔ . . . آپ نے کبھی ریڈیو سنا ہے؟"
"آپ کا مطلب؟" میں نے بوکھلا کر کہا۔
"ایریل ہوا سے آواز کی لہروں کو پکڑتا ہے اور ارتھ زمین سے۔"
"لیکن بلوچستان کے ریت کے ٹیلوں سے اس کا تعلق؟" میں نے جھنجھلا کر کہا۔
اور معاً فضاؤں میں ایک قہقہہ گونج گیا۔ گونجیلا۔ لچکیلا۔ لرزتا کانپتا قہقہہ۔ وہ قہقہہ جس میں جھوٹ کے جراثیم ہوتے ہیں۔ میرا دل چاہا کہ میں بھی اتنا زور سے قہقہہ لگاؤں کہ پھیپھڑے پھٹ جائیں۔ میں نے اس خواہش کو بڑی مشکل سے روک کر کہا۔
"آپ قہقہے پر قہقہہ لگا رہے ہیں۔"
"معاف کیجئے! میں قہقہہ لگانے کو صحت کے لئے نہایت ضروری سمجھتا ہوں پھیپھڑے کھل جاتے ہیں۔ دق اور سل سے انسان محفوظ رہتا ہے۔ . . . اور . . . . . آپ کو معلوم ہے کیا؟"
"کیا؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔
"فرنگی ہندوستان چھوڑنے سے پہلے یہاں دق کے جراثیم پھیلا گئے تھے۔" اُس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔
"دق کے جراثیم!" میں نے خوف سے کانپتے ہوئے کہا۔
"فرنگی سونے کی چڑیا کو بھلا کیسے چھوڑ سکتا تھا صاحب!" اُس نے کبوتر کی طرح چہرے کو معصوم بناتے ہوئے کہا: "فرنگیوں نے جانے سے پہلے بوتلوں کے منہ کھول دیئے۔ آپ یقین جانیں۔ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ ایک دن شہروں کی سڑکوں اور دیہاتوں کی گلیوں میں لاشوں کے انبار ہوں گے۔ ہاں گلی سڑی لاشوں کے انبار۔ ہڈیوں کے ڈھیر۔ کھوپڑیوں کے ہار۔"
"کھوپڑیوں کے ہار!" میں نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔
"لوگ کھوپڑیوں کے ہار پہنیں گے۔"
"کون لوگ؟" میں نے چیخ کر کہا۔
"وہی لوگ جو قہقہہ لگا کر ہنسیں گے۔ جن کے سینوں کے اندر تازہ ہوا آتی جاتی رہے گی یعنی میرا مطلب یہ ہے جو زندہ رہیں گے۔ میں اسی لئے تو قہقہے لگا کر ہنستا ہوں اور خوراک بھی تو اچھی کھاتا ہوں یعنی میرا مطلب ہے انڈا، گوشت، مرغی، مکھن اور دودھ۔ لکھنؤ کے باورچی بھی تو کمال کے کاریگر تھے۔"
"یعنی؟"
"ہمارے گاؤں کے ذیلدار نے لکھنؤ کے ایک باورچی کو ملازم رکھ لیا تھا۔ اُس نے ایک پاؤ مونگ کی دال پکائی اور تیس روپے خرچ مانگا۔ 'تیس روپے' ذیلدار نے حیران ہو کر پوچھا۔ باورچی کو غصہ آیا۔ اُس نے دال ایک سوکھے درخت کی جڑ میں انڈیل دی اور خود چلا گیا۔ دوسری صبح اُس ٹنڈ منڈ درخت میں سبز کونپلیں اور ہرے بھرے پتے تھے۔ میں نے اُس باورچی کو دیکھا ہے۔"
"آپ نے؟"
"جی ہاں! میں نے ان آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ باورچی لکھنؤ کے آخری نواب کے پاس تھا۔ اور پھر جب نواب غریب ہو گیا تو وہ روزگار کی تلاش میں پنجاب آ گیا۔ بہت بڈھا تھا محض ہڈیوں کا ڈھانچہ۔"
"لکھنؤ کا انقلاب ہوئے سو سال گذر چکے ہیں۔"
"سو سال" اُس نے کچھ دیر سوچ کر کہا۔ "اُس کی عمر کم از کم ایک سو تیس سال ہوگی جس دال سے سوکھے درخت ہرے ہو سکتے ہیں۔ اُس سے عمر کے

چند سال نہیں بڑھ سکتے۔ آپ بھی تو کمال کرتے ہیں بابو جی!"

اور مجھے اپنے کمال پر کمال ندامت ہوئی۔

"کیا وہ اب بھی زندہ ہے؟"

"مر گیا ہے بیچارا!" اُس نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ "موت سے کس کو مفر ہے!"

اور مجھے حیرت ہوئی جس شخص کے پاس ٹنڈ منڈ درخت کو ہرا بھرا کرنے کا معجزہ ہے۔ وہ بھلا مر کیسے سکتا ہے؟

"کیسے شکر ادا کروں تیرا نیلی چھتری والے!" اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ "سچ جانیں بابو جی میرا کوئی دھندا نہیں۔ پھر بھی دو وقت کی روٹی مل ہی جاتی ہے۔"

"گزارے کی کوئی سبیل نہیں! پھر بھی......" اس نے میری بات کاٹ لی۔

"بہت دیتا ہے۔ پیٹ بھر کے دیتا ہے۔"

"بغیر کسی کام کے"

"ہاں صاحب! بغیر کام کے چھپر پھاڑ کر..... ایک سگریٹ۔"

میں نے جلدی جلدی سگریٹ اس کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ اُس نے اٹیچی کیس نیچے رکھا اور سگریٹ سلگایا۔ پہلا کش لیکر کہا۔ "اُس کے دینے کے ڈھنگ نرالے ہیں۔ میں جب اسٹیشن پر اترا تو میرے پاس صرف ایک آنہ تھا۔ وہ میں نے ایک فقیر کو دے دیا۔ سگریٹ کی سخت طلب تھی۔ ہاں! واقعی اس کے دینے کے ڈھنگ نرالے ہیں۔"

مجھے دوسری بار ندامت ہوئی۔ کم بخت نے اپنی بات کا عملی ثبوت دے دیا تھا۔ اُس نے منہ کو غنچے کی مانند سکیڑا۔ لمبا سا کش لیا۔ دھوئیں کے حلقے بنتے اور فضا میں تحلیل ہوتے گئے۔ اس کے سگریٹ پینے کا انداز بھی بڑا فنکارانہ تھا۔ ایک عرصے تک ہم دونوں خاموش رہے۔ پھر اس نے کہا۔

"آپ بہت کم باتیں کرتے ہیں۔" میں احتجاج کرنے کے لئے منہ کھولنے ہی والا تھا کہ اس نے کہا۔

"کچھ لوگ فطرتاً بہت خاموش ہوتے ہیں صاحب۔ میں بھی بعض اوقات اتنا کم گو بن جاتا ہوں کہ میرے دوست شکایت کرتے ہیں۔"

"لیکن آج تو آپ کی روانی پر مجھے رشک آ رہا ہے۔" میں نے بڑی جرأت سے کہا۔

"رشک!" اور وہی گونجیلے، لچکیلے قہقہے پھر ساکن فضاؤں میں گونجے۔ "آپ سے مل کر نجانے کیوں خواہ مخواہ بے تکلف ہونے کو جی چاہتا ہے۔ بالکل آپ ہی کی شکل و صورت کا میرا ایک دوست تھا۔"

"تھا" میں نے کہا۔

"ہاں صاحب کبھی تھا، اب نہیں۔"

"لڑ پڑے تھے آپ؟"

"نہیں صاحب میری دوستی کا محل ریت کی بنیادوں پر نہیں بنا کرتا۔ یہی مولا کی مرضی تھی۔ موت نے اُسے چھین لیا۔"

اُس کی آواز میں غم کی کپکپاہٹیں تھیں۔ "وہ گھر سے امیر تھا لیکن جب مرا تو اُس کے پاس کفن کے لئے پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ کہہ رہے تھے کہ وہ امیر تھا۔"

"دولت خواہ جوئے میں لٹائی جائے یا عیاشی کی نذر کر دی جائے یا حاتم طائی کی طرح فقیروں میں بانٹ دی جائے۔ آخر ختم ہو ہی جاتی ہے۔"

"وہ شرابی تھے یا......؟"

"نہیں صاحب! وہ سخی تھا۔ دولت اس کے ہاتھوں کی میل تھی۔" میں نہ جانے کیوں مسکرا دیا۔ اس نے جواب میں پوری بتیسی کی نمائش کی۔ پوری بتیسی جس کے سامنے کے دو دانت سنہری تھے۔ سونے کے پتروں میں مڑھے ہوئے دانت۔ یہ سنہری مسکراہٹ بہت دلآویز تھی۔ بڑی معصوم۔ بڑی بے تکلف۔

"آپ کا اسم شریف؟" میں نے سیدھے سادھے خالص ایشیائی انداز میں پوچھا۔ "میرا نام جان کر کیا ملے گا آپ کو؟ یہی سمجھ لیں کہ ایک مسافر سا تھی

کے ساتھ چند لمحے گزرے تھے۔ مجھے آپ پردیسی کہہ لیا کریں۔" اور بات کرتے کرتے وہ یکدم چونک پڑا۔

"اُس عورت کو دیکھا آپ نے ؟"

"کس عورت کو ؟"

"وہ سامنے دیکھئے نا ! اس کے متعلق کیا خیال ہے آپ کا ؟"

"میرا خیال ! میں اسے نہیں جانتا۔"

"جانتا میں بھی نہیں لیکن تجربہ بھی تو کچھ چیز ہے۔"

"مجھے عورتوں کے متعلق بہت کم تجربہ ہے !"

"واہ صاحب ! تو سنیئے ! اس عورت کی کوئی چیز گم ہو گئی ہے۔ آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کیا ؟"

"نہیں !" میں نے چڑ کر کہا۔

اس نے مسکرا کر کہا: "شرط لگاتے ہیں آپ ! میرا اندازہ کبھی غلط نہیں ہوا۔"

اس اثنا میں وہ عورت نزدیک آ چکی تھی۔ ادھیڑ عمر کی عورت جس نے حد سے زیادہ شوخ اور رنگین کپڑے پہن رکھے تھے۔ ہونٹوں پر سرخی، آنکھوں میں کاجل۔ پاؤں میں سفید لفٹی۔ اس کی نگاہوں سے پریشانی کا اظہار ہو رہا تھا۔

میرے پردیسی دوست نے آگے بڑھ کر کہا: "بی بی !"

عورت نے چونک کر دیکھا اور اس کی نگاہیں اور زیادہ پریشان ہو گئیں۔

"بی بی ! تیری کوئی چیز گم ہو گئی ہے کیا ؟"

"ہاں ! بھائی !"

پردیسی نے مجھے گھور کر دیکھا۔ میرے پاس الفاظ نہیں کہ ان نگاہوں کی اُس چمک کو بیان کر سکوں جس میں ہٹلر، مسولینی، چنگیز اور دُنیا کے تمام فاتحوں کی فتحمندی میں چُور روحیں ہجوم کر آئی تھیں۔ میں نے ہارے ہوئے دُشمن کی مانند شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔

"کیا چیز تھی بی بی ؟ اور کہاں گم ہوئی ؟" اس نے اپنے لہجے میں دنیا بھر کی ہمدردی سمیٹتے ہوئے کہا۔

"یہیں اس سڑک پر...... میں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر تھک چکی ہوں۔"

"کیا چیز تھی بی بی ؟" بی بی خاموش رہیں۔

"ڈرنے کی کونسی بات ہے ؟ ایک ہی ہاتھ کی پانچ انگلیاں بھی تو برابر نہیں ہوتیں"

"نیکلس تھا۔ ایک سہیلی سے مانگ کر لائی تھی۔ ایک شادی میں شریک ہونا تھا۔ رومال میں لپیٹ کر جیب میں ڈال لیا تھا۔ نہ جانے کیسے گر گیا ؟"

اُس عورت کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

ہم دونوں آگے چل پڑے۔ کوئی دو فرلانگ چلنے کے بعد اُس نے سرخ رومال میں لپٹی ہوئی ایک پڑیا کو ٹھوکر لگا کر دُور پھینک دیا اور پھر آگے بڑھ کر اٹھا لیا۔ اُس نے پڑیا کھولی۔ اس کے اندر سنہری چمکتا ہوا ہار تھا۔ اس کا ہاتھ کانپا اور پھر اُس نے میری کلائی پکڑ لی اور کشاں کشاں مجھے سڑک سے ایک طرف لے گیا۔ ایک پرانے قبرستان میں ٹوٹی پھوٹی قبروں کے درمیان، اس نے ایک بوڑھے او کان کے تنے کے ساتھ ٹیک لگالی۔

"خدا جب دینے پہ آتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔"

"یہ ہار تو اُس عورت کا ہے"

"ہوگا مجھے کیا معلوم۔ میں نے رستے میں پڑا ہوا پایا۔" اُس نے بڑی خشونت سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ اس کی آنکھوں میں دنیا بھر کی ہوس جھلک رہی تھی۔ ایک قاتل کی آنکھوں کی خونی چمک، جیسے اس کے ہاتھ ابھی بڑھیں گے اور میرا گلا دبا ڈالیں گے۔

"تو پھر مجھے جانے دو۔" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

" مجھے پولیس کے سپرد کرنا چاہتے ہو دوست ۔ میں ایسی چالاکیوں کو خوب سمجھتا ہوں ۔" اُس نے دانت کٹکٹا کر کہا اور میری کلائی پر گرفت اور بھی سخت کر دی ۔

" یہ ہار اُس عورت کا ہے ۔ تم نے کہا تھا ایک ہی ہاتھ کی پانچ انگلیاں برابر نہیں ہوتیں ۔" میں نے بڑی جرأت سے کہا ۔

" میں اب بھی یہی کہتا ہوں ۔"

" پھر بہتر یہی ہے کہ ......" اُس نے مجھے بات پوری نہ کرنے دی ۔

" بہتر یہی ہے کہ میں اسے لوٹا دوں ۔ یہی کہنا چاہتے تھے نا آپ ! میں آخری بار کہتا ہوں کہ یہ ہار مجھے سڑک پر گرا ہوا ملا ۔ میں نے ڈاکہ نہیں ڈالا ۔ چوری نہیں کی ۔ میں ہار واپس نہیں کروں گا ۔ تین ساڑھے تین سو پر لات کیسے ماروں ؟ لیکن آپ میرے شریک ہیں ۔"

" میں حصہ نہیں لوں گا " میں نے بڑی شدت سے انکار کیا ۔ اس کے دو سنہری دانت ننگے ہو گئے ۔ لیکن اب اس پر سونے کی بنی ہوئی مسکراہٹ نہیں تھی ۔ ایک جھلائے ہوئے کتے کی غراہٹ تھی ۔

" آپ کو حصہ لینا پڑے گا ۔ میں پولیس کے سپرد نہیں ہونا چاہتا ۔" اس نے ہار کو بڑے غور سے دیکھا " بڑی خوبصورت چیز ہے ۔ اس کے دو ٹکڑے نہیں ہو سکتے ۔ آپ نصف ہار کی قیمت ......" چھٹکارے کی اور کوئی سبیل نہ تھی ۔ میں نے سر ہلا کر رضامندی کا اظہار کیا ۔

" تو لائیے ڈیڑھ سو روپے " اس نے چہک کر کہا ۔

میں نے چیخ کر کہا " تم نے نصف قیمت دینے کی پیشکش کی تھی ۔"

" میں نے کہا تھا ؟ میں نے کب کہا تھا ؟ میں نے ابھی ابھی بھکاریوں کی طرح ہاتھ پھیلا کر آپ سے ایک سگریٹ کی بھیک مانگی تھی ۔ گاڑی سے اترتے وقت میری جیب میں محض ایک آنہ تھا جو میں نے اپنے جیسے بھکاری کو خیرات کر دیا کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ ضرورت مند تھا ۔" اور اُس کے چہرے کی کیفیات ہارے ہوئے مایوس جواری کی مانند اداسی ، بے کسی ، بے بسی اور شکست میں بدل گئیں ۔ سچ جانیئے ! میں پھر شرمندہ ہو گیا ۔ میرے لاشعور نے اس کی سیدھی سادی بات کو غلط معنی دئے تھے ۔

اُس نے امید بھری آنکھوں کے ساتھ ہار کو لہرا کر کہا " آپ کے پاس ڈیڑھ سو روپے ہیں ؟"

" نہیں "

" ایک سو "

" نہیں "

" پچاس "

" نہیں "

" آپ بہت ضدی ہیں ۔ میں پچاس میں ساڑھے تین سو کا ہار پیش کر رہا تھا ۔ آپ نے سنہری موقع کھو دیا ۔"

" میرے پاس کچھ بھی نہیں ۔"

" کچھ بھی نہیں ، آپ بہت بڑا جھوٹ بول رہے ہیں ۔"

" جھوٹ ! " میں نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا ۔

" معاف کیجئے ! میں پاگل ہو گیا تھا ۔" اس نے آنکھیں میچ لیں اور خیالات کی دنیا میں کھو گیا ۔ اس کے مایوس چہرے کی شکنیں ایک ایک کر کے ہموار ہونے لگیں جیسے کوئی اَن دیکھا ہاتھ حرص و ہوس کے نقوش کو آہستہ آہستہ مٹاتا چلا جا رہا ہے ۔ پھر آنکھوں میں مسکراہٹ جھلکی اور ہونٹوں پر اتر آئی ۔ بھینچے ہوئے ہونٹوں کے تالے کھلے اور اُن سنہری دانتوں پر شفق کے لالہ زار کھلنے لگے ۔

" یہ ہار اس عورت کو دے دیجئے ۔" میں نے زندگی میں پہلی بار ایسی مسرت کا لطف اٹھایا جو غرض کے ہر جذبے سے پاک ہوتی ہے ۔ میں نے ایک انسان کے ابلیس کو زیر کر لیا تھا ۔ ہم چپ چاپ سڑک پر آ گئے ۔ وہ عورت ابھی تک ہار تلاش کر رہی تھی ۔ میں نے اسے اشارے سے بلایا ۔ قریب آنے پر

میں نے ہار اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ لیکن میں حیران رہ گیا کیونکہ اس کے چہرے پر خوشی کی ایک رمق بھی پیدا نہ ہوئی۔ میرا پردیسی ساتھی ہاتھ ملا کر اور تیس کیس میرے ہاتھ میں تھما کر رخصت ہو گیا۔ میں سارے راستے یہی سوچتا چلا آیا کہ وہ عورت ہار کو دوبارہ پا لینے پر خوشی سے پاگل کیوں نہ ہو گئی۔

اور یہ عقدہ جلد وا ہو گیا۔ چند دنوں کے بعد میں نے اخبار میں ایک خبر پڑھی۔ پولیس نے ٹھگوں کے ایک گروہ کو گرفتار کر لیا تھا جن میں عورتیں بھی شامل تھیں۔ وہ ہار پیتل کا تھا جس پر سنہری پانی پھرا ہوا تھا۔ پھر مجھے اپنی شرافت پر غصہ آیا۔ اپنی دیانتداری پر ڈوب مرنے کو جی چاہا۔

"کیوں؟" اشرف نے پوچھا

"اسلئے کہ جس شرافت، جس دیانتداری میں عقل کا فقدان ہو۔ وہ شرمناک طور پر قابلِ نفرت ہے۔"

"اور دوسرا واقعہ؟" اشرف نے بے قرار ہو کر کہا

یہ پچھلے سال کی بات ہے۔ میں چھٹی لے کر گھر آیا۔ معلوم ہوا کہ اہلیہ عرصے سے بیمار چلی آ رہی ہیں۔ انہیں گردے کا درد تھا۔ میں انہیں لیڈی ڈاکٹر سلیمہ کے پاس لے گیا۔ انہوں نے تشخیص کی کہ تلی بڑھ گئی ہے۔ انہوں نے دو روپے میں ایک بڑی بوتل بھر کر دوائی دی۔ میری اہلیہ نے دوائی پی۔ انہیں کچھ درد کا افاقہ بھی ہوا لیکن پورا آرام نہ آیا۔ دوائی شاید بہت کڑوی تھی یا وہم بڑھ گیا تھا۔ وہ لیڈی ڈاکٹر سلیمہ کے علاج سے مطمئن نہ ہو سکیں۔ اس لئے مجھے ڈاکٹر ارشد مرزا کے ہسپتال میں جانا پڑا۔ انہیں ڈاکٹری کے میدان میں بقراط سے بھی بڑھ کر شہرت حاصل تھی۔

ہم قریباً سات بجے صبح اُن کے ہسپتال میں پہنچے۔ ابھی مریضوں کا تانتا نہیں بندھا تھا۔ ارشد مرزا بہترین سوٹ پہنے کرسی پر دراز تھے۔ اُن کے ننگے سر کی چندیا انڈے کی طرح صاف اور شفاف تھی۔ پھولے پھولے گالوں پر ایک کھونٹی بھی نہ تھی اور سفید مونچھیں لبوں کے گوشے میں کچھ اس انداز سے لٹک رہی تھیں جیسے اپنے آپ سے محجوب ہوں۔ میں نے السلام علیکم کہی۔ ارشد مرزا کے چہرے کا ایک ایک نقش مسکرایا اور ہنسا حتیٰ کہ ان کی مونچھوں کا ایک ایک سفید بال تبسم کی نقرئی کرن بن گیا۔ وہ کرسی سے مسکراتے ہوئے اٹھے، مسکراتے ہوئے مجھ سے مصافحہ کیا اور پھر مسکراتے ہوئے کہنے لگے:

"آپ تشریف رکھیں۔ اوہ! معاف کیجئے آپ کے ساتھ لیڈیز بھی ہیں" اور دوسرے کمرے کی طرف اشارا کرتے ہوئے کہنے لگے: "لیڈیز روم" اور پھر مسکراتے ہوئے آہستہ آہستہ کرسی پر بیٹھے اور دراز ہو گئے۔ وہ دائمی مسکراہٹ دیر تک اُن کے ہموار اور نرم چہرے اور ملائم مونچھوں پر مارچ کی خوشگوار دھوپ کی مانند پھیلتی اور سمٹتی رہی اور اس وقت مجھے افسوس ہوا کہ کاش میں ایک مصور ہوتا اور ڈاکٹر ارشد مرزا کو ماڈل بنا کر "اخلاق کا دیوتا" نامی تصویر بنا کر شہرت دوام کا تمغہ حاصل کر لیتا۔ اے کاش!

میں نے بیوی کو لیڈیز روم میں بٹھایا اور پھر ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں چلا آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے پھر مسکراہٹوں کا ریشمی لبادہ اوڑھ لیا۔ کہنے لگے "فرمائیے! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں" میں نے اپنی بیوی کی بیماری کا ذکر کیا۔ وہ ہمہ تن توجہ بن گئے۔ میں نے اس کی تکلیف بیان کی۔ اُن کے چہرے پر درد اور کرب کے نقوش اُبھرنے لگے۔ میں نے کہا کہ میری بیوی لیڈی ڈاکٹر سلیمہ کے علاج سے صحتیاب نہیں ہو سکیں۔ ان کے چہرے پر بے اطمینانی اور مایوسی کا اندھیرا چھانے لگا اور جب میں نے کہا کہ میری بیوی آپکے پاس آئے بغیر مطمئن نہ ہو سکتی تھیں تو اُن کی باچھیں خوشی سے کھل گئیں۔ موٹے موٹے گال غبارے کی مانند پھولے اور پھولتے چلے گئے اور مجھے ڈر لگا کہ یہ گال روایتی مینڈک ——— کی طرح نہ پھٹ جائیں۔ اس لئے میں نے مزید تعریف سے اجتناب کیا۔

ڈاکٹر نے گھنٹی پر ہاتھ رکھا۔ ایک ڈسپنسر نمودار ہوا۔ "ڈاکٹر مس قریشی سے کہیں کہ ذرا کنسلٹنگ روم میں تشریف لے آئیں۔"

میں اپنی بیوی کو لے کر کنسلٹنگ روم میں پہنچا۔ ڈاکٹر صاحب پہلے ہی سے موجود تھے۔ چند لمحوں کے بعد لیڈی ڈاکٹر مس قریشی صاحبہ بھی نمودار ہوئیں اور میں نے سمجھا کہ کوہ ہمالیہ کی بلندیوں سے لڑھکا ہوا کوئی برف کا ٹکڑا کمرے میں پھسل آیا ہے۔ سفید لباس۔ سفید بے داغ چہرہ۔ اُن کی تشریف آوری سے کمرے کا ٹمپریچر یکدم گرتا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے کپکپی سی محسوس کی۔

"کوئی سیریس کیس ہے کیا؟" اُن کا انداز گفتگو ان کے لباس اور چہرے سے بھی زیادہ برفیلا تھا۔

"سیریس ...... نہیں ...... شاید!" ڈاکٹر نے کہا۔ میں نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اس کا رنگ اڑا جا رہا تھا۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کی ہمت بندھانے کی کوشش کی لیکن بے سود۔

مس قریشی نے آگے بڑھ کر میری بیوی کی نبض کو ٹٹولا۔ آنکھوں میں جھانکا۔ پیٹ کو تھپتھپایا۔ سٹیتھیسکوپ کانوں سے لگا کر دل کی دھڑکن پھیپھڑوں کے زیر و بم کو محسوس کیا اور پھر برفیلے چہرے کو نقطۂ انجماد بناتے ہوئے بولیں "جگر بڑھ گیا ہے"۔ ڈاکٹر ارشد مرزا نے سر ہلا دیا اور پھر محض نگاہوں سے کام لینا شروع کر دیا۔

"دل پر ورم ہے!" شاید اس نگاہ نے کہا۔

"تلی بڑھ گئی ہے"۔ ہو سکتا ہے۔ نگاہ نے جواب دیا۔

"گردے پر زخم ہو گیا ہے"۔

"ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے"۔ ڈاکٹر مرزا کہنے لگے "یورن (URINE) ٹیسٹ کر لینا بہتر رہے گا"۔ اور پھر انہوں نے ایسے لہجے میں جس میں شفقت اور ہمدردی کی ہر گہرائی موجود تھی، میری بیوی سے کہا:

"آپ ذرا پردے کے پیچھے...... میرا مطلب ہے یورن ٹسٹ کرنا ہے"۔

میری بیوی پردے کے پیچھے چلی گئیں اور چند منٹوں کے بعد واپس آ گئیں۔ پھر دونوں ڈاکٹر پردے کے پیچھے چلے گئے۔ دو منٹ تین منٹ حتیٰ کہ دس منٹ گزر گئے اور آخر خدا خدا کر کے ڈاکٹر باہر آئے۔

"پیشاب میں البیومن ہے" ارشد مرزا نے کہا۔

"میں نے پس سیلز (PUS CELLS) بھی دیکھے ہیں"۔ لیڈی ڈاکٹر بولیں۔

"پس؟" ڈاکٹر ارشد مرزا نے حیران ہو کر کہا۔

"گردے میں زخم معلوم ہوتا ہے"۔ لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔

"زخم؟" میں نے گھبرا کر پوچھا

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میرا اور ان کا ڈفرنس آف اوپینین ہے۔ ابھی فیصلہ ہوا جاتا ہے"۔ ڈاکٹر ارشد مرزا نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"میں کہتا ہوں 'البیومن' ہے۔ آپ کہتی ہیں 'پس' ہے۔ جب دو ڈاکٹر اگری نہ کر سکیں تو بیماری کی تشخیص میں شک پڑ جاتا ہے"۔ ڈاکٹر ارشد مرزا نے بڑی مایوسی سے کہا اور گہری سوچ میں پڑ گئے "ایکس رے" لیڈی ڈاکٹر مس قریشی نے سکوت توڑتے ہوئے کہا۔

اور میرے ذہن سے ایک عکس ریز شعاع نکلی اور دونوں ڈاکٹروں کے ذہن کے پردوں سے گزرتی ہوئی ایک مقام پر پہنچ کر رک گئی جہاں صاف لکھا ہوا تھا "دھوکا! دھوکا"۔ یہ ڈرامہ دس منٹ سے محض اس لئے کھیلا جا رہا تھا کہ عکس ریزی نقطۂ عروج پر پہنچایا جا سکے۔ ڈاکٹر ارشد مرزا نے حال ہی میں ایکس رے مشین خریدی تھی۔ اور اس کا استعمال ضروری تھا۔ اور مجھے بے انتہا غصہ آیا۔ اپنی بیوی کی ضد پر۔ اپنی بیوقوفی پر۔ اخلاق کے دیوتا کی ساحری پر، برف کی قاش پر۔ لیکن اب میں جال میں پھنس چکا تھا۔ بیوی سے کیسے کہتا کہ اٹھو اور اللہ کا نام لے کر لیڈی ڈاکٹر سلیمہ کی بوتل خالی کر دو۔

پھر ایکس رے فوٹو لی گئی۔ دونوں ڈاکٹروں نے فوٹو کو غور سے دیکھا۔ اور پھر دونوں اگری کر گئے۔ میں نہیں جانتا کونسی بیماری کی تشخیص ہوئی۔ نسخہ لکھا گیا۔ ایک بڑی سی بوتل تُرپ ہوئی۔ ٹیکوں کا ایک ڈبہ میرے ایک ہاتھ میں تھما دیا گیا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے پانچ پانچ کے پانچ نوٹ ڈاکٹر کی میز پر رکھ دئے۔ انہوں نے نوٹ میز کی دراز میں رکھے اور پھر اٹھ کر مجھ سے مصافحہ کیا۔ مسکراہٹوں کے طوفان میں تھینکس، کا لوچدار لفظ ابھر کر ڈوب گیا۔

میں نے باہر آ کر بوتل کو غور سے دیکھا اور میں نے شرما کر نگاہیں جھکا لیں۔

"کیوں؟" اشرف نے پوچھا۔

"مجھے بوتل کے پیچھے لیڈی ڈاکٹر سلیمہ طنزیہ انداز میں مسکراتی نظر آئیں"۔

"وہ کیسے" اشرف نے پھر پوچھا۔

"اس بوتل کی دوائی کا رنگ بھی وہی تھا۔ جو لیڈی ڈاکٹر سلیمہ نے محض دو روپے میں دو روز قبل مجھے دی تھی!" ٭

شخصیات:

مولانا اکرم خاں

یونس احمر

مسلم بنگالی صحافت نگاری میں مولانا اکرم خاں کا نام ہمیشہ سرفہرست رہے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان سے پہلے بھی صحافت کے میدان میں کچھ لوگ اپنے قلم کی جولانیاں دکھا چکے ہیں لیکن جس اولوالعزمی، استقلال اور ہمت سے مولانا نے بنگالی صحافت کی خدمت کی اور اب تک کر رہے ہیں اسکی مثال مشکل سے ملے گی۔ شیخ عبدالرحیم، مولانا منیر الزماں اسلام آبادی، یعقوب علی چودھری، شہادت حسین اور دوسروں نے بنگالی مسلمانوں کے خفتہ دلوں میں "عمل پیہم" کا جو چراغ روشن کیا تھا اسے مولانا نے نہ صرف "بادِ مخالف" سے بچائے رکھا بلکہ اس کی تابانی میں اضافہ بھی کیا۔

مولانا بیک وقت صحافی، سیاست داں اور ادیب ہیں۔ اور ان تینوں حیثیتوں سے انہوں نے اپنے لئے ایک الگ مقام پیدا کیا۔ ایک وقت ان کی صحافتی زندگی میں ایسا بھی آیا جب مخالفت کی آندھیاں چلیں لیکن وہ اپنے نصب العین پر قائم رہے اور آندھیوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ یہ تو مسلمہ حقیقت ہے کہ صحافتی زندگی پھولوں کی سیج نہیں۔ قدم قدم پر کانٹوں سے الجھنا پڑتا ہے۔ مولانا نے ایسے دور میں صحافتی زندگی کا آغاز کیا جب بنگال کے مسلمان بنگالی ہندوؤں سے نہ صرف زندگی کے تمام شعبوں میں پیچھے تھے بلکہ وہ ان کے پنجوں میں اس طرح جکڑے ہوئے تھے کہ رہائی مشکل تھی۔ مثلاً یہی کیا کم افسوسناک بات ہے کہ اکثریت میں ہونے کے باوجود مسلمانوں کی اپنی کوئی آواز نہ تھی۔ زمینیں ہندوؤں کے پاس تھیں، تجارت میں وہ چھائے ہوئے تھے، سرکاری ملازمتوں میں ان کی اکثریت تھی۔ تعلیم میں وہ آگے تھے۔ غرضیکہ زندگی کا کونسا ایسا شعبہ تھا جس پر وہ قابض نہ تھے۔ اس کے علاوہ سب سے بڑی بدنصیبی تو یہ تھی کہ بنگالی مسلمانوں کا اپنا کوئی پریس نہ تھا کہ اس کے ذریعے حکومت وقت کے کانوں تک شکایتیں پہنچائی جاتیں، جائز حقوق کا مطالبہ کیا جاتا۔ ان اندوہناک حالات میں مولانا اکرم خاں کی دوربینی کام آئی۔ انہوں نے اس حقیقت کو بھانپ لیا تھا کہ جب تک مسلمانوں کا اپنا مضبوط پریس نہیں ہوگا اس وقت تک بنگالی مسلمانوں کی حق تلفی ہوتی رہے گی۔ وہ ہندوؤں کے مظالم کا شکار رہیں گے اور ان کی فریادوں کی دادرسی نہیں ہوگی۔

مولانا نے بنگلہ زبان میں کلکتہ سے روزنامہ "آزاد" جاری کیا۔ اس روزنامہ کے اجرا میں بھی انہیں بہت ساری دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے بڑی دقت ہندو پریس کا مقابلہ تھا۔ جہاں بنگال کے ہندو زندگی کے دوسرے شعبوں میں مسلمانوں سے بہت آگے تھے وہاں ان کا پریس بھی بہت مستحکم تھا۔ ان کے اخبارات بنگلہ کے علاوہ انگریزی میں بھی شائع ہوتے تھے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں مولانا کو نہ جانے کن کن پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ سب سے بڑی پریشانی فنڈ کی کمی تھی۔ اس پر وہ کسی طرح حاوی ہوئے تو اخبار کی اشاعت بڑھانے کی فکر لاحق ہوئی۔ مسلمانوں میں تعلیم کی کمی بلکہ فقدان کے باعث اخبار بینی کا ذوق نہ تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اخبار کی اشاعت کا مقصد حاصل ہوتا نظر نہ آیا۔ لیکن مولانا کی ہمت، استقلال اور تگ و دو کی داد دینی چاہیئے کہ وہ اپنی راہ پر ڈٹے رہے اور پیشانی پر بل تک نہ آیا۔ بنگالی مسلمانوں کے اندر وہ اپنے قلم سے تعلیم کا چرچا کرتے رہے۔ انہیں ان کی پستی اور غلامی کا احساس دلاتے رہے۔

مولانا کو بیک وقت کئی محاذوں پر لڑنا پڑا۔ ہندو ان کے کٹر دشمن تو تھے ہی۔ مسلمانوں کا ایک طبقہ بھی ان کا مخالف ہوگیا۔ ہندو اپنے اخبارات اور ماہناموں کے ذریعے اپنی تہذیب، اپنی زبان، (سنسکرت بنگلہ) اپنی تاریخ اور اپنے تمدن کا خوب پرچار کرتے تھے۔ اگر کوئی مسلم ادیب و شاعر ان کے اخباروں، رسالوں میں چھپنے کے لئے کوئی چیز بھیجتا تو شائع کرنا تو درکنار وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ وہ برملا یہ کہتے تھے کہ مسلمانوں کو بنگلہ زبان نہیں آتی۔ مولانا نے اخبار جاری کرکے مسلم ادیب و شاعر کے لئے راہ کھولدی۔ ان کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ روزنامہ آزاد کے صفحات جب

ایسی تخلیقات کے لئے ناکافی ثابت ہوئے تو انہوں نے ہفتہ وار محمدی اور پھر ماہنامہ محمدی جاری کئے۔ دیکھتے دیکھتے مسلم ادیب و شاعر نے ایسے ایسے جواہر پارے پیش کئے کہ ہندوؤں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

میں نے اوپر تحریر کیا ہے کہ مسلمانوں کا ایک طبقہ مولانا کا مخالف تھا۔ اس مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ مولانا حتی الامکان سنسکرت کے الفاظ سے پرہیز کرتے تھے۔ وہ ان کی جگہ اردو فارسی اور عربی کے الفاظ کا استعمال زیادہ سے زیادہ کرنا مناسب سمجھتے تھے۔ وہ اس چیز کو محسوس کر چکے تھے کہ جب تک بنگلہ زبان سے سنسکرت کے ان الفاظ کو جن سے ہندو تہذیب اور کلچر کی بو آتی ہے دور نہیں کیا جائے گا اس وقت تک مسلمانوں کی صحیح ذہنی تربیت نہیں ہوسکتی ہے۔ مولانا کی اس تحریک سے یہ طبقہ برہم ہوگیا۔ یہ وہ طبقہ تھا جو ہندو تہذیب کا مدح خواں تھا اور "بنگالی قومیت" کے جذبے نے ان کی بصیرت چھین لی تھی۔ ظاہر ہے کہ ہندو پریس کا تن تنہا مقابلہ کرنا کمزور آدمی کے بس کا روگ نہ تھا۔ مولانا ان دونوں محاذوں پر ثابت قدم رہے اور انہوں نے اس طرح ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیا کہ دشمن بھی ان کا لوہا مان گئے۔

کچھ دنوں تک بنگلہ کے مشہور شاعر و ادیب، شہادت حسین نے بھی مولانا اکرم کے ساتھ کام کیا۔ یہ ہفتہ وار محمدی کے مدیر تھے۔ ان کی زباں دانی کے آگے بڑے بڑے ہندو ادیب بھی سرنگوں ہوگئے۔ ان کے بہت سے شہپارے ہفتہ وار محمدی اور ماہنامہ محمدی میں شائع ہوئے ہیں۔

مولانا کے روزنامہ آزاد نے اگر ایک طرف بنگالی مسلمانوں کو گہری نیند سے بیدار کیا اور ان کے جائز حقوق دلائے تو دوسری طرف ہفتہ وار اور ماہنامہ محمدی نے ان کی ادبیانہ صلاحیتوں کو اجاگر کیا۔ گویا مولانا نے مسلمانوں کی نہ صرف سیاسی بلکہ ذہنی صلاحیت کو بھی بیدار کیا۔ اس اعتبار سے بنگالی مسلمانوں پر ان کے احسانات کم نہیں ہیں۔

صحافتی زندگی کے ساتھ ساتھ مولانا سیاسی زندگی میں بھی پیش پیش رہے۔ انہوں نے بنگال کے مسلمانوں کو منظم کیا۔ ان کے ان ملی جذبات کو ابھارا جو سو چکے تھے۔ ان کو اپنے اخبار کے ذریعہ سیاسی تعلیم دی۔ انہیں خواب سے بیدار کیا اور احساس دلایا کہ ان کے حقوق کس طرح پامال ہورہے ہیں۔ میں نے مولانا کو ۱۹۴۵ء، ۱۹۴۶ء، ۱۹۴۷ء میں محنت کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ان کی کوٹھی (واقع پارک سرکس کلکتہ) میں کس طرح مسلم رہنماؤں کا تانتا بندھا رہتا تھا اور رات گئے تک جلسے ہوتے رہتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بنگال کے سارے ہندو اخبارات (بنگلہ اور انگریزی) مولانا کے روزنامہ آزاد کے خلاف متفقہ طور پر زہر اگل رہے تھے۔ لیکن یہ ان کی اولوالعزمی تھی کہ وہ اپنی راہ سے نہیں ہٹے۔ یہاں تک کہ پاکستان بن گیا۔

پاکستان بن جانے کے بعد مولانا کے لئے کلکتہ سے اخبار کو جاری رکھنا آسان کام نہ تھا۔ وہ اپنا پریس ڈھاکے لے آئے۔ یہ زمانہ بڑا ہی بے سروسامانی کا تھا۔

ڈاکٹر انعام الحق اپنی کتاب "مسلم بنگالی ادب" میں لکھتے ہیں:۔

"تقسیم سے پہلے کلکتہ بنگال کا دارالسلطنت ہونے کے ساتھ ساتھ بنگالی زبان کا بھی تہذیبی مرکز تھا۔ گویا ایک طرح سے تمام ادبی تحریکیں کلکتہ ہی میں جنم لیتیں اور پروان چڑھتی تھیں۔ اس لئے وہ ادیب جو ادب میں اپنی جگہ بنانا چاہتے تھے، لازمی طور پر کلکتہ ہی کی ادبی مجالس سے وابستگی کی فکر کرتے تھے .... تقسیم کے وقت بنگال کے دونوں حصوں میں فرقہ وارانہ فسادات کے شعلے بھڑک اٹھے .... تقسیم کا نتیجہ عام آبادی اور خصوصاً پڑھے لکھے لوگوں کے انخلاء کی شکل میں ظاہر ہوا۔ بنگالی ہندو مشرقی بنگال سے مغربی بنگال کیا گئے کہ مشرقی بنگال کی ادبی زندگی میں ایک وسیع خلاء پیدا ہوگیا .... اگرچہ اس خلاء کو مولانا اکرم خاں، شہادت حسین، شوکت عثمان اور اکبرالدین جیسے ادیبوں نے مشرقی پاکستان میں ہجرت کرکے پر کیا مگر صرف جزوی طور پر ...." لیکن اس کے باوجود مولانا ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹے۔ ان کا بڑھاپا ان کی راہ میں حائل نہ ہوا۔ شب و روز کی محنت اور جانفشانی کے بعد ڈھاکے میں انہوں نے پریس قائم کر ہی لیا۔ مشرقی پاکستان کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اتنا شاندار روزنامہ شائع ہوا۔ ماہنامہ محمدی بھی اسی آب و تاب سے نکل رہا ہے البتہ ہفتہ وار محمدی بند ہوگیا ہے۔

مولانا اپنی صحافتی اور سیاسی زندگی سے قطع نظر بلند پایہ ادیب بھی ہیں۔ ان کی کتاب "مصطفٰے چرتر" (سیرت مصطفٰے) بہت مشہور ہے۔ اس میں مولانا نے حضرت رسولِ خدا کی سیرتِ پاک کا نقشہ کھینچا ہے۔ انہوں نے "پارۂ عم" کی تفسیر لکھ کر تو بقول ڈاکٹر انعام الحق "بنگالی ادب میں

بے مثال اضافہ کیا ہے۔" مولانا نے مذہب پر ایک اور کتاب مکمل کر لی ہے جس کا نام "شمسا دسما دھان" ہے۔

مولانا کو اردو سے بھی کافی شغف ہے۔ ان کی اردو دوستی اور قدر دانی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا مل سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے اخبار کا نام "آزاد" رکھا۔ بنگالی اخباروں کے اردو نام رکھنے کی ایسی روایت چل پڑی کہ قیام پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان کے دارالحکومت ڈھاکے سے دو ایک کے علاوہ جو بھی اخبارات نکلے ان کے نام اردو ہیں۔ مثلاً "اتفاق"، "انصاف"، "اتحاد" اور ماہناموں کے نام "سوغات"، "دلربا"، "محمدی" وغیرہ۔ "سوغات" اور "محمدی" کلکتہ سے بھی شائع ہوتے تھے۔ اتحاد روزنامہ بھی کلکتہ ہی سے شائع ہونا شروع ہوا تھا۔

اس وقت مولانا کی عمر ۹۰ سال کی ہو چکی ہے لیکن اب بھی ان کے جوش و خروش اور ہمت و استقلال میں کمی واقع نہیں ہوئی۔

★

"اقبال کا ایک شعر" ــــــــــــــــ بقیہ صفحہ: (۲۲)

اس پر منطقی طور سے یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ رات کی تاریکی سب کے لئے یکساں ہوتی ہے۔ پھر ایک خاص شخص کی رات سب سے تاریک کیونکر ہو سکتی ہے۔ پھر ایک خاص کوکب ایسا سیاہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ اس کو کالی رات کا ٹکڑا کہا جائے جب کہ کواکب کا تصور روشنی کے بغیر ممکن نہیں لیکن منطقی طور پر یہ شعر حقیقت کے خلاف ہونے کے باوجود کیا اس عالم یاس کی تصویر کشی نہیں کرتا جس کا مکمل اظہار ہی شاعر کا اصل مقصد تھا؟

شعر کی تفہیم کے سلسلے میں جب بھی منطقی طرز استدلال کا استعمال ہوگا اور ریاضی کی طرح دو اور دو چار کی طرح سوچا جائیگا تو اس قسم کے غلط رجحانات اور تصورات نقد پرورش پائیں گے۔ آخر میں میں ایک مثال اور پیش کروں گا۔ میر حسن کا یہ شعر:

درختوں کی کچھ چھاؤں اور کچھ وہ دھوپ
وہ دھانوں کی سبزی وہ سرسوں کا روپ

بھی مدت مدید تک نقادوں کے اعتراض کا ہدف بنا رہا ہے' اور اعتراض ہمیشہ یہی رہا ہے کہ ایک ہی موسم میں دھان اور سرسوں دونوں یکجا نہیں ہوتے۔ یہ تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف ہے' اس لئے کہ دھان خریف میں بویا جاتا ہے اور سرسوں ربیع میں تعجب تو اس پر ہوتا ہے کہ حالی جیسا بالغ نظر نقاد بھی اس سے آگے نہیں دیکھ سکا۔ حالانکہ میر حسن کے اس شعر کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ باغ میں واقعی ایک طرف دھان بوئے تھے اور دوسری طرف سرسوں۔ بقول مجنوں دوسرا مصرع تو استعارہ ہے۔ 'دھانوں کی سبزی' اور 'سرسوں کے روپ' سے 'درختوں کی کچھ چھاؤں' اور 'کچھ دھوپ' کو تشبیہہ دی گئی ہے اور اس طرح کہ تشبیہہ تشبیہہ معلوم نہیں ہوتی۔

اب جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کی روشنی میں آپ اقبال کا یہ شعر پڑھیں ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

تو آپ کو محسوس ہوگا کہ یہ شعر مہمل و بے ربط اور حقیقت کے خلاف نہیں بلکہ شاعر نے ایک بدیہی حقیقت کو ایک بلیغ استعارہ کے ذریعہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ کامیاب رہا ہے۔ یہی شاعری کی زبان ہے۔

★

ماہِ نو، کراچی۔ جون ۱۹۵۹ء

شرق و غرب

عارف حجازی

"مشرق اور مغرب۔ میرے دل پر ان کی جولانیوں کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا"۔ یہ تو ہوئی ایک مغربی شاعر کی بات۔ لیکن ہم بھی تو اپنے مشرق و مغرب کے متعلق کچھ ایسا ہی محسوس کرتے ہیں۔ شاید اس میں جذبات کو بھی کچھ دخل ہو کیونکہ مشرق ہو یا مغرب، شمال ہو یا جنوب، ہمیں اپنی ساری سرزمین ایک ہی نظر آتی ہے۔ ایک ہی رنگ میں ڈوبی ہوئی، ایک ہی جاودانی کیف کی حامل۔ اور اس میں بسنے والے، ان کے طور طریق بھی ایک ہی جیسے لگتے ہیں۔ ان میں خشکیوں کے دور دراز فاصلے ہوں یا بے پایاں طوفانی سمندروں کے، ان کی وحدت، ان کی یکرنگی ایک نمایاں حقیقت ہے۔ اِدھر کے کوہ و دریا وادیاں، میدان، ہرے بھرے کھیت، سبزہ زار، ساحل، سمندر بے اختیار اُدھر کے پہاڑوں، ندی نالوں، وادیوں، میدانوں، لہلہاتے کھیتوں، سبزہ زاروں، ساحلوں اور سمندروں کی یاد دلاتے ہیں۔ اور وہاں کا رہن سہن، رسمیں ریتیں، طور طریق، مزاج، عقائد ہر چیز یہاں کی زندگی میں اپنا ہی عکس پاتی ہے۔

یہ کوئی اتفاقی بات نہیں۔ اس کی تہہ میں کتنے ہی طبعی حالات اور کتنے ہی عناصر، کتنے ہی عوامل اور تاریخ و تہذیب کے کتنے ہی دھارے کارفرما ہیں۔ جو آپس میں ملکر ایک ہی دھارا بن جاتے ہیں۔ کیونکہ جو ہم رنگی روح میں ہے وہ لازماً خارجی مظاہر میں بھی رونما ہوتی ہے۔

طبعی حالات کا اس ہم آہنگی میں کچھ کم حصہ نہیں۔ دونوں ایک وسیع و عریض میدان، اس میں لمبے چوڑے دریا بہتے ہوئے اور آخر میں ہم آغوش سمندر ہونے سے پہلے چھوٹی چھوٹی شاخوں میں تقسیم ہو کر ڈیلٹا پیدا کرتے، ایک خاص قسم کی زندگی کو جنم دیتے ہوئے بیرونی حصوں میں سمندر کی وسیع پہنائی اور اس کا مخصوص رہن سہن۔ بعض حصوں میں پہاڑ اور وادیاں، سرسبز شاداب۔ میدانی علاقوں میں کھیتی باڑی اور کسانوں کا سیدھا سادا چلن۔ اُدھر ساحل سے دور دور سفینے ہی سفینے۔ کہیں اکیلے اکیلے کہیں بیڑا بیڑا۔ چاروں طرف بل کھاتی قوس در قوس چمکتی لہریں۔ اَن گنت جیسے ہلال ہی ہلال اور ان میں چمکتا پانی۔ ستارہ ہی ستارہ۔ اس ستارہ و ہلال کی سحر کن فضا میں مچھیرے اپنے جال اور ساز و سامان لئے دنوں رواں رہتے ہیں اور میلوں دور مچھلی کا شکار کرتے ہیں۔ اُدھر خلیج بنگالہ کے آس پاس نظر دوڑائیے۔ کیا وہاں بھی ہو بہو یہی سماں نظر نہیں آتا؟ بلکہ ندی ندی نالہ نالہ یہی سماں ہے۔ جہلم پر نظر ڈالئے۔ اس کی وادی کے کتنے جیالے مضبوط، جفاکش نوجوان ہیں۔ تیراکی میں ماہر۔ جن پر پاکستانی بحریہ کو ناز ہے۔ ایسے ہی مشرقی پاکستان کا بچہ بچہ تیراکی اور کشتی رانی میں ماہر ہے۔ مہران کے زندۂ جاوید فرزند، شاہ بھٹائیؒ نے ملاحوں اور مچھیروں کے کیا کیا گیت نہیں گائے۔ جن میں عرفان کے ساتھ ساتھ رومان کی جھلکیاں بھی ہیں۔ اُدھر بھٹیالی، معرفتی، جاری گان۔ ان میں کیا کچھ نہیں۔ زندگی، غم، مسرت، محنت مشقت، محبت، امید، دکھ سکھ، عرفان۔ اگر اِدھر ننکھوٹ پر پیار محبت کی پینگیں بڑھتی اور رومان کی قدرتی خواہش پروان چڑھتی ہے تو اُدھر تال تلیا، جھیل ساگر نوجوان دلوں اور زندگی کی امنگوں کو رومان کے سانچوں میں ڈھلنے کی دل آویز فضا مہیا کرتے ہیں۔ اور اگر کبھی من کی ترنگ میں دل کے ساتھ ہاتھ پاؤں بھی رقص کا مدھ متوالا روپ اختیار کر لیں تو کیا تعجب ہے۔ اور وہ بھی تال سُر یا گیت اور گتوں کی سنگت میں۔ چنانچہ ایک طرف خٹک ناچ، لڈی اور بھنگڑا نظر آتے ہیں تو دوسری طرف رقص و موسیقی کی بے شمار رنگ برنگی صورتیں ہیں بلکہ یہ دونوں تو مشرقی پاکستان کی زندگی اور معاشرہ کا لازمی جزو اور روحِ رواں ہیں۔

مغربی پاکستان میں گرم مرطوب جنگلاتی علاقہ کی بے تحاشا برشگالی کیفیت نہ سہی لیکن جب برکھا کا موسم آتا ہے تو کیا یہ اسی طرح دھواں دھار طوفانی نہیں ہوتا اور وہی ہر چہار طرف ہریاول ہی ہریاول کا سماں نہیں پیدا کر دیتا، اور ویسے ہی گیتوں کو جنم نہیں دیتا؟۔ شاعر ہوں یا مغنی،

مرد ہوں یا عورتیں، بوڑھے ہوں یا بچے، سب کے دل میں بے پناہ ولولہ پیدا ہوتا ہے، اور زندگی اپنے نت نئے ہنگاموں جوش و خروش اور ترانوں کے ساتھ جاگ اٹھتی ہے۔ اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ مغربی پاکستان ہے یا مشرقی پاکستان۔

مشرقی اور مغربی پاکستان جغرافیائی اعتبار سے کتنے ہی دور کیوں نہوں، ان کے ماضی و حال کو تاریخی روایات کی روشنی میں دیکھا جائے تو ان میں کتنی ہی باتیں مشترک نظر آئیں گی۔ قدیم قوموں میں سے جو بھی مغربی پاکستان آئیں ان کی کوئی نہ کوئی شاخ مشرقی پاکستان میں بھی آئی اور اُن کے پیشروؤں سے نہ بچ سکا نہ وہ۔ اس طرح قدرت دونوں کی نسل دخون میں ہم رنگی کا برابر اہتمام کرتی رہی۔ خواہ سرحد کے آزاد قبائل ہوں یا چٹاگام کے ہرے بھرے جنگلوں سے پلٹے ہوئے لشائی یا پہاڑوں کی خوشنما وادیوں میں بسنے والے چکما۔ قدیم تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ پاکستان کے ان دونوں پہاڑی حصوں کے آزاد قبائل اور چکما لوگوں کی رگوں میں بھی قدیم منگولی نسل کے لوگوں اور دیگر ایشیائی قوموں کا خون دوڑ رہا ہے۔ یہی حال پاکستان کے ان دونوں علاقوں میں بسنے والے لوگوں کا ہے۔ خواہ یہ علاقے سبزہ زار ہوں یا ریگزار۔

اسی طرح متحدہ پاکستان کے قدیم تاریخی ادوار اور پرانے شہروں کے آثار کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد جب ہم دور مغرب یعنی ایران، عراق، شام اور مصر کے قدیم آثار کا جائزہ لیتے ہیں تو خیال گذرتا ہے کہ شاید کسی زمانے میں مشرقی پاکستان کی خوبصورت فضاؤں سے لے کر وادیٔ نیل تک ایک ہی تہذیب و تمدن کا دور دورہ ہو۔ زمانہ ماقبل تاریخ اور قدیم ترین زمانے کے متعلق کچھ کہنا دشوار ہے، لیکن سامی قوموں خصوصاً فنیقیوں کی بحرپیمائی اور تاریخی زمانے میں ایشیائے کوچک کے سواحل سے لیکر عرب الہند اور چین تک نقل و حرکت کو دیکھتے ہوئے یہ قیاس شاید بعید از حقیقت نہ ہو کہ ان کے قدم جہاں وادیٔ سندھ میں پہنچے اور انہوں نے وہاں اپنے نسلی و تہذیبی اثرات چھوڑے وہاں مشرقی پاکستان بھی ان کے نقوش قدم سے بیگانہ نہیں رہا۔ برصغیر کے جنوبی حصے میں بالائی علاقے کے دراوڑی یا ان سے ملتی جلتی نسل کی آمد بھی قرین قیاس ہے۔ اور پھر آریاؤں، مغلوں، ترکوں کی مسلسل آمد، سکونت اور تسلط تو تاریخ جدید کا ایک اہم باب ہے۔ جن کی بنا پر وادیٔ مہران کو تہذیبوں کا معمل قرار دیا گیا ہے۔ ادھر ایسا ہی عمل قرن ہا قرن، قدیم ترین زمانوں سے برابر جاری رہا ہے اور نسلی، تہذیبی، تمدنی ہیئتِ ترکیبی نے ویسی ہی مخلوط شکل اختیار کی ہے جس کا نقشہ دوسرے حصے میں نظر آتا ہے۔

ان دونوں علاقوں کے قدیم تاریخی رشتوں کی کہانی کتنی ہی نامکمل سہی لیکن جب اسلامی تہذیب و تمدن کا آفتاب طلوع ہوا تو اسلامی معاشرے نے باہمی رشتہ کو اور بھی مستحکم کر دیا۔ دونوں خطوں کے ہر ہر حصے کی بنیادی زبان کسی نہ کسی صورت میں کوئی نہ کوئی پرانی دیسی بولی ہی قرار پاتی ہے یا پراکرت۔ اور اس پر حاشیہ آرائی دوسری زبانوں کی ہے۔ پھر اسلامی زبانیں تو ظاہر سے لیکر باطن تک اس طرح سرایت کر گئی ہیں کہ سب زبانوں میں ایک ہی خاندان کے اراکین کی سی مشابہت محسوس ہوتی ہے۔

زندگی اور تہذیب کا رچاؤ بھی کچھ ایسا ہی نظر آتا ہے۔ چنانچہ زندگی کا مادی پہلو ہو یا روحانی، دونوں کے اوضاع و اطوار تقریباً یکساں ہیں۔ یہ ہم آہنگی موجودہ سیاسی وحدت سے کہیں زیادہ قدیم اور بنیادی ہے اور یہی بات غیر معمولی دوری کے باوجود بالآخر ان کے سیاسی ربط باہمی کی محرک اور سبب ثابت ہوئی۔ اور جو عناصر حقیقتاً اجنبی تھے وہ فوراً مسترد ہو گئے۔

پاکستان ایک زراعتی ملک ہے۔ یہاں کے آٹھ کروڑ باشندوں کے معاشرتی رشتے لہلہاتے ہوئے کھیتوں ہی سے وابستہ ہیں۔ یہاں کے تقریباً نوّے فیصدی عوام انہی کھیتوں کے درمیان سانس لیتے ہیں۔ شہروں سے کوسوں دور وہ اَن گنت گاؤں میں آباد ہیں۔ یہ معصوم، سیدھے سادے، پُرامن پاکستانی کسان خواہ وہ مشرقی پاکستان کے رہنے والے ہوں یا مغربی پاکستان کے، جس طرح رشتہ تلی میں تسبیح کے دانوں کے مانند منسلک ہیں اسی طرح اُن کی دیہی زندگی کے صبح و شام اور ماہ و سال لہلہاتے ہوئے کھیتوں کے درمیان بڑی ہی رومانی فضا میں گذرتے ہیں۔ سدا بہار ہریالی سے گھری ہوئی جھونپڑیاں، مٹی کے کچے پکے گھر اور زمین سے لے کر آسمان تک ان کی کڑی محنت سے حاصل کی ہوئی ہر دم جھومتی مسکراتی ہوئی فصلوں کا لامتناہی سلسلہ دیکھ کر کتنی مسرت اور طمانیت محسوس ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ تو کسی محنت کش کسان کے سیدھے سادے حقیقی دکھ سکھ سے بھرے گیتوں ہی سے ہو سکتا ہے۔ یہ گیت خوبصورت اور آزاد فضاؤں میں جنم لیتے ہیں اور جہاں یہ فصلوں اور دلکش ماحول کی تصویر پیش کرتے ہیں وہاں کروڑوں غریب کسانوں کی معاشرت اور تمدن کی سچی کہانیاں بھی سناتے ہیں۔ جہاں مشرقی پاکستان کے کسان اپریل کی جھلسا دینے والی دھوپ میں پسینے سے تر اور اپنے کام میں مصروف

نظر آتے ہیں۔ اُسی طرح وہ چھپروں اور کیکر کے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں زندگی کے تڑپا دینے والے گیت بھی گاتے ہیں۔ دور دراز پھیلے ہوئے دھان اور پٹ سن کے کھیتوں کے درمیان ان کی ترنم آواز بدمست فضاؤں میں نغمے بکھیرتی ہوئی گونج گونج اٹھتی ہے :-

میرے سنہری پاکستان !
میرے مشرقی پاکستان !
جس کے ہرے بھرے کھیتوں میں
نیلی نیلی پیلی پیلی دھان کی بالیاں لہراتی ہیں
لہراتی ہیں بل کھاتی ہیں

بنوں میں، پیڑوں کے سائے میں
بھائیوں، بہنوں، ماؤں کے پیار
اور الفت سے رسی بسی
جھونپڑیاں ہی جھونپڑیاں
دور دور تک بسی ہوئی
جیسے جنت ہٹی کی !

ایسے ہی جب مغربی پاکستان کے لاکھوں کسان اپنی گیہوں کی لہلہاتی ہوئی فصلوں کو دیکھ کر فرطِ مسرت سے جھوم جھوم کر غیر فانی گیت گاتے ہیں تو جیسے خوبصورت فضاؤں کے درمیان ان کی جی دار، پُرسوز اور نہایت دلکش صدائیں دونوں بازوؤں کے رشتہ باہمی کی استواری کا اعلان کرتی ہوئی سنائی دیتی ہیں :-

کنکاں دیاں فصلاں پکیاں نی   پکوان پکاندیاں جٹیاں نی
جٹ پیلی وے وچ گجدا اے

(گندم کی فصلیں پک گئی ہیں۔ جاٹنیاں پکوان پکاتی ہیں۔ کھیتوں میں جاٹ تڑا گرجتا ہے .....)

اور اب جبکہ غیر عناصر کا جغرافی، سیاسی و تہذیبی پیوند کٹ کر دونوں علاقے قریب تر آگئے ہیں اور ان میں ربط و اختلاط روز افزوں شدت سے رو پذیر ہو رہا ہے، ان کی ظاہری و باطنی ہم آہنگی اور بھی نمایاں ہوتی جاتی ہے اور اس کا ہر ہر پہلو اپنے اندر ایک مستقل دعوتِ نظارہ لئے ہوئے ہے ؛

"سندھ کا فن تعمیر" : ——— بقیہ صفحہ : (۶۱)

کے لئے بڑے کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں یہ شخص جس کا نام شاہ بہار دیا شاہ بہارا تھا، نور محمد کلہوڑہ کی فوجوں کا سپہ سالار تھا۔ رفاہ عام کے کاموں کا اسے بہت شوق تھا۔ چنانچہ اس نے کئی نہریں، کنوئیں اور سڑکیں بنائیں اور چند قلعے بھی تعمیر کئے۔ یہ شخص ۱۱۴۸ھ میں فوت ہوا اور رلاڑکانہ میں ایک باغ میں مدفون ہوا۔ اس مقبرے کی انفرادی خصوصیت وہ خشتی دروازہ ہے جس پر نہایت چابکدستی اور مہارت سے نقش و نگار کندہ ہیں۔ گنبد پر ایک مرصع چینی رکھی ہے جو اس کی خوبصورتی کو دوبالا کرتی ہے۔ یہ دروازہ لکڑی کے کام کی صنعت کا نفیس نادر نمونہ ہے جو بیجاپوری لکڑی کے کام کی یاد دلاتا ہے۔ عمارت کے اندرونی حصے میں ٹائلوں سے مرتب کئے ہوئے چند کتبے ہیں جو فارسی میں ہیں۔

یہ ہے ان چند مقبروں کا ذکر جو کلہوڑہ خاندان کے افراد نے اپنے لئے یا اپنے آباؤ اجداد کے لئے تعمیر کرائے تاکہ وہ ان شاندار عمارتوں میں آرام سے ابدی نیند سو سکیں یہ عمارتیں کسی زمانے میں بڑی شاندار اور بارونق ہوں گی لیکن اب دستبرد زمانہ سے خراب و برباد ہو رہی ہیں --- اس خرابی کے باوجود دیکھنے والے کو ان کی عظمت رفتہ کا احساس بڑی شدت سے ہوتا ہے۔ ؎

از نقش و نگارِ در و دیوار شکستہ
آثار پدید است صنادید عجم را

——— اگرچہ سندھ کی مناسبت سے انہیں صنادید سلف کہنا ہی مناسب ہے ؛



سندھ کا فن تعمیر

(مقابر: خاندان کلہوڑہ)

احمد نبی خاں

ریگزار سندھ مقابر و مزارات کی سرزمین ہے جہاں قدم قدم پر منقش پتھروں اور خوبصورت رنگین ٹائلوں سے مزین وسیع و بلند مزارات ملتے ہیں اور یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ مشرق کے دوسرے حصوں کے حکمرانوں کے عام رجحان کے بالکل برعکس جنہوں نے اپنی قابلیت اور اپنی دولت خوبصورت مساجد یا شاندار محلات کی تعمیر پر صرف کی، سندھ کے حکمرانوں نے خاص طور پر حیات بعد ممات کے استقرار ابدی کو پیش نظر رکھا چنانچہ سندھ کے حکمرانوں کی بنوائی ہوئی عمارات بیشتر مزارات و مقابر پر مشتمل ہیں۔ یہ لوگ اس قسم کی عمارتیں بنانے کے اسقدر شائق تھے کہ اپنے زمانۂ حیات ہی میں بڑی پُرشکوہ اور مکلف عمارتیں بنواتے اور وصیت کرتے کہ مرنے کے بعد ان کو ان عمارات میں دفن کیا جائے جہاں وہ آرام کی ابدی نیند سوسکیں ٹھٹھہ جس کو نیکروپولس (NECROPOLIS) بھی کہا جاتا ہے اس قسم کے خوبصورت اور مزین مقابر کی بہترین مثال ہے لیکن اس کے علاوہ حیدرآباد، سکھر، روہڑی، حیدرآباد جیسے مقامات میں بھی کلہوڑہ اور تالپور خاندان کے حکمرانوں کے بنوائے ہوئے نفیس اور شاندار مقابر و مزارات آج بھی توجہ و حیرت کا مرکز ہیں۔

یہاں ہمیں کلہوڑہ خاندان کے مقابر و مزارات کا جائزہ لینا ہے۔ اس خاندان نے سندھ کے کچھ حصوں پر تقریباً سو سال تک حکومت کی۔ یہ لوگ جیسا کہ مختلف روایات سے پتہ چلتا ہے اپنا شجرۂ نسب حضرت عباسؓ سے جو حضور سرور کائناتؐ کے چچا تھے، ملاتے ہیں۔ معلوم نہیں سندھ میں یہ خاندان کب اور کیسے آکر آباد ہوا بہرحال یہ یقینی ہے کہ ابتدا میں یہ لوگ فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے یا کچھ لوگ کاشتکاری کرتے تھے۔ ان کا مورث اعلیٰ محمد نامی ایک شخص تھا جس کے نام کے علاوہ ساری تفصیلات مفقود ہیں۔ کافی عرصے کے بعد اس سلسلہ کے ایک اور بزرگ کا پتہ چلتا ہے جن کا نام عادل شاہ تھا یہی اس خاندان کے جدامجد کہے جاتے ہیں۔ یہ ایک صاحب کرامات خدا رسیدہ بزرگ تھے جن کے معتقد بہت سے لوگ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ وہ ملتان گئے جہاں کے لوگوں نے بڑے احترام و عقیدت کا ثبوت دیا اور کثیر تعداد میں ان کے مرید ہو گئے۔ ملتان کے حاکم کو ان کی یہ مقبولیت ناگوار گزری، اسے خیال ہوا کہ کہیں اس کی حکومت خطرے میں نہ آجائے۔ چنانچہ اس نے ان کو گرفتار کرکے قتل کرا دیا۔ یہ واقعہ سولہویں صدی کے وسط کا ہے۔ بہرحال ان کی میت کو سندھ لایا گیا اور ان کی وصیت کے مطابق انہیں سکھر میں ایک پہاڑی کے پُرفضا ماحول میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ آج بھی ان کا سادہ مگر پرشکوہ مقبرہ مرجع خلائق ہے۔

اس عہد میں یہ لوگ یا تو کاشتکاری کرتے تھے یا پھر پیری مریدی۔ لیکن رفتہ رفتہ موخرالذکر گروہ نے اہمیت اور طاقت حاصل کرنا شروع کی حتیٰ کہ شاہی حکمرانوں سے مستقل جھڑپیں ہونے لگیں۔ ۱۶۹۶ء میں اس خاندان کے ایک فرد میاں نصیر محمد نے جو ان بزرگ شہید کا جانشین تھا، باقاعدہ شہر کی بنیاد رکھی یہ نیا شہر کھاری کے نام سے مشہور ہوا جو نصیر محمد کا صدر مقام یا مرکز تھا۔ میاں نصیر محمد کے بعد اس کا لڑکا میاں دین محمد اس کا جانشین ہوا جس کی وفات ۱۷۱۸ء کی بات ہے۔ اس کا مقبرہ دادو کے قریب خدا آباد میں ہے۔

کلہوڑہ خاندان کی سیاسی اہمیت نور محمد کے عہد سے شروع ہوتی ہے۔ یہ دین محمد کا لڑکا تھا اس کو امور سلطنت طے کرنے میں خداداد ملکہ تھا۔ اس نے خدا یار خاں کا لقب اختیار کیا اور اطراف و جوانب کے علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرکے وسیع کرلیا۔ اس وقت تک کلہوڑہ خاندان کی توجہ سندھ کے بالائی علاقے پر مرکوز تھی لیکن ۱۷۳۶ء میں اس نے سہوان اور بھکر پر بھی قبضہ کرلیا۔ اس عہد میں اس کی اہمیت اتنی ہوگئی کہ سلطنت دہلی نے ان لوگوں کی حکمرانی کو تسلیم کرلیا۔

میاں نور محمد کے عہد میں نادر شاہ نے برعظیم پر حملہ کیا۔ نور محمد اس کے حملے کی تاب نہیں رکھتا تھا چنانچہ جب اسے معلوم ہوا کہ نادر شاہ سندھ کی طرف بھی آنے کا منصوبہ بنا رہا ہے تو اس نے فوراً ایک سفارت روانہ کی تاکہ دوستی و یگانگت پیدا کی جائے۔ لیکن نور محمد کی یہ ترکیب

کامیاب نہ ہوسکی اور وہ مجبوراً اپنے لڑکے کو ساتھ لیکر امرکوٹ کے قلعہ میں جاچھپا۔ خیال تھا کہ نادرشاہ اس دور دراز اور دشوارگزار مقام تک نہیں پہنچ سکے گا لیکن اس کا یہ گمان بھی غلط نکلا اور نادرشاہ نے قلعہ پر حملہ کرکے نور محمد اور اس کے لواحقین کو گرفتار کرلیا۔ بعد میں ایک معاہدہ ہوا جس کے ذریعہ نور محمد کو دوبارہ سندھ کا حکمراں مقرر کیا گیا، نور محمد نے ایک مقررہ رقم سالانہ کابل بھیجنے کا وعدہ کیا۔ لیکن نادرشاہ احتیاط کے طور پر اس کے دو لڑکوں غلام شاہ اور محمد مرادیاب کو یرغمال کے طور پر اپنے ساتھ کابل لے گیا۔ ۱۷۴۹ء میں یہ دونوں لڑکے واپس سندھ پہنچے۔

۱۷۵۵ء میں نور محمد کا انتقال ہوگیا اور محمد مرادیاب جانشین ہوا۔ امور سلطنت کے نظم و نسق میں اسے خداداد ملکہ تھا اور وہ بڑا انصاف پسند حکمراں تھا۔ اسی وجہ سے عوام میں بہت مقبول تھا۔ اس نے نصرپور کے قریب ایک شہر آباد کیا جس کا نام مرادآباد رکھا لیکن کچھ عرصے کے بعد اس کے درباری اس کی سخت گیری سے تنگ آگئے اور انہوں نے سازش کرکے اسے تخت سے علیحدہ کردیا۔ اسی وقت نور محمد کے لڑکوں میں تخت گیری کے لئے کشمکش اور خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ اس جدوجہد میں غلام شاہ کو کامیابی ہوئی اور وہ ۱۷۵۸ء میں گدی نشین ہوگیا۔ غلام شاہ نے نیرون کوٹ میں ایک قلعہ تعمیر کیا اور ۱۷۶۸ء میں ایک اور شہر آباد کیا جس کا نام حیدرآباد رکھا۔ ۱۷۷۲ء میں غلام شاہ فوت ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ نور محمد کا یہ لڑکا ایک مغنیہ کے بطن سے تھا جس کے حق میں سندھ کے معروف صوفی شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے دعا فرمائی تھی۔ یہ بالکل ان پڑھ تھا لیکن کاروبار سلطنت طے کرنے میں اسے بڑی مہارت تھی۔ حیدرآباد میں وہ ایک شاندار مقبرے میں دفن ہوا۔

نور محمد اور اس کے بعد غلام شاہ کا دور کلہوڑہ خاندان کی حکومت کا زریں دور ہے۔ غلام شاہ کی وفات کے بعد اس کا لڑکا سرفراز خاں وارث سلطنت ہوا۔ اسی عہد سے اس خاندان کا زوال شروع ہوتا ہے۔ میاں سرفراز خاں کے دور حکومت میں ڈیرہ غازی خاں اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں بھی سندھ کے علاقے میں شامل ہوئے۔ اس زمانے میں تالپور خاندان کے افراد کو سیاسی طور پر ابھرنے اور ترقی کرنیکا موقعہ ملا۔ ابتدا میں میاں سرفراز خاں کے تعلقات اس خاندان سے بہت اچھے تھے لیکن ایک ہندو امیر کے ورغلانے پر ۱۷۷۴ء میں اس نے اس خاندان کے چند افراد میر بہرام اور اس کے لڑکے میر صوبدار کو قتل کرادیا۔ میر صوبدار کے چار لڑکے تھے فتح علی خاں، غلام علی خاں، کرم علی خان اور مراد علی خان۔

باپ اور دادا کے قتل کے بعد میر فتح علی خان نے بلوچیوں کی ایک جمعیت اکٹھی کی اور سرفراز خاں کے خلاف خداآباد کے قلعہ پر حملہ کردیا۔ سرفراز خاں اس حملے کی تاب نہ لاسکا اور مجبور ہوکر حیدرآباد بھاگ گیا۔ یہاں اسے گدی سے دستبردار ہونے پر مجبور کیا گیا۔ اسی دوران میں میاں غلام نبی نے تخت پر قبضہ کرلیا۔ لیکن چندہی دنوں بعد وہ بھی ہلاک کردیا گیا۔ اس قتل کے بعد غلام نبی کے بھائی میاں عبدالنبی اور خاندان کے دوسرے افراد میں تخت کے لئے خانہ جنگی شروع ہوگئی اور حالات بہت زیادہ دگرگوں ہوگئے۔ اس وقت میر بہرام کے دوسرے لڑکے میر بجار نے مداخلت کی اور میاں عبدالنبی کو حکمراں مقرر کردیا اور خود وزیر سلطنت بنا۔ اس افراتفری میں خزانہ بالکل خالی ہوچکا تھا اور کابل کو خراج نہیں بھیجا جاسکا تھا۔ چنانچہ ۱۷۸۱ء میں افغان بادشاہ نے سندھ کی طرف توجہ کی اور اپنے سپہ سالار عزت خاں کو گورنر سندھ بنا کر بھیجا۔ میر بجار نے اس کو شکارپور کے قریب شکست دے کر بھگا دیا اس پر بادشاہ خود سندھ روانہ ہوا اس وقت میر بجار کی فراست کام آئی اور بادشاہ مطمئن ہوکر لوٹ گیا لیکن احسان ناشناس عبدالنبی خاں نے امراء کے ورغلانے پر اپنے محسن میر بجار کو قتل کرادیا اور خود انتقام کے خوف سے بھاگ کھڑا ہوا۔

اس واقعہ کے بعد کلہوڑہ خاندان کی حکومت کا تقریباً خاتمہ ہوجاتا ہے۔ اگرچہ بعد میں سرفراز خاں نے مختلف قبائلی سرداروں کی مدد سے تخت حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ اور بالآخر اسی جدوجہد میں اسے قتل کردیا گیا۔ اور زمام سلطنت تالپور خاندان کے ہاتھ میں آگئی۔

اس طرح اس خاندان نے سندھ کی اس سرزمین پر تقریباً ایک صدی تک حکومت کی ان کے ابتدائی عہد میں سندھ خوشحالی اور امن و امان کی زندگی بسر کرتا رہا لیکن آخر میں جب سیاسی چپقلش اور تخت و تاج کے لئے ہنگامے شروع ہوئے تو بدامنی اور بے اطمینانی کی لہر دوڑ گئی۔ بہر حال اس خاندان کے کارناموں میں زندۂ جاوید ان کے وہ مقابر ہیں جنکو انہوں نے بڑے اہتمام سے بنوایا تھا۔ یہ شاندار مقابر حیدر آباد۔ خدا آباد اور سکھر میں ہیں کہ ان تاجداروں نے انہیں مقامات کو اپنی آخری آرام گاہ کے لئے منتخب کیا تھا۔ ان مقابر میں قدیم ترین اس خاندان کے جدامجد عادل شاہ کا مقبرہ ہے جو سکھر میں ایک پہاڑی پر بنا ہوا ہے۔ تعمیراتی نقطۂ نگاہ سے اس کی اتنی اہمیت نہیں کیونکہ یہ ایک سادہ سی عمارت ہے جس کی دیواروں پر باہر سے سادہ پلاسٹر کر دیا گیا ہے اور بعض جگہ معمولی قسم کی ٹائلیں لگا دی ہیں، جن پر کہیں کہیں ارغوانی رنگ کے بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں لیکن تاریخی اعتبار سے یہ مقبرہ خاصا اہم ہے کہ اس خاندان کے جدامجد کا مزار ہے۔

مقابر کے اس سلسلے میں غلام شاہ کلہوڑہ کا مقبرہ خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ یہ حیدر آباد میں ہے اور ایک شاندار وسیع مربع عمارت ہے جو ایک چبوترے پر بنائی گئی ہے اس کی دیواریں باہر سے سرتا پا رنگین ٹائلوں سے مزین ہیں جن پر گلکاری اور رنگ برنگ کے ڈیزائن بنے ہیں۔ ان ٹائلوں کا بیشتر حصہ اب گر چکا ہے اور گنبد بھی گر چکا ہے۔ اس شکست و ریخت سے عمارت کے اندر سنگِ مرمر کی بنی ہوئی قبر کو بھی نقصان پہنچا ہے جو کئی جگہ سے ٹوٹ گئی ہے۔ اس کی خوبصورت جالی (RAILING) تو ختم ہی ہو چکی ہے اس کے علاوہ مرصع عمودی ستون (PANELS) جو اس عمارت میں نصب تھے، ان کو بھی نقصان پہنچا ہے۔

اس عمارت کا اندرونی حصہ، دیواریں، چھت اور گنبد بڑے مفصل انداز میں مختلف طریقوں سے مزین کئے گئے ہیں بعض جگہ سنہری کام بھی ہے۔ رنگین گلیز ٹائلوں کی ایک مسلسل قطار چاروں طرف دیواروں میں لگائی گئی ہے۔ محرابوں اور پیشانی پر فارسی میں لکھے ہوئے کئی کتبے ہیں جن کو اسی طرح مختلف انداز میں مرتب کیا گیا ہے کہ بڑے دیدہ زیب معلوم ہوتے ہیں۔ ایک محراب میں فارسی کا ایک کتبہ غلام شاہ کے سب سے بڑے لڑکے سرفراز خاں کلہوڑہ نے یہاں نصب کرایا تھا۔

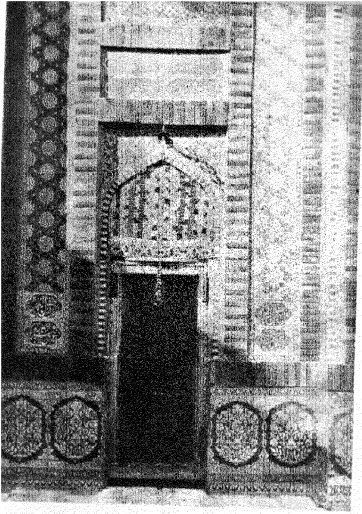
اس عمارت کی دیوار کے اندر ہی اندر ایک زینہ اوپر جاتا ہے جو گنبد کے چاروں طرف چھت پر جانے کے لئے ہے چبوترہ کے چاروں طرف، جس پر یہ عمارت بنی ہے، ایک جنگلہ ہے جو پتھر کی پتلی پتلی سلوں سے بنایا گیا ہے۔ اس جنگلے میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پہ منقش ستون ہیں جو بڑی خوبصورتی سے نصب کئے گئے ہیں، ان پر خوبصورت نقش و نگار کندہ ہیں، خاص طور سے چاروں کونوں پر جو بڑے بڑے ستون ہیں ان کا کام بڑا دیدہ زیب ہے اور ایسا نفیس کہ دیکھنے والے کو فتح پور سیکری کا کارنامہ یاد آ جائے۔ اسی قسم کا کام ٹھٹھہ میں عیسیٰ خان ترخان کے مقبرے میں بھی ملتا ہے۔ یہ پوری عمارت مٹی کی ایک بھدی سی دیوار سے محیط ہے۔

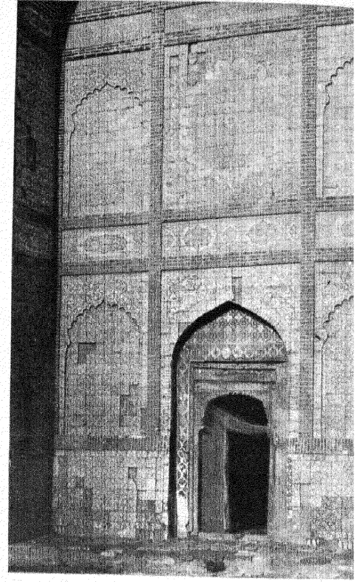
غلام شاہ کے مقبرے سے تھوڑے فاصلے پر اس کے بھائی نبی خاں کا مقبرہ ہے جس نے سرفراز خاں کے صدر مقام سے بھاگ کر گدی پر قبضہ کر لیا تھا۔ "سندھ گزیٹیر" کا مؤلف اس مقبرے کو سرفراز خاں کا مقبرہ بتاتا ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ بہر حال یہ مقبرہ بھی غلام شاہ کے مقبرے کی طرح مزین ہے اور کافی وسیع عمارت ہے جہاں تک اس کے تعمیراتی پہلو کا تعلق ہے یہ مذکورہ بالا مقبرے سے صرف اس قدر مختلف ہے کہ یہ مربع کی بجائے ہشت پہلو ہے۔ لیکن اندر سے اس کی شکل بھی مربع ہے۔

اس گروپ کا تیسرا مقبرہ سرفراز خاں کا ہے جو ایک پہاڑی کے دامن میں ہے۔ اس مقبرے کی اب بھی مرمت ہوتی رہتی ہے، اس لئے اچھی حالت میں ہے۔ سرفراز خاں کو اہل سندھ روحانی رہنما" اور شہید مانتے ہیں اور بڑی عقیدت و احترام سے اس کے مقبرے کی حفاظت کرتے ہیں۔ ان عمارات میں ایک شان و شکوہ اور ہیبت و جلال ہے جو تالپور عہد کی عمارتوں میں نہیں ملتا۔

ان مقابر کے علاوہ دو مقبرے خدا آباد میں ہیں، یہ مقام بھی کچھ عرصے کے لئے کلہوڑہ خاندان کا صدر مقام رہا ہے۔ خاص طور سے میاں نور محمد یہاں کافی عرصے تک مقیم رہا۔ یہاں ایک جامع مسجد ہے جو سندھ میں مسلم طرز تعمیر کا نادر نمونہ ہے۔ اس مسجد سے تھوڑے فاصلے پر جنوب کی جانب اس خاندان کے حکمراں یار محمد کا شاندار مقبرہ ہے۔ یہ ایک اونچی پرشکوہ مربع عمارت ہے جس کا سامنے کا حصہ خوبصورت ٹائلوں سے مزین ہے۔ اس کے علاوہ تینوں

سندھ کا فن تعمیر (مقبرے)

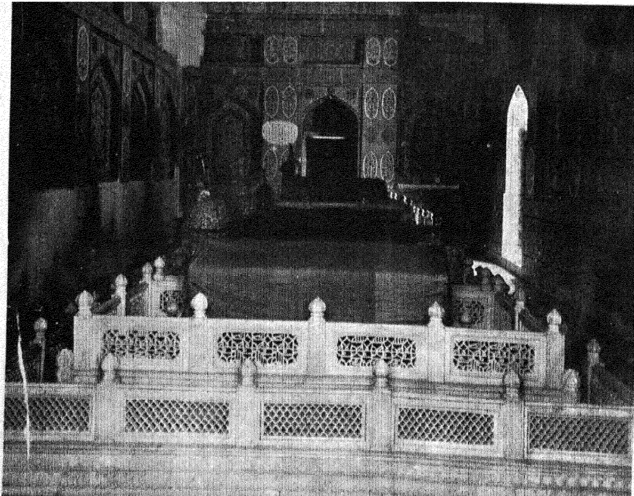




۱ : مقبرہ شاہ خیرالدین رح (پرانا سکھر)

۲ : مقبرہ یار محمد خاں کلہوڑہ (خداداد ، ضلع دادو)

۳ : میران تالپور کے مقابر (حیدرآباد)

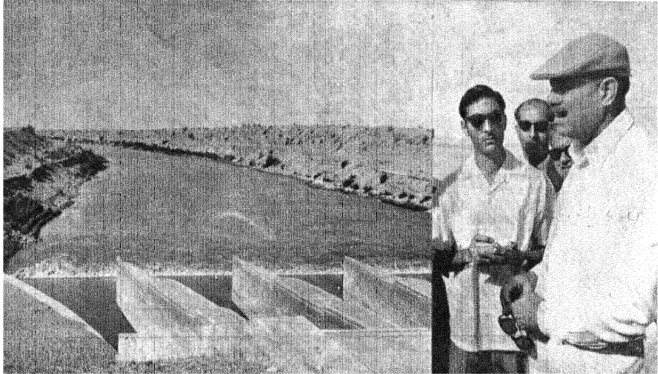


رفتار ترقی



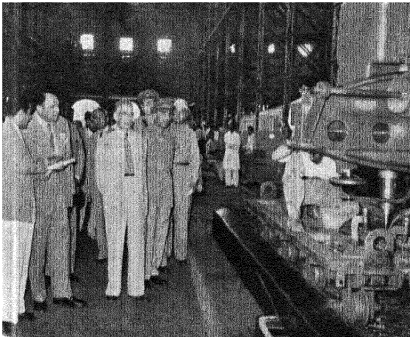
جنرل محمد ایوب خاں کی خدمت میں
ساختہء پاکستان ٹیلیفون کی پیشکش
ٹیلیفون فیکٹری، (ہزارہ)

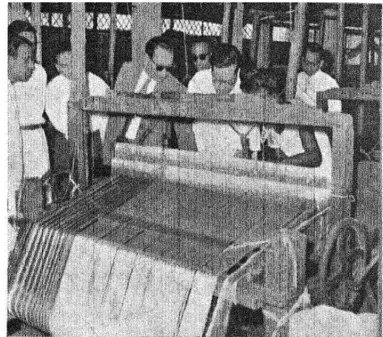
"نئی باراں دریا "کے سلسلہء
آب رسانی کا معائنہ



وزیر صنعت، جناب ابوالقاسم خاں، کپڑے کے
ایک کارخانے میں (میمن سنگھ، مشرق پاکستان)

مغل پورہ ریلوے ورکشاپ لاہور میں مشینی کام





اطراف کی دیواروں میں اوپر کی طرف بڑی بڑی محراب دار کھڑکیاں ہیں۔ ان میں پکی ہوئی مٹی کی خوبصورت جالیاں لگی ہیں۔ یہ جالیاں کافی روشن ہیں، جن سے گنبد کے گرد گیلری میں روشنی چھن چھن کر جاتی ہے۔ اسی قسم کی کھڑکیاں سامنے کی طرف بھی ہیں جو بڑے دروازے کے اوپر ہیں۔ ان میں گلیز ٹائلوں کی جالیاں لگی ہیں۔ سامنے کا دروازہ بڑی نفاست سے سجایا گیا ہے اور خوبصورت ٹائلوں کے بڑے بڑے پینل لگائے گئے ہیں۔
دس فٹ مربع جگہ میں تقریباً ۲۴ مربع شکل کی ٹائلیں جڑی ہیں۔ جن پر نقش ونگار اور بیل بوٹے بنے ہیں۔ ان بڑے بڑے پینل کے بنانے کا طریقہ یہ تھا کہ مقررہ جگہ میں سادہ ٹائلیں جما دیتے تھے اور پھر ان پر نقش ونگار بناتے تھے۔ بعد میں ان کو اس جگہ سے علیحدہ کر کے بھٹی میں پکاتے تھے تاکہ ان کے رنگ و روغن پختہ ہو جائیں۔ اس اہتمام کے بعد یہ ٹائلیں دوبارہ اپنی جگہ پر جما دی جاتی تھیں۔ اس طرح ان بڑے بڑے پینل پر اس قدر میناکاری کی جاتی تھی جو دیکھنے میں پوری ایک ٹائل معلوم ہوتی تھی۔ بڑی بڑی محرابوں اور دوسرے پر پیچ مقامات کے لئے بھی اسی انداز میں ٹائلیں بنائی جاتی تھیں۔ اس مقبرے میں یہ کام اتنی مہارت اور چابکدستی سے کیا گیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔
یہ وہی یار محمد ہے جو کافی عرصے تک شمالی سندھ اور بلوچستان میں مارا مارا پھرنے کے بعد خدا آباد میں مقیم ہوا۔ اسی نے اس جگہ کو یہ نام دیا۔ اس کی وفات سنہ ۱۱۳۱ھ کا واقعہ ہے۔

خدا آباد سے اٹھارہ میل دور ایک اور جگہ ہے جس کو دولت آباد کہتے ہیں اس مقام کے شمال مشرق میں سات میل کے فاصلے پر ایک اور اہم مقبرہ ہے جس میں یار محمد کا لڑکا نور محمد محو خواب ہے۔ اس مقبرے کا نقشہ بعینہ یار محمد کے مقبرے کی طرح ہے۔ یہ بھی بہت وسیع اور شاندار عمارت ہے لیکن قبل الذکر مقبرے کی طرح آراستہ و پیراستہ نہیں۔ اس مقبرے کے گنبد پر ایک چمنی (LANTERN) بھی لگائی گئی ہے۔ جو اس کی انفرادیت کو واضح کرتی ہے۔ اس مقام پر اور بھی کئی چھوٹے چھوٹے مقبرے ہیں۔
یہاں ایک اہم مقبرے کا ذکر اور باقی ہے جو کلہوڑہ حکمرانوں میں سے کسی کا تو نہیں لیکن ایک ایسے شخص کا ہے جس نے اس خاندان کی بقا و استحکام

(باقی ص۵۷ پر)



"مثنویات ہیر و رانجھا": ——— بقیہ صفحہ: (۳۵)

تو اس داستان کے فارسی مظاہر کی مجموعی کیفیت کا بہتر اندازہ کیا جا سکے گا اور جامع تقابلی مطالعہ کا امکان بھی ہوگا۔
ان مثنویات میں چند خصوصیتیں مشترک ہیں۔ ان کا سلسلہ نظامی، امیر خسرو اور جامی ہی کا سلسلہ ہے۔ چنانچہ بعض میں نظامی کی طرح بار بار ساقی کو یاد کیا گیا ہے۔ اکثر مثنویاں کسی راوی کے بیان پر مبنی ہیں اور فرمائش پر لکھی گئی ہیں۔ ان میں مقامی الفاظ بے تکلفی سے کھپائے گئے ہیں اور اسی بنا پر زبان و بیان میں بھی دانستہ یا نادانستہ کچھ بے تکلفیاں برتی گئی ہیں۔ یہ باتیں ان میں مقامی رنگ پیدا کرنے کے لئے ضروری تھیں اور یہی انہیں کلاسیکل ایرانی شاعری سے الگ حیثیت عطا کرتی ہیں۔ یہ ایران کے مقابلے میں برصغیر خصوصاً مغربی پاکستان کا فارسی زبان و ادب کو ایک غیر فانی فیضان ہے اور ہمارے ثقافتی ورثہ میں قابل قدر حیثیت رکھتا ہے۔

ان مثنویات اور وارث شاہ کی ہیر رانجھا میں ہر اعتبار سے زمین آسمان کا فرق ہے۔ اور یہی فرق خود پنجابی "ہیروں" میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ وارث شاہ نے اپنے مزاج، ذوق، ولولہ و آہنگ، زور طبع، ہنگامہ آرائی، ہر فن مولا شخصیت، تبحر علمی، مشاہدہ و تخیل، زندگی کی عکاسی، جزئیات نگاری، کردار آفرینی، حاشیہ آرائی، دانش و حکمت، واقعیت و تمثیلیت، سہتی مراد کے قصہ نے زیادہ بسیط اور زوردار اضافہ وغیرہ سے کچھ اور ہی عالم پیدا کر دیا ہے۔ ہیر رانجھا کے دوسرے تمام قصے ایک طرف اور وارث شاہ کا قصہ دوسری طرف۔ اور اس کے فرق باہمی کی توضیح و تشریح کا حق علیحدہ مطالعہ ہی سے ادا کیا جا سکتا ہے۔

کلری جھیل

اقبال حامد

غیر ملکی کرنسی کی قدر و منزلت کے اس دور میں سیاحتی مقامات کی اہمیت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ ان کا برآمد ہونے والے خام مال اور صنعتی پیداوار کا سا تحفظ ضروری ہو گیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کبھی کبھی خام مال برآمد کرنے والے ممالک تو زرِ مبادلہ کی کمی کا شکار ہو جاتے ہیں لیکن جو ممالک سیاحتی اور تفریحی مقامات کے مالک ہیں ان میں دنیا کے خوشحال اور آزاد ملکوں کے سکوں کی آمد کبھی بند نہیں ہوتی۔ آسٹریا اور سوئٹزرلینڈ اس ضمن میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جن کا محلِ وقوع، آب و ہوا، قدرتی دلکشی و رعنائی اور سیاحوں کے آرام و آسائش کے لئے فراہم کردہ انتظامات دنیا کے ہر کونے سے فرحت کے متوالوں کو کھینچ لاتے ہیں جس کی وجہ سے ان دو ممالک کے قومی خزانوں میں زرِ مبادلہ کی بہتات رہتی ہے۔

"پاکستان میں معلوم کتنے آسٹریا اور سوئٹزرلینڈ بکھرے پڑے ہیں" یہ الفاظ کسی محب وطن پاکستانی کے نہیں بلکہ آسٹریا کے ایک نوجوان صحافی کے ہیں جو عالمی سیاحت کے لئے اس واسطے نکلا تھا کہ ساری دنیا میں اپنے ملک کے برف پوش پہاڑوں اور سرسبز و شاداب وادیوں کا پروپیگنڈہ کرے اور ساتھ ہی یہ بھی دیکھے کہ دنیا کے ممالک اپنے صحت بخش و تفریحی حصّوں سے کس طرح فائدے اٹھا رہے ہیں۔ یہ نوجوان سیاح ویانا یونیورسٹی میں جرنلزم کا طالب علم تھا اور اس کے پاس آسٹریا کے تمام کوہستانوں، گلستانوں، وادیوں اور دنیوی حسن سے مالا مال شہروں کے رنگین سینما سلائڈ تھے جن کو وہ ہر شہر خاص کر ہر شہر کے تعلیمی اداروں میں دکھاتا۔ اس کے ساتھ ہی یہ نوجوان صحافی ان ممالک اور ان کے دلآویز مناظر دکھاتا تھا جہاں سے وہ ہو کر آ رہا تھا۔ تاریکی میں مشین چلتی رہتی، دیکھنے والوں کی نگاہیں پردے پر ہوتیں اور ہر سلائڈ کی تشریح یہ سیاح صحافی زبانی کرتا جاتا تھا۔ جب وہ سلائڈوں کے ذریعہ شاہدین کو سیر کراتا ہوا کاغان اور چترال لایا تو بول پڑا کہ ان علاقوں کے قدرتی مناظر بالکل آسٹریا جیسے ہیں اور ان کے سلائڈ بناتے وقت مجھ کو یہی محسوس ہوا کہ خود اپنے وطن کی رعنائیوں کا عکس لے رہا ہوں۔"

یہ نوجوان صحافی خاران، بسبیلہ، نتھیا گلی، ایبٹ آباد، مری، ہڑپہ، موہن جو دڑو، زیارت اور ٹھٹھہ، ہر اس جگہ گیا جس کی تاریخی، ثقافتی، سیاحتی یا آثار قدیمہ ہونے کی وجہ سے اہمیت ہے اور اس نے یہ تسلیم کیا کہ پاکستان سیاحتی نقطۂ نگاہ سے بڑا اہم ملک ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ سیاحوں کی دلچسپی کے تمام مقامات یہاں موجود ہیں۔ مثلاً بعض سیاحوں کی غرض تاریخی مقامات کا مشاہدہ و مطالعہ ہوتی ہے، اس کے لئے پاکستان میں ٹھٹھہ، عمر کوٹ، سیہون، ملتان اور لاہور وغیرہ ہیں۔ آثار قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ٹیکسلا، ہڑپہ اور موہن جو دڑو ہیں۔ پہاڑی مقامات کے شائقین کے لئے مری اور ایبٹ آباد ہیں۔ اور اقوام و ملل کی ثقافت سے شغف رکھنے والوں کے لئے مشرقی و مغربی پاکستان کے دامن معمور ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ گو ہمارا ملک قدرتی مناظر سے مالا مال ہے مگر اس کے سیاحتی مقامات وفاقی دارالحکومت سے سینکڑوں ہزاروں میل دور ملک کے کم ترقی یافتہ حصوں میں واقع ہیں جہاں پہنچنے کے لئے سڑکوں اور ریلوے لائنوں جیسی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے لئے پہاڑوں کو کاٹنا پڑتا ہے گھاٹیاں عبور کرنا پڑ رہی ہیں اور ہر موسم میں استعمال کے لائق پل بنانے پڑتے ہیں۔ یہ کام فوری طور پر تکمیل پذیر نہیں ہو سکتے بالخصوص اس عالم میں جبکہ ملک معاشی پسماندگی بلکہ تباہی سے نکل رہا ہو اور سیمنٹ، فولاد اور مشینری کو آبپاشی و آبادکاری کے کاموں میں استعمال کرنا لازمی ہو۔ لیکن اسی رفتار سے کام ہوتا رہا تو چند برس میں پاکستان کے سیاحتی مقامات کے لئے گذرگاہیں اور اقامت گاہیں مہیا ہو جائیں گی اور سیاح ہر جگہ حسبِ ضرورت قیام کر سکیں گے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ پاکستان کے تمام سیاحتی مقامات فی الوقت محتاجِ انصرام ہیں بلکہ ایسے کئی مقامات وجود میں آ چکے ہیں جو ذرا سی

کوشش سے سیرگاہ خاص و عام بن سکتے ہیں۔ ان میں "کلری جھیل" خاص طور پر قابل ذکر ہے جو ۲۰ دسمبر ۱۹۵۸ء کو نمودار ہوئی ہے۔ اگرچہ اس کو جھیل ہی کہا جاتا ہے لیکن طول و عرض کے اعتبار سے یہ ایک طرح کا رود بار ہے کیونکہ ۵۰ مربع میل پر پھیلی ہوئی ہے اور بیضوی شکل کی اس جھیل کی لمبائی سترہ میل ہے۔ یہ جھیل ضلع ٹھٹہ میں کراچی کے قریب قومی شاہراہ اور مین ریلوے لائن پر وجود میں آئی ہے۔ چنانچہ اندرون ملک سے کراچی کی طرف سفر کرنے والے اور کراچی سے مغربی پاکستان جانے والے عام آدمی تک اپنا سفر چند گھنٹوں کے لئے ملتوی کر کے قدرت کے اس شاہکار سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ قدرت کا شاہکار اس لئے کہ یہ جھیل قدرتی ہے۔ اس کو بنانے کے لئے نہ تو زمین کھودنا پڑی اور نہ کنارے ہی ابھارنے پڑے بلکہ نہ معلوم کتنے قرنوں سے یہ وسیع و عریض گڑھا بالکل خشک صورت میں مادر گیتی کے سینے کے گھاؤ کی حیثیت سے پڑا تھا۔ دراصل جہاں اب کلری جھیل کا پانی چاندی کے پتر کی طرح دمک رہا ہے وہاں سنہری اور کنجر نام کی دو جھیلیں تھیں اور دونوں کے درمیان میلوں کا فاصلہ صدیوں سے کبھی بنجر علاقہ اور کبھی جنگلات کی شکل میں موجود رہا۔ اس کا ثبوت اس علاقہ کی مشہور رومانی داستان "جام تماچی" سے ملتا ہے۔ تاریخ میں بڑے اختصار کے ساتھ درج ہے کہ یہاں جام تماچی نامی ایک حکمراں تھا جس کو سنہری جھیل کے ایک مچھیرے کی لڑکی نوری سے محبت ہو گئی اور اگرچہ ان کی شادی بھی ہوئی مگر خبر نہیں کیا وجہ ہے کہ ان دونوں کی قبریں ایک دوسرے سے دور نظر آتی ہیں۔ ایک جھیل کے اندر نوری کا مزار ہے اور جام کی قبر اس سے بہت دور کنارے پر واقع ہے۔ ان قبروں کے علاوہ جام کے عہد کے محلات بھی ہیں جو اس حکمراں نے اپنی محبوبہ نوری کیلئے تعمیر کرائے تھے۔ اگرچہ تاریخ اپنے دامن میں جام تماچی کے رومان کو چند سطور سے زیادہ جگہ نہ دے سکی مگر سندھ کے صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے اس عشقیہ داستان کو نظم کر کے ان دو محبت کرنے والوں کو غیر فانی بنا دیا ہے اور شاہ کی یہ منظوم داستان آج بھی اس علاقہ کی سہانی راتوں میں کوئی چھیڑ دیتا ہے تو جہاں تک آواز جاتی ہے ہر فرد گوش برآواز ہو جاتا ہے۔

قدیم تاریخی شہر ٹھٹھہ سے بھی بڑی کلری جھیل میں پانی غلام محمد بیراج کے دائیں کنارے کی واحد نہر کلری بگھار فیڈر کے ذریعہ لایا گیا ہے اور بیراج سے جھیل تک اس نہر کا فاصلہ کم و بیش ساٹھ میل ہے۔ چونکہ یہ نہر اور اس کی گذرگاہ خود پاکستانی انجینیروں کا انمٹ کارنامہ ہے اسلئے کلری جھیل کی سیاحتی اور تفریحی اہمیت بتانے سے قبل اس پر مختصراً روشنی ڈالنا دلچسپی کا باعث ہوگا۔

غلام محمد بیراج کے دائیں کنارے سے کلری بگھار کو کلری جھیل تک کھودنا بڑا ہی کٹھن کام تھا کیونکہ اس راہ میں بڑے سنگلاخ قطعے اور بڑی بڑی چٹانیں تک آگئیں جن کو اڑانے کے لئے ہزاروں ٹن ڈائنامائٹ استعمال کرنا پڑا۔ ایک جگہ تو پورے آٹھ میل تک سنگین زمین کو آتش گیر مادہ سے شق کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ نہر کلری بگھار فیڈر کی راہ میں ایک دریا "نئی باراں" راستہ کاٹ کر گذرتا تھا چنانچہ اس دریا کی چوڑائی کے برابر ایک سرنگ بنائی گئی جس کو نصف قطر میں سیمنٹ کنکریٹ سے ڈھانپ دیا گیا۔ اس طرح کلری بگھار نہر دریائے "نئی باراں" کے نیچے سے نکلتی چلی گئی اور دریا حسب معمول اس نہر کے اوپر سے بہتا رہا۔ ان دو دریاؤں کا ایک دوسرے کی مخالف سمتوں میں بہاؤ جھرک کے مقام پر ہے جہاں ایک خوبصورت بند باندھا گیا ہے۔ اس بند اور نہر کی سرنگ پر کم و بیش ایک کروڑ روپیہ صرف ہوا ہے۔ اور اس میں مچھلیوں کے شکار کا بھی پورا بند و بست کیا گیا ہے۔ انجنیرنگ کا یہ لائق تحسین اور قابل دید منصوبہ بھی قومی شاہراہ سے تھوڑے ہی فاصلہ پر واقع ہے جہاں سیاحوں، امیروں اور شکاریوں کے قیام کے لئے ایک سیکنڈ کلاس سرکاری بنگلہ بھی ہے۔ اس مقام کو جہاں دریائے "نئی باراں سپر پیسیج" کہتے ہیں یعنی "نئی باراں گذرگاہِ خاص"۔ دریائے "باراں" جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ایک برساتی ندی ہے۔ چونکہ اس میں پانی کا انحصار دور و نزدیک کی بارشوں پر ہے اس لئے دریا میں مچھلیاں پکڑنے کے لئے زینہ نما منڈیر نہیں بنائی گئی ہے البتہ ہمیشہ رواں اور کٹورے کی طرح لبریز رہنے والی نہر کلری بگھار کے اس مقام پر مچھلی پکڑنے کی جگہ خود بخود بن گئی ہے اس جگہ کلری بگھار کا اخراج ایک لاکھ نوے ہزار کیوسکس ہے۔ اس بند میں سات سرنگیں بنائی گئی ہیں اور سات دروازے ہیں۔ ہر سرنگ ۱۵۰ سو فٹ لمبی اور ۱۶ فٹ اونچی اور ۴۰ فٹ چوڑی ہے۔ دریا کی سطح پر صرف ایک ہی سرنگ کا نمونہ بنایا گیا۔ باقی سرنگیں نیچے ہیں۔ اس کے بعد کلری جھیل تک کوئی بند یا پختہ گذرگاہ نہیں۔ البتہ کلری جھیل کے ذخیرہ شدہ پانی کو زیریں حصے میں آبپاشی اور دوسری ضرورتوں کے لئے جن میں کراچی کی آب رسانی بھی شامل ہے، چھوٹی نہروں میں پانی پہنچانے کی غرض سے کلری بگھار فیڈر لوئر ریگولیٹر تعمیر کیا گیا ہے۔ اس طرح کلری جھیل کو پانی دینے اور اس سے پانی لینے، دونوں مقاصد کے لئے ہیڈ ورکس تعمیر کئے گئے ہیں یہ دونوں ہیڈ ورکس بذات خود

قابل دید ہیں اور بڑی پُر فضا جگہوں پر تعمیر کئے گئے ہیں۔

کلری جھیل جس مقام پر واقع ہے وہاں کی آب وہوا نہایت صحت بخش ہے کیونکہ یہاں ہر موسم معتدل رہتا ہے نہ گرمی شدید پڑتی ہے نہ سردی اور بارش کی سالانہ اوسط ۵ انچ سے زیادہ نہیں۔ البتہ برسات کے دوران سیاہ سرمئی، اودی گھٹائیں اس پر منڈلاتی رہتی ہیں۔ اس سے یہ علاقہ اور بھی خوشگوار ہو جاتا ہے۔ آج کل کے سیاح، سیاحت میں تفریحی مشاغل کو ترجیح دیتے ہیں، بالخصوص ایسے مشاغل جن سے تھوڑی بہت ورزش بھی ہوتی رہے۔ اور وقت بھی اچھی طرح گذر جائے، اس لئے کہ پر فضا اور صحت بخش مقامات پر مشاغل کے بغیر محض آرام ہی آرام کے چند دن بھی اکتاہٹ پیدا کر دیتے ہیں بالخصوص مصروفیت کے خوگر تعطیلات کے چند دنوں میں بھی بے کار نہیں رہ سکتے چنانچہ ایسے مقامات پر بالعموم تین قسم کی تفریحی ورزشوں کا اعلیٰ انتظام ہوتا ہے: پیراکی کشتی رانی اور شکار۔

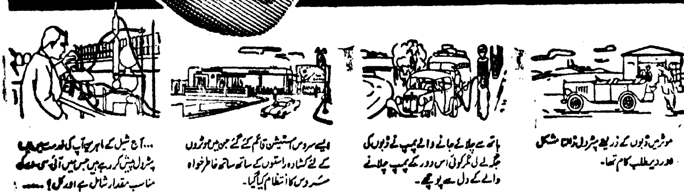
خوش قسمتی سے کلری جھیل ان تینوں شغلوں کے لئے انتہائی موزوں ہے یعنی پچاس مربع میل کے علاقہ پر صاف شفاف پانی میں پیراکی اور کشتی رانی کو شوق، فن اور پیشہ ہر اعتبار سے منظم کیا جاسکتا ہے۔ سیاح ان مشغلوں کو شوق کی حد تک جاری رکھ سکتے ہیں اور حکومت یا اسپورٹس کنٹرول بورڈ پیراکی اور کشتی رانی کے قومی اور بین الاقوامی مقابلوں کا مرکز بنا کر (جہاں تھوڑے سے خرچ سے ان دو فنون یا کھیلوں کے تمام فنی اور تربیتی لوازمات مہیا کئے جاسکتے ہیں) کلری جھیل کو کئی سو گنا اہم، پرکشش اور آمدنی کا ذریعہ بنا سکتا ہے۔ شکار کے سلسلہ میں صرف مچھلی پکڑنے تک ہی کلری جھیل کی اہمیت محدود نہیں بلکہ اس کا پانی بطوں اور مرغابیوں کا گھر ہو سکتا ہے اور حد نگاہ تک پھیلے ہوئے کناروں پر تیتر بٹیر فی الحال پڑے پڑے ہیں۔ اس کے علاوہ ہرن، ہرنی اور دوسرے شکار کے قابل جانوروں کی نہ ختم ہونے والی نسلیں بڑی آسانی سے پیدا کی جاسکتی ہیں اور مغربی پاکستان کے محکمہ شکار کے لئے یہ کام کافی کم خرچ بھی ہے۔ اس لئے کہ کلری جھیل کے کناروں پر جنگلات اور باغات لگانے کی کئی اسکیمیں تیار ہو چکی ہیں۔ ان پر عملدرآمد کے ساتھ ہی لائق شکار جانوروں کی نسل کشی کا کام شروع کیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک ماہی گیری کا تعلق ہے اس کے لئے کلری جھیل کی اہمیت اور موزونیت شروع سے ہی حکومت کے پیش نظر ہے چنانچہ اس کے ہیڈ ورکس کی افتتاحی تقریبات پر جو لٹریچر شائع ہوا اور تقاریر کی گئیں ان میں کلری کی ماہی گیری کا خاص طور پر حوالہ دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ اس لمبی چوڑی جھیل کا پانی آمد و رفت کے دونوں مرحلوں میں انسانی قبضہ و اختیار میں ہے اور پانی کے اس انسانی کنٹرول کے مقامات پر ایسا انتظام کیا گیا ہے کہ بلا اجازت ایک بھی مچھلی نہ جھیل میں آسکتی ہے اور نہ جھیل سے باہر جاسکتی ہے۔ مچھلی کی اعلیٰ نسلیں پیدا کرنے اور ان کو بچانے اور محفوظ رکھنے کے لئے جس طرح کے نہ ختم ہونے والے مگر محدود ذخیرۂ آب کی ضرورت ہوتی ہے کلری جھیل اس کے لئے بہترین جگہ ہے جو اس وقت بھی کئی نسلوں کی چھوٹی بڑی مچھلیوں کی دولت سے مالامال ہے، مگر کچھ دن بعد جب حکومت ماہی گیری کا انتظام خود سنبھال لے گی تو اس سے قومی دولت میں باقاعدگی کے ساتھ لاکھوں کا اضافہ ہونا شروع ہو جائے گا۔

صدیوں قبل جام تماچی کے عہد میں ممکن ہے یہ علاقہ خوشحال ہو لیکن اس کے بعد سے کلری جھیل کے وجود میں آنے تک یہ مثالی طور پر خشک اور بنجر سرزمین تھی جہاں آب پاشی برائے زراعت تو درکنار پینے کے پانی تک کے لئے لوگ بادلوں کی آس لگائے رہتے تھے مگر اب یہاں کے دہقانوں کے کڑے دن گذر گئے ہیں اور ان کی نگاہیں امید وبیم سے لبریز آسمانوں کی طرف نہیں بلکہ اس لاکھوں ایکڑ زمین پر ہیں جو اب تک بنجر پڑی تھی مگر کلری جھیل سے سیراب ہو کر لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں تبدیل ہو جائے گی اور جوں جوں وقت گذرتا جائے گا زیر کاشت رقبہ میں اضافہ ہی ہوتا رہے گا۔ علاقہ کلری کے لوگوں کو اس کا یقین اسی وقت ہو گیا تھا جبکہ کلری گنگھار فیڈر کے دہانے سے پہلا دھارا جھیل میں گرا۔ نہ معلوم اس پانی میں کیا تاثیر تھی کہ صدیوں کی تیز دھوپ سے جھلسے ہوئے دہقانوں کے چہرے کھل اٹھے اور انہوں نے اپنے مخصوص ساز اٹھا کر شاہ لطیف کی رومانی نظم جام تماچی کی دھن چھیڑ دی۔ یہ نظم یہاں ہمیشہ گائی جاتی رہی ہے لیکن صدیوں سے اس کے ہر لفظ میں کرب و سوز کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا جسے محسوس کرکے سننے والے بھی تڑپ اٹھتے تھے مگر اب اس میں کرب و درد کی جگہ مسرت اور سرخوشی بھری ہوئی ہے اور اس کے مسرت آفریں اثر کا یہ عالم ہے کہ جس عورت، مرد اور بچے کی سماعت سے یہ نغمہ ٹکراتا ہے وہ وہیں جھومنا اور رقص کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ انقلاب عطیہ ہے کلری جھیل کا اور کلری جھیل عطیہ ہے قدرت کا جو وہ ہر محنت کش، باعمل اور اپنا مقدر آپ بنانے والی قوموں کو ازل سے دیتی آئی ہے۔

۱۹۲۹ء ٹین کے ڈبّوں کے ذریعہ
۱۹۳۹ء پمپ کے ذریعہ
۱۹۵۹ء جدید طرز کے سروس اسٹیشن کے ذریعہ



برما شیل کے وسیع نظام اور سالہا سال کے تجربہ نیز شیل جیسے عالمی ادارہ سے وابستگی کی بدولت یہ سہولتیں بہ آسانی فراہم کی جاسکی ہیں۔



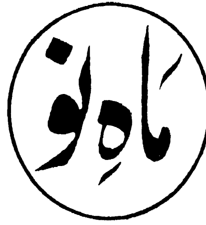
برما شیل ترقیٔ پاکستان کا حصّہ ہے

BSP-1-59



ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۲ کراچی نے شائع کیا - مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس میکلوڈ روڈ - کراچی
مدیر: رفیق خاور

جلد ۱۲ شمارہ ۷



جولائی ۱۹۵۹ء

مدیر: رفیق خاور نائب مدیر: ظفر قریشی

سرورق: سوات کا ایک منظر: رنگین عکس: محمد اسلم

سالانہ چندہ: ساڑھے پانچ روپے ٭ شائع کردہ: ادارۂ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳، کراچی ٭ فی کاپی: آٹھ آنے

شاعرِ مشرق

(دو تقریریں: بہ سلسلۂ یوم پاکستان، لندن)

رش بروک ولیمز

سر مالکم ڈارلنگ

آج سر محمد اقبالؒ کا شہرہ غالباً اس سے زیادہ ہے جتنا کہ ان کی وفات کے وقت تھا۔ کئی شاعر فلسفی بلکہ سیاست داں بھی اپنے انتقال کے بعد چند ہی سال کے عرصہ میں بالکل فراموش ہو جاتے ہیں۔ اقبالؒ اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔ ان کی شہرت پہلے سے بدرجہا زیادہ ہے۔ یہ کوئی ذوق و شوق کی ہنگامی رَو نہ تھی جس کے تحت اُن کا ایک عظیم انسان کی حیثیت سے خیر مقدم کیا گیا۔ جو لوگ ان کا ایک شاعر فلسفی یا سیاسی مبشر کی حیثیت سے مطالعہ کرتے ہیں، اُن کی تصانیف میں ایسے ارشاداتِ عالیہ اور حقائق و بصائر پاتے ہیں جن کی صداقت آج بھی اُسی طرح برقرار ہے جتنی کہ اس وقت جب وہ معرضِ اظہار میں آئی تھیں۔

میرے اقبالؒ کے ساتھ روابط اِس آخری یعنی سیاسی مبشر ہی کی حیثیت سے پیدا ہوئے تھے۔ میرا مطلب وہ کردار ہے جو انہوں نے ایک سیاسی مبشر کی حیثیت سے انجام دیا تھا۔ مجھے لاہور میں کئی بار اُن کی ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ اگرچہ میں یہ دیکھ کر خوش ہوں کہ آج کی محفل میں سر مالکم ڈارلنگ بھی شامل ہیں جن کے اُس زمانہ میں اقبالؒ کے ساتھ روابط مجھ سے کہیں زیادہ قریبی تھے۔

سر محمد اقبالؒ کے ساتھ میرے تعلقات حقیقی معنوں میں تین گول میز کانفرنسوں کے دوران پیدا ہوئے تھے اور انہی کانفرنسوں کے دوران ہی مجھے اُن کے سیاسی افکار کی وسعت اور گہرائی کو کماحقہٗ سمجھنے کا موقع ملا۔

اِس زمانے پر ایک نظر بازگشت ڈالی جائے تو ایسا معلوم ہوگا کہ ہم میں سے اکثر جو اُس وقت ایک متحدہ ہندوستان کا وفاقیہ قائم کرنے کی اُمید میں سرگرم کار تھے، سر اقبالؒ کی حکیمانہ بصیرت کو کم اہمیت دینے کی طرف مائل تھے۔ بلکہ میں تو اس سلسلہ میں قائد اعظم کو بھی کلی طور پر مستثنیٰ نہیں کروں گا۔ کیونکہ مجھے یاد ہے کہ میں کئی ایسی صحبتوں میں شریک تھا جن میں سر اقبالؒ ہمیشہ یہی اصرار کرتے تھے کہ ہندوستان کی مسلم آبادی کی کسی بھی مجوزہ وفاقیہ میں مکمل شرکت کی متقدم شرط ایک ہی ہے: ان کا فرقہ وارانہ انتخابات سے مسلسل تحفظ۔ اُس وقت قائد اعظم بھی اس بارہ میں متیقن نہ تھے اور میں بھی جو ہندوستانی ریاستوں کے مندوب اور نمائندہ کی حیثیت سے کام کر رہا تھا، یہی خیال کرتا تھا کہ سر اقبالؒ جو کچھ کہتے ہیں خواہ وہ ماضی میں کتنا ہی اہم کیوں نہ رہا ہو، بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں غالباً بالکل بے محل ہو چکا ہے۔ لیکن سچ پوچھئے تو وہ کس قدر صحیح تھے اور ہم کس قدر غلط! کیونکہ جونہی ۱۹۳۷ء میں وفاقیہ کے پہلے مرحلہ کی شروعات ہوئیں، وہ تمام اندیشے جن کی توضیح اقبالؒ نے ہندوستان کی مسلم اکثریت کے زاویۂ نگاہ سے اس قدر سنجیدگی اور پیغمبرانہ پیش بینی و بصیرت کے ساتھ کی تھی، وہ حرف بحرف درست ثابت ہوئے۔

۱۹۳۷ء میں اقبالؒ بہت علیل ہو چکے تھے، پھر بھی جو اثر انہوں نے قائد اعظم پر ۳۸-۳۷ء کے نازک، بحرانی سالوں میں ڈالا، وہ ہمیشہ اُن پر شدت سے حاوی رہا اور مجھے آپ کو یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ یہ اقبالؒ ہی تھے جنہوں نے قائد اعظم کو یہ تحریک دلائی کہ وہ مسلم لیگ کی تنظیم اس طرح کریں کہ اس کی طاقت کی بنیاد ہندوستان کے اعلیٰ طبقے یعنی خواص کی بجائے عوام پر ہو۔ یہ تبدیلی سر اقبالؒ کے اُس سیاسی فلسفہ سے جس کا پرچار وہ برسوں سے کر رہے تھے محض ہم آہنگ ہی نہیں بلکہ پوری طرح ہم آہنگ تھی۔

میرے خیال میں اِن واقعات کی طرف دوبارہ رجوع کرنا تحصیل حاصل ہے۔ کیونکہ سب جانتے ہیں کہ اقبالؒ نے آئندہ اسلامی مملکت کا جو پیغمبرانہ رویا یا تصور سب سے پہلے مسلم لیگ کے الٰہ آباد سیشن منعقدہ ۱۹۳۰ء کے خطبۂ صدارت میں پیش کیا تھا، وہ کیا تھا۔ اُس وقت مسلمانوں کا کل ہند میں اسلامی ہند کا مطالبہ چنداں واضح نہ تھا، لیکن اس معرکہ آرا تقریر میں سر اقبالؒ نے اس علاقہ کی ہیئت ترکیبی بیان کی جو اب مغربی پاکستان کے نام سے موسوم ہے۔ ابھی اس تصور کو مسلم عوام کے دل و دماغ میں بسا دینے کے لئے بہت کچھ کرنے کی ضرورت تھی لیکن یہ تصور پیدا ہو چکا تھا۔

تاہم یہ سر اقبالؒ کی عظمت کا بیّن ثبوت ہے کہ وہ ہندوستان میں اسلامی مملکت کے تصور اور اس کے جغرافیائی حدود کی توضیح ہی پر مطمئن نہیں ہوئے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر قدم رکھا۔ انہوں نے اُن خصوصیات کی توضیح بھی کی جن کا اس مملکت کو حامل ہونا چاہیئے تاکہ یہ فرد اور اس جماعت میں جس سے وہ وابستہ ہے، وہ تعاون و تعامل پیدا کر سکے جو اقبالؒ جانتے تھے اِن دونوں کی انتہائی نشوونما کے لازم ہے۔ آئیے میں آپ کو اُن آٹھ بنیادی امور کی یاد دلاؤں جو اُنہوں نے ایسے معاشرہ کے لئے لازم قرار دیئے ہیں۔

ان میں سب سے اولیٰ تھی توحید جس کو وہ بنی نوع انسان کی اخوت کے لئے لازمی خیال کرتے تھے۔ دوسرے، پُرخلوص اور والہانہ قیادت۔ تیسرے، ایک ایسا ضابطۂ اخلاق جو معاشرہ کے آدرشوں اور فضاؤں کا آئینہ دار ہو۔ چوتھے، اُس مملکت کا ایک معین جغرافی محل وقوع ہونا چاہیئے۔ اُن تمام سرگرمیوں اور وفاداریوں کا علاقائی مستقر اور مرکز و محور جن کو یہ مملکت وجود میں لائے۔ پانچویں اس مملکت کا ایک نصب العین ہو یعنی ایک ایسا مقصود جس کی تحصیل کے مملکت اور اس کے شہری پابند ہوں۔ چھٹے، یہ ذرائع فطرت پر قادر ہو جس کے معنی اقبالؒ کے تصور میں یہ تھے کہ اہلِ مغرب کے مشینی و سائنسی کمالات سے استفادہ کیا جائے مگر اس طرح نہیں کہ ان سے مغربی روح کی پیروی لازم آئے کیونکہ انہیں اس سے کئی امور میں اختلاف تھا۔ ساتویں، اس مملکت کو ایک مرکب اجتماعی خودی پیدا کرنی چاہیئے جو بیک وقت اس کے آزاد شہریوں کی ذاتی خودی کی توسیع بھی ہو اور تکمیل بھی۔ آٹھویں اور آخری بات یہ ہے کہ یہ ریاست خواتین کی نشوونما کے لئے مکمل گنجائش پیدا کرے خواہ وہ بالقوۃ ہو یا بالفعل۔

تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں یہ کہوں گا کہ ان آٹھ خصوصیات کی اہمیت پاکستان کی تاریخ سے بخوبی نمایاں ہے۔ ان کا جب بھی التزام کیا گیا ہے، ملک ان مقاماتِ عروج پر پہنچا اور قائم رہا ہے جن کا تصور اقبالؒ اور قائد اعظم نے کیا تھا۔ اور جب ان کو نظر انداز کیا گیا ملک میں تنزل رونما ہوا۔ آج پاکستان میں، جیسا کہ مجھے اور میری اہلیہ کو چند ہفتہ ہوئے دیکھنے کا اتفاق ہوا، ان بنیادی اصولوں کی طرف رجوع کرنیکا عزم بالجزم نظر آتا ہے۔ تاکہ یہ پاکستان کو وہی مثالی چیز بنانے کی طرف پیش قدمی ہو جو قائد اعظمؒ اور اقبالؒ کے تصور میں تھی۔ چنانچہ ہم ان اصولوں کا مظاہرہ ان گوناگوں اقدامات میں پاتے ہیں جن کے ذوق و شوق سے پاکستان کی نئی حکومت سرشار ہے۔

ان اصولوں میں جو بات سیاحانِ مغرب کے تخیل کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ رواداری ہے یعنی یہ عقیدہ کہ پاکستان میں دنیائے مغرب کے ساتھ بھائی چارہ اور دوستی کا پورا پورا امکان ہے۔ جب ہم پاکستان کی تاریخ پر اُس وقت سے نظر ڈالتے ہیں جب کہ یہ ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے وجود میں آیا، تو بعض ادوار سے یہ اندیشہ لاحق ہوتا ہے کہ کہیں اخوت و رواداری کی جگہ یہاں اندھیر گردی کا دور دورہ نہ ہو جائے۔ اس سلسلہ میں بھی دیگر اُمور کی طرح اقبالؒ ہی کا ارشاد آخری اور قطعی ہے ؎

نہیں فردوس مقامِ جدل و قال و اقول   بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت!
ہے بد آموزیٔ اقوام و ملل کام اس کا   اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت!

ان اشعار اور ایسے ہی کئی اور اشعار میں جو اقبالؒ نے کہے ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اس عظیم انسان نے پاکستانی معاشرہ کی ہمیشہ کے لئے نہج اور طرح مقرر کر دی ہے۔

آج جب ہم اس کی برسی منانے کے لئے جمع ہوئے ہیں، میرا خیال ہے کہ اگر ہم دنیا پر گہری نظر ڈال کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اس وقت اس کی زندگی سے بھی کہیں زیادہ نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا کے تمام ممالک کو اس سیاسی فلسفہ کی ضرورت ہے۔ جس کا اس نے اپنے حینِ حیات میں پرچار کیا تھا۔

●

میں آپ کی انجمن کا بہت شکرگذار ہوں کہ اس نے مجھے ایک ایسے شخص کو اپنا ناچیز خراجِ عقیدت پیش کرنے کی دعوت دی ہے جس کی دوستی میری اہلیہ اور میرے لئے برسوں سامانِ مسرت رہی اور جس کی شخصی جاذبیت میری چھوٹی سی بچی نے بھی محسوس کی جو پانچ چھ سال کی عمر میں اس کے گھٹنوں پر بیٹھا کرتی تھی اور اب بھی اس خوشی اور مسحور کن کیف کی یاد تازہ کر کے مسرور ہوتی ہے جو وہ ایسے موقعوں پر محسوس کیا کرتی تھی۔

اس وقت میری طرف سے اقبالؒ پر بہ حیثیت فلسفی یا شاعر کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اگرچہ ان دونوں حیثیتوں سے ان کا مقام بہت بلند ہے۔ کیونکہ میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں پاتا اور ان حیثیات سے سر محمد اقبالؒ کو کئی اہل الرائے بہت ہی عمدہ خراجِ تحسین ادا کر چکے ہیں۔ اس موقع پر

میں یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ اس شخص کا بحیثیت انسان تھوڑا بہت نقشہ آپ کے سامنے لاؤں جس کی دوستی کا مجھے ستائیس سال شرف حاصل رہا اور میں نے کئی ملاقاتوں میں اس کے متعلق نقوشِ تاثر فراہم کئے تھے۔ یہ ادھورا سا نقشہ بھی میں شاید اس خط کی بنا پر پیش کرسکوں گا جو مجھے اپنے کاغذات میں دستیاب ہوا ہے۔ یہ خط میں نے اگست ۳۴ء میں اپنی بیٹی کو لکھا تھا جس کا میں نے ابھی ابھی تذکرہ کیا ہے۔

میں ہندوستان کافی طویل عرصے کے بعد واپس آیا تھا۔ لاہور اور وہ بھی اگست یعنی گرمیوں کے مہینے میں جس دن میں یہاں پہنچا۔ اور وہ اتوار کا دن تھا، میں نے آتے ہی ڈاکٹر اقبالؒ کو اپنے ساتھ چائے پینے کی دعوت دی۔ اسی کے متعلق میں نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ :

"یہ نہ جانتے ہوئے کہ وہ لاہور میں ہیں یا نہیں، میں نے انہیں ایک رقعہ لکھا کہ وہ آج میرے ہاں تشریف لاکر چائے نوش فرمائیں۔ جب ان کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو میں یہ سمجھا کہ وہ کہیں گئے ہوئے ہیں بلکہ سچ پوچھو تو میں یہ بات بھول ہی گیا تھا۔ آج سہ پہر میں اپنے آدھی آستین کی قمیض پہنے ہوئے اسٹینوگرافر کو خط لکھوا رہی رہا تھا کہ ڈاکٹر اقبالؒ برآمدے میں تشریف لے آئے۔ مجھے نہایت خوشی ہوئی۔ وہ مجھے بیحد پسند ہیں۔ وہ ساڑھے چار بجے آئے اور ساڑھے سات بجے تک میرے پاس رہے۔ میں تمہیں کیا بتاؤں کہ ہماری گفتگو کس قدر دلچسپ رہی۔ مشرق سے لے کر مغرب، سیاسیات سے لیکر تصوف اور مان ٹیگو سے لے کر مسولینی سب کو محیط۔"

اس خط میں دو واقعات کا ذکر ہے جن سے وہ ۱۹۳۱ء کے دورۂ یورپ میں دوچار ہوئے تھے۔ ایک اقبال کے قرطبہ جانے سے متعلق ذکر ہے، جیسا کہ میرے دوست آغا محمد اشرف نے ابھی بتایا ہے۔ میں پھر اسی خط سے کچھ سطور پیش کروں گا جن میں اقبالؒ کے بیان کا معاصرانہ تذکرہ ہے۔ یہ خط میں نے اسی شام تحریر کیا تھا جبکہ اقبالؒ نے میرے ساتھ وہ بہت پرلطف گفتگو کی تھی۔ اس خط میں لکھا ہے :۔

"اقبالؒ نے مجھے اپنے قیام ہسپانیہ کی بہت ہی دلچسپ داستان سنائی۔ وہ قرطبہ کی قدیم مسجد کو تشریف لے گئے جو اب کلیسا بن چکی ہے۔ انہوں نے گائیڈ سے کہا کہ وہ وہاں نماز ادا کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ یہ جگہ کبھی ایک مسجد تھی۔ گائیڈ نے کہا پادریوں کو یہ بات ناگوار ہوگی۔ اقبالؒ اس مقام پر مصلیٰ بچھا کر بیٹھ گئے جس کو بے حد مقدس سمجھا جاتا تھا۔ جب انہوں نے ایسا کیا تو جھٹ ایک پادری نے پہنچ کر زور و شور سے احتجاج کیا۔ مگر اقبالؒ نے بڑی مضبوطی ایمان کا ثبوت دیا اور پادری کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا۔ اسے بتاؤ کہ ایک دفعہ مکہ میں عیسائیوں کا ایک وفد کوئی التماس لے کر پیغمبرِ اسلام کے پاس مکہ آیا تھا۔ اس کے اراکین کو آنحضرت صلعم کی اپنی مسجد یعنی مسجد نبویؐ میں ٹھہرایا گیا اور جب اُن کی عبادت کا وقت آیا تو وہ متردد تھے کہ انہیں اس کی اجازت دی جائیگی یا نہیں۔ یہ سن کر آنحضرت صلعم نے کہا کہ وہ یقیناً اپنے طور طریق کے مطابق مسجد میں عبادت کرسکتے ہیں۔ اقبالؒ نے کہا اگر عیسائیوں کو پیغمبرِ اسلامؐ نے اپنی ہی مسجد میں عبادت کرنے کی اجازت دی تھی تو انہیں ایک ایسی جگہ اپنے طور پر نماز ادا کرنے کی اجازت کیوں نہیں جو کبھی آخر ایک مسجد ہی تھی! جب وہ یہ باتیں کہہ چکے تو کلیسا کے سارے پادری ان کو دیکھنے آنکلے اور ایک نے ان کا فوٹو بھی لے لیا۔ اقبالؒ نے ایک گونہ تسلی کے ساتھ کہا کہ غالباً وہ واحد مسلمان ہیں جنہوں نے گذشتہ چار سو سال میں اس مسجد میں نماز ادا کی ہے۔"

اس واقعہ سے اقبالؒ کی استواریٔ ایمان ظاہر ہوتی ہے۔ دوسرا واقعہ مسولینی کے ساتھ ایک نہایت ہی دلچسپ ملاقات پر مشتمل ہے۔ جو ۲۰ منٹ جاری رہی اور اقبالؒ نے اس کی کیفیت کچھ ایسے دل پر نقش ہوجانے والے پیرایہ میں پیش کی کہ یہ مجھے اب تک یاد ہے۔ بلکہ یوں کہیے نقش کالحجر ہے۔ اسلئے میں نے اپنے خط میں اس پر کافی وقت صرف کیا۔ میں نے لکھا :

"مسولینی نے ان سے پلیزیو ڈی وینیشیا کے ایک عظیم الشان ہال میں ملاقات کی۔ جب وہ اندر داخل ہوئے تو انہوں نے کشادہ ہال کے دوسرے کنارے پر عظمت ڈوچے مسولینی کو ایک اونچی شہ نشین پر بظاہر کام میں منہمک پایا، اس قدر کہ اُسے آنکھ اٹھا کر دیکھنے کا موقع ہی نہ ملا کہ اس کی طرف کون آرہا ہے۔ جب سر محمد اقبالؒ اس شہ نشین کے پاس پہنچ گئے تب کہیں مسولینی نے نظر اٹھا کر دیکھا اور ان کی طرف بڑے کریمانہ اور بندہ نوازی کے انداز میں مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ ابتدائی آداب و مراسم کے بعد مسولینی نے کہا " سنا ہے آپ ایک ہفتہ سے اٹلی میں ہیں۔ کیا خیال ہے اس کے بارے میں؟" یہ ایک بڑا خطرناک سوال تھا جس کا بے تکلف جواب کسی ابتدائی حکمتِ عملی کے بغیر ممکن نہ تھا۔ سر اقبالؒ اسقدر نکتہ رس تھے کہ وہ سوال کے اس پہلو کو فوراً سمجھ گئے۔ اسلئے انہوں نے کہا "جناب والا! میرے تاثرات آپ کے لئے کیا معنی رکھ سکتے ہیں جب کہ مجھے جناب کے ارشاد کے مطابق یہاں آئے صرف ایک ہفتہ گذرا ہے۔" مگر مسولینی نے کہا میں یہ تاثرات جاننا چاہتا ہوں۔ چنانچہ اس نے

اصرار کیا اور آخر اقبالؒ نے اپنے آپ کو کافی مضبوط بنیاد پر محسوس کرتے ہوئے کہا "جناب والا! اگر آپ میرے تاثرات جاننا ہی چاہتے ہیں تو کیا میں سب کچھ صاف صاف کہہ دوں؟ اس کے جواب میں مسولینی لازماً "ہاں" ہی کہہ سکتا تھا۔ تب اقبالؒ نے کہا میں اطالویوں کے متعلق یہی سمجھتا ہوں کہ وہ ایرانیوں سے بہت ہی ملتے جلتے ہیں۔" اس پر مسولینی ذرا چونکا۔ "وہ بڑے ذہین و فطین، خوبرو، فن پرست ہیں، اور اُن کے پیچھے تہذیب و تمدن کی کتنی ہی صدیاں ہیں۔ مگر ــــ اقبالؒ نے کہا۔ "ان میں کوئی خون نہیں!" اس پر مسولینی کچھ اور چونک کر سراپا توجہ بن گیا ــــ "کوئی خون نہیں؟ کیا مطلب؟" تب مجھے خوب یاد ہے کہ اقبالؒ نے کس طرح اپنا بازو کھول کر دکھایا اور کہا "ان میں یہ سرخ چیز نہیں ہے جس کو خون کہتے ہیں، لیکن پھر اقبالؒ نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "ایرانیوں کو ایک فائدہ ہے جو اطالویوں کو حاصل نہیں ــ اُن کے اردگرد مضبوط، توانا قومیں ــ افغان کرد اور ترک آباد ہیں جن سے وہ تازہ خون حاصل کرسکتے ہیں مگر آپ، اطالوی ایسا نہیں کرسکتے۔ اسلئے آپ کمزور ہی رہیں گے۔" "اچھا" مسولینی نے کہا "پھر اطالویوں کو کیا کرنا چاہئے؟" اقبالؒ نے جواب دیا" اور اس وضع کا جواب میرے خیال میں اُسی سے مخصوص ہے کہ "یورپ سے منہ موڑ کر مشرق کا رُخ کرو۔ یورپ کا اخلاق، افسوس ہے، ٹھیک نہیں لیکن مشرق کی ہوا تازہ ہے، اس میں سانس لو۔" بعد میں مسولینی نے اقبالؒ کو خط لکھا اور پوچھا کہ اطالیہ میں بسنے والے مسلمانوں یعنی مسلمان رعایا کی خوشنودی کے لئے ان کے ذہن میں کوئی تجویز ہے؟ اقبالؒ نے دو تجویزیں پیش کیں: ایک یہ کہ روم میں ایک مسجد بنائی جائے کیونکہ اقبال نے یہاں تین سو ایرانی آباد دیکھے ــــ دوسرے، عربی علماء کی ایک کانفرنس سسلی میں منعقد کی جائے جس کو وہ ایک عرب شہر قرار دیتے تھے۔"

"مسولینی کے متعلق انہوں نے ایک بہت دلچسپ بات بیان کی۔ اور وہ یہ کہ اس کی آنکھیں بڑی عجیب تھیں ــ ان میں کچھ ایسی بات تھی جن سے اقبالؒ بہت مرعوب ہوئے۔ مگر یہ کہانی یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ کیونکہ جب وہ قصر وینس سے باہر نکلے تو انہوں نے خود کو نصف درجن صحافیوں سے دوچار پایا۔ جو یہ جاننا چاہتے تھے کہ "عظیم فلسفی ہندوستان" ــــ میں ہندوستان پرانی اصطلاح کے مطابق کہہ رہا ہوں۔ ان کے عظیم ڈوچے کے متعلق کیا رائے رکھتا ہے۔ اور یہاں پھر اقبالؒ نے ان کو ہاتھ پٹھے پر نہ رکھنے دیا۔ انہوں نے کہا کہ ان کا اس بارہ میں اُن سے کچھ کہنا خلاف مصلحت ہے کیونکہ پوپ اس کو ناپسند کریں گے۔"

"یہ ۱۹۳۱ء کی بات ہے جب گاندھی جی اور ان کی تحریک "ستیہ گرہ" کا بہت چرچا تھا۔ اس پر ایک صحافی نے کہا "اگر آپ نہیں بتائیں گے تو ہم ستیہ گرہ کر کے آپ کو مجبور کریں گے۔" تب اقبالؒ نے کچھ نرم پڑتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے آپ کا ڈوچے ایک لوتھر ہے مگر بے انجیل"۔

"اگر تم اس پر غور کرو تو یہ بہت گہری بات تھی کیونکہ لوتھر اپنی انجیل کے بغیر کیا ہوتا؟"

یہ دونوں واقعے میں نے خیال کیا آپ کو بتانے کے لائق ہیں۔ کیونکہ یہ اس انسان کی بھی یاد دلاتے ہیں اور اس فلسفی و شاعر کی بھی جس کے متعلق ہم نے آج کی سہ پہر اس قدر پُرلطف باتیں سُنی ہیں۔

آپ یہ بھی جاننا چاہیں گے کہ جب اقبالؒ کی مجھ سے ملاقات ہوئی تو وہ کیسے لگتے تھے۔ میں نے اس کے بارہ میں اپنی بیٹی کو یوں لکھا تھا:

"ڈاکٹر اقبالؒ درمیانے قد کے ہیں۔ عمر میں مجھ سے کچھ سال بڑے ــــ شاید سات سال ــ چہرہ خوب باآب و رنگ، تیکھے تیکھے گنجان بال، اور چھوٹی چھوٹی مگر تیز آنکھیں ہم روحانی دنیا کے متعلق بہت کچھ باتیں کرتے رہے جس پر ان کو پختہ یقین ہے۔"

یہ باتیں اگست ۱۹۳۴ء میں اقبال کی وفات سے کوئی چار سال پہلے لکھی گئیں، اور اس صحبت میں موت ہی کے متعلق زیادہ گفتگو رہی۔ یہ حصہ میں آپ کو پڑھ کر سنانا مناسب نہیں سمجھتا، لیکن اس میں ایک بات قابل ذکر ہے۔ انہوں نے ایک بڑی حیرت انگیز بات کہی اور وہ یہ "موت میں ایک زبردست قوت مضمر ہے کسی شخص کی وفات، کسی زندگی کا خاتمہ، سینکڑوں زندگیوں کو بدل دینے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن یا موت خود حیات نہیں؟" آج میرے خیال میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ گو اقبالؒ کو فوت ہوئے کئی سال گزر چکے ہیں، پھر بھی وہ ہمارے دلوں اور روحوں میں برابر زندہ ہیں اور میں یہ کہوں گا کہ خصوصاً وہ میرے دل میں ضرور زندہ رہے ہیں جو ستائیس سال ان کے قریب رہا اور تمام عرصہ ان سے برابر محبت کرتا رہا۔

★

بنگلہ تنقید

ڈاکٹر سجاد حسین

مترجمہ: محمد نہال وارث خاں

اُردو ہو یا بنگلہ یا ہماری کوئی اور زبان، ان سب کے مسائل ایک جیسے ہیں۔ ان میں سب سے اہم ہے ادب و فن اور تنقید کا ایک اعلیٰ تصور جو اربابِ قلم کو ایک بلند سطح تک پہنچنے میں مدد دے۔ یہ صریحاً عالمگیر ذہنی و ادبی رجحانات کا اثر قبول کرنے اور روایتی اثرات سے آزاد ہونے کی پرزور جدوجہد ہی پر موقوف ہے۔ امید ہے زیرِ نظر مقالہ اس لحاظ سے خیال افروز ثابت ہوگا۔ (مدیر)

۴۷ء سے آج تک بنگلہ میں جو تنقیدیں لکھی گئی ہیں اُن کا مطالعہ کیا جائے تو اولیں احساس یہ ہوگا کہ ہمارے ملک میں ایسے لوگوں کی بڑی کمی ہے جن کی صلاحیتیں تنقید کے لئے خصوصی طور پر وقف ہوں اور جنہیں اس اعتبار سے پیشہ ور نقاد کہا جاسکتا ہے۔ اس سے میری مراد ایسے لوگ ہیں جو تنقید نگار کی حیثیت سے اپنے فرائض نہایت سنجیدگی سے ادا کرتے ہیں اور اپنی صلاحیتوں کو ادب اور ادبی مسائل کی باقاعدہ وضاحت کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ مثلاً لسنگ، آئی۔ اے۔ رچرڈز یا ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ۔ بے شک ہمارے ہاں چند حضرات ایسے ہیں جو کبھی کبھار تنقیدیں لکھتے ہیں لیکن انہیں "پیشہ ور" نقاد نہیں کہا جاسکتا۔ ضروری نہیں کہ اس قسم کا نقاد دوسرے نقادوں کے مقابلے میں ادب کا بہتر ناقد ہو لیکن کسی معاشرے میں پیشہ ور نقادوں کی موجودگی اس بات کی علامت ضرور ہے کہ اس میں تنقید نے ایک مخصوص سرگرمی کی حیثیت سے باعزت مقام حاصل کر لیا ہے اور وہ ایک خاص معیار پر قائم ہے۔

ایک ادبی گروہ کی حیثیت سے باقاعدہ نقادوں کی عدم موجودگی کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ ہم ادبی اور غیر ادبی تنقیدوں میں شاید ہی کوئی فرق کرسکتے ہیں۔ حالانکہ یہ بہت ضروری ہے۔ ہم ہر اس شخص کو نقادوں کی فہرست میں شامل کر لیتے ہیں جس نے کبھی ادبی، سماجی، سیاسی یا تاریخی مسائل پر کچھ لکھا ہو۔ بعض کو اصرار ہے کہ اسمٰعیل حسین شیرازی اور واجد علی کو نقاد کہا جائے۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی صحیح معنوں میں ادبی نقاد نہیں تھا۔ یہ اور بات ہے کہ بنگلہ نثر کی تاریخ میں دونوں حضرات ایک بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ ممکن ہے اس قسم کی کڑی تقسیم میں کچھ خلا رہ جائیں مثلاً اس قسم کی سخت حد بندی سے ہماری زبان میں تاریخی اور فلسفیانہ تحریریں بالکل نظر نہ آئیں لیکن ہم جب تک ادبی تنقید اور تنقیدی نثر کی دوسری قسموں میں واضح فرق قبول نہیں کرتے۔ اس وقت تک ہمیں اپنی ادبی تنقید کی خوبیوں اور خامیوں کا صحیح شعور نہیں ہوسکتا۔

میرے خیال میں ادبی تنقید کی حدود کے اندر ایک اور حد بندی کی بھی شدید ضرورت ہے جو مشرقی پاکستان میں بالکل مفقود ہے۔ ضروری ہے کہ ہم تبحرِ علمی ادر تنقید میں فرق کریں۔ اور اس بات کو واضح طور پر جان لیں کہ ان دونوں کے امتیازی فرائض کیا ہیں۔ اچھی تنقید نگاری عمدہ علمیت سے مواد اور زندگی حاصل کرتی ہے۔ ایک اچھے نقاد کا صحیح اور دیانت دار عالم ہونا ضروری ہے لیکن اس بات کو تسلیم کرنے کے ساتھ یہ اعتراف بھی ضروری ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں ہم مشرقی پاکستان والے غلطی کرتے نظر آتے ہیں کہ تبحرِ علمی اور تنقید دونوں ایک چیز نہیں۔ عالم وہ ہے جو مبہم متن کی توضیح، الفاظ و محاورات کی تحقیق اور عبارت کی غلطیوں کو درست کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہے لیکن بنیادی طور پر وہ نقاد نہیں

ہوتا۔ مثال کے طور پر مغرب میں اسکیٹ، پولارڈ، گریگ اور ای کے چیمبرز وغیرہ کو لیجئے جو بنیادی طور پر عالم تصور کئے جاتے ہیں۔ ادب میں ان کی خدمات بے حد قابل قدر ہیں۔ اسکیٹ اور پولارڈ، چوسر کی تصانیف کے زبردست عالم ہیں اور گریگ اور ای کے چیمبرز، شیکسپیر کے عالموں میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ جدید تنقید نگاری ان کی خدمات کو نظر انداز نہیں کر سکتی لیکن جب ہم انگریزی تنقید نگاری کے متعلق سوچتے ہیں تو ہمارے سامنے کولرج، بریڈلے، مارک وان ڈورن یا میتھیسن کے نام آتے ہیں۔ ان لوگوں کا تعلق ادبی مسائل، خصوصاً تشریح و تحلیل کے مسائل سے ہے نہ کہ متن کی صحت کی تحقیق و تعین سے۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مشرقی پاکستان میں تنقید نگاری اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک اس بنیادی فرق کو تسلیم نہ کرلیا جائے۔ مثال کے طور پر یہ بات ڈاکٹر شہید اللہ اور منشی عبدالکریم کے لئے یقیناً باعث شرف ہے کہ ان کو عالم اور کتابوں کے شیدائی تسلیم کیا جائے جس میں وہ یقیناً نہایت بلند درجہ رکھتے ہیں۔ اس طرح پروفیسر منصور الدین جیسے شخص کو بھی، جن کی خدمات بنگلہ لوک گیتوں کے سلسلہ میں مشہور ہیں، عالموں میں شمار کرنا چاہیئے۔

ہم ادبی مورخوں اور سوانح نگاروں کو بھی نقاد تسلیم کرتے نظر آتے ہیں۔ اگر ادب کی تاریخ اور سوانحمری لکھنے والے واقعی نقاد ہوتے تو انگریزی اور امریکی ادب کی ایسی تاریخیں جو طلباء کے کام آتی ہیں ان کے مصنف بھی بڑے نقاد ہونے کا دعویٰ کرتے۔ کومپٹن ریکٹ جو ایک مشہور انگریزی کتاب کے مصنف ہیں یا ہڈسن جنہوں نے انگریزی ادب کے مطالعہ کے بارہ میں کتاب لکھی ہے۔ ان دونوں کو نقاد کی حیثیت سے پرکھ کر دیکھئے۔ جس معیار کے مطابق کومپٹن اور ہڈسن کو نقاد تسلیم نہیں کیا جاسکتا اس میں اور ہمارے معیار میں اس قدر واضح فرق ہے کہ اس پر زور دینے کی ضرورت نہیں۔

رہا ان تنقیدوں کا معیار جو ۱۹۴۷ء سے لیکر اب تک لکھی گئی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بیشتر نقادوں کی سب سے بڑی دشواری بنگلہ میں ایسی معیاری تصانیف کا فقدان ہے جن کی روشنی میں موجودہ تحریروں کی قدر و قیمت متعین کی جاسکے۔

جدید بنگلہ ادب کی بیشتر اصناف مغرب سے مستعار ہیں مثلاً ڈراما، ناول، مختصر افسانے اور شاعری میں بیلڈ، سانیٹ اور بلینک ورس وغیرہ۔ یہ سب کی سب ان لوگوں کی کاوش فکر کا نتیجہ ہیں جو مغربی نمونوں سے متاثر ہوئے۔ اگر کوئی جدید نقاد ان اصناف کی قدر و قیمت متعین کرنا چاہتا ہے تو اس کا علمی پس منظر وہی ہونا چاہیئے جو ان اصناف کو برتنے والے شعرا کا ہے۔ کسی شخص کا ملٹن سے پوری واقفیت کے بغیر بنگلہ نظم معرا پر بحث کرنا یا ہومر اور ملٹن کی شاعری پر عبور حاصل کئے بغیر کیقباد اور میکائل دت کے بیلڈوں پر تنقید کرنا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح مولیر، شیکسپیر، فیلڈنگ یا فلوبیر کو پڑھے بغیر بنگلہ ڈراموں یا ناولوں پر تنقید ناممکن ہے۔ ٹیگور اور سرت چٹرجی سے بنکم چندر چٹرجی کا موازنہ ہمیں ادب کو سمجھنے میں کوئی مدد نہیں دے سکتا۔

بعض لوگ سنسکرت کی تنقید شعر کو ارسطو کی بوطیقا کا مشرقی نعم البدل سمجھتے ہیں۔ اس میں یہ خیال کارفرما نظر آتا ہے کہ مغربی نمونوں کے بغیر مشرقی ادب پر بحث کی جاسکتی ہے۔ مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ مذکورہ تنقید شعر کی خوبیوں سے انکار نہیں لیکن اس سے نئی اصناف کو سمجھنے میں کوئی مدد نہیں ملتی جو مغرب کی پیداوار ہیں اور جنہیں انیسویں اور بیسویں صدی میں بنگلہ ادب نے اپنایا ہے۔

معیاری تصانیف کی عدم موجودگی سے قطع نظر بنگلہ میں فن تنقید نگاری کے ترقی نہ کرنے کی ایک معاشی وجہ بھی ہے۔ جب کوئی نقاد کسی ادیب پر تنقید کرتا ہے تو اس پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ وہ کسی ہمعصر ادیب کے ذریعۂ معاش کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ چونکہ کسی کتاب پر تنقیدی اعتراضات اس کے مصنف کی ادبی حیثیت کو خطرے میں ڈال سکتے ہیں، اس لئے یہ شبہ بے جا بھی نہیں۔ ہمارے ہاں تنقید شخصی تنقید تصور کی جاتی ہے، اسے نقاد کی بدنیتی پر محمول کیا جاتا ہے اور ناقد کو جائز تحقیق کے باب میں اقدار متعین کرنے والے کی بجائے ذاتی دشمن سمجھ لیا جاتا ہے (جیسا کہ کم و بیش دنیا میں ہر کہیں ہوتا ہے) بدقسمتی سے ابھی تک یہ تصور پیدا نہیں ہوسکا کہ بے تعلقی یا غیر جانبداری کے ساتھ ایک دوست کی ادبی کاوشوں پر بھی نظر ڈالی جاسکتی ہے۔ ہماری تنقیدی تحریروں میں جو ذاتی تلخی پائی جاتی ہے اس کی بڑی وجہ یہی ہے۔ اسی بنا پر عموماً

(باقی صفحہ ۵۷ پر)

لالۂ کہسار

خوشحال خان خٹک
مترجمہ: شہاب رفعت

پیشِ نظر ہیں کتنے جہاں — تو ہی نہ دیکھے اے ناداں
کئی زمینیں ایسی ہی — اور فلک بھی بے پایاں
تیرے دل میں سبھی سمائے — عرش سے برتر، اے انساں!
دل کا آئینہ صیقل کر — دیکھ لے تا وہ جانِ جہاں
دیکھ لے گر یہ نظارہ — تجھ سے جدا ہو کب یزداں

★

قاز بھی ہے پردار اور باز — اور نگران کی پرواز
جیسا قد ویسی پوشاک — جیسی صورت ویسا ناز
چادر عقل کی کاڑھی ہوئی — اور نہ سونے کی پشواز
کشتی اتھلے جل میں چلے — گہرے دریاؤں میں جہاز
موش ہو کتنا ہی تیراک — کب ہو مگرمچھ کا انباز
جنگلی بلے میں یہ تاب — چیتے پر ہو دست دراز

★

کیسی دلکش ہے یہ بہار — اور اس پر یہ بانگ ہزار
اسپ عراقی، برق خرام — ران تلے چنچل رہوار
ہاتھوں پر وہ باز ہی باز — ہر سو بے اندازہ شکار
سب سے بانکا باز آگے — اور عقب میں باز ہزار
کتنے شکاری ڈور بندھے — کھلتے ہی جا لیں جو شکار!
ہر صورت تسکین تمام — دل میں صرف خیالِ یار
ایسے شغل پر اے خوشحال — فرصتِ صبح و شام نثار

★

زیرِ نقاب وہ جانِ جہاں — عاشق سے ہے ناز کناں
بال جنہیں کاڑھا ہے ابھی — شانوں پر ہیں آویزاں
جب وہ آنگن میں آئے — ہائے پھر آنگن کا سماں
جانِ عاشق کے درپے — اور غیروں سے خندہ زناں
ڈھنگ ستم کا ڈھونڈ لیا — گھونگٹ کاڑھ کے میں قرباں
اے خوشحال رہے یہ فن — ایسی غزل، ایسے عنواں

★

جب تک مرد ہو بے کردار — کیا اس کی خالی گفتار
گالیاں سن کر جو چپ ہو — ننگِ صفِ مردانِ کار
وہ ہے جری جو بدلہ لے — بدلہ ہے مردوں کا شعار
بس وہ کرم ہے حسنِ کرم — جس کے سبب ہو ننگ نہ عار
مرد ہی کیا ہے جس کو نہ ہو — کوئی بھی پاس عزّ و وقار
مہرہ بھی ہیں زہر بھی ہیں — ایسے لوگ ہیں صورتِ مار
برق و باراں سرتا پا — اُن مردوں پہ جان نثار
اپنے کمال میں آپ لگن — نے زر چاہیں نے دینار
مرد کو ہے فکرِ ناموس — عزت کا بس اک معیار
نامردوں کو فخرِ نسب — مرد ورائے بند و حصار
یہ باتیں خوشحال کی دیکھ
لعل و گوہر تار بتار!

★

"اگر اعتبار ہوتا"

(ایک ایکٹ کا ڈرامہ)

آغا ناصر

کردار:-

* درشہوار
* عدنان ملک
* سکینہ ——— درشہوار کی خادمہ
* چمن ——— عدنان ملک کا خادم

وقت : موجودہ

مقام : ایک پارک

*

(منظر کسی شہر کے ایک پرانے پارک کا ایک حصہ—— داہنی طرف ایک پتھر کی بنچ خالی پڑی ہے—— موسم بہار کی چمکیلی خوشگوار صبح—— درشہوار پارک کے بائیں دروازے سے داخل ہوتی ہے اس کی عمر ساٹھ سال کے قریب ہے لیکن ابھی تک حسین نظر آتی ہے۔ اس کے بال روئی کے گالوں کی طرح سفید ہیں، ضعیفی کے باوجود اس کی آنکھوں میں چمک اور اس کے چہرے پر شادابی کا رنگ نمایاں ہے—— وہ اپنی نوجوان خادمہ سکینہ کے کاندھے پر ہاتھ رکھے آہستہ آہستہ باغ میں داخل ہوتی ہے۔ دوسرے ہاتھ میں ایک چھڑی ہے جسے وہ سہارے کے طور پر استعمال کرتی ہے)۔

درشہوار: (پھولے ہوئے سانس کے ساتھ) ا۔ ہا۔ ہم ٹھیک وقت پر آگئے مجھے ڈر تھا کہیں ہماری بنچ گھر نہ گئی ہو۔ کس قدر حسین صبح ہے آج کی۔

سکینہ: دھوپ کتنی بھلی معلوم ہو رہی ہے۔

درشہوار: ہاں۔ خصوصاً تمہاری جیسی نوجوان کے لئے (بنچ پر بیٹھ جاتی ہے) آج میں روزانہ سے زیادہ تھک گئی ہوں (سکینہ کی طرف دیکھ کر) اوہ۔ تم جانا چاہتی ہو۔

سکینہ: جی۔ نہیں تو مالکن۔ میں تو—— وہ......

درشہوار: گھبراؤ نہیں، میں جانتی ہوں تمہیں بچے اچھے لگتے ہیں۔ جاؤ تم پارک کے اس حصہ میں ہو آؤ جہاں آیائیں بچوں کو لیکر آتی ہیں لیکن دیکھو زیادہ دیر نہ کرنا۔

سکینہ: (خوش ہو کر) بہت اچھا مالکن۔

(سکینہ جانے کے لئے مڑتی ہے لیکن درشہوار اسے روک لیتی ہے)

درشہوار: ٹھیرو۔۔۔

سکینہ: (مڑ کر) جی مالکن؟

درشہوار: تم وہ دانے بھی ساتھ ہی لئے جا رہی ہو جو میں چڑیوں کو چگانے کے لئے لائی تھی۔

سکینہ: اوہ۔ معاف کیجئے گا۔ میں بالکل بھول گئی تھی۔

(سکینہ کپڑے کی ایک چھوٹی سی تھیلی درشہوار کو دیکر چلی جاتی ہے)

درشہوار: (تھیلی کھولتے ہوئے) بس اب آپ ہی آپ سب آجائیں گی۔

(وہ تھیلی سے مٹھی بھر کر دال کے دانے نکالتی ہے اور زمین پر بکھیرنے لگتی ہے۔ قسم قسم کی چڑیاں، جن میں طوطے۔ کبوتر اور چھوٹی چڑیاں شامل ہیں۔ چاروں طرف کے درختوں سے آکر نیچے آجاتی ہیں اور دانے چگنے لگتی ہیں)۔

درشہوار: یہ مجھے پہچاننے لگی ہیں۔ (وہ بار بار تھیلی میں ہاتھ ڈال کر مٹھیاں بھر کر دانے نکالتی ہے اور بکھیرتی ہے) یہ طوطوں کے لئے ہے۔ اور یہ بڑے بڑے پرندوں کے لئے ہیں اور یہ چھوٹی معصوم چڑیوں کے لئے—— اور یہ—— ارے! یہ چڑیا کتنی پیاری ہے۔ بالکل ڈرتی نہیں—— آ۔ میری ہتھیلی پر بیٹھ کر کھالے۔ آ۔ آ—— ارے رے رے۔ تم دونوں جھگڑنے کیوں لگے۔

والے بہت ہیں۔ کل میں اور زیادہ لاؤں گی۔ لے لے۔

آ۔ جا۔ ہا ہا۔

(پارک کے دائیں جانب والے دروازے سے عدنان ملک اپنے نوکر چمن کے کاندھے کا سہارا لئے داخل ہوتا ہے۔ وہ ستر سال سے زیادہ عمر کا آدمی ہے۔ اور اپنی ایک ٹانگ گھسیٹ کر چلتا ہے۔ چہرے سے بدمزاج قسم کا بڈھا معلوم ہوتا ہے۔)

عدنان ملک: (بڑبڑاتے ہوئے) خوامخواہ۔ بالکل فضول۔ وقت کی بربادی ہے اور کیا۔ وہ قصے کہانیاں سنا کر ایک دوسرے کا وقت خراب کر رہے ہیں۔

چمن: لیکن آپ یہاں بیٹھ سکتے ہیں ملک (درشہوار والی بنچ کی طرف اشارہ کرکے) وہاں اس بنچ پر صرف ایک بڑی بی بیٹھی ہیں اکیلی۔

(درشہوار اپنی گردن موڑ کر ان کی طرف دیکھتی ہے اور ان کی گفتگو سننے لگتی ہے)۔

عدنان: نہیں نہیں چمن — میں اپنے لئے ایک تنہا بنچ چاہتا ہوں۔

چمن: مگر خالی بنچ تو یہاں کوئی بھی نہیں ہے مالک۔

عدنان: لیکن وہ ادھر کونے والی بنچ میری ہے۔

چمن: مگر اس وقت تو اس پر وہ تین مولوی قسم کے لوگ بیٹھے ہیں ملک۔

عدنان: خوامخواہ۔ بالکل فضول — وہاں بیٹھے قصے کہانیاں سنا رہے ہیں۔ ہونہہ۔ وہ کتنی دیر میں اٹھیں گے وہاں سے۔

چمن: میں کیا کہہ سکتا ہوں مالک!

عدنان: اونہہ۔ جیسے بنچ خرید لی ہے انہوں نے۔ جم کر ہی رہ گئے ہیں کم بخت — چلو۔ چلو یہاں سے چمن۔

(وہ دونوں دانے چگتی ہوئی چڑیوں کے قریب سے گزرتے ہیں)

درشہوار: (گھبرا کر) ذرا دیکھ کر۔ ذرا دیکھ کر۔

عدنان: (مڑ کر) کیا آپ مجھ سے کچھ کہہ رہی ہیں محترمہ؟

درشہوار: جی ہاں۔ آپ ہی سے

عدنان: کیا چاہتی ہیں آپ؟

درشہوار: آپ نے چڑیوں کو اڑا دیا۔ وہ بیچاری دانہ چگ رہی تھیں۔

عدنان: ہونہہ — میں چڑیوں کا پابند نہیں ہوں۔

درشہوار: لیکن میں تو ہوں —!

عدنان: تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ یہ پبلک پارک ہے۔

درشہوار: تو پھر آپ یہ شکایت کیوں کر رہے تھے کہ مولویوں نے آپ کی بنچ پر قبضہ کر لیا ہے۔

عدنان: محترمہ آپ سے تعارف تک نہیں ہے۔ آپ کو مجھ سے مخاطب ہونے کا کوئی حق نہیں ہے — جی — چمن۔ آؤ۔

(دونوں چلے جاتے ہیں)

درشہوار: بڈھا کس قدر بدمزاج ہے۔ آخر بعض لوگ بڑھے ہو کر اس قدر چڑچڑے کیوں ہو جاتے ہیں۔ کتنا مزہ آئے اگر اسے آج پورے پارک میں کوئی بنچ ہی خالی نہ ملے۔ ایسے لوگوں کا یہی علاج ہے۔ اوہ۔ وہ پھر آ رہا ہے — کس قدر دھول اڑاتا ہے چلتے ہوئے۔ جیسے کچی سڑک پر گدھا گاڑی۔

(عدنان ملک اپنے نوکر کے ہمراہ پھر داخل ہوتا ہے)

عدنان: خوامخواہ۔ بیہودہ بات ہے منتظمین کو موسم سرما میں زیادہ بنچوں کا انتظام کرنا چاہئے کس قدر واہیات بات ہے — خیر چمن میاں۔ میرا خیال ہے میں اسی بنچ پر بیٹھا جاتا ہوں، جس پر یہ ضعیف خاتون بیٹھی ہیں۔

(وہ بڑبڑاتا ہوا درشہوار والی بنچ کے آخری کنارے پر بیٹھ جاتا ہے۔ چند لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا ہے پھر اس کی چھڑی کو چھوتے ہوئے آہستہ سے کہتا ہے آداب عرض۔

درشہوار: تو آپ پھر آ گئے —؟

عدنان: میں پھر دہراؤں گا محترمہ کہ ہم ایک دوسرے سے متعارف نہیں ہیں۔

درشہوار: میں آپ کے آداب کا جواب دے رہی ہوں۔

عدنان: سلام کے جواب میں سلام کیا جاتا ہے۔

درشہوار: آپ کو میری بنچ پر بیٹھنے کی اجازت لینی چاہئے تھی۔

عدنان: یہ بنچ اس پارک کی ہے آپ کی نہیں — اور یہ ایک پبلک پارک ہے۔

درشہوار: تو آپ نے اس بنچ کو جس پر مولوی صاحبان بیٹھے تھے اپنی کیوں کہا تھا؟

عدنان: بہت خوب۔ خوب۔ میں لاجواب ہوں — (بڑبڑاتے ہوئے) اتنی ضعیف العمر عورتوں کو تو گھر میں بیٹھنا چاہئے نہ کہ......

درشہوار: بڑبڑانا بند کر دیجئے میں یہاں سے اس طرح جانے والی نہیں ہوں۔

عدنان: (جیب سے رومال نکال کر اپنے جوتوں کی گرد صاف کرتا ہے)۔
ابھی اس پارک کی سڑکوں پر پانی کے چھڑکاؤ کی بہت ضرورت ہے۔
کس قدر گرد ہے۔

درشہوار: واہ واکیا بات ہے ـــ رومال سے جوتے صاف کرنا۔

عدنان: کیا کہا؟

درشہوار: (مسکراتے ہوئے) کیا آپ منہ پونچھنے کے لئے جوتے کا برش استعمال کرتے ہیں؟

عدنان: آپ کو مجھ پر تنقید کرنے کا کیا حق ہے؟

درشہوار: اس وقت ایک پڑوسی کی حیثیت سے یہ میرا فرض ہے ـــ

عدنان: (نوکر سے) چمن۔ میری کتاب دو۔ اب زیادہ دیر یہ حماقت میں برداشت نہیں کر سکتا۔

درشہوار: معاف کیجئے خاتون۔ مجھے واقعی افسوس ہے۔ لیکن دیکھئے نا اگر آپ ایسی باتوں میں دخل اندازی نہ کریں جن سے آپ کا کوئی واسطہ نہیں ہے تو ـــ کوئی حرج تو نہیں ہے محترمہ!

درشہوار: میں عام طور پر وہ سب کہہ دیتی ہوں جو سوچتی ہوں۔

عدنان: اچھا تو پھر کہتی رہیئے۔ چمن لاؤ میری کتاب دو ـــ

چمن: لیجئے مالک۔

(عدنان کتاب لے کر کھول لیتا ہے۔ پھر جیب سے چمڑے کا ایک بٹوا نکالتا ہے اور اپنی آنکھوں سے چشمہ اتار کر چمڑے کے بٹوے میں سے پڑھنے کا چھوٹا شیشہ نکال کر چشمہ کے شیشوں پر لگاتا ہے ـــ اور عینک آنکھوں پر لگا لیتا ہے)

درشہوار: میں سمجھی تھی کہ ابھی آپ خورد بین بھی لگائیں گے۔

عدنان: کیا کہا ـــ! پھر کہی ـــ

درشہوار: معلوم ہوتا ہے آپ کی نگاہ بالکل کمزور ہے۔

عدنان: ہو یا نہ ہو ـــ آپ سے پھر بھی ہزار درجہ اچھی ہے۔

درشہوار: جی بجا ارشاد فرمایا۔

عدنان: اس کی گواہی وہ لاتعداد خرگوش اور ہرن دے سکتے ہیں جو میری گولی کا نشانہ بن چکے ہیں۔

درشہوار: اچھا۔ تو کیا آپ شکار سے بھی شوق فرماتے ہیں۔

عدنان: ہاں میں بڑا اچھا شکاری تھا اور اب بھی کبھی کبھی میں شکار پر جاتا ہوں ـــ وقت گذاری کے لئے۔

درشہوار: وقت گزارنے کے لئے ـــ؟؟ ہاں ٹھیک ہی ہے، وقت گزاری کے سوا اب اور آپ کر ہی کیا سکتے ہیں۔

عدنان: کیا سمجھتی ہیں آپ ـــ آپ اس چیتے کی کھال دیکھ سکتی ہیں جو ۳۵ سال پہلے میں نے مارا تھا۔ ابھی تک اس کی کھال میری بیٹھک میں ٹنگی ہوئی ہے۔

درشہوار: اور میں آپ کو اپنے گھر میں دس چیتوں کی کھالیں دکھا سکتی ہوں ـــ واہ واصاحب کیا دلیل ہے

عدنان: اچھا محترمہ۔ آپ مجھے معاف فرمائیں۔ میں ذرا کچھ پڑھنا چاہتا تھا۔

درشہوار: بہتر ہے۔ آپ پڑھئے نا میں نے منع کب کیا ہے۔

عدنان: شکریہ۔ (عدنان جیب سے بٹوہ نکال کر پان کھاتا ہے) کیا آپ بھی شوق فرمائیں گی؟

درشہوار: شکریہ (وہ ایک پان لے لیتی ہے)

عدنان: میں مراد آبادی تمباکو کھاتا ہوں۔

درشہوار: اور میں بھی (دونوں ہنستے ہیں) کیا خوب اتفاق ہے!

عدنان: لیجئے۔

درشہوار: شکریہ ـــ (خود سے) تو پان نے ہم دونوں کی دوستی کرا دی۔

عدنان: آپ برا تو نہ مانیں گی اگر میں بلند آواز میں کتاب پڑھوں۔

درشہوار: قطعی نہیں ـــ آپ کا جیسے جی چاہے آپ پڑھ سکتے ہیں۔

عدنان: (پڑھتا ہے) "تب تو مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہئے ہے نا؟ ساہوکار کی بیوی نے کہا "جلد ہی ہم ایک دوسرے کے بے تکلف دوست بن جائیں گے"۔ راستنیاک بولا "اگرچہ آپ کی دوستی میرے لئے نعمت غیر مترقبہ ہوگی لیکن اس دوستی سے جی ڈرتا ہے" ـــ یہ بالزاک کے ناول "پیر گوریو" کا اقتباس ہے جسے نسیمہ ہمدانی نے ترجمہ کیا ہے۔ سن رہی ہیں نا آپ ـــ؟

درشہوار: غالباً۔

عدنان: (پڑھتا ہے) جن لوگوں کو اس قسم کی گفتگو کا پہلے پہل موقعہ ملا ہو انہیں اس قسم کے مہمل فقرے گھڑے گھڑائے مل جاتے ہیں۔ لیکن عورتوں کو ہمیشہ بہت پسند آتے ہیں ـــ"

درشہوار: (ہنسنے لگتی ہے)

عدنان: اس میں کچھ نظمیں بھی ہیں (وقفہ)

میرے پہلو بہ پہلو جب وہ چلتی تھی گلستاں میں
فراز آسماں پر کہکشاں حیرت سے تکتی تھی

درشہوار: آپ کو اتنی ساری عینکوں اور شیشوں کی مدد سے پڑھتے ہوئے دیکھ کر کچھ بہت ہی عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔

عدنان: تو کیا آپ بغیر عینک کے پڑھ سکتی ہیں؟

درشہوار: یقیناً۔

عدنان: آپ کی عمر کیا ہے؟ — آپ یقیناً مذاق کر رہی ہیں۔

درشہوار: لائیے کتاب دیجئے مجھے (وہ کتاب درشہوار کے ہاتھ میں دیتا ہے)
(وہ پڑھتی ہے)

مرے پہلو بہ پہلو جب وہ چلتی تھی گلستاں میں
فراز آسماں پر کہکشاں حیرت سے تکتی تھی
محبت جب چمک اٹھتی تھی اس کی چشم خنداں میں
خمستانِ فلک پر نور کی صہبا چھلکتی تھی

عدنان: کمال ہے۔ آپ کی نگاہ واقعی بہت اچھی ہے۔

درشہوار: (خود سے) یہ نظم مجھے زبانی یاد تھی۔

عدنان: مجھے شاعری سے بہت دلچسپی ہے۔ نوجوانی میں میں نے بھی چند ایک نظمیں کہی تھیں۔

درشہوار: کس قسم کی نظمیں؟

عدنان: ہر قسم کی — چند ایک امریکہ کے سفر کے دوران کہی تھیں؛ وہ بہت اچھی تھیں۔

درشہوار: کیا؟ — تو کیا آپ امریکہ بھی جا چکے ہیں؟

عدنان: کئی مرتبہ —— پہلی بار جب میں امریکہ گیا تو میری عمر صرف چھ سال کی تھی۔

درشہوار: تب تو غالباً آپ کولمبس کے ساتھ گئے ہوں گے۔

عدنان: (بے اختیار ہنستا ہے) خوب۔ بہت خوب! — اور چند نظمیں میں نے سرتاج پور میں کہی تھیں۔ سرتاج پور ایک بہت ہی پُرفضا مقام ہے۔ دریائے جہلم کے کنارے ایک بہت ہی حسین بستی۔ لہلہاتے ہوئے کھیتوں اور سبزہ زاروں سے گھرا ہوا۔ آہ کتنی میٹھی یاد ہے اس بستی کی۔ سرتاج پور۔ میں وہیں کا رہنے والا ہوں۔

درشہوار: واقعی؟

عدنان: ہاں۔ میں وہیں پیدا ہوا۔ وہیں بڑھا پلا۔ کیا آپ نے کبھی وہ بستی دیکھی ہے؟

درشہوار: کیوں نہیں۔ میں کتنی دفعہ یہاں گئی ہوں۔ سرتاج پور سے دو میل دور مغرب میں دریائے جہلم کے عین کنارے ایک بہت بڑی حویلی تھی۔ جو شاید آج بھی وہاں ہو۔ اس حویلی میں میری بہت سی یادیں دفن ہیں۔ بہت ہی خوبصورت جگہ تھی۔ اس کے چاروں طرف شہتوت اور کھجوروں کے درخت تھے۔ بڑا پیارا سا نام تھا اس کا۔ دیکھئے میں بھول گئی۔ بھلا سا نام تھا۔ ہاں یاد آیا۔ "راج محل"

عدنان: (جذباتی سا ہو کر) راج محل؟؟

درشہوار: کیوں؟ کیا یہ نام آپ کا جانا پہچانا ہے؟

عدنان: ہاں بہت زیادہ جانا پہچانا۔ راج محل۔ دریائے جہلم کے کنارے۔ سرتاج پور سے ۲ میل۔ آہ۔ آج سے چالیس سال پہلے اس راج محل میں ایک لڑکی رہتی تھی۔ بہت ہی حسین۔ بے حد خوبصورت۔ میں نے زندگی میں اس سے خوبصورت لڑکی کبھی نہیں دیکھی۔ کیا نام تھا اس کا۔؟ ہاں۔ شہوار۔ شہوار۔ درشہوار۔!

درشہوار: (جذباتی ہو کر) درشہوار؟

عدنان: ہاں (وہ دونوں ایک دوسرے کو عجیب عجیب نگاہوں سے دیکھتے ہیں)

درشہوار: (خود پر قابو پاتے ہوئے) کچھ بھی نہیں۔ مجھے اپنی پیاری سہیلی کا خیال آ گیا۔ درشہوار۔ وہ میری سہیلی تھی۔

عدنان: اوہ۔ کتنی عجیب بات ہے!

درشہوار: اسے لوگ راج محل کا کنول کہہ کر پکارتے تھے۔

عدنان: ہاں۔ "راج کنول"۔ وہ سارے علاقے میں اسی نام سے مشہور تھی۔ آہ۔ میں آج بھی۔ اس کے تصور کو حقیقت سمجھ کر دیکھ سکتا ہوں۔ دریا کی طرف والے دریچہ میں جہاں سرخ گلابوں کی جھاڑیاں تھیں۔ ہر صبح وہ اس دریچہ میں کھڑے ہو کر دریا کا نظارہ کیا کرتی تھی۔ آپ کو یاد ہے؟

درشہوار: ہاں اچھی طرح۔ وہ اس کا کمرہ تھا۔

عدنان :۔ ہر صبح وہ اس دریچہ میں کھڑی ہوتی تھی۔

درشہوار :۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) ہاں مجھے یاد ہے۔

عدنان :۔ وہ حسن کی شہزادی تھی۔ گلاب کی طرح شاداب۔ اس کی آنکھیں بالکل سیاہ تھیں اور بال بہت لانبے تھے۔ اس کے چہرے پر ہر وقت ایک عجیب سی چمک رہتی تھی ——— یوں لگتا تھا جیسے۔ وہ کوئی آسمانی روح ہے جو بھول کر اس دنیا میں آنکلی ہے، وہ ایک خواب تھی۔

درشہوار :۔ (خود سے) اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ وہ خواب اس وقت تمہارے برابر ہی بیٹھا ہوا ہے تو تمہیں اس خواب کی تعبیر کا بھی اندازہ ہو جائے۔ (بلند آواز میں) لیکن وہ بہت بدقسمت تھی۔ اس کی محبت کی کہانی بڑی پُر درد ہے۔

عدنان :۔ (آہ بھر کر) بہت ہی پُر درد؟

(دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں)

درشہوار :۔ کیا آپ کو معلوم ہے؟

عدنان :۔ ہاں۔

درشہوار :۔ (خود سے) قسمت کے کیا کرشمے ہیں۔ یہ آدمی میرا عاشق ہے۔

عدنان :۔ اس کی کہانی کسے معلوم نہیں۔ اور پھر اس کا عاشق تو میرا خالہ زاد بھائی تھا۔ وہ مجھے اپنا دوست سمجھتا تھا اور اس لئے ہمارے درمیان کبھی کوئی بات راز نہیں رہی۔

درشہوار :۔ اوہ۔ میری سہیلی نے اپنے ایک خط میں اپنی محبت کی کہانی لکھ کر بھیجی تھی مجھے۔ تمہارا بھائی ہر روز علی الصبح گھوڑے پر سوار اس راستہ سے گذرتا تھا جس طرف درشہوار کا دریچہ تھا۔ وہ دریچہ میں کھڑی ہوتی تھی اور گذرتے گذرتے تازہ گلاب کے پھولوں کا ایک گلدستہ بالکونی کی طرف اچھال دیتا اور میری سہیلی دریچہ سے ہاتھ بڑھا کر اسے دبوچ لیا کرتی۔

عدنان :۔ اور دوپہر ڈھلے جب وہ شہسوار اسی راستے سے واپس ہوتا تو آپ کی سہیلی سفید پھولوں کا ایک ہار اپنے دریچہ سے نیچے پھینکتی اور میرا بھائی اسے دبوچ لیتا کیوں ——— ؟ ایسا ہی تھا نا ؟؟

درشہوار :۔ ہاں ——— مگر میری بدقسمت سہیلی کے والدین اس کی شادی کسی تاجر سے کرنا چاہتے تھے جسے وہ بالکل پسند نہ کرتی تھی۔

عدنان :۔ اور ایک رات جب میرا بھائی اس کی بالکونی کے نیچے گلابوں کی جھاڑیوں میں اس واسطے چھپا ہوا تھا کہ چاندنی رات میں اسے گاتے ہوئے سنے۔ تو بھی تاجر جو اُس کا منگیتر تھا جانے کہاں سے آ گیا تھا۔

درشہوار :۔ اور اس نے تمہارے بھائی کو برا بھلا کہا تھا۔

عدنان :۔ اور میرے بھائی کو اس کی اس حرکت پر سخت غصہ آیا تھا

درشہوار :۔ اور پھر ان دونوں میں باقاعدہ لڑائی ہوئی تھی۔

عدنان :۔ اور میرے بھائی نے اس کے منگیتر کو قتل کر دیا تھا، پھر گرفتاری کے ڈر سے میرا بھائی دو تین روز تک گاؤں ہی میں چھپتا پھرا تھا اور پھر کسی نامعلوم مقام کو بھاگ گیا تھا۔

درشہوار :۔ معلوم ہوتا ہے آپ کو یہ کہانی اچھی طرح معلوم ہے۔

عدنان :۔ اور میرا خیال ہے آپ کو بھی ——— ؟

درشہوار :۔ میں نے کہا نا میری سہیلی نے سارے حالات مجھے لکھے تھے۔

عدنان :۔ اور میرے بھائی نے مجھے بتائے تھے (خود سے) یہ عورت یقیناً درشہوار ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ قسمت نے آج ہمیں اک بار پھر ملا دیا ہے۔

درشہوار :۔ (خود سے) یہ مجھے پہچان نہیں سکا ہے۔ یا پھر آخر میں اسے کیوں بتاؤں ——— ! اس کے ماضی کی حسین یادوں کے طلسم کو اسی طرح قائم رہنا چاہیئے۔

عدنان :۔ (خود سے) اس بیچاری کو کیا معلوم کہ وہ اس وقت اپنے محبوب سے باتیں کر رہی ہے۔ یہ جان کیسے سکتی ہے؟۔ میں اسے کبھی نہیں بتاؤں گا۔

درشہوار :۔ اور کیا وہ آپ ہی تھے جس نے اپنے خالہ زاد بھائی کو درشہوار کو بھول جانے کا مشورہ دیا تھا؟

عدنان :۔ یہ کیسے ——— ؟ میرا بھائی اسے کبھی بھی نہ بھلا سکا ——— ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں۔

درشہوار :۔ لیکن میں کس طرح یقین کروں؟

عدنان :۔ میں بتاتا ہوں۔ کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ سرتاج پور سے فرار ہونے کے بعد اس نے میرے گھر میں پناہ لی ———

چند دن وہاں گذارنے کے بعد جھانسی چلا گیا اور پھر جھانسی سے شیلانگ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس عرصہ میں اس نے درشہوار کو بہت سے خطوط لکھے لیکن اس نے ایک کا بھی جواب نہ دیا۔ شاید اس کے والدین نے وہ خط راستے ہی میں روک دئے ہوں آخر عدنان ملک کو یقین ہو گیا کہ اب وہ اس سے کبھی نہ مل سکے گا۔ ناامید اور مایوس ہو کر اس نے فوج میں نوکری کر لی اور افریقہ کے محاذ پر چلا گیا۔ جہاں وہ بہادری کے ساتھ لڑتا ہوا مارا گیا ۔۔ کہتے ہیں مرتے وقت بھی اس کے ہونٹوں پر صرف ایک ہی نام تھا۔ درشہوار۔ درشہوار۔ درشہوار!

درشہوار:۔ (خود سے) کس قدر عالیشان جھوٹ ہے۔

عدنان:۔ (خود سے) میں خود کو اس سے زیادہ بہادری کے ساتھ نہیں مار سکا تھا۔

درشہوار:۔ آپ کو اس کی موت کا سخت رنج ہوا ہوگا!

عدنان:۔ بے شک۔ وہ مجھے اپنی جان کی طرح عزیز تھا۔۔ اور پھر میں یہ بھی سوچتا تھا (ٹھنڈی سانس بھر کر) کہ درشہوار اس کے حالات اور موت سے بے خبر اپنے باغیچہ میں تتلیاں پکڑتی پھرتی ہوگی، ویسی ہی شوخی اور بے فکری کے ساتھ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

درشہوار:۔ نہیں یہ غلط ہے۔

عدنان:۔ عام طور پر عورتیں ایسا ہی کرتی ہیں۔

درشہوار:۔ نہیں۔ درشہوار عام عورتوں سے بہت مختلف تھی۔ میری سہیلی نے دنوں۔ ہفتوں اور سالوں عدنان کے خط کا انتظار کیا۔ لیکن اس کے پاس کوئی خط نہ آیا اور آخر ایک شام سورج غروب ہونے کے فوراً بعد جب آسمان پر پہلا ستارہ طلوع ہوا تو درشہوار اپنے گھر سے نکل کر دریا کی طرف روانہ ہوئی۔ بس اب وہی دریا تو اس کا محبوب تھا وہ دور تک اس راستہ پر چلتی گئی جس پر اس کا محبوب گھوڑے پر سوار گذرا کرتا تھا۔ آخر بہت دور جا کر وہ رک گئی یہاں دریا کا پاٹ بہت چوڑا تھا۔ وہ دیر تک کنارے پر بیٹھی دوڑتی شور کرتی موجوں کو دیکھتی رہی۔ اس نے ریت پر اپنی انگلی سے اپنے محبوب کا نام لکھا: عدنان عدنان۔ عدنان ملک۔ اور پھر وہ قریب کے ایک ٹیلے پر چڑھ گئی۔ اس کی نگاہیں افق پر لگی ہوئی تھیں ۔۔ دور کھجوروں کے جھنڈ کی آڑ سے آخری تاریخوں کا چاند جھانک رہا تھا۔ دریا زخمی شیر کی طرح چنگھاڑ رہا تھا، اور اس کے بعد ۔۔ اس کے بعد۔ کیا میں بتاؤں کیا ہوا؟

عدنان:۔ بس کرو۔ بس کرو۔ خدا کی پناہ!

درشہوار:۔ اس مچھیرے نے جو اس کی لاش دریا سے نکال کر لایا تھا بتایا کہ ریت میں عدنان کا نام موجوں کی روانی کے باوجود اسی طرح چمک رہا تھا جیسا اس نے لکھا تھا (خود سے) تم مجھ سے جیت نہیں سکتے۔ میری موت تمہاری موت کی کہانی سے کہیں زیادہ دلدوز اور دردانگیز ہے۔

عدنان:۔ (خود سے) یہ مجھ سے زیادہ کامیاب جھوٹ بولنا جانتی ہے۔

درشہوار:۔ (آہ بھر کر) آہ بیچاری درشہوار!

عدنان:۔ (آہ بھر کر) آہ بیچارہ عدنان ملک!

درشہوار:۔ (خود سے) میں اسے ہرگز نہیں بتاؤں گی کہ اس کے فرار ہونے کے چھ مہینے بعد ہی میں نے شادی کر لی تھی۔

عدنان:۔ (خود سے) میں اسے ہرگز نہیں بتاؤں گا کہ مہاراج پور سے بھاگ کر میں نے تھیٹر میں ملازمت کر لی تھی اور نہایت عیش و عشرت کی زندگی گذارنے لگا تھا۔

درشہوار:۔ قسمت بھی کیسے عجیب عجیب کھیل ہمارے ساتھ کھیلتی ہے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ میں اور تم دو اجنبی، جو اتفاقیہ طور پر ایک دوسرے سے مل گئے ہیں، چند ہی لمحوں بعد اس طرح گفتگو کریں گے جیسے ہم پرانے دوست ہوں۔

عدنان:۔ بڑی عجیب سی بات ہے واقعی۔ اور پھر یہ کہ ہماری ملاقات کا آغاز جھگڑے سے ہوا تھا۔

درشہوار:۔ آپ نے چڑیوں کو جو اڑایا تھا۔

عدنان:۔ ہاں۔ میں اس وقت خراب موڈ میں تھا۔

درشہوار:۔ ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے (بڑے پیار سے) کیا آپ کل بھی آئیں گے؟

(باقی صفحہ ۵۴ پر)

ماہ نو، کراچی، جولائی ۱۹۵۹ء

افسانہ:

کالی اُنگلی

انور ممتاز

ساری دنیا میں ایک پیرس ہے اور پیرس میں ایک شانزالیزے اور شانزالیزے میں سب کچھ ہے۔ پھر میں کسے ڈھونڈ رہا ہوں؟ مجھے کس کی تلاش ہے؟

اس دے سائڈ کافے کی دیواریں پلاسٹک کی بنی ہوئی ہیں۔ ان میں سے شانزالیزے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نظر آرہا ہے۔ خوبصورت کاریں چمک دار سڑک پر تیرتی ہوئی گزر رہی ہیں۔ مُلک مُلک کے سیاح اپنے کندھوں سے کیمرے لٹکائے حسین عورتوں کے بازوؤں میں بازو ڈالے ہشاش بشاش ٹہلتے پھر رہے ہیں۔ حسین عورتوں کے حسین لباسوں میں حسین جسم نظر آرہے ہیں۔ شانزالیزے ایک دلہن کی سج دھج کے ساتھ میرے سامنے ہے۔ پھر میں کیوں بے تاب ہوں؟ میں کیا دیکھنا چاہتا ہوں؟

اور اگر اس دے سائڈ کافے کی پلاسٹک کی دیواروں میں سے میں کچھ نہیں دیکھ سکتا۔ تو یہاں کیوں بیٹھا ہوں؟ میں کتنا بے وقوف ہوں۔

اور میرے پاس مسٹر سن کے لئے انٹروڈکشن لیٹر ہے۔ میں اس کو ڈھونڈنے کے لئے کیوں نہیں چلا جاتا؟ آج صبح جب میں ایک بک سٹال سے پیرس گائیڈ بک خرید رہا تھا، تو ایک نیلی آنکھوں والی دلفریب عورت نے مجھے کہا تھا "میں آپ کے لئے گائیڈ بک سے زیادہ مفید ثابت ہوں گی۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلئے"۔ میں نے اُسے "نو تھینک یو" کیوں کہا۔ وہ میرے لئے یقیناً گائیڈ بک سے زیادہ مفید ثابت ہوتی، اور میں اس دے سائڈ کافے کے شور و غل میں تنہائی محسوس نہ کرتا۔

میں بہت دیر سے اس میز پر تنہا بیٹھا ہوں۔ کتنی دیر تک اس میز کے اردگرد پڑی ہوئی تین خالی کرسیاں میری غمگسار بنی رہیں۔ اب دو کرسیاں کافے کے دوسرے گاہکوں نے میری اجازت سے لے لی ہیں۔ اب میرا تنہائی کا احساس زیادہ گہرا ہو گیا ہے۔ میرے دو خاموش دوست مجھ سے جدا ہو گئے ہیں۔ اب صرف ایک خالی کرسی میرے سامنے سے اٹھا کر کیوں نہیں لے جاتا؟

او میرے خدا! میں سمجھ گیا۔ اس کرسی پر کوئی نہیں بیٹھے گا۔ میں سفید قوموں کی دنیا میں ہوں۔ میں کالی قوم کا فرد ہوں۔ سفید قومیں ترقی یافتہ ہیں، کالی قومیں پسماندہ۔ سفید قومیں حاکم ہیں، کالی قومیں غلام۔ یہ کرسی خالی رہے گی۔ اس کرسی پر کوئی نہیں بیٹھے گا۔

اے میرے خدا! اس کرسی پر کوئی سفید قوم کا نمائندہ نہ بیٹھے۔ سفید قوموں کے نمائندے سیاہ قوموں کے نمائندوں سے بہتر نہیں ہیں۔ سیاہ قوموں کے نمائندے سفید قوموں کے نمائندوں سے بہتر انسان ہیں۔ سفید قوموں کے نمائندے اپنے وطن کی محبت کے ثبوت میں ہیروشیما پر ایٹم بم پھینک دیتے ہیں، سیاہ قوموں کے نمائندے اپنے وطن کی محبت میں اپنے خون کا آخری قطرہ بھی پیش کر دیتے ہیں۔ اے میرے خدا! اس خالی کرسی پر کوئی سیاہ فام انسان آکر بیٹھے۔ مجھے کسی کالی قوم کے فرد کی تلاش ہے۔ میں شانزالیزے کی دلکش فضا میں کسی کالے بدصورت انسان کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ مجھے دے سائڈ کافے کی پلاسٹک کی دیواروں میں سے سب کچھ نظر آتا ہے، لیکن کوئی کالا آدمی نظر نہیں آتا۔

کوئی الجیریا کا کالا باشندہ میرے سامنے بیٹھا ہو تو میں اُسے کہوں: "اپنے وطن پر اپنے خون کا آخری قطرہ بھی قربان کر دو۔ اپنے وطن کے لئے خود مٹنا اپنے وطن کے لئے دوسروں کو مٹانے سے بہتر ہے۔ مٹ جاؤ، اپنے وطن کی آزادی پر قربان ہو جاؤ"۔

کوئی میرا سیاہ فام ہم وطن اس کرسی پر بیٹھا ہو تو میں اسے ایک خوش خبری سناؤں۔ میں اسے بتاؤں کہ پاکستان گیارہ سال کی صبر آزما مدت کے بعد سیاستدانوں کے خود غرض پنجوں سے آزاد ہو گیا ہے، وزارتوں اور اسمبلیوں کو توڑ دیا گیا ہے، ملک میں مارشل لا کا نفاذ ہو گیا ہے اور تمام ملک

میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی ہے۔
کاش میرے سامنے کوئی کالا آدمی بیٹھا ہو!

یکایک ایک کالی انگلی میری نظروں سے ٹکرائی۔ کالی انگلی خالی کرسی کی بیک پر نمودار ہوئی، پھر اُس کے پیچھے خوبصورت سیاہ لباس میں ملبوس ایک خوبصورت سفید فام عورت نمودار ہوئی اور اس نے کالی انگلی سے کرسی کی طرف اشارہ کر کے مجھے کہا،
"کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟"
میں اُس کو غور سے دیکھنے لگا۔ سفید عورت! سیاہ لباس! کالی انگلی! یا خدا اب کیا کروں!
میں نے کہا:
"تشریف رکھئے۔"
وہ تعارف کرانے کے لئے بولی: "میں زی زولیمن کریر ہوں۔ میرے دوست مجھے زیزا کہتے ہیں۔ میں یونیورسٹی میں آرٹ کی سٹوڈنٹ ہوں۔"
میری رُوح نے اُسے خوش آمدید نہ کہا۔ میری زبان نے بداخلاقی گوارا نہ کی۔ میں نے اپنا تعارف کرایا اور جب دیر تک کوئی بات نہ سوجھی تو میں نے خاموشی کی بدمزگی سے بچنے کے لئے کہا،
"غالباً آپ تھوسی میکفرسن کو تو نہ جانتی ہوں گی۔ وہ بھی یونیورسٹی میں آرٹ کی سٹوڈنٹ ہیں۔"
"اوہ! تھوسی! خوب جانتی ہوں۔ تھوسی کو سب جانتے ہیں۔"
"میرے پاس اس کے باپ کا خط ہے۔"
"میں ملا دوں گی تھوسی سے آپ کو۔"
"آپ کیا پئیں گی؟ شمپین؟"
"جی نہیں۔ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں۔"
میں کھسیانا ہو گیا۔ اس کے جواب میں روکھا پن تھا۔ جیسے وہ میری بات سے ناراض ہو گئی ہے۔ چند لمحوں کے بعد مجھے اس کے لہجے میں غرور اور بدتہذیبی بھی محسوس ہونے لگی۔ میں نے اپنے ارد گرد دیکھا۔ دوسری میزوں پر بھی کرسیاں خالی تھیں۔ پھر وہ میرے سامنے آکر کیوں بیٹھ گئی ہے اور اس کی گفتگو کا آغاز تو بالکل عام لڑکیوں جیسا تھا۔
اس نے اپنا ہینڈ بیگ کندھے سے اتار کر میز کے دائیں کونے میں رکھ دیا اور کتاب بائیں کونے میں۔ پھر اس نے کتاب کو بائیں کونے سے اٹھا لیا اور اس کو دائیں کونے میں رکھ کر اس کے اوپر ہینڈ بیگ رکھ دیا پھر وہ اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گئی اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولی:
"آپ کیا کھائیں گے؟"
میرا خیال تھا کہ وہ اب مجھ سے کوئی بات نہ کرے گی اور میرا بھی اس سے بات کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس کے اچانک سوال سے میں بوکھلا گیا اور یہ کچھ عجیب بات بھی تھی۔ ہوٹلوں میں پیشکش ہمیشہ مرد کی طرف سے ہوتی ہے۔ مجھے پوچھنا چاہئے تھا آپ کیا کھائیں گی؟ لیکن میں تو پوچھ چکا تھا۔ فیشن کے مطابق پینے کے بارے میں پوچھا جاتا ہے۔ میں نے بوکھلا کر جواب دیا:
"جی، میں —— میں کچھ نہیں کھاؤں گا ——"
وہ جلدی سے میری بات کاٹ کر بولی: "میں ہوسٹل سے کبھی کبھی نکلتی ہوں۔ جب نکلتی ہوں، تو پینے کے لئے نہیں، کھانے کے لئے ہوسٹل کے کھانوں سے اکتائے پڑے ہیں ہم لوگ۔ کبھی کبھی چینج کے طور پر باہر کھانے میں لطف رہتا ہے۔ آپ کھا چکے ہیں؟"
میں سراسیمگی کے عالم میں بولا: "جی نہیں۔"

وہ چلائی: "گارسان، گارسان"
گارسان (بیرا) آگیا۔
"دو پلیٹ پوٹیٹو چپس اینڈ فش!"
میرے چہرے پر احتجاج کے آثار دیکھ کر وہ جلدی سے بولی: "مجھے تلے ہوئے آلو اور روسٹ کی ہوئی مچھلی بہت پسند ہے۔ اگر میں آپ کو آرڈر دینے کی اجازت دے دیتی تو آپ پوٹیٹو چپس اور فش کی بجائے فرانس کے مشہور پُرتکلف کھانوں کا آرڈر دیتے۔ مجھے پرتکلف کھانوں اور شرابوں سے نفرت ہے۔ آلو اور مچھلی غریبوں کا کھانا ہے، میں غریب ہوں۔ اس سے زیادہ پیش نہیں کرسکتی۔"
میں نے کہا: "میڈم، میں بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے اجازت دیجئے۔"
اس نے فوراً موضوع بدل دیا: "مجھے میڈم کا لفظ پسند نہیں۔ آپ مجھے زیزا کہہ سکتے ہیں لیکن مجھے زیزا کہتے ہوئے آپ کو کوئی رومانٹک احساس نہیں ہونا چاہئے۔ زیزا بڑا آرٹسٹک لفظ ہے۔ اس میں حروف اور آواز رنگوں کے امتزاج کی طرح ایک دوسرے میں تحلیل ہوگئے ہیں۔ مجھے کوئی زیزا کہتا ہے تو میں محسوس کرتی ہوں میں ایک آرٹسٹ ہوں۔ اور زیزا میری تخلیق۔ آپ مجھے زیزا کہئے، میں دیکھنا چاہتی ہوں آپ کی آواز میں موسیقی ہے یا نہیں۔"
اب مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ زیزا ایک دلچسپ اور ذہین لڑکی ہے، عام لڑکیوں سے مختلف۔ اس لئے میری بات میں میرے جذبات شامل ہوگئے۔
میں نے کہا: "زیزا، مجھے اجازت دیجئے، میں آپ کے لئے لنچ کا آرڈر دوں۔"
لیکن بیرا دو پلیٹ پوٹیٹو چپس اور فش لے کر آگیا اور ہم کھانے میں مشغول ہوگئے۔

کچھ دیر تک ہم چپ چاپ آلو اور مچھلی کھاتے رہے۔ پھر وہ بولی:
"جب میں ہوسٹل سے باہر آتی ہوں تو کسی سے ملنا پسند نہیں کرتی۔ اکیلی رہنا چاہتی ہوں۔ ہوسٹل کی شور شرابے کی زندگی سے باہر نکل کر کچھ عرصہ بالکل تنہا اور خاموش رہنے کو دل چاہتا ہے۔ میں مردوں کے ڈانس اور سینما کے پروگراموں کو بڑی حقارت سے ٹھکرا دیتی ہوں۔"
میں نے پریشان ہو کر کہا: "زیزا، مجھے افسوس ہے میں آپ کی تنہائی کی لذتوں میں خلل انداز ہو رہا ہوں۔"
اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ "لیکن جب کبھی مجھے کسی سیاہ قوم کا فرد نظر آجاتا ہے، تو میرا سر احترام سے جھک جاتا ہے اور میں اسکی تعظیم کے لئے اس کے پاس چلی جاتی ہوں۔"
میں حیران ہوگیا: "زیزا، کیا آپ اس بات کی وضاحت کرسکتی ہیں؟"
وہ ہنس پڑی: "اس بات کی وضاحت نہایت ضروری ہے۔ سنا ہے سفید عورتیں نیگرو اور دوسری کالی نسل کے مردوں کو بہت پسند کرتی ہیں۔ آپ کو میری بات سے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔"
میں بھی ہنس پڑا۔
"میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میں ایک آرٹسٹ ہوں اور رنگوں سے حُسن کی تخلیق میرا کام ہے۔ عجیب بات ہے کہ مجھے رنگوں میں سب سے زیادہ کالا رنگ پسند ہے۔ یقیناً کالے رنگ کو تمام دوسرے رنگوں کی ملکہ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ یہ رنگ سب سے افضل ہے۔ میرے رنگ بڑے گہرے ہوتے ہیں۔ میں ہر رنگ میں کالا رنگ شامل کر دیتی ہوں۔ میرے سٹوڈیو میں ایک پورٹریٹ ہے جس کو پینٹ کرنے میں میں نے اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر دی ہیں۔ وہ تصویر میری نمائندہ پینٹنگ ہے۔ وہ میرا ماسٹر پیس ہے، اس میں ایک جوانمرد کا سیاہ فام چہرہ ہے۔ سیاہ فام چہرے کے پیچھے گہرے سرخ خون کا سمندر ہے، خون کے سمندر میں حرکت اور قوت کا طوفان ہے۔"
میں مرعوب آواز میں بولا: "زیزا، کیا مجھے اس ماسٹر پیس کو دیکھنے کا شرف حاصل ہوسکتا ہے؟"

"آپ سوسی کو ملنے جائیں گے۔ ہم دونو ایک ہی سٹوڈیو میں کام کرتی ہیں آپ وہاں پینٹنگ بھی دیکھ سکیں گے۔"

زیزا نے یہ فقرے جلدی جلدی کہے۔ جیسے اس کو میری قطع کلامی پسند نہیں آئی۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی: "یہ پورٹریٹ پینٹ کرنے کے بعد مجھ پر ایک بہت بڑی حقیقت کا انکشاف ہوا۔ میرا تخیل وسیع ہو گیا اور کالا رنگ میرے سٹوڈیو سے نکل کر دنیا کی کالی قوموں کی حدود تک پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا کہ سیاہ رنگ سفید رنگ کے پیروں کے نیچے پڑا سسک رہا ہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ سیاہ رنگ میں حرکت اور قوت پیدا ہوئی اور وہ سفید رنگ کی غلامی سے آزاد ہونے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اب جہاں بھی میں کسی سیاہ قوم کے فرد کو دیکھتی ہوں میرا سر احترام سے جھک جاتا ہے اور میں اس کی تعظیم کے لئے اس کے پاس چلی جاتی ہوں۔"

میں نے زیزا کی سیاہ انگلی اور اس کے سیاہ لباس کو دیکھتے ہوئے کہا،

"تھینک یو، زیزا"

آملوا در مچھلی ختم ہو گئی۔ کوفی آ گئی۔ زیزا نے کوفی بناتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے آپ الجیریا کے باشندے ہیں۔ آپ کا ملک آزادی کے لئے لڑ رہا ہے۔ میری ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔"

میں نے کہا "جی نہیں۔ میں الجیریا کا باشندہ نہیں ہوں۔ میرے ملک کا نام پاکستان ہے۔"

وہ جلدی سے بولی: "میں جانتی ہوں۔ میرے والد وہاں ۱۹۳۷ء میں سفیر تھے۔ بڑا اچھا ملک ہے پاکستان۔ انگلش میں اس کو انڈیا کہتے ہیں۔"

میں ہنس پڑا: "انگلش میں جس ملک کو انڈیا کہتے ہیں، وہ ہندوستان تھا۔ پاکستان ۱۹۴۷ء میں ایک نیا ملک وجود میں آیا ہے اور ۱۹۴۷ء ہی میں ہم نے انگریزوں کی حکومت سے آزادی حاصل کی۔"

وہ کسی قدر کھسیانی ہو گئی اور اپنے کھسیانہ پن کو چھپانے کے لئے بلند آواز میں بولی۔

"او ـــ لا، لا۔ آپ کا ملک آزاد ہو گیا ہے۔ مبارکباد!"

ہم کچھ دیر خاموشی سے کوفی پیتے رہے۔ میں زیزا کے بارے میں کچھ زیادہ جاننے کا متمنی تھا۔ لیکن مجھے ذاتی سوالات کرنے کی جرأت نہیں ہو رہی تھی۔ آخر میں نے براہِ راست سوالات کرنے کی بجائے دوسرے طریقوں سے اس کے بارے میں معلومات کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے کہا:

"آپ مجھے فرانسیسی لڑکی معلوم نہیں ہوتیں۔"

وہ فرانسیسی لڑکی کے الفاظ پر کچھ چیں بجبیں ہو گئی اور بولی،

"میں ایک جرمن لڑکی ہوں۔ مجھے تعجب ہے آپ اندازہ نہ لگا سکے۔"

"مجھے یقین تھا کہ آپ فرانسیسی لڑکی نہیں ہیں۔ آپ کی سطح عام لڑکیوں سے بہت بلند ہے۔"

"دنیا میں صرف جرمن لڑکیوں نے عورت کے بنیادی وقار کو بلند کیا ہے۔ عورت کو مرد کے برابر کی حیثیت دینے کی صدائیں ہر ملک سے اٹھی ہیں۔ لیکن اس جدوجہد میں کامیابی صرف جرمن لڑکیوں کو حاصل ہوئی ہے۔ صرف جرمن لڑکیوں پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ عورت دنیا کو حسن و عشق کی داستانوں سے سجانے کے لئے پیدا نہیں ہوئی۔ انسان کی سوسائٹی میں عورت کا سب سے اہم رول حسن و عشق نہیں ہے۔ عورت کا رول انسانی سوسائٹی کی تشکیل میں حسن و عشق سے بہت بلند ہے۔ حسن و عشق عورت کی منزل نہیں۔ دنیا کا غم دوست کے غم سے زیادہ اہم ہے۔ ملک کے مسائل محبوب کی محبت سے زیادہ اہم ہیں۔ ملک کے مسائل محبوب کی محبت سے زیادہ دلکش ہیں۔ حسن و عشق کی داستان میں عورت مرد کے سامنے ایک ذیلی حیثیت اختیار کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ حسن و عشق عورت کو ایک گڑیا اور ایک کھلونا بنا کر مرد کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں اور اس طرح عورت مرد

کے برابر کی حیثیت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاتی ہے۔ صرف جرمن لڑکیوں نے اس حقیقت کو پہچانا ہے۔ اور میں ایک جرمن لڑکی ہوں۔"

میں بہت مرعوب ہو گیا، میری زبان بند ہو گئی۔ لیکن میں تو زیزا کے زندگی کے حالات جاننا چاہتا تھا۔ جو کچھ اس نے بتایا ہے وہ تو مجھے اسی وقت معلوم ہو گیا تھا جب اس نے میری شمپین کی پیشکش ٹھکرا دی تھی۔

میں چپ بیٹھا رہا

وہ بھی چپ بیٹھی رہی

پھر اُس نے اپنی کالی انگلی کو فی کپ کے ہینڈل میں ڈالنے کے لئے آگے بڑھائی۔ میں نے کہا:

"آپ اپنی کالی انگلی کے بارے میں کچھ بتا سکیں گی؟"

اُس نے کوفی کپ کے ہینڈل سے اپنی کالی انگلی نکال لی اور میز پر کہنی رکھ کر اس کو میری آنکھوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اور بولی:

"میری کالی انگلی کے پیچھے میرا سفید ہاتھ ہے۔ میرے سفید ہاتھ کے پیچھے میرا سنگِ مرمر جیسا بازو ہے اور میرے سنگ مرمر جیسے بازو کے پیچھے میرا دودھ جیسا بدن ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سفید انگلی سفید ہونے کے باوجود کالی ہو سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سفید قوموں کی قسمت سفید ہونے کے باوجود کالی قوموں کی قسمت جیسی ہو سکتی ہے۔ میرا پیارا ملک۔ جرمنی اوبار کی اُسی گہرائی میں ہے جہاں الجیریا ہے۔"

غضب ہو گیا۔ اُس کی نیلی نیلی بلور جیسی خوبصورت آنکھیں بھیگ گئیں۔ میں نے جلدی سے کہا:

"زیزا، تم آرٹسٹ ہو۔ تم بہت بڑی آرٹسٹ ہو۔"

اس نے میری بات نہ سُنی۔ اپنی بات کرتی رہی

"لیکن میری کالی انگلی اگر کالی قوموں کی قسمت کی یاد دلاتی ہے۔ تو یہ کالے ناگ کی اور گرانڈیل سیاہ ہاتھی کی بھی یاد دلاتی ہے۔ یہ اس سیاہ فام پورٹریٹ کی یاد بھی دلاتی ہے جس کے خون کے سمندر میں حرکت اور قوت کا طوفان ہے اور جس کو اس کالی انگلی نے خود بنایا ہے۔"

میں ہمہ تن گوش بیٹھا رہا۔ میں نے داد دینی بھی مناسب نہ سمجھی۔ ایسا نہ ہو اُس کی موڈ بگڑ جائے اور اُس کی روانی میں فرق آ جائے۔

میری توقع کے خلاف اس نے اپنی کہانی شروع کر دی۔

"جب ۱۹۴۷ء میں آپ کا ملک آزاد ہوا، میں قید میں تھی۔"

میں نے اُس کو اکسانے کے لئے خواہ مخواہ حیرت کا اظہار کیا۔

"آپ قید میں؟ کیوں؟ کہاں؟"

"آئرن کرٹن کے پیچھے۔ روس کے فولادی پردے کے اندر مشرقی برلن میں، میں، میرا بھائی، میری ماں، میرا باپ۔ میرا باپ فوہرر سروس میں تھا۔ ہمارے فیوہرر ہٹلر کو میرے باپ پر بڑا اعتماد تھا۔ اس نے میرے باپ کو بڑے بڑے اہم غیر ملکی مشنوں پر بھیجا۔ اسی سلسلے میں وہ ۱۹۳۷ء میں انڈیا گیا۔ پچھلی جنگ کے دوران میں میرا باپ فیوہرر کا دایاں بازو بن گیا۔ بدقسمتی سے جرمنی جنگ میں ہار گیا۔ برلن تقسیم کر دیا گیا۔ ہمارا خاندان مشرقی برلن میں آ گیا۔ میرا بھائی فیوہرر کی فوج کا بڑا ہونہار افسر تھا۔ ہمارے سارے کنبے کو جیل میں پھینک دیا گیا اور ہمارے گھر پر قبضہ کر لیا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد مجھے اور میری ماں کو رہا کر دیا گیا۔ میں اُس وقت بارہ تیرہ سال کی تھی۔ میری ماں ایک ہوٹل میں ملازم ہو گئی اور ہمیں سیڑھیوں کے نیچے ایک خلا میں رہنے کی جگہ مل گئی۔ ایک دن میری ماں ہوٹل کی سیڑھیاں دھو رہی تھی کہ ہوٹل کے سامنے دو لاشیں آئیں۔ وہ میرے باپ اور بھائی کی لاشیں تھیں! میرے بھائی کی کنپٹیوں میں گولی ایک طرف سے دوسری طرف نکل گئی تھی۔ اور خون کانوں، آنکھوں اور ناک پر بہتا ہوا کپڑوں پر گر کر جم گیا تھا۔ میرے باپ کے سر کے پیچھے گولی نے کھوپڑی کو توڑ کر ایک انچ قطر کا گول سوراخ کر دیا تھا۔ میری ماں اور میں ایک ہفتہ تک دھاڑیں مار مار کر روتے رہے۔ پھر ہوٹل میں رہنے والے میری ماں کے ساتھ ہمدردی اور دوستی کا سلوک کرنے لگے۔ میری ماں اور میں اکثر ہوٹل کے کسی مہمان کے ساتھ ڈنر، ڈانس اور سینما میں چلے جاتے۔ لیکن زیادہ تر میں اکیلی گھر پر رہتی اور میری ماں آدھی آدھی رات تک واپس نہ آتی مجھ اکیلی کو بڑا ڈر لگتا، لیکن میں کیا کر سکتی تھی۔

"ایک دن ہوٹل میں ایک مہمان آکر ٹھہرا۔ اس کے بال لمبے تھے، سر چھوٹا اور منہ لمبا جو فرنچ کٹ ڈاڑھی سے اور بھی لمبا ہو گیا تھا۔ اس کی کنپٹیوں کے بال سفید تھے، گال خشک اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں۔ اس کی عینک کے موٹے موٹے شیشوں میں سے اس کی آنکھوں کے ڈھیلے موٹے موٹے اور ڈراؤنے نظر آتے تھے۔ اس کا نام البرٹ بکواسو تھا۔"

میں چونک پڑا۔

"کون البرٹ بکواسو؟ یہاں کی فرنچ فائن آرٹس اکیڈمی کا پرنسپل؟"

"جی ہاں۔ وہ وہاں روس کی دعوت پر اپنی تصویروں کی نمائش کرنے گیا تھا۔ میں نے اُس کے حلیے کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، اس کو نہ بھولئے۔ اس کا آنے والے واقعات سے بڑا تعلق ہے۔"

میں نے کہا: "نہیں، یہ حلیہ بھولنے والی چیز نہیں۔"

"پروفیسر البرٹ بکواسو میری ماں کا بہت گہرا دوست بن گیا۔ وہ اکثر میری ماں کو کئی کئی گھنٹوں کے لئے باہر لے جاتا اور میں گھر پر اکیلی ڈرا کرتی۔ ایک دن میری ماں کہیں گئی ہوئی تھی۔ پروفیسر البرٹ بکواسو آیا۔ اس کے بعد جو واقعات پیش آنے والے ہیں۔ ان کو بتانے سے پہلے آپ کی یادداشت تازہ کرنا چاہتی ہوں۔

میں نے کہا:

"جی کیجئے۔"

"آپ کو یاد ہے میری عمر اس وقت کتنی تھی؟"

"بارہ تیرہ سال۔"

"اور آپ کو پروفیسر البرٹ بکواسو کا حلیہ یاد ہے؟"

"جی ہاں۔"

"پروفیسر البرٹ بکواسو اندر آیا۔ میں اس کے پیروں پر گر پڑی۔ اور گڑگڑا کر بولی: پروفیسر بکواسو، مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے مجھے یہاں سے لے جاؤ۔ مجھے اپنی بیوی بنا لو۔ مجھے یہاں بہت ڈر لگتا ہے۔" پروفیسر بکواسو کچھ دیر مجھے حیرت سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے مجھے اپنے پیروں سے اٹھا کر اپنی گود میں لے لیا۔ اور بہت پیار کیا۔ دوسرے دن میں سیڑھیوں میں کھیل رہی تھی۔ پروفیسر بکواسو اور میری ماں اندر بیٹھے تھے۔ میری ماں نے مجھے آواز دی۔ میں اندر گئی۔ جونہی میں نے اندر قدم رکھا۔ میری ماں اور پروفیسر بکواسو زور زور سے ہنسنے لگے۔ میری ماں نے کہا: "زینا! تم پروفیسر بکواسو کی بیوی بننا پسند کرتی ہو؟" میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ میں شرم کے مارے زمین میں گڑ گئی۔ میری ماں اور پروفیسر بکواسو نے ایک اور قہقہہ مارا اور دیر تک ہنستے رہے۔ پھر میری ماں نے پروفیسر بکواسو سے کہا: "البرٹ، تم ٹھیک کہتے ہو۔ زینا یہاں بے حد ناخوش ہے اور کسی نہ کسی بہانے اس ماحول سے نکل جانا چاہتی ہے۔ اس کی مدد کرو۔ میں ممنون ہوں گی۔" پھر جس دن پروفیسر بکواسو واپس آنے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی تصویروں کا بڑا صندوق کھولا۔ کچھ تصویریں نکال کر میری ماں کو دے دیں۔ اور ان کی جگہ مجھے لٹا کر صندوق کو قفل لگا دیا۔ اور میں پیرس آگئی۔"

بیرا بل لے کر آگیا۔ میرے بہ اصرار منع کرنے کے باوجود زینا نے دو نوبل ادا کر دئے۔ اور سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں نے کہا:

"زینا! میں نے آپ کو کالی انگلی پر کچھ روشنی ڈالنے کے لئے کہا تھا۔"

"سٹوڈیو میں آپ کو سُوسی سے ملنا ہے۔ اور اگر آپ کے پاس وقت ہوا تو مجھے آپ کو اپنا ماسٹر پیس دکھانا ہے۔"

ہم کافے سے باہر آگئے۔

میرے اصرار کے باوجود اس نے ٹیکسی سے انکار کیا۔ اور ہم پیدل سائن کی طرف چل پڑے۔
سائن کے پل کو عبور کر کے اور تھوڑی دور دائیں کنارے پر چل کر ہم یونیورسٹی پارک میں داخل ہو گئے۔ یونیورسٹی پارک میں گھاس کی مخمل بچھی ہوئی تھی، پھولوں کی پریاں ناچ رہی تھیں، ہوا کے جھونکے خوشبو بکھیر رہے تھے اور یونیورسٹی کے لڑکے لڑکیاں مغربی پارکوں کی آزاد محبت سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ دریائے سائن شرم کے مارے پانی پانی ہوا جا رہا تھا اور شام چار بجے کا سورج مغرب کی گہرائیوں میں غرق ہونے کے لئے بھاگا جا رہا تھا۔

زینیا نے کہا:
"غور سے دیکھو، یہ ہماری تہذیب کا قبرستان ہے۔"
میں نے کہا:
"مجھے شرم آ رہی ہے۔"
اس نے کہا:
"شرمانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ ہماری زندگی کی سینما سکوپ فلم ہے۔ جب ہماری بیٹیاں، بہنیں، مائیں اور بیویاں رات کو سینما ہالوں میں جا کر بڑی جرأت سے ایسی فلمیں دیکھ آتی ہیں، پھر آپ دن کو زندگی کی یہ فلم دیکھنے سے کیوں شرماتے ہیں؟"
میں نے کہا:
"زینیا، جلدی اپنے سٹوڈیو کو چلئے۔"
"لیکن ذرا ٹھہرئیے۔ اس سیب کے درخت کے نیچے دیکھئے۔ وہ جہاں پانی کا فوارہ موتی بکھیر رہا ہے اور گلاب کے پھولوں کا تختہ جھک رہا ہے۔"
میں نے طوعاً و کرہاً ادھر دیکھا۔

وہ بولی:
"یہ سُوسی ہے۔"
میری چیخ نکل گئی
"سُوسن؟"
"سُوسن میکفرسن"
دونوں کے ہونٹ ملے ہوئے تھے، دونوں کے چہرے جذبات سے سرخ ہو گئے تھے، دونوں ایک نہایت مکروہ منظر پیش کر رہے تھے۔ میں بھاگ پڑا۔
"زینیا، مجھے سُوسن سے نہیں ملنا، خدا کے لئے اپنے سٹوڈیو میں چلو۔"

سٹوڈیو سادہ سا گندہ سا تھا۔ گرد و غبار اور بے ترتیبی تھی۔ فریم کی ہوئی تصویریں دیوار کے ساتھ ایک دوسرے کے سہارے رکھی ہوئی تھیں۔ میں ایزل کے پاس چلا گیا۔ ایزل پر زینیا کے تاریخی ہیرو کی تصویر چڑھی ہوئی تھی۔ اس کا رنگ کالا تھا۔ اس کے ماتھے پر سیاہ رنگ کی لکیریں تھیں۔ اس کو پہچاننا مشکل تھا۔ وہ الہ دین کا دیو معلوم ہوتا تھا۔
زینیا بھی ایزل کے پاس آ گئی۔ اس نے اپنی کالی انگلی کو اپنے ہیرو کے ماتھے کی سیاہ لکیروں پر پھیرا اور کھوئے کھوئے انداز میں بولی:
"میرا ہیرو"
پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولی:

"پروفیسر بکوآسو کو میرے ہیرو سے نفرت ہے، میں اس کی تصویر پینٹ کر رہی تھی۔ وہ اندر آیا۔ کینوس پر میرے ہیرو کی تصویر دیکھ کر آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے کینوس کو ایزل سے اتار کر زمین پر پٹخ دیا۔ اور اس کو پیروں سے مسل مسل دیا۔ اور اس کے اوپر کھڑا ہو کر چلانے لگا: اُس ذلیل کتے نے ایک مقدس سرزمین کو اپنے ناپاک پیروں سے روند ڈالا۔ اس جاہل انسان نے میرے سٹوڈیو کو جلا کر خاک کر دیا۔ یہ خونخوار لٹیرا میری اکیڈیمی میں داخل نہیں ہوگا! میں غصے سے دیوانی ہو گئی۔ میں نے چلا کر کہا: پروفیسر بکوآسو، اپنی بکواس بند کرو۔ اور دروازے کی طرف بھاگی۔ دروازے کے پاس کھڑی ہو کر میں نے کہا: اگر میرا ہیرو اکیڈیمی میں داخل نہیں ہو سکتا تو میں بھی یہاں نہیں رہ سکتی اور میں نے باہر نکلتے ہوئے زور سے دروازہ چوکھٹ کے ساتھ دے مارا۔ میری انگلی دروازے میں آ گئی اور کالی ہو گئی۔"

میں نے کہا:

"لیکن زینرا تو یہیں ہے۔ اور اس کا ہیرو بھی ایزل پر ہے۔"

"میں جا رہی تھی۔ پروفیسر بکوآسو میرے کمرے میں آیا۔ اور میرے پیروں پر گر گیا۔ اور گڑگڑا کر بولا: زینرا تمہیں یاد ہے۔ تم چھوٹی سی تھیں۔ تم نے میرے پیروں پر گر کر کہا تھا: مجھے تم سے محبت ہے۔ وہ ایک مذاق تھا لیکن میں مذاق نہیں کروں گا۔ زینرا، میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھے تم سے محبت ہے، تمہارے خوابوں کا دیوتا ایزل پر آ گیا ہے اور زینرا یہاں سے کہیں نہیں جا سکتی۔"

کالی انگلی کا راز کھل گیا۔

اب مجھے زینرا کا ماسٹر پیس دیکھنا تھا۔

میں نے کہا:

"زینرا، میں آپ کا ماسٹر پیس دیکھنے کے لئے بے قرار ہوں۔"

زینرا ایک کونے میں گئی۔ وہاں سے مخمل کے غلاف میں چھپی ہوئی پینٹنگ اٹھا لائی۔ اس کو بڑے احتیاط سے مخمل کے غلاف میں سے نکالا۔ اور تصویر کو ایزل پر رکھ دیا۔ اور مجھے آواز دے کر بولی:

"یہ ہے میرا ماسٹر پیس!"

میں ایزل کے سامنے گیا۔

اور خوشی سے نعرے کے انداز میں چلایا: "ٹیپو سلطان!"

سیاہ خام خون کا سمندر تھا۔ حرکت اور قوت کا طوفان تھا۔

میرا سر احترام سے جھک گیا۔ میں آہستہ آہستہ پینٹنگ کی طرف بڑھا۔ اور میں نے انتہائی تعظیم سے ٹیپو سلطان کے ماتھے کو بوسہ دیا۔

پھر میں نے اسی احترام اور تعظیم کے جذبات کے ساتھ زینرا کو مخاطب کیا:

"محترمہ، آپ ایک عظیم آرٹسٹ ہیں۔"

اس نے جواب دیا: ——— "تھینک یو!"

میں نے کہا: "محترمہ، کیا آپ میری ایک تمنا پوری کر سکتی ہیں؟"

"کیا؟"

"کیا آپ مجھے اس ہاتھ کو چومنے کی اجازت دیں گی جس نے ٹیپو سلطان جیسا شاہکار پیدا کیا ہے۔"

زینرا نے اپنا ہاتھ میرے سامنے کر دیا۔

میں نے ادب سے جھک کر زینرا کی کالی انگلی کو چوم لیا۔

ایک جھونکا

احمد ندیم قاسمی

سرد جھونکا کوئی آیا کہ بگولا گذرا
آدمی ہو کہ لبِ جُو کا سرافراز درخت
اپنی نظروں میں تو قدموں سے اُکھڑتا گذرا
سر جُھکائے ہوئے، سوئے ہوئے گل یوں چونکے
جیسے بھونچال میں جاگ اٹھتے ہیں پیڑوں پہ پرند
اور چلّاتے ہیں یوں گونجتی تاریکی میں
جیسے بستی سے بپھرتا ہوا دریا گذرا

★

دُھوپ جھلّا کے نکلتی ہے تو ابر آتا ہے
مینہہ برستا ہے تو بڑھ جاتا ہے ماحول کا حبس
شب کی تو بات ہی کچھ اور ہے — آخر شب ہے
دن کو ہر چیز کا، ملبوس اُتر جاتا ہے
میری تہذیب کا پردہ — مری قدروں کا نقاب
سانپ کی کینچلی بن کر، کسی چو راہے پر
آدھے جاگے ہوئے انسان کو دہلاتا ہے

★

کن تضادوں میں تپاں ہے مری پروازِ خیال
دستِ تخلیق کی زنجیر طلائی کی قسم
ابھی انسان سے پوشیدہ ہے انساں کا جمال
ایک کہتا ہے غزل — ایک بناتا ہے بم
ایک کو دل بھی بہت — ایک کو آفاق بھی کم
اور یہیں ظلمتِ تہذیب کئی صدیوں سے
چاند بننے کو ہمکتے ہیں محبت کے ہلال

طنز و مزاح:

خاندانِ کیخسرو

سیّد ضمیر جعفری

سلطان راجہ مبارز خاں حکمرانوں کے ایک معزول بلکہ اب دو صدیوں سے تو گویا مفلوج کیخسرو خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ یہ "چشم و چراغ" میں نے یونہی ازراہِ اخلاق و مروت نہیں کہہ دیا بلکہ وہ لفظاً و معناً یعنی کیا محاورہ اور کیا روزمرّہ ہر لحاظ سے اپنے تاریخی خانوادے کے چشم و چراغ واقع ہوئے ہیں۔

مثلاً چشم کو لیجئے اور اتفاق دیکھئے کہ سلطان مبارز خاں صرف ایک ہی چشم رکھتے ہیں۔ مدت ہوئی جنگل میں ایک نو آموز عقاب کو "جھپٹ کر پلٹنے اور پلٹ کر جھپٹنے" کی مشق کرا رہے تھے کہ نامراد پلٹ کر سلطان صاحب کی پوری آنکھ ڈھیلے پتلی سمیت صاف کر گیا۔ لوگوں نے پتھر کا ڈھیلا ڈلوانے کی رائے دی مگر پتھر کی آنکھ ان کے مذاقِ لطیف پر گراں گزری۔ بعض ڈاکٹروں نے یورپ جانے کا مشورہ دیا کہ شاید وہاں کے ماہرین کسی مُردہ انسان کی کوئی ایسی نیم زندہ آنکھ ڈال دیں جو تھوڑا بہت دیکھ بھی سکتی ہو۔ لیکن سلطان مبارز خاں اس پر بھی آمادہ نہ ہو سکے۔ ایک تو انہیں سرے سے سفر کے خیال ہی سے وحشت ہوتی تھی کہ ریل جہاز وغیرہ میں دوسرے لوگوں کے ہمراہ جمہوری طرز کا سفر کرنا انہیں سخت ناگوار تھا۔ چنانچہ انہوں نے کوئی پچاس برس پہلے زندگی کا پہلا اور آخری سفر کیا تھا۔ پھر یورپ جا کر انسانی آنکھ ڈلوانے میں ایک بڑا خطرہ یہ بھی تھا کہ نہ معلوم کس خوانچہ فروش کی آنکھ ان کے سر تھوپ دی جائے جو خدانخواستہ ان کی زندگی کا زاویۂ نظر ہی بدل کر رکھ دے۔

سوچ بچار کے بعد آخر طے پایا کہ حکمرانوں، کشورکشاؤں کو باز و عقاب کی آنکھ ہی کچھ زیب دے سکتی ہے۔ چنانچہ ہاتھ کے بدلے ہاتھ، ٹانگ کے بدلے ٹانگ کے اُصول پر اُسی عقاب کی آنکھ نکلوا کر ان کی آنکھ میں فٹ کر دی گئی۔ مگر یہ آنکھ دُور سے صاف پہچانی جاتی ہے کہ باز کی آنکھ ہے کیونکہ ہر وقت باز رہتی ہے۔ کچھ یہ آنکھ، اس کے اوپر اُن کی پھیلی ہوئی گھبیر مونچھ، آدمی اگر کچھ زیادہ غور نہ کرے تو راجہ سلطان مبارز خاں ایک اڑتا ہوا عقاب معلوم ہوتے ہیں اور چڑیاں، فاختہ، کبوتر وغیرہ کی قبیل کے امن پسند پرندے تو سچ مچ ان کو دیکھتے ہی اڑ جاتے ہیں۔ البتہ کوّوں کو شاید پتہ چل گیا ہے کہ یہ باز کی مری ہوئی آنکھ ہے اور بازوں سے وہ غالباً کوئی خصومت بھی رکھتے ہیں کہ جب موقع ملتا ہے یمین و یسار سے اس آنکھ پر ٹھونگ مار جاتے ہیں چنانچہ بیچارے سلطان مبارز خاں دستار پر اکثر غلیل باندھ کر باہر نکلتے ہیں۔

یہ تو تھی چشم ——— رہا چراغ تو گو زندگی کی چہل پہل کی شمع تو ان کے ہاں مدت سے گل پڑی ہے لیکن حویلی کے ایک تہہ خانے میں جس کو توشہ خانے کہتے ہیں، پیتل کا ایک قدیم چراغ پچھلی کئی صدیوں سے روشن ہے۔ روایت یہ ہے کہ خاندانِ کیخسرو کے مورثِ اعلیٰ سلطان راجہ ممارا خاں نے بہرام پور کے قلعے کی تعمیر یا تسخیر (غالباً تسخیر کیونکہ تعمیر کی انہیں فرصت ذرا کم نصیب رہی) کی خوشی میں یہ چراغ اپنے ہاتھ سے روشن کیا تھا۔ اور یہ وصیت کی تھی کہ اس کو ہرگز کبھی بجھنے نہ دیا جائے۔ چراغ کے ساتھ سلطان مرحوم نے اپنی ایک شمشیر آبدار بھی توشہ خانہ میں رکھی تھی مگر چونکہ اسی کے بارے میں کوئی وصیت کرنا بھول گئے تھے لہٰذا شمشیر تو بعد میں کوئی مغل صوبیدار اٹھا کر لے گیا ——— مزید بعد وہ ایک بھونسلہ سردار اور پھر لارڈ کارنوالس کے اردلی کی کمر میں دیکھی گئی ——— ہاں چراغ آج تک برابر جل رہا ہے!

قلعہ بہرام پور کو اس خاندان کی تاریخ میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ان کی تاریخ اصل میں چلتی ہی اسی قلعے سے ہے۔ مگر بدقسمتی سے خود اس قلعے کو کوئی خاص تاریخ نصیب نہیں ہو سکی۔ قیاس یہ ہے کہ ایک طوائف الملوکی میں، جو اس زمانے میں اکثر پھیلا کرتی تھی، یہ قلعہ سلطان ممارا خاں کے ہاتھ پڑ گیا اور دوسری طوائف الملوکی میں ہاتھ سے نکل گیا۔ اور یہ دوسری طوائف الملوکی کچھ ایسی بے قابو ہو کر پھیلی کہ اب اس قلعے کے آثار تک بھی کہیں نظر نہیں

آتے۔ ویسے لوگ کہتے ہیں کہ بڑا عالیشان قلعہ تھا۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس پرگنے میں بعض دوسرے قبائل کے جو دس بارہ قلعے آج تک موجود ہیں، یہ دراصل بہرام پور کے قلعے ہی کے دمدموں، کنگروں، برجوں اور دیواروں کو اکھاڑ کر بنائے گئے تھے اور یہ خیال قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ سب قلعے وضع قطع میں حلیے، ممیرے، پچیرے بھائی نظر آتے ہیں ـــــ قلعے کی بنیادوں میں جو پتھر تھے، اُن سے پہلے تو بہرام پور کے لوگوں نے اپنے مکان بنوائے، بعد میں وہی پتھر ان کی قبروں پر صرف ہوئے اور آج نہ بہرام پور کا قلعہ موجود ہے، نہ وہ قصبہ، نہ وہ لوگ، نہ ان کی قبریں ع

حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے!

کیخسرو خاندان قلعے سے ہتھیلی پر جلتا ہوا چراغ رکھکر جو بھاگا تو نہ معلوم کہاں کہاں گھومتا ہوا پایانِ کار اس حویلی میں پناہ گزیں ہوا، جو اصلاً تو ایک عظیم قلعہ نما حویلی تھی مگر اب عرصے سے اس کا اصطبل ہی قابلِ رہائش رہ گیا تھا جس میں وقتاً فوقتاً جا بجا دیواریں اٹھا کر، یا جہاں دیواریں نہ اُٹھ سکیں وہاں ٹاٹ تان کر زنان خانے، دیوان خانے، توشہ خانے، ہاتھی خانے اور وزیر ڈیوڑھیاں اور غلام گردشیں وغیرہ بنالی گئی ہیں۔

معزولی کے وقت، پہلے سلطان کو معقول موروثی پنشن کے ساتھ خاص بڑی زرعی جاگیریں ملی تھی۔ مگر کئی نسلوں کی تقسیم و تفریق کے بعد اب یہ آمدنی محض ایک علامتی امتیاز رہ گئی ہیں۔ جو ہرگز اس لائق نہیں کہ "وضعِ سلطانی" کے بوجھ کو جو ہاتھیوں سے نہیں اٹھتا، سنبھال سکے مگر بوڑھا سلطان مبارز خاں اسی بوجھ کو اپنے سر کا تاج سمجھتا ہے۔

محل ڈھیر ہو چکا لیکن ڈیوڑھی پر چوبدار کھڑا ہے۔ مصاحب کوئی نہیں مگر دیوانِ عام موجود ہے۔ یہی نہیں بلکہ نشست و برخاست کے جو قواعد سلطان راجہ ممارا خاں کے وقت میں بندھ گئے تھے، ان معمولات پر آج بھی نہایت باقاعدگی سے عمل ہو رہا ہے۔ اِدھر آفتاب سوا نیزے پر بلند ہوا (یہ معلوم نہ ہو سکا کہ نیزہ لیکر آفتاب کو ناپتا کون ہے) اِدھر آپ محلسرا سے سوا جریب چل کر دالان کے ایک چبوترے پر رونق افروز ہوگئے۔ سامنے پیچوان رکھا ہے اور بازو میں ایک طشت کے اندر کلیجی کی بھنی ہوئی چند بوٹیاں، مونگ پھلی کے مغز، باجرہ، سونف اور مصری وغیرہ کے علاوہ سبز چارے کی چند چھوٹی چھوٹی گڈیاں رکھی ہیں۔ سلطان صاحب نے حقے کے دو کش لیکر آواز دی:

"وزیر ڈیوڑھی"

اور مولوی اللہ بخش جو مسجد میں امامت بھی کرتے ہیں، ڈیوڑھی کی ایک بغلی کوٹھڑی میں سے نکل کر دست بستہ حاضر ہوگئے۔

"کوئی عرضی پیشی؟" سلطان نے پوچھا۔

"حضور سب خیریت ہے"۔ وزیر ڈیوڑھی نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا۔ اور سامنے بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئے۔

"میر شکار"

اس آواز پر میر شکار جو دراصل نذرو مراثی ہے، ہاتھ کے انگوٹھے پر باز بٹھائے آگیا۔ سلطان نے باز کے سر پر دستِ شفقت پھیرا اور طشت میں سے کلیجی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر باز کی چونچ میں رکھ دیا۔ باز کو کھونٹی سے باندھ کر تھوڑی دیر میں وہی نذرو مراثی داروغۂ اصطبل کی حیثیت میں سلطان کے سمرقندی ٹٹو کو باگ سے پکڑ لایا جس کو انہوں نے اپنے ہاتھ سے سبز چارے کی گڈی کھلائی۔ اسی طرح پھر یکے بعد دیگرے محل کے طوطے، بٹیر، مرغ اور بکریاں سلام کو حاضر ہوئیں اور اپنے اپنے حصے کا چارہ دانہ لے گئیں۔

اب چار ساعتیں آفتاب کی طرف نکلنے کے بعد یہ آفتاب کے کسی زاویئے پر منحصر ہے کہ آپ چبوترے سے اٹھ کر دیوانِ خاص میں جائیں گے، توشہ خانے میں یا واپس محلسرا میں۔

حویلی سے باہر آپ شاذ ہی قدم رکھتے ہیں۔ ایک تو وہ اس بات کو خوب سمجھتے ہیں کہ: 'نکل کر پھول سے خوشبو ذلیل و خوار ہوتی ہے' ـــ اور دوسری بڑی قیامت یہ ہے کہ ان کے بزرگ ہاتھیوں پر نکلتے تھے۔ پھر چار گھوڑوں کی فٹن پر نکلتے رہے۔ پھر رفتہ رفتہ چار کے دو گھوڑے رہ گئے۔ اور اب سلطان صاحب کے پاس جو سمرقندی ٹٹو ہے، وہ مجذوبیت کے اُس مقام پر ہے کہ اگر فٹن کو کھینچنے لگے تو فٹن اس کو کھینچ کرلے جائے۔ پھر خود فٹن کا بھی یہ حلیہ کہ اگر آپ اُس میں بیٹھ کر نکلیں تو یوں معلوم ہو گویا کسی عاشق کا جنازہ دھوم سے نکل رہا ہو۔

توشہ خانہ تو ہاتھی خانے کی طرح شاید خالی پڑا ہے۔ البتہ دیوانِ خاص کی بعض چیزیں قابلِ ذکر ہیں۔

مخملیں غلاف میں ایک بہت بڑی منقش، مجلا و مطلا کتاب رکھی ہے جس میں سلطان عمارا خاں سے لیکر آج تک کے جملہ سلاطین کے روزنامچے درج ہیں۔ ابتدائی دَور کے روزنامچے تلواروں اور یلغاروں کے تذکرے سے لبریز ہیں۔ تلوار ہر وقت نیام سے باہر رہتی تھی۔ نیام میں غالباً راشن بھرا رہتا تھا۔ شہسواری کا یہ عالم تھا کہ دوڑتے گھوڑے کی پشت پر سو جاتے تھے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ خود تو گھوڑے کی پشت پر سو رہے ہیں اور گھوڑا میدان مار کر قلعہ میں واپس بھی آگیا۔ ایک سلطان نے محمد غوری کے تعاقب میں گھوڑا دوڑا تو حالانکہ محمد غوری ابھی جہلم کی پہاڑیوں میں بھٹک رہا تھا کہ سلطان غزنی پہونچ کر قتل بھی ہوچکا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ محمد غوری بھی بچ کر نہ جا سکا۔ کیونکہ اس کو ادھر جہلم کے ایک "کھوکھر" قبیلہ نے کیخسرو سلطان کے شبہ میں قتل کردیا۔

دوسرا دَور شورشوں، خانہ جنگیوں اور طوائف الملوکی کا دَور تھا۔ کیخسرو سلاطین، اُس زمانے میں کبھی دشمنوں سے اور کبھی خود اپنے آپ سے لڑتے رہے۔ اس دَور میں کوئی دس پندرہ چچا اپنے بھتیجوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ چنانچہ بھتیجوں نے چچا بننے کے خوف سے بعد میں اپنے بھائیوں کو قتل کرنا شروع کردیا۔ مصروفیت بیکار اور فتح و شکست کی بےیقینی کا یہ عالم تھا کہ رانیوں کو میدانِ جنگ میں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ فتح ہوتی تو دوسروں کی رانیاں گھر میں ڈال لیتے۔ چنانچہ اولادِ نرینہ کا سلسلہ عموماً دشمن رانیوں ہی کے بطن سے قائم رہا۔

ہاتھی، شیر، چیتے، عقاب وغیرہ کے شکار کے رسیا تھے۔

تیسرے دور میں اگرچہ معرکہ جوئی کا ولولہ تو سرد پڑچکا تھا اور دوڑتے ہوئے گھوڑے کی پشت پر اگر سونے کی کوشش کرتے تھے تو گر پڑتے تھے، تاہم ہنوز خاصہ دم باقی تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پنجاب میں سکھوں کا "طوطا" بول رہا تھا۔ سکھوں سے ابتداءً ان کے تعلقات کافی خوشگوار تھے مگر پھر ایک ذراسی غلط فہمی پر اُن سے لڑائی چھڑ گئی۔ قصہ یوں ہوا کہ ٹہل سنگھ یا میوہ سنگھ نامی ایک سکھ جرنیل مع لشکر ان کے ہاں اترا ہوا تھا کہ ان کے ایک سادہ لوح رکاب دار نے مدارات کے طور پر حقہ لاکر اس کے سامنے رکھدیا۔ اس پر وہ تلوار چلی کہ جب تلوار تھمی ہے تو اس علاقے پر انگریزوں کا تسلط قائم ہوچکا تھا۔ خاندانِ کیخسرو میں یہ لڑائی ــــــ "حقوں کی لڑائی" کے نام سے مشہور ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو انگریزوں کی کامیابی میں کیخسرو خاندان کے اس حقّے کا بہت اہم حصہ ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بعد میں بعض انگریز حکام چاندی، تانبے، پیتل وغیرہ کے چھوٹے چھوٹے حقے تحائف و یادگار کے طور پر اپنے ڈرائنگ روم میں رکھتے اور ولایت بھیجتے تھے۔

چوتھے دور میں، جو راجہ سلطان مبارز خاں کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے: روزنامچہ میں کچھ اس قسم کے اندراجات ملتے ہیں:-

"دن بھر پلنگ پر پڑے پڑے حقہ پیتا رہا۔"
"سلطان طہماسب خاں کے کمربند کو دیمک چاٹ گیا۔"
"مردان سے عمدہ نسوار منگوائی ہے۔"
"چترالی عقاب بیمار ہے۔"
"اس زور کی آندھی چلی کہ دیوانِ عام کی چھت اُڑ گئی۔"
"ہاضمہ سخت خراب ہے۔"
"کچھ بھی نہیں۔"

یہ اندراجات بھی سلطان مبارز خاں کے ابتدائی روزنامچوں میں ملتے ہیں۔ ورنہ بعد میں تو انہوں نے اپنے شاہی روزنامچہ میں دورہ پر ادھر آنے والوں افسروں سے ریمارکس اور سرٹیفکیٹ لکھوانے شروع کردیئے ہیں۔ چنانچہ پونا ہارس کے ایک میجر ایل۔ بی۔ ڈبلیو ہڈسن صاحب سلطان مبارز خاں کی مونچھوں، ان کی حویلی کی محرابوں، باز کی ٹانگوں میں بندھے ہوئے گھنگھروں اور ان کے باورچی خانے کی تعریف میں پورے دو صفحات لکھ گئے ہیں۔ آخری ریمارک ایک سب ڈویژنل افسر مسٹر ایلن ہارٹلے کا لکھا ہوا ہے جس پر یکم اپریل ۱۹۲۷ء کی تاریخ ثبت ہے۔ آزادی کے بعد سے

روزنامچہ خالی پڑا ہے۔ سلطان مبارز خاں کہتے ہیں کہ اب ہم ریمارک لکھوائیں تو کس سے لکھوائیں۔ جو افسر آتا ہے وہ پہلے کبھی نہ کبھی اسی علاقے میں قانونگو، گرداور، تحصیلدار، تھانیدار رہ گیا ہے۔ رہے بڑے سینیئر افسر تو وہ نہ معلوم کس افراتفری میں مبتلا ہیں کہ دورے پر کبھی اس طرف آتے ہی نہیں۔ آتے ہیں تو نہ انھیں شکار کھیلنے کا شوق نہ روزنامچہ لکھنے کی فرصت۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں ان سے ریمارک لکھواتے ہوئے کچھ شرم سی آتی ہے۔

مجموعی حیثیت سے اگر تاریخی واقعات کی اوسط فی صد نکالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس مسلمان خاندان کے سلاطین اکثر و بیشتر دوسرے مسلمان سلاطین کے خلاف نبرد آزما رہے ہیں۔

باز و عقاب سے شکار کھیلنا کیخسرو خاندان کا مرغوب مشغلہ رہا ہے چنانچہ آج بھی کوئی بیس پچیس نامی گرامی عقاب، جن کی کھال میں بھوسہ بھرا ہوا ہے۔ دیوانِ خاص کی دیواروں پر جابجا بیٹھے نظر آتے ہیں۔ ہر عقاب کے نیچے ایک تختی لگی ہے جس پر خطِ نسخ کوئی میں فارسی کا کوئی مشکل سا شعر کندہ ہے اور اُس کے نیچے مرحوم عقاب کی مختصر سی سوانحعمری ——— آخری عقاب وہ ہے جس کی آنکھ نکلوا کر خود سلطان مبارز خاں نے اپنی آنکھ میں فٹ کروا رکھی ہے۔

دیوانِ خاص میں آبنوس کا ایک بہت بڑا چوبی بورڈ آویزاں ہے جس پر عہد بعہد کے مصوّروں نے سلاطینِ کیخسرو کی تصاویر بنا رکھی ہیں۔ مورثِ اعلیٰ سلطان ممارا خاں کی تو قدِ آدم تصویر موجود ہے۔ مگر باقی سلاطین کے گردن تک صرف چہرے ہی دکھلائے گئے ہیں لیکن اس سے تصویر میں کوئی خاص کمی نظر نہیں آتی کیونکہ بعد کے تمام سلاطین وہی سلطان ممارا خاں کا چغہ، کمربند اور پاجامہ پہنتے تھے۔

چہروں میں بھی مصوروں نے زیادہ کمال مونچھوں پر صَرف کیا ہے کہ مونچھ اس خاندان کی قومی و تاریخی علامت سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ تصاویر کا یہ بورڈ عملاً گویا مونچھوں کا ایک کیلنڈر ہے جس میں بڑی بڑی جابر، گھنی اور گھمبیر، بلند و بالا مونچھیں نظر آتی ہیں۔ بعض سلاطین کے بارے میں تو مشہور ہے کہ وہ مونچھوں کے دونوں کونوں پر الگ الگ دو تلواریں لٹکا کر چلا کرتے تھے۔ داناؤں کا کہنا ہے ان مونچھوں کے طول بلد اور عرض بلد سے خاندانِ کیخسرو کے عروج و زوال کی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔ جن سلاطین کی مونچھیں شاندار تھیں۔ ان کا دورِ حکومت بھی شاندار ثابت ہوا۔ خود بوڑھے سلطان مبارز خاں کی مونچھیں دیکھ کر آدمی دنگ رہ جاتا ہے کہ اس پیری و ضعیفی میں اتنی گنجان مونچھیں یہ کہاں سے لائے ہیں اور اتنے نحیف و نزار جسم کے ساتھ اتنا بوجھ لیکر چلتے کس طرح ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر سلطان مبارز خاں کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا جائے اور اُن کی مونچھوں کو دوسرے میں، تو مونچھوں والا پلڑا شاید کچھ بھاری ہی نکلے۔ بہرحال سلطان مبارز خاں کی مونچھیں گھنی بھی ہیں، گنجان بھی ہیں، اور ان کا رُخ بھی ہنوز اوپر کی طرف ہے اور سلطان مبارز خاں خوش ہیں کیونکہ خاندان کا ستارۂ عروج انہیں مونچھوں سے بندھا ہوا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ستارہ بلندی کی طرف جا رہا ہے۔





قلوپطرہ کا رومانی سفر

ولیم شیکسپیئر
مترجمہ: رفیق خاور

(نظم کی چکیلی، ڈولتی بحر میں دریا کی لانبی لانبی، ہلورے لیتی لہروں کا سماں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی طرح الفاظ میں بھی اس شاہانہ سفر کے کروفر اور دریا کے ٹھاٹھ کے ساتھ مختلف سموں اور آوازوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔)

سفینہ جس میں بیٹھی تھی وہ ملکۂ پری وشاں
غضب تھا اس کے تیرنے کا جادو بھرا سماں
دھیرے دھیرے تیرے جیسے تختِ رواں کوئی
وہ اس کی چمک دمک، وہ اس کی دہکتی لَو
ہو دریا کے دل میں جیسے آگ سی لگی ہوئی
وہ کشتی بھلا کہاں سنہری سریر تھا
بھبوکا سی روشنی تھی، پانیوں کی تھرتھری
یہ عالم کوئی کہے کہ اک ٹکڑا اُبھر کا
بڑھ چڑھ کر بھڑکے سے ہو پانی میں گر پڑا
وہ دنبالہ سونے کا ڈھلکتا، شفق نما
شعلِ خور بھی جس کے آگے جھک جھک کرے سلام
وہ خوش رنگ بادبان عطر میں بسے ہوئے
سماں ہو بہو جیسے بادلوں میں پینگ[1] کا
وہ خوشبوئیں کہ ان پر ہوا لوٹ لوٹ جائے
جو اک بل ادھر پڑے تو یاں بل پہ بل پڑیں
وہ چپو جیسے سانچے میں نور کے ڈھلے ہوئے
ملے جلے سنہری روپہلی، شعاع دار
اور ان کے نیچے موج جیسی کشتی کی آن بان
تمام جیسے نیلم ایسی انگھڑیوں کے خم پہ ہوں

نفیس ہلکی ہلکی نرم پلکوں کی جھالریں
تھپکتے پانیوں کو نھنے کچھ اس طرح سے دمبدم
نفیریوں کے میٹھے میٹھے زمزموں کے ساتھ ساتھ
کہ تال مست ہو کے پانی ناچتا تھا اور کبھی
ہمک ہمک کے پاس آ کے "اک تھاپ اور بھی!"
وہ کامدار سائباں، حریری سنہری بھی
اور اس کے تلے وہ حور لیٹی تھی ناز سے
وہ پیکر کی آن بان، جوبن کی دھوم دھام
مجال کیا بیاں کرے جو کوئی حسن کی ادا
کہ بول اس کے سامنے تھے کھوئے قدرتِ بیاں
کوئی کہے کہ وینس کے ساحروں نے زہرہ کی
عجیب ہی ہنر سے جو تراشی ہے مورتی
بعینہٖ وہی ہے یہ وہی وہی وہی وہی!
مگر جو دیکھیں غور سے تو وہ بت تھا یہ پری
مقابلہ ہی کچھ نہ تھا کچھ ایسی گداز تھی
تھا انگ انگ اس کا نیر، سیال چاندنی
جو تن سیمِ خام کا تو مکھڑا نرا کنول
کہ فطرت ہو پانی پانی اس کے ڈھلاؤ سے
اِک اس طرف اک اُس طرف دو لڑکے پری جمال
کمال کے بھنور تھے جن کی ٹھوڑیوں کی اوٹ میں
وہ مسکاتے جس طرح ہوں کیوپڈ ہی ہو بہو
اُتر کر جو آئے ہیں ابھی آسمان سے
وہ جھلتے تھے مورچھل تو اللہ وہ سماں!
کہ جن نرم نرم گالوں کو ہولے سے ٹھنڈ دیں
وہ گال دہکاتے تھے، بھڑکتے تھے اور بھی
ادھر جو کام وہ کریں ادھر تمام پٹ کریں!

[1] پنجابی توس قزح

فن:

ہماری موسیقی میں جدید تجربے

انور عنایت اللہ

کسی بھی ترقی یافتہ قوم کی سماجی زندگی میں موسیقی کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور شاید اسی لئے فنونِ لطیفہ میں موسیقی کو سب سے اونچا درجہ دیا گیا ہے۔ موسیقی کا تعلق حسِ سمع سے ہے۔ موسیقار گویا ہوا میں گرہ لگاتا ہے۔ یہ ایک نہایت دشوار اور نازک فن ہے۔ دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرح یہ آنکھوں کے سامنے ٹھہرا نہیں رہتا۔ شاعری، اصنام گری، تعمیر اور مصوری کی طرح اس کی کوئی دیرپا شکل نہیں ہوتی کہ اس میں اصلاح و ترمیم ہوسکے یا کسی بہتر فنکار سے امداد لیکر اس کے حسن میں اضافہ کیا جاسکے۔ مغنّی کو بر وقت کمال فن کے ساتھ نغمہ کی ایک تصویر ہوا میں بنانی پڑتی ہے اور اس تصویر کو ایک مختصر یا محدود وقت میں اِس درجہ مکمل بنانا پڑتا ہے کہ سننے والا زیادہ سے زیادہ سرور حاصل کرسکے۔

"سُر" موسیقی کی اکائی ہے جو ارتعاش سے پیدا ہوتا ہے۔ خواہ یہ ارتعاش ضرب سے پیدا ہو، خواہ رگڑ سے، خواہ ہوا سے۔ گانے اور ساز، دونوں کی موسیقی کی بنیاد ہی ارتعاش ہے۔ جیسے جیسے ارتعاشات کی تعداد بڑھتی جاتی ہے، سُروں کی آواز چڑھتی جاتی ہے اور ایک حد ایسی آتی ہے کہ تیز سے تیز تر آہنگ میں یہ سُر پھر اپنے آپ کو دہرانے لگتے ہیں۔ غالباً اسی اُصول سے 'برسوں پہلے' فیثا غورث کو سُروں کی سپتک متعین کرنے کا خیال آیا۔ چنانچہ اُس نے سات سُروں کی ایک بنیادی سپتک مقرر کر دی جسے ہماری موسیقی میں بلاول کی سپتک کہتے ہیں۔ اس میں سات سُر مقرر کئے گئے۔ "سا، رے، گا، ما، پا، دھا اور نی" بعد کو ان کے علاوہ پانچ اور درمیانی سُر تشخیص کئے گئے۔ ان ہی بارہ سُروں میں دنیا کی تمام موسیقی سمائی ہوئی ہے۔ یہ وہ سُر ہیں جنہیں گوشِ انسانی آسانی سے تمیز کرسکتا ہے۔

ہماری موسیقی کی بنیاد راگوں پر رکھی گئی ہے۔ راگ چند خوش آہنگ سُروں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ بارہ سُروں کے امتزاج سے لاکھوں متفرق شکلیں بن سکتی ہیں۔ ان ہی مختلف شکلوں کو راگ راگنیوں سے موسوم کیا گیا۔ ان ہی راگ راگنیوں پر ہماری کلاسیکی موسیقی مشتمل ہے۔ کلاسیکی موسیقی سے میری مراد ہماری وہ موسیقی ہے جو صدیوں پُرانی ہے اور جسے عوام پکّے گانے اور فنی موسیقی کے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کی موسیقی اس علاقے کی تہذیب و تمدن کی طرح بے حد قدیم ہے۔ لیکن ابتدائی زمانے میں موسیقی اتنی ترقی یافتہ نہ تھی۔ ساز بھی گنے چنے ہی ہوتے تھے اور انہیں شاذ و نادر گانے یا ترنم سے اشلوک پڑھنے والوں کے ساتھ بجایا جاتا۔ جب رفتہ رفتہ موسیقی نے ترقی کی تو اس نے دھرپد کی شکل اختیار کی۔ اِس صنف کو بھی مسلمان فنکاروں نے ترقی دی۔ اس کو ہماری موسیقی کی سب سے قدیم شکل سمجھئے۔ یہ نہایت سادہ اور مردانہ طرز کا گانا ہوتا ہے جس میں خدا کی حمد کی جاتی ہے یا شجاعت اور تاریخ کے واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔ اس کا رواج اب بہت کم ہوگیا ہے۔ اس کے بعد 'خیال' گائکی کی ابتدا ہوئی۔ یہ بھی مسلمانوں ہی کی مرہون منت ہے۔ دُھرپد میں تانوں کی اجازت نہیں ہے۔ اس بندش سے بچنے کے لئے غالباً 'خیال' کا رواج ہوا جس میں ایک مخصوص ہیئت کے اندر برجستہ تان پلٹوں کے ذریعے تزئین و آرائش کی بہت گنجائش رکھی گئی ہے۔

مسلمان عرب اور ایران سے آئے تو اپنے ساتھ ایک نئی ترقی یافتہ تہذیب لائے۔ ہندوستان اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ جہاں مسلمانوں نے زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں انقلابات پیدا کئے وہاں مقامی موسیقی کو کچھ اس طرح اپنایا اور اس میں اتنی نمایاں تبدیلیاں کیں کہ آج تک یہ اسی نہج پر قائم ہے۔ حضرت امیر خسرو سے لیکر روشن آرا بیگم اور نزاکت علی سلامت علی تک بیسیوں اساتذہ نے اس کو اپنے خونِ جگر سے سینچا اور اس کی نشو و نما میں بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ آج جو فن موسیقی برصغیر میں رائج ہے وہ صرف مسلمانوں ہی کا مرہون منت ہے۔ مسلمانوں نے نہ صرف خیال، ٹھمری، دادرا، ٹپہ، غزل وغیرہ گانے کا سلسلہ رائج کیا بلکہ سازکی موسیقی کے سلسلے میں بھی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ طبلہ، ستار، دلربا، سارندہ، سرود، رباب،

دچترویناوغیرہ سب کی ایجاد اور ساز کی موسیقی پر صدیوں سے چھائے رہنے کا سہرا مسلمان فنکاروں ہی کے سر ہے۔

ایک عجیب اتفاق دیکھئے کہ جس موسیقی کو صدیوں تک مسلمان موسیقاروں نے اس قدر محنت و مشقت سے پروان چڑھایا۔ اس کو مندروں اور درباروں کے شکنجے سے آزادی دلائی اور عوام تک پہنچانے کی سالہاسال کوشش کی، اس کی زندگی میں ایک ایسا دور بھی آیا جب عوام اس سے دُور بھاگنے لگے۔ اس کی بھی بڑی معقول وجہ ہے۔ شروع شروع میں ہماری موسیقی نے شاہی سرپرستی میں ترقی کی جس سے یہ بڑی حد تک حکمرانوں کے درباروں کا اجارہ بن کر رہ گئی۔ دوسرے لفظوں میں نتیجہ نکلا کہ عوام الناس سے اس کا تعلق برائے نام رہ گیا۔ کلاسیکی فن کی پابندیاں عوام کو نہیں بھائیں تو ٹھمری دادروں کا رواج ہوا۔ یہ عوام کا من دوبارہ موہ لینے کی ایک اچھی کوشش تھی۔ اس کا سہرا تاجدار اودھ واجد علی شاہ کے سر ہے جو موسیقی میں اختر پیا تخلص فرماتے تھے۔ اس کے بعد ایرانی اثرات کے تحت غزلیں گانے کا رواج ہوا۔ موسیقی کی یہ نئی طرز طوائفوں کو بہت بھائی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے سرپرستوں کی تفریح کے لئے زیادہ تر غزل اور پھر اس کے بعد ٹھمری دادرے کو اپنایا جن میں نرت کے ذریعے سامعین کو بھلانے کی بڑی گنجائش تھی کبھی کبھار بندھے ہوئے خیال کو بھی مجروں میں جگہ دی جانے لگی۔ ان سب تغیرات کا نتیجہ یہ بھی نکلا کہ موسیقی ایک ایسے طبقے کی میراث بن گئی جسے عوام اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ اس کی مشکل ٹیکنک کے ساتھ ساتھ اسے گانے والی طوائفوں کی سوقیانہ اور غیر سنجیدہ حرکتوں نے اس کو خاصہ بدنام کر دیا چنانچہ تعلیمیافتہ شریف طبقہ اس سے دُور بھاگنے لگا۔ اب حالات یہ ہیں کہ صرف "گلے بازی" اور کسی راگ یا راگنی کی گرامر کی وضاحت یعنی دوسرے لفظوں میں بے معنی اور بے ہنگم شور و غل کو لوگ کلاسیکی موسیقی سمجھنے لگے ہیں۔ اس کی ذمہ داری فن کی اس نوع سے زیادہ اُن استادوں پر عائد ہوتی ہے جو اپنی لاعلمی کے باعث آواز کے حسن، ادائیگی کے مناسب اور متناسب اُصولوں اور سننے والوں کے میلانِ طبع سے زیادہ راگ کی گرامر اور آواز کی شعبدہ بازی کو اہمیت دینے لگے۔

یوں تو تھیئٹروں اور فلموں نے موسیقی کو عوام الناس سے قریب لانے اور مقبول کرنے میں بڑی خدمات انجام دیں لیکن سائنٹیفک اُصولوں پر پہلے گراموفون اور پھر ریڈیو ہی کی آمد سے موسیقی کی ترویج شروع ہوئی۔ اچھی موسیقی کو پہلی بار گھر گھر تک پہنچانے کا سہرا گراموفون اور ریڈیو ہی کے سر ہے۔ پاکستان میں اب تک اچھی موسیقی کو عوام میں مقبول کرنے کی کوششیں سب سے زیادہ ریڈیو ہی نے کی ہیں۔ اس سلسلہ میں جدید تجربے بھی ریڈیو ہی پر کئے جا رہے ہیں۔

پاکستان میں کلاسیکی موسیقی کے احیائے ثانی کا دور ۱۹۴۸ء کے بعد شروع ہوا۔ شروع ہی سے یہ محسوس کیا جانے لگا کہ اس قدیم فن کے متعلق عوام میں بڑی غلط فہمیاں ہیں۔ ان کو دور کیا جانا بے حد ضروری تھا۔ سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی تھی کہ کلاسیکی موسیقی کا صحیح روپ عوام کے سامنے پیش کیا جاتا تاکہ وہ اچھی اور بری موسیقی کا فرق محسوس کر سکتے۔ اس سلسلے میں فلم والوں کے بعض تجربے مفید ثابت ہوئے۔ جنھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ اگر کسی بھی راگ یا راگنی کو صحیح اور معقول طریقے پر پیش کیا جائے تو عوام اس کا بھی اتنے ہی جوش و خروش سے استقبال کر سکتے ہیں جتنا کہ عام ہلکے پھلکے گیتوں کا۔ عرصہ ہوا استاد جھنڈے خاں مرحوم نے ایک مشہور فلم "چترلیکھا" میں ایک انتہائی دلچسپ تجربہ کیا تھا جو بے حد کامیاب رہا۔ انہوں نے اس فلم کے تمام گانوں کی دھنیں ایک ہی راگ "بھیرویں" میں باندھی تھیں۔ اس کے تمام نغمے بے حد مقبول ہوئے۔ اس کے بعد ہماری فلموں میں ایک سے زیادہ گیتوں کو خالص راگوں میں پیش کیا گیا۔ مثلاً خورشید انور نے پاکستانی فلم "انتظار" میں نورجہاں سے ایک گیت ٹوڈی میں گوایا۔ خورشید انور ہی کی ایک دوسری فلم "زہرِ عشق" میں ایک نغمہ راگ پیلو میں ہے جسے ناہید نیازی نے گایا ہے۔ اسی طرح فلم "قسمت" میں روشن آرا کی گائی اور باندھی ہوئی ایک ٹھمری ہے اور فلم "وعدہ" میں نائک سدارنگ کا مشہور درباری کا خیال ہے "نین سے نین ملائے راکھو نیکو بلماں" جسے پاکستان کے دو اچھے کلاسیکی موسیقاروں، زاہدہ پروین اور فتح علی خاں نے مل کر گایا ہے۔ اگرچہ یہ تمام گانے راگوں کے پابند تھے۔ پھر بھی یہ عوام میں بے حد مقبول ہوئے۔ ان تجربوں نے ایک بار پھر یہ ثابت کر دیا کہ جہاں تک کلاسیکی موسیقی کی عوام میں نامقبولیت کا تعلق ہے، قصور موسیقی کا نہیں بلکہ ان لوگوں کا تھا جو راگوں کی روح اور اس کے صحیح تاثرات کو سمجھنے کی بجائے ان کی ظاہری وضع پر جان دیتے تھے۔ گانے والوں کے مختلف گھرانوں میں اختلافات کے باعث ہر موسیقار بڑی تندہی سے کوشش کرنے لگا کہ راگوں کو ثقیل سے ثقیل تر بنا کر پیش کیا جائے۔ اس سے بتدریج راگوں کا روپ اس قدر بھیانک ہوتا گیا کہ لوگ ان سے دور بھاگنے لگے۔

ان تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد پاکستان میں سب سے پہلے یہ کوشش کی گئی کہ راگوں کے قالب سے زیادہ ان کی روح کو اہمیت دی جائے۔ عوام کو راگوں سے مانوس کرنے کے لئے ریڈیو نے ایک دلچسپ تجربہ یہ کیا کہ غزلیں اور گیت راگوں میں پیش کئے جانے لگے۔ اس کے ساتھ ساتھ کلاسیکی موسیقی کا ایک پروگرام "راگ رنگ" شروع کیا گیا جس میں سامعین کی موجودگی میں ایک ہی خیال کو کئی فنکاروں نے مل کر گانا شروع کیا۔ اس سے فائدہ یہ ہوا کہ پہلی بار سب نے مل جل کر راگ کے صحیح روپ، اس کے صحیح تاثر کو ابھارنے کی کوشش کی ورنہ اب تک تو ہر استاد کو صرف اپنے ہی فن کے مظاہرے کی فکر ستایا کرتی تھی۔ اسے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ اس شعبدہ بازی میں راگ کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ جب دو یا دو سے زیادہ فنکاروں کو ایک ساتھ کوئی راگ پیش کرنا پڑا تو "گلے بازی" اور "شعبدہ بازی" بڑی حد تک ختم ہو گئی۔ یہ سلسلہ اب بھی ایک عبوری دور سے گزر رہا ہے۔ یہ تجربہ کس حد تک کامیاب ہو سکتا ہے، اس کا جواب تو وقت ہی دے سکے گا۔

عوام میں ہماری موسیقی کی مقبولیت کے سلسلے میں ایک اور دقت 'خیال' کے بولوں کی تھی۔ یہ محسوس کیا گیا کہ عوام اس وقت تک کسی نغمے کو قبول نہیں کر سکتے جب تک ان کے بول، چاہے یہ نغمے کلاسیکی ہوں یا ہلکے پھلکے' معقول نہ ہوں۔ چونکہ ہماری موسیقی کی ابتدا صدیوں پہلے دیوتاؤں کے مندروں میں ہوئی۔ اس لئے اکثر قدیم راگوں کے بول بھجنوں کا رنگ لئے ہوئے تھے۔ حضرت امیر خسروؒ پہلے عظیم موسیقار تھے جنہوں نے پہلی بار راگوں کو ان سنسکرت بولوں اور دیوی دیوتاؤں کی شان میں قصیدوں کے چکر سے آزاد کرنے کی کوشش کی۔ مثال کے طور پر ان کے باندھے ہوئے بول ملاحظہ فرمائیے:-

حضرت خواجہ سنگ کھیلئے دھمال
پیش خواجہ تم بن ٹھن آئے حضرت رسول صاحب جمال
حضرت خواجہ سنگ کھیلئے دھمال

اور ——

نجام الدین پیرا ولیا
نجام الدین شانِ امبیا
خسرو آن پڑے چرنن میں، کرپا کر دہر کرپا
نجام الدین پیراولیا

یہ سلسلہ حضرت امیر خسروؒ سے لیکر میاں تان سین، محمد شاہ رنگیلے کے درباری گوئیے سدا رنگ اور بہادر شاہ ظفر تک جاری رہا اور نئے نئے بول باندھے گئے۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں ایک ایسا دور بھی آیا جب موسیقی چند مخصوص گھرانوں کی میراث بن کر رہ گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو بول ورثے میں ملے۔ اُن میں ترمیم کو بدعت قرار دیا گیا۔ اور اس طرح ہم تک زیادہ بول ایسے آئے جو نہایت فرسودہ اور بے معنی تھے۔ بہت جلد سمجھدار لوگوں کو یہ احساس بھی ہو گیا کہ عوام ان بے معنی بولوں کی وجہ سے بھی کلاسیکی موسیقی سے دور بھاگتے ہیں۔ اب ہماری موسیقی کے اس اہم پہلو کے سلسلہ میں بھی بعض اچھے تجربے ہو رہے ہیں۔ اس سلسلے میں وہی لوگ کام آ سکتے ہیں جو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ موسیقی سے بھی شغف رکھتے ہوں اور جنہیں عروض کی پابندیوں کے ساتھ ساتھ راگوں کے تاثر کی بھی سوجھ بوجھ ہو۔ چنانچہ بعض ایسے ہی ذہین فنکاروں نے اب اس کی طرف دھیان دینا شروع کیا ہے جن میں اوروں کے علاوہ افضل پرویز اور "خوش رنگ پیا" نے اچھے اچھے نئے بول باندھے ہیں۔ اول الذکر کے باندھے ہوئے راگ بھیروں کے خیال کے بول ملاحظہ ہوں (تال چوتالہ):-

استھائی:- "نورِ سحر پھیلا ہے ہر سو، جھلمل کرتے نیارے تارے سارے لرز رہے ہیں —— نورِ سحر — ا
انترا:- "چھٹنے کو ہے گھور اندھیرا —— کوچ ہولنے رین کا ڈیرا —— اندھیارے کے سنگی تارے لاج کے مارے لرز رہے ہیں —— نورِ سحر —!
بھیروں صبح کا راگ ہے۔ اس کی مناسبت سے خیال کے ان بولوں کا تاثر بہت عمدہ ہو جاتا ہے۔

"خوش رنگ پیا" کے یہاں بھی راگوں کا صحیح تاثر ملتا ہے۔ ان کے دلکش اور سادہ بول اب اکثر ریڈیو پر سنائی دیتے ہیں۔ ان کے خیال درباری کے بول ملاحظہ فرمائیے:-

"نظر کرم فرماؤ — گوہر طرب برساؤ —— درباری کے گن جن، مل کے خوش رنگ کے سنگ — داتا کے گن گاؤ — گوہر طرب برساؤ — نظر کرم فرماؤ"

اور غالباً یہ بھی خوش رنگ ہی کے بول ہیں۔ یہ 'خیال' بہار ہے جو ایک تالہ میں گایا جاسکتا ہے:۔

استھائی:۔ "آئی ہے بہار قلب ونظر کا قرار"

انترا:۔ "زندگی سپنا تو نہیں ہے ـــ جلوہ ہے پردا تو نہیں ہے ـــ کا کلیں سنوار آئی ہے بہار ـــ!"

پاکستان میں لوک گیتوں کا سرمایہ ایسا ہے جس پر ہم بجا طور پر ناز کرسکتے ہیں۔ ریڈیو ہی نے ہلکے پھلکے گانوں کے لئے ان لوک دھنوں کو بڑی کامیابی سے اپنانے کی کوشش کی ہے۔ لوک دھنوں میں اکثر گیت بھی نشر کئے جاتے رہے ہیں اور غزلیں بھی۔ اس کے علاوہ ایک علاقے کی دھنوں میں دوسرے علاقے کے گیت کی طرزیں بھی کانوں کو بھلی لگتی ہیں۔ مثلاً بھٹیالی کی دھن میں کوئی پنجابی گیت یا ہیر کی دھن میں کوئی بنگالی نغمہ۔ ابھی یہ تجربہ بھی عبوری دور سے گذر رہا ہے لیکن آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ سلسلہ عوام کو بہت پسند آئے۔

ہماری موسیقی میں اب تک انفرادی کوششوں کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اسی لئے ہمارے یہاں شروع سے مغربی انداز میں آرکسٹرا کبھی پنپنے نہیں پایا۔ کئی سال ہوئے قیام پاکستان سے پہلے استاد علاء الدین خاں نے بعض تجربے کئے تھے۔ اس کے بعد فلموں نے آرکیسٹریشن کی کوشش کی۔ ان کوششوں کو ریڈیو نے اپنایا اور اب اس سلسلے میں بھی خاصے کامیاب تجربے کئے جارہے ہیں۔

خیال کے نئے بولوں کے سلسلے میں تو نہیں لیکن راگ راگنیوں کو اچھے اشعار کے روپ میں ڈھالنے کی بعض دوسرے شعراء نے بھی خاصی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ مثلاً قتیل شفائی، سیف الدین سیف، مختار صدیقی، احمد راہی وغیرہ۔ یہ تجربے اس لئے بھی اہم ہیں کہ راگوں کے تاثر کو شعر کے قالب میں پیش کرنے کی غالباً یہ پہلی کوششیں تھیں۔

شعر ونغمہ کے ذریعے سامعین کے ذہن میں مختلف تاثرات پیدا کرنے کے بھی بعض تجربے کئے جاتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں رفیق غزنوی نے عرصہ ہوا صرف سازوں کی مدد سے ایک دلچسپ کوشش کی تھی۔ اس پروگرام کا عنوان "سناٹا" تھا۔ صرف آوازوں کی مدد سے تصویر کشی خاصا مشکل کام ہے کیونکہ صوتی اثرات کا بھلا تصویروں سے کیا تعلق۔ لیکن متذکرہ بالا ریڈیو پروگرام میں مختلف آوازوں کے ذریعے، ان کے اتار چڑھاؤ اور ایک خاص انداز میں، مختلف سازوں کی ہم آہنگی سے سناٹے کو ابھارنے کی خاصی کامیاب کوشش کی گئی تھی۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے، عربی اور عجمی موسیقی کے میل ملاپ کے بعد ہی ہماری موسیقی نے اپنی موجودہ شکل اختیار کی ہے۔ غالباً اسی لئے قیام پاکستان کے بعد سے اردو غزلوں اور گیتوں کو عربی اور ایرانی دھنوں میں پیش کرنے کے تجربے کئے جاتے رہے ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں دقت یہ آن پڑی کہ ادھر ہم نے تو خالص عربی اور ایرانی دھنوں کو اپنانے کی کوشش کی اور ادھر عرب اور ایران میں موسیقی نے کچھ اور ہی رخ اختیار کیا۔ وہاں موسیقار اب "میلوڈی" کو خیرباد کہہ کر بڑی تیزی سے "ہارمنائزیشن" یعنی تالیفی موسیقی کی طرف جارہے ہیں۔ اسی لئے آئے دن وہاں خالص مغربی موسیقی کو مکمل طور پر اپنانے کی پُرخلوص کوششیں ہورہی ہیں۔ ہمارے ہاں بھی بعض موسیقاروں کا رجحان کچھ ایسا ہی ہے۔ "ہارمنائزیشن" کے تجربے ہورہے ہیں۔ لیکن ہماری موسیقی کا مزاج ہی کچھ ایسا ہے کہ شاید ہی وہ مغربی رنگ آسانی سے قبول کرسکے۔ اسی لئے ہمارے خالص دیسی سازوں پر یہ بدیسی نغمے کچھ عجیب سے لگتے ہیں۔

ان کے علاوہ آئے دن ہماری فلموں میں بھی بعض عجیب وغریب تجربے کئے جارہے ہیں۔ پچھلے سات آٹھ سال کی پاکستانی فلموں کا جائزہ لیا جائے تو بڑے خطرناک رجحانات کارفرما نظر آتے ہیں۔ میرا اشارہ ہماری فلمی موسیقی پر مغرب کے اثرات کی طرف ہے۔ میں ان اثرات کا مخالف نہیں کیونکہ میرا یقین ہے کہ فن کی کسی بھی نوع کی صحیح نشوونما کے لئے ضروری ہے کہ اس کے دروازے ہمیشہ کھلے رہیں تاکہ وہ مناسب حد تک بیرونی اثرات قبول کرسکے۔ لیکن ان دنوں جس قسم کے رجحانات کارفرما ہیں۔ وہ موسیقی کو غلط راستے پر لئے جارہے ہیں۔ بدقسمتی سے آجکل ہماری فلموں میں جس قسم کی مغربی موسیقی کی نقالی ہورہی ہے اسے خود مغرب میں کبھی اعلیٰ درجہ کی موسیقی نہیں سمجھا گیا۔ جیز اور ریگ ٹائم وغیرہ کا رونا ہی کیا، اب تو راک اینڈ رول کی قسم کی بھونڈی موسیقی کی نقالی بھی شروع ہوگئی ہے۔ فنی طور پر یہ تجربے غلط ہیں۔ ان سے ہماری موسیقی کے مزاج کو نقصان پہنچنے کے امکانات ہیں اگر فلمی موسیقی کے معیار کو بلند کرنا ہے تو اس نقالی کی خطرناک وبا کو فوراً سختی سے روکنا ہوگا۔ اس کا سدباب ضروری ہے ورنہ مجھے یقین ہے ہمارا بھی وہی حشر ہوگا جو اس روایتی کوے کا ہوا تھا جس نے اپنی چال بھول کر ہنس کی چال چلنے کی کوشش کی تھی۔

غزل

تابش دہلوی

کبھی دنیا سے کوشش بھی اگر کی دور جانے کی
ہمارے پاؤں میں زنجیر تھی گردش زمانے کی

جراحت ہے تبسّم کا نتیجہ، باوجود اس کے
گلوں کو دیکھ کر کرتا ہوں کوشش مسکرانے کی

ہوائے فصلِ گُل رکھتا ہے پیہم اس خرابی پر
ابھی چھوٹی نہیں ہے دل کی عادت زخم کھانے کی

حیاتِ جاوداں بخشی گئی اہلِ محبّت کو
تمنّا رہ نہ جائے تجھکو خنجر آزمانے کی

یقیں کرتے ہیں اب وعدہ ہو یا وہ عذرِ وعدہ ہو
کہ ہم لیتے ہیں لذّت اس طرح تیرے بہانے کی

دلِ حیراں کو اک نقشِ تصور کے سوا حاصل
ترا اس طرح آنا، ایک صورت ہے نہ آنے کی

ہمیشہ ٹوٹ کر گرنے کو ہے بیتاب اے تابش
یہ ہے برقِ بلا یا شاخ کوئی آشیانے کی

نظر حیدرآبادی

ملا نہ فصل گل و وصل گل رُخاں سے مجھے
فغاں کہ چین میسر ہوا فغاں سے مجھے

وہ اور ہوں گے اکیلے گئے جو منزل تک
نشانِ راہ ملا گردِ کارواں سے مجھے

شباب، شعر، ترنّم، شراب، حسن، سرور
حیات لے کے چلی ہے کہاں کہاں سے مجھے

بتاؤ کیوں نہ کروں ایسے حادثوں کو سلام
گذارتے ہیں جو ہر راہِ امتحاں سے مجھے

ملے ہیں کتنے خرد آزما رموز نہ پوچھ
جنوں کی چند حکایاتِ خونچکاں سے مجھے

ابھی تو قصّۂ آدم تمام ہونا ہے
مگر یہ کس نے پکارا ہے درمیاں سے مجھے؟

بچا لیا غمِ دوراں کے تازہ مضموں نے
قفس سے، دام سے، بجلی سے، آشیاں سے مجھے

نظر زبانِ غزل سے فروغِ نظم ہوا
ملا یہ نکتہ تری شوخیٔ بیاں سے مجھے

شرق

(ایک مغربی سیّاح)

پاکستان میں جو آٹھ کروڑ لوگ آباد ہیں ان میں سے آدھے مشرقی پاکستان میں بستے ہیں اور اگرچہ یہ مغربی پاکستان سے گیارہ سو میل دور واقع ہے، پھر بھی پی آئی اے کے تیز پرواز طیارے اس طویل فاصلے کو ایک ہی رات میں طے کر کے صبح سے پہلے ہی یہاں کے پُرسکون دارالحکومت ڈھاکہ پہنچا دیتے ہیں جہاں سمندر کی مخصوص بو ہواؤں میں رچی بسی ہوتی ہے اور لہلہاتی ہوئی ہریاول ہر طرف وہ جادو جگاتی ہے جو گرم مرطوب علاقوں کی روحِ رواں ہے۔ اور انسان کو کراچی کی بین الاقوامی فضاؤں بھلا دیتی ہے جیسے یہ بڑی دور کی چیز ہو۔

کئی اور حیثیتوں سے بھی مشرقی حصہ کی رفتارِ زندگی بہت مختلف ہے۔ یہاں زندگی ہولے ہولے پگ بھرتی ہے اور مغربی پاکستان کے بڑے بڑے شہروں کی ہاؤ ہو اور ریل پیل بالکل مفقود نظر آتی ہے۔ ڈھاکہ، جس کی بنیاد بنگال کے مغل نواب نے رکھی تھی، اپنی پتھر کی موجودہ پکی بل پیچ کھاتی سڑکوں اور بہت بڑے ٹاپو کے باوجود بدستور اپنی مشرقی وضع لئے ہوئے ہے۔ گو اُردو اور انگریزی سارے مشرقی پاکستان میں بولی اور سنی جاتی ہیں، لیکن مقامی زبان بنگالی ہی ہے۔

مشرقی پاکستان کی دلکشی اس کے مخصوص وضع کے لوگوں میں مضمر ہے۔ بعض فرنگیوں کی طرح بالکل صفاچٹ، بعض لمبی لمبی داڑھیوں والے یعنی اسرائیلی فریسیوں اور فقیہوں کی طرح ریشائیل اور بعض بودھی چپ چاپ، چلچلاتی دھوپ میں ننگی چندیا کے ساتھ رواں۔ ایشیا کا پس منظر اس ملک میں کہاں نہیں؟ وہ برمی وضع کے پگوڈا، وہ سیامی وضع کے راہب خانے، کسی گلی یا پہاڑی پر جھرمٹ بنائے، مسجدوں سے دور — اور پھر کہیں کہیں گرجے بھی۔



ڈھاکہ کی اپنی ہی انفرادیت بھی ہے اور اہمیت بھی۔ اس کا ماضی اس کی پرشکوہ عمارتوں میں محفوظ ہے۔ مثلاً لال باغ جس میں بی بی پری کا مزار ہے۔ ان عمارات کی نادر طرح اور کاریگری مغل دور کی صناعی کا دل آویز نمونہ ہے۔ یہاں شاہجہاں نے بڑے بڑے شاندار محل بنائے۔ تمام مسجدیں تاریخی اہمیت رکھتی ہیں۔ ہندوؤں کے مندر اور یہی کشش رکھتے ہیں۔ مسافروں کے لئے ایک تقریباً نیا ہوٹل "شاہ باغ" تیار ہوا ہے جو ایک عظیم الشان حویلی معلوم ہوتا ہے۔ تمام فرشوں پر سنگ مرمر کے اتنے ستون نصب ہیں کہ بے اختیار کسی کے یہ الفاظ یاد آتے ہیں:۔

"مجھے خواب آیا کہ میں ایک ایوانِ مرمریں میں آسودہ ہوں!" سامنے نظر اٹھا کر دیکھیں تو ہرے بھرے تختوں پر نیا ریڈیو اسٹیشن ایک قلعہ کی طرح سر اٹھائے کھڑا ہے۔ اور "شاہ باغ" کی چمک دمک کے ساتھ اپنی آب و تاب ملا کر خوب جگمگ جگمگ کرتا ہے۔

مشرقی پاکستان کے پیچ بل کھاتے دریا لگاتار بارش سے اُمڈ اُمڈ کر بہتے ہوئے اپنی ہی ایک زندگی رکھتے ہیں۔ سارے علاقے میں پٹ سن کے کارخانے جو ہزارہا لوگوں کو برسر روزگار رکھتے ہیں، یہاں کی مرطوب ہوا کا فیضان ہیں۔ کریم ہوٹل ملز کو ملاتے ہوئے لنگی پوش کارکنوں کا تانتا، دریا کے تنگ تنگ کناروں پر نہ صرف بڑا دلکش سین پیش

غرب

—کی نظر میں)

کیمل میر پوئی

خواہ آپ ہوائی جہاز سے آئیں یا سمندر کی راہ سے، بہر حال آپ کو کراچی ہی سے گزرنا پڑے گا جو دنیائے مشرق کا بابِ داخلہ ہے۔ اور سچ پوچھئے تو ایک مغربی سیاح کی نظر میں یہ شہر ہو بہو "مشرقیت" کی تصویر معلوم ہوتا ہے۔ جونہی انسان طیارے یا سمندری جہاز سے نیچے اترتا ہے پاکستان کے گہما گہمی سے پُر دارالحکومت کا جادو اس کے دل پر طاری ہو جاتا ہے۔ بڑے لطف کی بات یہ ہے کہ وہی نفیس نئی وضع کی سڑکیں جن پر جدید ترین ماڈل کی کاریں تیزی سے دوڑتی نظر آتی ہیں، انہی پر اونٹ بھی اپنی دھن میں مست اسی طرح بے تکلف چلتے پھرتے نظر آتے ہیں جس طرح انسان۔ ٹھیک ہے اونٹ یونہی شتر بے مہار نہیں ہوتے کہ آپ ہی آپ اینڈتے پھریں بلکہ وہ غریب بھاری بھرکم ٹھیلوں سے جتے ہوئے انہیں کھینچے لئے جاتے ہیں اور یوں لگتے ہیں جیسے کسی گھنے جنگل میں بڑے بڑے، زمین ہموار کرنے والے دیو جنہیں "بل ڈوزر" کہتے ہیں، اور ہم مغرب کے رہنے والوں کو بڑے عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہمارا تصور اُن کے بارے میں بہت رومانوی یا الف لیلوی قسم کا ہے۔ یعنی یہ صحرا کے جہاز لق و دق صحراؤں میں کاروانی شاہراہوں پر گامزن رہتے ہیں۔ یا اہرام مصر کے ارد گرد دور دراز مقامات کا چکر کاٹتے پھرتے ہیں۔ بے شمار گدھا گاڑیاں جن سے چلتے وقت گھنگھروؤں کی جھنکار بلند ہوتی ہے، اور سہ پہیہ سائیکل رکشہ گھومتے جھولوں کی طرح گل بوٹوں سے آراستہ ایک میلے کا سا سماں پیدا کرتے ہیں۔ اگر آپ زیادہ خوش قسمت واقع ہوئے ہوں تو شاید صدر پاکستان کا حفاظتی دستہ اپنی رنگا رنگ کی پوشاک زیب تن کئے گھوڑوں پر سوار آپ کی نظر سے گزر جائے، یا گھوڑ اسوار پولیس کا دستہ یا کوئی بارات جس کے سامنے بینڈ بجانے والے رنگ برنگی پوشاک پہنے بینڈ بجا رہے ہوں، دولہا پھولوں سے آراستہ گھوڑے پر سوار اور اس کے پیچھے پیچھے براتی چلے جا رہے ہوں۔ حق یہ ہے کہ بڑی آب و تاب سے چمکتا ہوا سورج، گہرے نیلے رنگ کا آسمان اور مردوں عورتوں کے لباس کی حیرت انگیز گونا گونی، یہ سب آپ کی نظر میں کسی تیوہار کا سماں پیدا کر دیتے ہیں۔



کراچی بس یہی چمک دمک اور چہل پہل ہی نہیں۔ جیسا کہ صریحاً ڈیڑھ صد لاکھ آبادی کا کوئی شہر نہیں ہو سکتا۔ آخر یہ آج سے سو برس پہلے محض مچھلیاں پکڑنے کی ایک چھوٹی سی بستی ہی تو تھا۔ اس لئے گو اس کے بعض حصے ترقی کرتے کرتے جدید وضع کے بڑے بارونق علاقے بن گئے ہیں لیکن ان سے ہٹ کر جو علاقے نواحیات میں ہیں وہ ویسے ہی پرانے لگتے ہیں۔

دو باتوں نے کراچی کو ترقی کرنے میں مدد دی: یہ ایک بڑی بندرگاہ بھی تھی اور بین الاقوامی ہوائی اڈہ بھی۔ جو براعظم ایشیا اور یورپ کا سنگم ہونے کی وجہ سے بڑی اہم کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اور مشرق و مغرب کو آپس میں ملاتا ہے۔ یہ تقریباً ہر ہوائی شاہراہ کا پڑاؤ ہے۔ اور آنے جانے والے مسافروں کے لئے اس کے بڑے بڑے ہوٹلوں میں جو آسائش مہیا کی جاتی ہیں وہ لندن پیرس اور نیویارک کے ہوٹلوں کا مقابلہ کرتی ہیں۔ دوستانہ تعلقات کی بناء پر یہ پرتگیزی ہند کے دارالحکومت، گوا پہنچنے کا واحد ہوائی

شرق:

کرتا ہے بلکہ صنعت کے حق میں بھی بے حد مفید ہے۔ ستلیاں، رستے، ٹوکریاں، اور قالین جو دنیا کے نصف حصہ میں دُور دُور تک پہنچتے ہیں، زیادہ تر مشرقی پاکستان ہی میں تیار ہوتے ہیں۔ میرا آدھے سے زیادہ وقت بڑے بڑے شہروں سے دور دیہات ہی میں گزرا لیکن مجھے وہاں کی زبانوں میں بولنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ لوگ مسکراہٹوں اور حرکات و سکنات ہی سے اپنا مطلب ادا کر لیتے تھے۔ مشرقی پاکستان کے ایک سرے سے دوسرے تک دوستی ہی دوستی ہے۔ جونہی کوئی اجنبی وہاں پہنچتا ہے یہ اس تک لپک کر پہنچتی اور اس کو گھیر لیتی ہے۔

چاٹ گام کی چہل پہل اور ہلچل سے پُر عظیم بندرگاہ میں ساتوں سمندر کے جہازوں کا نظارہ، ہری بھری پہاڑیوں کے پس منظر میں، عجیب سنسنی سی پیدا کرتا ہے۔ میل ہا میل لمبا دریائے کرنافلی پیچ و خم کھاتا، پہاڑیوں کے دامن دامن رواں، سطح پر ہر طرح کی کشتیاں، ہاؤس بوٹ وغیرہ، لوگوں سے کھچا کھچ بھرے اور آس پاس اُگنے والے گیلے پٹ سن اور دوسری زرعی پیداوار سے لدے بڑا سہانا منظر پیش کرتے ہیں۔

پہاڑی علاقے تک دریا سے، بذریعہ زنگامتی یا جیپ کے پہنچتے ہیں۔ یہ بھی مشرقی پاکستان کے اندر ایک اور ہی دنیا ہے — وادیوں میں دھان کے کھیتوں، اور پرانی وضع کے فارموں کی دنیا جہاں لوگ اس طرح رہتے سہتے ہیں جس طرح ان کے آبا و اجداد — صرف ایک لنگوٹی پہنے، دھرتی ماتا ہی کی طرح بھوری بھوری۔ یہ تمام دیہاتی لوگوں کی طرح ڈھور ڈنگروں کے ساتھ اور ان میں مل جل کر ہی رہتے ہیں، جو کبھی کبھی ان کے گھاس پھونس کے جھونپڑوں میں عین اس وقت گھس آتے ہیں جبکہ گھر والے کھانا کھا رہے ہوں اور اپنی تھوتھنی سے بڑی بے تکلفی کے ساتھ ٹہوکا دے دے کر روٹی کا ٹکڑا یا لقمہ طلب کرتے ہیں۔



ضلع جات کے کمشنر اور عمال کی بھی ایک روش خاص ہے۔ پرانی وضع کے رعونت پسند حکام اب کہیں نہیں رہے۔ نئے ملک کے عمال ایک نئی روح سے سرشار ہیں۔ اگر کوئی مہمان ریسٹ ہاؤس میں تنہا محسوس کرے تو وہ اسے اپنے یہاں قیام کی دعوت دیتے ہیں اور وہ بھی یہ معذرت کرتے ہوئے کہ افسوس ہے ان کا مکان مہمان کے شایانِ شان ایوان نہیں — عوام ان عمال تک بآسانی پہنچ سکتے ہیں۔ اور حکومت کا کاروبار زیادہ تر عمال اور جمہور دونوں کی باہمی فلاح و بہبود کے لئے مل جل کر کام کرنے پر موقوف ہے۔

یہی روح کاروباری حلقوں میں بھی دکھائی دیتی ہے چنانچہ چندر گونہ کے عظیم الشان کارخانہ کاغذ سازی میں جہاں مشینیں دیہاتی ماحول میں بڑی گھڑ گھڑاتی ہیں، کارکن اپنے ہی گھروں میں رہتے ہیں۔ ان سب کو ملک کے مستقبل میں بڑی دلچسپی ہے اور وہ فخر کرتے ہیں کہ کرنافلی کے عظیم الشان کارخانے اتنی بھاری مقدار میں کاغذ تیار کرتے ہیں جو پاکستان کے لئے بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ اور وہ بھی تمام تر اپنے ہی کچے مال یعنی بانسوں سے اپنے ہی کارکنوں اور راہبرین کی بدولت۔ چنانچہ ایک خوش خلق اور مستعد منتظم کے زیرِ نگرانی دل، دماغ، سائنس، خام مال، اوزار، ہتھیار سب مل کر طلسمی تیز رفتاری سے وہ نفیس چیز تیار کرتے ہیں جو کارخانے سے باہر نکلنے سے پہلے ہی بک جاتی ہے۔

یہاں سے کوئی پچاس میل دور موضع کپتئی واقع ہے، جہاں جدید امریکی بن بجلی کی مشین نصب ہے۔ یہ مشین سچ مچ جادو کرتی ہے۔ اور برسوں کے وحشی لاابالی بے قابو پانی کو بڑی استادی سے قابو میں لے آتی ہے اور لمبے وسیع علاقے کی جملہ ضروریات کے لئے بجلی مہیا کرتی ہے۔ دو مملکتوں کا یہ باہمی تعاون اور اس سے پیدا شدہ ترقی کی روح پاکستان کے خوشتر مستقبل کے لئے ایک نیک فال ہے۔

کارخانوں کی فضا سے ہٹ کر تفریح گاہوں کی طرف رُخ کیا جائے تو ہماری نظر "کاکس بازار" پر پڑتی ہے۔ یہ بڑا ہی دلکش، بڑا ہی خوبصورت ساحلی علاقہ، جو لمبائی میں اپنی مثال آپ ہے۔ گھنے جنگلات سے ڈھکی پہاڑیوں کے دامن میں واقع ہے۔ کراچی کا "ہاکس بے" بھلا اس کا کیا مقابلہ

غرب:

اڈہ ہے۔ اگر ہم سات سمندروں میں سے کسی پر بھی سفر کرنا چاہیں تو کراچی کی بندرگاہ سے کسی جگہ کے لئے بھی جہاز پر سوار ہو سکتے ہیں۔ اس سے سیاحوں کو بڑا خوشگوار احساس ہوتا ہے کہ ان کے لئے آمد و رفت کا صرف ایک ہی راستہ نہیں۔

کراچی کی گرینیا ترقی کا حقیقی سبب وہ خداساز اتفاق ہے جس نے اس کو ۱۹۴۷ء میں دنیا کی چھٹی سب سے بڑی مملکت کا دارالحکومت بنا دیا اور چند ہی سالوں میں اس کی آبادی تین گنا ہو گئی۔ نیز دنیا کے تقریباً تمام بڑے ملکوں نے یہاں اپنے سفارت خانے قائم کر دئے۔

کراچی ایک ایسی جگہ ہے جہاں مسلم، ہندو، عیسائی، پارسی اور رہبانی سبھی بستے ہیں اور سڑکوں پر سے گذرتے وقت ان سب کی عبادت گاہیں دکھائی دیتی ہیں۔ زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ مذہب، تہذیب، لباس، طور طریقوں کا تلوّن کچھ بھی ہو، انسانوں کے اس بے پایاں سلسلے میں یہ بالکل قدرتی خیال کیا جاتا ہے۔ اور کوئی شخص کسی دوسرے کو دیکھ کر متعجب نہیں ہوتا۔ چنانچہ آپ کو سڑکوں پر یورپین اور امریکن خواتین مغربی لباس میں نظر آئیں گی اور ان کے پاس ہی سندھ کے بالائی حصے کی سانولی مگر خوش اندام عورتیں بڑی نفاست سے کاڑھے اور رنگے ہوئے سُرخ و سیاہ پارچات پہنے چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ انہی کے ساتھ آپ آجکل کی پاکستانی ملازمت پیشہ خواتین کو بھی لہراتی ساڑیاں یا شلوار قمیض پہنے بڑی اولوالعزمی کے ساتھ رواں پائیں گے۔ ان کے علاوہ بلوچی اور پارسی خواتین بھی ہیں اور وہ بھی جو قیام پاکستان کے بعد برصغیر سے یہاں آئیں، سب اپنے اپنے لباس میں۔ مختلف النوع لوگوں کے گوناگوں لباس بڑا ڈرامائی اثر رکھتے ہیں۔ اور چاہے وہ کتنی ہی غریب کیوں نہ ہو، بڑی بوڑھیوں سے لے کر چھوٹی چھوٹی بچیوں تک سبھی چم چم کرتی چوڑیوں سے ضرور آراستہ ہوں گی۔



اُن بازاروں کی سیر جہاں گاہکوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے۔ بجائے خود ایک سامانِ کیف ہے۔ گھوڑا گاڑیوں کے ساتھ ہی ساتھ صاف ستھری چمکتی دمکتی کاروں کا تانتا لگا رہتا ہے اور بسیں مسافروں سے کھچاکھچ بھری رہتی چلی جاتی ہیں۔ تنگ تنگ پیچ پیچ ٹیڑھے میڑھے گلی کوچوں میں عجیب و غریب وضع کی لوکدار جوتیاں، چمکیلے موتیوں سے جڑی انوکھے اور نادر ڈھنگ کی، اتنی ہی عام اور مقبول ہیں جتنے ہمارے یہاں پانچ پانچ سینٹ کے کینڈی بار یا شکر پارے۔ اتنے کم قیمت روپہلی زری سلیپر اور چپلیں، ایسی کامدار اور موتیوں سے ٹکی ہمارے لئے تو بڑا حیران کن سودا ہیں۔ انسان چاہتا ہے اس کے پاس بے اندازہ وقت بھی ہو اور جگہ بھی کہ ان بیش بہا چیزوں کو سمیٹتا چلا جائے۔ صرافے میں دستی بنے ہوئے بڑے ہی خوبصورت اَن گنت کنگن اور ہار انسان کو اپنی طرف کھینچے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اہل پاکستان کو اس قسم کی چمک دمک بہت پسند ہے جو سورج کی کنگرہ کنگرہ کرنوں سے ملتی جلتی ہے۔ اس حیرت انگیز سرزمین کے فنون اور دستکاریاں ہاٹ بازاروں میں عام دکھائی دیتی ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں کے معمولی سے معمولی اَن پڑھ لوگ بھی فن کا کتنا سلیقہ رکھتے ہیں۔ شاید یہ مسلمانوں کا موروثی جوہر ہے کیونکہ ساڑیاں بنانے والے، جڑاؤ کام کرنے والے اور پیتل کو بڑی ہی محنت سے پیٹ پیٹ کر نفیس برتن بنانے والے کاریگر، سب میں وہ فطری ذوق اور شعور پایا جاتا ہے جس سے انمول، یادگار چیزیں وجود میں آتی ہیں۔

کراچی کے نواح میں سماجی بہبود کے کارکنوں نے ان ہنرمند کاریگروں کی ایک پوری بستی آباد کر دی ہے۔ اسی طرح ملتان کے نواح میں بھی ایک بستی ہے اور کچھ عجب نہیں کہ ایسی اور بھی کئی بستیاں ہوں۔

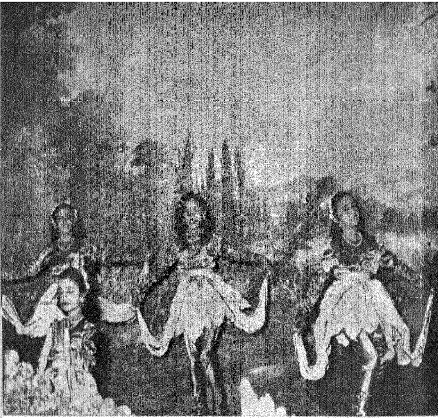
شرق:

کر سکتا ہے۔ میلوں میل پھیلا ہوا ساحلی علاقہ جہاں موجیں نرم و سبک رو ہیں اور رنگین پوش مچھیرے پانی میں بار بار جال ڈال کر ہر منٹ مچھلیوں کی کھیپ کی کھیپ کنارے پر لا ڈالتے ہیں! جب رام گڑھ کی طرف جاتے ہوئے میں نے جنگلاتی سڑک کے کنارے مچھیرے ماہی گیر کا ہنگامہ برپا دیکھا تو باز نہ رہ سکی اور کچھ مچھلیاں خریدنا چاہیں۔ کوئی ان کا ایک آنہ کبھی تو نہیں لیتا تھا! ایک پردیسی دوست کے لئے یہ سب کرارے کرارے کیکڑے اور کھانے کی سمندری چیزیں مفت ہیں!!



ہاں، وہ بڑی بڑی سیاہ چھتریاں۔ انگریزی دور کی یادگار۔ شہروں کے گلی کوچے ہوں یا دیہات کے، ہر شخص کے ہاتھوں میں دکھائی دیتی ہیں۔ مشرقی پاکستان کی قدرتی دولت، اس کا تیزی سے آگے بڑھتا ہوا دارالحکومت ڈھاکہ، اس کے لوگ باگ، ان کے لوک گیت، گانے، ہنسی کھیل سب ایک پوری کتاب چاہتے ہیں۔ مگر جو چیز اس کے متعلق سب سے زیادہ یاد رہتی ہے، وہ یہاں کے لوگوں کا سبھاؤ ہے جو معمولی کسان ہوں یا پڑھے لکھے بیدار مغز لوگ، ہر اجنبی کو اپنا لیتے ہیں، اس کا دل موہ لیتے ہیں۔ مسلمان اکثریت سے قطع نظر یہاں بودھی بھی ہیں، پارسی بھی، ہندو بھی، عیسائی بھی، اور یہ سب پاکستان کے شاندار مستقبل، اس کے اعلیٰ مقدر پر پورا پورا یقین رکھتے ہیں ◆

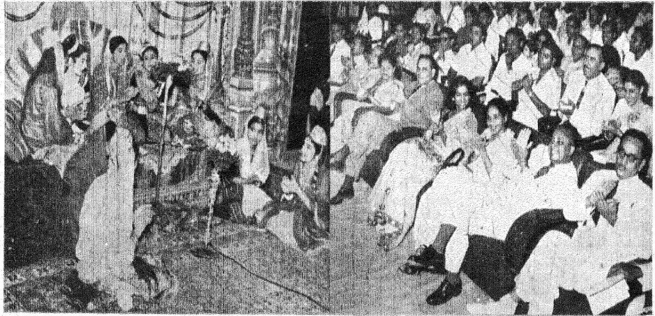




بلبل انسٹی ٹیوٹ آف کلچر کی سرگرمیاں :
رقص اور ڈرامہ کی ایک دل آویز پیشکش



پاکستان ایران کلچرل ایسوسی ایشن کا سالانہ اجتماع :
ویرائٹی شو میں ایک ننھے پاکستانی رقاص کا
دلچسپ مظاہرہ

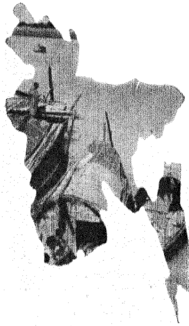


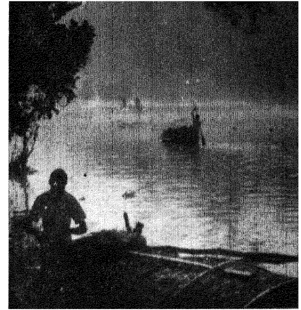
ڈرامہ '' انارکلی '' کا
ایک منظر :
یہ ڈرامہ گورنمنٹ ٹیچرز
ٹریننگ کالج (کراچی)
معذور بچوں کی امداد کیلئے
اسٹیج کیا



قاضی نذرالاسلام
کی اکسٹھویں سالگرہ پر
نذرل اکیڈمی (کراچی)
کا تفریحی پروگرام

مشرقی پاک





عظیم الشان دریاؤں پر
دھوپ چھاؤں کا
سہانا منظر

وجدآفریں رقص (مانی پوری)





تاڑ کے درخت:
قطار اندر قطار

خلیج بنگالہ کا سماں

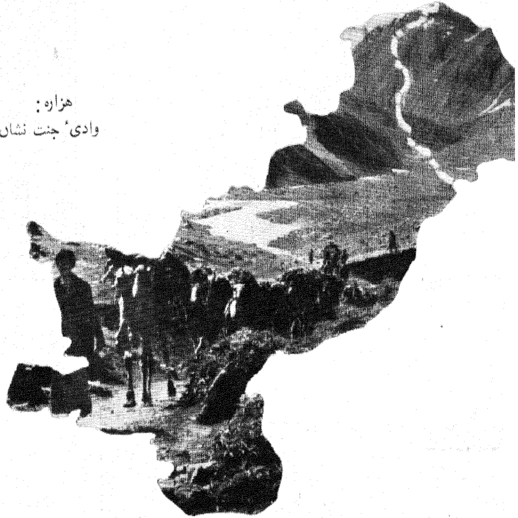


ستان

مغربی



ہزارہ:
وادیٔ جنت نشاں





سیبوں کے درخت:
بہار اندر بہار

جھومر: یا جھومتا ہوا رومان؟



بحیرۂ عرب: ''موج رقصاں اس کے ساحل کی چٹانوں پر مدام!''



سوات
(سرزمین لالہ و گل)



''کہسار کے سبز پوش خاموش!''



'' آتی ہے ندی جبین کوہ سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی''



دامن کہسار میں



ہزب:

کراچی سے باہر ایک بڑا وسیع صنعتی علاقہ ہے۔ جہاں پچھلے بارہ سالوں میں کتنی ہی صنعتیں پروان چڑھی ہیں۔ بلکہ پاکستان کی ساری صنعت کا ایک تہائی یہیں ہے۔ کراچی کے اردگرد بے شمار آبادیاں حشرات الارض کی طرح پھوٹ پڑی ہیں اور ان کا سلسلہ برابر بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ کراچی کے قریب کورنگی میں کاریگروں کے لئے تیس ہزار مکانات کی ایک خوبصورت بستی بسائی گئی ہے۔ درمیانے طبقے کے لوگوں کو زمینیں دی گئی ہیں۔ اور انہوں نے درجنوں ہاؤسنگ سوسائٹیاں قائم کر کے بہت ہی شاندار نو آبادیاں قائم کی ہیں۔ اسی طرح دیگر بڑے شہروں۔ لاہور، ملتان، لائلپور، اور ادھر ڈھاکہ میں بھی نو آبادیاں اور ذیلی بستیاں بنائی گئی ہیں۔

کلفٹن کا متمول علاقہ سمندر کے قریب اتنا خوبصورت اور ہرا بھرا ہے کہ اس سے کراچی کا صحرائی محلِ وقوع بالکل بھول جاتا ہے۔ پرانی وضع کی محلوں سے ملتی جلتی عمارات میں بالکل جدید وضع کے قطار در قطار بنگلے اضافہ ہوئے ہیں جو دنیا کے بہترین بنگلوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ کلفٹن کراچی کی سفارتی دنیا کا مرکز بھی ہے۔ کلفٹن عوام و خواص کی مقبول تفریح گاہ ہے۔ کیونکہ اس کا ساحل بے حد خوبصورت ہے اور اس کا باغ نہایت ہی دلآویز۔ تفریح کے شوقین یہاں جوق در جوق آتے رہتے ہیں، خاص طور پر شام کو، اور بحیرۂ عرب کے کنارے بڑی آزادی سے سیر کرتے ہیں۔

مجھے لاہور بھی ایک برق رفتار گاڑی میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اسکی دلکشی کراچی سے بہت مختلف ہے۔ یہاں مشرق کے جادو میں فرنگی عنصر بھی شامل ہو گیا ہے۔ کون ہے جو شالیمار کے جادو سے مسحور نہ ہو۔ قلعہ کے طلسمی اثر نے اپنے ٹھنڈے ٹھنڈے فواروں کے ساتھ وقت کی رفتار کو روک لیا۔ میں اس عالم میں بخوبی ان قدیم مغلوں کا تصور کر سکتی تھی جو اپنی اس قدر نفاست سے بنائی ہوئی شہ نشینوں پر بیٹھے، کھیلتے ہوئے فواروں کا نظارہ کرتے، قدرت سے لطف اندوز ہوتے تھے، جیسا کہ ہم میں سے آج کوئی بھی نہیں کرتا۔ یہ تھی دولتِ سکون ایک گزشتہ عہد میں۔ جہانگیر کے مقبرہ پر میں نے روزانہ نذرِ عقیدت کا منظر دیکھا اور ان تمام لوگوں کا مسرور نشاط جو اس کے اردگرد کے خوبصورت باغات میں آ کر اس باغ دلبہا طبیعت کے مالک شہنشاہ کی زندہ دلی اور خوشی و خرمی کی روایات کو تازہ کرتے ہیں۔



اور واپس کراچی، میٹروپول ہوٹل میں یہ احساس ہوا جیسے میں پھر گھر لوٹ آئی ہوں، رومانوی باغات میں شبینہ طعام تاروں کی چھاؤں تلے، سہانے گیت سنتے ہوئے! کچھ عجب نہیں کہ دور دراز سے آنے والے مسافر یہاں پہنچ کر ایسا محسوس کرتے ہوں گویا وہ کسی پرستان میں پہنچ گئے ہیں۔ (ملخص)

رپورتاژ :

سوات

(ایک جنتِ ارضی)

فیاض احمد نعیم

ریل گاڑی طویل مسافت طے کرکے ہانپتی کانپتی درگئی اسٹیشن پر ایک جھٹکے کے ساتھ رکی۔ میرے ہمراہیوں کے چہروں پر مسرت ناچنے لگی کہ وہ افسانہ جسے ہم کل تخیل کا شعبدہ سمجھ رہے تھے، آج حقیقت کا لبادہ اوڑھے ہمارے سامنے آ رہا تھا۔ ہماری وہ خیالی منزل جو سفید براق برف پوش وادیوں، چنار کے خوب صورت پیڑوں اور تاڑ کے طویل قامت اشجار پر مشتمل تھی، ہم سے صرف چالیس میل دور رہ گئی تھی۔ ہم نے جوں توں کرکے اپنے آپ کو بسوں پر لادا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہم بس میں اس طرح ٹھونسے گئے جیسے ماچس کی ڈبیا میں تیلیاں۔ اس کے باوجود ہمارے دل اس ارضی جنت کے قرب کی وجہ سے جانے کن خوشیوں کے راگ گنگنا رہے تھے کہ میرے ہمراہیوں کے میدانی علاقوں کی جھلستی ہوئی لو سے متاثر چہروں پر قوس قزح کے رنگ بکھرنے لگے۔ اگرچہ ہم اپنی منزلِ مقصود سے دس میل دور تھے۔ پھر بھی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے عطر بیز جھونکے ہماری خواہشات کے احترام کے لئے تیزی سے بھاگے چلے آ رہے تھے۔ بالآخر منگورہ کی معتدل آب و ہوا نے ہمارا گرمجوشی سے استقبال کیا اور ہم ممتاز ہوٹل میں قیام پذیر ہوگئے۔

ہماری پارٹی کے لیڈر ہماری طرح اس دیس میں اجنبی تھے۔ وہ کسی گائیڈ کی تلاش میں تھے کہ ایک مسکراتے ہوئے چہرے نے ہمیں خوش آمدید کہہ کر ہماری مشکل حل کر دی۔ یہ نوجوان کوہ پیما ہمارے ایک قریبی عزیز نکلے۔ وہ وادیٔ سوات کے چپہ چپہ سے اس طرح واقف تھے جیسے وہ یہاں کے مقامی باشندہ ہوں۔ وہ ہمارے قافلے کے میر کارواں ثابت ہوئے اور ہمیں خاکستری پہاڑوں پر اُگے ہوئے اخروٹوں، خوبانیوں، ناشپاتیوں اور خود رو پھولوں میں اس طرح لئے لئے پھرے جیسے کوئی شوخ تتلی پھولوں پر منڈلا رہی ہو۔ ہماری یہ کوہ پیمائی ایک چشمہ پر آ رکی۔ جو ہمارے قائد کے خیال کے مطابق تھوڑی دور واقع تھا۔ درحقیقت وہ "تھوڑی دور" نصف میل سے کسی طرح کم نہ تھا۔ چند دوستوں نے غسل کے لئے پر تولنے شروع کر دئے۔ قائد کی رہنمائی میں بچی کھچی جمعیت ذرا اوپر پہاڑ پر رینگتی ہوئی ایک ایسے مقام پر پہنچی جو ہزار ہا سال پیشتر مہاتما بدھ کے "زرّیں دور" سے روشناس ہو چکا تھا۔ یہاں آثار قدیمہ کے ماہرین کھدائی میں مصروف تھے چنانچہ مہاتما بدھ کی مورتی اور چند سکے دیکھنے میں آئے جن سے "منگورہ" کی تاریخی حیثیت اور قدامت پر روشنی پڑتی تھی۔ واپسی پر ہم نے خنک اور میٹھے پانی سے دو دو ہاتھ کئے اور اس محاورے کے حقیقی مفہوم سے آشنا ہوئے۔ ہم سردی کے مارے مسلسل بجتے ہوئے دانتوں کے ساتھ لحافوں میں آ گھسے۔

دوسرے دن سورج کی تیز اور شوخ و شریر کرنوں نے ہمیں لحاف چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ دن کافی چڑھ آیا تھا کل کی تکان دور ہو چکی تھی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر ہم نے خرید و فروخت کے لئے بازار کا ارادہ کیا۔ اشیاء خوردنی کی ارزانی نے ہمیں ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ لومڑ کی بڑی بڑی کھالیں ہم نے صرف ایک ایک روپیہ میں خریدیں۔ مرغے چھ چھ آنے اور انڈے تین تین پیسے میں خرید کر ہم اس طرح خوش و خرم ہوٹل کو لوٹے جیسے ہمیں لوٹ کا مال ہاتھ آ گیا ہو۔ چونکہ یہاں لذتِ کام و دہن کے لئے بافراط سامان مہیا ہو گیا تھا، جس کے مقابلہ میں ہم گویا فاقہ زدہ علاقے سے آئے تھے، اسلئے ہم نے چند یوم اس فاقہ زدگی کی کسر پوری کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ شام جب سورج کی الوداعی کرنیں منگورہ کے شاداب پہاڑوں کو آخری بوسہ دے رہی تھیں ہم دریائے سوات پر جا دھمکے۔ اگرچہ اس دریا کی وسعت ہماری عام چھوٹی نہروں سے زیادہ نہ تھی تاہم اس کا پتھروں پر سر ٹپکتا اور شور مچاتا ہوا پانی اس قدر تیز و تند تھا کہ تین آدمی ایک دوسرے کا مضبوطی سے ہاتھ پکڑے ہوئے بھی اس کے سامنے کھڑے نہیں ہو سکتے تھے۔ رات کے سائے گہرے ہونے سے پیشتر ہم اپنے ہیڈ کوارٹر آ پہنچے۔

صبح کی پہلی کرن نمودار ہونے پر ہم نے اپنا بوریا بستر باندھا۔ اور مدائن کو روانہ ہوگئے۔ ہماری بس دشوار گزار پہاڑوں اور عمودی چٹانوں پہ سے

اس طرح دھیرے دھیرے اور احتیاط سے گزر رہی تھی جیسے کوئی شیشے کا سامان دونوں ہاتھوں میں اٹھائے کسی بڑی بھیڑ کو چیرتا ہوا گزر رہا ہو۔

مدائن پہنچنے پر ہمیں سرد مرطوب آب و ہوا کا سامنا کرنا پڑا۔ غیر ملکی دوا ساز اور ہوائی کمپنیوں کے کیلنڈروں پر سوئٹزر لینڈ کے جو برف پوش اور اودے اودے یا سرخ پہاڑ ہم نے دیکھ رکھے تھے وہ بے حقیقت معلوم ہونے لگے اور ہمارے دل مسرت سے اچھلنے لگے کہ ہمارے ملک میں سوئٹزر لینڈ سے بھی زیادہ خوب صورت مقامات پائے جاتے ہیں۔ مدائن ہوٹل میں یک روزہ مختصر قیام کے دوران ہم تمام دن کیمرے سے لئے دل آویز برف پوش چوٹیوں اور گل پوش خطوں پر پھیلے ہوئے قدرتی لازوال حسن کو سلولائیڈ پر منتقل کرتے رہے۔ اگلے روز ہم بحرین کو روانہ ہوئے۔ یہ مدائن سے چھ میل کے فاصلے پر ایک دل فریب قصبہ ہے جس کے گرداگرد پہاڑوں نے دیوار سی چن رکھی ہے۔ ان پہاڑوں میں ٹھنڈے میٹھے میٹھے پانی کے چشموں کی بہتات ہے۔

اسی شام ہم کالام روانہ ہو گئے جو وہاں سے ۲۶ میل دور بلندی پر واقع ہے اور اس ساری حسین وادی کا دل سمجھا جاتا ہے۔ یہی جگہ ہے جس کا پر کشش حسن غیر ملکی سیاحوں کو کشاں کشاں لئے آتا ہے۔ چنار کے خوب صورت شگوفوں، جا بجا پھیلے ہوئے جنگلی پھلوں کے درختوں اور خود رو پھولوں کے سبب اس برف پوش سرزمین کا حسن سوئٹزر لینڈ سے کسی طرح کم نہیں۔ کالام کے دو روزہ قیام کا عرصہ آنکھ جھپکتے گزر گیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم کسی خوابوں کی حسین وادی میں آ نکلے ہیں۔ ہمیں اپنے میدانی علاقوں کی نومبر دسمبر کی سردی بھی یہاں کے موسم کے سامنے ہیچ نظر آتی تھی۔ چشموں کے انتہائی خنک پانی میں ہاتھ ڈالتے ہی یخ ہو جاتا چہ جائیکہ غسل کرنے کی جسارت یا حماقت کی جائے۔

دو روز بعد جب چڑیوں کی مترنم چہچہاہٹ نے ہمیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر میٹھی نیند سے جگایا تو ہم نے بادلِ ناخواستہ اس ارضی جنت کو آخری سلام کہہ کر منگورہ کے لئے رختِ سفر باندھا۔ منگورہ پہنچنے پر ہمارے سالارِ قافلہ نے والیٔ سوات، اعلیحضرت جہاں زیب صاحب سے ملاقات کا انتظام کیا۔ انہوں نے ہمیں شرفِ ملاقات بخشا۔ وہ ہمارے سروں پر سواتی ٹوپیاں دیکھ کر بہت خوش ہوئے ہم نے انہیں بتایا کہ ہمیں ان کی اس فردوس نما دنیا کی اکثر چیزیں بہت ہی پسند آئی ہیں۔ وہ ہم سے اس طرح گھل مل کر باتیں کرتے رہے جیسے وہ ہمیں سالہا سال سے جانتے ہوں۔ ہم نے یادگار کے طور پر ان کے آٹوگراف لئے۔ اور ایک گروپ فوٹو بھی۔ انہوں نے بڑی مہربانی سے ہمیں اپنی کار پیش کی اور ہمیں اپنے آبائی محل روانہ کر دیا جو مرغزار میں واقع تھا۔ ۱۳ میل کا سفر طے کرنے کے بعد ہم منزلِ مقصود پر پہنچے۔ سنگ مرمر کا سفید محل جدید طرز تعمیر کا عدیم النظیر شاہکار ہے۔ ایسا معلوم ہوا جیسے ہم کوہ قاف کے کسی پرستانی محل میں آ گئے ہیں۔ تین طرف آسمان سے باتیں کرتے ہوئے پہاڑ پاسبانوں کی طرح ایستادہ تھے، پھلوں اور پھولوں کے حسن نے بیحد تازگی اور لطافت پیدا کر دی تھی۔ ہم گرد و پیش سے آنے والے عطر بیز جھونکوں سے اپنے قلب و نظر کو محظوظ کر رہے تھے۔ ہم نے محل کی خوب سیر کی اور اس کا ایک ایک کونہ ہماری نگاہوں کی دست برد سے نہ بچ سکا۔ ہم مہمان خانہ میں گئے جہاں پکی ہوئی پیازی انجیروں، زرد ناشپاتیوں اور گہرے سبز اخروٹوں سے ہماری خاطر مدارات کی گئی۔ ہم طلبہ کی اس قدر افزائی پر بہت خوش ہوئے۔

کوئی پون گھنٹے بعد ہم جہاں زیب کالج دیکھنے گئے۔ اس ڈگری کالج میں مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ بھی نئے طرزِ تعمیر کا نہایت عمدہ نمونہ ہے۔ وہاں کے طالب علموں نے ہمارا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا اور ہمیں اپنے تمام اساتذۂ کرام سے ملایا۔ ہم نے جی بھر کر کالج کی سیر کی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ ہمارا اپنا ہی کالج ہے۔ اس کے بعد ہم نے کچہری کا رخ کیا۔ وہاں کے طریق کار اور مقدموں کے فوری فیصلہ کے متعلق سن کر بہت حیران ہوئے کیونکہ وہاں اکثر مقدمات کا فیصلہ ایک دو روز ہی میں سنا دیا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ باعثِ فخر بات عدالتوں میں اسلامی قانون کی پیروی ہے۔

ڈیڑھ ہفتہ پاکستان کے اس سوئٹزر لینڈ میں گزارنے کے بعد ہم پھر اپنے دوزخ، ملتان میں جھونک دئے گئے اور ایسا معلوم ہوا جیسے ہمیں جنت سے دیس نکالا مل گیا ہو۔

شہتوت کی شاخوں کے اوپر
پتوں کے ننھے گھروندوں میں
خوشیوں کے جھولے ڈالے ہیں
اک روحِ مسرت بستی ہے
کچھ ہلکے ہلکے نغموں کی بوندوں کی تراوش ہوتی ہے
کرنوں سے آنکھ مچولی ہے

غزل

عبداللہ خاور

کبھی جو اہلِ درد ناصبور ہو گئے
خیال سے وہ اور دُور دُور ہو گئے

مٹیں تمام حسرتیں، مگر مٹیں بھی کیا؟!
شعور کے صنم، پسِ شعور ہو گئے

وہی ہیں تم سے چاہتوں کی نسبتیں مگر
خود اپنی اس روش سے ہم نفور ہو گئے

کبھی تھیں عشق میں نیازمندیاں بہت
وہ ٹھوکریں لگیں کہ ہم غیور ہو گئے

ہزار بے قراریاں، ہزار ولولے
ترے حضور آ کے بے حضور ہو گئے!

نظر اٹھی، نظر میں قلب جھلملا اٹھا،
حضورِ حُسن پھر کئی قصور ہو گئے

رفاقتوں سی قربتوں سے کس کو کیا ملا
مگر دلوں میں فاصلے ضرور ہو گئے

وہ اہلِ شوق بھی جئے ہیں اہلِ انجمن
جو التفات کی حدوں سے دُور ہو گئے

روش صدیقی

یہ طلسمِ خیال سا کیا تھا
ہجر میں بھی وصال سا کیا تھا

شمع کے زرد زرد چہرے پر
آخرِ شب، جلال سا کیا تھا

ارتقائے کمالِ عشق نہ پوچھ
یہ مسلسل زوال سا کیا تھا

ہم تو برباد ہو کے بھی خوش ہیں
مگر اُن کو ملال سا کیا تھا

اُس ادائے جواب میں پنہاں
ہم نشیں! اک سوال سا کیا تھا

پردۂ جسم و روح میں اے دوست
عمر بھر یہ وصال سا کیا تھا

عشق نے جس کے خواب دیکھے تھے
ہاں وہ حسنِ خیال سا کیا تھا

بارِ ہستی اگر نہ تھا تو روش
دوش پر یہ وبال سا کیا تھا

بلوچی لوک گیت

سلیم خان گمی

وادیٔ بولان دہقانوں، ساربانوں اور چرواہوں کی وادی تریب قریب بارہ لاکھ نفوس پر مشتمل ہے اور اس کا کل رقبہ تقریباً انیس لاکھ مربع میل ہے۔ اس طرح آٹھ مربع میل میں صرف ایک انسان بستا ہے۔ اس کے برعکس مشرقی پاکستان کو دیکھیئے تو ایک مربع میل میں چھ سو افراد اقامت پذیر ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس وادی کا ماحول کیا ہوگا اور اس میں قدرت کی بے اندازہ پہنائی اور سکوت کا زندگی اور اس کی گہما گہمی سے کیا تناسب ہے۔ آب و ہوا میں بھی سابق بلوچستان کے مختلف مقامات میں زمین و آسمان کا فرق ہے سبتی دنیا بھر کے گرم ترین علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔ چنانچہ گرمیوں میں اس کا درجۂ حرارت ایک سو بیس ڈگری تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کے برعکس زیارت کی پر بہار وادی ہے جہاں سردیوں میں سخت سردی پڑتی ہے۔ یہ سطح سمندر سے سات ہزار فٹ بلند ہے۔ وادیٔ بولان کو جن پہاڑوں نے اپنے نرغے میں لے رکھا ہے ان میں سے اکثر دس ہزار فٹ سے بارہ ہزار فٹ تک بلند ہیں۔ یہ پہاڑ بالکل بنجر اور بے آب و گیاہ ہیں اور سال کا بیشتر حصہ برف سے ڈھکے رہتے ہیں۔ نوشکی اور فاران کے ریگستان ایران اور افغانستان تک پھیلے ہوئے ہیں۔ گرمیوں میں ان ریگستانوں سے سخت گرم اور تند و تیز ریت سے بھرپور ہوائیں میدانوں اور وادیوں کا رخ کرتی ہیں۔ ان ہواؤں کو مقامی طور پر "لوار" کہا جاتا ہے۔ جو انسانوں، حیوانوں اور نباتاتی زندگی کے لئے پیغام اجل ہیں۔ وادیٔ بولان کے شمال اور شمال مشرق کے علاقے کوہستانی ہیں۔ ان کوہساروں میں سرسبز و شاداب وادیاں ہیں جہاں کھیتی باڑی ہوتی ہے اور رنگا رنگ کے پھول اور قسم قسم کے پھل اس کثرت سے ملتے ہیں کہ تمام علاقے پر جنت کا گمان ہوتا ہے۔ یہی وہ جغرافیائی حالات جن سے بلوچ چرواہوں، ساربانوں اور دہقانوں کا واسطہ ہے۔ مظاہر فطرت کی اس رنگا رنگی اور دل آویزی میں کوہ وقار اور پاک دل بلوچ بستے ہیں اور اپنی صحت مند اور توانا ثقافتی اقدار سے پاکستان کے اجتماعی تمدن کو اپنے میں حسین اور دل نواز عطیئے پیش کرتے ہیں بلند بالا پہاڑوں، سیاہ دل ریگستانوں اور سرسبز و شاداب وادیوں میں بسنے والا بلوچ صحیح معنوں میں فطرت کا پروردہ ہے۔ جسمانی لحاظ سے صحت مند اور توانا، طبعاً سادہ اور فراخدل۔ جب وہ بلند پہاڑوں وسیع صحراؤں اور شاداب وادیوں میں اپنے روزمرہ کے کام کاج کے لئے نکلتا ہے تو اس کے قلب و نظر فطرت کی ملکوتی عظمت اور حیات بخش توانائی سے بے پناہ اثر لیتے ہیں یہی وہ ملکوتی عظمت اور حیات بخش توانائی ہے جو اس کی معاشرت اور کلچر میں جاری و ساری ہے۔ اور اسی کے پیش نظر بڈھے بلوچ نے اپنے بیٹے کو یہ نصیحت کی تھی کہ ؎

ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا

بلوچ سرزمین دہقانوں، شتربانوں اور چرواہوں، پہاڑوں۔ ریگستانوں اور وادیوں، میٹھے اور پر سوز نغموں کی سرزمین ہے۔ بلوچ اپنے گھر میں ہوں یا لہلہاتے کھیتوں میں، پہاڑوں کی ڈھلوانوں اور گھاٹیوں میں گلہ بانی کر رہے ہوں یا تاریک لمبی راتوں میں اپنے اونٹوں پر سوار ریگستانوں کا سفر کر رہے ہوں، ہر وقت کوئی نہ کوئی گیت الاپتے رہتے ہیں۔ اور ان لمحات میں ان کا کوئی نہ کوئی محبوب ساز مثلاً نڑ، سروز، چنگ، رباب، سرائندہ، دونلی، یک تارہ ان کا دمساز ہوتا ہے۔ ان سازوں کی رفاقت میں شمشیر بکف بہادروں کی داستانیں بیان ہوتی ہیں، رنگ و نکہت کے پیکر ترتیب پاتے ہیں سمن پوش وادیوں میں وفا کی تجدید کے قصے دہرائے جاتے ہیں۔ اندوہ وفا کے چرکے سینہ کھول کر اہل دنیا کو دکھائے جاتے ہیں، خوش اندام نازنینوں کی

فرقت دلوں کو پارہ پارہ کرتی ہے، سردار کی موت پر رو رو کر آنکھیں گنوائی جاتی ہیں، دلہن کی سہیلیاں اپنے چہچہوں سے دولہا بھائی کو تنگ کرتی ہیں، مرشد کامل کی نگاہ حقیقت بیں کو خراج تحسین ادا کیا جاتا ہے۔ غرضیکہ سینکڑوں موضوعات ہیں جو ان گیتوں میں صدیوں سے ادا ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔

ہمیں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ وادی بولان اور اس سے پرے دور دور مغربی پاکستان کا تمام شمالی و شمال مغربی علاقہ بڑی مضبوط، جفاکش، اور جری قوموں کا وطن ہے اور صدہا سال نہ صرف بے باک و آزاد منش انسانوں کا گہوارہ بلکہ ان کی جولاں گاہ بھی رہا ہے۔ یہ وہ دشتِ خطرناک ہے جس میں فطرت نے ریت کے ٹیلے تعمیر نہیں کئے بلکہ بڑے بڑے گراں ڈیل، جلے بھنے خاک سیہ ڈراؤنے پہاڑ ہی پہاڑ تعمیر کئے ہیں جو یہاں کے باشندوں کے دل کو بھی ایسے ہی مہبوت کن سانچے میں ڈھال دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بلوچوں نے تاریخ میں بڑا نمایاں اور قابلِ قدر حصہ لیا ہے۔ یہ شجاعت و جواں مردی قدرتی طور پر رزمیہ گیتوں کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے اسی لئے ہم اس کو ان کی زندگی کے ساتھ ساتھ شاعری اور گیتوں میں بھی شدت سے کارفرما پاتے ہیں۔ بلکہ سچ پوچھئے تو گیت بزمیہ ہوں یا رزمیہ سب میں یہی شجاعانہ رنگ جھلکتا ہے۔ مثلاً لوک گیتوں کی ایک بڑے ہی ہردلعزیز صنف "لاڈیا" "لاڈوگ" ہی کو لیجئے۔ ہے تو یہ شادی بیاہ کا گیت، چنانچہ جب کسی بلوچ نوجوان کی شادی ہوتی ہے تو اس کی ماں بہنیں اور دوسری رشتہ دار خواتین بڑے زور شور سے یہ گیت گاتی ہیں۔ لیکن ان میں تمام تر دولہا کی شجاعت، شہسواری اور شمشیر زنی ہی کی تعریف ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہا جاتا کہ ؎

رُخ پہ دولہا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
ہے گُہر بار سرا سر سہرا

بالفاظ دیگر دولہا محض ایک رنگین ہیولیٰ ہی نہیں ہوتا بلکہ پیکرِ شجاعت اور رزم و پیکار کا دھنی ہوتا ہے۔ اس کی امتیازی خصوصیت حسن و جمال نہیں بلکہ جلال ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کی تعریف حقیقی معنوں میں تعریف ہوتی ہے۔ ایسے جواں مرد کے لئے رفیقۂ حیات بھی محبت اور ایثار کا پیکر ہونی چاہیئے۔ چنانچہ جب لڑکی کی سہیلیاں گیت گاتی ہیں تو ان میں دلہن کے حسن اور پاکبازی کو خراج تحسین ادا کیا جاتا ہے۔ یہ بات ان کے سپاہیانہ مزاج اور جنگی روایات کے ساتھ پوری مناسبت رکھتی ہے کہ جب عہد قدیم میں ایک قبیلہ دوسرے پر چڑھائی کرتا تو خواتین اپنے بہادر بیٹوں، بھائیوں اور شوہروں کا دل بڑھانے کے لئے ان کی جواں ہمتی اور بہادری کی تعریف کرتیں۔ اور جب کوئی قبیلہ حملہ آور کے خلاف صف آرا ہوتا تو خواتین "لاڈوگ" میں ان سے مطالبہ کرتیں کہ وہ اپنی زمینوں اور چراگاہوں کی حفاظت کے لئے ڈٹ کر مقابلہ کریں اور اگر مرنا ہو تو سینے پر گولی کھا کر مریں نہ کہ پشت پر۔

قدرتی طور پر جب کوئی قبیلہ کامران ہوتا تو اس کے نوجوان فتح کی خوشی میں "لاڈوگ" گاتے اور اپنے کارناموں کا ذکر بڑے پروقار انداز میں کرتے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اب قبائل کی باہمی آویزش ایک قصۂ پارینہ بن چکی ہے اور شجاعت کا رخ دشمنانِ قوم و وطن کی طرف مڑ گیا ہے۔ اور بلوچ قوم اس سلسلہ میں کتنے ہی کارہائے نمایاں دکھا چکی ہے۔

ایک ایسی قوم جس میں تندرستی و توانائی پر زور رہو، قدرتی طور پر اپنی نئی پود کی بہترین صحت کی خواہشمند ہوگی۔ چنانچہ بچے کی پیدائش کے موقع پر بھی اس کی صحت مندی، سلامت روی اور بلند کرداری کے لئے "لاڈوگ" ہی گائے جاتے ہیں۔

یہ گیت جو بلوچوں کا مایۂ ناز ورثہ ہیں اب بھی ہر جگہ گائے جاتے ہیں جس سے ان کی شجاعانہ روح برابر تقویت پاتی ہے۔ یہ گیت بلوچ خواتین، مردوں کی تعریف میں اکیلی یا مل کر گاتی ہیں۔ اور ان کی خالق بھی وہی ہوتی ہیں۔ دیکھئے ایک خاتون اپنے جذبات کی ترجمانی کس پیرایہ میں کرتی ہے جس میں بزم کا انداز بھی ہے اور رزم کے تیور بھی[1]۔

---

[1] اس مضمون کے جملہ منظوم تراجم شہاب رفعت کے قلم سے ہیں۔ (مدیر)

جانم کی راہ پڑی دیکھوں
آنگن میں گم صُم بیٹھی ہوں
جانم - وہ نڈر جانباز مرا
وہ اُس کی تفنگ دلندیزی
کب اس کا نشانہ چوک سکے
رفتار ہے ایسی شاہانہ
سر کرنے کو جیسے قلعہ چلے
جب آنکھیں گھما کر دیکھتا ہے
اوسان خطا ہوں دشمن کے
اقرار کیا ہے ملنے کا
میں جانتی ہوں بلوچ ہے وہ
اور اپنا قول نبا ہے گا

جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے، یہی شجاعانہ روح بعض اور لوک گیتوں مثلاً ہالو، شئیر، یہاں تک کہ نازینک جیسی گھریلو صنف میں بھی پائی جاتی ہے۔ اور اس طرح بزم کا دامن کبھی رزم سے جدا نہیں ہوتا۔

جہاں آئے دن جنگ و جدل کے معرکے ہوں وہاں انسان پر مصیبتیں بھی آتی ہیں۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوتا کہ فاتح قبیلہ مفتوح قبیلے کی عورتوں کو پکڑ کر کنیزیں اور لونڈیاں بنا لیتا۔ اس طرح ان خواتین کی زندگی سراپا آہ بن کر رہ جاتی۔ وہ اپنی گذشتہ پر وقار اور آزاد زندگی کو یاد کرتیں، انہیں اپنے شوہروں کی محبت یاد آتی، تو ماضی کا خوش و خرم زمانہ اُن کی نظروں میں پھر جاتا اور ان کے ہونٹوں پر بے اختیار رنج و غم سے بھرے بول آجاتے۔ یہ دکھ درد کی پکار جو گیتوں کی شکل اختیار کر لیتی "زہیروگ" کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ ان سوگوار گیتوں کی تاثیر لازمی طور پر دائمی و غیر فانی ہے۔ اس لئے یہ قدیم درد بھرے گیت اب بھی وادیٔ بولان میں گائے جاتے ہیں۔ جن کو سن کر بے اختیار درد و سوز تخفہ کے یہ الفاظ یاد آتے ہیں:

شاید یہ پُر درد نوائیں	غم سے بھری دلدوز صدائیں
اگلے دنوں کی بڑی پرانی	بپتا کی ہیں رام کہانی
وہی نزاعیں، بَیر کی باتیں	دل کو دکھانے والی گھاتیں
جنگ و جدل اور کشت و خوں کی	وحشی انسانوں کے جنوں کی
یا کوئی اور یہی سیدھی سادی	اپنے زمانے کی جگ بیتی
باتیں یہی جانی پہچانی	رنج اور دکھ اور غم کی بانی
جو دل پر نت طاری ہوں گے	آج بھی ہیں اور کل بھی ہوں گے!

رزمیہ و طربیہ گیتوں کے برعکس یہ المیہ گیت زندگی کا دوسرا رُخ پیش کرتے ہیں جن کا اثر دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔

عوامی گیتوں کی یہی صنف دردمند انسانوں کے دیگر غمناک احساسات کی ترجمانی بھی کرتی ہے۔ سبی کے علاقے میں اسے ڈیہی اور مکران میں لیکو کہتے ہیں۔ بعض اور علاقوں میں ان گیتوں کو ڈیکو اور لیلی مور کہتے ہیں۔ اگر لاڈوگ میں الگ اور کھٹک ہے تو زہیروگ میں سوز اور محرومی ہے۔ جذبے کی آنچ، لہجے کا ٹھہراؤ اور دھیمی لے یہ سب ان کی بے پناہ مقبولیت کے راز دار ہیں۔ زہیروگ گانے

میں کسی کی تخصیص نہیں۔ یہ ہر انسان کا نغمہ ہے اور عورتیں مرد، بچے بوڑھے سبھی اس کو گاتے ہیں۔

نالہ پابندِ نے نہیں تو پابندِ مقام بھی نہیں۔ اس لئے جہاں کہیں کسی کا دل بھر آئے یہ پرسوز نغمہ خود بخود دل کی گہرائیوں سے ابھرتا ہے مثلاً جب کسی خاتون کا شوہر دیس سے دور ہو تو اس کی یاد میں اس کا دل گھائل ہو جاتا ہے اور زہیروگ اس کے ہونٹوں سے آہ بن کر نکلتا ہے۔ اگر شومئی قسمت سے اس کا رفیق حیات فوت ہو جائے تو انہی گیتوں کی دکھ بھری لے اس کی مونس و غمخوار بنتی اور اس کے دل کی بے چینی اور درد و کرب کو دور کرتی ہے۔ اسی طرح جب کسی ماں کا بچہ مر جاتا ہے تو وہ اس کی جدائی میں زہیروگ گا کر اپنے دکھے ہوئے دل کو تسکین دیتی ہے۔ اور اندھیری رات میں ایک گونہ تسلی کی لو پاتی ہے۔

پھر ان اندھیری راتوں کا تصور کیجئے جب ساربان پُرخطر راہوں پر سفر کرتے ہیں۔ وطن سے دوری اور محبوب کی جدائی کا احساس انہیں مغموم بنا دیتا ہے۔ یہ احساس ان کے دل میں گھر اور محبوب کی یاد کو شعلۂ جوالہ کی طرح بھڑکا دیتا ہے۔ اور وہ اپنی پرسوز آواز میں محرومی کے گیت گاتے ہیں۔ زہیروگ کی اس قسم کو بجا طور پر نغمۂ ساربان کہا جا سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ہر انسان اپنا اپنا دکھ ہی جھیلتا اور اپنا ہی غم کھاتا ہے۔ اس لئے یہ گیت بھی الگ الگ گائے جاتے ہیں۔ ہر شخص، مرد ہو یا عورت، ان سے تنہائی میں ہی اپنا غم غلط کرتا ہے۔ اس لئے انہیں مل کر نہیں گایا جاتا۔ جدائی عارضی ہو یا دائمی، دیکھئے اس کے دلگداز نغمے کیا کیف رکھتے ہیں:۔

اے میرے محبوب، اے پیارے!
یونہی رہیں گے کیا دن رات؟
بدلیں گے اک دن حالات
چمکیں گے آکاش پہ تارے

موقع ہاتھ آئے گا بارے
جب بن کر بادل کا ٹکڑا
بھاگتا بھاگتا آ جاؤں گا
آخر کار میں تیرے دوارے

ساون کے بادل کی صورت
آنکھوں سے آنسو ہی آنسو
چھلکاتا برساتا ہر سو
آؤں گا تجھ تک حسن کی مورت!

وہ وعدے وہ بھولے بسرے
پیار کے لمحے تازہ کرنے
پھر سے محبت کا دم بھرنے
آؤں گا اے جاں پاس ترے

اپنے سُموں سے میرا گھوڑا
اونچے اونچے کہساروں کو
اور قلعے کی دیواروں کو
توڑ کے آخر جا پہنچے گا

قید جہاں پر راحتِ جاں ہو
لمبے چوڑے میدانوں کو
تند اندھڑ تے طوفانوں کو
روند کے پہنچوں یار جہاں ہو

لیکو کا انداز یہ ہے:

مرا دل تھا
کھلے میدان میں تنہا اُگا پھول
جواب لُو سے
جدائی کی ہے مرجھایا ہوا پھول
مرا دل اب
ہے جیسے کوئی بنجر کھیت ویراں
نہیں جس میں
کوئی آثار ہستی کے نمایاں

ڈیہی میں بھی یہی پکار ہے:۔

ایک دن وہ تھا ترے دیدار سے سرشار تھا   ایک دن یہ ہے کہ دل افسردہ و بے بس ہوں میں

جہاں انسان ہے وہاں محبت بھی ہے۔ اور ماں کی محبت سے زیادہ لطیف چیز اور کیا ہوگی۔ سراپا شفقت و ملائمت۔ نازنک اسی ماتا کا میٹھا رسیلا اور چیلا گیت ہے۔ جب کوئی ماں اپنے بچے کی صحت اور خوش نصیبی کے لئے یہ گیت گائے تو اس صورت میں یہ لوری۔ یا لوری کہلاتا ہے بگرانی بلوچ اسے لیلو کہتے ہیں۔ جب کوئی بہن اپنے بھائی کی منگنی یا شادی کے موقع پر یہ گیت گاتی ہے تو اس میں بھائی کی بہادری اور حسن و وجاہت کا ذکر کیا جاتا ہے۔ محبوبہ اپنے محبوب کی شیر دلی اور جواں ہمتی کا بڑے فخر سے ذکر کرتی ہے۔ شادی کے موقعوں پر ہنسی ٹھٹھول اور خوشدلی کا مظاہرہ تو ہر کہیں ہوتا ہے۔ اور بلوچ اس زندہ دلی سے کیسے بیگانہ ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ جب ایسے موقعے آتے ہیں اور دلہن کی سہیلیاں نازنک گاتی ہیں تو اس میں از راہِ شوخی دلفن دو لہامیاں کی فرضی کمزوریوں کا ذکر کر کے اس کی خوب گت بناتی ہیں۔ اس صورت میں نازنک کا موضوع ان پنجابی لوک گیتوں سے ملتا ہے جو "سٹھنیاں" کہلاتے ہیں۔ دیکھئے ایک بلوچی ماں کس انداز سے اپنے بچے کا ذکر کرتی ہے:۔

مرا یہ پھول سا بچہ جواں ہوگا، جواں ہوگا
میں اپنے لاڈلے کو تیغ و خنجر سے سجاؤں گی
کندھے پر اپنے وہ بندوق کو رکھ کر رواں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا — مرا ننھا جواں ہوگا

چمکتی ہوگی اک تلوار ان مضبوط ہاتھوں میں
بہت منہ زور گھوڑا ہو، اسے چکپھیریاں دے گا
اگرچہ توسن سرکش سراسر بے عناں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا۔ مرا ننھا جواں ہوگا
میں اس کو دیکھ کر مسرور ہونگی، شاد ماں ہونگی
میں اس کی عظمتِ جاویدہی کے گیت گاؤں گی
خدا رکھے! جوانمردی کا چرچا جاوداں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا۔ مرا ننھا جواں ہوگا

اس کے ساتھ ہی بہن کے احساسات ملاحظہ ہوں:۔

بھیا، مرا پیارا بھیا   چاندسی دلہن لائے گا
میرے بھیا کی تلوار   مصری لوہے سے تیار
اس کا جیالا سرکش گھوڑا   کہساروں کو روندنے والا
نام مرے بھیا کا سن کر   دشمن کانپ اٹھتے ہیں تھر تھر
بھیا مرا پیارا بھیا   چاندسی دلہن لائے گا

اب ذرا سوت کی طرف آئیے۔ یہ وہ سوت نہیں جس کا جلاپا ہر عورت کو جلاتا ہے اور جس کو وہ بیرن کہتے نہیں تھکتی۔ یہ بلوچی زبان کی قدیم غزل ہے جو شادی بیاہ اور اس قسم کی دوسری تقریبوں کے علاوہ فصل کٹنے پر بھی گائی جاتی ہے کبھی اکیلے، کبھی مل جل کر۔ اس کے موضوعات وہی محبوب کا دیدار، وصل، دردِ فراق اور محبوب کی تعریف ہیں:۔

ہوں تیری یاد میں جاناں میں بلبل کی طرح نالاں
گنہ میرا بتا دینا
ہوں تپتی ریگ پر استادہ تیری دید کا خواہاں
خطا میری بتا دینا
ہے سوتے جاگتے تصویر طاقِ دل پہ آویزاں
گنہ میرا بتا دینا

ہالو، جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے، مبارک سلامت کا گیت ہے جو خواتین گاتی ہیں۔ کبھی لڑکے کی پیدایش پر، کبھی اس وقت جب دولہا یا دلہن کو مہندی لگائی جائے یا دولہا کسی بزرگ کی خانقاہ پر سلام کے لئے جارہا ہو وغیرہ وغیرہ۔ پچھلے زمانے میں جب فاتح قبیلے کے بہادر لڑائی میں جیت کر گھر لوٹتے تھے تو خواتین فتح کی خوشی میں چراغاں کرتی اور ناچ ناچ کر ہالو گاتی تھیں۔ اب بھی بعض علاقوں میں ہالو گاتے وقت گانے والے ڈھولوں کی تال پر ناچتے ہیں۔ ایسے ہی کسی اور خوشی کی تقریب پر بھی نوکر اور خادم یہی گیت گانے ہیں۔

بلوچی زبان میں دیہاتی بولیاں، بھی ہیں۔ جنہیں سوال و جواب کی صورت میں گایا جاتا ہے۔ یہ موَدہ کہلاتی ہیں اور ان کو میلوں یا موسمی تہواروں کے موقع پر گایا جاتا ہے۔ گانے والے آمنے سامنے بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک شخص گا کر سوال کرتا ہے اور دوسرا گا کر اس کا جواب دیتا ہے۔

ایک: پگلے بالکے تجھے کس سے پیار؟

دوسرا: لمبی زلفوں والی نار،
یہ بڑے بڑے کہسار
گئی چھوڑ کے ان کے پار
چھپ گئی کہیں دلدار!

سپت (شاید صفت کی بدلی ہوئی شکل ہو) ایک اور دلچسپ صنف ہے جس کے معنی ہیں، تعریف۔ اس کا مضمون سندھی وائی پنجابی کافی اور بنگالی مرشدی سے ملتا جلتا ہے۔ اگر کوئی فرق ہے تو یہ کہ وائی، کافی اور مرشدی کو مرد اور عورتیں یکساں طور پر گاتی اور سنتی ہیں، لیکن سپت صرف بلوچ خواتین گاتی ہیں۔ بچے کی پیدائش پر رشتہ دار اور اڑوس پڑوس کی خواتین مسلسل سات راتیں سپت گا کر گزارتی ہیں، جس میں خدا کی حمد و ثنا، رسول اکرمؐ اور اولیائے کرام کا تذکرہ اور ماں اور بچے کی صحت کی دعائیں ہوتی ہیں۔ اس کا رنگ ملاحظہ ہو:

سپت و ثنا ما خدا لائق است — خدا لائق است و رسولؐ لائق است
کسے واب و کسے آگاہ — بندہ واب و خدا آگاہ
(کوئی سوتا اور کوئی جاگتا ہو — انسان سوتا ہے اور خدا جاگتا ہے)

اس سلسلہ کی آخری اور بہت دلچسپ کڑی ہے شیئر یعنی بلوچی کی منظوم داستانِ حسن و عشق۔ اس کے علاوہ اس صنف میں دوسری قوموں سے جنگوں، باہمی آویزشوں اور چراگاہوں کی حفاظت کرتے ہوئے کسی بہادر بلوچ کے کارناموں کا ذکر ہوتا ہے۔ گویا اس کا موضوع ہنگامہ خیز واقعات اور حادثات ہوتے ہیں۔

شیئر کو بلوچی شاعری کا حسین ترین سرمایہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس میں وہ تمام واقعات بڑی سادگی، خلوص اور خوبصورتی سے پائے جاتے ہیں جنہوں نے بلوچ تاریخ مرتب کی ہے۔ کلاسکی بلوچی شاعری کی یہ منظوم داستانیں پہلے بے قافیہ ہوتی تھیں لیکن اٹھارویں صدی کے بعد قافیہ و ردیف کا التزام بھی ہونے لگا ہے۔

بلوچ اس صنف پر جان چھڑکتے ہیں۔ اسے سننا یا گانا باعثِ فخر خیال کیا جاتا ہے۔ گھر، چوپال، میلوں اور محفلوں میں یہ ولولہ انگیز داستانیں پڑھی اور سنی جاتی ہیں۔ ان کو ستار سے بھی گایا جاتا ہے۔

رات خنک ہے، ایسی خنک کہ زمیں ساری
برف کی صورت ڈھیر ہوئی ہے جم جم کر
جونہی محبوبہ کا سندیسہ پایا میں نے
اپنی سانڈنی پر ہلکا سا پاکھڑ رکھا
اس کی ناک میں ریشمی پھولوں والی سجل مہار
ڈال کے نکلا اپنے احاطہ سے باہر
اس کی پشت اتنی آرام دہ، اس پر بیٹھا
چابک چار جو مارے، سانڈنی ہرنی کے مانند
بے تابی سے اچھلنے لگ پڑی اور پکارا!
اے مالک! مجھ پر یہ عتاب، غضب کیسا
بس میری مہاری پکڑے رہنا میں آپ ہی آپ
سوئے نشیب رواں کہسار کی ندی
کے مانند چلی جاؤں گی بہتی ہوئی
اور بلندی کی جانب سیار بگولے کی صورت
تند ہوا کے دوش پہ تیرنے والے بادل کے مانند
تیز چلوں گی اور تجھے پہنچا دوں گی درِ جاناں تک

غرض ان لوک گیتوں میں بلوچوں کی زندگی، ان کی روح اور ان کا ماحول ہر چیز اس وضاحت اور خوش اسلوبی سے جھلکتی ہے کہ ان کو سن کر ہم بھی ان میں شامل ہو جاتے ہیں اور خود کو بلوچ ہی سمجھتے ہیں۔ جیسے ان کے گیت، ان کی زندگی، ان کی روح، ان کا ماحول ہمارا اپنا ماحول ہو۔ فن۔ اگر اس قسم کی بے ساختہ شاعری کو فن کہا جا سکے۔ کی کامیابی اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے؟

★

کراچی آرٹس تھیٹر سوسائٹی کے زیرِ اہتمام
کُل پاکستان ڈرامہ نگاری کا انعامی مقابلہ

شرائط وضوابط

۱۔ یہ مقابلہ صرف اردو ڈراموں کے لئے منعقد کیا جا رہا ہے، لہٰذا ڈرامے اردو زبان میں ہونے چاہئیں اور نثر میں لکھے گئے ہوں۔

۲۔ کسی خاص موضوع، طربیہ، المیہ وغیرہ کی پابندی نہیں۔ البتہ ڈرامہ نگاروں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ جدید دنیا کے تقاضوں خصوصاً پاکستان کی قومی روایات، معاشرت اور آئڈیالوجی کو خاطر خواہ طور پر ملحوظ رکھیں گے۔

۳۔ ڈرامہ اسٹیج پر بسہولت پیش کئے جانے کے قابل ہو۔ تقریباً ڈھائی گھنٹے میں مناسب وقفوں کے ساتھ پیش کیا جا سکے۔ سٹ کی تبدیلیاں کم سے کم واقع ہوں اور کرداروں کی تعداد محدود رکھی جائے۔

۴۔ ڈرامہ طبعزاد، اَن کھیلا، غیر مطبوعہ، اور مقابلے میں شریک ہونے والے مصنف کی اپنی ملکیت ہونی چاہیئے۔

۵۔ جن ڈراموں پر انعام پیش کیا جائیگا انہیں کم از کم ایک بار پبلک کے سامنے اسٹیج پر پیش کرنے کا پہلا اختیار کراچی آرٹس تھیٹر سوسائٹی کو حاصل ہوگا۔

۶۔ ہر مسودے کی تین صاف نقلیں وصول ہونی چاہئیں۔ مسودے بذریعہ رجسٹری سکریٹری کراچی آرٹس تھیٹر سوسائٹی کے نام بھیجے جائیں یا دستی طور پر ان کی رسید حاصل کی جائے۔

۷۔ ایک مصنف کے ایک سے زیادہ ڈرامے بھی مقابلے میں شرکت کے لئے بھیجے جا سکتے ہیں لیکن تینوں انعامات تین مختلف ڈرامہ نگاروں کو پیش کئے جائیں گے۔ البتہ کسی مصنف کے ایک سے زیادہ ڈرامے انعام کے قابل سمجھے گئے تو سوسائٹی اعلان کردہ انعامات کے علاوہ کوئی مزید انعام بھی دے سکتی ہے۔ یہ سوسائٹی کی صوابدید پر منحصر ہوگا۔

۸۔ پہلا انعام مبلغ ۵۰۰ روپے، دوسرا مبلغ ۳۰۰، اور تیسرا مبلغ ۲۰۰ روپے کا ہوگا۔ انعامات کا فیصلہ ایک بورڈ کے مشورہ سے ہوگا جو سوسائٹی نامزد کرے گی۔ انعامات نیز اس مقابلے سے متعلق جملہ امور کی بابت کراچی آرٹس تھیٹر سوسائٹی کا فیصلہ قطعی تصور کیا جائیگا۔

۹۔ ڈراموں کے مسودات ۱۵ ستمبر ۱۹۵۹ء تک سکریٹری کراچی آرٹس تھیٹر سوسائٹی کے پاس مذکورہ ذیل پتہ پہونچ جانے چاہئیں۔

سکریٹری کراچی آرٹس تھیٹر سوسائٹی ۱۵۴ میکلوڈ روڈ کراچی

۱۰۔ اگر کوئی اور امر وضاحت طلب ہو تو سکریٹری سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

"بنگلہ تنقید" ــــــــــ بقیہ صفحہ : (۱۳)

ہمارے ادیب یہ پسند نہیں کرتے کہ کسی بڑے حلقہ میں ان پر تنقید کی جائے۔

ہمارے نقادوں اور تخلیقی کام کرنے والوں نے خاموشی سے ایک قسم کے دوہرے معیار کو قبول کرلیا ہے۔ ایک وہ جو اپنے ملک کے قارئین کے لئے برتا جاتا ہے اور دوسرا باقی دنیا کے لئے۔ جس طرح آزادگی کا اظہار بنگلہ میں لکھے ہوئے تنقیدی مضامین پر کیا جاتا ہے اس سے زیادہ انگریزی میں لکھی ہوئی تنقیدوں پر ہوتا ہے کیونکہ یہ ہر قسم کے قارئین کی نظروں سے گزرتی ہیں۔ ایسے مضامین کے خلاف ہمیشہ یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ اپنے ملک کو دوسروں کی نظروں میں نہ گراؤ۔ یہ ذہنیت بڑی عجیب ہے اور اُس معاشی بے اطمینانی کی آئینہ دار ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے لیکن یہ ذہنیت اچھی تنقید کے منافی ہے جس کا فرض صاف گوئی اور غیر جانبداری کے ساتھ ادب پاروں کی قدر و قیمت کا تعین ہے۔ وہ نقاد جو سچی بات کہنے سے ڈرتا ہے یا بلند معیار کو قبول نہیں کرتا، اپنے فرائض کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ ہمیں اپنے تنقیدی ادب کی تنگ خیالی کو دور کرنے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے: وسعتِ علم اور بے باکی:

"اگر اعتبار ہوتا!" ــــــــــ بقیہ صفحہ : (۲۰)

عدنان :۔ ضرور۔ خدا کرے کل کی صبح بھی ایسی ہی خوشگوار ہو۔ کل میں بھی چڑیوں کے لئے تھوڑا سا دانہ لاؤں گا۔

درشہوار :۔ شکریہ۔ چڑیوں کو دانہ کھلانا ثواب کا کام ہے۔ معلوم نہیں میری خادمہ کہاں چلی گئی۔ (درشہوار کھڑی ہو جاتی ہے اور آوازیں دیتی ہے) سکینہ۔ سکینہ۔ کیا وقت ہوگا؟

عدنان :۔ گیارہ بج چکے ہیں۔ معلوم نہیں میرا نوکر کدھر نکل گیا (آوازیں دیتا ہے) چمن چمن۔

(عدنان دائیں جانب اور درشہوار بائیں طرف چل دیتی ہے

درشہوار :۔ (خود سے) نہیں نہیں میں ہرگز اسے نہیں بتاؤں گی کہ میں ہی درشہوار ہوں۔ اس کے تصور میں بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والی درشہوار ہی کا رہنا زیادہ اچھا ہے۔ جس کے بال لانبے تھے اور جس کا چہرہ گلاب کی طرح شاداب تھا۔ اور جو ہر سہ پہر اپنے دریچے سے سفید پھولوں کا ہار اس کی جانب پھینکدیا کرتی تھی۔

عدنان :۔ (خود سے) نہیں نہیں میں اسے ہرگز نہیں بتاؤں گا کہ میں ہی عدنان ملک ہوں۔ میرا چہرہ مسخ ہو چکا ہے۔ یہی اچھا ہے کہ اس کے ذہن میں اسی عدنان کی تصویر رہے جو بڑا وجیہہ اور بہادر تھا اور جو ہر صبح گلابوں کا ایک گلدستہ اس کے دریچہ کی طرف پھینکا کرتا تھا۔

(سامنے سے سکینہ اور چمن نمودار ہوتے ہیں۔ وہ دونوں ہنستے ہوئے آرہے ہیں)

درشہوار :۔ کہاں چلی گئی تھیں تم؟

سکینہ :۔ کہیں بھی نہیں مالکن

عدنان :۔ کہاں تھے چمن؟

چمن :۔ بس قریب ہی تو تھا مالک

(درشہوار سکینہ کے کاندھے کا سہارا لے لیتی ہے۔ عدنان ملک چمن کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیتا ہے اور دونوں اسی طرح دائیں اور بائیں جانب روانہ ہو جاتے ہیں جس طرح پارک میں داخل ہوئے تھے۔ جانے سے پہلے وہ ایک دوسرے کی جانب مڑ کر دیکھتے ہیں)

عرفان :۔ (بہ آواز بلند) خدا حافظ، کل تک کے لئے۔

درشہوار :۔ خدا حافظ!

عدنان :۔ صبح بہت خوشگوار تھی۔

درشہوار :۔ بہت خوشگوار۔ کل پھر ایسی ہی صبح ہوگی!

(دونوں مخالف سمتوں میں روانہ ہو جاتے ہیں)

عدنان :۔ اللہ کی پناہ وہ کسقدر بدل گئی ہے!

چمن :۔ جی مالک؟

درشہوار :۔ کتنا بدہیئت ہو گیا ہے وہ!

سکینہ :۔ کیا مالکن؟

(پردہ آہستہ آہستہ گر جاتا ہے)

(مرکزی خیال ماخوذ)

باب مراسلات

کل پاکستان انجمن ترقی اُردو
اُردو بورڈ، کراچی
۲۴۔ جون ۵۹ء

مکرمی رفیق خاور صاحب سلمہ اللہ تعالےٰ

میں نے آپ کا مضمون "اردو ادب کی تشکیلِ نو" پڑھا خوب لکھا ہے۔ آپ کی نظر قدیم اور جدید اردو ادب پر بہت صحیح اور گہری ہے۔ آپ نے مقدمۂ حالی کی اہمیت، افادیت اور اس کے انقلاب انگیز اثر کو جتانے کے بعد اس سلسلۂ انتقاد کو آگے بڑھانے کے متعلق جو بات سجھائی ہے وہ نہایت معقول، ضروری اور قابلِ توجہ ہے۔

اس مضمون کو پڑھ کر مجھے خوشی ہوئی اور میں نے کچھ حاصل بھی کیا۔ اُردو کی قسمت اب آپ ہی جیسے وسیع النظر اور پرخلوص اہلِ قلم کے ہاتھ میں ہے۔

عبدالحق

اپریل مئی اور جون کے ماہِ نو پڑھنے کے بعد چند نتائج اخذ کر چکا ہوں ماہِ نو کے نئے رجحانات کا اندازہ واضح ہو رہا ہے

آپ کے مضمون "اردو ادب کی تشکیلِ نو" کا بغور مطالعہ کیا اور اس سے راہ نمائی حاصل کرنے کی پُرخلوص کوشش کی مضمون بیحد خیال افروز ہے اور واضح اشارات موجود ہیں جن کی روشنی میں منزل کا ہیولےٰ بھی ابھرتا ہے اور منزل کی طرف بڑھنے کی تحریک بھی ملتی ہے۔ پھر بھی تشنگی باقی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ فطرتاً انسان سہل انگار ہے۔ خود سوچنے کی بجائے دوسروں کے فکر سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ خود سوچنا اور پھر اپنے فکر کو راہ بنا بنا کر آگے بڑھنا خال خال نابغانِ دہر کا کام ہے۔ اور ایسے لوگ کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں جو ماضی اور حال کی ہر تحریک کو اپنے اندر رچا کر نئی نئی راہیں تراشتے ہیں اور جدید روایات کی تشکیل کرتے ہیں۔ اسی قسم کے دو چار اور مضامین شائع ہوں تو آپ کی تحریک کا وہ رخ واضح ہو سکے جسے روشنی میں لانا انتہائی ضروری ہے۔ امید ہے کہ آپ توجہ کریں گے۔ (یہ مضمون ایک طویل سلسلہ کی پہلی کڑی ہے ۔ مدیر)

یہ ایک فطری امر ہے کہ اگر انسان اپنے ماضی اور اس کی روایات کو فرسودہ اور بے کار سمجھ کر یک قلم ترک کر دے تو اسے لامحالہ ان تحریکات کا سہارا لینا پڑتا ہے جو کرۂ ارض کے کسی حصے میں کامیاب ہوں یا ہو رہی ہوں لیکن دوسروں کے سہارے آگے بڑھنا بھی تو عقوبتِ دوزخ کے برابر ہے۔ ایک مقام ایسا آتا ہے کہ انگلی پکڑ کر چلانے والے ساتھ چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ ہر ملک اور ہر قوم کے اپنے اپنے مسائل ہیں اور ایک کا جامہ دوسرے پر صحیح نہیں بیٹھتا۔ لیبلے بنتے اور پھٹتے رہتے ہیں۔ شہابِ ثاقب کی چمک چند لحظوں کے لئے بہت شوخ و شنگ ہوتی ہے لیکن اس گریزپا روشنی سے کسبِ نور کرنے والے بھی چند لحظوں کے لئے ہی زندہ رہ سکتے ہیں اور ان کا فن چند لمحوں کی چکاچوند کے بعد تاریکیوں میں گم ہو جاتا ہے۔

آپ کے مضمون کا لب لباب یہی ہے کہ ہمارا فن 'اپنا' ہونا چاہئے۔ ایسا فن جس کے متعلق ہم جرأت سے کہہ سکیں کہ یہ ہمارے ارادوں، ہماری اُمنگوں، روایتوں اور خواہشات کا مظہر ہے۔ اس کی ہر دھڑکن ہمارے اپنے دل کی لرزش ہے۔ ہماری روح کا ساز دوسروں کے مضراب کا ممنونِ احسان نہیں بلکہ اس کا ہر نغمہ ہماری اپنے مضراب سے لرزاں اور وجود میں آیا۔ مستعار خیالات اور مانگے تانگے کے جذبات کسی بڑے ادب کی تخلیق نہیں کر سکتے۔ اپنے من میں اور اپنے من سے زیادہ اپنے ماحول اور اس کے مخصوص رجحانات میں ڈوب کر لکھنا ہی عظمت کا آئینہ دار ہے اور یہ عظمت بڑی کاوش اور سخت جانی کے بعد نصیب ہوتی ہے

غلام الثقلین نقوی

"ماہِ نو" اپریل ۱۹۵۸ء میں ڈاکٹر میری این شیمل کا مضمون "منصور حلاج اقبالؒ کی نظر میں" پڑھا یہ ایک قابلِ غور مضمون ہے جو اپنے اندر معنی خیز گہرائی لئے ہوئے ہے۔

علامہ اقبالؒ میں مسائل اور شخصیات پر حکم لگانے کی جرأت تھی جو ایک بڑی بات ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہیں بعض خیالات کو ناگزیر طور پر از سرِ نو ترتیب دینا پڑا۔ چنانچہ شیخ اکبر اور حافظِ شیراز کے متعلق ان کے تصورات میں تبدیلی ہوئی۔ منصور حلاج کے متعلق تو جیسا جاوید نامہ کے حوالے سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اقبال کے تصور میں بڑی ہی نمایاں تبدیلی ہوئی۔

منصور کے بارے میں جو منفی نقطۂ نظر اقبالؒ نے شروع ہی سے اختیار کیا تھا وہ نہ عجیب تھا نہ دوسروں سے مختلف کیونکہ علی بن عثمان ہجویری (حضرت داتا گنج بخشؒ) نے بھی حسین فارسی (منصور حلاج) کے حلولی فرقے کو ملامت کی نظر سے دیکھا تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:
"میں نہیں جانتا کہ فارسی کون ہے اور ابو سلمان کون۔ انہوں نے کیا کیا اور کیا کہا۔ لیکن جو شخص تحقیق اور توحید کے خلاف چلتا ہے اس کو دین میں

کچھ نصیب نہیں ہوتا۔"

علی بن عثمان ہجویریؒ کی رائے محض ایک عام صوفی کی رائے نہ تھی۔ وہ عالمانہ اور مجتہدانہ نظر رکھتے تھے۔ اسی طرح کی ایک سیدھی سادی اور پرخلوص رائے اقبال نے بھی شروع میں اختیار کی جو آج ایک صاحبِ علم کی نگاہ میں کھٹکتی ہے کیونکہ منصور پر اب بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور میسی نانؔ جیسے مستشرق نے منصور کے مسلک میں جان ڈال دی ہے جس کی تحقیق کے آگے شاید اقبال کو بھی سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔

ڈاکٹر میری ابن شیمل کے سامنے نہ مجھے صائب الرائے ہونے کا دعویٰ ہے نہ ان سے اختلاف کی مجال، تاہم یہ کہنے کی جسارت ضرور کروں گا کہ منصور حلاج کے مسلک سے اقبال کا متاثر ہونا، خصوصاً میسی نانؔ کی مطبوعات کے بعد کچھ زیادہ قابلِ اعتبار معلوم نہیں ہوتا۔ اقبال کے کلام کا مطالعہ ہمیں یہ باور کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ اقبال اور منصور میں بُعد المشرقین ہے۔ اقبال اور منصور کے ہاں فنا فی اللہ کا مفہوم جدا جدا ہے۔ ان کے درمیان خودی سے لیکر بیخودی تک کی وسیع و عریض خلیج حائل ہے منصور کے اناالحق اور اقبال کے مردِ مومن میں کوئی موافقت نہیں۔ اقبال کا مردِ مومن رومی کے شیرِ خدا اور نیٹشے کے فوق البشر کے قریب تو ہے لیکن منصور کے اناالحق کے مفہوم کے نزدیک نہیں۔ نعرۂ اناالحق بدھ کے نروان اور شوپنہاور کی نفرتِ دنیا کے قریب تو ہے لیکن ایک کلیم سر بکف اور حسینؑ بکنارِ فرات سے کوئی واسطہ نہیں۔

ڈاکٹر موصوف نے اناالحق کی تشریح وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے نظریات کی روشنی میں کی ہے اور رومی کا حوالہ دیا لیکن اناالحق سے حلاج کا منشا واضح نہیں ہو سکا حالانکہ فاضل مضمون نگار نے حلاج کے شارح روزبہان باقلی کا حوالہ بھی دیا ہے۔ یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ ڈاکٹر موصوف کی نظر رومی کی تصنیف "فیہ۔ فیہ" پر نہ پڑی ہو کیونکہ لوہے اور آگ والی تمثیل اسی سے ماخوذ ہے۔ "فیہ مافیہ" میں رومی کی اپنی زبان سے اناالحق کی تفسیر ایک نشست میں بیان ہوئی جو بڑی جامع ہے اور حلاج کے مسلک کے بالکل قریب ہے۔ فرمایا:۔

"حلاج نے اناالحق کہہ کر کونسی بڑی بات کی؟ بڑی بات تو وہ کہتے ہیں جو انا العبد کہتے ہیں۔ انا العبد کہنے سے دو ہستیوں کا اقرار ہوتا ہے یعنی اللہ اور بندہ۔ لیکن اناالحق کہنے سے تو اپنی مکمل نفی ہوتی ہے، صرف خدا کا اقرار ہے۔ دوئی کا تصور بھی محال ہے۔ اس سے زیادہ عجز کیا ہے۔ اس سے بڑھ کر انکساری کیا ہو؟"

یہاں عجز اور انکساری تو ممکن ہے حاضرین پر اثر ڈالنے کے لئے کہا گیا ہو کیونکہ اصل تحویل وحدت الوجود کے ایجاب کی صاف غمازی کرتی ہے۔ خود منصور کی بھی۔ (جس نے اقصاء الہندیہ کی خاک چھانی تھی اور فلسفۂ ویدانت سے ناواقف نہ تھا) اناالحق سے مراد وحدت الوجود کے اقرار باللسان کے سوا کچھ نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ وحدت الوجود کا مسئلہ سراسر اسلامی توحید و تحقیق کے خلاف پڑتا تھا۔ ان حالات میں اقبال جیسا قرآن فہم تصورِ منصور کی کبھی حمایت نہیں کر سکتا تھا۔

فاضل مقالہ نگار رومی کے مقام و شرف سے ضرور واقف ہوں گی اور اقبال تو رومی سے بیحد مرعوب تھے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اقبال، منصور حلاج کے متعلق زاویۂ نگاہ بدلنے میں میسی نان کے رجحانات اور انکشافات سے تو متاثر ہوئے لیکن مولانا روم کی تشریح سے ناواقف رہے یا جان بوجھ کر چپ سادھ لی؟ درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ اقبال کا تصورِ حلاج اسی مسلک پر مبنی رہا جس کا ذکر انہوں نے اپنے لیکچروں میں کیا اور "جاوید نامہ" مرتب کرتے وقت بھول نہیں ہوئی۔ "جاوید نامہ" ایک جامع اور مہتم بالشان نظم ہے جس میں کئی مغربی نظموں پر تبصرہ اور شاہکاروں کا جواب ہے۔ "جاوید نامہ" میں زروان فرشتہ، ہر وش نازنیں، منصور حلاج، افغانی یا رومی کوئی ہو، ہر ایک میں اقبال خود ہی بول رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے ہی مرکزِ فکر کو مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے جلا بخشی ہے۔ رہی اقبال کی اپنی زبان میں اناالحق کی تعریف تو ان کے کلام سے صرف ایک جواہر پارہ پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں:۔

اناالحق جز مقامِ کبریا نیست ۔۔۔ سزائے او چلیپا ہست یا نیست
اگر فردے بگوید سرزنش بہ ۔۔۔ اگر قومے بگوید ناروا نیست

سلیم صادق

مراسلات "ماہِ نو" میں آپ کی دلچسپی کا عملی ثبوت ہیں۔ جو آپ کے افکار و تاثرات کو بروئے کار لانے میں آپ کا ہمیشہ ممد و معاون رہا ہے اس کے ذریعہ تبادلۂ خیالات میں سرگرمی سے حصہ لیجئے۔ (مدیر)

ر۔خ

نقد و نظر

شرحِ دیوانِ غالب

از پروفیسر یوسف سلیم چشتی
ناشر: عشرت پبلشنگ ہاؤس،
ہسپتال روڈ، انارکلی، لاہور
صفحات: ۹۵۲ قیمت: آٹھ روپیہ

اس کتاب میں کلامِ اقبال کے ایک کارآزمودہ شارح نے دیوانِ غالب کی طرف رجوع کیا ہے۔ سابقہ شرحوں کی موجودگی جہاں اس کے لئے سہولت کا باعث ہوئی وہاں حصول امتیاز میں دقت آفریں بھی ثابت ہوئی۔ اس کے باوجود وہ اپنا نقش درست کرنے میں کافی کامیاب رہے ہیں۔ مگر ـــ جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے۔ کلامِ غالب کی تشریح ایک لامتناہی چکر بن کر رہ گئی ہے اور کسی شرح کے حرفِ آخر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً یہ شعر لیجئے ۔۔

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

شارح نے حالی کا سہارا لیتے ہوئے کہہ دیا ہے کہ "اگر یہ کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو اس کی فہم کا قصور ہے"۔ حالی نے جو معنی بتائے ہیں وہ اپنی جگہ معقول ہیں، لیکن "ہمت" ایک صوفیانہ اصطلاح بھی تو ہے جس کے معنی ہیں: ترکِ دنیا کی ہمت ۔ چنانچہ غالب نے مثنوی "رنگ و بو" میں تین پریوں، دولت، قوت اور ہمت کا ذکر کیا ہے جو ایک بادشاہ کے خواب میں آئیں۔ آخرالذکر کے بارے میں غالب نے جو کچھ کہا ہے اس سے اس کی نوعیت بالکل واضح ہوجاتی ہے۔ اس کی روشنی میں اس شعر کو دیکھا جائے تو کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ جو قطرہ دنیا کو ترک کردینے کی ہمت رکھتا ہے ہم اس کو اپنی آنکھوں میں جگہ دیتے ہیں۔ اسی طرح "رہا آباد عالم ....." میں جو گنجلک سی نظر آتی ہے وہ 'ہمت' کے اس مفہوم سے فوراً دور ہوجاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی ہی شرحِ تازہ کی گنجائش کئی اور اشعار میں بھی ہوگی۔

شارح کو عربی و فارسی پر خوب عبور ہے۔ اس سے اس نے کافی فائدہ اٹھایا ہے اور اسلامی افکار و نظریات کے اصلی ذرائع سے استفادہ کرکے وحدت الوجود کے بارہ میں نہایت اہم انکشافات کئے ہیں۔

ایک جدید شارح سے لازماً یہ توقع بھی ہوتی ہے کہ وہ ذوق اور تنقید کے تقاضوں کو کماحقہٗ پورا کرے گا۔ قاری کو یہ دیکھ کر بے حد مایوسی ہوتی ہے کہ مقدمہ میں من وعن دوسروں کی پامال آراء کو دوہرادیا گیا ہے۔ غالب کے متعلق کئی باتیں قصۂ پارینہ ہوچکی ہیں۔ خصوصاً اس کی فارسی شاعری کے بارے میں۔ تعجب ہے کہ شارح نے ان کے فارسی کلام سے واقف ہونے کے باوجود ان کے متعلق روایتی رائیں دوہرادی ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ تصوف کے برائے شعر گفتن ہی کی حد تک قائل تھے۔ اگر تعارف میں مکتبی و رسمی رنگ غالب نہ ہوتا تو کتاب کی افادی حیثیت زیادہ بلند ہوتی۔

قادر نامۂ غالب

مرتب:۔ تحسین سروری
ناشر:۔ مکتبہ نیا راہی
صفحات:۔ ۶۴، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ

آثارِ غالب کی تلاش اب بجائے خود ایک مقصود بن چکی ہے اور ہم آئے دن اس میں کسی نئی دریافت کا اضافہ پاتے ہیں۔ انہی میں سے ایک "قادر نامہ" ہے جس کا مقصد بچوں کو فارسی کے عام الفاظ اور ان کے معانی ذہن نشین کرانا ہے۔ یہ کتاب ایسے پیرایہ میں لکھی گئی ہے کہ بچے اسے شوق سے پڑھیں۔ یہ نظم مدتوں نایاب رہی اور اس کا غالب کی تصنیف ہونا بھی مشتبہ تھا۔ مرتب نے اس کا سراغ پاکر ضروری معلومات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جن لوگوں نے غالب کے فارسی کلام کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ "قادر نامہ" کے کئی الفاظ کو مانوس پائیں گے۔ یہ اس منظوم کتابچے کے غالب کی تصنیف ہونے کی ایک اور بہت عمدہ شہادت ہے۔

کلامِ بینظیر

مرتب:۔ محمد اکبرالدین صدیقی
ملنے کا پتہ:۔ کتاب خانہ عابد روڈ حیدرآباد دکن
صفحات:۔ ۴۶۴، قیمت صہ روپے

سید محمد بینظیر شاہ وارثی بینظیر صحیح معنوں میں ایک صوفی منش اور درویش سیرت شاعر تھے۔ گو ان کا چرچا ایک فطرت نگار شاعر ہی کی حیثیت سے رہا ہے۔ اسلئے انکے اس نئے اور حقیقی عارفانہ رنگ کو دیکھ کر اکثر لوگوں کو تعجب ہوگا۔ در حقیقت ان کی فطرت نگاری

جس میں وہ زیادہ کامیاب رہے ہیں، عرفان و سلوک ہی کا جزو ہے۔ ان کا رشتہ ایک طرف وارثی قادری مجددی سلسلوں سے ملتا ہے تو دوسری طرف سنائی اور عطار جیسے شاعروں سے۔ انکی شاعری مذہب و تصوف کے دبیز پردوں ہی سے گزر کر آتی ہے۔ اسلئے اس کا اپنا رنگ نسبتہً کم نمایاں ہے۔ قاری زیادہ تر مجذوبیت ہی کا احساس لے کر اٹھتا ہے۔ بنابریں شاعر ایک گزشتہ دور کی یادگار کی حیثیت ہی سے قابلِ توجہ ہے۔

اقبال کا سیاسی کارنامہ

صفحات:۔ ۵۳۳، قیمت چھ روپے

ناشر:۔ کاروانِ ادب، کراچی

از محمد احمد خاں

اقبال کا شعری و فکری کارنامہ اس قدر نمایاں رہا ہے کہ اس کے سامنے ان کے سیاسی کارنامے کو ابھرنے کا موقع نہیں ملا لیکن قیامِ پاکستان نے ثابت کر دیا ہے کہ ان کے سیاسی فکر کی اساس کس قدر مضبوط تھی۔ کیونکہ یہ درحقیقت ان کے حکیمانہ فکر کا جزو تھا۔ زیرِ نظر کتاب میں اس اہم موضوع کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اندازِ بیان بہت صاف اور دلکش ہے جس میں عنوانات کی طرحداری اور بھی کیف پیدا کرتی ہے۔

حسرت کدہ

از شفقت کاظمی

ناشر: علمی کتب خانہ، مظفر گڑھ

صفحات: ۱۷۶ ۔ قیمت: تین روپے

"کس قدر حیرت ہوتی ہے یہ دیکھ کر کہ ہم ان کی پہلی اور آخری غزل میں کوئی فرق محسوس نہیں کر سکتے"۔

بات نیاز فتحپوری کے انہی الفاظ پر ختم ہو جاتی ہے لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہ جاتا ہے کہ آخر یہ حسرت کدے تعمیر کرنے کی خواہش کیوں؟ شفقت کاظمی کے علاوہ جلیل قدوائی بھی تو خاکپائے حسرت ہونے کے مدعی ہیں۔ کوئی شخص کسی دوسرے شاعر کی ریس کرنے سے نہ تو شاعر بن سکتا ہے اور نہ اس جیسا شاعر اور نہ بڑا شاعر۔ خواہ وہ میر ہو یا غالب یا اقبال۔ اور پھر ریس بھی وہ جس میں اپنی خودی تمام تر غیر کی خودی بن جائے۔ رنگِ حسرت کو اگر وسیع بھی تسلیم کر لیا جائے تو نہ شفقت کاظمی کے یہاں اس کی کوئی علامت ہے نہ جلیل قدوائی کے یہاں۔ جب وہ بنیادی احساس و تجربہ ہی نہیں یعنی حسن سے گہرا لگاؤ اور عشق کی سرمستی اور سوز و گداز تو پھر کلام میں تاثیر کہاں؟ اس قسم کی شعری پیر پرستی اور مریدانہ ذہنیت شعر و ادب کے لئے کوئی اچھی فال نہیں۔

تاریخ آزاد پٹھان

(جلد اوّل)

از:۔ اللہ بخش یوسفی

صفحات:۔ ۳۱۲، قیمت چار روپے آٹھ آنے

ملنے کا پتہ:۔ محمد علی ایجوکیشنل سوسائٹی۔ کراچی ۵

کچھ عجب نہیں کہ آزاد پٹھانوں کی اس پہلی مبسوط تاریخ سے نہ صرف سردارانِ قبائل کے چہرے چمک اٹھیں بلکہ تمام ملتِ پاکستان کے دل میں بھی فخر و مسرت کی لہر موجزن ہو۔ کیونکہ یہ اسی کے شجیع و دلاور فرزند ہیں جن کی ساری تاریخ آزادی و حریت اور جہاد ہی کی تاریخ ہے۔ مصنف نے موضوع کے تمام پہلوؤں کا بڑی خوش اسلوبی سے احاطہ کیا ہے اور مورخانہ تحریر کی متانت اور صفائی کو بھی بڑی کامیابی سے برقرار رکھا ہے، جو تاریخی کتابوں میں شاذ ہے۔ غرض مفسد عناصر اور ناساز حالات نے پشتونوں کے متعلق جو غلط فہمیاں پیدا کر رکھی تھیں ان کو احتیاط سے دور کیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں پٹھانوں کی صورت و سیرت اور نسل و قوم کے حقیقی خد و خال جلوہ گر ہیں۔

زنستم

از:۔ لفٹننٹ کرنل مشتاق احمد

صفحات:۔ ۱۲۸، قیمت، درج نہیں۔

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ رحمانیہ کہوٹہ، ضلع راولپنڈی

ہست ہم تقلیل از اسمائے عشق۔ اور فارسی و اردو رباعیات کے اس مجموعہ پر جو ایک سپاہی شاعر کی کاوشِ فکر کا نتیجہ ہیں، شروع سے آخر تک عشق ہی عشق چھایا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ شاعر پر اسکے مرشد اقبال کا گمان ہوتا ہے۔ یہ ہم آہنگی حکیم ملت کے اس دعوے کی تصدیق کرتی ہے کہ۔ یہاں اب مرے ہم زباں اور بھی ہیں۔

(۱) "سیارہ"۔ فیڈریشن آف یونیورسٹی ویمن۔ کراچی
(۲) "ارم"۔ کاسموپولیٹن گرلز سیکنڈری اسکول کراچی
(۳) "ہونہار"۔ گورنمنٹ سیکنڈری اسکول۔ ۲ جیکب لائن۔ کراچی
(۴) "سید رضا علی کالج میگزین" (۵۸-۱۹۵۷)۔ کراچی

یہ چار دل رسالے ہماری نئی پود کی سرگرمیوں کے آئینہ دار ہیں اور ان کی ابھرتی ہوئی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے بہت امید افزا بھی ایسے کہ ہم ان آئینوں میں حسنِ فردا کی جھلک دیکھ سکیں۔ ان سب میں نفاست اور پیشکش کے اعتبار سے امتیاز مشکل ہے لیکن اول الذکر میں ریکھا کے خاکوں اور کارٹونوں سے کچھ زیادہ ذوقِ دل و نگاہ کا سامان نظر آتا ہے۔ امید ہے یہ کوششیں آئندہ اور بھی وسیع ثابت ہوں گی۔

آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک
اور دل کا سرور

یہ پھول سے نازک ——— آپ کے لختِ جگر ——— جب چلچلاتی دھوپ کی تپش اور لو کے جھکڑوں سے پژمردہ ہو کر اسکول سے گھر واپس آتے ہیں۔ تو انھیں موسم گرما کی اس بے رحمی سے نورس ہی نجات دلاتا ہے۔ نورس کو دیکھتے ہی شگفتہ ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ نورس کا استعمال گرمی کی حدت اور کوفت کو ختم کر کے تسکین اور ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔

بیش قیمت اجزا اور تازہ پھلوں کے رس سے تیار کردہ نورس اپنے وقت کا مقبول ترین مشروب ہے۔





مشروبِ وقت

احمد فروٹ پروڈکٹس کراچی پروپرائیٹرز:- احمد فوڈ انڈسٹریز لمیٹڈ



بچے کی پیدائش سے پہلے...



ماں کی زندگی کے تحفظ میں کیا چیز مدد دیتی ہے؟

آپ کا ڈاکٹر آپ کو بتائے گا کہ پیدائش کی نالی کی بیرونی جلد یا اندرونی جھلی میں اگر ذرا سی بھی خراش وغیرہ آ جائے تو جراثیم کو اسمیں داخل ہونے کا موقع مل جاتا ہے اور نتیجے کے طور پر زچہ چھوت کی بیماری یا زچگی کے بخار میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ بہت سی خواتین اس بات کو نہیں جانتیں کہ زچگی کے وقت جو چھوت لگ جاتی ہے اس سے زچہ کو نہایت شدید تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے اور اس کے بعد یہ حالت مستقل صورت اختیار کر لیتی ہے اور کبھی کبھی اس کا نتیجہ بانجھ پن ہوتا ہے۔ اپنے ڈاکٹر سے مشورہ لیجیے کہ زچگی کے موقع پر ڈیٹول کس طرح استعمال کرنا چاہیے۔

بچے کی پیدائش سے پہلے، پیدائش کے دوران میں اور پیدائش کے بعد ڈاکٹر اور دائیاں حاملہ خواتین کی حفاظت کیلئے ڈیٹول پر اعتماد کرتے ہیں۔ انکی تقلید کیجیے۔ ڈیٹول کی ایک بوتل ہمیشہ اپنے گھر میں موجود رکھیے۔

ڈیٹول

* ایک زود اثر دافعِ سمیت دوا ہے جو جراثیم کو بہت جلد ہلاک کر دیتی ہے۔
* یہ آیوڈین یا لائی سول کی طرح زہریلی نہیں ہے۔
* اسے ایک بچہ بھی محفوظ طریقہ پر استعمال کر سکتا ہے۔
* یہ جس جگہ لگائی جائے وہاں ذرا بھی تکلیف نہیں ہوتی۔
* اس کی بو ناگوار ہرگز نہیں۔



پیشہ ور ڈاکٹر ڈیٹول استعمال کرتے ہیں اور استعمال کا مشورہ دیتے ہیں۔

ڈیٹول کی ایک بوتل ہمیشہ اپنے گھر میں موجود رکھیے۔

ریکٹ اینڈ کولمین آف پاکستان لمیٹڈ۔

پوسٹ آفس بکس نمبر ۴۶۳۸ - کراچی نمبر ۱

RC 807   JWT

ہندوستان کے خریداروں کی سہولت کے لئے

ہندوستان میں جن حضرات کو ادارۂ مطبوعات پاکستان، کراچی کی کتابیں، رسائل اور دیگر مطبوعات مطلوب ہوں وہ براہِ راست حسب ذیل پتہ سے منگا سکتے ہیں۔ استفسارات بھی اسی پتہ پر کئے جا سکتے ہیں۔ یہ انتظام ہندوستان کے خریداروں کی سہولت کے لئے کیا گیا ہے:

"ادارۂ مطبوعات پاکستان" معرفت پاکستان ہائی کمیشن، کشمیر شاہ میس روڈ۔ نئی دہلی (انڈیا)

منجانب: ادارۂ مطبوعات پاکستان،
پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

صورِ اسرافیل

مغنیِ آتش نفس، قاضی نذرالاسلام کی منتخب شاعری کے اردو تراجم ـــــ مقدمہ شان الحق حقی

نذرالاسلام مسلم بنگال کی نشاۃ الثانیہ کا پہلا نقیب اور داعی تھا جس کے گرجدار آہنگ نے صورِ اسرافیل کی طرح قوم کے تن مردہ میں پھر حیاتِ نو پھونک دی تھی۔

اس کا مقدمہ جو نہایت کاوش سے لکھا گیا ہے، نذرالاسلام کی شخصیت اور شاعری پر اردو میں اپنی طرز کا نادر مقالہ ہے۔

ہر صفحہ دیدہ زیب آرائش سے مزین ہے،
سرورق مشرقی پاکستان کے فنکار زین العابدین کے موقلم کا حیرت آفریں شاہکار ہے۔
قیمت صرف ایک روپیہ آٹھ آنے

ملنے کا پتہ
ادارۂ مطبوعات پاکستان
پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا۔ مطبوعہ: ناظر پرنٹنگ پریس میکلوڈ روڈ کراچی ۔ مدیر: رفیق خاور


لہلہاتی کھیتیوں کے محافظ

جلد ۱۲


شمارہ ۸

اگست ۱۹۵۹ء

مدیر: رفیق خاور   نائب مدیر: لطف قریشی

سرورق: ایوب نیشنل پارک (راولپنڈی) کا ایک منظر   رنگین عکس: محمد اسلم

چندہ سالانہ صہ   ادارۂ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی   فی کاپی ۸ر

"دَورِ فلک بکامِ ما"

قاضی یوسف حسین صدیقی

ہماری قومی زندگی میں کتنے ہی اتار چڑھاؤ کیوں نہ ہوں، ۱۴ اگست کی اہمیت کبھی زائل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ وہ تاریخی دن ہے جب ہماری صبحِ آزادی طلوع ہوئی تھی، اور ہماری نظروں نے ایک بار پھر وہ اجالا دیکھا تھا جو کوئی دو صدیوں سے پردۂ ظلمات میں مستور ہو چکا تھا۔ یہ دن ہمارے لئے دلی مسرت کا پیغام ہے اور ہم اس کا کسی عملی صورت میں اظہار کریں یا نہ کریں، اس کا وجدانی طور پر ولولہ آفریں ہونا لازمی ہے۔

اگر ہم اس موقع پر شادماں ہوں کہ ہم نے اپنی آزادی کے بارہ سال پورے کر لئے ہیں اور تیرہویں میں قدم رکھا ہے، تو بیجا نہیں۔ یہ ہمارے لئے فخر کا باعث ہے کہ ہم نے ایک ایسے پُر آشوب دور میں اپنے قومی وجود کو برقرار رکھا ہے جس کا ہر لمحہ پیغامِ مرگ تھا۔ اور ایسی افتادوں کا سامنا کیا ہے جن کے سامنے بڑی بڑی قوموں کے قدم بھی ڈگمگا جاتے ہیں۔ دراصل کسی قوم کی توانائی کا صحیح معیار بھی یہی ہے کہ اس نے حالاتِ زمانہ کا مقابلہ کیسے کیا ہے۔ اپنی زندگی کی پیچیدہ گتھیاں کیسے سلجھائی ہیں، شدید سے شدید آزمائشوں میں کیسے پوری اتری ہے اور ٹیڑھے سے ٹیڑھے موڑ مڑ کر کس طرح ایسے راستے پر گامزن ہوئی ہے جو اس کی بقا اور ترقی کے ضامن ہوں۔

کسی قوم خصوصاً نئی قوم کا راستہ ہمیشہ پُر پیچ و خم ہوتا ہے۔ بلکہ اسے اپنا راستہ خود تلاش کرنا اور تراشنا پڑتا ہے۔ اگر کسی آڑے وقت پر اس کی [illegible] جواب دے دیں، اس کی نگاہیں حدِ نظر سے آگے نہ دیکھ سکیں، وہ کسی موقع پر آزمائش میں پوری نہ اترے اور صحیح اقدام نہ کر سکے تو عین ممکن ہے کہ اس کا چراغ گل ہو جائے اور وہی عناصر جنہوں نے اس کو جنم دیا تھا، اس کو اپنے اندر جذب کر لیں۔ ہم اس بات کو فخر و کامرانی کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ گو ہم [illegible] طوفانوں سے دوچار ہوئے ہیں اور ہمیں بہت ہی بے ڈھب افتادوں سے نبٹنا پڑا ہے پھر بھی ہم نے ہمت و استقلال کا دامن نہیں چھوڑا اور [illegible] برابر برقرار رہی ہیں۔ یہاں تک کہ ہم نے نہ صرف مخالف عناصر کا ہر وار سنبھالا بلکہ ان کو ٹھکانے بھی لگا دیا۔ اور اب ایسے عناصر کو خضرِ راہ بنا لیا [illegible] ہے جن کی وضع بالکل مختلف ہے۔ ان کا مقصد قومی مسائل کو پورے خلوص اور دیانت داری سے حل کرنا ہے اور عوام کو ان کے چھینے ہوئے حقوق عطا کرنا ہے۔ ان کا راستہ تعاون، اشتراکِ عمل، ہمدردی اور محبت کا راستہ ہے کیونکہ: ع

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے

دورِ ماضی کا ایک عام مرض گذشتہ [illegible] کے مسلک کی پیروی ہے۔ بے سر و پا [illegible] آمیز بیانات، جلسے، فریب کاری، کھوکھلی نعرہ بازی، ڈھنڈورے پیٹنا اور مصنوعی نمود و نمائش، لیکن یہ رویہ آپ اپنے لئے پیغامِ مرگ ہے۔ ع مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید۔ اسلئے آخر کار نوبت افراد [illegible] پہنچتی ہے۔ یہی حکومتوں اور قائدوں کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہیں اور خواہ کتنی ہی تدبیریں کیوں نہ کی جائیں، بالآخر ان کی طرف رجوع کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ اور ہماری بارہ سالہ تاریخ نے اس کا بار بار ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ لہٰذا جو لائحہ عمل اب اختیار کیا گیا ہے اس میں اس حقیقت کو ملحوظ رکھنے کی پوری پوری کوشش کی جا رہی ہے۔

[illegible] حالات کا رخ اجازت دیتا ہے، بعض قیاس آرائیاں کچھ بے جا بھی نہیں۔ یہ وہ نتائج ہیں جن کا ہم بآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ [illegible] کا باعث ہے کہ ہماری قوم نے کافی [illegible] ہے ہی، ایک بہت بڑی مہم سر کر لی ہے۔ یہ نہایت پُر امن طور پر وہ موڑ مڑنے میں کامیاب [illegible] جس سے نئی قوموں کو بالعموم [illegible] گزرنا پڑتا ہے۔ اور اب حالات اندرونی و بیرونی دونوں طور پر اس قدر اطمینان بخش ہیں کہ دوسری قومیں ہم پر رشک کرتی ہیں۔ ہمارا انقلاب موجودہ یوم استقلال سے تھوڑا ہی عرصہ پہلے واقع ہوا ہے۔ اسلئے مقامِ مسرت ہے کہ ہمارا تیرہواں سالِ آزادی

بدرجہا بہتر حالات کی نوید لئے ہوئے ہے۔

نئے دور میں جو پے در پے اقدامات ہوئے ہیں ان کا تذکرہ تحصیل حاصل ہے۔ ہم میں سے کوئی ہے جو ان سے واقف نہ ہو؟ ان کی حیثیت بلاشبہ نہایت ڈرامائی ہے۔ اور وہ آناً فاناً اس کثرت اور برق وش تیز رفتاری سے کوندکوند گئے ہیں کہ تعجب ہوتا ہے۔ زرعی اصلاحات، مہاجرین کی آبادکاری، متروکہ جائدادوں سے متعلق دعاوی کا فیصلہ، ناجائز درآمد برآمد کا سدباب، قوم دشمن عناصر اور سیاسی جماعتوں کا استیصال، انتظامی صفائی و تطہیر، قانون، تعلیم، پریس وغیرہ کی اصلاحیں، معاشری فلاح و بہبود اور ترقی کی تدابیر اور سب سے بڑھ کر قومی مزاج، ضروریات اور روایات سے ہم آہنگ اور مناسب ترین آئینی نظام کی تشکیل کے لئے جدوجہد یہ تمام امور ہماری تاریخ میں ایک نیا باب مرتب کر رہے ہیں۔ اور ان کا نتیجہ ایک نئی فضا ہے جس میں زندگی از سر نو جاگ اٹھی ہے، اور اس کے حوصلے، اس کے تقاضے، اس کے عزائم ایک نیا ولولہ، ایک نیا شوق [illegible] پیدا کرتے ہیں۔ اور وہ اطمینان و دلجمعی حاصل ہوگئی ہے جو توائے فکر کو پیغام نمو دیتے ہوئے ذہنی و ثقافتی سرگرمیوں کی رفتار تیز کرتی ہے۔

موجودہ زمانے میں ارباب قلم کی اہمیت سے کون انکار کرسکتا ہے کیونکہ معاشرہ کا دل و دماغ، اس کی روح رواں وہی ارباب فکر و نظر ہیں جو ادب و فن کی مشعل روشن کر کے "جہان نابصیر" کو راستہ دکھاتے ہیں۔ قبل ازیں یہ طبقہ بھی دوسروں کی طرح کس مپرسی کا شکار تھا۔ ایک کے بعد دوسری خودغرض و بے پروا حکومت آتی رہی اور یہ طبقہ پریشان حال و سرگرداں ہی رہا۔ نئے دور کے طلوع ہوتے ہی صورت حال بدل گئی۔ اس جماعت بے امام کو ایک امام، ایک سرپرست مل گیا۔ صدر پاکستان کی چشم حقیقت شناس شعر و ادب کی اہمیت سے بخوبی واقف تھی۔ اسلئے انہوں نے شعراء و ادباء کی قدردانی میں نمایاں حصہ لیا اور متعدد ذاتی و سرکاری انعامات سے حوصلہ افزائی کی۔ ان کے پیش نظر ادبی کاوشوں [illegible] جذبہ تلی کی قدردانی تھی۔ اسلئے انہوں نے ہر پیشکش کو قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا، اور بعض صورتوں میں خود اپنی جیب سے انعامات دے کر داد و دہش کی دیرینہ روایات کو تازہ کیا۔ ایک بہت بڑا کام ان ادیبوں اور فنکاروں کی دستگیری تھی جو معذور یا مفلوک الحال ہیں۔ چنانچہ [illegible] افراد کی اعانت کا بندوبست کیا گیا ہے۔

ان حالات نے ادب و فن کی دنیا میں ایک نئی ہلچل پیدا کردی۔ ادیبوں کو اپنے وجود کا احساس ہوا اور انہوں نے اپنے آپ کو ایک منظم جماعت بنانے کی جدوجہد شروع کی۔ اس کا نتیجہ پاکستان رائٹرز گلڈ کا قیام ہے جو تمام برصغیر میں اپنی قسم کا پہلا اور مہتم بالشان ادارہ ہے، اور جس سے کتنی ہی امیدیں وابستہ ہیں۔ اس کی آئندہ کارگزاریوں کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت ہے لیکن تاحال اس نے جو اقدامات کئے ہیں ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ خستہ حال اور معذور ادیبوں کے لئے جو کچھ کیا گیا ہے وہ اسی کے مشورہ اور جدوجہد ہی کا نتیجہ ہے۔ پھر اراکین کی زندگی کا نہایت آسان اور ارزاں شرائط پر بیمہ فی الحقیقت بہت بڑا کارنامہ ہے۔ جس کی ادبی اداروں کی تاریخ میں شاید ہی کوئی نظیر دکھائی دے۔ ایک پبلشنگ ہاؤس کا قیام جو ہر قسم کی کتابوں کی اشاعت کا اعلیٰ پیمانے اور مصنفین کے لئے بہترین شرائط پر اہتمام کرے گا، ایک اور نہایت اہم اقدام ہے جس کی اشد ضرورت تھی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ کئی اور بے حد اہم امور مثلاً ادیبوں کے حقوق کا تحفظ [illegible] پابندیوں کو دور کرانے کی سعی و کوشش وغیرہ ایسی باتیں ہیں جن کا ایک منظم و مضبوط ادارہ کے بغیر سرانجام ناممکن تھا اور ہمیں خوش ہونا چاہئے کہ ایسا ادارہ رائٹرز گلڈ کی شکل میں وجود پذیر ہوچکا ہے۔ جو ادب کے لئے بھی اچھی فال ہے اور ادیبوں کے لئے بھی۔

اس مختصر جائزہ سے ظاہر ہے کہ ہم اپنی آزاد قومی زندگی کے تیرھویں سال کا آغاز ایسے حالات میں [illegible] امید افزا ہیں۔ اگر "تیز ترک گام زن" کے [illegible] افروز پیغام پر عمل کی یہی کیفیت رہی تو ہم نہایت اعتماد سے [illegible] کی بشارت کے پورا ہونے کی نوبت دور نہیں اور ہمارے قدم بہت جلد اس منزل کو جالیں گے۔

حمد

منیر احمد منیر

ملکۂ شہرِ زندگی تیرا، شکر کس طور سے ادا کیجے
دولتِ دل کا کچھ شمار نہیں، تنگدستی کا کیا گلا کیجے

جو ترے حُسن کے فقیر ہوئے، اُنکو تشویشِ روزگار کہاں
در بدر بیچیں گے گیت گائیں گے، اس سے خوش وقت کاروبار کہاں

ساز چھیڑا تو جم گئی محفل، منّتِ طبعِ غمگسار کسے
اشک ٹپکا تو کھل گیا گلشن، رنجِ کم ظرفیٔ بہار کسے

خوش نشیں ہیں کہ چشم و دل کی مُراد، دَیر میں ہے نہ خانقاہ میں ہے
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں، ہر صنم اپنی بارگاہ میں ہے

کون ایسا غنی ہے جس سے کوئی نقدِ شمس و قمر کی بات کرے
ہم سے شوقِ نبرد ہو جس کو، جائے تسخیرِ کائنات کرے

کیمبرج میں میرے دو دن

ممتاز حسن

میں کیمبرج کا طالب علم تو نہیں ہوں۔ مگر اس دانشگاہ سے مجھے ہمیشہ ایک عقیدت سی رہی ہے۔ کیمبرج عربی اور فارسی کی تعلیم و تحقیق کا مرکز ہے۔ براؤن اور نکلسن اسی دانشگاہ کے استاد تھے۔ اور دونوں علمی دنیا میں اس حیثیت کے مالک ہیں کہ دنیا کی جس درسگاہ سے بھی ان کا تعلق ہوتا، اسے ایک پائدار عزت اور شہرت بخش دیتے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ کیمبرج وہ جگہ ہے جہاں اقبال نے اپنی علمی اور تحقیقی زندگی کا ابتدائی دور گزارا۔ اقبال، پروفیسر نکلسن کے شاگرد تھے۔ اور استاد اور شاگرد دونوں کو ایک دوسرے پر فخر تھا۔ جب "اسرار خودی" شائع ہوئی تو نکلسن مرحوم اس کی شاعرانہ اور فلسفیانہ عظمت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔ اگر یہ ترجمہ نہ ہوتا۔ تو اقبال کی بین الاقوامی شہرت کا آغاز اتنا جلد نہ ہوتا۔ اور غالباً خود برطانوی حکومت بھی اقبال کی شاعرانہ عظمت سے ناآشنا رہتی۔

براؤن، نکلسن اور اقبال کے ناموں کے ساتھ اگر عمر خیام اور فٹز جیرالڈ کے نام بھی شامل کر دیئے جائیں تو کیمبرج کی علمی عظمت کی تصویر زیادہ مکمل ہو جاتی ہے۔ فٹز جیرالڈ جس کے ترجمے نے مغربی دنیا کو عمر خیام کی رباعیات سے روشناس کیا، کیمبرج یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ اور اقبال کی طرح ٹرنٹی کالج میں داخل تھا۔ رباعیات کا دنیا میں قدیم ترین نسخہ کیمبرج یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ اور فٹز جیرالڈ کے مختلف مسودات بھی اسی یونیورسٹی میں محفوظ ہیں۔

میرا جی کیمبرج جانے کو پہلے بھی چاہتا تھا۔ جب یہ معلوم ہوا کہ فٹز جیرالڈ کے ترجمے کی صد سالہ یادگار کے سلسلے میں جو نمائش کیمبرج میں منعقد ہوئی تھی، وہ ابھی جاری ہے۔ تو اور بھی شوق ہوا۔ چنانچہ جب برٹش کونسل نے، جو یہاں میرے میزبان ہیں، میرے کیمبرج جانے کی تجویز کی، تو میں نے اس دعوت پر فی الفور لبیک کہا۔ دوسری مصروفیتوں کے پیش نظر میرے لئے کیمبرج میں دو دن سے زیادہ ٹھہرنا ممکن نہ تھا۔ مگر جو دو دن وہاں گزرے۔ وہ مجھے یاد رہیں گے۔

سب سے پہلے میں نے کیمبرج یونیورسٹی لائبریری میں عمر خیام کی نمائش دیکھی۔ اور رباعیات کا وہ قدیم ترین نسخہ بھی دیکھا۔ جسے پروفیسر آربری منظر عام پر لا چکے ہیں یہ نسخہ عمر خیام کی وفات سے تراسی سال کے بعد کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں عمر خیام، سنائی اور دوسرے شعرا کے کلام کا انتخاب شامل ہے۔ اس نسخے کے علاوہ فٹز جیرالڈ کے ترجمے کا پہلا ایڈیشن بھی نمائش میں موجود ہے پہلے ایڈیشن کا وہ نسخہ بھی ہے جو کیمبرج یونیورسٹی لائبریری کو کاپی رائٹ لائبریری ہونے کی وجہ سے ۱۸۵۹ء میں بھیجا گیا تھا۔ اس وقت لائبریری کے ارباب اختیار نے اسے قابل اعتنا نہ سمجھا اور ایک طرف پھینک دیا۔ ۱۹۱۹ء میں کسی نے اسے ردی کے انبار میں سے نکالا اور نسخہ ضائع ہوتے ہوتے بچ گیا۔ آج پہلے ایڈیشن کے نسخوں کی قیمت ۱۵۰۰ اور ۲۰۰۰ پونڈ کے لگ بھگ ہے۔

یونیورسٹی لائبریری میں فارسی اور عربی کی کتابوں کا معقول ذخیرہ ہے۔ مگر مجھے یہاں اردو کی کتابیں دیکھ کر خاص طور پر خوشی ہوئی۔ یہ کتابیں خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ اور ان کی فراہمی میں پروفیسر آربری کی، جو براؤن اور نکلسن کے جانشین ہیں اور جنہوں نے نکلسن کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اقبال کی "رموز بیخودی"، "لالہ طور" ("پیام مشرق" کا ایک حصہ) اور "زبور عجم" کا ترجمہ بھی فرمایا ہے، ذاتی توجہ کو دخل ہے۔ خود پروفیسر آربری سے بھی ملاقات ہوئی انہوں نے مجھے پروفیسر براؤن مرحوم کی تاریخی قیامگاہ دکھائی اور پھر خود اپنے مطالعے کے کمرے میں لے گئے۔ جہاں پروفیسر صاحب اور ان کی کتابوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ و خیر جلیس فی الزمان کتاب۔

شام کو ایوری صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ ایک زمانے میں رائل انڈین نیوی میں افسر تھے۔ آج کل کنگز کالج میں عربی اور فارسی کے لیکچرار ہیں۔ فارسی زبان، ایران اور ایرانیوں سے خاص شغف رکھتے ہیں۔ میں نے کنگز کالج کے ہال میں ان کے ساتھ کھانا کھایا۔ کھانا ختم ہوا تو وہ مجھے اپنے مکان پر لے گئے۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے تک گفتگو رہی۔ ان کے دو شاگرد بھی موجود تھے۔ میں نے علمی معاملات میں اتنا شگفتہ انہماک کم دیکھا ہے۔

ایوری صاحب سے ملنے سے پہلے میں نے کیمبرج کی پرانی کتابوں کی دکانوں کا گشت کیا ایک آدھ چیز ہاتھ بھی آئی۔ مگر پرانی کتابوں کے بارے میں جو کیفیت لندن کی ہے وہ نہ کیمبرج کی ہے نہ آکسفورڈ کی، نہ اس ملک میں کسی اور شہر کی۔

دوسرے روز ٹرنٹی کالج کی لائبریری دیکھنے کا موقع ملا۔ نو قدیم اور نفیس فارسی کے قلمی نسخے دیکھے۔ ایک کلیاتِ سعدی اور دوسرا جامی کی مثنویات۔ اس کے بعد ڈاکٹر ڈاڈویل صاحب نے، جو یہاں لائبریرین ہیں۔ مجھے ایڈورڈ فٹز جیرالڈ کے ذاتی کاغذات کا ذخیرہ دکھایا جو تمام تر اسی لائبریری میں محفوظ ہے۔ یہ ایک بیش بہا اور نادر ذخیرہ ہے۔ اس میں فٹز جیرالڈ کے ذاتی خطوط، اس کے مطالعے کی یادداشتیں، اس کے ہاتھ کی بنائی ہوئی تصویریں، اس کی تصنیف کردہ موسیقی، سب کچھ موجود ہے۔ ایک آدھ غیر مطبوعہ تصنیف بھی ہے۔ میں فٹز جیرالڈ کی مصوری اور موسیقی سے محض سرسری طور پر واقف تھا۔ اس ذخیرے میں جو کچھ دیکھا اس سے واضح ہوگیا کہ ابھی عمر خیام کے اس شہرۂ آفاق اور زندۂ جاوید مترجم کی پوری شخصیت دنیا کی آنکھوں کے سامنے نہیں آئی۔

ٹرنٹی لائبریری سے فارغ ہوا تو ڈاکٹر ڈاڈویل نے کالج ہال میں دوپہر کے کھانے کی دعوت دی۔ یہ وہ ہال ہے جہاں اقبال نے ٹرنٹی کالج کے طالب علم کی حیثیت سے بارہا کھانا کھایا ہوگا۔ اس کے بعد مجھے شوق ہوا کہ اقبال کی طالب علمی کے زمانے کی قیامگاہ دیکھوں۔ معلوم ہوا کہ وہ زیادہ تر وہ کیسل روڈ پر رہے ہیں۔ کچھ عرصے ہنٹنگٹن روڈ پر بھی قیام رہا۔ ڈاکٹر ڈاڈویل نے رہنمائی کی اور ہم دونو کیسل روڈ پر جا پہنچے۔ یہ مکان ایک گرجا کے پہلو میں واقع ہے۔ اس کی نچلی منزل میں آجکل بھی طالب علم ہی رہتے ہیں۔ ہم ہنٹنگٹن روڈ پر نہ جاسکے۔ مجھے لندن واپس آنا تھا اور گاڑی کا وقت ہو چکا تھا۔ (بشکریہ بی بی سی، لندن)

★

درسِ عمل

مشتاق مبارک

ہر عیش اہلِ کفر پہ دنیا میں عام ہے
عشاق اہلِ بیت کو جینا حرام ہے

شیرازۂ حیات پریشاں ہے آج بھی
مشکل میں اب بھی امتِ خیر الانام ہے

ہیں بے کسوں پہ جبر و تشدد کی یورشیں
اب بھی حیات صورتِ مرگِ دوام ہے

قائم ہیں اب بھی حق و صداقت پہ بندشیں
باطل بساطِ دہر پہ محوِ خرام ہے

یوں تو بڑے خلوص سے ملتے ہیں اہلِ کیں
لیکن دلوں میں جذبۂ صد انتقام ہے

اے بے نیاز ہوش تجھے کچھ خبر بھی ہے
مدت سے تو رہینِ غمِ صبح و شام ہے

اٹھ اور اٹھ کے وقت کے دھارے کو موڑ دے
پینا اگر تجھے بھی شہادت کا جام ہے

اک اور انقلاب پئے امن و عافیت
روداد کائنات ابھی ناتمام ہے

عزمِ حسینیت کو زمانے میں عام کر
تو عاشقِ حسین علیہ السلام ہے

ذہنی و ادبی نشاۃ الثانیہ

(چند حقائق و بصائر)

ڈاکٹر محمد صادق

بادی النظر میں یہ سوال ایک جداگانہ حیثیت کا حامل نظر آتا ہے مگر غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ دراصل یہ ایک متنوع سوال کا جزو ہے۔ "ہمارے نظام تعلیم میں انگریزی کا مقام" "ہمارے نظام تعلیم میں اردو کا مقام" اور "اردو بحیثیت ذریعہ تعلیم"، درحقیقت ایک ہی اہم اصل سوال کے مختلف پہلو ہیں اور ان کی حد بندی اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ لہٰذا اگر میں اپنے مخصوص موضوع سے ذرا پرے ہٹ کر متذکرہ بالا عنوانات میں مداخلت بے جا کا خطاوار ٹھہروں تو مجھے معذور رکھا جائے۔

میں محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے یہاں انگریزی علم و ادب کی کوئی منظم مخالفت نہیں، اور جو کچھ ہے وہ محض جذباتی ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہم میں ایک ایسا طبقہ ضرور ہے جو انگریزی کے رواج و عروج کا شاکی ہے۔ اس کی رائے میں انگریزی کی حمایت کرنا یا اس کی تعلیم دینا ذہنی غلامی کی علامت ہے۔ اور چونکہ ہم نئے نئے آزاد ہوئے ہیں اور اپنی آزادی پر کسی قسم کی پابندی کے لئے تیار نہیں، اس لئے یہ حربہ اکثر کامیاب ہوتا ہے۔ ان لوگوں کا طرز استدلال عموماً یہ ہوتا ہے کہ انگریزی زبان کو ہمارے بدیشی حکمرانوں نے ہم پر مسلط کیا تھا، جب تک وہ یہاں رہے ہمیں طوعاً و کرہاً یہ طوق غلامی پہننا پڑا۔ اب چونکہ غلامی کا دور ختم ہو چکا ہے۔ اس لئے اسے گلے سے اتار پھینکنا چاہیئے اس نظریئے کے موئید تین قسم کے لوگوں پر مشتمل ہیں: زمانہ ساز سیاست دان یا گھٹیا قسم کے صحافی جو وطن پرستی کا ڈھنڈورا پیٹ کر عوام کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہیں یا السنہ و علوم مشرقیہ کے چند نام لیوا۔ موخر الذکر طبقہ کی مخالفت محض ذاتی ہے۔ چونکہ فرنگی دور حکومت میں ان کی وہ قدر و منزلت نہ تھی جس کے وہ بوجہ اپنے علم و فضل کے مستحق تھے اس لئے غالباً غیر شعوری طور پر وہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر مغربیت سے، جس کی ایک ظاہری نشانی انگریزی زبان ہے، مکمل نجات مل جائے۔ تو وہ اپنا کھویا ہوا وقار پھر سے حاصل کر لیں گے۔ لیکن جیسا کہ میں آگے چل کر بتاؤں گا۔ یہ ایک خیال خام ہے ـــــ میری اپنی خواہش ہے کہ ہماری مرکزی زبان اردو کو عروج حاصل ہو اور اس کا دنیا کی متمدن زبانوں میں شمار ہو لیکن یہ کام انگریزی کی مخالفت سے نہیں ہو سکتا۔ باقی رہا غلامی کا سوال، تو ہر وہ شخص جس نے ہماری ثقافتی تاریخ کا بے لاگ مطالعہ کیا ہے اس ایسے گمراہ کن نظریہ سے ہرگز متفق نہ ہوگا۔ پچھلے سو سال کے محدود عرصہ میں ہماری زبان کے ادب نے جو ارتقائی منازل طے کئے ہیں ان سب کے لئے ہم انگریزی کے مرہون منت ہیں نہیں تو کس کے ہیں؟ آج سے سو سال پہلے ہمارے ہاں نثر قریباً قریباً مفقود تھی۔ ہماری شاعری محض جذبات کی زبان تھی۔ اور اگرچہ متغزلین کی کاوشوں نے اس میں لچک اور روانی پیدا کر دی تھی لیکن غزل کے طلسمی دائرے کے باہر اس کی فسوں گری منتہی تھی۔ علمی مضامین اور ٹھوس واقعات کے اظہار کی اس میں مطلق سکت نہ تھی۔ اگر ہماری شاعری تنگنائے غزل سے نکل کر زندگی کے بیشتر شعبوں پر حاوی ہو گئی، اگر ہمارے ادب میں افادی نثر کا آغاز و ارتقا عمل میں آیا۔ اور فن تنقید، ناول اور اس کے بعد افسانہ نے ترقی کی اور جدید صحافت نے جنم لیا تو اسے انگریزی ہی کا فیضان سمجھنا چاہیئے۔ ہماری زبان نے انگریزی کے ہزاروں الفاظ، محاورے، جملے، تراکیب اپنے اندر جذب کر لی ہیں۔ اور ان میں سے بیشتر اس میں ایسے گھل مل گئے ہیں کہ ان پڑھ اور تعلیم یافتہ، مرد اور عورتیں، بچے بوڑھے انہیں بے تکان استعمال کرتے ہیں اور انہیں خیال تک نہیں گذرتا کہ یہ سب کے سب غیر ملکی ہیں۔ پرانا طمطراق آمیز اسلوب متانت میں تبدیل ہو رہا ہے ادب میں نت نئے ہئیتی تجربے اور اسالیب بیان میں جو خوشگوار تبدیلیاں اسی اثر کی بدولت ہیں۔ دانش وروں کا طبقہ اور اس کی مخصوص ذہنیت کی تشکیل اسی کے زیر اثر ہوئی ہے۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے

کہ انگریزی آج تمام علوم جدیدہ کی کلید ہے اور صرف اسی کی بدولت یورپ کے علوم، ادبی تحریکات اور جدید ترین انکشافات ہم تک پہنچ سکتے ہیں اور پہنچ رہے ہیں۔ اس تعلق کو قطع کر دیجئے تو ہم پر پھر وہی بے حسی، وہی جمود طاری ہو جائے گا جس سے محض انگریزی زبان کی بدولت ہمیں نجات ملی ہے۔ صرف یہی نہیں۔ وہ اصحاب جو انگریزی تعلیم کو غلامی کے مترادف خیال کرتے ہیں، یہ حقیقت فراموش کئے ہوئے ہیں کہ آزادی کے لئے جدوجہد کا آغاز اور اس میں کامیابی کا سہرا انہیں لوگوں کے سر ہے جنہوں نے پہلے پہل انگریزی تعلیم حاصل کی۔ اور انہی ان تھک کوششوں سے نہ صرف سیاسیات میں قوم کی رہنمائی کی بلکہ ان تمام مذہبی اور سماجی بدعتوں اور بدعنوانیوں سے بھی نجات دلائی جن کے مہلک اثرات سے ہمارے ذہنی اور روحانی قویٰ مضمحل ہو رہے تھے۔

اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ سید احمد، حالی، شبلی اور ان کے رفقائے کار کی ادبی و اصلاحی سرگرمیاں اسی انگریزی تعلیم کا ثمرا لیں تھیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اگر انگریزی تعلیم نہ ہوتی تو نہ صرف سیاسی اعتبار سے بلکہ ذہنی طور پر بھی ہم غلام ہوتے۔

مانا کہ ہم نے مغرب سے بہت کچھ سیکھ لیا ہے لیکن ابھی ہمیں اس سے اور بہت کچھ سیکھنا ہے۔ لہذا علمی اور ادبی درآمد کا یہ سلسلہ ابھی عرصۂ دراز تک جاری رہنا ہوگا۔ اور چونکہ یہ سلسلہ انگریزی زبان کے علم سے وابستہ ہے اس لئے ہم عرصۂ دراز تک انگریزی زبان سے کلیتاً مستغنی نہیں ہو سکتے۔ میں یہاں صرف انگریزی زبان کی اہمیت پر زور دے رہا ہوں۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ہمارے تعلیمی نظام میں اس کا وہی مقام ہو جو اب تک رہا ہے یا آجکل بھی ہے۔ بے شک ہم نے انگریزی سے بہت فوائد حاصل کئے ہیں لیکن انگریزی کے وقار اور ہمارے انہماک کا ایک یہ نتیجہ ہوا کہ ہم نے اپنی زبان یا زبانوں کی تہذیب و ترقی پر بہت کم توجہ کی۔ آخر اس کا کیا سبب ہے کہ سید احمد، حالی، شبلی اور آزاد کے بعد ہماری ادبی ترقی کی رفتار دھیمی پڑ گئی ہے حالانکہ ان کے سامنے انگریزی ادب و تہذیب کا ایک دھندلا سا نقش تھا اور بعد کا تعلیم یافتہ طبقہ اس کی پیداوار تھا؟ جہاں تک میں سمجھتا ہوں فرق یہ تھا کہ انہوں نے اپنی تمام تر توجہات کو قوم کی خدمت اور تربیت کے لئے صرف کیا۔ ہمارے انگریزی خواں طبقہ کی یہی معراج کمال تھی کہ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر انگریزی تعلیم سے بہرہ ور ہوئے۔ لیکن چونکہ وہ اپنی زبان سے بے اعتنائی برتتے رہے لہذا نہ ان میں اہلیت تھی اور نہ انہیں یہ توفیق ہوئی کہ مغربی علوم کو اپنی زبانوں میں منتقل کر کے انہیں وسعت دیں۔ آجکل ہمارے ملک میں علوم کی فراوانی ہے لیکن بخیل کی دولت کی طرح انکا کوئی نکاس نہیں۔ اب ہمیں ایسے تعلیم یافتہ اصحاب کی ضرورت ہے جو بیک وقت انگریزی اور اردو میں مہارت تامہ رکھتے ہوں تاکہ وہ انگریزی علوم کو اردو میں منتقل کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ اس کام کے لئے ایک محدود لیکن مستعد اور ممتاز جماعت کی ضرورت ہے۔ یہ اصحاب تہذیب کے منتقل کرنے والے ہوں گے اور انگریزی علوم و ادب کو اردو میں منتقل کرنے کے فرائض سرانجام دیں گے۔ ہمارے موجودہ سلسلۂ تعلیم کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ طلبا کی زندگی کے بہترین سال انگریزی سیکھنے پر اس لئے صرف ہوتے ہیں کہ وہ مغربی علوم کو انگریزی میں سیکھ سکیں۔ اگر انہیں یہی علوم اردو میں پڑھائے جائیں تو انہیں تین فائدے ہوں گے: (۱) اعلیٰ تعلیم کا آغاز مقابلتہً چھوٹی عمر میں ہو سکے گا (۲) مطلب کے اخذ کرنے میں آسانی ہوگی (۳) تھوڑے سے وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل ہو جائیں گی۔ میں نے حال ہی میں ایک تجربہ کیا تھا۔ جو نتائج کے لحاظ سے بہت اہم ہے اس لئے اس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ میں نے سالِ اول کے اوسط درجے کے دو طلبا سے کہا کہ وہ مقبرۂ انارکلی پر اردو میں اپنی مضمون لکھیں اور ساتھ ہی سالِ چہارم کے دو اوسط درجے کے طلبا سے کہا کہ وہ بھی انگریزی میں اسی موضوع پر طبع آزمائی کریں۔ جب وہ لکھ کر میرے پاس لائے تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سالِ اول کے مضامین میں روانی، شگفتگی اور زبان کا رواں استعمال تھا۔ اور ان کے مضامین بھی کافی طویل تھے۔ مگر سالِ چہارم کے طلبا کے مضامین مختصر اور بے جان تھے۔ ان کی زبان ایک جسدِ بے روح کی طرح تھی۔ پھر انہیں اقتصادیات کا ایک معمولی سا مسئلہ انگریزی میں سمجھایا گیا اور سالِ اول کے طلبا کو اردو اور سالِ چہارم کے طلبا کو انگریزی میں لکھنے کے لئے کہا گیا۔ پہلے تجربہ کی طرح اس میں بھی اردو والے جوابات نسبتاً بہتر تھے۔ حالانکہ انگریزی والے طلبا نے میرے انگریزی کے الفاظ سے بھی فائدہ اٹھایا تھا۔ اور اردو والوں کو اپنی توجہ سے اردو الفاظ تلاش کرنے پڑے تھے۔

یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ مغربی طلبا کی معلومات ہمارے طلبا کی معلومات سے بہت زیادہ ہیں۔ اس کا سب سے بڑا سبب غالباً یہی ہے کہ

وہ ہماری طرح دوسری زبانوں کا بھی مطالعہ کرتے ہیں، لیکن ان کا ذریعۂ تعلیم اپنی مادری زبان ہے۔ آپ بھی تھوڑی دیر کے لئے کسی ایسی زبان میں اظہار خیال کی کوشش کیجئے، جس پر آپ کو کامل دسترس حاصل نہیں اور دیکھئے کہ آپ کو کتنی اعصابی اور ذہنی الجھن ہوتی ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے بیشتر طلبا اسی الجھن میں مبتلا ہیں۔ اظہار خیال کے وسائل پر دسترس کا فقدان احساسِ کمتری اور اعصاب زدگی کا ایک بڑا سبب ہے۔ اور ہمارے ہاں اس کی وجہ انگریزی کی غیر مناسب اہمیت ہے۔

میں انگریزی کی غیر مناسب اہمیت کا مخالف ہوں۔ اس کی اہمیت کا مجھے اقرار ہے۔ میں اوپر کہہ آیا ہوں کہ متمدن اقوام کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے ہونے کے لئے اعلیٰ انگریزی تعلیم لابدی ہے لیکن صرف انہیں افراد کے لئے جو خود کو اس کے کام کے لئے مخصوص کرنا چاہتے ہیں، اور جن میں اس سے عہدہ برآ ہونے کی اہلیت ہے۔

اگر انگریزی علوم و ادب کی صرف اتنی ہی ضرورت ہے کہ ان کی معلومات و ذخائر کو اردو میں منتقل کیا جائے تو طلبا کی اکثریت انگریزی تعلیم کیوں حاصل کرے اور اگر کرے تو اس کی کیا نوعیت ہونی چاہیئے؟

انگریزی زبان دنیا کی مہذب زبانوں کی صفِ اول میں جگہ رکھتی ہے۔ جدید وسائل نقل و حرکت کی وجہ سے پرانی جغرافیائی حدبندیاں ٹوٹ چکی ہیں اور روز بروز قومیں ایک دوسرے کے قریب تر آ رہی ہیں۔ تجارت، صنعت و حرفت، سفر کی ضروریات سیاسی تعلقات۔ ان سب کی وجہ سے ہمیں ایک ایسی زبان کی ضرورت ہے جس سے ہم دوسرے ممالک سے خط و کتابت کر سکیں۔ باز رشتۂ ارتباط بڑھا سکیں۔ اس سے پہلے بھی انگریزی زبان تمام دنیا میں عموماً سمجھی جاتی تھی لیکن دوسری عالمی جنگ کے بعد اس کا وقار بہت بڑھ گیا ہے اور اس نے عالمی زبان کی حیثیت سے فرانسیسی کی جگہ لے لی ہے۔ دنیا کا کوئی مہذب ملک ایسا نہیں جہاں یہ زبان نہ پڑھائی جاتی ہو۔ سیاسی اور ادبی دونوں لحاظ سے اسے ایک عدیم المثال وقار حاصل ہے۔ چونکہ ہم یہ زبان مدت سے سیکھ رہے ہیں اور اس میں اس کی تعلیم کی بے شمار وسائل اور صلاحیتیں حاصل ہیں۔ لہٰذا اس کا بطور ثانوی زبان کے سیکھنا ہمارے لئے بے حد موزوں ہوگا۔

چونکہ توقع کی جاتی ہے کہ عنقریب ہماری آبادی کا بیشتر حصہ اسے ثانوی زبان کی حیثیت سے حاصل کرے گا، اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے لئے کس قسم کا ادب زیادہ مفید ہوگا۔ میری رائے یہ ہے: چونکہ ان لوگوں کا مطمعِ نظر ادب برائے ادب نہیں ہوگا، بلکہ وہ اسے زندگی کی روزانہ ضرورتوں کے لئے حاصل کریں گے، اس لئے یہی مناسب ہوگا کہ ان کے نصاب میں افادیت کا خاص خیال رکھا جائے۔ انگریزی نثر کے بیشتر انتخاب جو آجکل داخلِ نصاب ہیں ادب کے ارتقائی پہلو کو پیشِ نظر رکھ کر مرتب کئے گئے ہیں اور ان میں جدید ادب کے ساتھ پرانے ادب کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ میں کہوں گا کہ ایسے طلبا کے لئے مجوزہ نصاب صرف جدید ادب تک محدود رکھا جائے یہی نہیں بلکہ ایسے جدید مصنفین جو افادی نقطۂ نظر سے سودمند نہ ہوں، نظر انداز کر دیئے جائیں۔

میرے خیال میں ایسے طلبا کو مطالعۂ نظم کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔ یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ کسی دوسری زبان کے صوتی اثرات، ترنم، نغمگی سے متاثر ہونے کے لئے فطری صلاحیت اور لگاتار کوشش کی ازحد ضرورت ہے۔ شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لئے الفاظ کے معانی کے علاوہ ان کی نوک پلک، مزاج، وضع قطع اور تلازمات سے کامل واقفیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ غیر ملکی تو ایک طرف اہل زبان بھی عام طور پر شاعری سے متاثر ہونے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ ورڈزورتھ لکھتا ہے:

"یہ ایک چونکا دینے والی حقیقت ہے کہ ننانوے میں سے اننچاس افراد میں شاعری سے کیف اندوز ہونے کی صلاحیت نہیں پائی جاتی"۔

اگر خود انگریزوں کا یہ حال ہے تو ہم لوگ کس گنتی میں ہیں؟

مجھے اس بات کا اقرار ہے کہ نظم کے مطالعے کے بغیر انسان کی ذہنی تربیت ادھوری رہ جاتی ہے اور انگریزی شاعری معراجِ کمال تک پہنچ چکی ہے۔ لیکن طلبا کی اکثریت کو غیر ملکی شاعری کے مطالعہ پر مجبور کرنا جب کہ ان میں اس سے تشکیف ہونے کی صلاحیت نہ ہو، نیز اس کے مطالعہ سے کوئی بدیہی فائدہ مرتب نہ ہو بے کار ہے۔

باقی رہا یہ سوال کہ آیا اردو زبان میں فی الوقت اتنی وسعت اور صلاحیت ہے کہ اسے انگریزی کی جگہ ذریعہ تعلیم قرار دیا جائے اس کا جواب صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ جب کسی زبان کو اعلیٰ مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تو اس میں آہستہ آہستہ تمام مطلوبہ صلاحیتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ دنیا میں کوئی زبان خود بخود ترقی نہیں کرتی۔ بلکہ جب اسے اعلیٰ مطالب کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تو اس کی وسعت، گہرائی اور لطافت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

انگریزی کے مخالفین اور ان کی نفسیات کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ اردو کے مخالف بیشتر وہ اساتذہ ہیں جو انگریزی کو بطور ذریعۂ تعلیم استعمال کر رہے ہیں۔ ان کی انگریزی سے شیفتگی صرف ایک عادت ہی کا سوال نہیں بلکہ انسان بالطبع آرام پسند واقع ہوا ہے اور یہ حضرات محسوس کرتے ہیں کہ اگر انگریزی ذریعۂ تعلیم نہ رہی تو انہیں نئے ذریعۂ تعلیم پر دسترس حاصل کرنے کے لئے محنت شاقہ کی ضرورت ہوگی۔ نیز انہیں حفظ مراتب کا بھی خیال ہے۔ "حوادث سن ستاون" کے بعد مسلمان علمائے نے انگریزی تعلیم کی مخالفت اس لئے بھی کی تھی کہ سلسلۂ تعلیم مسجدوں اور خانقاہوں سے نکل کر کالجوں اور مدارس میں جا رہا تھا۔ چنانچہ انہوں نے مذہب کی آڑ لیکر مغربی تعلیم کی تکفیر کی۔ بالکل اسی طرح آجکل کے اساتذہ جو علوم مغربی کی تعلیم انگریزی زبان کے ذریعہ دے رہے ہیں، محسوس کرتے ہیں کہ اگر انگریزی کے وقار میں فرق آگیا تو ان کے ذاتی وقار میں بھی فرق آجائے گا چنانچہ وہ اردو کی کم مائگی پر زور دیتے ہیں اور خواہش مند ہیں کہ پرانا نظام تعلیم قائم رہے۔ سچی بات یہ ہے کہ جو لوگ انگریزی کی مخالفت کرتے ہیں وہ یا تو جذباتی ہیں یا خود غرض یا دونوں۔ اسی طرح وہ لوگ جو اردو کے خلاف ہیں۔ اپنے آرام کو ملکی اور قومی ضروریات پر مقدم خیال کرتے ہیں۔

وہ صورت حال جس سے ہم آجکل دوچار ہیں نئی نہیں ہے۔ بیشتر زبانوں کو انہیں مراحل سے گذرنا پڑا ہے اور ان زبانوں والوں نے قومی ضروریات کے پیش نظر آرام طلبی کی خوشگوار راہوں پر کوشش اور علو ہمت کے کٹھن اور دشوار گذار رستے کو ترجیح دی ہے۔ اورنگ زیب کی وفات سے بیشتر فارسی کو وہی وقار حاصل تھا جو ہمارے ہاں آجکل انگریزی کو ہے۔ خاندان مغلیہ کے زوال کے بعد ہندوستانی علمائے نے محسوس کیا کہ انہیں اردو کو فروغ دینا چاہیئے۔ اس تحریک میں خان آرزو سب سے آگے تھے۔ وہ اور ان کے رفقاء اس مشن میں کامیاب ہوئے چنانچہ فارسی کی جگہ اردو نے لے لی۔ لیکن اردو کو فروغ دینے کا ان کے پاس صرف ایک ہی ذریعہ تھا ———— یہ کہ اردو کو فارسی کی دولت سے مالامال کیا جائے۔ اگر آج ہم اردو کو فروغ دینا چاہتے ہیں تو ہمارا بھی ایسا ہی فیصلہ ہونا چاہیئے یعنی انگریزی علوم کو عرق ریزی اور جانفشانی سے اردو میں منتقل کردیں۔

اس عمل کی بہترین مثالیں آپ کو مغربی نشاۃ الثانیہ کی تاریخ میں ملتی ہیں۔ یہ مثالیں اتنی وقیع ہیں، نیز وہ ہماری موجودہ صورت حال سے اس قدر ملتی جلتی ہیں کہ وہ بلاشبہ ہمارے لئے شمع ہدایت بن سکتی ہیں۔ نشاۃ ثانیہ درحقیقت السنۂ قدیم اور ان کے ادب کی احیاء و ترویج کا دوسرا نام ہے۔ اس احیاء میں جو لوگ آگے تھے انہیں HUMANISTS کہا جاتا ہے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ یورپ کی ورنیکلر زبانیں یونانی اور لاطینی کا مقابلہ نہیں کرسکتیں اور وہ ان قدیم زبانوں سے بالکل اسی طرح مرعوب تھے جیسے آجکل ہم انگریزی سے ہیں۔ آہستہ آہستہ ان علما کے نظریے میں تبدیلی ہونی شروع ہوئی اور انہوں نے عوام کی زبانوں کو اپنی ادبی کاوشوں کا مرکز بنایا۔ یہاں تک کہ انہیں زبانوں میں جن کی کم مائگی زبان زد خلائق تھی، اعلیٰ درجہ کی کتابیں تصنیف ہوئیں اور انہیں بعد میں "کلاسکس" یا ادب عالیہ کا درجہ دیا گیا۔

دیکھئے ذیل کے اقتباسات ہمارے کتنے حسب حال ہیں :-

سپیرونی (SPERONI) لکھتا ہے :-

"زبانیں قدرتی پیداوار نہیں ہوتیں۔ ان کی تشکیل انسان کی اپنی ضروریات اور منشا کے مطابق ہوتی ہے۔ زبانیں درختوں کی طرح نہیں ہوتیں کچھ کمزور اور دوسری توانا۔ جو انسانی افکار کے بوجھ کی متحمل ہوسکیں بلکہ ان سب کی صلاحیتیں استعمال کرنے والوں کی کاوشوں سے صورت پذیر ہوتی ہے۔ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جس میں اظہار خیال کی طاقت خود بخود پیدا ہو جائے۔ اس کا دارومدار اس کے استعمال کرنے والوں کی قوت ارادی اور سعی پیہم پر ہوتا ہے۔"

(باقی صفحہ ۳۸ پر)

واقعۂ کربلا اور ہمارا علاقائی ادب

ضیاء الحسن موسوی

بزم ترا شمع و گل خستگیٔ بوتراب
سازِ ترا زیر و بم واقعۂ کربلا (غالبؔ)

ہمارا علاقائی ادب ہماری مذہبی اور ثقافتی زندگی سے فطری طور پر مربوط ہے۔ ہمارا وطن بظاہر مختلف علاقوں میں رہنے بسنے والوں، مختلف بولیاں بولنے والوں کا مجموعہ ہے مگر یہ اختلاف ویسا ہی ہے جیسے ایک نظم کے مختلف اشعار میں ہوتا ہے۔ ہر شعر کا مطلب اپنی جگہ الگ مگر ہر شعر کا وزن و قافیہ و آہنگ ایک۔ ایک ہی مرکزی خیال سب اشعار کو مربوط کرکے نظم کی شکل دیتا ہے۔ یہی مرکزی خیال ہمارا وطن ہے جو ہمارے ہر علاقے میں مشترک ہے۔

ہماری قومی روایات میں قربانی کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور ہر زندہ قوم کی گرمیٔ حیات میں یہی عنصر سب سے اہم ہے۔ قربانی کے لئے جتنی بلند مثالیں جس قوم میں ہوتی ہیں اُتنا ہی اس کا اجتماعی جذبۂ فدویت بھی ہوتا ہے۔

استقلالِ پاکستان کی صد سالہ تحریک میں، جس کو غیروں کی لکھی ہوئی تاریخیں مختلف ناموں سے یاد کرتی ہیں، مسلمانانِ برصغیر نے بے شمار قربانیاں دی ہیں اور ان قربانیوں سے وہ اخلاقی طور پر ضرور فاتح ہوکر نکلتے رہے ہیں تاآنکہ ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کو انہوں نے اخلاقی اور مادی کشمکش کا آخری مورچہ بھی فتح کرلیا اور اپنی قومیت اور روایات کے تحفظ کے لئے ایک عظیم وطن حاصل کیا۔ یہی ان کی مختلف تحریکوں کا مقصد تھا۔

آزادی کے بعد زندگی کے دوسرے پہلوؤں کی از سرِ نو تنظیم و ترتیب کے ساتھ ہم کو اپنے ادبی ورثہ کی بھی تنظیم و ترتیب کرنی تھی اور اسی شعور کا نتیجہ ہے کہ ہم اپنے علاقائی ادب کو جگر لختِ لخت کی طرح جمع کر رہے ہیں اور اُس کے مختلف رجحانات کا جائزہ لے رہے ہیں۔ ابھی یہ کام بالکل ابتدائی منزل میں ہے اب تک تو ہمارے اہلِ قلم ناقدری اور ناموافق حالات ہی سے دوچار تھے مگر اب اس نئے دور میں پاکستانی اہلِ قلم کے وجود اور مستقبلِ آزادی اور خودداری کی ضمانت مل گئی ہے اور اب ہم اپنے سرمائے کی طرف خود اعتمادی سے متوجہ ہو رہے ہیں۔

ہماری قومی روایاتِ فدویت و قربانی میں معرکۂ کربلا "سجدہ گہ عزم و یقیں" کی حیثیت رکھتا ہے اور بقول اقبالؔ "مقامِ شبیری" حقیقتِ ابدی ہے، اور ادب ہمیشہ ابدی حقائق سے بھرپور تاثر حاصل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے علاقائی اور قومی ادب میں اس واقعہ کے تاثرات عام ہیں۔ ان تاثرات کے جائزے کے لئے وسیع مطالعے اور چھان بین کی ضرورت ہے۔ سردست ان تاثرات کی چند جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں اور اس توقع کے ساتھ کہ دوسرے اہلِ قلم ان ادھورے خاکوں میں رنگ بھریں گے اور ان کو زیادہ بھرپور اور جاذبِ نظر بنانے کی کوشش کریں گے۔

پشتو ادب

پشتو ادب تمام کا تمام شجاعت اور بہادری کے جذبات سے لبریز ہے۔ ۵۰۰ھ کے بعد سے پشتو شاعری نے فارسی شاعری کے اثرات قبول کئے اور عارفانہ شاعری کا آغاز ہوا۔ پشتو کی سب سے پہلی دریافت شدہ کتاب "تذکرۃ الاولیاء" ہے۔ یہ ۶۱۲ھ (۱۲۰۰ء) میں سلیمان ماکو نے لکھی جو قندھار کا رہنے والا تھا۔ ملا نور المشائخ مرحوم کے قول کے مطابق اس میں ایک پورا باب امام حسن اور امام حسین کی شہادت سے متعلق تھا۔ یہ کتاب نایاب ہے اور اس کے چند ہی اوراق مورخینِ ادب کے ہاتھ آسکے ہیں۔

پشتو کا مشہور شاعر، خوشحال خاں خٹک، اپنے ایک قصیدہ میں لکھتا ہے:

پہ یزید باندې لعنت شه په اعوان ئې — چه په تیغ ئې د نبي نسې مظلوم دے

پشتو غزل اگرچہ ایرانی غزل سے متاثر نظر آتی ہے لیکن اس میں "جمال وجلال" کا توازن ہے اور تصوف کے ذوق نے اس کو سوز وساز بھی عطا کیا ہے اور قبائلی زندگی کے مردانہ صفات نے اس کو حماست اور رجز کا انداز بھی بخشا ہے۔

پٹھانوں کی زندگی میں غیرت، شجاعت، سرفروشی، جانبازی، ایفائے عہد اور قربانی کے جذبات کو بڑی اہمیت حاصل ہے چنانچہ پشتو ادب میں واقعۂ کربلا کے اشارات فطری ہیں اس لئے کہ تاریخ اسلام کا یہ واقعہ صدیوں سے مسلمانوں کے جذباتِ فدویت وقربانی اور شجاعت و وفائے عہد کے لئے ایک جاودانی محرک کی حیثیت رکھتا ہے۔

پشتو کے نوحے اور مرثیے بھی عربی مزاق کی طرح صفاتِ شجاعت وعزم ومہماں نوازی، بلندی نسب اور مثالی روایات کی یاد سے بھرپور ہیں گویا بقول جوش ملیح آبادی ؎

آنکھ میں آنسو ہو، سینے میں شرارِ زندگی
شعلۂ آتش بھی ہو بہتے ہوئے پانی کے ساتھ

بنگال میں تیرھویں صدی عیسوی میں جب پٹھانوں کی حکومت قائم ہوئی اور پٹھان حکمرانوں کے زیر اثر جو بنگلہ ادب پروان چڑھا، اس میں اسلامیات کا عنصر نمایاں تھا۔ اس دور کی ایک کتاب "مقتل حسین" کا تذکرہ بنگالی ادب کے سلسلہ میں آیا ہے۔ اس ادب سے بھی پٹھانوں کے رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔

اب پشتو کے نئے ادب میں بھی پاکستانی قومیت کے واضح نقوش نظر آنے لگے ہیں اور اپنی روایات پر نازاں ہونے کے ساتھ ساتھ پشتو ادیب کو اس کا پورا احساس ہو چکا ہے کہ وہ ایک عظیم وطن کا باشندہ اور عظیم افتخار کا حامل ہے اور اس کے ماضی کا سلسلہ ایک "حال" تک پہنچتا ہے اور یہ حال عظیم ماضی کے مطابق ہونا چاہیئے۔

سمندر خاں بدرشی کا ترانہ زۀ اوس آزاد او په عمل لکه فولادیم - مومن همه جا دیم ....:" میں اب آزاد ہوں، آباد ہوں اور شاد ہوں، اپنی سرزمین پہ قربان ہوں اور سر مال کی بازی لگا چکا ہوں۔ میں مسلمان ہوں، پاکستان میرا وطن ہے۔ وطن کیا گویا چمن ہے جو لہلہا رہا ہے میں سعی وعمل میں مانند فولاد ہوں۔ میں مومن ہوں اور سخی ہوں" ان نئے رجحانات کا مظہر ہے۔

پشتو کے نئے ادب میں تقی شراب ہاشمی کے ایک مرثیے کے دو بند ملاحظہ ہوں جس کا عنوان ہے: "ذکر بلا نند اره"

غرمه ده، خوره دشته ده، سیلی طوفانونه
پېه قاد سپېنو تورو، تورے لمبے، خوګر دونه
لختی لختی په زړګې، دسر وینو قطار دنه
سینے سوري سوري، د تیرو غشو بارونه
صحرا د کربلا په سرو وینو لاله زار وه
فضا کښې سر کړ دانه قافله د خر غبار وه
یو خوا په وینو رنګ ایخ مخلے علی اکبر وه
بل خوا په ګرم رنګ پروت ماشوم علی اصغر وه
بے یاره مددګار پاتے نمسے د پېغمبر وه
نری نری کړ دونه هسکید لو، ماتېګر وه
خپل سر ئے هم آخر کښې د اسلام په نامه زار کړو
چمن ئې د توحید په خپلو وینو لاله زار کړو

سیلی طوفان، دشمنوں کی قطاروں، تیروں کی بارش، خونِ شہداء سے صحرائے کربلا کی لالہ زاری اور سردار قبیلۂ آلِ محمدؐ کے خون سے فضا کی غبار آلودگی، اکبر و اصغر کی شہادت، نواسۂ رسول کی تنہائی، ان سب مصائب کا مقصد وہی تھا جسے اقبال نے اپنے الفاظ میں یوں ادا کیا ہے کہ ؎

نقشِ الّا اللہ بر صحرا نوشت　　　سطرِ عنوانِ نجاتِ ما نوشت

بنگالی ادب

۱۲۰۰ء کے بعد سے بنگال مسلسل مسلمان حکمرانوں کے زیرِ نگیں رہا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ بنگلہ زبان نے ادبی حیثیت اختیار کی اور اس میں ایک ثقافتی روایت پیدا ہوئی جس میں اسلامی اثرات بہت نمایاں ہیں بلکہ مسلمان مصنفین کی عہد بہ عہد تصانیف سراسر اسلامی خصوصیات رکھتی ہیں۔ بنگالی زبان کا بیشتر سرمایہ مسلمان شاعروں، عالموں، صوفیوں اور حکمرانوں کی کاوش کا نتیجہ ہے۔

واقعۂ کربلا کے متعلق بنگالی ادب میں سب سے پہلی چیز ہم کو سولھویں صدی کے مسلمان شاعر شیخ فیض اللہ کی "جینبیر چوتیشا" (۳۴ حرفی مرثیۂ حضرت زینب) نظر آتی ہے جس کے متعلق ڈاکٹر انعام الحق "مسلم بنگالی ادب" میں لکھتے ہیں:۔

"مرثیے":۔ سولھویں صدی میں بنگالی میں حزنیہ موضوع پر قصے کہانیاں لکھنے کا رواج نہ تھا۔ لیکن بقول ایک انگریز شاعر کے ہمارے سب سے میٹھے گیت وہی ہیں جن میں زیادہ سے زیادہ حزن وملال کے خیالات ہوں چنانچہ بنگالی ادب کے اس دور میں مسلمان شاعر شیخ فیض اللہ نے حضرت زینب پر "چوتیشا" لکھ کر بنگالی ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔

چوتیشا جسے ۳۴ حرفی کہنا چاہئے بنگالی نظموں کی ایک بہت قدیم صنف ہے۔۔ سنسکرت سے یہ صنف بنگالی ادب میں منتقل ہوئی اور یہاں شیخ فیض اللہ نے اس کو ایک نئی شکل میں پیش کیا۔ شیخ نے واقعۂ کربلا کے بعد حضرت زینب کا نوحہ نظم کیا ہے۔ اس نوحے کے بعد پھر "ضریح" گیتوں اور دوسری نظموں مثلاً "مقتل حسین" کا رواج شروع ہوا۔" (ص ۱۲۸-۱۲۹)

یہ بھی ایک حسنِ اتفاق ہے کہ شہادت امام حسینؑ کے بعد سب سے پہلا نوحہ یا مرثیہ جناب زینب ہی کا ملتا ہے اور بنگالی ادب میں بھی صنف مرثیہ کا آغاز اسی کے ترجمے سے ہوا ہے۔

اس طرح بنگالی ادب میں "چوتیشا" مرثیے کی شکل میں ظاہر ہوا، پھر کربلا کے متعلق عوامی گیت "ضریح" کہلائے۔ یہ غالباً ویسے ہی ہونگے جیسے اودھ کے دیہاتوں میں "دَھے" ہوتے ہیں اور پھر مرثیے کی ایک اور شکل کا نام "مقتل حسین" ہوا۔

یوں تو بنگلہ زبان دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے مگر چند پوتھیاں عربی رسم الخط میں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً جنگ نامہ حضرت علیؓ اور محمد خاں کی مشہور تصنیف "مقتلِ حسین"۔

"مقتل حسین" ایک طویل نظم ہے اور محمد خاں کی سب سے ضخیم کتاب ہے۔ چند سال قبل کلکتہ میں "بڑتلہ" سے شائع کی گئی تھی مگر اب کمیاب ہے۔ محرم کے مہینے میں یہ کتاب جگہ جگہ گھروں میں اور باہر لوگ بلند آواز سے پڑھتے ہیں۔ یہ کتاب تاریخی نوعیت کی ہے لیکن اس کی بڑی خوبی شاعرانہ بلند خیالی ہے۔

ڈاکٹر انعام الحق کا خیال ہے کہ محمد خاں نے یہ کتاب "مہابھارت" کے جواب میں لکھی تھی۔ ہندوؤں کی کتابیں مسلمانوں میں عام تھیں سید سلطان نے اپنے شاگرد محمد خاں کو ہدایت کی کہ وہ تاریخ اسلام سے ایسی نظمیں تیار کریں جو مسلمانوں میں مقبول ہوں، وہ اپنے ماضی کی عظمت سے آگاہ ہوں اور ہندوانہ خیالی قصوں کی جگہ حقیقی بہادری اور جرأت و مردانگی اور مقابلۂ حق و باطل کی داستانوں سے سبق اندوز ہوں۔

ڈاکٹر انعام الحق کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ محمد خاں نے "قاسمیر لڑائی" یعنی حضرت قاسم کی جنگ" کے نام سے بھی ایک مرثیہ تصنیف کیا تھا۔ سترھویں صدی کے ایک شاعر، فقیر غریب اللہ نے بھی "مقتل حسین" لکھی تھی جو نامکمل رہی۔ اس کو ایک اور شاعر، محمد یعقوب نے مکمل کیا۔ محمد یعقوب چوبیس پرگنہ کے باشندے تھے۔ کتاب کی تکمیل کی تاریخ ۱۶۹۴ء ہے۔ یہ جنگ نامہ بھی ایک ضخیم کتاب ہے۔

عہدِ مغلیہ کے آخری شاعر "حیات محمود" نے جو ضلع رنگپور کے تھے، ۱۷۲۳ء میں "جنگ نامہ" یا "محرم تہوار" کے نام سے ایک طویل مرثیہ تصنیف کیا ہے جو حضرت جبرئیل کی زبان سے بیان کیا گیا ہے اور حسنینؑ کی شہادت کے مکمل واقعات نہایت مؤثر انداز سے بیان کئے گئے ہیں۔

چاٹگام کے رہنے والے ایک اور شاعر حمید اللہ خاں (۱۸۷۰ - ۱۸۰۸ء) کو عبوری دور کا بہترین شاعر کہا جاتا ہے۔ ان کی ایک نظم "گلزارِ شہادت" ہے۔ یہ اُس عہد کا کارنامہ ہے جب بنگالی ادب کے میدان پر غیر مسلم ادیب و شاعر چھا رہے تھے۔

نذر الاسلام کی شاعری کو واقعۂ کربلا سے ایک خاص تعلق ہے کیونکہ اس کی ابتدا اسی سرزمین میں ہوئی۔ قاضی نذر الاسلام "شط العرب" کے قریب ایک خندق میں بیٹھے تھے، پہلی جنگِ عظیم کی ایک رات تھی، اس ماحول میں ان کی شاعرانہ طبیعت پر الہامی کیفیت طاری ہوئی اور انہوں نے اپنی پہلی نظم "شاتی العرب" تخلیق کی اور ان کی شاعری پر واقعۂ کربلا کے تاثرات اس طرح چھاگئے کہ اس مجاہدۂ حق کی مصطلحات جا بجا اُن کی نظموں میں جھلکنے لگے۔ وہ اپنی نظم "مجاہد کی صدا" میں کہتے ہیں :-

"نئی زندگی فرات کے دھارے کی طرح بہہ رہی ہے
لیکن اُس کا ساحل قربانی کا پیاسا ہے
ظلم وستم کی فوجیں موج در موج چڑھی آتی ہیں
اور میں عباسؓ کی طرح اس دریا کو اپنی تشنہ لبی کا پیغام سنانے جارہا ہوں ...."

سندھی ادب

"وادیٔ مہران" یا "وادیٔ سندھ" قدیم ترین تہذیبوں کا گہوارہ رہی ہے برصغیر کا یہی وہ خطہ تھا جہاں سب سے پہلے اسلام کا پیام پہنچا اور تقریباً ساڑھے سترہ سو سال کے بعد یہ خطہ بھی دنیا کی پانچویں بڑی اور سب سے بڑی مسلم مملکت کا جزو بن گیا۔ ابتدائے عہدِ اسلام ہی سے سندھ کے باشندے علومِ اسلامی کی تشنگی میں حجاز و عراق و ایران پہنچنے لگے اور وہاں سے یہ تاثرات لاکے شمالی برصغیر میں پھیلانے لگے۔ سندھ کے ادب میں سچل سرمست اور شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے نام سے کون واقف نہیں؟

سندھ کے مشہور شاعر سید ثابت علی شاہ میاں غلام شاہ کلہوڑہ کے دورِ حکومت میں ۱۷۴۰ م ۱۱۵۵ھ میں پیدا ہوئے۔ وہ شہزادہ میاں سرفراز خاں کے ہم عصر شاعر تھے۔ اسی زمانے میں میاں مسکین پنجابی کی مرثیہ گوئی کا شہرہ تھا جن کا ذکر سودا نے بھی کیا ہے۔ خود شاہ صاحب سندھی میں بڑے پائے کے مرثیے کہتے تھے۔ ایک مرثیے میں انہوں نے ذکر کیا ہے کہ ہند میں مسکین اور سندھ میں میں نے مرثیے کہے ہیں۔ ثابت علی شاہ میر انیس (ولادت ۱۲۱۶ھ) اور میرزا دبیر (ولادت ۱۲۱۸ھ) سے پہلے اور میر ضمیر اور میر حسن کے ہم عصر تھے۔

سندھ کے آخری تاجدار ہز ہائی نس میر محمد محسن علی خاں جب قید ہو کے کلکتے گئے تو وہاں انہوں نے مراثی انیس و دبیر سُنے اور جب رہا ہو کر واپس آئے تو اپنے استاد مرزا فتح علی بیگ کے مشورہ سے سندھی میں اس طرز کے مرثیے تصنیف کرنے لگے۔ انہوں نے انیس و دبیر کے مراثی کا سندھی میں ترجمہ بھی کیا۔ ان کے علاوہ مرزا مراد علی بیگ سائل، آخوند محمد عالم، مرزا فتح علی بیگ، مرزا بدھل بیگ، مرزا قلیچ بیگ، اور خواجہ ناصر علی ناصر نے بھی مراثی انیس و دبیر کے ترجمے کئے ہیں۔

شاہ عبداللطیف نے اپنی نظموں کے لئے ایک خاص مرثیہ[1] ایجاد کیا تھا۔

شاہ صاحب نے واقعاتِ کربلا پر ایک طویل مرثیہ لکھا ہے جس کے منتخب اشعار کا رئیس امروہوی نے اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے اور وہ "تحفۂ لطیف" شائع کردہ محکمہ اطلاعات مغربی پاکستان میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ عجیب و غریب مرثیہ ہے جو ترجیع بند بھی ہے اور جس میں "محرم آگیا امت کے شہزادے نہیں آئے" کی ہر بند کے بعد تکرار ہے اس میں جا بجا نوحے بھی ہیں، جس طرح اردو کے طویل قصائد کے درمیان غزل آجاتی ہے۔

اس مرثیے میں ایسے زندہ اور حرکت میں لانے والے مضامین ہیں کہ اس کو شاہ عبداللطیفؒ کا شاہکار کہا جاسکتا ہے۔ اندازہ کے لئے جستہ جستہ اشعار ملاحظہ ہوں:

حسینی قافلہ صحرا کی جن راہوں سے گزرا تھا ۔۔۔ وہ راہیں آج تک اس قافلہ کو یاد کرتی ہیں

---

[1] ملاحظہ ہو مضمون بعنوان "مرثیہ حسینی" ماہِ نو اگست ۱۹۵۸ء (مدیر)

شہادت کیا ہے اک ورثہ محمد کے گھرانے کا — کوئی شکوہ نہ تھا مولا کو اعدا کے ستانے کا
شہیدِ عشق ہی واقف ہے اسرارِ شہادت سے — وگرنہ کس کو آتا ہے سلیقہ سر کٹانے کا
مدینے سے چلے تھے امتحاں گاہِ مصائب کو — جہاد فی سبیل اللہ کی دھن میں خدا والے
مصائب تھے مگر حضرت نے ماتھے پہ نہ بل ڈالا — شجاعت سے نظامِ زندگی سارا بدل ڈالا
شکستِ ظاہری فتحِ مبینِ عشق ہوتی ہے — حسینی فوج نے باطل کی قوت کو کچل ڈالا
حسینؓ اللہ اکبر اے حسینؓ اے کربلا والے — سبق لیں تجھ سے ایثار و شجاعت کا وفا والے

نوحہ کے اشعار ملاحظہ ہوں:

اٹھو غم رسیدوں کا ماتم کرو — خدارا شہیدوں کا ماتم کرو
اٹھو فخرِ امت کا ماتم کرو — قتیلِ صداقت کا ماتم کرو

پنجابی ادب پنجابی ادب عہدِ نو سے پہلے پنجاب کے ہرے بھرے دیہات کا ادب تھا اور زمانۂ ماقبلِ اسلام کی عربی شاعری کی طرح سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا۔ اس میں داستانیں بھی تھیں اور تانیں بھی، چھوٹے چھوٹے رسیلے اور دلسوز گیت بھی اور ماہیے جیسے متنوع اور رسیلے گانے بھی۔

مسلم پنجاب نے عربی فارسی اور اردو کو اس طرح اپنایا کہ اس میں اہلِ زبان کے درجے کے افراد پیدا ہوئے، خصوصاً اردو پر ان کے احسانات کو احسان فراموش بھی نظرانداز نہیں کر سکتے، اس لئے مسلم پنجاب کا زیادہ مکتوبی ادب فارسی اور اردو میں ہے پھر بھی پنجابی عوامی ادب میں ان کے بعض عظیم کارنامے ہیں۔ پنجابی کی مختلف منظوم داستان ہائے حسن و عشق کے آغاز میں واقعۂ کربلا کا تذکرہ ہے مثلاً:

حضرت حسن حسین دی ذات علیٰ شیر خدا دے شیر دونویں
لختِ جگر رسول بتول جائے عاشق رب دے مرد دلیر دونویں
جنہاں کدی سوال نہ رد کیتا وکے راہ مولیٰ کئی دیر دونویں
منزلِ عشق دی جنہاں ثبوت کیتی مڑے ذرہ ناہیں قدم پھیر دونویں

(ہیر وارث شاہ)

پنجابی کے نوحے اور مرثیے جو منتشر ہیں اگر یکجا ہو جائیں تو معلوم ہو گا کہ پنجاب نے صرف "میاں مسکین" ہی نہیں پیدا کیا بلکہ اور بھی صدہا عاشقانِ اہلبیت پیدا کئے ہیں اور پنجابی میں ایسے سخن پارے ہیں جو فنی اعتبار سے بھی اور سوز و اثر کے اعتبار سے بھی پاکستان کے علاقائی ادب میں نہایت قیمتی ورثہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بلوچی اور مکرانی ادب بلوچی زبان جو شمالی اور شمال مشرقی علاقے میں بولی جاتی ہے اس کو "سلیمانی" کہتے ہیں اور جنوب مشرق اور مشرقی علاقے کی زبان مکرانی کہلاتی ہے۔ بلوچی زبان جدید فارسی سے بہت مشابہ ہے اور پاکستانی اور ایرانی ثقافت کی ایک درمیانی کڑی سمجھی جاتی ہے۔ پھر بھی بلوچی زبان فارسی کی شاخ نہیں بلکہ ایک مستقل زبان ہے۔

بلوچی ادب بھی زیادہ تر سینہ بسینہ روایات کے سہارے زندہ ہے اور اپنے ماحول کی ترجمانی کرتا ہے۔ بلوچی شاعری میں مذہبی شاعری کا بڑا حصہ ہے اور اس میں بکثرت نوحے اور مرثیے موجود ہیں اس کی اکثر نظموں میں جابجا واقعۂ کربلا کی تشبیہیں، اشارات اور استعارات پائے جاتے ہیں۔

بلوچی ادب کے متعلق ابھی بہت کچھ کام ہونا ہے۔ جب یہ ذخیرہ مرتب ہو جائے گا اسی وقت اس کا تنقیدی جائزہ ممکن ہو سکے گا۔
مشرقِ وسطیٰ کے ایک سفر کے دوران کوئٹہ میں ایک بلوچی مرثیہ گو نے، جو فارسی سے بھی واقف تھا، مجھے بلوچی کے چند مرثیے سنائے تھے جن سے اندازہ ہوا کہ ان مراثی پر فارسی مراثی کا کافی اثر ہے۔ مگر یہ اسلوب کی حد تک ہے، مضامین میں مشرقِ اسلامی کی جاگتی ہوئی روح

آزادی کی گھن گرج واضح طور سے سنائی دیتی ہے۔

کشمیری ادب

کشمیری ادب بھی تصوف کے سرچشموں سے سیراب ہوا ہے اور کشمیر میں مسلمانوں کی دینی اور ثقافتی زندگی شہید کربلا کی نسل کے مبلغین، اہل علم وعرفان اور ان سے فیض یافتہ علماء کی مساعی کی احسان مند ہے۔

کشمیری ادب میں نوحوں اور مرثیوں کی کثرت ہے اور کشمیری مرثیہ ادب کی ایک اعلیٰ صنف ہے۔ اس موضوع پر اب تک بہت کم لکھا گیا ہے پھر بھی سید رضا ہمدانی نے اپنے مضامین میں کشمیری مرثیے کی جھلکیاں پیش کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

کشمیری ادب میں صنف مرثیہ بڑی مالا مال صنف ہے اگرچہ موضوع کے اعتبار سے یہ بڑی محدود ہے یعنی صرف واقعات کربلا، شہادت حسین، اور مصائب اہلبیت پر مشتمل منظوم کلام ہے، لیکن اس کے باوجود ادب کے تمام اصناف کا احاطہ کرتا ہے۔ کشمیری مرثیہ فن کی کسوٹی پر کسا جائے تو زرِ خالص سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ کشمیری مرثیہ تکنیک کے لحاظ سے اردو یا فارسی مرثیوں سے قطعاً جداگانہ نوعیت کا حامل ہے۔ اسی طرح کشمیری نظم تکنیک کے اعتبار سے فارسی یا اردو نظم سے یکسر جدا ہے، کشمیری مرثیے کے لئے لازمی ہے کہ وہ کسی عنوان کے تحت لکھا جائے۔ شاعر مرثیہ تصنیف کرنے سے پہلے عنوان تجویز کرے۔ عنوان شاعر کی اپنی پسند اور رجحان پر منحصر ہے مثلاً مرثیہ نگار نے "قفس" عنوان پسند کیا تو اب اسی عنوان کی رعایت سے سارے کا سارا مرثیہ مرتب ہونا چاہیئے۔ آغاز سے اختتام تک کہیں بھی تلازمے اور رعایت کا دامن نہیں چھوٹنا چاہیئے۔

کشمیری مرثیہ بالعموم طویل ہوتا ہے اور طویل نظم کی طرح اس میں مختلف بند ہوتے ہیں۔ ہر بند کو "چھیڑ" کہتے ہیں جس کے پہلے دو شعر الگ الگ قافیوں میں ہوتے ہیں پھر دو مصرعے الگ پھر دو چار یا چھ مصرعے الگ قافیوں میں آخری مصرع پھر ایک الگ قافیے میں ہوتا ہے۔ یہ التزام دوسرے بندوں میں بھی ہوتا ہے اور جو قافیہ ردیف پہلے بند میں اختیار کیا جاتا ہے وہی مرثیے کے آخری بند تک قائم رہتا ہے۔

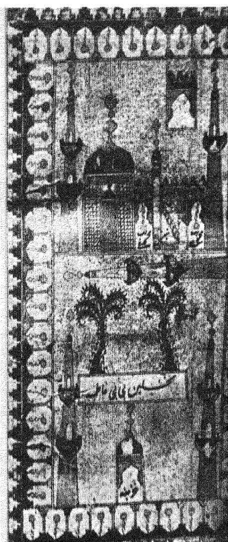
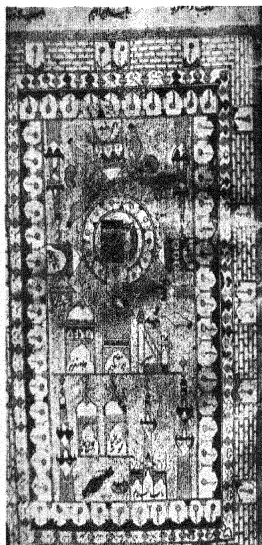
کشمیری مرثیے کا پہلا بند یا چہرہ حمد باری پر مشتمل ہوتا ہے، دوسرا نعت سرور کائنات اور منقبت امیرالمومنین علی پر۔ اس کے بعد گریز کے بند ہوتے ہیں اور پھر غیر محدود بند مصائب اور واقعات کربلا پر۔

دوسری زبانوں کے مراثی کی طرح کشمیری مرثیہ بھی اگرچہ رونے رلانے کے لئے کہا جاتا ہے تاہم اس کے چہرے میں علمی، ادبی، فقہی اور تاریخی واقعات ومسائل اور اخلاقی تعلیمات کا ذکر ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کی تعلیمی افادیت بھی مسلم ہے۔ کشمیری مرثیے کے چند عنوانات ملاحظہ ہوں: عرش، پیدائش، قفس، زینہ، عطش، دماغ اور آئینہ، نصرت، مرغ، کعبہ، چہار فصل، ماہ وسال، قرآن، عرش، اصول دین فہم، انگشتری، کیمیا، کاغذگری، حکمت، میراث، سفینہ، حج، ماہ صیام وغیرہ۔

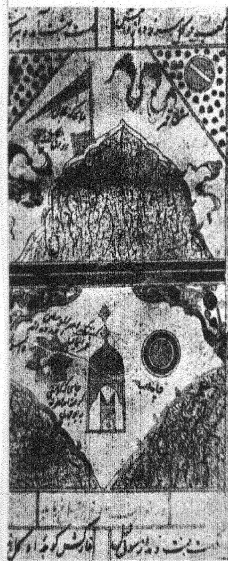
کشمیری مرثیہ گو بڑے عالم و فاضل و زاہد و عابد گزرے ہیں۔ بعض کو کشمیر میں "ولی" کا درجہ حاصل ہے قدیم مرثیہ نگاروں میں مرزا ابوالقاسم، یوسف بابا، حبیب ملا، منشی صفدر علی، حکیم حسن، منشی صادق علی خواجہ دویم حنفی، مولوی عبداللہ اسد، رضا شاہ، عظیم اور رحیم کافی شہرت کے مالک ہیں۔

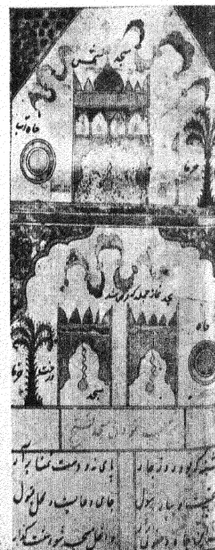
کشمیری مرثیہ خوانی کا طریقہ بھی کشمیریوں کی اپنی ایجاد ہے۔ امام باڑے میں آٹھ یا دس افراد دائرہ کی شکل میں بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ دائرہ "پس خوان" کہلاتا ہے۔ دائرے سے بہت سے بھی ہوتے ہیں "ذاکر" جیسے ہی مرثیہ شروع کرتا ہے پس خوان اس کو دہراتے ہیں اور ہم نوائی کرتے ہیں۔ کشمیری مرثیہ خوانی کی طرز، لے اور دھن بڑی خیبر پر ہوتی ہے۔ کشمیر کے علاوہ لاہور، پشاور، کراچی وغیرہ میں بھی ایسی کشمیری مجالس ہوتی ہیں۔

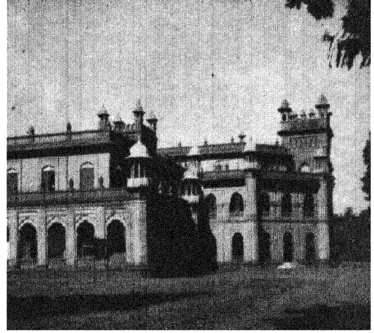
یہ تھیں پاکستانی علاقائی ادب کے ایک خاص موضوع کی چند جھلکیاں۔ وہ ادب جو اب از سر نو اپنی روایات کے مطابق آراستہ ہو رہا ہے اور جس میں ہر روز نئی نئی اور زندگی آموز آوازیں شریک ہو رہی ہیں۔ وہ آوازیں جو مل کے ایک وطن عظیم کی عظمت کا ترانہ بن جاتی ہیں۔ ان آوازوں کے لئے معرکۂ کربلا ہو یا ایسے ہی دوسرے حق و باطل کے معرکے، ہمیشہ نئے نئے گوشے، نیا اعتماد، نئی قوت اور نیا تاثر فراہم کرتے رہیں گے۔ اس لئے کہ معرکۂ کربلا کا سب سے بڑا پیام یہ ہے: "ذلت کی زندگی سے عزت کی موت اچھی" اور پاکستان کی آزاد فضا جو صدیوں کی قربانی کا حاصل ہے، عزت کی زندگی کا ماحول ہے اور اس کو برقرار رکھنے کا پہلا فرض ادیبوں ہی کا ہے ۔

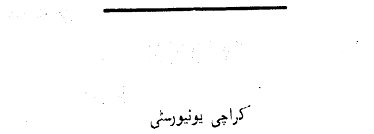

"فتوح الحرمین"
(دور مغلیہ کا ایک نادر مخطوطہ)







ڈھاکہ یونیورسٹی



پاکستان کی دانش گاہیں

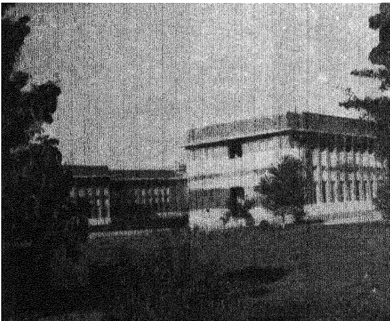
کراچی یونیورسٹی





پنجاب یونیورسٹی

پشاور یونیورسٹی



"فتوح الحرمین"

(عہدِ مغلیہ کا ایک نادر مخطوطہ)

لفٹننٹ کرنل خواجہ عبد الرشید

فریضۂ حج ہمیں بار بار اُس عہد اور اُن مقامات کی یاد دلاتا ہے جن سے اس کا آغاز ہوا تھا اور ہم بصد شوق یہ پکار اٹھتے ہیں کہ ؎

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایّام تو

اس سلسلہ میں ہماری نظر فارسی کی ایک مثنوی "فتوح الحرمین" پر پڑتی ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کا تعلق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد سے ہے اور اس میں حرمین شریفین اور ان کے مضافات کے اہم مقامات کا تذکرہ ایک خاص انداز میں کیا گیا ہے۔

یہ کتاب ایک فارسی مثنوی کے چھوٹے سے مسودے پر مشتمل ہے جس میں ۱۱۰۰ کے لگ بھگ اشعار ہیں۔ حرمین اور ان کے مضافات وغیرہ کی کیفیت بیان کرنے کے علاوہ اس میں احکامِ حج کی بجاآوری کی مفصل کیفیت بھی درج ہے۔

یہ کتاب گزشتہ صدی کے اواخر میں دہلی میں شائع ہوئی تھی۔ اور اب آسانی سے دستیاب نہیں ہوتی۔ گو اس کے کئی نسخے مختلف لائبریریوں یا ذاتی کتب خانوں میں ضرور پائے جاتے ہیں۔ میرے پاس جو مخطوطہ ہے وہ کئی وجہ سے خاص دلچسپی کا حامل ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ خاص مدینۂ منورہ میں لکھا گیا اور اس سے رسول کریمؐ اور خلفائے راشدین کے عہد مبارک کے تاریخی مقامات کے سنہرے اور نیلے رنگوں میں سترہ نقوش ہیں۔ یہ نقوش دو ابعادی ہیں۔ مصنف کا نام محی لاری ہے جیسا کہ مثنوی کے دو آخری ابیات سے ظاہر ہے ؎

محی ازاں ہر دو طلب کامِ خویش	محو کن از لوحِ کساں نامِ خویش
گرم شد از سعیِ تو بازارِ حج	ختم بنظمِ تو شد اسرارِ حج

یہ بات کہ مثنوی مدینہ میں لکھی گئی، کاتب کے ان الفاظ سے ظاہر ہے:

"تحریر یافت در مدینۂ منورہ"

یہ بات اس مخطوطہ میں اور بھی دلچسپی پیدا کر دیتی ہے کہ اس صفحہ پر مشہور ایرانی شاعر حکیم محمد آتشی کا نام درج ہے جو سلطان عادل شاہ ۹۴۱ تا ۹۶۵ھ کا درباری شاعر تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آتشی کوئی اور کاتب ہو جس نے مثنوی کی کتابت میں حصہ لیا۔ آتشی کے نام کے بعد فوراً ہی مصنف کا نام اس طرح آتا ہے:

الفقیر آتشی

از تصنیف محی علیہ رحمۃ

ایک اور بات جو اس نسخہ کی دلچسپی کو اور بھی بڑھا دیتی ہے یہ ہے کہ یہ دراصل مشہور ایرانی شاعر طالب ہمدانی کی ملکیت تھا جس نے وصلی پر اپنے ہاتھ سے یہ اشعار تحریر کئے ہیں ؎

بعرب تا م کہ با من .....
لطف او با منِ دلخستہ نگاہِ غضبیست
مردمان منع کنندم کہ مدہ دل بعرب
با عرب چوں ندہم دل محمدؐ عربیست

ان اشعار کے بعد طالب ہمدانی کے ہاتھ سے یہ الفاظ بطور تکملہ درج ہیں مگر تاریخ تحریر درج نہیں :

این رباعی بجہت یادگاری مشفق مرزای میرک حسین . . . .

فقیر حقیر طالب ہمہ . . . .

اسی عبارت کے نیچے مشہور خطاط، محمد صالح مشکیں قلم ولد میر عبداللہ زریں رقم کے ہاتھ سے چند الفاظ تحریر ہیں جو عبدالرحمن رشیدی کے ملازمت سے سبکدوش ہونے پر شاہی خطاطی اور مہتمم کتب خانہ کے عہدہ پر فائز ہوا تھا[1]

اسی جگہ تمت میں محمد صالح نے مخطوطہ کے کاتب کا نام رسول محمد خاں بیان لکھا ہے۔ اس عبارت پر ۲۴۔ جمادی الاول، سال جلوس ۳۲ شاہجہانی مطابق ۱۰۷۰ھ تحریر ہے۔

میرا خیال ہے کہ یہ نسخہ اس وقت سے کہیں پہلے طالب ہمدانی کی ملکیت رہا ہوگا کیونکہ یہ ظاہراً بعہد جہانگیر شاہی کتب خانہ میں پہنچا۔ اس لئے کہ اس کے صفحہ اول پر جہانگیر کی مہر ثبت ہے۔ شاید یہ اس کے کچھ عرصہ بعد باقاعدہ طور پر مہتمم کتب خانہ کی تحویل میں آیا، جیسا کہ محمد صالح کے عہد شاہجہانی میں بحیثیت مہتمم دستخط ثبت کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ اس کی تصدیق دیگر معاصر مخطوطات سے ہوتی ہے جن پر اس کے دستخط ثبت نہیں ہیں۔ مثلاً دیوان کامران پر بھی وہی تاریخ درج ہے جو زیر نظر مخطوطہ پر ہے یعنی ۳۲ سال جلوس۔ "رقعات عالمگیری" میں اس مخطوطے کے خاتمہ کا عکس طبع ہوا ہے۔ مخطوطے پر جہانگیر کی مہر کے علاوہ دو اور مہریں بھی ہیں جو پڑھی نہیں جاسکتیں۔ پانچ اور جگہ یہ الفاظ تحریر ہیں: عرض دیدہ شد۔ جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض اور عمائد نے بھی اس مخطوطہ کو دیکھا ہے۔ ان الفاظ کا آغاز اللہ اکبر سے ہوتا ہے۔ ان سب کے نیچے مختلف تاریخیں درج ہیں یعنی ۷، ۱۶، ۲۳ ۔ دو اور تاریخیں بھی ہیں جو مٹی مٹی سی ہیں، اس لئے پڑھی نہیں جاتیں۔ یہ سب تاریخیں غالباً سال جلوس ہی کی نشان دہی کرتی ہیں۔ مگر ایک جگہ سال ۱۰۵۵ھ تحریر ہے جو آسانی سے معلوم ہو جاتا ہے۔ بگمان غالب یہ اورنگ زیب عالمگیر کے دستخط ہیں کیونکہ یہ دستخط عالمگیر کے ان دستخطوں سے ملتے ہیں جن کے عکس میری نظر سے گزرے ہیں۔

جہانگیر کی مہر کے نیچے لفظ "الہدیہ" تحریر ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اصلی مالک نے یہ کتاب ہدیہ یا نذرانہ کے طور پر جہانگیر کی خدمت میں پیش کی تھی۔

کتاب ۷۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور اس کی تقطیع ۳ انچ × ۶ انچ ہے۔ لیکن مسودہ بشکل ۲" × ۴" جگہ میں لکھا گیا ہے۔ ہر صفحے میں ۵ اسطر یہ خط نستعلیق ہیں۔ عنوانات سنہرے اور سرخ رنگ میں مرقوم ہیں۔ تقریباً ہر دوسرے تیسرے صفحے پر کوئی رنگین خاکہ یا نقش ہے، کوئی سارے اور کوئی آدھے صفحے پر۔ تصاویر کی کیفیت حسب ذیل ہے :۔

۱۔ صورت حرم محترم	۲۔ صفا و مروا
۳۔ جائے کہ بلال اذان گفت	۴۔ مولود حضرت صلعم و حضرت فاطمہ
۵۔ گنبد حضرت خدیجہ و شہدائے معلّا	۶۔ گنبدے کہ شکم حضرت جبرئیل پُر نور کرد
۷۔ جبل ثور	۸۔ عرفات
۹۔ گنبد مزدلفہ	۱۰۔ بازار منا
۱۱۔ چاہ امیرالمومنین حضرت علی	۱۲۔ نخلین بی بی فاطمہ بین باب جبرئیل و باب رحمۃ

---

[1] ملاحظہ ہو "شاہ جہاں نامہ" جلد دوم۔ معلوم ہوتا ہے کہ میر محمد صالح نے ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی خطاطی کو ترک نہیں کیا، کیونکہ اپنی زندگی کے آخری حصہ میں وہ عالمگیر کے عہد حکومت میں دائی انگہ کے مقبرہ کے اندرونی حصہ کی آرائش پر مامور ہوا۔ چنانچہ اس مقبرہ پر اس کا نام بقید سال (۱۰۸۲ھ) درج ہے۔

۱۳۔ گنبد امیرالمومنین عباسؓ و امام حسنؓ و امام زین العابدینؓ

۱۴۔ چاہ کہ درون خاتم حضرت از دست حضرت سلیمان افتاد۔

۱۵۔ مسجد فتاح

۱۶۔ مسجد آنحضرتؐ

۱۷۔ جبل اُحد

ان میں سے اکثر تصاویر ابیات کے مضمون کی توضیح کرتی ہیں:

•

(ایران کے مشہور شاعر خاقانی نے بھی اپنے بعض قصاید میں سفرِ حج کی اول تا آخر نہایت ہی دلچسپ اور مفصل کیفیت پیش کی ہے اور دورانِ سفر کے چشم دید حالات و کوائف اس تفصیل سے درج کئے ہیں کہ سارے راستہ، اس کی منازل و اوقاف مقامات اور خطرات نظر کے سامنے آجاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی تاریخی واقعات کا بھی تذکرہ ہے اور حجاج کے دلی احساسات و کیفیات کی بھی بہت خوش اسلوبی سے عکاسی کی گئی ہے۔ آخر میں مناسکِ حج کے تمام جزئیات کی موقع بہ موقع اور درجہ بدرجہ نہایت حقیقت پسندانہ پیرایہ میں تصویر کھینچی گئی ہے جو ایک نہایت اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ اور اس قسم کے دیگر نوادر جہاں بھی ہوں قابلِ قدر ہیں) (مدیر)

•

ارضِ مُراد

نظر حیدرآبادی

زندہ باد ارضِ مراد، اے کشورِ امن واماں — روشن و رخشاں رہیں تیرے زمین و آسماں
چھا گیا مہرِ یقیں اور چھٹ گئی گردِ گماں — اپنی منزل میں ہے اب اہلِ وفا کا کارواں

جانتی ہے تو کہ عزم و جوش کا پیکر ہیں ہم
جانتی ہے تو تری بنیاد کا پتھر ہیں ہم!

مل گئی منزل، اندھیرے نور افشاں ہو گئے — راہ کے کانٹے گلستاں در گلستاں ہو گئے
لطفِ دورِ نو سے پھر جینے کے ساماں ہو گئے — صبح چمکی، رات کے نغمے پریشاں ہو گئے

عشرتِ ذوقِ طلب کیا ہے دلِ افگار سے پوچھ
امنِ ساحل کیا ہے ہم طوفان کے ماروں سے پوچھ

وقت بدلا، گردشِ دوراں سے واقف ہو گئے — حادثوں کی کشمکش و احسار سے واقف ہو گئے
لطفِ آزادی غمِ زنداں سے واقف ہو گئے — ہم مزاجِ عالمِ امکاں سے واقف ہو گئے

انتہائے یاس میں بھی مسکرانا آ گیا
زندگی کو زندگی بن کر جگانا آ گیا!

اے وطن پیارے وطن، اے سرزمینِ رنگ و بو — فکرِ مسلم کو رہی ہے کب سے تیری جستجو
تیری راتیں ماہ پیکر، تیری صبحیں مہر رُو — تیری تابانی کا ضامن ہے شہیدوں کا لہو

تو سلامت! ہم ترے پرچم کو یوں لہرائیں گے
ہر اندھیرے میں کرن امید کی بن جائیں گے!

دَورِ بہار

جمیل نقوی

مرے تصور میں پرفشاں ہیں، کچھ ایسی صبحیں، کچھ ایسی شامیں
کہ جن کی براق روشنی میں وجودِ شام و سحر نہیں تھا
وہ نور جو روشنی اثر ہے، بذاتہٖ جلوہ گر نہیں تھا
کہ جیسے تاروں کی سرزمیں میں نظامِ شمس و قمر نہیں تھا

★

فضا میں اک انتشار سا تھا، نگاہ محسوس کر رہی تھی
بیان پابندِ مصلحت تھا، لبوں پہ تالے پڑے ہوئے تھے
تپش سے سوزِ غمِ نہاں کی، زباں پہ چھالے پڑے ہوئے تھے
صبا گلوں سے الجھ رہی تھی، چمن کے لالے پڑے ہوئے تھے

★

عرقِ عرق تھی جبینِ شیریں، نگاہِ پرویز مطمئن تھی
کہ تیشۂ سنگ پاشِ آہن صدا سے محروم ہو چکا تھا
دوانہ اک بے ستوں بنا کر سکون کی نیند سو چکا تھا
پہونچ کے ساحل پہ آرزوؤں کے دل کی کشتی ڈبو چکا تھا

★

بجھی بجھی سی تھی شمعِ محفل، اداس تھی کارگاہِ ہستی
دلِ نشرِ رہِ محبت میں جیسے ناکام ہو گیا تھا
خود اپنے ذوقِ طلب کی قدروں پہ چل کے بدنام ہو گیا تھا
دماغ یوں مضطرب تھا جیسے خرد کو سرسام ہو گیا تھا

غبار میں چھپتے جا رہے تھے نشانِ منزل، نقوشِ جادہ
تھکا تھکا سا تھا ہر مسافر، جرس کی آواز مضمحل تھی
نگاہِ رہبر اگر کبھی اٹھ گئی تو دیکھا کہ منفعل تھی
مگر وہ اک آگ جو تصور کے دشت و صحرا میں مشتعل تھی

★

ہزار فتنے کھڑے ہوئے تھے خلوص و غیرت کے راستوں میں
حیات دوزخ بنی ہوئی تھی تمام تر جن کے دم قدم سے
بنامِ تکمیلِ آدمیت الجھ رہا تھا ستم کرم سے
زمانہ تاریخ لکھ رہا تھا ثبات کے آہنی قلم سے

★

یہ فکر تھی باغباں کو ہر دم کوئی کلی پھول بن نہ جائے
کہیں نہ سبزہ کی نیند ٹوٹے، چلے نہ بادِ صبا مچل کے
چہکنے پائے نہ کوئی بلبل، کہیں نہ لالہ کا جام چھلکے
خزاں رسیدہ چمن کے وارث نہ اٹھ کھڑے ہوں کہیں سنبھل کے

★

بنامِ تکمیلِ خود شناسی، بقدرِ احساسِ نامرادی
مرے جنونِ برہنہ سر نے خرد کو سو آئنے دکھائے
کبھی اجالوں سے بھیک مانگی کبھی لہو سے دیے جلائے
نقوشِ ماضی جو مٹ گئے تھے، افق پہ اکثر ابھر کے آئے

خود اپنی ہستی سے تنگ آ کر مرے دلِ جذب آفریں نے
حریفِ احساسِ ناامیدی کو رازدارِ جنوں بنایا
خلوص کو نیند سے جھنجھوڑا، عروسِ غیرت کو گدگدایا
چمن کو پھر تازگی عطا کی، گلوں کو پیغامِ نو سنایا
اٹھو کہ دورِ بہار آیا
اٹھو کہ دَورِ بہار آیا

ماہِ نو کراچی، اگست ۱۹۵۹ء

افسانہ:

گھر سے گھر تک

احمد ندیم قاسمی

حاجی مقتدا احمد کے دیوان خانے میں قدم رکھتے ہی شیخ نورالزماں کی بیوی عشرت خانم، ان کی بیٹی ہما اور بیٹے وقار کا سارا رعب داب صابن کے جھاگ کی طرح فشافش غائب ہو گیا۔ یہ لوگ جس کار میں حاجی صاحب کے ہاں آئے تھے وہ اتنی لمبی تھی کہ اگر ہوائی اڈے پر کھلے دروازوں کے ساتھ کھڑی ہوتی تو لوگ اسے طیارہ سمجھ بیٹھتے۔ حاجی صاحب کی گلی میں مڑتے ہوئے ڈرائیور کو اسی لئے خاصی دقت ہوئی تھی۔ پھر یہ کار جتنی لمبی تھی اتنی ہی خوبصورت اور چمکیلی بھی تھی۔ اسے دیکھ کر عام آدمی کا ایکا ایکی جی چاہتا تھا کہ اسے چھونا اور محسوس کرنا چاہیئے مگر فوراً خیال آتا تھا کہ اس ٹھاٹھ کی کار کو چھونا یقیناً خلافِ قانون ہوگا اور پولیس پکڑ کر لے جائے گی۔

کار حاجی مقتدا احمد کے مکان کے سامنے رکی تو باوردی ڈرائیور نے اتر کر کار کے باقی تینوں دروازے کھولے۔ عشرت خانم، ہما اور وقار پھول میں سے بھونروں کی طرح برآمد ہوئے۔ پھر ڈرائیور نے ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ تینوں دروازے تڑاخ پڑاخ بند کئے تو گلی کے اِس سرے سے اُس سرے تک کھڑکیوں میں سے جھانکتی ہوئی عورتوں اور آدھی آدھی لٹکتی ہوئی لڑکیوں کے کلیجے دھک سے رہ گئے۔ ڈرائیور بائیں بازو کو ہوا میں لہرا کر کلائی کو آنکھوں کے قریب لایا اور گھڑی میں وقت دیکھا۔ پھر اپنی سیٹ پر بیٹھ کر مونچھیں مروڑنے لگا۔

حاجی مقتدا احمد کی بیوی نورالنساء نے دروازے پر عشرت خانم، ہما اور وقار کا استقبال کیا اور کار کی طرف یوں دیکھا جیسے بچے پیسٹری کی طرف دیکھتے ہیں۔ پھر جب تینوں مہمان حاجی صاحب کے دیوان خانے کا ریشمی پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوئے تو پائدان پر ذرا دیر کو یوں کھڑے رہ گئے جیسے آگے قدم بڑھایا تو بے ادبی کا ارتکاب کر بیٹھیں گے۔

سب سے آگے عشرت خانم تھیں۔ انہوں نے قالین پر قدم رکھا تو ڈگمگا گئیں جیسے پھسلنے سے بچی ہیں۔ پلٹ کر انہوں نے ہما کی طرف دیکھا اور شلوار کے پائنچوں کو ذرا سا اٹھا کر صوفے کی طرف بڑھیں جیسے تالاب میں اُترنے چلی ہیں۔ ہما اور وقار پر بھی کم و بیش یہی عالم گزر گیا۔ نورالنساء نے سلیپر پائدان پر اتار دیئے اور ایک ڈگ بھر کر تخت کے پاس کھڑی ہو گئیں۔ سب اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھنے لگے تو وقار ایک قدم پیچھے ہٹ کر دروازے کے پاس بلش میں لپٹے ہوئے ایک مونڈھے پر دربان کی طرح بیٹھ گیا۔

نورالنساء چونک کر بولیں۔ "اے ہے وقار میاں، یہ کیا کر رہے ہو؟ اے بہن عشرت خانم، اسے سمجھایئے۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ وہیں مونڈھے پہ ہی ٹِک گیا۔ اٹھو بیٹا اٹھو، صوفے کس لئے رکھے ہیں؟"

عشرت خانم نے وقار سے کہا۔ "سن رہے ہو میاں، تمہاری خالہ جان کیا کہہ رہی ہیں؟"

وقار کچھ اس طرح چل کر صوفے کی طرف گیا جیسے ایک ایک سیڑھی چھوڑ کر زینہ اترا ہے۔

اس کے بعد تکلفات شروع ہوئے۔ تہذیب برتی جانے لگی۔ موسم کی بوالعجبیوں کا ذکر چلا۔ پھر نورالنساء اٹھیں۔ "ہائے میں نے معصومہ کو تو بتایا ہی نہیں کہ تمہاری خالہ جان آئی ہیں۔"

وقار جو دائیں ٹانگ کو بائیں ٹانگ پر رکھے بیٹھا تھا، بائیں ٹانگ کو دائیں ٹانگ پر رکھ کر اور ہما کی طرف دیکھتے ہوئے یوں سکڑا جیسے کہہ رہا ہے۔ "دیکھئے باجی، انہیں منع کیجئے۔"

ہما کھڑکھڑاتے ہوئے ریشم کے لباس کو سنبھالتی ہوئی اٹھی اور مسکرا کر بولی۔ "آپ تشریف رکھیئے خالہ جان، معصومہ کو میں لے آتی ہوں۔"

نورالنسا، فوراً بولیں۔ "نہیں نہیں ہما بیٹی۔ تم بیٹھو۔ میں نوکروں سے چائے لگانے کو بھی تو کہہ دوں۔"
نورالنسا سلیپر پٹخاتی سیڑھیوں پر چڑھنے لگیں تو ہما بولی۔ "دیکھا اماں۔ میں نہ کہتی تھی؟"
"اسی لئے تو میں آتی نہیں تھی۔" عشرت خانم بولیں۔ "سمجھ میں نہیں آتا حاجی صاحب نے اتنی بہت سی دولت کہاں سے بٹور رکھی ہے؟"
"غالیچہ دیکھئے جیسے سمندر کا جھاگ ہے" ہما نے ہاتھ بڑھا کر غالیچے میں انگلیوں کی پوریں ڈبو دیں۔ "پاؤں رکھو تو تھاہ نہ پاؤ۔ ایک ہزار کا تو ہوگا۔"

"ایک ہزار کا؟" وقار پہلی بار بولا۔ "کمال کرتی ہیں باجی۔ دس ہزار کہیے۔"
"آہستہ بولو" ہما نے آہستہ سے کہا۔ "جب لڑکیوں کو دیکھنے آتے ہیں تو آہستہ بولتے ہیں۔ یوں سمجھو کہ ہر پردے کے پیچھے کوئی کھڑا تمہاری باتیں سن رہا ہے۔"

"دس ہزار کا اگر صرف یہ غالیچہ ہے تو اس دیوان خانے کا پورا سامان ایک لاکھ سے کم کا کیا ہوگا۔" عشرت خانم نے صوفے میں گھوم کر پورے دیوان خانے پر نظریں دوڑائیں۔ "ایک لاکھ کوئی معمولی رقم نہیں ہے۔ منہ میں سماتی ہے، جیب میں رکھو تو پھٹ کر نیچے جا پڑے۔"
ہما جو دروازے کے قریب والے صوفے پر بیٹھی تھی جھکتے ہوئے پردے کو چھو کر کہنے لگی۔ "خالص ریشم کے تو پردے ہیں۔" پھر وہ پردے کو ذرا سا جھٹک کر بولی "یہ دیکھئے۔ ذرا سی شکن جو پیدا ہوتی ہے وہ پانی کی لہر کی طرح آخر تک چلی جاتی ہے۔ یہ دیکھئے، یہ دیکھئے۔" ہما نے پردے کو دو تین بار جھٹکا۔

"اے رہنے دے۔" عشرت خانم نے سرزنش کی۔ "کیا کر رہی ہے۔ پردہ گر پڑے گا۔" پھر دائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت سے پردے گنتی ہوئی بولیں۔ "ایک دو تین چار پانچ اور چھ۔ اکٹھے چھ پردے ہیں ایک جیسے۔"
"کچھ نہیں تو چھ سو کے تو یہی ہوں گے۔" ہما بولی۔
"لیجئے اور سنیئے" وقار تڑپ اٹھا۔ "باجی تو کمال کر رہی ہیں۔ دو ہزار سے کم کے نہیں ہوں گے۔ لکھوا لیجئے مجھ سے۔"
"صوفہ دیکھئے، بالکل نئے فیشن کا ہے۔" ہما نے تبصرہ جاری رکھا۔ "تپائیوں پر رکھے ہوئے عجائبات دیکھئے۔ وقار مینٹل پیس پر وہ جو ہرن رکھا ہے وہ مٹی کا ہے کہ لکڑی کا؟"

وقار نے ہرن کی طرف جوہری کی طرح دیکھتے ہوئے کہا۔ "نہ مٹی کا ہے نہ لکڑی کا۔ مجھے تو کسی قیمتی پتھر کا معلوم ہوتا ہے شاید عقیق کا ہے۔"
"عقیق کا؟" عشرت خانم ہرن کو دیکھنے کے لئے آدھی اٹھ گئیں۔
"بڑے بڑے گھروں کے دیوان خانے دیکھے ہیں۔" ہما نے جھوم کر کہا۔ "ایسے ٹھاٹھ کہیں نظر نہیں آئے۔"
عشرت خانم ہاتھ مل کر بولیں۔ "اتنے بڑے گھر کی لڑکی جانے مزاج کی کیسی ہوگی۔"
"میں نے تو کہا تھا کہ پہلے دیکھ دکھا لیجئے۔" وقار نے کہا۔
"ہما سے پوچھو۔" عشرت خانم بولیں۔ "مجھے تو یہی گھسیٹے لئے پھر رہی ہے۔"
"تو کیا ہے اماں؟" ہما بولی۔ "اس میں نقصان کونسا ہے۔ اتنا بہت سا جہیز ملے گا۔"
"تم بھی تو اتنے بڑے گھر کی بہو بن کر گئی تھیں۔" عشرت خانم اداس ہو گئیں۔ "بتاؤ کیا ملا؟"
"چُپ" ہما نے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔

تینوں یوں سنبھل بیٹھے جیسے ان کی تصویر اترنے والی ہے۔ سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ آ رہی تھی۔ ساتھ ہی بغل والے کمرے میں ریشمی پردے کے اُدھر چینی کے برتن بجنے لگے تھے۔

نورالنسا، پردہ ہٹا کر بولیں۔ "آجا بیٹی۔ شرمانے کی کونسی بات ہے۔ اپنی خالہ ہیں۔ اپنی باجی ہما ہیں جن سے تو سلیمہ کے ہاں ملی تھی۔

سب اپنے ہیں۔ آجا۔"

معصومہ کی صورت میں ریشم اور نائلون کا ایک ڈھیر دیوان خانے میں داخل ہوا۔ وقار ادب سے کھڑا ہو گیا۔ عشرت خانم اور ہما نے معصومہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور نور النساء نے معصومہ کو وقار کے بالکل سامنے والے صوفہ پر بٹھا دیا۔

معصومہ نے ایک دو بار سر پر سے کھسکتے ہوئے دوپٹہ کو درست کرنے کے لئے اپنا ہاتھ یوں ہولے سے اٹھایا جیسے ذرا تیزی سے اٹھایا تو ریشم کہیں نہ کہیں سے ضرور مسک جائے گا۔ وہ عمر کے اس حصے میں تھی جہاں بدصورتی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

ہما معصومہ سے باتیں کرنے کی کوشش کرتی رہی مگر "جی" یا "جی نہیں" سے زیادہ اسے کسی سوال کا جواب نہ ملا۔ وقار معصومہ کو یوں چوری چوری دیکھتا رہا جیسے اپنے مکان کی چھت پر کھڑا ہے۔ نور النساء معصومہ کی سلیقہ مندیاں اور کشیدہ کاریوں کے قصے سناتی رہیں اور عشرت خانم "ماشاء اللہ، ماشاء اللہ" سے جواب دیتی رہیں۔

پھر جب لٹھے کی صاف ستھری شلوار قمیص میں ملبوس ملازم نے بغل والے کمرے کا دروازہ کھول کر پردہ سرکایا اور سب لوگ طعام گاہ میں داخل ہوئے تو عشرت خانم تو جیسے گونگی ہو کر رہ گئیں۔ اتنی بڑی میز پر بچھے ہوئے منقش پلاسٹک پر انہیں ایسی کراکری نظر آئی، جس کے بارے میں انہوں نے بازار میں سے گزرتے ہوئے کئی بار کہا تھا کہ ایسے برتنوں کے لئے دو ہی جگہیں مناسب ہیں۔ دکانوں کے شوکیس یا وزیروں۔ کی طعام گاہیں۔ مگر یہ تو حاجی مقتدا احمد کا گھر تھا جس کے بارے میں ہما نے انہیں بتایا تھا کہ منیاری کی دکان ہے اور خاصے کھاتے پیتے آدمی ہیں۔ "یہ تو خاصے کھاتے کھلاتے پیتے چھلکاتے آدمی معلوم ہوتے ہیں!" عشرت خانم نے سوچا۔ طعام گاہ کے بڑے پن کو صرف ایک ریفریجریٹر کی کمی نے ٹھیس پہنچا رکھی تھی یا معصومہ کی انتہا درجے کی شرم و حیا نے۔ معصومہ نے نہ تو بڑے گھروں کی لڑکیوں کی طرح چہک چہک کر چائے بنائی۔ نہ کوئی پلیٹ اٹھا کر وقار تو چھوڑ، ہما اور عشرت خانم تک سے کہا کہ یہ خاص میرے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیز ہے۔ نہ اس نے کسی ذرا سی بات پر بڑا سا قہقہہ لگایا اور نہ اس انداز سے تعجب کا اظہار کیا کہ سب لوگوں کی نگاہیں اس پر گڑ جاتیں اور اس کی بھووں کے کٹیلے پن اور آنکھوں کے ہوشربا طول و عرض سے لے کر اس کی لمبی گردن کے مرمرتک کا جائزہ لے آتیں۔ وہ ہما اور اپنی اماں کے درمیان بیٹھی دیر تک مسلسل ایک ہی بسکٹ کو ذرا چکھتی رہی اور پیالی میں سے ایک ایک قطرہ چائے پی کر پرچ میں اسے یوں کوئی آواز پیدا کئے بغیر رکھتی رہی جیسے پیالی اور پرچ دونوں گتے سے بنی ہیں۔

"حاجی صاحب جب عدن میں بزنس کرتے تھے۔" نور النساء نے بتایا۔ "تو وہ دنیا جہان کے عجائبات اپنے گھر میں بھرتے رہے۔ چھ قسم کے تو چائے کے صرف روسی سیٹ تھے۔ کافی کے تین سیٹ انہوں نے ولایت جانے والے ایک دوست کے ہاتھ جرمن کے ملک سے منگائے اور ان کی قیمت جو ادا کی اس کا اندازہ آپ سے زیادہ کس کو ہو گا۔ ایران سے وہ جس آدمی کے ہاں سے قالین منگاتے تھے وہ ان سے یوں خط و کتابت کرتا تھا جیسے حاجی صاحب عدن میں قالینوں کے سوداگر ہیں۔ ایک بار انہیں کھانے کے کمرے کی میزیں خریدنے کا شوق چرایا تو ایک دو سال کے اندر ساگوان کی اکٹھی پانچ میزیں جمع کر لیں۔ میں چیخی چلائی تو بجائے اس کے کہ نیلام کر دیتے، اپنے انگریز دوستوں کو مفت میں دے آئے۔ نیلام کرتے تو چار پانچ ہزار روپے تو ضرور آ جاتے۔ اب آپ سے زیادہ کس کو اندازہ ہو گا کہ اگر نیلام کے دام یہ ہیں تو اصل قیمت کیا ہو گی۔ پھر جب اتنے بڑے بنگلے میں ایک تنکا تک رکھنے کی جگہ نہ رہی اور ادھر اپنے وطن کی آزادی کے بعد انہوں نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا تو ساری عمر کی کمائی وہیں اونے پونے بیچنا پڑی۔ بڑے بڑے انگریز افسروں اور عرب شیخوں نے آکر بولیاں دیں۔ گھر سے باہر بازار لگ گیا۔ معصومہ اس وقت یہی کوئی چار پانچ سال کی ہو گی۔ اسے بھی یاد ہو گا کہ اس روز کیسے سارا عدن ہمارے گھر سے باہر اُمڈ پڑا تھا۔ یاد ہے بیٹی؟"

"جی" معصومہ بولی۔

"اور بہن عشرت خانم"۔ نور النساء نے کہنا شروع کیا۔ "واپس وطن آکر ——"

باہر کا دروازہ کھلا اور صاف ستھرے ملازم نے اندر آکر پوچھا۔ "اور چائے لا دوں بی بی؟"

"لے آؤ" نورالنساء فوراً بولیں

عشرت خانم اور ہما چلا اٹھیں۔ "نہیں نہیں۔ ابھی رکھی ہے"

کچھ دیر خاموشی رہی اور ملازم بڑے ادب سے وہیں کھڑا رہا۔

سلسلۂ کلام جاری رکھنے کے لئے نورالنساء نے گلا صاف کیا اور عشرت خانم کی طرف متوجہ ہوئیں مگر فوراً سیدھی ہو بیٹھیں اور بولیں

"ضرورت ہوئی تو بلا لیں گے۔ جاؤ"

ملازم چلا گیا تو نورالنساء بولیں "تو بہن۔ وہ میں کہہ رہی تھی کہ وطن واپس آکر حاجی صاحب نے کتابیں جمع کرنے کا سلسلہ شروع کیا تو اب تک ختم ہونے میں نہیں آیا۔ ادھر جس کمرے میں بھی جائیے، کتابیں ہی کتابیں ٹھنسی پڑی ہیں۔ معصومہ اور میں کسی اور بات کی عادی تھیں۔ سو یہ سب غریبانہ چیزیں جو آپ کو یہاں نظر آرہی ہیں وہ ہم دونوں ہی کی دوڑ بھاگ کا نتیجہ ہیں۔ چیزیں میں نے جمع کر دی ہیں۔ انہیں ترتیب سے لگانے کا سلیقہ معصومہ کا ہے"

"ماشاءاللہ، ماشاءاللہ" عشرت خانم بولیں۔

"سلیقہ ہی تو سب کچھ ہے" ہما بولی۔ "ورنہ مشین تو آدمی سے بھی زیادہ تیزی سے کام کر سکتی ہے" وقار اپنے مکان کی چھت پر کھڑا نظر آنے لگا۔

واپس دیوان خانے میں آکر سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے مگر معصومہ کھڑی رہی اور اسے کھڑا دیکھ کر وقار بھی ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر نورالنساء نے کہا۔ "ادہر آج میری بیٹی جیبا کے بچے آئے ہوئے ہیں۔ صبح سے دھما چوکڑی مچا رکھی ہے۔ معصومہ کو اجازت دیجئے کہ جا کر انہیں سنبھالے۔ چائے پینے میں کپڑے سان دیں گے۔ چھوٹے چھوٹے سے ہیں"

"ہاں ہاں کیوں نہیں" عشرت خانم بولیں۔

"میں بس ایک منٹ میں حاضر ہوئی" نورالنساء نے کہا اور بیٹی کے ساتھ باہر چلی گئیں۔ چند منٹ تک ماں بیٹی اور بیٹا چپ چاپ بیٹھے رہے جیسے مینار کی سیڑھیاں طے کرنے کے بعد چوٹی پر آئے ہیں تو چکرا گئے ہیں۔

"اماں جی" ہما بولی۔ "دیکھا؟"

عشرت خانم ابھی جواب نہیں دے پائی تھیں کہ باہر سے ڈرائیور کی آواز آئی۔ "بی بی جی"

"کیا بات ہے؟" عشرت خانم جلدی سے باہر نکلیں۔ ڈرائیور کی بات سن کر بولیں "بس کوئی پانچ منٹ میں۔ زیادہ نہیں" ڈرائیور واپس اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔ عشرت خانم نے اوپر جاتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ ذرا دیر کھڑی سوچتی رہیں۔ پھر دیوان خانے کے دروازے کا پردہ ہٹا کر بولیں۔ "تم دونوں یہیں بیٹھو۔ میں ایک منٹ میں اوپر سے ہو کر آتی ہوں۔ نورالنساء کے نواسوں نواسیوں کو ایک ایک روپیہ دے آؤں"

"ایک ایک روپیہ؟" ہما بولی "نہیں اماں۔ دو دو دیجئے گا۔ کیوں وقار؟"

"اماں کی مرضی ہے" وقار بولا۔

"دو دو دے دوں گی پر نہ جانے ہیں کتنے؟" عشرت خانم سوچنے لگیں۔

ہما نے بڑی ناگواری سے کہا "اوہ اماں کبھی کبھی تو آپ حد کر دیتی ہیں۔ جتنے بھی ہوں پر دیجئے گا دو دو"

عشرت خانم نے کچھ کہے بغیر پردہ گرا دیا اور آہستہ آہستہ اوپر جانے لگیں۔ سیڑھیوں کے پہلے ہی موڑ پر رک گئیں کیونکہ اوپر سے نورالنساء اتر رہی تھیں۔ انہوں نے عشرت خانم کو یہاں کھڑے دیکھا تو پہلے تو ہکا بکا رہ گئیں۔ پھر بولیں "اے ہے بہن۔ دیوان خانے میں جا کر بیٹھئے۔ یہاں کھڑی کیا کر رہی ہیں؟"

"یونہی ذرا جی چاہا کہ اوپر سے بھی ہو آؤں"۔ عشرت خانم نے مسکرا کر کہا۔ "دو تین منزلوں والے مکان میں گھر کا ماحول اوپر کے حصے ہی میں ملتا ہے اور میں گھریلو عورت ہوں۔ پھر آپ کے نواسے نواسیوں کو بھی تو نہیں دیکھا۔ چلئے۔ ملا دیجئے ان سے"۔

"میں انہیں نیچے ہی بلائے لیتی ہوں"۔ نور النساء بضد رہیں۔ "ایک تو اوپر بچوں نے دنیا جہان کا کوڑا کباڑ جمع کر رکھا ہے۔ دوسرے ——"

"تو کیا ہوا"۔ عشرت خانم نے اگلی سیڑھی پر قدم رکھ دیا اور نور النساء کو بازو سے پکڑ کر کہا۔ "آئیے"۔

"نیچے ہما بیٹی اور وقار بیٹا کیا کہیں گے کہ ——" نور النساء نے احتجاج کیا۔

"کچھ نہیں کہیں گے"۔ عشرت خانم نے نور النساء کو کھینچا۔ "میں ان سے کہہ آئی ہوں کہ میں اوپر جا رہی ہوں"۔

نور النساء چپ چاپ عشرت خانم کے ساتھ ہولیں۔

آخری سیڑھی تک پہنچی تھیں کہ معصومہ کی کھنکتی ہوئی آواز آئی۔ "اے کلثوم۔ اس زاہد کے بچے کو پکڑ۔ یہ چائے سے سنے ہوئے ہاتھ لئے میرے کپڑوں کی طرف بڑھ رہا ہے۔ میں نے تو اتنی دیر تک نیچے بیٹھ کر ان کی استری تک خراب نہیں ہونے دی اور یہ اسے دھولنے چلا ہے۔ سلیمہ کیا کہے گی کہ ——"

یکایک نور النساء نے اونچی آواز میں باتیں کرنا شروع کر دیں۔ "میری تو سمجھ میں نہیں آتا بہن کہ آپ کو کس کمرے میں لے جاؤں۔ آج تو یہ یہاں سے وہاں تک بچوں کا گھر بنا ہوا ہے۔ وہ اٹھا پٹخ مچائی ہے انہوں نے کہ اللہ میری توبہ ہے"۔ پھر جس طرح انہوں نے یکایک بولنا شروع کیا تھا اسی طرح یکایک رک گئیں اور چہرے پر ایسی کیفیت طاری کر لی جیسے کان لگا کر کچھ سن رہی ہیں۔

عشرت خانم نے اپنی میزبان کو ایک لمحہ غور سے دیکھا۔ پھر بولیں۔ "ادھر بچوں کے پاس چلتے ہیں"۔

"ہائے بہن وہاں تو ——" نور النساء جیسے رونے کے قریب پہنچ گئیں۔ مگر عشرت خانم کو بڑھتا دیکھا تو ان کے ساتھ ہولیں۔

"اے ہے بیٹی، کپڑے بدل لئے"؟ عشرت خانم دروازے کے سامنے جا کر بولیں اور نور النساء نے قدم روک لئے جیسے معصومہ سے ان کا پردہ ہے۔

میلی داغی دیواروں اور جالوں بھری چھت والے اس کمرے کے دروازے پر پرانے دوپٹے کا ایک ادھورا سا پردہ لٹک رہا تھا جس کا ایک سرا اٹھا کر کواڑ سے اٹکا دیا گیا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں ٹوٹی ہوئی ادوائن کا ایک کھٹولا پڑا تھا جس پر معصومہ کے ریشمی لباس کا ڈھیر رکھا تھا اور پائینتی کے پاس پانچ چھ برس کا ننگا زاہد کھڑا چائے سے سنی ہوئی انگلیاں چوس رہا تھا۔ اکھڑے ہوئے سیمنٹ کے فرش پر مختلف عمروں کے پانچ لڑکے لڑکیاں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ چائے ایک کالی بھجنگ تپیلی میں تھی۔ چائے پینے والوں میں سے کسی کے ہاتھ میں مٹی کا پیالہ تھا تو کسی کے سامنے مراد آبادی کٹورا رکھا تھا۔ ایک بچے کے ہاتھ میں چینی کی پیالی تھی جس کی دستی ٹوٹ چکی تھی۔ ایک لڑکی نے ہاتھوں کو چائے کی تپش سے بچانے کے لئے ایلومینیم کے ایک ٹیڑھے میڑھے گلاس کو اپنی فراک میں لے کر اسے دونوں ہاتھوں میں یوں اٹھا رکھا تھا کہ اس کا ننھا سا پیٹ دکھائی دے رہا تھا۔ بڑی لڑکی کلثوم کے سامنے ایک پلیٹ میں لال شکر رکھی تھی جسے مکھیوں نے سیاہ کر ڈالا تھا۔ وہ کرے ہوئے کناروں والی ایک پرچ میں چائے پی رہی تھی۔ معصومہ میلی چیکٹ شلوار اور قمیص پر ایک چھلنی چھلنی دوپٹہ اوڑھے ننگے پاؤں یوں کھڑی تھی جیسے اسے چھو لیا جائے تو گر پڑے گی۔ اس کی لمبی سیاہ آنکھوں میں خوف گھس گیا تھا اور اس کے گلابی ہونٹوں پر نیل پڑ رہے تھے۔

عشرت خانم دروازے میں کھڑی بیلنظر دیکھتی رہیں۔ پھر مسکرا کر نور النساء کی طرف دیکھا تو وہ غائب تھیں۔ "اے بہن نور النساء"۔ وہ پکاریں جواب نہ پا کر سنجیدہ ہو گئیں اور ادھر ادھر دیکھ کر آگے بڑھ گئیں۔ ساتھ والے کمرے سے برتنوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کے دروازے پر پہنچیں تو دیکھا کہ نور النساء جلدی جلدی سے برتن سمیٹ رہی ہیں۔ "بہن" انہوں نے کہا اور نور النساء سناٹے میں آ گئیں۔ پھر بولیں۔ "یہ باورچی خانہ ہے مگر بچوں نے آج اسے کباڑ خانہ بنا رکھا ہے۔ ہائے بہن، مجھے تو ——"

پھر وہ خاموش ہو گئیں۔ ان کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو خاموش ہو جاتا۔ وجہ یہ تھی کہ عشرت خانم ہنس رہی تھیں۔

معصومہ پرے دروازے میں سے ڈری ڈری جھانک رہی تھی جیسے وہ ایک ایسی گاڑی میں سوار ہے جس کی بس ایک دو لمحوں کے اندر مخالف سمت سے آتی ہوئی گاڑی کے ساتھ ٹکر ہونے والی ہے۔

عشرت خانم ہنسے جا رہی تھیں اور اب پیٹ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی تھیں "ہائے میرے اللہ" وہ بڑی مشکل سے بولیں "توبہ ہے" انہوں نے بڑی محنت سے ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا اور پھر سامنے دیکھا۔

نورالنساء کے ایک ہاتھ میں پتیلی اور دوسرے ہاتھ میں اپنا سر تھا اور وہ یوں بیٹھی تھیں جیسے مٹی کی بیٹھی رہ گئی ہیں۔

عشرت خانم پر ہنسی کا ایک اور دورہ پڑا "اے بہن معاف کرنا" وہ بولیں "آپ نے مجھے یہ ٹوٹے ہوئے پیالے اور یہ پچکی ہوئی پتیلیاں پہلے کیوں نہیں دکھائیں؟ یہ کالی میلی دیواریں اور یہ پرانے دوپٹوں کے پردے آپ نے اوپر کیوں چھپا رکھے تھے؟ یہ ننگے اور ادھ ننگے بے دھلے بے نہائے بچے، وہ ٹوٹا ہوا کھٹولا اور یہ بے کنڈے کا توا۔ اے بہن نورالنساء۔ آپ نے یہ سب کچھ مجھ سے کیوں چھپایا؟ اور ذرا ادھر تو سنئے بہن" عشرت خانم اٹھ کھڑی ہوئیں "وہ کیا رکھا ہے؟ اچھا تو وہ تام چینی کی چوٹ لگی پلیٹیں ہیں جن کے کناروں پر چنے کی دال اب تک جمی ہوئی ہے۔ ادھر معصومہ بیٹی کے کمرے میں جو چارپائی رکھی ہے اس کی ادوائن کو پورا کرنے کے لئے رسّی کے ساتھ کسی کا کمر بند بھی تو باندھ دیا گیا ہے" عشرت خانم نے یہاں رک کر دو تین قہقہے مارے۔ پھر آنکھیں پونچھنے کے لئے اپنے دوپٹے کا پلو پکڑا مگر دوپٹے کو ابھی آنکھوں تک نہیں لے گئی تھیں کہ وہ نورالنساء کو یوں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگیں جیسے گھنی دھند میں راستہ ڈھونڈ رہی ہیں "بہن" وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئیں۔

عشرت خانم باورچی خانے میں داخل ہو کر نورالنساء کے پاس بیٹھ گئیں۔ نورالنساء کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں سے بینائی جیسے چوس لی گئی تھی۔

"دیکھئے بہن۔ مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنا ہے" عشرت خانم نے کہا "نیچے سیڑھیوں میں۔ الگ سے"

نورالنساء گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھیں تو ان کی ریڑھ کی ہڈی میں سے چٹاک پٹاک کی دو تین آوازیں آئیں جیسے تیز ہوا میں خشک ٹہنیاں ٹوٹ رہی ہیں۔

عشرت خانم منہ میں دوپٹے کا ایک پلو ٹھونسے ادھر ادھر دیکھے بغیر چند سیڑھیاں اتر گئیں۔ پھر رک کر اوپر دیکھا۔ نورالنساء برسوں کے مریضوں کی طرح سیڑھیوں کے جنگلے کے سہارے آہستہ آہستہ اتر رہی تھیں۔ جب وہ عشرت خانم کے قریب آئیں تو آنکھیں جھکا کر اتری چلی گئیں مگر عشرت خانم نے انہیں بازو سے پکڑ کر روک لیا۔ پھر انہیں اپنے مقابل کھڑا کر کے منہ میں سے دوپٹہ نکالا اور بجائے بولنے کے ہنسنے لگیں۔

"جوتیاں ماریئے بہن عشرت خانم" نورالنساء کی کہیں دور سے آواز آئی "پر یہ جو آپ کی ہنسی ——"

نورالنساء آگے کچھ نہ کہہ سکیں کیونکہ نیچے کسی نے دروازے پر دستک دے دی۔ نورالنساء بھڑک کر تیزی کے ساتھ نیچے اتریں مگر جب تک وہ سیڑھیاں اترتیں، ایک لڑکے نے دروازہ کھولتے ہی کڑک کر کہہ دیا "بی بی جی سلام۔ آپا جی کہہ رہی ہیں کہ جب مہمان چلے جائیں تو ہمیں جلدی سے بتا دیجئے گا۔ کہتی ہیں قالین اور صوفہ اور پردے بے شک کل تک رکھے رہیں۔ برتن اور سجاوٹ کی چیزیں ہم آج ہی واپس منگا لیں گے۔ صبح سویرے ہمارے ہاں بھی مہمان آ رہے ہیں"

نورالنساء آخری سیڑھی پر جنگلے کو مٹھی میں دبوچے کھڑی تھیں۔ انہوں نے صرف گردن کی جنبش سے "اچھا" کہا۔ لڑکا دھڑ سے دروازہ بند کر کے چلا گیا اور نورالنساء آخری سیڑھی پر جیسے گر پڑیں۔

"ڈرائیور" عشرت خانم زور سے پکاریں۔ اور دیوان خانے کا پردہ ہٹا کر ہما نے جھانکتے ہوئے پوچھا "کیوں اماں جی۔ کیا ہے؟"

"میں نے ڈرائیور کو بلایا ہے۔ تم اندر بیٹھو" عشرت خانم بولیں "اور دیکھو صوفے پر احتیاط سے بیٹھو۔ کپڑوں میں شکن نہ آئے۔ تمہاری سہیلی کیا کہے گی کہ مانگ کر پہننے کو لے گئیں اور گنجلا کر واپس کئے"

"اماں" ہما کے سینے پر عشرت خانم نے جیسے مکا مار دیا۔ پھر وہ تیورا کر پیچھے ہٹ گئی۔

"بڑی بے لحاظ ہوتی ہیں اس زمانے کی لڑکیاں" عشرت خانم نے نورالنساء کے پاس آخری سیڑھی پر بیٹھتے ہوئے کہا "مانگے کے کپڑے یوں پہنتی ہیں جیسے باپ نے خرید کر دئے ہیں" پھر وہ ہنسنے لگیں اور ادھر پہلی بار نورالنساء کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ کا پرتو پڑا۔

"ڈرائیور" عشرت خانم نے اٹھ کر باہر کا دروازہ کھول دیا۔ ڈرائیور سامنے آیا تو وہ بولیں "بھئی دیکھو۔ تم کار واپس لے جاؤ۔ ہم لوگ تانگے سے آجائیں گے بیگم صاحب کو سینما دیکھنے جانا ہے تو یہ مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا کہ کار کے مالک تو دوسروں سے کار مانگتے پھریں اور جو ایک گھنٹے کے لئے کار مانگ کر لائے ہیں وہ اس پر قبضہ جما کر بیٹھ جائیں۔ کہنا بہت بہت شکریہ" — پھر پانچ روپے کا ایک نوٹ بڑھا کر بولیں "یہ لو۔ تمہارا انعام ہے"۔

ڈرائیور سلام کر کے پلٹ گیا تو عشرت خانم دروازہ بند کر کے ہنسنے لگیں۔ پھر وہ اسی طرح ہنستی ہوئی بڑھیں اور نورالنسا سے لپٹ کر بولیں "اے بہن نورالنساء۔ خدا کے لئے ہنسئے۔ کیا یہ ہنسی کی بات نہیں ہے! اے بہن کیا یہ ہنسی کی بات نہیں ہے کہ انسان اپنے گھر سے نکل کر کسی دوسرے کے گھر جائے تو اپنے ہی گھر جا نکلے۔ اور بہن۔ میری معصومہ بھی اپنے گھر سے چلے گی تو اپنے ہی گھر جائے گی۔

اب نورالنسا کھل کر مسکرا رہی تھیں۔

باہر کار سٹارٹ ہوئی اور ڈرائیور نے رخصت کا ہارن دیا تو وقار جھپٹ کر دیوان خانے کے دروازے پر آیا۔ "اماں جی۔ کار تو جارہی ہے"۔

"جارہی ہے تو جانے دو" عشرت خانم بولیں "کیا یہ تمہارے باپ کی کار ہے"؟۔

وقار تیوری کر پیچھے ہٹ گیا اور نورالنسا پہلی بار قہقہہ مار کر عشرت خانم سے لپٹ گئیں۔ دونوں کی ہنسی وقار اور رہما کو ایک بار پھر دیوان خانے کے دروازے پر کھینچ لائی۔ جہاں وہ ریشمی پردہ ہٹا کر بتوں کی سی گول گول حیران حیران آنکھوں سے دونوں کو دیکھنے لگے۔ اور سیڑھیوں کے پہلے موڑ پر معصومہ کھڑی نیچے یوں دیکھ رہی تھی جیسے مداری نے ٹوکری کے نیچے چلا ہوا کاغذ رکھنے کے بعد اس میں سے کبوتر نکال لیا ہے۔ اور عشرت خانم کہہ رہی تھیں۔

"ہائے بہن نورالنسا میرے تو پیٹ میں بل پڑ گئے۔ قسم قرآن مجید کی۔ پسینہ سرخی پوڈر بہائے جاتے تو نیچے سے کیسے سچے اور کھرے چہرے نکل آتے ہیں۔ ہائے مجھے کتنا پیار آ رہا ہے آپ پر۔ آئیے ذرا دیر کو اوپر باورچی خانے کے ننگے فرش پر جا بیٹھیں"۔ ☆

★

ہماری موسیقی

مسلمان حکمرانوں اور فنکاروں نے سرزمین پاک و ہند میں موسیقی کے فن کو زندہ رکھنے اور اس میں نئے نئے اسالیب اور آہنگ پیدا کرنے کے سلسلے میں جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، اس کتاب میں اس کا ایک تاریخی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ہندی موسیقی میں عربی اور عجمی اثرات نے کس کس طرح خوشگوار تبدیلیاں پیدا کیں اور تاریخ میں کن اہم مسلمان موسیقاروں اور فنکاروں کا نام محفوظ ہو چکا ہے، ان کا تعارف اور تاریخی پس منظر اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔

"ہماری موسیقی" میں ان مسلمان مشاہیر فن کا تذکرہ شامل ہے:

حضرت امیر خسروؒ	سلطان حسین شرقی	میاں تان سین
نظام الدین مدھو نائک	تان رس خاں	مسیت خاں
	استاد جھنڈے خاں	

خوبصورت مصور سرورق۔ ۷۴ صفحات۔ قیمت صرف بارہ آنے

ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

حوّا اور سانپ

اعجاز حسین بٹالوی

وہ میرا نیا مؤکل تھا اور قانونی مشورہ کرنے آیا تھا۔

اس کی عمر بیس اکیس سے زیادہ نہ ہو گی۔ اکہرا بدن، لمبا قد، باریک سی مونچھیں اور چہرے پر ہلکی سی اُداسی جیسے جوانی میں کبھی کبھی ہوتی ہے۔ گفتگو میں ذرا سا حجاب۔ میں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ اگر میں اس کے چہرے کی طرف دیکھوں تو اسے گفتگو کرنے میں اور زیادہ دقت ہوتی ہے۔ بعض مؤکلوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہ کرو تو انہیں تسلی نہیں ہوتی۔ بعضوں کے چہرے کی طرف دیکھتے رہو تو ان کے لئے گفتگو کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں کبھی سامنے کی دیوار پر لگے ہوئے کیلنڈر کی طرف اور کبھی کتابوں کی الماریوں کی طرف دیکھتا رہا۔

اس نے کہا "جناب میں آپ سے ایک مشورہ کرنے آیا ہوں" پھر اس نے ذرا سا رک کر آہستہ سے کہا، جیسے کوئی سازش کی بات ہو "کیا عورت اپنے خاوند کو طلاق دے سکتی ہے؟"

"جی نہیں" میں نے جواب دیا "میرا خیال ہے آپ مسلمان عورت کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ وہ خاوند کو طلاق نہیں دے سکتی۔ اس سے طلاق حاصل کرنے کے لئے عدالت میں دعویٰ دائر کر سکتی ہے۔"

وہ خاموش ہو کر کسی گہری سوچ میں کھو گیا۔ میں نے پوچھا "آپ شادی شدہ ہیں؟"

"جی نہیں"۔ وہ پھر خاموش ہو گیا۔

میرا اصول ہے کہ جب تک مؤکل ایسے موقع پر خود کھل کر بات نہ بتائے اس سے کرید کرید کر پوچھنا مناسب نہیں سمجھتا۔ کیا معلوم وہ اس وقت اپنے آپ سے کونسی جنگ لڑ رہا ہو۔ میں نے سوچا یہ سوال اب تک مجھ سے کئی ایسی عورتوں نے پوچھا ہے جو شادی شدہ زندگی کی ناکامیوں اور مصیبتوں سے تنگ آ کر مجھ سے قانونی مشورہ کرنے آئی تھیں مگر ایک غیر شادی نوجوان مرد یہ سوال کیوں پوچھ رہا ہے۔ میں نے اس کے چہرے پر تذبذب اور کشمکش کے آثار دیکھ کر پوچھا "آپ کیا کرتے ہیں؟"

"میں . . . . جی، میں ریلوے ورکشاپ میں ملازم ہوں۔ ایف ایس سی میں دو مرتبہ فیل ہونے کے بعد مجھے نوکری کرنی پڑی۔ ہم انبالے کے ریفیوجی ہیں۔ والد کے کاروبار کا بھٹہ بیٹھ گیا تو میں تعلیم جاری نہ رکھ سکا، اب ورکشاپ میں کام کرتا ہوں۔ والدین کے پاس رہتا ہوں۔ ہمارا گھر شہر کے اندر ہے۔ ہم کو صرف نچلی منزل الاٹ ہوئی ہے۔ اُوپر والی منزل میں جالندھر کے ریفیوجی رہتے ہیں۔ ہم پانچ بہن بھائی ہیں۔"

میرے مختصر سے سوال کے جواب میں جب اس نے اتنی باتیں یکدم بتا دیں تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کہنے کی کوئی بات چھپا رہا ہے اور اس کے عوض ان باتوں کو غیر ضروری سمجھ کر اگلتا جا رہا ہے۔ وہ مجھے نچلے درجے کا سمجھدار نوجوان معلوم ہوتا تھا جس کی تعلیم اگر مکمل ہو جاتی تو زندگی میں ذمہ داری کا کوئی کام اچھی طرح سے انجام دے سکتا تھا۔

پھر وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولا "کیوں صاحب، اس مقدمے کا فیصلہ ہونے میں کتنا وقت لگے گا اور کیا اس میں کامیابی یقینی ہوتی ہے؟" میرا جواب سن کر وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔ "تو جناب اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ ممکن ہے ایسے مقدمے میں ایک دو برس لگ جائیں اور یہ بھی ممکن ہے آخر میں طلاق بھی نہ ہو۔"

"یہ ٹھیک ہے" میں نے جواب دیا "یہ سب کچھ تو مقدمے کے واقعات پر منحصر ہے اگر شہادت اچھی ہے اور وجہ مضبوط ہے تو طلاق ہو جائیگی

ورنہ مشکل ہے۔" پھر میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ "آپ کا کیا خیال ہے، وہ صاحب جن کے خلاف یہ مقدمہ دائر کیا جائے گا کیا وہ پوری شد و مد سے اس کی پیروی کریں گے؟"

"جی ہاں ضرور کرے گا۔ وہ بڑا ظالم انسان ہے۔" اور نوجوان کے چہرے پر غصے اور نفرت کے رنگ پھیلنے لگے۔ "اس کا بس چلے تو وہ اپنی بیوی کی ناک کاٹ ڈالے، اس کی آنکھیں پھوڑ دے، اس کے چہرے پر تیزاب ڈال دے، وہ تو بڑا مردود آدمی ہے جناب۔" اور پھر یک لخت اسکے چہرے پر اداسی کا سایہ پڑ گیا اور میری طرف دیکھ کر اس نے یوں زہرخند کیا جیسے نہ کہنے کی باتیں کہہ گیا ہو۔ پھر اس نے ایک عجیب و غریب سوال کیا۔ "یہ تو بتایئے کہ جب تک طلاق کا مقدمہ چلتا ہے، کیا میاں بیوی ایک ہی گھر میں رہ سکتے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "یہ تو ناممکن ہے۔ کم از کم میں نے کبھی یہ سنا نہیں، میرا خیال ہے اس سے تو مقدمہ کمزور ہو جائے گا۔"

پھر وہ کسی گہری سوچ میں پڑ گیا اور اٹھ کر دروازے کی طرف چلا گیا۔ پھر وہاں سے پلٹ آیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب اس کی پریشانی اور اضطراب نمایاں ہو گئے تھے۔ میں نے سوچا وہ بات جو اس کے دل میں اس طرح کھٹک رہی ہے۔ اب کہلوا ہی کیوں نہ لی جائے۔ میں نے چہرے پر وکیلوں کی سی بےتعلقی پیدا کرتے ہوئے کہا: "میرا خیال ہے آپ کسی ایسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں جو کسی اور کی بیوی ہے۔"

طوفان ختم ہو گیا اور اس کے چہرے پر سکون کے آثار نظر آنے لگے: "جی ہاں، یہی بات ہے۔ بالکل یہی بات ہے۔ وہ لڑکی ایک بہت ظالم آدمی کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہے۔ وہ اسے گھر سے باہر نکلنے نہیں دیتا۔ لڑکی کچھ پڑھی لکھی ہے، وہ خود جاہل ہے۔ خود بڈھا ہے نا، ہوٹل کا کام کرتا ہے اور ہر روز رات کو کام سے گھر آتا ہے تو اپنی بیوی کو پیٹتا ہے۔ میں نے ابھی آپ سے کہا تھا کہ ہمارے مکان کی اوپر والی چھت پر جالندھر کے ریفیوجی رہتے ہیں۔ یہ میں انہیں کا ذکر کر رہا تھا۔"

میں نے قانون کے ترازو میں زندگی کے بٹے ڈالتے ہوئے اس سے پوچھا: "بچے بھی ہیں ان کے کوئی؟"

"جی نہیں، ان کا کوئی بچہ نہیں، صرف میاں بیوی اس گھر میں رہتے ہیں اور سارے محلے والوں کو معلوم ہے کہ وہ اپنی بیوی کو مارتا ہے۔"

"تو یہ بتایئے کہ آپ جو اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو یہ محض اپنے ارادے کا اظہار کر رہے ہیں یا اس میں اس لڑکی کی خواہش بھی شامل ہے۔"

نوجوان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے چور آنکھ سے دروازے کی طرف دیکھا اور پھر دراز میز پر آگے کی طرف جھک کر کہا۔ "وہ بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے لیکن اگر اسے طلاق نہ ہو سکی تو کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔ ہم دونوں برباد ہو جائیں گے۔" محبت کی نرمی اس کی آواز میں آ گئی اور مجھے یوں لگا جیسے وہ میرے اندر بیٹھے ہوئے وکیل کو زندگی کی لوری سنا کر خاموش کرتا جا رہا ہے۔

اس کے عشق کی داستان طویل نہ تھی۔ میں اندرون شہر کے ایسے مقدموں کی نوعیت سے واقف ہوں۔ وہاں عشق کا آغاز اکثر ہمسائے میں ہوتا ہے۔ انجام کی صورتیں البتہ مختلف ہوتی ہیں مگر یہ نوجوان تو اپنی محبت میں نہا کر پاکیزہ ہو چکا تھا اور اس لڑکی کی باتیں کرتے ہوئے اس کے چہرے پر ایسی روشنی آ جاتی جیسی بعض مصوروں نے فرشتوں کے چہروں پر بنائی ہے۔ اس کی وارفتگی دیکھ کر مجھے اس پر رشک آنے لگا شاید ایسی بےپناہ محبت جو طوفان کی طرح ہر طرف چھا جاتی ہے جوانی کے اسی حصے میں ہوتی ہے اور پھر انسان باقی عمر اسی محبت کے بہانے چھوٹی چھوٹی محبتوں میں گزار دیتا ہے۔ یہ نوجوان جو زندگی کی دہلیز پر قدم رکھ رہا تھا، ایک ایسی محبت سے سرشار ہو چکا تھا جو اپنا راستہ خود متعین کرے گی اور میں تو محض ایک وکیل تھا۔ میں نے اسے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ "یہ طلاق کا مقدمہ اس لڑکی کو خود دائر کرنا پڑے گا۔ آپ اس کی طرف سے پیروی نہ کریں تو اچھا ہوگا۔ لڑکی کے والدین میں سے کسی کو یہ فرض انجام دینے دیجئے، اور ہاں یہ بھی یاد رکھئے کہ مقدمے کے واقعات کو ثابت کرنے کے لئے شہادت کی ضرورت ہوگی۔"

وہ نوجوان چلا گیا تو میں دوسرے مقدموں کی تفصیلات میں الجھ گیا۔ کہیں زندگی کی قبا پر کھونچ آ گئی ہے تو قانون اسے سینے کی کوشش کر رہا ہے۔ کہیں زندگی کے جامے پر خون کے دھبے ہیں تو قانون انہیں دھونے کی فکر میں ہے اور عدالتیں شہادتوں پر فیصلے کرتی چلی جاتی ہیں۔

چند دن گزرے ہوں گے کہ وہی نوجوان پھر میرے دفتر میں آیا۔ اس دفعہ اسکے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ کالا برقع پہنے ہوئے۔ جب وہ دونوں میرے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے تو لڑکے نے ایک جھجک کے ساتھ مجھ سے کہا: "انہیں کے بارے میں اس دن میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔" پھر اس نے لڑکی کو نام سے پکارتے ہوئے کہا: "ہاجرہ نقاب اٹھاؤ۔" اور لڑکے کے کہنے پر اس نے نقاب اٹھا دیا۔ اٹھارہ انیس برس کی ایک خوش شکل لڑکی تھی۔ غریب گھرانے کی مگر سلجھی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے پوچھا:

"آپ اپنے میاں سے طلاق لینا چاہتی ہیں؟"

وہ شرما گئی اور بولی۔ "جی ہاں!"

"وجہ کیا ہے؟"

وہ اور شرمائی اور اس کے رخساروں پر سرخی کی لکیریں دوڑنے لگیں لڑکے نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "ہاں ہاں بتاؤ شرمائی کیوں ہو؟" لڑکی نے ہمت کر کے کہا: "جی وہ مجھے مارتا بہت ہے۔ ہماری بنتی نہیں اور وہ مجھ پر ظلم بہت کرتا ہے۔ اور پھر....." یہاں پہنچ کر لڑکی رک گئی۔

"اور پھر......؟" میں نے دہرایا۔

"اور پھر اگر مجھے طلاق ہو جائے تو میں کسی اچھے آدمی کے ساتھ شادی کروں گی۔" میں نے چور نظر سے دیکھا تو میز کے نیچے اس لڑکی نے لڑکے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا اور ان دونوں نے اس طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھا جیسے انہیں میری موجودگی کا قطعاً احساس نہیں رہا۔ خدا جانے وہ کیا نگاہ تھی کہ مجھے یوں معلوم ہوا جیسے کمرے میں چاروں طرف موتیا کی ہلکی ہلکی مہک پھیل گئی ہو۔ محبت بھی کیا عجیب چیز ہوتی ہے۔ لڑکے نے پہلی دفعہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:

"یہ بتائیے اگر ہم اس وقت گھر جانے کی بجائے کہیں اور چلے جائیں تو کیا ہوگا؟"

میں نے کہا۔ "آپ دونوں گرفتار ہو جائیں گے۔"

"اور اگر ہم نکاح پڑھوا لیں تو؟"

"تو آپ کے ساتھ وہ مولوی بھی گرفتار ہو جائے گا جو آپ کا نکاح پڑھے گا۔ شادی شدہ عورت سے شادی کرنا جرم ہے۔"

میں نے لڑکے کے چہرے کی طرف دیکھا تو مجھے اطمینان ہوا کہ یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی ہے۔

لڑکی کی طرف دیکھ کر میں نے کہا۔ "اگر آپ طلاق کا دعویٰ دائر کرنا چاہتی ہوں تو اپنے والد یا کسی اور عزیز کو میرے پاس بھیج دیجئے۔"

چلتے ہوئے میں نے نوجوان کو پھر تاکید کر دی کہ اس نے لڑکی کے ساتھ بھاگ جانے کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا ان پر عمل نہ کرے۔ اس میں سراسر نقصان ہوگا اور کوئی اچھا نتیجہ نہ نکلے گا۔ لڑکی کی آنکھوں میں تشکر کی جھلک تھی جیسے کہہ رہی ہو۔ "اچھا کیا آپ نے ہم کو سیدھے راستے پر ڈال دیا۔"

اس واقعے کو مہینوں گزر گئے۔ ایک روز دفتر میں کام کر رہا تھا کہ منشی جی نے کہا: "ایک صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔ کہتے ہیں ضروری کام ہے۔"

میں نے کہا۔ "اندر بھیج دیجئے۔" ایک بزرگ صورت کمرے میں داخل ہوئے۔ عمر کوئی ساٹھ سے دو ایک برس کم۔ چہرے پر سفید ہوتی ہوئی چگی سی داڑھی، لبریز آنکھیں، کچھ پریشان سے دکھائی دیتے تھے۔ بیٹھتے ہی بولے۔ "میرے لڑکے نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ آپ کو سب قصہ معلوم ہے۔" انہوں نے اپنے لڑکے کا نام بھی لیا مگر مجھے کچھ یاد نہ آیا کہ کس کا ذکر کر رہے ہیں۔ اور میں یونہی اس امید میں ہوں ہاں کرتا رہا کہ کہیں نہ کہیں سے اس بات کا سرا ہاتھ لگ جائے گا۔ وہ کچھ اکھڑی اکھڑی سی باتیں کر رہے تھے۔ میں نے کہا۔ "آپ اپنے لڑکے کو کیوں نہیں بلا لیتے؟"

انہوں نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور بولے "آپ کو نہیں معلوم، اسے تو تین سال قید بامشقت کی سزا ہوگئی ہے"۔ اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے کاغذوں کا ایک پلندا میرے سامنے رکھ دیا۔ "میرا تو خیال تھا۔ آپ کو سب معلوم ہے۔ وہ ہمارے گھر کے اوپر والی منزل پر جالندھر کا ایک ریفیوجی رہتا ہے، ہوٹل کا کاروبار کرتا ہے، اس کی ایک جوان بیوی ہے"۔

میرے ذہن میں ٹن سے گھنٹی بجی اور میں نے بے صبری سے پوچھا۔" تو وہ نوجوان لڑکا اسے اغوا کرکے لے گیا آخر؟"

"جی نہیں اغوا کرکے لے جاتا تو مجھے افسوس نہ ہوتا۔ اس عورت کے خاوند کو جب ان دونوں کے بارے میں علم ہوگیا تو اس نے تھانے میں جھوٹی رپٹ لکھادی کہ جب وہ عورت گھر میں اکیلی تھی تو وہ بری نیت سے اس کے گھر میں گھس گیا اور......"

مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی اور میں نے جلدی سے پوچھا "یہ کیسے ہوسکتا ہے، کیا یہ وہی لڑکی نہیں جو آپ کے لڑکے کے ساتھ میرے دفتر میں آئی تھی۔ اپنے خاوند پر طلاق کا مقدمہ دائر کرنے؟"

اس بزرگ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں جیسے وہ یہ بات پہلی دفعہ سن رہا ہے۔ اس نے کہا" یہ مجھے معلوم نہیں۔ میرے لڑکے نے یہ مختار نامہ آپ کے نام دیا ہے۔ میں اسے جیل میں ملنے گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ میں آپ سے ملوں اور مقدمے کے کاغذ اور اپیل دائر کرنے کے لئے مختار نامہ آپ کو دیدوں۔ وہ تو یہی کہتا تھا کہ آپ کو سب معلوم ہے"۔

اور جب میں نے جلدی جلدی کاغذات دیکھنا شروع کئے تو مجھے احساس ہوا کہ مجھے تو خاک بھی معلوم نہیں۔ مقدمے کی رپٹ خاوند نے لکھوائی تھی کہ جب وہ دوپہر کو غیر متوقع طور پر گھر پہنچا تو مکان کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس کی بیوی کے چیخنے چلانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ دروازہ توڑ کر اندر پہنچا تو ملزم اسکی بیوی کے ساتھ زیادتی کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

میں نے جلدی سے مسماۃ ہاجرہ بی بی کا بیان پڑھنا شروع کیا۔ میں جوں جوں اس کا بیان پڑھتا جاتا تھا۔ الجھن اور بے یقینی کا جال میرے گرد تنگ تر ہوتا جارہا تھا۔ کیا یہ وہی لڑکی تھی جو اس خوبرو نوجوان کے ساتھ میرے دفتر میں آئی تھی۔ اس نے نہ صرف اپنے خاوند کے بیان کی تائید کی تھی بلکہ جرح میں یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ اس ملزم کو سرے سے جانتی ہی نہیں اور نہ اس سے پہلے کبھی اس سے ملی ہے۔

میں نے سفید چگی داڑھی والے بزرگ سے پوچھا" کیا آپ بتاسکتے ہیں اس عورت نے آپ کے لڑکے کے خلاف شہادت کیوں دی؟"

بوڑھے نے میری طرف یوں دیکھا جیسے اس لمحے میں اسے دنیا کا بیوقوف ترین آدمی نظر آرہا تھا اور پھر اس نے کہا: "میاں صاحب، آپ تو سمجھدار آدمی ہیں۔ آپ کو تو معلوم ہوگا کہ عورت جس کے قبضے میں ہو ہمیشہ اسی کی شہادت دیتی ہے۔ سارا محلہ جانتا ہے میرا لڑکا بے گناہ ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ ہوٹل والے نے عدالت میں لے جانے سے پہلے اپنی بیوی کو مارا بھی، اسے قرآن بھی اٹھوایا اور منتیں بھی کیں کہ اگر اس نے یہ گواہی نہ دی تو اس کے خاوند کی عزت ختم ہوجائے گی"۔

میں نے نظریں میز پر جھکالیں اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرنے لگا جیسے کاغذات کو دیکھنے میں مصروف ہوں۔ مگر دل تو یہی پوچھ رہا تھا کہ آخر اس لڑکی نے یہ بیان کیوں دیا۔ یہ تو وہی لڑکی ہے جو اس ملزم کے ساتھ میرے دفتر میں آئی تھی اور ان دونوں نے میری آنکھ بچا کر میز کے نیچے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ چگی داڑھی والے بزرگ نے دفتر کی گہری خاموشی کو توڑا۔ "میرے لڑکے کا آخری سہارا آپ ہیں۔ اسے آپ سے بڑی امیدیں ہیں"۔

میں سوچنے لگا کہ میں اس بزرگ کو کیسے سمجھاؤں کہ مجھے تو اس مقدمے میں وکیل نہیں گواہ ہونا چاہیئے تھا۔ عدالتیں تو مقدموں کے فیصلے شہادت پر کرتی ہیں۔ دفتر میں ہر طرف دیمک لگے ہوئے بوسیدہ کاغذوں کی بو پھیلنے لگی تھی۔

★

ایک پاکستانی فن کار

(دنیائے مغرب میں)

مصنف:- السانڈرو بوزانی

مترجم:- صوفی احمد وحید اختر

سجاد سے میری پہلی ملاقات کئی سال قبل اٹلی میں مقیم پہلے پاکستانی سفیر کے ہاں ہوئی۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں علامہ اقبال کی کتاب "جاوید نامہ" کا اطالوی زبان میں منظوم ترجمہ کر رہا تھا۔ سجاد اس وقت ایک نوجوان لڑکا تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں سے جو ذہانت ٹپکتی تھی اور سنجیدگی نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ اس کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو سنجیدگی ہے۔

فارسی کے عظیم صوفی شاعر باباطاہر عریاں کی شاعری سے متعلق اس کی معلومات اس وقت بھی بڑی وزنی اور ٹھوس تھیں جن سے پتہ چلتا تھا کہ اسے اپنی تہذیب اور ثقافت یعنی اسلامی روایات سے کس قدر لگاؤ اور عقیدت تھی۔

سجاد جیسے شخص کے لئے روم کے فنی حلقوں میں مقام پیدا کرنا آسان نہ تھا۔ اس کی پرورش اور تعلیم ایک بالکل جدا ماحول میں ہوئی تھی۔ جسے یورپی ثقافت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ لیکن اس کے باوجود آج ایشیا کے اس نوجوان فنکار کا اٹلی میں بہت چرچا ہے۔ حال ہی میں اسے "انٹرنیشنل آرٹسٹک ایسوسی ایشن" کا روم میں کونسلر چنا گیا ہے۔ اس کے تین ہزار سے زائد ممبر ہیں۔ جو زیادہ تر آرٹسٹ، شاعر، موسیقار اور معمار ہیں۔ اس کے صدر اور بارہ کونسلروں کا انتخاب ہر دو سال کے بعد ممبران کے ووٹوں سے کیا جاتا ہے۔ اور یہ دوسری بار ہے کہ سجاد کو ایک بھاری اکثریت سے کونسلر چنا گیا ہے۔

سجاد کونسل کے باقی تمام ممبروں سے کم عمر ہیں۔ اس کی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ ہے کہ ایشیا کا ایک فنکار اس کا ممبر کونسلر چنا گیا ہے۔ اور اہلِ پاکستان کو اس اعزاز پہ بجا طور پہ ناز ہونا چاہئیے۔ کیونکہ یہ نہ صرف سجاد ہی کی کامیابی اور عزت کا باعث ہے۔ بلکہ اس نے پاکستان کی شہرت کو بھی چار چاند لگا دئے ہیں۔

مشکلات بالعموم لوگوں کی زندگیوں کو کامیابی و کامرانی سے روشناس کرتی ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ وہ مشکلات اور تکالیف کو اپنے مقصد کے حصول کے لئے برداشت کریں۔ اور حصولِ مقصد میں ان رکاوٹوں کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کر دیں۔ جیسا کہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔ سجاد کی زندگی، مشکلات کا مجموعہ رہی ہے۔ ابھی وہ بچہ ہی تھا کہ اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ جس نے اس پہ مشکلات کا پہاڑ گرا دیا۔ اسے بچپن ہی سے مصوری کے ساتھ گہرا لگاؤ تھا۔ چنانچہ اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں وہ اپنی زندگی فن کے لئے وقف کر دے گا۔

علی گڑھ یونیورسٹی لائبریری میں اس نے مائیکل انجلو، لیونارڈو ڈی ونچی، رافیل وغیرہ کے فن پارے دیکھے۔ جنہوں نے سمندِ شوق پر تازیانے کا کام کیا اور اس نے تہیّہ کر لیا کہ جیسے بھی بن پڑے وہ مصوری کی تعلیم کے لئے روم جائے۔ اس کے پاس کوئی ذرائع نہ تھے۔ لیکن وہ فن کار تھا اور اسی لئے ثابت قدم رہا۔ چنانچہ اس نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے کوشش جاری رکھی۔

آج سے ساڑھے آٹھ برس قبل سجاد کی محنت پھل لائی اور فن کے بعض پرستاروں کی کوشش سے اسے روم کے پاکستانی سفارت خانہ میں اکاؤنٹنٹ کی اسامی مل گئی۔ روم پہنچتے ہی اس نے ایک "سنائٹ سکول" میں داخلہ لے لیا۔ اور وہاں مصوری کی تعلیم حاصل کرنے لگا۔ وہ دن بھر دفتر میں کام کرتا اور رات کو پینٹنگ سیکھتا۔ ان دنوں اسے سخت محنت کرنی پڑتی تھی۔ سارا دن فائلوں اور رات مصوری کی نذر ہو جاتی۔ اس کے

بعض ساتھی اس کا مذاق اڑاتے اور بعض نصیحت کرتے کہ وہ اپنی طاقت اور دولت کو خواہ مخواہ ایک فضول اور بیکار شغل میں ضائع نہ کرے۔ مشکلات اور رکاوٹیں دن بدن بڑھتی گئیں۔ لیکن اس نے اپنا کام بڑے انہماک سے جاری رکھا۔ سفیر، اور دوسرے اعلیٰ افسروں نے اس کی ہر ممکن طریق سے مدد کی اور وزارتِ خارجہ کے اعلیٰ، باذوق افسروں نے اس کی سرگرمیوں کو سراہا۔ کئی سال کی جدوجہد اور محنت کے بعد سجاد نے مصوری کی نمائشوں میں حصہ لینا شروع کیا اور بہت جلد غیر معمولی مقبولیت حاصل کرلی۔

اٹلی جیسے ملک میں سجاد کا مقبول ہونا تعجب انگیز ہے۔ کیونکہ گذشتہ دو ہزار سال سے اٹلی کو فنون کا گھر سمجھا جاتا ہے۔ اور ایک ایسے شخص کا جسے زندگی میں لاتعداد مشکلات نے گھیر رکھا ہو اور جس کے پاس دفتر کے کام سے فارغ ہونے کے بعد بہت تھوڑا وقت رہ جاتا ہو جسے وہ اپنے فن کی نذر کرسکے، اتنی شہرت اور مقبولیت حاصل کرلینا واقعی قابلِ داد ہے۔

گذشتہ چند سالوں میں سجاد نے تیس سے زائد نمائشوں میں حصہ لیا ہے، اور مندرجہ ذیل انعامات حاصل کئے ہیں:۔

(۱) طلائی تمغہ (اوّل انعام)؛ انٹرنیشنل فیسٹول آف ماڈرنیزم ۱۹۵۸ء۔ ۲۔ چاندی کا تمغہ (دوئم انعام)؛ انٹرنیشنل فیسٹول آف ماڈرنیزم ۱۹۵۶ء۔ ۳۔ چاندی کا تمغہ (اوّل انعام)؛ اگزیبیشن آف اٹالین لینڈسکیپ ۱۹۵۵ء۔ ۴۔ چاندی کا تمغہ: پینٹنگ اگزیبیشن، سان وائیٹو رومنا ۱۹۵۷ء۔ ۵۔ ڈپلوما برائے قابلِ تعریف کام: پینٹنگ اگزیبیشن، روم ۱۹۵۸ء۔

ان انعامات کے علاوہ سجاد نے کئی ایک سندیں اور سرٹیفکیٹ مختلف سکولوں اور فنی درسگاہوں سے حاصل کئے ہیں۔ روم کے ثقافتی و تہذیبی حلقوں میں وہ بہت مقبولیت حاصل کرچکا ہے۔ لہٰذا آج سجاد کی کوششیں بڑی ہمدردی اور ستائش کی مستحق ہیں۔ مجھے اس کے متعلق صرف اتنا کہنا ہے کہ وہ معدودے چند افراد میں سے ہے۔ جنہوں نے اپنے ملک سے باہر، وقت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ اور اپنے ملک کے پرچم کو سربلند کیا ہے۔ جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے "مشکلات ہی عظیم انسان پیدا کرتی ہیں" لیکن حد سے زیادہ مشکلات اور سرپرستی کی عدم موجودگی بسا اوقات باشعور افراد کے لئے سم قاتل ثابت ہوتی ہے۔ فنکار کے لئے مادی فوائد ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کی محنت اور ریاضت فن کی عظمت ہی کے لئے ہوتی ہے، نہ کہ مادی فوائد کے لئے!

تاریخ شاہد ہے کہ ادب اور آرٹ کا زریں دور وہی رہا ہے جس میں حکومتِ وقت یا حاکمِ عہد نے ادب اور فن کی سرپرستی کی ہو۔ لیکن جونہی سرپرستی سے ہاتھ کھینچ لیا گیا، ادب وفن کی ترقی بھی رک گئی۔ اور بسا اوقات زوال پذیر بھی ہوتی چلی گئی۔ اس کی واضح مثال سلطنتِ روم کا زوال ہے۔ پانچویں صدی عیسوی میں جب اس سلطنت پر زوال آیا تو ادب اور آرٹ کو یکسر فراموش کردیا گیا۔ اور عالموں اور دانشوروں سے بے حد بے اعتنائی برتی گئی۔ نتیجتہً ایک ایسا دور آیا جو سات سو سال تک قائم رہا۔ اس دور میں آرٹ اور ادب کا سخت قحط رہا۔ بالآخر چودہویں اور پندرہویں صدی میں شاہی خاندان نے دوبارہ ان کی سرپرستی اختیار کی۔ اور کلاسیکی روایات کو حیاتِ نو بخشی۔ اس ذہنی انقلاب نے سینکڑوں ذہین اہلِ علم وفن پیدا کئے۔ جن کی شخصیت اور کمال کا آج بھی چار دانگِ عالم میں ڈنکا بج رہا ہے۔ اسی قسم کے واقعات سے دوسری اقوام کی تاریخوں کے صفحات بھی مزین ہیں۔

دورِ حاضرہ میں وہ پرانا سلسلہ تو باقی نہیں رہا۔ شہنشاہیت بڑی حد تک ختم ہوچکی ہے۔ لہٰذا حکمرانوں کی سرپرستی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب فردِ واحد کی جگہ جمہوریت نے لے لی ہے۔ لہٰذا اب یہ جمہوری حکومت کا فرض ہے کہ وہ فنکاروں کی سرپرستی کرے اور ادب وفن کی ترقی میں معاون ثابت ہو۔

آج دنیا کے اکثر ترقی یافتہ ممالک میں چوٹی کے اہلِ قلم اور فنکاروں کو پارلیمنٹوں اور اسمبلیوں کا ممبر چنا اور بنایا جاتا ہے۔ انہیں معذوری کی صورت میں زندگی بھر کے لئے معقول پنشن دی جاتی ہیں۔ اُن کے فن پاروں اور کتابوں کی خرید میں عوام اور حکومت اپنی پوری دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ تاکہ اُن کی مالی اعانت ہوتی رہے۔ سڑکوں اور پارکوں کو ان کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ تاکہ ان کی یاد باقی رہ سکے۔ اور یہی نہیں بلکہ ہر سال ایک کثیر رقم انعامات کی صورت میں دی جاتی ہے۔ تاکہ ابھرتی ہوئی نسل کو ادب وفن کی قدر کا احساس ہو۔

اب مجھے نوجوان پاکستانیوں سے چند ایک باتیں کرنی ہیں:۔

میں پاکستان کے نوجوان طبقہ کو یہ نصیحت کروں گا کہ وہ سجاد کی زندگی سے سبق سیکھیں۔ وہ زندگی میں جو بھی پیشہ اختیار کرنا چاہیں کریں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ انہیں فنونِ لطیفہ یعنی موسیقی، مصوری اور سنگ تراشی وغیرہ میں بھی ضرور حصّہ لینا چاہئیے۔ فنونِ لطیفہ سے ہماری جمالیاتی حس بیدار ہوتی ہے۔ ان کے مطالعہ سے ہماری نظر میں وسعت اور خیالات میں طہارت پیدا ہوتی ہے۔ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ فنونِ لطیفہ انسان کو سُست اور بے کار بنا دیتے ہیں۔

اگر اطالوی مصوری، سنگ تراشی اور فنِ تعمیر، مغرب میں ایک عظیم انقلاب لا سکتے ہیں، اگر جرمن شاعری، موسیقی اور فلسفہ انہیں موجودہ سائنسی ترقی عطا کر سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اگر پاکستان میں انہیں اپنایا جائے تو یہ آپ کو ترقی کے راستے پر گامزن نہ کریں۔

دنیا میں ہر چیز بیک وقت مفید و غیر مفید ہو سکتی ہے۔ یہ ہمارے استعمال پہ منحصر ہے کہ ہم اسے اپنی ترقی کے لئے استعمال کریں یا تنزل کے لئے۔ آج پاکستان کو سائنس دانوں، انجنیئروں، معماروں، ڈاکٹروں، دیانت دار سیاست دانوں اور قانون دانوں کی ضرورت ہے لیکن ان کے ساتھ ہی ساتھ اُسے ایسے دانشوروں کی بھی ضرورت ہے جو عوام الناس کو خوابِ غفلت سے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کریں۔

تعلیم واحد ذریعہ ہے جس سے کسی ملک کو ایک مثالی ملک بنایا جا سکتا ہے۔ پاکستانیوں کو حالیہ انقلاب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نئے جوش اور ولولے سے اپنی منزل کی طرف گامزن ہونا چاہئے۔ خداوندِ کریم پاکستان کے عوام الناس کو ترقی اور خوش حالی کے راستے پہ گامزن کرے۔ آمین!

★

"ذہنی و ادبی نشاۃ الثانیہ": ———— بقیہ صفحہ: (۱۴)

اور انگلستان کا مصنف رچرڈ ملکاسٹر (RICHARD MULCOSTER) لکھتا ہے:۔

"کوئی زبان فی نفسہٖ کسی دوسری زبان سے بہتر نہیں ہوتی۔ اس کی فوقیت کا انحصار اس کے بولنے والوں کی ہمّت اور محنت پر ہوتا ہے جو اسے فصیح بناتے ہیں اور مختلف علوم سے مالا مال کرتے ہیں۔ لہٰذا یورپ کی علمی زبانیں اپنی قوم کے اُن افراد کی مرہونِ منّت ہیں جنھوں نے اسے اپنے گھر میں سنوارا۔ اور با ہر اس کی مقبولیت کا سبب بنے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ان کے وہ ادبی کارنامے جن کی خوبیوں پر آج ہمیں حیرت ہوتی ہے کبھی شرمندۂ تحریر نہ ہوتے۔"

"کیا یہ غلامی قابلِ افسوس نہیں کہ محض علوم کی خاطر ہم ایک دوسری زبان کے غلام بن جائیں۔ اور سارا وقت اس کی تحصیل پر ضائع کردیں جب کہ اس کے سب خزانے ہم اپنی زبان میں منتقل کر سکتے ہیں خصوصاً جب ہماری اپنی زبان ہماری آزادی کی مظہر اور لاطینی ہماری غلامی کی علامت ہے؟"

"مجھے روم سے محبت ہے لیکن لندن مجھے اس سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ میں اٹلی کا حامی ہوں لیکن مجھے انگلستان سے اس سے بھی زیادہ دلبستگی ہے۔ مجھے لاطینی کا احترام ہے لیکن مجھے انگریزی سے عشق ہے۔"

★

مضمون نگاران اور دیگر حضرات سے گزارش ہے کہ وہ ادارہ سے خط و کتابت کرتے وقت اپنا نام اور پتہ مکمل، صاف اور خوشخط تحریر فرمایا کریں۔ (ادارہ)

★

غزل

سراج الدین ظفر

اک عشق ہے آزادِ سزا اور جزا سے
ہر شے کے لئے ورنہ سزا بھی ہے جزا بھی

ناصح تری زلفِ سمن بو رہی موضوع
شب خلوتِ میخانہ میں ہم بھی تھے صبا بھی

بیٹھے ہوں اگر دست درازانِ خرابات
کُنجوں سے دبے پاؤں گذرتی ہے قضا بھی

اُن سے مری بیماریٔ دل میں ہے اضافہ
ہے روحِ شفا جن کے تنفس کی ہوا بھی

اخلاص ہو مفقود تو اے واعظِ خوشگو
الفاظ ہی الفاظ ہیں تسبیح و ثنا بھی

کیا الٹا زمانہ ہے کہ ہر سمت ہیں پہرے
ہے بندِ سلیماں کے لئے شہرِ سبا بھی

اے زہرہ وشو راہِ وفا میں مرے ساتھ آؤ
اس راہ میں رہزن بھی ہوں میں راہنما بھی

معلوم ہوا زہد فروشانِ حرم سے
اک جنس ہے بازارِ عقیدت میں خدا بھی

کچھ رشتہ تو ہوگا کہ جب یارِ گل اندام
بھٹکوں تو مرے ساتھ بھٹکتی ہے صبا بھی

اے تازگیٔ روئے غزالانِ خرابات
دم سے ہے ترے تازگیٔ آب و ہوا بھی

کیا کیا سفرِ راہِ محبت میں کشش ہے
چلتے ہیں مرے ساتھ نقوشِ کفِ پا بھی

اس طرح کیا تیز سبُو نے مرا احساس
سنتا ہوں سکوتِ ابدیت کی نوا بھی

کہہ دو کہ جو کر دے قدحِ بادہ مقرر
گردش اسی رستے پہ کریں ارض و سما بھی

اے آہوئے آوارہ ارادہ ہے کہاں کا
دل بادہ گساروں کا تعفن بھی ہے خطا بھی

دونوں سے مری روح نے باندھے تھے پیماں
کل رات کہ بُت بھی تھے مرے ساتھ خدا بھی

حوروں ہی سے مقصد ہے تو کیا شرطِ تقدس
کچھ اور طریقے ہیں تقدس کے سوا بھی

ہوتا ہے یہاں مثبت و منفی میں تصادم
قوسِ لبِ شاہد میں فنا بھی ہے بقا بھی

وہ پردۂ اسرار ہو یا پردۂ محمل
ہاتھ اپنے پہنچ جائیں گے بے اذنِ صلا بھی

کام آ ہی گیا تجربۂ زلفِ نگاراں
آسودہ ہیں میخوارِ تہِ دامِ بلا بھی

رکھا ہے مری خاک میں تو نے شررِ ہوش
اب کیا اسے سمجھوں کہ ستم بھی ہے عطا بھی

بہکا ہی نہ دے ہمنفسو مجھ کو مرا علم
عالم بھی ہوں آئینۂ جہلِ علما بھی

دیکھا ہے ظفر تجھ کو خرابات میں ہم نے
تجھ کو بھی ہے دعوائے کرامت، ارے جا بھی

غزل

ناصر کاظمی

کیا زمانہ تھا کہ ہم روز ملا کرتے تھے
رات بھر چاند کے ہمراہ پھرا کرتے تھے

اُٹھ گئی رسمِ مروّت ہی دلوں سے ورنہ
یار میخانے میں بیٹھے ہی رہا کرتے تھے

جہاں تنہائیاں سر پھوڑ کے سو جاتی ہیں
ان مکانوں میں عجب لوگ رہا کرتے تھے

کر دیا آج کسی غم نے انھیں بھی مجبور
کبھی یہ لوگ مرے دکھ کی دوا کرتے تھے

دیکھ کر جو ہمیں چپ چاپ گزر جاتا ہے
کبھی اس شخص کو ہم پیار کیا کرتے تھے

تم جفا بھی نہیں کرتے تو جفا کرتے ہو
وہ وفا کرتے رہیں گے جو وفا کرتے تھے

اتفاقاتِ زمانہ بھی عجب ہیں ناصرؔ
آج وہ دیکھ رہے ہیں جو سُنا کرتے تھے

★

صہبا اختر

کب تک بنامِ فکر نہ پھوٹے گی روشنی
محرومِ نطق ہیں کئی نغمے شنیدنی

رکھتی ہے اُس تبسّمِ سادہ کو رنگ رنگ
وہ غنچگیٔ لب کہ ہے ہر دم شگفتنی

پلکیں کہ جیسے چاند کی کرنیں سمٹ گئیں
کرنیں، کہ جن کا کام ہے بس تیر افگنی

میں چشمِ گُل بنوں کہ صبا کی طرح چلوں
وہ چہرہ دیدنی ہے وہ دامن کشیدنی

تیرے نثار تیری محبّت ہے جاوداں
ہر رنج رفتنی ہے ہر اک غم گذشتنی

کیوں سنگِ راہِ سلسلۂ رنگ و نور ہو
اے وسعتِ بہار! مری تنگ دامنی

صہباؔ غریبِ شہرِ سخن ہے مگر سُنو
پھر کس سے سُن سکو گے سخنہائے گفتنی

★

کُتّے کا کاٹا

ابن انشاء

ہمارے ایک دوست ہیں جمیل الدین عالی۔ غزل گو، دوہا نویس، خوش گل، خوش گلو، بذلہ سنج، حاضر جواب ——— آندھی، طوفان، بجلی، پارے اور ڈائنامیٹ کا آمیزہ ——— چونکہ دوست ہیں اس لئے ان کی خیریت ہمیں معلوم رکھنی پڑتی ہے۔ لہٰذا کل ہمارے ایک دوست نے جو فلسفی، نقّاد، سنجیدہ مزاج اور گنجے ہیں، سرِراہ ہمیں روک کر پوچھا:

"میاں یہ تمہارے عالی کو کس کتّے نے کاٹا ہے؟"

ہم نے کہا۔ "کتّے کا نام پتہ تو ہمیں معلوم نہیں۔ یہ سنا ہے کہ ایک روز گوشت کے ناغے کے دن عالی صاحب اپنے دوست ابن سعید کے پھاٹک پر اپنے چھکڑے سے اترے ہی تھے کہ موصوف نے ان کی سڈول ٹانگ کو بیف کا ٹکڑا یا نہ جانے کیا سمجھ کر دانت گاڑ دیئے تھے۔ خیر فکر کی کوئی بات نہیں موصوف اب پچھتا رہے ہیں، سلوتری ہر روز یہ موٹی سوئی ان کے پیٹ میں گھونپتا ہے۔"

کہنے لگے۔ "سلوتری؟ عالی صاحب کسی باقاعدہ ڈاکٹر سے انجکشن کیوں نہیں لگواتے۔"

میں نے کہا۔ "چشمِ بددور۔ عالی صاحب کو کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔ انجکشن کتے کو لگ رہے ہیں۔ خدا کرے تندرست ہو جائے۔ سنا ہے خوب صورت ہے لیکن آپ کو کہاں سے خبر ملی؟"

کہنے لگے۔ "حاشا! مجھے اس کی خبر نہ تھی۔ یہ تو آپ سے معلوم ہوا۔ میں نے تو محاورہ بولا تھا۔ اور یہ بھول گیا تھا کہ آپ اہلِ زبان نہیں ہیں۔ میں نئی کرن کا ذکر کر رہا ہوں۔ وہ بیٹھی سی کتاب انہوں نے لکھی ہے نا؟ بھائی تم اپنے دوہے دوہے لکھو۔ کیوں نثر میں مینیں ٹھونکتے ہو۔ کیوں سیاست کے پھٹے میں ٹانگ اڑاتے ہو۔"

میں نے کہا۔ "کیا چیز ہے نئی کرن۔ میں نے نہیں دیکھی۔"

کہنے لگے۔ "ضرور پڑھیئے گا۔ نئی حکومت کا ڈھنڈورا پیٹا ہے۔ بندۂ خدا۔ اپنے نام کا تو خیال کرنا چاہیئے تھا۔"

میں نے نہایت نادم ہو کر کہا۔ "واقعی بڑی ناشائستہ حرکت ہے۔ میں اسے سمجھا دوں گا۔ لیکن مجھے ایک دن کے لئے وہ کتاب دیجئے تو۔"

تب میں نے وہ کتاب پڑھی جس کے متعلق جمیل الدین عالی نے لکھا ہے کہ میں رات بھر بتی جلائے اپنے اینڈے بینڈے ہینڈ رائٹنگ میں لکھتا رہا اور صبح دم ختم کی۔ یہ کوئی ایسی اونچی کتاب نہیں ہے۔ ٹالسٹائی کی 'وار اینڈ پیس'، وکٹر ہیوگو کی 'لامزرابلے' اور شبلی کی 'شعرالعجم' سے اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، وہ کہیں بہتر تخلیقات ہیں تاہم میں نے اسے رغبت اور دلچسپی سے پڑھا اور ایک ہی نشست میں جماہیاں لئے بغیر ختم کر لیا۔ کراچی سے "کاشانۂ اردو" نام کے کسی پبلشر نے معمولی سا ٹائیٹل لگا کر چھاپ رکھی ہے اور بارہ کنے قیمت ہے۔ لیکن اس کی فروخت سے مجھے قطعی دلچسپی نہیں۔ کوئی صاحب اسے خریدنا چاہیں تو اپنی ذمہ داری پر خریدیں۔

جمیل الدین عالی، ایک چھوٹی سی ریاست کے آخری نواب کے فرزند دلبند ہیں۔ یہ ریاست پاکستان میں نہیں اور عالی صاحب کو چند سال قبل کلرکی کا چرخہ کاتتے ہم نے خود دیکھا ہے۔ ان کے اس دور کا ہم دوسروں سے مصلحتاً ذکر نہیں کرتے تھے لیکن حضرت نے اس کتاب میں خود یہ تسلیم کیا ہے۔ بہرحال نواب ہیں، بے ملک سہی۔ ان کے اہل خاندان کے سو سوا سو مربعے پاکستان میں بھی ہیں۔ جس شام زرعی اصلاحات کا اعلان

ہو لیے عالی صاحب رات بھر مضطربانہ جاگتے رہے۔

"ہائے اب کیا ہوگا۔ میرے بچوں کا مستقبل کتنا تاریک ہے۔ یہ زمینیں میرے خاندان میں رہتیں تو میں ہر سال یورپ جایا کرتا اور لندن میں اپنے زیرِ تعلیم بچوں سے مل کر فرانس میں انگور کے باغ کی تازہ کشید شراب پی پی کر دوشیزاؤں کے بارے میں دوہے کہا کرتا۔ مجھے سچ مچ کا دکھ ہے۔ کیا مجھے اسی نسل میں پیدا ہونا تھا۔"

یہ سوچ قدرتی سوچ تھی۔ ایک ایسے شخص کے لئے جس کی بیٹھک میں اب تک دقیانوسی عباؤں والے کج کلاہ بزرگوں کی تصویریں ٹنگی ہوں۔
"یہ تصویر اباجان کی ہے۔ یہ ان کے برابر لارڈ ڈینسٹون ہیں۔ ریاست میں شکار کھیلنے آئے تھے۔ غالب نے ہمارے اباجان ہی کو لکھا تھا: میں تمہارا دادا نہیں دلدادہ ہوں۔"

"انقلاب آیا۔ مارشل لا کا اعلان ہوا اور عالی جی کی آنکھوں کے سامنے ٹائم میگزین کے صفحے ناچنے لگے۔ نوری سعید کی دست وپا بریدہ لاش۔ کیوبا میں گولیوں کی باڑھ کے آگے سرنگوں اجسام ------" ہم پڑھے لکھے افسران خوف کے مارے لرز لرز جاتے تھے۔ قتل عام سے اتنا نہیں جتنا اپنی انا کے قتل سے۔ ہم ہر حکومت کے مستعد فرمانبردار اور چاق وچوبند افسران اس انقلاب سے لرز رہے تھے۔ سات بجے ایوب خاں کی تقریر سنی۔ مجھے ان کے ایک ایک لفظ سے خوف آرہا تھا۔ میرے بچے میری دہشت زدہ صورت دیکھ کر بھاگ گئے تھے۔ مجھے اپنا اکیلا کمرہ ایسے لگ رہا تھا جیسے کوئی سنسان جنگل ہو۔ جہاں چاروں طرف شیر گرج رہے ہوں۔
اب جو مارشل لا کے ضابطے چھپنے شروع ہوئے۔" اس کی سزا موت۔ فلاں بات کی سزا چودہ برس۔ دس برس۔ سات برس" تو عالی صاحب کو قدرِ عافیت معلوم ہوئی۔

"مجھے اپنی انگریز والی دلی یاد آگئی۔ گورا برابر سے گزرا تو ذرا پرے ہوگئے۔ باقی نہ دس برس نہ موت۔"

"میں مارشل لا سے مطمئن نہ تھا۔ وہ پرانے لوگ کچھ بھی تھے لیکن موت کی سزا تو نہ دے سکتے تھے۔ ایک دستور تھا۔ اس میں بنیادی حقوق تھے۔ عدالتیں ان کی حفاظت کرتی تھیں۔"

اِدھر ان کا یہ عالم تھا۔ اُدھر کافی ہاؤس میں بڑے سے بڑا دقیقہ رس بزرجمہر بیٹھا بلا معاوضہ حکمت کے موتی رولتا اور آپ کو ہر چیز کی اصل حقیقت سے آگاہ کرنے کے لئے ہمہ تن تیار ملتا۔ اس کو کسی قسم کا نظری دھوکا دینا ناممکن تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں دوربین اور دوسرے میں خوردبین تھی۔ سامنے ٹسٹ ٹیوبوں کی قطار تھی۔ وہ ہر چیز کا کیمیکل تجزیہ کرتے ہوئے اور ہر اعلان کی کنہ کو پہنچتے ہوئے آپ کو بتاتا تھا کہ:

"بوگس دعوے بھارت نے واپس کرائے ہیں۔"
"زرعی اصلاحات روس نے کرائی ہیں۔"
"چھپی ہوئی دولت برطانیہ نے نکلوائی ہے"
"سونا قارون صاحب کی وصیت کے مطابق نکالا گیا ہے۔"
"تعلیمی اصلاحات کی تجویز میکالے صاحب کر گئے تھے۔"
"امپورٹ لائسنس کی فروخت جرمن حکومت کے مفاد کے خلاف تھی۔"
"مہاجرین کا مسئلہ مصر نے طے کرایا۔"
"چیزوں کی قیمتیں اس لئے کم کی گئیں کہ غیر ملکی سیاحوں کو فائدہ پہنچے۔"
"رشوت کے خلاف مہم اسکاٹ لینڈ یارڈ کو خوش کرنے کے لئے ہے۔"
اس آب وہوا میں عالی صاحب نے نئی کرن لکھی تو یقیناً اسے کسی کتے نے کاٹ کھایا تھا۔ ابن سعید کے در دولت کے کتے نے نہیں، کسی

بڑے ہی ظالم اور زہری کتے نے ـــــ

وہ کتا جمیل الدین عالی کا DOG BENEATH THE SKIN ہے۔ ایک شاعر کا مضطرب ضمیر۔ اس کتے کے کاٹے کا علاج ہے ـــــ عالی ہی کے الفاظ میں :

"پیسے کھانے کی ترکیبیں، نقد، وظیفہ سیر"

"ہائے وہ دولت گھروں کی شامیں، وہ ان جانے کھوج
شیتل مدرا جلتی ناریں، میٹھے میٹھے بھوج"

"دس ڈالر میں پورس پیٹرنک سے پیار جتائیں
دس روبل میں لٹی فشر کو ننگا ناچ نچائیں"

عالی نے یہ علاج اور یہ حفظ ماتقدم پسند نہیں کیا۔ اچھا کیا یا برا کیا اس سے بحث نہیں۔ موجودہ قضیہ کی ابتدا یوں ہوئی کہ ایک روز ان کے کمرے کے باہر ایک چپراسی ایک دفتری سے بحث کر رہا تھا۔

"اچھا ایک بات بتاؤ"۔ ان پڑھ چپراسی نے دفتری سے پوچھا۔ "قانون کا کیا فرض ہے" پھر اس نے خود ہی جواب دیا۔ "قانون کا فرض ہے کہ ہم کو گھر دے۔ اناج دے اور ہسپتال کھولے۔ بولو ہے کہ نہیں؟"

"یہ فرض قانون کا نہیں" مڈل پاس دفتری بولا۔ "یہ فرض حکومت کا ہے"۔

"اچھا تو حکومت اور قانون الگ الگ ہے؟ تم ہمیں کیا سمجھتا ہے بھائی! ہم خود سب بات جانتا ہے"۔ چپراسی دباؤ میں نہیں آیا۔

"اچھا تو بڑا اتیرے لئے گھر بنا دیا ہے اس حکومت نے؟ جا آرام سے گھر پر قبضہ کر لے"۔ دفتری اس کی جہالت پر بھنانے لگا۔

"یہ بات نہیں ہے" چپراسی نے فتح محسوس کی۔ "مگر تم پہلے بتاؤ تمہارا دستور نے ہمارے لئے کیا کیا؟ اتنا قانون تھا مگر کون سا قانون چلتا تھا۔ بولو"

"اچھا نہیں چلتا تھا مگر اب کیا چل رہا ہے"۔ اب دفتری سوالوں پر اتر آیا۔

"دیکھو بھائی"۔ چپراسی بولا۔ "تم فیل ہو گیا۔ اب دوسرا آیا ہے۔ اسے دیکھو، اس کا کام دیکھو۔ جب وہ فیل ہو گا ہم یہی بات کرے گا۔ نہیں تو ہم اور بات کرے گا۔ ہم تو کام مانگتا ہے۔ بات کرنا نہیں مانگتا"۔

یہ سوجھ بوجھ کے ڈھائی انچھر جمیل الدین عالی کو کاٹی ہاؤس کے فیشا غورثوں کی عقل پر بھاری نظر آئے۔ اور اس نے کام دیکھنا شروع کیا۔

"میں کون دھنتر خاں ہوں جو نظریاتی الجھنوں میں نپتا پھروں"۔

(۱)

"ہماری ایک فوج تھی بے حد طاقتور فوج۔ اس کے پاس چھ اکتوبر کے بعد نئے اسلحہ نہیں آئے۔ وہی ٹینک، وہی توپیں، وہی رائفلیں جو ۸ اکتوبر کو اس کے پاس تھیں، ۶۔ اکتوبر کو بھی تھیں۔

۶۔ اور ۸۔ اکتوبر کے درمیان اس کے جوان اور افسر بھی نہیں بدلے گئے۔

یہ فوج ہماری سرحدوں کے قریب ٹھہری رہتی تھی مگر ۸۔ اکتوبر کے بعد ہمارا غلہ سرحدوں کے اندر ہی رہتا ہے ـــ کیوں؟"

لہ بیرونی سفارت خانے۔

(۲)

"۶۔ اکتوبر کو زمینداروں کے پاس غلہ نہیں تھا۔ نیا ترقی یافتہ ڈپٹی کمشنر پہلے ان کو حکم دیتا تھا پھر خوشامدیں کرتا تھا۔" میرا خیال تو کچھ سردار صاحب ۔۔ ابھی الکشن بھی آرہا ہے۔ میں بھی یہیں موجود ہوں۔ آپ بھی ہیں۔ برابر کے ضلعے میں انہوں نے اتنا جمع کرلیا ہے۔ اب آپ میرا تبادلہ ہی چاہیں تو اور بات ہے۔"

سردار صاحب کبھی رحم کھاکر دو ہزار من غلہ ظاہر کردیا کرتے۔ کبھی بلیک بہت اونچی جارہی ہوتی تو الکشن میں ہارنے کا خطرہ مول لیکر بھی انکار کردیتے اور ڈپٹی کمشنر نااہلی کا الزام لگواکر تبادلے یا رخصت پر چلا جاتا۔"

اور آج ان ہی زمینداروں کی جماعتیں اسی ڈپٹی کمشنر کے اہلکاروں کے سامنے قرینے سے صف میں لگی ہوئی لاکھوں من غلہ ظاہر کر رہی تھیں۔"

(۳)

ایک نواب صاحب، کا چودہ لاکھ کا کلیم منظور ہوچکا تھا۔ انہوں نے اسے گھٹا کر اٹھاسی ہزار کردیا۔ وہ ساتھ ساتھ تشریح بھی کرتے جاتے تھے۔

"یہ جو گھٹایا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ چودہ لاکھ جھوٹا تھا۔ چودہ لاکھ تو جملہ خاندانی جائداد کے تھے۔ تین نواب وہاں مرگئے۔ گو لاولد مرے مگر ان کا حصہ ہمیں نہیں آتا۔ ہم نے احتیاطاً دکھا دیا تھا کہ ان کی بیوہ طوائف تھی۔ نہ جانے گھر رہی ہو کہ چھوڑ بھاگی ہو۔ دوسرے چچا آنے کا حصہ دار قبلہ تایا میاں کا لڑکا تھا۔ وہ امریکہ میں بس گیا ہے۔ ہم نے اس کا حصہ بھی اپنے ہاں ڈال دیا تھا۔ پھر ایک کم بخت سوتیلی والدہ تھیں۔ ان کے نام باواجان نے چار آنے ہبہ کردیئے تھے۔ جب تک ہم رہے انہیں تکلیف نہ دی مگر قبضہ نہ ہونے دیا۔ کلیم میں وہ بھی ہم نے اپنا بتادیا تھا اور واقعہ بھی یونہی تھا مگر بھئی اب۔"

(۴)

بھنڈی، اور بابا جزیروں کے شاہ اسمگلر میرے ٹیکس گزاروں میں رہ چکے تھے۔ پچھلے وقتوں میں ان کی گفتگو کا یہ انداز تھا۔" ساب ادھر ہماری طرف آؤ تا کبھی۔ مچھی کھلائے گا ہم۔" وہ اینڈ اینڈ کر کہتے جیسے یہ کہتے ہوں۔" ساب تم ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ ہم بڑے سابوں کے آدمی ہیں۔"

اب یہی سمندر اور جزیرے منوں نہیں ٹنوں سونا اور ڈھیروں سامان اگل رہے تھے۔"

(۵)

۳۱۔ دسمبر کو ہمارے کمروں کے باہر تاجروں اور افسروں کی قطاریں کھڑی تھیں۔ پوشیدہ دولت کے اعلان نامے داخل کرنے کے لئے۔ ان میں تیسوں روزے رکھنے والے حجاج تھے۔ بعض اوقات ان کی لمبی سفید ڈاڑھیاں دیکھ کر ہم اپنے نپے تلے سوالات بھول جاتے تھے اور انکے حلفناموں پر فوراً یقین کرلیتے تھے۔

مگر ۳۱۔ دسمبر کی رات کے حلف نامے پہلے حلف ناموں سے مختلف ہوگئے تھے۔ کیوں؟ ایک آدمی نے اس کا جواب دیا۔" صاحب ہمیں تو یہ خیال ہوا کہ جنرل ایوب خاں نہیں چھوڑے گا۔ اب اس نے کہہ دیا کہ سچ بولو اور خطرہ نہ کرو تو ہم سبھی آہی گئے۔"

میں نے سوچا۔" جنرل ایوب خاں کو حساب کتاب کا کتنا علم ہے۔ شاید بہت معمولی۔ کیا وہ اس کے بہی کھاتے دیکھتے؟ اور دیکھتے تو پکڑ لیتے؟"

اس کا جواب بھی اس نے دیا (شاید میرے خیالوں میں)۔۔۔

"تم جو پکڑ لیتے۔ تم تو یہ کام جانتے ہو۔"

"تو وہ کہاں سے آگئے"

"ارے تم اپنے اندر جھانک کر دیکھو۔ وہ تمہارے اندر بیٹھے ہیں، اور مجھے دیکھو۔ وہ میرے اندر جو بیٹھے ہیں۔"

پس حاؔلی صاحب نے یہ کتاب لکھدی اور ہمارے فلسفی، نقاد اور گنجے دوست کو ناراض کرلیا۔ بہت سے اصحاب مجھ قسمیہ رازداری کا

حلف اٹھا کر بتلا چکے ہیں کہ عالی کا اصل مقصد اس کتاب کے لکھنے سے کیا ہے۔ پچھلے دنوں لاہور سے میرے اور عالی کے دو مدمغ دوستوں نے جو اعلیٰ انٹلکچول طبقے سے تعلق رکھتے ہیں (بائیں بازو والے نہیں۔ وہ تو بد اچھا اور بدنام بُرا کی ذیل میں مارے جاتے ہیں) مجھے پیغام بھیجا کہ عالی سے کہہ دو آج سے ہماری اُن کی کُٹی۔ ہم اس سے برأت کا اظہار کرتے ہیں۔ اس نے ہماری ناک کٹوادی۔"

میں نے کہا۔ "خیر باشد"

کہنے لگے۔ "میاں نئی کرن لکھ کر، حکومت کا ڈھنڈورچی بن کر، اس نے اپنے مستقبل پر لات ماری ہے۔ کونسی نئی کرن پھوٹ ہے بھلا۔ ہمیں بھی تو پتہ چلے۔"

میں نے اپنی عقل کے مطابق کچھ چنیں وچناں کرنے کی کوشش کی تو ان دوستوں کی زبانی معلوم ہوا کہ میں فرسٹ ایئر کے طالب علموں کی سی انتہائی سطحی اور سوقیانہ باتیں کر رہا ہوں اور یہ ضمیر کی خلش اور POSITIVE THINKING وغیرہ اصطلاحیں سن کر ان کو بے اختیار ہنسی آرہی ہے۔

اس ہنسی کے ڈر سے بے نیاز ہو کر میں نے کچھ اور مبتذل باتیں بھی کہہ دیں اور میرا واقعی خیال ہے :

(۱) جمیل الدین عالی نے صرف اپنے ادبی مستقبل کو خطرے میں ڈالا ہے، کسی اور کے ادبی مستقبل کو نہیں۔

(۲) کسی ادیب کو (خواہ وہ پاکستان کا ہے یا روس کا یا وینزویلا کا) اپنے ہاں کی حکومت یا اپنے ہاں کے انقلاب کی موافقت میں کچھ کہنے کا حق حاصل ہونا چاہیئے۔ جب وہ ایسا ایمانداری سے محسوس کرے۔

(۳) دیانت، خلوص، بصیرت، اور حب الوطنی ایسی چیزیں نہیں کہ ٹینڈر طلب کر کے کسی کو ان کا ٹھیکہ دیا جا سکے۔ یہ خواص کے علاوہ کبھی کبھی عامیوں کو بھی مل جاتی ہیں۔ ان کے لئے بہت بڑا صحافی، پروفیسر، وکیل یا حکومت کا سکتر یا وزیر ہونے کی ضرورت نہیں۔

(۴) حضرت جبرئیل۔ کہ بنفس نفیس آکر اہل زمین کی حکومت سنبھالنے اور خدا کی بے داغ بادشاہت قائم کرنے کے امکانات بہت کم ہیں، انسانی کاموں میں خطا و لغزش کی ملاوٹ معمولی بات ہے۔

(۵) قومی اور انفرادی زندگی میں ایسے موڑ آتے ہیں جب نامقبولیت یا زیاں کا خطرہ مول لے کر بھی دل کی بات کہنی چاہیئے۔

اور پھر عالی نے خاقانی کی زمین میں کوئی قصیدہ تھوڑا ہی لکھا ہے۔ احتیاط کا دروازہ بھی کھلا رکھا ہے :

"یہ صدر حکومت جو ہر محاذ پر آلائشوں سے جنگ کر رہا ہے، اچھے ارادوں کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اس نے اب تک تو اپنے وعدے پورے کئے ہیں"

"تاریخ بڑی بے رحم تلوار ہے۔ وہ نہ جنرل ایوب کی دوست ہے نہ میری۔ وہ بڑی بے باک نڈر اور صاف گو ہے۔"

★

عالی کی کتاب کو دیکھ کر کئی سوال پیدا ہوتے ہیں۔ اگر یہ کتاب بُری ہے تو عالی نے کیوں لکھی۔ اگر اچھی ہے تو دوسرے لکھنے والے کہاں ہیں۔ کیوں چپ ہیں۔ ایک وجہ اس کتاب کے لکھنے کی یہ ہوسکتی ہے کہ مصنف کا منہ موتیوں سے بھرا جائے گا یا کم از کم خلعت فاخرہ عنایت ہوگی۔ یہ بات ہوتی تو اس کے بہترین موقعے گزشتہ حکومتوں کے ساتھ گزر گئے۔ جو حکومتیں خود کچھ کام نہ کرتی ہوں وہ پراپیگنڈسٹوں کی محتاج ہوتی ہیں اور ان کی خوب سرپرستی کرتی ہیں لیکن کام کرنے والی یا انقلابی حکومتوں کو مداحوں کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ عالی کا شمار ان لوگوں میں کبھی نہیں رہا جو ہر حکومت کے مدح خواں ہوتے ہیں اور جن کے نزدیک سرکاری مصالح اور دعاوی سے ذرا سا انحراف بھی تخریبی کارروائی ہے۔ لوگو یا ما دراے سخن کچھ اور بات ہے۔ ان لوگوں کا شاعرانہ خلوص سے خیر مقدم کرنا جو اس کے خوش آیند جاگیردارانہ مستقبل پر اثر انداز ہوئے ہیں، مداح کی بھی خوبی ہے ممدوح کی بھی۔ حکومتِ وقت کی حمایت، خواہ وہ حکومت کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو، لوگوں کا نامقبولیت کا مجرب نسخہ ہے، اور ہمارے دوستوں نے عالی کے ادبی مستقبل کے متعلق جو تشویش ظاہر کی ہے وہ بے بنیاد نہیں۔ لیکن یہ ایک نفسیاتی سوال ہے۔

ہمارے اہلِ شعور میں بشرطِ استواری والے خوش عقیدگان اور ہر نئی حکومت کی طرف قبلہ راست کرنے والے ابن الوقتوں کے مقابلے میں دو طبقے اور ہیں۔ ایک جس کا خمیر کلبیت سے اٹھا ہے۔ یہ طبقہ آنکھیں اور کان موندے بیٹھا ہے اور صرف زبان کھولے ہے۔ ان لوگوں کے لئے اسلامی، جمہوری، اشتراکی یا فاشی کسی حکمراں کی تخصیص نہیں۔ یہ کسی کی رو رعایت کے قایل نہیں۔ ان کا ایمان یہ ہے کہ عالم آب و گِل کے مسائل ان کے سوا نہ کوئی سمجھ سکتا ہے نہ ان سے مشورہ لئے بغیر حل کر سکتا ہے۔ جب کبھی ملک پر کوئی افتاد پڑے یہ خوش ہو کر اور سر ملا کر کہتے ہیں: "دیکھا میں نہ کہتا تھا"۔ "میں نے تو پہلے ہی روز کہہ دیا تھا کہ یہ گاڑی چلنے کی نہیں"۔ ان کا کام محض ستاروں کی چال دیکھنا اور مستقبل کے زائچے بنانا ہے اور یہ لوگ اپنے خمارِ گندم کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ دوسرا طبقہ کلبی نہیں لیکن اپنے مزعومات کو الہام کا درجہ دیتا ہے۔ وہ اس بات کا قایل ہے کہ ہر چیز بطریقہ راسخہ شعرا ہونی چاہیئے اور اگر انقلاب کو آنا ہے تو ان کی نظریاتی بائبل کے احکام عشرہ کے مطابق آئے ورنہ یکسر غلط ہوگا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ زرعی اصلاحات ہو ہی نہیں سکتیں بھلا جو لوگ خود زمیندار یا کھاتے پیتے طبقے سے تعلق رکھتے ہوں وہ اپنے حقوق سے دستکش ہو سکتے ہیں؟ جب یہ اَن ہونی بات ہو گئی تو اب کہتے ہیں ذرا اسے عملی صورت ملے تو جانیں ــ جب عملی صورت بھی مل جائے گی تو ان کے پاس کوئی اور برہان قاطع نکل آئے گی۔ یہ لوگ اس مشہور ریاضی داں کے ہاتھ پر بیعت ہیں جس نے دریا عبور کرتے وقت اس کی گہرائی کا حساب نکالا تھا۔ ایک جگہ دو فٹ تھی، بیچ میں سات فٹ اور ایک کنارے تین فٹ ـ اوسط نکلا چار فٹ مطمئن ہو کر دریا میں قدم رکھ دیا ـ بیچ میں آ کر کنبہ ڈوب گیا۔ خود قسمت کے سکندر تھے ڈبکیاں کھاتے ہانپتے پاؤں مارتے کنارے پر آ لگے۔ پھر اوسط نکالی، وہی چار فٹ۔ حیران ہو کر کہنے لگے عجیب بات ہے۔ اوسط گہرائی برابر چار فٹ نکلتی ہے۔ کنبہ ڈوبا تو کیوں؟

زرعی اصلاحات بھی ہوئیں خفیہ آمدنیاں بھی باہر آ گئیں۔ اسمگلنگ بھی رک گئی، بدعنوان افسر بھی نکالے گئے۔ لیکن یہ کیسے ہوا؟ 'کتاب' کی رو سے تو ناممکن ہے ــ میاں ذرا میرے چٹکی لینا ــــ دیکھوں خواب کا عالم ہے یا بیداری کا۔

★

ہاں تو وہ کونسا نفسیاتی نکتہ ہے جو عالی یا کسی بھی ادیب کے لئے جو اثباتی نقطۂ نظر سے کوئی بات لکھتا ہے، خطرے کا باعث ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ کوئی کارنامہ کتنا ہی تعمیری کیوں نہ ہو اس کے حق میں کچھ کہہ کر مقبول ہونا بہت مشکل ہے، ہاں اس کے خلاف آپ چھوٹوں بھی آواز بلند کریں گے یا شاعری کے پردے میں چھپا ہوا احتجاجی یا تعریضی حملہ کریں گے تو لوگ طرح طرح کی رعایتوں اور چشم پوشیوں سے کام لے کر اسے سراہیں گے دنیا کے ان ادیبوں کی شہرت اور مقبولیت کا جنہیں ہم " DISILLUSIONED " کے زمرے میں رکھتے ہیں، یہ بھی ایک بڑا راز ہے۔ انسانی فطرت کسی کی اچھائی سننے کی طرف اتنی راغب نہیں ہوتی جتنی برائی سننے کی مشتاق ہوتی ہے۔ روس اور چین دنیا کے دو ملک ہیں جہاں سوشلزم کے عملی تجربے ہوئے، وہاں بلاشبہ اکثر تعمیری اقدامات اس قسم کے ہوئے جیسے ہمارے ہاں، اکتوبر کے انقلاب کے بعد ہوئے، یا متوقع ہیں۔ زرعی اصلاحات، تعلیمی اصلاحات، دستوری اصلاحات، روزگار کا تحفظ، بلیک مارکیٹ کا خاتمہ، دولت کے ارتکاز کا سدباب وغیرہ۔ ظاہر ہے ان کے متعلق نظمیں، مضمون، ڈرامے، افسانے، ناول وغیرہ بھی لکھے گئے ہوں گے۔ ان بے شمار تخلیقات میں سے کچھ چیزیں یقیناً اچھی بھی ہونگی ــ یعنی جو افادی بھی ہوں اور ادب بھی۔ لیکن ہم ان میں سے نہ کسی تخلیق کا نام جانتے ہیں نہ اس کے لکھنے والے کا۔ ہمارا پیمانہ وہی مفرور کرائے جنکو، وہی تیس برس پرانا آندرے ژید اور وہی سنکی جارج آرویل ہیں۔ آج اگر سکریننگ میں کوئی مشہور لکھنے والا نااہلی یا بدعنوانی کی بنا پر معتوب ہو جائے اور ایک رقت آمیز ناول لکھ کر جس میں صاحب دولت طبقے کو نزع کے عالم میں گرفتار دکھایا گیا ہو، انٹرنیشنل مارکٹ میں بھیج دے تو یقیناً وہ ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا اور پاکستان کی صحیح تصویر سمجھا جائے گا لیکن وہ تصویر حقیقت بھی ہوگی؟ کوئی عالی پاکستان کے موجودہ نظام کی ہجو کو اگر کسی ترکیب سے اپنے دوہوں میں اسمگل کر سکے تو خواہ ان کا موقف کیسا بھی سست بنیاد اور مغالطہ آمیز کیوں نہ ہوتا، اس کے ادبی مستقبل کی سبھی لوگ ضمانت لینے کو تیار ہو جاتے ــــ آخر کیوں؟

دانشور طبقہ ہر معاشرے میں بہت اہم طبقہ ہوا کرتا ہے لیکن اسے ریڑھ کی ہڈی نہیں کہا جا سکتا ــ یہ حیثیت غیر دانشور اکثریت ہی کو حاصل رہتی ہے۔

کسی صحیح انقلاب کا منصب دانشوروں کے لئے جنت شداد بنانا نہیں ہوتا۔ خیر کثیر اصل منزل ہوتی ہے۔ پاکستان کا انقلاب اگر کافی ہاؤس یا ڈرائنگ روم یا پریس کلب میں بیٹھے سو دو سو چار سو بقراطوں کو خوش نہیں کر سکتا تو کوئی ہرج نہیں۔ اس کا مقصد اسمگلروں، خائنوں، بلیک مارکیٹیوں اور عیاش جاگیرداروں کی خوشنودی بھی نہیں، خواہ وہ معاشرے میں کتنا ہی اونچا مقام کیوں نہ حاصل کر چکے ہوں۔ اس کی کسوٹی باقی آٹھ کروڑ غیر ادیب، غیر وکیل، غیر جرنلسٹ، غیر پروفیسر، غیر افسر، اور غیر نواب آبادی کا ردعمل ہے اور وہ ردعمل واضح ہے۔ موجودہ حکومت سے غالباً بعض فروگزاشتیں بھی ہوئی ہونگی اور آگے چل کر بھی ہو سکتی ہیں لیکن دو باتیں بدیہی ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ لوگ بہاوں سے مختلف ہیں اور کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے دارورسن کا ڈراما کھیلے بغیر چپ چاپ وہ کچھ کر دکھایا ہے جو عموماً کشت و خون والے انقلاب کے بعد ہوتا ہے (اکثر اوقات نہیں بھی ہوتا)، لہٰذا ان لوگوں کو معاف کر کے جو مرمریں برجوں میں بیٹھ کر آسمانی پریوں کے متعلق لکھتے ہیں یا حجاب امتیاز کے افسانوں کے کرداروں کی طرح دھنک دیکھتے، خوشبوئیں سونگھتے اور ایرانی بلیوں سے کھیلتے زندگی بسر کرنے کے قائل ہیں ـــ باقی سب کو سوچنا ہے کہ ملک کی تعمیر کے ایک اہم موڑ پر ان کا کیا فرض ہے۔ انہیں کس کا ساتھ دینا ہے۔ عالی کو لوگ جذباتی کہیں گے لیکن دنیا میں جذباتی ہونے کے مواقع بھی تو آتے ہیں، جس شخص نے دس سال تک نفسا نفسی کا ڈراما دیکھا ہوا سے جب معلوم ہوا کہ اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہو گیا۔ بڑے صاحبوں کو مچھی کھلانے والے شاہ اسمگلروں اور دیہات کے کھیتوں میں کسان زادیوں کا شکار کرنے والے زمینداروں کے دن ختم ہو گئے اور انسانی تعلقات میں سکے کے چلن کے علاوہ زندگی کی دوسری قدروں کی بھی پوچھ شروع ہو گئی ہے، تو وہ کیوں نہ جذباتی ہوگا۔ سرحد کا ڈیڑھ سو سالہ پیر مرد اول خاں سوچتا ہے یہ کون سا بادشاہ ہے جس کے راج میں پہلی بار میرے گاؤں میں قتل بند ہوئے ہیں۔ ایک صوبے کا حاکم حیران ہے کہ یہ کیسا صدر ہے جو ہدایت کرتا ہے کہ زمینوں کی ملکیت کی حد ایسی رکھنا کہ مجھے بھی اپنی زمین کا ایک ٹکڑا چھوڑنا پڑے۔ سکرٹری حیران ہے کہ اہل سیف کے طبقے میں سے یہ آدمی کہاں سے آ گیا جس کی زندگی کا ایک لمحہ بھی ذاتی عشرت میں صرف نہیں ہوتا، جس کا مطالعہ اتنا وسیع اور رائے اتنی صائب ہے۔ جو درویشوں فقیروں فلاکت زدوں اور اہل علم کے سامنے خاکساری سے گداز ہو جاتا ہے۔ جو برادری میں سبکی برداشت کر لیتا ہے لیکن ایک عزیز کو جس کا نام قرعے میں نہیں نکلا سفارش کر کے حج پر نہیں بھجوا سکا، جو ایک سالن کا کھانا کھاتا ہے اور اس مد میں خرچ کے لئے حکومت کی طرف سے جو رقم مقرر ہے اس کا ایک حصہ بچا کر سرکاری خزانے میں داخل کرتا ہے۔ یہ باتیں چھوٹی سہی لیکن حکومت کی پالیسیوں میں منعکس ہو کر چھوٹی نہیں رہتیں۔ یہ باتیں نامعلوم سہی لیکن جسے معلوم ہونگی اسے ضمیر کا کانٹا ضرور کھٹکے گا۔ عالی نے کتاب لکھ کر اپنی عاقبت، خراب کر لی ہے۔ دیکھیں:

کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد!



ہندوستان کے خریداروں کی سہولت کیلئے

ہندوستان میں جن حضرات کو ادارۂ مطبوعات پاکستان، کراچی کی کتابیں رسائل اور دیگر مطبوعات مطلوب ہوں وہ براہِ راست حسبِ ذیل پتے سے منگا سکتے ہیں۔ استفسارات بھی اسی پتہ پر کئے جا سکتے ہیں۔ یہ انتظام ہندوستان کے خریداروں کی سہولت کے لئے کیا گیا ہے:

"ادارۂ مطبوعات پاکستان" معرفت پاکستان ہائی کمیشن، شیر شاہ میس روڈ۔ نئی دہلی۔ ہندوستان۔

منجانب: ادارۂ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳، کراچی



مان سون کا دیس

بیگم سلمیٰ تصدق حسین

وہ لوگ جو برسات کی رت میں مان سون کے دیسوں کے سبزہ زاروں اور مرغزاروں کے پُر لطف نظاروں سے کیف اندوز ہوئے ہوں اور انہوں نے اِن مرغزاروں اور کہساروں میں موسلا دھار بارش اور طوفانی برسات کے مناظر دیکھے ہوں صرف وہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سیلون، سنگاپور، جاپان، انڈیا بلکہ تمام مشرق بعید کے ممالک اور مشرقی پاکستان کے دلفریب نظارے ایک دوسرے سے کس قدر مماثلت رکھتے ہیں۔ خاص طور پر برکھا رت کا دلفریب اور روح پرور حسن وہ کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ صبح ہو یا شام مطلع ابر آلود، گھٹا ٹوپ بادل! مست ہاتھیوں کی طرح جھومتے ہوئے، پانی سے لدے سیاہ بادل تہہ در تہہ لحافوں کی طرح اُلٹ پلٹ چلے آتے ہیں! اور فضا پر یوں چھا جاتے ہیں جیسے نیلی چھتری کے نیچے ایک اور کالی چھتری پھیل گئی ہو۔ اور اس چھتری میں سے کوئی چھاجوں بھر بھر کے پانی اُنڈیل رہا ہو۔ اور پھر یوں مینہہ برستا ہے کہ کئی کئی دن آسمان نظر نہیں آتا۔ اور اگر آسمان دم بھر کے لئے کھل جائے تو سورج کی کرنوں سے دُنیا چمک اُٹھے۔ آٹھوں پہر دھوں دھار بارش۔ ہر طرف جل تھل۔ ندیاں نالے بھر بھر کر اچھلتے ہیں۔ گھر گھر تال تلیاں، جھولے اور پکوان، غریبوں کی بستیاں ٹپکے سے حیران و پریشان نظر آتی ہیں۔ یہ سب پانی کے دیس، دھرتی کے پن کٹوروں کی طرح کناروں تک بھرے ہوئے، ڈل ڈل کرتے ہیں۔ اور لوگ جل پریوں کی طرح پانی میں تیرتے پھرتے ہیں۔ اوپر سے موسلا دھار پانی برستا ہے، اور نیچے دھرتی پر بھی پانی ہی پانی نظر آتا ہے۔

اگر آپ ہوائی جہاز کی بلندیوں سے یہ نظارہ دیکھیں تو اور بھی دلفریب معلوم ہوتا ہے۔ بے پایاں سمندر کی طرح کنارہ نظر ہی نہیں آتا۔ گاؤں کے گھروندے پانی میں گھرے ہوئے، بانسوں پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے آسمان سے یہ ننھے ننھے گھر نیچے زمین پر بکھیر دئے ہیں۔ کوئی یہاں جا پڑا ہے کوئی وہاں۔ اور اب یہ سارے بانسوں کے سہارے پانی کی سطح پر کھڑے ہیں۔

اگر تیز ہوا چلے تو شاید یہ گھر ناؤ کی طرح بہنے لگیں، لوگوں کی آمد و رفت ننھے ننھے شکاروں، کشتیوں اور درختوں کے کھوکھلے تنوں پر ہوتی ہے۔ جگہ جگہ سبز پودے اور پیڑ پانی سے باہر جھانکتے نظر آتے ہیں۔ خشکیوں کے رہنے والے پانی کے دیس میں حیرت سے منہ تکتے اور سوچتے ہیں کہ الٰہی خشک زمینوں پر ہم پانی کی ایک ایک بوند کو ترستے ہیں۔ اور یہاں تیری رحمت کا یہ عالم کہ زمین کو دم بھر کے لئے خشک نہیں ہونے دیتی۔

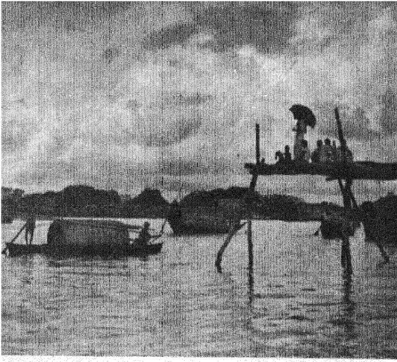
اِن پانی کے دیسوں کے باشندے آدھے خشکی اور آدھے پانی ہی میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ کوئی جگہ ایسی نہیں ہوتی جہاں پانی انسانوں کی زندگی میں اس طرح گھلا ملا نہ ہو جیسے شیر و شکر۔ خشکی کے رہنے والے ایسی رُت میں ضرور کپڑوں کو سنبھالیں گے، جسم کو چھپائیں گے اور کوشش کریں گے کہ وہ پانی سے بچ کر رہیں۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی اور ہے۔ عورتیں سروں پر گاگریں اٹھائے بے تکلفی سے پانی میں اُتر جاتی ہیں۔ انہیں ذرا بھی دھڑکا نہیں ہوتا کہ ان کی ساڑھی بھیگ جائے گی۔ یا جسم پانی سے شرابور ہو جائے گا۔

مرد ہیں تو وہ بھی جگہ جگہ کشتیوں میں گھومتے۔ مچھلیاں پکڑتے اور سودا سلف لاتے نظر آتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو مشرقی پاکستان کا یہ موسم اور یہ آب و ہوا، ایک نئی زندگی۔ اور نیا ہی نظریہ پیش کرتے ہیں۔ لوگ بے دھڑک پانی میں چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ سروں پر بانس کی چھتری نما ٹوپیاں رکھے ہوئے بارش سے بچاؤ کی صورت پیدا کر لیتے ہیں، اور روزمرّہ کے کام کاج میں کوئی رکاوٹ نہیں آنے دیتے۔

دیہاتوں کا منظر تو جو ہوتا ہے سو ہے، شہروں میں بھی پانی ہی پانی نظر آتا ہے۔ بلند اور عمدہ عمارات اونچی سطح پر بنی ہوئی طویل سڑکیں شہری آبادی کے لئے ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچاتی ہیں۔ سڑکوں کے دونوں جانب بارش کا پانی ہوتا ہے جبکہ قدرتی تالاب پانی سے لبالب اور کنول کے پھولوں سے بھرے ہوتے ہیں۔

مان سون کا دیس

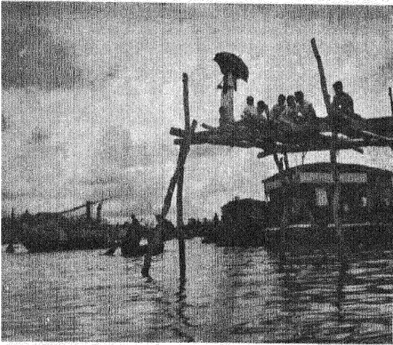
(مشرق پاکستان)



۱ :

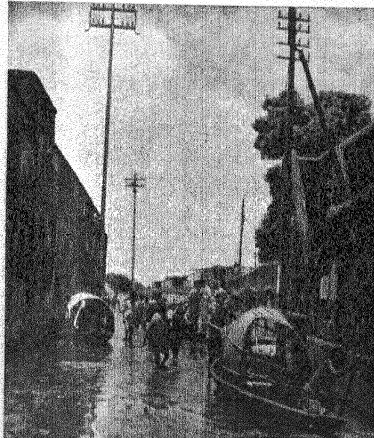


''آئے بدروا گھر گھر کے''



۲ :

۳ :

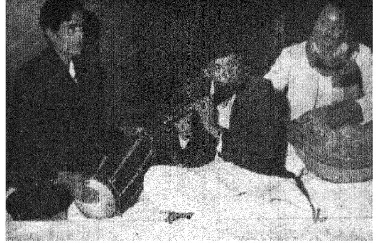


۱ : ''مجھے جانا ہے اس پار''

۲ : ''کشتی لوں یا لانچ''

۳ : ''کوچہ و بازار بھی اک جوئے آب''

ارض نغمہ
(وادیٔ مہران)



سرود بے خودی
(ڈھولک ، بانسری اور گھڑے پر سنگت)

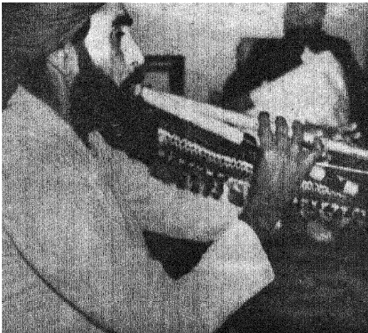
" مرلی کی دھن بجائے جا"





نغمات سرمدی
(روضہ شاہ عبداللطیف بھٹائی رح)

سوز نے (الغوزہ)



اونچے سرسبز درخت، پھولدار بیلیں، ہری ہری گھاس اور شام کے وقت چہکتے ہوئے پرندے، قمری کی کوکو کسی وقت بھی بند نہیں ہوتی - یہی وجہ ہے کہ بنگالی شاعری حسن کے اِن خوبصورت پیامیوں سے بھری پڑی ہے۔ قدرت کی اَن گنت حسین چیزوں کے علاوہ اڑتے پھرتے بادل، قدرت کے ارغوانی اور سفید ہرکارے، جگہ جگہ دوڑتے نظر آتے ہیں - یہ شعرا کے لئے ایک لاثانی دنیا کا نہایت دلکش اور حسین منظر ہے اور حسن و عشق کا لاجواب سرچشمہ ــــ - قدرت نے مشرقی پاکستان کو پانی اور ہریادل کا دیس بنا کر اس کے باسیوں کو زرخیز تخیل اور دلآویز طرز بیان بھی عطا کیا ہے - ایک مسلسل سبزہ زار جس میں پانی اَن گنت شکلوں میں بکھرا پڑا ہے - اس کے لئے خلیج بنگالہ کی وسیع پہنائی کیا کچھ معنی نہیں رکھتی - ادھر ہمالہ کی فلک بوس دیوار خلیج بنگالہ سے اٹھنے والے بے پناہ بخارات سے لدی ہوئی ہواؤں کے سامنے سینہ تان کر کھڑی ہو جاتی ہے اور انہیں حکم دیتی ہے کہ وہ اپنے طوفانی جوش و خروش کے ساتھ واپس لوٹ جائیں، اور جل تھل کا عالم رچادیں - بخارات بھی اس حکم کی تعمیل میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے - بادلوں کے کارواں پر کارواں اُمڈ اُمڈ کر آتے ہیں، فضا دھواں دھار ہو جاتی ہے - اور برسات کا گھن گرج ڈراما بڑے زور و شور سے شروع ہو جاتا ہے - جیسے کسی زبردست رَن میں رتھ ہی رتھ گڑگڑاہٹ پیدا کرتے چلے آ رہے ہوں - اس برسات کا ہر روپ کیف انگیز ہوتا ہے - آپ نے فلم "تان سین" میں دیکھا ہو گا کہ جب دیپک راگ گانے سے تان سین کا تن من پھنکنے لگتا ہے، تو اس کی محبوبہ "میگھ" راگ الاپنے لگتی ہے "اُمڈ گھمڈ کر برسو - پیا پر برسو" بادل کشتۂ محبت کی یہ درخواست سُن کر روئی کے گالوں کی طرح اِدھر اُدھر اُبھرنے لگتے ہیں - اور دیکھتے ہی دیکھتے - تمام آسمان پر چھا جاتے ہیں - اور پھر ایک طوفان ـــــــــــ بجلی رہ رہ کر چمکتی ہے، سیاہ بادل آپس میں ٹکراتے ہیں ــــ کڑک، خوفناک کڑک، دھرتی کا دل ہلا دیتی ہے، برسات کی اس جلالی شان کو دیکھنا ہمّت سے تعلق رکھتا ہے -

ہم خشک خطوں کے رہنے والے اگرچہ ان کیفیات سے بے بہرہ نہیں، مگر برسات کی جلالی اور قہرمانی شان سے آشنا نہیں ہو سکتے - ہمارے ہاں بھی برکھا رت کچھ ایسے ہی طمطراق اور کروفر سے آتی ہے - ہمارے یہاں بھی خلیج بنگالہ سے اٹھنے والے بخارات پہاڑوں کے سینوں سے ٹکرا کر برسات کا حسن و جمال پیدا کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ ہریادل بکھیرتے ہوئے اِدھر سے اُدھر نکل جاتے ہیں - ایک آدھ موقعہ پر ہمارے یہاں بھی دھرتی پر مشرقی پاکستان کا گمان ہونے لگتا ہے - ندی نالے ہر طرف ہاتھ پاؤں پھیلا دیتے ہیں - اور ایک بے پناہ سیلاب بن کر لوگوں کو طوفانوں سے نبرد آزما ہونے پر مجبور کر دیتے ہیں - زندگی خطروں میں گھر جاتی ہے - اور موت کے منہ میں بھی حیات کا سُراغ نکلنے لگتی ہے - مشرقی پاکستان اور دیگر خطہ ہائے وطن جیسے ایک ہو جاتے ہیں - اور ان طوفانی مصائب کا مقابلہ دونوں میں یکانگت پیدا کر دیتا ہے - خلیج بنگالہ کا پانی کراچی کی جانب منہ موڑ لیتا ہے - کون یقین کر سکتا ہے کہ سمندر کے کنارے پر آباد کراچی، جو برساتی طوفانوں سے نا آشنا تھی، اس کے گلی کوچے بھی ان طوفانوں سے ہمکنار ہوں گے - درحقیقت قدرت تند و تیز گھٹاؤں کے ذریعے کراچی اور سندھ کو اپنے وطن کے اس خطۂ دور و دراز سے مانوس کرانا چاہتی ہے - اب کراچی بھی مشرقی پاکستان کے تصور سے محروم نہیں - وہاں بھی قدرت اسی زور شور سے ساون کا حسین موسم مہیا کر دیتی ہے - اور اس کے گلی کوچوں کو ندی نالوں میں تبدیل کر دیتی ہے -

مگر سچ پوچھئے تو یہاں کی برسات اور مشرقی پاکستان کی برسات کا کیا مقابلہ! آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے، اس قدر بے پناہ کہ الامان و الحفیظ! اس کا نقشہ تو وہی کھینچ سکتا ہے جس نے اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو - مری اور اکثر دوسرے پہاڑوں کی طرح یہاں بھی بعض گھروں کی چھتیں چادری ہوتی ہیں - جب ان پر بارش کے موٹے موٹے قطروں کی اندھا دھند بوچھاڑ ہوتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے وحشی جنات نے ہزارہا ٹین کے کنستروں کو بے تحاشا پیٹنا شروع کر دیا ہو اور کان پڑی آواز سنائی نہ دے - اس قہرمانی شور و غل سے حسِ سماعت شل ہو جائے تو بعید نہیں - اور لطف یہ ہے کہ اس جلال میں ناقابلِ بیان جمال بھی پنہاں ہے - افسوس ہے کہ مغربی پاکستان کا اردو ادب اس جمال فطرت سے آشنا نہیں ہوا - ہمارے اکثر ادیبوں کو وہاں جانے کا موقعہ نہیں ملا - ورنہ آج سحر بنگالہ کے ساتھ ساتھ حسنِ فطرت کے سحر کا بھی چرچا ہوتا - برسات کے قہرمانی پہلو کی جھلک فضل احمد کریم فضلی کے ناول "خونِ جگر ہونے تک" میں اس طرح پیش کی گئی ہے کہ اس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں -

یہ تو مشہور ہے کہ زندگی اور ماحول میں چولی دامن کا ساتھ ہے - پھر کیا بعید ہے کہ جہاں افق پر بادل چھا جائیں - وہاں انسانی ذہن پر بھی

بادل ہی بادل منڈلانے لگیں۔ برسات کے موسم کی رومانی اور جذباتی کہانیاں شاعر کے لئے ایسا مواد مہیا کرتی ہیں کہ وہ دیوان کے دیوان مرتب کرسکتا ہے۔ اور بچاری عورت کے نام سے برسات کو مناسبت دے کر پریم کہانیاں لکھی جاتی ہیں۔ پی کی لگن، اور برہ کی اگن اور خدا جانے کیا کیا جادو نہیں جگائے جاتے۔ جس برہن کے پیا پردیس سدھارے ہوں، اس کی نظروں میں اُڑتے پھرتے بادل قدرتی پیغام بر نظر نہیں آئیں گے تو اور کیا ہوگا؟ یہی وجہ ہے کہ مشرقی پاکستان کی شاعری میں ان خوبصورت ہرکاروں کا بار بار ذکر آتا ہے، اور گیت لکھنے والے انہیں کے گن گاتے ہیں۔ وہاں پر بادل اور پانی ہی دو چیزیں زندگی میں حُسن و جمال اور محبت کی روح پیدا کرتی ہیں۔ بیگھوٹوں کا سلسلہ، گاگروں کا بھرنا اور چھلکنا، سانولیوں کا مٹک مٹک کر چلنا، بادلوں کی دلفریب آنکھ مچولیاں، ندی نالوں کا اٹھکیلیاں کرتے ہوئے بہنا، کشتیوں کی روانی، کھویوں کے گیت، چپوؤں کی آواز، لہروں کا بن بن کر ٹوٹنا، پانی میں مچھلیوں کا اچھلنا اور جھلملانا، کسانوں کا پانی سے بھرپور کھیتوں میں دھان لگاتے ہوئے گیت گانا اور بھونروں کا ڈال ڈال پات پات گھومنا۔ یہ سب زندگی کو ایک ناقابلِ بیان کیف عطا کرتے ہیں۔ سینکڑوں رومان اس کے آغوش میں پرورش پاتے ہیں۔ اور شاعری کا ایک وسیع حصّہ انہیں رومانوں کے سہارے جیتا ہے۔ بادلوں میں قوسِ قزح کی اٹھان حسن کی کمان بن کر عشق کے دیوتاؤں کو بلاتی ہے۔

ادھر کسانوں کی سوئی ہوئی امیدیں خود بخود جاگ اٹھتی ہیں، زندگی کھیلنے کودنے اور ناچنے لگتی ہے۔ شاعری اسی مان سون کی فضا میں پروان چڑھتی ہے۔ شعر و ادب کی گود ہری ہو جاتی ہے اور سینکڑوں جذبات مایوسی کی گرفت سے نکل کر حیات نو سے ہم آغوش ہوتے ہیں۔ چنانچہ بنگلہ شاعری جہاں ندی نالوں، کشتیوں اور مانجھیوں کے گیت سناتی ہے، وہاں کھیتوں کھلیانوں، دھرتی اور انسانوں کے راگ بھی الاپتی ہے۔ بنگلے کے مائیہ ناز شاعر نذر الاسلام اسی زندگی کے گیت اور انہیں طوفانوں کی کہانیاں سناتے ہیں، اور انہیں ملاحوں اور دہقانوں کے من کی جوت جگاتے ہیں۔ ان سب کا دامن اسی برسات کے موتیوں سے مالا مال ہے۔ اور ہر چیز اسی کی زلفِ گرہ گیر میں اسیر ہے۔ جو زلفِ بنگال سے کم دلآویز نہیں۔ دوسری طرف اس بانسوں کے دیس میں بنسری کا نغمہ بھی وہ کیف پیدا کرتا ہے جو بے اختیار شاعری کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔

یہ دیکھتے ہوئے کہ مان سون اس دیس کے چپے چپے کو گلزار بنا کر جنگل میں منگل کا سماں پیدا کر دیتی ہے، یہاں کے رہنے والے بجا طور پر اپنے دیس کے لازوال حسن پر، جو فطرت نے سے اس دریا دلی سے عطا کیا ہے، فخر کرتے ہیں اور اس سے لطف اندوز ہو کر شعر و نغمہ کا ایک ایسا ذخیرہ چھوڑ جاتے ہیں جو صدیوں تک ان کی یاد تازہ رکھتا ہے ؏

راولپنڈی — میرے خوابوں کا شہر

رفیق خاور

اگر میرے ذہن میں راولپنڈی کا تصور کتنی ہی یادوں سے لپٹا ہوا آئے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ کیونکہ میں نے اسی میں آنکھ کھولی اور اسی میں پروان چڑھا۔ میری نظر میں یہ بچپن کے دیکھے ہوئے نظاروں کی خواب نما دنیا ہے جس کی کشش میرے دل سے کبھی نہیں مٹ سکتی۔ اور اب جب حالات نے اسی کے پاس نئے "دار الحکومت کی طرح" ڈال دی ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ میرا خوابوں کا شہر اوروں کے خوابوں کا شہر بھی بن جائے۔

مجھے وہ دن یاد ہیں جب میں صبح سویرے اٹھتا تھا تو نظروں کے سامنے برف کی سفید براق دیوار کھڑی نظر آتی تھی جیسے کوہ ہمالیہ کا بے پایاں برف پوش سلسلہ میرے بالکل پاس کھڑا ہو۔ اور اقبال کے شعر کی مکمل تفسیر کرتا

اک تجلی تھی کلیم طورِ سینا کے لئے
تو تجلی ہے سراپا چشمِ بینا کے لئے

اور یہ کہ

برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالمتاب پر

اس برف کے دامن پر جو زمین سے آسمان تک پھیلی نظر آتی تھی جابجا دھاریں سے دکھائی دیتے تھے۔ جیسے سفید بادلوں پر بجلی کوند کر شاخ در شاخ نظر آتی ہے اور پھر جس طرف نظر اٹھائیں ٹیلے ٹیلے پہاڑ ہی پہاڑ۔ نور پور اور سید پور کی پہاڑیاں جن کے نشیب میں نیا دار الحکومت آباد ہونے کو ہے نو دس میل ہی تو دور ہیں نور پور کے پہاڑ پر دور سے ایک بڑا سا سفید نشان نظر آتا ہے۔ اس کے متعلق ایک بڑی دلچسپ کہانی سننے میں آئی تھی۔ یہ کہ کسی شخص کی گائیں سیلاب میں ڈوب گئی تھیں وہ ایک بزرگ کے پاس پہنچا اور رو دھو کر اپنی بپتا سنائی اس نے کہا تم اپنے گھر کا رخ کئے چلے جاؤ اور گائیں نکل نکل کے تمہارے پیچھے چلتی آئیں گی لیکن خبر دار! پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا ورنہ وہ سب پتھر ہو جائیں گی۔ اس نے بزرگ — (شاید وہ شاہ بری لطیف ہی ہوں) — کے کہنے پر عمل کیا اور گھر کی طرف منہ کر کے چلنے لگا تھوڑی دور چلا تو خیال آیا دیکھوں بزرگ کی بات کہاں تک سچ ہے۔ اس وقت تک صرف ایک بچھڑا باہر نکلا تھا وہی پتھر بن کے رہ گیا! بظاہر یہ عوامی ذہن کی من گھڑت کہانی معلوم ہوتی ہے جو بچھڑے سے ملتی جلتی کسی چٹان کو دیکھ کر گھڑی گئی ہے۔

کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ پہاڑ پر سے دھواں اٹھتا معلوم ہوتا اور آگ کی ٹیڑھی میڑھی لکیریں دکھائی دیتی جو کبھی لمبی ہو جاتی کبھی چھوٹی۔ جیسے نوا "ہنس" رہا ہو ——! ۔ خبر نہیں یہ کہاں تک سچ ہے لیکن ہمیں بتایا یہی جاتا تھا کہ یہ پہاڑی جنگلوں میں آگ لگ گئی ہے۔ کچھ بھی ہو اس آگ کا سماں بہت دلکش معلوم ہوتا تھا جی چاہتا ان پہاڑوں کو قریب سے دیکھیں چنانچہ مری کی تنگ سڑک پر جو زمین کی سطح سے ڈیڑھ دو گز اونچی بنائی گئی تھی اور جس کے دونوں طرف توڑے ہوئے پتھروں کے ڈھیر کے ڈھیر لگے رہتے تھے کبھی مستطیل کبھی مربع، سائیکل چلاتے چلاتے ہم نور پور پہنچ ہی جاتے۔ اس وقت ہمیں اندازہ ہوتا کہ پہاڑ کتنے پر فضا ہوتے ہیں اور ان کی آب و ہوا کتنی خوشگوار۔ نیچے بیس پچیس فٹ کی گہرائی میں ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کا صاف شفاف بل کھاتا نالہ عجیب لطف دیتا اور اس سے پرے بری شاہ لطیف اور دوسرے بزرگوں کے خوشنما مزار بڑے باوقار معلوم ہوتے اور ساری جگہ

یوں لگتی جیسے یہ ایک بہت ہی خوش آئیند باغ ہو۔ اگر یہاں میلہ لگا ہوتا تو اس کی رونق کیا کہنے۔ طرح طرح کے لوگ دور دور سے آئے ہوتے اور میلے کو چار چاند لگاتے۔ راگ رنگ اور ناچ گانا تو خیر ہوتا ہی ہے۔ لیکن جوئے کے رسیا دُور دُور سے آتے۔ کوئی ہارتا کوئی جیتتا اور جو ہار جاتا وہ اپنے مخصوص پشاوری انداز میں کہتا "خو شاہ بری لطیف نہ ہوسی طوطا دبا ہوسی" یعنی یہاں شاہ لطیف دفن نہیں ہیں طوطا دفن ہے جب ہی میں اس کی مدد سے کامیاب نہیں ہوا ——!

یہ تو یہاں کی زندگی کا مزاحیہ پہلو ہوا، جو کہاں نہیں ہوتا ہے۔ کہتے ہیں نالے کا پانی چشموں سے آتا ہے اور ہم ان کا سراغ لگانے کے لئے بڑی بڑی چٹانوں پر لپک لپک کر چڑھتے اور چشموں تک پہنچ کر ہی دم لیتے۔

نورپور سے ذرا پرے جائیں تو بل پیچ کھاتی پہاڑی سڑک کا اندازہ ہونے لگتا ہے۔ اور میل ڈیڑھ میل آگے بڑھیں تو لوکاٹ کے لمبے چوڑے باغات سے ہوتا ہوا انسان سید پور کے ہمسایہ پہاڑ تک پہنچ جاتا ہے۔ جہاں ہندوؤں نے اپنے مخصوص انداز میں مندر بنائے ہوئے ہیں اور نیچے مردوں اور عورتوں کے لئے علیحدہ علیحدہ غسل خانے بنائے ہیں۔ جن کے بیچوں بیچ ایک نالہ ہو کر نکلتا ہے۔ ان عمارتوں کے پیچھے بھی کچھ تاریخ ہے یا شاید کوئی تحریک تھی جو مجھے بھول چکی ہے۔

ان چھوٹے چھوٹے پہاڑوں کو جو سڑک جاتی ہے وہ مری روڈ کے اس طرف ایک اور سڑک ہے۔ مری روڈ کی دوسری طرف بھاری بھرکم چٹانوں میں سے بل پیچ کھاتا ایک بہت ٹھنڈا نالہ آتا ہے جو راول پر آبشار بنا کر گرتا ہے جس کا سماں دیکھنے کے لائق ہے۔ ہم اکثر دیکھتے کہ کوئی مچھلی کے شکار کا شوقین کنڈی میں کیچوا لگا کر پانی میں ڈال دیتا اور تھوڑی ہی دیر میں ایک لمبی سی بام مچھلی سانپ کی طرح تڑپتی باہر نکل آتی۔

اور ہاں، تھوڑی ہی دور ایک اور بزرگ عورت کا مزار بھی تو ہے۔ بالکل سڑک کے کنارے، دائیں طرف جس پر ہنڈیاں ہی ہنڈیاں دکھائی دیتی ہیں —— اس کے متعلق بھی چڑیلوں کی کوئی کہانی مشہور ہے، بڑی دلچسپ۔ مگر آپ کہیں گے یہ تو ہو ئیں راولپنڈی سے دور کی باتیں۔ ہمیں تو خاص راولپنڈی کی باتیں سنائیے۔

شاید راولپنڈی کا نام راول ہی کا مرہونِ منت ہے۔ اگرچہ ہم بچپن میں سنا کرتے تھے کہ اُس کو راولوں، یعنی ایک قسم کے فقیروں، نے آباد کیا ہے —— خاص راولپنڈی کی دلچسپیاں بھی کچھ کم نہ تھیں، اور وہ بھی ہم چھوٹے چھوٹے بچوں کی نظر میں۔ حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے کھیت ہی کھیت۔ کبھی مکا کبھی جوری کبھی سرسوں اور کہیں کہیں چنوں کی اک ہری بھری دنیا جن کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ شہر کا شہر اور گاؤں کا گاؤں۔ شہر اب اور بھی بڑھ گیا ہے بہت دور، مری روڈ کے دونوں کنارے، کئی میل تک۔ کتنی ہی جگہ "سیٹلائٹ ٹاؤن" نے گھیر لی ہے —— اگرچہ یہ کافی کھلا کھلا بنایا گیا ہے۔ گاؤں یعنی ہرے بھرے کھیت بہت پیچھے ہٹ گئے ہیں لیکن یہ اپنی بہار ضرور دکھاتے ہیں۔ پیاری پیاری زمین پر لہلہاتے کھیت یوں لگتے ہیں جیسے کسی نے سبز ریشمی تارکشی سے بڑی ہی استادی کے ساتھ کشیدہ کاڑھا ہو۔ باجرا، مکی اور جوری کے بھٹے اور سرسوں کے پیلے پیلے پھول مجھے ابھی تک یاد ہیں ان ہی سے میرے ذہن میں تر و تازگی یا ہرے بھرے پودوں اور سرسوں کی گندل یعنی ساگ کے ڈنٹھلوں کی لہلوٹ کا تصور رس بس گیا ہے۔ باجرے اور مکا کے بھٹے یا اُن کی گھی میں رچی میٹھی روٹیاں کھانا، یہ بھی پنڈی ہی پر ختم ہے۔

کھیتوں سے کوئی ایک میل دور زمین دوز قلعہ کتنا پُراسرار معلوم ہوتا تھا! جیسے کسی بہت ہی بڑی کچی عمارت کا گنبد زمین پر آ رہا ہو اور اس کی سطح پر گھاس ہی گھاس اُگی ہو۔ گرداگرد لوہے کی تیکھی تیکھی چپٹی چپٹی سلاخوں کا جنگلا، گہری کھائی کبھی خالی کبھی پانی سے بھرپور۔ اور سامنے لوہے کا بڑا گیٹ۔ ایسی ہی کہیں دوسری طرف ایک اور زمین دوز قلعہ بڑی طلسمی چیز معلوم ہوتا تھا۔ قریب ہی بڑے بڑے میدان تھے جہاں آئے دن ہاکی فٹبال کے میچ اور ٹورنامنٹ ہوتے اور عجیب گہما گہمی نظر آتی۔ اور کھیل ہی کھیل میں کبھی بے تحاشا دنگا فساد بھی شروع ہوتا۔ پانی سے بھری نہر کا سماں ہی کچھ اور تھا۔ آس پاس اونچے اونچے درختوں پر فاختائیں حق سرہ کرتیں اور ان سے ملتی جلتی ایک اور چیز جسے بٹیر کہتے ہیں، جھاڑیوں میں اڑتی پھرتی جن کا ہم کبھی غلیلوں اور کبھی چھرے والی بندوقوں سے شکار کرتے پھرتے کیونکہ اتفاق سے ہمارے پڑوسی پٹھان تھے۔ اور اُن کے پاس ہر طرح کی بندوقیں تھیں۔ وہ شکار یا یوں کہئے اس کے گوشت کے بہت ہی دلدادہ تھے۔ یہاں کے پہاڑی کوّے اتنے بڑے بڑے، پھولے پھولے، چونچ ذرا سی سفید بھاری کلا دنتوں جیسی

آواز میں قاقا کرتے، اپنے بھاری بھاری پر ہلاتے آتے اور جھٹ چھروں والی بندوق کا شکار ہو جاتے۔ 'کرٹرت' کھانا بھی ہم نے اپنے پڑوسیوں سے سیکھا۔ 'کرٹوت' پنیر کے سخت سخت یا گول ڈھیلوں کو کہتے ہیں جن سے دانتوں اور جبڑوں کی ورزش بھی ہوتی ہے اور آزمائش بھی۔

بلا کی سردی، بلا کی گرمی۔ سردیوں میں زمین پر کہرا ہی کہرا جما ہوا اور نالابوں کی سطح پر برف کی پپڑی جم جاتی ہے۔ ایک بلور کا صاف ستھرا ہموار تختہ جس پر پتھر لڑھکایا جائے تو وہ تیزی سے تیرتا ہوا دوسری طرف نکل جاتا ہے اور اگر اس کو کنکر مار کر توڑ دیا جائے تو خوبصورت کرچیں ہی کرچیں نظر آتی ہیں۔ پانی جمنے کی نوبت تو نہیں آتی تھی لیکن ہم رات کو کٹوروں میں پانی بھر کر کھلی ہوا میں رکھ دیتے — اور وہ صبح ہونے تک جم جاتا۔ پھر ہم اس میں شکر ڈال کر مزے سے چبا چبا کر کھاتے اور یہ خوب لطف دیتی۔ برسات آنے پر کچھ اور ہی رنگ ہوتا۔ جوہڑ پیازی رنگ کے گدلے پانی سے بھر جاتے اور کنارے پر یہ بو یعنی بُرادے کی سی باریک چیز تنکے اور کچرا تیرتا نظر آتا۔ اس کے ساتھ ہی بے شمار بڑے بڑے کالے بھونڈ بھی چلے آتے جنہیں ہم "سانڈ" کہتے تھے۔ (بعض جگہوں پر ان کیڑوں کو "اللہ میاں کی بھینس" بھی کہا جاتا ہے) ہم ان کا سر گیلی زمین میں گاڑ دیتے اور یہ اس کو اپنے کالے کالے سینگوں سے زور شور کے ساتھ کھود کھود کر اندر گھسنے لگ جاتے جب یہ ذرا زیادہ دور چلے جاتے تو بل میں پانی چھوڑ دیا جاتا اور یہ بیچارے باہر نکلنے پر مجبور ہو جاتے۔ اسی طرح "سانڈوں" کی لڑائی کرا کر اس کا تماشہ دیکھتے۔ برسات کے کلاونت مینڈک جتنے بڑے اور پاٹ دار آواز کے یہاں دیکھنے میں آئے شاید ہی کہیں ہوں۔ اور بارش ختم ہونے پر زمین سے اَن گنت سوراخوں سے نکل نکل کر ہوا میں اڑنے والے بھورے بھورے ننھے ننھے پر والے جنہیں چڑیاں لپک لپک کر کھاتیں!

برسات کا زور سب سے زیادہ نالہ لئی میں دکھائی دیتا۔ اتنا تنگ کر چڑھا ہوا پانی اس میں اندھا دھند ریلا مار کر آتا اور کمپنی باغ کے پاس، جو اب "لیاقت باغ" کہلاتا ہے، آکر پھیل جاتا۔ چنانچہ برسات کے بعد یہ ابلتی ہوئی ندی بھی دیکھنے کی چیز ہے۔ اور کمپنی باغ۔ اتنی خوبصورتی سے بنایا ہوا، اس کی شامیانوں جیسی بڑی وضع کی بارہ دریاں، ان کے اردگرد چھوٹے بڑے شہتوتوں کے درخت، کھیلنے کا میدان جہاں ہم ماموں جی اسلامیہ ہائی اسکول کے طالب علم سالانہ جلسوں کے موقع پر کاغذی پھولوں سے سجاوٹ کے لئے دن بھر بانسوں کی چٹائیں بناتے اور جس کے ایک طرف کھوسر کی گھنی جھاڑیاں اُگی تھیں اور ان کھوسروں میں وہ گہرے ارغوانی رنگ کا گاڑھا پانی، خونِ شہیداں کی طرح، جس سے زیادہ خالص سرخ رنگ شاید ہی تصور کیا جا سکے۔

راولپنڈی کی رگِ حیات مری روڈ ہے اور یہاں کی زندگی کی ساری دوڑ دھوپ اسی پر ہوتی ہے۔ کوئی ہے جس نے اس سے گزرتے ہوئے شاہ کی ٹاہلیاں یعنی شیشم کے پیڑ نہیں دیکھے؟ کہتے ہیں ان ٹاہلیوں کے شاہ صاحب کہیں سے روانہ ہوئے تو یہ شیشم کے پیڑ بھی ان کے ساتھ چل پڑے۔ اور جب وہ یہاں آکر رکے تو یہ چالیس ٹاہلیاں بھی یہیں رک گئیں یہ بھی عوامی تخیل کی کتنی اچھوتی پرواز ہے۔ جو شاید شیشم کے درختوں کا جھنڈ دیکھ کر پیدا ہوئی۔ ویسے راولپنڈی ٹاہلیوں کا گھر ہے۔ جہاں دیکھو شیشم کے بڑے بڑے تناور، پھیلے ہوئے درخت جو سڑک کے دونوں طرف عجیب بہار دیتے ہیں اور برسات میں بارش اور گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں چلتے پھرتے انسانوں کے لئے قدرتی شامیانے بن جاتے ہیں، ان کے گول گول پتے، ان کی سوندھی سوندھی خوشبو اور سفید سفید بور بھلائے نہیں بھولتے۔

مری روڈ پر پہلی عالمگیر جنگ کے زمانہ میں کیسی کیسی رنگ برنگی فوجیں بینڈ بجاتے گورے، ہائی لینڈر اپنے بیگ پائپ بجاتے اور دیسی زور شور سے ڈھول بجاتے، مارچ کرتی تھیں اور پھر خچر باتریوں اور رسالوں کا ایسا سلسلہ شروع ہوتا کہ ختم ہی نہ ہوتا۔ ان رسالوں میں تھوڑے تھوڑے وقفے پر توپیں اور گن مشینیں لگی ہوتیں۔ اسی مری روڈ پر چھاچھیوں کے خوبصورت ٹانگے اپنے بانکے گھوڑوں کے ساتھ رواں دواں دکھائی دیتے۔ ایک تو مضبوط و تنومند چھاچھیوں کی مخصوص وضع اور دوسرے ان کے نفیس ٹانگے جو پشاوری ٹانگوں کے بعد اپنا جواب نہیں رکھتے، کون ہے جو ان سے مسحور نہ ہو۔ ان گھوڑوں سے وہ میلہ اسپاں یاد آ گیا جو درحقیقت میلہ مویشیاں ہوتا تھا اور چھاچھی محلہ کے سامنے کے ایک وسیع میدان میں لگتا تھا۔ کمپنی باغ کی بارہ دریوں سے ملتی جلتی ایک خوش وضع بارہ دری یہاں بھی تو تھی جو ہمارے لئے طلسمی کشش

دکھتی تھی۔ جب میلہ لگتا تو اس میں خبر نہیں کہاں کہاں سے گھوڑے خچریں اور گدھے امڈ آتے اور ہنہنانے، رینگنے اور گھنگروؤں کی چھن چھن کرنے سے ایک عجیب سما بندھ جاتا —— جابجا تنبو بھی لگے ہوتے اور ہم لڑکے بالے سارا دن دیوانہ وار انہیں گھومتے رہتے۔ چونکہ اس میلے میں مویشیوں کا سودا ہوتا تھا، اس لئے جابجا تنبو لگے ہوتے جن میں لین دین کے دستاویز تیار ہوتے۔ ان سودوں میں ہمارے لئے خاص کشش بالکل نئی سنہرے رنگ کی چمکتی دمکتی پائیوں کی ہوتی جو خبر نہیں اتنی تعداد میں کیوں آتی تھیں۔

مری روڈ ہی کی دلچسپیوں میں سے ایک کشمیریوں کی آمد کا سلسلہ تھا۔ کبھی اکا دکا، کبھی ٹولے کے ٹولے۔ کالی کالی لوئیاں پہنے اور گردن یا پیٹھ پر نمک کے بھاری بھاری ڈھیلے اٹھائے۔ اس وقت تو آنا جانا قدرتی حالات کے تحت تھا۔ لیکن اب "ایک ناساز تقدیر" اور "اجنبی کے دست غارت گر" کی چیرہ دستیوں نے خاک و خوں میں غلطاں ہونے والے 'کشمیری' کو ترک وطن کرتے ہوئے ادھر ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا ہے! اور یہی مری روڈ ہے جس پر بلکہ سارے شہر میں لمبے تڑنگے پوٹھوہاری، ادھوڑی جوتے پہنے رواں نظر آتے ہیں۔

شہر کے اندر "شاہ چن چراغ" کی درگاہ پر ہر سال زوروں کا میلہ لگتا ہے جس میں گانا بجانا تو الگ رہا، سال بھر حال پڑنے کا سماں عجیب کیف رکھتا ہے۔ ہم لوگ راجہ بازار جاتے وقت اس کے پاس گذرتے تو دو چار آدمیوں کو درختوں کے ٹہنوں سے الٹا لٹکے "حق حق" کرتے دیکھ کر بڑے حیران ہوتے۔ ہم راجہ بازار سے جھنگی محلہ واپس آئیں اور سرداروں کے لمبے چوڑے شاندار باغ سے نہ گذریں، یہ ناممکن تھا۔ یہ باغ سردار سوہن سنگھ کا تھا، اسی لئے اس کو سرداروں کا باغ کہا جاتا تھا۔ ادھر سے آتے وقت لگے ہاتھوں جامع مسجد کا نظارہ بھی ہو جاتا جس کے تالاب میں سرخ رنگ کی مچھلیاں تیرتی تھیں۔ اور جس طرح یہ مسجد تعمیر ہوئی وہ بھی اچنبے یا یوں کہئے معجزے سے خالی نہیں۔ ہر گھر والی آٹا گوندھتے وقت مٹھی بھر آٹا ہنڈیا میں الگ رکھ لیتی جس کو جمع کرنے والے ہر جمعہ گھر گھر جا کر فراہم کر لیتے۔ اور اس کو بیچ کر جو روپیہ ملتا وہ مسجد کی تعمیر پر صرف ہوتا۔

راولپنڈی ہی کی یادوں میں محرم کے دنوں کی ہماہمی بھی شامل ہے جب گھر گھر شہدائے کربلا کی یاد میں کھیر یا فیرنی تیار کر کے چھوٹے چھوٹے کوزے بھرے جاتے جنہیں وہاں 'کجی' کہا جاتا ہے۔ یہاں کی ایک دلچسپ ریت یہ ہے کہ بچے ٹولیاں بنا بنا کر گلی کوچوں میں پھرتے ہوئے اونچی آواز میں "کوئی نادر وکہاری۔ کوئی . . . . . " کہتے پھرتے ہیں اور گھروں والے انہیں بلا بلا کر یہ چھوٹی چھوٹی خوبصورت 'کجیاں' دیتے ہیں۔

ایسے ہی کھیلوں میں چھپن چھپوت یا آنکھ مچولی سے ملتا ہوا دلچسپ کھیل ہے جو لڑکے رات کو جمع ہو کر کھیلتے ہیں۔ ایک ہانک لگاتا ہے "یوسف پھل گلاب دا، کالی انگل ٹی لو" اور دوسرے لڑکے آواز کی سمت کا پتہ چلا کر اسے پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پھلوں میں ملوک سوکھا ہوا گہرے نیلے یا کالے رنگ کا، ہاڑیاں زرد آلو، خوبانیاں اور گرنڈے (بہت ہی چھوٹے قسم کے کالے کالے دانے جن کی شکل اور ذائقہ جامنوں سے ملتا جلتا ہے) یہ سب برسوں گذر جانے پر ذہن، اور ذہن سے زیادہ دل سے محو نہیں ہوتے۔

صدر کی دلچسپیاں اپنی جگہ پر ہیں۔ یہ گوروں کی بسائی ہوئی بستی ہے جنہوں نے چھاؤنی اور صدر کو اپنی ضرورت اور ذوق کے مطابق بہت ہی شاندار بنایا تھا۔ اور پنڈی میں گوروں کے ساتھ ساتھ ان کے چرچے بھی رہتے تھے۔ چنانچہ دلیسیوں کی بہادری کے سلسلے میں یہ اکثر سننے میں آتا کہ کس طرح ایک گل مچھڑ والے چھاچھی کوجوان نے کتنے ہی نشے میں دھت گوروں کو پیٹ ڈالا اور ان کی ساری نقدی چھین لی! یہ تو تھا زندوں کا کارنامہ۔ مردوں —— اور وہ ظاہر ہے پیروں فقیروں کے سوا اور کون ہو سکتے ہیں —— کی کرامات بھی کچھ کم نہ تھیں۔ چنانچہ یہ بات آئے دن سننے میں آتی کہ ریلوے اسٹیشن کی دیوار کے پاس جو ایک سائیں کا مزار ہے وہاں کسی گورے نے حسبِ عادت کھڑے ہو کر نازیبا حرکت کی۔ سائیں نے جلال میں آکے اسے الٹا کر ساری رات سر کے بل کھڑا رکھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ پھر یہ بھی سننے میں آتا کہ جہاں ریل گاڑی اس مزار کے پاس آئی، الٹ گئی۔ انگریز بھی ایک استاد تھا اور پرلے درجہ کا مدبر۔ جھٹ جھنڈی سے سلامی دینے لگا اور سائیں جی کو راضی کر لیا ——!

صدر یوں تو سب کا سب دیکھنے کے لائق ہے۔ نفیس ڈاک خانہ، طویل اور شاندار پشاور روڈ، جابجا توپیں نصب، فوجی ہیڈ کوارٹر

جہاں سے ارد گرد نظر ڈالی جائے تو پہاڑیوں کا گول دائرہ ایک انگوٹھی سا لگتا ہے جس میں پنڈی نگینہ کی طرح جڑا ہے، لال کرتی جس کی وجہ تسمیہ خبر نہیں کیا ہے لیکن نام کتنا دلکش ہے! اور پنڈی سے تین چار میل دور ٹوپی رکھ کتنا پیارا نام ہے! آپ پوچھنے لگ جائیں گے کہ یہ نام پڑا کیسے۔ شاید اس کی شان نزول یہ ہو کہ صاحب لوگ یہاں تفریح کے لئے آتے تھے اور ہیٹ رکھ کر بیٹھ جاتے تھے! رکھ، کے معنی شاید آپ نہ سمجھیں یہ وہ ہری بھری جگہ ہے جو پھولوں پودوں وغیرہ کے لئے رکھ لی جائے۔ جیسے نرسری، گرین وڈیا" پریزرو" انگریز لوگ اسے پارک، کہتے تھے۔ دیسی 'رکھ' کہنے لگے۔ اور یہ میلوں تک پھیلا ہوا بیلا یا دریائی جنگل واقعی 'رکھ' کہلانے کا مستحق ہے۔ ڈاکٹر خالد نے اسی کی بنا پر لکھا ہے کہ سہ

رکھ میں پُرانے تھنڈ کے اندر
ایک پکھیرو درد کا مارا پھو پھو کرتا ہے
کون سنے یہ غم کی باتیں کون کسی کی سنتا ہے!

ٹوپی رکھ کے ادھر دریائے سہاں ایک عجیب شانِ محبوبی سے رواں ہے۔ ذرا اور پرے جائیں تو چک لالہ کی چھاؤنی نظر نواز ہے۔ پھر اسی کی ہم قافیہ دوسری جگہیں۔ سہالہ ۔ مانکیالہ وغیرہ۔ سارا علاقہ گیروا رنگ کی چٹانوں سے بھرا پڑا ہے اور پھر ادھر سے ادھر جائیں یا اُدھر یعنی جہلم گجرات سے ادھر آئیں، پہاڑیاں ہی پہاڑیاں اپنی گود میں ہری بھری پیاری پیاری خوبصورت کیاریاں لئے ہوتے اور سرنگوں پر سرنگیں جو ایک طلسم سے کم نہیں۔

دوسری طرف نکل جائیں تو "شاہ کی ڈھیری" زبانِ حال سے عہدِ رفتہ کے جاہ و جلال کی داستان سنا رہی ہے۔ ٹیکسلہ کے کھنڈرات اگر شاہ کی ڈھیری نہیں تو اور کیا ہیں؟ اور اس کی دلچسپیاں اور دلآویزیاں تو ایسی چیزیں ہیں جو تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور اسی نظر سے ان کو دیکھنا بھی لازم ہے۔

مگر پنڈی اور اس کے گرد و پیش کے علاقے کی سب سے بڑی دلچسپی اور دولت تو اس کے لوگ ہیں۔ مضبوط، توانا، جفاکش، جیالے۔ جو پیدائشی فوجی ہیں اور پاکستانی فوج کا ایک نہایت اہم حصہ۔ ہزارہ اور دوسرے پہاڑی علاقوں کی طرح پوٹھوہاری بھی نہایت بلند بالا، وجیہہ، دلیر اور بیباک ہیں۔ کھڑی زبان اور لب و لہجہ جس سے وقار اور مردانگی ظاہر ہو۔ اس رزمیہ وضع کے باوجود وہ بزم یعنی شعر و شاعری میں بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ اُن کی بولی، اُن کے ٹپے، ان کے گیت اک ناقابلِ بیان اور مسحور کن کیف، تازگی، چٹخارے اور سب سے بڑھ کر اصلیت کے حامل ہیں جنھیں سنتے ہی انسان پھڑک اٹھتا ہے۔ گریرسن نے ان کی زبان کو آریائی زبانوں کے بیرونی حلقے میں شمار کیا ہے۔ اور جو لوگ ہندکو، سندھی، ملتانی، سرائیکی وغیرہ کی ساخت اور لب و لہجہ سے آشنا ہیں وہ اس ہم وضعی کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ ایک الگ موضوع ہے جس کی داد کوئی ماہر لسانیات ہی دے سکتا ہے۔ ہماری دلچسپی تو محض بولی کے چٹخارے اور اس کے لوک گیتوں اور ٹپوں کی دلآویزی تک ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور ——— آخری بات بھی سن لیجئے۔ شروع شروع میں پنڈی کی بولی اور لب و لہجہ مجھ پر بُری طرح حاوی تھا ——— ہوسی ——— ویسی ——— آسی، جاسی ——— کھاسی اور دوسرے پوٹھوہاری الفاظ زبان پر چڑھے ہوئے تھے۔ چنانچہ جب میں اپنے آبائی وطن 'بٹالہ' آیا تو میرے ہم جماعت اس عجیب بولی کو سن کر لگے ہنسی اُڑانے ——— رفتہ رفتہ زبان اور لہجہ منجھ منجھ کر ایسے صاف ہو گئے کہ اچنبھے سے خالی نہیں ——— اگرچہ میرے بعض احباب ——— سید ضمیر جعفری، احمد ندیم قاسمی، اور زیڈ۔ اے۔ بخاری کے لہجے سے اب تک جہلم سرگودھا اور پشاور کا لہجہ صاف جھلکتا ہے۔ بالعموم جن لوگوں پر شروع ہی سے ان علاقوں کا لہجہ حاوی ہوتا ہے وہ اس سے کم ہی دامن چھڑا سکتے ہیں۔

ایوب نیشنل پارک (راولپنڈی):

"راولپنڈی سے تقریباً تین میل کے فاصلہ پر ایک جگہ اب سے کچھ دن پہلے تک ٹوپی پارک کے نام سے موسوم تھی۔ لانبے لانبے سرو، چیڑ اور بہت سے خودرو درختوں سے گنجان اس جگہ کو کبھی "ٹوپی رکھ" کے نام سے بھی پکارا جاتا رہا ہے۔ گرد و نواح کے غریب عوام یہاں سے خشک لکڑیاں اور ایندھن جمع کر کے لے جاتے تھے۔ یہ ویران جنگلی علاقہ بدمعاشوں کا مسکن اور لٹیروں کی جائے پناہ تھا۔ لوگ نصف النہار کی تیز روشنی میں بھی وہاں کی فضا کو تاریک اور گناہ آلود محسوس

کرتے تھے۔ انگریزی دورِ حکومت میں اس کا نام "ٹوپی پارک" رکھا گیا، اس کے باوجود اس کی ویرانیوں میں کمی نہ ہوسکی۔ لوگ نام سن کر جس شوق و اشتیاق سے جاتے، وہاں پہنچ کر انہیں اُسی قدر مایوسی ہوتی۔ وہی ہُو کا عالم، ہر سو وحشت، ویرانیاں، جنگل بیابان ایسا کہ غالب کو اپنا گھر یاد آئے.... لیکن مجرموں کا وہ مسکن اب ایک صاف ستھری بہترین تفریح گاہ میں تبدیل ہوچکا ہے۔ اس کا نیا نام "ایوب نیشنل پارک" ہے جس کا افتتاح خود صدرِ پاکستان جنرل محمد ایوب خاں نے ۵ مارچ ۱۹۵۹ء کو کیا۔

چکنی سپاٹ سڑکیں، گل ہائے رنگا رنگ کے دلفریب تختے، خوشنما ریسٹورینٹ، خوبصورت بارہ دری، وسیع مصنوعی جھیل اور دیگر آرائش و زیبائش نے مل کر نہ صرف ٹوپی پارک کو ایوب نیشنل پارک بنا دیا بلکہ اسے ایسا حسن بھی بخشا ہے کہ وہ ایک نہایت عمدہ تفریح گاہ بن گیا ہے۔ چاروں طرف لوگوں سے خوب چہل پہل اور گہما گہمی ہوتی ہے اور جیسے جیسے شام کی گلابی فضائیں پارک کے ہرے بھرے ماحول پر چھاتی ہیں یہاں کا ذرہ ذرہ زندگی کی گوناگوں خوشیوں سے چمک اٹھتا ہے۔ شام کی کجلاہٹوں کے ساتھ ساتھ کاروں، تانگوں اور سائیکلوں کی قطاروں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ جدید طرز کے پر تکلف اور صاف ستھرے ریسٹورینٹ زبانِ حال سے "تنگیٔ داماں" کی شکایت کرتے نظر آتے ہیں۔ جھیل میں کشتی رانی کا معقول انتظام ہے۔ لیلیٰ شب اپنے لانبے گیسوؤں سے جب سارے عالم کو ڈھانپ لیتی ہے، چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ درخشاں ہوتا ہے اور کہکشاں دور تک کسی عروسِ نو کی زرتار اوڑھنی کی طرح جگمگاتی ہے۔ کسی دوشیزہ کے دل کی معصوم دھڑکنوں کی طرح جھیل کی لہروں پر چاند ہلکورے کھاتا ہے تو اکثر باذوق لوگ کشتیوں میں محفلِ موسیقی کا رنگ جماتے ہیں۔ کبھی کشتیوں پر مشاعرہ منعقد ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے فلک کے باسی بھی جھیل میں اُتر آئے ہیں اور شعرا حضرات اس سحر انگیز فضا سے مسحور ہو کر شعر پر شعر کہتے چلے جاتے ہیں۔

پارک میں جگہ جگہ پختہ سائبان بنے ہوئے ہیں۔ کہیں کہیں رنگ برنگی بڑی چھتریاں جن کے نیچے پتھر کی ترشی ہوئی آرام دہ کرسیاں، کئی جگہ موتی لٹاتے ہوئے فوارے، حوضوں میں آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی خوش رنگ مچھلیاں، یہ سب مل کر پارک کے حسن کو اور بھی رنگین بنا دیتے ہیں۔ بچوں کا پارک، جس کی دیدہ زیبی بڑوں کو بھی دعوتِ نگاہ دے کر کچھ دیر کے لئے روک لیتی ہے بچوں کے لئے علیحدہ تفریح کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ پارک کے ایک حصہ میں گولف کلب اور کھیل کا میدان بھی ہے جس کا افتتاح بھی کچھ دن پہلے صدرِ محترم جنرل ایوب خاں ہی کے ہاتھوں ہوا تھا۔

راولپنڈی بذاتِ خود حسین جگہ ہے۔ اس کے بہت سے نواحی مقامات پکنک منانے اور فرصت کے اوقات گذارنے کی دعوت دیتے ہیں۔ لیکن ایوب نیشنل پارک اپنی خوبصورت ترتیب و تعمیر کی وجہ سے سب سے زیادہ پُرفضا مقام بن گیا ہے۔ پارک کو موجودہ ہیئت اور حسن بخشنے میں جنرل ایوب کی دلچسپی اور راولپنڈی کینٹونمنٹ بورڈ کے افسران کی کارکردگی شامل ہے۔ (قدیر نعیمی)



"ماہِ نو" کی توسیعِ اشاعت میں حصہ لے کر پاکستانی ادب و ثقافت سے اپنی دلچسپی کا اظہار فرمائیے۔



"ماہِ نو" میں مضامین کی اشاعت سے متعلق شرائط

(۱) "ماہ نو" میں شائع شدہ مضامین کا معاوضہ پیش کیا جائے گا۔

(۲) مضامین بھیجتے وقت مضمون نگار صاحبان "ماہ نو" کے معیار کا خیال رکھیں اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالہ یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔

(۳) ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر حوالہ جات دینا ضروری ہیں۔

(۴) ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔

(۵) مضمون کے ناقابلِ اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

(۶) ایڈیٹر مسودات میں ترمیم کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

نقد و نظر

نفرت کی دیوار

مصنف: منظور ممتاز
ناشر: ممتاز پبلیکیشنز لاہور
ضخامت: ۷۳۱ صفحات
قیمت: ساڑھے آٹھ روپے

مصنف کا خیال ہے کہ "اس دنیا میں کوئی ہرجائی نہیں ہے۔ لڑکے لڑکیاں اور لڑکیاں لڑکے بدلتے رہتے ہیں۔ دونوں کو ایک گم گشتہ روپ کی تلاش ہوتی ہے۔ کبھی حاصل کرنے کے لئے اور کبھی چھن جانے کے بعد!" چنانچہ ناول کے ہیرو مقصود کا قصہ اسی نظریے کے حق میں بطور دلیل پیش کیا گیا ہے۔ ابتدا میں اسے زینو سے دلچسپی ہو جاتی ہے جو اس کے خوابوں کی ملکہ ہے۔ زینو اسے نہیں ملتی۔ لیکن اس کی سہیلی ریحانہ جو خود ایک متمول اور ترقی پسند گھرانے کی لڑکی ہے مقصود سے متاثر ہو کر اس کے حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ مقصود بحرین چلا جاتا ہے اور وہاں ایک یہود دن میں زینو کی جھلک پا کر اس کے ساتھ اسرائیل بھاگ جانے کو تیار ہو جاتا ہے مگر یہودی رقیب کے ہاتھوں زخمی ہو کر پھر ریحانہ کی آغوش میں واپس آنا پڑ جاتا ہے۔

قصے کے واقعات عام قسم کے ناولوں سے مختلف نہیں البتہ مصنف نے رومانی محاکات میں خاصی دلچسپی لی ہے اور اس قسم کے مناظر کا اعادہ و تکرار نازک مزاج قاری کو شاید ضرورت سے زیادہ نظر آئے گا۔ ناول کا انداز بیان سیدھا سادا اور بے پیچ ہے اور نوجوان مصنف نے اس میں کسی نئے تجربے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ عام اسلوب شگفتہ ہے لیکن بعض جگہ زبان کی غلطیاں کھٹکتی ہیں۔

نوجوان مصنف تجرباتی دور سے گزر رہے ہیں اس لئے ان کا اسلوب نکھرنے اور بننے میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔ وقت گزاری کیلئے اس ضخیم ناول کا مطالعہ دلچسپ ثابت ہو سکتا ہے لیکن کتاب پڑھنے کے بعد وثوق کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہوگا کہ مصنف اپنے عجیب و غریب نظریے کی تاویل میں پورے طور پر کامیاب ہو گیا ہے۔ اخلاقی و مجلسی نقطۂ نظر سے مصنف کے نظریے پر گفتگو کی بہت کچھ گنجائش ہے لیکن ناول کی پستی میں ان امور کا تذکرہ غالباً بے محل سمجھا جائے گا۔ (ش - ا - [illegible])

بولتی تصویریں

از عبدالمجید بھٹی
ناشر: خاور پبلشنگ کوآپریٹیو سوسائٹی۔ لاہور۔
صفحات ۴۸، قیمت مجلد دو روپے

"تازہ خبر

کوے نے کچھ کم تولا تھا — آج اس کو بھی پکڑا گیا
چیل نے سونا چھپا رکھا تھا — آج اس کو بھی پکڑا گیا
الو نے نقلی گھی بیچا تھا — آج اس کو بھی پکڑا گیا
بلی نے چوری دودھ پیا تھا — آج اس کو بھی پکڑا گیا

ایسے تو پکڑے جائیں گے"

رنگین، خوبصورت، تصویروں اور نظموں کی یہ کتاب ننھے منے بچوں کے لئے بنائی گئی ہے جس کا رنگ ڈھنگ اور پیش کئے گئے نقش سے بخوبی ظاہر ہے۔ جیسے یہ اس کی منہ بولتی تصویر ہو۔ اور یہ خبر تو سچ مچ مارشل لا کے بعد کسی اخبار سے لی گئی ہو۔ صرف یہ نہیں بتایا گیا کہ کسی شاعر نے کیا کہا تھا کہ وہ بھی پکڑا گیا! اس کتابچے کی نظمیں بچوں کیلئے من بھاتی روحانی غذا بھی ہیں اور سبق آموز بھی۔ ابن انشا کی "بلو کا بستہ" کے بعد یہ انگریزی وضع کی بچوں کی نظمیں اردو میں داخل کرنے کی دوسری کوشش ہے۔ لیکن ان کے نتیجے اتنے شوخ، تیز، تیکھے اور رنگا رنگ نہیں کیونکہ تقریباً تمام نظموں کی وضع ایک ہی ہے۔

ایک بات اور۔ بچوں کے لئے نظمیں کہتے کہتے شاعر خود بھی ان میں شامل ہو گیا ہے۔ اور اس کی سنجیدہ شاعری میں بھی بچگانہ

اور مکتب کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ یہ کیفیت تا بکے ؟

مجید لاہوری

از شفیع عقیل
ناشر: مکتبۂ ماحول۔ بہادر شاہ مارکیٹ
کراچی۔ صفحات ۳۵۰
قیمت ساڑھے چار روپے

"میں ہوں مجید لاہوری"
حرف و حکایت کا کالم"

لیکن مجید محض ایک اخبار کا بے حس و حرکت کالم ہی نہ تھا بلکہ ایک الحکیم شمیم، زندہ و توانا اور زندہ دل انسان بھی تھا جس نے صحافت کی حد تک اردو کو بعض نرالی چیزیں عطا کی ہیں ان کا ملکی فضا کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ چنانچہ اس کی نظم و نثر کی تحریروں میں ایک رچی ہوئی واقعیت صاف نمایاں ہے۔ اس نے ایک ذکی الحس اور زندہ انسان کی حیثیت سے اپنے ماحول کے خلاف ردعمل کیا اور بعض بڑی اچھوتی چیزیں یادگار چھوڑیں۔ ایسے شخص کی زندگی اور علمی و ادبی سرگرمیوں کا مطالعہ دلچسپی اور اہمیت سے خالی نہیں اور شفیع عقیل نے اس کا پورا پورا حق ادا کیا ہے اس کی حیثیت بوسول کی تو نہیں پھر بھی اس نے اس گوشت پوست کے انسان سے قریب رہ کر اس کا بڑا ذوقِ نظر سے مطالعہ کیا ہے جو ہمدردانہ ہوتے ہوئے حقیقت پسندانہ بھی ہے۔ جو لوگ پاکستان کے ابتدائی دور میں دلچسپی رکھتے ہیں وہ "مجید لاہوری" سے بے نیاز نہیں رہ سکتے اور نہ پیش نظر کتاب سے جس میں حرف و حکایت کے اس کالم کو زندہ کر کے دکھایا گیا ہے۔

"منتخبات خوشحال خاں خٹک"

شائع کردہ: پشتو اکیڈمی
یونیورسٹی آف پشاور
مع اردو ترجمہ
از ڈاکٹر سید انوار الحق
صفحات ۳۲۰۔ اشاریہ ۴ صفحات
قیمت درج نہیں۔

آجکل پاکستانی زبانوں، ان کے ادب اور علاقائی مشاہیر پر روز افزوں توجہ ہے۔ اور اس سے ہماری ملت اور اس کی تہذیب و ثقافت کے خدوخال روز بروز زیادہ اجاگر ہو رہے ہیں۔ چنانچہ اس مقصد کو بوجہ احسن حاصل کرنے کے لئے مشرقی پاکستان اور سندھ، مغربی پنجاب اور سرحد میں متعدد ادارے سرکاری امداد سے قائم ہوئے ہیں جنہوں نے آثار کہن کو بروئے کار لانے میں بڑی اہم خدمت انجام دی ہے۔ "منتخبات خوشحال خاں خٹک" ان ہی میں سے ایک جو پشتو اکیڈمی یونیورسٹی آف پشاور کے سلسلۂ مطبوعات کی تیسری کڑی ہے۔ اور اس لحاظ سے بے حد اہم ہے کہ اس میں پہلی دفعہ نہایت اہتمام سے پشتو کے نامور شاعر خوشحال خاں خٹک کا منتخب کلام پیش کیا گیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ڈاکٹر سید انوار الحق کا اردو ترجمہ بھی ہے جس سے پہلی بار اردو خواں حضرات کو اس شاعر کے دل و دماغ اور فکر و بیان تک رسائی کا موقع ملتا ہے۔ شروع میں متعدد تمہیدی تحریروں سے اکیڈمی کے مقاصد، پختون قوم اور اس کی تہذیب و ثقافت اور خوشحال خاں خٹک کی شخصیت و کلام پر بسیط روشنی پڑتی ہے۔ یہ تمام باتیں اس شاعر کی زندگی اور شاعری کے بسیط مطالعہ کی دعوت دیتی ہیں۔ جس کا حکیم ملت نے اس قدر اہمیت سے ذکر کیا تھا اور جو انہی کی طرح شاہین و عقاب کا شاعر تھا۔ ایک مرد مجاہد جس نے آج سے کوئی ساڑھے تین سو سال پہلے اپنے طور پر خودی کی تربیت، تحفظ اور نشو و نما کی تعلیم دی تھی۔

پنجابی قصے فارسی زبان میں

باہتمام ڈاکٹر محمد باقر
شائع کردہ: پنجابی ادبی اکیڈمی
۱۲۔ جے ماڈل ٹاؤن لاہور۔
صفحات ۲۷۸۔ قیمت نو روپے

پشتو اکیڈمی کی طرح پنجابی ادبی اکیڈمی اپنے یہاں کی ادب و ثقافت کے سلسلہ میں اہم خدمات انجام دے رہی ہے۔ پنجاب کی مایۂ ناز چیزوں کی واریں اور طویل منظوم داستانیں ہیں جو اپنے دیس سے نکل کر برعظیم کے اکثر حصوں پر چھا گئی ہیں۔ ان میں ہیر رانجھا خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ دنیا میں ایسی اور کوئی نظم موجود نہیں جس کو اتنے لوگوں نے اتنی زبانوں میں نئے نئے رنگ میں پیش کیا ہو۔ صرف پنجابی ہی میں اس کی مختلف شکلوں کی تعداد بہتر ہے اردو میں بھی اس داستان نے کتنے ہی روپ دھارے ہیں یہاں تک کہ سابق پنجاب و سندھ میں متعدد مقامی فارسی شاعروں نے اس کو فارسی نظم میں بھی نظم کیا۔ اور غیر معمولی قدرت دکھاتے ہوئے تنوع اور آب و رنگ پیدا کیا۔ یہی کیفیت دیگر قصص و حکایات کی بھی ہے مثلاً سسی پنوں، مرزا صاحباں، سوہنی مہینوال۔ یہ واقعی سب ایک نہایت

مہتم بالشان ادبی سرمایہ ہیں جس کو مذکورہ اکیڈیمی نے فراہم کر کے بروئے کار لانے کا تہیہ کیا ہے۔ زیر نظر کتاب ایسے حصوں کا پہلا مجموعہ ہے جس میں چار مشہور داستانوں کی تقریباً ڈیڑھ درجن صورتیں پیش کی گئی ہیں۔ یہ سب مطالعہ سے تعلق رکھتی ہیں اور تحقیق کے لئے ایک وسیع میدان مہیا کرتی ہیں۔ اگر انہیں فارسی زبان و ادب کی "بہار ہند" کی بہار تازہ قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

خطاطی اور ہمارا رسم الخط

یوسف بخاری
طباعت: اردو ٹائپ
ضخامت ۲۱۳ صفحات
قیمت مجلد تین روپے آٹھ آنے غیر مجلد تین روپے
ملنے کا پتہ: ایچ۔ ایم سعید کمپنی ناشران کتب پاکستان چوک۔ کراچی

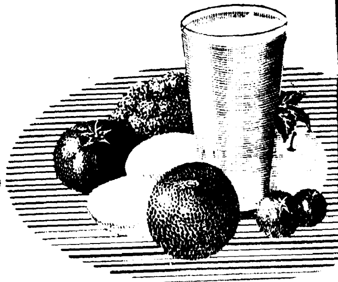
خطاطی اور رسم خط کے موضوع پر اردو میں مواد بہت کم ہے۔ چند مختصر رسالوں اور منتشر تحریروں کو چھوڑ کر اس موضوع پر کوئی مبسوط کتاب موجود نہ تھی۔ بخاری صاحب نے اس موضوع کا خاص طور پر مطالعہ کیا ہے اور نوادرات کی فراہمی کا شوق بھی ہے جو اس کتاب کی تدوین و ترتیب سے ظاہر ہے۔ زیر نظر کتاب کا بڑا حصہ "ماہ نو" کی مختلف اشاعتوں میں چھپ چکا ہے۔ رسم خط کی بحث پر بخاری صاحب نے بہت سے زاویوں سے نظر ڈالی ہے۔ ملکی، تعلیمی، انتظامی اور طباعتی موضوعات پر بھی گفتگو کی ہے مگر رسم خط کے بحث پر ان کی تحریر جوش کی حد میں داخل ہو گئی ہے۔ اعداد و شمار اور حقائق کو جمع کرنے میں ان کی کاوش قابل داد ہے۔ اور ٹائپ کی تجدید و اصلاح اور رسم خط کے باب میں ان کی بعض تجاویز قابل غور و عمل ہیں۔ (ظ۔ق)

باغی چٹانیں

مصنف: سراج رضوی
ناشر: ایچ۔ ایم۔ سعید کمپنی پاکستان چوک کراچی
صفحات: ۳۳۶
قیمت: ساڑھے چار روپے

اس ناول میں سابق صوبہ سرحد کے ایک مشہور "باغی اکبر خان" کی مہم جو زندگی کے حالات پیش کئے گئے ہیں۔ باغی اکبر خاں کی ایک انگریز خاتون سے شادی اور پھر اس شخص کا فرنگیوں کے ہاتھوں دھوکہ سے قتل اس کے لڑکے جہرگل کا انتقام لینا، وغیرہ۔ بڑے ہوشربا حالات بیان کئے گئے ہیں۔ ناول کے مطالعہ سے پٹھانوں کے رہن سہن، رسم و رواج معتقدات اور ان کی ثقافتی زندگی کی جھلکیاں نظروں کے سامنے آجاتی ہیں۔ (ظ۔ق)

جب آپ
متوازن غذا کا ذکر کرتے ہیں





تو یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ چکنائی متوازن غذا کا ایک اہم جزو ہے۔ چکنائی اپنے ہم وزن چاول یا گیہوں سے ڈھائی گنا زیادہ قوت بخش ہے، اور اس کی مدد سے نہ صرف حیاتین آپ کے جسم میں تحلیل ہو جاتے ہیں بلکہ یہ قوت کی ایک خاص مقدار بھی جسم میں محفوظ رکھتی ہے۔ ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ نوعمر بچوں اور بالغوں کے لئے کم از کم دو اونس چکنائی کا روزانہ استعمال نہایت ضروری ہے۔

کھانے کی لذت اور غذائیت میں اضافہ کے لئے **ڈالڈا برانڈ وناسپتی** گذشتہ ایک پشت سے اس ملک میں مشہور ہے۔ اس کے بنانے میں صحت اور صفائی کے اصولوں کی کڑی پابندی کی جاتی ہے۔ یہ ہاتھوں سے چھوئے بغیر تیار ہوتا ہے، اور مہر بند ڈبوں میں خالص اور تازہ دستیاب ہوتا ہے۔ یہ ڈبے کھجور کے درخت کے نشان سے پہچانے جاتے ہیں۔ اس میں وٹامن "اے" اور "ڈی" کثرت سے شامل ہونے کی وجہ سے اس کی غذائی قوت دوبالا ہو گئی ہے۔

ڈالڈا صحت مند گھرانوں کی روزمرہ غذا کا ایک اہم جزو ہے!



ڈالڈا (برانڈ) وناسپتی

ڈالڈا ایک وناسپتی ہی نہیں بلکہ مکمّل غذا ہے!

HVM 23—193 UD



ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا ۔ مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس میکلوڈ روڈ ۔ کراچی
مدیر: رفیق خاور

آپ کی ہونہار لڑکی ایک لائق طبیبہ بن سکتی ہے

اس کی صحت پر خاص توجہ دیجئے!

آپ چاہیں تو اپنی ہونہار لڑکی کو طبیبہ بنا سکتے ہیں۔ لیکن فی الوقت اس کی صحت کا خیال رکھنا ضروری ہے کیونکہ اچھی صحت پر ہی اس کی آئندہ کامیابی کا انحصار ہے۔ نشو و نما کی عمر میں مناسب غذا کے علاوہ کسی اچھے ٹانک کی ضرورت بھی رہتی ہے تاکہ جسمانی اور دماغی قوی اچھی طرح پرورش پا سکیں۔

سِنکارا ایسے ہی قوت بخش اجزا سے بنایا ہوا ایک مکمل اور متوازن ٹانک ہے۔ مفید و موثر جڑی بوٹیوں کے نچوڑ کے علاوہ ضروری حیاتین کے اضافے نے اسے ایسا جامع مرکب بنا دیا ہے جس کا استعمال ہر ایک کیلئے ہر موسم میں یکساں مفید بلکہ ضروری ہے۔







U.H.C-11/120

ہمدرد

جی! میں کپڑے گھر ہی میں
دھوتی ہوں!

New
SUNLIGHT
SOAP
SUNLIGHT

نئے سن لائٹ سے
اور بھی آسان ہو گیا ہے!

نئے سن لائٹ صابن میں ایک نیا
جادو اثر جزو شامل کیا گیا ہے جو سفید کپڑوں کو
پہلے کی نسبت کہیں زیادہ سفید دھوتا ہے اور
رنگین کپڑے اور بھی خوشنما ہو جاتے ہیں۔ آپ کے
تمام کپڑے نئے سن لائٹ صابن میں
دھلنے کے بعد ایک نئی چمک دکھائیں گے۔

نیا سن لائٹ استعمال کیا جائے
تو کوٹنے پیٹنے کی مصیبت سے بھی چھٹکارا
مل جاتا ہے۔ بس آپ کپڑوں کو
نیا سن لائٹ لگا کر ذرا سا مل لیجے
اور پھر نچوڑ ڈالیے۔ لیجیے سارا میل نکل گیا،
اور کپڑے بلور کی طرح صاف و شفاف ہو گئے

نیا سن لائٹ صابن
کوٹے بغیر کپڑوں کو
سفید اور اجلے
دھوتا ہے!

S. 21—193 UD

جلد ۱۲



شمارہ ۹

ستمبر ۱۹۵۹ء

مدیر: رفیق خاور نائب مدیر: ظفر قریشی

چندہ سالانہ: پانچ روپے ۸ر

شائع کردہ: ادارۂ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳، کراچی

فی کاپی: آٹھ آنے

بیادِ قائدِ اعظمؒ:

ایک شخصیت، ایک یاد!

میاں کفایت علی

قیامِ پاکستان سے کوئی دس برس پہلے "ایک پنجابی" کے قلم سے" "CONFEDERACY OF INDIA" کے نام سے ایک ضخیم کتاب شائع ہوئی تھی جو مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس، منعقدہ لاہور (۱۹۴۰ء) کی جلسہ گاہ، اور تمام برِ عظیم میں اپنی اردو تلخیص کے ساتھ تقسیم ہوئی۔ اور بانیٔ پاکستان کی نظر سے بھی گذری۔ بعد میں اسی مصنف کے قلم سے پاکستان کے موضوع پر متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔ اور ان کے قائدِ اعظم سے ذاتی مراسم بھی رہے۔ اسی بنا پر ہم نے موصوف سے التماس کی تھی کہ وہ ہمیں بانیٔ ملتؒ کے بارے میں اپنے تاثرات سے مستفیض فرمائیں۔ چنانچہ وہ اپنے حالیہ گرامی نامے میں تحریر فرماتے ہیں،

"عزیزی۔ کل تمہارا تار ملا۔ چند اوراق قائدِ اعظم پر لکھ کر ارسال کر رہا ہوں۔ ان کی شخصیت کا یہ اندازہ میرے ذاتی تعلق اور تجربہ کی بنا پر ہے۔ ۴۰ سے ۴۳ء میں تم بھی میرے ساتھ تحریکِ پاکستان میں شامل تھے۔ لہٰذا سب کچھ تمہارے پیشِ نظر ہونا چاہئے۔ کوئی بیس سال کے بعد لوگ مجھے بھول چکے ہوں گے، اور کسی ایسے شخص کا کچھ کہنا چہ معنی دارد؟ میں نے اس مضمون میں قائدِ اعظم سے ایک ملاقات کا حال بیان کیا ہے اور اپنے تاثرات کو قلمبند کرکے بھیج رہا ہوں۔ قائدِ اعظم کا کوئی خط میرے پاس موجود نہیں۔ جو تھے وہ بٹالہ رہ گئے۔ مجھے اس کا افسوس ہے۔۔۔ کفایت علی" بہرکیف ہم ان کا مقالہ یہاں پیش کر رہے ہیں۔ حقائق اور آرا صاحبِ مضمون کے اپنے ہیں۔ (مدیر)

اکثر نامور شخصیتیں تنہا ہوتی ہیں اور وہ اپنے کارنامے تنہا ہی انجام دیتی ہیں۔ قائدِ اعظم کا شمار بھی ان ہی منفرد شخصیتوں میں ہے۔ اس لئے ان کا یہ دعویٰ کہ انہوں نے پاکستان محض اپنے ٹائپ رائٹر کی مدد سے حاصل کیا، بالکل درست تھا۔ ان کی شخصیت اس قدر بلند تھی کہ ان کے ساتھی، ان کے نائب اس تک پہنچنے سے قاصر تھے۔ اور یہ بات کچھ قائدِ اعظم ہی سے مخصوص نہیں۔ اکثر بڑے انسانوں کے سلسلہ میں یہی ہوتا چلا آیا ہے۔ ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ کس طرح کسی قائد کے جانشینوں کا چھوٹا پن، ان کی کوتاہ نظری، نااہلی اور اخلاقی و ذہنی پستی اگر اس کی تحریک کے لئے فوری خطرہ کا باعث نہیں ہوتی تو بعد میں کسی نہ کسی موقع پر اس کی تخریب اور انحطاط کا باعث بن جاتی ہے۔ شومیٔ قسمت سے ہمارے یہاں بھی یہی ہوا ہے۔ ایک دو شخصیتوں کو مستثنیٰ کرتے ہوئے ہماری صفِ دوم کے تمام قائد کسی اعلیٰ کردار اور غیر معمولی قابلیت کے مالک نہ تھے۔ ان میں قیادت کی صلاحیتیں مفقود تھیں۔ اس سے قطع نظر کہ وہ اعلیٰ مقاصد کو ادنیٰ اغراض کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانے کی طرف مائل ہوں، وہ قوم کے لئے زیادہ تعمیری نہج پر سوچ بچار کرنے سے قاصر تھے۔ یہ ان کی دانستہ مذمت نہیں، امرِ واقعہ ہے۔ زیادہ تدبر و فراست کی باتوں میں ان پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ کوئی مفید مشورہ دینے کے اہل بھی نہ تھے۔ اس لئے جب وہ ایک دو قائد بھی اٹھ گئے جنہوں نے ابتداءً قوم کی رہنمائی کی تھی، تو مطلع بالکل تاریک ہو گیا اور ہماری نوزائیدہ مملکت کا وہی حشر ہوا جس کے نتائج سے ہم انقلابِ اکتوبر تک دوچار رہے اور جن سے ہمیں "مردے از غیب برون آید و کارے بکند" کے مصداق لفظاً و معناً ایک فرشتۂ غیب نے نجات دلائی۔ قائدِ اعظم کو ایسے نائبین کی موجودگی اور ہمرکابی کا فائدہ صرف اس قدر تھا کہ مخالفین مسلمانوں کے باہمی اتفاق اور ہم آہنگی سے مرعوب ہو جاتے تھے۔ ایسے نائبین کو جس چیز نے قائدِ اعظم کی شخصیت سے وابستہ رکھا وہ ان کے عام بلند کردار اور رائے عامہ کا دباؤ تھا۔ یہ ایک قابلِ لحاظ بات ہے کہ قائدِ اعظم کو اپنے ہمراہیوں کی شخصی اہلیتوں کا پورا پورا علم تھا اور وہ اس کے نتائج و عواقب سے بھی بے خبر نہ تھے۔ پھر بھی ایک صاحبِ عمل انسان کی حیثیت سے انہوں نے یہی قرینِ مصلحت سمجھا کہ وہ ان "ہمرہانِ سست عناصر" سے ان کی صلاحیتوں کے مطابق کام لیں۔

قائدِ اعظم کی غیر معمولی قد آور شخصیت کی وجہ سے ان کے رفقائے کار ان کو سمجھنے میں بالعموم غلطی کرتے تھے۔ ہم نے دوسری صف کے اکثر لیگی لیڈروں کو پس پشت یہ کہتے ہوئے بھی سنا کہ قائدِ اعظم خود پسند اور خود رائے واقع ہوئے ہیں۔ اور ان کی طبیعت میں ضد کا عنصر بدرجۂ اتم موجود ہے۔ لیکن میرا

تجربہ یہ ہے کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ یہ تاثر میں خود اپنے تجربہ سے پیش کرتا ہوں۔ ۱۹۴۲ء کا زمانہ تھا، میں اس وقت دہلی میں تھا۔ اس سال کے اواخر میں میرے عزیز دوست حمید نظامی، چند دوستوں کے ساتھ دہلی تشریف لائے اور میرے ہاں ہی ٹھہرے۔ ان کے قیام کے دوران میں ہمارا معمول تھا کہ میں تو صبح نو بجے اپنے دفتر چلا جاتا اور وہ اپنے کاموں کے سلسلے میں نکل کھڑے ہوتے۔ اگر پانچ بجے شام سے پہلے نظامی صاحب اپنے کاموں سے فارغ ہو جاتے تو دفتر میں میرے پاس تشریف لے آتے۔ پانچ بجے شام دفتر بند ہونے پر ہم دونوں کناٹ سرکس سے ہوتے ہوئے واپس گھر پہنچ جاتے۔

ایک شام نظامی صاحب کو قائداعظم سے ملنا تھا۔ ہمارے درمیان یہ طے پایا تھا کہ میں دفتر سے فارغ ہو کر شام کو سیدھا ۱۰ اورنگ زیب روڈ، جہاں قائداعظم کی کوٹھی تھی، پہنچ جاؤں اور پھر ہم وہاں سے اپنا کام ختم کرنے کے بعد گھر لوٹ آئیں گے۔ اس شام میری اہلیہ بھی دفتر پہنچ گئیں۔ ہم دونوں نے ٹانگہ لیا اور قائداعظم کے دولت خانے پر پہنچ گئے۔

وہاں جا کر معلوم ہوا کہ نظامی صاحب ایک گھنٹہ سے قائداعظم سے تخلیہ میں کچھ ضروری باتیں کر رہے ہیں۔ ہم دونوں مخل ہونا نہیں چاہتے تھے لیکن انتظار کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ قریباً نصف گھنٹہ گذر گیا۔ ہم نے محسوس کیا کہ ان دونوں حضرات کی باہمی گفتگو کے شاید ابھی ابتدائی مراحل بھی طے نہیں ہوئے۔ ہم قائداعظم کے اسٹینوگرافر کے کمرہ میں بیٹھے تھے۔ اسٹینوگرافر کے علاوہ وہاں مسٹر ٹی۔ آر۔ طوسی بھی موجود تھے۔ چند کرسیاں اور ایک چھوٹی میز جس پر ٹائپ رائٹر رکھا تھا، اس کمرے کا تمام فرنیچر تھا۔ شاید یہی وہ ٹائپ رائٹر تھا جس کی مدد سے قائداعظم نے پاکستان حاصل کیا تھا! لیکن اس وقت مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی ورنہ میں اس ٹائپ رائٹر کی پوری پوری تعظیم بجا لاتا! خیر میری اہلیہ کے لئے یہ انتظار کچھ "بور نگ" ثابت ہو رہا تھا چنانچہ وہ میرے کان میں کہنے لگیں "کیوں نہ ہم بھی قائداعظم سے مل لیں؟"۔ میں نے بات کو ٹالنے کی کوشش کی۔ اس اثنا میں ہمارے کمرے کا دروازہ کھلا اور ہم نے سمجھا کہ نظامی صاحب کی قائداعظم سے ملاقات ختم ہو گئی ہے لیکن خلاف توقع ایک سرخ و سفید، فربہ اندام نوجوان کو دروازہ میں کھڑا پایا۔ جو چند سکنڈوں تک ہم کو بری طرح گھورتے رہے۔ (اس لفظ کے لئے معافی کا خواستگار ہوں) پھر گھورنے والے صاحب بغیر دروازہ بند کئے لوٹ گئے۔ اور سامنے کا دروازہ، جس کے پیچھے نظامی صاحب اور قائداعظم بیٹھے باتیں کر رہے تھے، جا کھولا۔ اور پھر اسی بے تکلفی سے اندر جھانکا، پھر دروازہ بند کیا اور گیلری میں سے گزر کر اندرون خانہ تشریف لے گئے۔ دو منٹ بعد پھر واپس آئے۔ کھلے دروازے میں سے ہماری طرف پھر دیکھا، قائداعظم کے کمرے کے بند دروازے پر نگاہ دوڑائی، منہ بنایا اور باہر لان میں تشریف لے گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ حضرت ایک بہت بڑے لیڈر تھے۔ مگر ان کے طور طریقے اور حرکات سے طبیعت میں قدرے اشتعال پیدا ہو گیا۔ میں نے اپنی اہلیہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا "تم کچھ کہہ رہی تھیں"۔ انہوں نے کہا "بس یہی کہ قائداعظم سے مل لیں"۔

میں نے اپنا تعارفی کارڈ اسٹینوگرافر کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ کہنے لگے کہ ملاقات نہیں ہو سکتی۔ ہم نے اصرار کیا۔ وہ کارڈ لے کر چلے گئے اور نفی میں جواب لے کر فوراً لوٹ آئے، اور کارڈ مجھے واپس کر دیا۔ کارڈ پر نام تھا "کیپٹن میاں کفایت علی"۔ ہم نے قدرے تامل کیا اور کارڈ پھر ان کے ہاتھ میں دے دیا، اور درخواست کی ایک دفعہ پھر کوشش کریں شاید ہماری قسمت یاوری کرے۔ لیکن اس دفعہ قائداعظم کی خدمت میں عرض کریں کہ کیپٹن کفایت علی اور "اے پنجابی" ایک ہی شخص کے دو نام ہیں۔ اور "اے پنجابی" ملاقات کا متمنّی ہے نہ کہ کوئی فوجی کپتان۔ اب کے کامیابی ہوئی اور ہم بلا لئے گئے۔ قائداعظم بڑے اخلاق سے پیش آئے۔ سامنے پڑے ہوئے صوفے کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر عام رسمی مزاج پرسی کے بعد فرمانے لگے "آپ کانفیڈریسی چاہتے ہیں، اور ہم پاکستان کے حامی ہیں"۔ میرے کان اس فقرے سے پہلے ہی آشنا ہو چکے تھے۔ طبیعت میں کچھ شک سا پیدا ہو گیا۔ اور میں نے دل ہی دل میں واقعات کی کڑیاں ملانی شروع کر دیں اور فیصلہ کیا کہ اس بات کا فیصلہ آج ہو ہی جانا چاہئے۔ کیونکہ ایسا موقع پھر ہاتھ نہ آئے گا۔ چنانچہ کانفیڈریشن اور فیڈریشن کے باہمی فرق پر بحث شروع ہو گئی۔ اور میری تصنیف "کانفیڈریسی آف انڈیا" کے اصل موضوع پر بھی گفتگو ہوئی۔ ایک معمولی فوجی کپتان کے استدلال سے حقیقت پسند قائداعظم متاثر ہو گئے اور تسلیم کیا کہ کتاب کا اصل موضوع پاکستان ہی ہے اور نام محض ایک پردہ ہے۔ لیکن مجھے یاد تھا کہ میں کم درجہ کے لیڈروں سے یہ فقرہ پہلے بھی سن چکا ہوں۔ چنانچہ میں نے اس پہلے موضوع کے ختم ہونے پر قائداعظم کے نائبین کی صلاحیتوں پر تبصرہ شروع کر دیا۔ میرا آخری فقرہ یہ تھا "وہ سب نااہل ہیں"۔ اس پر وہ جوش میں آ گئے۔ اور فرمانے لگے "کیا آپ ایماندارانہ

طور پر کسی ایک کا نام لے سکتے ہیں جو آپ کی نظر میں نا اہل ہو؟" میں نے اس کا جواب یوں دیا "بہت خوب۔ کیا آپ ان میں سے کسی ایک کا نام لے سکتے ہیں جس کے بارے میں آپ کی دیانت دارانہ رائے یہ ہو کہ وہ کسی کام کا اہل ہے؟"۔

اس پر وہ عظیم المرتبت شخص فکر میں کھو گیا۔ سکوت توڑنے کے لئے میں نے سلسلۂ کلام جاری کیا۔ "مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کے بعد یہ لوگ آپ کے کئے پر پانی پھیر دیں گے۔"

میری اس بات نے انکو پھر سوچ میں ڈال دیا مگر کچھ توقف کے بعد فرمانے لگے "کیا آپ مجھے بارہ ایسے اشخاص کے ناموں کی فہرست مہیا کر سکتے ہیں جن کو میں پبلک لائف کے لئے تیار کر سکوں؟ میں نے یہ کہہ کر بات ٹالنے کی کوشش کی کہ "میں تو فوج میں ملازم ہوں، اہلِ کمال کو ڈھونڈ نکالنا میرا کام ہی نہیں۔ آپ اپنے نائب اور معین نا مزد ہی بہتر تلاش کر سکیں گے۔" مگر خلاف توقع انہوں نے کئی بار اس بات پر اصرار کیا کہ میں ایسے لوگوں کی فہرست ضرور ان کو مہیا کروں۔ بالآخر مجبور ہو کر میں نے دو اشخاص کے نام تو اسی وقت پیش کر دیئے جنہیں میں خدمتِ پاکستان عقل و دانش اور پختگی کردار کے لحاظ سے قائد اعظم کے تمام نائبین پر سبقت دیتا تھا۔ جب میں دوسرے صاحب کا نام لے چکا تو وہ کہنے لگے "اور تیسرا؟" اس پر میں نے کہا "بعد میں بتاؤں گا۔" زیرک ہستیوں کا ڈھونڈ نکالنا مشکل ہوتا ہے تو ان کو میدان میں لا کر ان کی صلاحیتوں کو کما حقہٗ کام پر لگانا مشکل تر مرحلہ ہوتا ہے۔ ہمارے حالات ہی کچھ ایسے واقع ہوئے ہیں۔

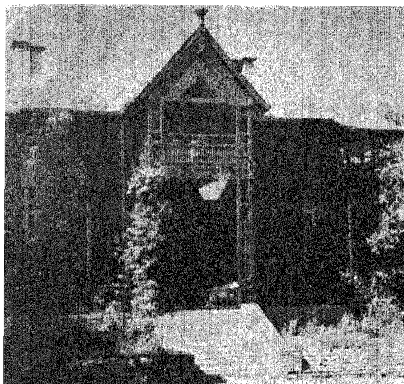
غرض، مذکورہ گفتگو قریباً دو گھنٹہ جاری رہی۔ میں نے قائد اعظم کو نہ تو خود پسند پایا اور نہ خود رائے ہی۔ کیونکہ وہ ایک منطقی رجحان کے آدمی تھے اور صحیح استدلال کی قوت کو فوراً قبول کر لینے میں فراخدل۔ ٹھیک بات کے ماننے میں انہیں کوئی عار نہ تھی۔ افسوس ان کے نائب ان کی شخصیت کا صحیح اندازہ نہ کر سکے۔ مجھے یاد ہے کہ جب بھی میں نے بذریعہ خط و کتابت کوئی صحیح بات ان کی خدمت میں پیش کی تو انہوں نے اسے شرفِ قبول بخشا۔ یہ برتر و عظیم شخصیت کی دلیل ہے۔

۱۹۳۹ء میں ڈاکٹر سید عبداللطیف (حیدرآباد دکن) کی پاکستان کی اسکیم میری کتاب "کانفیڈریسی آف انڈیا" کی اشاعت سے پہلے شائع ہو چکی تھی مگر ان کی اسکیم قطعی ناقابلِ عمل تھی۔ اور اس بارہ میں علامہ اقبالؒ کے پیش کردہ "خیال" سے دست و گریباں۔ چنانچہ میں نے ان کی اسکیم پر ایک خط میں تبصرہ بھی کیا تھا اور شاید یہی اس اسکیم کے مسترد کئے جانے کا باعث بنا۔ ورنہ لیگ والوں نے تو مذکورہ ڈاکٹر صاحب کو لاہور آ کر اپنی اسکیم پیش کرنے کی دعوت تک دے دی تھی۔ اس دعوت پر وہ لاہور تشریف بھی لائے اور "ممدوٹ وِلا" میں لیگی حضرات کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا اور ان سے داد بھی حاصل کی۔ اسی طرح سر سکندر حیات کی "زونل اسکیم" بھی تھی جس کے استرداد کی تہہ میں بھی کچھ ایسے ہی حالات تھے۔ سر سکندر کی اسکیم کی غرض پاکستان کی تنسیخ تھی۔

بعض غیر پاکستانی اہلِ قلم نے بھی قائد اعظم پر اس قسم کے الزام عائد کئے ہیں۔ لیکن انہوں نے بھی ان کی شخصیت کا صحیح اندازہ لگانے میں غلطی کی ہے، اور اپنی کم نظری کے باعث ان سے بے انصافی کی ہے۔ ان کی وفات کے بعد جو کچھ پاکستان پر بیتی وہ قارئین کے پیش نظر ہے۔ اور وہ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس وقت ہم لوگوں کے اندیشے کس قدر بجا تھے اور بعد کو واقعی یاروں نے ان کے عظیم کاموں پر کس طرح پانی پھیر دیا اور میرا تو خیال یہ ہے کہ لیگی حضرات نے تو بساطِ پاکستان کو الٹ ہی دیا تھا۔ ویسے بحمداللہ پاکستان قائم ہے مگر یہ ایک علیحدہ بات ہے۔ ہم اس کے لئے ایسے عناصر کے ممنون ہیں جو پیشہ ور سیاست داں نہ تھے اور ان کی طرف توقع نجات کے لئے شاید عام نظریں بھی نہ پڑتی تھیں۔ مگر یہ صاحبِ سیف لوگ صحتِ فکر اور عملِ صالح کی تیغ بے دریغ لے کر نکلے اور ایک عظیم قائد کی رہبری میں انہوں نے ایک پرامن انقلاب لا کر پاکستان کو بر وقت بچا لیا۔ اور قائدؒ کے پاکستان کو پھر ایک حقیقت بنا کر ہمارے لئے ایک قابلِ فخر وطن و مامن بنا دیا۔ ع

جب ناؤ ڈگمگائی پاس آ گیا کنارا

★



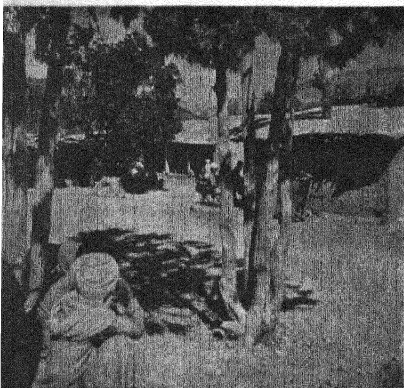
لکڑی کا بنگلہ (جہاں قائد اعظم ٹھہرے تھے)



رہگذر

زیارت

(قائد اعظم رحہ کی آخری قیام گاہ)

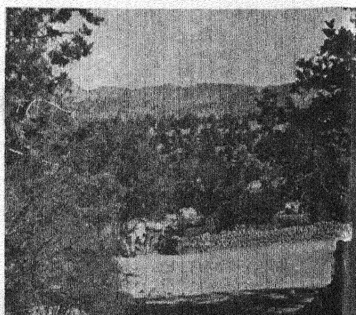


دیہی بستی

چراگاہ

خوشنما منظر



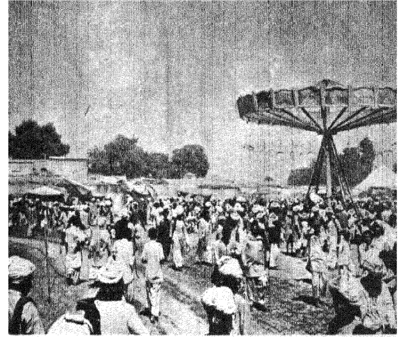


عرس شاہ عبداللطیف بھٹائی رح

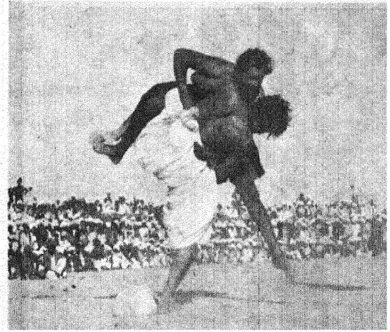
(اجتماعات اور میلہ کی رونق)



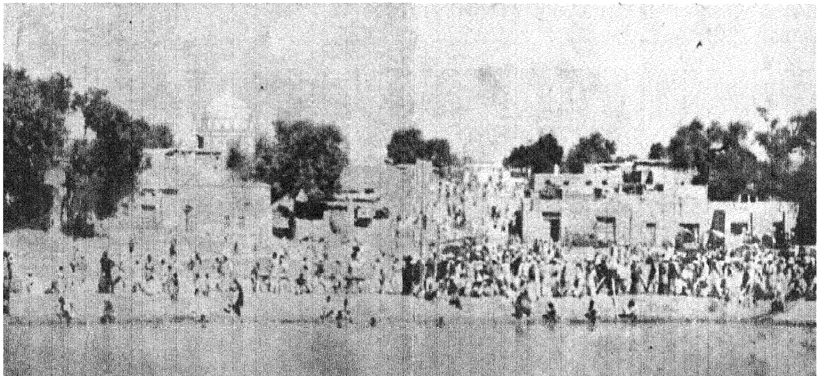
آستانہ کے سامنے زائرین کا ہجوم



میلہ کی گہما گہمی



'' ملاکھڑا '' (کشتی)



روضہ کے سامنے جھیل پر چہل پہل

ماہِ نو، کراچی۔ ستمبر ۱۹۵۹ء

قائدِ اعظمؒ کی آخری قیام گاہ

(زیارت)

مشتاق احمد نیّر

گاڑی کا بڑی بے چینی سے انتظار ہو رہا تھا۔ اسٹیشن پر ہمارے سامان کا ڈھیر لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ خدا خدا کر کے گاڑی آئی۔ ہم نے کوئٹہ کے ڈبے میں سامان کو بے ترتیبی سے رکھا اور اطمینان کا سانس لیا۔ گرمی کی شدت سے برا حال ہو رہا تھا اور غضب یہ ہوا کہ ڈبہ بھی کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

سب دوستوں نے مختلف جگہوں پر قبضہ جمایا اور ہم گاڑی کے چلنے کا انتظار کرنے لگے۔ انجن نے آخری سیٹی دی اور ہم ملتان کو الوداعی نظروں سے دیکھنے لگے۔ آہستہ آہستہ اسٹیشن ہماری نظروں سے دور ہونے لگا اور ہم زیارت کے حسین تصورات میں کھو گئے۔

زیارت کو ہم نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا لیکن اس کا عکس ہمارے دماغوں میں ضرور تھا۔ قائدِ اعظمؒ کی محبوب جگہ اور ان کی زندگی کا ایک جزوِ ناگزیر جس کو ہم دیکھنے جا رہے تھے دراصل یہ ہم طلباء کے اپنے ذوق و شوق کا نتیجہ تھا کسی کی سربراہی میں نہیں۔ اسی لئے ہم پروفیسر صاحبان کی کڑی نگرانی سے بھی آزاد تھے۔ اس سفر کو ایک "اسٹڈی ٹور" یعنی سفر برائے تلاش و تحقیق کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ ہمارا خیال کوئٹہ اور زیارت جیسے مقامات سے ایسے پتھر یعنی "کرومیٹ" لانا تھا جن سے دھاتیں وغیرہ نکلنے کا امکان ہو۔

گاڑی کی رفتار ہر لحظہ تیز ہو رہی تھی۔ گرمی کی وجہ سے ہم سب کھڑکیوں ہی میں لٹک رہے تھے اور پنکھے کی ہوا یوں لگتی تھی جیسے سخت لو چل رہی ہو۔ گاڑی کی رفتار میں پھر کمی ہونی شروع ہوئی اور ہماری پریشانی اور بڑھنے لگی کیونکہ آنے والے اسٹیشن پر زیادہ بھیڑ کی توقع تھی۔ جب اسٹیشن پر گاڑی رکی ہوئی تو ہم نے گارڈ سے اپنی مشکلات کا ذکر کیا۔ اس نے ہمیں ایک چھوٹا سا کمپارٹمنٹ خالی کروا دیا اور یوں ہماری مشکلیں آسان ہوگئیں۔ گاڑی نے پھر رینگنا شروع کیا۔ اور ہم کچھ دیر کے لئے باہر کے مناظر میں کھو گئے۔ گاڑی بڑی تیزی سے درختوں اور جھاڑیوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی جا رہی تھی۔ اور ہم زیارت کی طرف بڑھ رہے تھے۔

ہم تعداد میں تقریباً سات تھے اور خوش قسمتی سے تقریباً سب ہم جماعت۔ کالج کے کام سے فارغ ہو چکے تھے اس لئے سب کے چہروں سے خوشی جھلکتی تھی۔ ہم نے اپنی پارٹی کا سردار سعید ظفر کو بنایا کیونکہ وہ ہم سب میں زیادہ سمجھدار سمجھے جاتے ہیں۔ ابھی تک وہ کھڑکی ہی میں لٹک رہے تھے۔ لیکن گرمی نے انہیں وہاں بھی نہ ٹھہرنے دیا۔ اور وہ اندر آ دھمکے اور آتے ہی فرمانے لگے کہ اس طرح بیٹھے رہنے سے تو اتنا لمبا سفر کٹنا مشکل ہے۔ چنانچہ یہ مختصر قافلہ دو حصوں میں بٹ گیا یعنی ہماری دو پارٹیاں بن گئیں۔ ایک تاش میں اور دوسری لوڈو میں کھو گئی۔

شام کے سائے بڑھ رہے تھے اور گاڑی چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں کو چھوڑتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ رات کو ساڑھے گیارہ بجے ہم روہڑی پہنچے۔ یہاں پہلی بار ہم خوش گپیوں میں مشغول ہوئے اور ایک بار پھر قہقہے عود کر آئے۔ تقریباً سوا بارہ بجے ہماری گاڑی سکھر بیرج سے گذر رہی تھی اور وہ عظیم الشان منصوبہ ہماری نظروں میں پھر گیا جس نے ریگستانِ سندھ میں زندگی کی ایک نئی روح دوڑا دی ہے۔ اور نہ صرف مقامی لوگوں کے لئے خوشحالی کی نوید ہے بلکہ پاکستان بھر کے لئے نہایت وسیع امکانات لئے ہوئے ہے۔ اس سے ہماری ملت کی گریز پا ترقی، جدوجہد اور عزم و ارادے ایک نہایت ولولہ انگیز احساس پیدا ہوا۔ دریائے سندھ خاموش تھا، بالکل خاموش۔ جیسے یہ قدیم دریا ہمارے ملک کی گذری ہوئی تاریخ کی یاد میں گم ہو اور اپنے پرشکوہ سینے میں تہذیب و تمدن کے ان گنت نقوش لئے ہوئے ہو یا پھر وہ آئندہ عروج و کامرانی کے خواب دیکھ رہا ہو جن کو دوریوں نے پیغامِ نمو دیا ہے۔

سکھر سے ہمارے ڈبہ میں دو فوجی آ گئے جنہیں ہم نے بڑی خوشی سے سوار کیا اس لئے کہ ان کے چہرے ان کے مضبوط جسم ہماری زندگی میں ایک نئی سطوت اور وقار کے آئینہ دار ہیں ہم کیرو کے شاگرد یا مسٹر ملک کے بہت شوقین تھے۔ اس لئے ہم نے کہا جلوان فوجیوں کے ہاتھ ہی دیکھیں یقیناً ان کی لکیروں میں ترقی کے ساتھ ملّی عروج و ترقی کی پگڈنڈیاں اور شاہراہیں بھی ہوں گی۔ اور ان کی تہہ میں اس کی صاف صاف جھلکیاں دکھائی دیتی ہوں گی جیسے کہ ان کے چہروں سے صاف ظاہر تھا۔ ان ناموس ملت کے نگہبانوں سے مل کر دل بہت خوش ہوا اور راستہ بڑے مزے سے یوں کٹنے لگا جیسے وہ ہمیں میں سے ہوں۔ اور ہمارے اپنے گھر کے لوگ ہوں اور حق یہ ہے کہ انہوں نے اس کا آگے چل کر پورا پورا ثبوت بھی دیا کیونکہ انہوں نے باقی سفر میں ہمیں بہت سی سہولتیں بہم پہنچائیں۔

رات کا ایک بج رہا تھا سوائے گاڑی کی آواز کے اور کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ باہر تاریکی تھی اور ہم کھیل سے اکتا کر بستروں کی طرف لپکے اور یہ نہیں کہہ سکتے کہ کب سوئے۔ صبح تقریباً چھ بجے ہم سبی پہنچے، وہی مقام جو اپنی قیامت آفریں گرمی کے لئے مشہور ہے اور جہاں چیل واقعی انڈا چھوڑ جاتی ہوگی۔ ہم نے منہ ہاتھ دھویا اور اسٹیشن پر ناشتہ ڈھونڈنے لگے۔ لیکن یہاں روٹی تو درکنار چنے بھی میسر نہ تھے۔ مجبوراً کچھ پھل جو ہم ملتان سے ساتھ لائے تھے کھا کر ناشتہ کیا۔ یہاں سے پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ ہماری گاڑی میں دو انجن لگے اور آہستہ آہستہ گاڑی منزل مقصود کو روانہ ہوئی۔ سبی سے کوئٹہ تقریباً سو میل کا راستہ ہے جس کو گاڑی سات گھنٹوں میں طے کرتی ہے راستے میں تقریباً ۲۰ سرنگیں آتی ہیں۔ ایک بجے دوپہر کو ہم کوئٹہ پہنچے۔ بھوک کے مارے بے دم ہوئے جاتے تھے اور اس بارے میں چوہوں کا مشہور محاورہ صحیح ثابت ہو رہا تھا۔

سامان باہر نکالا اور تانگہ میں سوار ہو گئے۔ قندھاری بازار میں رہائش کا انتظام کیا ہوا تھا۔ یہاں ایک فلیٹ میں ہمیں دو کمرے مل گئے۔ ہر چیز معقول انتظام تھا۔ نہا دھو کر ہم کھانا کھانے ہوٹل میں چلے گئے۔

کوئٹہ پہاڑ کے دامن میں واقع ہے۔ یہ ایک بڑا ہی خوبصورت شہر ہے۔ چاروں طرف آتش فشاں پہاڑ فصیل کا کام دیتے ہیں۔ ہوٹلوں کی کثرت اس کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اگر کوئٹہ کو پھلوں کی زمین اور ہوٹلوں کا شہر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا ہم دو دن کوئٹہ میں رہے۔ اور آس پاس کے علاقے کی خوب سیر کی۔ ہڑک، جہاں سے کوئٹہ کو پانی مہیا کیا جاتا ہے اور خوبصورت ھنا جھیل دیکھنے کی چیزیں ہیں۔ ان سے طبیعت بے حد بشاش ہوئی اور جی چاہا انہیں کے سحر آفریں ماحول میں پہروں بیٹھے رہیں۔ اسٹاف کالج اور بروہی سینیٹوریم انسانی سعی و کوشش کو خراج تحسین ادا کرتے ہیں۔ تیسرے روز ہم زیارت روانہ ہوئے جو کوئٹہ سے ۷۰ میل شمال مشرق میں ہے۔ ہم صبح ۹ بجے بس میں بیٹھے اور تین بجے زیارت پہنچے۔

زیارت ایک چھوٹا سا پہاڑی گاؤں ہے جو سطح سمندر سے آٹھ ہزار آٹھ سو فٹ اونچا ہے جیسا کہ اس کی اونچائی سے ظاہر ہے چھ ماہ تک یہاں دس گیارہ فٹ برف پڑتی ہے۔ اور ان ہی مہینوں میں چار یا پانچ چوکیدار نگرانی کے طور پر رہ جاتے ہیں۔ لوگ بہت ایماندار ہیں۔ رات کو عموماً لوگ دروازہ کھلا چھوڑ کر ہی سوتے ہیں۔

ہر طرف سبزہ زار، ہر سمت سبزہ ہی سبزہ، جیسے یہ سبزہ ہی کا شہر ہو۔ زیارت کا نام دو فقیروں کی وجہ سے مشہور ہوا ہے جن میں سے ایک کا مزار تو زیارت ہی میں ہے۔ اور دوسرے کا زیارت سے چار میل دور۔

ہم نے پہلے ایک ہوٹل میں قیام کیا لیکن اس کی فضا کچھ راس نہ آئی۔ بہت بددل ہوئے۔ خیال آیا شاید ہمیں بے نیل و مرام ہی واپس جانا پڑے۔ مگر ایک کرم فرما کے توسط سے ہم ایک اعلیٰ پولیس افسر کے مہمان بن گئے۔ جنہوں نے نہ صرف رات کا کھانا کھلایا بلکہ رہائش کے لئے ایک بنگلے کا انتظام بھی کر دیا۔ اور ہمیں ایک بار پھر احساس ہوا کہ ہمارے ملک میں افسران کس قدر خوش خلق اور مردم نواز ہیں۔ اس کے بعد یہ افسر، راجہ صاحب، (آخر ان کا نام لے دینے میں کیا حرج ہے) ہر روز ہمارے ہاں آتے اور جس چیز کی ضرورت ہوتی فوراً پوری کر دیتے۔ بہر حال ہم ابتدائی حالات کے سبب پہلے دن زیارت کی صحیح زیارت سے محروم رہے۔

زیارت کی پہلی رات بڑی بے کیف تھی۔ سفر کی دوسری ٹریجڈی نے تو ہمیں بالکل ہی سنجیدہ بنا دیا تھا۔ دسویں کا پھیکا چاند آسمان پر دعوت نظارہ دے رہا تھا۔ لیکن ہمارے لئے اس رات کی رنگینیاں بے معنی تھیں۔ لحاف اوڑھے ہوئے پڑے تھے اور سردی کا یہ عالم کہ لحاف بھی چادر سے

زیادہ اہمیت نہ رکھتے تھے۔ ہمارے لئے تو زیارت میں "گرمیوں کی سردی" تھی سب لحافوں میں دبکے پڑے تھے۔ اگر کوئی شرارت کے لئے اپنا سر بھی باہر نکالتا تو پھر اندر کر لیتا۔ مجھے اس وقت پنجاب کی گرمی یاد آئی۔ کتنا فرق تھا زیارت کی رات اور پنجاب کی رات میں۔ تھوڑی دیر بعد ہم میٹھی نیند کے مزے لوٹ رہے تھے۔ اس طرح خوابوں میں ایک بار پھر گھر کی سیر، ریل کا سفر اور نہ جانے کن کن دنیاؤں کی زیارت ہو گئی۔

صبح ہوئی۔ غضب کی سردی تھی۔ لیکن ہمارے من میں وہی پرانی "گرمی" تھی۔ ٹھنڈے پانی سے غسل کیا طبیعت "صاف" ہو گئی۔ آئندہ صبح نہانے سے توبہ کی۔ نوکر نے ناشتہ بنا کر دیا۔ اور ہم کپڑے بدل کر گلاب خاں کی قیادت میں قائداعظمؒ کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ شخص اچکزئی قبیلہ کا ایک پٹھان تھا۔ قائداعظمؒ جتنے عرصہ زیارت رہے وہ بطور خانساماں کے ان کی خدمات بجالاتا رہا۔ ہمارے پانچ روزہ قیام کے دوران میں وہ ہمارے ساتھ ایک رہنما کے طور پر رہا تھا اور مختلف مقامات کی سیر کروائی۔ اگر ہم کہیں کہ ہماری زیارت سے دلچسپی صرف اس کی وجہ سے تھی تو بیجا نہ ہو گا۔

قائداعظم محمد علی جناحؒ کی رہائش گاہ ہماری جائے قیام سے تقریباً ایک فرلانگ اوپر کو تھی۔ پہاڑی پر ایک چھوٹا مگر خوبصورت بنگلہ تھا۔ لکڑی کا بنا ہوا یہ بنگلہ اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ اس نے بھی کبھی بہار دیکھی تھی۔ ماحول اداس تھا۔ جیسے اس ماحول کو قائداعظم اور صرف قائداعظم کا انتظار تھا۔ لیکن اس اداسی میں بھی مسرت و شادمانی کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ اس لئے برسوں بعد ایسی فضا پیدا ہو گئی ہے جس میں قائداعظم کے خواب حقیقی معنوں میں شرمندۂ تعبیر ہو سکیں اور ایسی سرزمین میں جو ویران ہو چلی تھی پھر سے بہار آ رہی ہے۔ ہم نے وہاں مختلف جگہوں کے فوٹو لئے۔ کچھ دیر قائداعظم کی یاد میں کھوئے رہے۔ کتنا مختصر تھا یہ بنگلہ جس میں اتنی عظیم ہستی قیام کر چکی تھی۔ ایک پرسکون ماحول۔ ایک عجیب شام ایک موہوم اور عجیب سی اداسی اور عجیب سی مسرت۔ لان میں اخروٹ اور سیب کے درخت شاہد تھے کہ کبھی ان کے نیچے بھی کوئی بیٹھا تھا گھاس زبان ماضی سے کہہ رہی تھی کہ میں بھی قائداعظم کے قدم چومنے کا شرف حاصل کر چکی ہوں۔ ایک ہمدرد انسان جس کے دل میں سوائے قوم کی بھلائی کے اور کوئی خیال نہ تھا۔ گلاب خاں نے ہمیں بتایا کہ آخری ایام میں بھی جب قائداعظمؒ کی طبیعت علیل تھی اور ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش نے آپ کو کام کرنے سے منع کر دیا تھا، وہ رات کے دو دو بجے تک اپنی میز پر کام کرتے دکھائی دیتے تھے۔ ان کے چہرے پر کبھی بھی مسکراہٹ نہ دیکھی جاتی۔ کون جانے ان کی سنجیدگی میں کون سا راز پنہاں تھا۔ گلاب خاں نے مزید بتایا کہ جب ہم باورچی خانے میں یا کسی اور جگہ کام کیا کرتے تھے تو قائداعظمؒ وہاں آ جایا کرتے اور ہم سے استفسار کرتے۔ کیا ہم موجودہ زندگی سے خوش ہیں؟۔ ایک بڑا انسان جس نے ملک کے بہت معمولی لوگوں کو قوم کا صحیح معیار تصور کیا۔ وہ جانتے تھے کہ یہی وہ لوگ ہیں جن کے کندھے ملک کا بار اٹھائے ہوئے ہیں۔ قائداعظمؒ کی بیماری کا ذکر کرتے ہوئے گلاب خاں نے کہا جب آپ بیمار ہوئے تو آپ کو زیارت سے کوئٹہ لے جایا گیا۔ ۷۶ میل کے راستے میں قدم قدم پر لوگ اپنے محبوب قائداعظمؒ کا آخری بار چہرہ دیکھنے کے لئے بے قرار تھے۔ آپ نے ہر شخص کو سلام کا جواب دیا۔ یہاں تک کہ جب کوئٹہ میں اتنی طاقت بھی نہ رہی کہ آپ اٹھ سکیں تو آپ کی ہدایت پر آپ کے ہاتھ کے نیچے ایک تکیہ رکھ دیا گیا۔ تاکہ آپ اپنے لوگوں کے سلام کا جواب دے سکیں۔ کتنی حیرت ہے کہ ہمارے قائداعظمؒ کو اپنی قوم کی ایک معمولی خواہش کا اتنا پاس تھا۔ قائداعظم کی موت نے زیارت کو سوگوار کر دیا۔ ہر راستہ اب بھی قائداعظمؒ کو پکارتا ہے۔ کاش قائداعظمؒ اب بھی ان کی پکار کو سن سکے۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ اس پکار کے لئے ہمیشہ گوش برآواز ہیں۔ عالم بالا میں بھی ان کی بہترین تمنائیں اپنی قوم، اپنے لوگوں کے لئے وقف ہیں اور یہ انہیں کی برکت ہے کہ حالات نے پھر ایک زبردست کروٹ لی ہے اور پاکستان ایک سرے سے دوسرے سرے تک قائداعظمؒ ہی کے خلاّ آثار خوابوں کا عکس معلوم ہوتا ہے۔

ہم اس جگہ کافی دیر تک ٹھہرے رہے۔ اس کے بعد کمشنر ہاؤس دیکھنے چلے گئے۔ پھر ہمارا معمول ہو گیا کہ ہم ہر روز قائداعظمؒ کی رہائش گاہ پر جاتے اور کافی دیر وہاں بیٹھے رہتے۔ آخر میں "سنڈیمان تنگی" یعنی سنڈیمان آبشار دیکھنے گئے۔ یہ آبشار زیارت سے چار میل دور دو پہاڑوں کو عبور کرنے کے بعد آتا ہے۔ ایک معمولی مگر خوفناک آبشار ہے جو بالکل پہاڑوں کے اندر ہے۔ وہاں سے ہم نے وہ پتھر بھی لئے جن سے کوئلہ، لوہا، کرومیم وغیرہ نکلتا ہے۔ چقماق یہاں عام ہے جس کو رگڑنے سے چنگاریاں نکلتی ہیں۔ ہم نے اس جگہ کے بھی کئی فوٹو لئے اور اگلے روز کوئٹہ آ گئے اور اس کے بعد ملتان روانہ ہو گئے۔ کیونکہ یوم استقلال اپنے شہر ہی میں منانے کا پروگرام تھا۔ اور حق یہ ہے کہ زیارت میں بابائے ملتؒ سے روحانی ربط اور تازگی و بشاشت پیدا کرنے کے بعد اس تقریب کو منانے میں بھی ایک خاص لطف تھا۔ نہ معلوم اس کی زیارت نے قائداعظمؒ سے رشتۂ غیبی استوار کر کے ہمارے دلوں میں کیا جوت پیدا کر دی کہ ان میں اب تک ایک روشن فضا نظر آتی ہے حالانکہ ہم کو زیارت کی پرکیف و پرسکون فضا کو خیرباد کہے مدت ہو چکی ہے۔

جہاں تاب

مجید شاہد

وقت ہے جملہ اسبابِ عالم کی تشکیل و تغییر کا محورِ بے نشاں
وقت ہے صدیوں، قرنوں، زمانوں کے آئندہ و رفتہ حالات کا راز داں
وقت کجرو کبھی ہے برق رفتار بھی، وقت خاکہ ہے ترتیبِ حالات کا
وقت صورت گرِ دورِ ایام ہے، وقت راوی ہے جملہ روایات کا
وقت ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہو جلوۂ صبح بھی منظرِ شام بھی
وقت ہر داستاں کا ہے آغاز بھی، وقت ہے ہر کہانی کا انجام بھی
وقت نے کتنے منفی و مثبت خد و خال ابھارے ہیں انساں کی تصویر کے
وقت نے جاوداں زندگی کے سنہرے اصول و ضوابط مرتب کئے
وقت جغرافیائی حدوں میں مقید نہیں بلکہ جغرافیائی حدیں
وقت ہی کے سہارے نکھرتی سنورتی رہیں ہر زمانے میں ہر دور میں
داستانیں، حکایات، قصے، روایات، غرضیکہ جتنے بھی موضوع تھے
وقت نے کہنہ تاریخ کے سادہ اوراق و ابواب کو خود مہیا کئے

★

کتنی صدیاں ہوئیں اک جوانِ عرب آکے دیبل کے ساحل پہ اترا تھا جب
چشمِ افلاک شاہد ہے اس امر کی وقت ہی نے کیا تھا اسے منتخب
تاکہ پیغامِ حق سندھ سے ہندیوں کو سنائے وہ رمز آشنائے حرم
اور پھر ہند کی وسعتیں رفتہ رفتہ ہوئیں آشنائے نوائے حرم
وقت بڑھتا رہا اور پیشانئِ ارضِ ہندوستاں پر یونہی دمبدم
ثبت ہوتے رہے، ماند پڑتے رہے کچھ نئے کچھ پرانے نقوشِ قدم

★

مدتوں کے تعطل کے بعد ایک ایسی ہی بھرپور انگڑائی لی وقت نے
سندھ ہی کے افق پر نمودار جب وہ ستارہ ہوا جس کی تنویر سے
ابتدا میں تھی ناآشنا ہر نظر ــــ اس حقیقت کی لیکن کسے تھی خبر
اس ستارے کی سمٹی ہوئی روشنی اصل میں ہے دلیلِ نمودِ سحر
اے وطن، کیا خبر تھی کہ اس کی ضیاء سے فضا تیری ہو گی منور کبھی
پردۂ ظلمتِ شب سے ابھرے گا وہ آفتابِ جہاں تاب بنکر کبھی

★

اے وطن، وقت کی اس ادا پر ہمیں ناز ہے اور بجا طور پر ناز ہے
کیونکہ یہ روشنی، یہ سماں، یہ سحر وقت کی گردشوں ہی کا اعجاز ہے

تاریخ۔ تہذیب اور پاکستان

سید محمد تقی

پاکستان کا قیام تاریخ کا کوئی اتفاق نہیں تھا۔ تہذیب جن متعین ثقافتی راہوں سے گذر رہی تھی ان کا لازمی تقاضہ ایک ایسے تہذیبی منطقہ کا قیام تھا جو ہندی عرب ثقافتی مرکب کا امین ہو سکے لیکن پاکستان کے قیام کے ۱۲ سال بعد بھی یہ بات عجیب بلکہ افسوسناک ہے کہ ان تہذیبی و ثقافتی عناصر کا تجزیہ کرنے کی کوئی منظم سعی نہیں کی گئی جو اس عہد آفریں واقعہ کا سبب بنے تھے۔ وہ واقعہ جو برِ کوچک کے عظیم تہذیبی تصادم میں عرب ہندی تہذیبی ملغوبہ کو بچانے کی کامیاب سعی کی حیثیت رکھتا تھا۔

مارچ ۱۹۴۰ء سے لیکر اگست ۱۹۴۷ء تک برصغیر کے سیاسی حلقے پاکستان کے مطالبہ کے سلسلہ میں جن بحثوں میں الجھے رہے وہ یک قومی اور دو قومی تصوّر سے متعلق بحثیں تھیں۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی جو متحدہ ہندوستان کی حامی تھی، اس نظریہ پر مُصر تھی کہ ہندوستان ایک ہی قوم کا وطن ہے، اس لئے برصغیر کی تسلیم کا مطالبہ غیر صحیح ہے۔ اس کے برعکس مسلم لیگ کا موقف یہ تھا کہ ہندوستان ایک سے زیادہ اقوام کا امین ہے، اس لئے مسلم ہندوستان کا حقِ خود اختیاری کا مطالبہ بالکل جائز ہے۔ مسلمانان ہند ایک قوم تھے یا نہیں، یہ بحث سیاسیات سے ایک قدم پیچھے ہٹ کر سماجیات کے دائرے میں داخل ہو کر کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح ہندوستان کے ایک قوم ہونے نہ ہونے کی بحث بھی سماجیات کے اساسی اصولوں سے تعلق رکھنے والی بحث ہے۔

انسان کی معلومہ تاریخ کو جو گذشتہ چھ ہزار سال کے عرصہ پر پھیلی ہوئی ہے، آپ دو طرح سمجھ سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ اسے تہذیب کے ایسے بہاؤ سے تعبیر کریں جو وادیٔ نیل، دجلہ و فرات کے ساحلی سبزہ زاروں اور وادیٔ سندھ کے زرخیز نخلستان سے اٹھ کر بنی نوع انسان کو مادی راحتیں مہیا کرتی ہوئی مغربی یورپ اور امریکہ کے شاندار محلوں یا ماسکو اور پیکنگ کی ان فیکٹریوں پر اختتام پذیر ہوا جہاں مادی راحتوں کے مہیا کرنے کی زبردست جدوجہد کی جا رہی ہے۔ تاریخ کے خطِ مستقیم پر ارتقاء کا یہ نظریہ انسان کی مر بوط فکر کے لئے بڑا دل خوش کن معلوم ہوتا ہے۔ تاریخ کی اس تعبیر کے پیش نظر انسانی تہذیب، مادی آسائشوں کے حصول کی جدوجہد سے عبارت ہے۔ اس نظریہ کی رو سے ہندوستان کے باشندوں کو متحدہ طور پر اپنی مادی آسائشوں کے حصول کی سعی کرنی چاہیئے تھی جس کے لئے انگریزوں کی غلامی سے آزادی ناگزیر تھی۔ تاریخ کی یک تہذیبی تعبیر کا یہ نظریہ مارکس کے مادی تعبیر کے نظریہ سے بہت ہم آہنگ ہے لیکن یہ حیرت انگیز اتفاق ہے کہ مارکس جیسے ذہین مبصر کی نظریں مسئلہ کے اتنے وسیع اطلاقات تک نہ پہنچ سکیں اور وہ تاریخ کی تعبیر کی بحث میں مسائل کے مذکورہ مضمرات کو نہ سمجھ سکا۔ مارکس ہی کی طرح آل انڈیا کانگریس کے وہ زعماء بھی جو مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان کے مخالف اور غیر شعوری طور پر اسی قسم کی تہذیبی تعبیر کی اساس کو اپنائے تھے، مسائل کی اُن پیچیدگیوں کو نہ سمجھ سکے جو اُن کے موقف سے قدرتی طور پر پیدا ہوتی تھیں۔ مسائل کے ان پہلوؤں سے مارکس کی ناآگہی کا یہ نتیجہ نکلا کہ اسٹالین نے ۱۹۱۱ء میں قومیتوں کے حق خود اختیاری کا تصور پیش کیا جو مختلف قومیتوں کے وجود کا اعتراف تھا لیکن مختلف قومیتوں کا تصور مختلف تہذیبی نمونوں کے وجود کو مستلزم ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی تہذیب ایک نہیں بلکہ وہ متعدد نمونے، متعدد نشوونما رکھتی ہے۔ ساتھ ہی اس کا یہ بھی مطلب تھا کہ تہذیب صرف مادی آسائشوں کے حصول کی جدوجہد سے عبارت نہیں ہے بلکہ وہ کچھ اور بھی ہے جو ایک قومیت کو کسی دوسری قومیت سے ممتاز کرتی ہے۔ مارکس اور اسٹالین کی طرح آل انڈیا کانگریس کے زعماء بھی اپنے موقف کے منطقی نتائج کو نہ سمجھ سکے۔ متحدہ ہندوستان کے نظریہ کا تحت شعوری پس منظر صرف یہی تھا کہ ہندوستان کے باشندے مادی آسائشوں سے محرومی میں مشترک ہیں۔ اس لئے انہیں متحد ہو کر غلامی کے خلاف منظم ہونا چاہیئے لیکن اگر یہی اشتراک، یک قومی نظریہ کی دلیل بن سکتا تھا تو پھر زیادہ منطقی نعرہ وہ ہونا چاہیئے تھا جو مارکس نے دنیا کے مزدوروں کو سکھایا تھا کہ عالم کے محروم عوام متحد ہو جاؤ۔ یوں تاریخ کے بہاؤ کو صرف یک تہذیبی جدوجہد خیال

کرنے کی صورت میں ہندوستان کے یک قومی ہونے کا نظریہ صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا کہ اس صورت میں ہندوستان ہی تنہا ایک قوم نہیں تھا، ساری دنیا ایک ہی قوم تھی۔

تاریخ کو یک تہذیبی بہاؤ تعبیر کرنے کا تصور کئی ناقابلِ حل دشواریوں سے دوچار ہوتا ہے۔ سب سے پہلے اس کی رو سے جنوبی امریکہ کی قدیم تہذیبوں کو تاریخی بہاؤ سے ایک غیر متعلق حقیقت گردانا پڑے گا اور جنوبی امریکہ کی قدیم تہذیبوں ازٹک اور انکاس کے باشندوں کی اس دلیل کا جواب دینا مشکل ہو جائے گا کہ تاریخ کی ارتقائی رفتار اُس وقت ختم ہو گئی جب قدیم دنیا کے باشندوں نے امریکہ کو دریافت کیا اور ہسپانی نوآبادکاروں نے جنوبی امریکہ کی پُرانی تہذیبوں کو مٹانے پر کمر باندھی۔ تاریخ کے خطِ مستقیم پر ارتقا، کا یہ نظریہ، جو جدید عہد کے انسان کے غرور اور خود پرستی کی علامت ہے، اپنی منطق ڈارون کے نظریۂ ارتقا، سے حاصل کرتا ہے۔ ڈارون کا نظریۂ ارتقا، جو عملی سائنسی ضرورتوں کے لئے کتنا ہی ناگزیر کیوں نہ ہو، اعلیٰ فکری سطح پر انسان کے اس نسلی غرور کی پیداوار ہے جس کی رو سے یہ بھیانک وسعتوں والی کائنات صرف مغربی یورپ اور ماسکو و پیکنگ کے نظریہ بازوں کو وجود میں لانے کے لئے اربوں سال سے متحرک رہی ہے۔ کچھ بھی ہو اتنا تو بالکل صاف ہے کہ انسان کی بزرگی و برتری اور کائنات کی ساری حرکت کو ارتقا کے محترم فرزندوں، آئزن ہاور اور خرشچیف کو پیدا کرنے سے مخصوص کر دینے کا یہ نظریہ بنانے والے حضرات نے اپنا نظریہ گھڑتے وقت سب سے پہلے ذی حیات وائرس (VIRUS) سے کوئی مشورہ نہ لیا تھا، اس لئے اگر وائرس کی رائے اُن سے مختلف ہو تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیئے۔

تاریخ کی تعبیر کا دوسرا انداز ہر تہذیب کو ایک جداگانہ اکائی خیال کرتا ہے جو کسی دوسری تہذیبی اکائی کا ضمیمہ نہیں بلکہ بجائے خود ایک خود مختار ذات ہے۔ تاریخ کی تعبیر کا یہ انداز جدید سماجیاتی اصولوں کے ساتھ انصاف کرتا ہے اور تہذیبوں کے مختلف نمونوں کے وجود کو تسلیم کرتا ہے۔ دراصل اس بحث کے ساتھ انصاف کرنے کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم دو اصطلاحات کے جدا جدا مفہوم معین کریں۔ کلچر (ثقافت و تہذیب) اور سویلزیشن (تمدن) دو بظاہر مترادف المعنی اصطلاحات ہیں لیکن فی الواقع ان کے اطلاقات کافی مختلف ہیں۔ سویلزیشن یا تمدن کسی عہد کے مادی ذرائع راحت کی نوعیت پر دلالت کرتا ہے جب کہ کلچر یا ثقافت کسی مخصوص انسانی گروہ کے ذہن، مزاج، کردار اور کائنات یا اپنے ماحول سے متعلق کسی انسانی جماعت کا متعین اندازِ نظر بتاتا ہے۔ مذکورہ اصطلاحوں کے اگر یہ مختلف اطلاقات صحیح ہوں تو پھر مادی راحتوں کی نوعیت کے پیشِ نظر تاریخ کی تعبیر اور متعدد تہذیبی نمونوں کی موجودگی کا تصور ہم آہنگ ہو جائے گا اور وہ اختلاف جو دونوں تعبیروں میں نظر آتا ہے، باقی نہ رہے گا۔

بہر حال بات کو دو جداگانہ اصطلاحات کی جداگانہ تشریح کے طرز پر کہا جائے یا تاریخ کی دو جداگانہ تعبیروں کا سوال اٹھایا جائے، تاہم اتنا واضح ہے کہ انسانی تاریخ متعدد تہذیبی و ثقافتی نمونوں کا مجموعہ رہی ہے۔ عرب ثقافت بھی انہی ثقافتی مجموعوں میں شامل ہے۔ یہ عرب ثقافت خواہ مجوس تہذیب کی زوال آمادہ شکل ہو، جیسا اشپنگلر کا خیال ہے یا اُس تصادم کی پیداوار جو مغربی تہذیب کے مشرقِ وسطیٰ میں داخلہ کی وجہ سے رونما ہوا جیسا ٹوئنبی اور گبن باور کرتے ہیں، ہندوستان آکر ہندی آریائی تہذیبی اکائی سے متصادم ہو کر ایک نئے ثقافتی مرکب کا نتیجہ بنی جو آیندہ ۸ سو سال میں ایک جداگانہ ثقافتی اکائی بن گیا۔ مسٹر ایم۔ این رائے اپنی اس رائے میں صحت پر ہیں کہ یہ عرب تہذیب ہندی آریائی ثقافت سے زیادہ جاندار تھی، اسلئے اس کی ہندی تہذیب پر گہری چھاپ لگی۔ عرب تہذیب کا یہ نیا نمونہ اٹھارویں صدی میں ایک متعین اور مخصوص شکل اختیار کر چکا تھا جس کے زندہ رہنے کے لئے ایک سیاسی خول کی ضرورت تھی۔ پاکستان کا مطالبہ شعوری طور پر بہت کم اور غیر شعوری طور پر بہت زیادہ اسی تقاضہ کا جواب تھا۔ عرب ہندی آریائی تہذیب اپنی زندگی آزاد ماحول میں بسر کر سکتی تھی ورنہ خالص ہندی آریائی تہذیب اور عرب ہندی آریائی تہذیب کا تصادم اس برصغیر کا امن غارت کئے رہتا۔ یوں پاکستان کا قیام نہ صرف سیاسی بلکہ ثقافتی و تہذیبی حل تھا اُس کشمکش کا جو گزشتہ آٹھ سو سال سے کبھی خفیہ اور کبھی اعلانیہ ہوتی رہی تھی۔ ثقافت و مذہب دو جدا جدا دائرے ہیں جن کے نقاط کئی جگہ ملتے ہیں لیکن یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ وہ تمام کے تمام نقاط پر ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہیں۔ اب اگر یہ صحیح ہو کہ پاکستان کا قیام ایک ثقافتی ضرورت کی حیثیت رکھتا تھا تو پھر یہ کہنا کہ پاکستان محض ایک مذہبی مطالبہ ہی تھا، پوری طرح صحیح نہ ہوگا۔ اس لئے کہ مذہب اس ثقافت کا صرف ایک ہی جزو تھا گو سب سے اہم جزو یہی جس کی اساس پر پاکستان بنا تھا۔

قیامِ پاکستان سے پہلے یہ بحث بڑی شدت کے ساتھ کی جاتی رہی کہ ہندوستانی مسلمان ایک جداگانہ ثقافتی نمونہ کی نمائندگی کرتے ہیں یا

نہیں۔ ایک گروہ جو کانگریسی طرزِ تفکر کی حمایت کرتا تھا، ہر صوبہ، ہر علاقہ کی مخصوص تہذیب پر زور دیتا تھا اور اس متحدہ ثقافت کے وجود سے منکر تھا جو مسلم ہند کے ساتھ مخصوص ہو۔ اس کے برعکس ایک دوسرا گروہ تھا جو مسلم ہند کی علاقائی خصوصیات کے اعتراف کے باوجود ایک متحدہ مسلم ثقافت کے وجود پر بھی اصرار کرتا تھا اور یہی وہ خیال ہے جس سے پاکستان کا جواز پیدا ہوتا تھا۔ پاکستان کا مطالبہ مسلم ہند کے ایک جداگانہ قوم ہونے کی اساس پر کیا جا سکتا تھا ورنہ اگر غیر منقسم ہند کے تمام باشندوں کے مسائل یکساں ہوتے تو پھر کسی ایک گروہ کے لئے جداگانہ سلطنت قائم کرنے کا مطالبہ جائز نہ ہوتا لیکن مسلم قوم کی جداگانہ قومیت کو خاص طور پر ایسی حالت میں کہ وہ محکوم اور جغرافیائی طور پر برصغیر کے مختلف حصوں میں پھیلی ہوئی تھی، صرف مذہب یا جداگانہ ثقافتی نمونہ ہونے کی بناہی پر جائز قرار دیا جا سکتا تھا۔ مسلم ہند کا مذہبی امتیاز جداگانہ سلطنت کے مطالبہ کا جواز نہ بن سکتا تھا کہ اگر صرف مذہب ہی آزادی کا واحد جواز قرار دیدیا جائے تو دنیا کی ہر مختلف العقیدہ حکومت کی اقلیت خود مختاری کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہوگی۔ دراصل ہندوستانی مسلمانوں کی تعداد اور مذہبی امتیاز کے ساتھ ساتھ ان کی مجلسی و سماجی خصوصیات جو لفظ ثقافت کے مفہوم میں شامل ہیں، اتنی ممتاز تھیں کہ انہیں جداگانہ ثقافتی نمونہ اور جداگانہ قوم کہنا بالکل صحیح تھا، اس لئے ان کا حقِ خود اختیاری کا مطالبہ بالکل جائز تھا۔ اس بحث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ پاکستان ایک مشترک ثقافتی نمونہ کے مامن کی حیثیت رکھتا ہے۔ پاکستان کے معماروں کو قیامِ پاکستان کے بعد یہ حقیقت پوری شدت کے ساتھ پیش نظر رکھنی چاہیئے تھی کہ اس نئی مملکت کے مختلف علاقوں کی ممتاز تہذیبی خصوصیات کے باوجود ایک مشترک ثقافت بھی ہے جو اس پوری مملکت، اور ایک ممتاز قوم کے موجود ہونے کی اساس ہے۔

آزادی کے بعد نظریاتی سطح پر سب سے اہم کام یہ تھا کہ پورے پاکستان کی مشترک ثقافت کے تحفظ کے لئے قومی شعور کو بیدار اور مضبوط کرنے کی جدوجہد کی جاتی اور یوں اس مملکت کے نظریاتی استحکام کے لئے مؤثر اقدامات عمل میں لائے جاتے لیکن انقلاب اکتوبر سے قبل جس حقیقت کو بڑے دردناک انداز میں بھلا دیا گیا وہ پاکستان بھر کی ثقافتی وحدت تھی۔ انقلاب اکتوبر سے پہلے تنگ نظریوں کو بڑے اہتمام سے پالا پوسا گیا اور قومی شعور کو ابھارنے کے بجائے تنگ نظریوں کو انتہائی غیر ذمہ دارانہ انداز میں اچھالا گیا۔ ہر چند علاقائیت اور گروہ بندی کو برا کہنے کا یہ مطلب لازماً نہیں ہے کہ مختلف علاقوں اور گروہوں کے جائز حقوق اور اختیارات چھین لئے جائیں اور ملک کو ناراض وحدتوں اور گروہوں کا مجموعہ بنا دیا جائے۔ ملک کے مختلف علاقوں اور گروہوں کا اطمینان اور ان کے ذہنی سکون کا مہیا کرنا متحدہ قومی شعور پیدا کرنے کی شرطِ اولین ہے لیکن متحدہ قومیت بہرحال وہ مقصد ہے جس تک ہم سب کو پہنچنا ہے اور جس کو زندہ رکھکر پاکستان کے استحکام کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔ نئے انقلاب سے پہلے ان پہلوؤں پر کوئی توجہ نہ دی گئی تھی لیکن انقلاب اکتوبر کے بعد یہ مسائل اپنی جائز اور ضروری اہمیت حاصل کر رہے ہیں اور اس طرح اب شعوری طور پر ٹھوس کام کرنے کی سعی کئے جانے کی توقع ہے۔

تہذیبی دائرہ میں یہ ٹھوس کام اس احساس پر کیا جانا تھا کہ پاکستان ایک مشترک عرب۔ ہندی، آریائی تہذیب کا وطن ہے۔ دہلی کے اسلامی اقتدار کے عہد میں جو تہذیبی نمونہ ابھرا تھا اور اٹھارویں صدی میں جس کے اہم مراکز دہلی، لکھنؤ، لاہور اور ڈھاکہ تھے وہ پاکستان کی تہذیب کا جوہری ورثہ تھے۔ اس تہذیب میں ادب، تعمیرات، لباس، مجلسی زندگی، کھانے، رسم و آداب، موسیقی و مصوری اور رہن سہن کے طریقے وغیرہ سب آجاتے ہیں۔ برصغیر کے مسلمانوں کے اس اجتماعی ورثہ میں پاکستان کے اپنے اپنے تہذیبی منطقوں کی امتیازی خصوصیات کے امتزاج کے بعد وہ تہذیبی نمونہ پیدا ہو جائے گا جو ایک طرف اس ملک کے ثقافتی ماضی کی نمائندگی کر سکے گا اور دوسری طرف ان تہذیبی عناصر کا مجموعہ ہوگا جو پاکستان کے مختلف علاقوں کی تہذیبی خصوصیات کے حامل ہیں۔ ماضی کے تہذیبی ورثہ کی تشکیل و تنظیم کا یہ کام ایک عظیم تحقیقاتی سعی و کوشش کا متقاضی ہے لیکن یہ سعی و کوشش بھی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکتی اگر ماضی کے اس ورثہ کا جدید زندگی اور حالات میں جائزہ نہ لیا جائے۔ ماضی کے تہذیبی ورثہ میں سے ہر حصہ ایسا ہے جس کو جدید حالات کی روشنی میں پرکھا اور زندگی کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ بنایا جائے گا۔ تاریخ میں تہذیبی ارتقاء و تغیر غیر شعوری طور پر ہوتا رہا ہے لیکن پاکستان میں تہذیب کی قدروں کا یہ تعین اور تعبیر شعوری انداز میں ہوگا جو ایک نیا، ایک عجیب تجربہ ہوگا۔ انسان کی تہذیبی تاریخ کا قیام پاکستان کے بعد ہی نئی مملکت کے ان ثقافتی عناصر کے تعین کی سعی کی جاتی

چاہیئے تھی لیکن سیاسی دھڑے بندیوں میں اس ٹھوس کام کی طرف کوئی متوجہ نہ ہوسکا۔ مگر اب کہ زندگی کے ہر شعبہ میں تعمیری کام کئے جارہے ہیں ملک کے مفکروں، ادیبوں اور محققوں کو اس کام کی تکمیل کا بیڑہ اٹھانا چاہیئے کہ اس تہذیبی اساس ہی پر اس معاشرہ کے قیام کی سعی کی جاسکتی ہے۔ جو رفاہی انداز پر منظم ہوگا۔ مآل کار پاکستان میں ایک ایسی رفاہی مملکت اور معاشرہ کو وجود میں لانا ہے جس میں اس مملکت کے ہر فرد کو اپنی مادی و روحانی ترقی کے آزادانہ اور مکمل مواقع مل سکیں۔ رفاہی مملکت کا یہ تصور ہی اس جدوجہد کا مقصود تھا جو مسلم ہند نے آزادی کے لئے کی تھی۔

قیام پاکستان کے بعد توقع یہ تھی کہ اس ارتقاء پذیر معاشرہ یا رفاہی مملکت کے قیام کی جدوجہد کی جائے گی لیکن آزادی کے فوراً بعد مختلف تنگ نظریوں نے ملک کے مختلف ٹکڑوں میں اتنا انتشار پیدا کر دیا کہ رفاہی مملکت کا مثالیہ پس پشت جا پڑا اور معاشی، مادی اور سیاسی افراتفری نیز مجرمانہ تنگ نظریوں اور بعد از وقت عقیدتی مطالبات نے وہ کیفیت پیدا کردی کہ ملک کا استحکام خطرے میں پڑ گیا۔

انقلاب اکتوبر نے اس صورت حال کو کامیابی کے ساتھ اختتام کیا اور رفاہی مملکت کے مثالیہ کو پھر قومی مساعی کا مقصود بنا دیا۔ اب رفاہی مملکت اور ایک ایسے معاشرہ کا قیام جو فرد کو اپنی ترقی و خوشحالی کے پورے مواقع مہیا کرسکے، وہ منزل ہے جہاں اس قوم کو پہنچنا ہے لیکن اس مقصد تک رسائی اس وقت تک ممکن نہ ہوگی جب تک اس مملکت کے وہ تمام طبقات، جو قومی تشکیل میں کوئی پارٹ ادا کرسکتے ہیں، خواہ وہ حکومتی دائرہ میں ہوں یا عام قومی زندگی کے اندر، ان تنگ نظریوں، سڑے ہوئے تصورات اور کلیسائی رجحانات سے محفوظ نہ رہیں جو قوم کے مختلف گروہوں، علاقوں اور طبقوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتے اور جدید عہد کے تقاضوں سے متصادم ہوتے ہیں۔ پاکستان وسیع سطح پر انسان دوستی اور نظریہ نوازی کے ذریعہ اپنی منزل مقصود پر پہنچ سکتا ہے۔ عقیدتی صلابت، جو ذہن کے رجعت کیشانہ رجحان کو پیدا کرکے انسان دشمنی پیدا کرتی ہے، اس مشن کی تکمیل میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوگی جس کے لئے اس مملکت کا قیام عمل میں آیا تھا۔ انقلاب اکتوبر کے بعد اس قوم کو پھر اپنی جدوجہد کو صحیح معنی، حقیقی مفہوم، نکھار اور رجحان عطا کرنے کا ایک نادر موقع ملا ہے۔ تاریخ بار بار ایک راستے گذرنے کی عادت نہیں رکھتی۔

انقلاب اکتوبر ارتقاء اور عظیم قومی خوشحالی کو حقیقت بنانے کا ایک فیصلہ کن موڑ ہے اگر اس سنہری موقعہ سے فائدہ نہ اٹھایا گیا تو عہد نامۂ عتیق کی زبان میں:

"میرے بعد ایک بھیانک سیلاب کا آنا مقدر ہوچکا ہے۔"



"قائداعظم نے فرمایا تھا کہ تخلیق پاکستان بجائے خود کوئی مقصود نہیں تھا بلکہ صرف ایک وسیلہ تھا اپنے نصب العین کو حاصل کرنے کا۔ اس لئے اب ہمیں عمل کے دور میں داخل ہوجانا چاہیئے۔ پاکستان صرف عمل اور پیہم عمل کے ذریعے ہی ترقی کرسکتا ہے نہ کہ خالی نعروں سے۔"

جنرل محمد ایوب خاں

(یوم پیدائش قائداعظم، ۲۵ دسمبر ۱۹۵۸ء)

نادر کاکوروی

ممتاز حسن

۱۹۱۰ء میں جب "جذباتِ نادر" کا دوسرا حصہ چھپا ہے، نادر کے کلام پر رائے زنی کرتے ہوئے مولانا عبدالحلیم شرر نے لکھا تھا کہ "حضرت نادر نے اردو کی ایک نئے میدان میں رہبری کی ہے، اور ایک بہت وسیع حد تک کامیاب ہوئے ہیں، لہٰذا قدر دانانِ ادبِ اردو کو اُن کا شکر گزار ہونا چاہئے۔" لیکن آج وہ زمانہ ہے کہ لوگ نادر اور نادر کے ادبی کارناموں کو بھول چکے ہیں، اور ادبی تاریخیں اور تذکرے دونوں میں اردو شاعری کے اس ماہر اور محسن کا تذکرہ شاذ و نادر ہی ملتا ہے۔ "شعرالہند" کے مصنفین نے صرف ان کا اور اُن کی تین نظموں کا نام لیا ہے۔ اور سمجھ لیا ہے کہ تذکرہ نگاری کا فرض ادا ہو گیا۔ رام بابو سکسینہ نے اس سے زیادہ توجہ فرمائی ہے، اور اپنی "تاریخ ادبِ اردو" میں نادر کے کلام اور شاعرانہ مقام پر ایک مختصر سا پیراگراف قلمبند کیا ہے، اور انہیں "طرزِ جدید کے بہت عمدہ کہنے والوں" میں سے شمار کرتے ہوئے اُن کی موت کو ایک "بے ہنگام سانحہ" کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ سردار موہن سنگھ نے اپنے مضمون "جدید اردو شاعری" میں ان کا ذکر اردو شاعری کی نئی تحریک کے علمبرداروں میں منشی درگا سہائے سرور جہاں آبادی کے بعد کیا ہے۔ ڈاکٹر گراہم بیلی نے اپنی کتاب "اردو ادب کی تاریخ" میں فرمایا ہے۔ کہ نادر، سرور کے مقابلے میں انگریزی بہت اچھی جانتے تھے، اور یورپ کی شاعری کا اثر بھی اُن پر زیادہ تھا۔ ڈاکٹر گراہم بیلی کی کتاب مختصر ہے اور انہوں نے نہ صرف نادر کے متعلق اختصار سے کام لیا ہے بلکہ کسی شاعر کا تذکرہ بھی تفصیل سے نہیں لکھا۔

رہا نادر کا کلام، تو اس وقت "جذباتِ نادر" جو اُن کی شاعری کا واحد مجموعہ ہے، صحیح معنوں میں نادر بلکہ نایاب ہے۔ مجموعہ کا دوسرا حصہ آج سے کچھ سال پہلے ہندوستان میں مل سکتا تھا۔ اب وہاں بھی قریب قریب ناپید ہے۔ پہلا حصہ میں نے کہیں بازار میں نہیں دیکھا، نہ پاکستان میں نہ ہندوستان میں۔ البتہ ایک غیر معروف لائبریری سے عاریتہً حاصل کیا تھا۔ اس لائبریری کے نسخے کے علاوہ کہیں نشان نہیں ملا۔ سردار موہن سنگھ نے نادر کے کلام کا غالباً کوئی مجموعہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ فرماتے ہیں کہ نادر کاکوروی کا کلام زندہ اور مردہ رسالوں کے صفحات میں پراگندہ اور پوشیدہ ہے۔

یہ تو نادر کی شاعری کا حال ہے۔ نثر کا کوئی مستقل کارنامہ ان سے منسوب نہیں ہے، البتہ اُن کے ایک ابتدائی ناول "دولہن ڈاکو" کا ذکر ملتا ہے، اور اس کا بھی محض نام ہی نام ہے، نشان کہیں نہیں۔

نادر کا پورا نام ہے شیخ نادر علی عباسی، وہ کاکوری کے مشہور و معروف عباسی خاندان میں پیدا ہوئے۔ یہ ایک پرانا علم دوست خاندان ہے جس میں اچھے اچھے صاحبانِ علم و فضل ہو گزرے ہیں۔ آجکل اس خاندان کے متعدد افراد پاکستان منتقل ہو چکے ہیں، اور ان میں بعض اعلیٰ سرکاری عہدوں پر تعینات ہیں۔

نادر ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام شیخ حامد علی عباسی اور دادا کا شیخ طالب علی عباسی تھا۔ نادر کی شادی شریف النسا بیگم عرف نمدہ بی بی سے ہوئی۔ جو منشی نقی علی کی صاحبزادی تھیں۔ شادی کے بعد تین اولادیں ہوئیں۔ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ مشفق النسا بیگم، جو اولاد میں اکبر تھیں، جوانی میں ناکتخدا فوت ہوئیں۔ دوسری لڑکی کا نام احسن النسا اور عرف منا بی بی ہے۔ ان کی شادی شیخ مظفر علی عباسی سے ہوئی۔ نادر کے صاحبزادے کا نام شیخ یاور علی عباسی ہے۔

نادر کا انتقال ۱۹۱۲ء میں ہوا۔ کل پینتالیس برس کی عمر پائی۔ اُن کی زندگی کے حالات تفصیل سے نہیں ملتے۔ "عباسیانِ کاکوری" کے نام سے ان کے خاندان کا ایک مبسوط تذکرہ چھپا ہے۔ جو اسی خاندان کے ایک رکن کی تصنیف ہے۔ اس تذکرے میں خاندان کے اکثر افراد کے

حالات کے بیان میں خاصی تفصیل سے کام لیا گیا ہے۔ مگر نادر کا ذکر بہت ہی سرسری سا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وضعدار اور قدامت پسند خاندان کے تذکرے میں نادر جیسے آزاد طبع انسان کے لئے زیادہ گنجائش نہیں نکل سکی۔ میں نے احباب کے وسیلے سے مزید حالات معلوم کرنے چاہے مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ البتہ اُن کی شاعری کہہ رہی ہے کہ وہ ایک اچھے پڑھے لکھے انگریزی داں، شگفتہ مزاج اور قوم پرست انسان تھے۔

نادر اردو شاعری کی نئی تحریک میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ یہ تحریک حالی اور آزاد کی "نیچرل شاعری" سے شروع ہوتی ہے۔ اگرچہ اس تحریک کے عناصر حالی اور آزاد سے پہلے بھی میر، انشا، نظیر اور دوسرے شعرا کے کلام میں پائے جاتے ہیں، مگر اس کا فروغ حالی اور آزاد کی کوششوں سے ہوا جن میں کرنل ہالرائڈ، ناظم تعلیمات پنجاب کی سرپرستی کو بہت کچھ دخل تھا۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ اردو شاعری کو زندگی کے حقائق اور واقعات سے قریب لایا جائے۔ اور تصنع اور تکلف کو ترک کر دیا جائے۔ تشبیہ اور استعارے کی بنیاد عام زندگی کے مشاہدات پر رکھی جائے۔ تاکہ شاعری زیادہ مؤثر ہو سکے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس تحریک کے دو شاعرانہ نصب العین تھے۔ سادگی اور واقعیت۔ یہی وہ "نیچرل شاعری" تھی۔ جسے حالی نے اپنے مقدمے میں منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی۔ اور جس کے نمونے ہمیں آزاد کی "شبِ سیاہ" اور حالی کے "مناظرہ رحم وانصاف" میں ملتے ہیں۔ یہ تحریک انگریزی شاعری سے متاثر تھی۔ مشکل یہ تھی کہ جو لوگ اس تحریک میں پیش پیش تھے۔ ان میں سے اکثر انگریزی زبان سے پوری واقفیت نہیں رکھتے تھے اور اس سے براہِ راست استفادہ نہیں کر سکتے تھے۔ مثلاً حالی اور آزاد کے گروہ میں پہلے لعل آشوب ہی ایک ایسے شخص تھے جو انگریزی جانتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئی تحریک اپنے اصلی سرچشمے یعنی انگریزی زبان اور ادب سے دور رہی۔ اور "نیچرل شاعری" نے جسے فطری جذبات اور احساسات کا آئینہ دار ہونا چاہئے تھا، بہت جلد سادگی اور واقعیت کے تصورات کو محض پھسپھسا مٹ کی بنیاد پر لا قائم کیا۔ ان حالات کا تقاضا تھا کہ اگر اردو شاعری کو اپنے شاعرانہ انقلاب کی حفاظت کرتے ہوئے خود اپنی ہستی ہی کو ختم نہیں کرنا ہے۔ تو اسے "ایک لڑکی گنگنا رہی ہے دال" یا "کہتے ہیں خدام ماموں کے بہت گستاخ تھے" کی سطح سے بلند کیا جائے۔ اور الفاظ کی سادگی اور مضامین کی واقعیت کو جذبات کی گرمی اور ندرت سے دوبارہ آشنا کیا جائے۔ یہ کام نادر اور سرور نے کیا، اور سرور اور نادر، حالی اور اقبال کی درمیانی کڑی بن گئے۔ سرور اور نادر، دونوں کی شاعری مشاہداتِ فطرت اور قومی اور انفرادی جذبات سے مالا مال ہے۔ مگر سرور کے ہاں جذبہ زیادہ ہے، اور نادر کے ہاں سادگی زیادہ۔

نادر کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت اس پر انگریزی شاعری کا اثر ہے۔ انہوں نے انگریزی نظموں کے متعدد ترجمے کئے ہیں۔ مگر یہ اثر ترجموں تک محدود نہیں ہے۔ اُن کی وہ نظمیں بھی جو ترجمہ نہیں ہیں، انگریزی نظموں کا انداز لئے ہوئے ہیں۔ عبدالحلیم شرر نے "جذباتِ نادر" حصہ دوم کے متعلق اظہارِ رائے کرتے ہوئے لکھا تھا کہ :-

"حضرت نادر نے کوشش کی ہے کہ انگریزی شاعری کے لطیف مذاق کو اردو میں پیدا کریں۔ چنانچہ اس مجموعے میں اکثر تو انگریزی کی مشہور نظموں کے ترجمے ہیں۔ اور بہت سی نظمیں جو شاعر کے اصلی خیالات و جذبات کو ظاہر کر رہی ہیں۔ وہ بھی اسقدر انگریزی شاعری کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں، کہ ان پر بھی ترجمے ہی کا دھوکا ہوتا ہے"

عبدالحلیم شرر کے اس قول پر یہ اضافہ ضروری ہے کہ نادر کے بعض ترجمے بھی ایسے ہیں کہ ان پر ترجمے کا گمان نہیں ہو سکتا۔ ما اُن کی شاعری پر انگریزی کا دھوکا، سو اس میں کچھ شک نہیں کہ نادر ایک نئی طرز کے موجد تھے جو انگریزی شعراء کے طرزِ بیان سے قریب تھی۔ اُن کا مقصد شعر کے ذریعے اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار کرنا تھا۔ نہ کہ روایتی اردو شعرا کی طرح محض ردیف قافیوں میں لفظی اور صوتی ہم آہنگی پیدا کرنا۔ اردو کے پختہ کار نقادوں کے لئے یہ ایک نئی بات تھی اور وہ نادر کی ہر نظم کو محض اس لئے کہ وہ عام روش سے الگ ہوتی تھی، انگریزی شاعری ہی کا چربہ سمجھتے تھے۔ ورنہ اس تنقید کی حقیقت اس سے کچھ زیادہ نہیں کہ نادر کی شاعری ایک انفرادی کیفیت کی حامل ہے۔

نادر نے جن انگریزی شعرا کی نظموں کے ترجمے کئے ہیں، اُن میں ٹینیسن، بائرن اور ٹامس مور خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ٹامس مور کا کلام انہیں غیر معمولی طور پر مرغوب تھا۔ انہوں نے اس کی ایک لمبی نظم "لالہ رخ" کے ایک حصے "لائٹ آف دی حرم" کا ترجمہ ایک لمبی مثنوی کی صورت میں کیا ہے جو جذبات

نادرؔ" حصہ دوم میں شامل ہے۔ یہ ایک قابلِ قدر ترجمہ ہے۔ بقول مولوی عزیز مرزا " اگرچہ اصل سے انہوں نے تجاوز نہیں کیا ہے، مگر اُن کا طرزِ بیاں اس قدر نیچرل اور اُن کے الفاظ ایسے خوشنما واقع ہوئے ہیں کہ ترجمے کی بجائے نظم اصل معلوم ہوتی ہے۔"

قاضی تلمذ حسین نے اس ترجمے کو اس سے بھی بڑھ کر خراجِ تحسین پیش کیا ہے:۔

"کسی زبان کی تخئیل کو دوسری زبان میں بعینہٖ منتقل کرنا یعنی اس طرح کہ اس کی تمام شاعرانہ خوبیاں اور تخئیل کی باریکیاں قائم رہیں حقیقت میں نہایت ہی مشکل کام ہے، لیکن قابل مترجم نے اس کام میں حیرت ناک کامیابی حاصل کی ہے۔ یہ مثنوی اردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے ....

.... میں نے اس ترجمے کو بہت احتیاط سے اصل مثنوی سے مقابلہ کیا اور میں معتبر طور پر کہتا ہوں کہ واقعی مترجم نے وہ کام کیا ہے کہ اُن قدردانوں کو جو اردو ادب کو نئے محاسن اور نئی خوبیوں سے آراستہ دیکھنا چاہتے ہیں، حضرت نادرؔ کا ممنون اور شکرگذار ہونا چاہئے۔"

" لائٹ آف دی حرم" کے ترجمے کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

وہ منظرِ شہرِ عشرت منزل — آئینہ وہ جھیل کا مقابل
ہر چیز پہ محویت کا عالم — ہر شے سے خوشی کا خیر مقدم
منہ باندھے کہیں کھڑی ہیں کلیاں — غنچے ہیں کہیں یہ نیم خنداں

شاعر نے ترجمے میں اصل سے لفظی اور معنوی مطابقت کی کوشش کی ہے اور جہاں کہیں اصل سے انحراف کیا ہے اُس کی وضاحت کر دی ہے ان کے ترجمے کا ایک شعر ہے:۔

محفل میں بن سنور کے آئے — اور وہ گھونگھرو بجا کے گائے

اس پر نادرؔ نے مندرجہ ذیل نوٹ دیا ہے:۔

"گھونگھرو بجا کے گائے۔ ٹامس مور نے اس موقع پر طائفہ کا کمر میں گھونگھرو باندھ کر ناچنا نظم کیا ہے لیکن چونکہ کمر میں گھونگھرو باندھ کر ناچنے کا رواج غالباً ہر ہندوستان میں پایا نہیں جاتا، اور غالباً کشمیر میں بھی نہ ہو، لہٰذا کمر کی لفظ ترجمے میں نہیں رکھی گئی۔ نادرؔ۔"

سارا ترجمہ صاف اور دلکش ہے۔ یہ خوبیاں قریب قریب نادرؔ کے ہر ترجمے میں پائی جاتی ہیں۔ ترجموں میں "شاعر کا دل" "مرحومہ کی یاد میں" اور "گذرے ہوئے زمانے کی یاد" بہت مشہور رہیں۔ "شاعر کا دل" ٹینیسن کی ایک نظم کا ترجمہ ہے۔ نادرؔ نے ترجمے کی صحت کی اتنا خیال رکھا ہے کہ جہاں کہیں مضمون کی وضاحت کے لئے کچھ الفاظ اپنے اشعار میں بڑھائے ہیں، وہاں اُن کے گرد خطوطِ وحدانی کھینچ دئے ہیں۔ یہ نظم اسی التزام سے نوبت رائے نظر کے رسالے "خدنگِ نظر" میں چھپی تھی۔

" مرحومہ کی یاد میں" ٹامس مور کی ایک نظم کا ترجمہ ہے۔ یہاں بھی مترجم نے حتی الامکان ترجمے کی صحت لفظی کی پابندی اپنے اوپر عائد کر رکھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کی پابندی سے ترجمے کی خوبی میں اضافہ نہیں ہوتا۔ اگرچہ ان حدود کے اندر رہ کر شستہ ادبی قسم کا ترجمہ کر لینا اور وہ بھی شعر میں، ایک تکنیکی کامیابی ہے۔ جہاں کہیں نادرؔ نے ان قیود میں سختی نہیں برتی، وہاں اُن کا فن معراج پر ہے۔ "ٹامس مور" کی نظم کا پہلا شعر ہے:۔

"In the mid hour of night when stars are weeping, I fly to the love lane we loved"

نادرؔ نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے:۔

رات کے پچھلے پہر روتی ہے جب چشمِ نجوم — اُلفتِ دیرینہ کی وادی میں اُڑ جاتا ہوں میں

یہاں " رات کے پچھلے پہر" اور " اُلفتِ دیرینہ کی وادی" میں اصل پر اضافہ کیا ہے۔ اور اس نے ترجمے کی شاعرانہ سطح بلند کر دی ہے۔

نادرؔ کا ایک ترجمہ تو ایسا ہے کہ ترجمہ معلوم ہی نہیں ہوتا۔ " گذرے ہوئے زمانے کی یاد" نہ صرف نادرؔ کا بہترین ترجمہ ہے، بلکہ اسے اردو شاعری کا بہترین ترجمہ کہنا چاہئے۔ اس کی ادبی اہمیت اصل اور ترجمے کو ساتھ ساتھ دیکھنے ہی سے واضح ہو سکتی ہے۔

مور کی نظم کا پہلا بند ہے:

THE LIGHT OF OTHER DAYS

Oft, in the stilly night
Ere slumber's chain has bound me
Fond memory brings the light
Of other days around me:
The smiles, the tears
Of boyhood's years,
The words of love then spoken,
The eyes that shone
Now dimm'd and gone,
The cheerful hearts now broken;
Thus, in the stilly night
Ere slumber's chain has bound me,
Sad memory brings the light
Of other days around me.

اب اس کا ترجمہ سنیے:

اکثر شبِ تنہائی میں   کچھ دیر پہلے نیند سے
گذری ہوئی دلچسپیاں   بیتے ہوئے دن عیش کے
بنتے ہیں شمعِ زندگی   اور ڈالتے ہیں روشنی
میرے دلِ صد چاک پر
وہ بچپن اور وہ سادگی   وہ رونا وہ ہنسنا کبھی
پھر وہ جوانی کے مزے   وہ دل لگی وہ قہقہے
وہ عشق وہ عہدِ وفا   وہ وعدہ اور وہ شکریہ
وہ لذتِ بزمِ طرب   یاد آتے ہیں ایک ایک سب   دل کا کنول جو روز و شب   رہتا شگفتہ تھا سو اب
اس کا یہ ابتر حال ہے   اک سبزۂ پامال ہے
اک پھول کمھلایا ہوا   ٹوٹا ہوا بکھرا ہوا
روندا پڑا ہے خاک پر
یوں ہی شبِ تنہائی میں   کچھ دیر پہلے نیند سے
گذری ہوئی ناکامیاں   بیتے ہوئے دن رنج کے
بنتے ہیں شمعِ بیکسی   اور ڈالتے ہیں روشنی
ان حسرتوں کی قبر پر

جو آرزوئیں پہلے تھیں　　پھر غم سے حسرت بن گئیں
غم دوستوں کی فوت کا　　اُن کی جوانا موت کا
ہاں دیکھ شیشے میں مرے　　اُن حسرتوں کا خون ہے
جو گردشِ ایام سب　　یا قسمتِ ناکام سے　　یا عیشِ غم انجام سے　　مرگِ بُتِ گلفام سے
خود دل میں میرے مرگئیں　　کس طرح پاؤں میں حزیں
قابو دلِ بے صبر پر

یہی انداز دوسرے بند کے ترجمے کا ہے۔ یہ ترجمہ اگرچہ اصل نظم کے الفاظ کا احاطہ کئے ہوئے ہے، مگر اس کا مقصد اور اس کی خوبی انگریزی اصل کی روح کو اردو شاعری کا جامہ پہنانا ہے۔ یہ ترجمہ نہیں ترجمانی ہے۔ یہی مقصد رباعیاتِ عمر خیام کے ترجمے میں فٹزجیرالڈ کا تھا، اور حق یہ ہے کہ اس نظم میں نادر کی فنی کامیابی فٹزجیرالڈ سے کسی صورت میں کم نہیں۔

اس طرح کا معنوی ترجمہ کوئی آسان چیز نہیں ہے اس کے لئے الفاظ کا لغوی اور صوتی انتخاب، ترجمے کی بحر کی اصل بحر سے ہم آہنگی، اور اصل نظم کی جذباتی فضا کا مترجم کے دل پر صحیح تاثر لازم ہیں۔ نظم حیدر طباطبائی نے گرے کے مرثیے کا جو ترجمہ کیا ہے، وہ کتنا مشہور ہے مگر پہلے ہی مصرعے کا ترجمہ دیکھئے۔ گرے کہتا ہے :۔

The curfew tolls the knell of parting day.

وداعِ روزِ روشن ہے گجر شامِ غریباں کا

دیکھئے اصل اور ترجمے کی فضا میں کتنا فرق ہے۔ گرے کا انداز ماتمی ہے۔ اس کا مصرعہ رُک رُک کر ایک مغموم لے میں ڈوب کر آگے بڑھتا ہے۔ اس کے برعکس طباطبائی کے مصرعے میں "وداع" اور "شامِ غریباں" کے الفاظ کے باوجود شادیانے بجتے سنائی دیتے ہیں۔ اور اس کا اُلٹا اثر ہوتا ہے۔

نادر کی ساری شاعری، ترجمے ہوں یا طبعزاد نظمیں، ایک انفرادی خلوص اور بے تکلفی کی حامل ہے۔

نادر اپنے خیالات اور احساسات کو رنگین الفاظ کے پردے میں غائب نہیں ہونے دیتے۔ ان کے خیالات براہِ راست لفظوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور وہ ایسا بے تکلف کہے چلے جاتے ہیں جیسے باتیں کر رہے ہوں۔ ان کی شاعری میں سادگی اور بے تکلفی اس قدر نمایاں ہے کہ اردو کے بہت کم شاعر اس میدان میں ان کے دوش بدوش کھڑے ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی ایک نظم "رات کے بجتے گھنٹے" کے چند شعر دیکھئے۔ شاعر چاند سے خطاب کر رہا ہے اور اپنی کہانی کے پردے میں ساری نوعِ انسانی کی سرگذشت اسے سنا رہا ہے :۔

اے چاند حال میرا تجھ سے چھپا نہیں ہے　　تو اور میں ہوں کوئی یاں دوسرا نہیں ہے
سُن کان دھر کے اپنی بپتی تجھے سناؤں　　میرا تو حال یہ ہے میں تجھ سے کیا چھپاؤں
طوفاں کا جیسے مارا ساحل کو ڈھونڈتا ہو　　یا وہ تھکا ہوا جو منزل کو ڈھونڈتا ہو
صدیاں گذر گئی ہیں مجھ کو تلاش کرتے　　خالق کو اور اُس کے اسرار فاش کرتے
جانچی ہیں میں نے برسوں خورشید کی شعاعیں　　ذرّوں پہ میں نے برسوں دوڑائی ہیں نگاہیں
تحت الثریٰ سے گذرا اُڑتا زقند بھرتا　　اجرام پھاڑتا اور اجسام قطع کرتا
اونچا بہت غباروں میں بیٹھ کر اُڑا ہوں　　بادل میں چھپ گیا ہوں تاروں میں مل گیا ہوں
سیرِ عدم کر آیا میں اسپتل اُڑاتا　　گذرا صراط پر سے بائسکل اُڑاتا
جنت میں جا کے وعدے لے آیا حوروں سے میں　　دوزخ کا دیکھ آیا دروازہ دور سے میں
شمس و نجوم کی میں رفتار دیکھ آیا　　اور کائنات کے کل اسرار دیکھ آیا
...

اے چاند دریچے میں اور میں بھی تھک گیا ہوں — یہ نیند کا نشہ ہے جو کچھ بہک گیا ہوں

ایک اور مثال کے طور پر بوڑھے دنیا پرست کی موت" کے چند اشعار دیکھیے :-

یا الٰہی آج دل میرا بجھا جاتا ہے کیوں — اور کلیجہ میرا بے قابو ہوا جاتا ہے کیوں
شمعیں روشن ہیں نظر مجھ کو نہیں آتی ہیں کیوں — ہائے آج آنکھیں مری دھندلی ہوئی جاتی ہیں کیوں
میرا سن کیا ہے ابھی تو سو برس کا بھی نہیں — میں نے دنیا کو ابھی جی بھر کے دیکھا بھی نہیں

"قاضی الحاجات، اور اشرف المخلوقات" ان کی ایک لمبی نظم ہے جس میں زر یعنی دنیا کے مال و دولت کو خطاب کیا ہے :-

چلا ہے دنیا میں اور عقبیٰ میں راحتیں بے قیاس دینے — بڑا بنا پاسبانِ جنت چلا ہے جنت کا پاس دینے
بہشت سے تجھکو واسطہ کیا؟ بہشت ہم کو دلائے گا تو؟ — گنہگار! اپنی تو خبر لے کہ خود جہنم میں جائے گا تو!
نکالا دوزخ سے کسکو تونے؟ غموں سے کس کو نجات دی ہے؟ — بچایا کس کس کو موت سے؟ اور بہشت کس کس کو مول لے دی؟

ان کی غزلیں بھی سادگی، بے ساختگی اور تسلسلِ معنی کے لحاظ سے ایک انفرادی حیثیت رکھتی ہیں :

وہ ہیں کہ بات ہی نہیں سنتے غریب کی — میں ہوں کہ دفترِ گلہ ہائے دراز ہے
پہلے تھا سر میں حبِ وطن کا مرے جنون — اب خبطِ یاد گردیٔ دور و دراز ہے
اچھا تھا وہ شباب کہ کچھ سوجھتا نہ تھا — اب ہر قدم پہ خوفِ نشیب و فراز ہے

نمازِ پنجگانہ سے ہے بہتر کام کیا زاہد — مگر نیت سے پہلے ٹھیک کر لے اپنی نیت بھی

مری طبع رواں کا یہ حال ہے کہ بس ایک بار گھٹا اٹھی
وہ بڑھی وہ گھر آئی وہ چھا گئی وہ برس چکی وہ نکل گئی

ان کی ایک نظم ہے :

یہ وضعِ قومیت آئندہ رخصت ہونے والی ہے — نئی تہذیب سے تجدیدِ ملت ہونے والی ہے
نئے سامانِ آرائش فراہم ہوتے جاتے ہیں — فراہم کیوں نہ ہوں ان کی ضرورت ہونے والی ہے

اس نظم کے آخر میں انہوں نے چند شعر ایسے کہے ہیں جیسے وہ پہلی اور دوسری جنگ عظیم اور ان کے الم افزا اخلاقی اور سیاسی نتائج کو تصور کی آنکھ سے دیکھ رہے ہوں :-

تمہیں معراجِ دنیاوی تو حاصل ہو چکا آگے — ترقی ہونے والی کیا ہے ذلت ہونے والی ہے
ترقی انتہا سے حد پہ پہنچی عقلِ انساں کی — اب آگے از سرِ نو پھر جہالت ہونے والی ہے
غرض دنیا بدلتی جا رہی ہے ایسی تیزی سے — کہ کوئی دن میں مخدوش اس کی سرعت ہونیوالی ہے
تمہیں کیا سوجھے تا در ہم نہ ہوگے اور نہ دیکھو گے — جو کچھ اچھی بری آئندہ حالت ہونے والی ہے

وہ اپنے اشعار میں جا بجا فارسی کے اشعار بھی کہہ جاتے ہیں جن کی کیفیت ان کی اردو شاعری سے مختلف نہیں ہے۔ ایک فارسی کی غزل کے شعر ہیں :-

بیادِ منصور رم صلیب اندر کلیسا می دہد — نعرۂ چند از انا اللہ و انا الحق بر زنم
کودکاں گردند موزوں شعر بابر مرگ من — مردہ نا آوارہ در ہر کوچہ و ہر بر زنم

نادر از نے نلے موسیقار پیدا می کنم　　ساعتے دیگر نشیں تا نغمۂ دیگر زنم

واقعہ یہ ہے کہ حالی اور آزاد نے جس شاعری کو "نیچرل شاعری" کا نام دیا تھا، نادر نے اس میں فطری جذبات اور ایک دلچسپ طرز ادا کا اضافہ کیا۔ وہ بلا شک و شبہ حالی اور آزاد کی تحریک کے گل سر سبد ہیں۔ وہ اردو شاعری کی پرانی فرسودہ روش اور بے کیف تصنع سے بیزار تھے اور اسے ایک نئی نہج پر دیکھنا چاہتے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے آنکھیں بھی پتھرانے لگیں　　تیغ قاتل ہے وہی اور رقص بسمل ہے وہی

وہ چاہتے تھے کہ دل کی بات کو جوں کا توں زبان پر لائیں، اسے خواہ مخواہ پیچ نہ دیں۔ شعر کا اصل جوہر ان کے نزدیک وہ جذبہ تھا جو شعر کہلوائے:-

مانا نغمہ مرا خوش آیند نہیں　　اور پردگیانِ عشق خورسند نہیں
لیکن یہ خروشِ دل ہے یہ ہیں جذبات　　جذبات کبھی ادب کے پابند نہیں

وہ اپنی شاعرانہ کوتاہیوں کے معترف ہیں۔ مگر یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ ان کی شاعری میں ادبی حسن نہیں ہے۔ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئیے کہ نادر نے فطری شاعری کو سادگی کی بے کیفی سے بچایا ہے ان کی شاعری کی جو مثالیں دی جا چکی ہیں، وہ اس کے لئے کافی ہیں۔ ان کے ہاں ادب بھی ہے، شعریت بھی اور فلسفہ بھی۔ ان کی نظم "شمع مزار" ان کے فلسفیانہ انداز کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے:-

اے شمع روشنی ہے تری نغمۂ سکوت　　ہے تیرا نور زمزمۂ سوز کا ثبوت
تیرا سکوت نائے نواہائے راز ہے　　سوز و گداز میں ترے در پردہ ساز ہے
فانوس میں خموش کہاں یک نفس ہے تو　　بلبل کی طرح نغمہ طرازِ قفس ہے تو

آخر میں شمع سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:-

دو تیرے درد مند ہیں اقبال اور میں

معلوم ہوتا ہے، اقبال سے دوستی تھی۔ ان دونوں کی باہمی خط و کتابت تو کہیں سے دستیاب نہیں ہو سکی۔ مگر دونوں کی نظمیں شیخ عبدالقادر مرحوم کے "مخزن" میں چھپا کرتی تھیں۔ اور اغلب ہے کہ دونو ایک دوسرے کو ذاتی طور پر بھی جانتے تھے۔ اقبال کا ایک پرانا مصرع ایک دوست کی زبانی سننے میں آیا:-

نادر کا کوروی نے دور سے دیکھا مجھے

مگر اس سلسلے کے کوئی اور شعر نہیں مل سکے۔ اور یہ بھی تحقیق نہیں ہو سکا کہ یہ مصرع اقبال کا ہے بھی یا نہیں!

نادر کی طبیعت میں دو متضاد چیزیں موجود ہیں۔ ایک طرف تو ان کے کلام میں ایک حد تک قنوطیت کا رنگ جھلکتا ہے:-

کوئی ایسے تھے کہ جو ہنستے ہنساتے اٹھ گئے　　کوئی ایسا تھا کہ جس نے روتے روتے کاٹ دی
ہوشیاری بھی ہے دنیا کی فریبوں سے بھری　　تھے وہی اچھے جنہوں نے عمر سوتے کاٹ دی

ان کی ایک نظم ہے "آہ یہ ہوگا" جس میں انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ہر شخص کی ایک خاص دنیا ہوتی ہے۔ جو اس کے ساتھ پیدا ہوتی، اس کے قدم بقدم چلتی، اس کی وسعتِ معلومات کے ساتھ وسیع ہوتی، اس کے انحطاط کے ساتھ رو بہ انحطاط ہوتی اور یہاں تک کہ اس کی موت کے ساتھ ہی تنگ و تاریک ہو کر اس کی قبر بن جاتی ہے۔

مگر اس تاریک بینی کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں شگفتگی اور زندہ دلی بھی اس درجے کی ہے کہ اکبر الہ آبادی یاد آ جاتے ہیں۔ نادر کی ظرافت طبع کی وجہ سے ان کا کلام "اودھ پنچ" میں اکثر چھپا۔ ہر نظم میں ان کی طبیعت کی شوخی ان سے کچھ نہ کچھ کہلوا لیتی ہے۔ مہدی حسن نواب محسن الملک کا انتقال ہوا تو جہاں انہوں نے اس صدمے سے متاثر ہو کر یہ المناک رباعی کہی کہ:-

(باقی صفحہ ۲۷ پر)

نئے بنگالی افسانہ نگار:

علاء الدین الآزاد

یونس احمد

جب پاکستان بنا، اُس وقت بنگلہ زبان کے چند ہی افسانہ نگاروں کے نام سُننے جاتے تھے۔ مثلاً یہی سیّد ولی اللہ، محبوب العالم، شوکت عثمان اور ابو الکلام شمس الدین اور یہ وہ افسانہ نگار ہیں جن کی شہرت بنگال میں پاکستان بننے سے پہلے ہی مسلّم ہو چکی تھی۔ بنگال کے ہندو ادیبوں نے بھی ان کی تحریروں پر حوصلہ افزا تبصرے کئے تھے اور ان کی عظمت کے قائل ہو چکے تھے۔ یہ واقعہ ہے کہ ہندو ادیبوں کے سامنے مسلمان ادیبوں کا چراغ مشکل ہی سے جلتا تھا کیونکہ ادب میں سو فیصدی ان ہی کی اجارہ داری تھی۔ ان کے اپنے جریدے تھے، اخبارات اور پریس تھے۔ نشر و اشاعت کے سارے کل پرزوں پر ان ہی کا قبضہ تھا۔ لہٰذا ایسی صورت میں بنگالی مسلمان ادیب بالکل بے بس تھے بلکہ دوسرے لفظوں میں وہ ہندوؤں کے رحم و کرم پر تھے۔ یاد رہ بات ہے کہ ادب میں ہندوؤں کی جاگیرداری سے تنگ آکر بنگالی مسلمانوں نے بھی اپنی ادبی تحریک شروع کی۔ دو ایک پرچے اور اخبار بھی شائع کئے۔ نشر و اشاعت کا بھی انتظام کیا لیکن یہ تو بحرِ ذخار کے آگے ایک قطرۂ آب والی بات تھی۔

پاکستان بننے کے بعد البتہ ان کو اُبھرنے اور کام کرنے کا موقع ملا۔ وہ دماغ جن کے اندر سمجھ بوجھ اور تلاش و جستجو کی صلاحیتیں تھیں ان کو ایک نئی راہ ملی۔ ان کے سامنے نئے موضوعات اور جدید خیالات کے خوش رنگ پھول نکل رہے تھے، نئے تقاضوں اور نئی راہوں نے اُن کے ذوق اور وجدان کو نمو بخشی۔ وہ غلامی کے تاریک زندان سے نکل کر بہتر اور خوشگوار زندگی کی قوس قزحی فضا میں داخل ہوئے تھے۔ ان کا ملک ایک نئے دَور میں سانس لے رہا تھا۔

اس گیارہ بارہ سال کی مختصر مدّت میں بے سروسامانی کے باوجود بنگالی اصناف ادب نے جو حیرت انگیز ترقی کی ہے اس کا اعتراف نہ کرنا ممکن نہیں ـــــ خصوصاً شاعری اور افسانہ نگاری کے میدان میں بنگالی ادب نے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ پرانے افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ نئے افسانہ نگار بھی اُبھرتے دکھائی دئے۔ قابلِ تحسین بات تو یہ ہے کہ اس قلیل مدت میں جتنے افسانے لکھے گئے ہیں وہ بے مقصد نہیں۔ ہر افسانہ کم و بیش ایک اہم مسئلہ اور ایک خاص موضوع کے گرد گھومتا ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے ہی سے بنگالی مسلمانوں کی زندگیاں ان گنت مسئلوں میں گھری ہوئی تھیں۔ جہالت، غربت، کال، سیلاب، بھوک وغیرہ جیسے روح فرسا حالات نے ان مسلمانوں کی زندگی کو موت سے بدتر بنا دیا تھا۔ وہ کاشتکار تھے مگر زمین اپنی نہ تھی۔ وہ لاکھوں من غلہ اگاتے تھے لیکن خود دانے دانے کے لئے محتاج تھے۔ وہ کمر کمر پانی میں ڈوب کر پٹ سن کی بوائی اور کٹائی کرتے تھے اور ان کا یہ سنہرا ریشہ ان کی قسمت کے اندھیرے کو دور نہ کر سکتا تھا۔ ظاہر ہے حساس اور زندگی سے قربت رکھنے والا افسانہ نگار ان روح فرسا مناظر سے اپنی آنکھیں کیسے بند کر سکتا تھا۔ جب کوئی مچھیرا غضب ناک لہروں اور طوفان بردوش ہواؤں سے لڑتا ہوا اپنی چھوٹی اور شکستہ کشتی کو دریا میں ڈال دے اور اللہ کا نام لے کر مچھلیاں پکڑنے کے لئے چل کھڑا ہو لیکن موجیں اُسے اپنا لقمہ بنا لیں تو ایسی حالت میں آپ کے دل کی کیفیت کیا ہوگی۔ یہ حادثے مشرقی پاکستان کے دریاؤں میں ہوتے رہتے ہیں مگر زندگی ہمت نہیں ہارتی۔ ان حادثوں پر بے شمار کہانیاں لکھی گئیں اور لکھی جائیں گی۔

علاء الدین الآزاد بھی مشرقی پاکستان کا ایسا ہی ایک افسانہ نگار ہے ـــــ اس کی ژرف نگاہی اور چابکدستی کا اچھے اچھے نقاد بھی لوہا مان گئے ہیں۔ یہ نوعمر افسانہ نگار جس کی عمر اس وقت چھبیس سال سے زیادہ نہیں ادب کی اس بلندی پر پہنچ گیا ہے جہاں پہنچنے کے لئے برسہا برس ریاضت کرنا پڑتی ہے۔ اس عرصہ میں اس کی مختصر کہانیوں کے تین مجموعے، دو ناول، مضامین کا ایک مجموعہ، ایک شعری انتخاب اور ڈراموں کے دو مجموعے شائع ہو کر سامنے آ چکے ہیں۔ اس کی بسیار نویسی سے یہ نتیجہ نہ نکالا جائے کہ اس نے بیکار باتیں کی ہوں گی۔ حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ اس بسیار نویسی اور کم عمری کے باوجود اس کی

ہر افسانہ زندگی کے تلخ حقائق سے بھرپور ہے۔ اس نے زندگی کے مختلف روپوں کا ہر زاویہ سے مطالعہ کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے خیال کی گہرائی اور نظر کی وسعت کسی افسانے میں بھی مفقود نہیں۔ وہ ایک معمولی واقعہ کو لیکر زندگی کا ایسا محل کھڑا کرتا ہے جس کے در و دیوار کے نقش و نگار اور آرائش جمال میں مسکراہٹیں بھی ہوتی ہیں اور آنسو بھی دمکتے ہیں۔

مشرقی پاکستان اپنے چھوٹے چھوٹے ہرے بھرے گاؤں میں بستا ہے۔ یہاں کی زندگی پُرپیچ نہیں، سیدھی سادی ہے۔ کاشتکاروں کو بھیک وقت اپنے کھیتوں اور اپنی مجلسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے تو پھر وہ اپنے سارے دکھ درد بھول جاتے ہیں کہ ساون اور بھادوں کے مہینے نزدیک ہیں اور ان کی جھونپڑیوں کی چھتیں اب تک مرمت طلب ہیں۔ انہیں ایسے عالم میں بیساکھ کی بھی پروا نہیں ہوتی جب ٹین کی چھتیں بیساکھی ہواؤں سے اُڑ جاتی ہیں اور بیڑے کی جھونپڑیاں گر پڑتی ہیں۔ ان ہی گاؤں میں اقتصادی اور معاشی زبوں حالی کے باوجود الھڑ ناریاں چوری چھپے محبت بھی کرتی ہیں۔ ان کی محبت دریاؤں کے جوار کی طرح بہت شدید ہوتی ہے اور کنول کی طرح نرم بھی۔ وہ اندر ہی اندر اس آگ میں تپتی رہتی ہیں مگر زبان سے کچھ نہیں کہتیں۔

ان چیزوں کے علاوہ مشرقی پاکستان کے گاؤں کا ایک رُوپ اور بھی ہے —— اور یہ روپ بڑا ہی پراسرار ہے اور خطرناک بھی۔ اس کے خلاف گاؤں کے سیدھے سادے لوگ احتجاج نہیں کرتے، انہیں ایسا سوچنے کی جرأت بھی نہیں ہوتی۔ یہ رُوپ ہے وہاں کے نام نہاد جاہل مولویوں ملاؤں کا۔ یہ مولوی ملا اسلام اور مذہب کی آڑ لیکر صدیوں سے گاؤں کی صاف ستھری زندگی کو ناپاک کرتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ کنواری اور کم عمر لڑکیوں سے نئی شادیاں رچاتے ہیں اور پھر چھوڑ دیتے ہیں۔ بہو بیٹیاں بھی ان کے پنجہ استبداد سے آزاد نہیں۔ چور بازاری میں بھی ان کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔

مشرقی پاکستان کی زندگی کے یہ وہ موضوعات ہیں جن پر علاء الدین الآزاد نے بڑے ہی فنکارانہ انداز میں کہانیاں لکھی ہیں۔ ان کہانیوں کو پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آزاد نے ان موضوعات پر کچھ لکھنے سے پہلے زندگی کے مختلف روپوں کو ہر زاویے سے دیکھا ہے' ان کا گہرا مطالعہ کیا ہے' ان پر غور کیا ہے۔

اس کی مشہور کہانی "بارش" ایسے ہی ایک موضوع کے گرد گھومتی ہے۔ آسمان پر دور دور تک بادل کا نام و نشان نہیں ہے۔ گرمی کی شدت کا یہ عالم ہے کہ زمین پھٹ چکی ہے۔ دوپہر کے وقت کھیتوں میں کھڑا ہونا ممکن نہیں۔ گاؤں والوں نے سمجھا کہ ضرور ہم سے کوئی خطا سرزد ہوئی ہے۔ ہم میں ایسا یقیناً کوئی گنہگار ہے جس کی وجہ سے گاؤں پر یہ مصیبت نازل ہوئی ہے۔ اس نفسا نفسی کے عالم میں گاؤں کے مولوی محی الدین منبر پر کھڑے ہو کر بلند آواز سے کہنا شروع کرتے ہیں: —— "برادران اسلام! میں خدائے برتر کا ادنیٰ بندہ ہوں۔ لہٰذا میں آپ لوگوں کی خدمت کیسے کرسکتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں خدا نے اپنی کتاب میں کتنے واضح لفظوں میں فرمایا ہے کہ دنیا میں خدا کا غضب اسی وقت نازل ہوتا ہے جب دنیا گنہگاروں سے بھر جاتی ہے۔ آج ہماری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں —— بیٹا باپ کی نافرمانی کر رہا ہے' عورتیں بے پردہ گھوم رہی ہیں' چوری' ڈاکہ زنی اور دوسری برائیوں کا بازار گرم ہے۔ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کو ہم بھول چکے ہیں۔ آئیے ہم اپنے گناہوں سے توبہ کریں۔ خدا بڑا رحیم و کریم ہے وہ ہماری دعا ضرور سنے گا۔"

اور دوسرے دن مولوی محی الدین صاحب بیمار پڑ گئے تو گاؤں والوں نے حاجی کلیم اللہ صاحب کو' بڑی منت سماجت کرنے کے بعد امام بننے پر رضامند کیا۔ حاجی صاحب نے دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر دعا مانگنی شروع کی: "بار الٰہا! اپنے مجبور بندوں پر رحم فرما۔ تو آسمان، زمین، چاند اور سورج کا خالق ہے۔ تیرے ایک اشارے سے سمندر کی لہریں غضبناک ہو جاتی ہیں، ہواؤں میں طوفان سا چلتا ہے۔ خدایا میگھ دے' پانی دے، چھایا دے، شانتی دے۔"

اور مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر حاجی کلیم اللہ تسبیح کے دانے گنتے گنتے سوچ رہے ہیں۔ "فکر کرنے کی کیا بات ہے۔ سوت کی چور بازاری میں تو میں نے ہزاروں روپے کمائے ہیں۔ نصف رقم خرچ کرکے میگھنا کنارے گودام بھی خرید لیا ہے اور باقی نصف رقم سے زمین حاصل کرلی ہے...."

پچھلے سال حاجی صاحب ہوائی جہاز پر سوار ہو کر حج بھی کر گئے ہیں۔ لیکن حج کے لئے روانہ ہونے سے پہلے جب لوگوں نے تیسری شادی کرنے پر مجبور کیا تو کہنے لگے: "ساٹھ کی عمر ہونے کو آئی۔ مجھے اپنی لڑکی کون دے گا؟" لوگوں نے کہا۔ "کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ صرف ہاں کیجئے اور پھر

دیکھئے۔ ایسی لڑکی آپ کو ملے گی کہ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔"

ساٹھ سالہ حاجی کلیم اللہ کے گھر میں جوان لڑکی آ گئی لیکن چوری چھپے اس نے اس کے بڑے لڑکے خالد کو پھانسنا چاہا۔ ایک دن دونوں ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ زہرہ کی گود میں چھوٹا بچہ تھا۔ خالد نے اس کی گود سے بچے کو لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے دیجئے، آپ تھک جائیں گی۔" زہرہ نے ترچھی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ بولی۔ "تمہیں تکلیف نہیں ہوگی؟" دونوں چلتے رہے۔ ایک جگہ آ کر زہرہ رک گئی۔ آگے گھٹنوں گھٹنوں پانی تھا۔ اس نے اپنا کپڑا ٹھیک کیا۔ پھر اس کی نگاہ چاند پر پڑی۔ اس کے من میں کیسی جوالا دہکنے لگی تھی۔ اُس نے پکارا۔ " خالد! اوہ تمہیں کیسے بتاؤں۔ تم تو کچھ نہیں سمجھتے۔"

اور پھر جب بارش چھما چھم ہونے لگی تو زہرہ بے اختیار صحن میں نکل آئی۔ حاجی کلیم اللہ نے گھبرا کر کہا۔ "ارے ارے، یہ کیسا پاگل پن ہے۔ سردی لگ جائے گی تمہیں۔ آتنی رات کو یہ کیا سوجھا۔"

زہرہ برآمدے کے پاس آ گئی۔ اس نے آنکھوں پر سے بالوں کے ایک گچھے کو ہٹاتے ہوئے اور ہونٹوں پر ہنسی لاتے ہوئے کہا۔ "آپ نہیں جانتے، یہ تو موسم کی پہلی برکھا ہے۔ نہانے میں بڑا مزا آتا ہے۔ اسی پانی سے فصل پیدا ہوتی ہے اور پھل آتے ہیں۔"

افسانے کے اختتام پر افسانہ نگار نے زہرہ کی زبان سے جو کچھ کہلوایا ہے اس میں کتنا بھرپور طنز ہے علاء الدین نے اشارے اشارے میں افسانے کی پوری حقیقت بیان کر دی ہے۔ بڑھاپے کی شادی، جوان بیوی اور پھر اس کے لڑکے سے بیوی کے ناجائز تعلقات۔ اور پھر اس کا بھیانک انجام۔ گاؤں کے مولوی اور حاجی جو گاؤں کے سیدھے سادے لوگوں کو اللہ کے غضب سے ڈرا دھمکا کر اپنا اُلو سیدھا کرتے ہیں۔ آج بھی ایٹم اور ہائیڈروجن بم کے زمانے میں وبا کی طرح پھیلے ہوئے ہوتے ہیں اور ان گنت روپ بدل بدل کر گاؤں کی الھڑ گوریوں کی زندگی تباہ کر رہے ہیں۔ اس میں خالد اور زہرہ کا کیا قصور ہے۔ اس میں اس چاندنی رات اور چاند کے حسین مکھڑے کی کیا خطا ہے جسے دیکھ کر زہرہ کے جذبات میں آتش فشاں دہک اٹھتا ہے۔ زہرہ کوئی مافوق البشر تو ہے نہیں کہ وہ فضا سے متاثر نہ ہو اور اپنے آتشیں جذبات پر قابو پالے۔

علاء الدین الآزاد نے اپنے اس افسانے کی تکنیک اور ہئیت میں بڑی سادگی سے کام لیا ہے۔ اس میں نہ کوئی الجھن ہے اور نہ پیچیدگی۔ ایک عام موضوع ہے جسے اس نے فنکارانہ رنگ دے کر بڑا ہی موثر اور دلکش بنا دیا ہے۔ خصوصاً افسانے کے اختتام پر تو اس نے کمال کر دیا ہے۔ "یہ تو موسم کی پہلی برکھا ہے۔ نہانے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ اسی پانی سے فصل پیدا ہوتی ہے اور پھل آتے ہیں۔"

"تاریک زینے" علاء الدین الآزاد کا دوسرا افسانہ ہے جس میں زندگی کے گھناؤنے پہلو کی عکاسی کی گئی ہے۔ بھوک، بیکاری، افلاس، تنگدستی انسان کو عجیب و غریب پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ لینا کا بھائی ڈینیل پڑھا لکھا جوان ہے مگر مسلسل بیکاری نے اس کی زندگی اجیرن کر دی ہے۔ وہ ملازمت حاصل کرنے کے لئے اپنی بہن کو "ہوس" کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ مگر اسے نہیں معلوم کہ اس کی بہن پہلے ہی اپنے ہمسائے ڈاکٹر کریم کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ وہ ڈاکٹر جس نے لینا کو یقین دلایا تھا کہ اس محبت، اس ملن کا نتیجہ سنگین نہیں ہوگا۔ لیکن جب لینا نے محسوس کیا کہ اس کا جسم غیر متناسب ہوتا جا رہا ہے تو اُسے شبہ ہوا۔

"جب رات گہری ہو گئی اور گھڑیال نے ایک بجایا تو لینا بچھونے سے نیچے آ گئی۔ اس نے روشنی تیز کر دی۔ اس وقت کوئی جاگ تو نہیں رہا ہے۔ نہیں کوئی نہیں۔ دیوار کے پاس پرانی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو کر...... آخر...... وہ کیا تلاش کر رہی تھی؟

نہیں، نہیں۔ اب تو شک و شبہ یقین سے بدل چکا ہے۔ یکایک اس نے لالٹین بجھا دی اور پھر وہ سرنگوں ہو کر دھپ سے بیٹھ گئی۔

"ٹن، ٹن، ٹن، گھڑیال نے تین بجائے۔ لینا اٹھ کھڑی ہوئی۔ آج کی رات کتنی حسین ہے۔ لیکن لینا کو اس رات کی قدر و قیمت معلوم ہے۔ ایسی ان گنت حسین راتوں میں اسے محبت کا تحفہ ملا ہے۔ ان لمحوں میں اُس کے ہونٹوں پر ہزاروں بوسے ثبت کئے گئے ہیں۔

تین بج گئے مگر وہ کہاں ہے۔ دستک نہیں ہوئی اب تک؟ آخر اسے ہوا کیا؟

"لینا نے کپڑے پہن لئے۔ وہ باہر آ گئی اور آہستہ آہستہ زینہ طے کرنے لگی۔ ایک جگہ آ کر اس کے پاؤں رک گئے۔

"یہ آپ نے کیا کر دیا۔ اعتماد کی اچھی قیمت چکائی آپ نے؟"
"اعتماد ــــ نہیں میں نے تو دل کی خوشنودی حاصل کی تھی۔"
کئی زینے طے کرنے کے بعد لینا پھر رک گئی۔
"تم کانپ رہی ہو؟"
"نہیں کچھ نہیں۔ تم سے کچھ کہنا ہے۔ بیحد ضروری۔"
"تو کہو"
"تم نے کہا تھا کہ کچھ نہیں ہوگا مگر ــــ"
"تو کیا ــــ مطلب؟ ذرا واضح لفظوں میں بتا دو"
اور لینا نے جب اس کی آنکھوں پر پڑا ہوا پردہ تار تار کر ڈالا تو اندھیرے میں اس کے پاؤں کانپنے لگے۔
"حادثہ" میں ڈاکٹر ہوں اور مجھ سے ایسا حادثہ سرزد ہو گیا۔ خیر ڈرنے کی بات نہیں۔ گناہ کی جڑ کاٹ کر پھینک دونگا۔"
"نہیں" لینا نے جواب دیا۔
"مگر میں تو تمہارے ساتھ شادی نہیں کر سکتا۔ کیا میں نے تمہیں نہیں بتایا کہ چند دن پہلے میرے بڑے لڑکے کی موت واقع ہوگئی ہے۔ ویسے ہی بہت پریشان ہوں۔ مزید پریشانی میں مبتلا نہ کرو۔"
یہ سن کر لینا کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا مگر اس نے خودکشی نہیں کی البتہ اس کے دل میں بیک وقت کئی سوال جاگ اٹھے ــ "کیا اس کے بعد اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں؟ کیا اس وسیع دنیا میں ایک ننھی جان اور اس کی بے سہارا ماں کے لئے کوئی جگہ نہیں۔"
یہ سوال آج ہماری سماج کے لئے نئے نہیں ہیں۔ یہ سوال بہت پرانے ہو چکے ہیں لیکن کیا جواب ملا؟ ان سوالوں کا جواب دے گا کون؟ ہم؟ آپ؟ پھر کون؟
علاالدین الآزاد نے اپنے افسانے میں ان ہی سوالوں کے جواب طلب کئے ہیں۔ کتنی موثر اور دل گداز کہانی ہے! ہماری سماج کے ایک گھناؤنے روپ کو اس نے کتنے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ یہی تو اس کی کامیابی کی دلیل ہے۔

*

"نادرؔ کا کاکوروی": ــــــــــــ بقیہ صفحہ: (۲۳)

اب قوم کو کچھ کرنے کا یارا نہ رہا ۔۔۔ اب تنکے کا بھی اس کو سہارا نہ رہا
ہر قوم کا ہادی ہے کوئی لیکن آہ ۔۔۔ ہم کس کے ہوں کوئی بھی ہمارا نہ رہا

وہاں وہ یہ بھی کہہ گئے کہ:-

دنیا کو کوئی چندے کی ڈالی ہے وہاں ۔۔۔ یا عہدہ سیکرٹری کا خالی ہے وہاں
کیوں ملک عدم کو تم چلے اے ہمدمؔ ۔۔۔ کیا کانفرنس ہونے والی ہے وہاں

یہ ایک مختصر سی جھلک ہے نادرؔ اور ان کے کلام کی۔ ان کا سارا کلام جمع نہیں کیا گیا، خصوصاً ۱۹۱۰ء کے بعد کا کلام جب "جذبات نادرؔ" کا دوسرا حصہ شائع ہو چکا تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی کے باقیماندہ دو سال میں جو کچھ لکھا، وہ ابھی پراگندہ ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کی طرف توجہ کی جائے اور ان کا سارا کلام دوبارہ چھپوایا جائے۔ ورنہ اردو شاعری احسان فراموشی کے اس الزام سے بری نہیں ہو سکے گی جو اس سلوک کی وجہ سے جو نادرؔ کے ساتھ اب تک روا رکھا گیا ہے، اس پر عائد ہوتا ہے۔

سندھی رومان:

"نوری جام تماچی"

(سُر کاموڈ)

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ
مترجمہ: عاصمہ حسین

جون کے شمارے میں مشہور سندھی رومان "نوری۔ جام تماچی" کا ذکر آیا تھا جس کو شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کی دلچسپی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم اس شمارہ میں ان کی دو "داستانوں" یعنی حصوں میں سے ایک کا منظوم ترجمہ پیش کر رہے ہیں جو رشید احمد لاشاری کے نثری ترجمہ پر مبنی ہے۔

شاہ بھٹائیؒ کے فکری مرکز و محور دو ہیں: الوعبد، حق در روح، جن کا آپس میں بنیادی تعلق ہے۔ لہٰذا وہ الوہیت کے ساتھ "روح" کے شاعر بھی ہیں اور ان کا کلام روح کی بلندی و پستی، فتح و شکست، عروج و زوال کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ ان کی ہیروئنیں سوہنی، سسئی، ماروی اور نوری بنیادی کیفیتوں اور اقداروں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ نوری کیا ہے؟ انسانی فطرت، اپنی تمام کمزوریوں اور سفلی رجحانات کے ساتھ۔ اسے درجہ بلند حاصل کرنے کے لئے جام تماچی کی ضرورت ہے۔ وہ ہستی جو انسان کو پستی سے بلندی کی طرف جانے کی تحریک دلاتی ہے۔ نظم کے بسیط مطالعے سے جام کی علامتی حیثیت بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ نوری پہلے گندری[1] ہے اور پھر نوری۔ اسی لئے اس کی ذات میں وہ ڈرامائی دلچسپی اور کشش نہیں جو سوہنی، سسئی اور ماروی میں ہے یا ان سے متعلق سُروں میں پائی جاتی ہے۔ کیونکہ موضوع کی نوعیت کلام پر بھی اثرانداز ہوتی ہے۔ تاہم بھٹائیؒ کے بنیادی تصور کو واضح کرنے کے لئے اس کی اہمیت ظاہر ہے۔ ہیروئنوں کے نام بھی اسی لئے نسوانی ہیں کہ وہ 'روح' کی تمثیل ہیں۔ (مدیر)

تو سمہ ہے میں گندری
تو اوج سراپا میں پستی
مرا دل ہے گناہوں کی بستی
کہیں دیکھ کے سج دھج رانیوں کی
اور ان کا سحر بھرا جوبن
مجھے چھوڑ نہ دینا اے ساجن!
منہ موڑ نہ لینا اے راجن!

(۲)

تو سمہ ہے میں گندری
مرے دل میں ہیں عیب ہی عیب بھرے
مرے تن پر مچھلی کے ریشے
کہیں نہ دیکھ کے یہ اوگن میرے
جن سے ہے بھرا میرا تن من
مجھے چھوڑ نہ دینا اے ساجن!
منہ موڑ نہ لینا اے راجن!

(۳)

تو سمہ ہے میں گندری
ہیں مجھ میں کروڑوں عیب نہاں
مرے تن پر ہے مچھلی کے نشاں
یہ تو کہ ہوں برگشتہ دل و جاں
ہاں دیکھو ان ہی کے کارن
مجھے چھوڑ نہ دینا اے ساجن!
منہ موڑ نہ لینا اے راجن!

(۴)

تو سمہ ہے میں گندری
عیبوں کا پُتلا من میرا
تن میرا مچھیروں کا پالا
میں کیا ہوں مری اوقات ہے کیا
میں مَے، تو جام، برائے خدا!
کہیں بھول سکے یہ بھر لو پرگن

---

[1] سندھ کے مچھیروں کا ایک قبیلہ جو گندری کہلاتا ہے۔ [2] کنول گٹہ

مجھے چھوڑ نہ دینا اے ساجن!
منہ موڑ نہ لینا اے راجن!

(۵)

تو سمتہ ہے میں گندری
مجھ میں ہے ہزار اک عیب بھرا
معلوم ہے تجھکو حال مرا
ہاں بہر خدائے بے ہمتا!
باندھا ہے جس نے یہ بندھن
مجھے چھوڑ نہ دینا اے ساجن!
منہ موڑ نہ لینا اے راجن!

(۶)

تو مالک ہے اس بستی کا
ہم بستے ہیں تیرے سائے میں
میں ایک مچھیرن بے مایہ
مت دیجیو داغ جدائی کا
ترے نام سے میری آن بچا
تو مان ہے میری ہستی کا

(۷)

تو جام ہے سب پر راج ترا
دریائی بستی سب تیری
میں غربت کی گودی میں پلی
تو اپنا ہے، اس کارن ہی
کر ہم کو معاف لگان سبھی
گو سب پہ ہے واجب باج ترا

(۸)

یہ رشتہ کن سے جوڑ لیا
جن میں نہیں کوئی تاب و تواں
ہیں مچھلیاں کھانے کا ساماں
یہ ڈھیر ہی ڈھیر عفونت کے
انبار ہیں ان کی دولت کے
سب پھرتے ہیں مارے مارے

تجھ سے ہی امید رکھیں سارے
ہے جام! سہارا تو ان کا

(۹)

یہ آتے ہیں بھاری جال لئے
یہ کشتیاں برگ و ساز اُن کا
اور ٹوکروں پر ہے ناز اُن کا
جب پھیلیں سورج کی کرنیں
دربار میں حاضر ہو جائیں
سمتہ نے خویش بنایا اُنھیں
نوری کی اتھاہ محبت میں
جو لوگ غریب مچھیرے ہیں
اور ذات قبیلے ہی کے ہیں
غربت میں سدا اک حال لئے

(۱۰)

بدبوئیں بسی پٹاروں میں
اور جھانج بھی سارے آلودہ
ہر تنکے میں مچھلی کا ریشہ
سمتہ ہے کہ ان لوگوں میں کھڑا
دن رات کرے کیا کچھ نہ کیا
کھویا ہے انہی ہنگاموں میں

(۱۱)

وہ کالی بھونڈی بدصورت
بے ہنگم بھدی ناریاں ہیں
لئے بیٹھی اپنی پٹاریاں ہیں
ہو کون بھلا غمخوار اُن کا؟
ہے جام پہ دارومدار ان کا
وہ اُن کے لئے عین رحمت

(۱۲)

یہ جال، پٹارے جھانج اُن کے
مچھلی کو دل و جاں سے چاہیں
دریا کے کنارے بیٹھیں اُٹھیں
مچھلی کی بو سے بسے ہوئے
نت اُن کی بساند میں کھوئے ہوئے
سید کہے: کچھوؤں کی صورت
ان لوگوں کو پانی سے الفت
ان مانجھیوں ہی کی دلجوئی
سمتے نے اپنے ذمے لی
ہے ٹھیک اسی سے کاج اُن کے

۱۳

وہ گھاس کہ جس سے گھن آئے
چمٹی ہوئی ان کے لہنگوں سے
تن ڈھانپیں پھول پوڑے کے
لو، راجہ ان کے جھونپڑوں میں
کس شوق سے آئیں، دیا کریں
جو دیکھے اُن کا جس گائے

(۱۴)

ہے گند کی گھاس اُن لہنگوں میں
اور تن پہ پھول پوڑے کے
یہ پھول ہی انگ سدا ڈھانپے
سب جھیل بٹی اُن لوگوں میں

(۱۵)

خوش ہو کر جام کی آمد پر
سب ناریاں شوقِ سلام لئے
شکرانۂ نو ہر گام لئے
لہنگوں پہ گھاس ہی گھاس سجی
اور سروں پہ گٹھری پہ گٹھری
اُٹھ کر تیار ہوئیں گھر گھر

(۱۶)

گھل مل گئے جام سے وہ سارے
ہر ایک مچھیرن چھوٹی بڑی
اونچے محلوں میں رہنے لگی
اک کینجھر جھیل کی بات ہی کیا

ہر ماجھی روم کے ساگر کا
خورشید فلک سے سرمایہ

(۱۷)

نوری، اس کی دنیا بدلی
نہ وہ مچھلیاں پکڑے نہ پاس رکھے
نہ وہ مچھلیاں کاٹے نہ بیچے
سب ٹوکرے کنوئیں میں پھینک دیئے
نت پیار کی نظروں سے دیکھے
کسکو؟ اپنے من راجن کو
اُس پریت کے رسیا ساجن کو
وہی رنگ اُس کا وہی ریت اُس کی
سمہ کے راج محل والی
اب اُس کی شان ہی اور ہوئی

(۱۸)

کم تول زیادہ تول ہے کیا
کیا کرتی اس کا اندازہ
کیا پاس تھا اُس کے پیمانہ
اس شے کا ترازو کوئی نہ تھا
نے باٹ تھا کوئی نے پلہ
نوری نے وہی ڈھنگ اپنایا
جو راج محل میں آ دیکھا
اُس کا معیار وہی ٹھہرا

(۱۹)

نوری کے دل میں شوق اُٹھا
اک پھول پھوڑے کا توڑا
اور بڑھ کر جام کی نذر کیا
سمے کے محل کی سب ناریں
گم ہو گئیں عالمِ حیرت میں
اور جام کا دل یوں لوٹ آیا
اک مہر کا دریا پھوٹ پڑا
کچھ نرمی سے کچھ الفت سے
ہاتھ اپنا بڑھایا شفقت سے

اور ہاتھ پکڑ کر گندری کا
گاڑی میں بٹھا کر چلا گیا
وہ جام، وہ گندری، شانِ خدا!

(۲۰)

کیا دل میں غرور تھا نوری کے؟
تھا اس کو روپ گمان کوئی؟
کیا اس کو تھا خود بزمان کوئی؟
نہیں، اس نے تو اپنی آنکھوں سے
اُن پیاری مدبھری آنکھوں سے
مخمور کیا تھا راؤ کو
مسحور کیا تھا راؤ کو
اور اپنی فہم و فراست سے
ہشیاری، دانش و حکمت سے
سب بیگموں کا دل موہ لیا
کی سب کے دل میں رہ پیدا
سب لوگ تھے اس کے متوالے

(۲۱)

نوری کا نیاز بھی کیا شے تھا
اک جادو خیز کرشمہ تھا
گویا اعجاز سراپا تھا
اُس شخص کے دل پر سحر کیا
سردار تھا جو سب لوگوں کا
وہ ایک مچھیرن کے سر پر
جھلتا تھا پنکھا رہ رہ کر
یوں مورچھل اس کو جھلتا ہوا
جیسے وہ اس کا چاکر تھا
وہ رانیاں اونچے سر والی
سب ختم ہوئی حجت ان کی
کٹ حجتیاں اور تکراریں
وہ زہر میں ڈوبی تلواریں
یہ فیصلہ پہلے ہی طے تھا

(۲۲)

ہاتھوں میں مچھیرن کے مچھلی
پر دل میں گہری سوچیں ہیں
کیا جانئے کیسی موجیں ہیں
آنکھوں میں راجہ ہی راجہ
اور من میں اسی کا روپ بسا
پیار اس کا چٹکیاں لے دل میں
اور خواب ہی خواب بھرے دل میں
دل کیا تھا خوابوں کی بستی

(۲۳)

کیا صورت میں کیا سیرت میں
وہ اور مچھیرن کیا کہنا
ہر رنگ میں وہ کچھ اور لگے
جس طرح ستاروں کے تاروں میں
ان دھیمی دھیمی دھاروں میں
دھاگے کا اجلا روپ جگے
اندھیارے میں جیسے دھوپ لگے
یونہی نوری لگتی تھی رانیوں میں
نورانی فرشتہ ناریوں میں
فطرت ہی تھی اس کی شاہانہ
اونچا تھا نظر کا پیمانہ
جبھی جام نے اس کو جان لیا
اور باندھا کلائی میں ڈورا
یکسر سرشار و جنت میں

(۲۴)

وہ روپ انوپ وہ آب و تاب کی
جھیل اس کے سامنے پانی بھرے
کب حسن و جمال کی تاب رکھے
نے ڈھیر لگائے مچھلیوں کے
نے گندریوں کے سنگ بسے
وہ ڈونگے کشتیاں کھینے کی

سب محنت اس کو معاف ہوئی
خود مور چھل اس کو جام جھلے
اور شوق سے صبح و شام جھلے
ایسی تھی بلند جناب اُس کی

(۲۵)

یہ بستی جام تماچی کی
وہ اس بستی کا راجہ ہے
ہر شخص اس کے گن گاتا ہے
اے طمچیؔ اس کے دوارے جا
اور اس کی شان میں گانے گا
تا اس کی شان کو جان سکے
اصلیت کو پہچان سکے
کیا ظرف ہے اس کا کیا دل ہے
کیا اس کی حقیقی منزل ہے
کیا اُس کا مرتبۂ عالی

(۲۶)

یہ سمیاں، سومریاں ساری
دھتکارنے کے لائق ہیں سبھی
سر اونچا اٹھا کر چلتی ہوئی
اچھلے ہے جلا ڈالیں ان کو
نظروں سے گرا ڈالیں ان کو
ان سے تو بھلی وہ بالیاں ہیں
کینجھر میں جو کھیلنے والیاں ہیں
دل میں جو بسائیں تماچی کو
اور یاد میں لائیں تماچی کو
یہ جتنی اُتم رانیاں ہیں
یوں جن کی چرب زبانیاں ہیں
ان میں سے ہیرا کس کو ملا
جو رات کو بھی دن کرتا تھا؟
یہ چیز مچھیرن ہی کو ملی!

وائی

رہی مچھیرنوں میں وہ لیکن ڈال دیئے ہیروں پہ ہات
نوری پہ تھی صرف نوازش جام تماچی کی دن رات
کیا کہنے ہیں اس کے کرم کے، احسانوں کی وہ برسات!
اس کا کارن؟ ترکِ غلاظت، اور وہ شوقِ عطریات

★

اندھوں لولوں لنگڑوں سب پر کیا سخاوت کا دروا
داد و دہش اس مردِ سخی کی، دیا دھڑا دھڑ مال لٹا
ہر ہر رُت پر تحفے نئے ان ناچیزوں کو کیے عطا
جو ہری ہن برسانے والا ہوا زمانے میں پیدا
مچھلی بیچنے والوں کو دیئے لعل و گہر بے مول عطا

★

پہلے بانٹ دیں ساری مہریں نوری نے ناداروں میں
پھر بھی مشغلہ ڈھونڈا اس نے سب چاندی کے سکوں میں
پھر ذوقِ کرم مشغول ہوا انمول اور نادر چیزوں میں
فیروزے ہزاروں بخش کیے محتاجوں اور فقیروں میں
بے انت جواہر بکھرائے دھرتی کے کنوڑے باسیوں میں
تسید کبھی اس نے یہ کام کیے بیٹھے ہوئے اپنی مچھیرنوں میں

ڈُوم۔ جو بے حد لالچی ہوتے ہیں۔ طمچیؔ میں صریحاً ایہام ہے۔ یہ لفظ شاہ لطیفؒ نے خود وضع کیا ہے ؛

ماہ نو، کراچی۔ ستمبر ۱۹۵۹ء

افسانہ:

آئینہ

عنایت اللہ بیگ

میں آئینے کے سامنے کھڑا ہوں۔

آئینہ دیکھتے ایک عمر گزر گئی ہے لیکن آج آئینہ مجھے دیکھ رہا ہے۔

میں شاید بوکھلا گیا ہوں یا شاید میری شکل و صورت ہی ایسی ہے۔ چہرے کا رنگ روپ ہی بدلا ہوا ہے۔ وہ نکھار ہی نہیں جو چند روز پہلے تک تھا۔ میں نے آئینے کو اچھی طرح دیکھ بھال لیا ہے۔ یہ وہی بلجیم کا اصلی شیشہ ہے، جو دو برس ہوئے "عوامی پولٹیکل فرنٹ" کے کنوینر کی کوٹھی سے میں اٹھا لایا تھا۔ ایک بار نیلوفر اس آئینے پہ ریجھ گئی تھی۔ میں نے اسے کسی بات پہ کبھی ناراض تو نہیں کیا تھا لیکن یہ آئینہ مجھے اس قدر اچھا لگتا ہے کہ اس نے مانگا اور میں نے نہ دیا۔ اگر حاجی نوردین گورنمنٹ کنٹریکٹر نیلوفر کو نیا قد آدم آئینہ نہ دے دیتا تو جانے وہ میرے ساتھ کب تک روٹھی رہتی یا مجھے اپنا آئینہ قربان کرنا پڑتا۔ حاجی نوردین کے ہاں کیا کمی ہے۔ وہ ۱۹۴۸ء میں ایک سرکاری محکمہ میں چپڑاسی تھا۔ اس زمانے میں وہ نورا چپڑاسی کے نام سے مشہور تھا اور اب دس برس کے عرصے میں آٹھ بار حج کر آیا ہے۔ کراچی میں اس کی تین محل نما کوٹھیاں ہیں اور ہر سال کار اور ہر تیسرے سال بیوی کا ماڈل تبدیل کرتا ہے۔

اس آئینے میں یہ خوبی ہے کہ نزدیک سے دیکھئے یا دور سے، اس میں لہریں نہیں پڑتیں لیکن آج اس میں مجھے چہرے کے خدوخال ہی ڈولتے، جھولتے اور ڈگمگاتے نظر آ رہے ہیں جیسے میں ساکن جھیل پر جھکا ہوا تھا کہ کسی نے پانی میں کنکری پھینک دی ہے۔ چہرہ تیرتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔

آئینہ تو اچھی قسم کا تھا، شاید میری شکل و صورت بدل گئی ہے۔ میں اپنی صورت دیکھنے سے گھبرا رہا ہوں۔ گریز کر رہا ہوں۔ خفیف سی جھینپ سے کہیں سکڑ بھی رہا ہوں۔ ایک غبار سا ہے کہ میرے سینے میں پھیلتا ہی جا رہا ہے۔ میرے نقش و نگار یوں مڑے تڑے اور مسخ سے تو نہیں تھے۔ میری پیشانی پر گرے ہوئے بال دلفریب کمان سے کہیں زیادہ دلکش تھے۔ میری آنکھوں میں نسوانی دلوں کو موہ لینے والی چمک تھی۔ باقی ناک نقشہ ٹونی کرٹس سے ملتا جلتا تھا۔ گو مجھے کبھی بھی کسی نے نہیں بتایا تھا کہ میں مردانہ حسن کا مرقع ہوں لیکن کسی کے کہنے یا نہ کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کالج کے زمانے میں نیلوفر، مسرت اور ثریا کا مجھ سے کھچے کھچے رہنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میرے چہرے مہرے اور جسم کی ساخت میں کوئی کشش نہیں تھی۔ آغاز میں انہوں نے اگر مجھے لفٹ نہیں دی تھی تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ میں خورشید اور شوکت سے کم خوبرو تھا۔ مجھے اپنی خوبصورتی اور دلکشی پر ہمیشہ ناز رہا ہے۔ لیکن آج آئینہ مجھے میرا وہ روپ دکھا رہا ہے جو میرے تصوروں نے کبھی قبول نہیں کیا تھا۔ کیا میں یہی نقش و نگار لے کے پیدا ہوا تھا؟ کیا یہی تھے وہ خدوخال جن پر میں ناز کرتا رہا ہوں؟ کیا میں اپنے آپ کو فریب دیتا رہا ہوں؟ یا کیا آئینہ ...... لیکن آئینہ تو وہی ہے، بلجیم کا بڑھیا شیشہ۔ اس میں تو کوئی نقص نہیں ہو سکتا۔ یہ جب سے بنا ہے بے عیب ہے اور جب تک رہے گا بے عیب ہی رہے گا۔

"تم آئینہ ہر روز دیکھتے ہو، کبھی آئینے میں اپنے آپ کا سامنا بھی کیا ہے؟"

کمرے میں برسوں پرانی سرگوشی کی سرسراہٹ سی سنائی دے رہی ہے۔ یہ میرے کالج کے ایک پروفیسر کی آواز ہے۔ "ہیملٹ" پڑھاتے پڑھاتے ایک روز پروفیسر موڈ میں آ گیا تھا۔ پروفیسر کے منہ میں صرف دو لمبے لمبے دانت تھے۔ دونوں ہلتے تھے۔ جب وہ مسکراتا تھا تو ایک دانت اندر کو ہو جاتا تھا اور دوسرا نیچے والے ہونٹ پہ ٹک کر ناچنے لگتا تھا۔ اگر یہ دانت زمانے کی دستبرد سے بچا ہوا نہ ہوتا تو ہم پروفیسر کے موڈ کا کبھی اندازہ نہ کر سکتے۔ ایک روز لیکچر کے دوران میں ہونٹ پہ اس ناچتے ہوئے اور منہ میں چھپے ہوئے دانت کے درمیان سے پروفیسر کی کانپتی ہوئی مسرت کی آواز آئی تھی ــ

"تم آئینہ ہر روز دیکھتے ہو، کبھی آئینے میں اپنے آپ کا سامنا بھی کیا ہے؟"

خدا جانے اسے کیا سوجھی تھی اور ہیملٹ کا آئینے کے ساتھ کیا تعلق تھا؟ اس نے کلاس کی طرف دیکھا تو اس پر سناٹا چھا گیا تھا۔ اشرف اور رعنا کی کھسر پھسر جو کبھی بند نہیں ہوتی تھی، بند ہو گئی تھی۔ شوکت کی پنسل جو میز پر ٹیلیگراف آفس والوں کی طرح ٹک۔ ٹکا۔ ٹک کرتی رہتی تھی اس روز پہلی بار خاموش ہوئی تھی۔ پچھلی سیٹوں پر، "ہی ہی ہی ہی" کی ہنستی ہوئی آوازیں پچھلی سیٹوں میں ہی فوت ہو گئی تھیں۔

"کبھی آئینہ میں تم نے اپنا سامنا کیا ہے؟"

پروفیسر کی بوڑھی آواز نے سکوت کو اس فقرے سے جھنجھوڑنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھنے سے پہلے ساری کلاس کا جائزہ لیا تھا۔ میں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ ہر لڑکے اور لڑکی کا سر جھکا ہوا تھا۔ حد یہ کہ نیلوفر اور ثریا کی شوخ آنکھیں بھی جھکی ہوئی تھیں۔ تب مجھے محسوس ہوا تھا کہ پروفیسر نے کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جو گہرے رمز کی حامل ہے لیکن میں نے اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے کلاس میں کبھی کوئی بات سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں کبھی سنجیدہ نہیں ہوا تھا۔ میں نے صرف اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش ضرور کی تھی کہ آج کلاس کے بڑے بڑے تیس مار خاں، بڑے بڑے فرہاد اور بڑے بڑے "دل لے کے بھلا دینے والے" تمام "سنتوش" اور "دلیپ کمار" اور وہ بھی جو اپنے آپ کو "میریلن منرو" "شیاما" اور "صبیحہ" اور جانے کیا کیا سمجھتی ہیں، ان کی نظریں کیوں جھک گئی ہیں؟ مسرت کے سرخی تلے چھپے ہوئے ہونٹوں پر کھسیانی سی مسکراہٹ کیوں ہے؟ یہ سب لوگ پروفیسر کی طرف کیوں نہیں دیکھتے؟ پروفیسر کا چہرہ آئینہ تو نہیں۔ وہ تو بے چارہ خود اس عمر میں آئینہ دیکھنے سے گھبراتا ہوگا۔ اپنے آپ کو اپنے یہ دانت کون دکھاتا ہے۔ سب طلبا اور طالبات پروفیسر کی بے نور مگر مسکراتی ہوئی آنکھوں کا سامنا کرنے سے گریز کر رہی تھیں۔ صرف میں تھا جو اس منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا —— کچھ سمجھ نہ سکنے میں کتنا لطف ہوتا ہے —— جب میں نے شوکت اور خورشید کی رقیب نگاہوں اور نیلوفر، ثریا اور مسرت کی شریر اور ہرجائی نگاہوں کو جھکا ہوا دیکھا تو میری گردن ضرورت سے زیادہ تن گئی تھی۔ پھر میں نے فاتحانہ انداز سے پروفیسر کی طرف دیکھا تھا اور پروفیسر مجھے یوں اکڑا ہوا دیکھ کر اس طرح ہنسا تھا جس طرح میں سرکس کے مسخروں کو دیکھ کر ہنسا کرتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ پروفیسر کا دوسرا دانت بھی باہر آ گیا تھا۔ اور اس کا سال خوردہ قہقہہ حلق میں ہی خرخر کر رہا تھا۔

آج ساڑھے دس برس بعد بلجیم کے اس آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر پروفیسر کا خراٹے نما قہقہہ پھر سن رہا ہوں اور اس کی بوڑھی آواز بھرپور طنز بن کر میرے کمرے میں گونج رہی ہے —— "کبھی تم نے آئینے میں اپنا سامنا کیا ہے؟" —— مجھے یوں لگتا ہے جیسے آج میری نگاہیں جھکی جا رہی ہیں اور کلاس کی درجنوں آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں۔ وہ ذرا سی بات جو میں اس وقت نہیں سمجھ سکا تھا آج بغیر کسی کے سمجھائے سمجھ رہا ہوں۔ زمانے نے اتنی سی بات سمجھانے کو پورے ساڑھے دس سال کا عرصہ صرف کیا ہے۔ کاش! میرا پروفیسر "اپنے آپ کا سامنا کرنے" کا فلسفہ اس روز تفصیلاً سمجھا دیتا، وہ یوں ہنس کے ٹال نہ دیتا اور آج میں اس آئینے کے سامنے کھڑا یوں اپنے آپ کو دیکھنے سے گریز نہ کر رہا ہوتا۔ ابھی ابھی دیکھا ہے کہ آج دوسرا روز ہے میں نے شیو نہیں بنائی مجھ پر پہلی بار انکشاف ہوا ہے کہ میری داڑھی کے آدھے بال سفید ہو چکے ہیں۔ سر کے بال سیاہ ہیں۔ (سفید بال حجام سے نکلوا لیتا ہوں) آنکھوں کے گرد شب بیداری، تعیش اور شراب نے سیاہی مائل رنگ کے گھیرے ڈال دئے ہیں اور یہ انکشاف بھی ہوا ہے کہ میرا رنگ جو غالباً ہمیشہ سانولا رہا ہے اب کراچی کی مرطوب ہواؤں اور دھوپ نے گہرا سانولا کر دیا ہے۔ ہونٹ جو کل تک اچھے بھلے تھے آج مرجھائے مرجھائے سے ہیں۔ چہرہ یوں لٹک آیا ہے جیسے گناہوں سے لدے ہوئے ضمیر پر ایک اور گناہ کا بوجھ آخری تنکے کا کام کر رہا ہے۔

اور میرے عکس کی آنکھیں دور بہت دور کسی شے کو دیکھ رہی ہیں جیسے برسوں پرانے، اور گذرے، وقت کی ربت میں گمشدہ شب و روز کو تلاش کر رہی ہوں۔

کہاں گئے وہ دن، وہ راتیں، کالج کا وہ زمانہ، وہ رقیبوں کی چوٹیں، وہ ثریا کی ادائیں، وہ ہنسی وہ قہقہے —— آج دوپہر تک تو مجھے کچھ بھی یاد نہیں آیا تھا۔ ذہن کبھی یوں پسپا تو نہیں ہوا تھا۔ پچھلے پہر آئینے کے سامنے کھڑے ہوتے ہی یہ کیا ہو گیا ہے؟ .... شاید نیلوفر نے بات ہی ایسی کہہ دی ہے، یا میں نے یا حالات نے ایسی بھونڈی سی قلابازی کھائی ہے کہ گرد و پیش کی ہر شے کا وہ رنگ روپ ہی نہیں رہا۔ ہر چیز الٹی الٹی سی دکھائی دے رہی ہے۔ ہوٹل کی اس تیسری منزل کے کمرے میں بھاگ بھاگ کر آتے ہوئے کراچی کی مرطوب ہواؤں کے تھپیڑوں میں وہ گداز ہی نہیں رہا۔ ان میں اعصاب کو سہلانے والی وہ خنکی ہی نہیں رہی۔ اعصاب کھنچتے ہی جا رہے ہیں۔ میں آئینے کے سامنے سے ہٹ جانے کی کوشش کر چکا ہوں، لیکن

کامیاب نہیں ہو سکا۔ میرے عکس نے مجھے ہپناٹائز کر لیا ہے۔

میں گھوم کر پیچھے دیکھنا نہیں چاہتا کیونکہ میں نے اپنے عکس کے عقب میں بوڑھے پروفیسر کا چہرہ دیکھا ہے۔ شاید واہمہ ہو گا لیکن میں نے ایک جھلک دیکھی ہے اور میں لرز گیا ہوں۔ وہم تو غیر محسوس ہوتا ہے مگر میرا لرزہ تو غیر محسوس نہیں۔ میرا رُواں رُواں ہل رہا ہے۔ عکس کے پس منظر میں لمبا سا ایک دانت مرجھائے ہوئے ہونٹ پر ناچ رہا ہے اور میں نے چیلنج کے انداز میں ایک بار عجب آواز سُنی ہے ـــــ

"کبھی آئینہ میں تم نے اپنا سامنا کیا ہے؟"

اوہ!.......... یہ کون ہے؟........ میرے سینے میں سے کسی نے جواب دیا ہے؟ جیسے نالائق سا کوئی طالب علم بول اٹھا ہو۔

"جی ہاں میں آجکل یہ جرأت طلب تجربہ کر رہا ہوں ـــ اُف کس قدر ہوش رُبا ہے یہ بات"

کاش! میرا وہ ضعیف پروفیسر ایک بار پھر مجھے مل جائے۔ میں اس کے سامنے دو زانو ہو کر گناہوں کا اعتراف کر دوں۔ میں اسے کہوں "میرے بزرگ استاد! ایک بار اپنے شانے تک لٹکائے ہی، اور میرے سر پہ ہاتھ رکھ لے۔ میں ڈر رہا ہوں۔ اپنے آپ سے خوف کھا رہا ہوں۔ دل ڈوب رہا ہے، بداعمالیوں کا بوجھ عمر کی کشتی کو ڈبو رہا ہے" ـــــ نہیں! وہ نہیں آئے گا۔ وہ لاہور کے ایک وسیع قبرستان کی کسی گمنام قبر میں سو رہا ہے۔ کالج کے زمانے کا ایک لمحہ بھی اب لوٹ کے نہیں آئے گا۔ اس دور کے اور میرے درمیان ساڑھے دس سال کا مہیب عرصہ حائل ہو چکا ہے۔ وہ لمحات جنہیں میں آج ڈھونڈ رہا ہوں دُور بہت دُور فضاؤں میں تحلیل ہو گئے ہیں۔ وہ رقیبوں سے جھگڑے ہیں اور حبیبوں کی محفلیں ویران ہو گئی ہیں۔ اب خاک اُڑ رہی ہے اور اس خاک میں سے تلخ و شیریں یادیں ابھر رہی ہیں۔ لاہور کے وسط میں میرے کالج کی عمارت تو اسی طرح کھڑی ہو گی۔ جی چاہ رہا ہے کہ بھاگ کر اس عمارت کے کسی کمرے میں جا چھپوں، اس کے تقدس میں جا پناہ لوں لیکن نہیں، اب اس عمارت کا بھی سامنا نہ کر سکوں گا۔ اب تو اس کی دیواریں بھی مجھ سے پوچھیں گی "تم نے آئینے میں اپنا سامنا کیا ہے؟" ـــــ اُن مقدس دیواروں کے سائے میں، اُن برآمدوں اور اُن کمروں میں اس طنز آلود سوال کے سوا کچھ نہیں رہا۔ اس محفل کو اُجڑے دس سال اور چھ مہینے گذر گئے ہیں۔

وہ لاہور کی بات تھی، میں کراچی میں ہوں۔ یہاں میل اور کوس نہیں، سال اور مہینے درمیان میں آ گئے ہیں۔ وہاں اب وہ بات نہیں رہی۔ خورشید جو میرا رقیب تھا اور صبیحہ کے مقابلے میں ہیرو کا رول ادا کرنے کو تڑپتا رہتا تھا اور بی۔ اے میں دو سال فیل ہو کر ثریا کو ساتھ لے کے کراچی آ پہنچا تھا، چند روز ہوئے مارشل لاء کے تحت اپنے کیفر کردار کو پہنچا اور ایک سمگلر کے ساتھ گرفتار ہو گیا۔ ثریا ایکسٹرا کے رول اور اپنے "سرپرست" کی شرائط سے اکتا کر تین سال ہوئے منوڑا کے ساحل سے ٹکراتی ہوئی لہروں میں جا چھپی تھی! ساتویں روز لہروں نے اس کی لاش کو منوڑا کے ہی ساحل پر واپس لا پھینکا تھا۔ فطرت کے باغیوں کو کون قبول کرتا ہے۔ میرا ایک اور کلاس فیلو، شوکت، نقلی فوجی افسر بن گیا اور بلیک میلنگ کے جرم میں تین سال قید بامشقت بھگت رہا ہے۔ مسرت تیسرے خاوند سے طلاق لے کر پھر گناہ کی زندگی کی طرف دوڑی اور ایک گھناؤنے جرم کی سزا میں پانچ سال کے لئے کراچی جیل کی دیواروں میں جذب ہو گئی ہے۔ میں مسرت کی مدد کو تیار تو نہ تھا۔ کالج کے زمانے میں اس نے مجھے ہمیشہ نظر انداز کیا تھا لیکن اس دور کی یاد نے مجبور کیا۔ آخر وہ کلاس فیلو تھی۔ معلوم ہوا کہ وہ بھی ہمارے معاشرہ کی ایک بُری لڑکی ثابت ہوئی۔ اس کے ایک نئے امیدوار مہینہ بھر پہلے تک سنا ہے نائب وزیر بھی رہے تھے۔ میں اسے ان صاحب سے متعارف کرانے کے لئے گیا تھا اور اسے مسرت کی مدد کے لئے آمادہ کیا۔ میں خود بلیک میلر ہونے کی وجہ سے اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس گھناؤنے گناہ کا موجب یہی شخص تھا لیکن اس سابق نائب وزیر کی اپنی ہی حالت مفرور ملزم کی تھی! راتیں گرانڈ ہوٹل میں گذارنے والا وزیر گمنام سے ایک ہوٹل میں دبکا ہوا کہیں دور بھاگ جانے کی سکیمیں بنا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ سے منظور کئے ہوئے دو درآمدی لائسنس پکڑے جا چکے تھے۔ وہ بھی اپنے انجام کی طرف آہستہ آہستہ پہنچنے ہی والا تھا۔

مجھے ناہید بھی یاد آ رہی ہے۔ ناہید شاید کتابیں ہی پڑھنے کے لئے پیدا ہوئی تھی۔ ہماری کلاس میں وہ بدھو اور چپ چاپ سی لڑکی تھی۔ اس نے کالج میں چار برس اس طرح خاموشی سے گزار دیئے تھے جیسے وہ گونگی اور بہری تھی۔ ہماری پھبتیاں، سیٹیاں اور فقرے شاید اسے سنائی ہی نہیں دیتے تھے۔ ہم نے کئی بار برآمدوں میں اس کا رستہ روکا لیکن وہ بغیر احتجاج یا ناک بھوں چڑھائے، سر جھکائے ہوئے، ایک

طرف ہو کر گذر جاتی۔ میں نے ایک دن یہاں تک کیا تھا کہ پروفیسر کے آنے سے پہلے اپنی سیٹ سے اٹھ کر ناہید کی سیٹ تک پہنچا۔ ایک ہاتھ اس کے کندھے اور دوسرا اس کی میز پر رکھ کر اس کے اوپر اس قدر جھک گیا تھا کہ اس کے بالوں کی بھینی بھینی خوشبو کو میں بہت قریب سے سونگھ رہا تھا اور جب اس نے اُوپر دیکھا تو اس کی پیشانی اور میرے درمیان صرف میری سانس کا ہی فاصلہ رہ گیا تھا۔ آہ! معصومیت، پاکیزگی اور اخلاق کی عظمت۔ اُس وقت میں اندھا تھا۔ آج برسوں بعد ناہید نے میری آنکھوں کے سامنے سے پردے اٹھائے ہیں۔ مجھ جیسا ڈھیٹ آدمی اُن شربتی آنکھوں کی کنواری چمک کو برداشت نہ کر سکا تھا۔ یہ میری پہلی شرارت تھی جس کے ارتکاب نے مجھے ڈرا دیا تھا۔ اُس دور میں میرے لئے کچھ بھی اجنبی اور بیگانہ نہ تھا۔ بیگانگی تھی تو کتابوں اور لیکچروں سے۔ اپنی کتابوں سے میری واقفیت، صرف ان کے سرورق تک تھی جب کہ گناہ کی زندگی کو میں عشقیہ ناول کی طرح صفحہ بہ صفحہ اور لفظ بہ لفظ جانتا تھا!

میں جب ناہید کے اس قدر قریب پہنچا تھا تو میں نے پہلی بار یہ خطرہ محسوس کیا تھا کہ وہ یقیناً پرنسپل تک شکایت پہنچائے گی اور مجھے کالج سے نکال دیا جائے گا حالانکہ میں ہمیشہ بڑھ کر بڑی خطرناک بلکہ شرمناک شرارتیں کرنے کا عادی تھا۔ میں نے وہاں سے ہٹ آنا چاہا تھا لیکن پیچھے سے آواز آئی، شاید اشرف تھا۔ "رنگ ماسٹر! کرتب ادھورا نہ رہے"۔—— مجھے ایک مدت بعد یاد آیا ہے کہ کالج میں مجھے رنگ ماسٹر کے نام سے یاد کیا جاتا تھا کیونکہ میں بڑے خطرناک کرتب کیا کرتا تھا۔ وہ میں ہی تھا جس نے فرسٹ ایئر کے ایک نئے طالب علم کی زنگ آلود، عمر خوردہ، صدیوں پُرانی چرخہ نما سائیکل، سٹینڈ سے اٹھا کر پرنسپل کے دفتر میں رکھ دی تھی عین اس وقت جب پرنسپل کی کار کالج کے گیٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ اس "کرتب" میں سب سے زیادہ خوفناک اور سنسنی خیز بات یہ تھی کہ پرنسپل کا وہ ادھیڑ عمر پٹھان دربان جس کے "خوتم برانڈہ کے نیچے نیچے جاؤ۔ اندر ساب بیٹا ہے" کے حکم سے سارا کالج لرزتا تھا، برآمدے کے نیچے سڑک پر پرنسپل کے استقبال کے لئے کھڑا تھا۔ اسے میں نے کانوں کان خبر نہیں ہونے دی ورنہ ......

میں ناہید کی طرف جھکا ہوا تھا اور وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اشرف کی آواز نے مجھے نیا حوصلہ دیا اور میں نے ناہید کو کہا تھا "مس ناہید! کل سنڈے ہے پک نک پہ چلیئے گا؟ بخدا آپ کے بغیر ہماری محفل ویران رہے گی"۔ مجھے (اور ساری کلاس کو بھی) توقع تھی کہ ناہید مجھے دھتکارے گی، شاید کچھ کہے بھی۔ اور کچھ نہیں تو شکایت کرنے کی دھمکی ضرور دے گی۔ لیکن اس کے نوعمر بھولے بھالے چہرے پر ذرہ بھر تبدیلی نہ آئی۔ نہ اس کی دلکش پیشانی پر ہی ہلکی سی شکن پیدا ہوئی۔ اس نے ناک سکیڑی نہ ہونٹوں کو دانتوں تلے دبایا بلکہ ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم پیدا کر کے معذرت کے لہجے میں بولی: "مجھے افسوس ہے میں آپ کا ساتھ نہ دے سکوں گی۔ آپ کے ساتھ جانے میں کیا حرج ہے، آپ میرے بھائی ہیں لیکن میں مجبور ہوں"۔

اگر وہ میرے منہ پر تھپڑ مار دیتی تو میں اس کا صدمہ ذرہ بھر محسوس نہ کرتا۔ لیکن اس کے ان الفاظ اور لب و لہجہ نے مجھے چکرا دیا۔ مجھے توقع نہ تھی کہ ناہید ایسی کاری ضرب بھی لگا سکتی ہے۔ میں اس کے کندھے اور میز سے اس طرح ہاتھ ہٹا کر پیچھے ہٹا تھا جیسے کالے ناگ نے مجھ پر حملہ کر دیا ہو۔ میں نے شدت سے محسوس کیا تھا کہ اس سے معذرت کروں، اسے کہوں۔ "معاف رکھنا ناہید بہن! میں بہت نادم ہوں"۔ لیکن اخلاقی جرأت میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ میں وہاں سے ہٹتے ہوئے کہنے لگا تھا "معاف رکھنا ناہید!" کہ ناہید کی حجاب آلود آواز نے میرے ہونٹ سی دیئے۔ وہ معصوم سی آواز میں بولی۔ "معاف رکھنا بھائی جان! میں آپ کو مایوس کر رہی ہوں" اور میں کھسیانی اور ہاری ہوئی سی ہنسی ہنستا ہوا اپنی سیٹ پر آگرا تھا!

ناہید سے یہ میری پہلی اور آخری ہمکلامی تھی۔ اس کے بعد میری جرأت نے کبھی ساتھ نہ دیا تھا کہ اسے "پک نک" پہ مدعو کروں، یا کم از کم چلتے چلتے پاس سے گذرتے ایک آدھ فقرہ ہی چُست کروں۔ میرے دوست مجھے اکثر اکساتے رہے کہ ذرا سی چھیڑ خانی ہو جائے لیکن میں انہیں ٹالتا رہا تھا۔ لگاتار دو سال ٹالتا رہا تھا۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ اتنی دلکش لڑکی کو اس قدر خاموش طبع نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ تعلیم میں اس قدر ہوشیار اور ذہین لیکن ذرہ بھر سوشل نہیں۔ مجھے اس کے ہونے والے خاوند پہ رحم آ رہا تھا۔

کالج سے فارغ ہوتے ہی میں ناہید کو بھول گیا تھا۔ مُردہ دلوں کو کون یاد رکھتا ہے۔ میں گزشتہ سال "عوامی پولیٹیکل فرنٹ" کے جلسے کے اہتمام و انتظام کے لئے بھاگ دوڑ رہا تھا۔ سٹیج، میز کرسیاں اور لاؤڈ اسپیکروں کا بندوبست تو ہو چکا تھا لیکن حاضرین کا کچھ بھروسہ نہیں تھا۔ شہر کے غنڈوں نے نرخ چڑھا دیئے تھے کیونکہ میونسپل کارپوریشن کے انتخاب کا ہنگامہ شروع ہو چکا تھا جہاں تین روپے میں ایک نعرہ باز مل جاتا تھا۔ اب دس روپے سے کم کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ حریف پارٹی نے جلسے میں ہڑبونگ مچانے کا پورا بندوبست کیا ہوا تھا۔ اُدھر ہماری پارٹی کا کنوینر غیر حاضر تھا۔ عدن سے کھجوریں لانے والی ایک دخانی کشتی میں اس کا "مال" کسٹم والوں نے پکڑ لیا تھا اور سی۔ آئی۔ اے کو رپورٹ ہو چکی تھی۔ کنوینر اس طرف مصروف تھا۔ جلسے کا سارا بوجھ میرے سر تھا۔ شہر کے تمام جیب کترے، قفل شکن، اٹھائی گیر اور دیگر جرائم پیشہ میونسپل کارپوریشن کے امیدواروں اور دوسرے چھوٹے بڑے سیاستدانوں نے بک کر لئے تھے۔ میں اسی بھاگ دوڑ میں "صدر مارکیٹ" کے قریب سے گزر رہا تھا کہ ٹیکسی اسٹینڈ پر کھڑی ایک پرائیویٹ کار میں سے ایک نسوانی آواز آئی۔ "رنگ ماسٹر صاحب!" میں نے چونک کے دیکھا۔ کار کی پچھلی سیٹ پر ناہید بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اسے دس برس بعد دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ دو پیارے پیارے بچے تھے۔ میں رُک گیا۔ ناہید کے ہونٹوں پر دہی تبسم تھا، چہرے کا نکھار وہی تھا، معصومیت وہی، شربتی آنکھوں میں چمک وہی اور ان تاثرات کے ملے جلے اثر میں سحر وہی جو دس سال پہلے تھا۔ وہی سیاہ برقع جو اکثر ہماری پھبتیوں کا نشانہ بنا کرتا تھا۔ میں بہت جلدی میں تھا۔ زیادہ باتیں نہ ہو سکیں۔ اس نے مجھے اپنے خاوند کا (جو اس وقت مارکیٹ میں شاپنگ کے لئے گیا ہوا تھا) ایڈریس دیا۔ مختصر سی چند ایک باتوں میں اُس نے بتایا کہ اس نے بی۔ اے کر کے شادی کر لی تھی۔ اس کا خاوند ڈاکٹر ہے۔ وہ پرائیویٹ پریکٹس کرتا ہے اور وہ خود ایک کنڈرگارٹن اسکول میں ہیڈ مسٹریس ہے۔ دو بچے پیدا ہو چکے ہیں۔ ناہید بچوں کا ذکر کرتے وقت بیحد مسرور ہونے لگی تھی۔ مطمئن اور گھریلو زندگی کے تاثرات اس کے حسن کے وقار اور جلال کو دوبالا کر رہے تھے۔ وہ دس سال پہلے والی چپ چاپ سی طالبہ اُس روز بولتے بولتے چُپ ہی نہیں ہو رہی تھی۔

"یہ دیکھی آپ نے میری رُوحی؟" اُس نے دو سالہ بچی کو گود میں اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اور یہ میرا رونی ہے۔۔۔۔۔ لیکن بھائی جان! اسے میں رنگ ماسٹر نہیں بننے دوں گی۔" اور لطیف سا ایک قہقہہ مارکیٹ کے مہیب شور شرابے میں تیرتا ہوا شور میں تحلیل ہو گیا۔ "۔۔۔ رنگ ماسٹر صاحب!۔۔۔۔۔ اوہ! معاف رکھنا بھائی جان! میں آپ کا نام بھول گئی ہوں۔ آپ کس ڈیپارٹمنٹ میں ہیں؟ گزیٹڈ پوسٹ پہ ہیں نا آپ؟"

اگر ناہید یہ سوال نہ پوچھ بیٹھتی تو شاید میں تھوڑی دیر اور اس کے پاس کھڑا رہتا اور اس کی مسرت بھری باتوں اور مطمئن مسکراہٹوں سے لطف اندوز ہوتا رہتا۔ میں گردوپیش سے بے خبر ہو چکا تھا لیکن اس نے میرے ڈیپارٹمنٹ کی بات پوچھی تو مجھے یاد آ گیا کہ میں بہت جلدی میں ہوں۔ میں چند غنڈوں کو کرائے پر نعرے لگانے اور چند ایک جرائم پیشہ لوگوں کو جلسے کی رونق بڑھانے کی خاطر جمع کرنے کی فکر میں ہوں۔ ناہید نے مجھے یاد دلا دیا تھا کہ میں ایک سیاسی پارٹی کا پروپیگنڈا سیکرٹری ہوں۔ بلیک میلنگ میں ماہر ہو چکا ہوں۔ ناہید کو میں بتانا نہیں چاہتا تھا کہ اگر ہماری پارٹی میں سے غنڈوں کو نکال لیا جائے تو پیچھے ہم چھ آدمی رہ جاتے ہیں جو پارٹی کے عہدیدار ہیں اور چار صفحے کے اخبار کا ایک ایڈیٹر ہے جو ہمارا یہ اخبار بلیک میلنگ کے زور پر چلا رہا ہے لیکن میں ناہید کو اپنا "ڈیپارٹمنٹ" کیسے بتاتا۔ اتنی جرأت کہاں سے لاتا۔

"معاف کرنا ناہید بہن!" میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "میں بہت جلدی میں ہوں۔ اس ایڈریس پر کسی وقت حاضر ہوں گا۔" اور میں بھاگنے ہی والا تھا کہ ناہید نے پوچھا۔ "اور ہمارے کالج کی وہ گلنار آجکل کہاں ہیں؟"

"گلنار؟" جیسے میں گلنار کو بھول گیا تھا۔ میں نے اپنا ایک جرم چھپاتے ہوئے کہا۔ "اچھا! وہ گلنار۔۔۔۔۔۔ کالج کے بعد آج تک میں نے اسے دیکھا ہی نہیں۔"

اگر مجھ میں سچ بولنے کی ہمت ہوتی تو ناہید کو تفصیلاً بتاتا کہ گلنار حاجی نورالدین کی چوتھی بیوی ہے۔ یہ شادی میری "پیشہ ورانہ کوشش" کا نتیجہ ہے۔ حاجی نورالدین سے میں نے دو ہزار روپیہ اس سلسلے میں وصول کئے تھے۔ وہ گلنار کے باپ کا ہم عمر ہے اور گلنار کے ماں باپ کی آنکھیں حاجی کے سمگل کئے ہوئے سونے کی چمک سے خیرہ ہو گئی تھیں۔ میں ناہید کو کیونکر بتاتا کہ وہ گلنار جو کالج میں ہمارے لئے ایک "ناول" تھی آجکل جاسوسی افسانہ

بنی ہوئی ہے بےحد سنسنی خیز اور راتوں کی نیند حرام کر دینے والی کہانی۔ لیکن میں نے ناہید کو کچھ بھی نہ بتایا۔ مجھ میں اعترافِ گناہ کی ہمت نہیں تھی اور نہ میں نے کوئی ایسی ضرورت ہی محسوس کی تھی۔ ملک کے سیاستدانوں نے گناہ کئے ہیں۔ سزا قوم نے بھگتی ہے، اعتراف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں ناہید کو کار کی پچھلی سیٹ پر مسکراتا چھوڑ کر بھاگ آیا تھا۔

آج آئینے کے سامنے کھڑے مجھے بہت کچھ یاد آ رہا ہے۔ میں کچھ بھی یاد نہیں کرنا چاہتا لیکن میرے عکس کے پس منظر میں تصویریں سی چلتی پھرتی دکھائی دے رہی ہیں جنہیں میں دیکھنا نہیں چاہتا پھر بھی دیکھ رہا ہوں۔ میں سمجھتا تھا کہ میری اوباش طبیعت نے سیاست بازی اور بھٹکے ہوئے دماغ نے گذرے ہوئے دنوں کو فراموش کر دیا ہے لیکن آج دیکھ رہا ہوں کہ ان دنوں کا ایک ایک لمحہ میرے چہرے کے خطوط میں زندہ ہے۔

شاید میں آئینے میں اپنے آپ کا سامنا کر رہا ہوں۔ یہ آئینہ یا آئینے میں میرا عکس میرا ضمیر بن گیا ہے — عریاں اور ننگ دھڑنگ ضمیر — نیلوفر نے ابھی ابھی ایسی بات کہہ دی ہے کہ میرے کردار کا ذرہ ذرہ تصویر بن کر میرے سامنے آگیا ہے۔ نیلوفر ساتھ والے کمرے میں لیٹی ہوئی ہے۔ شاید وہ رو رہی ہے۔ میں اسے تنہا چھوڑ کر بھاگ سکتا ہوں اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ وہ پانی کی طرح اپنا راستہ بنا لے گی لیکن میں انقلاب کے دور میں جس کا آغاز ۷۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء سے ہوا ہے، اس کا ساتھ چھوڑنا نہیں چاہتا۔ سوچتا ہوں کہ میں بھی تو اب مجبور ہوں۔ ہمارے "عوامی پولیٹیکل فرنٹ" کو دوسری سیاسی پارٹیوں کی طرح غیر قانونی قرار دیا جا چکا ہے۔ اخبار بند ہو چکا ہے۔ دفتر سربمہر ہو گیا ہے۔ کنونیر اور صدر اس سوچ میں دیوانے ہو رہے ہیں کہ "مال" فوجی حکام کے حوالے کر دیں اور گلو خلاصی کرائیں یا کہیں زیر زمین کر لیں لیکن ہمارا کنونیر آستین میں جن سانپوں کو پال رہا ہے ان کے ڈنک کا خطرہ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اسے مجھ پر بھی بھروسہ نہیں۔ میں اس کا پروپیگنڈہ سیکرٹری تھا مگر تھا تو میں پیشہ ور بلیک میلر ہی۔ صرف میں ہی نہیں اکثر چھوٹی بڑی سیاسی پارٹیوں کے عہدیدار بلیک میلر تھے کسی نہ کسی وضع قطع کے۔ وہ لمبے لمبے جلوس اور "فدایانِ اسلام کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے" جلسے۔ کوئی مجھ سے پوچھے کہ ان میں فدایانِ اسلام کی تعداد کتنی تھی اور کرائے کے "عوام" کتنے تھے۔

میں اب ملک کے سابق سیاستدانوں کو ببانگ بلند کہتا ہوں کہ آئینہ نہ دیکھنا۔ اپنے عکس کا سامنا نہ کرنا ورنہ جل بھن کر راکھ ہو جاؤ گے تمہارے ضمیر تمہیں ایسی سزا دیں گے جس کا تمہارے بنائے ہوئے توانین اور دستور میں کہیں بھی ذکر نہیں آتا۔

لیکن یہ باتیں میرے لئے اب محض بیکار ہیں میرے لئے تو اب نیلوفر مسئلہ بن گئی ہے اور اس مسئلے نے ایسے پچھتاوے کو جنم دیا ہے کہ میں اپنے آپ اور ماضی میں الجھ گیا ہوں۔ ذہن نے حقائق سے بھاگ کر دور بیتے ہوئے دنوں میں جا پناہ ڈھونڈی ہے مستقبل کی کیا سوچوں!

بارہ برس پہلے کی بات ہے —

نیلوفر، مسرت اور ثریا میری کلاس فیلو تھیں۔ تینوں امیر گھرانے کی لڑکیاں تھیں۔ شوخ اور شیطان۔ اپنی اپنی جگہ تینوں سارے کالج کے لوفر لڑکوں کی توجہ کا مرکز بن گئیں۔ ان کے ماں باپ کا شاید ان پر کوئی اثر اور قابو نہیں تھا۔ ہر پک نِک اور پارٹی میں وہ حاضر ہوتی تھیں۔ کلاس سے اکثر غیر حاضر اور کالج سے باہر کی زندگی کے سراب میں گم۔

ہم اس وقت سیکنڈ ایئر میں تھے۔ اس وقت میری دلچسپی گلنار کے ساتھ تھی، پر نظر نیلوفر پر بھی رہتی تھی جیسا کہ اوباش فطرت لوگوں کا وطیرہ ہے، مگر یہ تینوں سہیلیاں ذرہ بھر لفٹ نہیں دیتی تھیں۔ لائل پور، سرگودھا اور کاموکے کے چند ایک جاگیرداروں کے لڑکوں نے روپے پیسے نت نئے سوٹوں اور سینڈلوں سے انہیں اپنے جال میں آخر کار پھنسا ہی لیا۔ وہ میرے گروہ کے کسی لڑکے کے ساتھ آنکھ بھی نہیں ملاتی تھیں۔ میں تمام ہتھکنڈے استعمال کر کے ہار گیا تھا۔ آخر ایک ہی صورت قابلِ قبول نظر آئی کہ انہیں نظر انداز کر دیا جائے۔ چنانچہ کھٹے انگوروں کو نظر انداز کر دیا گیا۔ لیکن نیلوفر از سرِ نو میرے اعصاب پر سوار ہو گئی۔ وہ اس طرح کہ انہی دنوں میرے والد صاحب، دو مکان لاہور میں، لاہور کے گرد و نواح میں ایک سو ایکڑ زمین اور ستر ہزار روپیہ نقد میرے نام منتقل کر کے فوت ہو گئے۔ تین چار روز بعد گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہو گئیں۔ ان تین چار دنوں میں ہی سارے کالج میں میرے والد کی وفات کی خبر کم اور میرے دولتمند اور صاحبِ جائداد ہو جانے کی خبر زیادہ پھیل گئی۔ موت زندگی تو انسان کے ساتھ لگی ہوئی ہے، مجھے خود زیادہ دلچسپی دولت اور جائداد کے ساتھ تھی۔

میں نے دو ہزار روپیہ بنک سے نکلوایا اور کتابیں گھر میں پھینک کراچی کا رُخ کیا۔ والدین کا میں اکیلا بچہ تھا۔ بیس برس کی عمر میں بھی ماں مجھے بچہ (اور اب یتیم بچہ) سمجھ کر مجھ پر جان نثار کرتی تھی۔ اس نے مجھے کراچی جانے سے نہ روکا۔ اگر وہ روکتی بھی تو میں رک تھوڑے ہی جاتا۔ میں نے خیبر میل کے ایئر کنڈیشنڈ ڈبے میں سیٹ بک کرائی تھی۔ اس سے پہلے میں نے لمبے سے لمبا سفر گجرات تک کیا تھا وہ بھی تھرڈ کلاس میں۔ والد صاحب اس سے اوپر سفر کرنے کی اجازت نہیں دیا کرتے تھے۔ میرا کل جیب خرچ ساٹھ روپے ماہوار تھا جس میں جھوٹ کی برکت سے چالیس پچاس کا اضافہ کر لیا کرتا تھا۔ اب میں باپ کی دولت کا واحد مالک تھا کسی طرف سے کوئی پابندی نہیں تھی۔ چنانچہ میں نے زندگی میں پہلی بار ایئر کنڈیشنڈ ڈبے میں سفر کیا۔ اس چمکدار اور دلکش ڈبے کا نام ریلوے والوں نے "نیلوفر" رکھ کر مجھ پر یہ ظلم کیا کہ نیلوفر کی یاد اور اسے حاصل کرنے کا خبط دماغ میں تازہ ہو گیا۔ اس لئے نہیں کہ میں نیلوفر کو بھول گیا تھا اور ریلوے والوں کی "نیلوفر" دیکھ کر وہ یاد آ گئی تھی بلکہ اس لئے کہ یہ ڈبہ نیلوفر کی طرح ہی خوبصورت اور روح افزا تھا۔ اس ڈبے میں فردوسی کشش اور آسودگی تھی۔ چلچلاتی گرمی میں یہ کس قدر ٹھنڈا تھا اور اس کے فرش کے نیچے رکھے ہوئے برف کے بلاک نیلوفر کے دل کی ہی طرح یخ تھے۔ میں کراچی تک نیلوفر کی صحت افزا خصوصیات میں محو رہا اور دل میں مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ نیلوفر کو حاصل کر کے ہی رہوں گا۔ میں نے کراچی میں ایک ہوٹل میں ایک ماہ رہ کر وہ رنگ اور رستہ دیکھا کہ جن کے قصے کہانیاں (جو مجھے الف لیلیٰ کی داستانیں معلوم ہوتی تھیں) سنا کرتا تھا۔ ہوٹل کے بیروں نے دو ہزار روپے میں مجھے ان کہانیوں کے تمام کرداروں سے روشناس کرایا۔ اور زمین دوز دنیا کی وہ بہشت بھی دکھائی تھی جسے صرف روپے پیسے والے ہی دیکھ سکتے ہیں۔ (روپیہ کسی دوسرے کے خون پسینے کی کمائی کا ہونا ضروری ہے) یہ خصوصیت کراچی ہی کی نہیں ہے ہر نو دولتے شہر کی ہو جاتی ہے۔

میں "نیلوفر" میں ہی واپس لاہور گیا تھا۔ لاہور جا کر معلوم ہوا تھا کہ والدہ کو فوت ہوئے پندرہ روز ہو گئے ہیں۔ اس وقت مجھے یاد آیا تھا کہ کراچی ایک رات بیرے نے مجھے ایک تار دیا تھا لیکن میں وسکی کے نشے میں اس قدر مدہوش تھا کہ تار بغیر پڑھے کہیں پھینک دیا تھا۔ کالج کھلا تو میں نیلوفر کا دل جیتنے کے ارادے سے نئے حوصلے سے لیس ہو کر کالج گیا تھا۔ راستے میں سائیکل پر میں کراچی کے بیروں اور زیر زمین دنیا کے دو تین ماہرین کے بتلائے ہوئے ہتھکنڈوں کو ازبر کرتا رہا تھا اور دل ہی دل میں ریہرسل کرتا رہا تھا لیکن ایسی کوئی ضرورت پیش نہ آئی۔ میں جونہی سٹینڈ پر سائیکل رکھ کر برآمدے میں داخل ہوا تو نیلوفر اور ثریا نے میرا اس طرح استقبال کیا کہ میں نے اپنے آپ کو ایک بار پھر کراچی کی اندھی گلیوں میں محسوس کیا تھا۔ خصوصاً نیلوفر میرے ساتھ اس طرح بے تکلفی (بلکہ بے حجابی) سے پیش آ رہی تھی کہ جیسے میرا اور اس کا بچپن کا ساتھ رہا ہے اور وہ صرف میرے لئے ہی زندہ ہے۔

اور ثریا اس ڈرامہ میں سائڈ رول ادا کرتی رہی۔

پھر وقت بہت تیزی سے گذرنے لگا۔ میرے ماں باپ کا روپیہ وقت سے زیادہ تیز رفتار سے ختم ہونے لگا۔ فورتھ ایئر میں پہنچے تو میری آدھی زمین فروخت ہو چکی تھی۔ لائل پور، سرگودھا اور کاموںکے کے جاگیرداروں کے بیٹے ہمارے ساتھ دو تین جھڑپیں لے کر ہار چکے تھے۔

ایک دن اڑتے اڑتے سنا کہ امتحان سر پر آ رہا ہے۔ کالج کی فضا اور ماحول میں ہنگامہ اور سرگرمی شروع ہو گئی تھی۔ ہر طرف گھبراہٹ اور بھاگ دوڑ تھی لیکن ہم اس خطرے سے آزاد تھے۔ اپنی خواہش اور نیلوفر کی سکیم کے مطابق میں نے ساری زمین بیچ ڈالی۔ ایک مکان کرائے پر رہنے دیا دوسرا نیلام کیا اور امتحان سے ایک روز پہلے ہم دونوں "دور اس دنیا میں جہاں اور کوئی نہ ہو" اور جہاں محبت کرنے والے دو دلوں پر کوئی پابندی نہیں ہوتی چپکے سے روانہ ہو گئے۔ ہم جیسے نو فردوں کی یہی زندگی ہوتی ہے۔ خیر۔ یہ دنیا کراچی میں آباد تھی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ میرا تو دنیا میں کوئی نہ تھا مجھے کون تلاش کرتا۔ سوچتا ہوں کہ نیلوفر کو بھی کسی نے تلاش نہ کیا حالانکہ اس کی فیشن پرست ماں زندہ تھی اور اس کے تین مغرب زدہ بھائی (گھر میں بھی پنجابی لہجے میں انگریزی بولنے والے) زندہ تھے۔

دس سال گذر گئے ہیں ہمیں کوئی تلاش کرنے نہیں آیا۔ ان دس برسوں میں کیا کیا انقلاب آئے۔ وقت نے کیا کیا رنگ بدلے۔ میں نے ان پر کبھی غور نہیں کیا تھا۔ آج بلجیم کا یہ آئینہ مجھے اپنے وطن کی وہ ساری باتیں سنا رہا ہے اور وہ سارے رنگ دکھا رہا ہے کہ جنہوں نے ملک میں

ایک عظیم اور تاریخی انقلاب کو جنم دیا ہے۔ یہ سارے رنگ مل ملا کر گہرا سانولا رنگ بن کر میرے چہرے پر چھا گئے ہیں۔ میں چند اور چہرے بھی دیکھ آیا ہوں جو ایک ماہ پہلے تک شراب اور غازے سے لال سرخ تھے اب ان کا رنگ گہرا سانولا بھی نہیں رہا۔ سب رنگ اڑ گئے ہیں۔

ایک وہ وقت کہ میں کراچی کی زیر زمین دنیا کو اجنبی کی حیثیت سے دیکھنے آیا تھا اور دو ہزار روپیہ نقد ادا کر کے الف لیلیٰ کی بستی کا ذرہ ذرہ دیکھا تھا پھر وہ وقت بھی آیا کہ میں اور نیلوفر اسی دنیا کا (جس کی ہما ہمی اور گہما گہمی راتوں کو بیدار ہوتی ہے) جزو بن گئے اور اجنبی لوگوں نے ہمیں نقد روپیہ ادا کر کے دیکھا۔ نیلوفر کے واسطے میں کہاں کہاں تک نہیں پہنچا۔ حاجی نور دین کی شادی گانا رے کرا کے میں نے اس سے نقد روپیہ ہی نہیں لیا تھا بلکہ حج کے بہانے سونا سمگل کرنے کے ہنر سیکھے۔ سیاستدانوں کو نیلوفر کی جھلک دکھا کر سیاسی بلیک میلنگ سیکھی! نیلوفر تو کالج میں ہی ماہر ہو چکی تھی۔ دل لے کے بھلا دینے والے کھیل کی وہ پرانی کھلاڑی تھی۔ اس نے مجھے اونچی سوسائٹی سے متعارف کرایا اور سیاسی میدان میں میرے لئے نمایاں جگہ اور اہمیت پیدا کی۔ اس اونچی سوسائٹی کا نیچ پن مجھے آج اس آئینے میں دکھائی دے رہا ہے اور اس آئینے میں مجھے وہ بوڑھا پروفیسر بھی نظر آرہا ہے جس کی دس سال پہلے کی مضحکہ خیز مسکراہٹ آج زہرخند بن کر میرا منہ چڑا رہی ہے۔

کاش! وقت ایک بار پھر دس بارہ برس پیچھے لوٹ جائے۔ میں ان کتابوں اور لیکچروں میں جذب ہو کے رہ جاؤں میں اس بوڑھے پروفیسر کے سامنے سجدے کروں اور اسے کہوں "میرے بزرگ، استاد! مجھے وہ راہ دکھا جو تو نے اختر بیگ کو دکھائی تھی۔ وہ بھی تو میرا کلاس فیلو تھا اور آج وہ کراچی ہائی کورٹ کا مانا ہوا ایڈووکیٹ ہے۔ مجھے فضل کریم بنا دے جس کی غربت کو اور پیوند لگی ہوئی اچکن کو دیکھ کر ہم اسے یتیم خانے کا مہتمم کہا کرتے تھے لیکن آج وہ مرچنٹ نیوی میں انجینئرنگ آفیسر ہے۔ مجھے اس اونچی شلوار والے رشید کی طرح بنا دے جو تیرے سامنے اگلی سیٹ پر بدھو بن کے بیٹھا رہتا تھا آج وہ فوج کی ایجوکیشن برانچ میں میجر ہے ۔۔۔۔۔ میرے بزرگ استاد! میں نے جن کتابوں کو کبھی نہیں کھولا تھا مجھے آج یاد آرہی ہیں لیکن وقت انہیں اپنے ساتھ اڑا کے لے گیا ہے۔ وہ مجھ سے بہت دور چلی گئی ہیں۔ اتنی دور جتنا میں ان سے دور رہا کرتا تھا۔ اور دیکھ! میں آئینے میں اپنے آپ کا سامنا کر رہا ہوں۔ آ اور مجھے بتا کہ اس سے اگلا سبق کیا ہے۔ میں سخت اذیت میں ہوں۔ ضمیر گناہوں کے بوجھ تلے کچلا جا رہا ہے۔ میں نے شوکت، خورشید، اشرف، ارشد، رضوی اور سرگودھے اور لائل پور کے چوہدریوں کے ساتھ مل کر اپنی شخصیت میں جو بیج بوئے تھے وہ آج خاردار جھاڑیوں کی طرح اگ کر میرا کردار بن گئے ہیں اور میرے ہی دل و دماغ کو لہولہان کر رہے ہیں۔ اور جو لڑکے ہماری بدمعاشیوں اور مذاق کا شکار رہتے تھے وہ آج مطمئن اور مسرور زندگیاں گذار رہے ہیں بس

اوہ خدا! ۔۔۔۔۔ نیلوفر دوسرے کمرے میں رو رہی ہے۔ اس نے ابھی ابھی ایسا فقرہ کہہ دیا ہے کہ مجھ جیسا ماہر بلیک میلر اور سیاسی غنڈوں کا سرغنہ بھی گھبرا گیا ہے۔ سوچ اور فکر مفلوج ہو گئی ہے اور میں اپنے آپ میں الجھ گیا ہوں۔ میں کل حاجی نور دین کی کوٹھی پہ گیا تھا۔ چھ سات ماہ سے وہ نیلوفر کے ساتھ شادی کرنے کے لئے پیچھے پڑا ہوا تھا اور میں ٹال رہا تھا۔ اس لئے نہیں کہ گلنار کو ملا کر اس کی چار بیویاں موجود تھیں بلکہ اسلئے کہ میں نیلوفر کی "سرپرستی" کسی قیمت پر کسی کو سونپنا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ نیلوفر تو میرے سیاسی بلکہ معاشی مسائل کا بھی حل ہے۔ دس سال سے وہ میرے مسائل حل کر رہی ہے۔ کل میں حاجی کی کوٹھی پر اسے یہ کہنے گیا تھا کہ وہ نیلوفر سے شادی کرلے لیکن وہ ہاتھ جوڑ کر بولا "خدا کے لئے آئندہ یہاں نہ آنا۔ سی آئی ڈی سائے کی طرح منڈلاتی رہتی ہے اور مارشل لاء والوں کی کالی فہرست میں میرا نام درج ہونے والا ہے۔ یہ لو تین چار سو روپیہ لے جاؤ اور پھر یہاں نہ آنا۔ اور سنو!" اس نے مجھے قریب بلا کر کان میں کہا۔ "نیلوفر کی کہیں اور شادی کرا دو ہمارے اندر باہر کے بھید جانتی ہے۔ آخر کیا بھروسہ" اور میں نے آگ بگولا ہو کر سو سو کے چاروں نوٹ اس کے سامنے پھینک کر کہا۔ "تم آخر نور دین چپڑاسی ہونا ۔۔" اور میں اس کی کوٹھی سے کہ جس کی اونچی پیشانی پر دو گز لمبی اور ایک گز چوڑی مرمر کی سل پر ھٰذا مِن فضلِ ربّی لکھا ہوا ہے، نکل آیا۔

عوامی پولیٹیکل فرنٹ کا کنوینر ہمارے مدد کرنے سے قاصر ہے۔ وہ روپوش ہو چکا ہے۔ ہمارے اخبار کے ایڈیٹر نے اخبار بند کر کے آئس کریم بیچنی شروع کر دی ہے۔ پہلے وہ یہی کاروبار کرتا تھا۔ دوسرے بڑے بڑے عظیم اور "اعظم" لیڈر کونوں کھدروں میں چھپ گئے ہیں۔ نیلوفر اپنے طور پر ہر جگہ اور ہر کوٹھی میں گھوم آئی ہے۔ سرکاری کوٹھیاں خالی پڑی ہیں۔ جہاں لمبی لمبی کاریں کھڑی رہتی تھیں وہاں اب جیپیں اور تھری ٹن ٹرک کھڑے ہیں۔

وہ سابق وزیر جو نیلوفر کے ساتھ شادی کرنے کو ہمارے لئے کیا کچھ نہیں کرتا تھا اور جو نیلوفر کو اکثر باکس بے بے جایا کرتا تھا اب اس کے ساتھ بات کرتے ہوئے بھی گھبرا رہا ہے۔ نیلوفر اب اپنے مستقبل کی طرف سے مایوس ہو چکی ہے اور اب ہم دونوں ڈوبتی کشتی میں ہچکولے کھا رہے ہیں۔

ہوٹل کے منیجر نے صبح کہا تھا۔ "اگر بل ادا کر سکتے ہو تو کر دو نہیں تو دونوں کمرے رات تک خالی کر دو، میں بل بخش دوں گا ...... اور ستو سٹر! سات اکتوبر تک تم شہزادے تھے اور اب اشتہاری مجرم ہو اور کنگال۔ بھاگ جاؤ ورنہ ......" بوڑھے منیجر کی آواز میں غصّہ نہیں تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ تھی جسے میں بڑی اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ میں مسکرانے کی آٹھ قسمیں جانتا ہوں۔ بلیک میلنگ کا یہ سبق سب سے زیادہ مشکل اور اہم ہے۔

میں آج پچھلے پہر سر ہاتھوں میں تھامے راہ فرار ڈھونڈ رہا تھا کہ نیلوفر نے کہا "میں نے تمہیں بتایا نہیں کہ میں دو فلم پروڈیوسروں کے پاس بھی گئی تھی۔ وہ فی الحال ایکسٹرا پہ لینے پر رضا مند ہوئے ہیں لیکن ......" وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ میں نے اس کی طرف ہاری ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔ اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے اسے جھوٹی تسلیاں دیں تو وہ لاوارث بھولے بھٹکے بچے کی طرح بولی "کل شام سے کالج یاد آ رہا ہے۔ اگر ہم بھی اچھے انسانوں کی طرح کچھ دماغ میں بٹھا لیتے تو ......" وہ پھر چپ ہو گئی۔ اس کی پھٹی پھٹی نم آلود نگاہیں فرش پر بچھی ہوئی دری پہ اس طرح بھٹکنے لگیں جیسے اس گذرے ہوئے، بلکہ اپنے ہاتھوں ضائع کئے ہوئے دور کے لمحات تلاش کر رہی ہوں جب ہم اندھے تھے۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ مجھ پر رقت طاری ہو رہی تھی۔ میں اسے کوئی اور جھوٹی تسلی دینے ہی والا تھا کہ اس نے میری طرف دیکھا۔ میں اسے دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس کا چہرہ جو ہمیشہ سفیدی مائل گلابی رہتا تھا لال سرخ ہو گیا تھا۔ خون آنکھوں کی راہ بہا چاہتا تھا۔ وہ بلا جھجک بولی۔

"اگر ہم اپنے آپ کو فریب نہیں دے رہے تو آؤ ہم ایک دوسرے کو بتا دیں کہ ہم دونوں کسی اچھے معاشرہ کے معزز افراد نہیں ہیں۔ ہم جرائم پیشہ ہیں، ہمارا چلن داغدار ہے۔ لاہور جانے کی نہ سوچنا، بے شک وہاں تمہارا ایک مکان ہے اور میرے بھائی بھی زندہ ہیں لیکن اب ہم اس دنیا میں لوٹ کے نہیں جا سکیں گے۔ وہاں اب ہمیں کوئی شریف انسان قبول نہیں کرے گا۔ ہم دونوں جو کچھ کرتے رہے ہیں وہ ہم سے پوشیدہ نہیں رہنا چاہیئے ...... سوچ کیا رہے ہو؟ اس مسئلے کا آسان ساحل یہی ہے کہ میں جس غلاظت میں پھنس چکی ہوں اس میں ہمیشہ کے لئے پھنسی رہوں۔ اب میری اصلاح ناممکن ہے۔"

"نیلو!" میں گھبرا اٹھا۔ "کیا کہہ رہی ہو تم؟"

"کوئی نئی بات تو نہیں کہی میں نے ...... وہ سیاستداں مر گئے ہیں جنہیں تم جیسے بلیک میلروں اور مجھ جیسی بری لڑکیوں کی ضرورت رہتی تھی۔ تم نے قوم کو دھوکے دیئے ہیں، آؤ ہم اپنے آپ کو دھوکہ نہ دیں۔ آؤ ہم وہی بن جائیں جو ہماری سرشت بن چکی ہے۔ دنیا کو دھوکہ کب تک دیتے رہیں گے۔"

نیلوفر دوسرے کمرے میں لیٹی ہوئی ہے اور میں جانے کیوں آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا اور جانے کب تک کھڑا رہوں گا۔ اور جانے کب تک کھڑا رہ سکوں گا۔ اف، یہ ظالم آئینے کیوں جھوٹ نہیں بولتے! ◆

★

افسانہ:

شیرا نمبردار

سید غلام الثقلین نقوی

مغرب کی نماز پڑھ چکنے کے بعد جب بابا شیرا مسجد سے نکلا تو آسمان دُھل کر نکھر آیا تھا، مدھم تارے ڈھلک رہے تھے اور بے داغ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ گیلی مٹی سے ابھی تک سوندھی سوندھی خوشبو اُٹھ رہی تھی۔ ہوا کے جھونکے نمی سے بوجھل تھے اور اُن میں دُھلے ہوئے پتوں اور جڑی بوٹیوں کی تازہ باس بھی رچی ہوئی تھی۔ یہ اساڑھ کے مہینے کی پہلی بارش تھی اور دھوپ سے تپتے ہوئے کھیتوں کے سخت سینے نرم پڑ چکے تھے اور ہل کا پھالا مٹی کے نم ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ کل ایک کھیت میں ہل چلا کر "دتر" دبانا اور اسے جوار کی کاشت کے لئے تیار کرنا ضروری تھا۔ اس لئے ابھی سے جا کر بہادر کو اس سنہری موقعے سے پورا پورا فائدہ اُٹھانے کے لئے تیار کرنا بھی لازمی تھا۔

دالان میں بھی چاندنی کا نکھار اپنے پورے جوبن پر تھا۔ بابا شیرے نے دالان میں قدم رکھا تو کھنکار کر گویا بہو رانی کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ بہو چاٹی میں دودھ ڈال کر کھٹا لگا رہی تھی۔ اس نے جلدی سے دوپٹہ سر پر کر لیا اور کام کاج چھوڑ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ دالان کے ایک کونے میں چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ بابا شیرے نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا "بہو رانی؟"

"جی!"

"بہادر کنوئیں سے آچکا ہے؟"

"نہیں بابا۔ میرو دودھ لے کر آیا تھا۔"

"بہادر کہاں گیا؟"

"میرو نے بتایا تھا کہ آج مبارک پور کے چودھری کے بیٹے کی شادی تھی۔ وہاں کوئی لوہار گانے کے لئے آیا ہوا ہے۔"

"اوہ! جوانی کتنی بے سمجھ ہوتی ہے۔ کل صبح ایک پورے کھیت میں ہل چلانا تھا۔ اب وہ آدھی رات گذرنے پر آئے گا اور پھر تھکے ہوئے بیل کی طرح گر پڑے گا۔ خراٹے بھرتا رہے گا اور کل سورج نکلے اُٹھے گا ...." اور بابا شیرے نے بڑبڑا کر بات ختم کر دی اور اتنے میں بہو نے چنگیر اور دودھ کا لبالب بھرا ہوا ایک پیالہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ پہلا لقمہ دودھ میں بھگوتے ہوئے بابا شیرے نے کہا "ننھا لو سو گیا ہے کیا؟"۔ شیماں جو دالان کے دوسرے کونے میں بیٹھی ننھے کو سلانے کے لئے تھپک رہی تھی، چہک کر بولی "بابا! بس سونے ہی والا ہے۔"

"اچھا!" بابا شیرا مطمئن ہو گیا اور روٹی دودھ میں بھگو بھگو کر کھانے لگا۔

★

جوانی میں وہ صرف شیرا تھا۔ جب داڑھی میں سفید بال آئے تو بھی شیرا ہی رہا۔ اگرچہ وہ اپنے چھوٹے سے گاؤں کا نمبردار تھا اور ایک علیحدہ کنوئیں کا مالک جس کے ساتھ دس بارہ گھماؤں زمین تھی۔ اب لوگوں نے اس کے نام کے ساتھ "بابا" کا اضافہ بھی کر لیا تھا۔ اکثر لوگ اُسے شیرا نمبردار کہہ کر پکارتے تھے۔

بابا شیرا جوانی میں بڑے کلّے ٹھلّے کا گبھرو تھا۔ اب بھی اس کی چال میں بانکپن تھا اور آنکھوں میں چمک۔ چونکہ عمر کے ساتھ ساتھ وقار کا اضافہ بھی ہو گیا تھا، اس لئے اب وہ اکڑ کر نہ چلتا۔ سر پر بڑا سا پگڑ، لٹھے کا دُھلا ہوا سفید تہمد، سردیوں میں کھیس کی بکل، گرمیوں میں کندھے پر ململ کا صافہ، چہرے پر اطمینان کی جھلک، گذری ہوئی زندگی گویا طمانیت کی ایک مستقل مسکراہٹ بن کر رنگ رنگ میں رچ گئی تھی۔ سہ پہر کی

لہ مئی

نرم نرم دھوپ اور آنے والی شام کے خنک سایوں کا امتزاج۔ جیسے زندگی نے اس کے ساتھ اور اس نے زندگی کے ساتھ سمجھوتہ کرلیا۔

زندگی کو اس نے کبھی طوفانِ باد و باراں نہ سمجھا تھا کہ زناٹے کے چند تھپیڑوں کے ساتھ گذر جاتا ہے۔ وہ اُن لوگوں میں سے نہیں تھا جو طوفانوں سے کھیل کر تھک جاتے ہیں اور پھر زندگی میں اُن کے لئے کسی دل بستگی کا سامان باقی نہیں رہتا۔ زندگی پر اس اعتماد نے صرف ایک بار شکست کھائی تھی جب موت کے سرد سائے نے اس کے گھر میں قدم رکھا تھا۔ بہادر کی ماں نے تیسرا بچہ جنا تو گویا تخلیق کا فرض تو ادا ہوگیا لیکن موت کے بلاوے کے ساتھ اس وقت بہادر کی مَسیں بھی نہیں بھیگی تھیں اور شیماں تو ابھی سات آٹھ سال کی بچی تھی۔ یہ صدمہ اتنا اچانک، اتنا شدید اور غیر متوقع تھا کہ شیرا دنوں تک اس منوں مٹی کے نیچے دب کر رہ گیا جس کے نیچے بہادر کی ماں کا جسم تھا۔ کھلے کھیت، لہلہاتی ہوئی فصلیں، مٹی کی مہک، شگوفوں کی باس، کنوئیں کی روں روں اور پرندوں کے چہچہے قبر کی تاریک گہرائیوں میں دفن ہوگئے تو زندگی رنگ و بو سے محروم ہوگئی اور اس نے گھر کے آنگن میں پناہ لے لی۔ میرو اکیلا کھیتی باڑی کا کام کرتا رہا اور میرو کی بیوی شیرے کے گھر آکر صبح شام سرد چولھے میں آگ روشن کرتی رہی۔ بہادر کبھی کبھار کنوئیں پر چلا جاتا اور شیماں باپ کے گھٹنے سے لگ کر روتی رہتی اور ماں کو یاد کرتی رہتی۔

پھر ایک دن میرو نے کہا "نمبردار! مرنے والوں کے ساتھ لوگ مر تو نہیں جایا کرتے۔ میں تیرے گھر کا پرانا نمکخوار ہوں، پر کھیتی سائیں سیتی کبھی کبھی تو کنوئیں پر آجایا کر۔ دیکھ تو سہی آج کل کیا رنگ ہیں کھیتوں کے۔"

"میرو!" نمبردار نے بجھی بجھی آواز میں کہا "جس سے زندگی کی بہار تھی، وہ ہی نہ رہی تو جینے کا کیا مزا؟"

"واہ نمبردار! جس کے گھر میں دو ہیرے ہوں، وہ بے آس کیوں ہو۔ دیکھ تیرا بہادرا اب جوان ہوچکا ہے۔ کل اس نے دوپہر تک میرے ساتھ ہل چلایا۔ مجال ہے تھکنے کا نام بھی لیا ہو اور پھر جیبے، اور نیلے نے کل بہادر کے سامنے وہ وہ چُنگیاں بھریں کہ گورے، اور لاکھے کے پسینے چھوٹ گئے۔"

"سچ؟" شیرے نمبردار نے گھٹنوں پر سے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تو میں جھوٹ بول رہا ہوں نمبردارا؟" میرو نے چمک کر کہا۔

"بہادر!" شیرے نے اونچی آواز میں پکارا۔

"بابا کیا بات ہے؟"

"ادھر تو آ"

بہادر سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ شیرے نے نظر اٹھا کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ بہادرے کی ماں کے مرنے کے بعد اس نے آج تک کبھی اُسے اس نگاہ سے نہیں دیکھا تھا جو اس کے سارے سراپا کا جائزہ لے رہی تھی۔ یہ نگاہ جو بہادرے کے پٹھوں اور مچھلیوں پر سے تیرتی ہوئی جا رہی تھی۔ بہادر کا جسم ابھی محنت کی کٹھالی میں ڈھل کر لوہے اور فولاد کا نہیں بنا تھا لیکن مچھلیاں ابھر رہی تھیں اور پٹھے تن رہے تھے اور اوپر کے ہونٹ پر روئیں سیاہ پڑ رہے تھے۔ اس نے چارپائی سے اٹھتے ہوئے کہا "او بہادرے! تو تو جوان ہوگیا ہے۔ واہ بھئی واہ! میں بھی کتنا نادان تھا کہ مرنے والی کے ساتھ مر گیا۔" اور شیرے کا جسم تن گیا۔ وہ بڑھاپا جو موت کے سایوں کے ساتھ رینگ کر آیا تھا ایک دم لوٹ گیا۔ اور اس کی آنکھوں میں جوانی کی توتوں نے پھر جنم لے لیا۔ اس نے جذبات سے گلوگیر آواز میں کہا "میرو! چل ہم اپنے کھیتوں کی بہار دیکھ آئیں۔"

کنوئیں کے ساتھ کے کھیتوں میں دور دور تک گندم کے شگوفے پھوٹ رہے تھے اور وہ کھیت جو آج سے چند دن پہلے خالی میدان تھے مخمل کے فرش سے ڈھکے ہوئے تھے۔ اُن کے درمیان پگڈنڈیاں چمک رہی تھیں اور ننھے ننھے پودوں پر اوس کے قطرے موتیوں کی طرح ڈھلک رہے تھے۔ نرم نرم دھوپ میں پگھلا ہوا سونا تھا اور درختوں کے سبز پتوں کی اوٹ میں پرندے تھے جو چہچہا رہے تھے اور چہچہا کر اڑ رہے تھے۔ زندگی ہوا کے نرم ہلکوروں کے ساتھ بیدار ہوئی اور ایک اُڑان لے کر اُس کے جسم اور روح میں رچ گئی۔ اُس نے پھر مٹی کے پیار میں اپنے دُکھ کا مداوا ڈھونڈھ لیا، مٹی جو ماں ہے اور جس کی کوکھ سے انسان نے جنم لیا اور جس کی گود میں پروان چڑھا، کبھی لہلہاتی فصلوں کا روپ دھار لیتی ہے۔ کبھی چٹیل میدانوں کا کبھی اس پر چلچلاتی

دھوپ گرد و غبار کے بادل اٹھاتی ہے اور کبھی ابرِ رحمت کے چند چھینٹے وہ سوندھی سوندھی خوشبو اڑاتے ہیں جو مٹی کے ساتھ مخصوص ہے۔

لیکن اس کے باوجود جب سارے دن کے کام کاج سے تھک کر شیرا نمبردار گھر لوٹتا تو اُجڑا اجڑا گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ وہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر ڈیوڑھی میں قدم رکھتا۔ آنگن مُردہ اور بے حس نظر آتا، بہادر حقہ بھر کر لاتا، میرو کی بیوی دودھ بڑھاتی اور کھانا لگا کر چلی جاتی تو شیرا کہتا "بہادر بیٹا! شیاں ذرا سیانی ہوتی تو گھر کا سارا کام خود سنبھال لیتی۔ گھر عورت کے بغیر کہاں سنورتا ہے؟ تیری ماں زندہ تھی تو گھر میں کتنی چہل پہل تھی، پر تقدیر سے کون لڑ سکتا ہے۔ اچھا!" اور یہ کمی بھی جلد پوری ہو گئی۔ دو سال بعد بہادر کی مونچھیں کالی ہوئیں تو شیرے نمبردار نے اس کا بیاہ رچا دیا۔ بہو ابھی الھڑ مٹیار تھی۔ پندرہ سولہ سال کی نادان لڑکی لیکن وہ عورت تھی اور اس کے آنے پر شیرے نمبردار کے گھر میں سرِ شام دیا جلنے لگا اور آہستہ آہستہ یہ نادان لڑکی عورت بن کر گھر کا اُجالا بن گئی اور شیرا زندگی سے پھر مطمئن ہو گیا۔

★

صبح سویرے شیرا کنوئیں پر پہنچ گیا۔

میرو نے بیلوں کی گردنوں میں جوا ڈالا اور ہل کے پھالے دھرتی کا سینہ پھاڑنے لگے۔ زمین نرم اور گیلی تھی، اس لئے ہل گویا تیرتے ہوئے چلے جا رہے تھے اور صبح اوس سے بھیگی ہوئی تھی اور ہوا کے ہلکوروں میں امرت رس تھا۔ سورج کی پہلی کرن پھوٹی تو آدھے کھیت میں سیدھی لکیریں ابھری ہوئی نظر آئیں۔ گیلی مٹی کے بھربھرے ڈھیلے ہر طرف بکھرے ہوئے تھے، آسمان دھلا ہوا تھا اور سورج کی کرنوں نے بہت جلد گرم اور تیز ہونا شروع کر دیا جب ہل کا رُخ سورج کی طرف ہوتا تو کرنوں کی تیز چمک آنکھوں کو چندھیا دیتی۔ شیرا ایک ہاتھ ہل کی ہتھی پر اور دوسرا آنکھوں پر رکھ لیتا۔ پھر کسی نے ہتھی پہ ہاتھ رکھ دیا۔ شیرے نے کہا "بہادرے تو آ گیا؟"

"ہاں بابا" اور شیرے کا جی چاہا کہ بہادر کو تھوڑی سی گرما گرم نصیحت کر دے، ہلکی سی سرزنش، لیکن دوسرے لمحے شیرے کو یاد آ گیا کہ آدھی رات کے بعد آنگن کا دروازہ کھلا تھا اور بہادر اچوروں کی طرح اندر آیا تھا۔ بہو نے اس کا بستر پہلے سے لگا رکھا تھا۔ بہادر اچپکے سے لیٹ گیا تھا اور بابا شیرے نے ابھی کروٹ بھی نہ بدلی تھی کہ جوانی مستِ خواب ہو گئی تھی۔ "آہ جوانی کی نیند!" اور شیرے کا دل پگھل گیا۔ اس نے کہا "بہادر بیٹا! جا بیلوں کے لئے چارا کاٹ۔ تھوڑا سا کام باقی رہ گیا ہے۔"

اور پورے بیگھے میں سے صرف دو چار مرلوں میں ہل چلنا باقی تھا کہ بہو چھاہ[1] و بلا[2] لے کر آ گئی۔ کھیت کی مینڈھ پر کیکر کی چھدری چھاؤں میں بہو لسی کا مٹکا اور روٹیوں کا چھابا[2] سامنے رکھ کر بیٹھ گئی۔ میرو نے چھینبے اور تیلے اور شیرے نے لاکھے اور گورے کو چھیڑا تو دیکھتے دیکھتے پورا کھیت جُت گیا۔ بہادرے نے بیلوں کے گلوں سے جوئے اتارے اور انہیں ہانک کر کنوئیں کی طرف لے گیا۔ شیرا اور میرو کیکر کی چھاؤں تلے آ کر بیٹھ گئے۔ بہو نے مٹی کے پیالوں میں لسی انڈیلی، نمک کا ڈلا پھیرا اور چھابا ان کے سامنے بڑھا دیا۔

شیرے نمبردار نے چپڑی ہوئی روٹی کا پہلا ٹکڑا منہ میں رکھا اور ٹھنڈی چھاچھ کا ایک گھونٹ بھرا تو گویا سینے سے لے کر پیٹ تک نرم نرم خنکی بھر گئی۔ تھکا ہوا جسم راحت کے احساس میں ڈوب ڈوب گیا تو شیرے کو محسوس ہوا کہ زندگی بڑی میٹھی شے ہے۔ اس کا ایک لمحہ بھی بیکار گیا تو سمجھو زندگی نے اپنی مٹھاس کھو دی۔

ناشتہ کر کے شیرے نے اپنے ارد گرد دیکھا۔ کنوئیں کے عین ساتھ والے کھیت میں شفتل کی سرسبز سبزیاں چمکیلی دھوپ میں زمرد کا تختہ لگ رہی تھیں اور نظروں کو ٹھنڈک اور راحت پہنچ رہی تھی اور دور دور تک خالی کھیت تھے جن میں گندم کے ٹھنٹھ قطار در قطار افق کی چمکیلی گولائیوں سے جا ملے تھے۔ ان پر تیز دھوپ کے پیچ در پیچ ہیولے تیر رہے تھے۔ کہیں کہیں ننھے ننھے بگولے اُٹھ رہے تھے جو ہمیں دُھول اور تنکوں کو ایک چکر دے کر دھوپ میں گم ہو رہے تھے اور درخت سبز عمامے پہنے سر نہوڑائے کسی گہری سوچ میں غرق تھے۔ بگولوں کی تکونیں اُن کی پھننگوں سے چھوتیں تو شاخیں جھومتیں اور

---

[1] صبح کا ناشتہ   [2] چھوٹی چنگیر

پتے لرز جاتے اور جب بگولا گذر جاتا تو یہ لرزشیں بھر ساون کے گہرے سینے میں دفن ہو جاتیں۔

★

اسی کیکر کی چھدری چھاؤں میں بیٹھے بیٹھے نکھن اور ٹھنڈی تپھا پھکے گھونٹوں کے ساتھ زندگی بنتی اور بیتتی رہی۔ کھیتوں میں ہل چلتے رہے اور پھالے دھرتی کا سینہ چیر کر اسے بیجوں سے بھرتے رہے۔ کنوئیں کی رول رول کے ساتھ چمکیلے پانی کی ایک نقرئی لکیر نغمۂ مسلسل کی طرح دھرتی کے سینے میں زندگی کا ارتعاش بنتی رہی۔ شگوفے پھوٹتے اور پروان چڑھ کر لہلہاتے کھیتوں کا روپ دھارتے رہے۔ بادل آتے رہے اور پیاسے کھیتوں کو سیراب کر کے فضاؤں میں تحلیل ہو جاتے رہے۔ سبزے کی چادریں بچھتیں اور سنہری خوشوں سے دامن بھرتی رہیں۔ پھر یہی سنہری خوشے کھلیانوں میں جمع ہوتے رہے اور چلچلاتی دھوپ میں سونا بھوسے سے جدا ہوتا رہا۔ بیٹھے نمبردار کے گھر میں اناج کے انبار لگتے رہے اور بہادر کا جسم محنت کی کٹھالی میں ڈھل کر لوہے اور فولاد کا بن گیا، مچھلیاں ابھر آئیں، ہاتھ کھردرے اور انگلیاں لوہے کی سلاخوں کی طرح مضبوط ہو گئیں۔ مسیں سیاہ ہوئیں اور ننھی ننھی مونچھوں کی نوکیں نکل آئیں۔ کبھی یہ مونچھیں پسینے میں بھیگ کر نہین دھول سے اٹ جاتیں، کبھی انہیں تیل سے چپڑا جاتا تو ان کی سیاہی کوے کے پروں کی طرح چمک اٹھتی۔ بہو تین بچوں کی ماں بن گئی۔ اب وہ بھرے گھر کی رانی تھی۔ اس کی ہر ادا میں وقار تھا اور ایک ایک بات دانا عورتوں کی طرح جچی تلی تھی۔

انہیں لہلہاتے کھیتوں کے ساتھ شیماں کا بچپن بھی گذر گیا۔ شگوفہ پروان چڑھا اور شاداب پودا بن گیا تو شیرے کی آنکھ نے پہلی بار اسے شعور کی نگاہ سے دیکھا اور اس کا رواں رواں کانپ گیا۔ اس نے زیر لب کہا "اس کی ماں کا سایہ سر پر ہوتا تو مجھے کس بات کا ڈر تھا ؟" اور سوتے جاگتے شیماں کی الھڑ جوانی شیرے کے خوابوں کا بھوت بن گئی۔ وہ کھیتوں میں کام کرتا ہوتا تو دھیان شیماں کی طرف لگا رہتا۔ شیماں ذرا مٹک کر چلتی تو شیرا بول اٹھتا "شیماں بیٹی! شریف گھروں کی لڑکیوں کی چال میں ٹھہراؤ ہوتا ہے۔ وہ چلتی ہیں تو نظریں نیچی رکھتی ہیں، ان کے پاؤں کی چاپ کبھی نہیں آتی، وہ بولتی ہیں تو ان کی آواز دوسرے کان تک نہیں پہنچ پاتی۔" اور شیماں کا دوپٹہ ذرا سرک جاتا تو شیرا کھنکار کر کہتا "شیماں بیٹی!" اور شیماں سراسیمہ ہو کر ادھر ادھر دیکھتی اور سمجھ نہ پاتی تو شیرا دھیمی آواز میں کہتا "شیماں بیٹی! مجھے باپ ہو کر وہ فرض ادا کرنا پڑتا ہے جو تیری ماں کا تھا۔ مرنے والی آج زندہ ہوتی تو مجھے کیا پروا تھی؟ دیکھ تیری اوڑھنی کا پلو سر سے ڈھلک گیا ہے۔"

چند دنوں تک شیماں اس ٹوکم ٹاک کو لاشعوری طور پر برداشت کرتی رہی۔ آہستہ آہستہ اس کے نسائی غرور نے جاگ کر کہا "شیماں! بابا کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ ہر بات پر تجھے ٹوکتا ہے۔" اور اس کے بعد نا تجربہ جوانی سراسیمہ ہو کر پھر کوئی ننھی سی غلطی کر گئی تو شیرے کی ٹوک زہر میں بجھی ہوئی محسوس ہوئی اور جوانی کے حساس دل میں نشتر کی طرح اتر گئی اور شیماں کی آنکھوں میں خود بخود آنسو آ گئے۔ یہ آنسو اس کے گالوں پر گر کر جلتے ہوئے پانی کی بہتی ہوئی دھارا بن گئے اور شیماں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "بھابی! ایک بات پوچھوں؟"

"کہو شیماں۔"

"بابا کچھ دنوں سے مجھے زہر بھری نظروں سے کیوں دیکھتے ہیں؟"

"تو جوان ہو چکی ہے نا!" بھابی نے دانا عورت کا روپ بھرتے ہوئے کہا۔

"لڑکیاں جوان ہو جائیں تو باپ اُن سے نفرت کرنے لگ جاتے ہیں؟"

"نفرت! ..... نہیں ..... ہاں ......" بھابی نے دانا تجربہ کار عورت کا چولا اتار دیا اور جوان لڑکی کا روپ دھارتے ہوئے کہا "کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ جب میں جوان ہوئی تھی تو میرے بابا بھی کچھ اسی قسم کی باتیں کرتے تھے اور ایک دن جب پگڈنڈی کے دونوں طرف اونچی گندم کے کھیت لہرا رہے تھے اور میں اکیلی ان میں سے گذر رہی تھی اور سماں اتنا پیارا تھا تو میرے ہونٹوں پر ڈھولک گیت کے دو بول آ گئے اور میں گنگناتی رہی اور میں بھول گئی کہ میں کس کے سامنے کھڑی ہوں اور بابا نے کہا تھا 'نادان لڑکی! تو اکیلی کنوئیں پر کیوں آئی؟ تیری ماں کو اتنا بھی یاد نہ رہا کہ تو جوان ہو چکی ہے اور تجھے اکیلا بھیج دیا' اور میں نے چمک کر کہا تھا 'کیوں بابا؟ راستے میں کوئی جن بھوت ہیں کہ مجھے کھا جائیں گے۔ میں تو ہر روز کنوئیں پر انہی کھیتوں میں سے گذر کر آتی ہوں' اور بابا نے بجھی بجھی آواز میں کہا تھا 'نہیں بیٹی جن بھوت تو نہیں، پر اب تو جوان ہو چکی ہے' اور مجھے بڑی دیر بعد سمجھ میں آیا تھا کہ بابا کیا کہتے تھے اور جوان لڑکیوں سے باپ نفرت کیوں کرتے ہیں۔"

شیماں کے آنسو پھر بہہ نکلے۔ اور وہ چند دنوں تک جوانی کی اُلھڑ آگ کو بجھاتی رہی، گلیوں میں سے دَبے پاؤں گذرتی رہی اور اس کے پاؤں کی چاپ بھی نہ آتی۔ اس کی نظریں خطِ مستقیم سے اِدھر اُدھر نہ ہوتیں۔ ایک دن جب وہ گلی میں سے گذر رہی تھی اور اس کے سر پہ اوڑھنی کا پلّو اس طرح جما ہوا تھا کہ اس کے کانوں کی لَوئیں تک بھی ننگی نہ تھیں اور اس کی پیشانی ڈھکی ہوئی تھی اور آنکھیں بھی اوڑھنی کے پیچھے چھپ کر رہ گئی تھیں کہ کانوں نے کچھ سنا، کیونکہ زبان پر تالے ہوں اور آنکھیں بھی نہ دیکھتی ہوں تو کان پھر بھی کچھ نہ کچھ سن لیتے ہیں۔

"شیماں"

وہ تڑپ گئی۔ اس نے اوڑھنی کی اوٹ سے جھانکا اور اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پکارنے والے کو اس نے کئی بار پہلے بھی دیکھا تھا۔ یہ اُسی کی برادری کے ایک چوہدری کا بیٹا تھا لیکن آج اس کی پکار میں ایک عجیب اسرار تھا اور یہ اسرار اس کے کانوں کے راستے بجلی کی رَو بن کر دَر آیا۔ اس کے اعصاب جھنجھنا اٹھے اور اس کی پیشانی پسینے سے تر ہو گئی۔ اس نے تیز تیز قدم بڑھائے لیکن یہ آواز، یہ پکار نغموں کا مسلسل دھارا بن کر اس کی روح کو تھرتھراتی رہی اور جب اس نے آنگن میں قدم رکھا تو وہ خود ایک تھرتھراتا ہوا نغمہ بن گئی تھی۔ برسات میں گھنے پتوں میں چھپی ہوئی کوئل کی کوک، جس میں آگ بھی ہوتی ہے اور چھما چھم برستی ہوئی بوندوں کا ارتعاش بھی۔

بھابی نے کہا۔ "شیماں! آج گھبرائی گھبرائی سی ہو؟"

"بھابی! آج گلی کے نکڑ پر اُس نے میرا نام لے کر پکارا۔"

"کس نے؟" بھابی کا منہ غنچے کی طرح سکڑ گیا۔

"وہی .... حیدر ....." اور بھابی نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "اسی لئے تو بابا تجھے ٹوکتے تھے کہ یہ آواز تیرے کانوں میں نہ پڑے۔"

"اب کیا ہوگا؟" شیماں نے گھبرا کر کہا۔

"میں کیا جانوں؟" بھابی نے جھک کر کہا۔ "پر اب تُو باہر نہ جایا کر۔ میں تجھ پر کڑا پہرہ رکھوں گی۔"

اور شیماں کے حواس پر مُردنی چھا گئی، نغمہ مر گیا۔ کوئل کی کوک پاتال میں اتر گئی اور شیماں کے پاؤں لڑکھڑا گئے۔ تب بھابی اچانک کھلکھلا کر ہنسی جیسے کالے اور گہرے بادلوں میں چاند نکل آیا ہو۔

"بھابی!" شیماں نے گویا دوبارہ زندہ ہو کر کہا۔ پر بھابی نے کوئی جواب نہ دیا اور کام کاج میں لگ گئی۔

اور ایک دن شیماں کے آنگن میں برادری کے سرکردہ لوگ جمع ہوئے۔ بابا شیرا اُس دن بڑا متفکر تھا، بھادر بھی کچھ کم سنجیدہ نہیں تھا اور بھابی بڑی مصروف تھی۔ شیماں کو کوٹھڑی میں دبکی پڑی تھی اور باہر محفل میں باتیں ہو رہی تھیں پر شیماں کے پلّے کچھ نہ پڑا۔ جب لوگ ایک ایک کر کے چلے گئے تو شیماں ڈرتے ڈرتے باہر آئی۔ اس نے بھابی سے پوچھا۔ "بھابی! آج اتنے سارے لوگ اکٹھے کیوں ہوئے تھے؟"

"میں کیا جانوں؟" بھابی نے بے تعلق بنتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھابی!" شیماں نے ٹھنک کر کہا۔ "بتاؤ بھی۔" اور بھابی نے اٹھ کر شیماں کے سر پہ ہاتھ رکھا اور کہا۔ "ضرور پوچھوگی؟"

"ہاں!" شیماں نے جواب دیا۔

"تو پھر کلیجہ تھام لو۔" شیماں ڈر گئی۔ بھابی کچھ لمحے چپ رہی۔ پھر شیماں نے دور، بہت دور سے آنے والی یہ آواز سنی۔

"پگلی یہ اُس پکار کا جواب تھا جو تونے گلی کی نکڑ پر سنی تھی۔"

"ہائیں" شیماں نے کہا اور اسے چکر آ گئے، زمین و آسمان گھوم گئے، آندھیاں چلیں، جھکڑ چیخے، وہ بے بس ہو کر بھابی کے گلے سے لپٹ گئی، اس کے سینے سے ایک غبار اٹھا اور آنکھوں سے چھم چھم آنسو برسے۔ بھابی نے اپنے دوپٹے کے پلّو سے اس کے آنسو پونچھے اور اس کے گال سہلائے۔

"پگلی تو رو رہی ہے پر یہ آنسو بھی تو زندگی میں صرف ایک ہی بار نصیب ہوتے ہیں۔"

بہادر نے حقہ تازہ کیا۔ کڑوے تمباکو کی ایک چلم بھری اور حقہ شیرا کے سامنے رکھ دیا۔ شیرا اس مزدور کی طرح تھکا ہوا تھا۔ جس نے مدتوں ایک بھاری بوجھ اٹھائے رکھا ہو اور اب وہ بوجھ اس کے سر پر سے اتار لیا گیا ہو۔ اس نے پہلا کش لیا اور کہا۔ "بہادر! ادھر میرے پاس آکر بیٹھ۔" بہادر پائینتی پر بیٹھ گیا تو شیرا نے بڑی شفقت سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔ "بہادر بیٹا! آج میرے سر سے ایک پہاڑ اتر گیا ہے۔ شیماں اپنے گھر چلی گئی۔" بہادر نے سر جھکا لیا۔ ہنگامہ گزر چکا تھا۔ اب گھر میں سناٹا تھا۔ اس کی مونچھیں تھرتھرائیں اور ہونٹ خم کھا گئے۔ آنکھوں کے کونے تر ہو گئے تو شیرا نے کہا۔ "بیٹیاں پرایا دھن ہوتی ہیں۔ پرائے گھر میں کب تک مہمان بن کر رہ سکتی ہیں۔ تجھے تو خوش ہونا چاہیئے تھا کہ تیرا فرض ادا ہو گیا۔"

"ہاں بابا! میں نے خود شیماں کی ڈولی کو کندھا دیا۔ میں نے خود اسے اس گھر سے نکالا جہاں ہم اتنے دنوں اکٹھے رہ کر پلے اور جوان ہوئے۔"

"واہ واہ! شیماں کونسا کالے کوسوں دور چلی گئی ہے۔ اسی گاؤں میں تو ہے، جب چاہو اُس سے مل لینا۔" بہادر نے آنکھیں پونچھ لیں۔

اور اس رات حیدر نے کہا۔ "شیماں!"

یہ وہی پکار تھی جو اس نے ایک دن گلی میں سنی تھی اور اس کی رگ رگ کانپ گئی تھی۔ کنپٹیاں جلنے لگی تھیں اور پیشانی گرم لوہے کی طرح تپ گئی تھی لیکن آج یہ پکار اس کے خون میں مل جل کر نرم رو نغمے کی مانند رواں دواں ہو گئی تھی اور اسے نیند آنے لگی تھی۔ نیند جس میں شبنم کے خنک قطروں کی بارش تھی اور زندگی کا پیار تھا۔ سبک اور خمار آلود نیند......

اس سال بہادر نے بڑی محنت سے کام کیا۔ شیماں کی شادی پر سارا جمع جتھا لگ گیا تھا۔ کچھ قرض بھی لینا پڑا تھا۔ بابا شیرے نے کہا تھا۔ "بہادر! تیری ایک ہی تو بہن ہے، اپنے دل کی حسرت نکال لے۔ پھر یہ موقع کہاں آئے گا؟" اور بہادر نے سینہ ٹھونک کر جواب دیا تھا۔ "بابا! اگر شیماں کے لئے مجھے اپنی ہڈیاں بھی بیچنا پڑیں تو میں دریغ نہیں کروں گا۔" لیکن جب ان تھک محنت، پسینے، چلچلاتی دھوپ اور کڑکڑاتی سردی کا یہ سال گزر گیا تو بہادر کا قرض ادا ہو چکا تھا۔ اور بابا شیرے کے کندھے جھک گئے تھے۔ اس کی داڑھی میں اب کالے بال خال خال ہی نظر آتے تھے۔ زندگی کی شام پڑ چکی تھی اور ابھی تک عاقبت کے لئے زادِ راہ تیار نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا۔ ایک دن اس نے بہادر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بہادر بیٹا! ساری عمر دنیا کماتے گزر گئی۔ اب کہو تو کچھ عاقبت سنوارنے کا کام بھی کر لوں۔"

"بابا!" بہادر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"بہادر، موت تو برحق ہے!"

"بابا! موت کا نام نہ لو۔" بہادر کے جسم میں تھرتھری آئی۔

"واہ بھئی واہ!" شیرے نے کہا۔ "میں نے کوئی نئی بات کی؟"

"نہیں..... پر..... ساری برکتیں تیرے دم سے ہیں۔ تو نے کنوئیں پر آنا چھوڑ دیا تو......"

"نہیں.... میں ہر روز کنوئیں پر آیا کروں گا۔ جس نے ساری عمر مٹی سے نباہ کیا، وہ اس سے جدا کیسے ہو سکتا ہے؟"

بہادر نے شیرے کی جگہ لے لی۔ ہل کا پھالا دھرتی کا سینہ چیرتا رہا، بہادر کے چہرے پر مہینوں اور سالوں کی گرمی اور سردی نے اپنے نقوش ثبت کرنے شروع کر دیئے۔ اب وہ گاؤں کا سربراہ نمبردار تھا۔ وہ بڑی سنجیدہ باتیں کرتا۔ پنچایت میں بیٹھتا تو ذمہ داریوں کا بوجھ

اس کی آنکھوں کی چمک بن جاتا اور ماہ وسال کی یہ گردش گورے اور لاکھے، چنبے اور تیلے پر بھی اپنے نقوش کاڑھ گئی۔ گورا جو ان چاروں بیلوں میں سردار تھا اب بہت زیادہ عمر رسیدہ ہو چکا تھا۔ اب وہ ان کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر نہ چل سکتا۔

ایک دن شیرے نے ہنس کر کہا۔ "بہادر! گورا بھی اب میری طرح دنیا داری سے اُکتا چکا ہے۔ اسے بھی اب اللہ اللہ کرنے کے لئے چھٹی دے دے۔" بہادر نے جلد ہی ایک نیا بیل خرید لیا۔ گورا اب تھان پر بندھا رہتا اور دوسرے بیلوں کو گدلی گدلی آنکھوں سے دیکھتا رہتا۔ اور دنیا کی بے ثباتی پر غور کرتا رہتا۔ اس کی کھال ڈھیلی پڑ کر جھرّیوں کی صورت میں لٹک آئی تھی۔ اس کی پسلیاں نکل آئی تھیں اور بڑھاپے کا نکما پن اس کی ٹانگوں کی لڑکھڑاہٹ بن گیا تھا۔ بابا شیرے نے سوچا کہ گورا چند دنوں کا مہمان ہے۔ اس لئے اس نے کہا۔ "بہادر بیٹا! گورے کے چارے پانی کا خیال رکھنا۔ بیس سال کا ساتھی ہے۔"

"بابا! مجھے تو ہر قسم کا خیال ہے، پر تیرا گورا کچھ زیادہ ہی فقیر بن گیا ہے۔ کبھی جی چاہے تو دو چار منہ مار لیتا ہے!"

بابا شیرے نے ہنس کر گورے کی گردن پر ہاتھ پھیرا۔ گورے نے گدلی گدلی نگاہوں سے شیرے کو دیکھا اور اسے پہچان لیا۔ آخر بیس سال کا ساتھی تھا۔ بابا شیرے نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کھلے کھیتوں کی طرف دیکھا جہاں کئی، باجرے اور جوار کے پودے پلٹن باندھے کھڑے تھے۔ برسات کا موسم گذر رہا تھا اور اپنے پیچھے سرسبزیاں چھوڑ رہا تھا۔ بابا شیرے نے سوچا۔ "کتنی رُتیں بیت گئیں، کتنی برساتیں آئیں اور پیاسی زمین کی پیاس بجھا کر اپنا دامن خالی کر گئیں۔ زندگی میں کتنے اُلٹ پھیر ہیں۔ اب گورا بھی ساتھ چھوڑ رہا ہے!" اس خیال سے اُسے جھرجھری سی آئی، جیسے ہوا کا ایک یخ بستہ جھونکا سر سے پاؤں تک سن سے گذر گیا ہو۔ "میں موت سے ڈر گیا۔" شیرے نے سوچا۔ "واہ! میں بھی کتنے تھوڑے دل کا ہوں۔"

گورا روز بروز لاغر ہوتا چلا گیا اور بابا شیرا ہر صبح یہ وہم لئے ہوئے کنوئیں پر آتا کہ گورا رات کی تاریکیوں میں اپنا سفر ختم کر چکا ہوگا لیکن ہر صبح گورے کو ناند پر کھڑے دیکھ کر اسے اطمینان بھی ہوتا اور حیرت بھی۔ اچانک ایک دن گورے کی بجائے چنبے نے چارا چھوڑ دیا۔ بابا شیرا جب کنوئیں پر آیا تو بہادر نے گھبرا کر کہا۔ "بابا! آج چنبا چارے کو منہ نہیں لگا رہا۔" شیرے نے ٹھوکر مار کر چنبے کو کھڑا کیا تو اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ شیرا بھی گھبرا گیا۔ اس نے کہا۔ "بہادر بیٹا! چنبے کا پیٹ پھولا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ میرو سے کہو۔ گاؤں سے گڑ، اجوائن اور سرسوں کا تیل لے آئے۔ اگر آم کا پرانا اچار مل جائے تو بڑا اچھا ہے۔" میرو بھاگا بھاگا گاؤں گیا اور گڑ، اجوائن اور سرسوں کا تیل لے آیا تو شیرے نے مرکّب بنا کر اسے بانس کی ایک نال میں بھرا۔ بہادر نے چنبے کا منہ کھولا اور شیرے نے مرکّب اُس کے منہ میں انڈیل دیا۔ شیرا سارا دن کنوئیں پر رہا۔ شام تک چنبے کو مرکّب کی کئی خوراکیں پلائی گئیں اور آم کا اچار چٹایا گیا۔ شیرا شام کو گھر جانے لگا تو اس نے کہا۔ "بہادرے! آج رات تو کنوئیں پر رہ جا چنبے کو پیٹ اپھارا ہے، رات دو تین بار جاگ کر دوائی پلا دینا اور ہاں......" شیرے نے رک کر کہا۔ "فکر کی کوئی بات نہیں۔ صبح تک چنبا بھلا چنگا ہو جائے گا۔"

لیکن شیرے کو رات بھر نیند نہ آئی۔ علی الصبح وہ اذان کے بلاوے پر مسجد گیا۔ اور نماز پڑھنے کے فوراً بعد کنوئیں پر پہنچ گیا۔ بہادر اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ شیرے نے دُور سے ہی بھانپ لیا کہ رات چنبے نے دم توڑ دیا ہے۔ اس نے بہادر کے پاس آ کر کہا۔ "بہادر بیٹا! چنبا مر گیا ہے؟"

"ہاں بابا!" اور بہادر کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔

"واہ بہادرے! ایک چنبے کے مرنے پر تو اتنا غم کر رہا ہے۔ خدا زندگی دے تو چنبے سے بھی اچھا بیل خرید لیں گے۔" بابا شیرا کہنے کو تو یہ کہہ گیا پر اُس کی آنکھوں کے سامنے گھُپ اندھیرا چھا گیا۔ وہ تھان کی طرف بڑھا۔ چنبا ایک طرف بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بے نور تھیں اور اس کا پیٹ غبارے کی طرح پھولا ہوا تھا۔ گورا دوسرے کھونٹے پر بندھا مُردہ چنبے کو گھور رہا تھا اور اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ بابا شیرا، چنبے تک پہنچتے پہنچتے خود بھی لڑکھڑا گیا۔ میرو نے آگے بڑھ کر سہارا دیا اور کہا۔ "نمبردارا! تو اتنا تھڑ دلا تو نہیں تھا۔"

"نہیں میرو، مجھے چنبے کے مرنے کا افسوس نہیں۔ ایسے نقصان ہوتے ہی رہتے ہیں، پر میں سوچ رہا تھا کہ مرنا تو گورے کو تھا اور دم توڑ دیا چنبے نے!"

"کس کو پتہ موت کس کو پہلے آئے گی؟"

"ہاں میرو...... پر گورے کا تو وقت اخیر تھا اور چنبے نے ابھی جوانی کا میٹھا میوہ بھی سیر ہو کر نہ کھلیا تھا" شیرے نے کہا اور اُس کا جی بیٹھ گیا۔ موت کا اندھا شکاری نشانہ کہیں باندھتا ہے اور لگ کسی اور کو جاتا ہے۔ چنبا تو ابھی بھر جوان تھا، اس کی رگ رگ میں بجلیاں تھیں۔ مُٹھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتا تھا، ذرا چھیڑو تو ہل کو لے کر ہوا ہو جاتا، ذرا سے لمس سے اُس کی حسّاس جلد پر تھرتھری طاری ہو جاتی، ملائم اور چکنی کھال پر پانی کی ایک بوند بھی نہ ٹھہر پاتی اور چنبے کو موت یوں اُچک لے گئی جیسے وہ ننھا سا مولا ہو جسے شکرا ایک جھپٹ میں دبوچ لے جاتا ہے اور سوچتے سوچتے شیرے کی جھریاں گہری ہو گئیں، آنکھوں کی چمک پر غم کی راکھ چھا گئی اور نہ جانے کیوں وہ دو چار روز تک کنوئیں پر آنے اور بہادر کو آنکھ جما کر دیکھنے کی جرأت نہ کرسکا۔ اور گورا ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ گیا' پر سانس کی دھونکنی چلتی رہی۔ قدرت کے کھیل نیارے ہیں۔ ان کا راز کس نے پایا ہے۔

بابا شیرے نے گورے کی طرح یکدم دنیا سے جی اُٹھا لیا! گھر سے مسجد اور مسجد سے گھر۔ وہ کبھی کبھار کنوئیں پر آتا بھی تو مہمانوں کی طرح۔ ایک نظر کھیتی پر ڈال لیتا اور بس۔ بہادر البتّہ نئی فصل بونے سے پہلے یا کوئی سودا طے کرتے وقت اس سے ضرور مشورہ لے لیتا۔

چنبے کی موت کے بعد سارے گاؤں کی قسمت گویا شیرے اور بہادر کے گھر اٹھ آئی۔ بہادر نے مٹی پر ہاتھ ڈالا تو وہ بھی سونا بن گئی اور دنیا کی ساری دولتیں، برکتیں، اور نعمتیں اس کے قدموں پر نچھاور ہو جاتی رہیں۔ لوگ کہتے: "یارو! بڑے اچنبھے کی بات ہے۔ رحمت کی برکھا ہماری زمینوں پر بھی ہوتی ہے، پر بہادر کی کھیتی میں تو سونا بکھیر جاتی ہے۔"

"یہ اپنی اپنی نیّت کی بات ہے۔" کوئی کسان کہتا۔

"نیت نہیں قسمت کہو۔ قسمت کے بھی کئی روپ ہیں۔ یہ عورت کی طرح کسی پر مہربان ہونے پر آتی ہے تو اپنا سب کچھ لٹا دیتی ہے۔"

بابا شیرا مطمئن قلب لیکر گاؤں میں پھرتا۔ دولت اور عزّت کی زیادتی نے اس کے پندار کو انگیخت نہ کی تھی۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ عاجز اور نرم دل ہو گیا تھا۔ دوسروں کی مصیبت پر سب سے پہلے ہمدردی کا تحفہ لیکر پہنچتا لیکن یہ اطمینان' یہ مسکراہٹیں' یہ زندگی جس میں بہار کے موسم کی نرم نرم دھوپ تھی، شیرے کے دل پر بوجھ بننے لگی۔ روشنیوں کے اس نرم رو سیلاب میں سے کبھی کبھار اندھیرے کی کوئی اندھی کرن بھی اپنی جھلک دکھلا جاتی، شیرے کے جسم میں تھرتھری آجاتی اور روئیں روئیں سے ٹھنڈا پسینہ پھوٹ بہتا جیسے اس نے کسی بل کھاتے ہوئے سانپ کی گیلی جلد کو چھو لیا ہو اور شیرے نمبردار نے آئے دن صدقہ دینا اور کھانا پکا کر غریبوں میں بانٹنا شروع کر دیا لیکن ان دیکھے بھوت کا یہ ٹھنڈا ہاتھ اس کے سینے سے دور نہ ہوا اور شیرے نے دعا مانگی: "مولا! میں نے آج تک دنیا کی اتنی خواہش نہیں کی تھی۔ میرا سب کچھ لے لے پر مجھے وہ اطمینان لوٹا دے جو مدّتوں سے میرا ساتھی تھا!"

★

سردیوں کی ایک رات کو بابا شیرا عشا کی نماز سے فارغ ہو کر آیا ہی تھا اور گھر میں ابھی تک دیا جل رہا تھا اور بہو نے رات کے کام کاج سے فارغ ہو کر ڈیوڑھی کا دروازہ بھی بند نہیں کیا تھا کہ بہادر کنوئیں سے لوٹ آیا۔ شیرے نے پوچھا "بہادر! آج تو نے کہا تھا کہ گندم کو پانی لگانا ہے اور تجھے رات کو کنوئیں پر ہی رہنا تھا، پر تو چلا کیوں آیا؟"

"بابا! مجھے سردی لگ رہی ہے۔ میری پسلی میں درد ہے۔"

"پسلی میں درد ہے؟" بابا شیرے کی آواز کپکپا گئی۔

"کوئی فکر کی بات نہیں بابا۔ ابھی لحاف اوڑھ کر لیٹوں گا، ذرا پسینہ آئے گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔"





لکڑی پر کندہ کاری (پنجاب: ۱۹ویں صدی)

سوار اور سمند

(ہمارے فن میں عکاسی)

شہسوار چغتائی (اکبر اعظم: مختصر مغلیہ تصویر)

جدید روغنی تصویر (عمل: شاکر علی)

''گھوڑے: شہر پناہ کے سامنے''



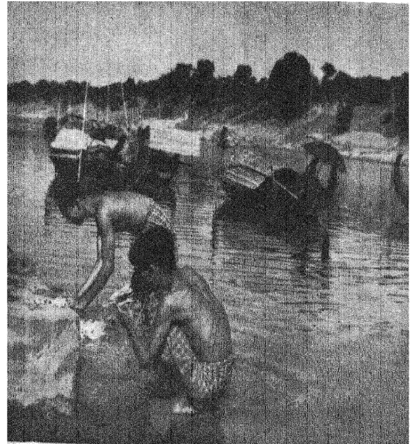


مشرقی پاکستان

خوشنما رہگذر (چاٹگام)

بانس: کاغذسازی کے لئے ہمارا انمول سرمایہ
(دریائے کرنا فلی)





زندگی: (لب دریا)

"پر تیری پسلی میں درد ہے۔" بابا شیرے نے کہا "پسلی میں درد!" اور وہ گھبرا کر گھر سے باہر نکل گیا۔

بہادر نے لحاف میں لپٹتے ہوئے اپنی بیوی سے کہا "بابا کو چھوٹی سی بات کا فکر لگ جاتا ہے۔ میرا جسم گرم ہوا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

لیکن لحاف میں لپٹ کر بھی اس کے درد کو کوئی افاقہ نہ ہوا۔ اس کی بیوی نے چولھے میں سے کوئلے نکال کر مٹی کی انگیٹھی میں ڈالے اور انگیٹھی اس کی چارپائی کے پاس رکھ دی لیکن بہادر کو پہلے سے بھی زیادہ سردی محسوس ہونے لگی اور درد کے مارے سانس لینا بھی دوبھر ہو گیا۔ کچھ عرصے کے بعد بابا شیرا گاؤں کے بوڑھے حکیم کو لے کر آ گیا۔ حکیم نے بہادر کی نبض پر ہاتھ رکھا اور پھر کچھ کہے بغیر چلا گیا۔ دس پندرہ منٹوں کے بعد وہ تین پڑیاں لے کر آ گیا۔ اس نے کہا "یہ بارہ سنگھے کے سینگ کا کشتہ ہے۔ بڑی اکسیر شے ہے۔ تھوڑا سا دودھ تو گرم کر دو۔" دودھ گرم ہوا تو بہادر کو ایک پڑیا کھلا دی گئی۔ حکیم نے کہا "دوسری پڑیا آدھی رات کو دے دینا۔ میں علی الصبح آؤں گا۔ نمبردار! کوئی فکر کی بات نہیں۔"

پڑیا کھانے کے کچھ دیر بعد بہادر کو کچھ افاقہ محسوس ہوا اور اس کی آنکھ لگ گئی۔ بابا شیرے نے کہا "بہو! میرا مصلّے بچھا دو۔ دوا کے ساتھ دعا بھی ہو تو اللہ ضرور رحم کرتا ہے۔" آدھی رات کو دوسری پڑیا کھلائی گئی اور بہو تھک کر سو گئی لیکن بابا شیرا جاگتا رہا۔ وہ گڑگڑا کر دعا مانگتا رہا۔ نفل پڑھتا رہا اور بار بار بہادر کی پیشانی پر دم کرتا رہا لیکن اس کے دل پر سے بوجھ نہ اترا۔ غم اور مصیبت کے منحوس سایوں کا بادل گہرا ہو کر سنگِ خارا کی چٹان بن گیا جو اس کے دل کا گلا گھونٹ رہی تھی۔

اور صبح نے آتے آتے بہت دیر لگا دی۔

جب صبح کا ستارا نکلا تو بابا شیرا گھبرا کر گھر سے باہر نکل آیا۔ اس نے اپنے داماد حیدر کے دروازے پر دستک دی۔ حیدر آنکھیں ملتا ہوا باہر آیا تو شیرے نے کہا "حیدر بیٹا! بہادر کو رات سے پسلی میں درد ہے۔ تو شہر چلا جا اور کسی ڈاکٹر کو لے آ۔ دیکھ روپے پیسے کے معاملے میں کنجوسی نہ کرنا۔ ڈاکٹر کو منہ مانگی فیس دینا۔"

"پر بابا ابھی تو بہت سویرا ہے اور سردی بھی کڑاکے کی پڑ رہی ہے۔"

"حیدر!" شیرے نے کہا "تو رات کے اندھیرے اور سردی سے ڈرتا ہے اور میری جان پر بنی ہوئی ہے۔ تو ابھی باپ نہیں بنا تجھے کیا پتہ؟"

حیدر نے کھیس کی بکل ماری اور لاٹھی ہاتھ میں لے کر شہر کی طرف نکل گیا جو وہاں سے دس کوس دور تھا۔

بابا شیرے نے صبح کی نماز امید و بیم کی کشمکش کے درمیان پڑھی۔ جب وہ مسجد سے واپس آیا تو بہو رو رہی تھی۔ اس نے بہو کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا "واہ بہو رانی! دل چھوٹا کیوں کر رہی ہو؟ میرا جی کہتا ہے کہ بہادر کے سر سے بلا ٹل گئی ہے۔" لیکن اس کے دل نے بغاوت کرتے ہوئے کہا "واہ شیرے! تو مجھے دھوکہ دینے کی کوشش کر رہا ہے۔" بہادر کا درد بڑھ گیا تھا۔ وہ کراہ رہا تھا۔ "بہادر بیٹا! صبر کر۔ کڑیل جوان تو اتنے درد کو ماں کا دودھ سمجھ کر پی جاتے ہیں۔" بہادر نے ہونٹ بھینچ لئے۔ درد کی ٹیسیں آنکھوں کا کرب بن گئیں۔ کرب جو بپھری ہوئی موجوں کی طرح صبر کے بند سے رہ رہ کر ٹکراتا، بہادر کی پتلیاں پھیل جاتیں، حواس تنکوں کی طرح منتشر ہو جاتے اور بھینچے ہوئے ہونٹ کھلتے اور جوانی کا ضبط دبی سی کراہ کے ساتھ ہتھیار ڈال دیتا۔

ڈاکٹر بہت دیر سے پہنچا۔ اس وقت تک بہادر کی آنکھوں سے ہوش و حواس رخصت ہو چکے تھے۔ اس کی پتلیاں یوں گھومتیں جیسے وہ اپنے گرد و پیش کو حسرت کی نگاہ سے دیکھ رہی ہوں۔ اس کی زبان میں ژولیدگی بھی آ گئی تھی۔ ڈاکٹر نے ٹیکہ کیا، دوا پلائی، چند خوراکیں دوائی کی اور ہدایات دیں تو بابا شیرے نے پوچھا "ڈاکٹر صاحب! بہادر اچھا تو ہو جائے گا نا؟"

ڈاکٹر نے کہا "کیوں نہیں؟ جوان آدمی کے اندر مقابلے کی قوت زیادہ ہوتی ہے۔ بیماری کا حملہ بے شک شدید ہے لیکن مریض طاقتور ہے۔" بابا شیرے نے سر نیہوڑا کر سوچا "جب جوان آدمی پر بیماری حملہ کرتی ہے تو وہ اپنی پوری طاقت سے لیس ہو کر آتی ہے۔" اور اس نے مایوسی کی شدت میں اپنے ہونٹ کاٹ لئے۔ گاؤں سے باہر آ کر ڈاکٹر نے حیدر سے کہا "مریض کو سرسام ہو گیا ہے۔ اگر کل صبح تک..... میرا مطلب ہے..... یعنی..... کل صبح سویرے مجھے لینے کے لئے آ جانا۔"

★

لیکن دوسری صبح ہڈیوں کا پنجر گورا، ابھی تک تھان پر کھڑا تھا۔ اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں اور سانس کی دھونکنی چل رہی تھی۔ چنبا جس کی رگ

رگ میں جوانی کی آگ تھی، دیئے کے کمزور شعلے کی طرح موت کے ایک سانس سے ہی پھڑپھڑا کر بجھ گیا تھا!

شیرے نمبردار نے جو ساٹھ سال سے دنیا کے گرم سرد کا مردانہ وار مقابلہ کر رہا تھا۔ یک لخت ہتھیار ڈال دیئے۔ اس نے جوانی کی بجھی ہوئی راکھ کو دیکھا تو اسے اپنے لڑکھڑاتے ہوئے بڑھاپے پر غصہ آگیا۔ غصہ جو اچانک غم کے تندریلوں پر حاوی ہو گیا تھا، بپھری ہوئی موج کی طرح ابھرا اور اس کی آنکھوں کی مایوس راکھ میں دوزخ کی دہکتی ہوئی آگ کا شعلہ بن گیا تھا۔ اس نے غصے سے چیخ کر کہا "لوگو! اتم گورے کا گلا کیوں نہیں گھونٹ دیتے جس کا منحوس بڑھاپا چھینے کی جوانی کو کھا گیا!" اس کے ہاتھ بڑھاپے کے گلے کی طرف لپکے۔ اس نے بڑھاپے کے نحیف و نزار گلے کو اس زور سے گھونٹا کہ ہاتھوں کی رگیں ابھر آئیں اور پیشانی کی ایک ایک سلوٹ، ایک ایک جھرّی ابھری اور تنی اور پھر ہاتھوں کی گرفت خود بخود ڈھیلی پڑ گئی اور...... ان لوگوں نے لپک کر بڑھاپے کو تھام لیا جو جوانی کی آگ کو سرد ہونے سے نہ بچا سکے تھے۔

★

اس شام ایک قبر پر کھڑے ہو کر، جس پر نئی نئی مٹی پڑی تھی، شیرے نے کہا "حیدر! یہ قبر شیرے نمبردار کی ہے نا!" حیدر نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ "بہادر! جب مبارک پور سے لوٹ کر آئے تو اسے کہنا کہ اس پر ایک مٹھی خاک کی ضرور ڈال دے۔ تم اسے منا لاؤ گے نا!"

"ہاں! ہاں!" حیدر نے گلے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ شیرے نے بڑبڑا کر کہا "بہادر روٹھ گیا ہے۔ پر وہ جا بھی کہاں سکتا ہے! آخر اسی گھر میں لوٹ کر آئے گا۔"

★

لیکن روٹھا ہوا بہادر لوٹ کر نہ آیا!

شیرے کے گھر میں خاک اڑنے لگی۔ وفادار میر دکنویں پر تندہی سے کام کرتا لیکن اکیلا آدمی سارا کام نپٹا نہ سکتا تو کہتا "نجانے نمبردار کو کیا ہو گیا ہے!" اور جب وہ گاؤں آتا، تو بہادر کے تین بچوں کو کھیلنے کودتے دیکھ کر سوچتا "جس کے گھر میں تین لال ہوں، وہ دنیا سے منہ کیوں موڑے؟"۔ شیرے نے بہادر کا بہت انتظار کیا۔ وہ بہادر کو ڈھونڈھنے کے لئے ہر روز مبارک پور جاتا اس کے سر پہ نہ پگڑی ہوتی نہ پاؤں میں جوتا۔ سر اور ڈاڑھی کے بالوں میں خاک جم گئی تھی۔ وہ ہر روز شام کو بہو سے پوچھتا "ابھی بہادر نہیں آیا بہو؟"

"نہیں تو" بہو کہتی اور منہ موڑ کر چپکے سے دو آنسو بہا لیتی اور شیماں اٹھ کر اندر چلی جاتی تاکہ خوب دل کی بھڑاس نکال سکے۔ "جوانی کتنی بے سمجھ ہوتی ہے۔ کل صبح ایک پورے کھیت میں ہل چلانا تھا۔ اب وہ آدھی رات گذرنے پر آئے گا اور پھر تھکے ہوئے بیل کی طرح گر پڑے گا اور خراٹے بھرتا رہے گا۔ صبح سورج نکلے اٹھے گا۔" شیرا بڑبڑاتا ہوا چارپائی پر لیٹ جاتا۔ آدھی رات بھی گذر جاتی اور بہادر نہ آتا تو شیرا مایوس ہو کر تارے گننے لگتا۔

★

آخر تین ماہ بعد شیماں کو اپنے سسرال جانا پڑا تو بہو نے میکے سے اپنی ماں کو بلا لیا۔ بہو کی ماں نے گھر کا ابتر حال دیکھا تو رو پڑی "بیٹی! تجھے یہ گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہوگا!"

"ہاں ماں!"

"پھر کچھ دنوں کے لئے میرے ساتھ چلی چلو۔"

"پر میرے پیچھے بابا کا کیا حال ہوگا!"

"شیماں کو بلا لو۔"

"شیماں آج ہی سسرال گئی ہے۔"

ماں چپ ہو گئی۔ اتنے میں شیرا بھی باہر سے آگیا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں، کرتہ پھٹا ہوا تھا، ننگے پاؤں زخمی تھے۔ اس نے آتے ہی پوچھا "بہو بیٹی! بہادر آ گیا؟"

"نہیں تو۔" بہو نے منہ پھیر کر ماں کو دیکھا۔ بہو کی ماں پہلے اس بات کا مطلب نہ پا سکی۔ پھر اس نے بیٹی کے چہرے کو دیکھا اور وہ بے اختیار رو پڑی۔ اس نے کہا "نمبردارا! تو نے یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟"

"بہادر چور وٹھ گیا ہے تو کیا ہوا! اس کی نشانیاں تیرے پاس ہیں۔"

شیرے نے چارپائی پر گرتے ہوئے کہا "بہادر بیٹا! تو کب لوٹ کر آئے گا! اب تو میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک چکا ہوں۔"

نانی نے دو دہتوں کو آگے بڑھایا۔ شیرے نے پہلے انہیں گھور کر دیکھا۔ پھر دیے کی ہلکی سی روشنی میں انہیں پہچان لیا اور ان کے سروں پر ہاتھ پھیرا۔ سمدھن کے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے تو شیرے نے پوچھا "بہن تو کیوں رہی ہے؟"

"نمبردارا!" سمدھن نے شیرے کے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا "تجھے معلوم نہیں میں کیوں روتی ہوں؟"

"نہیں"

"تو سن" سمدھن نے اپنے عزم کی تمام قوتوں کو مجتمع کرتے ہوئے کہا "بہادر اب لوٹ کر نہ آئے گا۔ وہ وہاں چلا گیا ہے جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔"

"ہائیں!" شیرے نے تڑپ کر کہا "بہادر لوٹ کر نہیں آئے گا؟"

"چوہدری!" سمدھن نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا "بہادر لوٹ کر نہیں آئے گا۔ تیرا یہی حال رہا تو بہادر کی یہ نشانیاں، یہ ننھی سی کلیاں بھی مرجھا کر رہ جائیں گی۔" شیرا سر جھکا کر سوچنے لگا۔ سمدھن نے موقع کو غنیمت جانا اور کہا "نمبردارا! تیرے سوا ان کا کون ہے؟ تو نے ان کو سہارا نہ دیا تو یہ موتی خاک میں مل جائیں گے۔ چوہدری ہوش میں آ۔ لوگ مرنے والوں کے ساتھ مر تو نہیں جایا کرتے۔ بن آئی موت تو منہ مانگے بھی نہیں ملتی۔ کہو تو میں ان کو ساتھ لے جاؤں۔"

"کن کو؟"

"تیری بہو اور بہادر کی نشانیوں کو۔ تو بہادر کے لوٹ آنے کا انتظار کرتا رہ۔"

"نہیں ... نہیں ...." شیرے نمبردار نے چونک کر کہا "نہیں ..." اور اس کا سر جھک کر گھٹنوں سے جا لگا۔ بہو نے سہارا دے کر اسے چارپائی پر لٹا دیا۔

حقیقت کا احساس شیرے پر بجلی بن کر گرا۔ نرم رو ہوا کے ایک دھیمے جھونکے کی طرح آیا اور شیرے نے اپنے جسم کے ساتھ اپنی روح کو بھی ایک خمار آلود نیند میں پایا۔ شیرے کے انگ انگ میں جنوں کی آگ سرد ہوئی تو اس کے جسم اور دماغ سے ہر قوت یوں رخصت ہوئی جیسے جوار بھاٹا کے اترنے کے بعد ریت اور خس و خاشاک باقی رہ جاتے ہیں۔ وہ کئی دنوں تک چارپائی سے نہ اٹھ سکا اور آہستہ آہستہ راکھ میں پھر زندگی کا شرارا چمکا تو شیرا چارپائی سے اٹھا اور بہادر کی قبر پر پہنچا۔ اس نے قبر کے سرہانے بیٹھ کر پہلی بار فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھائے تو اس کے دل کا دوزخ سرد پڑ گیا جیسے کسی نے کوثر کا ایک جام لنڈھا دیا ہو۔

سمدھن نے کہا "چوہدری! کہو تو میں تیری بہو کو چند دنوں کے لئے ساتھ لے جاؤں؟"

"بہن! بہو سے پوچھ لو، پر...... یہ خالی گھر مجھے کاٹ کھانے کو نہ دوڑے گا؟"

بہو نے کہا "ماں! ابھی کیا ضروری ہے۔ ذرا بابا کی طبیعت ٹھیک ہو لے تو میں آ جاؤں گی۔" اور سمدھن مطمئن ہو کر اپنے گاؤں لوٹ گئی۔

ایک دن اساڑھ کی پہلی موسلا دھار بارش ہوئی اور جلی ہوئی مٹی سے نئی زندگی کی خوشبو اٹھی تو شیرے کے دل کا وہ پیار جاگ اٹھا جو مٹی کے خمیر سے وابستہ ہے۔ اس نے رات کو میرو سے کہا "کل صبح ایک کھیت کو جوار کی بوائی کے لئے تیار کرنا ہے۔ میں صبح سویرے کنوئیں پر پہنچ جاؤں گا۔" اور میرو کا بڑھاپا بھی خوشی سے تھر تھر کانپنے لگا۔ وہ ساتھی جو تھک ہار کر راہ میں ہی بیٹھ گیا تھا، پھر ساتھ دینے پر آمادہ ہو گیا تھا۔

سورج کی پہلی کرن پھوٹی تو چند مرلوں میں ہل چلنا باقی رہ گیا تھا۔ بھربھری گیلی مٹی کے ڈھیلے ہر طرف بکھرے ہوئے تھے، ہل کی سیدھی لکیریں

ابھری ہوئی تھیں۔ دھوپ تیز ہوئی تو شیرے نے ایک ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیا اور دوسرا ہل کی ہتھی پر۔ اور جب وہ ایک موڑ کاٹ چکا اور اس کی پیٹھ سورج کی طرف ہوئی تو اس نے بہو کو دیکھا جو صبح کا ناشتہ لے کر آ رہی تھی۔ شیرے نے کہا "میرو! بہو روٹی لے کر آ گئی ہے"۔ دونوں نے ہل چھوڑ دئیے اور کیکر کی چھدری چھدری چھاؤں تلے آ کر بیٹھ گئے۔ بہو نے پیالوں میں لسی بھری، نمک کا ڈلا پیس ڈالا، لسی اور روٹیاں ان کی طرف بڑھا دیں۔ شیرے نے پہلا لقمہ منہ میں رکھا تو وہ حلق میں اٹک گیا۔ اس نے لسی کا ایک گھونٹ بھرا تو لقمہ اتر گیا اور یہ گھونٹ زندگی کی ٹھنڈک بن کر حلق سے سینے تک پہنچ گیا اور اسے ایسا لگا جیسے اسے جلتے بلتے ریگزار میں اچانک ٹھنڈا سا سایہ مل گیا ہو۔

زندگی کے سفر میں کہیں نہ کہیں مسافر کو سایہ مل ہی جاتا ہے!

اس نے کہا "واہ بہو! آج مدتوں بعد روٹی اور لسی کا مزا آیا۔ بیٹی تو نے روٹی میں کتنا گھی ڈال دیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ آج میرو کو ایک لقمہ بھی نہ دوں"۔

"کھا لے نمبردارا! میرے حصے کا بھی کھا لے" میرو نے جھک کر کہا۔

بہو نے خالی مٹکا سر پر دھرا، اس کے اوپر چھابا رکھا اور اس پگڈنڈی پر ہو لی جو گاؤں کی طرف جاتی تھی۔ بابا شیرا اسے دیکھتا رہا۔ بہو ایک موڑ پر کماد کے ایک کھیت کی اوٹ میں چھپ گئی تو اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا "اٹھ میرو تھوڑے سے سیاڑ باقی رہ گئے ہیں"۔

"نمبردارا تو تھک گیا ہے۔ ذرا آرام کر لے"۔

"ہاں میرو! میں تھک تو گیا ہوں پر میں نے آج ہل کی ہتھی پر ہاتھ نہ رکھا اور بہو نے مڑ کر دیکھ لیا تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا"۔ اور شیرا کمر پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "میرو! ہمارا بڑھاپا تو آخری منزل پر ہے، پر بہو کو ابھی پہاڑ جیسی جوانی کاٹنی ہے۔ آہ! تقدیر نے زندگی کے کس موڑ پر دھوکا دیا"۔ اور شیرے کا چہرہ خزاں رسیدہ پتے کی طرح سکڑ گیا تو میرو نے کہا "نمبردارا!"

"ہاں!"

"تیرے بہادر کی تین نشانیاں تیرے پاس ہیں۔ تو کس لئے جی میلا کرتا ہے؟"

"میرو!" شیرے نے سنجیدہ ہو کر کہا "کونپلیں پھوٹتی ہیں تو کسان آس لگا کر بیٹھتا ہے کہ کب یہ شگوفے بڑھیں گے، پروان چڑھیں گے اور لہلہاتے پودے بن جائیں گے۔ لو کا ایک جھونکا آئے تو یہ کونپلیں جھلس جاتی ہیں اور کسان کا دل لہو ہو جاتا ہے۔ بادل گھر گھر کر بن برسے گذر جائیں تو پہلے منہ کھلے کے کھلے رہ جاتے ہیں اور ان میں ایک قطرہ بھی نہیں ٹپکتا۔ کون جانتا ہے کہ جو کونپل مٹی کا سینہ چیر کر نکلی وہ پروان چڑھ کر پھل پھول بھی دے گی؟"

خزاں رسیدہ پتے پر ساٹھ سال محنت اور غم، دھوپ اور بارش، آس اور نراس کے نقوش ابھرے تو جھریاں گہری ہوئیں اور صدیوں کا دکھ ایک لمحے میں سمٹ آیا۔ پھر برکھا لگی اور میرو نے سوچا "اچھا ہوا آج کئی مہینوں کے بعد نمبردار پہلی بار بہادر کو رویا"۔

آنسو گرد سے اٹے ہوئے چہرے پر گدلی ندیاں بن کر بہنے لگے ...... طوفان تھما تو میرو نے کہا "نمبردارا دھوپ تیز ہو رہی ہے، تھوڑے سے سیاڑ باقی رہ گئے ہیں"۔

میرو نے ہل کی ہتھی پر ہاتھ رکھ کر بیلوں کو چھیڑا تو وہ لمحہ جو شیرے پر گذر گیا تھا اب اچانک میرو کے دل میں اتر آیا۔ میرو کو بہادر کی جوانی اور رفاقت یاد آ گئی اور پھر شیرے کا بڑھاپا اور بہو کی جوانی کی تصویر ابھری تو وہ گہری سوچ میں کھو گیا۔

اچانک شیرے نے کڑک کر کہا "اوئے میرو! پاڑا[1] اوے پاڑا"

میرو نے گھوم کر شیرے کو دیکھا اور اسے شیرے کی آنکھوں میں وہی چمک نظر آئی جو کبھی اس نے شیرے کی جوانی میں دیکھی تھی۔ اس نے پھالے کو اٹھا کر سیاڑ سے سیاڑ ملا دیا۔

---

[1] سیاڑ سے سیاڑ ملا ہوا نہیں جا رہا۔

چند برس بعد

قیوم نظر

جس سے پہلے آرزو ویران رستوں پر بھٹکتی گرد تھی
جس کے بعد آنکھوں میں آنسو، سر میں سودا، لب پہ آہِ سرد تھی
جس کے ہونے کچھ نہ تھا، جو کچھ نہ ہونے پر بھی یکسر فرد تھی

سنگِ مرمر کا وہ پیکر — زندگی کے جس پہ کیا کیا جال تھے
طرفہ تر شیرازہ بندی روپ کی، نایاب خد و خال تھے
اک دمکتی لہر کے شانوں پہ رقصاں جھاگ تھی یا بال تھے

ابر پارہ تھا، ہوا کے دوش پر اڑتا ہوا آیا —— گیا
حُسن کا اک گرم رو شعلہ جو لمحہ بھر کو تھرّایا، گیا
کائناتِ دل پہ صد کیفیتوں کو کیسے پھیلایا گیا

ذہن کے گوشوں میں اتری کرچیاں ہوں جس طرح دھنستی ہوئی
میری دنیائے تصوّر میں ہیں یادیں وقت پر ہنستی ہوئی
راج ہنسوں کی طرح اڑتی، مگر پھندوں میں بھی پھنستی ہوئی

ل

مشفق خواجہ

اس قدر حیرتیِ جلوہ تھے دیوانے ترے
کچھ نہ کہنے پہ بھی کہتے رہے افسانے ترے

کائناتِ دلِ ویراں فقط اک ذوقِ طلب
وادیاں تیری، گلستاں ترے، ویرانے ترے

جانے کیا رنگ ہو پھر جلوہ گہہِ ناز ترا
ہم سے منسوب اگر ہو گئے افسانے ترے

تیرے ملنے کی جہاں کوئی بھی امید نہیں
اب وہاں ڈھونڈھ رہے ہیں تجھے دیوانے ترے

کاش ہم وقت سے اس طور ہم آغوش رہیں
ہم کو ہر لمحہ سناتا رہے افسانے ترے

ہم نے ہر شے کو، تجھے دیکھ کے، دیکھا اکثر
ہم نے ہر روپ میں سو روپ ہیں پہچانے ترے

اُجڑی راہوں پہ سدا، صورتِ نقشِ کفِ پا
جانے کیا سوچ کے بیٹھے رہے دیوانے ترے

اب وہ پہلی سی پرستاریٔ اوہام کہاں
یاد ہیں پھر بھی غمِ دوست کچھ افسانے ترے

کاش تو جان سکے، اے نگہِ میکدہ ساز!
تشنگی اور بڑھا دیتے ہیں پیمانے ترے

تجربہ ہے کہ پسِ پردۂ ہر قصۂ غم
ہم نے مشفق سے سنے بھی تو بس افسانے ترے

سوار اور سمند

(ہمارے فن میں عکاسی)

"میں اپنے رخشِ تیز گام پر سوار جاؤں گا" — یہ محض شاعری ہی نہیں۔ گھوڑے کو اگر تہذیب کی علامت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ ہم کسی ایسے وقت کا تصور نہیں کر سکتے جب یہ بے حد شریف، جفاکش اور وفادار جانور ہم انسانوں کا یار و آشنا نہ رہا ہو۔ یہ تو ہماری زندگی میں تاریخ سے بھی کہیں پہلے داخل ہو چکا تھا۔ ابتداء میں اس کی زندگی، عوامی تصور کے مطابق، خود انسانوں کی طرح عالمِ بالا ہی میں تھی۔ اسلئے کہ فرشتوں کی طرح یہ بھی ایک مقدس مخلوق تھا جس کے بڑے ہی شاندار اور خوبصورت پر تھے۔ جب یہ انسان کی طرح اس دنیائے سفلی میں اترا تو اس کے پر بھی نہ رہے لیکن اس کے فرشتہ خصلت ہونے میں کوئی فرق نہ آیا۔ اور اس کا دامن انسان اور اس کی تہذیبی زندگی کے ساتھ ایسا مل گیا کہ تب سے اب تک اس باہمی ربط و الفت کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ اور گھوڑا مختلف رنگوں میں انسانی زندگی اور تہذیب کے ساتھ عناں بہ عناں رہا۔ اس لئے یونانِ قدیم کے شہرۂ آفاق المیہ نگار، سوفکلیز، کے مشہور ڈرامہ "انٹگونی" میں کورس کی زبانی، جو عموماً شاعر، مرد دانا یا عوام کی آراء کی ترجمانی کرتا ہے، انسان کے گھوڑے کو سدھانے اور قابو میں لانے کا تذکرہ سن کر کوئی حیرانی نہیں ہوتی۔ رزم و بزم دونوں اس کا میدان ہیں۔ زندگی کے رومان میں اپنی سج دھج کے ساتھ یہ دولھا کا ہمرکاب یا دولھا اس کا ہمرکاب اور پھر مغرب میں تو کاشتکاری کا سارا بوجھ بھی اسی کے شانوں پر ہے جب کہ کاشتکاری ہزارہا سال سے تہذیب کا مرکز و محور رہی ہے۔ باقی رہی رزم تو مشرق سے لے کر مغرب تک اس کی جولانیوں کے لئے میدان کھلا نظر آتا ہے، اور تاریخ کے صفحات اس کے کارناموں سے لبریز ہیں۔ عرب، ایران اور تاتار کی تہذیبی روایت بقول ٹائن بی ہے ہی، گھوڑے کی پشت پر سوار۔ راکب اور مرکب دونوں یک جان و دو قالب۔ وہ ربط و تعلق جیسے رستم، اور رخش نے ضرب المثل بنا دیا ہے۔ مغلوں نے شہسواری کو فن ہی نہیں زندگی بنا رکھا تھا۔ لہٰذا ان کے نزدیک "سوار سمند ناز" اور "عالی گُہری" ایک عملی حقیقت تھی۔ ابھی حال ہی تک ہم اپنے بزرگوں کے متعلق بھی یہی سنتے آئے ہیں کہ لوگ گھوڑے ہی کی پیٹھ پر جیتے اور اسی کی پیٹھ پر مرتے تھے۔ شاید ہی کوئی سچ مچ صاحبِ فراش ہو کر بستر میں جاں بحق تسلیم ہوتا ہو۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جہاں زندگی اب بھی رزم کے آغوش میں پلتی ہے، سوار و سمند کی چست و چاق زندگی کی روایت بدستور تازہ ہے۔ اور ہماری مسلح افواج کو بجا طور پر خوبصورت اور مضبوط و توانا رخش ہائے تیز گام پر ناز ہے۔ جو ہمارے فوجی رسالوں کی روح رواں ہیں — اور ہمارے دیہاتوں اور پہاڑی علاقوں میں تو اعلیٰ قسم کی نسل کشی ایک پہیتا مشغلہ، ایک فن لطیف بن چکا ہے۔ رخش کا نام یقیناً ایسے ہی چست و چاق چمکدار جسم والے شاندار گھوڑوں کی بنا پر رکھا گیا تھا۔ جو واقعی اپنے پٹھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتے۔ اور زندگی سے فن تک ایک ہی قدم تو ہے۔ اگر گھوڑا اور اس کا لازمہ شہسواری ہماری زندگی کا جزو ہیں تو فن کیوں نہ ان کی عکاسی کرے۔ ہمارے ادب اور شاعری کا دامن تو گھوڑوں کے دلفریب مرقعات اور شہسواروں کی تعریف سے لبریز ہے۔

تاریخ میں ٹرائے کے گھوڑے کی داستان سے لیکر براق کی خیالی تصویر کشی تک گھوڑے کو طرح طرح کے روپ ملتے رہے ہیں۔ ادب میں شاید ہر جگہ ہی اس کی صاف و روشن جھلکیاں نظر آئیں گی اور کوئی عہد بھی اس کی داستان سرائی سے خالی نہ دکھائی دے گا۔ مگر مشرق میں فن و حسن کاری کے مظاہروں اور تخلیقات میں تو اسے بہت ہی نمایاں اور مخصوص جگہ مل چکی ہے۔ سیر، شکار، مہم جوئی، فوج کشی اور فتح و ظفر کے کارناموں میں اس شریف "مردِ غازی" کا مذکور اس کثرت سے آیا ہے کہ بعض بعض جگہ وہ اصنامِ خیالی کی صف میں پہنچ گیا ہے اور یہ سب خراج ہے انسان کی طرف سے اس حیوانِ عزیز کو جو اس کی زندگی میں پوری طرح رس بس گیا ہے۔

پاکستان کو قدیم الایام سے گھوڑے کی پرورش اور شہسواری کے فن میں لازوال شہرت حاصل رہی ہے۔ اور وہ ہمارے اولوالعزم جیالے انسانوں کا

محبوب مرکب ہی نہیں رہا ہے بلکہ اس کے حسن کاروں کا تخلیقی موضوع بھی بنا رہا ہے۔ ہمارے حسن کاروں نے اس حیوان میں وہ سب خوبیاں دیکھی ہیں جو خود اس سرزمین کے باسیوں کی فطرت و جبلت ہے۔ کڑیاں جھیلنا، ترت پھرت، سیمابی جست و خیز، شجاعت، تہوّر، متانت، صبر و تحمل، وفاکیشی اور معرکہ پسندی۔ ہمارے مصوروں نے اپنی تصویروں میں اس حیوان کو خاص طور پر اپنایا ہے اور اگر ہم اپنے تصویری خزانوں کو ذرا کھنگالیں تو معلوم ہوگا کہ اس موضوع پر بھی ہمارا دامنِ فن بڑا مالا مال ہے۔

پاکستان کے باشندوں کو اس جانور سے جو دلی شغف ہے وہ اکثر طرح طرح سے ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ اسی طرح کا ایک مظاہرہ وہ نمائش اسپاں ہے جو ہمارے ہاں ہر سال بڑے طمطراق سے منعقد ہوتی ہے۔ شہسواری کے کھیلوں اور گھوڑوں کے سدھانے، ان کی نسل کشی اور اس حیوان کے اعلیٰ نمونے پیش کرنے کا جذبہ شریفانہ مسابقت کی مہمیز سے نئے نئے روپ اختیار کرتا رہتا ہے۔ پچھلے دنوں لاہور میں نمائش اسپاں بڑے کروفر کے ساتھ منعقد ہوئی۔ جس کو دیکھنے کے لئے منجملہ دیگر اکابر کے خود ہمارے صدر پاکستان بھی تشریف لے گئے تھے۔ شہسواری و جواں مردی کے اس شغل کو ان کی آمد سے چار چاند لگ گئے۔ ادھر نمائش کے ساتھ ساتھ فکر و نظر کی دعوت بھی یوں میسر آگئی کہ نیشنل کالج آف آرٹس (سابق میو سکول آف آرٹ) میں دلدادگانِ فن نے ایک ایسی نمائش کا اہتمام کیا جو اس نمائش اسپاں کا گویا تصویری پہلو تھا۔

مصوری کی اس مشہور درسگاہ میں یہ نمائش جو "سوار و سمند" کے موضوع پر ترتیب دی گئی تھی، لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ دیکھنے والوں کا ہجوم لگ گیا۔ میں بھی "پانچویں سوار" کی حیثیت اختیار کر گیا اور اس نمائش میں ایک معمولی ناظر کی طرح حصہ لیا۔

•

نمائش میں جو تصویریں اور مجسمے لا کر جمع کئے گئے تھے انہیں بڑی خوش سلیقگی کے ساتھ ترتیب دیا گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ تاریخی ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور ایک عام ناظر کو اس سرزمین میں گھوڑے کی داستان کا مطالعہ کرنے میں بڑی مدد ملتی تھی۔ مثلاً یہ کہ تیسری صدی قبل مسیح کا ایک کھلونا جو کھریا مٹی کا بنا ہوا تھا' دکھائی پڑا۔ کہنے کو تو یہ ایک کھلونا ہی تھا مگر اس قدر مکمل، نفیس اور نک سے سک تک درست کہ بچے تو دیکھ کر ہی مچل جائے کہ مجھے اس پہ بٹھا دو! بڑے کا یہ جی چاہے کہ بس اس خوبصورت فن پارے کو دل میں جگہ دے لے۔

یہاں سے کچھ چیزیں دیکھتا بھالتا جب میں آگے بڑھا تو ایک نئی چیز نے دامن نگاہ کو کھینچ لیا۔ یہ قدیم کے مقابلہ پر جدید کام کا مطالعہ تھا۔ کھریا مٹی کی بجائے آجکل کی سیمنٹ سے کام لیا گیا تھا۔ یہ ایک ماڈل تھا جس کا عنوان تھا "دوست"۔ یہ ایک بڑا گھوڑا تھا جو بڑی نفاست کے ساتھ "براہِ راست" سانچہ سازی کا مرہونِ منت تھا۔ بنانے والی ایک غیر ملکی خاتون ہیں مس میری آیوس۔ یہ مجسمہ سازی کے فن پر ایک سال کے لئے ہمارے اس کالج میں لیکچرار کے فرائض انجام دینے کے لئے آئی ہوئی ہیں۔

میری نظریں یوں تو کئی نمونوں پر جا کر ٹھہریں مگر سہ جہتی فن کے کئی نمونے دیکھ کر نظریں واقعی آسودہ ہو گئیں۔ خصوصیت کے ساتھ ایک ابرقی لوح دیکھ کر آنکھوں میں نور بھر گیا۔ یہ تراشی تیسری صدی قبل مسیح کی تھی اور ٹیکسلا کے عجائب گھر سے لائی گئی تھی۔ مجھے ادھر ادھر دیکھنے پر قدیم صناعی کے چند اور نمونے بھی دکھائی دیئے۔ اور قدرتی بات تھی کہ گندھارا مجسمہ طرازی اور کافرستانی گڈوں کو دیکھ کر اس سرزمین کے قدیم فنکاروں کی حسن کاری کا قائل ہونا پڑا۔

میں سوچ رہا تھا کہ سوار و سمند کی اس بزم میں میدانِ رزم کے ہمارے جیالوں نے بھی کچھ حصہ لیا ہے یا نہیں۔ میری گرداں نظریں زیادہ دیر تک تکلیف انتظار میں نہ رہیں کیونکہ جیسے ہی میرے دل میں یہ خیال گذرا، وہیں میری نظریں بعض ایسی ٹرافیوں پر پڑ گئیں جو ہمارے فوجی احباب نے اس نمائش کے لئے یہاں بھیجی تھیں۔ شہسواری کے کرتبوں کی یہ ٹرافیاں ہماری گھوڑ سوار رجمنٹوں کے افسروں کی میسوں سے لائی گئی تھیں۔ کیا کیا چہرے سواروں کے 'کیا کیا روپ ان کے مرکبوں کے، کیا آن کیا چھل بل، بس یوں سمجھیے خون کی گرمی' خو کی تندی' رگ پٹھوں کی کھچاوٹ اور پارہ کی طرح مچلتی ہوئی ادائیں، جوش عمل۔ حرکت کی منہ بولتی تصویریں تھیں۔ "لانسر رجمنٹوں" کے ان نمونوں کے علاوہ بھی مغربی پاکستان کے اور مقامات سے بعض چیزیں لائی گئی تھیں جو اپنی اپنی جگہ بڑی خوب تھیں۔

سوار و سمند کی گفتگو ہو اور "شہسوارانِ چغتائی" کا مذکور بیچ میں نہ آئے، یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ نمائش کے ذخیروں میں مغلیہ مصوری و نقاشی

کے بھی بہت سے نمونے موجود تھے۔ خاص کر مختصر تصویریں۔ یہ زیادہ تر نجی ذخیروں سے حاصل کی گئی تھی۔ ہزہائینس امیر بہاولپور کے ذخائر میں سے بھی بعض نفیس چیزیں مجھے یہاں ہی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ایک دوسرے صاحب ذوق میجر نقیر سید مغیث الدین بخاری ہیں۔ ان کے ذخیروں کی بعض نادر چیزیں بھی یہاں بہت پسند کی گئیں۔

مغلیہ نقوش کے شاید تمام مدارج ترقی موجود تھے۔ وضع و موضوع کے اعتبار سے اگر ایک طرف "جلّ جلالہٗ اکبر" اپنے مرکب شاہی کے موجود تھا تو دوسری طرف اسی کے دربار کا "حیوانِ ظریف"۔ "ملّا دوپیازہ" بھی مع اپنی ہیئت کذائی اور اپنے روایتی گھوڑے کے یہاں دکھائی دیا۔ نقیر صاحب موصوف کے ذخیرے میں مجھے چند اور چیزیں بھی بڑی عمدہ نظر آئیں مثلاً راجپوت اور سکھ نقاشی کے نمونے۔ ان کے جداگانہ سٹائل الگ سے اپنی انفرادیت کا اعلان کر رہے تھے۔ یہاں ایک اور بڑی عمدہ تصویر جو میری طرح سب ہی کی نظروں کا مرجع بنی وہ "نواب محمد مبارک خاں عباسی" کی تھی۔ یہ تصویر عام طور پہ صادق گڑھ پیلس (ڈیرہ نواب صاحب) کے "ایوان ضیافت" کی زینت دکھائی دیتی ہے۔ مجھ جیسے عام ناظر کو ایسی چیز غالباً ایسی ہی کسی جگہ دیکھنے کا اتفاق ہو سکتا تھا۔

مشرق کی صورت گری اور یورپی روشِ فن کا امتزاج اپنی جگہ اور ہی بہار دکھاتا ہے، گویا پرتگالی شراب حلبی شیشوں میں بند تھی مثلاً یہاں میں نے ایک تصویر دیکھی "پروبین شہسواروں کا حملہ"۔ اس تصویر میں حملہ کی تیزی، تندی، طراری اور سوار و سمند دونوں کا خروشِ بے محابا بڑی ہی چابکدستی سے دکھایا گیا تھا۔ اسی طرح "میجر ملک احمد خاں" کی شبیہ بھی منہ بولتی ہوئی تھی۔ غالباً یہ تصویر سیو آن پٹین کی کاوشوں میں سب سے اول و فائق مانی جاتی ہے۔

تنگیٔ داماں حائل تھی ورنہ عصری فنکاروں کے بہت سے نمونے نمائش گاہ میں لائے جا سکتے تھے۔ پھر بھی بعض نقش بڑے اچھے نظر آئے۔ مثلاً شاکر علی کا کینوس پہ بنا ہوا روغنی عمل "گھوڑے: قہر پناہ کے سامنے" اس میں رنگ، ماحول اور "زمین" کو بڑے ڈرامائی انداز میں چھوٹ دی گئی تھی اور بہت ہی خوبصورت نتیجہ برآمد ہوا تھا۔ جن لوگوں کو شکل طرازی کی روایتی خوبیاں زیادہ پسند ہیں ان کے ذوق نے حاجی محمد شریف کی تصویر "پاکستانی چوگان باز" کو بہت سراہا۔

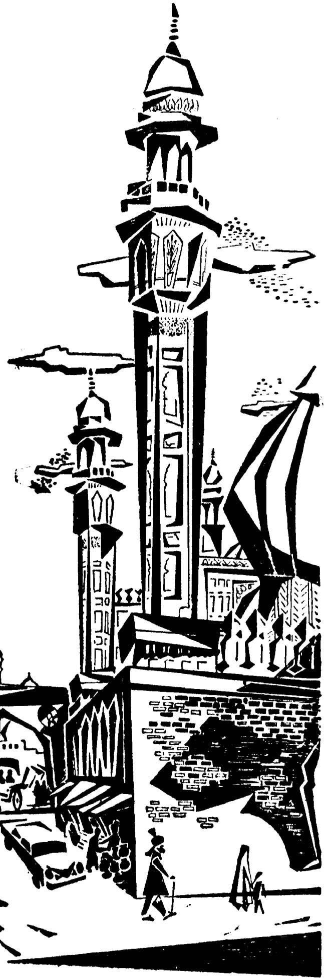
فنون لطیفہ کے ان مظاہروں کے علاوہ نمائش میں دستکاری اور صنعتی ڈیزائن کے پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا تھا۔ موضوع وہی تھا "سوار اور سمند"۔

انسان نے اپنے اس بے زبان شریف دوست کو ظاہری سجاوٹ اور لباس و زیور کی خوبصورتیوں سے بھی ہر طرح نوازا ہے تاکہ اس کا دل میلانہ ہو اور وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے کہ اس کا یار بھی خالی دانہ گھاس ڈال کر نہیں ٹرخا دیتا ہے بلکہ اس کی خدمات کا اعتراف تحائف و ملبوسات سے بھی کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ مجھے یہاں خیرپور اور بہاولپور سے آئے ہوئے گھوڑوں کے زرق برق ساز اور دیگر لوازمات مرصع بھی نظر آئے۔ لکڑی کی کھدائی کے نمونے، کشیدہ کا کام۔ تانبے پر ابھرواں کام۔ دستی چھاپے کی سوتی چھینٹیں۔ اپنی جگہ الگ الگ بہار دکھا رہی تھیں۔ اس موقع پر گلیکس ٹیکسٹائل ملز ملتان نے ایک بہت نفیس دلآویز میز پوش تیار کر کر بھیجا تھا جو واقعی دیکھنے کی چیز تھی۔

ہر چند کہ یہ نمائش مختصر پیمانہ پر تھی مگر تھی بڑی نمائندہ اور بھرپور۔ یہاں آ کر یہ بات تو بخوبی واضح ہو جاتی تھی کہ ہمارے فنکار اور حسن کار جس نمونہ اور وضع و ہیئت کو بھی اپناتے ہیں اس میں اپنے اس پرانے رفیق کو نہیں بھولتے۔ سوار اور سمند کا موضوع چونکہ پاکستانی فنکاروں کی شجیع ذہنیت اور تصوری ذوق سے بہت قریبی نسبت رکھتا ہے اس لئے وہ ان کی تخلیقات میں برابر نمو پاتا رہتا ہے۔

مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ آئندہ سال اسی نوعیت و اہمیت کی نمائش پھر منعقد کی جائے گی اور اس موقع پر ہمیں اپنے فنکاروں کی قدیم و جدید کاوشوں کے اور زیادہ وسیع و متنوع نمونے دیکھنے کا موقع فراہم ہوگا۔

ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا - مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس میکلوڈ روڈ - کراچی
مدیر: رفیق خاور

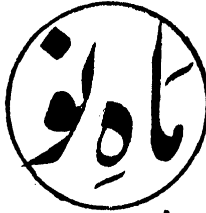






CALTEX

جلد ۱۲ شمارہ ۱۱



نومبر ۱۹۵۹ء

مدیر: رفیق خاور   نائب مدیر: ظفر قریشی

چندہ سالانہ: پانچ روپے آٹھ آنے

شائع کردہ: ادارہ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

فی کاپی: آٹھ آنے

بنیادی جمہوریتیں

(صدرِ پاکستان، جنرل محمد ایوب خان کے تاثرات)

جب تک ہمارے دل میں خدا کا خوف اور عوام کے ساتھ محبت کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا اس وقت تک نہ ہم اچھے انسان بن سکتے ہیں نہ اچھے مسلمان اور نہ اچھے پاکستانی ہی۔ جب ہزاروں لاکھوں انسانوں نے جان، مال اور آبرو کی قربانیاں دے کر اس ملک کو حاصل کیا تھا اس وقت ہرگز یہ مقصد نہ تھا کہ یہاں آکر صرف چند لوگ یا چند خاندان پھلیں پھولیں اور قبضہ جما کر بیٹھ جائیں۔ یہ ملک آپ نے حاصل کیا تھا، یہ ملک آپ کے لئے بنا تھا۔ اس لئے آپ کو آگے بڑھنا، اسے چلانا اور زندہ رکھنا ہے۔ پچھلے سال جب انقلاب آیا تھا تو شاید کچھ لوگوں کے دلوں میں یہ خیال گزرا ہو کہ حکمرانوں کی ایک ٹولی چلی گئی، شاید اب یہ نئے لوگ ساری عمر حکومت پر قبضہ جمائے بیٹھے رہیں گے۔ مگر میں نے اسی روز آپ سے وعدہ کیا تھا کہ ملک میں صحت مند اور اچھی قسم کی جمہوریت قائم کرنے کے لئے جلد از جلد اقدامات کئے جائیں گے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے اپنا وعدہ پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائی اور اب انشاءاللہ بہت جلد اس سال کے آخر تک سارے ملک میں بنیادی جمہوریتوں کا نظام قائم کر دیا جائے گا۔

بنیادی جمہوریتوں کا یہ نظام ہم نے دوسرے ملکوں کے تجربات اور اپنے ملک کے حالات دونوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا ہے۔ جمہوریت کے سلسلے میں ہمیں دوسروں کی اندھا دھند نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم کو اپنے ملک کے حالات اور اپنے عوام کی افتادِ طبع کے مطابق کام کرنا ہے۔ بنیادی جمہوریتوں میں ہم نے تین باتوں کو خاص طور پر مدِنظر رکھا ہے۔ ایک تو یہ کہ جمہوریت اوپر سے عوام کے سروں پر نہیں ٹھونپی جائے گی بلکہ اس کی بنیاد بالکل نیچے کی سطح سے شروع کرکے اوپر تک منزلیں تعمیر کی جائیں گی۔ دوسرے یہ کہ عوام کو اپنا نمائندہ چننے کے لئے دور نہیں جانا پڑے گا۔ تعلیم کی کمی کی وجہ سے خاص طور پر دیہات میں، تیس چالیس ہزار یا ایک لاکھ کی آبادی میں سے ایک اچھا نمائندہ چننا بہت مشکل ہے۔ ایسے انتخابات میں ایک عام رائے دہندہ کو اتنا تک معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ جس آدمی کو ووٹ دے رہا ہے، وہ ہے کیسا آدمی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے الکشنوں میں جو ووٹ پڑتے تھے وہ دباؤ یا ناواقفیت کی وجہ سے پڑتے تھے یا پھر ناجائز طریقوں سے ووٹ حاصل کئے جاتے تھے۔ لیکن بنیادی جمہوریتوں میں ایسی کوئی بات قطعی ممکن نہیں ہوگی۔ اب صرف ہزار پندرہ سو آدمی ایک نمائندہ چنیں گے۔ اتنے چھوٹے سے حلقے میں لوگ ایک دوسرے کو ضرور جانتے پہچانتے ہوں گے۔ اور الکشن کے موقع پر ہر ایک کو معلوم رہے گا کہ وہ جس کو آدمی ووٹ دے رہا ہے وہ اچھا آدمی ہے یا بُرا۔ اس طریقے سے جو جمہوری نظام قائم کیا جائے گا وہ عوام کا حقیقی معنوں میں نمائندہ ہوگا۔

بنیادی جمہوریتوں کی تیسری خاص بات، اور بڑی اہم بات، یہ ہے کہ اب جو کونسلیں قائم ہوں گی وہ سیاسی دباؤ اور دھواں دھار تقریریں کرنے والے سیاستدانوں کے وجود سے آزاد ہوں گی، جو ماضی میں ہماری اسمبلیوں کی خصوصیت بن گئے تھے۔

اب جو کونسلیں تشکیل پائیں گی وہ اپنے دیہات یا وارڈ کی ایسی باعمل جماعتیں ہوں گی جو حکومت کے ساتھ

ترقیات عامہ کے کام میں ہاتھ بٹائیں گی۔ ان کونسلوں کی خاص ذمہ داری ترقیات عامہ کے مسائل ہوں گے۔ ان کونسلوں کو جو ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں ان میں خاص طور پر صحت، تعلیم، زراعت، اور سماجی بہبود کے عملی کام ہیں۔ یہ بہترین طریقہ ہے جس کے ذریعہ رائے عامہ کو حکومت سے اور عمال حکومت کو عوام سے نزدیک تر لایا جائے گا۔ اگر ان کونسلوں نے اپنی ذمہ داریاں اور فرائض بخوبی سرانجام دیئے تو ملک کے ہر گاؤں اور ہر گاؤں کا باشندہ حکومت کے کام میں برابر کا شریک ہو جائے گا۔ عمومی تخمینہ یہ ہے کہ کوئی (۰۰۰، ۲۰، ۱) نمائندگان بنیادی جمہوریتوں کے نظام میں کام کریں گے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے حکومت کی مشینری کے (۰۰۰، ۲۰، ۱) کل پرزے ہوں گے جو خود عوام مہیا کریں گے۔ اگر یہ مشینری بھی اب صحیح طرح کام نہ کرے — یعنی یہ کہ اس نوعیت کی جمہوریت بھی کامیاب نہیں ہوئی — تو پھر خدا ہی ہمارا حافظ ہے۔ مگر مجھے پکا یقین ہے کہ انشاء اللہ یہ نظام ضرور کامیاب ہوگا۔

بنیادی جمہوریتوں کے نظام کو کامیاب بنانے کی ذمہ داری بڑی حد تک اب خود آپ پر ہے۔ اس وقت ملک میں کوئی سیاسی جماعت نہیں ہے اس لئے اس بات کا قطعی کوئی امکان نہیں ہے کہ آپ پر اس نمائندہ یا اُس نمائندہ کو ہی ووٹ دینے یا نہ دینے کا دباؤ ڈالا جائے گا۔ یعنی انتخابات بالکل آزادانہ ہوں گے اور قطعی منصفانہ۔ کسی سرکاری افسر کو اس بات کی اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ الکشنوں پر اپنا اثر ڈال سکے۔ اس لئے اب یہ آپ کا اور صرف آپ کا کام ہے کہ ایسے نمائندے اپنے لئے چنیں جو دیانت دار ہوں، بے غرض ہوں اور خدمت خلق کے جذبہ سے ہی متاثر ہوں۔ اب آپ کو چاہیئے کہ ایسے آدمیوں کا انتخاب کریں جو آپ کی پرخلوص نمائندگی کر سکیں اور ان پر آپ جب بھروسہ کریں تو وہ اس بھروسہ پر پورا اتر سکیں۔

یونین کونسلیں جو اب بنیادی جمہوریتوں کے نظام کے تحت قائم کی جائیں گی وہ اس عظیم جمہوری نظام کا سنگ بنیاد بنیں گی۔ یونین کونسلوں ہی سے نمائندے تحصیل کونسل اور تھانہ کونسل میں جائیں گے۔ اور اسی طرح ڈسٹرکٹ کونسلوں اور ڈویژنل کونسلوں میں۔ یہ نمائندے تمام ان کاموں میں جو تعمیر وطن سے متعلق ہوں گے حکومت کا ہاتھ بٹائیں گے۔ اس لئے یہ بڑا ضروری ہے کہ یونین کونسلوں میں معاشرہ کے تمام مفید عناصر کو مناسب نمائندگی حاصل رہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہوں جنھیں عوام اپنے حلقے سے نمائندہ بنا کر بھیجنا چاہیں مگر وہ بوجہ تکلف آگے نہ بڑھیں یا انھیں یہ گمان ہو کہ اب بھی الکشنوں کا کھیل پرانے رنگ میں ہی ڈوبا ہوا رہے گا۔ ان بعض لوگوں میں خواتین بھی ہو سکتی ہیں جو زیادہ بہتر حالات میں واقع نمائندگان کے مقابلہ پر برابری کے ساتھ مقابلہ کرنے کے وسائل نہ رکھتی ہوں۔ اس لئے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ یونین کونسلوں کو ایسے حضرات، و خواتین کی موجودگی کے فوائد سے محروم نہیں رہنے دینا چاہیئے۔ اس نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے ہم نے طریقۂ نامزدگی کا بھی اصول طے کیا ہے۔ مگر یہ بات بالکل صاف صاف سمجھ لینی چاہیئے کہ ان نامزدگیوں کا مقصد ہرگز ہرگز یہ نہیں ہے کہ ان لوگوں کو یونین کونسلوں میں حکومت کے پٹھو بنا کر بٹھایا جائے۔ ہمارا مقصد اس سے صرف یہ ہے کہ ایسے لوگ جنھیں خصوصی علم و تجربہ ہو انھیں بھی ترقیات عامہ کے کاموں میں، جو ان یونین کونسلوں کے علاقوں میں کئے جائیں گے شریک کار کیا جا سکے تاکہ وہ بھی اس سلسلے میں مفید خدمت انجام دے سکیں۔

اب تک جو نظام حکومت چل رہا تھا وہ ورثہ تھا ایک غیر ملکی دور حکمرانی کا جو اس کے اپنے مقاصد کے لئے وضع کیا گیا تھا۔ اب ہمیں آہستہ آہستہ اس نظام کو اس طرح بدلنا ہے کہ وہ ہماری آزاد قوم کی ضروریات کو پورا کر سکے۔ ہم درجہ بہ درجہ مرکزیت اختیارات کو صوبوں، ڈویژنوں اور اضلاعی حکام کے سپرد کر رہے ہیں۔ اس کا

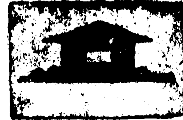
نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہر ہر علاقے کے لوگوں کے اپنے مسائل وہیں کے وہیں حل ہو جایا کریں گے۔ لوگوں کو اپنے فوری اور بڑے ضروری مسائل کے حل کے لئے لاہور، راولپنڈی کراچی یا ڈھاکہ کے چکر لگانے اور دور دراز کے تکلیف دہ سفر کرنے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ اب ڈویژن اور ڈسٹرکٹ کے کمشنر صاحبان ہی اپنے اختیارات استعمال کریں گے اور اس سلسلہ میں ان نمائندوں سے مشورہ کرتے رہیں گے جو یونین کونسلوں کے واسطے سے ڈسٹرکٹ اور ڈویژن کونسلوں میں آتے ہوئے ہوں گے۔

میں اس نظامِ جمہوریت کو جس قدر زیادہ اپنے ذہن میں سوچتا ہوں اتنی ہی مجھے یہ اُمید بندھتی ہے کہ میرے ملک کا مستقبل بہتر ہو جائے گا۔ مجھے ان بنیادی جمہوریتوں میں اس بات کی پہلی جھلک دکھائی دیتی ہے کہ عوام اپنی بھلائی اور فلاحِ ملک کے کاموں میں اپنے حق کو صحت مندانہ اور مفید طریقہ پر پورا ہوتے دیکھ سکیں گے۔ لہٰذا ہمیں خدا سے دعا کرنی چاہیئے کہ وہ بنیادی جمہوریتوں کے اس نظام کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کی ہمیں توفیق عطا فرمائے۔

بنیادی جمہوریتوں کا قیام بجائے خود کوئی مقصد نہیں ہے بلکہ ایک وسیلہ ہے، ایک نصب العین کا۔ نصب العین ہے ملک کی تعمیرِ نو۔ جیسے ہی ملک میں بنیادی جمہوریتوں نے اپنا کام کرنا شروع کیا ملک کی تعمیرِ نو کا کام دراصل شروع ہو جائے گا۔ ہم نے اس سال میں جو کچھ بھی کیا ہے دراصل تمہید ہے اُن بہت سے بڑے کاموں کی جنہیں ہمیں مکمل کرنا ہے۔ ◆

(اقتباس تقریر، لائل پور — ۱۲- اکتوبر ۱۹۵۹ء)

پاک جمہوریت

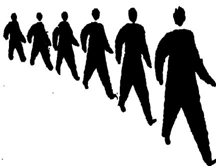


ڈویژنل کونسلیں — چوتھا زینہ

ضلع کونسلیں — تیسرا زینہ

تحصیل / تھانہ کونسلیں — دوسرا زینہ

یونین کونسلیں — پہلا زینہ



پرانی حویلی

صہبا اختر

پرانی جمہوریت کی یہ سرنگوں حویلی
یہی حویلی سنا ہے خوش رنگ و مشکبو تھی
یہی حویلی جو آج بوسیدہ ہو چکی ہے
سنا ہے اپنے مکین کی طرح خوبرو تھی
یہی حویلی کہ آج جز خاک کچھ نہیں ہے
سنا ہے آفاق میں کبھی اس کی گفتگو تھی
سنا ہے اِس کے دراز سائے نشہ اثر تھے
سنا ہے ہر خشت اِن در و بام کی سبو تھی
مگر لیاقت کے خون کے بعد یہ حویلی!
شہید خونیں کفن کی صورت لہو لہو تھی

پرانی جمہوریت کی یہ سرنگوں حویلی
اِسی حویلی میں رات کے شہریار کھیلے
اسی حویلی کے گوشۂ تیرگی میں چھُپ کر
زمین کی قسمتوں سے جاگیردار کھیلے
اسی حویلی کے ایک اک نقش مضمحل سے
ہزار، عزت مآب، دیوانہ وار کھیلے
اِسی حویلی میں چھُپ کے جمہور کے شکاری
مرے وطن کی مسرتوں کا شکار کھیلے
اسی حویلی میں وہ سیاست سے کھیل کھیلا
کہ جیسے شطرنج گھر کی باندی سے زار کھیلے

پرانی جمہوریت کی یہ سرنگوں حویلی
ہمارے پرچم کی سربلندی پہ طعنہ زن تھی
وہ خستہ دیوار جس کے اندیشے لازمی تھے
شکستگیِ قریب سے خطرۂ وطن تھی

وہ موج زہراب جانے کتنوں کی موت بنتی
جو اس کی مسموم خواب گاہوں میں موجزن تھی

تھے اس کے اوراقِ شب پہ تحریر وہ اندھیرے
کہ جس سے پیشانیِ مورخ بھی صد شکن تھی
مگر حویلی کی مرگ آشام ظلمتوں سے
ابھر پڑی وہ سحر کہ خود شعلہ پیرہن تھی

عطا ہوئی ہے اُسے بھی بارے زبان صہبا
وہ حلقۂ ملک دوست، جو کم سخن رہا ہے
کسان، مزدور، اہلِ فن، علم دوست شہری
وطن سے بے لوث عشق جن کا چلن رہا ہے
وہ سب کے سب جمع ہو رہے ہیں نئے افق پر
نئے ستاروں کا حسن رہ رہ کے چھن رہا ہے
عوام، سلطانِ دورِ جمہور پاک ہوں گے
عوام، جن کو عزیز پیارا وطن رہا ہے
بہ تیشۂ عزم کہنہ جمہوریت کے بدلے
"چہار منزل" کا اک نیا قصر بن رہا ہے



صبح امید

محمد صادق شاد

وہ پو پھٹی گجر بجا!
گجر کے ساتھ ہی وطن کا بختِ خفتہ جاگ اٹھا
مجاہدوں کے نعرہ ہائے پرخروش کی صدا
سوادِ پاک سے اٹھی
فضاؤں میں بکھر گئی
حیات بے کراں سے تازہ دم مرا وطن ہوا
شباب کی رگوں میں خونِ گرم موجزن ہوا
پکارتا ہوا یہ وقت کا نقیب آگیا!
نشانِ منزل وطن بہت قریب آگیا!
خزاں گئی چمن کھلا
چمن کا ذرہ ذرہ نورِ زیست سے چمک اٹھا
خدا کا شکر ہے کہ دورِ انحطاط کٹ گیا

ہوا کا رُخ پلٹ گیا
غموں کا ابر چھٹ گیا
کہ ملتِ غیور پاک کو زعیم مل گیا
جو منتشر تھے اُن کو رہبرِ عظیم مل گیا
ہوا ہے ابر خیمہ زن
چمن میں کاروانِ شاہدِ بہار آگیا
وطن کے اوج پر وطن کا غمگسار آگیا
ہوائیں سنسنا اٹھیں
فضائیں مسکرا اٹھیں
وطن کی دل گرفتہ روح کو قرار آگیا!
وطن میں دورِ انقلابِ خوشگوار آگیا!



ماہ نو، کراچی، نومبر ۱۹۵۹ء

بنیادی جمہوریتوں کی چار منزلیں

اللہ بخش یوسفی

برصغیر میں مسلمانوں کی سلطنت ختم ہونے کے بعد ملت پر ادبار کی گھٹائیں چھا گئیں اور وہ ہر طرح تہی دست اور تہی دامن ہو گئے۔ ترقی اور فلاح کی سب راہیں ان پر مسدود نظر آتی تھیں کہ سرسید نے افق پر نمودار ہو کر ملت کو صحیح رہنمائی دی اور اسے ترقی کی راہ پر ڈال دیا اور ملت کی کشتی کا پتوار اس طرح سنبھالا کہ یہ سفینہ ڈوبنے سے بچ گیا۔

ایک صدی تک ملت اپنی بقا کے لئے جد و جہد کرتی اور ۱۹۴۷ء تک مختلف محاذوں پر مخالف قوتوں سے نبرد آزما رہی۔ اس نے اپنی انفرادیت اور بقا کے لئے بڑی سے بڑی قربانی پیش کی اور جیسی جیسی کٹھن منزلیں اس نے طے کیں وہ تاریخ کا بڑا ہوشربا باب ہے۔ ۱۹۴۰ء کے بعد سے قائد اعظم کی انتھک اور مخلصانہ کوششیں اور ملت کا جوش عمل ایک نئے شعور کا سبب بنا رہا اور بالآخر پاکستان کے وجود میں ہمارا قومی نصب العین حاصل ہو گیا۔ لیکن بانئ پاکستان کے ذہن میں جو تصور حکمرانی تھا اسے اُن کی اچانک وفات کے باعث پوری طرح بار آور ہونے کی مہلت نہ مل سکی۔ صرف ایک قطعۂ ارض حاصل کر لینا بجائے خود اتنا بڑا مقصد نہ تھا جتنا یہ نصب العین کہ مسلمانوں کے لئے ایک ایسی سرزمین میسر آئے جو ان کی قوم کے لئے ایک مامن اور ان کی ملی حیات اور معاشری و معاشی بہبود کا گہوارہ ہو، جہاں وہ اپنی قومی صلاحیتوں کو ترقی دے سکیں اور اپنی ثقافت کو محفوظ رکھ سکیں جہاں ہر فرد کو زندگی کے مساوی حقوق اور مواقع حاصل ہوں، جہاں معاشری انصاف ہو اور زندگی صحیح اسلامی نہج پر گامزن ہو۔

قائد اعظم کی وفات کے بعد عوام کو ترقئ وطن کے جذبے سے پُرخلوص لگاؤ باقی رہا لیکن اسی زمانے سے ایسے عناصر نے بھی سر اٹھانا شروع کر دیا جن کے سامنے نہ مفاد ملت تھا نہ خدمتِ وطن کا جذبہ بلکہ سیاسی آدمیوں کی جنگ زرگری تھی یا معاشرہ کے دوسرے عناصر کی قوم دشمن سرگرمیاں جس نے ملک کو تباہ کر دیا اور ہم ساری دنیا کے لئے مایۂ تضحیک بن گئے۔ ملک کی اس بارہ سالہ تاریخ میں ہمیں اپنے "رہنماؤں" کی ان کوششوں کا نمونہ دکھائی دیتا ہے جو انہوں نے صرف اپنی اغراض کے لئے کیں اور اُسے نام دیا گیا "جمہوریت" کا۔ وہ کروڑوں انسانوں کو اسی بنا پر فریب دیتے رہے اور ملک ہر شعبہ میں تباہ ہوتا رہا۔

مگر یکایک غیرتِ حق کو حرکت ہوئی اور پچھلے سال ۸ راکتوبر کو جب مؤذن میناروں سے اللہ کی بڑائی کا اعلان کر رہے تھے ایک نئی صبح اس ملک میں طلوع ہوئی۔ ایک مردِ مجاہد نے ملک کے افق پر نمودار ہو کر ابن الوقت زعماء کے ہاتھ سے اقتدار سلطنت چھین لیا اور اس قابلیت اور جرأت کے ساتھ کہ ایک قطرۂ خون بھی نہ بہنے پایا۔ یہ ایک انقلاب تھا پُرامن اور ہمہ گیر، مگر اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل خلاف معمول۔ اس انقلاب کا سہرا جنرل محمد ایوب خاں کے سر ہے۔ قیادت سنبھالتے ہی انہوں نے اعلان کر دیا تھا کہ ملک اہلِ ملک کا ہے۔ اور یہ عوام ہی کی ملکیت رہے گا۔ اس وقت جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ صرف تطہیر کا عمل ہے اور جمہوریت (جو عوام کا فطری حق ہے) انہیں بہت جلد واپس مل جائے گی اس وعدہ پر وہ اپنے دوسرے وعدوں کی طرح، بالکل کھرے اور سچے ثابت ہوئے۔ چنانچہ بنیادی جمہوریتوں کے قیام کا انہوں نے اعلان کر دیا ہے اور اس کے لئے انتخابات اور تشکیل کا عمل اب صرف چند روز کی بات ہے لیکن جمہوریتوں کے قیام سے قبل انہوں نے ملک کو ان تمام عناصر سے بھی پاک کر دیا جو جمہوریت کو عملاً بے معنی بنا رہے تھے۔ سیاسی جماعتوں کا خاتمہ، زمینداری کی تنسیخ اور معاشرے وانتظامیہ کی دوسری خرابیوں کو دور کر دینا ان کی دور اندیشی اور عملی سیادت کی روشن نشانیاں ہیں۔ کیونکہ زمینداروں کے چنگل، سیاسی آدمیوں کی ریشہ دوانیوں اور انتظامیہ کی تطہیر کے بغیر

صحیح جمہوری نظام کا کوئی بھی عمل کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا تھا۔

اب اس سلسلہ میں یہ پوچھا جاتا ہے کہ پچھلے جمہوری نظام اور ان بنیادی جمہوریتوں میں فرق کیا ہے۔ یہ فرق بہت بڑا اور بنیادی ہے۔ "بنیادی جمہوریت" کے الفاظ بجائے خود انقلابی تصور کو ہمارے سامنے لے آتے ہیں۔ کیونکہ پہلے جمہوریت کا آغاز اوپر سے سمجھا جاتا تھا۔ اب اس تعمیر کا کام بنیاد یعنی عوام سے شروع کیا گیا ہے۔ بالخصوص دیہات کے عوام جو ملک کا ۸۵ فی صد حصہ ہیں اور پاکستان کے لئے ریڑھ کی ہڈی کے مصداق ہیں۔ پہلے مکان کا ڈھانچہ کھڑا کرنے کے بعد اس کی بنیادیں بنانے کی سعی کی جاتی تھی۔ اب پہلے بنیادیں رکھی جائیں گی بعد میں اس پر عمارت تعمیر ہوگی۔ سابقہ جمہوریت میں رائے دہندہ اپنے حالات سے مجبور تھا اور دوسروں کے اشاروں پر عمل کرتا تھا۔ اب وہ آزادانہ طریقہ پر اپنی رائے کو استعمال کر سکے گا۔ زرعی اصلاحات اور دوسرے قوانین کے تحت چونکہ عوام کو زمیندار اور سرمایہ دار سے نجات مل چکی ہے اس وجہ سے اب اسے کسی کے اشاروں پر اظہار رائے کی ضرورت یا مجبوری باقی نہیں رہی اور رائے دہندگی چونکہ حق رائے دہی بالغان کے اصول پر ہوگی۔ اس لئے ملک کے ہر بالغ باشندہ کو اپنی سمجھ اور عقل سلیم کے مطابق اظہار رائے کا حق حاصل ہوگا اور وہ اسے آزادانہ استعمال بھی کر سکے گا۔

اس سلسلہ میں جنرل محمد ایوب خاں نے ۱۲ جون ۱۹۵۹ء کو "بنیادی جمہوریتوں" کے قیام کا اعلان کر دیا ہے۔ اس جمہوری نظام کو انہی چار منزلوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

(۱) **یونین کونسلیں**: ایک یا ایک سے زاید دیہاتی آبادیاں جن کے بالغوں کی تعداد ایک ہزار سے ڈیڑھ ہزار تک ہوگی۔ باہم مل کر اپنی یونین کونسل کے نمائندوں کا انتخاب کرے گی۔ ظاہر ہے کہ اتنے مختصر حلقۂ انتخاب میں رائے دہندگان ان لوگوں سے پوری طرح واقفیت رکھتے ہوں گے جو کنیت کے امیدوار کی حیثیت سے منظر عام پر آئیں گے۔ اب وہ بہ آسانی معلوم کر سکیں گے کہ امیدوار کس قابلیت و اہلیت کا مالک ہے اس کی گذشتہ زندگی کیسی گذری۔ اس کے عادات و اطوار کیا ہیں۔ اسے اپنے علاقہ یا رائے دہندوں اور ان کے مفاد سے کس قدر دلچسپی ہے۔ وہ ان کی نمائندگی کر بھی سکے گا یا نہیں۔ اور ان کے حقوق و مفاد اس کے ہاتھ میں محفوظ رہ سکیں گے یا نہیں۔ اور اب رائے دہندگان چونکہ جدید اصلاحات کی برکت سے ہر طرح کی دھونس سے آزاد ہو چکے ہیں اور اب وہ کسی زمیندار، سرمایہ دار، یا جماعت کے سامنے بے بس و مجبور بھی نہیں اس وجہ سے آزادانہ اظہار رائے کا انہیں پورا پورا موقع مل گیا ہے۔ ہر یونین کونسل دس ارکان پر مشتمل ہوگی۔

ہو سکتا ہے کہ بعض ایسے افراد بھی ہوں جن کی قابلیت و اہلیت یا تجربہ سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہو لیکن وہ لوگ انتخابات کی ہنگامہ آرائیوں میں الجھنا پسند نہ کرتے ہوں۔ یا بعض خاص طبقے مثلاً مستورات، یا مزدوروں وغیرہ کی نمائندگی اس یونین میں نہ ہو سکتی ہو تو اس کے لئے حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ چند نشستیں بذریعہ نامزدگی پُر کر دی جائیں گی۔ لیکن ان نامزدگان کی تعداد یونین کی کل تعداد کے ۱/۳ سے زائد نہ ہوگی۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ دس ارکان کی یونین کونسل میں صرف تین ارکان نامزد کئے جا سکیں گے۔ یہی یونین کونسلیں حقیقت میں بنیادی جمہوریتیں ہیں اور حکومت کی باقی عمارت انہی بنیادوں پر کھڑی کی جائے گی۔ شہری آبادیوں کو بھی اسی طرح چھوٹے چھوٹے حلقوں میں تقسیم کر کے کونسلیں قائم کی جائیں گی۔ یہ کونسلیں اپنا صدر خود منتخب کیا کریں گی۔

(۲) **تحصیل یا تھانہ کونسلیں**: جب ابتدائی یا یونین کونسلیں بن جائیں گی تو مغربی پاکستان میں تحصیل وار اور مشرقی پاکستان میں تھانہ وار کونسلیں مرتب ہوں گی۔ ان کونسلوں کے لئے عام انتخابات نہ ہوں گے بلکہ یونین کونسلوں کے صدر ہی ان کے رکن متصور ہوں گے۔ اور جہاں میونسپل کمیٹیاں موجود ہوں گی وہاں ان کے صدر بھی رکن سمجھے جائیں گے۔ یہ کونسلیں بیشتر امور ترقیات عامہ سے متعلق ہوں گی اس وجہ سے ان کا تعلق ان محکموں کے افسروں سے بھی رہے گا۔ اس لئے حکومت نے اتحاد و یکجہتی اور باہمی طور پر مل جل کر کام کرنے کے خیال سے فیصلہ کیا ہے کہ ان کونسلوں میں ان محکموں کے افسروں کو بھی شامل کیا جائے تاکہ ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ چنانچہ تحصیل یا تھانہ کونسلوں میں امور ترقیات عامہ سے متعلق افسروں کو نامزد کیا جائے گا لیکن ان کی تعداد منتخب ارکان کے نصف سے زائد نہ ہوگی۔

(۳) **ضلع کونسلیں** : اس کے بعد تیسری منزل میں "ضلع کونسلیں" مرتب ہوں گی ان کونسلوں میں ضلعوں کی ترقیاتی پالیسیاں طے ہوں گی۔ اور چونکہ اس کام میں حکومت اور عوام دونوں کا باہمی تعاون ضروری ہے۔ اس لئے دونوں کے اراکین کی تعداد ان کونسلوں میں نصف نصف کی بنیاد پر رکھی جائے گی یعنی نصف سرکاری اور نصف غیر سرکاری یا عوامی نمائندے ہوں گے اور جن میں یونین کونسلوں کے ارکان شامل ہوں گے۔

(۴) **ڈویژن کونسلیں** ۔ اس سکیم کی چوتھی منزل ڈویژن کونسل ہوگی۔ جو ہر ڈویژن میں قائم کی جائے گی۔ اس کے اراکین میں بھی ضلعی کونسل کی طرح سرکاری اور غیر سرکاری اراکین اسی نصف نصف کی نسبت سے ہوں گے۔ اور ہر ڈویژن کا کمشنر اپنی ڈویژن کونسل کا صدر ہوگا۔

اس طرح ابتدائی بنیادی کونسلیں جن کے سپرد انتظامی معاملات میونسپلٹی سے متعلق کام عدالتی اور پولیس کا نظام نیز ترقیات عامہ وغیرہ جیسے اہم امور ہوں گے۔ درجہ بدرجہ تحصیل ضلع یا ڈویژن کونسلوں میں دکھائی دینے لگیں گی۔ ان کے منتخب اراکین وہی ہوں گے جنہیں رائے دہندوں نے جان پہچان اور سوچ سمجھ کر منتخب کیا ہوگا۔ اور جن کے ساتھ حکومت ایسے ہی افسروں کو نامزد کرے گی جو ہر حیثیت سے امور ترقیات عامہ اور قومی ترقی یا تعمیر نو میں پوری طرح ممد و معاون ثابت ہوں گے۔ اور ہر یونین کونسل کو چند ٹیکس عائد کرنے کے بھی اختیارات دے دئے جائیں گے اور انہیں سرکاری مطالبات زر وصول کرنے کے اختیارات بھی حاصل رہیں گے یقین کیا جا سکتا ہے کہ یونین کونسلیں عوام کے لئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوں گی اور ان پر تعمیر شدہ عمارت ملک و قوم کی ترقی کی مستقل ضمانت ہوگی۔

یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ ملک کے لئے نیا دستور مرتب کرنے والوں نے اگر صدر مملکت یا پارلیمنٹ کے انتخابات کے لئے بالواسطہ طریقہ انتخاب پسند کیا۔ تو ہو سکتا ہے انہی اداروں سے کام لیا جائے اور یہ بہت ہی موزوں حلقہ ہائے انتخاب قرار دئے جا سکتے ہیں۔

غرض اس طرح حکومت کے کاروبار میں شرکت کرنے کا ایک عملی موقع فراہم کر دیا گیا ہے۔ اب یہ عوام کا کام ہے کہ وہ اس نظام سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہونے کی سعی کریں۔ اور اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ لوگ اپنے اپنے حلقوں میں جو نمائندے چنیں انہیں اچھی طرح جانچ لیں۔ ان کو دیانت دار، مفید خلائق اور مخلص محب وطن اور ملک و معاشرہ کے مفاد کا بے غرض امین ہونا چاہئے۔ صحیح لوگوں کے انتخاب پر ہی اس نظام کے کامیاب ہونے کا انحصار ہے اور یہ جمہوری نظام دراصل ایک بہت بڑے کام۔ یعنی ملک کی تعمیر نو کا سنگ بنیاد ثابت ہوگا۔



"ماہ نو" کی اشاعت خاص

جمہوریت نمبر

دسمبر ۱۹۵۹ء

انقلابی حکومت کے سربراہ، فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے ۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو عوام سے خطاب کرتے ہوئے یہ وعدہ کیا تھا کہ ملک میں سیاسی جماعتیں توڑنے کے بعد معاشرہ اور انتظامیہ کی تطہیر کی جائے گی اور اس کے بعد جمہوری نظام بحال کر دیا جائے گا۔ انقلابی حکومت نے یہ وعدہ پورا کر دکھایا اور آج ملک میں بنیادی جمہوریتیں قائم کرنے کے انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔ تعمیر ملت کے اس اہم کام کی تفصیل عوام تک پہنچانے کے لئے "ماہ نو" کی اگلی اشاعت ایک خصوصی اشاعت ہوگی جس میں بتایا جائے گا کہ جمہوریت کا مفہوم کیا ہے اور اس کی عملی شکل اس ملک کے لئے کس طرح موزوں ہے۔ اس کے بعد ملک کو دستوری نظام حکمرانی کے لئے کس طرح تربیت دی جائے گی اور ان اقدامات میں عوام کی بہبود اور ہمہ جہتی ترقی کے کیا کیا امکانات مضمر ہیں۔ نیز یہ بھی بتایا جائے گا کہ جمہور کے حقوق کیا ہیں اور فرائض کیا اور ہم ان سے کس طرح عہدہ برآ ہو کر ملک کو ایک فلاحی مملکت بنا سکتے ہیں۔ اس خصوصی اشاعت کے لئے مشتہرین اور ایجنٹ صاحبان فی الفور توجہ کریں — (ادارہ)

ادیب اور قومیت

قدرت اللہ شہاب

میں "ادیب اور قومیت" کے مسئلہ پر گفتگو کا آغاز دو حصّوں میں کرنا چاہتا ہوں:

پہلے تو میں پاکستان کے علاقائی و ثقافتی سیاق و سباق میں قومیت کی بنیادی حیثیت کی تشریح کرونگا اور پھر اس سیاق و سباق میں ادیب کی اہمیت اور ذمہ داریوں کو واضح کروں گا تاہم یہ اعتراف کرنے میں کوئی حجاب محسوس نہ کرنا چاہئے کہ اس تمام مدت کے دوران ہمارے پاس جس چیز کی سب سے زیادہ کمی رہی وہ ایک قوم ہونے کا احساس ہے۔ غالباً دنیا میں ہمارا واحد ایسا ملک ہے جہاں جمہور کو اکثر یہ یاد دہانی کرنا ضروری ہوتا ہے کہ محب وطن ہونا اچھی بات ہے اور اس نیک مشورہ پر جمہور کچھ ناراضگی بھی محسوس نہیں کرتے!۔ ان کے اس عجیب و غریب رویہ کی تاریخی وجوہ ہیں۔ ایک بات تو یہ ہے کہ ہم میں سے ابھی کوئی شخص پاکستانی کی حیثیت سے پیدا نہیں ہوا ہے۔ ہم میں سے بیشتر سب سے پہلے تو مسلمان، اور پھر ہندوستانی اور اس کے بعد بنگالی، پنجابی، سندھی، اور پٹھان وغیرہ، کی حیثیت سے پیدا ہوئے ہیں۔ جب ہم نے برصغیر میں اپنے ایک علیحدہ قوم ہونے کا اعلان کیا تو ہمارے اس اعلان کی بنیاد علاقائی نہیں بلکہ مذہبی و روحانی تھی۔ لیکن تقسیم ملک کے بعد ہمیں فوری طور پر اپنی روحانی قوم پرستی کو علاقائی قوم پرستی میں منتقل کرنے کا مسئلہ درپیش ہوا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ کیونکہ پچھلے ۱۲ سال کی بے اصولی سیاست کے تماشے نے اسے اور زیادہ دشوار بنا دیا تھا۔ لیکن اب ہمیں حقیقتوں کو تسلیم کرنا چاہئے۔ علاقائی لحاظ سے ہمارا ملک دو دور دراز حصوں میں منقسم ہے۔ لسانی اور ثقافتی اعتبار سے دیکھئے تو ہمارے یہاں بہت سی زبانیں اور ثقافتیں ہیں۔ لہٰذا ہماری قومیت ان لحاظات پر مبنی نہیں ہو سکتی۔ ہماری قومیت کی واحد اور تنہا بنیاد مذہب ہے اور یہ مذہب اسلام ہے۔ خواہ ہمارے ذاتی خصائل کے لئے اسلام مناسب ہو یا نہ ہو۔ خواہ وہ ان مستعار ثقافتوں سے جو ہم نے اختیار کر رکھی ہیں ہم آہنگ ہو یا نہ ہو۔ خواہ وہ ہماری غیر ملکی تعلیم سے مطابقت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ بحیثیت قوم کے ہم اسلام سے فرار نہیں کر سکتے۔ ہم اس سے جتنا دور ہونگے اتنا ہی زیادہ ہم انتشار کے غار میں گرتے جائیں گے اس لئے اگر ہم کسی اعلیٰ مقصد کے لئے ایسا نہ بھی کریں تب بھی قومی یگانگت اور بقا کے خالص دنیاوی مقصد کے لئے ہم اسلام کو اپنی مملکت کی بنیاد اور طراز کی حیثیت سے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ پاکستان کے سیاق و سباق میں اسلام کے لئے یہ پہلی دلیل ہے اور اس سے وسیع تر اور اعلیٰ تر سیاق و سباق میں دوسری دلیل یہ ہے کہ ــــ

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشہ ہو!
جدا دیں ہو سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

وسیع معنوں میں ہمارے ملی اور قومی معاملات میں مذہب کو تسلیم کرنے کی تیسری وجہ بھی ہے اور اس کا تعلق فلسفۂ جنگ سے ہے۔ ایک ادبی مناظرہ میں لفظ جنگ کے استعمال پر بلاوجہ شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ انسان اپنی معجزنما ترقیوں کے باوجود ابھی تک جنگ کا بدل نہیں نکال سکا ہے۔ انسانی ذہن اور ثقافت کے ارتقار کے ساتھ ساتھ جنگ کے ادعا اور مقاصد میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ ابتدائی دور میں جانوروں، بستیوں یا عورتوں پر جنگیں ہوئیں۔ جیسے جیسے انسان وسیع النظر ہوتا گیا علاقوں اور ملکوں کی جنگ ہونے لگی۔ مزید ارتقار کے بعد صرف قومیت ہی جنگ کا باعث نہ رہی بلکہ ملی، قومی، سیاسی و اقتصادی گروہوں میں رقابت جنگ کا سبب بنی۔ اب ہم ایک ایسی منزل پر پہنچ چکے ہیں جہاں جنگ صرف نصب العین کی بنا پر چھڑے گی۔ لیکن انسانی ترقی کا یہی انجام نہیں۔ انسانی بصیرت مادی نصب العین سے بلند ہوتے ہی

جس کا بلند ہونا یقینی ہے آخری جنگ ایسی تہذیبوں کے درمیان چھڑے گی جو مادی دنیا کے بجائے روحانی دنیا میں انسان کے فرائض سے متعلق مختلف تصورات کی حامل ہوں گی۔ اس فیصلہ کن جنگ میں اسلامی تہذیب جو انمٹ روحانی اقدار کی حامل ہے ایک عظیم فریق کی حیثیت سے شریک ہوگی۔ آج ان ہی اقدار کو مضبوط کرکے ہم اس آخری جنگ میں حصہ لے سکیں گے۔ جو ہو سکتا ہے ۱۰ سال بعد، پچاس سال بعد یا مستقبل کی ان گنت صدیوں بعد، جو ابھی وقت کی گود میں پوشیدہ ہیں، لڑی جائے مگر ۸ کروڑ انسانوں کی قوم اپنے وسائل اور شاندار صلاحیتوں کے باوجود اس اہم مقصد کو نظر انداز کردے یا انسانی تقدیر پر اپنی مہر لگانے میں ناکام رہے تو تاریخ کا فیصلہ قطعی ہمارے خلاف ہوگا۔ جسے معاف نہیں کیا جاسکے گا۔

اس طرح ہماری قومیت کی تشکیلِ جدید ایسی ہی ہے جیسی کہ ایک نگینہ کی ہشت پہل تراش خراش اور جو قوسِ قزح کی طرح ہفت رنگ لیکن خود ایک ٹھوس ہیرے کی طرح شفاف و چمکدار ہوگی۔

یہ کام چار باتوں پر منحصر ہے پہلے تو ہمیں آزادی سے قبل کے جذباتی و نفسیاتی ماضی سے نکلنا ہے دوسرے یہ کہ ایک مشکل جغرافیائی صورتِ حال پر قابو پانا اور ایک ایسی سرزمین سے اپنے کو وابستہ کرنا ہے جو ۱۰۰۰ میل کے درمیانی فصل کے باوجود ایک ہی سرزمین کا ٹکڑا ہے۔ تیسرے ہمیں بے شمار علاقائی ثقافتوں اور زبانوں کے تانے بانے سے یک رنگی ثقافت کو جنم دینا ہے، جو اپنی گوناگونیوں کے باعث رنگا رنگ اور نہایت شاندار ہو۔ چوتھے ہمیں اپنی قومیت کے عناصرِ قوت کو اسی طرح بروئے کار لانا ہے کہ وہ ملت کے ناگزیر ڈھانچے کی معاون بن جائیں۔ میں اسے ناگزیر اس لئے کہتا ہوں کہ اسلام میں قومیت کا مفہوم تمام سیاسی تصوروں اور نظاموں کے مقابلہ پر سب سے زیادہ آفاقیت کو محیط اور بے شمار صلاحیتوں کا حامل ہے۔

اس چہار پہلو کام کی تکمیل صرف ایک سیاسی و انتظامی عمل ہی نہیں بلکہ درحقیقت ایک تخلیقی عمل ہے۔ اس لئے ادیب اس چیلنج اور اس کو قبول کرلے کے وسیع بلکہ لامحدود میدان میں اتر کر اپنا غیر معمولی کردار ادا کرسکتا ہے۔

ہر ادب بنیادی طور پر یا تو بڑی حد تک ذات کے متعلق یعنی داخلی ہوتا ہے یا بڑی حد تک ماحول کے متعلق یعنی خارجی ہوتا ہے۔ یہ مصنف کی فنکارانہ صلاحیت ہوتی ہے جو اسے بدیہی اور کلی حیثیت دیتی ہے۔ مصنف کی عظمت اس امر میں ہے کہ وہ اپنی روح کے اندرونی تجربوں اور اپنے ماحول کے بیرونی اثر کو سچائی اور حسن کی اعلیٰ تر حقیقتوں میں بدل دے۔ ایک دوشیزہ کی زلفوں کی آب و تاب، اس کی حسین آنکھوں کی چمک، اس کے اعضا کا تناسب، اور اس کے وجود کی مہک، ادب کے وجدان اور تخلیق کے لئے غالباً کافی ہیں۔ لیکن یہ ادب اسی وقت کوئی مقصد اور کوئی رُخ رکھ سکتا ہے جب اس میں اس ماحول کا بھی لحاظ رکھا جائے جس میں وہ پیدا ہوا اور سانس لے رہا ہے۔ لیکن اگر شاعر کے خوابوں کی یہ دوشیزہ ایسی معاشرت سے تعلق رکھتی ہے جہاں اعلیٰ امارت کے پردوں نے اسے غریب مردوں کی نظر سے پوشیدہ رکھا ہے، تو یقیناً وہ ایسے ادب کو جنم دے گی جس میں طبقاتی فرق اور ناانصافیوں پر خاص زور دیا جائے گا۔ لیکن اگر یہ دوشیزہ ظلم و جور کے ایسے معاشرہ میں پروان پا رہی ہے جس میں اس کا بہ آسانی اغوا کیا جاسکتا ہے اور اسے محلوں اور شاہی حرم کی کنیز بنا کے رکھا جاسکتا ہے تو یہ شکست، انا اور بغاوت کے ادب کو جنم دے گی۔ ہاں اگر اس کے برخلاف اس کی زندگی اور معاشرہ کے حالات اسے اپنا حسن بازار میں فروخت کرنے پر مجبور کرتے ہیں تو وہ لازماً معاشرتی انصاف اور اصلاح کا ادب پیدا کرنے کا باعث بنے گی۔ غالباً ادب مقصد اور رُخ کے اس حس کے بغیر بھی پیدا کیا جاسکتا ہے اور یہ ادب ایک اچھا ادب بھی ہوسکتا ہے لیکن لازماً یہ بڑا ادب نہ ہوگا۔

لہٰذا مقصد و رُخ کے اس جذبہ پر پاکستان کے مصنفین کو پورے خلوص اور حقیقت پسندی کے ساتھ توجہ دینا چاہئے۔ ہم طبعی اور مابعد الطبعیات کی زندگی کے متعدد مسائل سے دوچار ہیں۔ لیکن زندہ رہنے کے لئے ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ حب الوطنی اور قومی یکجہتی کا ہے۔ مستقبل کے قاری کو یہ کہنے کا موقع نہ دیجئے کہ آج کا مصنف اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہ ہوسکا۔ ★

★

★ (مباحثہ رائٹرز گلڈ۔ ڈھاکہ)

غزل

احمد ندیم قاسمی

میں ہوں، یا تو ہے خود اپنے سے گریزاں جیسے
میرے آگے کوئی سایہ ہے خراماں جیسے

تجھ سے پہلے تو بہاروں کا یہ انداز نہ تھا
پھول یوں کھلتے ہیں، جلتا ہے گلستاں جیسے

یوں تری یاد سے ہوتا ہے اُجالا دل میں
چاندنی میں چمک اُٹھتا ہے بیاباں جیسے

دل میں روشن ہیں ابھی تک ترے وعدوں کے چراغ
ٹوٹتی رات کے تارے ہوں فروزاں جیسے

تجھے پانے کی تمنّا، تجھے کھونے کا یقیں
تیرے گیسو مرے ماحول میں غلطاں جیسے

وقت بدلا، پہ نہ بدلا مرا معیارِ وفا
آندھیوں میں سرِ کہسار چراغاں جیسے

اشک آنکھوں میں چمکتے ہیں تبسّم بن کر
آ گیا ہاتھ ترا گوشۂ داماں جیسے

تجھ سے مل کر بھی تمنّا ہے کہ تجھ سے ملتا
پیار کے بعد بھی لب رہتے ہیں لرزاں جیسے

میرے اشعار میں یوں دفن ہیں اسرار ترے
پردۂ ساز میں آواز ہو پنہاں جیسے

بھری دُنیا میں نظر آتا ہوں تنہا تنہا
مرغزاروں میں کوئی قریۂ ویراں جیسے

چھا گئی ضبطِ فغاں پر کبھی یوں شدّتِ غم
گونج اُٹھے شورشِ زنجیر سے زنداں جیسے

غمِ جاناں، غمِ دوراں کی طرف یوں آیا
جانبِ شہر چلے دخترِ دہقاں جیسے

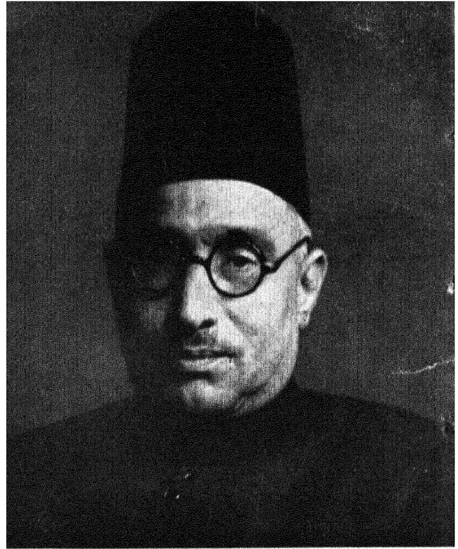
عصرِ حاضر کو سناتا ہوں اس انداز میں شعر
موسمِ گل ہو مزاروں پہ گل افشاں جیسے

زخم بھرتا ہے زمانہ، مگر اس طرح ندیم
سی رہا ہو کوئی پھولوں کے گریباں جیسے

چراغِ زندگی ہوگا فروزاں ہم نہیں ہوں گے
چمن میں آئے گی فصلِ بہاراں ہم نہیں ہوں گے

جوانو! اب تمہارے ہاتھ میں تقدیرِ عالم ہے
تمہیں ہوگے فروغِ بزمِ امکاں ہم نہیں ہوں گے

اگر ماضی منور تھا کبھی تو ہم نہ تھے حاضر
جو مستقبل کبھی ہوگا درخشاں ہم نہیں ہوں گے



مولانا عبدالمجید سالک مرحوم

مسلم ٹاؤن لاہور
۲۴۔ اپریل

عزیز مکرم۔ السلام علیکم۔

خط ملا۔ سوالات کا جواب لکھ کر بھیجتا ہوں۔ تبصرہ ذکر اقبال پر نظر سے گزرا تھا۔ شکریہ۔

آپ نے کسی "انجمن خدام الصوفیہ" کا نام اور اس کے رسالے کا نام "انوار الصوفیہ" چھپا ہوا دیکھا ہے یا نہیں؟ صوفیا لکھنا درست نہیں۔ صوفیہ میں پھر بھی ایک قرینہ صحت کا موجود ہے گو صحیح یہ بھی نہیں۔ آپ کسی مستند ادیب یا عالم کی کتاب میں صوفیا نہیں پائیں گے۔ صوفیہ البتہ جابجا ملے گا

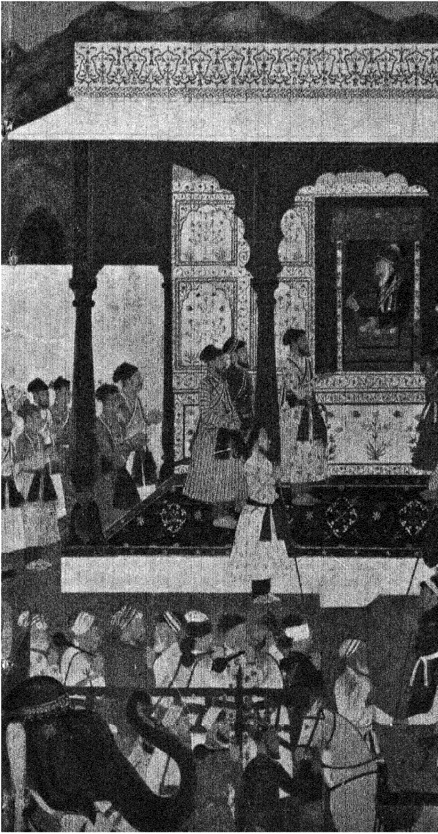
"حامی بھرنا" "ہاں کرنے" کو کہتے ہیں۔ اور خالص دہلی کا اردو محاورہ ہے اس لیے اس میں جائے غلطی کا کوئی دخل نہیں۔ حامی بھرنا حمایت کرنے کو نہیں کہتے۔ صرف "ہاں کرنے" یعنی آمادگی ظاہر کرنے کو کہتے ہیں۔

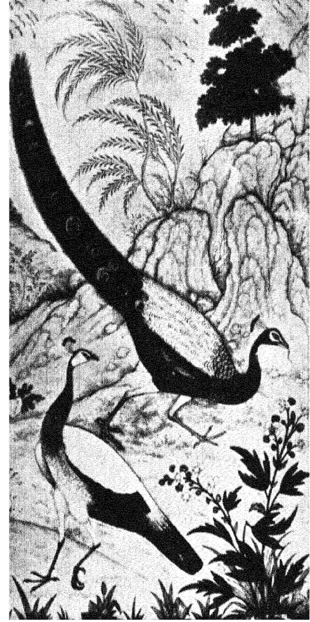
آپ نے جن حضرات سے دریافت کیا۔ اور جنہوں نے صوفیا اور "حامی بھرنا" کو درست بتایا وہ زبان سے بے خبر ہیں۔

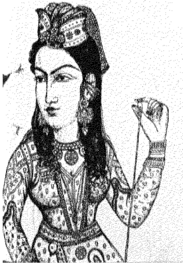
سالک

عکس تحریر
(خط بنام شفیع عقیل)

مغلیہ مصوری









۱۔ طاؤس (قلم: استاد عبدالصمد، عہد اکبری)

۲۔ دربار شاہجہاں (عہد شاہجہانی کی تصویر)

۳۔ اشرف زمانی بیگم زوجہ بہادر شاہ ظفر (مختصر شبیہ نگاری)

۴۔ ایک مغل شہزادی (اٹھارویں صدی) (مختصر شبیہ نگاری)

ماہ نو، کراچی، نومبر ۱۹۵۹ء

بہ یادِ رفتگاں :

مولانا عبدالمجید سالکؔ مرحوم

(چند یادیں)

شفیع عقیل

یہ سنہ ۱۹۵۱ء کا ذکر ہے۔ شام کا وقت تھا اور، میں اور مجیدؔ لاہوری سڑکوں پر بیکار گھومنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ نہ کوئی پروگرام تھا اور نہ کوئی خاص دلچسپی۔ مقصد صرف گھومنا تھا بے ارادہ اور وہ بھی پیدل۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ ابھی شام ہی تھی اور رات بھیگنے میں خاصی دیر تھی۔ اس لئے نہ کلفٹن جا سکتے تھے اور نہ نیٹی جیٹی کے پل پر بیٹھ کر سمندر کی خنک ہوا سے لطف اندوز ہو سکتے تھے شاید یہی وجہ تھی کہ ہم چند منٹ گھومے اور تھک گئے۔ اور یہ گھومنا بھی صرف بندر روڈ تک ہی محدود رہا۔ اس بے کیفی کو دیکھتے ہوئے طے یہ ہوا کہ مولانا سالکؔ کے پاس چلا جائے۔ کچھ لطیفے ہوں گے اور کچھ باتیں سنیں گے۔ پرانے یاروں کے قصے چلیں گے اور بیتی یادیں ابھر جائیں گی۔ اور اس طرح وقت آسانی سے کٹ جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ہمارے پیش نظر سالکؔ صاحب کے پاس جانے کا محض یہی ایک مقصد تھا۔ اس وقت نہ تو ہم علم کے موتی رولنا چاہتے تھے اور نہ ادبی مسائل پر گفتگو سننے کا اشتیاق تھا۔ مجیدؔ کا تو معلوم نہیں، لیکن میرا یہی تصور تھا۔ اور جہاں تک مجھے اندازہ ہے اس وقت مجیدؔ بھی اسی موڈ میں تھے ـــ لیکن ہاں، میں آپ کو یہ بتانا تو بھول ہی گیا، کہ اس سے پہلے میں مولانا عبدالمجید سالکؔ سے کبھی نہیں ملا تھا! بارہا ان کے تذکرے ضرور ہوئے، کئی بار اُن کے بارے میں گفتگو بھی ہوئی اور سینکڑوں دفعہ ان کے لطیفے اور چٹکلے سنے مگر ان سے ملاقات ابھی تک نہ ہو سکی تھی۔ جہاں تک ان کی تحریروں کا تعلق تھا وہ تو اس زمانے سے پڑھتے آرہے تھے جب وہ "مولانا عبدالمجید سالکؔ" کم اور "عبدالمجید سالکؔ بٹالوی بی۔ اے" زیادہ تھے۔ تاہم اُن کی تحریروں سے دلچسپی اور اُن کی شخصیت کا احترام دل میں بہت تھا۔ ان سے دو چار بار مراسلت بھی ہو چکی تھی، لیکن ان سب باتوں کے باوجود کبھی ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اور اس وقت ان کے پاس جانے کا پروگرام بے مقصد اور اچانک تھا۔ جب ہم سالکؔ صاحب کے پاس جا رہے تھے، عین اسی وقت ایکا ایکی مجیدؔ کو نہ جانے کیا یاد آگیا کہ بولے: "تم مولانا کے پاس چلو ـــ میں ابھی آتا ہوں۔"

اس وقت مجیدؔ سے یہ پوچھنا قطعی لاحاصل تھا کہ انھیں کیا کام یاد آگیا ہے، کیونکہ عام طور پر ان کے کام اچانک اور ایسے ہی موقعوں پر یاد آجایا کرتے تھے۔ اور ان کے متعلق دریافت کرنا پرلے درجے کی حماقت تھی۔

ان دنوں مولانا عبدالمجید سالکؔ لاہور سے کراچی آئے ہوئے تھے اور ان کا قیام نگار ہوٹل میں تھا۔ وہ جب بھی کبھی کراچی آئے ان کا قیام ہمیشہ نگار ہوٹل ہی میں ہوا اور یہ بھی انؐ کی وضع داری کی ایک دلیل تھی۔ خیر، میں کہہ یہ رہا تھا کہ مجیدؔ تو اچانک یاد آنے والے کام کے سلسلے میں چلے گئے۔ اور میں نگار ہوٹل میں پہنچ گیا۔ سالکؔ صاحب ایک ہی روز پہلے کراچی پہنچے تھے اور اُن کے کمرے کا نمبر مجھے یاد تھا۔ اور میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ ان کے حلیہ کے بارے میں، میں نے طرح طرح کی باتیں سوچ رکھی تھیں۔ نام کے ساتھ مولانا ہونے کی وجہ سے میرا خیال تھا کہ ان کی بڑی سی داڑھی ہوگی، مونچھوں کی لبیں کٹی ہوں گی اور قرأت کے انداز میں باتیں کرتے ہوں گے۔ سرسیدؔ اور حالیؔ کی تصویریں دیکھنے کے بعد ان کے متعلق یہ خیال اور بھی پختہ ہو گیا تھا۔ جب میں نے یاد کئے ہوئے نمبر والے کمرے کے دروازے پر دستک دی تو اندر سے ذرا بھاری اور بارعب آواز آئی: "کون ـــ؟ اندر آجایئے ـــ!"

لیکن جونہی میں دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا تو ایک لمحہ کے لئے تو کچھ سٹپٹا گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کمرے کا نمبر بھول کر کسی دوسرے کمرے میں آپہنچا ہوں۔ کیونکہ اس وقت کمرے میں جو صاحب سامنے بیٹھے تھے وہ میرے تصور کے بالکل خلاف تھے۔ نہ ان کی لمبی لمبی داڑھی تھی، نہ مونچھیں، اور نہ مولویانہ طرزِ تکلم ـــــ درمیانہ قد، جسم قدرے بھاری، رنگ گندمی اور خط و خال موزوں، آنکھوں میں چمک اور چہرے پر بشاشت۔ داڑھی صاف اور مونچھیں بہت چھوٹی، سر پر چھوٹے چھوٹے اُلٹے بال جن کی سفیدی اور سیاہی آپس میں دست و گریباں، آنکھوں پر سفید شیشوں کی عینک اور گلے میں نہ ہونے کے برابر پان، کشادہ پیشانی اور گول چہرہ۔ یہ تھے مولانا عبدالمجید سالک۔ ان کا یہ سراپا میں نے ایک ہی نظر میں دیکھ لیا تھا۔ اس وقت وہ ململ کا سفید کرتہ اور سفید شلوار پہنے کہنی کا سہارا لئے چارپائی پر یوں نیم دراز تھے جیسے گندم کا کوئی بہت بڑا بیوپاری ابھی ابھی چڑھتے بھاؤ سودا کرکے فارغ ہوا ہو!

انھوں نے لیٹے لیٹے مجھے ایک نظر دیکھا اور پھر ذرا مسکرا کر بولے:ـــ "بیٹھیے۔"

اور پیشتر اس کے کہ وہ میرا نام، یا میرے آنے کا سبب، دریافت کرتے، میں نے جلدی سے اپنا تعارف کرا دیا میرا نام سنتے ہی وہ اور بھی خندہ پیشانی سے بولے: "اچھا ـــ تو آپ ہیں شفیع عقیل!"

اس وقت انھوں نے "اچھا" اور "شفیع عقیل" کے الفاظ کو خاصا کھینچ کر ادا کیا تھا۔ "وہ ٹرک کہاں رہ گیا۔؟" انھوں نے پوچھا۔ ٹرک سے ان کی مراد مجید لاہوری سے تھی۔ ضرورت سے زیادہ موٹا ہونے کی وجہ سے وہ مجید کو عام طور پر ٹرک کہا کرتے تھے۔ اور ٹرک بھی جس میں مٹی بھری ہوئی ہو۔ انھوں نے مجھ سے یہ سوال کرنے کے ساتھ ہی اپنے دائیں ہاتھ سے ناک دبائی۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ یہ ان کی عادت تھی۔ باتیں کر رہے ہوں یا تنہائی میں بیٹھے ہوں، کوئی ادبی مسئلہ زیرِ بحث ہو یا محض لطیفے ہو رہے ہوں، وہ اپنے دائیں ہاتھ سے درمیان میں کبھی کبھی ناک کو چھوتے اور یا پھر دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں سے فضا میں اس طرح لکھنے لگتے جیسے باقاعدہ کتابت کر رہے ہوں۔ اس طرح فضا میں لکھنا بھی اُن کی عادت میں شامل تھا۔ بلکہ ایک بار تو میں نے پوچھا بھی کہ۔ "مولانا! آپ یہ فضا میں اس طرح کیا لکھتے رہتے ہیں۔؟" جواب میں ہنس کر بولے۔ "بس عادت سی ہو گئی ہے۔" اور پھر لمحہ بھر رُک کر خود کہنے لگے، "میں سمجھتا ہوں میرا خط لکھنے سے اتنا پختہ اور صاف نہیں ہوا جتنا اس طرح فضا میں لکھتے رہنے سے ہوا ہے۔" بہرصورت اس وقت وہ فضا میں نہیں لکھ رہے تھے انھوں نے ہاتھ سے مُنہ صاف کیا اور پھر میرا جواب سُنے بغیر بولے: "اچھا تو شفیع صاحب ـــ اور سنائیے؟"

بھلا میں کیا سناتا ـــ؟ میں تو خود سننے گیا تھا اور وہ بھی لطیفے۔ مگر مجید کے نہ ہونے سے وہ پروگرام یونہی رہ گیا۔ میری ان سے پہلی ملاقات تھی۔ نہ ان سے بے تکلفی سے بول سکتا تھا اور نہ قہقہہ مار کر ہنس سکتا تھا۔ لہٰذا ہوا یہ کہ میں عقیدت، احترام، اور رعب میں کرسی پر یوں بیٹھا رہا، جیسے کسی نے زبردستی پکڑ کر بٹھا دیا ہو اور اب وہی آکر اٹھائے گا۔ سالک صاحب اس دوران برابر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اور میں درمیان میں کبھی ہنس دیتا اور کبھی سنجیدہ ہو جاتا لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس وقت میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ ہنسنا کب شروع کردوں اور سنجیدہ کب سے بنوں۔ بہرحال مجید کو نہ آنا تھا اور نہ آئے۔ میں نے جوں توں کرکے، جس طرح بھی بن پڑا وقت گزارا، اور وہاں سے بھاگ نکلا۔

اس کے بعد یہ معمول بن گیا کہ اِدھر شام ہوتی اور اُدھر میں اور مجید نگار ہوٹل جا دھمکتے۔ پھر سالک صاحب کی باتیں ہوتیں اور ہم۔ ابھی یہاں کا قصہ چھڑا ہوا ہے تو تھوڑی دیر بعد کہیں اور کا ذکر ہو رہا ہے تاثیر کی باتیں ہو رہی ہیں، پطرس کے لطیفے سنائے جا رہے ہیں، حفیظ کے معرکوں کی داستانیں دہرائی جا رہی ہیں۔ "نیاز مندانِ لاہور" کے تذکرے چھڑ جاتے یا سالک صاحب کی صحافتی زندگی کی کہانیاں چل نکلتیں تو وقت کا احساس تک نہ رہتا۔ لطیفے پر لطیفہ ہو رہا ہے، چٹکلے پر چٹکلہ چلا آ رہا ہے، اور جملے پر جملہ کسا جا رہا ہے لیکن مجال نہیں کہ پاسِ ادب ہاتھ سے چلا جائے۔ سالک صاحب اپنی وضع داری کو کبھی نہ بھولتے تھے۔ رکھ رکھاؤ کا دامن کبھی ان کے ہاتھ سے نہ چھوٹتا تھا۔ وہ چھوٹوں میں چھوٹے اور بڑوں میں بڑے تھے لیکن اس کے باوجود ان کی وضع داری میں کبھی فرق نہ آیا۔ "نیاز مندانِ لاہور" کے حلقہ میں صفِ اوّل کی ادبی شخصیتیں شامل تھیں، پطرس، تاثیر، حفیظ، صوفی، مہر، مجید ملک، چغتائی، تاج، سبھی لوگ تھے لیکن یہ لوگ "نیاز مندانِ لاہور" میں شریک ہوتے ہوئے بھی سالک صاحب کے نیاز مند رہے۔ اور یہاں

کے بڑے ہونے کی دلیل تھی ۔ بڑے ادیب یا فنکار تو بہت ہوتے ہیں لیکن ایسے فنکار یا ادیب جن کی شخصیت بھی بڑی ہو بہت کم ہوتے ہیں۔ سالک صاحب کی ادبی اور علمی حیثیت کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت بھی بڑی تھی ۔ اور اسی بڑی شخصیت کی دلکشی تھی کہ شام ہوتے ہی، بڑی باقاعدگی سے میں اور مجید ان کے پاس پہنچ جاتے ۔ ادھر ان کا یہ معمول تھا کہ وہ صبح ہی صبح اٹھتے اور ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر پہلے وقت میں جو کام ہوتا اس سے فرصت پالیتے اور سیدھے نمکدان کے دفتر آجاتے۔ گرمیوں کے دن، دوپہر کا وقت، "نمکدان" کا دفتر اوپر کی منزل میں تھا۔ مولانا کا سانس چڑھا ہوا ہوتا، آتے اور اپنی بھاری آواز میں السلام علیکم، کہہ کر شیروانی ایک طرف ٹانگ دیتے۔ چھڑی دیوار سے ٹیک جاتی، جناح کیپ میز پر رکھ دیتے اور دفتر میں بچھے ہوئے تخت پر گاؤ تکیہ کا سہارا لے کر نیم دراز ہو جاتے۔ نیچے ایرانی کے ہوٹل سے ایک ٹھنڈا سوڈا منگوا کر پیتے اور پھر ان کی چٹخے دار باتیں شروع ہو جاتیں۔ یوں معلوم ہوتا جیسے مصری کی ڈلیاں چبائے چلے جا رہے ہیں۔ روزانہ کوئی نہ کوئی تازہ لطیفہ ہوتا، کوئی نہ کوئی نیا واقعہ سناتے۔

سالک صاحب کا طنز بڑا دھیما مگر تیز ہوتا تھا۔ اور اس دھیمے پن کی وجہ ان کی ذات تھی۔ ان کے لہجہ تک میں دھیما پن تھا۔ دراصل وہ میانہ روی اور آہستہ روی کے قائل تھے۔ زندگی کے کسی شعبہ میں بھی وہ جلد باز نہ تھے۔ اپنی روزمرہ کی زندگی میں بھی ان کے چند اصول تھے جن کی سختی سے پابندی کرنا، ان کا ایمان تھا۔ دوستی ہو یا دشمنی، ان کے ہاں جلد بازی نام کو نہ تھی۔ وقت کو دیکھ کر بات کرتے اور حالات کو سمجھ کر قدم اٹھاتے تھے۔ ان کی نظر جس قدر گہری تھی اتنی ہی محتاط بھی۔ یہ قرینہ ان کی زندگی میں ہمیشہ برقرار رہا۔ یہاں تک کہ انہوں نے ادب اور سیاست میں بھی وقت اور حالات کو دیکھ کر اپنے لئے راستہ کا تعین کیا۔ دراصل وہ وقت اور حالات سے سمجھوتہ کرتے رہنے کی عملی دانش سے واقف تھے۔ اور یہ خصوصیت ان کی تحریر و تقریر میں بھی موجود تھی۔ چنانچہ وہ طنز بھی کرتے تھے تو بڑا دھیما دھیما میٹھا میٹھا ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار کراچی کے ایک تاجر نے اپنے گھر پر مشاعرے کی مخصوص نشست کا انتظام کیا۔ کھانا بھی تھا اور کھانے کا انتظام ایک کھلے لان میں میزوں پر کیا گیا تھا۔ جونہی کھانے کے لئے بلایا گیا یار لوگ اس طرف لپکے۔ مجید کھانے میں بہت تیزی دکھایا کرتے تھے۔ میں اور سالک صاحب ایک طرف کھڑے کھا رہے تھے کہ اتنے میں مجید آئے۔ ان کے ہاتھ میں پلیٹ تھی جو اس وقت بھی بھری ہوئی تھی اور وہ خاصا کھا بھی چکے تھے۔ وہ جلدی سے میری طرف بڑھے اور بولے۔

"شفیع کھانے میں کیا کیا ہے۔؟" پیشتر اس کے کہ میں مجید کو کوئی جواب دیتا سالک صاحب ہاتھ سے لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسکرا کر بولے: "یہ لوگ بچ گئے ہیں" اور مجید تلملا کر رہ گئے۔

سالک صاحب نے اس وقت کی حکومت کی ایک باقاعدہ ملازمت اختیار کر لی تھی اور اب ان کا قیام مستقل طور پر کراچی ہی میں ہو گیا تھا۔ رامچندر ٹیمپل روڈ پر انھوں نے ایک فلیٹ پگڑی پر لے لیا تھا۔ اور اب وہیں محفلیں جمنے لگی تھیں۔ عقیدت مندوں، دوستوں، اور ملنے والوں کا یوں تانتا بندھا رہتا تھا جیسے کسی مشہور معالج کا مطب ہو۔ ایک آتا اور دوسرا جاتا۔ یہاں تک کہ رات ہو جاتی اور مجید کہیں گھومنے کا پروگرام بناتے یا پھر مشورہ دیتے۔ "مولانا! آج کوئی فلم دیکھیں۔؟" اور کبھی کبھار سالک صاحب بھی فلم دیکھنے کے لئے تیار ہو جاتے۔ اس سلسلہ میں میری بدقسمتی نے جو مجھے پکارا تو ایک روز ان کے ساتھ میں بھی فلم دیکھنے چل دیا۔ مجید کہنے لگے۔ "شفیع تو وی چل ۔"

لہذا "میں وی چل دیا" لیکن جب وہ ایک پرانے اور تیسرے درجے کے سینما کے پاس جا کر رک گئے تو بڑی پریشانی ہوئی، وہاں ایک محیّر العقول قسم کی نام نہاد سائنسی فلم چل رہی تھی۔ میں نے کہا بھی کہ:

"فلاں سینما میں اچھی فلم چل رہی ہے"۔ لیکن مجید اور سالک صاحب دونوں کا کہنا یہ تھا کہ "یہی دیکھتے ہیں۔ سائنس کی فلم ہے معلوماتی ہو گی"۔ معلوم نہیں اس میں مجید کے ذوق کو زیادہ دخل تھا یا سالک صاحب کی پسند کو لیکن ہوا یہ کہ فلم کے دوران مجید اور سالک صاحب دونوں بڑی محویت سے فلم دیکھتے رہے اور میں بیٹھا دل ہی دل میں کڑھتا رہا۔ اس کے بعد جب بھی کبھی مجید نے میرے سامنے فلم دیکھنے کا ذکر چھیڑا، میں وہاں سے سر پہ پیر رکھ کر بھاگ کھڑا ہوتا تھا۔

غالباً ۱۹۵۲ء کی بات ہے۔ پطرس پاکستان آئے ہوئے تھے۔ انہی دنوں اتفاق سے ایک دن سالک صاحب کے فلیٹ میں پانی نہیں آیا تھا۔ گھر میں بڑی پریشانی تھی۔ لیکن شام کو دیکھا تو پطرس مرحوم اپنی کار میں پانی کا ایک بڑا سا گھڑا رکھے چلے آ رہے ہیں۔ ملازم نے

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

کلمۂ حصر

محمد اقبال سلمان

"ہی" ایک کلمہ ہے، جسے قواعد اردو میں کلمۂ تخصیص کہتے ہیں۔ مختلف موقعوں پر جن مختلف معنوں میں اسے استعمال کیا جاتا ہے، ذیل میں ان کی وضاحت کی جاتی ہے:

۱۔ صرف، فقط کے معنوں میں۔ غالب:

منہ نہ دکھلاوے نہ دکھلا پر بانداز عتاب
کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

۲۔ مطلق، قطعاً کے معنوں میں۔ جلال:

ناصح بتائیں کیا ہمیں چپ لگ گئی ہے کیوں
جس کا جواب ہی نہیں یہ وہ سوال ہے

۳۔ بلاشبہ، یقیناً کے معنوں میں۔ "تم بات ہی ایسی کرتی ہو کہ نہ رکھی جائے اور نہ اٹھائی جائے" (رویائے صادقہ)

۴۔ بالآخر، آخرکار کے معنوں میں۔ داغ:

دروازے پر آ ہی گئے وہ میری صدا سے
ملتا تھا بہت غیر کی آواز کا انداز

۵۔ فوراً، بلاتاخیر کے معنوں میں۔ "میں درگاہ سے شہر میں آیا۔ آتے ہی میں نے فصد کھلوائی" (نادراتِ غالب)

۶۔ تاکید کے معنوں میں، جیسے، نہ حامد ہی آیا نہ محمود؛ زید ہی نے کہا تھا، عمرو ہی گیا تھا۔ محزوں:

نہ تو نامہ ہی نہ پیغام زبانی بھیجا
حیف محزوں مجھے یارانِ وطن بھول گئے

۷۔ کم کو مزید کم اور زیادہ کو اور بھی زیادہ کر کے دکھانے کے لئے نیز مبالغے کے لئے بھی آتا ہے۔ جیسے وہ بڑا ہی عالم ہو، وہ بہت ہی شریر ہے۔ "یاد رکھو! مردم آزادی بہت ہی بُری چیز ہے" (امراؤ جان ادا)

<u>ہی ضمائر و اسماء کے ساتھ:</u>

جب "ہی" ضمائر، اسمائے اشارہ اور بعض دوسرے حروف کے متصل واقع ہو، تو عموماً اپنی الگ شکل میں باقی نہیں رہتا۔ بلکہ اپنے ماقبل میں مدغم ہو جاتا ہے۔ بعض صورتوں میں دوسرے کلمے کے ساتھ اس طرح گھل مل جاتا ہے کہ بظاہر اس کے وجود کا احساس تک نہیں ہوتا۔ جن الفاظ میں کسی نہ کسی شکل میں "ہی" پایا جاتا ہے، وہ حسب ذیل ہیں:

یہی۔ اصل میں "یہ ہی" تھا۔ اب الگ الگ نہیں بولتے۔ اشارۂ قریب (یہ) پر زور دینے کے لئے "خصوصاً یہ" یا "ایسا ہی" کے معنوں میں مستعمل ہے۔ داغ:

گر یہی قسمیں ہیں تو مجھ کو یقین — آپ کے سر کی قسم بس ہو چکا

وہی ۔ "وہ ہی" کا مخفف۔ "یہ ہی" کی طرح "وہ ہی" بھی متروک ہے۔ "خاص کر وہ" یا "صرف وہ" کے معنی دیتا ہے۔ مومن:

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

نظم میں کبھی "وہ ہی" بھی استعمال کر لیتے ہیں۔ مومن:

نہیں اس کے خواں سے کوئی تلخ کام
وہی اشتہا بخشے، وہ ہی طعام

اُسی ۔ "اُس ہی" کا مخفف۔ اسمِ اشارۂ قریب (اِس) اور اسمِ اشارۂ بعید (اُس) کے حصر کے لئے آتا ہے۔ الگ الگ لکھنا بولنا تقریباً متروک ہے۔ امیر:

لہو رو آنسوؤں کا قحط اگر ہے
اِسی دن کے لئے خونِ جگر ہے!

غالب:

محبّت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

اُنھیں ۔ بکسرِ اول و دوم و سکون یائے معروف۔ "ہی" کی ہائے ہوز، ہائے مخلوط سے اور یائے معروف، یائے معروف و نونِ غنہ سے بدل گئی ہے۔ اسمِ اشارۂ قریب جمع (اِن) اور اسمِ اشارہ بعید جمع (اُن) کے حصر کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ تعظیماً واحد کے لئے بھی آتا ہے۔ اس کی جگہ "اُن ہی" کا استعمال غیر فصیح ہے۔

(الف) اِنھیں "اِن کے بیٹے کی شادی کی تقریب میں آئے تھے۔ اُنھیں کے ہاں اترے تھے" (نادراتِ غالب)

(ب) اِنھیں ۔ امانت لکھنوی:

سرشکِ دیدہ ہائے تر سے دھو ڈالوں گا عصیاں کو
اِنھیں چشموں سے اے دل آبروِ محشر میں پانی ہے

"اُنھیں" جب یائے مجہول سے پڑھا جائے، تو "اُن کو" کے معنی دیتا ہے۔ اکبر الٰہ آبادی:

اُنھیں شوقِ عبادت بھی ہے اور گانے کی عادت بھی
نکلتی ہیں دعائیں اُن کے مُنھ سے ٹھمریاں ہو کر!

مجھی (مجھ ہی) ضمیر واحد متکلم (مجھ) کے حصر کے لئے آتا ہے۔ ذوق:

یا تو پاسِ دوستی تجھ کو بتِ بے باک ہو
یا مجھی کو موت آ جائے تو قصہ پاک ہو

تجھی (تجھ ہی) ضمیر واحد مخاطب (تجھ) کے حصر کے معنی دیتا ہے۔ خواجہ میر درد:

بستے ہیں ترے سائے میں سب شیخ و برہمن
آباد تجھی سے تو ہے گھر دیر و حرم کا

ہمیں (ہم ہی) بفتحِ اوّل و کسرِ دوم و سکونِ سوم۔ ضمیر جمع متکلم (ہم) کے حصر کے لئے مستعمل ہے۔ داغ:

ہمیں تھے وہ جو کبھی تھے خزانۂ عرفاں ۔۔۔ ہمیں ہیں اب کہ جو ڈھونڈو تو ہم میں خاک نہیں

کبھی نظم میں "ہم ہی" بھی لے آتے ہیں، جیسے:

دھول دھپّا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

اگر یائے مجہول کے ساتھ پڑھا جائے، تو اس کے معنی ہوں گے: ہم کو۔ غالبؔ:

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں؟
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں؟

تمھیں (تم ہی) بضم اول و کسر دوم و سکونِ سوم۔ ضمیر مخاطب (تم) کے حصر کے لئے آتا ہے۔ غالبؔ:

جو بات بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمھیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

تمھیں (بیائے مجہول "تم کو" کے معنی دیتا ہے۔ "انھوں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا کہ جاتے کہاں ہو؟ اب تو مجھے اور تمھیں جل کر راکھ کا ڈھیر ہونا ہے" (آبِ حیات)

سبھی: "سب ہی" کا مخفف ہے اور "سب" کے حصر کے لئے آتا ہے۔ میر دردؔ:

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بت خانہ تھا
ہم سبھی مہمان تھے واں تو ہی صاحب خانہ تھا

کہیں: "کہاں ہی" کا مخفف ہے۔ متعدد معنوں میں مستعمل ہے، لیکن زیادہ تر "کسی جگہ" کے معنی دیتا ہے۔ جلالؔ لکھنوی:

اُٹھے جو بزمِ یار سے تنہا ہم آئے گھر
طاقت کہیں، حواس کہیں، دل کہیں رہا

وہیں: "وہاں ہی" کا مخفف ہے۔ اُسی جگہ، اسی مقام پر۔ حالیؔ:

مگر ہم کہ اب تک جہاں تھے وہیں ہیں
جمادات کی طرح بارِ زمیں ہیں

یہیں: "یہاں ہی" کا مخفف ہے۔ اسی جگہ، اسی مقام پر۔ ناسخؔ:

جسم خاکی کو یہیں چھوڑیں عدم کی راہ لیں
اب وطن کو چلیے گردِ دشتِ غربت جھاڑ کر

جونہیں، جونہی، جُونہیں: اکیلا "جوں" حرفِ تشبیہ[1] ہے، لیکن جب اس کے ساتھ "ہی" مل جائے، تو حرفِ شرط بن جاتا ہے۔ حالیؔ:

جونہی کان میں حق کی آواز آئی
لگا کرنے خود ان کا دل رہنمائی

یُونہیں، یُونہی: (یوں ہی) یہ لفظ "یُہیں" (بضم اول و کسر دوم و سکون سوم) بھی بولا جاتا ہے۔ اساتذہ نے اسے زمین اور قرین کے قافیہ میں نظم کیا ہے۔ بعض کے نزدیک "یونہی" یا "یوں ہی" صحیح ہے اور "یونہیں" غلط، لیکن اکثر اہل علم کے نزدیک ترجیح "یونہیں" کو حاصل ہے، کیونکہ حرفِ علت پر ختم ہونے والے الفاظ کے آخر میں نون غنہ کا اضافہ اردو میں عام ہے۔ اسی طرح، ایسی:

---

[1] ذوقؔ: جوں سبزۂ دوئیدہ تہِ سنگ ہمارا سر زیرِ گراں بارِ الم اٹھ نہیں سکتا

یونہیں گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

کبھی (کب ہی) کب (ظرفِ زمان) کے حصر کے لئے آتا ہے۔ کسی وقت۔ غالب:

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

تبھی[1] (تب ہی)، اسی وجہ سے، اسی سبب سے۔ خواجہ میر درد:

یوں وعدے ترے دل کی تسلی نہیں کرتے
تسکین تبھی ہووے گی جس آن ملے گا

جبھی[1] (جب ہی، اسی لئے)، اسی واسطے۔ جلیل:

بتوں کے ذکر سے رکتی نہیں زباں کم بخت
جبھی تو اپنی دعا میں اثر نہیں آتا

یہ کلمات ہیں، جن میں "ہی" شامل ہے۔ ان کے علاوہ ایک لفظ "آپ" بھی ہے، جس کے متصل "ہی" واقع ہو، تو مخفف صورت "آپی" بن جاتی ہے۔ داغ نے کہا ہے:

لن ترانی سے غرض کیا حسنِ عالم سوز کو
ہم نظر آپی چرا جاتے ہیں اکثر دیکھ کر

لیکن ادھر کچھ مدت سے مخفف صورت کا استعمال صرف زبانوں پر رہ گیا ہے۔ تحریر میں مکمل شکل "آپ ہی" کو ترجیح دی جانے لگی ہے۔

"ہی" کا محلِ استعمال:

قواعد زباں کی رو سے "ہی" مندرجہ ذیل موقعوں پر استعمال ہوتا ہے:

(الف) (حرفِ جار) سے پہلے، مومن:

جو پہلے دن ہی سے دل کا کہا نہ کرتے ہم
تو اب یہ لوگوں سے باتیں سنا نہ کرتے ہم

(ب) میں (علامتِ ظرف) سے پہلے۔ ناسخ:

ہر کھیر کے دائرے ہی میں رکھتا ہوں میں قدم
آئی کہاں سے گردشِ پرکار پاؤں میں؟

(ج) نے (علامتِ فاعل سے پہلے، جیسے:

تم ہی نے داغ نہ اے نہیں اٹھائے ستم
یوں ہی سلف سے مرے یاد ہوتی آئی ہے

یہ قاعدہ صرف ضمیر مخاطب، ضمیر غائب اور ضمیر جمع متکلم پر عاید ہوتا ہے۔ ضمیر متکلم واحد کی صورت میں ہی کا استعمال علامتِ

---

[1] ، [1] تب اور جب حروفِ شرط میں بھی شمار ہوتے ہیں اور اسماء موصولہ میں بھی۔

فاعل کے بعد ہوگا۔ مثلاً "میں نے ہی لکھا تھا"۔ "میں ہی نے" لکھنا اور بولنا غلط ہے۔

(ک) پہ اور پر (حرفِ ربط) سے پہلے۔ اکبر الٰہ آبادی:

اے دوست! مجھے تو ہے خدا ہی پہ بھروسا
دشمن کو مبارک ہو میری گھات میں رہنا

(ل) تک (حرفِ انتہا) سے پہلے — "جو کچھ راستے کی صعوبتیں اور خرابیاں تھیں، وہ بھی ان بھوتوں ہی تک تھیں"۔ (نیرنگِ خیال)

(و) کو (علامت مفعول) سے پہلے — "حالانکہ تم بالتخصیص مسلمانوں ہی کو ملزم ٹھہراتے ہو"۔ (ابن الوقت)

(ف) کا، کے، کی (حرفِ اضافت) سے پہلے، جیسے:

ہے قطعِ رہِ عشق میں اے ذوق ادب شرط
جوں شمع تو اب سر ہی کے بل جائے تو اچھا

مختصر یہ کہ "ہی" کا استعمال اس لفظ کے بعد ہونا چاہیئے، جس کی تخصیص، تاکید یا حصر مطلوب ہو۔ اس صورت میں حروفِ ربط "ہی" کے بعد آ سکتے ہیں، اس سے پہلے نہیں۔ اسی طرح دو منفی جملوں میں "ہی" کو حرفِ نفی کے ساتھ نہیں لایا جا سکتا، جیسے "کسی شخص کو نجی، خاندانی، گھریلو یا اس کے مماثل امور میں مستبدانہ مداخلت کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا اور نہ ہی اس کی عزت اور شہرت پر حملہ کیا جائے گا"۔ یہاں دوسرا منفی جملہ یوں ہونا چاہیئے: "نہ اس کی عزت اور شہرت ہی پر حملہ کیا جائے گا"۔

بعض کے نزدیک "نہایت" کے بعد ہی کا استعمال جائز نہیں۔ دلیل یہ دی جاتی ہے کہ نہایت کے معنی ہیں "بہت ہی" اور "نہایت ہی" کے معنی ہوں گے "بہت ہی ہی"۔ یہ استدلال صحیح نہیں۔ اساتذہ کی نظم و نثر میں "نہایت ہی" برابر استعمال ہوا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد "محصنات" میں لکھتے ہیں:

"بیاہ تک مبتلا کی زندگی نہایت ہی فکر سے گزری"۔

بہادر شاہ ظفر کا ایک مقطع ہے:

زمیں نہایت ہی تھی یہ مشکل ظفر ہے استاد پر وہ کامل
غرض دکھائے نہ ہی بنا کر زمیں پہ گو ہر فلک پہ اختر

★ ★ ★

ہمارے سامنے جو کام ہے اس کو انجام دینے کے لئے ہمیں یقیناً مشکلات کا سامنا کرنا پڑیگا قدرتی عوامل ہمیشہ مہربان نہیں ہوتے اور نہ عالمی حالات ہی ہمیشہ سازگار ہوتے ہیں لیکن ہم ایک جفاکش اور تنومند قوم ہیں جو مشکلات سے نہیں جھجکتی۔ ہمیں معجزات کی بھی توقع نہیں کرنی چاہیئے بلکہ اس عزم کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیئے کہ جو لوگ جی لگا کر کام کرتے ہیں وہ اپنی محنت کا پھل ضرور پاتے ہیں۔

(جنرل محمد ایوب خان: قوم سے نشری خطاب
بہ سلسلہ دوسرا پنجسالہ منصوبہ)

افسانہ

"مہمانِ عزیز"

انور عنایت اللہ

وہ چپکے سے ڈرائنگ روم میں آیا اور اس نے بڑی احتیاط سے دروازہ بند کیا اور اچھی طرح سے اطمینان کر لینے کے بعد کہ آس پاس کوئی نہیں تھا، اس نے باہر کا دروازہ کھولا۔ سِل وآنا اب بھی بڑی فرمانبرداری سے باہر اس کی منتظر تھی!

شام ہو گئی تھی۔ بادلوں کی وجہ سے قبل از وقت تیزی سے اندھیرا ہو رہا تھا۔ بڑی بی اب تک غالباً اپنی خوابگاہ سے باہر نہیں آئی تھیں۔ ملازم باورچی خانے میں تھے۔ گھر پر ایک عجیب پراسرار سکوت چھا گیا تھا۔ یہ اچھا تھا کہ یہ کوٹھی شاہراہ عام پر نہیں تھی بلکہ ایک گلی میں تھی ورنہ آج سِل وآنا کی فکر اسے علیحدہ ستاتی۔ اب امجد کو کم از کم اس کی طرف سے مکمل اطمینان تھا۔ اس نے بے چینی سے گھڑی دیکھی، وہ چپکے سے اپنے کمرے کی خاموش فضا میں لوٹ کر اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے کچھ دیر اور صبر سے حالات کا انتظار کرنا ہوگا۔ دریچے کے قریب ایک آرام کرسی پر وہ بیٹھ گیا اور ایک ٹھنڈی سانس لینے کے بعد اس چیخ کا انتظار کرنے لگا جس پر اس کے مستقبل کی خوشیوں کا دارومدار تھا۔

اسے کراچی آئے آج دس دن ہو رہے تھے اور اب تک وہ سِل وآنا کے بارے میں کسی قسم کا فیصلہ نہ کر سکا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے لئے آخر کیا انتظام کرے۔ کراچی پہنچتے ہی خود اس کے قیام کا مسئلہ دردِ سر بن گیا تھا۔ عارضی طور پر اپنے لئے ایک کمرہ کرایہ پر لینے کے بعد اس نے سِل وآنا کی خاطر فوراً مکان کی تلاش شروع کر دی۔ فی الحال اسے اپنے ایک گوانیز شناسا ڈاکٹر برگانزا کے یہاں ٹھہرایا اور پھر دن بھر کراچی کی سڑکیں ناپنے کے بعد اسے احساس ہو گیا کہ کراچی میں مناسب کرایہ پر، بغیر پگڑی یا پیشگی کرایہ ادا کئے معقول گھر مل ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کا ہوٹل بھی بس غنیمت ہی تھا اس کے باوجود خاصا مہنگا تھا۔ چنانچہ جب دو دن گذر گئے اور حالات حوصلہ شکن نظر آنے لگے تو امجد نے فیصلہ کر لیا کہ کل شام کو وہ یقیناً کسی نسبتاً سستے ہوٹل کا رخ کرے گا۔

شام کو اپنی ذہنی الجھنوں سے بچنے کے لئے وہ ایلفی پر نکل آیا۔ سردیاں شروع ہو چکی تھیں۔ عموماً شام کو بادل بھی گھر آتے لیکن بارش شاذ و نادر ہی ہوتی۔ مہینے کا دوسرا ہفتہ شروع ہو چکا تھا اس کے باوجود دکانوں میں خاصی بھیڑ تھی۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے کتابوں کی ایک دکان پر پہنچا اور پل بھر کے لئے رک کر رنگ برنگے سرورق کی نئی کتابوں کا جائزہ لینے لگا۔ ایک کتاب اٹھا کر یونہی ورق گردانی شروع کی ہی تھی کہ یکایک کسی نے بڑی محبت سے اسے لپٹا لیا۔

"تم یہاں کہاں امجد؟ کب آئے بھئی؟ کہاں ٹھہرے ہو؟" نووارد نے ایک سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔ آج تقریباً دو سال کے بعد دونوں دوست ملے تھے۔ رفیع اسے کافی ہاؤس لے گیا۔ کافی کا آرڈر دے دیا گیا اور پھر باتیں شروع ہو گئیں۔ امجد نے اپنی بپتا سنائی تو رفیع نے کہا: "اماں یار۔ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو۔ سب انتظام ہو جائے گا۔ آخر ہم کس مرض کی دوا ہیں۔ تم تنہا ہو۔ اگر بیوی بچے ساتھ ہوتے تو پھر یہ مسئلہ دقت طلب تھا۔ میری رائے میں تم علیحدہ مکان کرائے پر لینے کا خیال فوراً دماغ سے نکال دو — این خیال است و محال است و جنوں۔ میں تمہیں آج ہی ایک کمرہ دلوا دیتا ہوں جہاں تم پیئنگ گیسٹ بن کر مزے میں رہ سکتے ہو۔ مہمانی کا یہ سلسلہ مجھے بہت پسند ہے۔ اب تک میں بھی ایک بہت ہی معقول جگہ پیئنگ گیسٹ تھا۔ بقول شخصے مالکن ایک معمر خاتون ہیں، صرف ڈھائی سو روپے لیتی ہیں۔ کشادہ ہوادار صاف ستھرا کمرہ ہے۔ معقول فرنیچر ہے۔ کھانا بہت عمدہ۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ گھریلو ماحول ہے بس تم آج ہی میری جگہ آ جاؤ۔" اس نے ایک سگریٹ امجد کو پیش کرتے ہوئے کہا۔

"تمہاری جگہ؟ ۔ تم کہاں جا رہے ہو؟" امجد نے پوچھا ۔

"ارے بھئی معاف کرنا۔ یہ بتانا یاد ہی نہیں رہا کہ میرا تبادلہ ہو گیا ہے۔ کل میں ڈھاکہ جا رہا ہوں ۔ میں بیگم زیدی سے تمہاری شرافت کی پُر زور سفارش کر دوں گا۔ مجھے یقین ہے وہ تمہیں رکھ لیں گی ۔ دراصل ان کا دنیا میں کوئی نہیں۔ خاصی بڑی کوٹھی ہے ۔ کرایہ پر اس لئے نہیں دیتیں کیونکہ اکثر کرایہ دار ستاتے ہیں ۔ بڑی بی نے ایک کمرہ مہمانوں کے لئے وقف کر رکھا ہے ۔ عموماً ایک سے زیادہ گیسٹ نہیں رکھتیں"

چنانچہ اس طرح بیگم زیدی سے تعارف ہوا اور امجد کی رہائش کا مسئلہ طے ہو گیا۔ پہلی ہی رات کو کھانے کے بعد باتوں باتوں میں چوروں کا ذکر آ گیا ۔ پچھلے دنوں اس محلے میں چوری کی کئی وارداتیں ہو چکی تھیں ۔ اس کی وجہ سے بیگم زیدی خاصی خائف تھیں، کہنے لگیں "رات کو بڑا پھاٹک، اور صدر دروازہ میں خود اپنے ہاتھ سے بند کرتی ہوں ۔ نوکریں تو پڑی ہیں لیکن یہاں مجھے اس وقت تک چین سے نیند نہیں آتی جب تک خود یقین نہ کر لوں کہ دروازے بند ہیں ۔ ذرا آپ بھی اس کا خیال رکھئے گا ۔ اگر رات کو کبھی دیر سے آنا ہو تو مجھے بتا دیجئے گا میں جاگتی رہوں گی ۔ ویسے بھی مجھے راتوں کو بہت کم نیند آتی ہے"

"آپ اطمینان رکھئے میں ان معاملوں میں خود بے حد محتاط ہوں ۔ آپ اچھا سا کتا کیوں نہیں پال لیتیں؟ ۔ بڑا وفادار اور قابل اعتماد ہوتا ہے!" امجد نے ازراہ ہمدردی مشورہ دیا ۔

"جی؟ ۔ کتا؟؟؟ ۔ ارے نہیں میاں ۔ انتہائی نجس جانور ہے جس گھر میں ہو وہاں فرشتے نہیں آتے ۔ نہیں نہیں میاں ۔ اگر مجھے دنیا میں کسی چیز سے نفرت ہے تو کتے سے ۔ چھوٹے کتوں سے گھن آتی ہے ۔ بڑوں سے روح کانپتی ہے ۔ نہیں نہیں بھئی کتے وتے کی علت نہ میں نے کبھی پالی اور نہ ارادہ ہی ہے ۔ کئی سال ہوئے ۔ ایک ریٹائرڈ فوجی افسر میرے پینگ گیسٹ تھے ۔ دو دن تو وہ بڑے معقول طور پر رہے ۔ لیکن تیسرے دن نہ جانے کہاں سے ایک کتے کا پلہ لے آئے ۔ انتہائی ذلیل ۔ سیاہ فام ۔ کریہہ شکل ۔ کہنے لگے مجھے کتوں سے عشق ہے ۔ میں نے اسی دن انہیں چلتا کیا ۔ وہ دن اور آج کا دن ۔ خدا کے فضل سے کسی کتے کی ہمت نہیں ہوئی کہ اس طرف کا رخ کرتا"

بڑی بی سے کتوں کے خلاف اتنی لمبی چوڑی تقریر سن کر امجد کا دل بیٹھنے لگا ۔ اس کی ہمت نے ساتھ چھوڑ دیا اور اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ اس نازک موضوع پر وہ کسی اور دن، جب حالات زیادہ حوصلہ افزا نظر آئیں، تبادلۂ خیال کرے گا ۔

چنانچہ پہلی رات جوں توں کٹ گئی ۔ دوسرے دن صبح ناشتے کے بعد دفتر جانے سے پہلے امجد، ڈاکٹر برگا نزا کے یہاں گیا، سِل دانا کی مزاج پرسی کی، ڈاکٹر کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا، اپنی مشکلات بیان کیں اور دس بارہ دن کی مہلت اور مانگی ۔ سل دانا ایک طرف بیٹھی بڑی سنجیدگی سے اس کا جائزہ لے رہی تھی ۔ دراصل وہ کتوں کی اس نسل سے تھیں جو انسان کی ذہانت کے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں رکھتی ۔ سل دانا کو یوں تو امجد کی شکل پسند تھی لیکن اپنی نسلی عادتوں سے مجبور اسے یقین کامل تھا کہ امجد ضرورت سے زیادہ خبط الحواس تھا ۔ ورنہ آخر وہ اسے اس اجنبی گھرانے میں چھوڑ کر خود لاپتہ کیوں رہتا ۔ اب تو مجبوری تھی ۔ امجد نے آگے بڑھ کر پیار سے تھپتھپایا تو اس نے کوئی خاص لفٹ نہیں دی ۔ وہ ایک عجیب بیگانہ انداز سے منہ کھولے اسے چپ چاپ دیکھتی رہی ۔ آنکھیں گویا کہہ رہی تھیں ۔ عجیب مالک ہو تم میرے ۔ مجھے غیروں کے یہاں چھوڑ کے اب آئے ہو یتیم صورت بنائے؟ جاؤ ہم نہیں بولتے!

دفتر میں دن بھر امجد کا مطلق جی نہ لگا ۔ سل دانا کا مستقبل رہ رہ کر اسے ستا رہا تھا ۔ بڑی بی کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ حشر تک سل دانا کے داخلے کی اجازت نہ دیں گی ۔ دن کسی نہ کسی طرح کٹ گیا ۔ شام اپنے ساتھ تمام تر اداسیاں لے آئی ۔ وہ دفتر سے نکلا اور نہ جانے کب تک صدر کی پُر رونق سڑکوں پر کھویا کھویا سا ادھر ادھر بھٹکتا پھرا حتیٰ کہ اندھیرا ہو گیا ۔ وکٹوریا روڈ سے وہ ایک گلی میں مڑا تو آگے چل کر ایک چھوٹے سے ہوٹل کے پچھواڑے اسے کئی کتے نظر آئے جو بڑے ذوق و شوق سے ہڈیاں کھا رہے تھے ۔ نہ جانے کیوں ان کتوں کو دیکھتے ہی یکایک برق رفتاری سے اس کے ذہن میں ایک خیال آیا ۔ وہ پل بھر کے لئے رک گیا، اپنی ٹھوڑی کھجائی اور کچھ سوچ کر

ہوٹل میں داخل ہوا۔ ہوٹل کے مالک نے ایک خاصے معقول خوش پوش صاحب بہادر کو اپنے گندے ہوٹل میں داخل ہوتے دیکھا تو قدرے حیرانی اور خوشی کے ساتھ اپنی کرسی پر سے اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔ ہوٹل غریب مزدور قسم کے گاہکوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک طرف ریڈیو گلا پھاڑ رہا تھا اور دوسری طرف گاہکوں نے زور زور سے باتیں شروع کر رکھی تھیں۔ امجد نے ہچکچاتے ہوئے موٹے مالک سے سرگوشیوں میں باتیں کیں اور تھوڑی دیر بعد جب وہ ہوٹل سے باہر نکلا تو اس کی جیب میں کاغذ کا ایک پیکٹ تھا جس میں تلا ہوا ایک چاپ تھا!

امجد سیدھا ڈاکٹر برگانزا کے یہاں پہنچا۔ وہاں سے ٹہلانے کے بہانے سے سِل وانا کو لیا اور اسے سیدھا اپنے گھر لے آیا۔ گھر سے ذرا دور رک کر اس نے بڑی احتیاط سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ یہ محلّہ خاصا پرسکون تھا۔ گھر پر حسب معمول سکوت چھایا ہوا تھا۔ بڑی بی اور نوکروں کا زیادہ وقت گھر کے اندر گذرتا۔ وہ کتیا کو صدر دروازے تک لے گیا، جیب سے چاپ نکالا اور عین دروازے کے سامنے سیڑھیوں پر چاپ رکھ دیا۔ تلے ہوئے گوشت کی بو ناک میں پہنچی تو سِل وانا کے معدے کا منہ کھل گیا اور اس نے زور لگا کر آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ امجد نے چپکے سے اسے اجازت دے دی۔ سِل وانا نے وہیں آرام سے بیٹھ کر چاپ کھا لیا اور ساتھ ہی اس دروازہ کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کی جہاں یہ نعمت ملی تھی۔ جب ہڈی کی باری آئی تو امجد نے چپکے سے زنجیر تھام لی اور اسے گھسیٹتا واپس ڈاکٹر برگانزا کے یہاں لے گیا۔

اب روز یہ اس کا معمول ہو گیا کہ دفتر سے سیدھا صدر جاتا، اسی ہوٹل سے تلا ہوا چاپ خریدتا، ڈاکٹر کے یہاں جاتا، سِل وانا کو ساتھ لیتا۔ جب اندھیرا ہو جاتا تو اپنے یہاں لے جاتا۔ دور ہی سے اطمینان کر لینے کے بعد کہ میدان صاف ہے، کتیا کو صدر دروازہ تک لے جاتا۔ اسے سیڑھیوں پر بٹھا کر چاپ کھلاتا اور واپس ڈاکٹر کے یہاں پہنچا دیتا۔

سِل وانا کی یوں تو امجد کے بارے میں کوئی بہت اچھی رائے نہیں تھی لیکن اس کے باوجود اسے اپنے مالک کی یہ ادا خوب بھائی۔ وہ روزانہ بےچینی سے شام کا انتظار کرتی۔ دن کو جب بھی وہ آنکھیں بند کرتی، وہ فراخدل دروازہ اس کے ذہن میں ابھرتا جہاں سے روزانہ اسے ایک مزیدار چاپ ملتا۔ دسویں دن تک سِل وانا کے ذہن میں وہ دروازہ کچھ اس طرح مرتسم ہو گیا تھا کہ اس کے تصور کے ساتھ اسے چاپ یاد آتا اور بے اختیار اس کی رال ٹپکنے لگتی۔ اب وہ بڑی سنجیدگی سے اپنے نوجوان صاحب ذوق مالک کے بارے میں رائے بدلنے کی سوچ رہی تھی۔ حالات یہ بتا رہے تھے کہ وہ اتنا احمق نہیں تھا جتنا کہ وہ اپنے موٹے موٹے شیشوں کی عینک سمیت نظر آتا۔

دس دن تو مزے میں گذرے۔ گیارہویں دن پانچ بج گئے تو بھوک سے سِل وانا کی بےچینی میں اضافہ ہو گیا۔ آج نہ جانے امجد کو کیوں دیر ہو رہی تھی۔ وہ عموماً پانچ بجے تک آ جاتا۔ خدا خدا کر کے چھ بجے امجد صاحب تشریف لائے اور سِل وانا کی جان میں جان آئی۔ آتے ہی حسب معمول اس نے چند لمحے ڈاکٹر اور ان کی بیگم سے گفت زیادہ کی شنید کم۔ پھر سِل وانا کو پیار سے تھپتھپایا، اس کی زنجیر کھولی اور دونوں ٹہلنے نکل پڑے۔

آج سِل وانا کو راستہ بھی معمول سے زیادہ طویل لگا۔ خدا خدا کر کے شام کے دھندلکے میں دور سے وہ دلکش دروازہ نظر آیا تو سِل وانا خوشی سے جھوم اٹھی، پیار سے غرائی اور پھر اس نے زور لگا کر خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔ لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ خلاف معمول آج امجد نے مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ بڑے پھاٹک سے کوٹھی میں داخل ہو کر امجد نے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور پھر اچھی طرح سے اطمینان کر لینے کے بعد آج زنجیر کے ساتھ ساتھ کتیا کے گلے کا پٹہ بھی کھول دیا۔ آزاد ہوتے ہی وہ تیزی سے دم ہلاتی ہوئی آگے بڑھی اور بند دروازہ پر رک گئی کیونکہ خلاف معمول آج چاپ کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔ اس نے ادھر ادھر سونگھ کر دیکھا لیکن اسے مایوسی ہوئی۔ آخر تھک کر اس نے ایک سرد آہ بھری اور دم سے فرش صاف کیا اور

چپ چاپ صبر کے ساتھ سیڑھیوں پر منہ لٹکائے پنجوں پر سر رکھے بیٹھ گئی۔ غالباً گوشت اندر کہیں تلا جا رہا ہے۔ کوئی بات نہیں۔ دیر ہو ہی جاتی ہے۔ انتظار کر لوں گی!۔ اس نے آنکھیں بند کئے سوچا۔

امجد دور کھڑا سب کچھ دیکھتا رہا۔ پھر اس نے زنجیر اور پٹہ پودوں کے ایک جھنڈ میں چھپا دیا اور چپکے سے سیل وانا کے کان میں صبر سے یہیں بیٹھے رہنے کی تلقین کرنے کے بعد وہ گھر میں داخل ہوا۔ ڈرائنگ روم میں حسب توقع کوئی نہ تھا۔ بڑی بی غالباً اپنے کمرہ میں تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ وہ روزانہ مغرب کے بعد، سڑک کی دوسری طرف، اپنی ہم عمر ایک دوسری بڑی بی کے یہاں جاتیں۔ اس نے بےچینی سے گھڑی دیکھی۔ مغرب کا وقت قریب تھا۔ وہ چپ چاپ اپنے کمرہ میں چلا گیا، دریچہ کے قریب ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور ایک ٹھنڈی سانس لینے کے بعد اس چیخ کا انتظار کرنے لگا جس پر اس کے مستقبل کی خوشیوں کا دار و مدار تھا!

اُسے سیل وانا پر مکمل بھروسہ تھا۔ نہ جانے وہ کب تک یوں ہی خاموش بیٹھا اپنے خیالوں میں کھویا رہا۔ آسمان پر بادل اب بھی منڈلا رہے تھے اور ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ یکایک حسب توقع بڑی بی کی چیخ سنائی دی تو وہ تیزی سے اٹھا اور ڈرائنگ روم میں جا پہنچا۔ بیگم زیدی عین اس وقت صدر دروازہ اندر سے بند کر رہی تھیں۔ انہیں قدموں کی چاپ سنائی دی تو وہ تیزی سے مڑیں۔ "امجد صاحب۔ کتا!" وہ چیخ پڑیں۔

"جی۔؟ کیا فرمایا؟؟" امجد نے حیرت سے پوچھا۔

"دروازہ پر اتنا بڑا خوفناک کتا بیٹھا ہے" وہ تیزی سے بولیں۔

"کتا؟۔ یہاں؟۔ ٹھہریئے۔ میں دیکھتا ہوں" یہ کہتے ہوئے امجد تیزی سے آگے بڑھا۔ وہ جوں ہی دروازہ کے قریب پہنچا، بیگم زیدی تیزی سے ڈرائنگ روم کے دوسرے سرے پر پہنچ کر سہمی سہمی نگاہوں سے صدر دروازہ کو دیکھنے لگیں۔ امجد نے باہر نکل کر دروازہ باہر سے بند کر لیا اور چند لمحوں کے بعد دوبارہ لوٹ آیا۔ بیگم زیدی اب بھی خاصی سہمی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

"جی ہاں۔ کتا ہی ہے۔ لیکن عجیب لیجڑ قسم کا ہے۔ وہ تو ملتا ہی نہیں" اس نے اطلاع دی۔

"لیکن۔ عجیب مصیبت ہے۔ مجھے تو باہر جانا ہے۔ بیگم شمسی انتظار کر رہی ہوں گی۔ اسے مار کر کیوں نہیں بھگایا آپ نے؟"

"اجی۔ السا شین ہے۔ یوں تو پالتو نظر آتا ہے۔ لیکن سنا ہے۔ اس نسل کے کتے بدتمیزی مطلق پسند نہیں کرتے۔ میں نے شوں شا کیا تو بھی وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ میرا خیال ہے راستہ بھٹک کر اس طرف آ گیا ہے۔ غالباً تھک کر سستا رہا ہے۔ آیئے۔ کچھ دیر یہیں بیٹھ کر باتیں کریں۔ مجھے یقین ہے دس پندرہ منٹ سستا کر چلا جائے گا۔" امجد نے تسلی دی۔ یہ بات بڑی بی کی سمجھ میں آ گئی اور دونوں بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ جب پندرہ بیس منٹ گذر گئے تو امجد اٹھا اور ایک بار پھر اٹھ کر باہر گیا اور چند لمحوں کے بعد لوٹ آیا۔

"کیوں؟۔ گیا وہ؟" بڑی بی نے اشتیاق سے پوچھا۔

"جی نہیں۔ وہ تو ہلتا ہی نہیں۔ میں نے پتھر اٹھا کر مارنے کی کوشش کی تو پیار سے دم ہلا کر اٹھا اور ایسی رحم طلب نگاہوں سے مجھے دیکھا کہ میرا تو دل پسیج گیا۔ وہ تو بے حد معصوم ہے بیگم زیدی۔ مجھے تو بیمار نظر آیا۔ مجھے یقین ہے پالتو ہے۔ رات ہو گئی ہے۔ موسم خراب ہے۔ پڑے رہنے دیجئے باہر۔ صبح خود ہی چلا جائے گا۔" امجد نے سادگی سے سفارش کی۔ بنیادی طور پر بیگم زیدی رحم دل تھیں ویسے پالتو جانور انہیں پسند تھے سوائے کتوں کے۔ اس وقت غالباً وہ امجد کی لفاظی سے متاثر ہو گئی تھیں۔ انہوں نے کچھ سوچ کر اجازت دے دی۔ اس پر امجد نے فوراً کہا:

"ارے۔ میں یہ تو بھول ہی گیا تھا کہ آپ کو بیگم شمسی کے یہاں جانا ہے۔ چلیئے۔ میں پہنچا آتا ہوں۔ گھنٹہ بھر بعد خود آپ کو لے آؤں گا۔" یہ تجویز بیگم زیدی کو پسند آ گئی۔ دونوں باہر نکلے تو سیل وانا نے بڑی پرامید نگاہوں سے سر اٹھا کر دیکھا۔ بڑی بی سہمی سہمی

امجد کے پیچھے پیچھے باہر نکلیں۔ امجد نے ایک بار پھر شوں شاں کیا۔ لیکن اس چھیڑ چھاڑ کا کتیا پر مطلق کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بدستور زبان نکالے مسکراتی رہی۔

"دیکھ لیا نا آپ نے؟۔ بے حد مسکین ہے۔ مجھے تو لگتا ہے بیچاری ستم رسیدہ ہے۔ دیکھئے۔ بالکل کچھ نہیں کرتی۔" یہ کہہ کر امجد نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو فوراً بڑی بی نے اس کا بازو تھام لیا۔ "نہیں نہیں امجد صاحب۔ کہیں حملہ نہ کر دے۔" انہوں نے روکا۔ "ارے نہیں بیگم زیدی۔ یہ تو بے ضرر ہے۔ مجھے تو یہ بھوکی نظر آ رہی ہے۔ دیکھئے لمبی زبان باہر لٹک رہی ہے۔" امجد نے ہمدردی جتائی۔ بڑی بی دور سے خاموش کھڑی غور سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ سِل دانا بھی دلچسپی سے ان کا جائزہ لے رہی تھی۔ اسے بڑی بی امجد سے زیادہ معتبر نظر آئیں۔ اب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس گھر کے باورچی کو آج ہو کیا گیا؟ آج امجد صرف زبانی جمع خرچ پر کیوں تلا ہوا تھا؟۔ اس نے بیزاری سے ایک انگڑائی لی اور اٹھ کر ایک ٹانگ سے کان کھجانے لگی۔

"مجھے بھی بھوکی لگ رہی ہے۔" بیگم زیدی نے کہا۔

"اگر آپ اجازت دیں تو اسے کھانے کو کچھ دے دوں۔ شاید کھانا کھا کر یہ چلی جائے۔" امجد نے ایک نئی تجویز پیش کی۔ بیگم زیدی کے دل پر کتیا کی بیکسی کا اثر ہونے لگا تھا۔ انہوں نے حامی بھر لی۔

جب وہ گھنٹہ بھر بعد ڈرتے ڈرتے پھاٹک میں داخل ہوئیں اور انہیں کتیا نظر نہیں آئی تو ان کی جان میں جان آئی۔ وہ خوش خوش ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں تو امجد کو منتظر پایا۔

"آپ خود ہی آگئیں؟ میں آپ کو لینے آنے ہی والا تھا۔ میں ابھی اسے بھگاتا ہوں۔ کمبخت یہاں یوں سو رہی ہے جیسے اس کے باوا کی میراث ہے۔" امجد نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"کیا کہا؟۔ یہاں سو رہی ہے؟۔ کون؟" بڑی بی نے گھبرا کر پوچھا۔

"آپ گھبرائیے نہیں۔ بے حد مسکین کتیا ہے۔ کتوں سے میری بھی جان نکلتی ہے۔ لیکن خدا کی قسم۔ یہ تو بھیڑ ہے بلکہ بھیڑ سے بھی زیادہ بے ضرر۔ وہ دیکھئے۔ پیٹ بھر کھانا ملا تو اس کونے میں کتنے آرام سے سو رہی ہے۔ شی۔ اٹھ بھئی۔ موسم خراب ہے تو کیا ہوا۔ ہم نے کوئی ٹھیکہ لے رکھا ہے؟ چل نکل یہاں سے!"

امجد نے دوبارہ شوشاں شروع کر دی۔ اس بدتمیزی کا سِل دانا پر مطلق کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے بیزاری سے ایک آنکھ کھول کر اسے دیکھا۔ "عجیب نامعقول انسان ہے۔ اتنی دیر بعد کھانا دیا اور اب چین سے سونے بھی نہیں دیتا۔ سونے دو بھئی۔ کیوں ستاتے ہو؟"۔ پنجوں پر سر رکھے وہ دوبارہ سکڑ کر سو گئی۔

"میرا خیال ہے اسے سردی لگ رہی ہے۔" بیگم زیدی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"جی ہاں جی ہاں۔" امجد نے خوش ہو کر فوراً کہا۔ "سنا ہے اس نسل کے کتے بے حد نازک ہوتے ہیں۔ بہت زیادہ حساس۔ سنا ہے فوراً نمونیا ہو جاتا ہے۔ اور پھر یہ تو کتیا ہے بیچاری۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو۔ یعنی اگر آپ اجازت دیں تو رات بھر بیچاری یہیں پڑی رہے۔ باہر بارش کے آثار ہیں۔" اس نے ڈرتے ڈرتے تجویز پیش کی۔ بیگم زیدی کو ہچکچاتے دیکھا تو اس نے فوراً کہا۔ "صبح یہ نہ بھی گئی تو پولیس اور اخبار کی مدد سے اس کے سنگدل مالک کو ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کروں گا۔ مجھے تو یہ کسی بڑے گھرانے کی پالتو کتیا نظر آتی ہے۔"

اب کے امجد کی ترکیب کارگر ثابت ہوئی اور سِل دانا کو گھر کے اندر رات گزارنے کی اجازت مل گئی۔

دوسرے دن امجد نے سِل دانا کے فرضی مالک کی تلاش شروع کر دی۔ حسب توقع اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ ان حالات میں ایسی مسکین، اتنی بے ضرر، اس حد تک معقول کتیا کو کیسے گھر سے نکال دیا جاتا؟۔ بیگم زیدی نے فیصلہ کیا کہ جب تک اس کے اصلی مالک کا پتہ نہیں چلتا کتیا یہیں رہے گی۔ غالباً انہیں سِل دانا بہت پسند آ گئی تھی۔

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

بنگلہ افسانہ:

زندگی ہے یا کوئی .....

علاءالدین الآزاد

مترجم، یونس احمد

بہت پہلے بادل چھٹ گئے تھے۔ لیکن جب شام کو نیرو گملے میں پانی دینے کے لئے آئی اور زینے کے پاس ایک خالی جگہ پر نظر پڑی تو اس کا جی یکدم سے اداس ہو گیا۔ بہت دیر تک وہ چپ چاپ ہاتھ میں بالٹی لئے کھڑی رہی۔

اگرچہ پھول کا گملہ چھوٹا اور بہت ہی معمولی سا تھا لیکن اس کے لئے نیرو ہمیشہ فکرمند رہتی۔ دوسروں کے لئے تو یہ بہت ہی معمولی بات ہو سکتی ہے لیکن جو قرینے سے زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں انہیں اس کی اہمیت معلوم ہو سکتی ہے۔ کوئی چیز حقیر اور چھوٹی ہی کیوں نہ ہو، لیکن دل میں اگر اس کی عزت ہے تو پھر یہی چھوٹی سی چیز بڑی بن جاتی ہے۔ نیرو کا دل بھی ایسا ہی تھا —— بڑا ہی نازک، نرم اور حساس! اس کے دل کو کوئی بات ناگوار گذرتی تو وہ کمرہ بند کر کے دیر تک روتی رہتی اور اس طرح دل کا بار ہلکا کرتی۔

کل جو واقعہ پیش آیا کوئی اتنا سنگین واقعہ نہ تھا۔ کالج سے واپسی میں ظہیر کو کچھ دیر ہو گئی تھی۔ وہ گھبرایا ہوا تھا اور اس گھبراہٹ کے عالم میں اس نے برآمدے کے اوپر قدم رکھا ہی تھا کہ پھول کا گملہ جوتے سے ٹکرا گیا اور گر پڑا۔ اس نے گملے کو جھٹ سے پکڑنے کی کوشش بھی کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔

"کون ہے؟" آواز سن کر اندر سے نیرو نے پوچھا۔

"میں، میں ہوں" ظہیر نے جواب دیا۔ "نیرو ذرا تم بھی آکر دیکھو۔"

ظہیر کی گھبراہٹ کا اندازہ لگا کر نیرو پریشان ہو گئی۔ خالہ اماں کی طبیعت زیادہ خراب تو نہیں ہو گئی؟ چار دن پہلے وہ عیادت کو گئی تھی۔ مرض نازک صورت اختیار کر گیا تھا۔ اسی دن سے نیرو گھبرائی گھبرائی سی رہنے لگی تھی۔ اس نے اسی عالم میں آکر پوچھا —— "کیا ہوا؟ کیا بات ہے!"

"وہ دیکھو" ظہیر نے انگلی کے اشارے سے دکھاتے ہوئے کہا۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتی اس کی آنکھوں نے ٹوٹے ہوئے گملے کو دیکھ لیا تھا۔ مٹی بکھر گئی تھی۔ وہ جلدی جلدی چیختے ہوئے ادھر گئی اور بولی —— "کیسے ٹوٹا؟ کس نے توڑا اسے؟" اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔

تھوڑی دیر تک تو ظہیر مجرم کی طرح چپ چاپ کھڑا رہا پھر آہستہ آہستہ بولا "قصور میرا ہی ہے۔ مجھے ذرا ہوشیاری سے چلنا چاہئے تھا لیکن اب کیا کیا جائے۔ نیا گملہ لا دوں گا —— کل ہی!"

نیرو خاموش رہی۔ کتنی خوشامدیں کرنے کے بعد وہ اپنی ایک سہیلی کے گھر سے رجنی کے تین چار بیج لائی تھی۔ بہت دنوں تک گملے کی حفاظت کرتی رہی، پانی دیتی رہی، تب جا کر پودا بڑھا تھا۔ اگرچہ وہ سمجھ گئی تھی کہ ظہیر کا کوئی قصور نہیں پھر بھی وہ اس سے روٹھ ضرور گئی۔

بچپن ہی سے نیرو کی طبیعت اور لڑکیوں سے مختلف تھی۔ اس کی شادی کو تین سال ہو چکے تھے مگر خانہ داری سے اسے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ البتہ گھر کی زینت بڑھانے میں اس کی طبیعت خوب لگتی تھی۔ ماہانہ ڈھائی سو تو ملتے تھے ظہیر کو، اس کے باوجود وہ ہر ماہ کچھ نہ کچھ بچا لیتی اور ان پیسوں سے گھر کو خوب سجاتی۔

عمارت ایک منزلہ تھی۔ ایک حصے میں مکان کی بیوہ مالکہ خود رہتی تھی، دوسرا حصہ نیرو کے قبضے میں تھا۔ دو بڑے بڑے کمرے تھے۔ کمرے سے نکل کر کھلی ہوئی چھت تھی، صحن بھی کہہ لیجئے اسے۔ برآمدہ کوئی بڑا اور کشادہ نہ تھا تاہم اس میں تقریباً پندرہ گملے قرینے سے رکھے ہوئے تھے۔ پھولوں کے

پودے بھی مختلف قسم کے تھے۔ جن میں دیسی بھی تھے اور ولایتی بھی۔ دروازوں اور دریچوں پر خوب صورت پردے لٹکتے تھے۔ بیٹھک میں بید کی کرسیوں کے بیچ میں ایک تپائی بھی تھی جس پر سبز رنگ کا کپڑا بچھا ہوا تھا۔ دو الماریاں کتابوں سے بھری پڑی تھیں۔ دیوار پہ ایک آرٹسٹ سے تین طرح کے لینڈ سکیپ بنوائے گئے تھے۔ سونے کا کمرہ بھی صاف ستھرا تھا۔ پلنگ کے اوپر کئی گدے بچھے ہوئے تھے۔

نیرو اکثر کہتی۔ "محض پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہے۔ سلیقہ سب سے بڑا آرٹ ہے۔" چنانچہ گھر دیکھ کر ہر آدمی اس کے سلیقہ کی داد ضرور دیتا تھا۔ ظہیر کی عمر ستائیس سے زیادہ نہیں ہوگی اس کے باوجود اس کا جسم ڈھیلا ڈھالا تھا۔ بچپن ہی میں والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ ورثہ میں کچھ نہ ملا۔ پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا اسلئے شہر چلا آیا۔ دنیا کے گرم و سرد چکھے، تب جا کر وہ آدمی بنا تھا۔ اس نے مسلسل جان توڑ محنت اور کوشش کی۔ ہزاروں لاکھوں انسانوں کے مقابلہ میں آکر اپنی جگہ خود بنائی تھی۔

یہ جانتے ہوئے بھی کہ خانہ داری کی طرف سے نیرو کی بے پروائی فطری ہے وہ بعض اوقات پنجرے میں بند پنچھی کی طرح ہانپ اٹھتا۔ وہ اس سے کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا۔ دل شکنی کا بہت خیال تھا اسے۔ کیونکہ دنیا میں وہی تو اس کے لئے ایک سہارا تھی، وہی تو اس کی کل کائنات تھی۔ اس کے علاوہ وہ بھی بن ماں کی بچی تھی۔ خالہ نے اس کی پرورش کی۔ دونوں ایک دوسرے سے وہیں ملے تھے —— وہ بھری برسات کا دن! اس دن کو یاد کرکے ظہیر خلاء میں بھٹکنے لگتا، اس کی آنکھوں تلے کتنی تصویریں ناچ اٹھتیں۔

ظہیر کا ساتھی محفوظ بھی اکنامکس میں دوسرے پارٹ کا امتحان دے رہا تھا۔ جس دن گورنری راج کا اعلان کیا گیا اسی دن وہ اپنی کتابیں لیکر محفوظ کے گھر آگیا تھا۔ محفوظ نے اسے خوش آمدید کہا۔ اس کی بڑی خاطر مدارات کی۔ کوئی دوسرا ہوتا تو شاید اسے اپنے گھر میں جگہ نہ دیتا کیونکہ اس کی حرکتیں ہی ایسی تھیں لیکن اس نے ظہیر کی پریشانی کو دور کرتے ہوئے کہا تھا —— اگر میرے والدین کو تمہارے کرتوتوں کا علم ہوا تو انہیں صدمہ پہنچے گا۔ میں ان سے جھوٹ بولوں گا کہ تم امتحان میں میری مدد حاصل کرنے کے لئے میرے پاس آگئے ہو۔ میری باتوں کا انہیں ضرور یقین آجائے گا۔"

یہ سن کر ظہیر کا چہرہ خوشی سے روشن ہو گیا۔ اس نے کہا "تمہارا یہ احسان میں کبھی نہیں بھولوں گا۔"

محفوظ کو ہنسی آگئی "اس میں احسان کی کیا بات ہے۔"

ظہیر دن بھر کمرے میں بند، کتابوں میں غرق رہتا۔ اس کے ذہن میں مختلف قسم کے سوالات ابھرتے لیکن کسی ایک سوال کا بھی اسے جواب نہ ملتا۔ دوسرے دن شام کو وہ گھر سے باہر نکلا تھا اور رات کے بارہ بجے جب کچھ سرگراں گھر لوٹا تو اس کی آنکھوں نے ایک لڑکی کو بھاگتے ہوئے دیکھا۔ اسے دیکھتے ہی اس کے منہ سے یہ آواز نکلنے ہی والی تھی —— "کون" مگر اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اس نے سوچا —— "میں یہاں مہمان ہوں اسلئے ممکن ہے کوئی لڑکی مجھ سے شرما کر بھاگ رہی ہو۔"

وہ گیٹ بند کرکے آگے بڑھا ہی تھا کہ اُسے ٹھیس لگی اور منہ سے "اُف" نکل گئی۔ وہ بڑی مشکل سے کمرے کے پاس آیا۔ اس نے پاؤں کی انگلی کو غور سے دیکھا۔ اس میں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ ایک دم سے اس کا دماغ معطر ہو گیا "رجنی" کی بھینی بھینی خوشبو سے کمرہ معطر ہو رہا تھا۔ اس نے غور سے کمرے کا جائزہ لیا۔ کون سو رہا ہے اُدھر؟ محفوظ؟ سونے دو اُسے۔ وہ میز کے قریب آگیا۔ اس نے لالٹین کی روشنی تیز کردی۔ پلنگ کے پاس پھولدان رکھا ہوا تھا اور اس میں رجنی کے پھول مسکرا رہے تھے۔ ایک طرف کتابیں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں اور پاس ہی کھانا ڈھکا ہوا رکھا تھا۔ بچھونے کے اوپر جو چادر تھی اسے دیکھ کر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ابھی ابھی بچھائی گئی ہو۔

زخم کی ٹیکلی بھول کر ظہیر بید کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اتنے میں دروازے کے باہر روشنی نظر آئی پھر آہستہ آہستہ بات کرنے کی آواز!

کچھ دیر کے بعد دس گیارہ سال کا ایک بچہ کمرے میں داخل ہوا اور ایک شیشی دیتے ہوئے بولا۔ "ڈیٹول ہے، زخم دھو ڈالئے اس سے۔ اور پھر کھانا کھا کر سو جائیے۔"

ظہیر حیران رہ گیا! اس بچے کو کس نے یہاں بھیجا؟ اس نے لڑکے کو آواز دی "میاں ذرا سننا"۔

"کہئے" لڑکے نے کہا "جلدی کہئے مجھے نیند آ رہی ہے"۔

ظہیر نے پوچھا "کیسے معلوم ہوا تمہیں کہ میری انگلی میں چوٹ لگی ہے؟"

"مجھے کچھ نہیں معلوم"۔ اور یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلا گیا۔

تھوڑا بہت کھانے کے بعد ظہیر جب سونے کے لئے گیا اس وقت ڈیڑھ بج چکا تھا۔ بارش شروع ہو چکی تھی اور دریچے سے سرد ہوائیں بھی آ رہی تھیں۔ ظہیر کو نیند آ گئی۔ تاریکی، بارش، ہوائیں ـــــ فضا کیسی سحر آلود بن گئی تھی!

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کا چہرہ گلاب کی طرح کھلا ہوا تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ کتنے دنوں کے بعد اُسے پُرسکون نیند آئی تھی۔ اس نے ایک سرد آہ کھینچی اور بچھونے سے کود پڑا۔ ارے یہ کیا! اس کی زخمی انگلی میں پٹی کس نے باندھ دی تھی؟ اُسے اس گھر کے در و دیوار پُر اسرار نظر آنے لگے۔

اس دن بھی وہ حسبِ معمول شام کو باہر گیا مگر پندرہ منٹ کے بعد ہی واپس آ گیا۔ اس نے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے دریچے سے جھانکا۔ خواب تو نہیں ہے یہ؟ لالٹین کی روشنی دھیمی کر کے سفید ساڑی میں ملبوس ایک لڑکی اس کی کتابوں اور بچھونے کو درست کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ ظہیر چپ چاپ کمرے میں داخل ہوا۔ لڑکی نے آہٹ محسوس کی۔ اس نے مُڑ کر دیکھا۔ وہ بھاگ جانا ہی چاہتی تھی کہ ظہیر نے اس کو روک لیا اور پوچھ بیٹھا "تم کون ہو؟ تم؟"

لڑکی نظریں نیچی کر کے بولی "دیکھئے کوئی آ جائے گا۔ مجھے جانے دیجئے"۔ اس کے بعد دونوں خاموش ہو گئے۔ دونوں کی زبانیں گنگ ہو گئی تھیں کیونکہ اسی دن دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔ لڑکی کمرہ سے چلی گئی۔

ظہیر نے اس کی اداس اور پژمردہ زندگی کو جو رس اور رنگ بخشا تھا اس کا نتیجہ تھا کہ اس کی نگاہیں ہر وقت اُسے سکھی دیکھنا چاہتی تھیں۔ گملہ خرید کر لا دینے کی بات اُسے یاد تھی۔ دوسرے ہی دن وہ بازار گیا۔ دکان سے پلٹ ہی رہا تھا کہ ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھا اور فریاد سنائی دی ـــــ "بابا دیا کیجئے۔ مجھ پر نہیں میرے بچوں پر۔ خدا تمہیں سکھی رکھے گا"۔

ظہیر سے یہ منظر نہ دیکھا گیا۔ اس نے اٹھنی اس کی طرف پھینکی اور رکشا پر بیٹھ گیا لیکن اس کا دل برابر دھڑک رہا تھا۔ اس کی فریاد برابر اس کے کانوں میں آتی رہی اور گذشتہ شام کا ایک دردناک واقعہ اُس کے ذہن میں تازہ ہو گیا۔ گذشتہ شام کو وہ پیدل گھر جا رہا تھا عثمان غنی روڈ کے موڑ پر آیا ہی تھا کہ دیوار سے لگ کر بیٹھے ہوئے ایک شخص پر اس کی نظر پڑی۔ اس کی نگاہیں ظہیر کو برابر گھور رہی تھیں۔ ظہیر اس کے پاس آیا ادہ کھڑا ہو گیا لیکن پھر چل پڑا۔ اس شخص نے پکارا۔ ظہیر کو بُرا معلوم ہوا۔ وہ رُکا نہیں وہ شخص دوڑتا ہوا ظہیر کے پاس آ گیا اور اس کی جیب میں ہاتھ ڈالنے لگا اور کہا۔ "میں پیسے نہیں لوں گا"۔

"پھر؟"

اُس شخص نے پھر گہری نظر سے ظہیر کو دیکھا اور یکایک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کہتا تھا "مجھے پہچان نہ سکے۔ ہاں کیسے پہچانو گے مجھے میں انسان کہاں ہوں؟"

ظہیر حیران رہ گیا۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے کوئی ناٹک کھیلا جا رہا ہے۔ وہ بہت دیر تک اُسے دیکھتے رہنے کے بعد یکایک بول اُٹھا ـــ "ارے تم؟ تم ماجو؟"

"تو تم پہچان گئے مجھے۔ ہاں میں ہوں ماجو۔ رتن پور کا معین الدین"۔ اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہنا شروع کیا ـــ "ظہیر میں جانتا ہوں کہ زندہ نہیں رہوں گا لیکن مرنے سے پہلے زندگی حاصل کرنے کی لگن میں ڈھاکہ آ گیا ہوں۔ تین دن ہسپتال گیا مگر داخل نہ ہو سکا۔ مجھے نکال دیا گیا"۔

بچپن کی بہت سی باتیں یاد کر کے ظہیر کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ماجو کہہ رہا تھا ـــ "یکایک اپنے ایک ایم ایل اے دوست کی بات یاد آ گئی۔ ان کا پتہ یاد تھا۔ ان کے گھر کے برآمدے میں پڑا رہا۔ ایک دن اتفاقاً ملاقات ہو گئی۔ وہ اپنی گاڑی میں سوار ہو رہے تھے۔ پہچان تو گئے مگر بولے ـــ "مجھے فرصت

مطلق نہیں ہے۔ اس لئے معافی چاہتا ہوں۔"

ظہیر نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا۔ نہ جانے وہ کیا سوچ رہا تھا۔

ناجو کہتا گیا ۔۔۔ " بعد میں تمہارا خیال آیا۔ اتنا معلوم ہوا تھا کہ تم کالج میں پروفیسر ہو گئے ہو۔ لیکن گھر کا پتہ نہیں معلوم تھا۔ میں یہاں بیٹھا یہی سوچ رہا تھا اب کیا کروں کہ تم آ گئے۔ ظہیر! مجھے بچا لو۔ ہسپتال میں داخل کرا دو۔ شہر میں تمہاری عزت ہے۔" اتنا کہنے کے بعد وہ ہانپنے لگا۔

ظہیر نے کش لیتے ہوئے کہا۔ "ہاں! مگر آج تو وقت نہیں ہے۔ کل صبح نو بجے داخل کرا دوں گا۔"

ناجو نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "میں جانتا تھا تم یہ کام کر دو گے۔" اس کی آنکھیں ساون بھادوں بن گئیں۔ "بچ گیا تو قرضہ اتار دوں گا بھائی۔"

" پریشان نہ ہو ناجو۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ سوچ رہا ہوں آج کی رات تم کہاں گذارو گے؟"

"کہاں گذاروں گا۔ ہاں ٹھیک کہتے ہو؟"

" میرا مکان چھوٹا سا ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو ڈھنگ کے یہ مکان کتنی مشکل سے ملتا ہے۔ کس طرح بس ہم میاں بیوی کو سر چھپانے کی جگہ مل گئی ہے۔" یہ کہنے سے پہلے ظہیر کے ضمیر نے ملامت کی تھی۔ لیکن وہ کرتا بھی کیا۔ اس مریض اور گندے آدمی کو دیکھ کر نیرو پریشان ہو جاتی۔ ناجو نے اپنے دوست کے دل کی گہرائی کا جائزہ لے لیا تھا۔ اس نے کہا" نہیں میں تم لوگوں کو تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ یہیں رات گذار دوں گا۔ البتہ سویرے ٹھیک وقت پر آ جاؤ ۔۔۔ آ ؤ گے نہ؟

" ہاں، ہاں کیوں نہیں۔" ظہیر نے کہا۔ " ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے پہنچ جاؤں گا۔ ویسے گھر پہنچ کر میں تمہارے لئے جگہ نکالنے کی کوشش کروں گا۔ اگر گنجائش نکل آئی تو فوراً آ کر لیجاؤں گا۔ اچھا جاتا ہوں۔"

اور وہاں سے رخصت ہونے کے بعد ظہیر پھٹ پڑنا چاہتا تھا۔ اس نے جھوٹ کیوں بولا؟ وہ تو اس کے لئے کمرے میں نہ سہی برآمدے میں جگہ نکال سکتا تھا۔ اس نے نیرو کو تیار کرنے کا ارادہ بھی کیا تھا لیکن گملہ ٹوٹ جانے کے بعد دونوں کے درمیان خاموشی کا جو پردہ گر چکا تھا اس کی وجہ سے یہ واقعہ اس کے ذہن سے دُور ہو گیا۔

اور جب ظہیر کا رکشا نواب پور روڈ سے عثمان غنی روڈ کے موڑ تک آ گیا تو سڑک کے بائیں جانب لوگوں کی بھیڑ نظر آئی۔ اس کا دل دھڑک اٹھا۔ اس نے دیکھا ایک لاش چادر سے ڈھکی ہوئی پڑی ہے۔ اور کچھ لوگ اس کے کفن دفن کے لئے چندہ جمع کر رہے ہیں۔

ظہیر تھوڑی دیر تک رکشا پر چپ چاپ بیٹھا رہا پھر نیچے اترا اور بھیڑ کو چیرتا ہوا لاش کے پاس آیا۔ اس نے چادر اٹھائی۔ چہرے کو دیکھا۔ بھیڑ میں سے ایک شخص نے پوچھا ۔۔۔" صاحب آپ پہچانتے ہیں اسے؟" لیکن وہ تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا ۔" نہیں، نہیں۔ میں نہیں پہچانتا اسے۔ نہیں پہچانتا۔" یہ کہہ کر وہ رکشا پر بیٹھ گیا۔ گھر واپس آ گیا ۔۔۔ گم سم! میز پر کھانا لگا کر نیرو اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے جوڑے کو پھولوں سے سجایا تھا۔ گلے میں ہار تھا اور ساڑی بھی نئی تھی ۔۔۔ دونوں نے پہلے ہی سے پکچر دیکھنے کا پروگرام بنایا تھا۔ ظہیر نے عجیب نظروں سے اسے دیکھا اس کے بعد دونوں گملے رکھے اور کچھ کہے بغیر وہ خواب گاہ میں چلا گیا اور کسی نہ کسی طرح جوتے اتار کر بچھونے پر لیٹ گیا۔

نیرو اس کے پیچھے پیچھے آئی۔ اور ظہیر کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بولی ۔۔۔ "کیا درد ہے؟ منہ ہاتھ دھو لیں۔"

ظہیر نے اس کی طرف دیکھا اور ایک درد بھری آواز میں کہا۔" نیرو ذرا دیکھنا میری آنکھوں سے خون تو نہیں ٹپک رہا ہے؟"

" نہیں تو" یہ کہہ کر نیرو نے اس کے گالوں کو چھوتے ہوئے کہا۔" مگر جسم تپ رہا ہے۔ کیوں؟ کیا بخار ہے؟ کوئی اچانک صدمہ ہوا ہے۔ چلو۔ کوئی بات نہیں۔ اٹھو جلدی۔"

ظہیر کچھ نہ کہہ سکا صرف نیرو کو خاموش نگاہوں سے دیکھ کر بچھونے سے اٹھ بیٹھا۔

★

ماہ نو، کراچی، نومبر ۱۹۵۹ء

افسانہ :

حکیم روشن دین

منظور عارف

حکیم روشن دین جب فوت ہوئے تو اُن کے احباب نے اللہ تعالیٰ سے اُن کی تین بیواؤں اور نو بچوں کو صبر جمیل عطا فرمانے کی دعا کی اور چلے گئے۔ مرحوم ایک درمیانہ درجہ کے حکیم اور بے ضرر سے انسان تھے تعلیم معمولی تھی اس لئے اکثر و بیشتر سنی سنائی باتوں پر ایمان لے آتے اور اُن پر سختی سے عمل بھی کرتے۔ ویسے پابند صوم و صلوٰۃ بھی تھے اور کبھی کبھی امامت بھی کرتے۔

حکیم صاحب سرخ و سفید رنگت، میانہ قد اور دُہرے بدن کے آدمی تھے۔ اُن کی پہلی شادی بیس برس کی عمر میں، جب قاضی احمد دین کی بڑی لڑکی سلطانہ سے ہوئی تھی تو اُن کے والد بقید حیات تھے۔ یہی وجہ تھی کہ حکیم صاحب اُن دِنوں ذرائع آمدنی سے اگر بالکل نہیں تو کافی حد تک بے نیاز تھے۔

سلطانہ نہ تو زیادہ خوبصورت تھی نہ پڑھی لکھی اور نہ گھریلو کام کاج ہی میں ہوشیار۔ البتہ شریف تھی، جوان تھی۔ شادی سے پہلے نہ سلطانہ نے حکیم صاحب کو دیکھا تھا نہ حکیم صاحب نے سلطانہ کو۔ مگر چونکہ حکیم صاحب کے والد سلطانہ کے والد کو زبان دے چکے تھے اس لئے نیک فرزند کی حیثیت سے حکیم صاحب کو یہ رشتہ منظور کرنا پڑا۔ اُن کی پہلی تین لڑکیاں ساجدہ، زینب اور کلثوم اُن کے والد کی زندگی ہی میں پیدا ہوئیں۔ حکیم صاحب نے کچھ روایتی آرزوئیں خواہ مخواہ اپنے دِل میں پال رکھی تھیں۔ نہ جانے کیوں انھیں لڑکیوں کی پیدائش سے نفرت تھی۔ وہ اپنے بے تکلف دوستوں سے اکثر ایک لڑکے کی پیدائش کی آرزو کا اظہار کرتے۔ معلوم نہیں یہ اُن کے حقیقی جذبات تھے یا محض دوسری شادی کرنے کا بہانہ۔ ساجدہ کے بعد زینب اور زینب کے بعد کلثوم کی پیدائش نے انھیں سلطانہ کی طرف سے بالکل مایوس کر دیا تھا۔ جب اُن کے والد فوت ہوئے تو وہ ایک سال تک نہایت سنجیدگی سے مطب کی طرف توجہ دیتے رہے۔

ایک روز ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی اپنے چھوٹے بھائی کو، جس کے جسم پر بہت بُری طرح خارش تھی لے کر حکیم صاحب کے مطب میں آئی۔ حکیم صاحب اُس وقت پچیس برس کے لگ بھگ تھے، اور داڑھی بھی نہ رکھتے تھے۔ انھوں نے لڑکے کو دیکھنے کے بعد اُسے پینے اور مالش کرنے کی دوا دی اور ساتھ ہی غذا میں پرہیز کی بھی ہدایت کی۔ ابھی تک حکیم صاحب نے لڑکی کا چہرہ نہ دیکھا تھا۔ صرف ہاتھ ہی دیکھے تھے جنھیں دیکھ کر انھیں معلوم ہو گیا کہ لڑکی خوبصورت ہوگی۔ لڑکی کو ایک روز پیشتر بخار ضرور ہوا تھا۔ مگر اب اتر چکا تھا۔ اِس کے باوجود احتیاطاً اُس نے پینے کی دوا مانگی۔ حکیم صاحب نے اُس کی نبض دیکھنے کے بعد اُس کی زبان دیکھنا چاہی۔ لڑکی نے جب چہرے سے نقاب ہٹائی تو حکیم صاحب کو گویا اپنے کسی پرانے خواب کی تعبیر مل گئی۔ وہ بڑی دیر تک اُس کے چہرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے۔ لڑکی نے شرما کر نقاب ڈال لی اور کھڑے ہو کر آہستہ سے بولی "دوا نہیں دیں گے آپ؟" حکیم صاحب کچھ سٹپٹا گئے اور کہنے لگے "ہاں، ضرور، مگر کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں خود بیمار ہو گیا ہوں۔" اس عجیب جواب پر لڑکی کچھ مخمصہ میں پھنس گئی اور اُس نے جھٹ بھائی کا ہاتھ تھام لیا اور دوا کے پیسے پوچھنے لگی۔ حکیم صاحب اپنی ترنگ میں کافی آگے بڑھ چکے تھے۔ کہنے لگے۔ "کیوں شرمندہ کرتی ہو۔ خیر اگر لینے ہوئے تو بعد میں لے لوں گا۔ لڑکے کو ابھی کچھ روز اور دوا لینے بھیج دیا کرو، اگر ساتھ لے آیا کرو تو بہتر ہے۔" لڑکی چپ چاپ دکان سے باہر نکل گئی۔ البتہ ایک بار اُس نے مڑ کر ضرور دیکھا۔ یہ فریدہ اور حکیم صاحب کی پہلی ملاقات تھی۔

حکیم صاحب کو اب واقعی عشق کا بخار چڑھنے لگا اور وہ فریدہ کے خیال میں کچھ ایسے محو رہنے لگے کہ سلطانہ مکمل بے توجہی اور تغافل کی نذر ہو گئی۔ سلطانہ اکثر سوچتی کہ اُس کا قصور کیا ہے۔ آخر کیوں حکیم صاحب نہ اُس کی طرف توجہ دیتے ہیں نہ بچوں کی طرف۔ وہ کیوں ہر وقت

کھوئے کھوئے رہتے ہیں۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ انھیں فریدہ سے محبت ہوگئی ہے، جو اُس سے زیادہ حسین اور زیادہ ہوشیار تھی۔ آخر اُس نے ایک روز حکیم صاحب سے وجہ پوچھ ہی لی۔ حکیم صاحب ہرگز نہ بتاتے اگر فریدہ کے والد اپنی لڑکی کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دینا منظور نہ کر چکے ہوتے چنانچہ حکیم صاحب نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں جو از روئے " اسلام " نہ صرف جائز بلکہ اُن کے معاملہ میں تو فرض ہے!
سلطانہ بہت چیخی چلائی مگر انھوں نے سنی اَن سنی ایک کردی۔ ان کی دلیل ایک ہی تھی اور وہ یہ کہ انھیں نرینہ اولاد کی ضرورت ہے۔ چنانچہ سلطانہ کو یہ زہر پینا ہی پڑا۔ اور حکیم صاحب کی شادی فریدہ سے ہوگئی۔ انھوں نے اپنے والد کے اندوختہ سے اپنے مکان کی ساتھ والی چھوٹی سی حویلی بھی ہمسائے داموں خرید لی اور بیچ کی دیوار ہٹا کر دونوں حویلیوں کو ایک کر دیا۔

سلطانہ گو دل میں بے حد کڑھتی تھی مگر شوہر کی خوشنودی حاصل کرنے کے خیال سے اُسے فریدہ کی خدمت کرنا ہی پڑتی۔ اُس کی حیثیت بالکل نوکرانیوں کی سی ہو چکی تھی۔ فریدہ کی شادی کو لگ بھگ آٹھ ماہ ہو چکے تھے؛ وہ ساجدہ اب قریب قریب چھ برس کی تھی۔ اس لئے گھریلو معاملات کی کچھ نہ کچھ شُدھ بُدھ رکھنے لگی تھی۔ وہ اپنی ماں کو اداس دیکھ کر اکثر اُس کا گھٹنا تھام کر حیرت سے اُس کی طرف دیکھتی رہتی۔ بعض اوقات عجیب عجیب سوال کرتی۔ "ماں، ہمارے گھر میں ابا کیسے نے آئے ہیں۔؟ یہ عورت کون ہے۔ یہ مجھے گھورتی ہے۔ ممکل ابا کے چھات اپنچ اپنچ کے باتیں کلتی ہے، ماں ابا اُچھ کے چھات کھیلتے ہیں۔ میلے چھات کیوں نہیں کھیلتے۔ ماں کلثوم کے ساتھ کیوں نہیں کھیلتے۔ جلیب لوتی ہے تو اُچھ کو مالتے ہیں۔ ماں تمہالے چھات کیوں نہیں کھیلتے؟" اور ماں اُسے سینے سے لگا کر آنسو بہانا شروع کر دیتی۔ ساجدہ رونی صورت بنا کر پھر سوال کرنا شروع کر دیتی" ماں تم لوتی کیوں ہو؟" ماں دل پر قابو پاکر جواب دیتی۔" نہیں بیٹی، دیکھو، میں تو ہنس رہی ہوں۔ میں کب رو رہی ہوں" ماں اسے اپنے سامنے بٹھا لیتی اور ہنسنے کی کوشش کرتی۔ "ماں، یہ عولت کون ہے؟" وہ پھر سوال کرنا شروع کر دیتی۔ ماں جواب دیتی۔ " بیٹی وہ تمہاری نئی ماں ہے ان کی بات مانا کرو۔ ابا مٹھائی لاکر دیں گے" یہ بات ساجدہ کی سمجھ میں نہ آتی۔ " نہیں ماں میلی ماں تو تم ہو۔ یہ تو مجھے گھورتی ہے۔ مالنے کو دولتی ہے۔ ابا کے چھامنے بلاتی ہے تو ابا کہتے ہیں۔ بھاگ جامنحوچھ۔ ماں منحوچھ کیا ہوتا ہے؟"
"منحوس اچھی لڑکی کو کہتے ہیں" اور ماں پھر رونے لگتی۔

حکیم صاحب کی دوسری شادی کے بعد چاند دسویں بار ڈوب چکا تھا۔ آج فریدہ نے اپنی حالت کچھ ایسے الفاظ میں حکیم صاحب کو بتادی تھی کہ عصر کی نماز کو مسجد جاتے انھیں سلطانہ سے پہلی بار نرمی کے ساتھ بات کرنا پڑی۔" سلطانہ فریدہ کا خیال رکھنا۔ میں جاتے ہوئے یوسف صاحب سے بھی ملوں گا۔ اُن کی بیگم بھی آجائیں گی۔ ضرورت پڑی تو مجھے مسجد سے بلا لینا" حکیم صاحب کے یہ بول سلطانہ کے کانوں میں رس گھول گئے۔ اس نے دل ہی دل میں دُعا کی کہ خدا اس کے شوہر کو فریدہ کے بطن سے چاند سا بیٹا عطا کرے۔ اُس کا خیال تھا کہ اگر اُس کے شوہر کی یہ آرزو پوری ہوگئی تو وہ اس کی طرف ضرور توجہ دیں گے اور پھر بیٹے کی پیدائش کے بعد بیٹیاں بھی انھیں پیاری لگیں گی۔ وہ انہی خیالوں میں کھوئی فریدہ کے کمرے میں داخل ہوئی۔ فریدہ پلنگ پر لیٹی تھی۔ سلطانہ ادوائن کی طرف پاؤں اوپر کرکے بیٹھ گئی۔ اور اس کے پاؤں دابنے لگی۔ وہ بڑی دیر تک خاموش بیٹھی رہی۔ آخر اُس نے خاموشی توڑی" فریدہ، میں دل سے دعا کرتی ہوتی کہ خدا تمھیں خوبصورت بیٹا عطا کرے۔ اُسے میں پالوں گی، میں کھلاؤں گی، میں سلاؤں گی۔ میں اُسے بالکل اپنا بیٹا سمجھوں گی" فریدہ اگر آج مجبوری کی حالت میں نہ ہوتی تو اُس کے گال پر تھپڑ رسید کر دیتی اور کہتی تم بکواس کرتی ہو۔ جھوٹ کہتی ہو۔ اس میں ضرور تمہاری کوئی غرض پوشیدہ ہے۔ جنسی یا اقتصادی۔ مگر وہ خاموش رہی۔ کیوں کہ آج اُسے سلطانہ کی مدد کی ضرورت تھی۔ سلطانہ جواب نہ پاکر خاموش ہوگئی، اور پاؤں دابتی رہی۔

یوسف صاحب کی بیگم، محمودہ کے آنے نے اس خاموشی کو توڑا۔ محمودہ نے داخل ہوتے ہی ہنس ہنس کر باتیں کرنا شروع کردیں۔ محمودہ ایک زمانے میں بیحد زندہ دل تھی مگر گیارہ برس میں سات بچوں کی پیدائش اور اُن کی پرورش نے اُسے جسمانی طور پر اتنا کمزور اور ذہنی طور پر اتنا تھکا دیا تھا کہ اب جب کبھی اُسے ہنسنے کا موقع ملتا تو ایسا لگتا گویا اس کے ہونٹ ہنس رہے

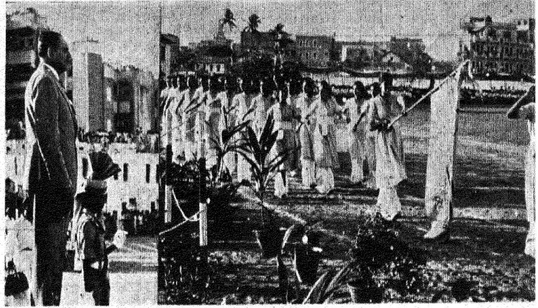
ہوں اور آنکھیں حیرت سے تماشہ دیکھ رہی ہوں۔ محمودہ کے شوہر یوسف صاحب اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز تھے۔ فارسی کے ایم۔ اے تھے اور بی۔ ٹی بھی۔ معلم ہونے کی وجہ سے اُن کی طبیعت میں انکساری اور عادات میں سادگی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ اُن کی آمدنی سات بچوں کی پیدائش اور اُن کی اچھی پرورش کی متحمل نہ تھی مگر بیچارے لوگوں کے سامنے قدرت کی دین کہہ کر اور قدرت کو رازق ثابت کرکے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کر لیتے۔ قدرت تو واقعی پیدائش کے بعد سب کو رزق دیتی ہے اور یوسف صاحب کے بچوں کو بھی وہ رزق پہنچا رہی تھی۔ مگر اُس نے یوسف صاحب کے دلوں کا چین اور راتوں کی نیند حرام کر دی تھی۔ اس لئے کہ اُس نے یوسف صاحب کو عقل اور تعلیم دونوں نعمتیں عطا کر رکھی تھیں۔ اور اُن کے سامنے اُن کے والد کی مثال بھی پیش کر دی تھی۔ جسے اُس نے اُن کی بساط اور خواہش کے مطابق صرف دو بچے عطا کئے تھے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ یوسف اور ثمینہ۔ اگر یوسف صاحب کے والد فیاض محمد خاں چاہتے اور شادی شدہ زندگی کی احتیاطیں نہ کرتے تو قدرت اپنے اٹل قوانین کے تحت انھیں ضرور اولاد کی کثرت کی سزا دیتی۔ بچوں کو رزق تو ملتا مگر فیاض محمد خاں کی زندگی ضرور عذاب بن جاتی اور بھر اولاد پر مصیبتیں نازل کرنا بھی قدرت کی طرف سے والدین کے لئے ایک منتخب سزا ہے۔ اگر فیاض محمد خاں کی اور اولاد ہوتی تو آج ثمینہ گریجویٹ اور یوسف صاحب ایم۔ اے، بی۔ ٹی نہ ہوتے۔ ثمینہ کو آپریٹو بنک کے ایک انسپکٹر کی بیوی تھی اور گیارہ برس کی شادی کے بعد اب وہ صرف دو بچوں کی ماں تھی۔ مہ جبینہ اور ناصر۔ پیارے پیارے خوبصورت، صاف ستھرے مہذب بچے۔ بیگم یوسف کو جب کبھی ثمینہ کے گھر جانے کا اتفاق ہوتا تو اُسے اُس کی صحت اور اُس کے بچوں کی پرورش پر رشک آتا۔ ایک بار تو اُس نے ثمینہ سے پوچھ بھی لیا تھا "تمہارے ہاں اور بچے کیا اب نہیں ہوں گے"؟ بھابی کے اس سوال پر ثمینہ کچھ شرما سی گئی تھی مگر اُس نے جواب ضرور دیا تھا "آدمی اگر سمجھ دار ہو اور چاہتا بھی ہو کہ خاندان کو ایک حد میں رکھا جائے تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔" بیگم یوسف اس جواب پر حیران رہ گئی تھیں اور اسی حیرت کے عالم میں انھوں نے پوچھ لیا تھا۔ "مگر روبینہ کے ابا ....." اور ثمینہ نے بات کاٹ دی تھی۔ "وہ اور ہم دونوں ہمخیال ہیں جبھی تو ایسا ہے"۔ بیگم یوسف جو کم تعلیم یافتہ تھیں۔ اور یہ غلط لتقدیر رائے ہوئے تھی کہ یہ سب کرشمہ قدرت ہے اس سوال سے مطمئن نہ تھی چنانچہ ایک بھرپور سوال کر دیا "کارخانہ قدرت میں دخل؟" اس پر ثمینہ نے فوراً جواب دیا تھا۔ "قدرت ہم پر بہت مہربان ہے۔ وہ میرے دو بچوں کو تمہارے سات بچوں جتنا رزق بہم پہنچا رہی ہے۔ اور ساتھ ہی ہمیں ذہنی سکون بھی حاصل ہے۔" اس پر بیگم یوسف خاموش ہو گئی تھیں۔ آج اس کے گھر ثمینہ آئی ہوئی تھی۔ اپنے دو بچوں کے ساتھ۔ اس لئے محمودہ کو اطمینان تھا کہ اس موقع پر اس کے بچے بھاگے بھاگے حکیم صاحب کے گھر اُدھم مچانے نہیں آدھمکیں گے۔ اسی خیال سے آج محمودہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ اور فریدہ کو بھی ہنسا رہی تھی۔ ایک لطیفہ تو اس نے ایسا سنایا کہ فریدہ بھی اپنی غیر حالت بھول کر بے تحاشا ہنس پڑی اور چونکہ ہنس ہنس کر اس کے پیٹ میں بل نہ پڑ سکتے تھے، اس لئے بچہ پیدا ہو گیا۔ محمودہ نے فریدہ کو سہارا دیا اور سلطانہ نے بچہ کو مگر سلطانہ نے جب دیکھا کہ لڑکا نہیں، لڑکی ہے۔ تو اُس نے ڈر کے مارے خاموشی سے یہ خدمت محمودہ کے سپرد کر دی اور خود فریدہ کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئی۔

حکیم صاحب کو جب اِس کی اطلاع ملی تو وہ اُس رات گھر نہ آئے۔ علی الصبح مطب میں چلے گئے۔

دوسری رات جب آئے تو بچی کی صورت تک نہ دیکھی۔ رسماً فریدہ کی طبیعت پوچھی اور سلطانہ کو قہر آلود نظروں سے دیکھ کر الگ کمرے میں جا کر سو رہے۔ کچھ روز بعد جب فریدہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گئی تو اس نے حکیم صاحب کے کان بھرنے شروع کر دیئے۔ "سلطانہ منحوس ہے۔ اس گھر میں اُس کی موجودگی بُرا شگون ہے"۔ مگر حکیم صاحب چونکہ رائے عامہ سے بہت ڈرتے تھے۔ اس لئے انھوں نے سلطانہ کو گھر سے نکالنا بھی خلافِ مصلحت سمجھا۔

فریدہ اپنے حسن اور اپنی چالاکیوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تین سال تک حکیم صاحب جیسے سادہ مزاج انسان کا دل اپنے دل میں لئے رہی۔ اس مدت میں اس کی دو لڑکیاں اور پیدا ہو چکی تھیں۔ ہاجرہ اور فاطمہ۔ فاطمہ کی پیدائش نے حکیم کے صبر کا پیمانہ لبریز کر دیا تھا۔ اب انھیں فریدہ کی ہر بات میں بناوٹ کی بُو آنے لگی تھی۔ اوّل اوّل تو اُنھوں نے بے رخی اختیار کی۔ پھر مکمل تغافل برتنا شروع کر دیا۔

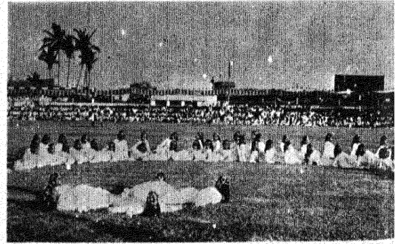
کراچی میں بین‌الاقوامی یوم اطفال

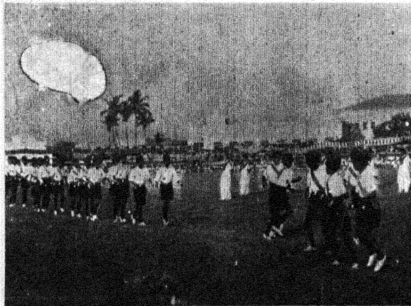

صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خاں :
بچیوں کی سلامی

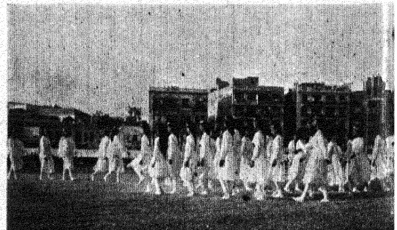
تفریحی کھیل ، پریڈ اور دیگر مظاہرے


شریک تقریب :
جنرل محمد ایوب خاں ، لفٹننٹ جنرل برکی اور چند مہمان






لڑکوں کی پریڈ



معاشرتی و ثقافتی سرگرمیاں



لفٹننٹ جنرل ، محمد اعظم خاں ، وزیر بحالیات و آبادکاری امریکی سفیر (متعینہ پاکستان) کو ایک نئی بستی (شمالی ناظم آباد ، کراچی) کی تعمیر کا نقشہ سمجھا رہے ہیں



ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کی روک تھام کے لئے خاندانی منصوبہ بندی کی اہمیت اب ہر جگہ محسوس کی جا رہی ہے
لفٹیننٹ جنرل برکی (وزیر صحت و معاشرتی بہبود) اور اراکین بورڈ ، خاندانی منصوبہ بندی' کے درمیان ایک غیر رسمی بات چیت

یوم اطفال کے موقع پر فریئر گارڈن کراچی میں بچوں کی تقریب کا ایک منظر



فلمی انجمن اطفال پاکستان (ڈھاکہ) کے پیش کردہ ڈرامہ میں ننھے اداکار



اس تغافل کی تاب، نہ لاکر فریدہ بات بات پر سلطانہ سے جھگڑ پڑتی۔ مگر چونکہ حکیم صاحب کو اپنی دونوں بیویوں سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی اس لئے سلطانہ بھی اب فریدہ کی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے لگی۔ حکیم صاحب مطب سے جب تھک تھکا کر گھر آتے تو بچوں بچیوں کے شور غل سے اُن کے کان گویا پھٹنے لگتے۔ بعض اوقات تو وہ انھیں اتنا پیٹتے کہ بے ہوش ہونے لگتیں! فریدہ اور سلطانہ چپ چاپ بیٹھی رہتیں کیونکہ دونوں کو معلوم تھا کہ زبان کھولی نہیں اور طلاق کی نوبت آئی نہیں! کثرت اولاد کا اکثر یہی انجام دیکھا گیا ہے۔

ایک روز حکیم صاحب کے مطب میں ایک دیہاتی بڑھیا میلے کچیلے کپڑے پہنے داخل ہوئی اور رونی صورت بنا کر اُن کی منت سماجت کرنے لگی کہ وہ اُس کے بیمار شوہر کو دیکھنے اس کے گاؤں چلے چلیں۔ حکیم صاحب نے اس کی حالت سے اندازہ تو لگا لیا کہ فیس تو برائے نام ہی ملے گی مگر اُن کی خدا ترسی کی ایک شہرت قائم ہو چکی تھی۔ اس لئے انکار بھی نہ کر سکے۔

حکیم صاحب جب بڑھیا کے ہمراہ ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں داخل ہوئے تو صحن میں ایک انتہائی لاغر، سفید ریش، بزرگ چارپائی پر پڑا کھانس رہا تھا۔ ان کے بالکل قریب ہی ایک اور چارپائی پڑی تھی حکیم صاحب اس کے اوپر بیٹھ گئے اور بیمار کی نبض دیکھنے لگے۔ پھر زبان، آنکھیں، پیٹ اور پسلیاں دیکھیں اور تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گئے۔ بڑھیا کو کچھ تشویش لاحق ہوئی۔ اس لئے ہاتھ جوڑ کر اُن کے قریب زمین پر بیٹھ گئی اور زار و قطار رو رو کر التجا کرنے لگی کہ وہ خدا کے لئے اُس کے شوہر کو کسی نہ کسی طرح بچا لیں ورنہ وہ اور اُس کی بیٹی دنیا میں بالکل بے سہارا رہ جائیں گی۔ اس پر بیمار نے آنکھیں کھولیں اور نحیف آواز میں کہنے لگا۔ "بے سہارا تو تم اُس وقت سے ہو گئی تھیں جب تمہاری آنکھوں کے سامنے تمہارے چار لڑکوں نے ایک ایک کر کے دم توڑ دیا تھا۔ میرے دم کا کیا بھروسہ۔ دو روز اور جی لوں گا۔" حکیم صاحب نے اسے تسلی دی اور کہا کہ خدا نے چاہا تو ان کی دوا سے بیمار کو ضرور شفا حاصل ہوگی۔ بڑھیا کو اچانک کچھ یاد آیا اور اُس نے آواز دی "بیٹی۔ چائے تیار ہوئی یا نہیں؟" آواز سنتے ہی ایک نوجوان، سرو قد اور حسین و جمیل لڑکی قدرے پھٹے مگر صاف کپڑے پہنے اور دونوں ہاتھوں میں پرانی ٹرے تھامے سامنے کے کمرے سے نمودار ہوئی۔ حکیم صاحب نے اُس کی طرف دیکھا تو بس دیکھتے ہی رہ گئے! لڑکی نے سلام کیا اور ٹرے اُن کے سامنے چارپائی پر رکھ کر ماں کے قریب زمین پر بیٹھ گئی، اور ایک تنکے سے کچی زمین پر الٹے سیدھے خطوط کھینچنے لگی۔ حکیم صاحب چائے کے ہر گھونٹ کے ساتھ لڑکی پر بھی ازراہِ اخلاق نظر ڈال لیا کرتے تھے۔ اچانک انھیں کچھ سوجھا اور کہنے لگے۔ "مائی! تم بالکل فکر نہ کرو۔ چچا میاں انشاءاللہ بالکل تندرست ہو جائیں گے۔ میرے بارے میں سب جانتے ہیں۔ دوسروں کا دکھ میرا دکھ ہے۔ اور دوسروں کا آرام میرا آرام ہے۔ اور پھر تم تو بہت مظلوم ہو۔ تمہاری اور چچا میاں کی مدد کرنا تو میرا فرض ہے۔ خدا کے لئے میری فیس یا دوا کے پیسوں کا خیال ہرگز اپنے دل میں نہ لانا ورنہ مجھے بہت دکھ ہوگا۔ مجھے تم اپنا ہی سمجھو اور روز میرے مطب سے دوا لے جایا کرو۔ کہو تو میں خود روز چچا میاں کو دیکھنے آ جایا کروں۔ یا پھر کسی اور کو..... بلکہ اس کو کیا نام ہے اس کا؟" بڑھیا بولی "جی زرینہ۔" حکیم صاحب کو زرینہ کا نام اُس وقت سے یاد تھا جب اُس کی ماں نے اسے آواز دی تھی وہ کچھ تو چھپانا چاہتے تھے اور کچھ اس نام کا لطف لینا چنانچہ انھوں نے دہرایا۔ "زرینہ۔ اچھا۔ اچھا۔ ہاں تو بیشک زرینہ کو بھیج دیا کرو۔ مگر دوا کے استعمال میں ناغہ نہ ہونا چاہیئے۔"

اس کے بعد زرینہ نے روزانہ ان کے مطب میں آنا شروع کر دیا۔ زرینہ تین میل سے چل کر آتی، اس لئے حکیم صاحب اسے آرام کرنے کے بہانے بٹھائے رکھتے جس روز مطب میں اور کوئی مریض نہ ہوتا حکیم صاحب موقع کو غنیمت جان کر اُس کے قریب جا بیٹھتے اور اس سے نہ صرف اظہار ہمدردی کرتے بلکہ ہر قسم کی امداد کا وعدہ کرتے۔ ایک روز انھوں نے زرینہ سے پوچھا۔ "زرینہ میرے متعلق تمہاری کیا رائے ہے، میں اچھا آدمی ہوں یا بُرا؟" زرینہ نے نظریں جھکا لیں اور جواب دیا۔ "آپ بہت اچھے آدمی ہیں۔" انھوں نے دوسرا سوال کر دیا۔ "نہیں، بلکہ تمہارے دل کو میں اچھا لگتا ہوں یا بُرا؟" زرینہ خاموش رہی۔ بھلا اس مہمل اور بے محل سوال کا وہ کیا جواب دیتی۔ حکیم صاحب نے اصرار کیا۔ "بتاؤ۔ سچ سچ بتاؤ۔ اگر بُرا لگتا ہوں تو صاف صاف کہہ دو۔" زرینہ خاموش رہی۔

حکیم صاحب سمجھے الخاموشی نیم رضا۔ اب حکیم صاحب نے اپنا راستہ تیار کر لیا تھا۔ کہنے لگے۔ "زرینہ مجھے تم سے دلی لگاؤ ہو گیا ہے۔ بے پناہ۔ میں ہر وقت تمھارے ہی متعلق سوچتا رہتا ہوں۔" زرینہ نے اپنا سر اور بھی جھکا لیا۔ آنکھیں نیچی کر لیں۔ اور وہ بالکل بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ حکیم صاحب نے پھر پوچھا۔ مگر وہ خاموش ہی رہی۔ اس پر حکیم صاحب نے کہا "کیا میں نے یہ سوال پوچھ کر کوئی غلطی کی ہے؟" زرینہ نے زبان کھولی "میں کیا کہہ سکتی ہوں"۔ وہ یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی، اور پھر حکیم صاحب کی طرف دیکھا اور سلام کر کے مطب سے باہر چلی گئی۔ حکیم صاحب دور تک اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے اور اس کے خیال میں کھوئے رہے۔

دوسرے ہی روز حکیم صاحب زرینہ کے گاؤں گئے اور اس کی ماں سے اس کی شادی کا ذکر چھیڑ دیا۔ اندھے کو کیا چاہیئے دو آنکھیں۔ ماں فوراً مان گئی۔ اب زرینہ حکیم صاحب سے پردہ کرنے لگی۔ اگر زرینہ کا والد ذرا بھی چلنے پھرنے کے قابل ہو جاتا تو اُن کی شادی میں کوئی دیر نہ لگتی۔ مگر زرینہ کے والد کی یہ آخری خواہش بھی پوری نہ ہو سکی اور وہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ زرینہ کے والد کی وفات کی وجہ سے حکیم صاحب کی شادی بھی پورے ایک برس تک رکی رہی۔

ایک برس کے بعد جب حکیم صاحب اور زرینہ کے نکاح کا دن مقرر ہو گیا تو انھوں نے اپنی دونوں بیویوں کو بلایا اور ان سے اپنی ہونے والی تیسری شادی کا ذکر چھیڑا۔ دلیل نرینہ اولاد کی خواہش کے سوا کچھ نہ تھی۔ سلطانہ، جو ایک بار پہلے بھی یہ زہر پی چکی تھی، زیادہ سدِ راہ ثابت نہ ہوئی۔ مگر فریدہ نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اس پر حکیم صاحب کو وہی حربہ یاد آیا۔ جس کے استعمال کا حق مرد کو ہر وقت حاصل ہے۔ مگر انھوں نے قدرے احتیاط سے کام لیا۔ اور فریدہ کو اجازت دی کہ اگر وہ ناخوش ہے تو وہ طلاق حاصل کر سکتی ہے۔ طلاق کا نام سنتے ہی فریدہ ٹھنڈی پڑ گئی۔

زرینہ کے نکاح کی رسم نہایت ہی خاموشی اور سادہ طریقہ پر ادا ہوئی۔ اور جب وہ لاکھوں آرزوؤں اور لاکھوں تمناؤں کے ساتھ حکیم صاحب کے گھر میں داخل ہوئی تو اُن کی چھ لڑکیوں اور دو بیویوں نے اڑی اڑی رنگت اور خاموش نگاہوں کے ساتھ اُس کا استقبال کیا۔

اب کے بھی چاند جب دسویں بار ڈوبا تو حکیم صاحب کی مراد پوری نہ ہوئی۔ زرینہ نے حکیم صاحب کی معمولی سی بے رخی سے اندازہ لگا لیا کہ اُس کا حشر بھی سلطانہ اور فریدہ کا سا ہونے والا ہے۔ وہ ہر وقت اسی خیال میں کھوئی رہتی۔ چونکہ وہ گاؤں کی رہنے والی تھی اس لئے اس کے سوچنے کا طریقہ شہریوں کے طریقے سے مختلف تھا۔ ایک روز وہ دیر تک سوچتی رہی تو اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی، اور بہت خوش ہوئی۔ اُسی روز اُس نے تھوڑی دیر کے لئے اپنی ماں کو اپنے پاس بلانے کا پیغام بھیجا جس کا علم حکیم صاحب کو نہ ہو سکا۔ اُس نے اپنی ماں کے سامنے ایک تجویز پیش کی؛ اور اُس کی ماں نے اُسے یقین دلایا کہ اس پر عمل کیا جائے گا۔

ایک صبح حکیم صاحب نماز کے لئے اٹھے تو زرینہ بھی ایک قہقہہ لگا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ حکیم صاحب نے سبب دریافت کیا تو وہ فوراً سنجیدہ ہو گئی۔ آنکھیں مل کر کلمہ پڑھا۔ اور اپنا خواب بیان کیا کہ اُس نے خواب میں دور ایک شاخ پر گلاب کا ایک پھول دیکھا ہے مگر جب وہ اُسے توڑنے کے لئے دوڑی تو دو مرتبہ بُری طرح گری اور اُس کے پاؤں میں دو بڑے بڑے کانٹے چبھے مگر تیسری بار وہ پھول کے قریب پہنچ گئی اور پھول توڑ لیا۔ اس پر وہ خوش ہو کر اس زور سے ہنسی کہ اُس کی آنکھ کھل گئی۔ حکیم صاحب نے کافی دیر تک سوچنے کے بعد اُس سے وعدہ کیا کہ وہ کسی سے ضرور اس کی تعبیر پوچھیں گے۔ زرینہ نے اُسے اپنے گاؤں کے دو مشہور تعبیر بتانے والوں کے نام بتائے۔ حکیم صاحب نماز سے فارغ ہو کر سیدھے اس کے گاؤں گئے اور تعبیر بتانے والوں سے جا کر ملے۔ دونوں نے فیصلہ دیا کہ جس عورت نے یہ خواب دیکھا ہے اُس کی دو لڑکیاں ہوں گی۔ اور اُس کے بعد اُسے خدا بیٹا دے گا۔ گرنے اور کانٹے لڑکیوں کی طرف اشارہ ہے۔ اور پھول بیٹے کی طرف۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ایسے اچھے اور واضح خواب بہت کم خوش نصیب دیکھتے ہیں۔ حکیم صاحب بیحد خوش ہوئے اور اسی خوشی میں ڈیڑھ برس بعد جب زرینہ کے بطن سے دوسری لڑکی پیدا ہوئی تو انھیں ذرا بھی ملال نہ ہوا۔ سلطانہ اور فریدہ حیران تھیں کہ زرینہ نے حکیم صاحب پر کیا جادو کر دیا ہے۔

سلطانہ کا ایک ہی بھائی تھا۔ ناصر۔ جو عمر میں اُس سے چھوٹا تھا۔ ناصر کی شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی۔ اس لئے وہ اپنی بہن اور حکیم صاحب کو اپنے ساتھ جہلم سے راولپنڈی لے جانے کو خود چلا آیا تھا۔ اُس نے حکیم صاحب کی بہت منت سماجت کی کہ وہ ضرور چلیں۔ چنانچہ حکیم صاحب نے وعدہ کر لیا کہ وہ عین شادی کے دن پہنچ جائیں گے۔ وہ فی الحال اپنی بہن کو لے جائے۔ حکیم صاحب دنیا دکھاوے کو شادی کے دن راولپنڈی پہنچ گئے۔ برات گئی اور دلہن بھی آ گئی۔ رات تک لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ حکیم صاحب کے لئے رات بسر کرنے کو ایک الگ تھلگ چھوٹے سے کمرے میں پلنگ بچھا دیا گیا۔ اُن کی عادت تھی کہ سونے سے پہلے دودھ ضرور پیا کرتے۔ سلطانہ کو اس کا علم تھا۔ اس لئے جب وہ دودھ سے بھرا گلاس تھامے اُن کے کمرہ میں داخل ہوئی تو حکیم صاحب کی نظر بلا ارادہ اس کے چہرے پر پڑ گئی۔ بھائی کا بیاہ تھا سلطانہ نے کیا کچھ سنگھار نہ کر رکھا تھا۔ بھڑکیلا لباس۔ ہونٹوں پر سرخی، گالوں پر سرخی۔ آنکھوں میں کاجل۔ وہ کوئی حکیم صاحب کو دکھانے بن ٹھن کے تھوڑا آئی تھی۔ اس کے بھائی کا بیاہ تھا۔ حکیم صاحب کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ سلطانہ اتنی حسین بھی ہو سکتی ہے۔ وہ حسین تھی مگر کئی برس پہلے۔ حکیم صاحب کو یوں محسوس ہوا جیسے اُس رات دلہن ناصر کے گھر نہیں اُن کے اپنے گھر آئی ہے۔ وہ سوچنے لگے سلطانہ سے کیا بات کریں۔۔۔

دوسرے روز حکیم صاحب واپس چلے گئے۔ سلطانہ دس روز تک بھائی کے گھر رہی اور پھر ناصر اُسے حکیم صاحب کے گھر چھوڑ آیا۔ حکیم صاحب ذہنی طور پر بیحد پریشان رہنے لگے تھے۔ ان کی صحت بھی گرتی جا رہی تھی۔ ناصر کی شادی کے چھ ماہ بعد تک تو انھیں کوئی شدید بیماری لاحق نہ ہوئی تھی مگر اُس کے بعد وہ مسلسل تین مہینے بستر پر ایسے پڑے کہ چلنا پھرنا تو در کنار اٹھ کر بیٹھنے کے قابل بھی نہ رہے۔ اب کے جب زرینہ نے پھر ایک لڑکی کو جنم دیا تو اُن پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اور زرینہ کے خواب کا پھول تیسرا کانٹا بن کر اُن کے سینے میں ایسا چبھا کہ وہ درد کی شدت سے چیخ اٹھے۔ آخری دنوں میں انھوں نے سب سے بولنا بند کر دیا تھا۔

ایک روز جب سلطانہ نے پانی سے بھرے ہوئے دو گھڑے دوسری جگہ رکھنے کے لئے دو ہاتھوں میں اٹھائے تو گھڑے ہاتھ سے چھوٹ گئے اور وہ بے ہوش سی ہو کر گر پڑی۔ حکیم صاحب جس چارپائی پر پڑے تھے وہ صحن ہی میں بچھی تھی۔ فریدہ اور زرینہ جھٹ اُس کے پاس پہنچیں۔ اور اُس کے اوپر چادر اڑھا دی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب بات شک کی حد سے گزر کر یقین تک پہنچی تو فریدہ خوشی سے پکاری "لڑکا ہے"۔ زرینہ نے سلطانہ کو سنبھالا اور فریدہ بچے کو کمرے میں لے گئی۔ حکیم صاحب نے پہلی بار اپنی بڑی لڑکی حسنٰی کو اشارے سے مسکرا کر بلایا۔ ان کی آواز بیحد نحیف ہو چکی تھی اس لئے کان میں کہا۔ "بھائی کا خیال رکھو"

آج لڑکے کی پیدائش کا تیسرا دن تھا۔ اور حکیم صاحب کی ۳ تین بیویاں اور ۹ نو بچے اُن کے پلنگ کے دائیں بائیں بچھی ہوئی چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ حکیم صاحب کی زبان بند ہو چکی تھی۔ پہلے انھوں نے ایک نظر نومولود پر ڈالی۔ دوسری نظر سب پر۔ پھر دونوں ہاتھ ملنے لگے۔ آخری ہچکی لی۔ اور آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے موند لیں۔

حکیم روشن دین مرحوم کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر اُن کے احباب و اعزا خدا سے ان کی ۳ تین بیواؤں اور ۹ نو بچوں کو صبر جمیل عطا فرمانے کی دعا کرتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے ✦

★

ماہِ نو، کراچی، نومبر ۱۹۵۹ء

خاکہ:

پنکھے والے حافظ جی

اشرف صبوحی

آج سے کوئی پچاس برس ہوئے دلی میں ایک بزرگ جاڑے گرمی پنکھا ہاتھ میں لئے پھرا کرتے تھے۔ قاضی کے حوض سے سرکی والوں، لال کنوئیں تک بازار میں اور پنڈت کے کوچے، نیاریوں، شاہ گنج اور شاہ تارا کی گلی کے اندر اندر انہیں چکر لگاتے دیکھا۔ یوں سننے کو ہزاروں باتیں سنیں۔ ایک ہی دن کسی نے کہا ہم نے قطب کی لاٹھ کے نیچے دیکھا ہے تو کسی نے بیان کیا کہ ہم ابھی روشن چراغ دہلی میں چھوڑ کر آئے ہیں۔ بلکہ اجمیر سے آنے والوں نے اجمیر میں اور کلکتے سے آنے والوں نے کلکتہ میں بھی دیکھا۔ مگر ہم نے تو سارے دن دوپہر شام انہی گلیوں اور انہی بازاروں میں پنکھا ہلاتے اور پھیرے کرتے دیکھا۔

لوگ انہیں مجذوب کہتے تھے ہوں گے۔ اللہ ہی جانے مگر ہم نے تو کبھی ان کی ایسی حالت نہیں دیکھی جیسی عام طور پر مجذوبوں کی ہوتی ہے۔ ہمیشہ کپڑے پہنے ہوئے۔ لٹھے کا انگرکھا۔ بغیر کرتے کے جس میں سے چھاتی کے بال نظر آتے۔ ایک بر کا پاجامہ۔ اجلا بے داغ۔ پاؤں میں گول پنجے کی جوتی۔ البتہ سر سے ننگے۔ ٹوپی پہنے کبھی نہیں دیکھا۔ ہمارا لڑکپن تھا اور ان کا بڑھاپا۔ اس وقت وہ کم از کم ستر برس کے پیٹے میں ہوں گے۔ ہاڑ کے معمولی تھے۔ دبلے پتلے۔ بال کھچڑی۔ چاول زیادہ اور دال کم۔ رنگ گندمی تھا کسی قدر میلا۔ صورت نورانی۔ چھوٹی کسی ڈاڑھی لبیں کتری ہوئیں۔ چہرے پر متانت۔ نہ بڑبڑانا نہ کسی سے کچھ بات کرنا۔ کوئی سلام کرتا تو پنکھا ہلا دیتے اور گزر جاتے۔ نہ لڑکوں کا غول ان کے پیچھے رہتا اور نہ کوئی ان سے بات چیت کرتا۔

دیوانہ کو دیوانہ بنا دینے کے بھی اسباب ہوا کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ مجذوب پرست انہیں بھی چھیڑ چھیڑ کر پاگل بنا دیتے اور یہی پتھر مارنے اور گالیاں بکنے لگتے۔ لیکن چونکہ ان کے بھتیجے محمد نذیر تھانے دار تھے۔ اپنے وقت کے بڑے مشہور تھانے دار۔ اور اسی علاقے میں قاضی کے حوض کے تھانے پر ان کی تعیناتی تھی اس لئے کس کی ماں نے دھونسا کھایا تھا جو انہیں ستاتا یا ان کے ساتھ گستاخی سے پیش آتا۔

ہم نے محمد نذیر تھانے دار کو بھی دیکھا ہے۔ اگرچہ ہمارے ہوش میں انہوں نے پنشن لے لی تھی لیکن رعب داب ان کا بدستور تھا۔ سرکی والوں کے بازار میں لال دروازے کے سامنے ایک کوچہ ہے جس کو نور اللہ بیگ کا کوچہ کہتے ہیں۔ اس کوچہ میں ان کا مکان تھا۔ شام کے وقت جاڑے گرمی کوچہ کے آگے پٹڑی پر لمبی مونڈھے بچھ جاتے۔ ایک مونڈھے پر تھانے دار صاحب بیٹھے ہوئے دکھائی دیتے اور دوسرے پر مرزا وزیر بیگ۔ وزیر بیگ بڑے ہاڑ کے آدمی تھے شیر کا سا چوڑا چکلا چہرہ۔ مہندی سے رنگی ہوئی گول ڈاڑھی کے ساتھ لال۔ آواز ایسی جیسے بادل گرجا۔ محمد نذیر تھانیدار بھی مہندی لگاتے تھے مگر مرزا کے مقابلے میں ان کا جثہ بہت حقیر تھا اس لئے یاروں نے ان پر پھبتی اڑائی تھی کہ لال مرغے میں ایک اصیل ایک تیتی۔ بہرحال ان دونوں کا گٹھ جوڑ رہا تھا جب تک یہ دونوں زندہ رہے کوچے کے آگے کی بیٹھک نہیں چھوٹی اور کبھی دونوں میں سے ایک کو اکیلا نہیں دیکھا۔ تھانے دار صاحب کے چچا جس وقت اپنے گشت میں ادھر سے گزرتے تو دو چار منٹ کے لئے ایک مونڈھے پر ہو بیٹھتے اور خاموش بیٹھے رہتے۔ اتنی دیر تک یہ دونوں بھی کوئی بات نہ کرتے نیچی نگاہیں کئے مؤدب انہیں دیکھا کرتے۔

محلے اور بازار کے شیر جب ان کے آگے گردنیں جھکا لیتے تو لومڑیاں کیا ان کے گرد ہوتیں۔ دوسرے ان کی نہ صورت ایسی تھی کہ لوگ ہنستے نہ کوئی حرکت ایسی کہ لڑکے بالے چھیڑیں۔ اب رہے درویشوں کے پرستار یا مجذوبوں کے متوالے وہ اکیلے دکیلے ضرور ان سے عرض معروض کرتے ہوں گے۔ ہم نے اس کے متعلق کچھ سنا نہیں۔ درحقیقت درویشوں کی شہرت ان کی شوریدہ مزاجی ہی سے ہوتی ہے۔ یہ خاموش تھے اس لئے علانیہ نہ ان کا پہنچے ہوئے فقیروں میں شمار تھا نہ مجذوبوں میں۔

ہم نے ان کا نام معلوم کرنا چاہا۔ افسوس جس سے پوچھا اس نے لاعلمی ظاہر کی اور یہی کہا کہ محمد نذیر تھانیدار کے چچا ہیں۔ پھر ہم نے بعض اپنے

بڑوں سے پوچھا کہ ان کی یہ کیفیت کب سے ہے؟ اس کا جواب بھی نفی میں ملا۔ یہی کہ ہم نے جب سے دیکھا اسی حالت میں دیکھا۔

لڑکپن کی ایک خصلت یہ بھی ہے کہ جس بات کا پتہ نہیں لگتا اس کی کرید ہو جاتی ہے۔ ایک دن میں اپنے مکان کی ڈیوڑھی پر نانا کے ساتھ کھڑا تھا کہ سامنے سے حضرت پنکھا ہلاتے گزرے۔ میں نے نانا سے بھی ان کے متعلق سوالات شروع کر دئے۔ اتنے میں کریم اللہ خاں آ گئے۔ یہ شیری گوہر کے پوتے تھے۔ محلے میں سب سے بڑی عمر کے آدمی۔ ہمارے مکان کے سامنے ان کا گھر تھا۔ پوچھنے لگے "کیوں بھئی نانا سے کیا باتیں ہو رہی ہیں؟" نانا نے کہا۔ "محمد نذیر کے چچا کو پوچھتا ہے کہ کب یہ دیوانے ہوئے"۔ کہنے لگے "آؤ بیٹا ہم بتائیں۔ ہم نے ان کا بچپن بھی دیکھا ہے بلکہ مسجد میں ہم دونوں کئی مہینے تک ساتھ پڑھے ہیں۔ یہ بڑے شریر تھے۔ ملّاجی ان کی خوب ٹھکائی کیا کرتے مگر ذہن ایسا اچھا تھا کہ چھ مہینے میں قرآن حفظ کر لیا"۔

اس دن معلوم ہوا کہ واقعی حافظ ہیں۔ لوگ یونہی نہیں کہتے۔ میں نے پوچھا کہ اچھا پھر ان کا دل کس طرح اُلٹا؟ انہوں نے بتایا کہ یہ سامنے جو سید کا تھان ہے۔ جمعرات کی جمعرات۔ اب تو اتنے نہیں پہلے بہت چڑھاوا چڑھا کرتا تھا۔ بیسیوں چراغ جلتے۔ کبھی کبھی کوئی قوال یا مناجاتی آ بیٹھتا۔

یہاں میں چاہتا ہوں کہ سید کے تھان کی جگہ بھی آپ کو بتا دوں۔ جہاں اب پیرجی عبدالصمد مرحوم کا مکان ہے یہاں کچھ کچے مکان اور کچھ کھنڈر تھے۔ اسی النگ میں شاہ گنج کی طرف چلو تو ان کچے ڈھابوں کے برابر سفید گھوڑے والے میر صاحب کا اصطبل تھا۔ اصطبل کے آگے میدان۔ لڑکے کبڈی گلی ڈنڈا۔ گیند چڈی اور گیڑیاں کھیلا کرتے تھے۔ میدان کے خاتمے پر کسی پرانی عمارت کی ایک محراب سی باقی تھی اور اس میں ایک طاق بنا ہوا تھا۔ اسی طاق کو کسی سید صاحب کا گنبد سمجھنا چاہیئے۔ وہیں سہرے لٹکائے جاتے۔ کھیلیں بتاشے ریوڑیاں وغیرہ چڑھائی جاتیں۔ گھی کے چراغ جلتے۔ جمعرات کو یہ بہار ہم نے بھی دیکھی ہے۔ جھاڑو ملتی چھڑکاؤ ہوتا اور شام سے رات گئے تک بیسیوں عورتیں اور مرد چڑھاوا چڑھانے آتے۔ نوچندی جمعرات کو ڈھولک بھی پٹتی۔ کسی کسی کے سر کبھی کبھی سید صاحب بھی آ جاتے۔ ہمیں ممانعت تھی کہ جمعرات کو اُدھر ہرگز نہ جانا۔ ہم کبھی کچھ ڈر سے اور اس لئے کہ گھر والوں میں سے کسی نے دیکھ لیا تو خفا ہوں گے اس طرف نہ جاتے۔ دور ہی دور سے تماشا دیکھا اور گانا سنا کرتے۔

اچھا تو کریم اللہ خاں نے سنایا "مشہور تھا کہ تھان والے سید کوئی بڑے جلالی ہیں۔ جب بگڑ جاتے ہیں تو بچے بوڑھے عورت مرد کسی کو نہیں دیکھتے۔ کئی قصّے بھی کہے جاتے تھے کہ جمعرات کو طاق میں فلاں شخص کو اس صورت میں نظر آئے تو فلاں کو اس روپ میں۔ کیا مقدور ان کے نام کے چڑھاوے کو کوئی ہاتھ تو لگا لے۔ تخولی پہلوان نے منع کرتے کرتے جلیبیوں کا دونا اٹھا لیا تھا ایسا پٹخنا دیا کہ خون تھوکتے تھوکتے آخر مر گیا۔ دھنو دھنوا ایک نٹنی تھی ٹھری شہدن خلیفہ کلن نے اس کو ڈال لیا تھا۔ کسی نے کھیر کا پیالہ چڑھایا۔ اس کی رال ٹپک پڑی۔ ہاتھ ڈالتے ہی لوٹن کبوتر بن گئی۔ غرض یہ ہے کہ ایسی ایسی کہانیاں سنا کر بچوں کو وہاں جانے سے روکتے تھے لیکن بچے کیا مانتے۔ ریوڑیوں اور میٹھی کھیلوں کے لالچ میں آس پاس لگے ہی رہتے۔ کیونکہ بعض لوگ چڑھاوا چڑھانے کے بعد تھوڑی تھوڑی مٹھائی بچا کر بچوں کو بھی بانٹ دیتے۔ ملّاجی نے ہم کو منع کر رکھا تھا اور چونکہ مسجد سامنے ہی تھی ان کے ڈر سے کوئی لڑکا نہ جاتا۔ جاتا بھی تو آنکھ بچا کر۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ملّاجی کہیں دعوت میں گئے ہوئے تھے۔ نوچندی جمعرات تھی۔ ہم کو موقع مل گیا ہم پہنچے۔ یہ حافظ جی بھی آ گئے۔ ایک عورت نے برفیوں کا دونا چڑھایا۔ حافظ جی کے منہ میں پانی بھر آیا۔ کہنے لگے یار اس پر ہاتھ مارنا چاہیئے۔ میں نے کہا اگر تم نے یہ دونا اُچک لیا تو صبح کو اتنی ہی برفیاں اور کھلاؤں گا۔ بولے اچھا ٹھہرو۔ ذرا سوفتہ ہو جانے دو۔

چنانچہ ہم پرے ہٹ کر کھڑے ہو گئے اور سوفتہ ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ عشاء کی نماز کے بعد بھیڑ چھٹنی شروع ہوئی اور نو بجتے بجتے آنے جانے والوں کا تانتا ٹوٹ گیا۔ ان دنوں آج کل جیسا حال تو تھا نہیں کہ آدھی آدھی رات تک گلی کوچے چلتے رہیں۔ عشا کی نماز کے بعد گلی میں کون چلتا پھرتا۔ تھان کے چراغ بھی ٹمٹمانے شروع ہو گئے۔ حافظ جی اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے آگے بڑھے اور جاتے ہی طاق پر جھپٹّا مارا۔ برفیوں کے دونے پر ہاتھ پڑنا تھا کہ طاق کے اندر سے ایک پنجہ نکلتا ہوا دکھائی دیا۔ حافظ جی "شیر شیر" کہتے ہوئے طاق کی حد کے باہر آ کر گر پڑے اور ہم بھاگ کر اپنے گھروں میں گھس گئے۔ رات بھر مجھے بخار چڑھا رہا۔ حافظ جی پر کیا گزری کچھ خبر نہیں۔

صبح کو جب میرا بخار اترا اور مجھے ہوش آیا تو گھر میں چرچا سنا کہ حافظ جی کا برا حال ہے۔ لینے کے دینے پڑے ہوئے ہیں۔ لڑکے مانتے ہی نہیں لاکھ دفع منع کیا کہ سید صاحب کے تھان پر بچوں کا کام نہیں۔ اب مزہ آیا اور جائیں۔ معلوم ہوا کہ جب مولا بخش ٹرھئی صبح کی نماز پڑھنے جا رہا تھا تو اس نے

حافظ جی کو بیہوش پڑے ہوئے دیکھا۔ بڑی مشکل سے اٹھا کر مسجد میں لے گیا۔ نماز کے بعد ملا جی نے بہتیرا پڑھ پڑھ کر پھونکا مگر حافظ جی کو ہوش نہ آیا۔ آخر ان کے گھر والوں کو خبر کی۔ بیچارے رات بھر پہلے ہی پریشان رہے تھے۔ سنتے ہی بے اوسان ہو کر بھاگے ہوئے آئے اور ڈولی ڈنڈا کر کے اٹھا لے گئے۔

پیر جی سنگھاڑا پیر جی پھندے۔ سید حسن، مولوی نیک عالم، فراشخانے میں اخوند جی ان دنوں یہی دو چار آدمی جھاڑ پھونک کرنے والے تھے اور سفلی کرنے والوں میں امیر بیگ یا بھگت کمہار کسی نے فلیتے کی دھونی ناک میں دلوائی۔ تعویذ دئے نقش لکھے کسی نے ڈورو بجائے سارے کرتوت کئے مگر حافظ جی نے آنکھ نہ کھولی۔ چار دن کے بعد آنکھ کھلی تو نہ منہ سے بولتے ہیں نہ سر سے کھیلتے ہیں۔ بالکل گم صُم نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کی پروا۔ لیٹے ہیں تو لیٹے ہیں کھڑے ہیں تو کھڑے ہیں۔ کچھ پوچھو تو جواب نہیں۔

اس زمانے میں کبھی کبھی گھڑ چڑھے فقیر آیا کرتے تھے۔ اس اثنا میں وہ بھی آ گئے۔ گھڑ چڑھے فقیروں کی صدا جو حافظ جی کے گھر والوں کو پہنچی تو حافظ جی کو پکڑ ان کے سامنے لائے۔ انہوں نے دیکھتے ہی کہا "مائی یہ تو میراں کی جھپیٹ میں آ گیا ہے۔ پیران کلیر والے کے ہاں لے جاؤ نہیں تو پاگل ہو جائے گا۔"

حافظ جی کے گھر والوں میں کوئی مرد نہیں تھا۔ دُکھڑا پیٹنے والی عورتیں ہی عورتیں تھیں۔ ماں بیچاری جس طرح بنا مامتا کی ماری پیران کلیر لے گئی۔ طبیعت میں ایک قسم کی وحشت جو چلی آتی تھی۔ وہ تو جاتی رہی لیکن آدمی کی جون میں نہ آئے۔ پھر ایک مرتبہ سنا کہ مدار کی چھڑیوں والوں کے ساتھ اجمیر شریف کی طرف نکل گئے۔ لوگ ڈھونڈ ڈھونڈ کر بیٹھ رہے۔ عورتوں نے بھی ان کو صبر کر لیا۔ کوئی گیارہ برس کے بعد خود بخود آ گئے۔ لیکن آنا نہ آنا یکساں تھا۔ نہ گھر کے کام کے تھے نہ باہر کے۔ چپ یہاں کھڑے ہیں وہاں بیٹھے ہیں۔ کھانا کھلا دیا کھا لیا۔ پانی پلا دیا پی لیا۔ ورنہ کچھ نہیں۔ کپڑے میلے ہیں بلا سے پھٹ گئے تو پھٹ جائیں۔ نہ نہانا نہ دھونا نہ نائی نہ دھوبی۔

اتنے میں محمد نذیر سپاہیوں میں نوکر ہو گئے تھے۔ ان کے آتے ہی یکایک حولدار ہو گئے۔ ان کی کرامت سمجھی گئی۔ انہوں نے ان کا خیال رکھنا شروع کیا۔ جمعہ کے جمعہ ان کا خط بنواتے نہلواتے کپڑے پہناتے۔ چنانچہ اس وقت سے ان کی یہی کیفیت ہے۔ دیوانے تو البتہ نہیں ہیں لیکن دن رات پنکھا ہلاتے پھرنے سے کام ہے۔ اللہ ہی جانے کس خیال میں مست رہتے ہیں اور مجذوبوں یا فقیروں میں ان کا کیا درجہ ہے۔ ہم تو بھئی ایسی باتوں کے قائل نہیں۔"

کریم اللہ خاں کی زبان سے یہ سن کر کہ ہم تو ان باتوں کے قائل نہیں مجھ کو بڑا تعجب ہوا اس لئے کہ اس زمانے میں ظاہری حکومت کے ساتھ باطنی حکومت کی بڑی دھوم تھی۔ ہر انوکھا فقیر اور مجذوب خدائی فوجدار سمجھا جاتا تھا۔ علاقے بٹے ہوئے تھے۔ فلاں صاحب دلّی دروازے سے جامع مسجد تک کے قطب ہیں تو فلاں بزرگ کی عملداری کشمیری دروازے سے لاہوری دروازے تک ہے۔ حافظ جی کو بھی بعض لوگ اپنے علاقے کا حاکم سمجھتے۔

مختصر یہ کہ حافظ جی کے متعلق کوئی خاص کرامت تو منسوب نہ تھی تاہم ان کی قطبیت میں بھی شبہ نہ تھا۔ مجھے ان سے ایک قسم کی دلچسپی ہو گئی تھی۔ اکثر ان کے ساتھ ساتھ دور تک چلا جاتا۔ شوق تھا کہ کبھی ان کی آواز سنوں۔ مہینوں گزر گئے۔ کبھی کبھی ہونٹ ہلتے ہوئے تو ضرور دیکھتا لیکن آواز سننے میں نہیں آئی۔

ایک روز ٹھیک دوپہر کا وقت تھا اور ٹھیٹھ گرمی کا موسم۔ خدا معلوم کیوں میں ڈیوڑھی کے باہر آیا۔ گلی بالکل سنسان تھی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ حافظ جی غیر معمولی تیز قدمی کے ساتھ جا رہے ہیں۔ پنکھا بھی زور زور سے ہل رہا ہے۔ تیور بدلے ہوئے۔ آپ ہی آپ کچھ بول بھی رہے تھے۔ میں پیچھے پیچھے ہو لیا کہ سنوں کہتے کیا ہیں۔ چند قدم کے بعد صاف آواز آنے لگی۔ ایسی جیسے کوئی وعظ کہتا ہے۔ ان کے الفاظ تو کیا یاد رہتے۔ یہ بھی ان کی کرامت سمجھو کہ مفہوم آج تک مجھ کو یاد ہے۔ اس وقت تو میں کچھ سمجھا نہیں لیکن آج جب ان کی بڑ کا خیال آتا ہے تو ان کے صاحب نسبت ہونے میں شک نہیں رہتا۔ واقعی خاموش اللہ والے تھے۔ ان کی بڑ کا مفہوم میں اپنے لفظوں میں آپ کو سناتا ہوں۔ سمجھ لیجئے اللہ والوں میں ان کا کیا درجہ ہو گا۔

"دور ہو دور! او دنیائے دلفریب دور دور! تو نے مکار دھوکے باز مجھے کن مصیبتوں میں پھنسا دیا ہے۔ میں مختار نہیں بندۂ مجبور ہوں۔ اپنی خوشی ایک لمحہ یہاں قیام نہیں کر سکتا۔ کیا مقدور اپنے ارادے سے سانس تک لے سکوں۔ میں آزاد نہیں پابند ہوں۔ اپنی مرضی سے

کچھ نہیں کرسکتا۔ ہر وقت چشم براہ اور ہر لحظہ گوش برآواز ہوں۔ آقا کے حکم کا انتظار ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کس وقت میری طلبی کا فرمان آجائے۔ آہ اس فرمان کے بعد اس کے سوا چارہ کار نہیں کہ جس طرح بیٹھا ہوں اسی طرح اٹھ کھڑا ہوں۔ پھر تو ہی انصاف کر کہ یہ آخری لمحہ میرے لئے کس قدر دشوار ہو جائے گا۔ اگر میں ابھی سے اپنے آپ کو اس کے لئے آمادہ نہ کروں اور اس رہ گزار سے آگے بڑھنا میرے لئے کس قدر تکلیف دہ ہوگا اگر میں ابھی سے ان کانٹوں کو نہ ہٹا لوں جو خواہشوں نے بچھا رکھے ہیں اور ان پتھروں کو دور نہ کردوں جن کی موجودگی میں قدم جنبش نہیں کرسکتے۔

لوگ مجھے دیوانہ کہتے ہیں میں دیوانہ ہی سہی کسی نے میرا نام مجذوب رکھا ہے۔ قربان اگر میاں اپنے اندر مجھے جذب کرلیں۔ دنیا مجھ کو گونگا بہرا اپنے حال سے بے خبر سمجھتی ہے۔ لیکن نہ میں گونگا ہوں نہ بہرا نہ اپنے حال سے بے خبر۔ جو اپنے آقا کی آنکھیں دیکھ چکا ہو جس نے اپنے مالک کی پکاریں سنی ہوں کون ہے جو اسے بے خبر کہے۔

دور ہو دور! مجھے اپنی آرائشوں سے معاف کر۔ میں ان بالوں کو کیا سنواروں جن کا رنگ چند روز میں تبدیل ہو جاتا ہے اور جو سودائے اعتدال میں ذرا کمی ہونے سے موت کا پیام دینے لگتے ہیں۔ آہ! میں اس چہرے کو کیا آئینہ میں دیکھوں جس کی نجانے کونسی ادا پیا کو بھاتی ہے جس کی تروتازگی چند روز کی مہمان ہے اور جو تھوڑے دن میں ڈراؤنی شکل اختیار کرنے والا ہے۔ بتا میرا منہ کیا دیکھتی ہے بتا۔ آخر میں کس امید پر اس پیکر فانی کو لباس فاخرہ سے آراستہ کروں جس کے انتظار میں قبر کے پرشور ذرات بے چین ہو رہے ہیں۔ میں تو جیسا ماں کے پیٹ سے نکلا تھا ویسا ہی پھرتا مجھ کو اور تیری زینتیات کو دعوت دیتا کہ آ اور مجھ سے شرما یا مجھ کو شرما۔ لیکن کیا کروں میرے مالک کا حکم نہیں۔

اری چڑیل! چھل پائی! تو مجھے طعنے دیتی ہے۔ اضطراب کے طعنے، آخر میں ان در و دیوار کے اندر کیوں کر چین سے بیٹھوں جن سے عنقریب جبری طور پر یا بدست دگرے دست بدست دگرے مجھ کو جدا کیا جائے گا، اور میں تیرے اس ساز و سامان سے کس طرح دل خوش کروں جبکہ تھوڑے ہی عرصے میں یہ میرے قبضے سے باہر ہونے والا ہے۔ تیرے میکدے کے متوالوں کی رنگین صحبتیں مجھے بھی غفلت کی ترغیب دے چکی ہیں لیکن میں ان تماشوں سے کیوں آنکھیں بند کر لیتا جو میرے سامنے ہو رہے ہیں۔ میں کس طرح واقعات کو دل سے بھلا دوں۔ جانتا ہوں کہ یہ صحبتیں عنقریب برہم ہو کر رہیں گی، اور وہ زمانہ کچھ دور نہیں کہ محبت و یکجائی کا شیرازہ ٹوٹ جائے گا۔ تو ہنسے گی اور سب روئیں گے۔

غرض میں نے جدھر نظر اٹھائی اور اب بھی جس طرف نظر اٹھاتا ہوں تیری ہر شے میں مکاریوں کی دلفریبی پائی اور آج بھی پاتا ہوں۔ لیکن ایک ایسی دلفریبی جس کے اندر زوال کا اضطراب اور فنا کی افسردگی موجیں مارتی دکھائی دیتی ہے۔ اور اس لئے مجھ کو چین نہیں۔ مجھے تو خوشی کی جگہ ملال امن و عیش کی جگہ بیقراری و تکلیف کا سامنا رہتا ہے۔ خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہیں، اندر ہی اندر گھٹ کر دل ہی دل میں حافظ کا یہ شعر پڑھنے لگتا ہوں

مرا در منزل جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم
جرس فریاد می دارد کہ بربندید محمل ہا

اب میں حافظ کو کیا کہوں۔ تجھ کو جس میں فریب کے سوا کچھ نہیں منزلِ جاناں بتاتے ہیں۔ منزلِ جاناں اگر یہی ہے تو ایسی منزلِ جاناں کو سلام لیکن نہیں منزلِ جاناں کو اس سے زیادہ دغابازی کا گھر ہونا چاہئے۔ عشق و ہوس کا امتحان آخر کس طرح ہوتا۔ کیوں! پتہ کی سن کر گھبرائی۔ حافظ جیسے خوش مذاق لوگوں نے تجھ کو منزلِ جاناں کہہ دیا تو اکڑ گئی لگی ہم کو بھی اپنا متنی پن دکھانے۔ اپنی آرائش و دلکشی کے لحاظ سے تو منزلِ جاناں سہی۔ ہم بھی حافظ کی لے میں لے ملا کر کہتے ہیں کہ تو منزلِ جاناں، منزلِ جاناں، منزلِ جاناں۔ لیکن منزل جاناں کہنے کے بعد یہ بھی دیکھا کہ حافظ جی نے آنکھیں کس طرح نیچی کرلیں سر کیسا جھکا لیا۔ انہیں فوراً یاد آگیا کہ ایک بے قرار راہرو کو اس منزل میں امن و سکون اور راحت و آسودگی کے کیا معنی جہاں ہر لحظہ فریاد جرس بلند ہو رہی ہے کہ اٹھو اسباب سنبھالو۔ کمر باندھو۔ سفر کی تیاری کرو۔ یہ جرس کیا ہے؟ نفس کی آمد و شد جو ہر دم عمر کی کمی اور موت کے قرب کا پتہ دے رہی ہے ؎

اے غافلو! دم اس نمط آئے جائے ہے
سوچو کہ نخلِ عمر کو یہ کھائے جائے ہے

(باقی صفحہ ۱۰۵ پر)

دھوپ چھاؤں

طاہرہ کاظمی

(۱)

دھوپ روز آتی ہے
اوٹ سے پہاڑوں کی
سُرخ آتشیں تھالی
روز یوں اُبھرتی ہے
جیسے زندگی اُبھرے
چوٹیاں پہاڑوں کی
دھوپ میں نہاتی ہیں
پتھروں کے سینے میں
دھوپ آگ بن بن کر
جذب ہوتی جاتی ہے
تند، گرم دھاتوں کا
کھولتا ہوا لاوا
سرد قلبِ گیتی میں
کروٹیں بدلتا ہے

(۲)

گرم اور سنہری دھوپ
جنگلوں میں جاتی ہے
مدّتوں پُرانے پیڑ
اپنی جڑ کے پنجوں پر
اٹھ کے سانس لیتے ہیں
تاکہ سرد شریانیں
زیست کا لہو پائیں
مسکرا کے خود رو پھول
گردنیں اٹھاتے ہیں

(۳)

دھیمے دھیمے قدموں سے
دھوپ شہر آتی ہے
شہر کے مناروں سے
سیڑھیاں لگاتی ہے
شہر کے نظاروں میں
روشنی لٹاتی ہے

(۴)

صبح اپنے آنچل میں
رنگ بھر کے لاتی ہے
پیڑ جاگ اٹھتے ہیں
سُرخ چمپئی گلنار
پھول شاخساروں میں
آگ سی لگاتے ہیں
اودے اودے غنچوں کے
بوجھ سے لدے کچنار
جھوم جھوم جاتے ہیں
شب کی نیند کے ماتے
پھول آنکھ ملتے ہیں
کاسنی رسیلے پھول
سرخ پیلے نیلے پھول
بند بند غنچوں کی
دلنواز رعنائی
رس بھرے ہوئے ڈنٹھل
بوجھ سے جھکے ڈنٹھل
سبز کرکرے پتے
شاخ شاخ کلیوں پر
سُرخ مکھیوں کی گونج
پھول پھول کے اوپر
سرد اوس کے قطرے
کانپتے سیہ بھونرے
سرو کی قطاروں میں
ننھی ننھی چڑیوں کی
میٹھی میٹھی آوازیں
نرم مخملیں سبزہ
ہر روش پہ خوابیدہ
ہر خبر سے بے پروا

(۵)

دھوپ سے بھرے دن بھی
داغ داغ رہتے ہیں
لمبے لمبے پیڑوں کے
سائے رقص کرتے ہیں
دھوپ چھاؤں بنتی ہے
سائے جال پھیلائے
دھوپ کی تمازت کو
سرد کرتے رہتے ہیں

(۶)

رات اپنی چادر میں
نرم نرم یادوں کی
چھاؤں لے کے آتی ہے
جیسے رات کی رانی
دور خواب میں مہکے
جیسے موتیا جوہی
شب کو عطر سے بھر دیں
تارے گیت گاتے ہیں
چاند گنگناتا ہے
یہ سکوت گویا ہے
بیکراں خموشی بھی
اک حسین نغمہ ہے
یہ طویل تاریکی
دن کا پیش خیمہ ہے

(۷)

دن ہے کس قدر تاریک
رات کتنی چمکیلی
دن اداس رہتا ہے
آنے والی ظلمت کے
خشمگیں تصور سے
ظلمتیں فضاؤں میں
پھیلتی ہی جاتی ہیں
زندگی کی راہوں میں
گر کبھی سرِ منزل
اک چراغ بجھتا ہے
سو چراغ جلتے ہیں
چاند ڈوب جاتے ہیں
آفتاب اُبھرتے ہیں
رات مسکراتی ہے
بھر کے مانگ میں افشاں
صبح کے جھروکوں سے
پرنیاں کے پردوں کو
تہہ بہ تہہ اٹھاتی ہے

(۸)

سایہ اک حقیقت ہے
دھوپ بھی حقیقت ہے
دھوپ اور سائے کے
امتزاجِ باہم سے
کائنات رنگیں ہے
کائنات باقی ہے

یاد

ضمیر اظہر

نسیمِ سحر کا سکوں پاش جھونکا
کسی شاہزادی کے خوابِ منقش کی صورت جلو میں کئی رنگ لیکر
بہاروں کے شاداب نیرنگ لیکر
بہ اندازِ آہو خراماں خراماں
ریاضِ تصور کی جانب رواں ہے

سبک چاپ، مدھم صدا لہلہاتی
ریاضِ تصور میں خوشبو نے نغمہ لچکتی ہوئی بے حجابانہ آئی
درختوں میں، شاخوں میں، پتوں میں، پودوں میں ہے جوشِ بالیدگی کارفرما
گلوں سے ہے موجِ تبسم ہویدا
پرندوں کی چہکار ہے کتنی سادا

نسیمِ سحر کا فسوں ساز جھونکا
ریاضِ تصور سے ہو کر کسی اور وادی کی جانب روانہ ہوا ہے!
اور اس کی جدائی میں ہر ایک طائر ریاضِ تصور کا نوحہ کناں ہے
خزاں کے پلٹنے کا امکان پھولوں کی سہمی ہوئی صورتوں سے عیاں ہے
فضا پر مسلط غمِ بیکراں ہے!

★

غزل

عبداللہ خاور

ہے صبحِ عیش بھی یوں، غم کی شام ہو جیسے
ہمارا غم بھی غمِ ناتمام ہو جیسے
ترے حضور بھی پابندِ احتیاط رہوں
یونہی سا ربطِ پیام و سلام ہو جیسے
مگر نظر کے اجالے سلام کرتے ہیں
پیامِ لغزشِ پا، گام گام ہو جیسے
شفق میں صبح کی پہلی کرن ہوئی تحلیل
تری جبیں پہ نظر کا خرام ہو جیسے
ہر ایک غنچہ ہے لب بستہ اے لبِ رنگیں
شگفتِ گل کو ترا احترام ہو جیسے
چھڑی ہوئی ہے چمن میں حدیثِ غنچہ و گل
فسانہ لبِ مینا و جام ہو جیسے
بہار ہے تو، مگر چشمِ ملتفت کی قسم
ترا کرم ہو بہاروں کا نام ہو جیسے
ترے بغیر یہ عالم نگاہِ یاس کا ہے
سنے بغیر فسانہ تمام ہو جیسے!
ہر ایک لمحہ مرا، مجھ سے بے تعلق ہے
حیات تیرے تغافل کا نام ہو جیسے
میں کیا کہوں کہ شکستہ ہے سازِ درد کی لے
رکا رکا نفسِ کم خرام ہو جیسے
بہت ہی نرم ہے آہنگِ عرضِ غم خاور
زبانِ عشق کا طرزِ کلام ہو جیسے

غزل

جلیل قدوائی

جب سے وہ شوخ مجھ سے برہم ہے
کیا بتاؤں جو دل کا عالم ہے

بے رخی مجھ سے ہے مگر پھر بھی
میری اُمید سے بہت کم ہے

شاید اُن کو مرا خیال آیا
درد کیوں آج دل میں کچھ کم ہے؟

کیا وہ اپنی جفا پہ نادم ہیں؟
کس لئے اُن کی آنکھ پُرنم ہے؟

میرے دل میں بسی ہے اک دُنیا
اُن کی آنکھوں میں ایک عالم ہے

جس کو منظور ہو خوشی اپنی
اس کو اُن کی خوشی مقدّم ہے

سادگی حسن کا شعار نہیں
عشق کی سادگی مسلّم ہے

دستِ ہر رند میں ہے جامِ سفال
دستِ ساقی میں کاسۂ جم ہے

گُل کا مُنہ آنسوؤں سے دھو ڈالا
کس قدر خوش نصیب شبنم ہے

پیار میں ہو گئے خفا وہ جلیل
دل کو اس بات کا بہت غم ہے!

مجید شاہد

بیاضِ ارضِ وطن پہ تحریرِ نورِ بنکر جو ضو فشاں ہے
وہ روشنی کی کرن ازالۂ ظلمتوں کا تو جاوداں تو ہے

غرورِ منصب ہے ٹمٹماتے چراغ کا آخری سنبھالا
سیاہیِ شب فقط سسکتے ہوئے ستاروں کی داستاں ہے

یہ کائناتِ حسیں حدودِ خیال ہی میں حسیں ہے ورنہ
تعیناتِ نظر کی حد تک بساطِ عالم دھواں دھواں ہے

وہاں بڑی تمکنت سے رازِ حیات ہوتا ہے آشکارا
جہاں گماں پردۂ یقیں ہے یقیں سراپردۂ گماں ہے

ہوس کے پاتال سے نکالا جسے بصد ہا ریاض ہم نے
نفس کا وہ زیر و بم اگر ہو محیطِ عالم تو بیکراں ہے

زوالِ فکر و نظر محرک ہے پستی و پاشکستگی کا
کمالِ عزمِ بشر کی زد پر ستارہ و ماہ و کہکشاں ہے

تراش لی ہیں یہ اصطلاحات سہل انگاریٔ نظر نے
تلاش کرنے چلو چمن میں تو پھر قفس ہے نہ آشیاں ہے

عجیب سے سرمدی خد و خال کا مرقّع ہے ابنِ آدم
قریب سے دیکھنے پہ ہر چند خاک کا تودۂ رواں ہے

جنم دیا لاشعور نے اور شعور نے جس کی پرورش کی
وہ غم سلامت رہے، وہ غم ہی مسرتوں کا مزاج داں ہے

نئے زمانے کو جملہ اقدارِ زندگی پر محیط کر لو
گئے زمانے کا ذکر بھی اب سماعتِ عام پر گراں ہے

نزاعِ عقل و جنوں کے ردِ عمل سے شاہد خدا بچائے
متاعِ سوزِ دروں کا حاصل تمام ترکیفِ جاوداں ہے

تیموریوں کا فنِ تصویر

احمد نبی خاں

ہندوستان، جسے تیموریوں نے جنت نشان کہا، ابتدا ہی سے فنونِ لطیفہ کا امین و مرکز رہا ہے۔ یہاں کے باسی سنگ تراشی سے لے کر مصوری تک میں دلچسپی رکھتے تھے۔ یہاں کا فن کار عہد قدیم سے ہی اپنے شاہکار نمونوں سے دنیا کو محو حیرت بناتا رہا ہے۔ مصوری کے نمونے بھی اس برعظیم میں گیارھویں صدی عیسوی سے ملتے ہیں۔ لیکن جیساکہ ہندوستان کا مزاج ہے، اس دور کا مصور اپنے دوسرے فنکار ساتھیوں کے ساتھ مذہب و فلسفہ کی موشگافیوں کے لئے "تعبیرات" کا سہارا لے رہا تھا۔ اس کی قوت تخیل ہندو، جینی اور بدھ مذاہب کے دیوی دیوتاؤں کے مختلف روپوں کی عکاسی تک محدود تھی۔ زندگی کے دوسرے جیتے جاگتے موضوعات سے نہ اسے دلچسپی تھی اور نہ وہ ان سے سروکار ہی رکھتا تھا۔ پھر کاغذ کا استعمال بھی اس دور کے مصور کو یا تو معلوم نہ تھا یا اسے پسند نہ تھا، غرض کہ تیموریان ہند یہاں کے اس دل کشا حصے سے اٹھ کر آئے تھے جہاں زندگی کی جیتی جاگتی رعنائیوں سے اہتزاز حاصل کرنا اور ان سے بھرپور لطف اندوز ہونا ہی حاصل زیست سمجھا جاتا تھا۔ جبھی تو "عالم دوبارہ نیست" کی طرف اشارہ کرکے دنیا سے اپنا حصہ لینے کی کسی نے دعوت دی تھی۔ ادب و شعر کی محفلیں اور مصوری و نقاشی کے مراکز اس مقصد کی تکمیل کا ذریعہ تھے۔ اور یہی راز ہے اس حقیقت کا کہ یہ تیموری سلاطین ان فنون لطیفہ کے اس قدر قدرداں تھے اور ان کی سرپرستی ادبی و ثقافتی فریضہ سمجھتے تھے۔ اور مصوری سے تو ہر با مذاق تیموری کو لگاؤ رہا ہے۔ چنانچہ بابر سے لے کر بہادر شاہ ثانی تک سب اس فن لطیف کے دلدادہ رہے۔ سیاسی تاریخ کا یہ ایک معمولی واقعہ ہی سہی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمایوں کا یہ اقدام کہ ایران سے واپسی پر وہ دو باکمال ایرانی مصوروں، میر سید علی تبریزی اور عبدالصمد کو اپنے ہمراہ لایا اور ان کو داستان امیر حمزہ کا مصور نسخہ تیار کرنے کا حکم دیا، اس عظیم کام کی ابتدا تھی جس کو اکبر اور جہانگیر جیسے با مذاق شہنشاہوں نے پورا کیا اور ان کی سرپرستی میں مصوری کو وہ فروغ و عروج نصیب ہوا کہ اس دور کی مصوری کو باقاعدہ "تیموری اسکول" کا نام دیا جانے لگا۔

ہندوستان میں تیموری مصوری کا اولین نمونہ داستان امیر حمزہ کا وہ مصور نسخہ ہے جس کی تدوین سنہ ۱۵۵۰ء میں کابل میں ہمایوں کے حکم سے شروع ہوئی۔ اس کتاب کی تیاری میں پچیس سال کا عرصہ صرف ہوا اور اکبر کے عہد میں آگرہ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ یہ کپڑے پر ہزار سے زیادہ صفحات پر مشتمل تھی اور اس میں ۱۳۷۵ تصاویر تھیں جنہیں عبدالصمد کی نگرانی میں میر سید علی تبریزی نے چند مقامی مصوروں کی مدد سے تیار کیا تھا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اتنے طویل عرصہ میں مختلف ہاتھوں سے مختلف عرصے میں تیار ہوئی، یہ امر قابل ذکر ہے کہ ساری کتاب میں یکسانیت اور توازن نہایت کامیابی سے برقرار رہا ہے۔ جہاں تک ان تصاویر کے اسلوب کا تعلق ہے یہ بنیادی طور پر ایرانی ہے۔ لیکن ہندوستانی اور مقامی اثر بھی جابجا جھلکیاں دکھاتا نظر آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالباً خاکے (SKETCH) تو ان ماہر ایرانی مصوروں نے تیار کئے لیکن رنگ آمیزی کا کام ہندی مصوروں نے کیا۔ ان تصویروں میں ایرانی عناصر مثلاً نازک شگفتہ پھولوں سے لدے ہوئے درخت، سرسبز و شاداب جھاڑیاں، تین چوتھائی چہرے کی عکاسی۔ قالینوں کے خوبصورت ڈیزائن اور رنگ برنگے ٹائلوں سے بنے ہوئے فرش عام طور سے ملتے ہیں۔ مقامی مصور نے بھی ان خوبیوں پر اضافہ کیا اور انسانی چہرے کی عکاسی میں تناسب کا خاص طور سے خیال رکھا۔

داستان امیر حمزہ میں ہندوستانی اثر کے لئے ایک تصویر خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ اس تصویر میں رسول اکرمؐ کی پیدائش پر

ظہور میں آنے والے معجزات کی عکاسی کی گئی ہے مثلاً کعبے میں رکھے ہوئے بتوں کو گرتے ہوئے دکھایا ہے، مجوسیت کی آگ بجھ رہی ہے۔ پجاری اِدھر اُدھر بھاگ رہے ہیں اور عجیب افراتفری کا عالم ہے۔ اس تصویر کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ یہ بت پرست شکل و صورت اور وضع قطع میں بدھ مذہب کے بھکشوؤں سے زیادہ ملتے جلتے ہیں! اسی طرح زرتشتی مجاوروں کو برہمنوں کے لباس میں دکھایا ہے جو دھوتی اور دوپٹہ پہنے ہوئے ہیں اور جن کے گلے میں مالا پڑی ہے۔!

یہاں اس بات کے اعادے کی ضرورت نہیں کہ اکبر مصوری کے تیموری اسکول کا بانی تھا۔ اس نے مصوروں کے لئے ایک کارخانہ قائم کیا جہاں ایک سو سے زیادہ مصور عبدالصمد اور میر سیّد علی تبریزی جیسے باکمال مصوروں کی زیرنگرانی کام کرتے تھے۔ اس دور میں قلمی کتابوں کو تصاویر سے مزین و آراستہ کرنے کا رواج عام تھا چنانچہ اس کارخانے میں مختلف کتابوں کے متعدد مصور نسخے تیار کئے گئے۔ ان نادر نمونوں میں سے اکثر آج دنیا کے مختلف کتاب خانوں میں محفوظ بھی ہیں۔ مثلاً حمزہ نامہ، بابرنامہ (برٹش میوزیم)، تیمورنامہ (خدا بخش لائبریری بانکی پور پٹنہ) رزم نامہ (جے پور لائبریری)، انوار سہیلی (اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز لندن) لیلیٰ مجنوں (انڈیا آفس لائبریری) بہارستان جامی (بوڈلین لائبریری آکسفورڈ) خمسۂ نظامی (پیرس)، بابرنامہ (ماسکو)۔

ان کتابوں کی تصاویر کا باقاعدہ تفصیلی مطالعہ کرنے کے لئے ان کو عصری ترتیب کے لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس ترتیب میں داراب نامہ اور بابرنامہ (برٹش میوزیم) پہلے شمار ہوتے ہیں جو اکبر کے ابتدائی عہد میں غالباً ۱۵۷۵ء میں تیار ہوئے۔ جہاں تک ان تصاویر کی فنی حیثیت کا تعلق ہے یہ ابھی تکمیل و ترقی کے ابتدائی مراحل میں نظر آتی ہیں اور گو بھیم، سور، مسکین، ننھا اور بساوان جیسے باکمال مصور ان کتابوں کی تیاری میں شریک تھے لیکن مصوروں کی انفرادیت تصاویر میں نمایاں نہ ہو سکی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مصوروں نے پوری آزادی سے اپنے فکر و تخیل کو تصویر بنانے میں استعمال کیا۔ بہرحال، دوسرا حصہ رزم نامہ اور تیمورنامہ پر مشتمل ہے جو نسبتاً بعد کے عہد میں (غالباً ۱۵۸۵ء) یا اس کے لگ بھگ تیار ہوئیں۔ رزم نامہ کی تزئین کا کام خاص طور پر تین مصوروں دسونت، بساوان اور لال کے سپرد ہوا تھا لیکن انھوں نے دوسرے کم درجے کے مصوروں کو بھی اس کام میں شریک کر لیا یہی سبب ہے کہ ان تصاویر میں بہت کم تصاویر انفرادی کوشش کا نتیجہ ہیں۔ یہی حال تیمورنامہ کا بھی ہے۔ بایں ہمہ فنی اعتبار سے یہ مجموعہ پہلے مجموعے سے نسبتاً بہتر ہے۔ جس میں تناسب ترتیب اور یکسانیت کے عناصر نمایاں ہیں۔ تیسرا حصہ بہارستان اور خمسۂ نظامی پر مشتمل ہے ان دو کتابوں کی تیاری میں اکبری دربار کے سولہ باکمال مصوروں نے حصہ لیا اور اس مجموعہ کی بیشتر تصاویر انفرادی کوشش کا نتیجہ ہیں یعنی مکمل تصویر ایک ہی مصور کے قلم کا نتیجہ ہے خاص طور پر اکبری دربار کے پانچ مایۂ ناز مصوروں مسکین، مادھو، مکند، بساوان اور لال نے پورے پورے صفحات کی تصاویر تیار کی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان دو کتابوں میں تزئین اور مختصر تصویرکشی (ILLUMINATION AND MINIATURE) کے ہنر تکمیل و عروج پر پہنچے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان تصاویر میں بساوان کی تصویر فنِ مصوری کا بے مثال نمونہ ہے۔

اکبری عہد کے مصوروں کو شوخ رنگ زیادہ مرغوب تھے، ظاہر ہے کہ یہ اثر ایران کا تھا چنانچہ گہرا نیلا خاص طور سے لاجوردی رنگ نیل زنگار شنگرف، پیوڑی اس دور میں استعمال ہوتے تھے۔ مرکب رنگوں کا استعمال اس دور میں عام نہیں تھا۔

جہاں تک قدرتی مناظر کی عکاسی کا تعلق ہے، ان مصوروں نے اس موضوع پر زیادہ توجہ نہ دی۔ مثلاً انھوں نے درختوں کو بالکل سیدھے تنوں کی حالت میں دکھایا ہے، پتیاں اور شاخیں نیلے پس منظر پر بنائی ہیں، ایرانی انداز میں درختوں کو ہوا میں ہلتا ہوا بھی دکھایا ہے۔ درختوں کے بعد پہاڑ ان تصاویر میں نمایاں ہیں، یہاں بھی ایرانی اثر ظاہر ہے۔ چنانچہ بعض جگہ تو یہ بالکل لق و دق پہاڑ ہیں اور سبزے کا کہیں نام و نشان نہیں نظر آتا۔ لیکن بعض جگہ ان کے ساتھ درخت بھی ہیں۔ ان کے اوپر بادل ہیں جنھیں عام طور سے نیلے رنگ سے نمایاں کیا گیا ہے۔

انسانی چہروں کو اس دور میں یا تو تین چوتھائی نمایاں کیا گیا ہے یا یک رخی چہرہ (PROFILE) رکھا ہے۔ صنف نازک کی تصویروں میں نہ صرف لباس و آرائش بلکہ ناک نقشہ اور رنگ، روپ سب کچھ ہندوستانی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ انسانی شبیہ کی عکاسی میں اس دور کے

مصوّروں نے تناسب کا خیال کم رکھا ہے۔ مگر یہ خامی ابتدائی عہد میں ہے جو رفتہ رفتہ دور ہوتی گئی اور ہندوستانی اثر نمایاں ہوتا گیا ہے۔ مثلاً بعد کی تصویروں میں آنکھیں بادامی، ناک ستواں، لب باریک، کمر نازک اور سینہ نمایاں نظر آتا ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا اکبری دور میں سیکڑوں مصور تھے جن کے نام مختلف جگہوں پر ملتے ہیں۔ لیکن باقی تفصیلات مفقود ہیں۔ ابوالفضل نے "آئینِ اکبری" میں اس دور کے اہم ترین مصوروں کی ایک سرسری سی فہرست دی ہے اس کے علاوہ ان کے سوانح حیات اور دوسرے کارنامے معلوم نہیں۔ ان سارے مصوروں میں ایک مصور عبدالصمد استثنا کی حیثیت رکھتا ہے جس کے حالات شروع سے آخر تک محفوظ ہیں۔ یہ مایۂ ناز مصور ہمایوں کے ساتھ ایران سے ہندوستان آیا بادشاہ اس کی فنی قابلیت کا بڑا معترف تھا اور اسی اعتراف میں اس نے اسے "شیریں قلم" کا خطاب بھی دیا تھا۔ اکبر کے عہد میں اسے مزید منصب و جاہ عطا ہوا۔ اور چار صدی افسر کا معزز عہدہ ملا کہ وہ اس کا استاد تھا اور کابل میں اس سے طرح (ڈرائنگ) سیکھی تھی۔ پھر عبدالصمد کی مشاقی اور مہارت کا بھی جواب نہ تھا وہ شبیہ سازی (PORTRAITURE) خاص طور خد وخال (FEATURES) اور جذبات کی عکاسی میں لاثانی تھا۔ عبدالصمد کا شاگردِ رشید دسونت تھا جو استاد کے بعد اپنے فن کا ماہر تھا عبدالصمد کی فنی قابلیت کا نتیجہ تھا کہ ۱۵۷۷ء میں اسے شاہی ٹکسال کا مہتمم بھی مقرر کیا گیا۔ آخر عمر میں وہ ملتان کے صوبے کا "دیوان" یعنی ریونیو کمشنر بھی بنایا گیا۔ اس کا لڑکا، شریف، جہانگیر کے عہد میں امیر الامراء کے ممتاز عہدے پر فائز نظر آتا ہے۔

عبدالصمد کا دوسرا ساتھی مصور میر سید علی تبریزی تھا لیکن اسے یہ عروج و رتبہ حاصل نہ ہو سکا۔ ان کے علاوہ ایرانی اور ترکستانی مصوروں میں فرخ بیگ، خسرو قلی، جمشید اور مسکین تھے۔ جنھوں نے اپنے شاہکاروں سے شاہی کتاب خانے کی کتابوں کو ارفع و اعلیٰ نمونہ بنانے میں سعی کی۔

یہ وہ مسلمان مصور تھے جو ایران و ترکستان جیسے ملکوں سے دربارِ اکبری میں آ کر جمع ہو گئے تھے۔ مصوری کے قبولِ عام سے دیسی اور مقامی مصوروں نے بھی ترقی کی اور انھیں بھی بلا لحاظ مذہب و ملت دربارِ شاہی میں جگہ ملی جو سلاطین تیموریہ کی اور مسلمان استادانِ فن کی عالی ظرفی اور رواداری کی ایک اور مثال ہے۔ ان ہندو مصوروں میں دسونت بڑا ماہر فن کار تھا۔ ادھیڑ عمر میں دماغی عارضہ میں مبتلا ہو گیا تھا چنانچہ ۱۵۸۴ء میں ایک روز تلوار سے خود کو زخمی کر لیا۔ زخم اتنے گہرے تھے کہ ان سے جانبر نہ ہو سکا۔ بہت سی تصاویر اس سے یادگار ہیں خصوصاً رزم نامہ میں تقریباً ۲۴ تصاویر پر اس کا نام لکھا ہے۔

دسونت کے علاوہ دو اور مصور بساوان اور لال بھی قابلِ ذکر ہیں ان کو بھی ابوالفضل کی اہم فہرست میں شامل ہونے کا فخر حاصل ہے جس نے ان دونوں کے فن کی بڑی تعریف کی ہے۔ خاص طور سے موخر الذکر مصور مختصر تصویر کشی (MINIATURE PAINTING) میں مہارت رکھتا تھا۔ رزم نامے میں اس کی ۲۹ تصاویر ملتی ہیں۔

اکبری دور کے ان مصوروں اور ان کے کارناموں پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مختلف نسلوں اور قوموں کے یہ مصور، دور و دراز ملکوں سے آ کر بادشاہ کے دربار میں جمع ہو گئے تھے۔ ان کی روایات، معاشرت، طور طریقے اور فنی مہارت سب کچھ مختلف تھا مگر اکبر کی فراست نے نہ صرف ان سب کو ایک جگہ رکھا بلکہ ان کے فن کے مختلف عناصر و اجزا کو اس طرح ترتیب دیا کہ ایک نئے طرز و اسلوب کا آغاز ہو گیا۔

جہانگیر کے عہد میں مصوری عروج و ترقی کے منازل کی طرف تیزی سے گامزن نظر آتی ہے جہانگیر کا جمالیاتی ذوق اس ترقی کا سبب تھا۔ وہ فنونِ لطیفہ کا دلدادہ تھا اور مصوری کی جمالیاتی قدروں سے اسے خاص طور سے لگاؤ تھا۔ اس نے اپنے ذوقِ لطیف کی تسکین کے لئے مصوروں کی سرپرستی کی اور انھیں ترقی کرنے کا موقع دیا۔ چنانچہ اس دور میں مصوری کے لاتعداد شاہکار نمونے تیار ہوئے اور مستقل و مسلسل مشق سے نفاست پیدا ہونے لگی۔ اب خارجی (ایرانی) اور دیسی (ہندوستانی) مصوری کی بلا امتیاز تقلید کا دور ختم ہوا اور تیموری مصوری نے مستقل رنگ و اسلوب اختیار کیا۔ اس اسلوب میں دونوں ملکوں کی مصوری کے محاسن شامل تھے۔ جن پر

مغربی مصوری کے اثر و نفوذ نے اس دو آتشہ کو سہ آتشہ بنا دیا تھا۔

اس دور میں کتابوں کی آرایش و تزئین (ILLUMINATION) اور مختصر تصویر کشی (MINIATURE PAINTING) کو وہ قبول عام حاصل نہ رہا۔ اور بادشاہ، شاہزادوں اور امرا و دربار کی شبیہوں (PORTRAITS) اور دربار، حرم، مناظر قدرت اور جیتی جاگتی دنیا کی تصویروں نے اس کی جگہ لے لی۔ بات یہ ہے کہ جہانگیر کا تصور زندگی اکبر سے مختلف تھا وہ رنگینیٔ حیات کا زیادہ قائل تھا اور زندگی کی ہما ہمی اور رنگینیوں سے پوری طرح لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ چنانچہ گلگشت چمن، سیر باغ و راغ، نالۂ بلبل، جام و صراحی اور نرگس و محبوب میں جو دلکشی اسے نظر آتی تھی وہ بے جان کتابی تصویروں میں کہاں مل سکتی تھی۔ یہی سبب ہے کہ اس دور کی ہر شے میں جس کا تعلق جہانگیر کی ذات سے ہے، ایک رنگینی، ایک حسن اور ایک نفاست جلوہ گر ہے۔ ظاہر ہے کہ حسن پرست بادشاہ کا مصور ان جزئیات سے بے خبر نہیں رہ سکتا تھا۔ بادشاہ کے ان رجحانات کی وجہ سے مصور کا دائرہ کار وسیع ہو گیا اور وہ تخیلی اور مافوق الفطرت چیزوں کی عکاسی کی بجائے جیتی جاگتی دنیا کی نقاشی کرنے لگا۔

شبیہ سازی (PORTRAITURE) کے بعد جہانگیری عہد کی مصوری کا دوسرا بڑا کارنامہ پرندوں اور جانوروں کی عکاسی ہے جہانگیر کو پرندوں کی ہیئت و ماہیت جاننے کا بڑا شوق تھا۔ اس نے اپنی تزک میں جگہ جگہ پرندوں اور حیوانات کا ذکر بڑے انہماک سے کیا ہے اور مصوروں سے ان کی تصاویر بنوائی ہیں۔ اس نوع کی تصاویر بنانے میں استاد منصور کو کمال حاصل تھا اور اسی وجہ سے جہانگیر نے اس کو "نادر القلم" کا خطاب دیا تھا۔

اس دور میں جہاں مصور کا دائرہ کار وسیع ہو رہا تھا وہاں فنی تکمیل کے دوسرے مراحل بھی آہستہ آہستہ طے ہو رہے تھے چنانچہ مصوری کے جو نمونے اس دور میں تیار ہوئے وہ اعلیٰ ترین نمونے ہیں اور ان میں صفائی، پاکیزگی اور تناسب کا اعلیٰ ترین معیار قائم رکھا گیا ہے۔ مثلاً انسانی شبیہ کی عکاسی میں بڑا حقیقت آمیز رویہ اختیار کیا گیا ہے۔ اکبری اسکول کے مصور جو ہرات اسکول سے بہت زیادہ متاثر تھے، شبیہ سازی میں تناسب کا خیال نہیں رکھتے تھے لیکن اس دور کے ماہر فن کاروں نے اس روایت کا پورا لحاظ رکھا ہے۔ اس کے علاوہ اکبری عہد کی یہ روایت کہ انسانی چہروں کے تین چوتھائی حصوں کی نمائش کی جائے، اس دور میں قائم رہی لیکن یک رخی چہرے (PROFILE) زیادہ بنائے گئے بلکہ بعض تصاویر میں ابروؤں کے آخری حصے اور شقیقہ تک کو نمایاں کیا گیا ہے۔

مناظر قدرت کی عکاسی بھی اس دور کے مصور کا محبوب مشغلہ تھی پہاڑوں کی بلند چوٹیاں، اور لہراتے ہوئے سرسبز و شاداب درخت عام طور سے تصاویر کے پس منظر میں بنائے گئے ہیں۔ جہانگیری دور کے آخری حصے میں تو مصور نے مناظر قدرت کی عکاسی میں بڑی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ ساری جزئیات کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ تصویر اصل سے ہو بہو مل جاتی ہے۔ اور ہر حصہ اور ہر جزو بالکل نمایاں، علیحدہ علیحدہ نظر آتا ہے۔ یہ بات بڑی حد تک مغربی مصوری کے اثر کا بھی نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن کنول کی موجودگی ہندی اثر کی غمازی کرتی ہے۔ رنگوں کے استعمال میں بھی اس دور کے مصور نے مہارت کا ثبوت دیا۔ مختلف رنگوں کی آمیزش سے نئے نئے رنگ بنائے گئے اور ان رنگوں سے تصویر کی دلکشی میں اضافہ کیا گیا۔

جہانگیری عہد میں مصوروں کی اُس باقاعدہ جماعت بندی کا سراغ نہیں ملتا جس کی داغ بیل اکبر نے ڈالی تھی۔ اس دور کے مصوروں کی ایسی کوئی فہرست بھی نہیں ملتی جیسی کچھ کہ ابوالفضل ہمیں دے گیا ہے لیکن تزک جہانگیری اور تاریخ و ادب کے دوسرے ماخذوں سے ان فنکاروں کے بارے میں کچھ معلومات ضرور ملتی ہیں۔ جہانگیر جس مصور کے کام سے خوش ہوا ہے، اس نے اس کا ذکر تزک میں ضرور کیا ہے۔ گویا اس دور کے تقریباً تمام عظیم فنکاروں کا تذکرہ تزک میں موجود ہے اس لحاظ سے جہانگیر کی تزک نے وہی کام کیا ہے جو ابوالفضل کی آئین اکبری نے کیا تھا۔ بہرحال، تزک کے مطالعہ سے جن مصوروں کا پتہ چلا ہے وہ بشن داس، فرخ بیگ، ابوالحسن اور منصور ہیں۔ یہ اپنے دور کے مایۂ ناز فنکار تھے جن کو جہانگیر جیسے باذوق سرپرست کی تائید و خوشنودی حاصل تھی۔ ان میں فرخ بیگ کو دربار جہانگیری میں وہی مقام حاصل تھا جو اکبر کے عہد میں میر سید علی اور عبدالصمد کو حاصل تھا۔ ان کے علاوہ وسط ایشیا کے دو باکمال مصور، محمد نادر اور محمد مراد سمرقندی بھی تھے جو سیاہی قلم

میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔

جہانگیر کا دستور تھا کہ وہ سفر میں بھی مصوروں کی ایک جماعت اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ یہ مصور موقع پر ہی ان مقامات کی تصاویر بنا لیتے جن کو بادشاہ نظرِ تحسین سے دیکھتا۔ بعد میں یہ تصویریں بادشاہ کے ملاحظہ کے لئے پیش ہوتیں اور پھر یا تو تزک کی تزئین کا کام دیتیں یا مرقع شاہی کی زینت بنتیں۔ گویا اس طرح ایک طرح کی "قلمی" دستاویز سی بنتی چلی جاتی۔ علاوہ ازیں درباری مصوروں کی نگارشات سے ہی بادشاہ کے ذوقِ مصوری کی تسکین نہ ہوتی تھی بلکہ وہ دنیا کے دوسرے حصوں کے مصوروں کی نگارشات بھی جمع کرتا رہتا تھا۔ ایران و ترکستان اور مغربی ملکوں سے بادشاہ کے لئے تصاویر خریدی جاتی تھیں اور ذاتی شاہی کتاب خانے میں یہ نوادرات محفوظ رہتے۔

جہانگیر کی وفات ۱۶۲۷ء کے بعد شاہجہاں تخت کا وارث ہوا۔ ایامِ شہزادگی میں اسے بھی مصوری سے بڑی دلچسپی تھی لیکن بعد میں فنِ تعمیر ہی اس کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ بایں ہمہ اس عہد میں بھی مصوری نے ترقی کی اور تکمیل کے مختلف مراحل طے کئے۔ اس دور میں مصوری کے موقلم نے چار قسموں کی تصویروں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور انھیں قبولِ عام حاصل ہوا:

۱۔ انفرادی شبیہ سازی (PORTRAITS ، شاہی خاندان کے افراد، درباری، وزرا، و امرا، اور دوسری برگزیدہ ہستیوں کی لاتعداد تصاویر پوری صحت و صفائی سے تیار ہوئیں اور ان کو اصل سے قریب تر لانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ ان تصاویر میں شاہزادوں اور امراء دربار کو ان کے پُرتکلف زرق برق لباس اور شمشیر و نیزہ اور زرہ بکتر میں مسلح، اور چاق و چوبند دکھایا ہے، گویا دربارِ شاہی میں بصد ادب کھڑے شاہی حکم کے منتظر ہیں۔ ان تصاویر میں جزئیات کو بڑی مشاقی سے نمایاں کیا گیا ہے جس سے فنی تکمیل و مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔

۲۔ صنفِ نازک کی تصاویر بھی اس دور کی مصوری کا شاہکار ہیں۔ حرم شاہی کی اجتماعی تصویروں کے ساتھ ساتھ انفرادی تصویریں بھی پوری تفصیل اور جزئیات کے ساتھ بنائی گئیں جو حسن و جمال اور زیب و زینت کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان شبیہوں کی تاریخی حیثیت کے بارے میں تو شک و شبہ کیا جا سکتا ہے کیوں کہ مصوّر کو تیموری حرم میں بارِ عام کبھی بھی حاصل نہیں رہا پھر اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ان مصوروں میں سے کسی کو ان بیگمات کی شبیہ بنانے پر مامور کیا گیا ہو۔ اس لئے یہ کہنا کہ یہ شبیہ نورجہاں کی ہے اور یہ جہاں آرا بیگم کی، صحیح نہیں۔ البتہ ان تصویروں میں فنی کمال اور تناسب نیز رنگوں کی ترتیب دوسری تصاویر سے زیادہ ہے اور اس سے فنی مشاقی کا ثبوت ملتا ہے۔

۳۔ درویشوں اور فقرا، اور قلندروں کی تصویریں۔ عرفا و فقرا کی محفلوں میں کبھی کبھی بادشاہ بھی مع اپنے درباریوں اور شاہزادوں کے جاتا تھا۔ چنانچہ بعض تصاویر میں بادشاہ اور شاہزادوں اور درباریوں کو ان اولیاء اللہ کے دربار میں بیٹھے دکھایا گیا ہے۔ ان تصاویر میں اصلیت و حقیقت قدم قدم پر نمایاں ہے۔ فقرا کا استغنا اور بے نیازی اور بادشاہ کا ان کے لئے اظہارِ احترام و عقیدت ان تصویروں کی جان ہے۔

۴۔ رات کے وقت شکار کی منظرکشی بھی اس دور کی خصوصیت ہے۔ شاہجہاں کا یہ محبوب مشغلہ تھا۔ یہاں بھی فن کار کی مہارت پوری طرح جلوہ گر ہے۔

ان تمام تصاویر میں فنی تکمیل کے شواہد قدم قدم پر ملتے ہیں۔ مثلاً اس دور کی تصویروں میں رنگوں کا استعمال اور زیادہ نفاست سے کیا گیا کہ کاغذ کی سطح شیشے جیسی گلیز بن گئی ہے۔ گہرے اور شوخ رنگوں کی جگہ ہلکے سادہ رنگ پسند کئے گئے۔ جہانگیر کے دور میں مختلف رنگوں کی آمیزش سے نئے رنگ بنائے جاتے تھے ان رنگوں کو استعمال کرنے کے بعد تصویر کی سطح کو ہموار کرنے اور یکساں بنانے کے لئے نقطہ کاری (STIPPLING) کی ضرورت ہوتی تھی جو فن کاری کے اعلیٰ ترین اصولوں کے منافی ہے، مگر اس دور میں سادہ اور مجرد رنگ استعمال ہوئے جس سے نقطہ کاری کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔

مصوّری کے اس قدر قبولِ عام نے مصوّر کے لئے دقیقہ رسی اور تکمیلِ فن کے بہت مواقع پیدا کئے۔ چنانچہ مستقل مشق سے اس دور میں خاکہ کاری (DRAUGHTSMANSHIP) بہت زیادہ پُرکار ہوگئی۔ لائنوں کا باقاعدہ مطالعہ کیا گیا اور ان میں

اس قدر نزاکت اور باریکی پیدا کی گئی کہ ان کو دیکھنے کے لئے آتشی شیشے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ انسانی شبیہوں میں جسم کے ہر حصے کو پوری طرح نمایاں کیا گیا اور پوری تفصیل پیش کی گئی چنانچہ اس دور کی تصویروں میں جسم کا ہر بال اور مسام تک نمایاں ہے۔ یہ خصوصیت اس دور کے مصور کا کارنامہ ہے۔ پھر شبیہوں کے چہروں میں منگولی اثر جو اس سے پہلے نظر آتا تھا، اب بالکل مفقود ہو گیا اور خط و خال مصور کے اپنے گرد و پیش کی دنیا سے ملنے لگے۔

تصاویر کی جدول کشی اور حاشیہ نگاری جسے "تحریر" کہتے تھے اس دور کی مصوری کا امتیاز ہے ان حاشیوں کو مختلف چھوٹی چھوٹی تصاویر، پھول پنکھڑیوں اور مختلف پرندوں سے مزین کیا گیا ہے یہ مختلف تصاویر مرقع کی زینت ہوتی تھیں۔

شاہجہاں کے درباری مصوروں میں استاد فقیر اللہ خاں ممتاز مصور تھا، دوسرا مصور ہاشم تھا جس کے فن کی تعریف سارے فن شناسوں نے کی ہے یہ نامی گرامی مصور اور چند دوسرے جن کے حالات معلوم نہیں، دربار شاہی سے منسلک تھے۔ باقی تمام مصور دوسرے امراء و وزراء اور شائقین فن کے درباروں سے متوسل تھے۔ یہ روایت اس سے پہلے ادوار میں بھی ملتی ہے۔ لیکن شاہجہاں کے دور میں تو تقریباً تمام مصور انھیں امراء کے دربار میں موجود تھے۔ اور بقول برنیر اس عہد میں کہ فن تعمیر کا زریں دور ہے، اگر یہ امراء مصوری جیسے فن لطیف کی کما حقہٗ سرپرستی نہ کرتے تو یہ فن بہت پہلے کس مپرسی اور زوال کا شکار ہو جاتا۔ زوال سلطنت کے ساتھ مصوروں کی سرپرستی میں وہ شاہانہ انداز تو نہ رہا لیکن مصور مطمئن ضرور تھا۔ اب مصور کو وسیع اور آزاد ماحول مل گیا تھا جس سے اس کے فن میں ہمہ گیری اور تنوع پیدا ہوا۔ دربار شاہی میں تو بادشاہ کا رجحان اور اس کا نکتہ رس ذہن ہی مصور کے رہنما تھے لیکن اب عوام کی پسند کا بھی دخل ہونے لگا اور فن میں عمومیت کا رجحان بڑھنے لگا۔ مصوروں نے عوام کی پسندیدہ تصویریں بنا کر فروخت کیں اور وہ فن جو اب تک شاہانہ دربار اور امراء کی محفلوں کی ہی زینت تھا۔ عوامی پسند اور مصور کی حقیقت پسندی کا آئینہ دار بن گیا۔

اسی دور میں ایک اور اہم روایت کا آغاز ہوا۔ ان ماہر مصوروں نے دربار سے الگ ہو کر باقاعدہ اسٹوڈیو بنائے جہاں نہ صرف تصویریں بنائی جاتی تھیں بلکہ نئے مصوروں کی تربیت کا کام بھی ہوتا تھا۔ ان اسٹوڈیوز نے سیکڑوں مصور پیدا کئے جنھوں نے تیموری اسکول کی مصوری کی روایات کو زندہ رکھا۔

زوال سلطنت کے بعد امراء دربار نے بھی مصوروں سے باقاعدہ انہماک اور دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ لے دے کر عوام تھے جو مصوری کے فن کو زندہ رکھنے میں معاون و مددگار ہوتے۔ اور انھیں کی قدردانی سے یہ فن زندہ رہا۔ لیکن ایک خامی یہ پیدا ہو گئی کہ کوئی خاص معیار نہ ہونے کی وجہ سے تیز روی میں تصاویر بنائی گئیں یہی سبب ہے کہ اس دور میں عمدہ تصاویر خال خال ہی نظر آتی ہیں۔

فرخ سیر اور بعد میں آنے والے دوسرے بادشاہوں کے عہد میں مصوروں کی پھر ضرورت ہوئی۔ کیونکہ ان میں سے اکثر نقاشی سے لگاؤ رکھتے تھے، مصوروں کو دربار میں پھر رسوخ حاصل ہونا شروع ہوا اور تصویریں بننے لگیں۔ چنانچہ اس دور کی بنائی ہوئی بہت سی تصاویر مختلف مرقعوں کی زینت ہیں جن میں گذشتہ زمانوں کی شان و شوکت، نفاست و شائستگی اور ذوق سلیم کے کچھ آثار بھی جلوہ طراز نظر آتے ہیں لیکن یہ مختصر دور بھی جلد ہی ختم ہو گیا اور سلطنت کے زوال نے مصوری کو پھر پنپنے کا موقع نہ دیا۔ یہ آخری بہار تھی، جو اس دور کے مصور نے دیکھی، پھر اس کے بعد خزاں کا مستقل دور شروع ہو گیا اور مصوری کا یہ دور اپنی شاندار روایات کے ساتھ سن ستاون پر آ کر ختم ہو گیا۔

★

رپورتاژ:

چاٹگام کا پہاڑی علاقہ

اگر مغربی پاکستان کی گل پوش وادیاں جیسے گلگت، آزاد کشمیر اور کاغان ہمارے لئے جنت نگاہ ہیں تو مشرقی پاکستان کی سرزمین آب رواں اور اس کے پہاڑی علاقوں کی دلکشی و نفاست بھی اپنی جگہ کچھ کم جاذب نظر نہیں۔ کوہستان چاٹگام کا علاقہ اپنی قدرتی خوبصورتیوں کے لئے دور دور مشہور رہے۔ سیاحوں کے لئے یہاں وہ سب کچھ ہے جسے وہ دیکھنے کے آرزو مند رہتے ہیں۔ کوہستانی علاقہ کی سادگی یہاں کی مترنم ندیاں، یہاں کے رنگا رنگ لباس، قبائلی لوگوں کے رسم و رواج اور چائے کے باغات کے خوشنما قطعے اور ان کی بھینی بھینی فضا انسان کو "سحر بنگالہ" سے لفظاً و معناً آشنا کر دیتے ہیں۔ چاٹگام کے پہاڑی علاقے، ضلع چاٹگام کے دھان کے کھیتوں کا سلسلہ اور یہاں کی سرزمین کی رومانی کیفیت ایک جنت ارضی سے کم نہیں۔ آیئے میرے ساتھ ذرا اس پاک سرزمین پر قدم رکھئے۔ مٹی کو دیکھئے۔ کہیں تو گلاب کی طرح دمکتی سرخ ہے تو کہیں اس کا رنگ گہرا اُٹیالا ہے۔ یہ عطریت کہاں سے آگئی۔ یہ آپ نے غور کیا۔ یہ یہاں کے باغ و راغ کی قدرتی باس ہے، دھرتی کی سوندھی سوندھی باس، نباتات کی فراوانی، باغوں کی قطاریں، ان سب نے مل کر فضا کو معطر کر رکھا ہے اور حواس اس کے سحر سے متاثر ہو جاتے ہیں۔

ان کی وضع قطع سے تو آپ نے اندازہ کر ہی لیا ہوگا کہ یہ یہاں کے پہاڑی لوگ ہیں۔ مغربی پاکستان کے گلگتی اور کافرستانی، وغیرہ بھی اکثر دیکھے ہوں گے۔ اب اپنے اس حصۂ ملک کے پہاڑیوں کو بھی دیکھیں۔ وہی سادگی و پُرکاری، وہی خصوصیاتِ مزاج صرف آب و ہوا اور ماحول و نسل کے امتزاج کا قدرتی فرق تو بیشک ہے ورنہ ان کو ہم کسی طرح اپنے سے جدا نہیں سمجھ سکتے۔ آیئے ذرا ان کی مہمان نوازی کا بھی حال دیکھیں۔ سنا تو یہی ہے کہ مغربی پاکستان کے سرحدی اور قبائلی دوستوں کی طرح ان لوگوں کی بھی مہمان نوازی اور حسنِ سلوک کی داستانیں دور دور مشہور ہیں۔ یہ تو آپ نے دیکھ لیا کہ جدید تمدن کی ملمع کاری نے ابھی ان کے لباس، رہن سہن، گھر مکانات کسی چیز کو بھی ملوث نہیں کیا ہے مگر ان کی سادگی اور روایتی طرز زندگی میں بھی ایک البیلا پن ہے۔ معصومیت ہے۔ سچائی ہے اور ان کے خط و خال بھی یہاں کے دوسرے لوگوں کے خط و خال سے کچھ جدا ہیں۔ اس کی وجہ کچھ برمی اثرات ہیں کیونکہ برما اور اس علاقہ کے ڈانڈے ملے ہوئے ہیں۔

اس وقت میں آپ کو جس سڑک پر لئے جا رہا ہوں یہ ۱۹۴۸ء میں پاکستان بننے کے بعد بنائی گئی تھی۔ یہ چاٹگام سے ۲۷ میل دور تک چلی گئی ہے۔ لیجئے ذرا انہیں دیکھئے۔ ان کا لباس کیا ہے بس ایک لنگوٹی ہے جسم تانبے کی طرح دمک رہا ہے۔ ان صاحب کو یہاں کے گاؤں والوں کا نمونہ سمجھئے۔ اس آب و ہوا میں ان کا یہی لباس موزوں ہے۔ ادھر ان کا کھیت ہے۔ دھان کا کھیت جو پہاڑی ڈھلان پر دور تک چلا گیا ہے۔ یہاں ابھی حال تک جنگل ہی جنگل تھا۔ اسے کاٹ کاٹ کر ڈھلان صاف کی گئی ہے اور دھان بو دیا گیا ہے۔ آپ نے ابھی مجھ سے کیا پوچھا تھا؟ ہاں! یاد آیا۔ یہ جو لوہے کا آنکڑا سا ان کے ہاتھ میں ہے یہ ان کا بہت بڑا اوزار ہے اور غالباً یہی ایک اوزار ہے۔ اسے یہ لوگ "داؤ" کہتے ہیں۔ اسی سے زمین کھودنا اور فصلیں کاٹنا سب کام لیا جاتا ہے۔ دھان تو خیر بہت ہوتا ہے مجھے تو سرسوں اور کھیا بھی بو یا ہوا نظر آتا ہے۔ جس چیز کی فصل آئی وہ تیار ہوتی چلی گئی۔ مغربی پاکستان کی زمینوں کی طرح سے یہاں کی بھی زمین بڑی زرخیز ہے۔ روئی بھی یہاں پیدا ہوتی ہے۔ زمین میں پہاڑی ذرّے ملے ہوئے ہیں اس لئے پیداوار کو ہر طرح کی قوت بخش کیمیاوی غذا ملتی رہتی ہے۔

یہ ان صاحب کی بیوی ہیں۔ دوسری خاتون ان کی یا تو بھانجی ہیں یا بھتیجی۔ ان خواتین کا لباس بڑا صاف ستھرا رنگین اور نفیس ہے۔ اب ذرا ان بچوں کے چہروں کو دیکھیے۔ یہ کالی کالی دھاریاں کیوں بنائی ہیں، بھوتوں کی بدنظر سے بچانے کے لئے اور یہ گھنگھرو بلی کی سی آوازیں بھی بھوتوں کو بھگانے کے لئے لگاتے رہتے ہیں۔

پیاسے کو پانی پلانا جس طرح مغربی پاکستان میں عام کار ثواب سمجھا جاتا ہے یہاں کے کوہستانی باشندے بھی اپنے عقیدہ کے مطابق پانی پلانا بہت بڑی نیکی سمجھتے ہیں۔ اس غرض سے یہ لوگ اپنی عورتوں سے متوقع رہتے ہیں کہ وہ پانی کا گھڑا بھر کر راہ میں بیکر چلیں گی۔ اور اگر کوئی راہگیر پانی مانگ بیٹھا تو اسے پانی پلائیں گی۔ گھرداری کی مصروفیتوں کے علاوہ یہاں کی پہاڑنیں پانی کے گھڑے بھی بھر کر کھیتوں کی طرف جاتی رہتی ہیں۔ جس وقت بچے گاؤں میں واپس آتے ہیں تو سب سے پہلے مائیں ان کے چہروں سے کلونس کی دھاریاں دور کرتی ہیں گویا کہ نظر بد کا خوف ختم ہو گیا۔

وہ سامنے کیا عمارت ہے؟ غالباً تھانہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ کچھ پہرہ چوکی دکھائی دے رہی ہے۔ پاکستان کا جھنڈا اب تو صاف نظر آنے لگا۔ جی ہاں۔ یہ تھانہ انگریزی عملداری میں بنا تھا۔ نئے زمانہ کی شہری ضرورتوں کا خیال کرتے ہوئے پاکستانی سرکار نے تمام علاقے میں تھانے قائم کر دئے ہیں۔ ویسے امن و امان ہی رہتا ہے اور جرائم کی بھی کوئی کثرت نہیں ہے کیونکہ یہ لوگ نہ شری طبیعت ہیں، نہ جرائم پیشہ۔

ان لوگوں کے کھپریل والے گھر کیسے صاف ستھرے نظر آرہے ہیں۔ آیئے کسی راہگیر سے پوچھیں یہاں کے لوگ گھر کو کیا بولتے ہیں۔ باقی بنگال میں تو "باڑی" بولا جاتا ہے ——— کیا بتایا انہوں نے ——— "باشا"۔ یوں کہنے کو یہ جھونپڑی سی ہے مگر یہ "باڑی" یا "باشا" اپنی جگہ بہت عمدہ گھر ہے۔ یہ مارکیٹ ابھی بنی ہے۔ پہلے یہاں گھنے جنگل ہوتے تھے۔ ذرا ذرا سی ضرورتوں کے لئے ان کوہستانی باشندوں کو دور دور کی بستیوں میں جانا پڑتا تھا مگر اب پختہ سڑکیں بن جانے سے مال آنے جانے لگا ہے اس لئے سب ضروری چیزیں اس مقامی مارکیٹ میں مہیا ہو جاتی ہیں بازار میں یہ مجمع کیسا لگا ہوا ہے ڈھول جھانج کی برابر آواز آرہی ہے۔ آیئے آگے بڑھ کر دیکھتے ہی چلیں۔ بازار میں خوب چہل پہل ہے ——— خرید فروخت کا سلسلہ تو چل ہی رہا ہے یہ جھن جھن جھن جھن اور بھی مزا دے رہی ہے۔ یہ ناچ ہو رہا ہے۔ قبائلی مرد اور عورت مل کر ناچ گا رہے ہیں۔ ان کے بول آپ کچھ سمجھے۔ مجھے کچھ کچھ بنگالی آتی ہے۔ یہاں کے لوگوں کی بولی کچھ تو بنگالی ہوتی ہے اور کچھ برمی۔ یہ ناچ بھی بڑا ارمان انگیز معلوم ہوتا ہے۔ مغربی پاکستان کے بھنگڑا ناچ سے کچھ کچھ ملتا جلتا ہے۔

بازار میں کیا کیا پھل ہیں۔ آیئے ان لوگوں سے کچھ خرید کر اپنے دیس کے ان پھلوں کا ذائقہ چکھیں۔ انناس تو ضرور ہی کھانے چاہئیں، پپیتے بھی بہت میٹھے اور ملائم نظر آتے ہیں یوں کراچی میں بھی پپیتا اچھا خاصا ہوتا ہے۔ مگر یہاں کی زمین میں تو مٹھاس اور رس ہی رس گھلا ہوا ہے۔ سنا ہے پپیتا اور انناس اب ڈبوں میں بند کر کے باہر بھی بھیجا جاتا ہے۔ شاید وہ دور اسی چیز کی فیکٹری نہ ہو۔ چاٹگام کے ان پہاڑی علاقوں میں کافی اور ربڑ کی پیداوار بہت اچھی ہوتی ہے۔ عمدہ قسم کے پودے باہر سے منگا کر ان لوگوں کو دیئے گئے ہیں۔ لیجئے اب موٹر سے اتر جایئے۔ اوپر چوٹی تک پہنچنا ہے۔ یہ سرکاری ریسٹ ہاؤس ہے۔ یہاں ہم بھی کچھ دیر سستائیں گے ——— آپ ادھر کیا دیکھ رہے ہیں۔ ہاں وہ سمندر، بحیرۂ بنگال ہے، اور میری طرف نگاہ کریں تو یہ دور تک میدانی علاقہ جو چلا گیا ہے یہ چاٹگام کا ضلع ہے۔ یہ پہاڑ ایک سلسلۂ کوہ کا حصہ ہے جسے اپچاری سلسلۂ کوہستان کہتے ہیں۔ ادھر کے اونچے اونچے پہاڑ جو ایک اونچی سیڑھی سی بناتے چلے گئے ہیں سو بالانگ کے پہاڑ کہلاتے ہیں اور برما تک یونہی چلے گئے ہیں۔

اچھا صاحب، اب یہاں سے چلنا چاہیئے اور پہلے اس پل کو دیکھ لیں۔ دور سے بڑا خوشنما دکھائی دیتا ہے۔ ہرا اور سفید رنگ اس طرح پینٹ کیا گیا ہے کہ پاکستان کا جھنڈا معلوم ہو۔ یہ نبلٹ پل کہلاتا ہے۔ اس کے نیچے جو ندی بل کھاتی گذر رہی ہے، مانک چاری کہلاتی ہے۔ بارشوں کے زمانہ میں اس کی تندی و تیزی غضب کی ہوتی ہے۔ اس تمام کوہستانی علاقے کا صدر مقام رنگ متی ہے۔ واقعی یہ رنگ و نور کی بستی ہے اور اس کا یہی نام ہونا چاہیئے تھا۔ نباتات کی بڑی کثرت ہے۔ کیلا بڑا نفیس ہوتا ہے دھان بکثرت اور انناس، پپیتا، چائے، کافی، ربڑ، غرض قدرت نے اس سرزمین کو بہت کچھ دے رکھا ہے۔

یہ سامنے کوئی مندر معلوم ہوتا ہے۔ اسے شاید یہ لوگ کیانگ بولتے ہیں۔ ذرا دیکھنا، یہ پہاڑی بھینسا ہے۔ کیسا تنومند

ہے۔ نوشانی کی پہاڑیاں نزدیک ہی تو ہیں۔ یہاں کے لوگ ان بھینسوں کو وہاں سے گھیر لاتے ہیں اور نسل کشی کے لئے کام میں لاتے ہیں۔ آزادی کے بعد سے بہت سے جنگلات کاٹے گئے ہیں تاکہ صاف شدہ زمینوں پر دھان بویا جاسکے۔ اب یہاں کی ضرورت کا پورا غلہ یہیں پیدا ہو جاتا ہے۔ اس جگہ ایک مقام کا نام جنرل محمد ایوب خاں کے نام نامی پر رکھا گیا ہے۔ یہ خراج عقیدت ہے اس زمانہ کا جب وہ پاکستان کے کمانڈر انچیف تھے۔ جنگلوں کو اب بھی صاف کیا جا رہا ہے۔ جب درخت، جو بڑے قد آور ہوتے ہیں، گرا دیئے جاتے ہیں تو ہاتھیوں سے ان درختوں کو کھنچوایا جاتا ہے۔ درختوں کے بڑے بڑے لٹھے اور شہتیر دور دور جاتے ہیں۔ چاٹگام کی بندرگاہ سے یہ کراچی کی بندرگاہ کو بھی بھیجے جاتے ہیں۔ جس طرح دریائے سندھ میں لکڑی بہا دی جاتی ہے اور وہ اپنی منزلوں پر پہنچ جاتی ہے خاص کر جہلم پر۔ اسی طرح بانس اور شہتیروں کے لٹھے دریائے کرنا فلی کے دھاروں پر ڈال دیئے جاتے ہیں۔ کاسالونگ کے جنگل کی لکڑی اسی طرح آتی ہے۔ ہمارا ملک اب کرنا فلی کا کاغذ ہی برت رہا ہے۔ اس کے لئے خام مال، بانس یہیں سے مہیا ہوتا ہے

جس جنگل کے پاس ہم پانی پینے کے لئے ٹھہرے تھے یہ "کنج جناح" کہلاتا ہے۔ یہاں دیودار کے درخت بہت ہیں۔ ایک ایک درخت پانچ پانچ سو روپے بلکہ ہزار ہزار روپے تک کا ہوتا ہے۔ مہاگنی نامی لکڑی کی دنیا میں بڑی شہرت ہے۔ قدرت کی یہ دولت بھی مشرقی پاکستان کے پاس بڑی کثرت سے ہے۔ یہاں کے جنگلات کوئی ۱۲۰۰۰ مربع میل کو گھیرے ہوئے ہیں۔ یہاں کی چائے اور ربڑ بھی بہت عمدہ ہوتے ہیں۔ اس سرزمین کی سرخ مٹی نے چائے کے رس اور بُو باس کو بہت عمدہ بنا دیا ہے۔ آیئے اس ریستوراں میں بیٹھ کر چٹگامی چائے کے دو گھونٹ پی کر دن بھر کی تکان دور کریں ٭

●

تبصرہ:

"خاتون پاکستان" کا انقلاب نمبر

مدیر: شفیق بریلوی

"خاتون پاکستان"، ہمارے جدید اور قدیم نسائی ادب کا ایک خوشگوار امتزاج ہے یہ غیر ضروری روایت پرستی اور بے ڈھنگی ترقی پسندی سے مبرا ہے، انقلاب نمبر کے مضامین اور اس کی ترتیب و تدوین نسائی شعور اور حسن قبول کا پورا پورا ساتھ دیتی ہے، جس کی انقلابی اشاریت اور تزویجی افادیت کا احترام کرنا ہی پڑتا ہے، انقلاب کے معنی اور اس کا مفہوم کیا ہے! انقلاب کیوں آیا! انقلاب سے صحیح معنوں میں قوم استفادہ کس طرح کرسکتی ہے؟ یہ وہ لازمی سوالات ہیں جو مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین کے ذہنوں میں بھی پیدا ہونا چاہئیں، اور "خاتون پاکستان" اپنے انقلاب نمبر میں ان تمام سوالات کا جواب اس خوبصورتی سے پیش کرتا ہے جو پاکستانی خواتین کی ذہنی سطح اور انداز فکر کے عین مطابق ہے۔ اردو ادب کے ممتاز قلم کاروں سے اس نمبر کی فہرست مزین ہے۔ ہماری رائے میں "خاتون پاکستان" کا یہ نمبر نہ صرف خواتین بلکہ مردوں کے لئے بھی خصوصی دلچسپی اور معلومات میں اضافہ کا باعث ہوگا۔ قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ: ۵/۸۰۰ لالوزار، کراچی۔ (ط۔ق)

* * *

مولانا عبدالمجید سالک مرحوم - بقیہ صفحہ ۱۹

پانی اوپر چڑھایا۔ پطرس ہنستے ہوئے سیڑھیاں چڑھے اور سالک صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے بولے:

" مولانا دیکھئے۔ آپ کو پانی پانی کر دیا۔"

بھلا سالک صاحب پر اتنی آسانی سے وار کیسے کیا جا سکتا تھا۔ ؟ وہ مسکرائے اور میری طرف دیکھتے ہوئے برجستہ بولے:

" دیکھا آپ نے، یہاں کیسے کیسے لوگ پانی بھرتے ہیں ؟"

اور ان کے اس بھرپور طنز پر پطرس مرحوم نے جلدی سے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ پکڑ لئے اور بولے: "جائے استاد خالی"

عام طور پر تو یہ تھا کہ سالک صاحب گاؤ تکیہ کا سہارا لے کر بیٹھ جاتے اور پھر واقعات اور معلومات کا ایک دریا بہہ نکلتا۔ واقعہ سے واقعہ جڑتا چلا جاتا اور بات سے بات نکلتی۔ گفتگو کا موضوع چاہے کچھ بھی ہو، کسی ملک یا قوم کا ذکر ہو، کوئی ادبی مسئلہ ہو یا سیاست کا پہلو سامنے آجائے، میں نے دیکھا ہے کہ سالک صاحب اس روانی سے بولتے کہ سننے والا منہ دیکھتا رہ جاتا، ان کی گفتگو کے لئے موضوع کی پابندی نہیں ہوتی تھی، بلکہ موضوعات ان کے پابند ہوتے تھے۔ اور ان کی یادداشت تو حیرت انگیز طور پر قابل رشک تھی جب کبھی گزشتہ حالات و واقعات کی بات چل نکلتی تو وہ اس طرح سن، تاریخ، دن، اور وقت کا حوالہ دیتے چلے جاتے جیسے کوئی تحریر پڑھ رہے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ سالک صاحب ایک چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا تھے جس کے اوراق میں برصغیر پاک و ہند کی سیاسی، ادبی، علمی، صحافتی، ادبی مجلسی تاریخ۔ قلمبند تھی۔ افسوس کیسے کیسے لوگ تھے کہ اٹھتے چلے جا رہے ہیں۔ اور قحط الرجال کا یہ عالم ہے کہ نئی تانتی میں تو شاید کبھی بھی ایسی جامع شخصیتیں دکھائی نہ دیں گی۔

مہمان عزیز: ——— بقیہ صفحہ ۲۹

اگلے دس دن خیریت سے گزر گئے۔ گیارہویں دن امجد خلاف معمول رات گئے گھر واپس آیا تو بیگم زیدی کو اپنا منتظر پایا۔ سل وانا ان کے پیروں کے قریب آنکھیں بند کئے بیہوش سو رہی تھی اور بڑی ہی پیار سے اس کا سر سہلا رہی تھیں۔

"آئیے آئیے امجد صاحب۔ دراصل مجھے آپ ہی کا انتظار تھا۔ آپ تشریف رکھئے۔ مجھے آپ سے ضروری باتیں کرنی ہیں" وہ بولیں

امجد آج بہت خوش تھا۔ وہ اطمینان سے بیٹھ گیا۔

" دیکھئے امجد صاحب۔ آپ کو شاید علم ہو۔ یہ بڑا گھر تنہائی میں مجھے کاٹنے کو دوڑتا۔ چوروں اچکوں کا بھی مجھے اکثر ڈر لگا رہتا۔ دراصل اپنی تنہائی ہی کے خیال سے، صرف کمپنی کی خاطر اب تک میں پینگ گیسٹ رکھنے کی دردسری مول لیتی رہی ہوں۔ لیکن جب سے سل وانا آئی ہے میرے دل کو بڑا اطمینان ہے۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے بڑے پیار سے سل وانا کی کھال سہلائی۔ " تو امجد صاحب۔۔ اب حالات بدل گئے ہیں۔ اب مجھے گیسٹ رکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔۔۔ یعنی اگر آپ ایک ہفتہ کے اندر کمرہ خالی کر دیں تو نوازش ہوگی ——— مجھے بے حد افسوس ہے۔ لیکن مجبوری ہے ——— !!!"

پنکھے والے حافظ جی: ——— بقیہ صفحہ ۴۳

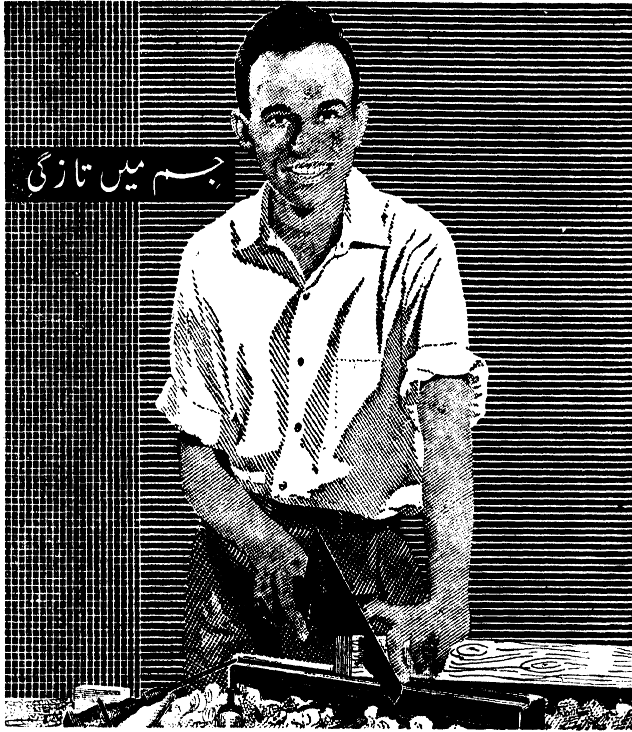
پھر ؛ پھر کیا ایک " عابد سبیل اور ایک عال کن فی الدنیا غریبا" کو راستے کی روح افزائیوں اور رنگنائیوں سے کیا لطف حاصل ہو سکتا ہے جب تک وہ اپنے اصلی وطن کی سرزمین پر قدم نہ رکھے جہاں پھول مرجھانا نہیں جانتے اور جہاں خزاں کا نام کسی کو معلوم نہیں۔ نہ رُتیں بدلتی ہیں نہ اندھیرے اُجالے سے واسطہ رہتا ہے "۔

اتنا کہنے کے بعد حافظ جی نے یکایک پلٹ کر دیکھا اور پنکھا زور زور سے ہلانے لگے۔ اس وقت ان کے چہرے پر ایک عجیب جلال تھا۔ میں ڈر کر بھاگا اور گھر میں آکر دم لیا۔ اس کے بعد کوئی ایک ہفتے تک وہ بالکل نظر نہ آئے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا پردہ کر گئے۔ ایک دن خلاف معمول شام کے وقت گھر سے گئے۔ دضو کیا نماز پڑھنے کھڑے ہوئے۔ اللہ اکبر کہتے ہی سجدے میں گر پڑے۔ عورتیں دیکھنے کو دوڑیں تو ختم تھے۔ سدا رہے نام اللہ کا۔


سب ایک دوسرے
سے پوچھتے ہیں!
"کہئے مزاج کیسا ہے؟"
laham
یہی وہ الفاظ ہیں جو ملاقات کے وقت سب سے پہلے زبان پر
آتے ہیں۔ مگر کیا سچ مچ اس کا جواب ہمیشہ درست اور حسبِ دلخواہ
ہوتا ہے؟ صحت کی طرف تھوڑی سی توجہ ہماری بہت سی عام
شکایات کا خاتمہ کر سکتی ہے۔
ماء اللحم کا استعمال خصوصاً اس موسم میں ہماری صحت اور توانائی کی
ضمانت ہے۔ جدید طبی تحقیق کی مدد سے اس کے خواص اور خوبی کو کمال تک پہنچا دیا
گیا ہے اور اب یہ ہر لحاظ سے ایک مکمل اور مؤثر ٹانک بن گیا ہے جو
صحت اور شباب کو قائم رکھتا ہے۔






جسم میں تازگی

جلد ۱۲ — شمارہ ۱۲



جمہوریت نمبر

دسمبر ۱۹۵۹ء

مدیر: رفیق خاور — نائب مدیر: ظفر قریشی

سرورق: ہمارا کسان: جمہوریت کی اصل اساس — رنگین عکس: (بابی جوزف)

چندہ سالانہ: پانچ روپے آٹھ آنے

شائع کردہ: ادارہ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

فی کاپی: آٹھ آنے

بابائے ملّت — جمہوریت کا اوّلین نقیب

رئیس احمد جعفری

قائدِ اعظمؒ کی یاد ہم سب ہر سال ان کے یومِ ولادت اور یومِ وفات پر مناتے ہیں، اسلئے کہ قائدِ اعظم پاکستان کے خالق تھے، لیکن وہ کون دن ہے جب قائدِ اعظم یاد نہیں آتے؛ جس کی یاد نے دلوں میں نشیمن بنالیا ہو بھلا اسے کوئی بھول سکتا ہے؛

قائدِ اعظم زندہ ہیں، اور زندہ رہیں گے، اگر چاند اور سورج، پہاڑ اور سمندر، زمین اور آسمان مر سکتے ہیں تو قائدِ اعظم بھی فنا ہو سکتے ہیں لیکن اگر یہ نہیں ہو سکتا تو قائدِ اعظم بھی ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں جو زندگی ہی میں مر جاتے ہیں، کچھ وہ ہوتے ہیں جو مرنے کے بعد زندۂ جاوید ہو جاتے ہیں، قائدِ اعظم کا شمار انہی لوگوں میں ہے جو بظاہر موت سے ہمکنار ہوئے، لیکن حقیقۃً حیاتِ دوام کے منصب پر فائز ہو گئے۔

ذرا تصور تو کیجئے، ایک غلام ملک ہے جس کی آبادی تقریباً چالیس کروڑ ہے۔ یہ ملک مجموعۂ اقوام و ملل ہے۔ ملک کی سب سے بڑی اکثریت جو ۳۰ کروڑ کی آبادی رکھتی ہے، بیدار ہے، شعورِ سیاسی سے بہرہ ور ہے، قوتِ عمل سے بھرپور ہے، صنعت و حرفت کے میدان میں سب سے آگے ہے، تعلیم و سائنس کی دنیا میں سربلند ہے، سیاست و معیشت کے زمین و آسمان کی مالک ہے، دولت و ثروت کی کوئی حد اور کمی نہیں۔ اعلیٰ، اوسط اور ادنیٰ سرکاری ملازمتوں کے دروازے اس پر آغوشِ شوق کی طرح کھلے ہوئے ہیں، وہ جدوجہد کرتی ہے، لڑتی ہے، مورچے سر کرتی ہے، آقا قوم اس سے لرزتی ہے۔ دنیا کی دوسری بڑی اور ترقی یافتہ قومیں اس کا لحاظ کرتی ہیں، اور بالآخر انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی صورت میں اسے آزادی کی پہلی اور بہت بڑی قسط وصول ہو جاتی ہے، چند صوبوں کے علاوہ ہر صوبہ میں وہ اپنی حکومت قائم کرلیتی ہے، اور گورنران صوبہ نہایت سعادت مندی کے ساتھ وعدہ کرلیتے ہیں کہ — تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر!

اکثریت کی صوبائی وزارتوں کے معاملات و مسائل میں، فیصلوں میں، پالیسیوں میں نہ گورنر مداخلت کرتے ہیں، نہ وائسرائے، نہ وزیرِ ہند، نہ ملکِ معظم، حالانکہ انڈیا ایکٹ میں صاف اور واضح طور پر یہ بات مرقوم ہوتی ہے کہ اقلیتوں کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہونے پائے گی۔

اس ملک میں کئی اقلیتیں ہیں، لیکن کسی اقلیت کی تعداد، لاکھوں سے متجاوز نہیں، ہاں ایک سب سے بڑی اقلیت — مسلمان — ہے جس کی تعداد آٹھ کروڑ سے متجاوز ہے، لیکن یہ اقلیت ہر اعتبار سے پسماندہ ہے، تعلیم میں پیچھے، صنعت و حرفت میں پس رو، سیاست سے ناواقف، سرکاری ملازمتوں کا دروازہ بڑی دیر تک کھٹکھٹانے کے بعد ذرا سا کھلتا ہے اور پھر بند ہو جاتا ہے، یہ وہ اقلیت ہے جس نے ایک ہزار سال تک اس دیس پر عدل و انصاف، اور رواداری کے ساتھ حکومت کی تھی، لیکن آج یہ اقلیت صرف غبارِ کارواں بن کر رہ گئی تھی نہ اس کی کہیں پوچھ تھی، نہ اس کا کوئی مقام تھا۔ اس کی فریاد صدا بہ صحرا بن کر رہ جاتی تھی، اس کے مطالبات کا مذاق اڑایا جاتا تھا، اسے جو تحفظات دیئے گئے تھے وہ صرف زینتِ قرطاس تھے، یہ حسرت سے آسمان کی طرف دیکھتی تھی، اور زیرِ لب کہہ اٹھتی تھی، — کہیں پرسشِ داد خواہاں نہیں!

مایوسی، افسردگی اور اضمحلال کے اس عالم میں، ایک لمبا تڑنگا، دُبلا پتلا، مردِ کہن سال میدان میں آیا، اور اس نے نعرہ لگایا۔

پاکستان — مسلمان پاکستان کے سوا کسی چیز پر قناعت نہیں کرسکتے!

یہ نعرہ برحق ہونے کے باوجود کتنا اجنبی، کتنا نامانوس، اور کتنا ناممکن تھا!

جس قوم کو ملازمت نہیں مل سکتی، حقوقِ عامہ نہیں مل سکتے، تحفظات نہیں مل سکتے، وہ پاکستان لے گی؟ — ایک نیا ملک، ایک آزاد اور خود مختار ملک؛ جس کی اپنے ملک میں کوئی پوچھ نہیں، وہ اقوامِ عالم کی صف میں پہلو بہ پہلو بیٹھے گی؟ — مرا بہ آرزو دہلے

نظیریؔ خندہ می آید!

لیکن خندۂ استہزا اور قہقہہ استحقار کے اس ہنگامہ میں طوفان کی کڑک اور بادل کی گرج کی طرح نئے الفاظ میں، نئے عزم کے ساتھ وہ مطالبہ، بدلے ہوئے تیوروں میں پھر گونجا؛

"پاکستان ـــــ یہ مسلمانوں کا واحد اور ناقابل مفاہمہ مطالبہ ہے!"

یہ آواز اس مرتبہ صدا بہ صحرا نہیں ثابت ہوئی، اس نے اثر کیا، اس کا نتیجہ نکلا۔

اس آواز میں، اس نعرہ میں، کچھ ایسی صداقت تھی، کچھ ایسا خلوص تھا، کچھ ایسا ولولہ تھا کہ بہت جلد واقعی یہ مطالبہ ساری مسلمان قوم کا مطالبہ بن گیا۔ وہ قوم جسے آقایانِ فرنگ ہیچ سمجھ رہے تھے، برادرانِ وطن کی نظر میں جس کی کوئی اہمیت نہ تھی، دفعتہً ایک زندہ اور فعال قوم بن گئی اور یہ مردِ کہن سال اس بکھری ہوئی، منتشر اور آوارہ قوم کا شیرازہ بند اور قائدِ اعظم بن گیا۔

اور بالآخر ایک روز دنیا نے سن لیا کہ پاکستان عالمِ وجود میں آگیا!

ایک نیا ملک!

دنیا کی آزاد، خود مختار اور ترقی یافتہ قوموں میں ایک نئی قوم کا اضافہ ہوگیا، ایک نئے ملک کا اضافہ ہوگیا، یہ ملک، جو ایک ہی شخص کے خلوص اور عزمِ بے کراں کا نتیجہ تھا، دنیائے اسلام کا سب سے بڑا ملک تھا ـــ! دوستوں نے اور دشمنوں نے، حامیوں نے اور مخالفوں نے اس نئے ملک کو سخت ترین موانع اور مشکلات کے ہوتے ہوئے، عالمِ وجود میں آتے دیکھا، اور ششدر رہ گئے ـــــ این چہ می بینم بہ بیداریست یارب یا بہ خواب؟ ـــــ قوموں اور ملتوں کی تاریخ میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بیداری خواب بن جاتی ہے، اور خواب بیداری۔ مسلمانوں کے یہ دونوں دور گزر گئے، ایک وہ جب ان کی بیداری خواب میں تبدیل ہو چکی تھی، ایک وہ جب ان کا خواب بیداری بن گیا تھا۔

پاکستان بننے سے پہلے بھی قائدِ اعظمؒ نے وہ مقام حاصل کر لیا تھا کہ آسانی سے اپنی قوم کے ڈکٹیٹر بن سکتے تھے۔ شاہ بے تاج تو تھے ہی، اور پاکستان بننے کے بعد اگر وہ چاہتے تو تاجِ شہریاری زیبِ سر کرکے بادشاہت کا اعلان کر دیتے۔ اگر چاہتے تو ہر نظام اور آئین کو معطل کرکے آمرِ مطلق بن جاتے، قوم، دل سے (نہ کہ بہ نوکِ سنگین) انہیں بادشاہ ہی بنا لیتی اور ڈکٹیٹر بھی۔

لیکن قائدِ اعظمؒ نے ایسا نہیں کیا!

قائدِ اعظم اپنی طبیعت، مزاج، اور اصول کے لحاظ سے کٹر جمہوریت پسند تھے، زندگی کے ہر دور میں انہوں نے جمہوریت کا پرچم سربلند رکھا، وہ طبعاً آئین پسند آدمی تھے، جمہوریت کے حفظ و بقا کے لئے انہوں نے بڑی سے بڑی قوت سے ٹکر لی، مقابلہ کیا، مصائب برداشت کئے۔ لارڈ ولنگڈن جیسے فرعون مزاج گورنر سے انہوں نے ایسی شاندار ٹکر لی کہ مخالف بھی ان کے سامنے سرنگوں ہوگئے، بمبئی میں کانگرس نے اس دلیرانہ کارنامہ کی یادگار میں جناح میموریل ہال تعمیر کرایا جو آج تک موجود ہے۔ یہ ہال جب تعمیر ہوا تو قائدِ اعظم پیرس میں تھے، مسز سروجنی نائیڈو نے انہیں تار دیا۔

"قوم نے پیغامبر کی زندگی ہی میں اس کی قدر بھی کر لی!"

جمہوریت ہی کے تحفظ کے لئے، بعد میں انہوں نے کئی مرتبہ لارڈ لنلتھگو، لارڈ ویول اور لارڈ اٹیلی سے ٹکر لی۔ کانگرس انہیں اپنا صدر بنانے کو تیار تھی، انگریز حکومت ہر بڑے صوبہ کی گورنری ان کی خدمت میں پیش کرنے کو آمادہ تھی، لیکن قائدِ اعظم نے حفظِ جمہوریت کے لئے جو کچھ کیا تھا وہ کسی صلہ کی تمنا اور انعام کی آرزو میں نہیں کیا تھا، انہوں نے اپنے ضمیر کی رہنمائی میں گام فرسائی کی تھی، کانگرس کی صدارت یا کسی بڑے صوبہ کی گورنری اس کی قیمت نہیں بن سکتی تھی۔ انہوں نے جاہ و منصب کی طرف کبھی نگاہِ غلط انداز سے بھی نہیں دیکھا، اپنے کام میں لگے رہے۔

قائدِ اعظم قوم کے مزاج کو سمجھتے تھے۔ ان کے کمالات میں سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ایسی قوم کو، جس کی پسماندگی حدِ تصور سے

مادر تھی، اور جو سیاسی شعور سے یکسر محروم تھی، بہت مختصر مدت میں جمہوریت کا رمز آشنا کر دیا۔ پاکستان اتنا بڑا ملک کسی بغاوت کا، کسی شورش کا، کسی خانہ جنگی کا نتیجہ نہیں ہے۔ یہ جمہوریت کا نتیجہ ہے، جمہوریت کی فتح ہے۔

دنیا میں کوئی نیا ملک جغرافیہ کے صفحات پر اور نقشۂ عالم پر اس طرح نہیں اُبھرا جس طرح پاکستان۔ آئرلینڈ برطانیہ سے الگ ہوا لیکن کتنے خون خرابہ کے بعد؟ امریکہ نے برطانیہ کی غلامی کا جوا اتار پھینکا، لیکن کتنے ہولناک کشت و خون کے بعد؟ انڈونیشیا نے آزادی کا پرچم لہرایا، اور ہالینڈ سے گلو خلاصی حاصل کی، لیکن کتنی خفیہ اور علانیہ تحریکوں کے بعد؟ پاکستان عالم وجود میں آیا، لیکن جمہوری اقدار اور روایات کے ساتھ۔

جمہوریت قائد اعظم کو اتنی محبوب تھی کہ گو قوم ان کے کسی اقدام پر نکتہ چینی نہیں کرتی تھی، گو ان کے اصحاب و رفقا ان کی کسی بات سے اختلاف نہیں کرتے تھے، لیکن کوئی چھوٹے سے چھوٹا۔ اور بڑے سے بڑا معاملہ ایسا نہیں تھا جس کا فیصلہ انہوں نے بطور خود کر لیا ہو، ہر معاملہ میں وہ اپنی ورکنگ کمیٹی سے استصواب کرتے تھے، ضرورت ہوتی تو مسلم لیگ کونسل کا جلسہ طلب کرتے تھے، اور زیادہ معاملہ اہم ہوتا تو عام سیشن منعقد کرتے تھے، مگر ممکن نہ تھا کہ قوم کی منظوری، ساتھیوں کی تائید، رفقا کے مشورے، اور نمائندگان ملت کی اجازت کے بغیر وہ کوئی قدم اُٹھالیں۔ گاندھی جی سے تصفیہ ہو رہا ہو یا وائسرائے سے فیصلہ کن گفتگو ہو رہی ہو، یا سرکرپس سے معاملات و مسائل زیر بحث ہوں، یا کابینہ وفد کی تجاویز زیر غور ہو رہا ہو، ہر معاملہ کا آخری فیصلہ قائد اعظم کر سکتے تھے لیکن نہیں کرتے تھے۔ وہ ساری صورتِ حال اپنی ورکنگ کمیٹی کے سامنے ——— وہ ورکنگ کمیٹی جو ملت کے معتمد ترین نمائندوں پر مشتمل تھی ——— رکھ دیتے تھے، اور فیصلہ اسی پر چھوڑ دیتے تھے۔ جو فیصلہ وہ کرتی تھی، اس کی اطلاع اصحاب متعلقہ کو دے دیتے تھے، عام اس سے کہ وہ فیصلہ قائد اعظم کی مرضی کے مطابق ہوا ہو یا ان کی مرضی کے خلاف۔ محرمان اسرار اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ورکنگ کمیٹی کے کئی فیصلے ایسے ہوئے ہیں جن کے ساتھ قائد اعظم کی رائے نہیں تھی لیکن قوم کے نمائندوں کی رائے سے وہ اپنے آپ کو الگ نہ رکھ سکتے تھے۔ قوم نے جب ایک فیصلہ کر لیا، تو اب اختلاف یا اپنے اقتدارِ عامہ کی بنا پر تخویف، تہدید یا ترغیب سے کام لینے کا کوئی سوال نہ تھا، قوم ان کے ساتھ تھی۔ وہ قوم کے ساتھ تھے۔

پاکستان بننے کے بعد بھی ان کی یہ روش قائم رہی، بلکہ اپنے اس مسلک میں وہ اور زیادہ سخت ہو گئے، سرکاری طور پر انہوں نے "قائد اعظم" کا خطاب اس وقت تک نہیں استعمال کیا، جب تک کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی نے باقاعدہ اسے منظور نہیں کر لیا۔

اپنے رفقا اور متبعین کو وہ برابر اس کی تلقین کرتے رہتے تھے کہ عوامیت اور جمہوریت کے راستہ سے گریز نہ کیا جائے۔ ایک آمر کتنا ہی اچھا ہو لیکن اگر اسے قوم کا اعتماد حاصل نہیں ہے تو اس کا اقتدار ہر وقت معرضِ خطر میں ہے، صرف اس کا اقتدار ہی نہیں ملک کی سلامتی بھی ہر وقت معرضِ خطر میں ہے، اور جسے قوم کا اعتماد حاصل ہو، اسے آمر بننے کی ضرورت کیا ہے؟

جمہوریت دشمنوں نے جمہوریت کے نام پر پاکستان کو تباہی کے دہانے پر کھڑا کر دیا تھا، پاکستان تباہی سے دوچار ہو رہا تھا، پاکستانی قوم خانہ جنگی میں مبتلا ہوا چاہتی تھی، جمہوریت دم توڑ رہی تھی، قوم کی آواز کوئی وزن نہیں رکھتی تھی، چند موقع پرستوں نے حکومت پر قبضہ کر لیا تھا، اور وہ جو چاہتے تھے کرتے تھے، زندگی دشوار سے دشوار تر ہوتی جا رہی تھی۔

یہ حالات تھے، جب ایک شخص، فیلڈ مارشل جنرل محمد ایوب خاں قائد اعظم کے پاکستان کو بچانے کے لئے میدان میں اترا، وہ فوج کے بل پر آیا تھا، مارشل لا اپنے ساتھ لایا تھا، جنرل فرانکو کی طرح ملک کے سیاہ و سفید کا غیر مسئول طور پر مالک بن سکتا تھا، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ عنانِ اقتدار ہاتھ میں لیتے ہی اس نے اپنی سب سے پہلی تقریر میں جمہوریت کی بحالی کا قوم کو یقین دلایا، قوم نے اس پر اعتماد کیا، اور اس اعتماد کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک سال کی مختصر سی مدت میں جمہوریت کا پہلا مرحلہ تکمیل کے قریب ہے۔ یونین اور پنچایت یہ جمہوریت کی ریڑھ کی ہڈی ہے، اس کے بعد دوسرا مرحلہ آئے گا۔ جب قوم کو وہ قوت واپس دے دی جائے گی جو موقع پرست سیاست دانوں نے اس سے چھین لی تھی۔ یہ مرحلہ ہو گا آئین سازی کا۔ قوم کے صحیح نمائندے یہ آئین بنائیں گے اور پھر ملک میں جمہوریت کے شادیانے بجیں گے! ٭

پاکستان زندہ باد!



علمبردار جمہوریت، قائداعظم محمد علی جناح رح

نیا افق

(فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، صدر پاکستان)

پاکستان میں چند ہفتوں کے اندر یونین کونسلوں کے انتخابات ہوں گے اور یہ انتخابی ادارے، جن کا انتخاب حق رائے دہندگی بالغان کی بنا پر عوام کریں گے عنقریب کام شروع کر دیں گے۔ یہی وہ واحد مقصد ہے جس کے لئے ہم انقلاب کے بعد ان بارہ ماہ کے دوران برابر سرگرم کار رہے ہیں۔ کیونکہ یہ عوام کی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا بہترین اور مفید ترین ذریعہ ہے۔

اب مفاد پرست اشخاص سیدھے سادے دیہاتی لوگوں کو یہ دھوکہ نہیں دے سکیں گے کہ فلاں پیسے والے سیاسی لیڈر یا زمیندار کو آنکھیں بند کر کے ووٹ دے دو۔ اب جمہوریت عوام کے گھر تک پہنچا دی گئی ہے اور وہ اس قابل بنا دئے گئے ہیں کہ جس طرح وہ اپنے گھر یا خاندان کا انتظام کرتے ہیں اسی طرح جمہوریت کے ذریعے اپنے گاؤں یا محلہ کا بھی انتظام کریں اور اسے ترقی دیں۔

پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہوگا کہ ہمارے عوام ان مردوں اور عورتوں کو اپنے نمائندوں کی حیثیت سے چنیں گے جن کی اچھائی، دیانت داری اور قابلیت سے وہ ذاتی طور پر واقف ہیں۔ بنیادی جمہوریتیں آزاد قوم کے افراد کو قومی و معاشرتی فرائض اور ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا شاندار موقع دیتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ بنیادی جمہوریتوں کی بدولت جو ادارے وجود میں آئیں گے ہمارے عوام ان میں شریک ہونے کے مواقع سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں گے اور پاکستان کی عظیم تر بہبود کے لئے ان کو زیادہ سے زیادہ کام میں لائیں گے۔

(۲۷۔ اکتوبر: قوم سے نشری خطاب)

"پندِ پیرِ دانا"

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

صاحبو! جنگِ آزادی کے بعد ہمارے ملک پر پھر ایک سخت آزمائش کا وقت آیا ہے۔

پہلے ہم نے انگریز کی سیاسی غلامی کے خلاف انقلاب برپا کیا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان بن گیا۔ آج ہم نے انگریز ہی نہیں بلکہ پورے مغرب کی ذہنی غلامی سے آزاد ہونے پر کمر باندھ لی ہے اور یوں مکمل آزادی کی طرف ایک اور قدم بڑھایا ہے۔

ذہنی آزادی حاصل کرنا کوئی معمولی کام نہیں۔ اس میں سب سے بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ بہت سے لوگوں کو اپنی ذہنی یعنی روح کی غلامی کی خبر ہی نہیں ہوتی۔ عام آدمی کو تو ویسے ہی سوچنے کی فرصت نہیں ملتی مگر کچھ پڑھے لکھے نوجوان بھی اس بات سے بے خبر ہیں کہ اصل میں ان کے سوچنے سمجھنے کا طرز ابھی تک غلامی کی زنجیروں سے آزاد نہیں ہوا۔ آج سے اٹھارہ برس پہلے اچھے اچھے لوگ پاکستان کے نام سے ہی بدکتے تھے، اور اس نام کا مذاق اڑاتے تھے مگر وہ بن کر رہا، ممکن ہے آج بھی بنیادی جمہوریت کے نام اور ڈھانچے سے کچھ لوگ حیرت زدہ ہوں لیکن میری بوڑھی آنکھیں صاف دیکھ رہی ہیں کہ بنیادی جمہوریتوں کے رواج کے بعد پاکستان صحیح معنوں میں آزاد ہونے والا ہے۔ بنیادی جمہوریت کی اسکیم ایک انقلابی اسکیم ہے، اور صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ صدر ایوب خاں نے صرف سیاسی انقلاب ہی نہیں کیا بلکہ ذہنی انقلاب پر بھی کمر باندھی ہے۔ یہ ایک مہم ہے اور اس مہم کی وجہ سے ہماری قومی زندگی میں طرح طرح کی تبدیلیاں پیش آ رہی ہیں جن میں سے کچھ ہمیں اچھی لگتی ہیں، کچھ بری لگتی ہیں اور کچھ سمجھ میں نہیں آتیں۔ چونکہ انقلاب اصل میں تبدیلی کا دوسرا نام ہے اسلئے اسے سمجھنے اور برتنے کے لئے بہت سی باتیں جاننی ضروری ہیں۔

میں کوئی سیاست داں نہیں ہوں۔ میں نے اپنی زندگی اردو زبان کی خدمت کے لئے وقف کر رکھی ہے لیکن میری عمر نوّے سے اوپر ہے پاکستان بھر میں ایسے لوگ بہت کم ہوں گے جنہوں نے ملکہ وکٹوریہ کا زمانہ دیکھا ہو۔ میں اُس وقت نوجوان تھا۔ میں نے مغربی سیاست اور مغربی طور پر سوچنے کا زہر آہستہ آہستہ پھیلتے دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ہر ناقص اور جھوٹی تعلیم کا بوجھ کس طرح لادا گیا۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ ہم جمہوریت کے نام پر کس طرح للچائے گئے اور کس طرح انگریز نے ہماری انقلابی قوت کا دھارا اسمبلیوں کی طرف موڑ دیا۔ میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔ میں نے اسّی برس میں ہر طرح کے بڑے لوگوں کو جانا اور پرکھا ہے، میں نے سرسید احمد خاں کے ساتھ کام کیا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ غدر کے بعد جو مسلمانوں کی حالت تھی وہ کتّوں اور بلّیوں سے بدتر تھی اگر اس وقت سرسید نے انگریز کے ہتھیار اسی کی ڈھالوں پر نہ روکے ہوتے تو آج مسلمان قوم کا نام نشان تک نہ ہوتا۔ اس وقت انگریز اور ہندو چکّی کے دو پاٹ بنے ہوئے تھے مگر سرسید، قوم کو ان دو پاٹوں کے بیچ سے صاف بچا کر لے گئے۔ مجھے علامہ اقبال اور قائدِ اعظم کی دوستی کی عزت بھی حاصل ہے۔ یہ دونوں عمر میں مجھ سے چھوٹے تھے لیکن میں ان کی بے حد عزت کرتا تھا۔ یہ بہت بڑے لوگ تھے۔ ایک نے پاکستان کا خواب دیکھا دوسرے نے اس کی تعبیر پوری کر دکھائی لیکن اصل میں ابھی قائدِ اعظم کا کام شروع ہوا تھا کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ میں آپ کو نہایت دیانت سے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اقبال اور جناح صرف جغرافیائی پاکستان نہیں چاہتے تھے۔ اُن کا مقصد یہ نہیں تھا کہ انگریز اور ہندو کی حکومت سے الگ ایک ملک بنا لیا جائے جہاں لوٹ کھسوٹ بے ایمانی، چور بازاری، ظلم، جبر جو کچھ کریں مسلمان کریں اور کوئی روکنے والا نہ ہو۔ نہیں، ان کا مقصد کچھ اور تھا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو اپنے اعلےٰ مقصدوں کے پورا کرنے کے لئے ایک آزاد زمین مل جائے اور بس۔ اور مسلمانوں کا اعلےٰ مقصد وہ نہیں تھا جو ارسطو چاہتا تھا یا جو افلاطون بتا گیا

ہے یا جو برٹش پارلیمنٹ بتا دے بلکہ انہیں اپنے ملک اور پوری دُنیا کے لئے ایک نہایت بلند اور عظیم نظریۂ حیات کو ترتیب دے کر اسے اپنے عمل سے ایک مثال بنا کر سب کے سامنے پیش کرنا تھا۔

افسوس کہ پاکستان نام کا ایک ملک تو بن گیا مگر پاکستانی قوم نہیں بن سکی۔ قوم باتوں سے نہیں بنتی۔ اسمبلیوں میں تقریروں سے نہیں بنتی، پمفلٹوں کے پروپیگنڈے، ریڈیو کی تقریروں سے نہیں بنتی۔ روز کی نئی وزارت بنانے سے نہیں بنتی۔ روز ایک پارٹی چھوڑ کر دوسری پارٹی میں چلے جانے سے نہیں بنتی بلکہ ملک میں کام کرنے سے بنتی ہے۔ کام اور صرف کام۔

نوجوانو! مجھے معاف کر دینا اگر کام کا لفظ زیادہ برا لگا ہو۔ تم زیادہ تر باتیں کرنا جانتے ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ دو چست فقرے بول کر، ایک زوردار قہقہہ مار کر ملک اور قوم کی خدمت ہو جاتی ہے۔ مگر میں پرانے زمانے کا آدمی ہوں۔ میں نے زندگی میں صرف کام سیکھا ہے اور کام کیا ہے۔ میں کام کو زندگی سمجھتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ کون سا کام کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ اب میں تم سے سقراط اور افلاطون کی باتیں کیا کروں، تم نے تو ان کی کتابیں پڑھی ہوں گی میں نے ان کو پڑھا بھی ہے اور اپنے زمانے میں بڑے بڑے سقراط اور افلاطون بھی دیکھے ہیں۔ میٹھی زبان کے افلاطون ڈنڈے مارنے والے افلاطون، سو مجھ سے کتابی باتوں کی امید نہ رکھنا میں کام کی بات کروں گا۔

صاحبو!

کام ابتدا سے چلتا ہے کسی کام کی مثال لو۔ تم دیکھو گے کہ اسے کرنے سے پہلے سیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک پانچ برس کے بچے کو اسٹیج پر تقریر کے لئے کھڑا کر دو تو وہ کیا بولے گا۔ یہ مثال آسان ہے۔ مگر غور کے قابل ہے۔ اب جمہوریت کے معاملے پر غور کرو۔ یہ ایک سیدھا سادا لفظ ہے۔ اس کے عام معنی یہ ہیں کہ لوگ اپنے آپ پر خود حکومت کریں۔ اب یہ بھی سب جانتے ہیں کہ سبھی آدمی روزمرہ کی حکومت کا کاروبار نہیں چلا سکتے بلکہ کاروبار نمائندوں کے ذریعے چلایا جاتا ہے اور یہ نمائندے بالغ لوگوں کے عام ووٹ سے چُنے جاتے ہیں۔ یہاں تک تو بات بہت سیدھی سادی ہے لیکن اب غور کرو تو معلوم ہوگا کہ اس ملک میں اب تک اس اصول پر عمل ہی نہیں ہوا۔ بجائے اس کے کہ عوام اپنے نمائندے چنتے، نمائندے عوام پر اپنے آپ کو لاد دیتے تھے، الیکشن کا وقت آتا تھا تو لیڈر لوگ نعرے لگا کر، لالچ دے کر، دھونس ڈال کر جھوٹے وعدوں کے سبز باغ دکھا کر ووٹ لینے آ جاتے تھے۔ ان کے ایجنٹ روپیہ اور موٹریں لئے گھومتے تھے اور تم لوگ ان لوگوں کو ووٹ دیتے تھے جنہیں تم نے نہ کبھی پہلے دیکھا تھا نہ بعد میں دیکھنے کی امید تھی۔ خیر یہ تو جمہوریت کا غلط استعمال تھا اب سنو کہ خود اس جمہوریت میں برائی تھی۔ یہ جمہوریت اس کام کی طرح تھی جسے کرنے والے نے سیکھا نہ ہو اور اسے کام کرنے کی آزادی مل گئی ہو۔ اس سلسلے میں ہمیں انگریزی پارلیمنٹ کی مثال ضرور یاد آئے گی لیکن تاریخ کے طالب علم جانتے ہیں کہ انگریز قوم ووٹ دیتی ہوئی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ یہی حال باقی اور مغربی قوموں کا ہے، وہاں سینکڑوں برس کی تعلیم سائنس کی ایجادات فلسفے کے رواج اور ہزاروں طرح کے کشت و خون کے بعد وہ صورت پیدا ہوئی تھی جسے جمہوری حکومت کہا جاتا ہے اور آج تو وہ بھی دنیا کے بہت سے ملکوں میں سے ختم ہو چکی ہے۔ مثلاً امریکہ میں وزیراعظم ہوتا ہی نہیں۔ وہاں ایک طرف تو سب لوگ مل کر ایک صدر چُن لیتے ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ اپنے اپنے حلقے سے امریکن کانگرس اور سینیٹ میں نمائندے بھی بھیجتے ہیں۔ روس اور چین میں اور ہی طرح کی حکومت ہے۔ وہاں صرف ایک سیاسی پارٹی ہوتی ہے اور صرف اسی کے نمائندے حکومت کرتے ہیں۔ وہاں مخالف پارٹی ہوتی ہی نہیں۔ فرانس میں بھی کئی دفعہ دستور بدلا جا چکا ہے۔ غرض یہ کہ دنیا بھر کے ملک سینکڑوں برس سے اپنے اپنے مزاج کے موافق جمہوری حکومت کے تجربے کرتے رہے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ جس طرح کی جمہوریت ہمارے ملک میں چل رہی تھی وہ کوئی آسمانی چیز نہیں تھی بلکہ ایک ایسا طریقہ تھا جو ہمیں غلامی کی میراث کے طور پر ملا تھا۔ باقی دنیا اس چکر سے خاصی آگے نکل چکی تھی مگر ہم اسی میں مبتلا تھے، حالانکہ وہ ہمیں گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا۔ اس کی بڑی خرابی یہ تھی کہ ایک تو ہمارے لیڈر اوپر ہی اوپر سے حکومت کرنا چاہتے تھے اور عوام کے آگے جوابدہی کے لئے تیار نہیں تھے اور دوسری وجہ یہ کہ ہمارے عوام کو تعلیم کی کمی نے اس قابل ہی نہیں رکھا تھا کہ وہ ایک آدمی کو بے جانے بوجھے صرف اخباری خبروں کے ذریعے پہچان لیں۔ وہ تو جیسی رَو آتی تھی اسی کے ساتھ بہہ جاتے تھے۔ نہ تو انہیں اتنی مہلت ملی تھی کہ تعلیم حاصل کریں اور پھر اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق اپنی مرضی کا کام کریں نہ ان کے لئے کوئی پنچایتی یعنی چھوٹے پیمانے پر حکمرانی کی تربیت کا انتظام کیا گیا تھا۔

صاحبو! دماغ میں طاقت دو طرح آتی ہے۔ تعلیم سے اور تجربے سے۔ تعلیم پیسے اور محنت سے حاصل کی جاتی ہے، تجربہ عمر گنوانے اور کام کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ تعلیم کا معاملہ یہ ہے کہ پاکستان میں سو میں سے اسی آدمی دیہات میں رہتے ہیں اور زیادہ تر ان پڑھ ہیں۔ انہیں تعلیم ملی ہی نہیں۔ جو شہروں میں ہیں وہ بھی زیادہ تر ناخواندہ ہیں۔ وہ صرف تجربے کو کام میں لا سکتے ہیں۔ لیکن تجربہ وہاں چلتا ہے جہاں اس کا موقع ہو۔ اب میں اتنا عمر رسیدہ اور تجربہ کار آدمی ہوں لیکن اگر کوئی مجھ سے کہے کہ تم برطانیہ کے فلاں آدمی اور امریکہ کے فلاں آدمی میں سے ایک کو اپنے تجربے کے بل پر چن لو تو میں کیا جواب دوں گا۔ میں ان میں سے کسی کو بھی نہیں جانتا نہ تو میں ان کے ساتھ رہا ہوں نہ انہیں دیکھا ہے نہ انہیں پرکھا ہے، زیادہ سے زیادہ میں نے ان کا نام سن لیا ہوگا۔ اب ظاہر ہے کہ اگر مجھے ان میں سے ایک آدمی چننا ہی پڑا تو میں اس کے کسی ایجنٹ، اس کے کسی اخبار، اس کے کسی پروپگنڈے کی وجہ سے ایسا کروں گا لیکن اپنی عقل استعمال نہیں کر سکوں گا کیونکہ میں اس سے بہت دور رہتا ہوں اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔ میں نے اس کا کام نہیں دیکھا مختصراً یہ کہ میں اسے نہیں جانتا۔ ہاں اگر مجھ سے میرے شہر یا میرے محلے کے دو آدمیوں کے بارے میں پوچھا جائے تو میں اطمینان کے ساتھ ایک کو چن لوں گا۔ مجھے اپنے محلے کا تجربہ ہے، اپنے شہر کو جانتا ہوں میں ان لوگوں کی اگلی پچھلی باتیں جانتا ہوں۔ میں ان کی لیاقت سے واقف ہوں۔ میں خوب سمجھتا ہوں کہ ان میں سے کون کس کام کے لئے مفید ثابت ہوگا۔



اب یہ باتیں کہنے کو تو آسان ہیں لیکن ان کو سچا ثابت کرنے میں تو بے ایمانوں کے لئے سخت خطرے تھے۔ وہ کیسے دیہاتیوں اور شہریوں کو چھوٹے چھوٹے حلقوں میں خود کام کا موقع دیدیتے اس طرح ایک تو عوام کو اپنا کھوٹا کھرا پرکھنے کا تجربہ ہو جاتا دوسرے بڑے بڑوں کے اختیارات کم ہو جاتے تھے۔ اب یہی سوچو کہ اگر کسی گاؤں میں ایک چھوٹی سی نہر بنانی ہے یا کسی سڑک کی مرمت کرانی ہے تو ضلع کے بڑے افسر یا کسی بڑے آدمی کے عزیز یا دوست تک پہنچنا پڑتا تھا۔ وہ پہلے تو سو طرح کے احسان جتاتا تھا۔ پھر گھمانے پھرانے کے بعد ضلع یا شہر جاتا تھا اور عام طور پر ہوتا یہ تھا کہ کام پھر بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس طرح بڑے لوگوں کی دھونس قائم رہتی تھی اور عام لوگ ان کے محتاج رہتے تھے۔ مگر پھر انہی عام لوگوں سے وہی خاص لوگ ووٹ مانگنے آجاتے تھے۔

اب بنیادی جمہوریتوں کا زمانہ آیا ہے۔ یہ طریقہ بہت سیدھا سادا اور مضبوط ہے پہلے ہزار پندرہ سو آدمی ایک نمائندہ چنیں گے پھر ایسے دس چنے ہوئے آدمی ایک انتظامی حلقہ یا پنچایت بن کر اپنے چھوٹے سے علاقے کی بہت سی ذمہ داریاں سنبھال لیں گے۔ ان کے ذمے اپنے گاؤں کی ترقی کے کام ہوں گے۔ امن امان، آپس کے جھگڑے قضیے مویشیوں کے جھگڑے یہ سب خود وہ طے کریں گے۔ چھوٹے موٹے ٹیکس بھی وہ خود لگائیں گے۔ ان کے ساتھ حکومت کے افسر بیٹھیں گے۔ ان کے ساتھ ماہر لوگ جیسے انجینئر، ڈاکٹر، وکیل غرض کہ جس طرح کے فنی ماہروں کی ضرورت ہوگی وہ بھی نامزد کر دئے جائیں گے تاکہ یہ نہ ہو کہ فنی ناواقفیت کی وجہ سے فیصلے غلط ہوں۔ یہ سب کیا ہے۔ یہ حکومت کرنے کا تربیتی اسکول ہے۔ یہ ذمہ داریوں کو سمجھنے اور پورا کرنے کا موقع ہے۔ اپنا کام خود کرو اور بڑے کاموں کی تربیت لو۔ یہ سبق وہ لوگ نہیں دیتے جو خود غرض اور حکومت سے چمٹے رہنے کے شوقین ہوتے ہیں کیونکہ کسی کو کوئی کام سکھا دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ پھر اسے سکھلانے والے کے بغیر بھی کر لے گا۔ یہ سبق صرف ایک ایسا آدمی دے سکتا ہے جس کو سب کی بھلائی منظور ہو، اور جو یہ چاہتا ہو کہ اس کی قوم اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھ جائے۔ یاد رکھو جنرل ایوب خاں نے یہ کام ایسا عجیب و غریب کیا ہے کہ نہ صرف اس ملک کے لوگوں کی آنکھیں کھل گئی ہیں بلکہ پوری دنیا کے دانشمند اور ہر ملک کے اخبارات پکار پکار کر ان کی نیک نیتی، ایمانداری اور عقلمندی کی تعریف کر رہے ہیں۔ آج تک ہزاروں فوجی حاکم گزرے ہیں۔ مگر کسی نے اپنی طاقت کو اپنی قوم میں بانٹ دینے کا ارادہ بھی نہیں کیا تھا۔ جنرل ایوب خاں اگر چاہتے تو تنہا فوج اور



سول افسروں کے ذریعے کام چلاتے جاتے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا وہ ایک سچے اور وعدے کے پکے آدمی ثابت ہوئے ہیں۔ انہوں نے مارشل لا لگاتے ہی جو وعدہ کیا تھا اسے اس سے بھی زیادہ بہتر طریقے پر پورا کر دکھایا ہے جس کی توقع ان سے کی جاتی تھی۔ انہوں نے بنیادی جمہوریتوں کے نام سے ایک بے نظیر اسکیم بنا دی ہے۔ اس میں آپ ہی کا فائدہ ہے۔ آپ خود سوچئے کہ ایک اکیلا تھانیدار، ایک اکیلا پٹواری، ایک اکیلا ڈپٹی کمشنر حکومت کرتا اچھا لگتا ہے یا وہ دس دس بیس بیس آدمیوں کے مشورے سے جو کام کرے گا وہ زیادہ مفید ہوگا۔ اس طرح تھانیدار یا تحصیلدار یا ڈپٹی کمشنر آپ کے حاکم نہیں رہیں گے بلکہ آپ کے ساتھی اور افسران اجلاس کی طرح کام کریں گے۔ مجھے یہ کونسلیں صاف طور پر کام کرتی نظر آ رہی ہیں، ان میں بحثیں ہوں گی کبھی کبھی کج بحثیاں اور فضول باتیں بھی ہوں گی مگر یہ سب کچھ ضروری ہے پہلے ایک دوسرے کو سمجھنے میں مشکل ہوتی ہے مگر پھر مل کر کام کرنے کی عادت ہو جاتی ہے اس میں اور بہت کچھ ہوگا۔ ممکن ہے کچھ برے لوگ پھر اپنے اثر رسوخ سے ان کونسلوں میں آ جائیں مگر کب تک چلیں گے۔ ان کی بے ایمانی بالکل آپ کی نظر کے سامنے ہوگی آپ اسے ثابت کر سکتے ہیں۔ آپ انہیں پکڑ سکتے ہیں۔ ہر ایک ہزار آدمیوں میں ایک آدمی کو پہچان لینا اور چن لینا بہت آسان ہے۔ اپنے گاؤں کی بات اپنے محلے کی بات اپنے گھر کی سی بات ہوتی ہے۔ اتنے تھوڑے آدمیوں میں ایک برادری کا سا رشتہ ہوتا ہے۔ یہاں آدمی چھپ کر نہیں رہ سکتا۔ اب یہ آپ صاحبوں کا کام ہے کہ جہاں تک ہو سکے سچے اور ایماندار آدمیوں کو چنیئے تاکہ اس بار پھر آپ ایک نئی الجھن میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ آپ کے امیدوار آدمی آپ کے اپنے علاقے کے ہوں گے۔ آپ ان کو جانتے پہچانتے ہوں گے، یہ ضلعوں سے گاؤں میں نہیں آئیں گے۔ کوٹھیوں سے محلوں پر نہیں اتریں گے یہ آپ کے آس پاس کے آدمی ہوں گے اب اگر آپ ان میں سے بھی کھوٹے کھرے کو نہ پہچان سکے تو پھر آپ کا خدا حافظ ہے۔

یاد رکھئے یہ پورے نظامِ حکومت میں ایک بڑی تبدیلی کی پہلی سیڑھی ہے۔ یہاں ٹھوکر نہ کھائیے گا۔ ابھی ملک کا دستور بننے والا ہے۔ دستور بنانے والے آپ کی جانچ پرکھ کے نتیجوں کو سامنے رکھیں گے اگر آپ نے اس بار بھی اپنے ووٹ بیچے، اگر آپ اس بار بھی ووٹ چاہنے والوں کے ایجنٹوں سے دھوکہ کھا گئے تو آپ دنیا بھر میں بدنام ہونے کے ساتھ ساتھ تباہی کی طرف چلے جائیں گے۔ میں حکومت کے خوف سے بے پرواہ ہو کر یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ اگر حکومت کا کوئی آدمی بھی آپ کو دھمکی دے تو اس کے خلاف کھڑے ہو جائیے اور کسی کے دباؤ میں نہ آئیے مجھے جنرل ایوب خاں کی ذات پر پورا اعتماد ہے اور مجھے یقین ہے کہ اگر کسی عہدے دار کے خلاف جانبداری کی سچی شکایت ان تک پہنچ گئی تو وہ اسے فوراً سخت سے سخت سزا دیں گے آپ کو نہ کسی قسم کا لالچ ہونا چاہئے نہ خوف۔ خوف لالچ سے بدتر ہے۔ اگر آپ کو ڈر ہو کہ کسی عہدے دار کی شکایت سے آپ کو نقصان پہنچے گا تو نقصان آپ ہی کا ہے، اس طرح ساری عمر آپ کی شکایت دور نہیں ہوگی آخر کبھی تو آپ کو بے خوفی سے بھی کوئی بات کرنی ہے۔ یوں مجھے اطمینان ہے کہ انتخابات میں کسی قسم کی مداخلت نہ ہو پھر بھی اچھے آدمی چننے کی ذمہ داری آپ کی ہے۔

آخر میں میں ایک اور بات سے خبردار کرنا چاہتا ہوں جن بے ایمان اور غدار سیاست دانوں کو نئے قانون کے ماتحت کالی فہرست میں رکھا جا رہا ہے وہ ان کونسلوں اور پنچایتوں کے خلاف طرح طرح کی افواہیں پھیلائیں گے اور پھیلا رہے ہیں گے۔ آخر ان کی حکومت چھینی گئی ہے۔ ان کے جرموں کے پردے چاک کئے گئے ہیں، ان کی نفع خوری ختم ہو گئی ہے اجارہ داریاں ٹوٹ گئی ہیں، ان جیسے ان کے بہت سے ساتھی ہیں، وہ خود بھی چاہیں گے کہ بنیادی جمہوریتیں چلنے نہ پائیں اور ان کے ہمدرد بھی یہی چاہیں گے۔ اس کے لئے وہ ہزاروں ترکیبیں کریں گے، ان سے ہوشیار رہنا چاہئے۔

اسی کے ساتھ ساتھ میں اَن پڑھے لکھے لوگوں سے بھی ایک بات کہوں گا۔ مانا کہ آپ نے مغربی تعلیم حاصل کی ہے اور آپ لوگوں میں سوچنے سمجھنے کا مادہ ہے لیکن خدارا اس مرتبہ آزاد



قوموں کی طرح سوچیئے، سوچیئے کہ یہ کتنا بڑا کام ہے کہ حکومت کی بنیادیں گاؤں اور محلّے میں رکھی جا رہی ہیں۔ یہ بنیادیں کتنی گہری کتنی مضبوط اور کتنی چوڑی ہیں؟ ان پر جو عمارت قائم ہوگی وہ کتنی شاندار اور عظیم ہوگی۔ آپ کا فرض ہے کہ اس عمارت کی تعمیر میں ہاتھ بٹائیں اور زبانی، تحریری اور عملی طور پر اس مہم میں حصہ لیں۔ یہ مہم عوام کے لئے ہے ایک آدمی یا چند آدمیوں کے لئے نہیں۔ ہمیں اپنی نیتیں صاف رکھنی چاہئیں۔ ہمیں اپنے ارادے مضبوط اور اپنے حوصلے بلند رکھنے ہیں۔ اس مہم کے پیچھے سچائی اور دیانتداری ہے۔ ایک آدمی نے صاف صاف ایک بات کی ہے۔ آیئے اسی جیسی سچائی سے اس کا جواب دیں۔ اس میں پیچیدگیاں نہ پھیلائیں بلکہ کام کریں اور کام کئے جائیں یہاں تک کہ عوام کو اعلیٰ درجے کے چناؤ کا پورا تجربہ ہو جائے۔ اعلیٰ درجے کے کام کرنے کی تربیت ہو جائے۔ یہ ایک بہت بڑا کام ہے ایک بہت بڑا انقلاب ہے۔ انقلاب آسانی سے نہیں آتا اس کے لئے بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔ اور ایمانداری کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے۔

میں ہر ایک سے ہر طریقے سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس مہم میں حصہ لے۔ میں افسروں، تاجروں، امیروں، غریبوں، ادیبوں، شاعروں، فنکاروں، دانشوروں، مزدوروں، کسانوں سب سے اپیل کرتا ہوں کہ جس طرح انہوں نے پاکستان قائم کرنے کے لئے آپس کے سب اختلافات بھلا کر اپنے دن رات ایک کر دئے تھے اسی طرح بنیادی جمہوریتوں کو کامیاب بنانے کے لئے جان کی بازی لگا دیں۔ میں خاص طور پر ادیبوں، دانشوروں اور صحافیوں کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اس موقع کی اہمیت سمجھیں اور کام پر لگ جائیں۔ ان پر بہت سے فرائض عائد ہوتے ہیں وہ قوم کے ذہن کو بنا اور بگاڑ سکتے ہیں۔ ہمیں اس موقع پر بہت بڑی ذمہ داری سنبھالنی ہے۔ آزاد ملکوں میں تو یہ تک ہوا ہے کہ ادیبوں اور صحافیوں نے خانہ جنگیوں تک میں عملی حصہ لیا ہے۔ یہ موقع خالص ادب اور اشتہاری ادب پر بحث کا نہیں ہے کوئی اچھا جذبہ یا کوئی اچھا کام کسی کو غزل کہنے یا افسانہ لکھنے سے نہیں روکتا۔ لیکن چونکہ تمام اچھا ادب عام انسانوں کی مسرت اور اعلیٰ مقاصد تک پہنچنے کے لئے ہوتا ہے اسلئے آپ لوگوں پر فرض ہے کہ خالص ادب پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ عام خوشحالی کے لئے بھی کام کریں۔ قدرت نے آپ کو اچھے دماغ اور تیز قلم دئے ہیں، آپ کو چاہیئے کہ عوام اور خواص کو ان کی ذمہ داریاں پُراثر لفظوں میں بتائیں تاکہ آپ کا خلوص دوسروں کے دلوں تک پہنچے اور آپ کے خیالات کے خزانے سے سب فائدہ اُٹھائیں۔



آخر میں مجھے اتنا اور کہنا ہے کہ آج میرے دل و دماغ پر ایک عجیب کیفیت چھائی ہوئی ہے آج میں ایک گھنے تناور درخت کی جڑیں پیدا ہوتا دیکھ رہا ہوں اور مجھے خوشی ہے کہ میں ایک ایسے نیک اور عظیم کام میں شریک ہو گیا ہوں جس کی آرزو میں میرے بہت سے پیارے ساتھی رخصت ہو چکے ہیں۔



”نالوں کا جواب آخر!“

شاہد احمد دہلوی

انگریزی کی جمہوریت کے بارے میں اقبالؔ نے کہا تھا کہ اس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے۔ اور انگریز نے یہی جمہوریت، ہم پر لاد دی سو سال کے انگریزی راج نے ہمیں بہت سی ایسی چیزیں دیں جنہوں نے ہمیں ایسی دنیا میں پہنچا دیا جو ہماری اپنی دنیا سے بالکل الگ تھی، اور اس طرح ہمارے ذہن و دماغ میں الجھنیں اور پیچ پیدا ہو گئے۔ اور کچھ ہماری حالت ایسی ہو گئی کہ نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے۔ سوچتے تھے ہم انگریز کی طرح اور رہتے تھے ہم اپنے دیس میں۔ اپنے ہمیں غیر سمجھتے تھے اور غیروں کے لئے تو ہم تھے ہی غیر۔ بات یہ ہے کہ جو جمہوریت آج ہم انگریز کے ہاں دیکھتے ہیں وہ اس طرح پیدا نہیں ہوئی کہ ایک روز قانون بنا اور دوسرے دن جمہوریت ہو گئی۔ بلکہ آج کی جمہوریت کی ایک تاریخ ہے۔ کئی سو سال میں جا کر انگریز نے اسے سیکھا ہے اور آج وہ بھی اس سے بددل ہے۔ ہماری مشکل یہ ہے کہ ہمیں جمہوریت قانون کے ذریعہ ملی۔ ہم اس کے لئے تیار نہیں تھے۔ انگریز اپنی حکومت پر آزادی کا پردہ ڈالنا چاہتا تھا۔ اس نے یہ ڈھونگ رچایا اور اگر پاکستان سے پہلے کی پچاس سال کی تاریخ دیکھئے تو یہ حقیقت کھل جاتی ہے کہ انگریز انتخاب کے پردے میں ایک خاص طبقہ کی سرپرستی کرتا رہا اور وہ لوگ انگریز کے اشاروں پر ناچنے والے تھے۔ پھر بھی اس نے اسمبلیوں کو پوری آزادی نہیں دی تھی کیوں کہ اسے اپنی حکومت کے جانے کا خطرہ تھا۔ سنہ ۳۵ء میں پہلی مرتبہ اسمبلیوں اور عوام میں رشتہ ہوا اور اس میں پہلی مرتبہ عوام کے نمائندوں کو اسمبلیوں میں جانے کا موقع ملا۔ لیکن ہر اسمبلی چاہے صوبہ کی ہو یا مرکز کی صرف بات چیت کرنے کی جگہ تھی۔ اور اس طرح ہمارے ہاں ایک طبقہ ایسا پیدا ہوا جو عمل سے دور ہوتا گیا۔ یہی انگریز کی جیت تھی۔ آزادی کے بعد ہمارے لئے صرف دو راستے تھے۔ یا تو اس بوجھ کو اتار پھینکیں یا اسے اٹھالیں۔ اگر بوجھ اتار پھینکتے تو دوسرا کوئی راستہ سامنے نہیں تھا۔ اس لئے ہمیں مجبوراً بوجھ اٹھانا پڑا اور وہی طبقہ جو انگریز کے زمانہ میں اسمبلیوں پر چھایا ہوا تھا ہمارے ہاں کی اسمبلیوں پر بھی چھا گیا۔ اس کی عادتیں نہیں بدلی تھیں، تقریر کرنے اور جھوٹ کو سچ کر دکھانے میں یہ ماہر تھا اور اپنی کرسی کو ذاتی فائدہ حاصل کرنے کے لئے استعمال کرنا اس کا شیوہ تھا اور اس کے نتیجہ میں ہمیں وہ تماشا دیکھنا پڑا جو خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ سیاسی پارٹیاں بنیں۔ ووٹ پڑے نمائندے چنے گئے۔ جوڑ توڑ ہوئے، وزارتیں بنیں اور ٹوٹیں اور ہر وزیر نے موقع کو غنیمت جان کر فائدہ اٹھایا۔ یہ سچ ہے کہ ان میں سب ایسے نہیں تھے لیکن یہ ضرور ہے کہ جو ایسے نہ تھے وہ انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے اور جو ایسے تھے وہ بے شمار اور پھر کرسیوں کے کھیل میں ملک کا بُرا حال ہو گیا۔ شیشوں کی دیواروں کے پیچھے یہ کھیل ہو رہا تھا اور عوام کو اس کی خبر نہیں تھی جو کھیل میں شریک تھے وہ عوام کے نمائندے تھے اور عوام سے ان کو کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آٹھ کروڑ انسانوں کی جانیں تین سو آدمیوں کے ہاتھ میں آگئی ہیں اور ان تین سو کی جانیں تیس آدمیوں کے ہاتھوں میں ہیں اور وہ تیس آدمی ایک آدمی کے اشارہ پہ ناچ رہے ہیں اور وہ آدمی دوسرے آدمیوں کے حکم کا تابع ہے اور وہ، نہ دوسرے آدمی، اس ملک اور قوم کے ہمدرد نہیں۔ اور اسی لئے سنہ ۴۷ء سے لے کر سنہ ۵۸ء تک ہر میدان میں ہم ذلیل گئے۔ مونچھوں والے جرم کرتے رہے اور داڑھی والے پکڑے جاتے رہے۔ قصور گنے چنے آدمیوں کا تھا اور سزا پورے ملک کو بھگتنی پڑی۔ خزانے خالی ہو گئے۔ ساکھ ختم ہو گئی۔ عزت جاتی رہی۔ دوسروں نے ہمارا مضحکہ اڑایا اور ہم بے چارے عوام خراب حالات اور اس سے بھی بڑھ کر





روحانی عذاب کا نشانہ بن گئے۔ پھر خدا نے ہماری فریاد سنی اور ۷ اکتوبر کو نئی صبح چمکی۔ اندھیرے چھٹ گئے۔ چونکہ پچھلے نو سال میں بڑے دعوے کئے گئے تھے نئے نئے منصوبے بنے تھے زوردار تقریریں ہوئی تھیں اور نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلا تھا عوام ان دعودں سے گھبرا چکے تھے۔ منصوبوں سے بیزار تھے اور تقریروں کو تفریح کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ وہ دل سے حالات کی تبدیلی چاہتے تھے اور انقلاب کا انھوں نے اسی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ لیکن وہ آس لگاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ وہ بے یقینی کے مریض تھے، مایوسی ان کی فطرت بن گئی تھی۔ نئی حکومت کو بھی انھوں نے اسی شک و شبہ سے دیکھا مگر رفتہ رفتہ ان کے دل کو یقین آتا گیا۔ نئی حکومت جو کہتی رہی کرتی رہی اور اس لئے آج تک کوئی ایسی بات نہیں کہی جو کی نہ ہو۔ نئی حکومت کو بنے ہوئے صرف ایک سال ہوا ہے اور اس ایک سال میں مہاجروں کی جھونپڑیوں کی جگہ پکے مکان نظر آتے ہیں، کاشتکار زمین کے مالک ہیں خزانے بھرپور ہیں ساکھ قائم ہوگئی ہے۔ دوسرے ملکوں میں ہمارا مذاق نہیں اڑایا جاتا۔ ہماری عزت کی جاتی ہے قانون کو عوام کے لئے زیادہ کارآمد بنا دیا گیا ہے۔ حکومت کی مشینری سے نااہلوں، بدکرداروں کو نکال دیا گیا ہے۔ اس کے کام کو تیز کرنے کا طریقہ رائج کر دیا گیا ہے۔ ذخیرہ اندوزی، چور بازاری اور اسمگلنگ کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ آخر یہ سب کچھ پچھلے نو سال میں کیوں نہیں ہوا تھا ایک سال میں کیسے ہوگیا؟ پچھلے نو سال میں ہم نے اپنے نمائندے حکومت کرنے بھیجے تھے ہم نے اپنا ووٹ کا حق استعمال کیا تھا کہ اسمبلیوں میں جاکر وہ بے کار ہو گئے اپنے وعدوں سے پھر گئے یا وہ ہمارے نمائندے نہیں تھے۔

یہ ایسے سوال ہیں جن کے جواب کے لئے ہمیں انگریزی جمہوریت کو پرکھنا پڑے گا۔ ہمیں اس جمہوریت سے کوئی واسطہ نہیں جو انگریز کے ملک میں رائج ہے۔ لیکن جو جمہوریت کی شکل اس نے ہمیں سونپی تھی اس میں سیاسی پارٹیاں انتخابات میں حصہ لیتی تھیں اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ چار حلقوں میں انتخاب کیا جائیگا۔ اور ان چار حلقوں میں بیس ہزار ووٹ ہیں اور چار سیاسی پارٹیاں انتخابات میں حصہ لے رہی ہیں تو ان کی صورت کچھ اس طرح بنتی ہے:

	حلقہ نمبر ۱ کل ووٹ ۵ ہزار	حلقہ نمبر ۲ کل ووٹ ۵ ہزار	حلقہ نمبر ۳ کل ووٹ ۵ ہزار	حلقہ نمبر ۴ کل ووٹ ۵ ہزار
سیاسی پارٹی نمبر ۱	نمبر ۱ ۱۸۶۰ ووٹ	نمبر ۱ ۵۰۰ ووٹ	نمبر ۱ ۱۰۰۰ ووٹ	نمبر ۱ ۱۲۰۰ ووٹ
سیاسی پارٹی نمبر ۲	نمبر ۲ ۱۴۰۰ ووٹ	نمبر ۲ ۲۰۰۰ ووٹ	نمبر ۲ ۱۸۰۰ ووٹ	نمبر ۲ ۴۰۰ ووٹ
سیاسی پارٹی نمبر ۳	نمبر ۳ ۱۲۴۰ ووٹ	نمبر ۳ ۱۵۰۰ ووٹ	نمبر ۳ ۲۰۰۰ ووٹ	نمبر ۳ ۸۰۰ ووٹ
سیاسی پارٹی نمبر ۴	نمبر ۴ ۵۰۰ ووٹ	نمبر ۴ ۱۰۰۰ ووٹ	نمبر ۴ ۲۰۰ ووٹ	نمبر ۴ ۲۶۰۰ ووٹ

اسی طرح اگر حلقہ نمبر ۱ سے سیاسی پارٹی نمبر ۱ کا نمائندہ آئے اور حلقہ نمبر ۲ سے نمبر ۲ کا، نمبر ۳ سے نمبر ۳ کا اور چار سے نمبر ۴ کا تو ان کو ملاکر کل ووٹ ۸۴۶۰ ملے۔

اور ۱۱۵۴۰ اُن کے خلاف پڑے جس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ چار آدمی جو منتخب ہوکر اسمبلی میں پہنچے یہ اکثریت کے نمائندے نہیں۔



پھر انتخابات میں جو طریقے استعمال کئے جاتے ہیں ان کو تو چھوڑیئے۔ سب سے بڑی بات جو ہمارے ملک میں ہے وہ یہ ہے کہ عوام کی اکثریت اپنے حقوق نہیں جانتی وہ ووٹ دینے اور نمائندے چننے کو کوئی اہمیت نہیں دیتی اس میں جہالت کو اتنا دخل نہیں جتنا اس بات کو دخل ہے کہ جمہوریت کے لئے ان کی تربیت نہیں ہوئی۔ انھوں نے جمہوریت کی منزلیں طے نہیں کیں۔ ان پر یہ لادی گئی ہے۔

آیئے اب ذرا اپنے ملک کے حالات کو دیکھیں۔ ہمارے ہاں پچاسی فیصد



آبادی تعلیم سے محروم ہے۔ ان پر پرانے جاگیرداری نظام کا گہرا اثر ہے۔ اس پندرہ فیصد آبادی میں سے جو پڑھے لکھے ہیں صرف تین فیصد وہ لوگ ہیں جو تجارت، صنعت میں اور عہدوں پر قابض ہیں اور باقی بارہ فیصد ان کے اثر میں ہیں۔ اس لئے جب بھی پرانے طریقہ پر انتخاب ہوتے تھے صرف تین فی صد آبادی کے لوگ اس میں کامیاب ہوتے تھے اور اسی لئے جنھیں ہم اپنا نمائندہ سمجھتے تھے وہ اصل میں تین فیصد آبادی کے نمائندے ہوتے تھے انہی کے لئے کام کرتے تھے اور انہی کا فائدہ سوچتے تھے پھر ان کی آپس میں رقابتیں چلتی تھیں تجارت کے مالک عہدوں اور زمین کے جاگیرداروں کے مخالف تھے صنعت کے قابض باقی تینوں کے دشمن تھے اور عہدوں کے والی باقی سب کے۔ اس طرح آپس میں کرسیوں کا کھیل ہو رہا تھا۔ اور ہم اُن کی طبقاتی رقابتوں کی چکی میں پس رہے تھے۔ یہ تھی وہ جمہوریت اور اس سے پیدا ہونے والے حالات۔ دنیا کے دوسرے ملکوں نے ہم سے بہت پہلے اسے خیرباد کہدیا تھا۔ اٹلی نے اسے ملک بدر کردیا تھا۔ روس نے اسے دیس نکالا دیدیا تھا مصر نے اسے ختم کردیا۔ سپین میں وہ مرگئی۔ انڈونیشیا نے اُسے بھلادیا۔ اس لئے نہیں کہ وہاں کی اکثریت جاہل تھی۔ بلکہ اس لئے کہ بنیادی طور پر یہ ناقص ہے۔ انگلستان میں یہ موجود ہے مگر کچھ برس پہلے کے انتخابات نے اس کا بھرم بھی کھول دیا ہے۔ اس میں لیبر پارٹی کو زیادہ ووٹ ملے تھے مگر کنزرویٹو پارٹی کی حکومت قائم ہوئی تھی کیونکہ اس نے ۶۰ نشستیں زیادہ حاصل کی تھیں۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ اقلیت کی اکثریت پر حکومت ہے اور جمہوریت کا بنیادی نظریہ "اکثریت کی حکومت" ختم ہوگیا۔

انہی تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے صدر ایوب خاں نے کہا تھا کہ "ہم ایسی جمہوریت قائم کریں گے جسے عوام سمجھ سکیں اور چلا سکیں"۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسی جمہوریت کونسی ہوسکتی ہے جسے عوام سمجھ سکیں۔ ہمارے ملک کی بیشتر آبادی دیہاتوں میں آباد ہے۔ ہمارے ہاں رسل و رسائل کے ذرائع محدود ہیں۔ ریڈیو اور اخبار کی آسانیاں سب کو حاصل نہیں اس لئے ہمارے عوام شہری زندگی سے ناواقف ہیں انھیں صحیح طور پر سیاسی تبدیلیوں کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے وہ ہر چیز کو دور کی بات سمجھتے ہیں اور ذمہ داری محسوس نہیں کرتے۔ عوام صرف وہ چیز سمجھتے ہیں جس کا ان سے تعلق ہو۔ اس لئے اگر انھیں جمہوریت سے واقف کرانا ہے تو ان کا جمہوریت سے تعلق پیدا کرنا ہوگا اور ایسی ہی جمہوریت کو وہ چلا سکتے ہیں ہمارے عوام شہروں سے دور ہیں۔ اس لئے جمہوریت کو گاؤں میں لے جایئے۔ اس کے بہت سے فائدے ہیں سب سے بڑا یہ ہے کہ عوام کو اپنے نمائندے منتخب کرنے میں آسانی ہوگی۔ وہ ہر اُس شخص سے اچھی طرح واقف ہوں گے جو انتخابات میں حصہ لے گا اور زرعی اصلاحات کے بعد ان پر بیرونی اثرات بھی نہیں ہوں گے جو اُن کی رائے کو مسخ کرسکیں اس لئے کونسل میں وہی لوگ آئیں گے جو واقعی اس کے اہل ہوں گے، جو لوگوں کے ہمدرد ہوں گے اور ان کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کریں گے۔

آیئے اب ذرا دیکھیں کہ بنیادی جمہوریت کس طرح کام کرے گی۔

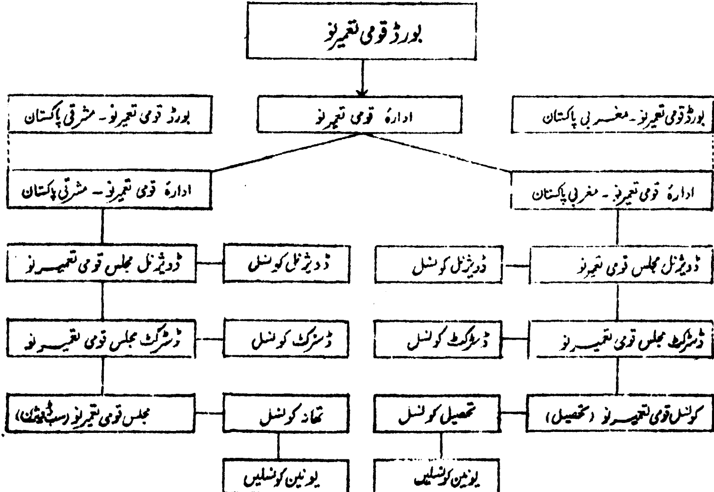
پہلی بات تو یہ ہے کہ ہر بالغ، باہوش کو ووٹ دینے کا حق ہوگا اور ہر ایک کو انتخابات میں حصہ لینے کی آزادی ہوگی۔ اس یونین کونسل میں ایک ہزار سے پندرہ سو تک آبادی کے لئے ایک نمائندہ ہوگا۔ اور کونسل میں ایسے دس نمائندے ہوں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کبھی یہ کونسل دس گاؤں کی آبادی کے لئے ہوگی اور یہ بھی ممکن ہے کہ چالیس گاؤں کی ایک کونسل ہو یعنی رقبہ اہم نہیں، آبادی اہم ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ حکومت علاقوں کے اوپر زور نہیں دینا چاہتی۔ پچھلی حکومتوں کا زور علاقوں پر اس لئے ہوتا تھا کہ زمیندار اپنے رسوخ اور اثر کو زیادہ سے زیادہ استعمال کرسکیں۔ اب زور آبادی پر ہے، انسانوں پر ہے۔ کیونکہ مشکلیں انسانوں کو پیش آتی ہیں۔ وہی اپنی مشکلیں سمجھ سکتے ہیں اور وہی اپنے حل تلاش کرسکتے ہیں۔ پھر یہ کہ ایک ہزار سے پندرہ سو



تک کی آبادی میں ہر شخص ایک دوسرے سے واقف ہوتا ہے سب کی برائیاں اور اچھائیاں ایک دوسرے پر ظاہر ہوتی ہیں۔ اس لئے مختصر آبادی کو صحیح فیصلہ کرنے کی آسانی ہے اور اس طرح مفید اور بے لوث آدمیوں کا نمائندہ بننا ممکن ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ یونین کونسل میں بہتر لوگ نمائندے بن کر آئیں گے۔ پھر اس کے علاوہ دس نمائندوں کے ساتھ پانچ نامزد ہوں گے۔ جن کی تعداد نمائندوں سے آدھی ہے اس لئے کونسل کی نمائندہ حیثیت قائم رہتی ہے۔ ان پندرہ ممبروں میں سے ایک صدر اور ایک نائب صدر چنا جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ وہ صدر اور نائب صدر عوام کے اعتماد کے آدمی ہوں گے۔ یہ کونسل اپنے حلقہ کو ترقی دینے اور بہتر بنانے کا کام کرے گی۔ سڑکیں بنائے گی، اسکول تعمیر کرے گی، نظم و ضبط قائم رکھے گی۔ اور چھوٹے موٹے دیوانی اور فوجداری مقدمات کا فیصلہ کرے گی اور اپنے خرچ کے لئے ٹیکس وصول کرے گی اور اسی کے نمائندے تھانہ، تحصیل، کونسل کے انتظام میں مدد کریں گے۔ اور اس طرح جمہوریت جڑوں سے شروع ہو کر درخت کی آخری شاخ تک پہنچے گی اور اس ملک میں پہلی مرتبہ نیچے سے بڑھ کر اوپر تک کوئی چیز آئے گی ورنہ ہمیشہ یہ ہوتا رہا ہے کہ اوپر سے ہر چیز تھوپی گئی ہے۔ اور پہلی مرتبہ عوام میں یہ شعور پیدا ہوگا کہ یہ ملک ان کا اپنا ہے، اس کے چلانے کی ذمہ داری ان کی ہے، اس کو بہتر بنانا ان کا فرض ہے اور اس کو ترقی دینا ان کا مقصد ہے۔ عوام کو آج تک اس ملک پر کوئی حق نہیں تھا۔ اس کی کوئی ذمہ داری ان کی نہیں تھی۔ اور آزادی ملنے کے باوجود، انھوں نے کبھی آزادی کا سانس نہیں لیا تھا۔ اب پہلی مرتبہ سورج نکلا ہے پہلی بار ان کی آنکھیں کھل رہی ہیں اور ان کی نظروں میں آس پاس کی چیزیں صاف ہوئی ہیں۔ ایک نئے دور اور ایک روشن مستقبل کا آغاز ہے۔ ہم پاکستانی اسے خوش آمدید کہتے ہیں ●



قومی تعمیر نو کا سلسلۂ کار



ٹرے باز خاں سے نیک محمد تک

ابنِ انشا

یونان کی کہانیوں میں ایک پہلوان کا نام آتا ہے جس کی طاقت کا بھید بس اتنا تھا کہ دھرتی کو نہیں چھوڑتا تھا جب تک اس کے پاؤں دھرتی کو چھوتے رہیں، دنیا کی کوئی طاقت اس کو ہرا نہیں سکتی تھی۔ دشمن نے اس کو مارا، دھرتی سے اس کے پاؤں اکھاڑ کر ــــ دھرتی سے جدا کر کے۔ یہی حال میں اپنا سمجھتا ہوں، عام لوگوں کا بھی۔ لکھنے والوں کا بھی۔ شعر و شاعری میں میں خود چاند تک پہنچا ہوں بلکہ آجکل جو راکٹ اس کا چکر لگا رہے ہیں، اکثر ان سے بھی آگے نکل گیا ہوں لیکن عام زندگی میں میں نے زمین کو نہیں چھوڑا۔ اس کی مٹی کی سوندھی باس مجھے نفیس سے نفیس عطر سے زیادہ عزیز رہی ہے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ ہو کہ میں گاؤں میں بڑھا پلا۔ ایک کسان کا بیٹا ہوں۔ خود کھیت میں کام کرتا رہا ہوں۔ قسمت اچھی تھی، پڑھ لکھ گیا بلکہ سولہ جماعتیں شاندار طریقے پر پاس کر گیا لیکن اب بھی افلاطون کے فلسفے کی نسبت زیادہ دلچسپی مجھے اس سے ہے کہ میرے گاؤں کے لوگ کس حال میں ہیں۔ وہاں جو سڑک بن رہی تھی کہاں تک پہنچی ہے۔ بنجر اور ریتلی زمین قابلِ کاشت بنی کہ نہیں۔ گاؤں کے بعد اپنے علاقے اور اپنے ملک کے متعلق یہی بات سوچتا ہوں۔ تب کہیں باہر کا، ایران توران کا ذکر آتا ہے۔ چاند اور مریخ تو بہت دور ہے۔

پھر میرا سوچنے اور بات کرنے کا انداز بھی سیدھا سادا ہے۔ اگر کوئی شخص آکر لمبی چوڑی پیچ دار بات کہے یا خوبصورت لفظوں کے طوطا مینا بنائے تو میں فوراً ٹوک دیتا ہوں: "بھائی میری سمجھ میں نہیں آیا، تو کہنا کیا چاہتا ہے؟ صاف صاف کہہ۔" لوگ تھوڑی دیر کو مجھے سادہ لوح سمجھ لیتے ہیں لیکن اس میں میرا کیا جاتا ہے۔ دھوکے اور چھل، فریب کا امکان تو نہیں رہتا نا۔

یہ سب کچھ لکھنا اس لئے ضروری معلوم ہوا تاکہ آپ جان لیں اس مضمون کا لکھنے والا کس قسم کا آدمی ہے۔ میں زیادہ غیر جانب دار ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کرتا۔ مجھے محنت کر کے کھانے والوں اور ملک کی خوشحالی اور ترقی میں عملی حصہ لینے والوں سے زیادہ محبت ہے۔ بہ نسبت نکھٹو احدیوں، ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جانے والوں اور عیش کرنے والوں کے۔ کسی چیز کا برا بھلا پرکھنے کے معاملہ میں بھی میری یہی کسوٹی ہے۔ آپ نے انقلاب کا نام لیا تو میں یہی پوچھوں گا: کیا مطلب؟ یہ بات نہیں کہ مجھے اس لفظ کے معنی نہیں آتے۔ بہت آتے ہیں۔ لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ نظام بدلا ہے یا محض حکومت۔ اگر محض حکومت بدلی ہے تو مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ یوں بھی دس سال میں دس حکومتیں آتی ہیں۔ ہاں نظام بدلا ہے تو ایک بات ہے۔ پھر یہ بتاؤ اس سے فائدہ کس کو ہوا۔ اگر امیر لوگ اور امیر، اور غریب لوگ اور زیادہ غریب ہوتے ہیں تو اس انقلاب کو سلام۔ ادیب لوگ ویسے بھی تانا شاہ ہوتے ہیں، ناک پہ مکھی نہیں بیٹھنے دیتے۔ کسی چیز کو اچھا یا بہت اچھا کہہ دینے سے ان کی شان میلی ہونے کا ڈر رہتا ہے



لہٰذا مجھے بھی انقلاب نے رفتہ رفتہ منوایا۔ انقلاب کے اعلان کے دن آدھی خوشی ہوئی۔ چلو وہ لوگ ختم ہوئے جنہوں نے ملک کو تماشا بنا رکھا تھا اور تباہی کی طرف لئے جا رہے تھے۔ باقی آدھی کے لئے کچھ انتظار کرنا پڑا:

چور بازاری ختم ہوئی

مالِ ناجائز درآمد کرنے والے پکڑے گئے۔

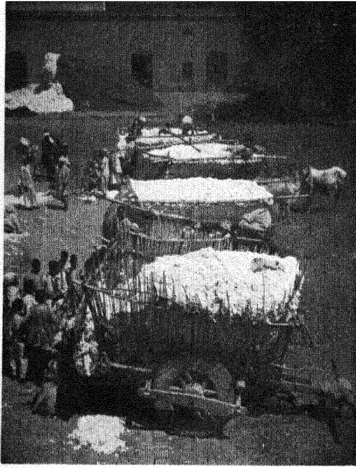
ٹیکس چوری، رشوت ستانی، بدعنوانی ختم!

خوب۔ بہت۔ بڑی اچھی باتیں تھیں لیکن انقلاب کا منصب اور مقصد ان سے کچھ اونچا تھا۔ اصل خوشی اسی وقت ہوئی جب زرعی اصلاحات کا اعلان ہوا، جاگیرداریاں ختم ہوگئیں۔ بڑی زمینداریاں چھوٹی رہ گئیں۔ بے زمین لوگوں کو، موروثی کاشتکاروں کو زمین کے مالک بننے کی خوش خبری ملی۔ یہ تھا انقلاب کا میٹھا پھل۔ خرابی کی جڑ پر کلہاڑا لگانا چاہیئے۔ پتّے چھانٹ دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کسی پھوڑے کا سارے جسم میں زہر پھیل رہا ہو تو نشتر لگانا ہی پڑتا ہے، آپریشن کرنا ہی پڑتا ہے۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ بغیر پھانسی گولی کے یہ سب کچھ ہوگیا۔ اب تو جو بوئے گا وہ کاٹے گا جس کے ہل بیل، اسی کی فصل۔ دیکھتے ہیں پھر جانبداری برت گیا۔ میرے سامنے میرا گاؤں رہا لیکن میرے گاؤں میں سارے پاکستان کی پچاسی فیصدی آبادی پھیلی ہوئی ہے۔ ان پچاسی میں شاید ایک فیصدی ہوں گے جو بہت اونچے ہیں۔ شاندار حویلیوں اور سینکڑوں مربعوں والے۔ میں ان کی نمائندگی نہیں کرتا نہ سہی، باقی چوراسی کی تو کرتا ہوں۔

اب جو بنیادی جمہوریتوں کا اعلان ہوا اور ایک صاحب اس کی خبر لے کر آئے تو میں نے حسب معمول سادگی سے پوچھا: جمہوریت؟ کیسی جمہوریت؟ وہ حیران رہ گئے کہ یہ شخص بظاہر پڑھا لکھا معلوم ہوتا ہے اور ایسے سوال کر رہا ہے۔ میں نے کہا: "بھائی! میں لفظی معنی نہیں پوچھ رہا۔ یہ جاننا چاہتا ہوں اس کا عملی روپ کیا ہوگا۔ لوگوں کی نمائندگی کیسے ہوگی۔ ان کی آواز کہاں تک سنی جائے گی۔ کہیں یہ وہ طرے باز خاں والی جمہوریت تو دالیں نہیں آرہی جو ابھی پچھلے سال ختم ہوئی ہے۔" کہنے لگے: "طرے باز خاں کون؟" میں نے بتایا کہ وہ ہمارے علاقے سے اسمبلی کے ممبر تھے۔ نام تو کچھ اور تھا لیکن ان کا طرہ کہ بھرا اونچا ہوتا تھا، سارے ممبروں کے طرے اس کے سامنے ہیچ تھے لہٰذا ان کا یہ نام پڑ گیا تھا بلکہ ہمارے علاقے کے بعض لوگ اس امر پر فخر بھی کیا کرتے تھے۔ کہنے لگے: "آپ کو ان کے طرے سے کیا شکایت تھی بھائی؟" میں نے کہا: "طرے سے نہیں تھی کیونکہ وہ تو میں بھی خوب سا کلف لگا کر بلند کیا کرتا تھا اور کسی شادی میں جاؤں تو اب بھی اسی سج دھج سے جاتا ہوں، مجھے تو ان کی ذات کے بعض پہلوؤں پر اور جس طریقے سے وہ ممبر منتخب ہوئے اس پر اعتراض تھا۔" کہنے لگے: "وہ کیا؟" میں نے کہا: "معلوم ہوتا ہے پوری کتھا سنانی پڑے گی۔ طرے باز خاں صاحب ہمارے نمائندے کہے اور سمجھے جاتے تھے لیکن ہمارا گاؤں بلکہ ارد گرد کے گاؤں بھی ہمیشہ ان کی شکل دیکھنے کو ترستے رہے۔ آخر آخر میں جو وہ نائب وزیر بنے ہیں تب ان کی تصویر اخبار میں ضرور دیکھی۔ الکشن کا حال یہ تھا کہ ایک میلہ سا لگ رہا تھا۔ موٹریں گاؤں گاؤں دوڑی پھر رہی تھیں کیمپ سے تھوڑی دور دیگیں چولھوں پر چڑھی ہوئی تھیں اور پلاؤ کی خوشبو ہوا میں پھیلی ہوئی تھی۔ پلاؤ تو مخالف امیدوار زباں دراز خاں نے بھی پکوایا تھا لیکن اس میں بوٹیاں کم تھیں۔"



میرے دوست بات کاٹ کر بولے: "یہ کیا نام ہوا زباں دراز خاں؟" میں نے کہا: "ایسے معاملوں میں اصل نام نہیں پوچھا کرتے۔ یہ ایک صاحب تھے بڑے ہی چرب زبان۔ جلسے میں تقریر کرتے تو معلوم ہوتا ان سے بڑا ہمدرد لوگوں کا کوئی نہیں ہوگا۔ بچارے عوام کے غم میں گھلتے گھلتے موٹے ہوگئے ہیں۔ لوگوں کی لیڈری کے پردے میں دنیا بھر کو لوٹا۔ اپنے بیٹے کو سڑک کی بسوں کا ٹھیکہ دلا دیا تھا۔ کچھ مربعے بھی اپنے حق میں زیادہ لے رکھے تھے۔ روز نئی پارٹی بدلتے تھے۔ طرہ باز خاں کے ساتھ برابر کی چوٹ تھی، بس قسمت سے رہ گئے۔ لیکن میں الکشن کا حال کہہ رہا تھا۔ ادھر طرہ باز خاں صاحب کے ایجنٹوں نے شہر سے ایک مولوی بلا کر جلسہ کر رکھا تھا، ادھر زباں دراز خاں صاحب خود تھے اور مزید دلچسپی کے لیے ضلع کے نامی گرامی بھانڈ اور نقلیے منگا کر لوگوں کی تفریح طبع کا



پاک جمہوریت

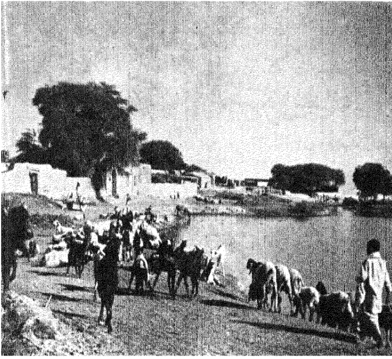
ہمارے ملک کی ۸۵ فیصد آبادی دیہات میں بسی ہوئی ہے۔
قومی تعمیر نو کے سلسلے میں بنیادی جمہوریتوں کا قیام
ایک حوصلہ مندانہ اقدام ہے۔ اس کے لئے دیہات سے کام
شروع کیا گیا ہے تاکہ ہمارے عوام ملک کی تعمیر کے
کاموں میں خود شریک ہو کر اپنی بہبود
کی راہیں پیدا کر سکیں







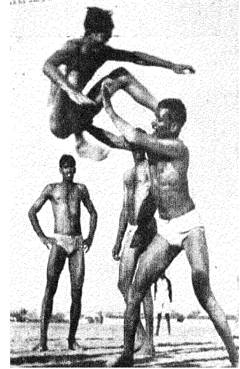








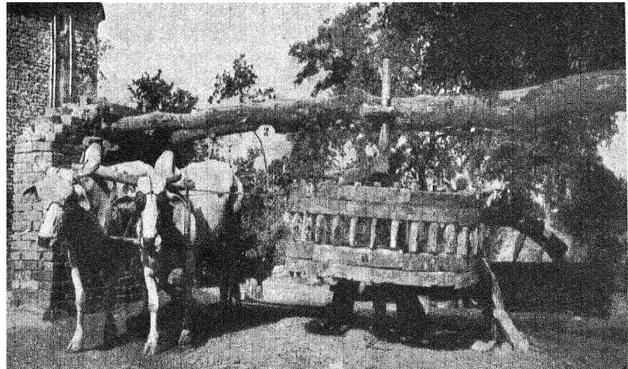




پاک جمہوریت

(۲)

یہ دیہات ہمارے ملک
کی آئندہ ترقی کی اساس
بن جائیں گے



سامان کر رکھا تھا۔ دیہات کے لوگ بچارے سادہ طبیعت کے ہوتے ہیں۔ دونوں امیدواروں کے چلتے پرزے لوگ پھرکی کی طرح یہاں وہاں گھوم رہے تھے۔ کسی سے رشتہ نکالا، کسی کو برادری کا واسطہ دیا، ایسے بھی ووٹر تھے جنہوں نے صرف یہ دیکھا کہ گھی کس کے پلاؤ میں زیادہ تھا۔ ایسے بھی تھے جو نوٹ دیکھ کر ووٹ دینے پر راضی ہوئے۔ خیر لاؤڈ اسپیکروں سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

"طرہ باز خاں کا نام یاد رکھنا۔ ان کے بکس پر طرے کا نشان ہے۔"

"آپ کا قیمتی ووٹ زبان دراز خاں صاحب کو ملنا چاہیئے۔ ان کے بکس پر گراموفون کا نشان دیکھ لیجئے۔"



خیر یہ چہل پہل، یہ موج میلہ ختم ہوا طرہ باز خاں ممبر بن گئے۔ اس سال یہ بڑی نہر بھی نکل رہی تھی۔ ہمارے گاؤں والے چاہتے تھے کہ اس کی ایک شاخ ہمارے ہاں بھی آئے اور جو زمینیں اس وقت بنجر پڑی ہیں، کام کی ہو جائیں۔ گاؤں کے پرائمری اسکول کو مڈل بنوانے کی ضرورت بھی محسوس ہو رہی تھی لہٰذا گاؤں والے وفد بنا کر خان صاحب کی تلاش میں نکلے۔ ہمارے چاچا جی بھی اس وفد میں تھے۔ بیس میل دور خاں صاحب کے گاؤں پہنچے تو معلوم ہوا وہ تو زیادہ تر شہر میں رہتے ہیں۔ فقط سال میں دو تین بار شکار کھیلنے آتے ہیں، خیر یہ وفد اگلے دن ریل کے ٹکٹ کٹا شہر پہنچا۔ کوٹھی پر بڑا سا پیتل کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ یہ لوگ دروازے پر ہی تھے کہ دو خاص الخاص پلے ہوئے کتوں نے استقبال کیا۔ بلکہ ایک تو خلوص کے مارے وفد کی ٹانگوں سے بھی لپٹ گیا۔ پہچان گیا ہوگا میرے آقا کے علاقے کے لوگ ہیں۔ ایک مالی نے رحم کھا کر چھڑایا۔ بہت دیر انتظار کیا۔ آخر خان صاحب کی لمبی چمکیلی موٹر آئی لیکن زن سے پھاٹک میں داخل ہو گئی۔ یہ لوگ کھڑے درخواست کا کاغذ ہلاتے رہ گئے۔ اندر پیغام بھجوایا تو جواب ملا "فرصت نہیں، یہ بھی کوئی ملنے کا وقت ہے۔"

ان صاحب نے پوچھا: "کیا کوئی اور اچھا امیدوار نہ تھا ان دونوں کے سوا؟"

میں نے کہا: "تھا کیوں نہیں، اپنے چودھری نیک محمد کو گاؤں کے لوگوں نے امیدوار کھڑا کیا تھا۔ تم جانتے ہو کتنے اچھے آدمی ہیں۔ علاقے کی خوشی اور غم میں شریک رہتے ہیں۔ ان کو جاننے والے ہزار دو ہزار آدمیوں نے انہیں ووٹ بھی دیئے۔ یعنی دو تین گاؤں جن کو ان کی خوبیوں کا علم تھا، ان کے پیچھے تھے۔ لیکن اتنا بڑا حلقہ تھا اور دوسرے دونوں امیدواروں نے لالچ اور دھونس، دونوں ہتھکنڈے استعمال کئے۔ یہ بچارے رہ گئے بلکہ ضمانت ضبط ہوتے بچی۔"

وہ صاحب بولے: "تو خوش خبری سن لو، اب کے چودھری نیک محمد کامیاب ہوں گے۔ ان کے دشمن ان کے آگے نہیں ٹھہر سکیں گے۔ بنیادی جمہوریتوں کا نظام ہی کچھ ایسا ہے۔ یونین کونسل سے بات شروع ہوتی ہے۔ ایک ہزار سے لیکر پندرہ سو تک کا حلقہ ایک آدمی چنے گا۔ کونسل میں دس آدمی ہوں گے۔ یوں سمجھو دس پندرہ ہزار کی آبادی یعنی چند گاؤں میں ایک کونسل۔ قصبوں اور شہروں میں بھی یہی حساب رہے گا۔ دس پندرہ ہزار آبادی کے قصبے میں ایک، بڑے شہروں میں زیادہ کونسلیں رہیں گی۔ اس سے اوپر تحصیل، ضلع، کمشنری وغیرہ کی کونسلیں ہوں گی۔ جن میں نیچے سے درجہ بدرجہ اوپر تک آدمی جائیں گے اور متعلقہ افسران کے مشوروں سے فائدہ اٹھائیں گے۔

یہ بنیادی جمہوریت ہے۔ یہ مکان اوپر تک جائے گا لہٰذا اس کی بنیادیں مضبوط ہونی چاہئیں۔ فارسی میں کہتے ہیں کہ اگر کوئی معمار دیوار کی پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھ دے تو دیوار آسمان تک ٹیڑھی ہی جائے گی (بشرطیکہ وہ آسمان تک پہنچ سکے) بنیاد مکان کے بننے سے پہلے ہی مضبوط ہو سکتی ہے بعد میں نہیں، جیسا دو تین سال ہوئے کراچی کے ایک ٹھیکدار نے کیا تھا۔ اس ٹھیکدار نے مہاجرین کے لئے کوارٹر بنائے۔ بن گئے تو معلوم ہوا، کفایت کے خیال سے اس نے نیو کھودی ہی نہیں بلکہ زمین سے اینٹوں کی چنائی شروع کر دی تھی۔ شکایت ہوئی تو اس نے کہا: "معاف فرمایئے گا بھول ہو گئی اب ٹھیک کئے دیتا ہوں۔" اس نے دیوار کے نیچے سے زمین کھود دی اور اس میں عمارتی مسالہ بھر دیا۔ لیجیے صاحب، بنیاد بن گئی۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ اس مرحلہ پر دیوار میں مضبوطی تو کیا آسکتی ہے، ان کا رہا سہا

زور بھی بکھر گیا ہوگا۔ خیر پرانے دور میں اسی طرح کی لیپا پوتی رہی لیکن اب یہ بات نہیں۔ نئی یونین کونسلیں اپنا کام تو خیر کریں گی ہی۔ سڑکوں، راستوں کا بنانا، گاؤں، محلے کی صحت، صفائی۔ روشنی کا انتظام، جرائم کی روک تھام۔ چھوٹے موٹے جھگڑوں کا فیصلہ جس کا اختیار قانون نے کونسلوں کو دیا ہو، وغیرہ۔ اس کے علاوہ یہ اعلیٰ سطح پر نمائندگی کے لئے تربیتی مرکزوں کا کام بھی دینگی۔ ایک ڈیڑھ ہزار کے حلقے میں لوگ سوچ سمجھ کر اچھا آدمی چنیں گے، اور وہ کام کرے گا۔ کیوں نہ کرے گا۔ اس کا اپنا بھلا اسی میں ہے، اس کا اپنا گھر اسی کونسل کے علاقہ میں ہے۔ یونین کونسل کا صدر اور تحصیل کی کونسل کا خود بخود ممبر بن جائے گا لہٰذا وہاں آواز پہنچے گی۔ وہاں سے ضلع کی کونسل کے لئے، کمشنری کی کونسل کیلئے راہ کھلی ہے۔ علاقہ کی ترقی پر جو بھی خرچ ہوگا اس کی منظوری میں اس کا دخل رہے گا اور وہ کہہ سکے گا کہ نہر میرے علاقے میں بھی آنی چاہیئے۔ میرے گاؤں کا پرائمری اسکول، مڈل اسکول بننا چاہیئے۔ طرہ باز خاں کا دور ختم ہوتا ہے، چودھری نیک محمد کا دور شروع ہوتا ہے۔ پیاسا کنوئیں کے پاس نہیں جائے گا۔ کنواں پیاسے کے پاس آگیا ہے۔ یہی جمہوریت کی اصل روح ہوتی ہے اپنی مدد آپ، اپنے فیصلے آپ، اپنی حکومت آپ



سازِ صد آہنگ

آغا صادق

آزادی اک بادل
اس بادل کو ہر کھیتی پر چھا جوں جل برسانے دو
آزادی اک پیڑ
پیڑ کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں ہم سب کو ستانے دو
آزادی اک نغمہ
اس نغمہ کی سُریلی دھن پر سب کو ساز بجانے دو
آزادی اک نور
اس کی جوت سے ہر بستی میں امن کے دیپ جلانے دو
آزادی آئینہ
آئینے میں سب کو اپنی بانکی چھب، دکھلانے دو
آزادی اک پھول
پھول کی بھینی بھینی مہک کو روش روش مہکانے دو
آزادی اک چشمہ
اس چشمے سے سب پیاسوں کو من کی پیاس بجھانے دو
آزادی پیمانہ
پیمانے سے ہر ساغر کو پورا حصہ پانے دو
آزادی اک خواب
خواب کو ایک حقیقت کا اب روپ دھار کر آنے دو

حقیقی جمہوریت — ایک نعمتِ عظمیٰ

ابو الجلال ندوی

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے زمانہ سے ۱۹۴۷ء تک مسلمانوں کا ایک گروہ برابر اس کوشش میں لگا رہا کہ ساری دنیا میں نہیں تو ہندوستان میں از سرِ نو اللہ اور رسولؐ کے آئین کو بالادستی حاصل ہو جائے۔ عوام نے اپنے خون کی قربانیاں دے کر، جان و مال اور عزت و آبرو بھینٹ چڑھا کر، اعزہ و اقارب اور وطن مالوف سے ناتا توڑ کر، اپنا سب کچھ کھو کر تحریکِ پاکستان کو کامیاب کر دیا لیکن صحیح نہج پر قائم ہونے کی بجائے خطۂ پاک میں دس گیارہ برس ایسی حکومتیں فرماں روا رہیں جنہوں نے بنیادی اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر عوام سے بے اعتنائی برتی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساری قوم مایوسی کا شکار ہو گئی لیکن ۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء اور اس کے بعد اس سے بھی زیادہ شدت سے ۲۷ اکتوبر کا آفتاب حضرت یعقوب بن کر پکار اٹھا کہ "اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوا کرتے مگر کافر لوگ۔" (یوسف ۸۷) دستِ غیب نے قومی مفاد کو ذاتی اغراض پر بھینٹ چڑھانے والے گروہ پر بالادست پر حملہ کیا اور ایک پُرامن و بے خون انقلاب سے آنِ واحد میں ملک کی کایا پلٹ دی۔ چنانچہ پاکستان کے ایک ایک شہر کے گلی کوچے پکار اٹھے کہ خود پرستوں کا دور گیا اور خدا پرستوں کا دور آیا۔ قوم نے سمتِ کعبہ کی طرف چلنے کے لئے احرام باندھ لیا۔ اب عنقریب بنیادی جمہوریتیں برسرِ کار آنے کو ہیں جو کچھ عرصہ بعد مرکزی مجلسِ شوریٰ کو چنیں گی اور از سرِ نو حق و انصاف کا بول بالا ہو گا۔ وذالک علی اللہ یسیرہ۔

لیکن ایسا ہمہ گیر انقلاب محض نیک خواہشوں سے انجام نہیں پایا کرتا۔ اس کے لئے انتہائی جدوجہد اور عزم و ارادہ کی ضرورت ہے۔ ہمارے قاید کتنے ہی پُر خلوص اور پیکرِ عزم و عمل کیوں نہ ہوں — اور فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں اور ان کے رفقائے کار سے زیادہ ان اوصاف کا مظہر اور کون ہو گا! — جب تک جمہور اپنے نیک ارادوں اور ذوقِ عمل سے تعمیری کاموں میں پورا پورا تعاون نہ کریں ہمارا کارواں کبھی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ اسلام کی حکومت پہلے افراد کے دل میں متمکن ہوتی ہے، پھر تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کے ذریعے معاشرہ پورے کا پورا اسلام کا محکوم بنتا ہے۔ اس کے بعد اولوالامر کو موقع مل سکتا ہے کہ وہ اسلامی آئین کو زندگی کے ہر شعبے میں نافذ کریں۔ حصولِ آزادی کے لئے ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۷ء تک جو کچھ کیا گیا اس سے زیادہ قوی جدوجہد کے بغیر ہم اپنے اعلیٰ مقاصد کے حصول سے معذور ہی رہیں گے۔ پہلے ہمارا مقابلہ اغیار سے تھا۔ اب ہمیں خود اپنے اندرونی نقائص کے خلاف جنگ کرنی ہے جو نسبتہً شدید تر ہے۔ اور اس کے لئے بعض بنیادی حقائق کا سمجھنا ضروری ہے تاکہ ہم انہیں شمع راہ بنائیں اور ملّی عروج و ترقی کے مدارج زود تر اور بوجوہ احسن طے کر لیں۔

اس سلسلہ میں اقوامِ کہن کی تاریخ، جیسی کہ قرآن مجید میں مذکور ہے، خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اگرچہ پرانی قوموں کے حالات قصہ ہائے پارینہ کی شکل اختیار کر چکے ہیں اور طبائع بالعموم ان کی فرسودگی سے گریز کرتی ہیں پھر بھی اربابِ نظر جانتے ہیں کہ یہ محض قصص و حکایات نہیں بلکہ ان کی تہہ میں زندگی کے حقائق اور اصلیتیں پنہاں ہیں۔ آیئے ہم ان پر ایک سرسری نظر ڈالیں۔

طوفانِ نوح اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ محض ثروت کو معیارِ فضیلت و سرداری قرار دینا تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ہے۔ اس طرح ایک بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے جو آج بھی ہمارے لئے وہی بنیادی حیثیت رکھتا ہے کہ مخدوم و مطاع ہونے کا حق صرف زرداروں ہی کو ہے۔ دیگر افراد اس کے حقدار نہیں۔ حقیقی جمہوریت میں یہی مناسب و لازم ہے کہ اس میں محض شرطِ زر نہ ہو بلکہ دوسری خوبیوں کو بھی ملحوظ رکھا جائے۔

زر پرستی کی طرح جباری بھی، جس نے ہمارے زمانہ میں ڈکٹیٹر شپ کے نام سے شہرت حاصل کی ہے، معاشرہ میں بنیادی خرابی کا باعث ہے۔ بنو عاد یا ہود اپنے ہر امراء و فرماں روا کو جبار دیکھنا چاہتے تھے جو دوسروں پر استبداد روا رکھے۔

ایک اور قوم۔ صالح یا ثمود۔ کا نظام حکومت ایک طرح کی جمہوریت تھا۔ معلوم نہیں اس کے اولوالامر خود بخود قوم کے رہنما بن گئے تھے یا لوگوں نے ان کا انتخاب کیا تھا، بہرحال ان کے "شہر میں نو سردار تھے جو زمین میں خرابی پھیلاتے تھے اور سدھارتے نہ تھے" (نمل ۴۸)۔ ثمود نے کہا "کیا ہم اپنے درمیان سے ایک واحد بشر کا اتباع کریں؟ ایسا کریں گے تو ہم گمراہی اور حماقت میں مبتلا ہوں گے" (قمر ۲۴) اس سے معلوم ہوا کہ ثمود کے نزدیک

(۱) اکثریت کی رائے واجب الطاعت تھی، اقلیت کی نہیں (یہی تصور عہد جدید میں بھی ہے)

(۲) ان کے امراء اخلاقی محاسن سے متصف نہ تھے، بلکہ مسرف (حد سے گزر جانے والے بدعمل) تھے مصلح نہ تھے۔ ان کے حکام جیسے بھی ہوتے قوم اُن کو بخوشی مان لیتی تھی، کوئی احتجاج نہ کرتی تھی۔

نوح، ہود، اور قوم صالح کا زمانہ بادشاہوں کے زمانے سے پہلے گذرا۔ سب سے قدیم بادشاہ جس کا ذکر قرآن میں ہے، قوم ابراہیم کا بادشاہ ہے۔ (امرافیل، لقب نمرود؟) اس کے نزدیک ضروری تھا کہ رعیت کے ہر فرد کا دینی مذہب ہو جو اس کا تھا۔ غرور بادشاہی نے اسے اپنا مسلک بدلنے کی اجازت نہ دی۔

مسلمانوں کے نزدیک دنیا کی بدترین حکومت فرعونی حکومت تھی، لیکن قرآن مجید کو غور سے پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ فرعونی راج عہدِ جدید کی بعض محبوب ترین حکومتوں کے مشابہ تھا۔ فرعون الوہیت کا مدعی تھا، دوسرے اس نے یہ کہا تھا "کیا مصر کا ملک اور یہ نہریں جو میرے تلے بہتی ہیں میری نہیں؟ (زخرف ۵۱)

قرآن اگرچہ ایک تاریخی حقیقت کے طور پر شخصی حکومتوں کو تسلیم کرتا ہے لیکن آئینی حیثیت سے اسلام یہ پسند نہیں کرتا کہ کوئی شخص واحد کسی ملک یا قوم کا بادشاہ ہو۔ حضرت موسیٰ کے الفاظ میں مسلمانوں کی پوری قوم کو ملوک ہونا چاہیئے۔ ("اللہ نے تم سب کو ملوک بنایا ہے" مائدہ ۲۰)

یہ امر باعث مسرت ہے کہ ہمارے موجودہ حکمرانوں نے تسلیم کر لیا ہے کہ "تمام جمہوری نظاموں کا مضمر تصور یہ ہوتا ہے کہ اصل حکومت و بالادستی صرف عوام کا حق ہے اور وہی اپنے حکمران ہوتے ہیں"۔ یہی حضرت موسیٰ کی تعلیم تھی جس کی بنا پر فرعون حضرت موسیٰ اور ان کے معتقدین کا دشمن ہو گیا تھا۔ قرآن پاک میں حکومت سے متعلق جتنی آیتیں ہیں ان میں (الذین آمنوا) مخاطب ہیں کہیں کسی بادشاہ یا اولی الامر کو مخاطب نہیں کیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن نہ تو کسی فرد کو مسلمانوں کا آمر مانتا ہے نہ کسی جماعت کو۔ مسلمان من حیث الکل خدا کے محکوم ہیں اور خدا کے بعد اپنے حاکم آپ ہیں۔

فرعون کا نظام حکومت، جیسا کہ قرآن سے ظاہر ہے، بالکل پارلیمانی تھا۔ اس کی پارلیمان کا قرآنی نام الملؤ من قوم فرعون ہے (اعراف)۔ یہ معلوم نہیں کہ ملا، فرعون کے افراد نامزد ہوتے تھے۔ یا منتخب کئے جاتے تھے۔ لیکن دربار فرعون میں ہر امر مشورۃً باہم سے طے ہوتا تھا۔ آخری منظوری یا نامنظوری کا اختیار فرعون کو تھا۔

دربار فرعون میں فرعون کے علاوہ جو لوگ مشورہ میں حصہ لیتے تھے ان میں سے تین شخصوں کو ہم جانتے ہیں (۱) مومن آل فرعون خاندان فرعون کا نمائندہ، یہ شخص حضرت موسیٰ سے عقیدت رکھتا تھا۔ مگر اپنے ایمان کو اس نے مخفی رکھا تھا (۲) قارون یہ اپنے وقت کا بڑا دولتمند اور قوم موسیٰ کا ایک فرد تھا۔ غالباً اپنی قوم کے نمائندے کی حیثیت سے ملا فرعون میں داخل تھا۔ (۳) ہامان قوم فرعون کا نمائندہ، محکمہ تعمیرات کا افسر۔ باقی افراد اس قدر اہم نہ تھے کہ ان کا ذکر قرآن میں آتا۔

فرعونی حکومت جو توراۃ، انجیل اور قرآن کی بدولت دنیا کی بدترین حکومت سمجھی جاتی ہے۔ موجودہ عہد کی بہترین جمہوریتوں سے

بہتر تھی۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ حکومت کی بنیاد قومی نمائندوں کے مشورۂ باہم پر قائم ہونے اور اکثریت کے فیصلے کو واجب العمل قرار دینے سے کوئی حکومت اچھی اور خدا کی پسندیدہ حکومت نہیں بن جاتی بلکہ ہم کو یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ ارکانِ حکومت میں ہامان و فارون جیسے افراد داخل نہ ہونے پائیں۔ مجلس شوریٰ میں جو بات بھی طے پائے اسے امر رشید بھی ہونا چاہیئے۔ آئین ساز مجلس اگر کوئی ایسی بات طے کرتی ہے جو خدا کے آئین سے ٹکراتی ہو۔ یا رشید یعنے مناسب و برحق نہ ہو تو ایسے امر کی اتباع اور فرعونی حکومت کے اتباع میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

بنو اسرائیل شخصی حکومتوں کے ماتحت زندگی بسر کرنا اس لئے پسند کرتے تھے کہ ان دنوں کی تمام قومیں ایک نہ ایک بادشاہ کی تابع تھیں۔ چنانچہ انہی کی استدعا پر طالوت بادشاہ بنے جو پہلے قدیم ترین مسلمان بادشاہ تھے۔ ان کے بعد حضرت داؤد اور پھر حضرت سلیمان کو خدا نے بادشاہی سے نوازا۔ یہ دونوں بزرگ خود صاحب الہام تھے۔ ان تین بادشاہوں کے زمانے میں بتوسط انبیا خود ذات باری کی بنو اسرائیل پر حکومت تھی۔ ان کی مثال سے ظاہر ہے مسلمانوں کے حکام علم اور جسم کے لحاظ سے ممتاز ہوں۔ علم سے مراد الٰہی شریعت اور مصالح امت کا علم و فہم ہے۔ اور جسم سے مراد عمدہ صحت اور ہر ذمہ داری کو اٹھا سکنے کی تاب و تواں ہے۔ لہٰذا ہماری بنیادی جمہوریتوں کے لئے ایسے لوگ منتخب ہونے چاہئیں جو اپنے حلقے کے لوگوں کے مفاد کا بہترین فہم رکھتے ہوں، اس کی موثر و احسن طریق پر ترجمانی کر سکیں اور دیانت داری سے اس کا تحفظ بھی کر سکیں۔

اسلامی حکومت کیا ہے اور کیونکر قائم کی جا سکتی ہے؟ قرآن، حدیث، فقہائے امت کے اقوال اور مسلمانوں کی گذشتہ تاریخ کو سامنے رکھ کر اس باب میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ عام مسلمانوں کے سیدھے سادہ فہم کو مدنظر رکھتے ہوئے بالاختصار یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم پر تین اطاعتیں فرض ہیں۔

(۱) اللہ کی اطاعت (۲) رسولؐ کی اطاعت (۳) اولوالامر کی طاعت یعنی ان احکام کی تعمیل اور نواہی سے اجتناب جو صریحاً کتاب اللہ میں وارد ہیں۔ حضور صلعم کے ارشادات پر عمل جو درحقیقت خدا ہی کی اطاعت ہے کیونکہ آپ کی طرف جو حدیثیں منسوب ہیں، بشرط صحت وہ قرآن ہی کی تشریحات ہیں۔ اور وہ قوانین جو کتاب و سنت پر غور کر کے فقہائے اسلام نے مستنبط کئے ہیں ان پر صحت اجتہاد کی شرط کے ساتھ عمل۔ واجب الطاعت اولی الامر کو "الذین آمنوا" میں سے ہونا چاہیئے جیسا کہ منکم کی شرط سے ظاہر ہے۔ ہر وہ شخص اولی الامر نہیں ہو سکتا جو غیر آئینی طریقہ سے خود بخود آمر بن گیا ہو۔

"مسلمانوں کا امر آپس میں مشورہ کرتا ہے" (شوریٰ) اولوالامر جن کی طاعت ہر مسلمان پر واجب ہے، یہی اصحاب شوریٰ ہیں، جن کے لئے بعض شرائط درکار ہیں۔

اسلامی حکومت کا سنگِ بنیاد ہے ان الحکم الا للہ یعنی فیصلے کا حق نہیں مگر اللہ کو۔ اللہ نے جو امر و نہی یا اجازت نازل فرما دی اس میں کسی رد و بدل کی اجازت نہ کسی امیر کو دی جا سکتی اور نہ کسی مشیر کو۔

اللہ نے بعض امور کو بندگانِ خدا کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے جن کو وہ باہمی مشورہ سے طے کر سکتے ہیں۔ (امرھم شوریٰ بینھم (شوریٰ ۳۸)) لہٰذا اسلامی معاشرے کی بنیادیں دو ہیں: فتویٰ اور شوریٰ۔ قرآن و حدیث سے احکام استنباط کرنے کے قواعد و ضوابط فقہائے اسلام نے صدیوں غور و فکر کے بعد منضبط کر دئے ہیں۔

سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اہل شوریٰ چنے کیسے جائیں۔ یہ تو ممکن نہیں کہ ایک ایک فرد سے رائے لی جائے۔ امت کے چند نمائندوں ہی سے رائے پوچھی جا سکتی ہے۔ قرآن نے اصحاب شوریٰ کا انتخاب اور طریق انتخاب ہماری بصیرت اور صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔ پیروانِ رسول میں جو لوگ اصحاب حل و عقد اور فکر و تدبر والے ہیں وہ اتفاق آراء سے جس طریقۂ انتخاب کو پسند کر دیں اسے سبیل مومنین قرار دے کر قبول کر لینا چاہیئے۔ متعدد آیتوں سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کے مشیر و امیر ہونے کا حق صرف ایسے افراد کو ہے جو ایمان دار اور عابد ہونے کے ساتھ دیگر اخلاقی فضائل سے متصف ہوں اور اخلاقی رذائل ان میں نہ پائے جاتے ہوں۔ تمام رذائل سے پاک، تمام فضائل سے متصف،

افراد تو مشکل ہی سے ملتے ہیں پھر بھی ہم اس بات کا لحاظ رکھ سکتے ہیں کہ تا امکان اخلاقی اور دینی حیثیت سے نسبتہً بہتر افراد کو امت کے مشیروں کی حیثیت سے چنیں کیونکہ اولوالامر یعنے اصحاب شوریٰ کی طاعت ہم پر واجب ہے اور آثم و کفور کی کسی رائے کو ماننے سے منع کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو علم و فضل سے زیادہ تقویٰ محبوب ہے۔

(۱) اللہ محبوب رکھتا ہے متقین کو۔

(۲) اللہ محبوب رکھتا ہے توبہ کرنے والوں کو اور محبوب رکھتا ہے پاک رہنے والوں کو۔

(۳) اللہ محبوب رکھتا ہے بھلے کام کرنے والوں کو۔

(۴) اللہ محبوب رکھتا ہے صابروں (حق کی خاطر دشواریاں جھیلنے والوں) کو

(۵) اللہ محبوب رکھتا ہے توکل کرنے والوں کو (ان کو جو ہر کام میں اللہ پر اعتماد رکھتے ہیں)

(۶) اللہ محبوب رکھتا ہے انصاف کرنے والوں۔

(۷) اللہ محبوب رکھتا ہے ان کو جو اس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں صف باندھ کر ایسی جیسے کہ وہ سیسہ پلائی دیواریں ہوں۔

قرآن کے مطابق نیکی اور تقویٰ کے ساتھ ضروری معاملہ میں مشورے دینا بڑا کارِ ثواب ہے جس کے لئے اپنے آپ کو پیش کرنا ویسا ہی ہے جیسے خود کو جہاد کے لئے پیش کرنا۔ ایک حدیث ہے۔ "ہم امیر نہیں بناتے اس کو جو امارت چاہتا ہے" اس حدیث کو عمال حکومت اور صدر مملکت اور وزراء سے متعلق سمجھنا چاہیئے۔ ان کاموں کے لئے ایسے لوگ چنے جا سکتے ہیں جو ان عہدوں کی صلاحیت رکھتے ہیں مگر خواہش نہیں رکھتے۔ ایسے لوگوں کو مشیران قوم تلاش کریں گے، لیکن مجلس شوریٰ میں شرکت کے لئے خود کو پیش کرنا ایک طرح کا مجاہدانہ عمل ہے۔

موجودہ زمانے کی مجالس شوریٰ عموماً پارٹی سسٹم پر قائم ہوتی ہیں۔ لیکن اسلام تحزب و تشیع کا روادار نہیں ہے۔ "یقیناً جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کیا اور ٹولیاں بن گئے (اے محمدؐ) تمہارا ان سے کوئی ناتا نہیں ہے (انعام ۱۵۹)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اختلاف آراء کی صورت میں فیصلہ کیسے ہو؟ کثرت آراء کسی بات کے حق ہونے کی دلیل نہیں ہوتی۔ قرآن میں جہاں جہاں اکثرھم کا لفظ آیا ہے اس پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حق کو عموماً ابتدا میں شخص واحد نے پیش کیا، اقلیت نے قبول کیا، اکثریت نے مدتوں حق سے نفرت کی مگر بالآخر اکثریت کی آنکھیں کھلیں اور اس نے اقلیت کی رائے کو قبول کیا۔ اسلامی انداز کے شوریٰ میں رائے دینے والوں کی تعداد نہیں گنی جاتی بلکہ دلائل و مصالح کا وزن معلوم کیا جاتا ہے۔ مگر دلائل کو تولے کون؟ اگر ہم نے انہی لوگوں کو مشیر ہونے کے لئے چنا ہے جو خدا کے محبوب ہو سکتے ہیں یعنی متقی اور مُقسِط (خدا ترس و منصف مزاج) تو دلائل و مصالح کا وزن پوری مجلس خود محسوس کرے گی۔ اسلامی تاریخ کا ابتدائی دور ہم کو یہ طریقہ بتاتا ہے کہ مشیرانِ ملت ایک متقی انسان کو ملت کا امیر چن لیں، پھر اس کی اطاعت پر پوری امت سے بیعت لی جائے۔ یہی متقی ترانسان اصحاب شوریٰ کی رایوں کو سن کر انہیں قرآن و حدیث کے ترازو پر تولے گا، اور دلائل و مصالح کی بنا پر مختلف فیہ آراء میں سے ایک کو ترجیح دیگا۔ اس کے بعد وہ اولوالامر کا حکم بن جائے گی جس کی طاعت ہم پر اسی طرح ہوگی جیسے خدا اور رسولؐ کی طاعت، بشرطیکہ وہ کسی قطعی فرمان خدا اور ارشاد رسولؐ سے متصادم نہ ہو کیونکہ لا طاعة لمخلوق فی معصیة اللہ۔

ان تفصیلات سے ظاہر ہے کہ ہمارے ہاں بنیادی جمہوریتوں کا تصور اور لائحۂ عمل دونوں اسلامی نظریات اور قرآنی تعلیمات سے کس قدر ہم آہنگ ہیں۔ ان میں نہ جباری ہے نہ قہاری، نہ زر پرستی پر زور ہے نہ مصنوعی مراعات پر کسی طبقہ کو دوسرے طبقوں کو فوقیت حاصل نہیں بلکہ ہر بات میں ایک خوشگوار توازن اور عوام کے بہترین مفاد کو پیش نظر رکھ کر نہایت عمدہ منصوبہ بندی کی گئی ہے۔ خدا کرے ہمارا یہ جدید ترین، پرخلوص ملی تجربہ اُس کامیابی سے ہمکنار ہو جس کی اس سے توقعات وابستہ ہیں اور جس کے امکانات اس میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

*

وہ اداسیاں — یہ شگفتگی

عبدالرؤف عروج

فضا تمام صنم خانۂ تغیّر ہے
زبانِ عصر پہ افسانۂ تغیّر ہے

لہولہان سمن زار میں نے دیکھے ہیں
دل و نگاہ کی تقصیر یاد ہے مجھ کو
ہزاروں زخم ہیں گلزار میرے سینے میں
ہوس کا دشنۂ تعزیر یاد ہے مجھ کو
نہ کوئی عقدہ کشا تھا نہ کوئی حلقہ شکن
وہ زلف و دام، وہ زنجیر یاد ہے مجھ کو

مجھے خبر تھی، ہوس کا مآل کیا ہوگا
شکستِ روح کے نغمے سنے نہیں میں نے
بریدہ نور چراغوں کے سرد بالیں پر
سوادِ جبر کی راتیں گذار دیں میں نے
ستم نژاد حقائق کی داستانیں تھیں
بساطِ محفلِ دوشیں پہ جو کہیں میں نے
شدید یاس کی گھڑیاں قبول کیں میں نے
مئے نشاط بہ پیمانۂ تغیّر ہے

فضائے جبر عجیب و غریب تھی کتنی
دل و نظر کی تباہی قریب تھی کتنی

شکارِ شامِ فسوں گر، عروسِ صبح کے خواب
علاجِ تشنگیِ دل، لہو بجائے شراب
بہ نوکِ خارِ پریشاں، سمن کدوں میں گلاب
حیات نذرِ جہنّم، حیات صرفِ عذاب
کہیں پہ صرف تسلّی، کہیں پہ صرف عتاب
خطوطِ چہرۂ جمہوریت تھے نقش بر آب

وراثتوں کا تصوّر محیطِ دانش و ہوش
پسِ خیال معیشت تباہیوں کا خروش
غبارِ علم میں صد ہا جہالتیں روپوش
ہر ایک تاجرِ شہد و نبات، زہر فروش
یقینِ آمدِ فردا شکارِ تہمتِ دوش
کمالِ آگہی و آگہی اذیّت کوش

اُداسیوں سے ہراساں شگفتگی کی اُمنگ
دل و نگاہ کی وسعت، دل و نگاہ پہ تنگ
اُبھرتے ڈوبتے خاکے، سراب زنگار رنگ
ہر اک انارکلی زیرِ بارِ تختۂ سنگ
ہر اک فرید کی ملتانیاں فغاں آہنگ
ہر اک لطیف کی کافی، تباہِ شورشِ چنگ

وہ جبرِ اہلِ سیاست، وہ قیدِ بے الزام
وہ سطحِ ساز پہ جانسوز ہچکیوں کا خرام
وہ موجِ زہر بنامِ شراب جام بہ جام
وہ ملکیت سے سراسیمگی سی گام بہ گام
وہ ذہن و فکر پہ پہرے، دل و نگاہ غلام
وہ مضطرب سے تقاضے، وہ مشتعل سے عوام
پکارتے تھے حقائق کوئی جدید نظام
مگر مسافتِ زلف و صلیب تھی کتنی

سمومِ وحشتِ سوزاں، دمِ گلاب ہوئی
جنوں کے ہاتھ سے تشکیلِ انقلاب ہوئی

ضمیرِ سینۂ تہذیب جگمگا اُٹھا
شبِ حیات کی تابانیوں کے دن آئے
فسونِ یورشِ غم کو نگاہ توڑ گئی
متاعِ عیش کی ارزانیوں کے دن آئے
کوئی غریب سرِ کوچۂ سبا سے کہے
پھر آج اس کی سلیمانیوں کے دن آئے

نہیں وہ علم کے پیرانِ تسمہ پا باقی
نہیں وہ جہل کی بے مایگی عیارِ ہنر
کراں سے تا بہ کراں روشنی کے سیل رواں
افق افق کی جبیں پر کرن کرن جھومر
سمٹتے پھیلتے احساس کی نصیبوں سے
اُبھر رہے ہیں اجالوں کے رایت و لشکر

ہر ایک موڑ پہ کلیاں، ہر ایک راہ میں پھول
صبا کی چال میں رفتارِ یار دیکھو تو

شررکدوں کو ملا پیرہن شگوفوں کا
ذرا رفاقتِ جشنِ بہار دیکھو تو
ہر ایک کنج مہکتا ہے بوئے یاراں سے
جمالِ تمکنتِ آشکار دیکھو تو
فروغِ جلوۂ صبر و قرار دیکھو تو
سکوں پذیر ہر اک موجِ اضطراب ہوئی

وفا سرشت تقاضے، اصول ہو کے رہے
دل و نظر کے فسانے قبول ہو کے رہے

نظامِ جبر کی وحشت فروز راتوں میں
تمدنوں کے اجالے بکھر کے رہتے ہیں
سکوتِ یاس کی صرصر زدہ فضاؤں سے
صبا خرام زمانے گذر کے رہتے ہیں
کرشمہ سازیِ حالات کا بھنور کیسا
یقیں کنار سفینے ابھر کے رہتے ہیں

گماں کی رات میں نیکر یقیں کی قندیلیں
نظامِ تازہ کی تنویر مسکرائے گی
ہر ایک دشت میں کہسار میں خرابے میں
قلم اٹھائیں جو آرٹسٹ تو ان کے ذہنوں میں
جنابِ دلیس کی ہر نہر مسکرائے گی

کڑے کی تال ہو یا پائلوں کی چھم چھم ہو
سلونے سانولے رمنے بہار گائیں گے
ہر ایک فصل کا نغمہ، ہر ایک فصل کے گیت
ہلوں کے ساز پہ مردانِ کار گائیں گے

زمیں بھول گئی کام دیوتاؤں کو
سلگتے کھیتوں کے دیپک ملار گائیں گے

ہزاروں رنگ اڑائے گی پھولتی سرسوں
لذیذ آم کے باغوں میں بور مہکے گا
شمیم بیز حسین زعفران زاروں تک
جمالِ جادۂ سرو و چنار لہکے گا
ترانے رقص کریں گے ضعیف ہونٹوں پر
کٹیں گی دھان کی فصلیں الاؤ دہکے گا
قیامِ امن کا بڑھتا قدم نہ بہکے گا
ہوس کدے مرے قدموں کی دھول ہو کے رہے

بنامِ فکر و فنِ عصر تاب آیا ہے
سلامِ ارضِ وطن انقلاب آیا ہے

دل و دماغ، خیال و نظر، یقین و شعور
یہ سب غلام تھے جمہوریت کے سائے میں
شیوخِ پاک شریعت، کبار دین و طریق
حریصِ نام تھے جمہوریت کے سائے میں
ابھرتی ڈوبتی پیہم قیادتوں کے ہجوم
خیالِ خام تھے جمہوریت کے سائے میں

عوام، صاحبِ فردا ہیں آج ان کے حضور
لہو نچوڑتی جمہوریت گوارا نہیں
مفاد کوش سیاست کے ہر اشارے پر
رخ اپنا موڑتی جمہوریت گوارا نہیں
طلسمِ ہر نگہ سرگِ ساز کھل کے رہا
دلوں کو توڑتی جمہوریت گوارا نہیں

مجاہدانہ صداقت کے دلبرانہ خلوص
پیامِ عظمتِ جمہور لے کے آئے ہیں
نئی حیات کا پرتو ہے تیرہ ذہنوں پر
نئی حیات تھی پُر نور لے کے آئے ہیں
پئے وطن نئی جمہوریت کے قالب میں
علاجِ قیصر و فغفور لے کے آئے ہیں
ہم اپنے عہد کا دستور لے کے آئے ہیں
جنوں بسوئے غزل، کامیاب آیا ہے

صلیب و طوق، نہ زنجیر و دار کے دن ہیں
قیامِ خیمۂ جشنِ بہار کے دن ہیں
فضائیں پرچمِ زلفِ خیال لہرائیں
تمام حوصلۂ اختیار کے دن ہیں
یہ رنگ رنگ تجلی، یہ رنگ رنگ سماں
جمالِ تمکنتِ روزگار کے دن ہیں
زمانہ چھیڑ رہا ہے سرودِ عشرتِ نو
مغنّیانِ ہنر آشکار کے دن ہیں
فضائیں کیف، ہوائیں شراب کی تاثیر
طرب فروز، دل بیقرار کے دن ہیں
حنائی ہاتھوں کی مشعل کے ساتھ ساتھ چلو
جنوں کی لغزشِ مستانہ وار کے دن ہیں
میں آج آئینۂ شعر لے کے نکلا ہوں
فروغِ جلوۂ حسنِ نگار کے دن ہیں
عروج کوئی در دل پہ دے رہا ہے صدا
یہی تو عظمتِ مردانِ کار کے دن ہیں

پیغامِ سحر

باقی صدیقی

رات ڈھلی، تارے مُرجھائے، خوابوں نے پَر تولے
صبح کی دیوی جاگ اٹھی کرنوں کی زلفیں کھولے

چرخ نے اپنی پلکوں سے تاروں کے آنسو جھٹکے
منزل کی آواز پہ لپکے راہی بھُولے بھٹکے

مست صبا کے جھونکوں سے شبنم کے موتی ٹوٹے
کوئل کی شہنائی سُن کر جاگ اُٹھے گل بُوٹے

شاخوں کے جھُولے لہرائے، پتے ہوش میں آئے
غنچوں نے منہ کھولے، کلیوں نے دامن پھیلائے

چنچل کرنوں کی آہٹ سے مست نظارے جاگے
تاریکی کا اندھا لشکر بھاگا آگے آگے

دُور افق سے پہلی کرن کے ساتھ صدا یہ آئی
جس نے سفر جاری رکھا ہے اُس نے منزل پائی

★

منظر منظر

احمد ظفر

لمحوں کے چراغ جلتے جلتے
افسانۂ غم سنا رہے تھے
سانسوں کے چراغ بجھ رہے تھے
آنسو تھے کہ جگمگا رہے تھے
ٹوٹے ہوئے تارِ سازِ دل کے
ویرانیٔ دل بڑھا رہے تھے
ہر نقشِ حیات مٹ رہا ہے
حالات ہمیں بتا رہے تھے

دیکھا تو بہار کا سماں تھا
لیکن یہ بہار بھی خزاں تھی
لمحوں میں چھپے ہوئے تھے آنسو
بے تابیٔ دل کہ بیکراں تھی
آنکھوں سے نہاں رہا اُجالا
تاریکیٔ شب کہ درمیاں تھی
وہ رات بھی ٹل گئی کسی طور
وہ رات کہ باعثِ فغاں تھی

جب شمعِ مزار جل رہی تھی
اب شمعِ بہار جل رہی ہے
سینے میں مچل رہے ہیں طوفاں
آنکھوں میں ہنسی مچل رہی ہے
جب بادِ سموم چل رہی تھی
اب بادِ مراد چل رہی ہے
بدلا ہے کچھ اس طرح سے منظر
ہر چیز یہاں بدل رہی ہے

تاریخ کے موڑ پر

جلیل حشمی

صلیب دوش پہ اپنے اٹھائے چلتے تھے — وہ زخم تھے کہ لہو میں نہائے چلتے تھے
رواں تھے چشمۂ خورشید کی طرف ہم لوگ — مگر قدم پہ قدم ساتھ سائے چلتے تھے
ٹپکتا جاتا تھا راہوں میں قطرہ قطرہ لہو — ہم اپنے زخموں سے نظریں چرائے چلتے تھے
تڑپ تڑپ کے گرے تیر کھا کے ظلمت کے — ہتھیلیوں پہ جو شمعیں جلائے چلتے تھے
قسم اٹھاتے تھے ہم جن کی رہنمائی کی — وہ آستینوں میں سورج چھپائے چلتے تھے
ترس چکی تھیں نگاہیں کرن کرن کے لئے — اک آس تھی کہ افق سے لگائے چلتے تھے

ہمارے بخت نے کی یاوری کہ دھند چھٹی — اور ایک مردِ جواں نے ہمیں صدا دے کر
بڑے خلوص سے اک رہگذر پر موڑا — چلے تھے چند قدم ہی تو اور تھا منظر
نہ ظلمتوں کا سماں اور تیرگی کا نزول — جراحتوں کے نہ وہ رنگ اور نہ رقصِ شرر
جہاں کرن بھی نہ ملتی تھی بھیک میں ہم کو — وہاں کی خاک سے پیدا ہیں لاکھ شمس و قمر
اس انجمن میں ضیا تاب ہیں چراغِ غزل — جہاں سخن کو ترستے تھے ہم زباں رکھ کر
چھڑا ہوا ہے وہاں نغمۂ حیاتِ جہاں — سکوتِ مرگ تھا پہرے تھے دل کی دھڑکن پر
نظر نظر میں فروزاں ہیں عزم کی شمعیں — قدم قدم پہ نشاں کھل رہے ہیں رفعت کے

دلوں میں تازہ امنگیں، نکھار چہروں پر
ضیائیں پھیلی ہیں خاکِ وطن کے ذروں سے

صبحِ دلآویز

صہبا اختر

اُفقِ پاکستان پر حقیقی جمہوریت کا طلوع جو جلوہ ہائے گوناگوں خیبر کی چٹانوں سے پدما کے کناروں تک بکھیر رہا ہے اور ہر مرد وطن دوست کے دل میں رنگارنگ احساسات پیدا کر رہا ہے۔ وہ حقیقتہً جنت نگاہ ہیں۔ اس نظم میں انہی کی عکاسی کی گئی ہے۔ (مدیر)

لو کہر میں لپٹی ہوئی ظلمت کے جگر میں
یکبار ہوا دشنۂ خورشید ترازو

آئی مری محبوبۂ خوش رنگ کی صورت
اک صبح دلآویز ہمہ گل ہمہ خوشبو

چہرے پہ دوپٹے کو بنائے ہوئے ہالہ
آنکھوں میں چھپائے ہوئے سو بولتے جادو

ہر گام بہ اعجازِ خرام ایک چراغاں
ہر انگ سے اڑتے ہوئے ہر رنگ کے جگنو

ہر ذرۂ زرکار ہدف بننے کو بیتاب
گو نیم کشیدہ ہے کمانِ خمِ ابرو

یہ صبح ہے مجروح بہاروں کی مسیحا
جو زرد فضاؤں کو بنا دے گی حنا رو

پھر پاک زمینوں پہ گہر بار ہوئے ہیں
دوشیزہ گھٹاؤں کے مہکتے ہوئے گیسو

شمشاد و صنوبر کی کمر میں ہیں حمائل
رقاص ہواؤں کے لچکتے ہوئے بازو

بادل کی گرج ہے کہ یہ بوندوں کی چھماچھم
یہ طنطنۂ جوش ہے یا نغمۂ باہو

سننا تو ذرا مطربۂ بادِ صبا نے
سُرِ شاہ کے چھیڑے ہیں کہ موسیقیٔ نذرو

خوشحال کی آواز کہ اقبال کا اعجاز
افسانہ و افسوں کی فضا وجد میں ہر سو

کہتا ہے کوئی سلسلۂ ریگِ رواں سے
آ پھر نمِ شبنم سے کریں غسل لبِ جو

ہر ساعتِ منحوس ہوئی موت کا پیوند
تقدیر کے برجوں میں نہ کیتو ہے نہ راہو

کل تک جو سیہ چشم و سیہ بخت رہے ہیں
اب صندلی رمنوں میں نہ بھٹکیں گے وہ آہو

ہاں ختم ہوئی سطوتِ فرعون نژاداں
باقی نہیں آثارِ رفیقانِ ہلاکو

ہر خوشۂ گندم سے ملے گی وہ مسرت
غربت کے ستم ہوں گے نہ افلاس کے آنسو

اب بھوک نہ ہو گی کسی محنت کا نتیجہ
اب قسمتِ مزدور نہ چھینیں گے جفا جو

"سلطانیِ جمہور" کی تجدید میں مصروف
پدما کے کناروں پہ کبھی برسرِ "کے ٹو"

بنگال کے ملاح کہ پنجاب کے دہقاں
سلہٹ کے جواں مرد کہ خیبر کے بلا جو

افسانہ

چودھری

ابوسعید قریشی

تو پھر بات پکی ہوگئی ناچودھری جی!

چودھری کے لفظ سے مولابخش کے چہرے پر ستر سال کی آندھیاں اور بگولے، ستر سال کے ساون اور سیلاب، جاڑے اور گرمیاں، ستر سال کے سورج اور چاند سب ایک ساتھ جمع ہو گئے۔ اُس کے تانبے سے گالوں کے مسام لاوا اُگلنے لگے اور ماتھے کی جھریاں برسات کے ندی نالوں سی چمک اٹھیں۔ "چودھری" اس کی ذات نہیں تھی۔ اِک زمانہ تھا کہ وہ سچ مچ کا چودھری تھا۔ اُس کی مرضی کے بغیر گاؤں کے کھیتوں سے کوئی بٹیر بھی نہیں پکڑ سکتا تھا۔ بھُس کا تنکا، گندم کی بالی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ تھانیدار تو کیا بڑے صاحب کو بھی آنے سے پہلے پوچھنا پڑتا۔ اُس کا گاؤں، امن پور ایک نمبر کا گاؤں تھا۔ آس پاس کی بستیوں میں اگر کسی کو ضامن کی ضرورت پڑتی تو سیدھا چودھری کے پاس آتا۔ مگر اب کہاں۔ اب تو وہی بات تھی کہ چور اُچکا چودھری.... اور چودھری کے پیٹ سے ایک بڑا سا تبرّہ ابھرا۔ مگر حقے کی منہال نے اُس کے خیالات کا راستہ روک لیا۔ چودھری مولابخش نے ایک ایسا کش لگایا کہ دھوئیں کے ساتھ حقے کے پیٹ سے پانی بھی منہ میں آگیا۔ اُسے زور کا اچھو آیا۔ کھانسی رکی تو اُس نے آنکھیں سکیڑ کر تھانیدار کی طرف یوں دیکھا جیسے ٹڈی دل آرہا ہو۔

تھانیدار چارپائی پر بیٹھا تھا۔ اُس کی عمر کوئی بیس اکیس سال ہوگی۔ چہرے پر مسکراہٹ تھی جو مونچھوں کی کالی لکیر سے اور بھی "کھنڈی" جارہی تھی۔ کسی اچھے گھرانے کا لڑکا معلوم ہوتا ہے۔ پہلے بھی آیا تھا وہ ایک مرتبہ۔ خیر خیریت پوچھنے۔ دستور کے مطابق گاؤں والوں نے تھوڑا راشن۔ گڑ، گھی، اور مرغیاں ـــ ساتھ کرنا چاہا، انکار کر دیا۔ مولابخش نے اُسی دن اپنی گھر والی سے کہا تھا کہ چودھرانی یہ نیا تھانیدار ہے تو لونڈا سا پر آدمی ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ چودھری کو اپنی بات پھر یاد آگئی۔ اور اُس نے کہا:

"وقت آنے پر دیکھا جائے گا نا میاں۔ تم کیوں ابھی سے حیران ہوتے ہو؟"

"اچھا تو پھر اجازت"

"گھونٹ لسی کا تو پیتے جاؤ نا پُتر جی۔ گرمی ہے۔ کہو تو ستو گھول دوں۔"

"بڑی مہربانی ہے چودھری جی آپ کی۔ پیاس نہیں کچھ ایسی۔ ضرورت ہوگی تو ٹھنڈی بوتل ساتھ ہے"۔ اس نے اپنی سائیکل کی ٹوکری میں رکھی ہوئی تھرمس کی طرف اشارہ کیا۔ "آپ اتنی مہربانی کیجئے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے اسے بھولئے گا نہیں اور باقی بھائیوں کو بھی یہ ساری باتیں سمجھا دیجئے۔"

"جھوٹ کیوں بولوں۔ جان خدا کو دینی ہے۔ باتیں تو سب معلوم ہیں۔" مولابخش نے کہا۔ "کچھ اور لوگ بھی آئے تھے کہنے کہ اس میں سب کی بھلائی ہے۔ فلم بھی دکھائی تھی۔ ریڈیو پر نظام دین اور چودھری بھی ہر روز یہی باتیں کرتے ہیں"۔ اس نے حقے کا ایک اور کش لگایا، اور عادتاً نے تھانیدار کی طرف کر دی ـــ

"پر باتیں ہی ہیں نا بادشاہو۔ گھگھو گھوڑے نیانوں کو پرچاتے ہیں نا موتیاں والیو۔ یہ نہیں سوچا کوئی کہ گھر گھر میں تو اسکول بنا ہے۔ دس لونڈے امن پور کے تو کالج میں پڑھتے ہیں اُدھر شہر میں۔ اور پھر اپنا نظام دین ریڈیو والا دنیا جہان کی سناتا ہے۔ ابھی

کل ہی کہہ رہا تھا کہ چاند کی سیر کو تیار ہو جاؤ بھئی پنچو۔ ایک سال کی بات ہے اور چاند اور اپنی زمین کے بیچ ہوائیاں چھوٹا کریں گی جیسے اپنے اسٹیشن اور لاہور تک مسافر گاڑیاں چلتی ہیں سو باتیں تو بہت ہیں میاں جی۔ پر اصل بات تو وہ ہے تم جانو جو پکی ہو چٹکی چٹکی تو کتنے لئے پھرتے ہیں اپنی جھولی میں۔ دق سل کا دارو۔ آؤ نتروں نکھٹروں کے بیٹے! پر باؤ جی۔ ٹھگی سب ٹھگی!"

"اب کے ٹھگی نہیں ہوگی چودھری جی۔ خاطر جمع رکھو۔ جہاں اتنے تعویذ گنڈے کئے، اتنے وید طبیب دیکھے، نسخے گھول کئے۔ ایک کو اور آزما لو۔ اللہ شفا ہی دے گا۔"

"چلو تمہاری خاطر یہ بھی کر دیکھیں گے۔ پر ہوگا وہی۔"

"اچھا چودھری جی۔ لو خدا حافظ۔"

"چلتے ہو خیر سے۔ میں تو کہتا تھا کہ گرا ہیں کھا جاتے دو، روکھی مسّی ہے۔ آم کا اچار اور لسّی۔"

"اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیئے چودھری جی۔ بیسنی روٹی تو بادشاہ بھی شوق سے کھاتے تھے۔ آم کے اچار پر تو پانی بھر آتا ہے میرے منہ میں۔ لیکن پھر آؤں گا کبھی۔ ایک ضروری کام سے واپس پہنچنا ہے ایک بجے۔"

"اچھا تو اللہ بیلی!"

تھانیدار کی روانگی کے بعد چودھری مولا بخش سوچنے لگا کہ زمانہ کتنا بدل گیا ہے۔ علاقے کا حاکم جس کو چاہے باندھ دے، جس کو چاہے چھوڑ دے۔ اور سائیکل! ایک پیادے کو بھیج دیتا تو دس موٹریں آ جاتیں۔ اور الٹا احسان موٹر والوں پہ ہوتا۔ ابھی پار سال جو آیا تھا..... چودھری نے ایک بڑی سی گالی دی۔ اپنے ملکوں کی گاڑی کو یوں لئے پھرتا تھا جیسے باپ کا مال ہو۔ سچ کہتے ہیں پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ یا پھر زمانہ بدل گیا ہے۔ سبھی کہتے ہیں۔

اس کو وہ زمانہ یاد آ گیا جب "انقلاب زندہ" کے نعرے لگا کرتے تھے، گاؤں گاؤں میں میجر بیٹھا تھا اور رہنما کی کپڑوں کو دیکھ کر لوگوں کے اوسان خطا ہو جایا کرتے تھے۔ اور ایک یہ دن بھی تھے کہ تھانیدار خود انقلاب کے گن گاتا پھر رہا تھا۔ یہ کیسا انقلاب تھا آخر۔ انگریز تو چلا گیا۔ پھر انقلاب کیسا؟ ایک وزارت ٹوٹی اور دوسری آئی۔ یہی نا؟ ٹوٹتی بنتی وزارتوں کے تصور سے چودھری مولا بخش کو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی بھینس اپنی زنجیر سمیت بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔ اور گاؤں والے اس کو گھیرے میں لا کر پکڑنے کے لئے شور مچا رہے تھے۔ الیکشن کہتے تھے اس کو۔ سارے گاؤں کو ہانک کر لے گئے تھے۔ مال گاڑی میں مویشیوں کو ڈھوتے ہیں جیسے۔ ڈالو فلانے ..... کو پرچی! اور بدمعاشوں کی بن آئی تھی۔ رُلدو اور ساجے اور..... نے تو کپڑے بدل بدل کر دس دس پرچیاں ڈالی تھیں۔ سیاں بھئے کوتوال..... اور اب بھی ہانکا ہوگا۔ ڈالو فلانے کو پرچی! ایک سال آرام سے گزر گیا تھا۔ چخ چخ نہ بک بک۔ اب کہتے ہیں پھر آؤ۔ ایک جمہوریت سے ناک میں دم تھا اور اب تو اللہ جانے کتنی ہوں گی۔ اور پرچی اب کے بھی اُسی کے ڈبے میں جائے گی جس کو تھانے دار چاہے گا۔ ہم کو اپنی کھیتی باڑی کرنے دو بھائی۔ ہمارا بڑھاپا کیوں خراب کرتے ہو۔ ایسی تیسی ایسی چودھرائیت کی۔ اور چودھری مولا بخش نے جو اُس وقت حقہ تازہ کرنے کی سوچ رہا تھا۔ جوڑے کو رہٹ کے تالاب میں شراب سے غوطہ دیا اور الیکشن کے دھندوں اور ممبری کے امیدواروں، سب کو غرق کر دیا لیکن ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کے لمس سے اس کو پھر نوجوان تھانیدار یاد آ گیا۔ اس کے چہرے پر اور نیلی کالی آنکھوں میں کچھ ایسی ٹھنڈک تھی، سچائی تھی کہ ٹھگی سے اُس کا کوئی سروکار نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے بھولے پن کو دیکھ کر تو ٹھگ بھی ٹھگی سے توبہ کر لے۔ لیکن جوڑی رک گئی اور رہٹ کی ٹک ٹک کے ساتھ ہی چودھری کے خیالات کا تار بھی ٹوٹ گیا۔ اُس نے گردن گھما کر بیلوں پر نظر ڈالی۔ بیلوں کی جوڑی اور چودھری کے درمیان ٹنڈوں کی ماہل اُبھرتے چاند کی طرح پھیلی ہوئی تھی اور اس سے دودھ کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ جب سے اُس نے "ٹینڈیں" بدلی تھیں، پانی کا ایک قطرہ بھی ضائع نہیں گیا تھا۔ "کھال" "مونہوں مونہہ" بھرا نظر آیا تھا۔ کھیتوں نے جی بھر کے پانی پیا تھا۔ اور پہلے سے دوگنی فصل ہوئی تھی ــــــ یہ سب نئی ٹنڈوں کا صدقہ ہے چودھری مولا بخش نے شفقت بھری نظروں سے مٹی

کے نئے کوزوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ کوزے کرمو کمہار نے امن پورہ ہی کی مٹی سے بنائے تھے چکنی جاندار مٹی! اس کی چکناہٹ کے تصور سے ستر سالہ چودھری کو گاؤں کے بچے یاد آگئے جن کے سر گرمیوں میں گھٹا دیئے جاتے۔ وہ اُن کے سروں پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگا۔ اُن کے ہونٹوں سے دودھ بہہ رہا تھا۔ بیلوں کی جوڑی پھر چل پڑی۔ شاید وہ ایک ثانیہ ہی کو رُکی تھی۔ رُکی بھی تھی کہ نہیں۔ رُکتی کوئی چیز نہیں ہے چودھری نے کہا "جو ٹھہریا سو مُکّیا"۔ سورج، زمین، آسمان، چاند، نہریں، دریا، سب چلتے ہیں۔ اُس کا رہٹ بھی چل رہا تھا۔ اور رہٹ کے اُدھر شیشم کے سایوں میں چلتی ہوئی پکی سڑک پر تھانیدار کی سائیکل پھسلتی چلی جا رہی تھی۔ یہ سڑک دیہاتی امداد والوں نے گاؤں کے چھوروں سے ہی بنوائی تھی۔ اللہ بھلا کرے اُن کا۔ ڈھول نہ دلدل! — چودھری نے انھیں دعا دیتے ہوئے کہا۔ "ڈسٹرکٹ بورڈ کے سہارے رہتے تو اللہ جانے کب باری آتی — سڑک کے موڑ پر سائیکل کی لال بتی کا لشکارا سا پڑا۔ اور پھر سائیکل آنکھ سے اوجھل ہوگئی۔

اور جیسے الیکشن بھی وہیں کہیں سڑک کے موڑ پر ہی کھڑا تھا۔ دن یوں گزرتے گئے جیسے رہٹ کے ڈولچے۔ ایک کے پیچھے دوسرا۔ اور ستّر سالہ چودھری الیکشن پنڈال کے باہر کھڑا اس سوچ میں ڈوب گیا کہ جانے کون سی جوڑی دن اور رات کے اس رہٹ کو چلا رہی ہے، تھکتی ہی نہیں، رُکتی ہی نہیں!

"تو آپ آگئے چودھری جی"۔ کسی نے چودھری مولا بخش کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

چودھری نے مڑ کر دیکھا۔ تھانیدار کے چہرے پر وہی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ رہٹ کے ڈولچوں سے بہتا ہوا دودھ سا چمکتا تازہ پانی۔

"سرکار کا حکم بادشاہو! گولی کس کی اور گہنے کس کے۔ ہم تو نوکر ہیں"۔

"آپ کے حکم کا زمانہ ہے چودھری جی! نوکر تو ہم ہیں"۔ تھانیدار نے چودھری کی بات کاٹی۔

"کیوں شرمندہ کرتے ہو موتیاں والیو؟ حکم کرو کس کو ڈالنی ہے پرچی"۔

"جس کو آپ کا جی چاہے"۔ تھانیدار نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

"لو اور سنو!" چودھری بوکھلا گیا۔ "یہ بھی کبھی ہوا ہے"۔

"اس کا تو مجھے پتہ نہیں۔ پر اب ہو رہا ہے۔ اب جائیے اندر دیر نہ کیجئے"۔

چودھری کی بوکھلاہٹ اور بڑھ گئی — نوجوان آدمی ہے نا۔ اُس نے سوچا۔ مذاق کر رہا ہے۔ ورنہ ہوگا وہی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن تھانیدار کہیں جا چکا تھا۔

اچھا یہ بھی دیکھ لیتے ہیں۔ چودھری نے اپنے آپ سے کہا۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی — ابھی الگ الگ ہو جائے گا۔ دیر ہی کتنی ہے — اس قنات کے اس طرف پاؤں رکھنے کی تو بات ہے۔ ابھی پتہ چل جائے گا کہ یہ چھورا کتنے پانی میں ہے — اُس نے اپنی ستّر سالہ داڑھی پہ ہاتھ پھیرا — کل کے لونڈے اب ہم کو بنانے لگے۔ بعد کو آنکھیں نہ ملانی پڑیں اس لئے کھسک گیا۔ کوئی بات نہیں پُتر جی — تو بھی یہیں ہے اور چودھری مولا بخش کو بھی کہیں نہیں جانا۔ دس بیس سال تو ابھی مرتا نہیں۔ ہوں گی باتیں!

لیکن قنات کے اُس طرف صرف رنگ رنگ کے ڈبے پڑے تھے۔ اُن میں ایک ڈبہ اُس کے بھتیجے کا بھی تھا۔ جس نے ابھی پچھلے سال بی۔ اے پاس کیا تھا اور ہائی اسکول میں پڑھاتا تھا۔ اور اب یونین پنچایت کی ممبری کا امیدوار تھا۔ اُس کے مقابلے میں زمیندار کا لڑکا تھا۔ جو دن رات موٹر اڑاتا پھرتا تھا سنا تھا کہ لاٹ صاحب تک پہنچ ہے، لیکن اس کے باوجود چودھری اسکول ماسٹر کے ڈبے کی طرف بڑھا۔ اسے یقین تھا کہ ابھی آواز آئے گی چودھری ادھر نہیں، اس ڈبے میں۔ لیکن وہ نہ ہوا جس کی اُسے توقع تھی۔ اُس نے اطمینان سے اپنی پرچی ڈالی اور دوسرے دروازے سے باہر نکل گیا۔

اُس کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ یوں بھی ہو سکتا ہے۔ تھانیدار کی نیت پہ شک کرنے پر اسے دفعتاً سخت ندامت کا احساس ہوا۔ لیکن وہ ہے کہاں؟ — ہاں یہ وہی تو تھا۔ پٹواری سے بات کر رہا تھا۔ اور اُس کے چہرے پر اب بھی وہی مسکراہٹ تھی جو چودھری نے

پہلے دن دیکھی تھی۔ چودھری ہچکچاتے ہوئے اُس کی طرف بڑھا۔ لیکن اُس سے چند قدم کے فاصلے پر رُک گیا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں۔

"کہئے چودھری صاحب۔ ووٹ ڈال آئے؟"

"جی ہاں" چودھری نے گلوگیر آواز میں جواب دیا۔

"کسی نے دباؤ تو نہیں ڈالا؟"

"جی نہیں موتیاں والیو!"

"اچھا تو اجازت ــ پھر ملاقات ہوگی۔"

"ایک کام تھا ذرا۔"

"حکم کیجئے۔"

"جی۔ ذرا اِدھر آجاتے۔"

"خیریت؟"

"بس کچھ ایسی ہی بات ہے ــ بات یہ تھی میاں جی کہ غلطی ہوگئی تھی ایک۔ اُس کی معافی مانگنی تھی۔"

"کیسی غلطی چودھری صاحب؟"

"بس جی اب کیا بتاؤں۔ جھوٹ نہیں بولوں گا میاں جی۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ بھی ویسا ہی تماشہ ہوگا، پہلے جیسا۔ پر یہ تو ــــ"

"بات ہی اور نکلی!" تھانیدار نے قہقہہ لگایا۔ "میں نے تو پہلے ہی عرض کیا تھا کہ زمانہ بدل چکا ہے۔"

"بس بس یہی بات تو میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی ستر، بہتر ہوگیا ہوں نا میاں جی! معاف کرنا، موٹی سی بات بھول گیا کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔"

"شکر ہے کہ آپ کو یقین آگیا۔ آپ بزرگ ہیں، جہاندیدہ ہیں، اب آپ نوجوانوں کی رہنمائی کیجئے۔ اور اُنھیں اپنے تجربے سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیجئے۔"

یہ تمہاری بڑی مہربانی ہے۔ موتیاں والیو! اللہ تمھیں لمبی عمر دے! پر یہ تمہارا زمانہ ہے، نوجوانوں کا زمانہ ہے۔ ہم بڈھوں کو تو اب اللہ اللہ کرنے دو۔ اللہ تمھیں خوش رکھے۔"

تھانیدار کے دانت چمک اٹھے!

اور بڈھے چودھری کی آنکھیں نم آلود ہوگئیں!



بُت ٹوٹتے ہیں

انور عنایت اللہ

خان صاحب بشیرالدین پہاڑی جھاڑیوں سے بچتے بچاتے آہستہ آہستہ وہاں پہنچے تو بوڑھے برگد پر دونوں اُلوؤں نے سرگوشیاں شروع کردیں۔ "خاموشی سے دیکھتے جاؤ۔ آج یہاں بڑا دلچسپ تماشہ ہونے والا ہے۔" بڑے اُلو نے فلسفیانہ انداز میں ایک آنکھ بند کرکے دوسری سے غور سے خان صاحب کی چمکتی ہوئی چندیا کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ چھوٹے اُلو کو رازو نیاز کی باتوں میں کچھ زیادہ دخل نہیں تھا۔ وہ اِن دنوں بڑے اُلو کی تربیت میں تھا۔ دونوں اس ویرانے میں دور سے اُڑکر آئے تھے۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے فضل دین بھی وہاں آگیا۔ علیک سلیک کے بعد خان صاحب بشیرالدین نے بڑی نفاست سے دو انگلیوں کے درمیان جلتا ہوا سگریٹ رکھا، مُٹھی بند کی اور پھر بند مُٹھی سے منہ لگا کر زور کا ایک کش لینے کے بعد کھوئے کھوئے سے انداز میں سگریٹ کا دھواں چھوڑا۔ ندی میں اب بھی گھاٹ سے قریب ایک کشتی کھڑی تھی جس نے کبھی خان صاحب کے لئے بڑی خدمات انجام دی تھیں۔ شام کا دھندلکا پھیل رہا تھا اور دور اُفق سے قریب زرد سا چاند بادلوں کے سفید گالوں میں پھنسا آگ کا ایک بڑا گولہ لگ رہا تھا۔ سامنے فضل دین اب بھی غلاموں کی طرح ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔ پھر خان صاحب نے آہستہ سے کہا۔ یوں جیسے بے خیالی میں اپنے آپ سے مخاطب ہوں۔ "تو ماسٹر ظہیر کے بھی اب پر نکل آئے ہیں"۔

"جی ہاں، جی ہاں"۔ فضل دین نے فوراً لقمہ دیا۔ "کیا بتاؤں سرکار ـــ پچھلے مہینے شہر سے جنرل صاحب دورہ پر آئے تھے۔ سب سے پہلے ظہیر ماسٹر ہی نے ان سے ملاقات کی۔ دو گھنٹے وہ فوجی افسروں کے ساتھ رہا۔ مجھے یقین ہے اس نے آپ کے خلاف ضرور زہر اُگلا ہوگا۔" دوبارہ خاموشی چھاگئی۔ خان صاحب نے سگریٹ کا ایک اور طویل کش لیا اور انگلیاں چٹخائیں۔ یہ اضطراب کی نشانی تھی۔ چہرہ پر جھنجھلاہٹ کے بھی آثار اُبھر آئے تھے۔ فضل دین نے مالک کو خاموش دیکھا تو آہستہ سے کہا:

"وہ آپ کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتا! لیکن مجھے ڈر ہے کہ کہیں ہم سب کو نہ دھروادے۔ میں نے سنا ہے ظہیر ماسٹر کے فوجی افسروں سے بڑے اچھے تعلقات ہیں۔ سنا ہے اب وہ آپ کی جگہ لینے کے خواب دیکھنے لگا ہے ـــ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے سرکار ـــ اور پھر سلمان صاحب ـــ!" وہ رُک گیا۔ اُسے معلوم تھا کہ خان صاحب کو بیٹا بہت عزیز تھا۔ لیکن آج اس کا ذکر بھی تو ضروری تھا۔ ظہیر ماسٹر کی لونڈیا تو اسے لے ڈوبی تھی اور بڑے میاں کو ہوش ہی نہیں تھا۔

"سلمان کو فوجیوں سے نفرت ہے فضل دین"۔ خان صاحب نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ "تم اطمینان رکھو۔ وہ ہمارے ساتھ ہے ـــ لیکن فتنہ تو ظہیر ماسٹر ہے"۔

"جی ہاں سرکار ـــ دسمبر میں سنا ہے بنیادی جمہوریتوں کے لئے انتخاب ہوں گے ـــ اس میں ظہیر ماسٹر بھی الیکشن لڑیں گے ـــ توبہ توبہ کیا زمانہ آگیا ہے۔ اب ٹٹ پونجئے بھی سیاست میں حصہ لیں گے"۔ فضل دین نے کہا۔ خان صاحب کے چہرے سے لگ رہا تھا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ہوں۔

"سنو فضل دین"۔ انھوں نے آہستہ سے کہا۔ "تمہیں معلوم ہے ہم لوگ بڑے نازک دور سے گذر رہے ہیں۔ ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس کے بارے میں نہ میں زبان کھول سکتا ہوں اور نہ انتخابات میں حصہ لے سکتا ہوں۔ تم نے پچھلے بارہ سال میں ہمیشہ بڑی وفاداری سے میرا ساتھ دیا ہے جس کے لئے میں تمہارا شکرگزار ہوں۔ پچھلے سال بھر سے ملک میں جو باتیں ہو رہی ہیں ان سے نہ تمہارا کبھی بھلا ہوگا اور نہ میرا ـــ لیکن اب خدا کے فضل سے ایسے آثار پیدا ہوگئے ہیں کہ ہمیں ایک بار اور ملک و ملّت کی خدمت کا موقع ملے گا ـــ چونکہ میں اِن انتخابات میں حصّہ نہیں

لے سکتا۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم الیکشن لڑو۔"

"میں ـــ! یعنی میں!" فضل دین نے حیرت سے پوچھا۔ اس کی سمجھ میں غالباً یہ نہیں آرہا تھا کہ وہ بھلا الیکشن کیسے لڑ سکتا ہے۔ اس کی تو گاؤں میں پنساری کی دکان تھی۔ یوں تو وہ دسویں فیل تھا۔ خان صاحب کی رفاقت میں اس نے انگریزی بھی سیکھ لی تھی۔ لیکن الیکشن لڑنے کے لئے تو اور صفات ضروری تھیں۔ مثلاً علاقے میں رسوخ، اخراجات برداشت کرنے کی قوت، چرب زبانی، وغیرہ، وغیرہ۔ وہ تو اِن باتوں سے محروم تھا۔ یہ صحیح تھا کہ جب سے خان صاحب بشیر الدین اس پر مہربان ہوئے تھے اس کے لئے آمدنی کے کئی نئے دروازے کھل گئے تھے۔ اُس کے لئے بشیر صاحب کا وجود ایک بڑے سایہ دار درخت کا سا تھا۔ خود اس کی خدمات بھی کم نہیں تھیں۔ خطرہ صرف اسے مول لینا پڑتا۔ راتوں رات وفادار ساتھیوں کی مدد سے غلّہ وغیرہ سرحد کے پار پہنچانا جان جوکھوں کا کام تھا۔ خان صاحب کا زیادہ وقت تو مزے میں کراچی میں گذرتا۔ ہر ماہ وہ ایک آدھ دن کے لئے دولت آباد آتے اور چپکے چپکے آمدنی کے نت نئے ذرائع ڈھونڈ نکالتے۔ یہ سلسلہ تو بڑی پابندی سے ۷ اکتوبر ۵۸ء تک جاری رہا۔ پھر انقلاب کیا آیا سارا کاروبار ماند پڑ گیا۔ خان صاحب چپکے سے گاؤں لوٹ آئے اور گوشہ نشینی کے دن گذارنے لگے۔ شروع شروع میں تو فضل دین بھی خاصا سہما ہوا رہا۔ لیکن جب کئی مہینے گذر گئے اور فوجیوں نے نہ خان صاحب بشیر الدین کا رُخ کیا اور نہ فضل دین ہی کی باری آئی تو اُن کے حوصلے بلند ہو گئے۔ اب خان صاحب روزانہ شام کو ویرانے میں سیر کو نکلتے۔ موقع دیکھ کر فضل دین بھی ندی کنارے اِن پہاڑیوں میں پہنچ جاتا اور پھر دونوں اگلے وقتوں کی باتیں کرتے، ایک دوسرے سے ہمدردی کرتے، انقلابی حکومت کی اصلاحات کا مذاق اڑاتے اور اُس دن کا شدت سے انتظار کرتے جب یوں ہوگا کہ پاکستان کو دوبارہ اس کے اُن سچے خادموں کے حوالے کر دیا جائے گا ـــ جو ۷ اکتوبر ۵۸ء تک بے لوث خدمات انجام دیتے رہے تھے اور بار بار نت نئی وزارتیں بنا کر بیرونی دنیا میں ملک کا بول بالا کرتے رہے تھے اور اس کا ثبوت پیش کرتے رہے تھے کہ ہم صحیح معنوں میں ایک زندہ قوم ہیں!

"جب ظہیر ماسٹر الیکشن لڑ سکتا ہے تو تم بھی لڑ سکتے ہو فضل دین!" خان صاحب نے فضل دین کو خاموش دیکھا تو کہا۔ "میں نے پچھلے بیس سال سے بھاڑ نہیں جھونکا۔ سیاست ہمیشہ میرے گھر کی لونڈی رہی ہے۔ میں نے مصلحتاً سیاست سے کنارہ کشی کر لی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اب ظہیر ماسٹر جیسے ٹٹ پونجیئے ہم پر حکومت کر سکیں گے۔"

"جی ہاں۔ سنا ہے اب حکومت گنواروں کے ہاتھ میں دی جائے گی۔ ہی ہی ہی ہی!" فضل دین نے مالک کو خوش کرنے کے لئے قہقہہ لگایا۔

"میں نے بھی سنا ہے فضل دین ـــ سب سے نچلی منزل ہوگی یونین کونسل۔ اس کے بعد مغربی پاکستان میں تحصیل کونسل ہوگی اور مشرقی پاکستان میں تھانہ کونسل۔ تیسری منزل ہوگی ضلع کونسل۔ اس کے بعد ڈویژن کونسلیں آئیں گی ـــ یہ ہے بنیادی جمہوریتوں کا ڈھانچہ۔ یہ لوگ اس ترقی یافتہ دنیا میں ہزاروں سال پرانا نظام رائج کرنے کی کوشش کر رہے ہیں فضل دین ـــ ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا ـــ ورنہ ہمارا پیارا ملک تباہ ہو جائے گا ـــ سنو فضل دین ـــ!"

انھوں نے فضل دین کو اپنے قریب کر لیا، اور اپنے موٹے دستے کی چھڑی کا سہارا لے کر سرگوشیوں میں اسے کچھ سمجھانے لگے۔ بوڑھے برگد پر یکایک چھوٹے اُلّو نے آہستہ سے پوچھا۔ "اب کیا ہوگا؟ ملک کا غم تو انھیں اب بھی کھائے جا رہا ہے!"

"شی! ـــ چپ چاپ تماشہ دیکھو۔" بڑے اُلّو نے مشورہ دیا۔ اب رات کی سیاہی چپکے سے بڑھ گئی تھی اور بیمار سا چاند اب بھی بادلوں میں پھنسا ہوا تھا۔ یکایک دور سے انجن کی چیخ سنائی دی جو چند لمحوں تک فضا میں تھراتی رہی۔ جب تک خان صاحب بشیر الدین بولتے رہے، فضل دین غور سے سنتا رہا۔ بیچ بیچ میں وہ سر ہلا کر اس بات کا ثبوت دیتا جاتا کہ تمام باتیں اس کی سمجھ میں آرہی تھیں۔ چند لمحوں کے بعد گفتگو ختم ہو گئی۔ فضل دین جس طرح چپکے سے ندی کے کنارے کنارے یہاں آیا تھا اسی طرح لوٹ گیا۔ خان صاحب بشیر الدین نے ایک اور سگریٹ سلگایا اور اس پگڈنڈی پر ہو لئے جو نشیب میں دور آبادی تک چلی گئی تھی۔

اُن کے جانے کے بعد بوڑھے برگد پر چھوٹے اُلّو نے ٹھنڈی سانس لی۔ یکایک دو سائے پہاڑی ٹیلوں کے پیچھے سے نکلے اور چاند کی دھیمی روشنی میں آ گئے تو وہ بُری طرح سے چونک اٹھا۔

"کیوں؟ ڈر گئے؟" بڑے الّو نے مسکرا کر پوچھا۔ "تمھیں ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے ـــ یہ دونوں تو بڑی دیر سے یہاں چھپے بیٹھے ہیں۔ یہ دنیا بیحد عجیب ہے برخوردار ـــ اُس طرف جنگلی چوہے کو کیوں گھور رہے ہو؟ شکار کے لئے تو رات پڑی ہے ـــ خبردار منہ نہ کھولنا ورنہ فوراً یہ دونوں یہاں سے چلے جائیں گے۔" چھوٹا الّو بڑی فرمانبرداری سے اس سڈول جسم والی حسین لڑکی کو دیکھنے لگا جو ایک ٹیلے پر جا بیٹھی تھی اور اب ساڑی کے پلّو سے کھیلنے لگی تھی۔ حمیدہ خاموش تھی۔ سلمان نے بے چینی سے سگریٹ سلگایا۔ حمیدہ نے ماچس کی کانپتی روشنی میں دیکھا اُس کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئی تھیں اور چہرے پر جھنجھلاہٹ کے آثار تھے۔ حمیدہ خود بھی مضطرب تھی لیکن اس نے اپنے جذبات پر اب قابو پا لیا تھا۔

"کیا سوچنے لگے؟" حمیدہ نے آہستہ سے پوچھا۔ یہ بات چیت ضروری تھی ورنہ یہ معنی خیز خاموشی پاگل کر دیتی۔

"سوچ رہا ہوں ـــ کاش، ہم آج اِس طرف نہ آتے۔" سلمان نے جواب دیا۔

"حقائق سے اس قدر گھبراتے ہو؟ ـــ دیکھ لیا نہ سلمان؟ ـــ میرے بابا کے خلاف کیسی سازشیں ہو رہی ہیں؟ اسی لئے کہتی تھی کہ تمھیں اس قدر بے تعلق نہیں رہنا چاہئیے۔ میں جانتی ہوں تم شاعر ہو۔ تمہیں اِن بکھیڑوں سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ لیکن سلمان! ہم ایک بڑے نازک دور سے گذر رہے ہیں۔ آج جو ہمارے ملک میں ہو رہا ہے اس پر ہمارے مستقبل کا بڑی حد تک دار و مدار ہے۔ اس سے بے تعلقی غلط ہے۔ اسی لئے آج کئی دنوں سے سمجھا رہی ہوں۔ خدا کے لئے ہوش میں آؤ۔ باطل کی قوتیں اب بھی تاک میں ہیں۔"

حمیدہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ سلمان خاموش کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ چہرہ سے لگ رہا تھا جیسے کسی الجھن میں مبتلا ہو۔ حمیدہ نے بیٹھے ہی بیٹھے داہنا ہاتھ بڑھایا اور ہاتھ کی چوڑیاں یکایک جھنجھنا اٹھیں۔ اس نے آہستہ آہستہ سے کہا۔

"سلمان! ـــ یہاں آؤ ـــ میرے پاس۔" آواز میں پیار تھا اور اس دھیمی سی روشنی میں اس کا گورا سڈول بازو بے حد حسین لگ رہا تھا۔ سلمان آگے بڑھا تو حمیدہ نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا ـــ پیار سے اس کا سر اپنے شانے پر رکھ لیا اور اسے یوں بہلانے لگی جیسے وہ ننھا منا سا بچہ ہو۔

"سنو سلمان! آج میں تم سے صاف صاف باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ تم نے اکثر مارشل لاء کی سختی سے مخالفت کی لیکن یہ نہیں سوچا کہ ہر خطرناک بیماری کا علاج خطرناک ہوتا ہے۔ اور یہ مارشل لاء اتنا سخت ہے کب؟ تم نے دوسرے ملکوں کے خونی انقلابوں کو نہیں دیکھا۔ خیر، تو ہمارے سیاستدانوں نے جس قسم کی دھاندلی ملک میں شروع کر رکھی تھی اس کا علاج مارشل لاء ہی تھا۔ تمھیں وہ شام یاد ہے جب ہم دونوں اِن ہی پہاڑیوں میں دور تک نکل گئے تھے اور تم نے کہا تھا۔ ایسا نظام کس کام کا جس میں جمہوریت کو دخل نہ ہو ـــ میں خاموش ہو رہی تھی۔ لیکن آج پوچھتی ہوں ـــ ہمارے ملک میں جمہوریت تھی کب؟ ـــ اگر جمہوریت ہوتی تو ایک بڑے معقول وزیر اعظم کی وزارت کبھی توڑی نہیں جا سکتی تھی۔ حالانکہ پارلیمنٹ میں انھیں اکثریت حاصل تھی۔"

اس پر سلمان نے فوراً کہا۔ "تم نے یہ بھلا دیا کہ اس کے بعد جب بھی کوئی وزیر اعظم بنا اسے اکثریت حاصل ہو گئی۔"

حمیدہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور آنکھوں سے یوں لگا جیسے سلمان کے اس جواب سے خوش ہوئی ہو۔

"بالکل ٹھیک کہا تم نے ـــ ہمارے ملک کا تو قرینہ ہی یہ ہو گیا تھا کہ چڑھتے سورج کو سلام کرو۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا سیاست داں طبقہ ازل سے ابن الوقت رہا ہے۔ اس نے جس کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور دیکھی اس کا ساتھ دیا۔ عوام کو ان لوگوں نے ہمیشہ بے تعلق رکھا۔ اس لئے صحیح رائے عامہ بھلا کب پیدا ہوئی؟" حمیدہ کی باتیں غالباً سلمان کی سمجھ میں آنے لگی تھیں۔

"یہ تو ہونا ہی تھا۔ جہاں کے عوام تعلیم سے بے بہرہ ہوں وہ بھلا ملک کی سیاست میں کیسے حصہ لے سکتے ہیں؟"

"یہی تو میں بھی کئی دنوں سے سمجھا رہی ہوں جناب ـــ اب بنیادی جمہوریتوں کی اہمیت تمھاری سمجھ میں آجائے گی۔ ہمارے عوام کی محدود صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے ایک ایسا طریقہ رائج کیا جا رہا ہے جس کی رو سے وہ پہلی بار براہِ راست حکومت کے انتظامی امور میں حصہ لے سکیں گے۔ چونکہ ہمارے یہاں آبادی کا پچاسی فی صد حصہ دیہاتوں میں بسا ہوا ہے اس لئے یہ تجربہ دیہاتوں سے شروع ہوگا۔ ملک میں نمائندہ حکومت کے قیام کے سلسلے کی اسے پہلی منزل سمجھو۔ اس کے لئے بقراطِ وقت ہونے کی ضرورت نہیں بس اپنے حلقے کے معاملات کی سمجھ بوجھ ہونی چاہیئے۔"

حمیدہ یکایک رک گئی کیونکہ ایک کشتی اب قریب آ گئی تھی اور لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی ہوئی چاندنی میں اس کا مٹیالا بادبان ہوا کے تھپیڑوں سے مقابلہ کر رہا تھا اور دور سے اب مانجھی کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی جو بڑا اداس نغمہ الاپ رہا تھا۔

حمیدہ اور سلمان کا بچپن اسی ویرانے میں گزرا تھا جب دونوں ان پہاڑوں میں رنگ برنگی تتلیوں اور حسین جنگلی پھولوں کی تلاش میں گھنٹوں اِدھر اُدھر مارے مارے پھرا کرتے۔ حمیدہ مقامی اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی بیٹی تھی۔ اس نے اسی سال ضلع کے کالج سے بی۔ اے پاس کر لیا تھا۔ سلمان زمیندار کا بیٹا تھا۔ خان صاحب بشیر الدین کو ہمیشہ سے سیاست سے دلچسپی رہی۔ جب زمینداری چلی گئی تو سیاسی گتھیاں اور پیچیدہ ہو گئیں۔ ان کی بڑی آرزو تھی کہ بیٹا ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ملک کی سیاست میں حصہ لے اور پاکستان کا وزیرِ اعظم بن جائے۔ پچھلے دس سال میں تک کا ہر سیاستدان وزیرِ اعظم بننے کا ہی تو خواب دیکھا کرتا تھا۔ سلمان کو یہ مشغلے ایک آنکھ نہ بھاتے۔ اس نے پچھلے سال فلسفہ میں ایم۔ اے کیا تھا۔ شعر و شاعری کے دائرے سے نکل کر وہ کسی قسم کی ذمہ داری قبول کرنے کے لئے مطلق تیار نہ تھا۔ وہ تو اپنے باپ کو فرشتہ سمجھتا لیکن ابھی ابھی کچھ دیر پہلے اس نے جو باتیں سنی تھیں اس سے اس کے جذبات بری طرح سے مجروح ہوئے تھے۔ اسے آج پتہ چلا تھا کہ اس کا باپ انسان کے روپ میں شیطان تھا۔ اس نے اب تک اس علاقے میں غیر قانونی درآمد برآمد کی صرف کہانیاں ہی سنی تھیں لیکن آج اسے ثبوت مل گیا تھا کہ یہ داستانیں فرضی نہیں تھیں۔ اُن کی پُشت پر خود اس کا صاحبِ اثر، با رسوخ باپ تھا۔ جواب موقع دیکھ کر ایک بار پھر سر اٹھانے کی سوچ رہا تھا۔ حمیدہ کے تمام خدشے صحیح ثابت ہوئے تھے۔

دونوں اپنے خیالوں میں کھوئے نہ جانے کب تک بیٹھے رہے۔ حمیدہ کا چہرہ پُرسکون تھا لیکن سلمان مضطرب تھا۔ اُس کے باغی بالوں کی ایک ننھی سی لٹ پیشانی پر آ گئی تو حمیدہ نے پیار سے یہ لٹ ہٹا دی۔ سلمان نے چونک کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور بوڑھے برگد پر دونوں اُلوؤں نے بڑے فلسفیانہ انداز میں ایک دوسرے کو دیکھ کر سرگوشیاں شروع کر دیں۔ ادھر حمیدہ کہہ رہی تھی۔ ہمارے یہاں جمہوریت بے چاری کو تو آزادی سے کام کرنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ اس کی بنیاد ہمیشہ کمزور رہی کمی گئی۔ جب زمین پر بسنے والے لاکھوں عوام اور آسمان پر رہنے والے پیشہ ور سیاست دانوں کے درمیان کوئی رابطہ باقی نہ رہا تو یہ ڈھانچہ زمین پر آ رہا۔ سیدھی سی بات ہے سلمان! ایک دیہاتی کے لئے سیاست دانوں کے گروہ میں سے کسی کو چننا آسان نہیں ہے کیونکہ وہ ان سے مطلق واقف نہیں ہوتا۔ لیکن اگر اس سے کہا جائے کہ اپنے دیہاتی بھائیوں میں سے کسی کو نمائندہ چنو تو وہ یقیناً صحیح نمائندہ چنے گا۔ کیونکہ ایسی صورت میں غلطی کے امکانات بہت کم ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے انقلابی حکومت نے ملک بھر میں بنیادی جمہوریتوں کے قیام کا فیصلہ کیا جس کے تحت عنقریب ملک بھر میں انتخابات ہونے والے ہیں۔"

"— جس کے لئے عادل آباد والوں نے تمہارے والد کو نامزد کیا ہے اور جن کے مقابلے میں ہمارے والد خان صاحب بشیر الدین، رئیسِ اعظم عادل آباد، سابق رکن پاکستان نیشنل اسمبلی، "فضل دین" جیسے بدمعاش کو کھڑا کر رہے ہیں تاکہ اس کی آڑ لے کر دوبارہ ملک کی سیاست میں دخل دے سکیں۔" سلمان نے فوراً کہا۔ اس کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی۔

"دیکھ لیا نا!" بڑے الو نے آہستہ سے کہا۔ "یہی ہوتا ہے میاں اس دنیا میں۔ لیکن دیر یا سویر حق کی قوتوں کے آگے باطل کی طاقتوں کو جھکنا ہی پڑتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ارتقا کا سلسلہ رک جائے یہ دنیا ختم ہو جائے۔"

"لیکن اب ہوگا کیا؟" چھوٹے الو نے بے چینی سے پوچھا۔ بڑے الو نے کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ وہ غور سے سلمان کو دیکھ رہا تھا۔ سلمان نے یکایک اٹھتے ہوئے کہا۔ "اب یہ نہیں ہوگا حمیدہ! بخدا میں یہ ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔ چلو، مجھے فوراً اپنے والد کے پاس لے چلو۔ میں ان کی کھلی حمایت کروں گا۔ دیکھتا ہوں خان صاحب بشیر الدین میں مجھ سے مقابلے کی تاب ہے یا نہیں اب دیکھتا ہوں فضل دین کیسے الیکشن لڑتا ہے۔"

اُس نے حمیدہ کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی گرفت سخت ہو گئی اور دونوں چپ چاپ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے، اُس ویران پگڈنڈی پر ہو لئے جو چاند کی سنہری روشنی میں سفید لکیر سی نظر آ رہی تھی اور بل کھاتی ہوئی ظہیر ماسٹر کے گھر تک چلی گئی تھی جہاں اس علاقے کے کئی بارسوخ لوگ، ہونے والے انتخابات کے سلسلے میں بعض اہم فیصلے کرنے کے لئے جمع تھے۔ چاند اب بھی تاریک بادل کے ایک بڑے ٹکڑے کے پیچھے چھپا ہوا تھا لیکن بادل کے چاروں طرف تیز روشنی کا ایک ہالہ بن گیا تھا اور اب سنہری چاندنی آسمان پر پھیل گئی تھی۔

پھر دھان کے خوشے لہرائے

یونس احمد

بادل کی گرج کے ساتھ ساتھ کلثوم کا دل بھی دھڑک اٹھتا تھا۔ نیا گھر، نئی فضا، نئے چہرے، نئے در و دیوار، ہر چیز نئی۔ اس کے دل میں اس وقت جو بیتابی تھی اس کا اظہار بھی وہ کسی سے نہیں کر سکتی تھی۔ کرتی بھی کیسے۔ اسے تو اس گھر میں قدم رکھے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ اگر جرأت کر کے ساس یا نند سے کچھ کہتی بھی تو فوراً بے شرم ہونے کا خطاب مل جاتا۔ وہ چپ چاپ ٹکٹکی باندھے کفیل میاں کا انتظار کرنے لگی۔ آج خلافِ معمول اسے کھیت سے لوٹنے میں دیر ہو گئی تھی۔ بہت دیر تک تو کلثوم اپنے دل کو سمجھاتی رہی۔ بارش کی وجہ سے شاید وہ کہیں رک گئے ہونگے لیکن جب ایک ایک پل بھاری ہونے لگا تو اس کی بیقراری بھی بڑھنے لگی اب تو رہ رہ کر بجلی بھی تڑپ اٹھتی تھی۔ ایک بار بجلی کچھ اس تیزی سے لہراتی ہوئی آئی کہ اس کے حلق سے چیخ نکل جاتی مگر وہ بڑی مشکل سے ضبط کر سکی۔ پدما میں بھی طغیانی آ گئی تھی۔ اس کی بیتاب لہروں کا شور صاف سنائی دے رہا تھا۔

رات بیحد تاریک تھی۔ اماوس کی رات سے بھی زیادہ تاریک اور بھیانک۔ مینڈکوں کے ٹرانے کی آوازوں سے فضا اور بھی ڈراؤنی ہو گئی تھی۔ کلثوم نے لالٹین کی دھیمی روشنی کو اور تیز کر دیا۔ اس کا کمزور دل برابر دھڑک رہا تھا۔ یکایک بادل اس زور سے گرجا کہ گاؤں کے کتے ایک ساتھ بھونکنے لگے۔ اور کلثوم نے جلدی سے کمرہ کا دروازہ بند کر لیا۔ پھوس کی چھت دو ایک جگہ سے ٹپکنے لگی تھی۔ صحن بھی پانی سے ڈوب گیا تھا۔ اب اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہونے لگے۔ برے برے خیالات۔ "خدانخواستہ وہ...... نہیں نہیں چودھری اتنا کٹھور نہیں ہو سکتا۔ چند پیسوں کے لئے اس سے ایسی ذلیل حرکت سرزد نہیں ہو سکتی...... تو پھر...... وہ کہاں رہ گئے۔ میرے خدا۔" اس نے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ مگر کہاں، کوئی بھی تو نہیں۔ وہ ڈرتے ڈرتے صحن میں آ گئی۔ بارش تھم گئی تھی۔ مگر بھیانک اندھیرا ابتک اسے کاٹے کھا رہا تھا۔

کلثوم پھر کمرے کے اندر گئی اور اب اس نے لالٹین کو چوکھٹ پر رکھ دیا ابھی وہ پلٹنے ہی والی تھی کہ کانوں میں آواز آئی "کلثوم!" آواز جانی پہچانی تھی۔ اس نے فوراً لالٹین اٹھالی۔ صحن میں پانی اب تک کھڑا تھا۔ "آج تو تم بہت پریشان ہوئی ہو گی" لیکن کلثوم چپ چاپ کھڑی رہی۔ اس کی زبان جیسے گنگ ہو گئی تھی۔ کفیل میاں نے کلثوم کے ہاتھ سے لالٹین لے لی اور کہا۔ "چلو نا" دونوں کمرے میں داخل ہوئے۔

کلثوم نے بچھی ہوئی چادر دیتے ہوئے کہا "بارش میں بھیگ گئے ہو۔ جسم پونچھ لو اس سے۔"

"ہی ہی ہی" کفیل میاں کو ہنسی آ گئی۔ "کلثوم تم کتنی اچھی ہو۔ تمہیں دیکھ کر میں اپنا سارا دکھ درد بھول جاتا ہوں۔ آج ہی کی بات ہے، خیر چھوڑو۔"

"کیا بات ہے؟" کلثوم نے چٹائی بچھاتے ہوئے کہا۔ "خدا کے لئے......"

"ارے پگلی کچھ بھی نہیں۔ تم تو فوراً پریشان ہو جاتی ہو" کفیل میاں نے چٹائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں ضرور کوئی بات ہے۔ اسی لئے تو میرا دل دھڑک رہا تھا" کلثوم نے سالن نکالتے ہوئے پوچھا۔

"وہی چودھری آج پھر مل گیا تھا"

"کیا کہا اس نے؟" کلثوم کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

"پہلے کھانا کھالو پھر بتاؤں گا" کفیل میاں نے سمجھاتے ہوئے کہا
"نہیں پہلے بتا دو۔"
"میں سب کچھ بتا دوں گا۔ کوئی بات تم سے چھپاتا تو نہیں ہوں"
"کمینہ۔ بدذات"
"ارے ارے، تم تو گالی بھی دینے لگیں۔ دیکھو کوئی سن نہ لے"
دونوں کھانے سے فارغ ہو کر بیٹھے ہی تھے کہ کلثوم پھر پوچھ بیٹھی "ہاں کیا کہہ رہا تھا وہ چودھری؟"
"وہی پرانی باتیں۔ کہنے لگا اس بار اپنی فصل کسی اور کے ہاتھ بیچی تو کھیت جلا ڈالوں گا"
"بڑا آیا کھیت جلانے والا" کلثوم کو غصہ آگیا تھا۔
"جانتی ہو میں نے کیا جواب دیا اسے۔ میں نے کہا۔ دیکھا جائے گا"
"پھر چودھری نے کیا کہا؟"
"میرے سامنے وہ سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں انگارے برسانے لگیں۔ کہنے لگا۔ کھیت میں آگ نہ لگا دوں تو میرا نام رفیق الدین چودھری نہیں۔ سپاہی بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ روپے سے سب کو خرید سکتا ہوں"
کلثوم نے لالٹین کی روشنی دھیمی کر دی "سچ مچ اگر اس نے آگ لگا دی تو"
"فکر نہ کرو کلثوم" اور یہ کہہ کر اس نے کلثوم کو لالٹین کی دھیمی روشنی میں غور سے دیکھا۔ کلثوم کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں سچ مچ جادو گھل مل گیا تھا۔

اس بار کفیل میاں کے کھیت میں دھان کی فصل بہت اچھی ہوئی تھی۔ ہوا میں جھومتے ہوئے خوشوں کو دیکھ کر اس کا دل بھی جھوم اٹھتا تھا۔ اس نے ایک دن کلثوم سے کہا "اس بار ہماری فصل بہت اچھی ہوئی کلثوم۔ اب تو گھر کی چھت پر ٹین ڈلوا کر رہوں گا۔ تمہیں برسات میں کتنی تکلیف ہو رہی ہے۔ اور جانتی ہو میں نے کیا سوچا ہے؟"
"کیا سوچا ہے بھلا؟" کلثوم نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
"شہر جا کر تمہارے لئے ساریاں لاؤں گا۔ خوبصورت چوڑیاں اور ٹیکا بھی"
"مجھے نہیں چاہئیں یہ چیزیں۔ میں تو چاہتی ہوں کہ تم پیسے جمع کرنا سیکھو"
"دل کی آرزو بھی تو کوئی چیز ہے کلثوم۔ شادی کے موقع پر تمہیں کچھ نہ دے سکا تھا۔ میں نے شادی سے پہلے خدا سے دعا کی تھی کہ اس بار فصل اچھی ہوئی تو اپنی ہونے والی بیوی کے لئے بہت کچھ لاؤں گا۔ خدا نے میری دعا سن لی" کفیل میاں نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ اور کلثوم ایکدم سے شرما گئی ــــ بالکل نئی نویلی دلہن کی طرح۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں فوراً جھک گئیں۔ بڑے سلیقے سے اس نے سر پر آنچل رکھا۔
"یہ تو تمہارے ہی قدم کی برکت ہے کلثوم کہ فصل اتنی اچھی ہوئی۔ ورنہ پچھلے کئی سال سے برابر فصل کسی نہ کسی وجہ سے تباہ ہو جاتی تھی۔ کبھی پدماتی میں سیلاب آجانے سے کھیت بہہ گیا کبھی خشک سالی آگئی کبھی کچھ کبھی کچھ۔ میں سچ مچ کتنا خوش قسمت ہوں۔ بس کل پرسوں سے کٹائی شروع ہو جائے گی۔ جی چاہتا ہے ابھی سے ناچوں، گاؤں۔ خوشیاں مناؤں۔ میرے دل میں کتنی آرزوئیں بھری پڑی ہیں۔ کتنے سہانے سپنے دیکھتا رہا ہوں" اتنا کہہ کر وہ یکایک چونک پڑا۔
"اوہ، سورج نکل آیا۔ آج تو بہت دیر ہو گئی جانے میں" اور وہ جانے ہی والا تھا کہ اس کو راجو چاچا کی آواز آئی "ایں راجو چاچا اور اس وقت" کفیل میاں چونک پڑا۔
"کیا بات ہے راجو چاچا؟" کفیل میاں نے باہر آتے ہوئے پوچھا۔

"کفیل غضب ہو گیا۔"

"غضب ہو گیا؟ کیا ہوا؟" کفیل پریشان ہو گیا۔

"تمہارے کھیت میں کسی نے آگ لگا دی۔"

"آگ!" کفیل میاں کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ لیکن تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ رفیق الدین چودھری کی تصویر اس کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ ان آرزوؤں کا کیا ہوگا جو سینے میں پرورش پا رہی تھیں۔ ساس وعدے کا کیا ہوگا جو اس نے اپنی کلثوم سے کیا تھا۔ اب کیا ہوگا۔ رفیق الدین چودھری سے ٹکر لینا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اس کے پاس دولت تھی۔ وہ اپنی دولت سے کیا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس دولت کے بل پر ہی تو وہ الیکشن لڑا اور کامیاب بھی ہو گیا تھا۔ وہ تو ڈنکے کی چوٹ کہتا تھا کہ میں اپنی دولت سے سارا ملک خرید سکتا ہوں۔ کفیل میاں نے جوانی کے نشے میں آ کر اس کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا جس کا نتیجہ اب اس کے سامنے تھا۔ اب تو دھان کے خوشے راکھ کا ڈھیر بن گئے تھے۔ اب اس کی تمنائیں برف کا تودہ بن گئی تھیں۔

ایک سال کے بعد ـــــ

"راجو چاچا، راجو چاچا" کفیل میاں کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔

"میں سمجھ گیا بیٹے۔ میں سمجھ گیا۔ کمائی خوب اچھی ہوئی ہے۔ کیوں؟"

"ہاں راجو چاچا۔ میں نے پھوس کی چھت بدل کر ٹین ڈلوا دیا ہے۔ کلثوم کے لئے شہر سے ساریاں، چوڑیاں اور ٹیکہ بھی خرید لایا ہوں۔"

"شہر گئے تھے تم۔ مجھے بتایا ہوتا بیٹے؟"

"کیوں چاچا؟"

"دیکھو نا کتنے دنوں سے چشمے کی یہ کمانی ٹوٹی پڑی ہے۔"

"جلد ہی پھر جاؤں گا چاچا۔ اس بار ضرور لا دوں گا۔ اور ہاں سنو شہر میں رحمان سے بھی ملاقات ہوتی۔"

"کچھ بتایا اس نے کب آ رہا ہے؟ وہ تو بالکل بھلا بیٹھا اپنے باپ کو۔" راجو چاچا کی آواز بھرا گئی۔

"چاچا پریشان نہ ہوں۔ جلد آنے والا ہے۔ اس سے بہت دیر تک عجیب عجیب باتیں ہوئیں۔"

"عجیب عجیب باتیں! مطلب؟"

"چاچا وہ تو بالکل بابو معلوم ہوتا ہے۔ شہر کا بابو۔ ڈاڑھی تو پہلے ہی نہ تھی اب مونچھیں بھی غائب ہیں۔"

"کلجگ ہے بیٹے کلجگ ہے۔ شہر کی ہوا خوب راس آئی اسے۔ ہاں کیا کہہ رہا تھا وہ؟"

"چاچا اس کے پاس ایک کتاب تھی۔ اس نے مجھے ہوٹل میں لیجا کر سب سنایا۔"

"کیسی کتاب؟ ہوگی بائیسکوپ کی کوئی کتاب۔ شہر جا کر بالکل تباہ ہو گیا وہ تو۔"

"نہیں چاچا بڑے ہی کام کی کتاب تھی۔ ہمارے ہی فائدے کی باتیں لکھی ہوئی تھیں اس میں۔"

"بیوقوف نہ بنا مجھے کفیل۔ یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کئے ہیں۔ مجھے تو پہلے ہی شبہ تھا کہ اس کا چال چلن بگڑ گیا ہوگا جب ہی تو گاؤں نہیں آتا ہے۔ شہر کی ہوا ہی ایسی ہے۔"

"چاچا قسم خدا کی ایسی کوئی بات نہیں۔ رحمان بھائی جلد گاؤں آ رہے ہیں اور انتخاب میں حصہ لیں گے۔"

راجو چاچا کو ہنسی آ گئی۔ بولے۔ "معلوم ہوتا ہے شہر کی ہوا تمہیں بھی لگ گئی ہے۔ پاگلوں جیسی باتیں کرنے لگے۔"

کفیل نے راجو چاچا کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "چاچا، رحمان بھائی نے بتایا ہے کہ ہماری نئی حکومت نے گاؤں میں کونسل کی طرح کا ایک

طریقہ چلانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اب چودھریوں کی دال نہیں گلے گی اور نہ وہ اپنی دولت سے گاؤں والوں کو خرید سکیں گے۔"

"اس کا فائدہ" راجو چاچا نے سوال کیا۔ اب ان کے چہرے پر سنجیدگی آ گئی تھی۔

"اس کے فائدے بہت ہیں چاچا۔ گاؤں والے اپنے معاملوں کا خود ہی فیصلہ کریں گے۔ عدالت اور پولیس کا کام بھی یونین کونسل ہی کے سپرد کیا جائے گا۔"

یہ سن کر راجو چاچا کی باچھیں کھل گئیں۔ ان کے چہرے کی تھکن ایک دم سے غائب ہو گئی۔ کہنے لگے۔ "ہاں ہونا تو یہی چاہیئے تھا بیٹے کفیل۔ مگر ہم گاؤں والوں کو ہمیشہ بیوقوف بنایا گیا۔ ہم گاؤں والے اپنے اچھے برے کو خوب پہچانتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اگر گاؤں ڈوبا تو ہم ڈوبیں گے۔ ہمیں تو برابر سبز باغ دکھایا جاتا رہا اور ہماری زندگیاں بد سے بدتر ہوتی گئیں۔" یہ کہہ کر راجو چاچا چلم بھرنے لگے۔

"چاچا ایک بات کہوں برا تو نہیں مانیں گے" کفیل میاں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"کہو کہو۔ آج تو تم بڑی سوجھ بوجھ کی باتیں کر رہے ہو۔"

"راجو چاچا گاؤں کے سردھرے آپ ہی ہیں۔ ہم تو آپ ہی کو اپنا سردار چنیں گے۔"

"ہی، ہی، ہی" راجو چاچا کو زور سے ہنسی آ گئی۔ "بیوقوف کہیں کے۔ پنچ اگر چاہے تو ٹھیک ہے۔"

کفیل نے چلم پھونکنا شروع کیا۔ جب گڑگڑی تیار ہو گئی تو اس نے کہا۔ "لو چاچا پیو۔ آج تو دو کش میں بھی لگاؤں گا۔"

"بتاؤ آجکل رفیق الدین چودھری کہیں نظر نہیں آتا ہے۔ کیا بات ہے؟ ملاقات ہوئی تم سے؟"

"کچھ لوگ تو کہتے ہیں کہ وہ گاؤں چھوڑ کر بھاگ گیا ہے مگر مجھے یقین نہیں آتا۔ اسے تو اپنی بے ایمانی سے کمائی ہوئی دولت پر گھمنڈ ہے۔ وہ کسی نہ کسی روپ میں انتخاب ضرور لڑے گا۔"

راجو چاچا نے زور کا ایک کش لیتے ہوئے کہا۔ "ہنہ! دولت۔ میں کروں گا اس کا مقابلہ۔"

یکایک پیپل کے بڑے بڑے پتے کھڑکے اور زور کی ہوا چلنے لگی۔ کفیل نے سر اٹھا کر اپنے کھیت کی طرف دیکھا۔ دھان کے خوشے ہواؤں سے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے اسے دوبارہ زندگی ملی ہے۔ اسے اب رفیق الدین چودھری کا ڈر نہ تھا۔ اب تو کھیت کسانوں کے تھے۔ گاؤں گاؤں والوں کا تھا۔ دھان کے خوشوں میں ان کی آرزوئیں پروان چڑھ رہی تھیں۔ ان کی سرسراہٹوں میں ان ہی کے گیت چھپے ہوئے تھے جو ہواؤں کے ساتھ فضا میں بلند ہو رہے تھے۔

کفیل میاں کی نگاہیں دھان کے خوشوں سے ہٹ کر کسی اور کو ڈھونڈنے لگیں۔ وہ بیتاب ہو گیا۔ اس نے راجو چاچا کی گڑگڑی کا ایک کش لیتے ہوئے کہا۔ "اچھا چاچا میں چلا۔ کلثوم انتظار کر رہی ہو گی۔"

"ہاں بیٹے جاؤ۔ بہت دیر ہو گئی تمہیں" اور یہ کہہ کر وہ ہنس پڑے۔ ان کی ہنسی کی اڑان دھان کے خوشوں تک جا پہنچی۔ اور ساتھ یہ خوشے بھی لہرانے لگے۔



ستاروں کی آخری منزل

محمد عمر میمن

اور جب کھیت جاگیں گے تو...... ؟ راجے کی ماں ایک نئی شلوار پہنے گی اور راجے کی بہن، ؟ ایک شوخ رنگ کا لہنگا پہن کر بڑے فخر سے گاؤں کی مٹیاروں کے ساتھ مل کر گھر پر مٹکا دھرے ندی پر پانی بھرنے جایا کرے گی۔ اور خود راجے کو ایک نئی نویلی، لجاتی شرماتی، جوانی کی حدت سے سرشار دلہن ملے گی جو اس کے جیون میں اپنے دھڑکتے، پر نور وجود سے ہر سو اجالا بکھیر دے گی، جو اس کے لئے اپنی جوان کوکھ سے ایک لڑکے کو جنم دے گی ــــ یہ لڑکا جوان ہو کر اپنے باپ کی جگہ لے لے گا، اور یہ کہانی یونہی دہرائی جاتی رہے گی۔

یکایک بوڑھے کسان کو خیال آیا، آنے والی سردی سے بچنے کے لئے اس کے بوڑھے اور لاغر جسم کو ایک عدد پتوہی یعنی صدری کی بھی تو ضرورت ہے ــــ لیکن یہ تو جب ہو گا کہ کھیت جاگیں گے۔ کیا یہ کھیت کبھی جاگ بھی سکیں گے؟

گرمی اور بڑھ گئی، چلچلاتی دوپہر میں بوڑھا کسان کھیت کی جلتی زمین کے سینے کو چیرتا رہا۔ دم بھر ستانے کو بیلوں کی جوڑی کو اس نے ہل سے جدا کیا اور کھیت کے کنارے پرانے برگد کی پر سکون گھنیری چھاؤں میں آکر بیٹھ گیا، اپنی جوانی سے لے کر آج اپنے بڑھاپے تک گرمی کے شدید حملوں سے دم بھر بچنے کے لئے وہ یہاں اس برگد کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھتا آیا تھا۔ آج بھی جب منہ اندھیرے سے کھیت میں ہل چلاتے چلاتے اس کے ضعیف بازو شل ہو گئے اور بھوک کی شدت سے اس کا جسم نڈھال ہو گیا تو وہ بوڑھے برگد کی آغوش میں آ بیٹھا، اور جیسے برگد بھی تو اب اسے پہچاننے سا لگا تھا، اسے کبھی اعتراض نہ ہوا۔ کسان یہاں کیوں آتا ہے، زندگی بھر کا ساتھ جو تھا۔

اس نے بیلوں کے آگے چارہ ڈال کر سامنے بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھا۔ راجے کی ماں دھیمے قدموں سے سر پہ ڈولا دھرے، سنبھلتی سنبھلتی آرہی تھی۔ کوئی دم میں وہ وہاں آ پہنچے گی، کسان کی بھوک چمک اٹھی، اس نے بے صبری سے ہانک لگائی۔

" راجے دی ماں! چھیتی کر چھیتی۔ کیہہ ہولی ہولی چل رہی ایں۔"

بڑھیا نے جو یہ سنا تو زندگی کی ان پُرپیچ پگڈنڈیوں پر جنم جنم سے چلتے ہوئے اس کے تھکے تھکے سے قدم بجلی کی سرعت سے آگے بڑھنے لگے، جیون مرن کے ساتھی کی پکار تھی یہ، وہ اب کیوں دھیمے چلتی؟ یکایک اسے محسوس ہوا وہ گاؤں کی ان پتلی پتلی ناگن کی طرح بل کھاتی پگڈنڈیوں پر جوانی میں اپنے گبھرو کے لئے کھانا پہنچانے، چنگھاڑتی آندھی، چیختے طوفان سے بھی زیادہ تیز چلی ہے۔ وہ خوب سمجھتی تھی، گاؤں کی ایک لجاتی شرماتی گوری کے لئے گبھرو کا تصور کس قدر خوبصورت ہوتا ہے۔ جوان ہوتے ہی وہ اس تصور میں گم رہنے لگتی ہے۔ اس کی زندگی کا یہ رمتا ہوا خواب بھی کبھی نہ کبھی جب وہ ندی پر گاؤں کی دوسری اٹھکھیلیوں کے دل اور ہنس بولنے کے دن والی ساتھنوں کے ساتھ اجلی گہلی پانی بھرنے جارہی ہوگی تو، ندی کے کنارے، جانے کن اجنبی دیسوں کی خاک چھانتا ہوا اور چہرے پر سفر کی صعوبتوں کے آثار لئے آجائے گا اور دھیمے سے کہے گا۔

"ڈھولوں اور ماہیوں کی رُت ہے! پردیسی کو اوک بھر پانی تو پلا دے۔"

اس کی آواز میں بہتے نیلگوں پانیوں سے کہیں زیادہ ٹھنڈک ہوگی، اسے سنتے ہی وہ شرم سے کٹ کٹ جائے گی، پھر پس منظر میں اپنی سہیلیوں کی مدھم سرگوشیوں کی بھنبھناہٹ لئے وہ چور نظروں سے اجنبی کو، اپنے جیون کی مہار تھامنے والے کو دیکھتے ہوئے اپنی مٹکی کو اجنبی کی اوک پر جھکا دیگی۔ اور پھر اس کا یہ اجنبی مسافر، اس کی زندگی کی مہار ہاتھ میں تھامنے والا اسے بہت دور محبت کی سہانی بستیوں کی طرف لے جائے گا۔

وہ سوچتی رہی، چلتی رہی، تیز تیز قدموں سے۔ جونہی وہ نزدیک پہنچی، بھوکا کسان اپنے لہجے میں پھوٹتی شفق کی سی ملائمت لئے بولا۔

"اب ذرا جلدی آجایا کرو۔ جانتی ہو اب مجھ میں وہ دم نہیں رہا۔ بھوک برداشت نہیں ہوتی"

وہ بولنے کی بجائے مسکرا دی۔ اس کی مسکراہٹ بالکل ایسی تھی جیسے طلوع ہوتے ہوئے سورج کی کرن دریائی کی درمیانی موج پر چمک رہی ہو۔ بڈھے نے بڑی بے صبری سے سامنے دھری ڈلیا سے جوار کی دو موٹی موٹی روٹیاں نکالیں اور پیاز کی ایک ڈلیا کے ساتھ جلدی جلدی چبا چبا کر نگلنے لگا۔ بڑھیا نے جو یہ دیکھا تو دھاڑی۔"میاں ہولی ہولی کھا۔ روٹی بھج تے نہیں چلی" اس کے لہجہ میں کڑا پن تھا لیکن اس میں محبت کا ایک بیکراں سمندر بھی ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

کسان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس وہ تو تیزی سے کھاتا رہا۔ معاً اس کے ذہن میں یادیں کلبلانے لگیں، جوانی کے وہ دن جب اس کے بازو کی مچھلیاں تنی ہوئی تھیں، بھری ہوئی تھیں اور اب وقت گزرنے کے ساتھ لٹک گئی تھیں۔ چہرے پر بے شمار جھرّیاں ابھر آئی تھیں۔ پہلے وہ سارا سارا دن بغیر تھکے کئی بیگھے زمین جوت لیتا تھا۔ اور باجرے کی اتنی اتنی موٹی چار روٹیاں کھا لیتا تھا۔ مگر یہ تو زمانے کا ازل ہی سے دستور رہا ہے۔ پرانے چراغ جھلملا کر گل ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ لینے کے لئے نئے چراغ آجاتے ہیں۔ پرانے انسان مٹ جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے انسان پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ چکر تو یونہی چلتا رہے گا۔ اب وہ بوڑھا ہو گیا ہے، چند ہی دن میں نکمّا ہو کر رہ جائے گا۔ اس کے کمزور کاندھے ہل کا بوجھ نہ اٹھا سکیں گے۔ اور اس کی جگہ اس کا راجے لے لے گا۔ یہ کہانی یونہی نسل بعد نسل دُہرائی جاتی رہے گی، یہی جوار باجرے کی روٹیاں کھنے کا ہر کسان کھاتا رہے گا، اور یونہی سارا دن کھیت میں ہل چلاتے، تھک کر سستانے برگد کی ٹھنڈی آغوش میں آگرے گا، اور یہ کھیت، کسان کی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے گندم کی نفیس سبز سنہری بالیوں، اور مکئی کے کونلے کونلے بھٹوں کو جنم دیتے رہیں گے۔ کسان کبھی فنا نہ ہوگا، گو اُس کا جسم، منوں مٹی تلے دب کر سڑ گل جائے مگر اس کی روح نئے نئے کسانوں کے روپ میں جلوہ گر ہوتی رہے گی۔ یہ کھیت کسان کی زندگی ہیں، اس کی روح اس کے مالک اور ان کی محبت سے لبریز آغوش میں دھرتی کے یہ لال چین کی نیند سوتے رہیں گے۔

بوڑھے کسان کا ذہن کافی دیر انہی خیالات کی آماجگاہ بنا رہا۔ پیاز کی گٹھی اور باجرے کی روکھی پھیکی خشک روٹیوں کو چبا کر نگلنے کی سکت تو کب سے اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ وہ اُٹھا، مگر اس کا جوڑ جوڑ ہل گیا، بمشکل وہ کنوئیں کی مینڈھ تک پہنچا۔ جہاں ڈول بھر پانی اُس کی بڑھیا نے پہلے ہی سے نکال رکھا تھا۔ اس ٹھنڈے پانی کے چند گھونٹ پی کر اس نے اپنی جلتی روح کو تسکین دی، پھر اس کے چھینٹے اپنے جھلسے ہوئے چہرے پر ڈالے اور بڑھیا کی طرف منہ کر کے کہا۔

"اچھا راجے کی ماں، اب ڈولا لے کر چلی جاؤ۔ وقت کم ہے۔ میں دیگر دیلے آؤں گا"

بڑھیا نے ڈولا اٹھایا اور "ذرا سویرے آجائیو" کہتی ہوئی بل کھاتی پگڈنڈی پر ہولی۔ وہ وہیں کھڑے کھڑے دھاڑا۔

"ہونہہ سویرے آجائیو! یہ کھیت پھر میرا باپ آکر واہے گا"

وہ بیلوں کو ہانکتا ہوا جلدی جلدی کھیت میں آپہنچا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ ہاں اگر برساتی گرمی کے بعد وہ اس قابل نہ رہ سکے گا کہ آئندہ سال کھیت میں کام کر سکے۔ اس نے ایک نگاہ، بھرپور اور معنی خیز نگاہ کھیت پر ڈالی ـــــ وہ کھیت جو چند مہینوں میں گندم کی نرم نرم سرسبز شاداب بالیوں کو جنم دینے والا تھا۔ دیکھا تھوڑی زمین اور باقی ہے۔ پھر آدھا دن بھی تو پڑا ہے، وہ دن ڈھلے تک اس حصہ کو بھی جوت لے گا۔ ہل کے جوئے میں بیلوں کی جوڑی جوت کر وہ پھر جلتی دوپہر میں کھیت میں ہل چلانے لگا۔ زندگی کی حرارت قائم رکھنے کے لئے یہ کس قدر ضروری ہے۔ اگر کھیت میں ہل نہ چلے تو زندگی کے سارے ہنگامے، ساری شوخیاں یکدم ختم ہو جائیں۔

ہل چلتا رہا، زمین کی چھاتی پھٹتی چلی گئی، کچی کچی دھول اڑاتی راہوں پر آنے جانے والے بیلوں کی سریلی نغمہ ریز گھنٹیاں گونجتی رہیں، مگر وہ تمام خارجی باتوں سے بے خبر۔ اپنے تصورات کی حسین دنیا میں کھویا رہا۔

اگر اس سال بارش وقت پہ ہوئی تو فصل بڑی اچھی ہوگی اور پھر کم از کم بتیس من گندم اور اٹھارہ من مکئی پیدا ہوگی اور وہ راجے کی ماں کو ایک نئی شلوار دلائے گی اور راجے کی بہن کو؟ ایک شوخ رنگ کا لہنگا۔ راجہ بھی تو ماشاءاللہ جوان ہو گیا ہے، اس کی شادی کا بھی بندوبست کرنا ہے۔ آخر عمر

ہے، یہ خوشی بھی تو وہ دیکھ لے۔ اور ہاں اپنے لئے بھی تو اُسے سردی سے بچنے کے لئے موٹے جھوٹے کپڑے بنانے ہی ہیں۔ پچھلے سال بارش بھی تو بہت ہوئی تھی اور کچّے مکان کی دیواریں بیٹھ گئی تھیں۔ اب کی اس کا بھی تو بندوبست کرنا ہے۔

بوڑھا کسان سوچتا ہی رہا۔ فصل کا انحصار بارش پر ہے، اور چار زندگیوں کا، اس کے جنم جنم کے پیاسے خوابوں کا انحصار فصل پر ہے۔ ہل چلتا رہا۔ اس کے خیالات ہل کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں حسین مستقبل کے خواب بنتے رہے، وہ مستقبل، جس پر خود اسے قابو اور اختیار نہ تھا۔ اور جب بیل رک گئے، دوپہر ڈھل گئی، آفتاب کی تمازت گھٹنے لگی اور آفتاب دور مغرب میں پچھلے پیپل کے جھنڈ کے لامتناہی سلسلوں کے عقب میں روپوش ہو گیا، ناگن کی طرح بل کھاتے کچّے راستوں پر کھیتوں سے واپس گاؤں کی طرف جاتے بیلوں کی سریلی گھنٹیاں بج اٹھیں تو بوڑھے کسان کے خیالات کا تانتا ٹوٹا اور اُسے محسوس ہوا۔ ارے کھیت تو کب کا جُت چکا، شام بہت پہلے ہی ڈھل چکی ہے اور اب تو رات کا طلسمی اندھیر آتیزی سے پھیلتا ہے۔ تب اُس نے کاندھوں پر ہل رکھا اور آگے آگے ارہر کے لچکدار بید سے بیلوں کو ہانکتا مضمحل مضمحل اور تھکا تھکا سا گاؤں کی طرف چلنے لگا۔ نیم روشن، کثیف اور تنگ گلیوں سے ہوتا ہوا وہ اب ٹھیک، عبداللہ کی چوپال کے سامنے نکل آیا۔ پیپل کے پیڑ سے لگی چوپال بھی، سرمئی دھندلکوں کی چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ ٹمٹماتی لالٹین کی لَو اس قدر مدّھم تھی کہ چوپال کا صرف ایک ہی گوشہ روشن تھا جہاں گاؤں کے تھکے ماندے کسان دن بھر کی کسل دور کرنے یہاں چلے آئے تھے اور عبداللہ کے پاس بیٹھے جنم بھر کی بے کیفی کو حقّے کی گڑگڑاہٹ میں سمو دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ سامنے ہی ٹوٹی کرسی پر زمیندار فضل محمد کا پٹھو، لال محمد، بیٹھا تھا اور اس کے چاروں طرف یہ کسان، یاس اور پژمردگی کے کتنے ہی آثار لئے، تھکے تھکے سے عبداللہ کے بچھائے ہوئے کھیس پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ اگر ان میں کوئی مسرور تھا تو صرف لال محمد جو زمیندار کا جاسوس، اس کے گوداموں کا رکھوالا اور اس کا لگان وصول کرنے والا تھا۔ اس سے گاؤں کے تمام کسان ڈرتے تھے۔ وہ جاسوس تھا۔ اگر زمیندار کے خلاف کبھی کوئی بات سنتا تو فوراً زمیندار سے جا لگاتا، کسی نجی معاملے پر کوئی نوجوان بے کس کسان اس سے اُلجھ جاتا تو وہ اس وقت تو چپ سادھ لیتا مگر غلّہ اور لگان اکٹھا کرتے وقت ساری زندگی کی رہی سہی کسر نکال لیتا۔ آج بھی کسان اس کے آگے دم سادھے بیٹھے تھے۔ کہیں ان کی زبان سے کوئی الٹا سیدھا لفظ نہ نکل جائے ورنہ لال محمد فصل پر سارا قصّہ ہی پاک کر دے گا!

بوڑھا کسان چوپال کے نزدیک اپنا دامن بچاتا نکل گیا۔ لال محمد کے آگے سہمے ہوئے کسانوں کو دم سادھے دیکھ کر اُسے محسوس ہوا، کیا ہم زندگی بھر زمیندار کے آگے بھینٹ چڑھائے جائیں گے؟ وہ دن کب آئے گا جب غلّہ ہمارا ہو گا اور ہم آزاد ہوں گے، کسی کے تابع نہیں؟ مگر اُسے اپنے ان سوالوں کا جو روز ہی اس کے ذہن میں ہجوم کیا کرتے تھے، حسب سابق کوئی جواب نہ مل سکا۔ بوڑھے کسان نے جانے کتنی بار سوچا تھا۔ کاش اس کا راجو بھی پڑھ سکتا! کاش اس کے اپنے گاؤں میں بھی کوئی اسکول ہوتا جہاں گاؤں کے آوارہ بچّے پڑھ لکھ سکتے! کاش اس کا گاؤں بھی صاف ستھرا ہوتا! یہاں کوئی اسپتال ہوتا۔ گندگی کے ڈھیروں پہ پلنے والے اس بوڑھے کو گندگی سے شدید نفرت تھی۔ اس نے اپنے بچپن میں بارہا سوچا تھا، اگر کبھی وہ اس گاؤں کا زمیندار ہو جائے تو یہاں خوبصورت، صاف ستھری پکّی سڑکیں بنوا دے گا، اپنے بھائیوں کے آگے اپنے خزانے کا منہ کھول دے گا اور —— اور —— اس کے آگے اس کا کچا ذہن رک سا جاتا، اس کے آگے اُسے معلوم ہی نہ تھا کہ اپنے بھائیوں کے ساتھ اور کس قسم کی بھلائی کی جا سکتی ہے۔ جب ایک بار وہ بچپن میں اپنے باپ کے ساتھ شہر گیا تھا تو صاف ستھری سڑکیں دیکھی تھیں اور شہر کی جگمگاتی فضا نے اُسے اس درجہ متاثر کیا تھا کہ وہ بے اختیار اپنے باپ سے لپٹ کر پوچھ بیٹھا تھا۔

"کیوں چاچا۔ ساڈا پنڈ ایہو جیہا کیوں نہیں؟" اور اس کا باپ اپنے احساس کی ساری تلخی لئے بولا تھا۔

"اِسیں زمیندار دے زر خرید جے ہوئے!" اور اس دن سے ہی اُسے زمیندار کے ساتھ نفرت سی ہو گئی تھی۔

بچپن جوانی کے آگے اور جوانی بڑھاپے کے آگے سرنگوں ہو چکی تھی! اب وہ جوش نہ رہا تھا، نہ وہ ولولہ، اور بوڑھا کسان اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ "یہ گاؤں اس وقت تک نہیں سدھر سکتا جب تک وہ آزاد نہ ہو جائیں۔ اور ان کی آزادی زمیندار کے آگے زنجیروں میں جکڑی پڑی ہے، اُسے ہتھکڑیاں لگی ہیں جس کی چابی زمیندار کے ہاتھوں میں ہے۔ پھر کیوں نا وہ اس ہتھکڑی کے آہنی حلقے کو زمیندار کے سر پر دے ماریں۔ مگر یہ کس قدر مشکل ہے! اور غلاموں کو یہ سب نہ سوچنا چاہئے۔" سوچتے ہوئے وہ اس روح فرسا حقیقت کو بھول جانے کی سعی کرتا۔

بوجھل قدموں سے وہ چلتا رہا۔ اس کا ذہن خیالات کے عمیق سمندر میں غوطہ زن تھا۔

کھیت جُت گئے، بیج پھیلا دیئے گئے، آبیاری ہوتی رہی۔ اس سال وقت پر بارش بھی حسبِ ضرورت ہوئی، پیاسی زمین نے دل کھول کر پانی پیا اور پھر اپنی سنگلاخ کوکھ سے حسین نرم نرم سبز سبز گندم اور مکئی کے پودوں کو جنم دیا جن میں پھر ملائم گندم کی سنہری بالیاں اور موٹے موٹے بھٹے پھوٹ آئے اور ہوا کے لطیف دوش پر جھک جھک کر مسرت سے لہلہانے لگے، اٹھکھیلیاں کرنے لگے، مسکرانے لگے، گیت گانے لگے، مترنم پُرکیف نغمات جن میں ایک کسان کی محنت، خون اور پسینے سے ترتیب دی ہوئی موسیقی سے لبریز دھنیں تھیں۔ کسان کی روح اور زندگی تھی۔

وہ مسکرایا۔ فخر سے سر کو جنبش دی، گندم کی سنہری بالیاں مسکرا دیں خوشی و انبساط سے اور کسان کی مسکراہٹ سے پودوں کی مسکراہٹیں ہم آہنگ ہو گئیں۔ مسرت سے سرشار ہو کر کسان ایک شوخ اور جوان گیت گنگنا اٹھا، گندم کی بالیاں محوِ رقص ہو گئیں۔ کائنات کا ذرہ ذرہ فطرت کے اس بے پایاں حسن میں ڈوب گیا۔ اور کسان نے سوچا۔

اس دن جلتی دوپہر میں، عالمِ بیداری میں، دیکھا ہوا وہ خواب ضرور شرمندۂ تعبیر ہوگا، اب راجہ کی دلہن بھی آئے گی اور راجہ کی بہن شوخ رنگوں کا لہنگا بھی پہن سکے گی، اور اس کا راجہ ـــ جوان راجہ پھر دھرتی کا سینہ چیر کر اگلے سال اناج اُگائے گا، اور وہ خود سکھ چین سے زندگی کے باقی ماندہ دن خدا کی عبادت میں صرف کر دے گا۔

پھر مسرت کے انوکھے جذبے سے سرشار ہو کر اس نے اپنی مضطرب، منتظر باہیں پھیلا دیں ـــ بیس تیس گندم کے قد آور پودوں کو اپنی آغوش میں بھینچ لیا۔

اوہ! گندم کے سبز پودو! تم ہی میری زندگی ہو، ایک کسان کی زندگی، اس کا سرمایۂ حیات، اس کی جاگیر، اس کی روح، اس کی خوشی، اس کا غم اور اس کے خدا! میں نے تمھیں اپنے لہو سے سینچا ہے، اپنے سرخ لہو سے تمہیں جنم دیا ہے، تمھیں سیراب کیا ہے!

اور گندم کی ریشمیں بالیں مسرت سے کسان کی باہوں سے یوں لگ گئیں جیسے بچہ سکون کی خاطر، شفیق ماں کی چھاتی سے چمٹ جاتا ہے آغوش میں سما جاتا ہے، جہاں حیات کی خوشیاں ہیں۔ اور جہاں زیست کا کوئی غم، کوئی خوف اس کے پاس نہیں پھٹکتا۔ محبت اور بے لوث جذبۂ محبت سے لبریز آغوش!

بہت بھولے ہو، تم خوشی کے گیت گا رہے ہو، ذرا دھیمے دھیمے، کوئی سن نہ لے، ورنہ اپنے پودوں کی محبت میں جو تمہارے خون سے پروان چڑھ کر بھی تمہارے اپنے نہیں، زمیندار کے لوگ تمھیں دھر لیں گے۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں، کتنے نادان ہو، اپنے پاؤں میں پڑی ان غلاموں کی بیڑیوں اور ہاتھوں کی ان آہنی ہتھکڑیوں کو نہیں دیکھتے، یہ تو وہ آہنی بیڑیاں ہیں جنھیں زمیندار کے ہاتھوں نے صدیوں کی محنت کے بعد خود تمہارے لئے تیار کیا ہے۔ دن رات کچے لوہے کو بھٹی کی دہکتی ہوئی آگ کے تیز شعلوں میں بڑی محنت سے ان ہاتھوں نے ہی پکایا ہے اور پھر تیشے سے سرخ لوہے کو کاٹا ہے اور جب زنجیریں اٹوٹ ہو گئیں تو انھیں تمہارے جسموں کے گرد لپیٹ دیا گیا ہے۔ اب دن رات تیز و تند ریتی کو لے کر انھیں گھِسو گے تو بھی یہ نہ ٹوٹیں گی، اب تو تمہاری نظروں پر بھی پہرے بٹھا دیئے جائیں گے، اور کچھ دنوں کے بعد تو تمہارے یہ نغمے بھی چھین لئے جائیں گے، جو اپنی تخلیق کی اس حسین تکمیل کو دیکھ کر تمہارے لبوں پہ آ کر رس بن جاتے ہیں۔ آج تمہارے دیس کی ہر کنواری کا دل شدتِ اندوہ سے مرجھا رہا ہے، آج کوئی اجنبی دور دیس سے گاؤں میں ندی کے کنارے تھکن سے چور ـــ سفر کی مٹی اپنے ننگے پاؤں پہ لئے آتا ہے تو کسی کی غزالیں آنکھیں نہیں چونکتیں اور نہ کسی کا آنچل بوئے حبیب سے عنبریں ہوتا ہے۔ بس ان منتظر آنکھوں میں تو بڑی اُداسی رچی ہوتی ہے، اتنی اداسی جس میں دنیا کی ساری خوشیاں بھی ڈوب جائیں تب بھی سطح پر ہلکی سی جنبش نہ ہو۔ بس ایک گہرائی ہے، اتھاہ گہرائی۔ تم نے اس وقت ہی کیا کر لیا تھا جب گاؤں کی کتنی گوریاں ـــ شادآں، رجآں، تاجی، اور کتنی ہی اور اجنبیوں کے آگے اپنا دل رکھ آئی تھیں اور اس کے بدلے زمیندار کی ہوس کا نشانہ بنی تھیں۔ جب تم چُپ تھے اور تمھارے ساتھی بھی۔ اور اب تو کوئی گوری کسی اجنبی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ کہیں محبت کے جرم میں زمیندار کے ہاتھوں اپنی عصمت ہی نہ بھینٹ چڑھا آئے۔ جانتے ہو، دیس پنجاب کی ایک بیٹی ہے اس کا دل چھین لیا گیا تو اسی زمین نے وارث شاہ کو جنم دیا۔ جس نے ہیر کے ایک ایک آنسو کو سنہری حرفوں میں پرو کر دنیا کے آگے رکھ دیا۔

لیکن جب آج اس غریب دھرتی کی کتنی بیٹیاں اُداس ہیں، کتنے دامن خالی ہیں، کتنی آنکھیں اپنی بے بسی پر آپ ہی اشکبار ہیں تو کوئی آگے نہیں بڑھتا۔ مجبور دبے بس کسان، تم سے تمہارے گیت بھی چھین لئے جائیں گے!

پھر وراتی لے کر کھیتوں کی کٹائی شروع ہوئی، میدانوں میں کٹے ہوئے پودوں کے اونچے اونچے ڈھیر لگا دیئے گئے، اور پھر چاندنی راتوں میں، سرمئی دھند میں لپٹی ہوئی گلابی سردیوں میں، گیت گاگا کر ان کسانوں نے مکئی کے بھٹوں اور گندم کے خوشوں سے دانے الگ کئے، کتنی عجیب بات تھی! گندم جسے کسان اُگاتا ہے خود اس سے محروم رہ جاتا ہے اور اس کے حصہ میں تو صرف جوار اور باجرے کی روکھی پھیکی روٹیاں ہی آتی ہیں جن کو نگلنے کے لئے لعابِ دہن بھی ناکافی ہوتا ہے!

پھر جب دانے الگ ہو گئے اور ہر طرف بڑے بڑے ڈھیر لگ گئے تو ایک صبح زمیندار کے کارندے آ گئے جن میں لال محمد پیش پیش تھا۔ یہ صبح دوسری صبحوں سے کس قدر عجیب تھی، جب گاؤں والے ایک انجانے خوف سے کانپ کانپ گئے تھے، جانے اب کونسی افتاد پڑنے والی تھی۔ صبح ہی صبح یوں منہ اندھیرے زمیندار کے کارندوں کی صورت دیکھنا یقیناً کوئی اچھا شگون نہ تھا۔ ہر طرف خوف دہراس کی لہر دوڑ گئی۔

"کیا ہے بادشاہو؟" حیرت و خوف کے ملے جلے احساس سے کسان چلّا اٹھے۔ بھولے کسان۔ یہ صبح تو ان کی زندگی میں بارہا آئی تھی، اور جب دانے ڈھیروں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں تو یہ صبح ضرور آتی ہے اُن کی آواز لرز گئی۔ "زمیندار فضل محمد خاں کا حصہ دانوں سے الگ کر دو" یا بہ الفاظ دیگر اپنی زندگی کی بھینٹ دیدو، زمیندار کا حصہ الگ کرنے کے یہی تو معنی تھے۔ حصہ الگ کر کے ان کے اپنے پاس کیا رہ جائے گا؟ محض چند دانے، جو حیات کی اس حرارت کو قائم رکھنے کے لئے اتنے ہی ناکافی تھے جتنا لامتناہی تپتے ریگستان میں کہیں اُگا ہوا کوئی کھجور کا تنہا درخت! کسانوں کے چہروں پر بے بسی کی لکیریں ابھر آئیں۔ انھیں محسوس ہوا، ان کی خوابیدہ تمنائیں، ان کے خواب کم از کم اس جنم میں تو شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکیں گے جن کی پرورش برسوں سے وہ اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں کرتے آئے ہیں۔ بے بس کسان! غلامی کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے خاموش خاموش بغیر کسی احتجاج کے اپنے گاڑھے پسینے اور خون سے سیراب کردہ دانوں میں سے زمیندار کا حصہ الگ کرنے لگے جو سب پر مقدم ہے، اور بوڑھے کسان نے سوچا۔ اب اس کا راجے زندگی بھر کنوارا ہی رہ جائے گا، اور راجے کی بہن شوخ رنگوں کا لہنگا نہیں پہن سکے گی، اس کے نخل آرزو میں تازیست یاس و حرماں کے طوفانی جھکڑ ہی چلتے رہیں گے۔ اس کے گاؤں میں کوئی اسکول نہ کھل سکے گا۔ بے بس کسان اپنی فصل سے زمیندار کا حصہ الگ کرنے لگا۔ اور کسان نے سوچا۔ جس طرح ایک کسان کے مرنے پر اس کی روح دوسرے کسان کا روپ دھارے گی کیا اسی طرح غلامی کی یہ زنجیریں نسل در نسل اناج اُگانے والے کسان کے گلے میں طوق بن کر اترا کریں گی جوں جوں یہ کہانی دھرائی جاتی رہے گی کیا اسی طرح کنبے کے ہر کسان کو غلامی کی زنجیریں ورثہ میں ملا کریں گی؟ کیا انسان کبھی آزاد نہ ہوگا؟ جانے کب یہ نظام بدلے گا۔ "جانے یہ کھیت کب جاگیں گے؟ وہ گنگنانے لگا: "ہر چیز زمانے دی بدلدی اے۔ کیوں نہ ساڈی لے سرکار بدلے"

رات کے بے شمار آنسو نورانی صبح کے کشکول میں ایک ایک کر کے ٹپک جاتے! ... شب کے ظلماتی طلسم اور سکوت کو توڑنے سورج کی جبین سے کرنیں پھسلتی ہیں اور اندھیروں کے سینے میں دور تک اترتی ہی چلی جاتی ہیں۔ اندھیرے کسمساتے ہیں، گھبراتے ہیں، تڑپتے ہیں اور کرنوں کے اس نورانی غبار میں کائی کی طرح چھٹ جاتے ہیں! لیکن یہ کیا تماشہ ہے، ان کی زندگی کی اس ٹھہری ہوئی شب تار کو کوئی سحر آ کر نہیں توڑتی!

آج نہیں تو کل، بوڑھے کسان نے سوچا، صبر و ضبط کے یہ بند ٹوٹ بھی جائیں گے، اور ساتھ ہی کسان کی گردن سے اس کی غلامی کی یادگار، اس طوق کو بھی اتار پھینکیں گے، جب کسان آزاد ہوگا، اس کی فصل اس کی اپنی ہوگی، جب زمیندار فصل لینے نہ آیا کریں گے، زمین اس کی ہوگی، اور کھیت اس کے ہوں گے۔ شاید جلد ہی کوئی زلزلہ آئے۔ اور موجودہ نظام کی ساری بنیادوں کو ہلا دے!

دھرتی کے لال! دھرتی کے پتھریلے سینے پر اپنے کھردرے ہاتھوں سے طرح طرح کے نقش و نگار، کیسے کیسے نادرِ روزگار شاہکار بنانے

والے کسان! تمہارے کھیت اب جاگ گئے ہیں۔ کھیت تمہارے ہیں، زمین تمہاری ہے، وہ زلزلہ آگیا ہے جس کے سامنے ہی [illegible] کی بلند و بالا حویلیاں منہدم ہوگئی ہیں۔ وہ صبح طلوع ہوگئی ہے جس کا تمہیں انتظار تھا، یہ یاس کیسی، یہ کوئی ڈھکوسلہ نہیں، یہ تو پُرامید اور نورانی مستقبل کا سندیسہ ہے، مشرق کی طرف تو ذرا دیکھو ـــ کیسا اجالا پھوٹ رہا ہے، تمہارے لہو کی سرخی رنگ لے آئی ہے۔

اور جب زمین کے پُرنم کناروں کو چومتی ہوئی، افق کے سرمگیں دریچوں سے جھانکتی ہوئی سحر، ساحلِ سمندر کے نزدیک کسی پرشکوہ محل میں محوِ خواب بہاروں کی جمیل دوشیزہ کی طرح آنکھوں میں مستی اور خمار لئے، جوان انگڑائیاں لیتی ہوئی بیدار ہوئی تو، ـــ اس کے جلو میں، جنم جنم سے دُکھ کے، ان طویل اور کٹھن راستوں پر محوِ خرام کسانوں کے لئے کتنے ہی دلفریب رنگ تھے، سرخ، شہابی، جوان، شوخ، نارنجی!

آج چوپال میں بڑا شور ہے۔ یہ کیسی خوشی صدیوں بعد آج جنم جنم کے پیاسے کسانوں کے چہروں سے پھوٹ رہی ہے، آج ٹوٹی کرسی پر لال محمد کی بجائے بوڑھا کسان بیٹھا ہے، اس کے چہرے پر مسرت کی دبی دبی آگ ہے۔

وہ سب کہہ رہے ہیں "بادشاہو! ہم تو تمھیں اپنا سردار بنائیں گے۔"

بڑی آوازیں ہیں، ـــ بہت شور ہے، نقرئی، تیز، بھاری، بوجھل، مدھم، ہلکی آوازیں ــ ذرا زمیندار کے پرشکوہ محل کی طرف بھی تو دیکھو ـــ وہاں کیسی تاریکی پھیلی ہوئی ہے، یاس و حسرت کے کتنے ہی ماتمی دھندلکے تیر رہے ہیں۔

عبداللہ جلد جلد حقہ بھر رہا ہے اور آوازوں کے اس سیلاب میں شور سے بہت دور ٹوٹی کرسی پر بیٹھا کسان مسرت کی دبی دبی آگ اپنے جھریوں بھرے چہرے پر لئے سوچ رہا ہے۔ اب اس کے راجہ کے لئے وہ گاؤں کی سب سے الھڑ، سب سے خوبصورت گوری لائے گا، اب راجہ کی بہن بھی شوخ رنگوں کا لہنگا پہن سکے گی اور راجہ کی ماں نئی شلوار ـــ اور اگر جیسا کہ یہ کہتے ہیں اُسے ہی اپنا سردار بنا لیں گے تو وہ سب سے پہلے گاؤں میں ایک اسکول کھولے گا۔ شہر کو جانے والی کچی سڑک کو پختہ کرائے گا، وہ دس چنے ہوئے آدمیوں کی پنچایت کا سربراہ ہوگا، اس کی ذمہ داریاں بڑھ جائیں گی، وہ اپنے علاقے میں کوئی جھگڑا نہ ہونے دے گا، وہ اپنے گاؤں کی ترقی کے لئے کام کرے گا، امن قائم رکھے گا، ہسپتال کھلوائے گا، آپس کے جھگڑے، مویشیوں کے جھگڑے وہ خود ہی مل کر پنچایت کے ساتھ طے کرے گا ـــ وہ سوچتا رہا، سوچتا ہی رہا یہاں تک کہ شام ڈھل گئی اور گاؤں کی طرف آتے مویشیوں کی ترنم ریز گھنٹیاں گرد سے اٹے کچے راستوں پر گونجنے لگیں۔

اب تمہارے گاؤں کی کوئی راجاں، شاداں، یاسمین زمیندار کی ہوس پر بھینٹ نہیں چڑھیں گی، اندھیرے کنوؤں میں اپنی عصمت اپنی ناموس نہ بیچیں گی، ـــ اب تو وہ ندی کنارے اجنبی دیسوں سے سفر کی صعوبتیں برداشت کرکے، تھکے تھکے سے، ننگے قدموں پر سفر کی گرد لئے آنے والے ان مسافروں کا انتظار کیا کریں گی جو اُن سے آکر پانی مانگیں گے اور ان کی جھکتی ہوئی مٹکیوں کے ساتھ ہی اُن کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جائیں گی ـــ اور پھر وہ اجنبی کو دیکھ کر چونکا کریں گی اور ان کے آنچل کا مہکتا ہوا شعلہ بوئے حبیب سے عنبریں ہو جائے گا، ان منتظر آنکھوں میں بڑی مسرت ہوگی، اور اب تو ایک بار پھر اُن کی محبت کچے گھڑے کے سہارے ندی کی طوفانی موجوں سے لڑنا سیکھ گئی ہے، وہ ساحل تک کنارے تک ضرور پہنچے گی ـــ انھیں اب اپنی منزل دکھائی دینے لگی ہے ـــ اور کسی کے رہنما ہاتھ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اس منزل کو پہنچنے والے راستہ پر ڈال بھی دیا ہے۔



ڈرامہ:

رات اور مسافر

آغا ناصر

کردار:

کسان ——— بوڑھا آدمی

مہاجر ——— ادھیڑ عمر

بیروزگار ——— ۲۲ سال کا نوجوان

شاعر ——— جوان

پہلا منظر

وقت:- ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء سے پہلے

مقام:- کسی ویرانے میں ایک پرانی سرائے کے کھنڈرات۔

جب پردہ اٹھتا ہے تو اسٹیج پہ گہرا اندھیرا ہے۔ پس منظر میں موسلا دھار بارش کے صوتی اثرات اور بادلوں کی گرج جاری ہے۔ بجلی کی چمک سے یکبار اسٹیج جگمگا اٹھتا ہے تو ایک پرانی حویلی کے کھنڈرات نظر آتے ہیں۔ جھکی ہوئی کڑیوں کے ایک سائبان کے تلے کسان بالکل ساکت کھڑا ہے، یوں جیسے پتھر کا بت۔ دالان کے مغربی حصہ سے مہاجر داخل ہوتا ہے۔ اس کی عمر تقریباً چالیس سال ہے۔ بارش سے اس کے سارے کپڑے بھیگ گئے ہیں۔ وہ اپنی جیب سے ایک سیلی ہوئی موم بتی نکال کر سائبان کے مشرقی کونے کے قریب پڑے ہوئے بڑے سے پتھر پہ رکھتا ہے اور ماچس سے موم بتی کو آگ دکھلاتا ہے، چند لمحوں کی کوشش کے بعد موم بتی جلنے لگتی ہے اور اس کی مدھم روشنی سارے اسٹیج پر پھیل جاتی ہے۔ کسان جس کے سر اور داڑھی کے بال بگلے کے پروں کی طرح سفید ہیں چونک کر مہاجر اور موم بتی کی طرف دیکھتا ہے۔

کسان:- کون؟!

مہاجر:- (چونک کر) ارے یہاں بھی کوئی ہے — میں تو تمہیں پتھر کا بت سمجھا تھا۔

کسان:- پتھر کا بت؟ ٹھیک ہی سمجھا تم نے (ٹھنڈی سانس لیکر) تم کون ہو؟

مہاجر:- مسافر، بارش سے بچنے کے لئے اس چھت کے نیچے آگیا ہوں، اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو۔

کسان:- اعتراض؟ کیسی باتیں کہتے ہو۔ میں تو خوش ہوں کہ رات گذارنے کو ایک ساتھی مل گیا (وقفہ) تم غلط سمجھے۔ میں اس حویلی کا مالک نہیں ہوں۔ میں تو خود تمہاری طرح بارش سے بچنے کے لئے یہاں آگیا تھا۔

مہاجر:- چلو اچھا ہی ہے (اچانک ایک نوجوان آدمی بھاگتا ہوا مغربی دالان کی طرف سے اسٹیج پر آتا ہے۔ اس کا لباس بوسیدہ ہے، سر کے بال الجھے ہوئے ہیں۔ شیو بڑھا ہوا ہے)۔

بیروزگار:- معاف کیجئے گا۔ میں بغیر اجازت یہاں چلا آیا۔ در اصل بارش بہت تیز ہے۔ میں نے دور سے ان کھنڈرات میں یہ روشنی دیکھی تو بے اختیار اس کی طرف دوڑ پڑا۔

کسان:- تم نے اچھا ہی کیا۔ کون ہو تم؟

بیروزگار:- مسافر! (کسان اور مہاجر بڑبڑاتے ہیں، "مسافر!") — اور کیا میں پوچھ سکتا ہوں آپ کون ہیں؟

کسان:- ہم بھی مسافر ہیں، تمہاری ہی طرح۔ بارش سے بچنے کے لئے یہاں آگئے ہیں۔

بیروزگار:- خوب اتفاق ہے (ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ پھر مایوسی کے ساتھ زمین پر بیٹھ جاتا ہے) تو پھر آئیے آرام سے زمین پر ہی بیٹھ جائیں۔ یہاں تو پتھر تک بھی نہیں ہیں بیٹھنے کے لئے — اور رات بہت لمبی ہے اور بارش بہت تیز۔

مہاجر:- ٹھیک ہے (مہاجر اس پتھر کے قریب جاتا ہے جہاں موم بتی جل رہی ہے۔ وہ اپنی جیب سے ایک اور موم بتی نکال کر جلاتا ہے)

میری جیب میں اتفاق سے دو موم بتیاں تھیں۔ جب میں چلا تھا تو میرے بچوں نے کہا تھا ہمارے لئے کچھ لے کر آنا۔ میں نے سوچا موم بتی سے سستی اور کوئی چیز نہیں جسے دیکھ کر بچے خوش ہو جائیں۔

کسان :- تو تم اپنے گھر جا رہے تھے۔

مہاجر :- گھر! گھر!! (مہاجر اسٹیج کے درمیان میں آتا ہے اور نوجوان کے کاندھے کا سہارا لیکر زمین پر بیٹھ جاتا ہے) گھر — میرا ایک گھر تھا چھوٹا سا گھر جس کے آنگن میں نیم کا ایک بڑا پرانا درخت تھا۔ لوگ کہتے تھے وہ درخت میرے دادا نے اسوقت لگایا تھا جب وہ بچے تھے۔ اور ہمارے مکان کی ڈیوڑھی کے سامنے بہت سی چھوٹی چھوٹی کیاریاں تھیں۔ میرا گھر! ہاں میرا ایک گھر تھا، اس کی چہار دیواری مٹیالے رنگ کی تھی لیکن جب میری شادی ہوئی تھی تو میرے باپ نے اس پر گہرا نیلا رنگ کرا دیا تھا۔ اور جب ہم نے اپنا مکان چھوڑا تو وہ گہرے نیلے رنگ کا نہیں رہا تھا۔ بارشوں اور دھوپ نے اُسے ایسا کر دیا تھا جیسا آسمان — آسمان جیسا رنگ تھا میرے گھر کی دیواروں کا (اس کے چہرے سے کرب کے آثار ہویدا ہیں) آسمان جیسا رنگ۔ لیکن آسمان نے میرا گھر چھین لیا۔ اور اب ہم آسمان کی چھت کے تلے سوتے ہیں — میں، میری بیمار بیوی، میرے دونوں بچے۔ میرا گھر مجھ سے چھین گیا اور میں — (اس کی آواز رُندھ جاتی ہے)۔

کسان :- (بڑی عقیدت سے) تم مہاجر ہو؟

مہاجر :- ہاں — اور ... تم کون ہو؟ تمہارے پاس گھر ہے۔ ہے نا؟

کسان : گھر، ہاں۔ شاید۔ ایک چھوٹا سا جھونپڑا — لیکن اتنی بڑی زمین پر اگر سر چھپانے کو ایک جھونپڑا مل بھی گیا تو کیا ہوا! میں اپنے گھر، اپنے گاؤں، اپنی زمین اور اپنے کھیتوں میں رہنے کے باوجود ان سب سے دُور ہوں!

مہاجر۔ تم کسان ہو؟

کسان۔ ہاں، میں کسان ہوں۔ لیکن میرے کھیت کہاں ہیں، میرے بیلوں کی جوڑی کہاں ہے؟ کبھی وہ سب میرے تھے۔ نہر سے لے کر امرودوں کے باغ تک سارے کھیت، سب میرے تھے۔ میرے باپ نے خود مجھے بتایا۔ لیکن وہ ساری زمین، وہ سارے کھیت ایک ایک کر کے ہمارے ہاتھ سے نکل گئے! صرف ہمارے ہی نہیں، بہت سے اور لوگوں کے کھیت بھی! وہ سب ایک ہی آدمی کے قبضہ میں چلے گئے اور وہ زمیندار بن گیا۔ دن گزرتے گئے۔ موسم آتے رہے جاتے رہے۔ فصلیں بوئی جاتی رہیں اور کٹتی رہیں۔ (تھوڑی خاموش رہنے کے بعد) سب کچھ بھول گئے — ہونہہ! (طنزیہ) بھول گئے — بھولا کیسے جا سکتا ہے۔ اپنے کھیت گنوا کر، اپنی زمین دوسرے کے قبضہ میں چلے جانے کے بعد کون بھول سکتا ہے؟ اس مٹی میں میرے آبا و اجداد کا پسینہ گرا ہے۔ مجھے اس مٹی سے اسی قدر محبت ہے جتنی اپنے خون سے! پھر انھیں بھلایا کیسے جا سکتا ہے، میرے کھیت، میری زمین (مضطرب سا ہو کر) مگر نہیں نہیں، میرا تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میں کسان ہوں لیکن میرے پاس کوئی کھیت نہیں! میں بوڑھا ہو گیا لیکن بیلوں کی ایک جوڑی خریدنے کی تمنا اب بھی میرے دل میں اُسی طرح ہے جیسے — کسی معصوم بچے کو چاند چھونے کی آرزو!

بیروزگار۔ سب کی کہانی ایک ہی ہے۔ صرف عنوان مختلف ہیں۔

مہاجر۔ تم! میرا مطلب ہے تم؟

بیروزگار۔ میں — میں آپ دونوں سے بہت چھوٹا ہوں۔ میرا اور آپ کا کوئی مقابلہ نہیں۔ پھر بھی — پھر بھی میں کہوں گا کہ قسمت نے میرے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کا مذاق کیا ہے۔ جب میں ہوش سنبھالا (چند لمحوں کے لئے آنکھیں بند کرکے کچھ سوچتا ہے) ہاں جب میں نے ہوش سنبھالا تو میرے ملک کی فضا میں انقلاب کے نعرے گونج رہے تھے۔ غیر ملکی حکمرانوں کی غلامی سے آزاد ہو جانے کی لگن تھی جو ہر انسان کے دل میں تھی۔ اور پھر مجھے اس چھوٹی سی عمر میں وہ دولت مل گئی جس کی تمنا اپنے دل میں لئے میرے آبا و اجداد مر گئے تھے۔ ہمیں آزادی مل گئی۔ وقت کی ڈور پکڑ کر میں عمر کی سیڑھیاں چڑھتا گیا۔ اور آج —

کسان۔ آج؟

بیروزگار۔ آج اس بات کو پورا ایک سال ہو گیا کہ اپنی تعلیم ختم کر کے نوکری کی تلاش میں سرگرداں ہوں! شہر شہر، قصبہ قصبہ میں نے

ملازمت کی تلاش کی، اپنے اس ملک میں جسے صدیوں
کی غلامی کے بعد آزادی نصیب ہوئی ہے۔ لیکن ....

مہاجر۔ تو تمہیں نوکری نہیں ملتی؟

بیروزگار۔ میرے پاس کوئی سفارش نہیں ہے نا۔ میں رشوت نہیں دے سکتا نا۔ مجھے نوکری کیسے ملے؟ (تینوں مایوسی سے ایک دوسرے کے چہروں کو تکتے رہتے ہیں) تمہیں گھر نہیں ملا، تمہیں کھیت نہیں ملا، مجھے نوکری نہیں ملی! ہم کس قدر بدقسمت ہیں! (بڑے جوش کے ساتھ) ہم نے اندھیرے کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ ہم تاریکیوں کی گود کے پالے ہوئے ہیں۔ ہم ظلمتوں .... (اچانک شاعر داخل ہوتا ہے۔ اس کے بال بہت بڑھے ہوئے ہیں۔ باہر بارش اُسی طرح ہو رہی ہے لیکن آنے والے کا لباس خشک ہے)

شاعر۔ بس خاموش رہو۔

دوسرے۔ (تعجب سے) کون؟ تم کون ہو؟

شاعر۔ میں بہت دیر سے تمہاری گفتگو سن رہا ہوں۔ تم سب یا تو پاگل ہو یا احمق۔

بیروزگار۔ لیکن تم کون ہو؟

شاعر۔ شاعر

کسان۔ تم شعر کہتے ہو؟

شاعر۔ نہیں۔

مہاجر۔ (ہنستا ہے) تم کیسے شاعر ہو؟

بیروزگار۔ ایسا ہی شاعر جیسے یہ کسان ہے لیکن اس کے پاس نہ کھیت ہیں نہ بیلوں کی جوڑی۔

مہاجر۔ (مسکرا کر) تو تم شعر کیوں نہیں کہتے شاعر؟

شاعر۔ کس کے لئے کہوں؟ (بیروزگار کی طرف اشارہ کرکے) اس نے بالکل ٹھیک کہا۔ میں ایسا ہی شاعر ہوں جیسا یہ کسان ہے۔ میں نے تم سب کی کہانیاں سنی ہیں۔ میں دیر سے اس دیوار کے پیچھے کھڑا تم لوگوں کی باتیں سن رہا تھا۔ اسی لئے تو میرے بھیگے ہوئے کپڑے خشک ہو گئے ہیں تو دوستو میری کہانی بھی تم سے مختلف نہیں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میں مایوس نہیں ہوں۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔

کسان۔ کاہے کا؟

شاعر۔ انقلاب کا!

بیروزگار۔ جو کبھی نہیں آئے گا۔

شاعر۔ نہیں، جو ضرور آئے گا اور جب وہ آئے گا تو (کسان سے) تمہیں تمہارے کھیت واپس مل جائیں گے (مہاجر سے) تم اپنا کھویا ہوا گھر پا لوگے (نوجوان سے) تمہیں ملازمت مل جائے گی۔ اور پھر میں گیت لکھوں گا۔ انقلاب کا گیت! عوام کے گیت!

مہاجر۔ (مایوسی) کے ساتھ یہ محض شاعری ہے!

شاعر۔ نہیں یہ شاعر کا تخیل ہے — ایسا تخیل جو حقیقت کا روپ دھار کر جلد ہی تمہارے سامنے آجائے گا۔

بیروزگار۔ دن بدل جائیں گے؟

شاعر۔ ہاں۔

مہاجر۔ مجھے میرا گھر مل جائے گا؟

شاعر۔ ہاں۔

کسان۔ مجھے میرے کھیت مل جائیں گے!

شاعر۔ ہاں، انتظار کرو۔ انتظار کرتے رہو۔ جب رات کا اندھیرا بہت بڑھ جائے تو صبح ہو جاتی ہے۔

مہاجر۔ اندھیرا۔ (پتھر پر رکھی ہوئی دونوں موم بتیاں بھڑک کر گل ہو جاتی ہیں۔ اسٹیج پر گہرا اندھیرا چھا جاتا ہے۔ پس منظر میں بارش کے صوتی اثرات اُسی طرح جاری رہتے ہیں)

سب۔ اندھیرا — اندھیرا!

شاعر۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) ہاں اندھیرا ہو گیا۔ لیکن یہ اندھیرا عارضی ہے۔ صبح ضرور ہوگی۔ بادل چھٹ جائیں گے اور سورج طلوع ہوگا۔ اور پھر میں اس طلوع ہوتے سورج کی چمکیلی دھوپ میں بیٹھ کر گیت لکھوں گا۔ ابھرتے ہوئے سورج کا گیت، طلوع ہوتی ہوئی صبح کا گیت!

مہاجر۔ بارش بند نہیں ہوئی۔ اور اب کوئی موم بتی بھی نہیں!

کسان۔ اور رات بہت باقی ہے۔

بیروزگار۔ اور اندھیرا بڑا مہیب ہوتا جا رہا ہے!

شاعر۔ (قہقہہ لگاتا ہے) اندھیرا۔ اندھیرے سے نہ ڈرو ساتھیو! اندھیرے کی کوکھ سے جنم لینے والی صبح کا انتظار کرو — (جس سمت سے آیا تھا اسی سمت کو لوٹ جاتا ہے۔ آواز

آہستہ آہستہ دور ہوتی جاتی ہے) انتظار کرو۔ انتظار کرتے رہو۔ (پردہ آہستہ آہستہ گر جاتا ہے)

دوسرا منظر

وقت۔ ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کے بعد

مقام۔ وہی پرانی حویلی کے کھنڈرات

جب پردہ اٹھتا ہے تو حویلی کے دالان میں چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی ہے۔ پس منظر میں نیلا آسمان چمک رہا ہے۔ دالان کی ایک منڈیر پر شاعر بیٹھا کچھ لکھنے میں مصروف ہے۔ مشرقی جانب سے بوڑھا کسان آتا دکھائی دیتا ہے۔ اس نے سفید کپڑے پہنے ہوتے ہیں اور چتکبرے بچھڑوں کی جوڑی کو ہانکتا چلا آ رہا ہے۔ دالان کے سامنے آ کر وہ بچھڑوں کو روکتا ہے۔ پھر مسکرا کر شاعر کی طرف دیکھتا ہے اور اس کے قریب جاتا ہے)

کسان:۔ تم گیت لکھ رہے ہو؟

شاعر:۔ (چونک کر) کون۔۔ کون ہو تم!

کسان:۔ مجھے پہچانا نہیں تم نے؟

شاعر:۔ مجھے کچھ کچھ خیال ہے۔ تمہیں دیکھا ہے کہیں

کسان:۔ کوئی طوفانی رات یاد کرو۔ جب تم بارش سے بچنے کے لئے اس حویلی میں پناہ گزیں ہوئے تھے۔ تقریباً ایک سال پہلے۔

شاعر:۔ مجھے یاد نہیں۔ میں نے سب کچھ بھلا دیا ہے۔ اور یوں بھی رات کے اندھیروں میں ملنے والے جب صبح کی روشنی میں ملتے ہیں تو ایک دوسرے کو پہچانتے نہیں ہیں۔

کسان:۔ تم سچ مچ شاعر ہو (پلٹ کر دوسری طرف دیکھتا ہے) ارے یہ کون آ رہا ہے؟

شاعر:۔ کوئی مسافر ہوگا (آنیوالا قریب آ جاتا ہے۔ یہ وہی مہاجر ہے لیکن اب اس کے چہرے پر اضطراب کی جگہ سکون نے لی ہے)

کسان:۔ آؤ آؤ میرے بھائی!

مہاجر:۔ ارے! یہ بھی یہاں موجود ہے۔ کتنا عجیب اتفاق ہے کہ ہم آج پھر مل گئے۔

کسان:۔ لیکن ہمارا ایک اور ساتھی آج موجود نہیں ہے۔ جانے کس حال میں ہوگا بیچارہ (موڑ سے نوجوان کی آواز آتی ہے) وہ دوڑتا ہوا اسٹیج کی مشرقی جانب سے حویلی کے دالان میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے بال ترشے ہوئے ہیں اور وہ سفید پتلون اور بشرٹ پہنے ہوئے ہے)

نوجوان:۔ میں آ گیا، میں آ گیا دوستو!

کسان:۔ (تم نے میرے بیلوں کی جوڑی دیکھی (بچوں کی طرح کلکاریاں مارتا ہے) یہ دیکھو یہ میرے بیل ہیں جن سے میں اپنے کھیتوں میں ہل چلاؤں گا۔

نوجوان:۔ تمہارے کھیت؟

کسان:۔ ہاں مجھے میرے کھیت مل گئے، میری زمین مل گئی، میری قسمت بدل گئی۔

مہاجر:۔ اور تم نے میرا نیا گھر دیکھا ہے (بیقرار سا ہو کر) بالکل ویسا ہی گھر، میرا وہی گھر جو کھو گیا تھا۔ تم نے نہیں دیکھا نا؟ میرے ساتھ چلو میں تمہیں دکھاؤں گا اور (جیب سے ایک پڑیا نکالتا ہے) اور تم جانتے ہو اس میں کیا ہے۔ نیلا رنگ! میں اپنے گھر کی چہار دیواری پر نیلا رنگ کراؤں گا۔ اور تمہیں معلوم ہے میرے چھوٹے بچے نے کل اس کے کچے آنگن میں نیم کا ایک پودا لگایا ہے۔ اور ڈیوڑھی کے سامنے بہت سی چھوٹی چھوٹی کیاریاں بنا دی ہیں!

نوجوان:۔ مبارک ہو تمہیں تمہارا نیا گھر اور تمہیں تمہارے کھیت اور بچھڑوں کی یہ جوڑی!

کسان:۔ مگر تمہاری ملازمت کا کیا بنا؟

نوجوان:۔ مجھے ملازمت مل گئی۔ اب میں بے روزگار نہیں ہوں۔ میں اپنی ملازمت پر قریب کے گاؤں میں جا رہا ہوں۔

مہاجر:۔ کیا کام کرو گے تم؟

نوجوان:۔ مجھے گاؤں کے رہنے والوں کو ایک بڑا اہم منصوبہ سمجھانے کا کام سپرد ہوا ہے۔ یونین پنچایتیں کیا ہیں اور کیا کریں گی۔ ہماری انقلابی حکومت نے بنیادی جمہوریتوں کا منصوبہ کیوں بنایا۔ یہی اور اسی قسم کی اطلاعات اور تفصیلات سمجھانا میرا کام ہوگا

کسان:۔ ہم سب خوش قسمت ہیں۔ لیکن تم میں سے کسی نے بھی اس کا حال نہیں پوچھا (شاعر کی طرف اشارہ کر کے) یہ وہی شاعر ہے جس نے اس رات انقلاب کی پیشینگوئی کی تھی اور اب یہ ہمیں پہچاننے سے بھی انکار کرتا ہے!

نوجوان:۔ شاعر! (شاعر سر اٹھا کر نوجوان کی طرف دیکھتا ہے) تم مجھے پہچانتے ہو نا شاعر؟

شاعر:۔ میں کسی کو نہیں پہچانتا!

نوجوان:۔ بتاؤ کون ہوں میں؟

شاعر :- مسافر، جو چند لمحوں کے لئے سستانے اس پرانی حویلی کے دالان میں آبیٹھتا ہے۔

نوجوان :- بس اس سے زیادہ اور کچھ نہیں؟

شاعر :- نہیں۔

مہاجر :- شاعر! مجھے میرا گھر مل گیا (شاعر خاموش رہتا ہے)

کسان :- مجھے میرے کھیت مل گئے شاعر! (شاعر خاموش رہتا ہے)

نوجوان :- تم کیا کر رہے ہو شاعر؟

شاعر :- میں شعر لکھ رہا ہوں

نوجوان :- کس کے متعلق؟

شاعر :- اس کے کھیتوں کے متعلق، اس کے نئے گھر کے متعلق اور اس منصوبہ کے متعلق جس کے لئے تم کام کر رہے ہو۔

نوجوان :- مگر تم تو ہمیں پہچانتے بھی نہیں؟

شاعر :- اس سے کیا ہوتا ہے؟ میں تمہیں نہیں جانتا تو کیا ہوا ان کھیتوں کو جانتا ہوں جو اس کے ہیں، اس گھر کو جانتا ہوں جس کا یہ مالک ہے، اس منصوبہ سے واقف ہوں جس کے لئے تم کام کر رہے ہو۔ میں انہیں کے متعلق لکھ رہا ہوں چونکہ یہ سب زندہ رہیں گے۔ تم مر جاؤگے اور یہ زندہ رہیں گے!

مہاجر :- لیکن شاعر ــــ

شاعر :- میرا وقت برباد نہ کرو۔ مجھے گیت لکھنے دو۔

کسان :- مگر شاعر۔

شاعر :- اگر تم اسی طرح باتیں کرتے رہے تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔

نوجوان :- (کسان اور مہاجر سے) اسے تنگ نہ کرو، اسے کام کرنے دو۔ اس کا کام ہم سب سے اہم ہے۔ اسے سکون کی ضرورت ہے۔ صدیوں بعد اسے سکون ملا ہے، اسے تنگ نہ کرو۔ آؤ ہم یہاں سے چلیں۔ اسے کام کرنے دو۔ (تینوں شاعر کی طرف دیکھتے ہیں جو اسی طرح منڈیر پر بیٹھا گیت لکھنے میں مصروف ہے۔ اور پھر حویلی کے دالان سے نیچے اتر کر ایک طرف چل دیتے ہیں۔ شاعر سر اٹھا کر دور جاتے ہوئے تینوں آدمیوں کی طرف دیکھتا ہے۔ اور اس کے ہونٹوں پر بڑی میٹھی مسکراہٹ پھیل جاتی ہے ــــ پردہ آہستہ آہستہ گر جاتا ہے)

رپورتاژ:

اجالے کی طرف

عنایت اللہ

۲۳ر اکتوبر ۱۹۵۹ء کی صبح طلوع ہو چکی تھی۔

اس صبح میں کوئی خاص بات نہیں تھی سوائے اس کے کہ قید کا ایک اور دن شروع ہو چکا تھا۔ اس صبح میں کوئی انوکھا پن نہیں تھا۔ کوئی دلکشی بھی نہیں تھی۔ زنداں کی ہر صبح کی طرح یہ بھی عام قسم کی صبح تھی۔ قیدیوں کی بارکوں اور کوٹھڑیوں کے دروازے کھل چکے تھے اور وہ روزمرہ کی مشقت پوری کرنے، جوڑی جوڑی، جیل کے کارخانے کی طرف جا رہے تھے۔ سر جھکے ہوئے تھے۔ جیسے ضمیر نے کوئی ناگوار سا بوجھ بڑی مشکل سے اٹھا رکھا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ، نہایت ہی آہستہ چلے جا رہے تھے۔ جیسے اسی کوشش میں ہوں کہ وقت آگے نکل جائے اور وہ پیچھے رہ جائیں۔ سامنے جیل کی دومنزلہ ڈیوڑھی پر پاکستان کا سبز جھنڈا عجب شانِ بے نیازی اور معصومیت سے اکتوبر کی خنک ہواؤں سے کھیل رہا تھا۔

قیدیوں کے انبوہ میں سے کچھ چہرے اوپر کو اٹھے۔ نگاہوں نے غیر ارادی سے انداز میں جھنڈے کو دیکھا اور نگاہیں گرد و پیش کا جائزہ لینے لگیں۔ ماحول میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ پتھروں کی اونچی دیواروں میں وہی روزمرہ والی، صدیوں پرانی، ہیبت تھی۔ ان کی بلندی وہی تھی اور اس بلندی کا نفسیاتی اثر وہی تھا۔ باہر کی دنیا کی گہما گہمی کی مختلف آوازیں، ملوں کی طرف مزدوروں کے بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں، ان کے آزاد قہقہے، سائیکلوں کی گھنٹیاں اور کسی ہوٹل کے لاؤڈ سپیکر کے اگلے ہوئے فلمی گانے جیل کی فضا میں سے تیرتے ہوئے گزر رہے تھے جس طرح صحرا کے اوپر سے بادلوں کے ٹکڑے بن برسے اُڑے جا رہے ہوں۔ یہ آوازیں چند ہی قدم سے آ رہی تھیں جیل کے ساتھ ساتھ جاتی ہوئی سڑک اور قریبی آبادی سے — لیکن ان دیواروں کا نفسیاتی اثر یہ تھا جیسے یہ آوازیں قیدیوں تک کوسوں دور سے — برسوں دور سے — آ رہی تھیں، افق کے اس پار سے۔

قیدی روزمرہ کی مشقتوں میں مصروف ہو گئے۔ ان کے کام کرنے کے انداز میں کام کم اور مصروفیت زیادہ تھی۔ وہ کام سے کم اور وقت سے زیادہ نبرد آزما تھے۔

کوئی تین ماہ سے یہ افواہیں پھیلنی شروع ہو گئی تھیں کہ یوم انقلاب کے موقع پر قیدیوں کو عام معافی دی جائے گی۔ قیدی کی زندگی میں خوشگوار افواہ کو اُسی قدر دخل ہے جس قدر پیاسے صحرا نورد کی مسافت میں سراب کو۔ تھکا ہارا، پیاس کا مارا مسافر فریب کے تعاقب میں طویل، بہت ہی طویل مسافت طے کر جاتا ہے۔ پانی ملتا تو نہیں، نظر تو آتا رہتا ہے۔ افواہیں بے بنیاد ہی سہی لیکن قیدی ان کے نیچے بنیادیں خود تعمیر کر لیتے ہیں۔ آزاد دنیا میں افواہ پروپیگنڈا یا عملی مذاق کی خاطر پھیلائی جاتی ہے لیکن جیل میں افواہ پھیلانے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وقت کو کسی فریب یا جھوٹی سچی امید سے بہلا کر چلتا کیا جائے۔ جب افواہ جیل میں گھومتی ہے تو قیدی اپنی اپنی امید، ابتلا اور عقل کے مطابق اس میں قطع و برید اور ترمیم کر کے اسے قابلِ یقین بنا لیتے ہیں۔ ان کی ایڈیٹنگ قابلِ تحسین ہوتی ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ افواہ کا مصنف اکثر خود بھی اپنی ہی پھیلائی ہوئی افواہ کا شکار ہو جاتا ہے۔ پیشتر اس کے کہ ایک افواہ مکمل طور پر ٹھنڈی ہو جائے اسی میں سے ایک اور شوشہ نکلتا ہے جو ایک اور افواہ کے روپ میں ہوا کی طرح جیل بھر میں گھوم جاتا ہے۔ اور اس طرح قیدی اپنے آپ کو امیدوں، جھوٹی تسلیوں اور افواہوں پر زندہ رکھتے ہیں۔

اب عام معافی کی افواہ جو پھیلی تو ہر ایک قیدی نے اسے مصدقہ خبر کا درجہ دے دیا اور اس میں نت نئے اضافے کرنے لگے۔ سرکاری طور پر قیدیوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں، عادی اور اتفاقیہ۔ لیکن عام معافی کی افواہوں نے قیدیوں کو دو مختلف حصوں میں بانٹ دیا تھا۔ ایک

مارشل لا، سے پہلے کے سزا یافتہ اور دوسرے مارشل لا کے نفاذ کے بعد کے ــــ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ افواہیں یہ ترمیم ہو گئی تھی کہ، اکتوبر ۵۸ء کے بعد کے سزا یافتہ قیدیوں کو کوئی معافی نہیں ملے گی کیونکہ ان کے مقدمات دیانتدارانہ، غیر جانبدارانہ اور منصفانہ فضا اور ماحول میں سنے اور پرکھے گئے ہیں لیکن مارشل لا، سے پہلے کے قیدیوں کے متعلق انقلابی حکومت کو یقین ہے کہ ان کے ساتھ انصاف نہیں ہوا اور ان کے مقدمات میں سیاسی شعبدہ بازیاں کارفرما رہی ہیں۔ بہت سارے بے گناہ ہیں اور بیشتر کی سزائیں جرائم کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں۔ قیدیوں کا خیال تھا کہ نئی حکومت معاشرے کے کونے کونے کو چھان رہی ہے۔ لہٰذا قیدیوں کو کسی طرح نظرانداز نہیں کیا جائے گا۔

اگست کے آخر تک عام معافی کی اس افواہ کو قیدیوں نے " سرکاری اطلاع کا درجہ دے دیا تھا۔ جیل کے اندر اخبارات کی مانگ بڑھ گئی تھی اور ان پڑھ قیدیوں نے لکھے پڑھے قیدیوں سے اخبارات پڑھوا پڑھوا کر ادھ موا کر دیا تھا۔ ہم " بی کلاس" کے قیدیوں کو ہر قدم پر اس سوال کا جواب دینا پڑتا تھا۔ " بابو صاحب! کوئی نئی خبر؟" میں نے ایک دن قیدیوں کے ہجوم میں بیٹھے کہہ دیا ــــ " ارے جاہلو! یہ محض افواہیں ہیں۔ ابھی کوئی سرکاری اطلاع نہیں آئی۔" میرا یہ کہنا تھا کہ قیدی جیسے مجھ پر ٹوٹ پڑے ۔۔

" بابو صاحب"! ایک نے کہا۔ " آپ کو یوں نہیں کہنا چاہیئے تھا۔ آپ تو تعلیم یافتہ ہیں آپ نے مارشل لا، کی توہین کر دی ہے"

ان پندرہ بیس قیدیوں نے (جن میں سوائے ایک دو کے ان پڑھ تھے) مجھے قائل کر لیا کہ " جنرل ایوب قیدیوں کو نہیں بھولے گا۔" یہ سب مارشل لا، سے پہلے کے سزا یافتہ تھے۔ جب وہ مجھے یکے بعد دیگرے اپنے دلائل دے رہے تھے تو مجھے خدشہ محسوس ہوا کہ اگر ان قیدیوں کو نظرانداز کر دیا گیا تو بے انصافی ہوگی۔ گو مجھے امید تھی کہ قیدیوں کی توقعات کے مطابق ان کو کبھی فراموش نہیں کیا جائے گا لیکن میں اپنے طور پر سوچ رہا تھا کہ اگر، اکتوبر ۱۹۵۸ء سے پہلے کی اس سیاست گزیدہ مخلوق کو انقلابی حکومت نے بھی نظرانداز کر دیا تو؟ جب یہ قیدی مجھ پر دلائل کی بوچھاڑ کر رہے تھے تو یوں لگ رہا تھا جیسے میں ایک ہجوم میں کھڑا سنگسار کیا جا رہا ہوں۔ وہ تیزی سے، غصے سے اور بلند آواز سے بول رہے تھے ــــ " تم کیا سمجھتے ہو بابو کہ میں جو عمر قید بھگت رہا ہوں کیا میں واقعی قاتل ہوں؟" میں نے اس کی طرف دیکھا۔

" قاتل کوئی اور تھا۔ گاؤں جانتا ہے کہ قاتل نمبردار کا بیٹا تھا لیکن جھوٹی گواہیوں، بناوٹی مشیرناموں اور فرضی برآمدگیوں کے جال میں مجھے الجھا کر عمر قید دلائی گئی ...." اس پر رقت طاری ہو گئی۔ وہ گھونٹ سا نگل کر بولا۔ " میرا جرم صرف یہ تھا کہ میں نے گھر اور اپنی برادری کی پرچیاں فلاں ممبر کے نام نہیں ڈالی تھیں۔ میرے گھر کی پانچ پرچیاں تھیں اور برادری کی چالیس۔" اس کے بعد جب اس نے اس داستانِ خونچکاں کی تفصیلات سنائیں۔ تو کئی بار جی چاہا کہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دوں، روک دوں اسے کیونکہ وہ رو رہا تھا اور میرے اعصاب متحمل نہیں ہو رہے تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی آنکھوں سے آنسو نہیں قانون کی شاہ رگ سے خون ٹپک رہا تھا۔

" میں ایک ہی نہیں بابو!" اس نے میرے کندھے پر زور سے ہاتھ مار کر چونکا دیا۔" پاکستان کی تمام جیلوں میں جا کے کال کوٹھڑیوں اور بارکوں کو نہ دیکھو۔ قیدیوں کے سینے چیر کے دیکھو۔ میں ایک ہی نہیں جانے کتنے بے گناہوں کو ان لیڈروں اور وزیروں نے پابہ زنجیر کر کے ان کے بچوں کو بھوکا رلایا ہے اور ان کی عورتوں کی کسمپرسی سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے، پرچیوں والے جرم، میں کون جانے کتنے 'مجرموں' کو پھانسی چڑھا دیا گیا ہے۔ بعض بھلے مانس اور شریف لوگوں کو ڈکیتی اور اغوا وغیرہ کے جھوٹے مقدموں میں گرفتار کر کے سالہا سال کے لئے جیلوں میں ٹھونس دیا گیا ہے۔"

" مارشل لا کیوں لگایا گیا ہے؟" ایک اور قیدی نے اشتیاق سے پُر لہجے میں پوچھا ــــ " فرعونیت کو ختم کرنے کے لئے۔" دوسرے قیدی نے جواب دیا۔

" ہم جو بھگت چکے ہیں۔ بھگت چکے ہیں ...." ایک اور نے کہا۔ " اب انصاف کا وقت آ گیا ہے۔ ہمیں اس یومِ انقلاب پر رہا کر دیا جائے گا۔"

" یہ حکومت خدا اور قرآن کی ہے۔"

اور ایک قیدی جسے میں شکل و شباہت کی مطابقت سے بدّھو سمجھ رہا تھا، بولا " ہم یقیناً بخشے جائیں گے بابو صاحب! کیونکہ ہم طلوعِ اسلام سے پہلے کے لوگ ہیں "۔

اور میں بھی عام معافی کی افواہ کو سچ ماننے لگا۔ میرے پاس صرف ایک دلیل تھی وہ یہ کہ ان مظلوم محبوسین کو جس ضربِ کلیم کا انتظار تھا اس کا دھاکہ انھوں نے ، ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو سن لیا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر ان قیدیوں کا انقلابی حکومت پر یہ اعتماد کہ " جنرل ایوب ہمیں نہیں بھولے گا " مجھے قائل کر رہا تھا کہ یہ خبر گو افواہ ہے لیکن اس میں جان ہے ، اس کے پیچھے بنیادیں ہیں اور اس میں خدا کا ہاتھ بھی ہے۔

مارشل لا ، سے پہلے کے قیدی مطمئن تھے لیکن ، ۷ اکتوبر ۵۸ء سے بعد کے سزا یافتہ سر جھکائے ہوئے الگ بیٹھے تھے۔ وہ بھی ایک حد تک مطمئن تھے۔ انھیں یقین تھا کہ ان کے ساتھ بے انصافی نہیں ہوئی۔ یا کم از کم انھیں یہ تسلی تھی کہ انھیں اپنے گناہوں کی سزا ملی ہے اور سزائیں جرائم کی شدت و نوعیت کے مطابق ملی ہیں۔

ماہ ستمبر کے آخر تک جیلوں میں ہنگامہ بپا ہونے لگا تھا حالانکہ کسی طرف سے اس افواہ کی سرکاری تائید نہیں ہوئی تھی نہ کوئی جیل کا افسر تائید کی ذمہ داری لے رہا تھا لیکن قیدی جانے کہاں کہاں کے حوالے دے دے کر عام معافی کی افواہ کو سرکاری حیثیت دے رہے تھے۔ اکتوبر کے آغاز میں ایک اردو اخبار نے اپنے نامہ نگار کے حوالے سے خبر شائع کر دی کہ انقلاب کی پہلی سالگرہ پر قیدیوں کو عام معافی دی جائے گی۔ لیکن خبر کا متن کچھ اس قسم کا تھا کہ اسے مصدقہ یا یقینی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس کا " معتبر ذرائع " کوئی قیدی معلوم ہوتا تھا۔ کچھ بھی ہو اس خبر نے جیل میں وہ اودھم مچایا کہ قیدی رات بھر ناچتے اور گاتے رہے۔ خبر کے آخر میں لکھا تھا " سرکاری اعلان عنقریب کر دیا جائے گا " اور قیدیوں نے " عنقریب " کی انتہائی میعاد کا تعین شروع کر دیا۔ بعض نے کہا عنقریب کا مطلب ہوتا ہے ایک ہفتے تک۔ اور بیشتر دس روز کہہ رہے تھے۔ ایک قیدی نے منطق اور علم کے زور پہ دلیل دیتے ہوئے کہا۔ " گاؤں میں جب کوئی نزع کی حالت میں ہوتا ہے تو دوسرے گاؤں میں یوں اطلاع بھجوائی جاتی ہے کہ فلاں " موت القریب " (قریب الموت) ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اطلاع بھجوانے کے فوراً بعد وہ مر جاتا ہے لہٰذا 'عنقریب' اور 'موت القریب' کی مدت میں اگر کچھ فرق ہے تو زیادہ سے زیادہ ایک آدھ دن کا ہوگا۔" آخر قیدیوں نے سر جوڑ کے فیصلہ کیا کہ ایک ہفتے تک سرکاری اعلان ہو جائے گا۔

اب " عنقریب " کے انتظار کی تلخیاں شروع ہو گئیں۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ دس دن بھی گذر گئے " عنقریب " کی میعاد طویل تر اور عام معافی کی افواہیں گرم تر ہوتی گئیں۔ جب ۲۰ اکتوبر تک کوئی سرکاری اعلان نہ ہوا تو بعض چہرے مرجھانے لگے۔ مایوسی کی دبی دبی آوازیں سنائی دینے لگیں اور بعض قیدی بحث مباحثے میں الجھنے لگے۔ ایک وہ تھے جو مارشل لا ، میں کیڑے نکالنے لگ گئے تھے اور زیادہ تعداد ان کی تھی جو ابھی مایوس نہیں ہوئے تھے۔

" مجھے ایک بات کا جواب دو " یہ ایک قیدی کی آواز تھی۔ " ہمیں کیوں معاف کر دیا جائے ؟ قاتلوں اور ڈاکوؤں کو کیوں بخش دیا جائے ؟ کیا ہم نے بھی کسی کو بخشا تھا ؟ " - " لیکن تم تو بے گناہی میں دس سال کی سزا بھگت رہے ہو " دوسرے نے حیرت سے پوچھا۔ " تم ایسی بات کیوں کہتے ہو ؟

" میں پوچھتا ہوں چند بے گناہوں کی خاطر گناہگاروں کو بھی کیوں چھوڑ دیا جائے ؟ " اس نے متانت سے جواب دیا۔ " میں بے گناہ ہی سہی ، مجھے مارشل لا ، معافی نہ دے نہ سہی ، میں صرف ایک بات پہ خوش ہوں کہ ملک سے بے ایمانی اٹھ گئی ہے اور مارشل لا ، والوں نے پرچیوں کی منڈی بند کر دی ہے۔ میں خوش ہوں دوستو ! میں بہت ہی خوش ہوں مجھے جس نے جیل بھجوایا ہے وہ آج خود مجرم ہے۔ پولیس ہتھکڑیاں لئے اس کے پیچھے گھوم رہی ہے۔ مارشل لا ، والوں نے اس کی بادشاہی ہم مزارعوں پر بانٹ دی ہے..... اب آئے پرچی لینے "۔

یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ جیلوں میں بہت سے قیدی " الیکشن زدہ " تھے ہزارہا انسانوں کو " غلط امیدوار " کو ووٹ دینے

یا کسی حریف سیاسی پارٹی سے متعلق ہونے کے جرم میں پھانسا گیا اور انھیں سزائیں دلوائی گئی تھیں: گو اُس وقت کے قانون میں ایسے کسی جرم اور دفعہ کا ذکر نہیں آتا لیکن تعزیراتِ پاکستان میں سیکڑوں اور دفعات جو موجود تھیں جسے جیل نہیں بھجوایا جاتا تھا اس کے پیچھے پٹواری کو ڈال دیا جاتا تھا۔ پٹواری کا بستہ مداری کی پٹاری سے کیا کم ہوتا ہے۔ اس میں سے جہاں جیتا جاگتا کبوتر نکل آتا ہے وہاں لوہے کے گولے اور میخیں بھی نکل آیا کرتی ہیں۔ ۷ راکتوبر ۱۹۵۸ء کو ختم ہونے والے دور میں بستے کی مسمریزم تھی۔

جیل میں قیدی ووٹوں کے نام سے یوں گھبرا رہے تھے جیسے بچے چیچک کے ٹیکے لگانے والے کو دیکھ کر بھاگ اٹھتے ہیں۔ ان حادثات کی تفصیلات بہت طویل ہیں اور بے حد تلخ۔ اُن پرچیوں پر جانے کتنی خونچکاں داستانیں لکھی ہوئی ہیں۔ مارشل لا سے پہلے کی دیگر دھاندلیوں کی صحیح اور مکمل تصویر دیکھنی ہو تو جیل میں جا کے دیکھئے۔ ایک ایک انسان اور انسان کا ایک ایک خط عریاں نظر آئے گا۔

جب بنیادی جمہوریت کی خبریں آنے لگیں تو میں نے بعض قیدیوں کو اداس اور یاس آلود لہجے میں کہتے سنا۔ "ہم خوش تھے کہ مصیبت ختم ہوئی، مارشل لا، والوں نے پھر ووٹوں کا قصہ اٹھا لیا ہے۔" وہ بنیادی جمہوریت کے نام کو صرف اس لئے ناپسند کرتے رہے کہ اس میں ووٹوں کا ذکر تھا لیکن انھیں انقلابی حکومت پر اس حد تک اعتماد تھا کہ وہ مارشل لا کی ہر چیز کو پسند کرنا چاہتے تھے۔ آخر انھوں نے 'بی کلاس' کے قیدیوں سے کرید کرید کر پوچھنا شروع کر دیا کہ 'بنیادی جمہوریت' کیا ہے۔ وہ اس میں اچھے پہلو تلاش کرنا چاہتے تھے۔ پرچیوں کے مارے ہوئے اَن پڑھ دیہاتی قیدی ساری بات سمجھنے کی ذرہ بھر کوشش نہیں کر رہے تھے۔ وہ رہ رہ کے یہی سوال پوچھتے تھے۔ "کیا یہ پرچیاں پہلے کی طرح ڈالی جائیں گی؟ کیا دیہات میں پھر موٹر کاریں جائیں گی اور پرچیوں کی خاطر قرآن اور رسولؐ کے نام پہ جھوٹے وعدے دیئے جائیں گے؟ کیا اب بھی دیہاتیوں کو ڈرا دھمکا، بہلا پھسلا اور سبز باغ دکھا کر پرچیاں لی جائیں گی؟ کیا اب بھی پرچیوں پر برادریوں میں خون خرابے ہوں گے؟ کیا اب بھی ووٹوں کے پیسے دیئے جائیں گے جو وزارت بننے کے بعد ٹیکسوں اور دوروں کے ذریعے پورے کر لئے جائیں گے؟ کیا اب بھی جو آدمی اپنی مرضی کے مطابق ووٹ دے گا رات اس کی گائے چوری ہو جائے گی۔"

"اور بابو صاحب! کیا پھر سَن چھپن والا جمہوریہ بن جائے گا؟"

"اور بابو صاحب! کیا مارشل لا ہٹ جائے گا؟"

"یہ تو بہت بُرا ہو گا بابو صاحب!"

جب انھیں یقین دلایا گیا کہ ایسا نہیں ہو گا اور وہ جسے جی چاہے ووٹ دیں گے اور جسے ووٹ نہیں دیں گے وہ خواہ کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہو وہ کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکیگا، تو قیدیوں کے مرجھائے ہوئے چہرے مسرّت سے کھِل اٹھے۔ ان میں جو بنیادی جمہوریت کے تصور اور افادیت کو سمجھ گئے وہ بہت ہی خوش اور مطمئن تھے اور جو نہ سمجھ سکے وہ اسی پہ مطمئن تھے۔ اور ان کے لئے یہ اطمینان کافی تھا۔ کہ وہ اپنے ووٹ کا صحیح اور جائز استعمال کر سکیں گے اور بے خوف و خطر کر سکیں گے۔ ان کا کامیاب امیدوار پہلے کی طرح ہمیشہ کے لئے ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو جائے گا بلکہ اس نئے طرزِ حکومت میں وہ کسی بھی وقت اپنے نمائندے کا گریبان پکڑ سکیں گے۔

"اور بابو صاحب! ۲۷ راکتوبر کو عام معافی ملے گی؟"

"بھئی! ابھی تو کچھ علم نہیں۔"

کھِلا ہوا چہرہ مرجھا گیا۔

۲۰ راکتوبر کی صبح قیدیوں کے ہجوم میں کئی چہرے اداس تھے۔ 'عنقریب' کی میعاد ختم ہو چکی تھی۔ عام معافی کی سرکاری اطلاع نہیں آئی تھی۔

۲۳ راکتوبر کی صبح طلوع ہوئی۔ قیدی جاگ اٹھے تھے، امیدیں اونگھ رہی تھیں۔ قیدی روزمرہ کی مشقت پوری کرنے جوڑی جوڑی جا رہے۔ سامنے پاکستان کا سبز جھنڈا بے نیازی اور معصومیت سے جھوم رہا تھا۔ قیدیوں کے جلوس میں سے کچھ چہرے ذرا اوپر

اُٹھے، نگاہوں نے غیرارادی سے طور پر جھنڈے کو دیکھا اور نگاہیں جھک گئیں۔ یوم انقلاب میں صرف چار روز باقی تھے جن میں سے ایک نہایت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ عام معافی کی افواہ محض بے جان افواہ بنتی جا رہی تھی۔ ابھی تک سرکاری اعلان نہیں ہوا تھا۔ دن کا پچھلا پہر تھا کہ جیل میں یکلخت ہڑبونگ مچ گئی۔ قیدیوں کی چیخوں اور نعروں سے جیل کی دیواریں اور سلاخیں ہلنے لگیں۔ قیدی ایک دوسرے سے بغلگیر ہو رہے تھے اور پاگلوں کی طرح چیختے جا رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے جیل میں بغاوت ہو گئی ہے جسے قابو میں نہ لایا جا سکے گا۔ معلوم ہوا ایک اردو اخبار نے چار کالمی سرخی دی ہے کہ انقلاب کی پہلی سالگرہ پر قیدیوں کو عام معافی دی جائے گی۔ اس معافی میں ۷ راکتوبر ۵۸ء کے بعد کے سزا یافتہ بھی برابر کے شریک تھے لیکن یہ خبر بھی اسٹاف رپورٹ کی تھی۔ سرکاری اطلاع ابھی تک نہیں آئی تھی۔

شام قیدیوں کی گنتی ہو رہی تھی کہ ایک بار پھر جیل کے در و دیوار ہل گئے۔ وہ اودھم کہ جیل کے وارڈروں نے بھی گنتی چھوڑ کر لطف اندوز ہونا شروع کر دیا۔ کسی نے آکر خوش خبری سنا دی تھی کہ دفتر میں سرکاری چٹھی آگئی ہے۔ چٹھی میں لکھا تھا کہ دس سال سے کم والے جن قیدیوں کی سزا مع حج کی معافی کے، نصف گذر گئی ہو انہیں ۲۷ راکتوبر کو رہا کر دیا جائے، سزائے موت کے قیدیوں کی سزا عمر قید میں تبدیل کر دی جائے اور جو قیدی ابھی نصف سزا پوری نہ کر چکے ہوں (عمر قید والے بھی) انہیں دو مہینے فی سال کے حساب سے معافی دی جائے۔

۲۴ راکتوبر کی صبح کو جیل کا ماحول بدلا ہوا تھا۔ فضا سے یاس اور ناامیدی ڈھل چکی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ہیبت ناک دیواریں اور سیاہ کالی سلاخیں بھی مسکرا رہی تھیں۔ عجیب سرگرمی تھی۔ ساری جیل میں میلے کا سماں تھا۔ قیدی کھانا اور سونا تک بھول گئے تھے۔ جدھر دیکھو تین تین چار چار کی ٹولیاں مٹھی یا کھڑی نظر آتی تھیں اور رہائی کے بعد کے پروگرام بن رہے تھے۔ کوئی بچوں سے جلد از جلد ملنے کے لئے بے تاب تھا تو کوئی سب سے پہلے سسرال پہنچنا چاہتا تھا۔ جن کی شادیاں قید کی وجہ سے التوا میں پڑی ہوئی تھیں ان کا رنگ ہی نرالا تھا۔ بعض کسی پیر فقیر کے مزار پر جانا چاہتے تھے اور کوئی سب سے پہلے "ایوب پارک" کی سیر کرنا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک مارشل لاء کا شکریہ ادا کرنے کا یہ موزوں ترین طریقہ تھا۔ جن کے ابھی چار چار، پانچ پانچ سال باقی تھے اور وہ رہ گئے جا رہے تھے وہ رہ رہ کے آسمان کی طرف دیکھتے تھے۔ اور ۷ راکتوبر ۵۸ سے پہلے کے سزا یافتہ قیدی جنہیں اپنے جرم کا بھی کوئی علم نہ تھا زار و قطار رو رو کر خدا و رسولؐ اور انقلابی حکومت کی دریا دلی اور انصاف پسندی کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔

سب سے زیادہ قابلِ غور عادی مجرم یعنی جرائم پیشہ تھے۔ میں نے ایسے تین چار قیدیوں سے بات کی تو اُن کا جواب اور آئندہ پروگرام سن کر حیران رہ گیا۔ تقریباً سب نے کہا۔ "جس نے ہم پر مہربانی کی ہے ہم اس پر مہربانی کریں گے۔"

"مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"آج سے ہم جرائم کا پیشہ ترک کر رہے ہیں۔" انہوں نے فاتحانہ انداز سے کہا۔ "جب تک یہ حکومت قائم رہے گی ہم کسی گھر چوری نہیں کریں گے، نہ کوئی جیب کاٹیں گے۔" وہ اور کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن انہیں سجھائی نہ دیتا تھا کہ کیا کہیں۔ اظہار کی راہیں مسدود تھیں۔ اگر کوئی ماہر نفسیات ہوتا تو یہ دو ہی فقرے سن کر مجرم کی نفسیات اور اصلاح کے فلسفے کو تہہ کر کے رکھ دیتا۔

رہائی میں صرف دو دن باقی تھے لیکن گذرتے نظر نہیں آ رہے تھے۔ ایک قیدی کہہ رہا تھا "دو برس نہایت اطمینان سے گذارے ہیں، یہ دو دن مشکل سے گذر رہے ہیں۔" آخر ۲۷ راکتوبر کی صبح طلوع ہوئی۔ رہا ہونے والے قیدیوں نے نماز شکرانہ ادا کی اور انقلابی حکومت کی کامیابی کی دعا کی۔ پھر جیل کے دو تو آہنی دروازے کھول دیئے گئے اور قیدی "پاکستان زندہ باد" "فیلڈ مارشل ایوب خاں زندہ باد" "قائد اعظم زندہ باد" اور "انقلابی حکومت زندہ باد" کے فلک شگاف نعرے لگاتے ہوئے باہر نکلے اور اس زندگی میں باعزت شہریوں کی طرح داخل ہو گئے جہاں اب انصاف ہے، مضبوط اور اٹل قانون ہے، جمہوریت ہے اور جہاں اب وہ ۷ راکتوبر ۵۸ء سے پہلے والے دور کی بے اطمینانیوں اور بے انصافیوں کے خطرات سے آزاد ہوں گے۔


لہلہاتی کھیتیوں کے محافظ



آپ کی دایہ کے ہاتھوں میں ہے۔



زچگی کے بعد جب بھی آپ کی دایہ زچگی سے متعلق کام کے لئے آئے تو یہ ضرور دیکھ لیجئے کہ اُسے اپنے ہاتھوں اور آلات کو جراثیم سے پاک کرنے کے لئے صاف برتن، صاف پانی اور ڈیٹول مہیا کیا گیا ہے یا نہیں۔ اگر اُس کے ہاتھ اور آلات ڈیٹول کے جراثیم کُش محلول سے صاف نہ کئے گئے تو وہ آپ کے اور آپ کے بچہ کے لئے خطرہ کا باعث ہو سکتے ہیں کیونکہ اس طرح انھیں چھوت کی بیماری لگ جانے اور اُن کے خون میں زہر پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ چھوت سے زچہ کی حفاظت کیجئے۔ زچگی سے پہلے، زچگی کے دوران میں اور زچگی کے بعد ڈیٹول کا استعمال کیجئے۔

ڈیٹول

* زود اثر اور دافعِ سمیت ہونے کی وجہ سے جراثیم کو فوراً ہلاک کر ڈالتا ہے۔
* جس جگہ لگایا جائے وہاں ذرا بھی تکلیف نہیں ہوتی۔
* اس کی بو خوشگوار ہے۔

۸'۱۶ اور ۴ اونس کے سائزوں میں ملتا ہے۔
آج ہی ایک بوتل خریدیئے

ڈیٹول

تمام ڈاکٹر استعمال کرتے ہیں اور استعمال کا مشورہ دیتے ہیں

ریکٹ اینڈ کولمین آف پاکستان لمیٹڈ
پوسٹ بکس نمبر ۴۶۳۸ - کراچی۔

R C 807 JWT



دو مشہور نام

شیریں اور فرہاد

فرہاد نے سنگِ مرمر کا پہاڑ کاٹ کر ایران کی حسین شہزادی شیریں کے محل تک دودھ کی نہر پہنچادی۔ شیریں نے اُس کے کمالِ فن کی تعریف کی لیکن اُسکی محبت کو ٹھکرادیا کیونکہ فرہاد اُسکی نظر میں محض ایک غریب کوہکن تھا۔ لیکن فرہاد کی سچّی محبت شیریں کے دل پر اثر کئے بغیر نہ رہی اور آخر کار شیریں کا دل بھی پسیج گیا۔



اُتنے ہی مشہور نام

موبل گیس اور موبل آئل

بہترین موٹرنگ کے لئے اسٹینڈرڈ ویکیوم کے پراڈکٹس ہیں۔

پٹرولیم پراڈکٹس کو کفایت سے خرچ کرکے غیرملکی زرمبادلہ کی بچت میں حکومت کی مدد کیجئے۔ موبل گیس اور موبل آئل استعمال کرکے آپ ہر میل پر پٹرول کی بچت کرسکتے ہیں۔



موبل گیس اور موبل آئل وہیں دستیاب ہوتے ہیں جہاں اُڑتے ہوئے سرخ گھوڑے کا نشان نظر آئے

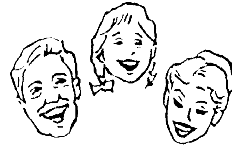
اسٹینڈرڈ ویکیوم آئل کمپنی

(انکارپوریٹڈ ان یو۔ ایس۔ اے۔ محدود ذمہ داری کے ساتھ)

کراچی — ڈھاکہ — لاہور

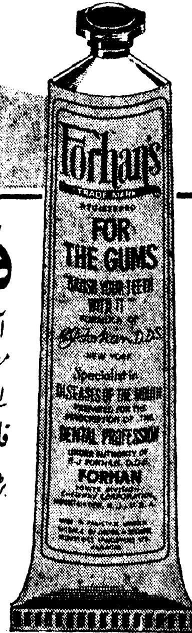
ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا - مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس میکلوڈ روڈ - کراچی
مدیر: رفیق خاور

فارہنس، خاندان کے لئے ٹوتھ پیسٹ !





مضبوط اور صحتمند
مسوڑوں کے معنی ہیں
چمکدار اور سفید دانت !



فارہنس استعمال کیجئے۔

آپکا دنداں ساز آپکو بتائیگا کہ مسوڑوں کی حفاظت ہی دانتوں کی صحیح حفاظت ہے، مضبوط مسوڑے صحتمند دانتوں کی بنیاد ہیں۔ ہر روز فارہنس سے برش کے ذریعہ اپنے دانتوں کو صاف کرتے وقت مسوڑوں پر بھی برش ملنے کی عادت ڈالئے۔ فارہنس آپکی سانس میں خوشبو اور مسکراہٹ میں دلکشی پیدا کردے گا۔

بڑے سائز کا ٹیوب۔ قیمت ۲ روپے ۲/ آنے۔ چھوٹے سائز کا ٹیوب۔ ایک روپیہ ۶/ آنے ۶ پائی۔

اِس سے زیادہ ہرگز نہ دیجئے۔

تیارکنندگان

ڈاج اینڈ سیمور انڈسٹریز (پاکستان) لمیٹڈ

ویسٹ وھارف۔ کراچی۔

DS 1002 JWT

سرودِ رفتہ: مولانا محمد علیؒ کی ایک قدیم تحریر

اکبر علی خاں

مولانا محمد علی صرف ہندوستان کی تحریک آزادی و حریت کے راہنما ہی نہیں تھے بلکہ تعلیم کے معاملے میں بھی ایک باغی اور انقلابی سوچ رکھتے تھے۔ انہیں ایک کامیاب ماہر تعلیم کہا جاسکتا ہے۔ انہوں نے اپنی سیاسی مشغولیتوں کے ساتھ ساتھ علی گڑھ سے مایوس ہو کر جامعہ ملیہ کا جو عملی نقشہ مرتب کیا وہ ان کے بھرپور پرخلوص توجہ اور لگن کی وجہ سے ہندوستان کے تعلیمی تجربات میں بہت اونچا مقام رکھتا ہے۔ وہ ہمارے سیاسی رہنماؤں میں اپنے نونہالوں کی تعلیم و تربیت کی ضرورت کو سختی سے محسوس کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ آزادی کی تحریک کے ساتھ ساتھ نئے ذہنوں کو نئی اور روح پرور غذا بھی میسر آتی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود اُن کی رہنمایانہ زندگی میں بے باک جذباتیت کا کوئی نشان نہیں۔ وہ شاید اس حیثیت سے بھی منفرد قرار دئے جائیں گے۔

خود ان کے ذہن کی تشکیل میں بی اماں کا ہاتھ برائے نام نہیں تھا۔ ان کی سوجھ بوجھ، ان کے انداز فکر اور ان کی تربیت کا اقرار مولانا محمد علی نے بھی سرسری طور پر نہیں کیا ہے۔ وہ پوری شدت سے بی اماں سے متاثر ہوئے۔ ان کی تعلیمی زندگی ختم ہونے کے بعد قومی مصروفیتوں میں بھی ان کا بہت بڑا سہارا بنی رہیں۔ وہ بڑی روشن دماغ اور پیش بین ہستی تھیں۔ اسی لئے انہوں نے اپنے قدامت پرست خاندان کی شدید مخالفت کے باوجود محمد علی کو مغربی تعلیم کے سپرد کر دیا۔ شاید ان کا یہ اقدام ہندوستانی مسلمانوں کی بیداری کے لئے ایک بیش قیمت انعام تھا جس نے محمد علی کو وہ کچھ بنا دیا جو دوسری صورت میں ممکن نہ تھا۔

محمد علی کی قومی تحریکات اور مشغولیتوں میں جو رُخ بی اماں نے اختیار کیا تھا اس سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کے سامنے محمد علی کی دنیاوی زندگی ہی کا سدھار نہیں تھا بلکہ وہ اپنے بیٹے کو قوم کے سپرد کرنے کے لئے تیار رہی تھیں۔ "جان بیٹا خلافت پہ دیدو" صرف لفظی اور کھوکھلا نعرہ نہیں ہے، اس کے ذریعے بی اماں کے سارے جذبات اور ان کی بزرگ ہمدرد اور وطن دوست شخصیت مجسم ہو کر سامنے آجاتی ہے اپنے تمام انقلابی دلولوں کے ساتھ۔

محمد علی بھی اپنے بچپن ہی سے تنگ و تاریک روایات کے حبس بیجا سے باہر نکلنے کے لئے بے چین نظر آتے ہیں اور ان کی ناقدانہ شان کے نقوش بہت واضح طور پر مل جاتے ہیں۔ وہ سرگشتۂ خمار رسوم و قیود نہ رہ سکے۔ اور بچپن میں اُن کے ذہن نے جس روشنی کا اکتساب کیا وہ ہندوستان کے چپے چپے پر پھیل کر رہی۔

جو تحریر ہم آگے چل کر پیش کرنے والے ہیں اس سے اس محمد علی کا سراغ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی جو مغربی تعلیم کو نفاق پسندی نہیں کرتا تھا بلکہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اس دولت بیدار کو عام کرنا چاہئے جس کا وہ خود سرمایہ دار ہے۔ اس تحریر سے تنگ اور محدود زندگی کی نفی بھی ہوتی ہے اور وسعتِ خیال کا پتہ بھی چلتا ہے۔

یہ تحریر مولانا محمد علی کی عام شاعرانہ بے کیفی کو پرکھنے میں بھی مددگار ہو سکتا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں مجاز سے جو فرار اختیار کیا ہے اس کے لئے ان کے ذہن میں بچپن ہی سے زمین ہموار ہو چکی تھی۔ اور وہ "باعقیمان کوئے دلدارم" کو بھی گوارا کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ پاکبازی سے دلدادگی کا رجحان اور شاعرانہ رندی دنیا کی سیہ دوری کا اظہار، یہ دونوں باتیں اسی تحریر میں ان کے قلم سے نکل چکی ہیں۔ وہ کسی بھی "شعریت" کو زندگی میں در کنار صرفِ شاعری میں بھی داخل کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا کلام ملاحظہ کیجئے۔ وہ تو امیر مینائی بھی نہ بن سکے۔ اسی لئے ان کے

یہاں شاعرانہ تاثرات، رنگ رنگ احساسات اور بالغ و بہار خیالات کا فقدان ہے۔ ان کی شاعری صرف وہیں جاندار نظر آتی ہے جہاں انہوں نے اپنے انسانی خلوص کے تحت شاعری کی ہے۔ اس میں سیاست بھی شامل ہے اور دین سے محبت بھی، قوم بھی، وطن بھی اور قوم پر سب کچھ نچھاور کر دینے کا جذبہ بھی۔

یہ تحریر رامپور کے اسٹیٹ گزٹ کی اشاعت دوشنبہ ۲۲ ستمبر ۱۸۹۱ء مطابق ۱۸ صفر ۱۳۰۹ھ جلد ۲ نمبر ۳۸ صفحہ ۱۰ پر درج ہے۔

مولانا محمد علی نے اپنی عمر اپنی خود نوشت سوانح میں یوں لکھی ہے:

"جس خالق نے مجھے ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۹۵ھ کو پیدا فرمایا تھا اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آج بتاریخ ۱۵ ذی الحجہ ۱۳۴۵ھ میں میں نے اپنی عمر کے پچاس سال پورے کر لئے"

یہ ہجری تاریخ پیدائش عیسوی حساب سے ۱۰ دسمبر ۱۸۷۸ء ہوتی ہے۔ گویا قول الذکر تحریر لکھتے ہوئے وہ اپنی عمر کے بارہویں سال میں تھے۔ انہوں نے ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ سے بی اے کیا اس ۱۸۹۰ء میں انہیں مڈل کلاس کا طالب علم ہونا چاہیئے لیکن مولانا محمد علی کے کسی سوانح نگار اور خود مولانا نے بھی رامپور کے کسی سکول میں طالب علم کا ذکر نہیں کیا۔ "حیات جوہر" میں عشرت رحمانی کا بیان ملاحظہ فرمائیے:

"ابتدا میں مولانا کو قرآن کریم کی کمسنی تعلیم دلائی گئی اور جب اس کی تکمیل ہو گئی تو جدید اصول کے مطابق ضروری دینیات سے فراغت ہوئی بعدازاں بریلی ہائی سکول میں داخل کرائے گئے۔ ابنائے وطن نے عموماً اور تمام عزیز و احباب نے خصوصاً یہ طریقہ تعلیم پسند نہ آیا اور انگریزی تعلیم کے مضر اثرات سے خوف دلایا گیا اور ناراضگی بھی ... والدہ محترمہ کو بھی ہوا مگر دھن کی پکی جلیل القدر روشن دماغ خاتون نے کسی کے کہنے سننے کی پرواہ نہ کی اور اپنی رائے کے مطابق اپنے بچوں کی تعلیم جاری رکھی۔

کچھ عرصے بریلی اسکول میں رہے۔ چند سال بعد علی گڑھ محمڈن اسکول میں داخل ہو گئے اور وہاں نہایت شاندار کامیابی کے ساتھ اسکول سے فراغت کر کے مسلم اینگلو اورینٹل کالج میں اعلیٰ تعلیم پانے لگے۔ اس وقت تک یونیورسٹی کی داغ بیل بھی نہیں پڑی تھی جو اعلیٰ کامیابی اسکول میں حاصل ہوئی تھی اس سے زیادہ اپنی خاص ذہانت اور ذکاوت کا ثبوت کالج میں دیا اور نہایت شان و شوکت کے ساتھ بی اے کی ڈگری حاصل کی"
(صفحہ ۴۵ کتاب مذکور)

رئیس الاحرار کے مشہور سوانح نگار رئیس احمد جعفری کی عبارت بھی دیکھتے چلئے:

"بچپن کی دو بہاریں دیکھی تھیں کہ داغ یتیمی برداشت کرنا پڑا لیکن خوش قسمتی سے آغوش مادر سے جدا نہیں ہوئے تھے۔ بی اماں مرحومہ نے جس بے نظیر مستقل مزاجی اور ایثار سے کام لے کر اپنے صاحبزادوں کو انگریزی تعلیم دلائی وہ یقیناً تاریخ سیاسیات کا ایک اہم باب ہے۔ پہلے اردو فارسی کی تعلیم تو مکان ہی پر ہوئی پھر بریلی کے ہائی اسکول میں داخل کر دئیے گئے" (سیرت محمد علی)

گھر پر اور بریلی ہائی اسکول کے درمیانی وقفے کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ ان بیانات کے پیش نظر تو یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ گھریلو تعلیم کے فوری بعد وہ بریلی کے ہائی سکول میں داخل کر دئیے گئے۔ اس طرح رامپور کی کسی باقاعدہ درسگاہ میں ان کی موجودگی کا علم ابھی تک کسی کو نہیں۔ جو تحریر میں پیش کر رہا ہوں وہ اس راز سے بھی پردہ اٹھاتی ہے اور عظیم رہنما کی پرخلوص، پرمحبت اور پرعزم، باشعور زندگی کی داستان کی یہ کڑی اس شکل میں سامنے آتی ہے کہ بچپن کا محمد علی اپنی غور و فکر کو چھپا یا ہوا ... اور نمایاں طور پر آشکارا کر دیتا ہے۔

گزٹ کے اسی شمارے میں اسکول ... کی ایک رپورٹ بھی شریک اشاعت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ:

"مارچ ۱۸۹۰ء میں انگریزی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ شہر میں کھولا گیا اس مدت سے اس وقت تک جو ترقی کی ہے بہر وجوہ باقاعدہ اور قابل اطمینان ہوئی ہے"

رپورٹ میں آگے چل کر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ:

"ابتدا میں یہ مدرسہ جماعت ششم تک تھا۔ پھر ۱۸۹۱ء میں درجہ مڈل بھی قائم کر دیا گیا" (مذکورہ رامپور گزٹ صفحہ ۱۴)

اسلئے ۱۸۹۰ء میں مولانا محمد علی کا اس مدرسئہ انگریزی کے درجۂ اول یا ہائر کلاس میں ہونا قرین قیاس ہے۔

مبینہ نتیجے کا مطلب یہ ہے کہ اپنی تعلیم سے فراغت کے بعد علی گڑھ چھوڑ کر مولانا محمد علی رامپور آئے تھے جب انگریزی اسٹیٹ ہائی اسکول کے پرنسپل مقرر کئے گئے تھے دراصل انہی کے دو اولین طالب علم تھے اور انہوں نے بھی اپنے اس منتظم کی تعمیر میں ایک موثر ادا کیا تھا۔

یہ مضمون مولانا محمد علی کی ذہنی اور سادگی زندگی کے دو رخ پیش کرتا ہے۔

۱۔ انگریزی تعلیم کے لئے فراخ دلی اور ذہنی وسعت۔

۲۔ گھریلو دینی تعلیم کے بعد اور ہائی اسکول میں داخلے سے پہلے ابتدائی مدرسہ کی تعلیمی شمولیت کا حال اسکول کے باقاعدہ طالب علم کی صورت میں۔

مولانا نے اپنی اس تحریر میں انگریزی تعلیم کی جس شد و مد سے حمایت کی ہے اس کو یقیناً پسند کیا جا سکتا۔ مضمون مولانا حالی اور سر سید احمد خان کے قلم سے نکلا ہوا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ انہیں کی بازگشت ہو۔ لیکن اس کو سمجھنے کے لئے بھی مولانا محمد علی کی اصل زندگی کو دیکھنا چاہئے جس کے بعد یقیناً یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ وہ بنیادی طور پر خالص مشرقی عادات و خصائل کے آدمی تھے۔ اپنے لباس میں کبھی کبھی کسی حد تک اپنی عمر کے ہر حصے میں انہوں نے مشرق و مغرب کو برقرار رکھا ہے۔ وہ ان لوگوں میں کبھی نہ تھے جو مغربی ماحول سے متاثر ہو کر مرعوب ہو جاتے ہوں اور احساس کمتری کا شکار اس انداز میں ہوتے ہوں کہ اپنی مادری زبان بولنا بھی انہیں گناہ معلوم ہو۔ انہوں نے خود سپردگی کی وہ روش بھی اختیار نہ کی جس میں قومی مزاج کی نفی اور مذہبی احترام سے لاپرواہی ثابت ہوتی ہو۔ وہ چند باتیں ضرور تھے لیکن بگڑے ہوئے نہیں سنبھلے ہوئے افراط و تفریط سے دور۔

اصل تحریر سے پہلے یہ بات اور بتا چلیں کہ انسپکٹر مدارس کی رپورٹ اور طالب علم محمد علی کے مضمون کی تاریخ ایک ہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں مدرسہ انگریزی کے سالانہ جلسے میں پڑھی گئی تھیں۔ اس لئے گزٹ میں دونوں پر ۱۶ اگست ۱۸۹۰ء اندراج تاریخ ہے۔

مولانا محمد علی کا یہ مضمون اس لئے قابل قدر ہے کہ یہ ایک ذہنی انقلاب کا نمائندہ ہے اور ایک تعلیمی انقلاب کی یادگار ہے جو آگے چل کر ہندوستان کی سرزمین خصوصاً مسلمانوں کی دنیا میں آیا۔ لیکن یہ اس لئے بھی مزید قابل قدر اور اہم ہو جاتا ہے کہ یہ اب تک کی قدیم ترین معلومہ تحریر ہے جسے رئیس الاحرار مولانا محمد علی سے نسبت کا شرف حاصل ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس ایک چراغ سے ابھی کئی اور چراغ جلائے جا سکیں اور امید ہے کہ بطل حریت کی یہ قدیم ترین تحریر اپنی افادیت اور تاریخی اہمیت کے پیش نظر ملک کے ثقافتی سرمایہ میں اضافہ کا باعث ہوگا۔

مضمون محمد علی خاں طالب علم مدرسۂ انگریزی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جب ہم غور سے دیکھتے ہیں ایک بڑا حصہ ہماری ابتدائی عمر کا افسوسناک نمونہ دکھاتا ہے۔ ہماری ابتدائی تعلیم محض ناقص اور ادھوری بلکہ خطرناک مرحلہ ہے۔ ایک مدت بغیر معنی الفاظ کے تعلیم پاکر فقط قوت حافظہ کو کام میں لاتے ہیں، فکر و غور کا کوئی موقع نہیں ملتا۔ غرض کرنے کے عادی نہیں ہوتے۔ یہی سبب ہے کہ فکر و تامل کے معرکے میں ہماری عقل غیر مفید اور فکر نارسا ثابت ہوتی ہے۔ وہی ابتدائی زمانہ عجب زمانہ ہے جس میں دل و دماغ صاف اور غیر مکدر ہوتے ہیں۔ فکر و غور کرنے کی عمدہ اور مضبوط بنیاد اسی وقت قائم ہو سکتی ہے۔ اس قوت کے پیدا ہو جانے سے شائستگی، تہذیب، علم و ہنر انواع اقسام کی دولت پر ثابت قدمی سے تصرف کر سکتے ہیں۔ اور جو باقی زندگی کہ ہم کو اس دنیا میں بسر کرنا ہے نہایت فارغ البالی سے بسر

کر سکتے ہیں - لیکن ہم ایسے اقبال مند کہاں تھے جو یہ دولت ہمارے ہاتھ آتی - ہم کو تو اوّل ہی حسن و عشق کی سوسائٹی میں شامل ہونا پڑا - قیس و فرہاد کی آشفتہ حالی کا نقشہ لیلیٰ و شیریں کے خوبی و جمال کی تصویر ہماری تعلیم کا جزو سمجھی گئی اول جب ہی مکتب میں قدم رکھا کسی کے یہ شعر بر زبان تھا:

اے داغ بر دل از غم حال تو لالہ را
شرمندہ ساخت آہوئے چشمت غزالہ را

اور کوئی یہ شعر ازبر پڑھتا:

ما مقیمان کوئے دلداریم　　رخ بدنیا و دیں نمی آریم

یہ پرانے فیشن کی (دقیانوسی) تعلیم ہے - جس تعلیم میں حکایاتِ عشق آمیز اور فسانہ ہائے جنوں خیز داخل ہوں اس سے پھر نتیجے کی امید رکھنا محض فضول خیال ہے - بلکہ سادہ اور صاف طبیعت کو بڑے خطرناک رنگ میں رنگتی ہے -

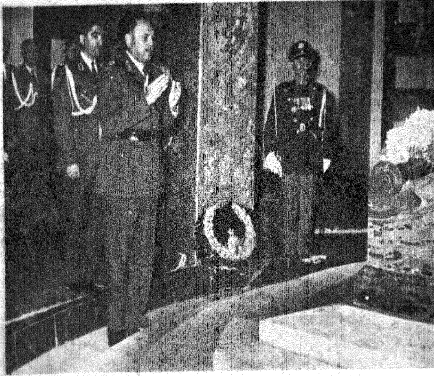
ہر تعلیم کے واسطے قدیم ہو یا جدید طبیعت کا یکسو ہونا بہت ضروری بات ہے - شاعرانہ خیال کی پابندی یا عشقیہ شعر و سخن کا مطالعہ طالب علم کے واسطے خراب اثر پہنچاتا ہے جیسے بدادت موسم کو اور ہوا طبیعت کو اور طبیعت جسم کو اور جسم جان کو - تعلیم جدید کی جو ایشیائی رنگ سے بالکل سادہ اور جس کے اصول نہایت قیمتی اور قابل قدر ہیں ہمارے واسطے نہایت ضرورت ہے جیسے نابینا کو بینائی کی - باوجود کسی قدر تعلیم قدیم پانے کے ہنوز نامبارک لقب نیم وحشی انسان کا ہم سے واپس نہیں ہوا ہے - لیکن اب زمانہ بدل چلا ہے، زمانہ پہلے سے غیر ہے - مگر بیشتر ہم کو اپنی عادت کی اصلاح کرنا فرض ہوگی - ہماری رفاہ اور صلاح کا سارا سامان مہیا ہے، ہماری حالت کبھی بدل جائے گی، ترقی کے زینے پہ قدم جمائیں گے اور انشاء اللہ ضرور ترقی مدارج کو طے کریں گے -

خدا کے فضل سے عالی جناب جنرل محمد اعظم الدین خاں صاحب بہادر وائس پریذیڈنٹ نے ان ضرورتوں کو ملاحظہ فرما کر یہ مدرسۂ علوم جدید نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ قائم کرایا - جناب ممدوح کی دلی توجہ اس مدرسے کی سرپرستی میں مصروف ہے - یہ ہونہار و تعلیم یافتہ نوجوان کا فرض ہے کہ اپنی عمدہ کوشش سے اپنی اعلیٰ لیاقت کا ثبوت جناب محتشم الیہ کے حضور میں پیش کرے - اس روز عالی جناب اپنی خاص توجہ کا آخری نتیجہ ملاحظہ فرما کر کس درجہ اظہار خوشنودی فرمائیں!

اے خدا جلد وہ مبارک دن دکھلا

محمد علی طالب علم مدرسۂ انگریزی رام پور اسٹیٹ
۱۸ اگست ۱۸۹۰ء

★

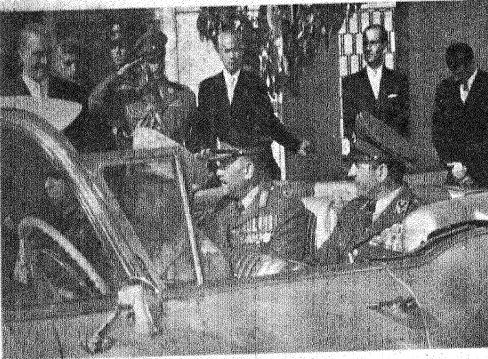


رضا شاہ پہلوی کے مزار پر



شاہی محافظ دستہ کی سلامی (ایران)

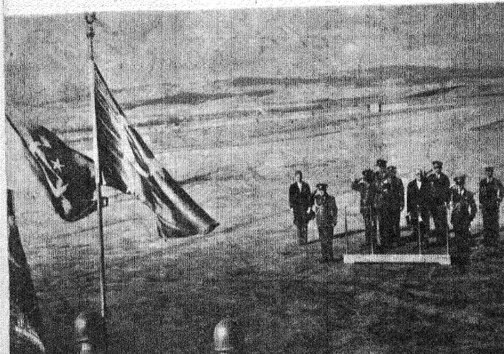
فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں :
(دورهٔ ایران و ترکی)



فیلڈ مارشل اپنے شاہی میزبان ، شہنشاہ ایران کے ساتھ



اتاترک کو خراج عقیدت
(مزار کی طرف روانگی)



ترکی پرچم کی سلامی



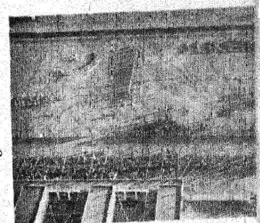


صدر آئزن ھاور پاکستان میں

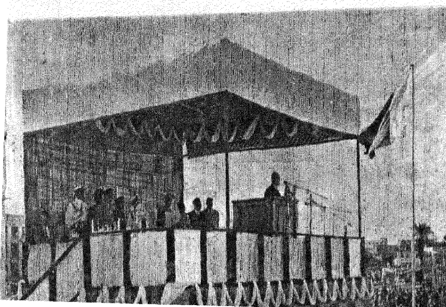
۱: صدر پاکستان کے خیر مقدم کا جواب
۲: شاھی سواری
۳: فضا سے کورنگی کی نوآبادی کا نظارہ

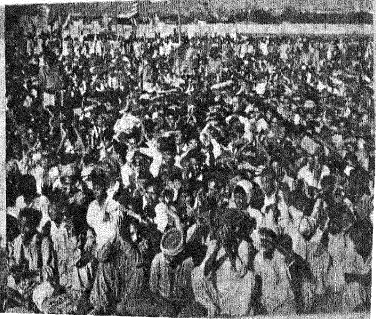






۴: محافظ دستہ صدر پاکستان (مظاھرہ نیزہ بازی)
۵- ''آئی لائیک آئیک!''
۶: ''خوش آمدید''





اک شمع رہ گئی تھی....

جمیل نقوی

بزمِ سخن کو پھر ماتم میں ہے۔ اسد ملتانی جو حالی، اکبر اور اقبال کے دور کی یادگار تھے ہم سے رخصت ہو گئے۔ ان کو محض اقبال ہی کے معتقدین میں، بزمِ سخن کے سب مسافر ہم نشین ہیں۔ مرحوم کو ماہِ نو کے ساتھ ایک ربطِ خاص تھا اور وہ ہمیشہ بصد شوق اسے اپنے رشحاتِ قلم سے مستفید فرماتے رہے۔ ہم آج اپنی محرومی کو بڑی شدت سے محسوس کر رہے ہیں جو تمام دنیائے ادب کی محرومی بھی ہے۔ ہم ذیل میں مرحوم اسد ملتانی کے متعلق ایک مختصر نگارش پیش کر رہے ہیں جس میں ان کے سوانح کے ساتھ ساتھ ان کے کلام کے خد و خال ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔

محمد اسد خان اسد ملتانی ۱۳ دسمبر ۱۹۰۲ء کو کو گلی افغانان ملتان شہر میں پیدا ہوئے ــــــ نومبر ۱۹۵۹ء بمقام راولپنڈی داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اِنّا لِلّٰہِ واِنّا الیہِ راجعون۔ ان کے والد ملک غلام قادر خان قوم افغان شیرانی سے تعلق رکھتے تھے۔ اسد ملتانی مرحوم نے مشن اسکول ملتان اور گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم پائی۔ ۱۹۲۲ء میں بی، اے کیا۔ ۱۹۲۶ء میں امتحان مقابلہ میں کامیاب ہو کر گورنمنٹ آف انڈیا سیکریٹریٹ میں ملازم ہوئے۔ فارن اینڈ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں اسسٹنٹ اور سپرنٹنڈنٹ رہے۔ پاکستان بننے کے کچھ دنوں بعد وزارت ریاستہائے سرحدات میں اسسٹنٹ سکریٹری مقرر ہوئے، اور آخر وقت تک اپنے فرائض منصبی کو بڑی دیانت اور خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔

اسد مرحوم بڑے مرنجان مرنج اور ملنسار بزرگ تھے۔ ان کی نظر اردو اور فارسی شاعری پر بہت وسیع تھی۔ اردو کے علاوہ کبھی کبھی فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے اور اکثر اچھے شعر نکال لیتے تھے۔ کراچی آنے کے بعد ہی، غالباً ۱۹۴۹ء میں، میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ ایک شاعر کی حیثیت سے خواہ ان کا مقام کچھ ہی ہو لیکن بحیثیت ایک انسان انھوں نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا۔ ان کی خاکساری کم سخنی، بزرگانہ شفقت اور ایک ایسا خلوص جو عام طور پر میسر نہیں آتا، ان سب خصوصیتوں نے مل کر ان کی شخصیت کو بڑا پرکشش اور محبوب بنا دیا تھا۔ اس پر خدا ترسی اور اسلام دوستی مستزاد تھی۔

مرحوم اسد ملتانی آج کی دنیا میں اگلے وقتوں کے بزرگوں کا ایک عمدہ نمونہ تھے۔ مغربی تعلیم نے انہیں مشرقی تصورات اور اسلامی معاشرت کا اور بھی زیادہ گرویدہ کر دیا تھا۔ انہیں اسلام اور مسلمانوں سے عشق تھا۔ قرآن اور حدیث پر انہیں کامل ایمان تھا۔ اور اس سلسلہ میں وہ کوئی بات سننے کو تیار نہ ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ ان کے ایک دیرینہ عزیز دوست نے ایک مشہور رسالہ میں جب اس مسئلہ پر ایسے خیالات کا اظہار کیا جن سے اسد مرحوم کو اختلاف تھا تو مرحوم نے اپنے مکان پر ہفتہ وار جلسوں کا انتظام کیا اور ایک مشہور عالم دین کو اس "فتنہ" کو دبانے کے لئے مواعظ کی دعوت دی۔ پند و موعظت کا یہ سلسلہ اُن کے راولپنڈی جانے تک جاری رہا۔

خود اسد ملتانی صاحب کے بیان کے مطابق انہوں نے تو دس برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا لیکن کالج میں پہنچنے کے بعد باقاعدگی سے شاعری کرنے لگے تھے۔ ۱۹۲۱ء میں کالج میں نظم گوئی کا ایک مقابلہ ہوا تھا جس میں ان کی نظم کو اول قرار دیا گیا تھا اور انعام بھی ملا تھا۔ مقابلہ میں داخل کرنے سے پہلے انہوں نے اپنی نظم علامہ اقبالؒ کی خدمت میں پیش کی تھی جس پر انہوں نے از راہِ کرم اصلاح فرما دی اور نظم کہیں سے کہیں پہنچ گئی، اور انعام کی مستحق قرار پائی۔ زمانہ طالب علمی میں سخن وری اور سخن فہمی کالج کی چہار دیواری تک ہی محدود رہی لیکن یہی وہ زمانہ تھا جبکہ اسد ملتانی نے مشقِ سخن بہم پہنچائی اور فنِ شعر پر عبور حاصل کیا۔ تعلیمی مشاغل سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے باقاعدہ شعر کہنا شروع

کر دیا۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی اکثر نظمیں لکھیں جنہیں افغانستان کے رسائل میں بھی اکثر نقل کیا گیا۔ روزنامہ "زمیندار" اور "انقلاب" میں بھی نظمیں شائع ہونے لگیں۔ نیرنگ خیال، ہمایوں اور بعض دوسرے ادبی رسائل میں بھی بالالتزام لکھنا شروع کیا۔ لیکن ۱۹۲۸ء سے زیادہ تر نظمیں رسالہ معارف اعظم گڑھ میں ہی چھپتی رہیں۔ یا پھر تقریباً ۱۹۳۸ء سے رسالہ "طلوع اسلام" میں باقاعدگی سے لکھنا شروع کیا اور یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ "ماہ نو" میں بھی وقتاً فوقتاً ان کا کلام شائع ہوتا رہا۔ لیکن بجز "مرثیۂ اقبال" اور "ماتم حرم" کے جنہیں مرحوم نے کتابی شکل میں شائع کیا تھا، ان کا مجموعۂ کلام ابھی تک اشاعت پذیر نہ ہو سکا۔ [illegible] وہ مدت سے اپنے کلام کو مجموعہ کی شکل میں مرتب کر رہے تھے۔ "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

یوں تو اسد ملتانی نے صنف غزل کو بھی بہت کچھ نوازا ہے لیکن ان کا اصل میدان نظم ہے۔ فی الحقیقت وہ بنیادی طور پر نظم ہی کے شاعر تھے اور ان کا بیشتر ادبی سرمایہ نظم ہی کی صورت میں ہم تک پہنچا ہے۔ لیکن ان کی نظمیں جدید شعرا کی نظموں سے باعتبار مزاج و باعتبار انداز بیان یکسر مختلف ہیں۔ ان کی نظموں کو مذہبی، سیاسی، وطنی، اور اصلاحی وغیرہ عنوانات کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

اسد ملتانی کی نظموں میں اکبر کا طنز، حالی کے پند و نصائح قومی درد اور اقبال کا تفکر اور حب الوطنی کا ایک نہایت عمدہ امتزاج ملتا ہے۔ موجودہ دور میں وہ واحد شاعر تھے جس نے حالی اور اقبال کی روش شاعری کو نہ صرف کامیابی کے ساتھ برتا بلکہ اس کو آگے بڑھایا اور اس کی مصلحانہ شان برقرار رکھی۔ قومی شاعری جدید انداز میں بھی کی جاتی ہے لیکن وہ دل سے زیادہ دماغ کی شاعری ہے۔ حالی اور اقبال کی شاعری میں جو بات ہے وہ جدید قومی شاعری میں نہیں ملتی۔ حالی اور اقبال براہ راست قلب و روح کو متاثر کرتے ہیں۔ اسد ملتانی بھی اسی ڈگر پر چلے ہیں۔ اور انہوں نے بھی اپنی شاعری کی بنیاد خلوص اور حب الوطنی پر رکھی ہے۔ انہوں نے بھی باتیں بڑی سادگی اور سلاست کے ساتھ بڑے معصومانہ انداز میں پیش کی ہیں۔ خواہ غزل ہو یا نظم ان کے یہاں دونوں کا مزاج یکساں ہے۔ وہی اصلاح کی کوشش، اسلام اور مسلمانوں کی بہبودی و بہتری کے مضامین، مذہبی اور سیاسی مسائل کا بیان۔ قومی اور ملی عظمت کے ترانے اخلاقی اور اجتماعی قدروں کا پرچار۔ حسن عمل کی تلقین، بنی نوع انسان کا درد، یہ تمام موضوعات یوں دیکھنے میں تو بہت آسان نظر آتے ہیں مگر انہیں شعر کے قالب میں اس طرح ڈھالنا کہ شاعرانہ وقار بھی قائم رہے اور عام فہم انداز میں بات نہ صرف پورے طور پر ادا ہو جائے بلکہ قاری اور سامع کے دل و دماغ پر وہ تاثر بھی پیدا کر سکے جو اس کا اصل مقصود ہے۔ یہ بڑا مشکل کام ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر شاعری صنعت گری ہو جاتی ہے۔ اور اگر شاعر کا خلوص کارفرما نہ ہو اور اس کے اپنے دل و دماغ پر موضوع کلام کا بھرپور اثر موجود نہ ہو اور اس کی تمام جزئیات پر اسے عبور حاصل نہ ہو تو ایک مصرعہ ترتیب دینا بھی مشکل ہوگا۔ اکبر، حالی اور اقبال کی طرح اسد ملتانی نے بھی یہ مقصد بڑے اہتمام سے طے کیا ہے اور اکثر و بیشتر وہ خاطر خواہ طور پر کامیاب ہوئے ہیں۔

یوں تو اسد ملتانی نے غزلیں بھی کافی تعداد میں کہی ہیں اور عام روش سے ہٹ کر اچھے اچھے شعر نکالے ہیں لیکن ان کا اصل میدان نظم ہے جہاں ان کے فطری جوہر پوری آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہوئے ہیں خصوصاً مسائل حاضرہ پر ان کی بعض نظمیں بڑی کامیاب ہیں۔ مثلاً جب شہید ملت مرحوم کی قیادت میں قرارداد مقاصد منظور کی گئی تو اسد ملتانی نے اس بنیادی اقدام کا بڑے لطیف انداز میں خیر مقدم کیا ہے۔

اب پھر کسی کے حسن کا چرچا ہوا تو ہے
اس دور میں بھی عشق کا دعویٰ ہوا تو ہے

تو مضطرب کہ جلوہ ابھی عام کیوں نہیں
میں اس پہ مطمئن کہ تقاضا ہوا تو ہے

پھر ہو چلی ہے جرأت پرواز کی امید
روئے نگاہ سوئے ثریا ہوا تو ہے

آثار سربلندی اسلام ہیں عیاں
دنیا و دیں کا سلسلہ یکجا ہوا تو ہے

انجام کے لئے بھی خدا کارساز ہے
آغاز کار حسب تمنا ہوا تو ہے

افرنگ سے حجاز کی جانب پھرا ہے رخ
قبلہ بنائے قوم کا سیدھا ہوا تو ہے

ایک اور موقع پر انہوں نے کیسی اچھی بات کہی تھی ؎

ملت کی عمارت ابھی تیار نہیں

سامان تو موجود ہے معمار نہیں

ترشی ہوئی اینٹوں کے کچھ انبار تو ہیں

اک سیسہ پلائی ہوئی دیوار نہیں

اسد ملتانی کی ملی نظموں میں مجھے ان کی نظم "آئینِ نو" سب سے زیادہ پسند ہے۔ جو ۱۹۵۶ء میں انہوں نے نیا دستور جاری ہونے پر لکھی تھی اس کا ایک ایک لفظ کیف و اثر میں ڈوبا ہوا ہے ؎

سبز ہوئی شاخ شاخ پھول بنی ہر کلی

باغ ہوا باغ باغ، بادِ بہاری چلی

تاکہ عروسِ بہار اس پہ ہو گرم خرام

سبزۂ نو رستہ کا فرش بچھا مخملی

صحنِ گلستاں میں پھر ذکرِ محبت چلا

دل کے شبستاں میں پھر شمع مسرت جلی

تھی افقِ شرق پر چھائی جو کالی گھٹا

اس کی سیاہی ذرا رنگِ شفق میں ڈھلی

دورِ تذبذب گیا ختم ہوا اضطراب

دل کو سکوں مل گیا، دور ہوئی بیکلی

آج ہوئی رونما حریت کامله

سایۂ اغیار کی مہر سے مصیبت ٹلی

اقبال کو تو اپنا امام تصور کرتے تھے انہوں نے اپنی شاعری کا نصب العین ہی اس بات کو قرار دے رکھا تھا کہ اقبال کے "بصیرت" اور "سوزِ عشق" کو عام کریں۔ ان کی کامیاب ترین نظمیں وہی ہیں جہاں انہوں نے روحِ اقبال سے فیض حاصل کیا ہے۔

قائد اعظم کے متعلق یہ اشعار تمام تر حقیقت ہی کے آئینہ دار ہیں:

قائد اعظم نے ملت پر یہ احسان کر دیا

عقل و تدبیر و سیاست کو مسلماں کر دیا

ہے کمی کوئی تو کوتاہی ہماری ہے اسد

اس نے تو آزادیٔ کامل کا ساماں کر دیا

شاعرِ مشرق نے پاکستان کا دیکھا تھا خواب

قائد اعظم نے ساماں کر دیا تعبیر کا

اگرچہ اسد ملتانی نے اپنی نظمیں ایک اضطراری کیفیت اور وقتی تاثر کے ماتحت لکھی ہیں، اس کے باوجود ان کی ایک مستقل حیثیت بھی ہے۔ وہ آج بھی اتنی ہی نئی ہیں جیسی وہ تخلیق کے وقت تھیں۔ مجھے یقین ہے ہماری ملی شاعری میں انہیں ایک باوقعت مقام حاصل رہے گا۔ پھر وہ نظمیں جو مذہبی مسائل پر مبنی ہیں۔ ان کی دائمی افادیت سے کسی وقت بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

"سفینۂ عرب" کے عنوان سے حاجیوں کی پاکستان سے روانگی کا سماں کتنے دلکش انداز میں پیش کرتے ہیں ؎

وہ دن بھی آخر آگیا　　کہ جس کا انتظار تھا

ادھر حرم کا قافلہ　　اُدھر عزیز و اقربا

دلوں میں خیر کی دعا　　سلامِ شوق برملا

یہی تھا سلسلہ کہ جب

چلا "سفینۂ عرب"

وہ دوستوں کی انجمن　　وہ ہم نشیں وہ ہم سخن

وہ دلبرانِ سحر فن　　وہ گھر وہ کشت وہ چمن

عزیز خطۂ وطن　　لگی دلوں میں کیا لگن

کہ چھوڑ کر یہ سب کے سب

چلا "سفینۂ عرب"

ایسے ہی اردو کو قومی زبان بنانے کی کس خوبصورتی کے ساتھ وکالت کرتے ہیں ؎

ہر چند اردو میں محاسن ہیں جبلی

اغیار سے جو داد اُسے ملنی تھی مل لی

کیا رنج کی بات اس سے اگر چھٹ گئی دلی

ہے اب بھی ہمارے لئے سرمایۂ ملی

ارباب وطن ہمدم و ہمراز ہیں اس کے

یک دل ہیں اگر دیس نئے ہم آواز ہیں اس کے

اور آگے چل کر نظم کو اس طرح ختم کرتے ہیں ؎

واپس وطن آئی ہے مسافر نہیں اردو

اس ملک کی مالک ہے مہاجر نہیں اردو

حالانکہ اسد ملتانی بنیادی طور پر میدانِ نظم کے ہی یکہ تاز ہیں لیکن غزل بھی ان کی شاعرانہ صلاحیتوں سے کافی فیضیاب ہوئی

(باقی صفحہ ۶۳ پر)

اِک فرد، اِک دَور

(مولانا عبدالمجید سالک مرحوم کی یاد میں)

جگن ناتھ آزاد

پھر آئی ہے اردو کے گلستاں میں خزاں آج
پھر ہے لبِ افکار و حوادث پہ فغاں آج
پھر سینۂ الفاظ سے اٹھا ہے دھواں آج
پھر دیدۂ معنی سے ہوا خون رواں آج

پھر نالہ و زاری ہے صحافت کی زباں پر
ماتم کا ہے اک شور ظرافت کی زباں پر

اے بزمِ وفا! کون تجھے چھوڑ چلا ہے
ہر لب پہ جو فریاد ہے نالہ ہے بکا ہے
دُنیائے سخن کون الگ تجھ سے ہوا ہے
اے شعر و ادب! تم پہ یہ کیا وقت پڑا ہے

ماتم ہے یہ آزادؔ! نئے طَور کا ماتم
اک فرد کا ماتم ہے کہ اک دور کا ماتم

محفل کو گیا چھوڑ کے محفل کا وہ محبوب
ہر بات رہی جس کی پسندیدہ و مرغوب
جس کی نگہِ فیض سے ناخوب ہوئے خوب
کہتے تھے جسے اہلِ نظر کعبۂ مطلوب

اب کعبۂ مطلوب وہ پائیں تو کہاں ہم
اے وحشتِ دل بول کہ جائیں تو کہاں ہم

جس بزم میں تازہ تھا بخاری کا ابھی غم
اخترؔ کا الم، حسرتؔ و تاثیرؔ کا ماتم
کیفیؔ کی جہاں یاد ہوئی تھی نہ ابھی کم
جس بزم میں اک دردِ مسلسل کا تھا عالم

اس بزم سے سالکؔ بھی ہوئے آج روانہ
یا بزم سے ہے بزم کا سرتاج روانہ

وہ پیار کا شفقت کا عنایت کا خزینہ
اخلاص و محبت کا مودّت کا خزینہ
وہ مہر و وفا کا وہ مروّت کا خزینہ
مٹتی ہوئی دیرینہ شرافت کا خزینہ

آخر کو لُٹا گردشِ ایّام کے ہاتھوں
یا صبح کی تنویر مٹی شام کے ہاتھوں

کتنوں کو شرابِ سخن و شعر پلا کر
کتنوں کو حسیں نثر کے جادے پہ لگا کر
کتنوں کو نشانِ منزلِ مقصد کا بتا کر
کتنوں کو غمِ عشق کے آداب سکھا کر

ہر راہ میں نقشِ کفِ پا چھوڑ گیا ہے
قندیلِ محبّت کی ضیا چھوڑ گیا ہے

اے وقت! خبر ہے کہ وہ کیا دے کے گیا ہے
کیا شے وُہ تجھے مردِ خدا دے کے گیا ہے
اک دل وہ تجھے درد بھرا دے کے گیا ہے
اک روشنیٔ مہر و وفا دے کے گیا ہے

جو دردِ ازل اُس کی زباں پر تھا ترانہ
وہ درد ہے اب تیرا گراں مایہ خزانہ

سالکؔ کے حسیں طرزِ بیاں، طرزِ ادا سے
اک سوز میں ڈوبی ہوئی پُرکیف نوا سے
جو دے کے گیا ہے تجھے اس درسِ وفا سے
اے نسلِ نوی اس کے تفکّر کی ضیا سے

ممکن ہو تو کسبِ ادب و کسبِ ہنر کر
تاریکیٔ شب ہائے غمِ دل کی سحر کر

اے خاکِ وطن! منزلِ مقصودِ محبت
قرباں ترے ذرّوں پہ مرے اشکِ ارادت
مانا کہ ہے ناچیز بہت میری عقیدت
پہلے بھی کچھ آساں نہ تھی تیری زیارت

اس راہ میں اب ایک رکاوٹ سی پڑی اور
اک ٹوٹ گئی رشتۂ اُلفت کی کڑی اور

★

ڈرامہ:

وہ لوگ

ہاجرہ مسرور

کردار:

بابا خیرو: لمبی سفید داڑھی، سیاہ رنگت، سامنے کے دو دانت ٹوٹے ہوئے — سیاہ تہمد اور کھدر کی آستینوں والی صدری جسم پر ننگے پاؤں — گلے میں کپڑے سے منڈھا ہوا تعویذ۔

اماں: خیرو کی بیوی۔ ادھیڑ عمر کی دُبلی پتلی عورت۔ ماتھے پر سیاہ کپڑے کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔ میلے، ڈھیلے ڈھالے چوڑی دار پاجامے اور لمبے کرتے میں ملبوس۔ سر پر ڈوپٹہ جس میں سے کندھوں پر پڑے ہوئے کھچڑی بال جھانکتے ہیں۔ گلے میں موٹے منکوں کی تسبیح۔

زینب: ان کی بڑی بیوہ بیٹی۔ عمر تیس سال۔ کالے ڈوپٹے لمبے کرتے اور چھوٹے پائنچوں کی سیاہ شلوار پہنے ہوئے ہے۔

جنت: چھوٹی بیٹی، عمر بیس سال۔ جسم پر سستے ریشم کی قدرے میلی شلوار اور قمیص۔ کانوں میں چاندی کی بالیاں اور ہاتھوں میں چاندی کی چوڑیاں۔

رجو: زینب کی بارہ تیرہ سال کی لڑکی۔ اٹنگی شلوار اور اونچی سی قمیص پہنے، سر پر گز بھر کا میلا سا کپڑا، ننگے پاؤں، بکھرے ہوئے بال، ہر بات ہنس کر لاپروائی سے کرتی ہے۔

ممدو: زینب کا لڑکا۔ عمر دس سال۔ تہمد اور بنیان میں ملبوس۔ پاؤں میں کینوس کا پرانا جوتا۔ جلدی جلدی بے حد جوش سے بولتا ہے۔

کلو: بابا خیرو کا بیٹا۔ عمر سترہ اٹھارہ سال۔ نئی نئی پھوٹتی ہوئی داڑھی مونچھیں جسم پر پاجامہ اور کرتہ، سر پر کپڑے کی گول ٹوپی — پاؤں میں جوتا۔

ننھا: جنت کا ڈیڑھ سالہ بچہ

مقام: ایک بڑا قصبہ

زمانہ: جو چاہے سمجھ لیجئے۔

منظر:

(پردہ اٹھتا ہے تو ایک جھونپڑا نظر آتا ہے۔ جس کا صرف سامنے کی طرف ایک دروازہ ہے۔ جھونپڑی کے اگلے حصے پر پھونس کا چھپر ہے اس چھپر تلے ایک طرف ہٹ کر مٹی کا چولھا بنا ہوا ہے جس میں بے تحاشہ راکھ بھری ہوئی ہے اس کے قریب ہی ذرا سی ٹوٹی ہوئی چند سوکھی ٹہنیاں، دو چار اُپلے اور سوکھے پتے ڈھیر ہیں۔ ساتھ ہی چند المونیم کے برتن اور مٹی کا گھڑا پڑا ہوا ہے۔ دائیں بائیں مٹی کی نیچی چار دیواری پر اُپلے سوکھ رہے ہیں۔ صحن میں ایک طرف مٹی کے بدھنے اور ڈبے ڈھیر ہیں۔ یہ ہلکی سردیوں کی ایک شام ہے، سورج ابھی غروب نہیں ہوا اس لئے زرد ہوتی ہوئی دھوپ سے چھپر کا کچھ حصہ اور بائیں ہاتھ کی دیوار روشن ہے۔ اس دیوار سے ٹیک لگائے اماں حقہ سامنے رکھے بیٹھی اونگھ رہی ہے۔ چھپر تلے کھاٹ پر جنت کنگھی کر رہی ہے کنگھی سے زیادہ وہ اپنے چہرے کی طرف متوجہ ہے۔ بار بار وہ چھوٹے سے شیشے میں جھک کر اپنا چہرہ دیکھتی ہے، کبھی ناک کی کیل گھماتی ہے۔ اور کبھی گریبان کے چاندی کے بٹنوں کو چھوتی ہے۔ اس دوران میں اکثر وہ نظر اٹھا کر باہر کی طرف دیکھتی ہے جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہو۔ زینب چولھے کے پاس اکڑوں بیٹھی گندھے ہوئے آٹے کو مکیاں لگا رہی ہے اور بار بار غصے اور حقارت سے جنت کی طرف دیکھتی جاتی ہے — چند لمحے بڑھیا اونگھنے سے چونک کر حقے کی نے ہونٹوں میں دباتی ہے اور پھر کھانسنا شروع کر دیتی ہے۔)

اماں: (کھانسی سے نجات پا کر لمبا سانس لیتے ہوئے) اری جینب (زینب) چلم میں آگ ڈال دے جرا سی۔

زینب: اِتی دیر ہوئی جنت سے کہا تھا تو نے کہ چولھا سلگا دے۔ اب سی

سے آگ مانگو۔ گھنٹے بھر سے بیٹھی مانگ پٹی کر رہی ہے۔

جنت: (ہاتھ پھیلا کر لڑنے کے انداز سے) ابھی یہ چولہا سلگا دوں، جیسے بڑے پلاؤ قورمے پکنے ہیں۔

زینب: (منہ بنا کر) ہنہ تیری سسرال میں تو روج (روز) پلاؤ پکتا ہے نا!

جنت: لے، پھر میری سسرال کا نام لیا!۔۔ دیکھ لے اماں! میں کوئی کہتی ہوں میرے گھر روج (روز) پلاؤ پکتا ہے! ہاں جب کوئی مہمان آئے تب تو جرور (ضرور) پلاؤ پکتا ہوا۔
(کنگھا رکھ کر آئینے میں منہ دیکھتی ہے اور چوٹی گوندھنے لگتی ہے)

اماں: اور کل دال نہیں پکوائی تھی اس کھیال سے کہ تیرا میاں آتا ہوگا۔

زینب: اور گھی سے بگھار بھی تو لگایا تھا ۔۔۔ کیسی منت کی تھی بابا نے فضلو پرچونئے کی تب اُدھار دال اور گھی اس نے دیا تھا (جلدی جلدی آٹے پر مکیاں لگاتی ہے)

جنت: (گندھی چوٹی پشت پر پھینک کر) ہاں تیرے تو دل پہ لکھ گیا۔ اگر وہ آکر گھی سے بگھاری دال کھا لیتا تو جانے کتنے جکر (ذکر) کرتی دنیا بھر میں۔

زینب: (ہونٹوں پر حیرت سے انگلی رکھ کر) ہائے ری جنت تو تو یوں ہی بگھڑ جاتی ہے۔ میں نے تو یوں ہی کہا تیری بات پر ۔۔۔ (سر جھٹک کر دوبارہ آٹے کی طرف متوجہ ہو کر) تیرا میاں بچارہ کون روج روج آتا ہے۔ میں نے تو آپ اماں سے کہا تھا کہ دال جرور پکے، جنت کا میاں ایک دن کو آئے اور روکھی روٹی کھا کر جائے کیسی سرم (شرم) کی بات ہے۔

جنت: (منہ پھلا کر مگر نسبتاً کم غصے میں) کل اس کو روکھی روٹی دینا سرم (شرم) کی بات تھی اور آج؟ آج تو وہ جرور (ضرور) پہنچے گا ۔۔۔ پھر؟

اماں: (تھوڑا سا کھانس کر) تیرے منے مہرو کو پرچونئے کی دکان پر نہیں بھیجا تھا؟ اب وہ اُدھار نہ دے تو تیری مَیّا کیا کرے۔ (کمر پکڑ کر اٹھتے ہوئے ٹھنڈی سانس بھر کر جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہو کر) تیرا بابا کیا کرے؟ اپنے حصے کے رزق پر تو سدا جینے والے بابا خضر کا سایہ پڑ گیا جیسے ۔۔۔ کتنے دن ہو گئے آج؟ کوئی نہ آیا۔ (کچھ سوچ کر تیز آواز میں) لا، جنیب (زینب) وہ ڈیگچی اٹھا دے، اسے رکھ کر تو پرچونیا دال دے دے گا۔

جنت: (کھاٹ سے اٹھ کر ایک دم ہنستے ہوئے) لے بھلا اماں کی باتیں! دیکھ جنیب (زینب) (ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر) دیگچی پرچونئے کے پاس رکھ دے گی تو دال کاہے میں پکائی گی؟

زینب: (سنجیدگی سے) اور کیا ۔۔۔

(جنت ہنستے ہنستے چپ ہو جاتی ہے۔ وہ پھر آئینہ اٹھا کر کوٹھری کے دروازے میں غائب ہو جاتی ہے۔ اس دوران میں بڑھیا اماں چولھے کے پاس بیٹھ کر ٹھنڈا چولھا کریدتی ہے۔ آگ نہ پا کر دیوار میں بنے ہوئے چھوٹے سے طاق پر سے ماچس کی ڈبیا اٹھاتی ہے۔ اسے ہلا کر دیکھتی ہے اور پھر ماچس خالی پا کر اس کے ڈھکنے سے ایک تنکا توڑ کر دوبارہ آہستہ آہستہ چلتی دیوار کے پاس دھوپ میں بیٹھ کر تنکے سے خلال کرنے لگتی ہے۔ جنت کوٹھری سے نکل کر دوبارہ کھاٹ پر بیٹھ جاتی ہے۔)

زینب: (جنت کی طرف ہمدردی سے دیکھتے ہوئے) سورج ڈوبے رجو کو بھیجوں گی۔ شاید کوئی دیا جلا جائے۔ تیرا میاں آ گیا تو اس کی روٹی پر تیل چپڑ دیں گے۔

(جنت کوئی جواب نہیں دیتی، صرف اپنی ٹانگیں ہلاتی رہتی ہے اور بار بار دروازے کی طرف دیکھتی ہے۔ بڑھیا آنکھیں بند کئے خلال کئے جاتی ہے، اور زینب سر جھکا کر زور زور سے آٹے پر مکیاں لگانے لگتی ہے)

(چند لمحے کے وقفے کے بعد)

(مہرو اندر بھاگتا ہوا آتا ہے، اس کے چہرے پر ہنسی ہے اور آنکھیں خوشی سے چمک رہی ہیں۔ وہ بے حد بے تابی سے اِدھر اُدھر جیسے کچھ نظروں ہی نظروں میں تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے)

زینب: مہرو دال لایا؟

مہرو: وہ ۔۔۔ وہ ۔۔۔ آ گیا

جنت: (کھاٹ سے اٹھ کر) آگیا؟ اندر لے آ رے مہرو۔ (سر پر دوپٹہ ٹھیک کرتی ہے)

مہرو: (ٹھٹھک کر پھر ہنستے ہوئے) خالو تو پھر آئے گا ۔۔۔ بابا؟ ۔۔۔ بابا نہیں ہے؟ (بھاگ کر کوٹھری میں دیکھ کر لوٹتا ہے) بابا کدھر ہے؟

اماں : کیا ہے رے کیوں ہر وقت بابا، بابا کرتا ہے — جب سے دوبار
بابا کو آ کر آوا جیس نا رگیا — بابا کو تو سیل سپاٹا چاہئے ۔ ذرا
کوئی بات ہوئی اور بگڑ کر گھر سے نکل گیا ۔

مہرو : (خوب زور سے ہنس کر) ارے بابا کا کام آیا ہے نانی —
(تینوں عورتیں کھل اٹھتی ہیں)

اماں : (آسمان کی طرف منہ اٹھا کر) اللہ ! (ایک ہاتھ اٹھا کر مسکراتی ہے)

مہرو : (ادھر ادھر بے تابی سے گھوم کر) ماموں کو نئے گئے موٹر میں بیٹھ کر
میں مسجد کے پاس کھڑا تھا ۔

اماں : (حیرت اور خوشی سے ہاتھ بڑھا کر) موٹر میں بیٹھ کر گیا ہے
تیرا ماموں ؟
(جنت اور زینب بھی خوشی سے کھڑی ہو جاتی ہیں)

جنت : ہائے — سچ ؟

مہرو : ماموں نے چلتے و کھت (وقت) کہا جلدی سے بابا سے کہدے
کھودنا شروع کر دے — اور کھودے بڑی ۔

زینب : (آٹے میں سنے ہوئے ہاتھ بڑھا کر جلدی جلدی) ہائے میرے
لال تو نہیں جانتا بابا سویرے کا روٹھ کر گھر سے نکلا ہے تیرے
سامنے ہے — ادھر کیا ڈھونڈنے آیا ہے ۔ جا رکھو کے اڈے
پر دیکھ میرے چاند ۔ بابا وہاں ہو تو اسے چپکے سے بلا نا الگ اور
دیکھ رکھو کے سامنے کچھ نہ کہیو — نہیں تو —

جنت : (بے حد بے تابی سے) ہاں وہاں نہ ہو تو پرے چونے کی دکان پر بھی
دیکھنا ۔ حُکّے (حقے) کی لالچ میں وہاں جرور ایک آدھ بار جائے گا ۔
ہائے جلدی کر مہرو ۔ کہیں تو جرور ہو گا بابا — (مہرو باہر کی طرف
بھاگتا ہے ۔ جنت چلّا کر) اور دیکھ مہرو یوں ہنستا ہوا نہ جا ۔
شاہ دین نہ تاڑ لے پرسوں کی طرح ۔

مہرو : (ہاتھ اٹھا کر بھاگتے ہوئے) اچھا — اچھا ۔
(جنت لوٹ کر اماں کی طرف آتی ہے جو ابھی تک آسمان کی
طرف منہ اٹھائے مسکرا رہی ہے)

جنت : (ری اماں اللہ سے باتیں پھر کر لیجیو — ذرا تو بھی باہر ایک
نظر مار لے دیکھ بابا یہیں کہیں پھر رہا ہو شاید ۔
(اماں غصے سے سر جھٹک کر تیز تیز چلتی کوٹھری کی طرف جاتی ہے)

زینب : اے اماں ادھر کہاں — (حیرت سے اس کا راستہ
روکتی ہے)

اماں : (زینب کا ہاتھ جھٹک کر) چل ہٹ سامنے سے ۔ (اندر جا کر
دوسرے لمحے پھاوڑا کدال کندھے پر اٹھائے بے حد شان
سے صحن میں آ جاتی ہے ۔)

زینب : (تقریباً چیخ کر) اماں ! (پھاوڑا ہاتھ سے لینے کی کوشش
کرتی ہے)

اماں : (آنکھیں نکال کر اور لفظ جما جما کر) کیا میں تیرے بابا کے انتظار
میں بیٹھی رہوں گی ۔ اس دن بھی تو تیرا بابا گھر سے روٹھا تھا اور
شاہ دین نے اپنی جیب گرم کی تھی — تو چاہتی ہے آج
بھی شاہ دین — ہنھ
(بڑے غرور سے سر اٹھا کر باہر چلی جاتی ہے
جنت اور زینب ایک دوسرے کو حیرانی سے دیکھتی
ہیں ۔ اور پھر جنت آنکھیں جھپکا کر ہنس پڑتی ہے)

جنت : (کچھ سنجیدہ ہو کر) اماں کھودے گی جیبنب ؟

زینب : (سنجیدگی سے) اماں گھُسے (غصے) میں ہو تو کیا نہ کرلے ۔ !
(ذرا رک کر) شاہ دین کی عورت نے دیکھ لیا تو کیا کیا باتیں بنائے گی

جنت : ہنھ ! باتیں بنائے گی تو بنانے ۔ ہمیں کچھ دے تو نہ دے گی ؟

زینب : (بے دھیانی سے دور دیکھتے ہوئے) کوئی کسی کو کچھ نہیں دیتا
بس اللہ میاں دینے والا ہے ۔ لوگ تو دوسروں کے منہ کا نوالہ
چھیننے کو پھرتے ہیں ۔

جنت : (ان سنی کر کے دروازے کی طرف جا کر) بابا تو نظر نہیں آتا
اماں کیسے کرے گی اتنی جلدی ۔ کیوں جیبنب (زینب) کل بابا
نے اُدھر ٹیلے پر تھوڑی کھدائی تو کی تھی — اماں بھی وہیں
سے مٹی نکالے گی نا ؟

زینب : ہاں — کل بابا نے کام پورا کر لیا ہوتا تو کوئی فکر نہ تھی ۔ پر
اسے کیا پتہ تھا کہ آج جرور ہی اللہ رزق بھیجے گا ۔ (فکرمندی ہو کر
دروازے کے پاس جنت کے قریب آ کر) رجو بھی گھنٹے بھر سے
تیرے ننھے کو لے کر باہر گئی تو اب تک نہ لوٹی — وہ ہوتی تو
اس کو اس کے پاس بھیجتی ۔ بے چاری نے کب سے تمباکو
نہیں پی ۔

جنت : (بے حد بے چینی سے) موٹر والوں کے سینا کام جلدی کے

ہوتے ہیں۔ اماں بیٹھ کر حُکّہ (حقہ) پیئے گی تو کام کیسے بنے گا۔ دیکھ بیجو بس جرا (ذرا) میں آ پہنچیں گے لے کر — میں نے تو سنا یہ لوگ روتے بھی نہیں جی بھر کے۔ بس جلدی جلدی اٹھا دیتے ہیں —

(جنت اس اضطراری کیفیت میں ہاتھ ملتی دروازے کے پاس سے ہٹ کر اس جگہ دیوار کی ٹیک لگا کر بیٹھ جاتی ہے جہاں پہلے اماں بیٹھی ہوئی تھی۔ دھوپ اب دیوار کے اوپری حصے پر پہنچ چکی ہے — زینب بھی دھیمے دھیمے قدم اٹھاتی دوبارہ چولھے کے پاس بیٹھ کر آٹے میں مکیاں مارنے لگتی ہے)

جنت: (منمنا کر جیسے خود سے) بابا کو اتنا کھیال (خیال) نہیں کہ میں سسرال جانے کو بیٹھی ہوں، کیا کھالی ہاتھ جاؤں گی — آج ہی کے دن اسے بھی روٹھنا تھا — کسی کو میرا کھیال نہیں — سال بعد مائیکے آئی، میری ساس نہیں پوچھے گی لا دکھا کیا لائی بابا بھیا کے گھر سے؟ لے بھلا دیکھو تو —

زینب: اری جنت کسی کو کسی کا خیال نہیں۔ میری بے باپ کی لونڈیا بارہ برس کی ہو جائے گی اب کے رجب کے چاند۔ اس کے بیاہ کے لئے تو ذرا بھر چاندی بھی کسی نے کھرید (خرید) کر نہ رکھی۔ (لمبی سانس لے کر مدھم آواز میں) بابا کے پاس تو اب محنت کرنے کو ہاتھ پاؤں میں طاکت (طاقت) نہیں ایک جمانہ (زمانہ) تھا اس جگہ ایک ایک دن میں دو دو تین تین کو دھرنے کا ٹھیکا کر لیتا تھا — کڑاکے کی سردی ہوتی یا تڑاکے کی گرمی ایسے دن بابا پر رزق برستا۔

جنت: بھیا کلو کو جو بابا نے پڑھوا پڑھوا کر حافظ بنوایا تو کس کام کا — نمارج (نماز) وہ پڑھا لے۔ گسل (غسل) وہ ڈال لے۔ مہجد (مسجد) کے امام صاحب بھی بڑے دل کے نہیں آج بھی دیکھ آپ نہ گئے بھیا کو موڑ میں بھیج دیا۔ میرے ہوتے دو تین گسل تو اس نے ڈالے۔ پھر اس کی کمائی کدھر جاتی ہے؟

زینب: (جل کر آٹے پر دو ایک تھپڑے لگا کر کونڈی ایک طرف ہٹا کر) تو رہنے دے حساب کتاب۔ میری لونڈیا تو سورج چھپے دے ڈھونڈتی پھرتی ہے اور جرا بہت تیل اکھٹا کرتی ہے۔ وہی تیل بیچ کر تو میں نے ایک شنون کی اوڑھنی کھر یدی۔ وہی تجھے دیکھی اور اب بیٹھ کر بھائی کی کمائی کا حساب لینے لگی مجھ سے۔ (جھٹکے سے اٹھ کر دیوار پر ٹنگی ٹوکری اتارتی ہے اور آٹے پر الٹی ڈھک دیتی ہے) اب تو اللہ مارے لوگ دیئے بھی کم ہی جلاتے ہیں۔ بس موم بتیاں۔ اُن جلی موم بتیوں کا کیا بنے؟

جنت: (نرمی سے) اری تو میں نے کب کہا کہ شنون کی اوڑھنی بھیا نے لے کر دی ہوگی — تیل چن چن کر میں نے بھی چاندی کی انگوٹھیاں نہیں بنائی تھیں۔ تجھے کیا پتہ تو تو اس جلنے (زمانے) میں اپنی سسرال میں رہتی تھی۔

(باہر سے جنت کے بچے کے رونے کی آواز سنائی دیتی ہے دونوں بہنیں ادھر متوجہ ہو جاتی ہیں۔ رجو جنت کے ننھے کو کولھے پر لٹکائے اندر آتی ہے)

رجو: (ایک دم ہنس کر) اماں شاہو چچا کے گھر آج بھی گوشت پک رہا ہے۔ (بچے کو اتار دیتی ہے)

زینب: اری دیوانی تو وہیں بیٹھی اب تک دوسروں کی ہانڈی سونگھ رہی تھی — میں نے جو ہرو کے پیچھے بھیجا تھا تجھے (فضلو کے ہاں سے دال لے آ —

رجو: (اٹھلا کر) فضلو دادا نے کہا نہیں تھا مہروسے پہلے ادھار کے پیسے دو پھر کچھ اور ملے گا — (ایک دم ہنستے ہوئے) اماں شاہو چاچا آج بھی پھاوڑا لئے ادھر جا رہا تھا۔ (ہاتھ سے سمت کا اشارہ کرتی ہے)

(زینب اور جنت چونک پڑتی ہیں اور اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ زینب رجو کے قریب آکر مدھم آواز میں)

زینب: اری کب جا رہا تھا؟

رجو: ابھی — اُدھر گیا ہے۔ (ہاتھ سے اشارہ کر کے یوں ہنستی ہے جیسے خوش خبری سنا رہی ہو)

جنت: (اپنے سینے پر ہلکا سا ہاتھ مار کر) ہائے رے — بس دیکھ شاہو تاڑ گیا نا — اری جلدی سے جا رجو! بابا کو کہیں سے ڈھونڈ لا۔

رجو: (آہستہ آہستہ دروازے کی طرف جاتے ہوئے) آں — بابا — بابا کو ڈھونڈوں!

(دونوں بہنیں بھاگ کر اس سے پہلے دروازے پر پہنچ کر

باہر جھانکتی ہیں اور پھر پلٹ کر رجو کو دیکھتی ہیں)

زینب: (رجو کی پیٹھ پر ایک ٹکہ مار کر) اری جا بھی جلدی سے۔ کیا مریل گھوڑی کی طرح چلتی ہے بدنصیب۔ تو ہی قسمت والی ہوتی تو بابا یوں بیکار رہتا۔

(رجو ہنستی مٹکتی باہر غائب ہو جاتی ہے۔ جنت کا بچہ صحن میں بیٹھا رو رہا ہے۔ جنت پلٹ کر اسے گود میں اٹھا لیتی ہے۔)

جنت: بس جینب! دیکھ لیجو آج کا دن بھی گیا۔

زینب: تو صبح صبح بابا کے سامنے اماں سے نہ جھگڑتی تو بابا کیوں گھر سے جاتا۔

جنت: واہ ری! — جھگڑتی نہ تو ویسے ہی! — پھر میں نے کہا ہی کیا تھا۔ بس اتنا ہی تو کہ اماں تو نے میرے لئے اوڑھنی تک نہ بنائی میری ساس تھوکے گی۔ بس اور تو کچھ نہ کہا تھا — اماں ہی نے چلانا شروع کر دیا — !

(مایوسی اور افسوس سے منہ پھیر کر کھڑی ہو جاتی ہے اور چپکے چپکے اوڑھنی کے پلو سے آنکھیں پونچھتی ہے)

زینب: (گلوگیر آواز میں) تجھے نہیں معلوم بابا کے پاس کچھ ہوتا تو وہ تیرا منہ کھلواتے۔

جنت: مجھے کیا کھبر (خبر) تھی بابا گھسہ ہو جائے گا — ہائے اللہ میاں بابا کدھر گیا — (اپنے ڈوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھتی ہے اور اس کا بچہ زور زور سے دھاڑنا شروع کر دیتا ہے۔)

زینب: (جنت کو گلے لگا کر) اری تو رونے کیوں لگی؟ — واہ رونے کی کیا بات ہے — بابا یہیں کہیں ہوگا۔ اس کا روٹھنا کوئی نیا ہے — چل آنسو پونچھ — بچے کو دودھ دے۔

(جنت اور زینب چھپر تلے آ جاتی ہیں — جنت کھاٹ پر بیٹھ کر بچے کو اپنا دودھ پلانے لگتی ہے۔ اور زینب گھڑے سے پانی انڈیل کر آٹے سے سنے ہوئے ہاتھ دھونے لگتی ہے)

جنت: (ایک دم پریشان سی ہو کر) اماں کھود رہی ہوگی۔ کیوں جنت؟

زینب: ہاں پر اسے سانس کا دورہ نہ پڑ جائے۔ اس نے کہا ہے کہ کبھی چپہ بھر جمین بھی کھودی ہوگی۔

جنت: مہرو بابا کو ڈھونڈنے گیا اس سے اچھا تھا تو مہرو کو اماں کے ساتھ لگا دیتی۔

زینب: (ایک دم بھبھک کر) جنت کیا کہتی ہے تو؟

جنت: (اسی فکرمندی کے ساتھ) دو مل کر کھودتے تو شاید کام جلدی ہو جاتا۔

زینب: (چیخ کر آنکھیں نکالتے ہوئے) زبان کھینچ لوں گی تیری جو مہرو سے تو نے یہی بات کہی۔ میرا مہرو کبھی اس پھاوڑے کو ہاتھ نہ لگائے گا۔ سمجھ لے تو۔

جنت: (ہاتھ نچا کر اور منہ بنا کر) کیوں، تو اور تیرے بچے اسی پھاوڑے کے صدکے (صدقے) میں کھا کما کر پلیں۔ میری بڑھیا ماں بھی پھاوڑا اٹھا لے اور تیرا مہرو کانچ کا بنا ہوا ہے۔ وہ نہیں ہاتھ لگائے گا پھاوڑے کو۔ وہ کو ٹرا ڈپٹی ہے۔

زینب: بس جنت۔ بس جبان (زبان) روک لے۔ (یوں لگتی ہے جیسے جنت کو نوچ ڈالے گی۔ مگر پھر ایک دم اپنا پلو آنکھوں پہ رکھ کر بیٹھ جاتی ہے)

جنت: لے بیٹھ کیوں گئی مار آ کر — سچی بات جمرو (ضرور) بولوں گی۔

زینب: (روتے ہوئے) میں کیا کسی کو ماروں — اللہ نے مجھے مار دی۔ میرے دل سے یہ بات کیسے نکلے۔ ہائے مہرو کا باپ یوں ہی پٹنے پھاوڑے سے کھودے گڑھے میں آپ دفن ہو گیا تھا۔

جنت: (قدرے نرم پڑ کر) ٹیلے تلے کی جمین (زمین) پولی تھی اوپر سے پانی جو برسا تو بیٹھ گئی — اللہ کی یہی مرجی تھی۔ کسی کا کیا کسور (قصور) اپنے بابا نے عمر بھر یہی کام کیا۔ اور آج تو اماں بھی تیرے بچوں کا پیٹ بھرنے کو گڑھا کھودنے پہنچ گئی — مگر تیرا بیٹا —

زینب: (چیخ کر) مت لے میرے بیٹے کا نام — (مارنے کو اٹھتی ہے)

جنت: (کھاٹ پر سے جلدی سے اٹھ کر پیچھے ہٹتے ہوئے) نہیں چپ ہوں گی شاہو آج بھی ہمارا رزق اپنے گڑھے میں ڈال لے اور میں نہ کہوں۔ تو نے تو مائیکے کو لوٹ لیا (پیچھے ہٹتی جاتی ہے)

(ایک دم بھاگتا ہوا مہرو ان کے درمیان آ جاتا ہے)

مہرو: اماں! کھالہ! بابا مل گیا۔ (خوشی سے گھوم کر ہنستا ہے)

زینب: }
جنت: } (یک زبان ہو کر) بابا مل گیا — کہاں تھا۔

مہرو: پہلے فضلو دادا کی دکان پر نہیں تھا — پھر فضلو دادا کی دکان پر آ کر حکہ (حقہ) پینے بیٹھ گیا — بابا کا کام لگنے کی کھبر سن کر فضلو دادا نے یہ ڈال دی ہے۔ (کرتے کے دامن میں بندھی

(چھوٹی پوٹلی کھول کر جوڑتا جاتا ہے اور دال ہانڈی میں الٹ دیتا ہے۔ پھر باہر کی طرف بھاگتا ہے)

زینب: (چلا کر) ارے او بے مہرو۔ ذرا تو دم لے ـــ بابا کے لئے روٹی تو لے جا ـــ پتہ نہیں سویرے کا کچھ کھایا بھی اس نے کہ نہیں۔

(مہرو لوٹ کر اندر آتا ہے۔ تیر کی طرح کوٹھری کے اندر جاتا ہے اور ہاتھ میں ایک موٹی روٹی لئے اسی تیزی سے باہر کے دروازے کی طرف بھاگتا ہے اور پھر اندر آتی ہوئی اماں سے ٹکراتا غائب ہو جاتا ہے)

اماں: (پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ) ارے مٹا نے دیکھتا نہیں۔

زینب: اماں! (قریب جا کر اسے تھامنا چاہتی تھی)

جنت: اماں رجو کہتی تھی شاہو پھاوڑا لئے اپنی کوٹھری سے نکلا تھا ابھی۔

اماں: (ہاتھوں سے مٹی جھاڑ کر) اب کھودے گا اپنی اماں کی کبر (قبر) ہاتھ دو ہاتھ مٹی تو میں نے ہٹالی۔ اس ٹیم (وقت) تیرا بابا ہزار جوان کا ایک جوان ہے آتے ہی جو دو چار پھاوڑے مارے تو کمر تک مٹی ہٹالی۔

(کمر کو اپنے ہاتھوں سے سہارا دیتے کراہتے ہوئے۔ اری ذرا پانی تو پلائیو جنت۔

زینب: اماں لیٹ جا میں تیری کمر دبا دوں۔

(اماں کھاٹ پہ بیٹھ جاتی ہے اور زینب اس کی کمر دبانے لگتی ہے۔ جنت پانی کا کٹورا لئے آتی ہے اور اپنے بچے کو زمین پہ بٹھا کر پانی ماں کو دیتی ہے۔)

جنت: لا اماں میں تیرے پاؤں دبا دوں۔

اماں: بیٹھ بیٹے تو تو میری چلم بھر دے۔ (جمائی لے کر) کتی (کتنی) دیر سے تماکو نہیں پی۔ (جنت حقے پر سے چلم اٹھا کر چولھے کے پاس جاتی ہے اور سے چولھا کریدکر واپس آجاتی ہے۔ پھر کچھ سوچ کر اِدھر اُدھر طاق پر اور کوٹھری میں کچھ تلاش کرتی ہے اور پھر دیا سلائی کی ایک تیلی حاصل کر کے آگ جلا دیتی ہے)

زینب: (کمر دباتے ہوئے) کیسے تو نے پھاوڑا اٹھایا ہوگا اماں!

اماں: جنموں لے بھلا پھاوڑا اٹھانا بھی کچھ مشکل ہے۔

(اماں کھاٹ سے اٹھ کر پھاوڑا اٹھانے کی نقل کرتی ہے)

اماں: یوں پھاوڑا اٹھایا۔ یوں جمین پر مارا ـــ بس اس طرح مٹی اٹھائی اور دور پھینک دی۔ آج تو تیرا بابا مجھے دیکھ کر حریان (حیران) رہ گیا۔ اب میرے آگے منہ کھولے گا کبھی۔

جنت: (چلم لاتی ہے) اماں رکھو سنے یا شاہو نے تجھے دیکھا تو نہیں؟

اماں: دیکھ تو میرا کیا بنا لے گا۔ عورت جات ہوں تو کام نہ کروں؟ واہ اب اب تک تیرے بابا کی انتجاری کرتی تو بس ـــ ابھی دیکھیو موٹر والوں کا کام ہے دم کے دم میں لے کر آجائیں گے۔

جنت: اماں آج تو اچھے پیسے ملیں گے بابا کو اور بھیا کو۔ ایک بار پہلے بھی موٹر والوں کا کام کیا تھا تو بیس روپے دے گیا تھا بابا کو۔

اماں: اللہ مالک ہے۔ (اماں حقے کے لمبے لمبے کش لیتی ہے ـــ اور کھانستی ہے)

زینب: جا ری جنت تو دال چڑھا دے چولھے پر۔ اتنا وقت ہو گیا۔ بچے بھوکے ہوں گے۔

جنت: جا تو ہی چڑھا دے (کھاٹ پر بیٹھنے لگتی ہے۔)

زینب: پھر کل کی طرح تو کہے گی کہ میرا میاں آنے والا تھا دال میں اتا (اتنا) پانی ڈال دیا جینب نے ـــ تو آپ ہی ہانڈی روٹی دیکھ۔

جنت: (ٹھنک کر) نہیں کہوں گی۔ تو کوئی میرے میاں سے جلتی ہے؟ میں نے ہنسی میں کہی تھی بات۔ (بے حد محبت سے) جا تو ہانڈی روٹی کر لے جلدی جلدی بس اماں کو دباتی ہوں۔

زینب: (ایک دم بگڑ کر) کیوں تو کوئی بڑی لاٹ صاحب ہے۔ میں روج ہانڈی روٹی کروں۔ ایک دن تو کر لے۔ میرے ہاتھوں میں کوئی کانٹے لگے ہیں جو میں اماں کو نہ دباؤں؟

جنت: (تیز ہو کر) میں یہاں کوئی بیٹھی رہوں گی۔ منے کا ابا آج پہنچے گا تو کل مجھے لے جائے گا۔ پھر تو اکیلی خوب کھدمت کر لیجیو اماں کی۔

زینت: (چلا کر) چل چل بڑی آئی کھدمت کرنے والی۔ آج بابا اور بھیا کا کام لگا تو تجھے محبت آئی اماں کی۔ روج تو پاؤں پسارے کھاٹ پہ بیٹھی رہتی تھی۔

جنت: (روہانسی ہو کر) دیکھ لے اماں ـــ کیا کہہ رہی ہے جینب۔

زینب: (ہاتھ نچا کر چڑانے کے انداز سے) سچی کہی تو مرچیں لگ گئیں تجھے۔

اماں: (بے حد مدبرانہ انداز سے سر ہلا کر) تو بھی سچی یہ بھی سچی۔ جا جنیب آج بھی تو ہی ہانڈی روٹی کر لے۔ یہ آج کی رات ہے دو گھڑی میرے پاس بیٹھ لے۔

زینب: (جلا کر چولہے کے پاس بیٹھتے ہوئے) ہاں۔ ہاں یہ جنت تیری لاڈلی کل سسرال چلی جائے گی اس لئے اس کی کدر (قدر) ہے میں تیرے درواجے (دروازے) بیٹھی ہوں۔ اللہ نے مجھے لا کر بٹھایا ہے، میری کیا کدر (قدر)؟

(اماں جواب میں کچھ کہنا چاہتی ہے مگر کھانسی کا پھندہ پڑ جاتا ہے اور وہ ہاتھ سے نفی میں اشارے کرتی رہ جاتی ہے)

جنت: (ہاتھ بڑھا بڑھا کر) تیری کدر تھوڑی ہے۔ بابا اور بھیا کی ساری کمائی کو کڑک مرغی کی طرح چھاپ کر بیٹھ گئی ہے اب سن تو مجھ سے۔

زینب: (ماتھے پر ہاتھ مار کر) ارے میں کمائی چھاپ کر بیٹھی ہوں۔ میرا مالک جیتا دفن ہو گیا، میرے بچے یتیم ہو گئے اور تو کہتی ہے میں کمائی چھاپ کر بیٹھ گئی ہوں۔ جیسے میں بیٹھی ہوں ویسے سب بیٹھیں آ کر۔

جنت: (ایک دم رو کر) دیکھ لے اماں، اور کو سنے دلوا لے۔

اماں: (کھاٹ سے اٹھ کر تھر تھراتا ہاتھ اٹھا کر) جنیب جبان روک لے۔

زینب: (اسی طرح) میں تو یوں ہی کہوں گی۔

اماں: (دھاڑ کر) ارے رانڈ کلموہی بہن کو کوستی ہے۔ تیرے منہ میں راکھ۔

(زینب ایک دم خاموش ہو کر مجروح انداز سے ماں کو دیکھتی ہے اور پھر جھک کر چولہے میں پھونک مارنے لگتی ہے)۔

(جنت اپنے بچے کو گود میں اٹھا کر کھاٹ پر بیٹھ جاتی ہے اور منہ ڈھانک کر رونے لگتی ہے)۔

جنت: (رونے میں بین کرتے ہوئے) تین سال پیچھے مائیکے آئی تو میری بہن کو بُرا لگا۔ ارے میں نے کسی کا کیا لے لیا، دو نوالے روٹی کھائی ـــــ اور آج بہن کے کوسنے سن لئے ـــــ ارے اماں مجھے کیوں بلایا تھا ری۔

زینب: (گھٹنوں میں سر رکھ کر آواز سے روتے ہوئے) میں بابا کے گھر نہ بیٹھتی تو کہاں جاتی۔ میرے بچوں کی دو روٹیاں سب کو کانٹے کی طرح لگتی ہیں۔ ارے اماں، میں کلموہی تھی تو مجھے اس کے ساتھ جیتا کیوں نہ دفن ہونے دیا۔

(اماں پہلے تو کبھی ایک بیٹی کی طرف، کبھی دوسری کی طرف ہاتھ پھیلا پھیلا کر روکنے کی کوشش کرتی ہے۔ "ری جنیب" "اری جنت" کہہ کہہ کر رہ جاتی ہے آخر ہار کر اپنے سر پر ایک دوہتڑ مار کر صحن میں بیٹھ جاتی ہے)

اماں: (جیسے اپنے سے فریاد کر رہی ہو) ہائے اللہ! اے میں کیا کروں۔ دونوں دکھ (وقت) ملنے آئے اور گھر میں ہائے ہائے پڑی ہے آج کتنے دکھ (کتنی) دن بعد رونق اتری اور ادھر گھر کے دو بول نہیں ـــــ (جنون ہاتھوں سے سر پکڑ لیتی ہے پھر ایک لمحے کی خاموشی کے بعد ایک دم مسکرا کر سرگوشی کرتی ہے جیسے اپنے آپ سے مشورہ کر رہی ہو)

اماں: رونے اور جھگڑنے کی کیا بات ہے تمہارا گلوبند جو لائے وہ جنت کا ـــــ اور جو بابا کو ملے وہ جنیب کا ـــــ (زمین سے اٹھ کر کرتے کا دامن جھاڑتی ہے اور کھاٹ پر بیٹھ کر حقے کا لمبا کش لیتی ہے)

زینب: (دوپٹے میں ناک پونچھ کر روٹی کو تھوڑا سا کھاتے ہوئے) تو میں نے جنت کو کیا کہا تھا ـــــ اس نے آپ ہی میرے بچوں کی روٹی گنی۔

جنت: (آنسو پونچھ کر) تو میں نے اسے کیا کہا آپ ہی تو مجھے کوسا اس نے!

اماں: (دونوں طرف ہاتھ پھیلا کر دانت کپکپاتے ہوئے) اری چپ ہو بابا نے یہ جھگڑا سن لیا تو رات بھر نہیں ٹکنے کا گھر۔

زینب: ہاں اسے بڑا خیال ہے بابا کا۔

جنت: اور بابا کو میرا بڑا خیال ہے پچھلے ساون آئی تھی تو بابا نے دو روپے کی اوڑھنی بھی خرید دی ـــــ (پھر رونے کی کوشش کرتی ہے)

اماں: ہاں ری تو بٹیا اب تو بابا کو ہوا دے اپنے کی تو کسے کہے گی۔ بابا نے تجھے پر اچھا گھر کر دیا ناسے تیری برات کو پلاؤ زردہ (زردہ) دیا۔

جنت: (ہاتھ جھٹک کر ـــــ) ہو کا برات کو ـــــ مجھے کیا دیا بابا نے۔ میں کونی اتنی بچی نہ تھی جب جنیب کا بیاہ ہوا تھا۔ اسے

سونے کے جھمکے اور سونے کا تعویذ دیا تھا۔ اور پاؤں میں سیر بھر چاندی کے کڑے ـــ مجھے تو ماشہ بھر سونا بھی نہ دیا۔

اماں: (زینب کی طرف فریادی انداز سے مخاطب ہو کر) ـــ لے سن ذرا ـــ (جنت سے) اری تیرے دولہا کو تولہ بھر سونے کی انگوٹھی نہیں دی تھی۔ اس پہ اللہ نام کھودنے کے لئے سنار نے روپیہ الگ لیا تھا۔ بول اب بول ذرا ـــ وہ انگوٹھی کیسے بھولے گی وہ تو تیرا دولہا اب تک پہنے پھرتا ہے۔

جنت: (لاجواب سی ہو کر) میرے بیاہ کی انگوٹھی تو جبان (زبان) پہ دھری ہے اور جینب کے سونے کے جھمکے اور تعویذ بھول گئی۔
(بچے کو ڈوپٹے کے اندر چھپا کر دودھ اس کے منہ میں دے دیتی ہے اور ماں کی طرف سے منہ پھیر کر بیٹھ جاتی ہے۔)

اماں: یہ جینب کی کسمت (قسمت) تھی۔ جب جینب کا بیاہ ہوا تو کیتی کمائی تھی۔ بستی میں بیماری پھوٹی تھی۔ رات دن تیرے بابا کی پکار پڑی رہتی تھی۔ لوگ تیرے بابا کی خوشامد کرتے تھے۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) کیا رزق برسا تھا۔ اپنے ڈاکٹر بابو نے اس کے بعد ہی تو موٹر کھریدی تھی۔ اور ہم نے جینب کا بیاہ کیا تھا ـــ (ٹھنڈی سانس لیتی ہے اور آسمان کی طرف دیکھتی ہے)

زینب: اور جب تیرا بیاہ ہوا تھا کتنا مندا تھا۔ بابا دو دو دن ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا تھا۔ بلا تیری کھاتر (خاطر) ڈاکہ ڈالتا؟

جنت: (تڑپ کر) بڑی آئی مجھے بدکسمت کہنے والی جبھی تو شاہ دین اور رکھو نے یہاں نئی نئی جھونپڑیاں ڈالی تھیں ـــ رکھو نے میرے بیاہ سے آٹھ دن پہلے اپنے بیٹے کا بیاہ کیسی دھوم سے کیا تھا۔ گیس کے ہنڈے جلے تھے تو کیا رکھو نے ڈاکے ڈالے تھے۔

(اماں ایک دم پھڑک کر یوں ہاتھ بڑھاتی ہے جنت کی طرف جیسے مشاعرے میں پرانے لوگ داد دیتے ہیں)۔

اماں: واہ لے اب تو نے آپ ہی جھگڑے کی جڑ پکڑ لی ـــ (ہاتھ پر ہاتھ مار کر) دیکھ پہلے بابا اکیلا تھا اپنے کام میں ـــ پھر شاہ دین اور رکھو آ گئے۔ رزق بٹ گیا نا! اب بتا تیرے بابا کا کیا کسور جو تجھے سونے کے جھمکے نہ ملے۔ بول اب؟
(جنت لاجواب ہو کر رو پڑتی ہے)

اماں: (جنت کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) اری دیوانی بابا کے لئے تو اور جینب برابر ہیں۔ اللہ سے دعا کر بابا کا کام بڑھے۔ بیٹیاں تو سدا ماں باپ سے لینے کا حق رکھتی ہیں۔ اب کی تیرے گھر بیٹا ہوا تو سونے کے جھمکے لیجیو۔

جنت (بچوں کی طرح مچل کر) آج بھیا موٹر میں گیا ہے گسل ڈالنے۔ اسے ضرور روپے بھی ملیں گے اور کوئی انگوٹھی چھلا بھی۔ پر دیکھ لینا وہ مجھے روپیہ بھی ٹکا سے تو کہنا۔ چھپالے گا اپنی کمائی ـــ میرے ننھے کا ایک نیا کرتہ بھی بننا ہے اور میری اوڑھنی بھی ـــ پر دیکھ لیجیو تو اماں کچھ بھی نہ بنے گا۔ اور میری ساس طعنے ماریگی۔

زینب: (چولہے پر ہانڈی میں ڈوئی پھیرتے ہوئے) بابا کو کیا ملے گا؟ آٹا بھی کل کھتم ہے۔ فضلو پہ چونے کا ادھار بھی ٹوٹا تا ہے۔ ابھی تو اماں نے کہہ دیا کہ جینب بابا کے پیسے لے گی ـــ لے گی جب بچ کر بچ جائے ـــ میری رجو بارہ سال کی ہو رہی ہے بابا نے اس کے بیاہ کے لئے ایک کرتہ بھی نہ کھرید کر ڈالا۔

اماں: (حقے کا ایک لمبا کش لے کر) اری دیوانیو، اپنی اپنی پھکر میں یہ بھول گئیں کہ کام موٹر والوں کا ہے ـــ اللہ کرے گا تو کل ننھے کا نیا کرتہ اور جنت کی اوڑھنی لیں گے۔ اور رجو کے لئے کرتے کا کپڑا بھی۔

زینب: (گھبرا کر) اور مہرو کے لئے تہمد؟

جنت: (خوشی سے منہ اٹھا کر) اور میرے لئے نئی چوڑیاں بھی اماں
(اسٹیج پر شام کا اندھیرا چھا جاتا ہے ـــ اس اندھیرے میں رجو دھیرے دھیرے پر اسرار انداز سے آ کر کھڑی ہو جاتی ہے پہلے اپنا سر کھسوٹتی ہے اور پھر ہاتھ الٹا کر کے اپنی پیٹھ کھجاتی ہے)

رجو: بابا مل گیا اماں؟ (دھیرے سے ہنستی ہے)

زینب: اری تجھے اب کھبر لگی؟ کہاں پھر رہی تھی اب تک۔

رجو: آج کسی نے دیا نہیں جلایا، بوند بھر تیل بھی نہیں ملا۔

زینب: چل دفع کر دیوں کو ـــ تو بیٹھ کر اماں کو دبا۔
(رجو اسی طرح کھڑی سستی سے اپنی پیٹھ کھجاتی رہتی ہے)
(اندھیرا بڑھ جاتا ہے)
(ایک دم مہرو بھاگتا ہانپتا ہنستا اندر آتا ہے ـــ اور دیوار پر ٹنگی ہوئی سیاہ لالٹین کو اتار کر واپس باہر جانے لگتا ہے

زینب اس کے پیچھے بھاگتی ہے۔)

زینب: او رے مہرو کدھر چلا۔

مہرو: (ٹھٹھک کر) وہ لوگ آگئے لے کر ۔۔۔ مسجد میں بڑا مولوی نماج پڑھا رہا تھا۔

اماں: ان کو تو آنا ہی تھا ۔۔ بابا نے کام ختم کر لیا؟

مہرو: (باہر کی طرف قدم اٹھا کر، جرا سی مٹی اور نکالتا ہے۔ اندھیرے میں بابا کو نجر نہیں آ رہا۔

جنت: ارے بتی جلا تو لینے دے ۔۔ (مہرو کے ہاتھ سے لالٹین لیکر اسے روشن کرتی ہے اسٹیج پر ایک لمحے کو روشنی ہوتی ہے اور پھر مہرو کے چھپر تلے پیروں کے ساتھ یہ روشنی غائب ہوجاتی ہے اور اسٹیج پر گہرا اندھیرا چھا جاتا ہے۔)

[ایک لمحے کی خاموشی اور اندھیرے میں قریب کسی کتے کے رونے کی صدا بلند ہوتی ہے اور پھر اسٹیج پر روشنی ہو جاتی ہے ۔ وہی منظر ہے۔ طاق پر رکھا چراغ مدھم سی روشنی دے رہا ہے۔ چھپر تلے اب تین کھاٹیں بچھی ہوئی ہیں۔ بابا مٹی کے بدھنے سے ہاتھ دھو کر اپنے تہمد سے ہاتھ اور منہ خشک کر رہا ہے۔ مہرو اور رجو کے سامنے کھاٹ پر المونیم کی پلیٹوں میں روٹی پڑی ہے۔ مگر وہ کھا نہیں رہے ہیں۔ زینب چولھے سے آگ نکال کر چلم میں رکھ رہی ہے اور جنت چپ چاپ اپنے ننھے کو میلے لحاف میں لئے کھاٹ پر بیٹھی ہے۔)

رجو: (روٹی پر انگلیاں پھیرتے ہوئے) شاہو چاچا کے ہاں گوشت پکا ہے آج بھی۔ (ہنستی ہے)۔

مہرو: ہمارے گھر کل پکے گا۔ کیوں بابا؟

بابا: ہوں ۔۔ ہوں

جنت: (جل کر) ہاں پانچ روپے ملے ہیں بابا کو کل تک سب کر لو اپنے لئے۔

زینب: (چلم اٹھا کر بابا کے قریب آتے ہوئے) سن لے بابا۔

بابا: ہوں ۔۔۔ (چلم لے کر کوٹھری میں چلا جاتا ہے)

(چند لمحے کو سب خاموشی سے ایک دوسرے کو شکایت بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ باہر کوئی کتا رو تا ہے۔ ہوا کی سائیں سائیں بڑھ جاتی ہے۔ زینب اپنے بچوں کو ڈالی کھاٹ پر ٹک جاتی ہے)

زینب: ارے روٹی نہیں کھاتے تم دونوں۔ (رجو بتکے پن سے ہنستی ہے)

مہرو: نانی آئے گی پھر کھائیں گے۔

زینب: (فکر مند ہو کر) رتی (اتنی) دیر ہوگئی اماں نہیں آئی۔ مسجد اتنی دور بھی نہیں۔

جنت: کیوں رے مہرو تو نے اچھی طرح دیکھا تھا تیرا ماموں لوگوں کے ساتھ نہیں آیا تھا؟

مہرو: نہیں۔ بالکل ماموں آیا ہی نہیں

جنت: (اداس لہجے میں) آتا کیسا۔ سمجھا ہوگا گھر گیا تو بہن کو کچھ دینا پڑے گا۔

رجو: (ہنس کر) ماموں آج "سلیما" گیا ہوگا کھالہ۔

زینب: (ڈر کر) شی! ۔۔ چپ! بابا سن لے گا تو بھیا سے رات ہی کو جھگڑے گا۔ ایک بار پہلے کتا (کتنا) جھگڑا ہوا تھا، مردار، بھول گئی ۔۔۔ (اپنے آپ سے) بابا نے سچ تو کہا تھا میں نے تجھے حارج (حافظ) مولوی بنایا اور تو "سلیما" جاکر گندہ ہوتا ہے۔

رجو: سلیما کیسا ہوتا ہے اماں؟

مہرو: ہا ۔۔ تجھے نہیں معلوم۔ میں بتاؤں تصبیریں (تصویریں) ناچتی اور گاتی ہیں ۔۔

(بیٹھے بیٹھے کمر پر ہاتھ رکھ کر تھرکتا ہے) "آجا مورے بالما تیرا انتجار ہے۔"

زینب: (ہنستی ہے اور مہرو کو دھمکانے کے لئے ہاتھ اٹھاتی ہے) چپ بے حیا۔ بابا سنے گا تو چمڑی ادھیڑ دیگا تیری۔

جنت: (تھکے ہوئے اداس لہجے میں) جو جس کی مرجی ہو کرے میں اب کے جاؤں تو آکر منہ نہ دکھاؤں گی کبھی ۔۔۔ اماں کہہ رہی تھی آج جیادہ پیسہ ملے گا۔ بابا نے آکر پانچ دکھائے۔ بھیا نے صورت بھی نہ دکھائی آکر۔

زینب: کیوں ایسی باتیں کرتی ہے بھیا کوئی برا ہے ۔۔۔ دیکھ لیجیئو اس کو جرور اچھے پیسے ملے ہوں گے۔

آنے دے، اسے کوئی کام پڑ گیا ہو گا جواب تک نہ آیا۔

(دور لکڑی کے کھڑاؤں کی آواز آتی ہے۔ مہرو دوڑ کر دروازے تک جاتا ہے۔ اور شور مچاتا ہے)

مہرو: مائی آگئی۔

(اماں کھڑاویں بجاتی لالٹین جھلاتی ہانپتی اندر آجاتی ہے جنت بے چینی سے لحاف سر سے اتار دیتی ہے۔ سب سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہیں۔ اماں کسی کی طرف دیکھے بغیر بیچ والی کھاٹ پر بیٹھ کر اکھڑی اکھڑی سانسیں لیتی ہے)

بابا: (کوٹھری کے دروازے پر حقہ اٹھائے آکر) آگیا گلو؟

اماں: (ہاتھ سے نہیں کا اشارہ کرتی ہے اور بے حد دل جمعی سے ہانپتی رہتی ہے)

بابا: کیوں نہیں آیا۔ کدھر گیا۔ حرام جادہ مجھے کرنے۔ آنے دو آج ادھیڑ کر رکھ نہ دیا ہو تو میرا نام نہیں۔

اماں: (سانس ٹھیک کر کے) کیوں ادھیڑے گا میرے لال کو۔ بہت تیرے دس پانچ بیٹے ہیں جو مارے گا میرے گلو کو۔

بابا: (دھاڑ کر) جبان نکال لوں گا جو بیٹے کی طرف سے بولی (مارنے کو بڑھتا ہے)

(زینب اور جنت ایک دم بیچ میں آجاتی ہیں۔ زینب باپ کے ہاتھ سے پٹ جاتی ہے۔ مہرو رونے لگتا ہے اور رجو مہرو کی طرف دیکھ کر منہ پھیر کر ہنستی ہے)

بابا: چھوڑ دے مجھے آج بتاؤں بڑھیا کو بیٹے کی طرف داری کرتی ہے۔

اماں: (بابا کی طرف بڑھنے کی جد و جہد کرتے ہوئے) لے آج دل کا ارمان نکال لے۔ آ مار مجھے۔ مگر خبردار جو میرے بیٹے کو کچھ کہا۔۔۔ ہاں۔ (جنت ماں کو پیچھے ڈھکیلتی ہے)

بابا: (رجو امیں گلے چلا چلا کر) ایک بیٹا ہے یہی سوچ کر میں نے کہا اس سے کیا پھاوڑا اٹھواؤں، آپ محنت کی اور اسے مولبی کے پاس بٹھا دیا۔ اب کسی لائک (لائق) ہوا تو کمائی اپنی جیب میں ڈال کر سلیمے دیکھتا پھرتا ہے۔ اور تو اس کی طرف داری کرتی ہے۔ میت کے کپھن (کفن) پہ خون تھا۔ جس پر اس نے گسل ڈالا۔ یہ تو نہیں کہ بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے والا ہو جو گھر والے پہلے سے انگوٹھی چھلے اتار لیں۔

اماں: (بات کاٹ کر) ہاں تو میں کب کہتی ہوں کہ اسے انگوٹھی نہیں ملی۔۔۔ پھر تجھے کیا؟

بابا: مجھے کیا؟ آکر کہہ دے گا کچھ نہیں ملا۔ اچھا میں اس کی ہڈیاں نہ توڑ دوں تو کہنا۔۔۔ بہن سسرال جانے کو بیٹھی ہے اور تو کہتی ہے مجھے کیا؟

جنت: (اماں کو چھوڑ کر بابا کے قریب جا کر ہنستے ہوئے) بابا، اماں بی کو کھیال نہیں میرا تو مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔

زینب: میرے بچوں کا کسی نے خیال کیا کبھی؟

بابا: (آپے سے باہر ہو کر) بتا تجھے سونا دکھا کر کدھر گیا، بتا وہ آیا کیوں نہیں۔

اماں: (بے تعلقی سے) مولبی کے پاؤں دبا رہا ہے۔ مولبی چاہتا تو آپ جاتا موٹر میں بیٹھ کر۔ چاہتا تو دوسرے لڑکوں کو بھیجتا اب میرا بیٹا مولبی کے پاؤں نہ دبائے تو تیرے دبائے۔

بابا: (اور بھڑک کر) میت نہلا کر جب سے پاؤں دبا رہا ہے۔ مجھے بناتی ہے بڑھیا۔ بول کہاں گیا تیرا بیٹا۔

(اماں بڑے غرور سے بابا کی طرف بڑھتی ہے اور بے پروائی سے اس کے ہاتھ سے حقہ لے کر ایک کش لگاتی ہے)

اماں: سنار کے پاس گیا تھا انگوٹھی لے کر سیدھا۔ اس کی دکان بند تھی۔ پھر اس کے گھر گیا کہ تلوا کر کسوٹی پر پرکھوا لے۔ دیر نہ لگتی تو کیا ہوتا؟

(بابا ایک دم کوٹھری کی دہلیز پر بیٹھ جاتا ہے اور لاجواب ہو کر حقہ کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ اماں اسے حقہ پکڑا کر یوں کھاٹ پر بیٹھ جاتی ہے جیسے سارے جہان کی دولت اس کے قدموں تلے پڑی ہو)

جنت: (خوشی سے بمشکل آواز نکالتے ہوئے) اماں! سونے کی ہے؟

زینب: (خوشی سے آنکھیں پھاڑ کر جیسے اپنے آپ سے) اور چاندی ہوتی تو بھیا یوں مارا مارا پھرتا؟

(ہوش میں آکر رجو سے) اٹھ اماں کے پاؤں دبا رجو! اماں مسجد سے چل کر آئی ہے۔ رجو ہنستی ہے اور بیٹھی رہتی ہے)

(باہر کتے کے بھونکنے کی آواز آتی ہے، ساتھ ہی جوتوں کی چاپ)

زینب: گلو بھیا آرہا ہے۔

(جنت جھپٹ کر لالٹین اٹھاتی اور دروازے کی طرف بھاگتی ہے۔ اس کے پیچھے زینب اور مہرو بھی دوڑتے ہیں۔)

جنت: (چلا کر) بھیا مٹی کے ڈھیر دیکھ کر۔ ٹھوکر نہ کھائیو۔

مہرو: (خوشی سے اچھلتے ہوئے) ماموں آگیا۔ ماموں آگیا۔ بابا۔ بابا!

(گلو بھاری بھاری قدم رکھتا جھومتا جھامتا اندر آتا ہے۔ وہ سب اسے ایک طرف ہٹ کر راستہ دیتے ہیں۔ گلو چھپر تلے ایک دم کھاٹ پر یوں لیٹ جاتا ہے جیسے بہت تھکا ہوا ہو۔ زینب، جنت سے آگے بڑھ کر پوچھتی ہے)

زینب: بھیا روٹی کھائے گرم گرم دال پکی ہے۔

گلو: کھالوں گا۔ بہت تھک گیا آج تو (ٹانگیں اور ہاتھ اکڑا اکڑ کر ایک جماہی لیتا ہے۔ اور پھر کھاٹ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ جاتا ہے)

زینب: (ہنستے ہوئے بڑے پیار کے ساتھ) اے بھلا حافظ مولوی ہوگیا۔ جھوٹ بولنے کی عادت نہ گئی تیری۔ کیا مجھے معلوم نہیں موٹر میں بیٹھ کر گیا تھا غسل دینے۔ لا پاؤں دبوانے کو جی کرتا ہو تو دبا دوں۔ (گلو کی طرف جھکتی ہے)

گلو: (پاؤں سمیٹ کر) نہ ـــ نا آپا۔

جنت: مجھ سے دبوالے، بھائی چھوٹا ہو تب بھی بہن سے بڑا ہی ہوتا ہے۔ (جنت گلو کی طرف جھکتی ہے)

اماں: دبوالے میرے لال، کہاں کہاں مارا پھرا ہے تھک گیا ہے۔

بابا: (اماں سے مخاطب ہو کر) ہاں تیرا لونڈا بڑے کنویں کھود کر آیا ہے۔ جو بیٹھا ٹانگیں اینٹھا رہا ہے۔ (دونوں بہنیں سیدھی ہو کر غصے سے بابا کو دیکھتی ہیں۔ اماں کچھ کہنے کی کوشش میں کھانسی کا شکار ہو جاتی ہے)

گلو: (رنجیدہ ہو کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے) بابا تجھے اپنا کام دکھتا ہے دوسرے کا نہیں۔ تو قبر کھودتا ہے میں گندے مڑے مردے نہلاتا ہوں۔

(جھرجھری لے کر منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بدلی ہوئی خوفزدہ آواز میں) توبہ الٰہی توبہ۔ کیا بری میت نہلائی ہے آج

مہرو: ماموں موٹر والوں کی میت بھی گندی ہوتی ہے۔

رجو: (ایک دم بے تکے پن سے ہنس کر) کیوں ماموں، موٹر والے تو روز تیل ک دینے جائیں گے قبر پر؟

گلو: (دونوں بچوں کی طرف دیکھ کر اکیدم چیخ پڑتا ہے) موٹر والے۔ موٹر والے (آواز دھیمی کر کے) وہ تو موٹر والوں کو خدا کا خوف تھا۔ کل ان کی موٹر تلے آکر کچلا گیا تھا۔ غلطی مرنے والے کی تھی۔ پھر بھی ان موٹر والوں کے دل میں اللہ تعالیٰ نے رحم ڈالا انہوں نے پولیس سے کہا سنا اور لاش ہسپتال سے اٹھا لائے کہ ہم آپ کفن دفن کریں گے ـــ ایسے بھی بڑے لوگ ہوتے ہیں دنیا میں ـــ (ایک لمحہ رک کر) بابا! قسم ہے اللہ پاک کی منہ تو بالکل پچکی ہو گیا تھا۔ پانی پر پانی ڈالتا گیا۔ پھر بھی خون ہی خون۔ (جھرجھری لے کر منہ پر ہاتھ پھیرتا ہے)

بابا: (جھلا کر) جیادہ نقشے (نخرے) نہ کھینچ وہ تو قبر میں اتارتے وقت کفن پر خون میں نے بھی دیکھا تھا ـــ یہ بتا تو تھک کیسے گیا۔

اماں: واہ رے بڈھے، میں نے نہیں بتایا کہ سنار کے گھر کے چکر لگا رہا تھا۔ لے حقہ پی۔ پھر یاد آجائے گا۔ (حقہ اٹھا کر بابا کے سامنے رکھ دیتی ہے اور بابا غصے میں دو ایک لمبے لمبے کش لیتا ہے)

زینب: ہائے ـــ کون تھا مرنے والا؟

گلو: جانے کون تھا۔ موٹر والے صاحب کہتے تھے اس کی جیب سے پانچ روپے اور گڑ کی گجک نکلی تھی۔ گجک اور روپے سے کسی کا کیا پتہ نشان ملتا۔

اماں: (بے حد دانشمندی سے سر ہلا کر) اور کیا ـــ ٹھیک تو ہے۔

جنت: (ایک دم ہنس کر) اور انگوٹھی جو تھی اس کے ہاتھ میں اس کا جکر (ذکر) نہیں کرتا بھیا۔ ڈرتا ہے جنت کو کچھ نہ دینا پڑ جائے۔ اس واسطے نا! (اٹھلا کر گلو کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے) لا میں بھی دیکھوں انگوٹھی۔

گلو: (جلدی سے دونوں ہاتھ اپنی بغلوں میں چھپا لیتا ہے) چل چل میرے پاس نہیں ہے انگوٹھی"

جنت: تو میں کھا جاؤں گی تیری انگوٹھی۔ (روٹھ کر بچوں کی طرح ہونٹ لٹکا لیتی ہے۔ لیکن ہاتھ پھیلائے رکھتی ہے)

گلو: (کچھ سنجیدگی اور کچھ ہنسی سے) اماں دیکھو جنت کو — ہر سال آ کر یہ لاڈ وہ لاڈ کرنے لگتی ہے۔

جنت: (ایک دم غصے میں آ کر) دیکھ لے اماں کیا کہہ رہا ہے بھیا —

اماں: ٹھیک تو کہہ رہا ہے۔ جا کل شنو کی اوڑھنی لا دے گا تیرے لئے — اب بھیا کے بیاہ کے لئے بھی کچھ رہنے دے گی یا نہیں۔

جنت: (آگ بگولہ ہو کر) میں نے کیا لیا تیرے گھر سے — جنت کو سونے کے جھمکے دیئے تھے — میں یہ انگوٹھی لوں گی آج لا مجھے انگوٹھی دے — (گلو کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے) (ایک دم بابا خیرو کوٹھری کی دہلیز سے اٹھتا ہے۔ سامنے پڑا حقہ ہاتھ سے الٹ دیتا ہے اور پھر گردن اور ہاتھ بڑھائے گلو کی طرف تول تول کر قدم بڑھاتا ہے)

بابا: (گمبھیر آواز میں) انگوٹھی مجھے دے۔

گلو: بابا اس انگوٹھی سے میں —

بابا: (چیخ کر) انگوٹھی مجھے دے (خوفناک انداز سے دونوں ہاتھ گلو کی طرف بڑھاتا ہے — گلو کھڑا ہو جاتا ہے اور اپنی جیب کو بازو سے چھپا لیتا ہے)

بابا: مجھے دے نہیں تو — نہیں تو گلا گھونٹ دوں گا تیرا۔ (سب دم بخود بابا کو دیکھتے ہیں گلو کے ہاتھ نیچے گر جاتے ہیں۔ بابا اپنی اکڑی ہوئی انگلیاں اس کی جیب میں ڈال کر انگوٹھی نکال لیتا ہے۔ اماں باپ بیٹے کے بیچ میں آنے کی کوشش کرتی ہے مگر بابا اسے زور سے دھکا دیتا ہے۔ وہ اس خوفناک اور پُر اسرار آہستگی سے لالٹین کی طرف انگوٹھی والا ہاتھ بڑھاتا ہے اور انگوٹھی کو غور سے دیکھ کر زور سے کہتا ہے)

بابا: اللہ (انگوٹھی ہاتھ میں لئے چھپر تلے سے نکل کر صحن میں رینگ آتا ہے)

بابا: (آہستہ آہستہ) اللہ! اللہ!

گلو: (اس کے پیچھے آ کر غصے سے) بابا یہ میرا حصہ ہے

بابا: (لاڈ زارانہ طریقے سے) یہ پوری تولہ بھر ہے نا — (گلو اثبات میں سر ہلاتا ہے)

بابا: اور اس پہ اللہ تعالیٰ کا نام کھدا ہوا ہے نا — تو نے اسے نہلایا یہ تجھے مل گئی میں نے کبر کھودی، پانچ روپے میرے حصے میں آ گئے۔ اور گجک — اور گجک — (ایک دم پاگلوں کی طرح ہنستے اور چیختے ہوئے) جنت او جنت تیرے ننھے کو گڑ کی گجک لا دوں۔ اس کے حصے کی گجک موٹر تلے آ گئی — ہاہاہا — (انگوٹھی اوپر اٹھا کر دیکھتا ہے اور پھر اسے زمین پر گرا کر باہر نکل جاتا ہے۔ جنت لالٹین لے کر دوڑتی ہے اور انگوٹھی اٹھا کر دیکھتی ہے۔ اس کے ہاتھ سے لالٹین گر جاتی ہے اسٹیج پر گھپ اندھیرا ہو جاتا ہے باہر سے بابا کے قہقہوں اور کتوں کے بھونکنے کی آواز آتی ہے۔ پھر سب مل کر روتے ہیں۔ اندھیرے بڑھیا اماں کے بین کی صاف صدا آتی ہے۔

اماں: ارے میرے لال — پردیس میں ہو، بولو تو جرا —!

(پردہ)

افسانہ:

کہی، ان کہی

دیوندر ستیارتھی

اس وقت میں آپ کو ایک واقعہ سنانے جا رہا ہوں۔ آپ چاہیں تو اسے ایک کہانی بھی سمجھ سکتے ہیں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا اب وہ گوٹے والا بابا میری یاد کی دہلیز پر اسی طرح کھڑا رہے گا۔ آپ بھی اس زندہ کردار کو خوب پہچان لیں، شاید کہیں اس سے آپ کی ملاقات ہو جائے۔ سر پر بھاری بھرکم پگڑی، کندھوں پر چادر، آنکھوں میں اداسی، چہرے پر کسی سے ملنے کا اشتیاق۔

میں نے اس کا نام نہ پوچھا، اس کا تو مجھے کوئی خاص افسوس نہیں۔

اس کا لہجہ بہت سہما ہوا تھا، پھر بھی معلوم ہوتا تھا کہ اب اسے اپنے سامنے ایک نیا مستقبل نظر آ رہا ہے۔ آجکل اسی طرح کے کردار مجھے پسند آتے ہیں، جن کے دائیں بائیں کھڑا ہو کر میں اپنے نظریے کا جائزہ لے سکوں۔

گوٹے والے بابا کو میں نے قد میں اپنے سے بہت بلند پایا۔ حالانکہ ہماری ملاقات پہلی ملاقات تھی اور وہ بھی نہایت مختصر۔ بجلی کی روشنی لاہور ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر چاندنی کی طرح بچھی ہوئی تھی۔ یقین کیجیے چودہ برس بعد لاہور کا یہ روپ دیکھنا مجھے میسر ہوا تھا۔ اور میں بہت خوش تھا۔ اپنی کلپنا میں مجھے دور تک دئیے ہی دئیے نظر آ رہے تھے جیسے پرانی یادوں کی گلیوں میں بزم چراغاں کا منظر پیش نظر ہو۔ سج جائے۔ وہ گوٹے والا بابا بھی کسی چراغ کی لو کی طرح لپک کر سامنے آ گیا۔

میرے ساتھ ایک صاحب تھے، جو کہانیاں لکھتے ہیں۔ اسٹیشن پر پہنچنے سے پہلے لاہور کے ایک کالج کی بزم ادب میں ہم اکٹھے ہوئے، جہاں ایک کہانی پڑھی گئی۔ وہ کہانی میری ہی لکھی ہوئی تھی۔ اور بحث کے دوران میں میں نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ اس کی تخلیق میں میں نے اپنی بڑھیا ساس کو سامنے رکھا تھا جس کی ذہنی الجھن یوں شروع ہوئی تھی کہ بیٹی کے گھر کا تو پانی بھی نہیں پیتے اور وہ ایک پاپن کی طرح سوا سال سے بیٹی کے گھر میں روٹیاں توڑ رہی ہے۔ بحث میں ایک صاحب بولے کہ ایسے کردار تو ہمارے معاشرے سے رخصت ہو چکے ہیں۔ اور اب نئی پود کے سننے اور پڑھنے والے اس طرح کی چیز سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ اور اس کے جواب میں میں نے صرف اتنا عرض کیا تھا کہ کسی بھی کہانی کا خاکہ ایک ایسی وحدت ہے جسے تخیل کی مدد کے بغیر مرتب کرنا ناممکن ہے۔ اور اگر یہ صحیح ہے کہ ایک کہانی کا وجود بھی ادراک آگہی کی سوگند کھاتا ہے تو پھر اسی ادراک آگہی کے بل بوتے پر آپ کسی کہانی کا جمالیاتی حظ حاصل کر سکتے ہیں۔ بزم ادب سے اٹھ کر ریلوے اسٹیشن پہنچنے تک ہم اسی بحث میں الجھے رہے کہ کیسے ایک کردار یا واقعہ کو لے کر کہانی کا تانا بانا بن ڈالتے ہیں اور پھر کیسے ہمارے کردار ہمارے ساتھ سانس لینے لگتے ہیں۔ اور جناب کچھ ایسی ہی ہماری ذہنی کیفیت تھی، جب گوٹے والے بابا سے ملاقات ہوئی۔

جیسے کسی جانے پہچانے رنگ نے مجھے آواز دے کر بلا لیا۔ اور مجھے یہ احساس ہوتے دیر نہ لگی کہ بلانے اور سننے والے میں سب دوریاں مٹ چکی ہیں ــــ اور لفظوں کو توڑے مروڑے بغیر ہی میں اس رات کی بات کہہ رہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ میرے اور میرے اور میرے دوست کے ذہن میں ان گنت احساسات رنے ہو گئے، جب گوٹے والے بابا سے ہماری ملاقات ہوئی۔

یہ پوچھنے کا تو سوال ہی نہ تھا کہ بابا تمہاری تعلیم کہاں تک ہوئی۔

نہ یہ دریافت کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ کیا کبھی ایسا بھی ہوا کہ تم نے مٹی میں ہاتھ ڈالا اور وہ سونا بن گئی۔

لمبا اونچا قد، پاؤں میں دیسی جوتی، گھنی بھرپور داڑھی، بڑی بڑی مونچھیں، خوش گفتار گوٹے والے بابا کی یہ باتیں تو اب ہمیشہ یاد رہیں گی ــ

جیسے کوئی گیت جاگ اٹھا۔ بابا کی پتلیاں پھیل گئیں۔ اور باتوں میں پھولوں کی باس نزدیک آ گئی۔

اس گوٹے والے بابا کی آنکھوں میں وہ جوت تھی، جو کسی سچے سچے دل کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔ یہ بات تو پہلی ہی نظر میں کھل گئی کہ گوٹے والے بابا کو غصّہ بالکل نہیں آتا ہوگا۔

ہم دونوں ایسے ملے جیسے دو پربت گلے ملیں۔ میں نے مڑ کر دیکھا میرا ساتھی بھی گوٹے والے بابا کی شخصیت کی چھاپ محسوس کر رہا تھا۔

اب سنیئے! قصہ یوں ہوا کہ میں نے دور سے دیکھا ایک بوڑھا میری طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ میں نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ سمجھانا چاہا۔ وہ جواب میں مسکرایا۔ لیکن میں نے مسکرانے کی چنداں ضرورت نہ سمجھی۔ اب وہ بوڑھا میرے قریب آ چلا تھا اس نے بازو پھیلائے۔ اب میں بھی جواب میں بازو پھیلائے بغیر نہ رہ سکا۔

اور پھر ہم گلے لگ کر ملے۔

میں نے کہا "کہیے کہاں سے آئے بابا؟"

"پٹیالے سے!"

میں دوبارہ بابا سے گلے لگ کر ملا۔ اور میں نے کہا "اچھا تو آپ پٹیالے سے آئے نا بابا! میرا گاؤں بھی تو کبھی پٹیالے میں ہی تھا۔"

"بچھڑے ساتھی مل ہی جاتے ہیں" اس نے ہولے سے کہا۔

اور مجھے محسوس ہوا کہ اس کی آواز بزمِ چراغاں بن اٹھی۔

میں نے پوچھا "یہاں کہاں رہتے ہو تم؟"

وہ بولا "سکھر میں"۔

"وہاں کیا کرتے ہو؟"

"رسیاں بانٹتا ہوں۔ اور خدا کے فضل سے روزگار میں فرق نہیں پڑا"

میں نے کہا "یہ تو بری بات نہیں، بابا! پیٹ لگا ہے تو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوتا ہے۔ اور محنت تو ضروری ہے"۔

بابا نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔

میرے ساتھی نے کہا "اب چلنا چاہیئے" میرے ساتھی کو جیسے اس وقت کسی کہانی کے کردار سے ملاقات کرنے میں ذرا بھی دلچسپی نہ ہو۔

مجھے خاموش پا کر میرے ساتھی نے کہا "تمہاری تو وہ بات ہے کہ چپک گئے تو بس چپک ہی گئے۔ اب گاڑی آنے میں دیر نہیں۔ بابا سے چھٹی لی جائے"۔

"تھوڑا رکو" کہتے ہوئے میں نے اپنے ساتھی سے آنکھوں ہی آنکھوں میں معذرت کی اور پھر میں نے بابا کے قریب ہو کر کہا:

"وہاں پٹیالے میں کیا کام کرتے تھے بابا؟"

بابا بولا۔ "وہاں اپنا گوٹے کا کام تھا۔"

"اور اب وہ گوٹا کیا ہوا؟" میں خاموش نہ رہ سکا۔

"وہ گوٹا تو وہیں رہ گیا!" اور پھر میں نے بابا کی آنکھوں میں قطرے کو گہر بنتے دیکھا۔

ظاہر تھا کہ یہ کوئی ایسا مصرعہ نہیں جس پر سینکڑوں ہزاروں لوگ نعرہ لگائیں۔ جواب میں میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن الفاظ نے میرا ساتھ نہ دیا۔

میں بابا سے گلے ملے بنا نہ رہ سکا۔

جناب میں اپنی بات خاموشی میں ہی کہہ پایا۔

میرے ساتھی نے کہا۔ "اب بابا سے اجازت لی جائے"۔

جونہی میں نے اپنی باہیں بابا کے گلے سے ہٹائیں، بابا نے مجھے اپنی باہوں میں کھینچ لیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ وہاں ایک نئی دوستی کا سورج طلوع ہو رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "ایسے منحوس دن بھی آتے ہیں بابا، جب کسی کا گوٹا چھن جاتا ہے لیکن ---"

معلوم ہوتا تھا، میرے الفاظ کہیں چھن گئے۔ میرا گلا بھر آیا۔

میں نے کچھ کہنے کے لئے زبان ہلائی لیکن الفاظ نے میرا ساتھ نہ دیا۔

میرے ساتھی نے کہا۔ "بابا! تم یہاں ٹھہرو، ہم لوٹ کر آتے ہیں"۔

"[illegible] گے نا؟" بابا نے آنسو بھری آنکھوں سے ہماری طرف دیکھا۔ رنگ گھٹا ہوا گندمی، یہ خالص پٹیالے والا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے اس گراموفون ریکارڈ کی یاد آ گئی جس کے آخر میں یہ آواز ابھرتی تھی "بھائی چھیلا، پٹیالے والا"۔ اور جب میں نے یہ بات اپنے ساتھی کو بتائی تھی اس نے اس کا یہ جواب دیا۔ "بھائی چھیلا" پٹیالے والا کا جواب نہیں۔ بھائی چھیلا پٹیالوی میں یہ رنگ پیدا نہ ہوتا"۔

میں نے بڑے غور سے بابا کے چہرے کے گندمی رنگ کا

جائزہ لیا۔ اور اس کے خالص پٹیالے والے لہجہ کو جھک کر سلام کیا، اور میں نے کہا: "بابا! ہمارے سامنے ایک نیا مستقبل ابھر رہا ہے!"

اور پھر اپنے ساتھی کی بات مان کر میں نے بابا سے سردست اجازت لی۔

"تو آپ لوٹ کر آ رہے ہیں نا!" گوٹے والے بابا نے پوچھ لیا۔

"ضرور" میرے منہ سے نکل گیا۔

پلیٹ فارم پر بدستور بجلی کی روشنی چاندنی کی طرح بچھی ہوئی تھی۔ پتہ چلا کہ گاڑی آنے میں ابھی بیس منٹ رہتے ہیں۔

چند لمحوں کے لئے ایک جگہ میرا ساتھی رکا پھر ایک بک اسٹال کی طرف گھوم گیا۔ مجھے یہ سوچ کر کوفت ہو رہی تھی کہ آخر بک اسٹال پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالنے کے لئے ہی میرا ساتھی بار بار تاکید کر رہا تھا کہ گوٹے والے بابا سے اب چھٹی لی جائے۔

بک اسٹال کے قریب کھڑے کھڑے میں سوچ رہا تھا کہ آخر گوٹے والے بابا نے کیسے یہ پتہ لگا لیا کہ میں بھی پٹیالے والا ہوں۔ آخر کیسے اس نے پتہ چلا لیا کہ میں بھی ایک بھٹکی ہوئی منزل کا مسافر ہوں۔

جناب مجھے بے حد کوفت ہو رہی تھی۔ اور میرا ساتھی یونہی بک اسٹال پر اچھے برے میگزینوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اور بار بار جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ گویا سوچنے لگتا کہ اومنی بس کے ٹکٹ کیلئے بچا کر رکھے ہوئے پیسے یہاں کیسے خرچ کئے جا سکتے ہیں۔

اس سرد ماحول میں میرے دل و دماغ ٹھٹھر رہے تھے۔ اور مجھے اپنے ساتھی پر بری طرح غصہ آ رہا تھا، جسے کہانیوں کے لئے نئے سے نیا موضوع تلاش کرنے کی ہمیشہ دھن رہتی تھی لیکن آج اس نے ایک زندہ کردار میں دلچسپی دکھانے میں بری طرح کنجوسی سے کام لیا تھا۔

میری آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی میرے دل و دماغ کی بے بسی سے گلے مل رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ اپنے ساتھی کا سنگ چھوڑ کر گوٹے والے بابا کے پاس چلا جاؤں اور اس سے کہوں کہ اب پچھلی باتیں یاد کرکے سسکتے رہنے سے تو کام نہیں چلے گا۔

ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر چاندی کی طرح بچھی ہوئی روشنی بھی یہی بات کہتی معلوم ہو رہی تھی کہ ہماری آنے والی خوشیوں کی باگ ڈور تو ہمارے اپنے ہاتھ میں رہنی چاہیئے۔

میں گوٹے والے بابا سے یہ بھی تو نہ پوچھ سکا کہ اس کے گھر والے کتنے آدمی ہیں۔ کم سے کم مجھے یہ تو پوچھ لینا چاہیئے تھا کہ کبھی ویزا لے کر پٹیالے کا وہ گوٹے والا بازار دیکھنے کا اس کا ارادہ کب دوستی کے گل بوٹے کاڑھے گا!

میں گوٹے والے بابا کے حضور میں جھک کر کہنا چاہتا تھا کہ انسان ابھی زندہ ہے اور دوستی کی بزم چراغاں کے لئے ہم انتظار کر سکتے ہیں، جب روٹھے ہوئے دل گلے مل کر کہیں گے — آؤ ہم چند باتوں میں مل کر چلنے کا تجربہ کریں۔

میرا ساتھی بک اسٹال کی دنیا میں گم اِدھر اُدھر ہاتھ بڑھا رہا تھا۔ اس کا دوسرا ہاتھ متواتر جیب میں پیسے گن رہا تھا۔

میں نے اس کا کندھا جھنجھوڑ کر کہا:

"یہاں کیا رکھا ہے؟ چلو گوٹے والے بابا سے دو باتیں اور کر لی جائیں۔"

"ارے یار تم بھی کیسے کہانیاں لکھنے ہو گئے؟" میرا ساتھی جھنجلایا "ارے بابا کے پاس جاؤ گے تو خود بھی بور ہو گے اور اسے بھی بور کرو گے۔"

"مطلب؟"

"مطلب یہی کہ کہانی کو پیاسی رہنے دو۔"

"تو دوبارہ گوٹے والے بابا کے پاس نہ چلا جائے؟"

"ہرگز نہیں۔"

"لیکن ہم اس سے وعدہ کر کے آئے ہیں۔"

"وعدے کی ایسی تیسی!"

میرا ساتھی بدستور بک اسٹال پر جھک گیا۔

میں بڑی الجھن میں تھا۔ میرے ساتھی نے میرے جذبات کا گلا گھونٹنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔

معلوم ہوتا تھا کہ پلیٹ فارم پر چاندنی کی طرح پھیلی ہوئی روشنی سے بھاپ اٹھ رہی ہے، بیچ بیچ میں میرا ساتھی میری طرف یوں دیکھنے لگتا جیسے وہ گھوڑے کا ساز کس رہا ہو۔ جیسے میں انسان نہ تھا، اس کے تانگے میں جتا ہوا گھوڑا تھا۔

اچانک اس نے بک اسٹال سے دور ہٹ جانے کا فیصلہ کیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دوسری طرف چل پڑا۔

میں نے کہا: "ہم ایک بار بابا کے پاس ہو آئیں۔ تاکہ وہ

ہمیں جھوٹا تو نہ سمجھے"

"وہ ہمیں جھوٹا سمجھے گا تو ہمارا کیا لے گا؟" میرے ساتھی نے ہنس کر کہا: "میاں کہانی کو پیاسی رہنے دو"

کاش میں ایک منہ زور گھوڑے کی طرح تانگے سے چھوٹ کر دوبارہ بوڑھے بابا کے سامنے جا کھڑا ہوتا لیکن میرا ساتھی تو میرے کندھے پر بازو رکھے زبردستی مجھے دوسری طرف لئے جا رہا تھا۔

پلیٹ فارم پر طرح طرح کے لوگ نظر آ رہے تھے۔ میں دوبارہ بوڑھے بابا کے پاس جا کر پوچھنا چاہتا تھا۔ بابا، تم یہ تو سمجھ گئے ہو یا نہیں کہ تمہارے ووٹ کی بہت قیمت ہے۔

بس اتنے میں گاڑی کے پہیوں کی دندناتی آواز ہمارے کانوں پر طبلہ سا بجانے لگی۔

میں چاہتا تھا کہ اپنے ساتھی کا ہاتھ چھڑا کر دوڑتا ہوا اس بوڑھے بابا کے پاس جا کر اسے ڈبے میں سوار کرانے میں مدد دوں۔ لیکن میری بھی تو ایک مشکل تھی۔

راولپنڈی کی طرف سے آنے والی اس گاڑی پر کراچی جانے والے ایک صاحب سے میرا ساتھی مجھے ملانے لایا تھا جس کی مدد سے کراچی میں میری رہائش کا انتظام ہو سکتا تھا۔

گاڑی ٹھیک وقت پر لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر آ کر رکی۔ میرا ساتھی مجھے اپنے دوست سے ملا کر یہ وعدہ لینے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ کراچی میں میری مدد کرے گا۔

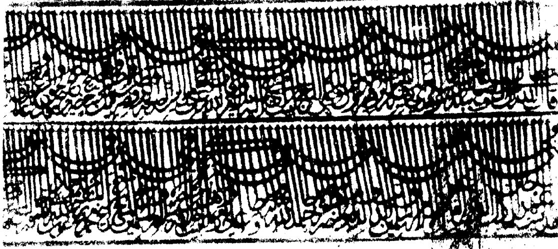
اس گھوڑے والے بوڑھے سے دوبارہ نہ مل سکنے کا مجھے بہت افسوس تھا۔ جب بھی مجھے کسی کردار کی ضرورت پڑی، میں نے اسے یاد کی دہلیز پر کھڑے پایا۔ اور زوار دوہ کہانی کے کردار کہیں بے موسم کے پھلوں کی طرح کسی مداری کے تھیلے سے تو نہیں نکلتے، سچ کو پھانسی نہ لگنے دو، پیارے!

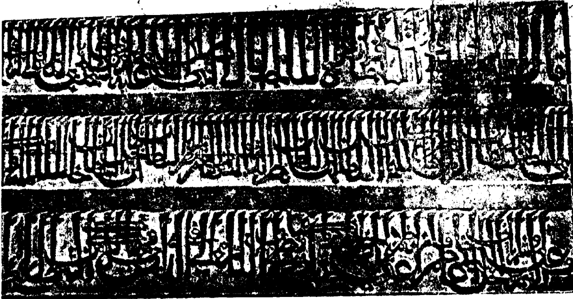
ہاں تو اب سنئے سارا قصہ، گاڑی چھوٹ چکی تھی۔ جونہی ہم دروازے کی طرف بڑھے یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی حد نہ رہی کہ گھوڑے والا بابا بدستور کھڑا ہمارا انتظار کر رہا ہے۔

ڈرامے کی فنی اور ادبی قدریں ـــــ بقیہ صفحہ ۱۲

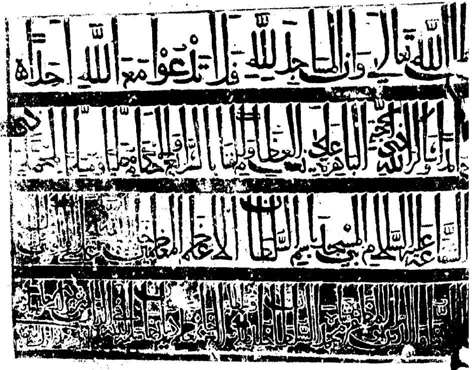
لائے اور اس کے ساتھ ساتھ "علامتوں" کو خیال کے وسیع تر اور عمیق تر اظہار کا وسیلہ بنایا اور یوں ایک بار پھر ڈرامے کی فنی اور ادبی قدروں میں صحیح توازن پیدا ہوا اور ڈرامے کو محض ایک فن سمجھنے کے بجائے اسے ادب سمجھنے کے رجحان کو محض ایک محدود اور مخصوص گروہ کا رجحان نہیں بلکہ پوری ادبی دنیا کا رجحان سمجھا جانے لگا۔ چیخوف نے گمترا اور ابسن نے ایک وسیع تر پیمانے پر حقیقت پسندی اور رمزیت کے لطیف اور مکمل امتزاج سے ڈرامے کو بھرپور ادبی حیثیت حاصل کرنے میں مدد دی ہے جو اس میں فطرتاً موجود تھی، لیکن فکر اور عمل کے غلط اندازوں نے اسے نظر سے پوشیدہ کر دیا تھا۔ اور اب ڈرامے کو جس طرح ایک خاص طرح کا فن سمجھا جاتا ہے اسی طرح ادب کی بھی ایک خاص صنف تصور کیا جاتا ہے۔ اسٹیج کے ڈرامے اور ادب کے ڈرامے کو دو الگ الگ چیزیں تصور کرنے کے بجائے بجا طور پر ایک ہی فنی حقیقت کے دو رُخ سمجھا گیا ہے جس کی ترتیب، تشکیل، تنظیم اور تعمیر ایسی قدروں کے امتزاج سے ہوئی ہے جن میں سے بعض کو ہم آسانی کے خیال سے "ڈرامے کی فنی قدریں" کہتے ہیں اور بعض کو "ادبی قدریں" ـــ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ بقول ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے "ڈرامے کو اسٹیج سے الگ کر کے محض ایک ادبی صنف کی حیثیت سے دیکھنا اور جانچنا بھی اتنا ہی غلط ہے جتنا یہ سمجھنا کہ ڈرامے کے لئے ادب ہونا ضروری نہیں"۔

★





مشرقی پاکستان میں خطاطی



۱- خط طغری (''تیر کمان'' کا اسلوب عہد مظفر شاہ ، پانڈوہ)

۲- نسخ (درگاہ شاہ جلال رح ، سلہٹ)

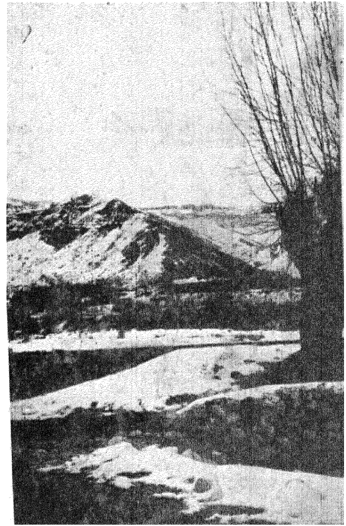
۳- ثلث (مسجع) (عہد سلطان ناصرالدین محمود شاہ ، اول)

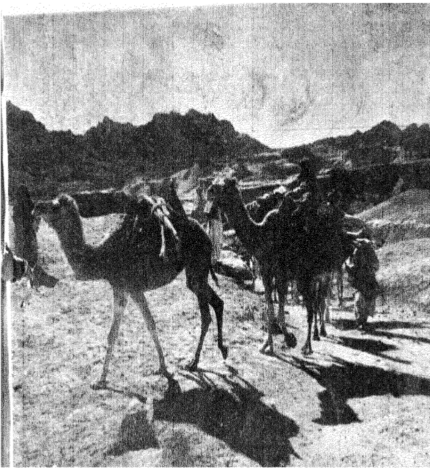
۴- ثلث (عہد محمود شاہ)

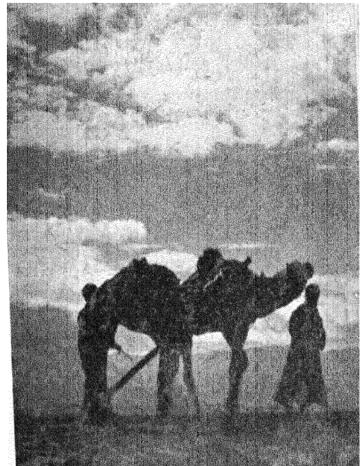
۵- کوفی : (محراب مسجد ادینہ ، پانڈوہ)











وادیٔ بولان

۱- پہاڑی گاؤں

۲- برفباری

۳- اونٹوں کے قافلے

۴- شام صحرا

"اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا"

ہم کو حسب ذیل تحریر اسیہ و نظمیں دستیاب ہوئی ہیں جن کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر شائع کی جاتی ہیں۔ (مدیر)

محمد حسین [illegible] ڈگری کالج بہاولپور
~~۱۲؍اکتوبر ۱۹۵۹ء~~
یکم نومبر

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان؛
محترم صدر گرامی قدر مدظلہ العالی؛
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

چند روز ہوئے میں اپنے والد مرحوم مولانا محمد [illegible] کی ایک بیاض مطالعہ کر رہا تھا چند اشعار پر میری نظر پڑی جو مرحوم نے ۳۰ مئی ۱۹۵۰ء کو آنجناب کو مخاطب کر کے کہے۔ یہ دیکھ کر مجھے بے انتہا حیرت ہوئی کہ محترم والد مرحوم نے مارشل لاء کے نفاذ سے قریباً ایک سال چار ماہ قبل عجیب انداز سے آنجناب کی توجہ کو ملک و قوم کی بہبودی کی طرف مبذول کیا تھا۔ میں وہ اشعار اسی عریضہ کے ساتھ جناب والا کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ کارپردازانِ قدر و قضا کی جانب سے کتنا عرصہ پہلے آنجناب کو [illegible] کی سعادت تفویض ہو چکی تھی اور محترم والد مرحوم کے یہ اشعار گویا ایک پیشگوئی تھی جو اب تک حجاب اندر حجاب قرطاسِ بیاض میں مستور رہی۔ اور قبلہ والد صاحب کی وفات کے قریباً ۲ سال ۱۰ ماہ بعد حرف بحرف صادق آئی۔

مجھے بہت خوشی ہے کہ میں جناب والا کو اس سعادت پر جو [illegible] خداوند بخشندہ کی عنایت ہے آج پھر ایک دفعہ صمیمِ قلب سے مبارکباد پیش کروں۔ مجھ جیسے بے بضاعت اور پُر تقصیر انسان کی بھی دعا ہے کہ مالک حقیقی جناب والا کا سایہ پاکستان اور ہم پاکستانیوں پر اس وقت تک قائم رکھے جب تک [illegible] جناب والا پاکستان میں [illegible] حکومت [illegible] قائم کر سکیں [illegible] قوم صحیح معنوں میں [illegible] نام

خیر اندیش: احقر
(محمد حسین عفی عنہ)

جناب والا کو فیلڈ مارشل کا عہدہ قبول فرمانے پر یہ خاکسار تہہ دل سے ہدیۂ تبریک پیش کرنے کا فخر حاصل کرتا ہے

احقر (محمد حسین)

حضورِ ربّ العزّت

اے مالکِ ارض و سما تو نے جب ملک کیا ہے ہم کو عطا
طارق سا امیر البحر بھی دے خالد سا سپہ سالار بھی دے
پھر علم و عَلم اور تیغ و قلم میں رابطۂ باہم ہو عطا
ہو بدر کا سودا ہر سر میں ہو دل کو وہی ایثار بھی دے
دل میں ہو سپاہی کے جو تڑپ دربار میں بھی ہو اس کی جھلک
پھر ولولۂ افکار بھی دے، پھر غلغلۂ کردار بھی دے

گیرم بدل لشکر تو گرمیٔ خون است — دانی کہ سراسیمگیٔ ملک چگون است
ہم خوف برون است ہم آفات درون است — با دست و زبان خیز بدل خیز و بجان خیز
از خوابِ گران خواب گران خواب گران خیز
از خواب گران خیز

برخلق عیاں کن کہ منم مالک و مختار — برخلق عیاں کن کہ منم مخزنِ اسرار
برخلق عیاں کن کہ منم نائبِ سرکار — اے خفتہ سبک خیز و چو طوفان گران خیز
از خواب گراں خواب گران خواب گران خیز
از خواب گران خیز

اسرارِ نہاں چیست تو میدانی و ہم من — یا سود و زیاں چیست تو میدانی و ہم من
غم چیست اماں چیست تو میدانی و ہم من — سالار! چو طوفانِ سرِ فوج گران خیز
از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز
از خوابِ گران خیز

برخیز کہ تو جلوۂ خورشیدِ جمالی[1] — برخیز کہ تو جوہرِ شمشیرِ کمالی[2]
برخیز کہ تو قائدِ افواجِ ھلالی — با ہمتِ مردانہ و اسرارِ نہاں خیز
از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز

[1] جمال الدین افغانی [2] کمال اتاترک

بتانِ وہم وگماں

یوسف ظفر

وقت کی خاک میں صدیوں کی صدائے فردا
بت بنی اپنے تبسم کے سکوں میں گم تھی
مردہ لمحات کے تابوت میں اک عمر یہ بت
اپنے خالق کی تمنا کے تراشیدہ صنم
خاک میں خاک ہوئے مدت سے ہمدوش رہے
موت صدیوں کے جنازوں پہ کھڑی سوچتی تھی
کون اِن لاشوں کا اندازِ نظر جانے گا!
کون اِن بگڑے ہوئے چہروں کو پہچانے گا!!

ٹیکسلا! تیرے دفینوں میں بہت کچھ ہوگا
وقت کی ہنستی ہوئی گاتی ہوئی تصویریں
تیری آغوش میں ہیں، تیری فسانہ خواں ہیں،
مردہ ماضی کا صنم خانہ ہے پیکر تیرا،
تیرے سینے کے یہ ارمان، یہ پتھر کے صنم
کتنی تہذیبوں کی میراث ہیں، سرمایہ ہیں،
موت کی مٹی کے اُگلے ہوئے ہر بت کی نظر
چیخ کر اپنے زمانے کی خبر دیتی ہے
دیکھنے والے کو اک اور نظر دیتی ہے

میں نے دیکھے ہیں وہ بت راہوں پہ چلتے پھرتے
جن کے سینے بھی صنم خانے ہیں، جن کے ارماں
اُن کے چہروں کی لکیروں میں نظر آتے ہیں،
ہر کوئی ٹیکسلا ہے، اپنے بتوں کا مندر،
میرا سینہ بھی دفینہ ہے تمناؤں کا
لیکن اس دور میں ہم لوگ یہی چاہتے ہیں
اجنبی نظروں پہ یہ راز عیاں ہونے نہ دیں
دل کو ہم خون کریں سنگِ گراں ہونے نہ دیں

ٹیکسلا! تیرے صنم خانے میں کیا کچھ ہوگا!
لیکن اک چہرہ مری روح سے کچھ کہتا ہے
اس کو میں دیکھنے لگتا ہوں تو چپ رہتا ہے
اس کے چہرے پہ سکونِ دلِ آسودہ ہے
اس کی پیشانی پہ ہیں ثبت محبت کے نقوش
اس کی آنکھوں سے ازل اور ابد جھانکتے ہیں
اور ہونٹوں پہ وہ نوخیز تبسم کی لکیر
جو خدا دے تو دو عالم کو خوشی مل جائے
گلِ آدم کو بتِ سنگ کی ہستی مل جائے

اے بتِ سنگ! اگر تو بھی ہے اک خوابِ سکوں
تیرے خالق نے تجھے اپنی تمنا جانا
اس کی مایوس نگاہی نے تراشا تجھ کو
اس نے پایا تجھے امیدوں کے گورستاں میں
اس کی حسرت نے ترے رخ کو تبسم بخشا
تو مری روح کو مت چھیڑ کہ مجبور ہیں ہم
اپنے خالق کی تمنا کے تراشیدہ صنم



غزل

سراج الدین ظفر

شوقِ راتوں کو ہے در پے کہ طپاں ہو جاؤں
رقصِ وحشت میں اٹھوں اور دھواں ہو جاؤں

کھو تجھے دوں تو پسِ قافلۂ شام و سحر
اک بھٹکتی ہوئی آوازِ فغاں ہو جاؤں

اب یہ احساس کا عالم ہے کہ شاید کسی رات
نفسِ سرد سے بھی شعلہ بجاں ہو جاؤں

لبِ معجز نفساں کی ہو اگر بخششِ خاص
ناگہاں نے کی طرح زمزمہ خواں ہو جاؤں

لا صراحی کہ کروں وہم و گماں غرقِ شراب
اس سے پہلے کہ میں خود وہم و گماں ہو جاؤں

میں نہیں خضر کہ بس زہد و اطاعت کے لئے
وقت کے دوش پہ اک کوہِ گراں ہو جاؤں

مجھ کو پیری ہے جو منظور تو اس شرط کے ساتھ
صبح کو پیر تو راتوں کو جواں ہو جاؤں

وہ تماشا ہوں ہزاروں مرے آئینے ہیں
ایک آئینے سے مشکل ہے عیاں ہو جاؤں

یوں جلائے تپشِ سینہ و رخسارِ بتاں
سرمۂ دیدۂ صاحب نظراں ہو جاؤں

بوئے مے آئے گی انفاس سے ورنہ میں تو
حلقۂ زہد کی بھی روحِ رواں ہو جاؤں

ہاتھ اُس زلف سے ہیں دور مگر کیا معلوم
کس گھڑی بے خبرِ سود و زیاں ہو جاؤں

شوق کا جب کسی صورت نہ ادا ہو مفہوم
دہن عین خموشی میں زباں ہو جاؤں

اس طرح تیز ہو اے گردشِ پیمانہ کہ میں
سینۂ گردشِ دوراں میں سناں ہو جاؤں

ایسی چھلکا کوئی اے پیرِ خرابات نشیں
صبح تک واقفِ اسرارِ بتاں ہو جاؤں

ہیں ترے بندِ قبا سے کہ ہے بے شرح و بیاں
الجھوں اس طرح کہ بے شرح و بیاں ہو جاؤں

غرق ہو کر بھی ہے برحق ابدیت میری
پھر نہ ابھروں جو زماں سے تو زماں ہو جاؤں

ایسا اندازِ غزل ہو کہ زمانے میں ظفرؔ
دورِ آئندہ کی قدروں کا نشاں ہو جاؤں



غزل

اختر احسن

راتیں دیدۂ تر سے پہلے راتیں دیدۂ تر کے بعد
منزلیں مجھ سے دور رہتی ہیں میرے سیر و سفر کے بعد

ایک کرن بھی درد کی سرخی توڑ کے دل تک آ نہ سکی
دل میں کوئی رنگ نہ جاگا رنگ شام و سحر کے بعد

دید کا دروازہ نہ کھلا صحرا کی پھیلی وسعت پر
وحشت سایۂ در سے پہلے، وحشت سایۂ در کے بعد

دشت ہے وہ ویرانی کا، شب کو دیس نکالا ہے
نام نہ لوں گا ریگِ رواں کا منظرِ ریگِ سحر کے بعد

یاد کا اک تارا بھی نہیں جو شامِ اُفق پر آن بسے
دھول سی بن کر اُڑ گئی شامیں رحلتِ شمس و قمر کے بعد

چار طرف اب ویرانی کا پانی تنہا بہتا ہے
درد میں گھل کر بہہ گئی راہیں قتلِ شام و سحر کے بعد

نالۂ دل جب بیچ میں اُٹھا نالۂ شب بھی ماند ہوا
رات ستارے لے کر بھاگی درد کے اس منظر کے بعد

کوئی ثمر اس دل پہ نہ آیا شاخ کے ایک ثمر کے بعد
آنکھ کو کوئی پھول نہ بھایا دل کے غنچۂ تر کے بعد

کوئی بھی پیاری شکل نہ دیکھی دل کی پیاری شکل کے بعد
کوئی صورت دل میں نہ جاگی صورتِ غنچۂ تر کے بعد

دل سے گئے پر ایک اُداسی شام و سحر میں چھوڑ گئے
خامشیوں کی خاک جمی ہے شورشِ شمس و قمر کے بعد

پھول ہنسے تھے لیکن اب دل مدت سے ہے بھول چکا
ہاتھ قلم ہیں شاخوں کے اس قتلِ لعل و گہر کے بعد

آب و ہوا میں خاک کی آخر خاک ہی ہو کر بیٹھ رہا
کوئی الفت دل کو نہ بھائی الفتِ لعل و گہر کے بعد

کیا کیا جھوٹ تھے نور سے بن کر منزلِ دل میں آ کے رہے
نالۂ حسرت دل میں جاگا لمحہ بھر کے بعد

شاخ شاخ پہ پھول کھلے ہیں صورتِ غنچۂ تر کے بعد
نخلِ دل بھی رقص میں آیا رقصِ تیغ و تبر کے بعد

ایک گرج سی بن کے اُڑی ہے رات کی پھیلی تنہائی
پُر زے پُر زے خامشیاں ہیں یورشِ شمس و قمر کے بعد

سیلِ نور نے آن دبوچا خاک کو گھول کے پی ہی گیا
نور کا اک طوفان اُٹھا ہے قتلِ لعل و گہر کے بعد

رات کہانی بن کر آئی دن بن کر اک افسانہ
رنگ میں سارے منظر بھیگے منظرِ شام و سحر کے بعد

صبح نئی اک آن کے پھر سے آئینۂ دل میں اُتری
کیا کیا پھیلے منظر جاگے وحشتِ دیدۂ تر کے بعد

کونہ کونہ صحراؤں کا نقشِ قدم سے آگ ہوا
چار طرف اک گلشن دہکا میرے سیر و سفر کے بعد

اک اک شاخ پہ ایک عجب سی صورت آن کے بیٹھ گئی
باغ تھا حیرانی کا عالم میرے ذوقِ نظر کے بعد

فن:

ہمارے عوامی رقص

شفیق بریلوی

مجھے ذوقِ تماشا اکثر کہیں نہ کہیں لے ہی جاتا ہے — جہاں سانولی سلونی شامیں فن کی گوناگوں جلوہ آرائیوں سے جگمگ جگمگ کرتی ہیں اور بھیگی ہوئی سرشار راتیں رقص و نغمہ کی سحرکاریوں سے "جنت نگاہ یہ فردوس گوش ہے" کا سماں پیدا کرتی ہیں۔ چنانچہ صدر آئزن ہاور اور ان کے ہمراہ آنے والے امریکی مہمانوں کے اعزاز میں جن تفریحی پروگراموں کا اہتمام کیا گیا تھا، میں بھی ان میں شریک تھا۔ بزم حرب جہاں کبھی ہو بزم طرب ہے۔ اور پھر ہوٹل میٹروپول کی مدہوش کن سراپا بہار فضا میں۔ ان نغمہ ہائے دلنشیں اور رقص ہائے دلنواز نے بے اختیار پاکستان کے گوشے گوشے کی یاد تازہ کردی۔ خواہ وہ مشرقی پاکستان ہو جہاں ہم چاروں طرف خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں یا مغربی پاکستان جس کے کوہسار، میدان، ریگ زار سب ایک انوکھی، ایک دلآویز فضا لئے ہوئے ہیں۔

ہمارے عوامی ناچوں کی یہی بات مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔ جیسے زندگی خود رقص کے سانچے میں ڈھل گئی ہو۔ جیسے ہر مقام کے باشندوں کی روح نے ایک نرالی وضع اختیار کرلی ہو۔ جیسے دھرتی خود جی اٹھی ہو اور ایک عجیب شان دلربائی کے ساتھ انگڑائیاں لے۔ اور اس کا انگ انگ، اس کی ہر ادا، ہر حرکت دل کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ ان رقصوں کی دلآویزی اور فنی نفاست اپنی جگہ پر ہے۔ لیکن ان کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے۔ سچائی، تازگی اور قدرتی وضع۔

دلبری بے قاہری جادوگری است — یہ ایک حقیقت ہے۔ اسی طرح دلبری با قاہری پیغمبری است۔ اور اس کا بین ثبوت سرحد کا سنگلاخ ماحول ہے۔ یہ سرحد کی چٹانوں کے فرزند جن کی رگ رگ میں ایک بہادر اور جنگجو قوم کا خون گرم موجزن ہے۔ یہ لوگ صدہا سال سے رزم و پیکار کے دھنی ہیں۔ اور ان کے لئے شمشیر و سناں ہی زندگی ہیں۔ اگر یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اس روح اور اس زندگی کی عکاسی خٹک، لختہ اور رتنی سے بہتر اور کیا کرے گا؟ یہ رقاص نہیں سرحد کے جیالے، جنگجو، شمشیرزن ہیں۔ اور ان کا والہانہ رقص تیزی سے گھومنے، اعضا کے پُرزور جھٹکوں، ولولہ و جوش کا ایسا پُرجلال مظاہرہ ہے۔ جس میں قاہری ہی قاہری ہے — جس سے نرم رگ انسان دہم ہوجاتے ہیں۔ اور بزمیہ وضع کے تفریحی مشاغل کے شوقینوں کے دل دہل جاتے ہیں۔ یہ قاہرانہ دھمال ایک ایسا قوی اور پُرزور اثر دکھاتا ہے جو ناظر کے دل و دماغ پر مدت العمر چھایا رہتا ہے۔ خٹک ناچ کی حرکات تمام تر زندگی ہیں۔ اور ان میں خالصتاً اجتماعی روح کارفرما ہے۔ کیونکہ ڈھول کی گرجتی کڑکتی آواز، رقاصوں کے پاؤں کی دھمک ہی سے نہیں دھڑکتے دلوں کی شورش سے بھی ہم آہنگ ہوتی ہے — اور ڈھول کی سنگت رقص و مستی کی شان اور اٹھان کو دوبالا کرتی ہے۔

خٹک اور لختہ، زندہ دلان سرحد کی قومی شجاعت کا بھرپور عکس ہیں اور یہاں کے گرم خون نوجوانوں کے پسندیدہ اور محبوب ناچ ہیں جن میں رزم کا پہلو زیادہ نمایاں ہے تو رتنی رزم و بزم اور مردانگی و نسائیت کا ایک لطیف مجموعہ ہے۔ کیونکہ اسے مرد اور عورتیں مل کر ناچتے ہیں۔ اور گو اس میں بھی ورزش کا انداز پایا جاتا ہے۔ پھر بھی صنف نازک کا لطیف پرتو جلال کو جمال سے نرم و سبک، لوچدار اور نشیلا بنا دیتا ہے۔

بلوچستان — یہ جری بلوچوں، قسترانوں، چرواہوں، جفاکش دہقانوں کا مسکن جن کی زندگی پہاڑوں، ریگستانوں اور وادیوں ہی کی زندگی ہے — سرحد سے دور نہیں اور نہ اس سے کچھ مختلف ہے۔ اس لئے یہاں کے لوگ ناچ بھی سرحد کے مردانہ لوک ناچوں کے ہم وضع بھی ہیں اور حریف بھی۔ لہٰذا یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ وہ لوگ جن کے متعلق حکیم ملت علامہ اقبال نے فرمایا تھا کہ — ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا — ان کے عوامی رقصوں

میں ان کی پوری زندگی جھلکتی ہے۔

اور وہ پنجاب انتخاب ہفت کشور — اس کے جیالے جاٹ، بلند ہمت اور بلند قامت کسان، شیشم اور دھریک (شاہ بلوط) کے پیڑوں کی طرح فضا میں ابھرتے ہوئے۔ اور انہی کے ساتھ وہ سرو ہی کی طرح بلند اور خوبصورت جاٹنیاں اور مٹیاریں ان کا رقص بے تحاشا گھومتا ہوا قاہرانہ رقص نہیں۔ بلکہ اچھلتا کودتا ہوا چونچال رقص ہے۔ متوازی اور حلقہ وار نہیں بلکہ عمودی۔ جب پری وشوں کا کوئی جھرمٹ دن کے بھولے اجالے یا رات کی سحرکن سیمیائی چاندنی میں حلقہ باندھ کر یہ ناچ ناچتا ہے تو بھی گھومنے سے زیادہ یہی اچھلنے کودنے کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ جیسے کوئی اپنی توانائی کی شدت سے اچھل کر ہوا میں نکل جانا چاہے۔ جیسے یہ کسی دلی خوشی کی لہر یا فتح و کامرانی کے تحرک انگیز جذبہ کا نتیجہ ہو۔ اب وہ پری وش ایک ہو یا البیلی پری وشوں کی مست ٹولی، وہ اپنی گھریلو زندگی اور باہر کھلے کھیتوں کی زندگی ہی کی عکاسی کرتی ہے — شاید یہی باتیں تھیں جن سے لعبتانِ چین کا وہ طائفہ جو کچھ عرصہ ہوا ہمارے یہاں آیا تھا مسحور ہوا اور اس کی نظرِ انتخاب اسی چلبلے، بہت ہی چلبلے ناچ پر پڑی۔ ناچنے والیاں بانہوں کو لہراتی، بڑی ہی مستی و بیخودی کے عالم میں ناچتی ہیں۔ کبھی کبھی تو ناچتے ناچتے صبح سے شام اور شام سے صبح ہو جاتی ہے کوئی منچلا نوجوان شیخ سعدی کی اس تعلیم کے برعکس کہ اے مرداں بکوشید — تا جامۂ زناں نپوشید — بڑی بے باکی سے عورتوں کا لباس پہن لیتا ہے۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے رومانوں کی اس سرزمین کو دیکھنے ایک بار پھر آسمان سے ہیر اتر آئی ہو اور پھر نہ جانے کتنے رانجھے اس کے گرد منڈلانے لگتے ہیں۔

بھنگڑا — جاٹوں کے اس مقبول ناچ کی آن بان ہی کچھ اور ہے۔ جہاں گیہوں کی بالیاں گدرائیں اور پیلی ہو ہو کر لہرانے لگیں، دیہات کے لوگ خوشی سے مست بلکہ بدمست ہو کر بے اختیار بھنگڑا ناچنے لگتے ہیں۔ اُف اس کی بے پناہ دھمک اور ہڑبونگ کا سا عالم! اور جب شورش و مستی اس قدر عام ہو جائے تو پھر بوڑھوں جوانوں کا امتیاز کیا۔ سبھی ایک ہی موج میلے میں ڈوب جاتے ہیں۔ ایک شخص گلے میں ڈھول ڈالے اس کو زور شور سے بجاتا رہتا ہے اور ناچنے والے رنگیں لنگیوں اور لانبے لانبے کرتوں میں ملبوس اس کے گرد حلقہ سا بنا کر ڈھول کی تال پر قدم اٹھاتے، تالیاں بجاتے گھنٹوں ناچتے رہتے ہیں۔

جھمر ہو یا جھومر بات تو ایک ہی ہے۔ اس میں جھوم جھوم کر لہرانے کی سی ادا ہے۔ وہی سوز، وہی نرمی، وہی لوچ اور بانکپن جو سابقہ مغربی پنجاب یعنی ملتان اور بہاولپور وغیرہ کے علاقوں میں ہے۔ اور لہندا اور مرکزی علاقہ میں فرق پیدا کرتا ہے۔ نوجوان ڈھول پر جھومر کی تال سن کر مدہوشی کے سے عالم میں اس کے گرد ناچتے ہیں۔ جیسے فانوس کی گردش کرتی ہوئی شکلیں اندر جلتی ہوئی شمع کے گرد۔ اور اگر مردوں کی جگہ یہاں کی البیلی لانبی لانبی ڈھیلے ڈھالے لباس والی جادوگرنیاں ہوں تو پھر کیا کہنے۔

سمّی، گدّا اور کلکلی — ان ناموں ہی میں شوخی و شرارت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی۔ سمّی یا سماع شاید ایک ہی چیز کے دو روپ ہوں۔ اس دیہاتی ناچ کا سلسلہ ملتان اور سندھ سے ہوتا ہوا شاید عرب تک پہنچ جاتا ہو۔ سمّی کیا ہے؟ نوجوان البیلی دیہاتی لڑکیوں کا ناچ جب ان کے ولولے اور امنگیں چند گھنٹوں کے لئے سماج کی چادر ہٹا کر سامنے آجاتے ہیں۔ اور اُن کے چہرے ایک دلی خوشی کی لہر سے کھل اٹھتے ہیں۔ اس ناچ میں جب لڑکیاں مٹکتی تھرکتی، آنچل لہراتی، چوڑیاں اور پازیب بجاتی مستی کے عالم میں کھوئی ہوتی ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس سمّی یا سہیلی کی یاد میں یہ ناچ ناچا جا رہا ہے وہ ابھی کہیں سے نکل کر آجائے گی اور ان مہ جبینوں میں شامل ہو کر ناچنے لگے گی۔

گدّا یعنی تالی — یہ بھی دلی ترنگ اور کیف و مستی کی ایک پُرلطف علامت ہے۔ اس میں لڑکیاں تو لڑکیاں بچے اور لڑکے بھی شامل ہوتے ہیں۔ جب اس ناچ کا سماں بندھتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے ستارے آسمان سے ٹوٹ کر زمین پر آ کر مچل کھیل رہے ہیں۔

کلکلی کلیر کی — یہ ہیں ایک پنجابی لوک گیت کے الفاظ جیسے کوئی کلی چٹک رہی ہو یا طبیعت میں گدگدی ہو۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کا چست اچھلتا کودتا ناچ، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے تیزی سے اچھلتی کودتی گاتی گلہریاں۔ جہاں "کلکلی کلیر دی" کے الفاظ زبان پر آتے ہی آنکھوں کے سامنے ایک روشن ہالا اور رنگینیاں ہی رنگینیاں ابھر آتی ہیں۔

وہ محفل رنگا رنگ جس کا شروع ہی میں ذکر کیا گیا ہے، سندھی دیہات کا شوخ اور نظر فریب رنگ بھی دامن میں لئے ہوئے تھا۔ رقص اور گیت دونوں کا موضوع وہی عورت کے دل کا ازلی و ابدی موضوع تھا۔ اپنے پیارے محبوب، اپنے سائیں کی آمد پر بے اندازہ خوشی اور مسرت کا اظہار گیت کے بولوں میں سندھی اور پنجابی زبانوں اور روحوں کے ڈانڈے آپس میں ملتے نظر آتے ہیں اور عجیب کیف پیدا کرتے ہیں۔

کشمیر کو کہنے والوں نے "ایران صغیر" کہا ہے۔ اور یہ بالکل صحیح ہے۔ اہل کشمیر کی کاریگری اور نفاست ذوق سے کون انکار کر سکتا ہے اور پھر یہ سرزمین جہانگیر، نورجہاں اور شاہ جہاں کا بھی چہیتا دیس رہا ہے۔ اس لئے یہاں کے لوک ناچوں میں ایرانی طرز اور مغلیہ مذاق دونوں کا گہرا رچاؤ نظر آئے تو کچھ عجب نہیں۔ ان میں صوفیانہ کلام اور حافظ بہت مشہور ہیں۔ اس کے برعکس بچہ نغمہ ٹھیٹ کشمیری چیز ہے۔ جو شہنائی اور ڈھولک کے ساتھ ناچا جاتا ہے۔ اور دیہات کے لوگوں میں کافی مقبول ہے۔ فصل کاٹنے کے بعد جگہ جگہ اسی خالص کشمیر زادہ ناچ کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں۔ رؤف کشمیری عورتوں کا ناچ ہے اور تہواروں کے موقع پر یا فصل کی کٹائی کے زمانے میں اس کا خوب رنگ جمتا ہے۔

مشرقی پاکستان کی ہری بھری فضا حسب موقع اپنے آغوش میں بسنے والوں کا دل جیت لیا کیا کیف و مستی نہیں پیدا کرتی۔ سیلی سیلی ہری ہری دھرتی پھڑکتے پاؤں اور جھومتے لہراتے بدن کبھی زیر کان اور کبھی ایک پرفسوں رقص اور کبھی دوسرے کی مست کن صورتیں اختیار کرتے ہیں اور اپنے انوکھے حسن سے دل کو لبھاتے ہیں۔

کھیتوں اور کھلیانوں کے ناچ جیسے مغربی پاکستان میں ہیں ویسے ہی مشرقی پاکستان میں بھی ہیں اور سچ پوچھئے تو یہ ان کا برجستہ جواب ہیں۔ اس لئے کہ دونوں کے لوگ ایک، ان کی روح ایک، ان کے احساسات ایک ہیں۔ فصل کی کٹائی کے موقع پر ان ناچوں سے عجیب گہما گہمی پیدا ہو جاتی ہے اور خود دھرتی بھی پاؤں کی دھمک سے تھرکنے لگتی ہے جیسے ان کا ازل ہی سے سنگ ساتھ ہو۔ نوجوان عورتیں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر دائرہ سا بنا لیتی ہیں اور اپنے سالونے سلونے جسموں کو ہر سمت حرکت دیتی ہیں۔ مرد پکھراج کی قسم کے انوکھے انوکھے ہلکے پھلکے ڈھول لئے جنہیں "کھول" کہتے ہیں، بجاتے اور پھر ایک لند منش شاعر کے الفاظ میں۔

چوڑیاں بجتی ہیں چھاگل کی صدا آتی ہے۔ جب تال اور ناچ کی سنگت انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو ناچ میں حصہ لینے والے ہوں یا دیکھنے والے، سبھی محسوس کرتے ہیں گویا پوری کائنات گھوم رہی ہے، ناچ رہی ہے۔ اور یہی تو ہے وہ دیار حسن لسنغہ جس کی سحر آفرینی اپنے رنگین و طرحدار رقص میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ ہماری باکمال رقاصاؤں نے اسے بھی ہزاروں میل کی حدیں پار کر کے اسے ہماری نگاہوں کے سامنے لا کھڑا کیا۔ یہاں کے رقص کا سب سے جاذب نظر پہلو مہ پارہ حسیناؤں کا عجیب و غریب لباس ہے۔ ریشمی سایوں کی تیاری میں کچھ ایسی حکمت برتی جاتی ہے جیسے وہ خوب پھیلے ہوئے فانوس ہوں یا جیسے برقی قمقموں کا بہت ہی نفیس مومی وضع کا پلاسٹک شیڈ۔ اس پھیلے ہوئے زریں لباس سے رقاصاؤں کے ابھرتے ہوئے سرخ و سفید جسم ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کتنی ہی روشن شمعیں پردۂ فانوس سے باہر نکل کر دیکھنے والوں کی نگاہوں کو مسحور کر رہی ہوں اسی لئے ان کا کیف دیکھنے کے بعد مدت تک دل و دماغ میں رسا بسا رہتا ہے۔

اسی صحبت کی ایک اور دلآویز یاد ــــ "اپوا" کی ہنر دوست خواتین کی طرف سے غالب کے اس شاندار قطعہ کی ڈرامائی پیشکش جو زندگی کے ہنگاموں اور عیش و طرب کی محفلوں کی ایک زندۂ جاوید تمثیل ہے ؎

اے تازہ واردان بساط ہوائے دل ٭ میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے

اگرچہ یہ بظاہر عوامی رقصوں کے ذیل میں نہیں آتا لیکن یہ تھا تو پاکستانی فن کاروں ہی کی بالکل نئی نوعیت پیشکش۔ غزل کہاں اور ڈراما کہاں، یہ تو خلوت کو جلوت میں لانے کی بات ہے لیکن ان نسائی فن کاروں کی داد دینی چاہئے کہ وہ واقعی خلوت کو جلوت میں لے آئیں اور گو ان کی پیشکش میں ڈرامائی حرکت نہ پیدا ہو سکی اور نہ ہو سکتی ہے پھر بھی یہ اپنی جگہ ایک کیفیت ایک ندرت کی حامل تھی۔ اور اس بزم نشاط کا ایک بہت ہی موزوں و مناسب تکملہ مرزا غالب اپنے نورانی چہرے اور سفید براق داڑھی کے ساتھ سراسر نمونۂ عبرت۔ وہ کم سن "نصیحت نیوش" سب کے سب چپ، مہر بلب۔ پس منظر یہ موسیقی اس کیفیت کو پوری طرح نمایاں کرتی ہوئی۔ اور حرف حرف سننے والوں کے دل میں اترتا ہوا جب ساقی نوخیز صراحی لئے بزم میں آتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے شرح مے خانہ فضا میں تیر گئی۔ اور لطف خرام ساقی پر واقعی جنت نگاہ اور صدائے چنگ پر نوبہو نوائے سروش کا گمان ہوتا ہے۔ دامان باغبان و کف گلفروش کا جو نقشہ اس چھوٹی سی محفل میں نظر آیا وہ بہت ہی پر لطف رہا۔ اور وہ آخری سین جو سارے قطعہ اور ساری تمثیل کی روح ہے۔ شمع جو جلتے جلتے، گھلتے گھلتے آخر روپوش ہو جاتی ہے اور گرد و پیش پھیلے ہوئے اندھیرے کو اور بھی تاریک اور سناٹے کو اور بھی گہرا بنا کر دل پر ایک گہرا نقش چھوڑ جاتی ہے۔ یہ ساری پیشکش کچھ ایک کبھی نہ بھولنے والی کیفیت عطا کر دیتی ہے۔ اور رقص و فن کے حلقۂ رنگین کے تمام نقطے ہمیشہ کے لئے آپس میں مل کر حلقۂ سحر کی شکل اختیار کر لیتے ہیں ٭

نبود وفائے عہد دمے خوش غنیمت ست
از شاہداں بنازش عہد وفا برقص
ذوقیست جستجو چہ زنی دم ز قطع راہ
رفتار گم کن و بصدائے درا برقص
در عشق انبساط بپایاں نمی رسد
چوں گرد باد خاک شود در ہوا برقص

(غالب)

رپورتاژ:

فتح باغ کے ویرانوں میں

عارف حجازی

دوپہر کے گہرے سناٹے میں ویران، اُداس ٹیلوں پر جیسے موت کی دہشتناک پرچھائیاں چل پھر رہی تھیں۔ آس پاس ہُو کا عالم طاری تھا لیکن جب نیم گرم ہوا کے جھکڑ سرسراتے ہوئے چلنے لگتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے سینکڑوں زخموں سے نڈھال انسان تپتے ٹیلوں کے درمیان پڑے سسک رہے ہیں۔

میں بڑی دیر تک فتح باغ کی خاک و خون میں ڈوبی ہوئی داستان کے بارے میں سوچتا رہا۔ یہ کوئی انوکھی داستان نہ تھی بلکہ اُن قدیم تاریخی روایات کی آئینہ دار تھی جن سے دنیا کی تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ میں نے بیٹھے بیٹھے اپنے گرد و پیش ایک اچٹتی نگاہ ڈالی اور دل میں کہا "قرطاجنہ، طُرائے، بابل اور نینوا جیسے قدیم شہروں کو تو فنا ہوئے ہزاروں برس بیت چکے ہیں۔ مگر فتح باغ کو مٹے ابھی کونسی اتنی صدیاں گزر گئی ہیں کہ زمانہ اسے یکسر بھلا بیٹھا؟"

یہ سوچ کر مجھے بڑا تعجب ہوا اور مدفون شہر کے ٹیلے پر لیٹے۔ وادوں پہ غصہ بھی آیا لیکن جب میں نے اپنے ملاقاتی گدّو فقیر کو اپنے قریب بیٹھے پایا تو جیسے دل کا غبار آپ ہی آپ چھٹ گیا۔ اب اس ٹیلے پر جہاں کسی زمانے میں پُر رونق شہر ہوگا۔ گھاس پھونس کے صرف چند گھر بنے تھے اور ان کے چاروں طرف ویران ٹیلے! ایک طرف یہ منظر اور دوسری طرف اذیت ناک افسردگی چھائی ہوئی۔ میں نے یہ سماں دیکھ کر گدّو فقیر سے باتیں چھیڑ دیں: "گدّو سائیں! تمہیں فتح باغ کے اُجڑنے کی کہانی یاد ہے؟"

یہ سن کر حبشی نژاد سو سالہ بوڑھے کے مرجھاتے ہوئے چہرے پر سنجیدہ مسکراہٹ دوڑ گئی اور اس نے بڑے فلسفیانہ انداز میں جواب دیا۔

"میرے نوجوان مسافر! آج تم نے بڑی بھولی بسری یاد تازہ کر دی۔ خدا کی شان دیکھئے، جہاں ہم آج بیٹھے ہوئے ہیں یہاں کسی زمانے میں بڑا خوبصورت شہر آباد تھا۔ یہی دو سو سال پہلے کی بات ہے۔"

میں نے فوراً کہا۔ "اتنا تو مجھے بھی معلوم ہے لیکن اس کی تباہی کے اصل اسباب کیا تھے؟"

بوڑھا پھر مسکرایا اور کہنے لگا۔ "آہ! اس شہر کی تباہی کے اسباب پوچھتے ہو۔ وہی انسانی ہوسِ اقتدار اور لوٹ کھسوٹ جس کی مثالیں تاریخ میں بھری پڑی ہیں۔" گدّو نے ایک لمبی سانس لیکر کہا۔ "کلہوڑہ کا آخری حکمران میاں عبدالنبی جو نواب سندھ کے نام سے مشہور تھا۔ اسی کے زمانے میں یہ شہر تباہ ہوا۔ نواب بڑا بزدل تھا۔ اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر بلوچی سردار فتح علی خاں تالپور نے اس کی مملکت پر چڑھائی کر دی اور ٹھہناٹی کے مقام پر دونوں میں گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ آخر نواب شکست کھا کر کابل بھاگ گیا۔"

"کابل؟"

"ہاں۔ کابل پہونچ کر اس نے والیٔ افغانستان سے مدد حاصل کی اور افغان جرنیل عزت یار خاں کے ہمراہ ایک بڑی فوج لیکر سندھ آیا۔ عزت یار خاں نے اس کی کھوئی ہوئی حکومت بحال کر دی لیکن ابھی اسے کابل واپس ہوئے تھوڑے ہی دن گزرے ہوں گے کہ بلوچی سردار فتح علی خاں تالپور نے نواب کو پھر ملک بدر کر دیا۔ آخر نواب کو پھر شاہ افغانستان کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔

"یہ وہ زمانہ تھا جب مغلوں کے عروج کا چراغ دم توڑ رہا تھا۔ ہر سُو ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ ادھر سندھ پر افغانوں کا زور بڑھ گیا تھا چنانچہ

اس دفعہ شاہ افغانستان نے نواب عبدالنبی کی اس شرط پر مدد کرنے کا وعدہ کیا کہ وہ اسے بھاری خراج ادا کرے گا۔

"نواب کیلئے اب کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اس شرط کو تسلیم کرلے۔ چنانچہ افغان بادشاہ نے اپنے ایک آزمودہ جرنیل 'مدد خاں' کو نواب کے ساتھ بھاری فوج دیکر روانہ کیا۔ مدد خاں نے سندھ پہونچکر نواب کو بڑی آسانی سے اس کی کھوئی ہوئی حکومت دوبارہ دلوادی لیکن ادھر مدد خاں کی آمد کی خبر پاکر فتح علی خاں تالپور تمام قیمتی ساز و سامان اور خزانہ لیکر فرار ہوگیا تھا۔ چنانچہ جب مدد خاں واپس کابل جانے لگا تو اس نے نواب سے خراج طلب کیا۔ اس پر نواب بڑا اسٹپٹایا۔ خزانہ پہلے ہی خالی ہوچکا تھا اور کوئی دوسری صورت ایسی نہ تھی کہ وہ مدد خاں کو ٹال سکتا۔ آخر کئی روز انتظار کرنے کے بعد مدد خاں کی فوج رسد کی کمی کی وجہ سے فاقہ کرنے لگی۔ اس پر مدد خاں بہت بگڑا۔ یہ دیکھکر خود غرض اور بزدل نواب نے مدد خاں کو مشورہ دیا کہ وہ ملک کے پُرامن اور نہتے عوام کو لوٹ کر خراج وصول کرلے۔ مثل مشہور ہے 'اندھا کیا چاہے دو آنکھیں'۔ مدد خاں کے لئے نواب کا اتنا اشارہ بہت کافی تھا۔ چنانچہ اس کی ٹڈی دل فوج شہر، گاؤں، بستی جو سامنے آیا تخت و تاراج کرتی چلی گئی اور لوٹ مار، قتل و غارتگری کا ایک ایسا ہولناک کھیل شروع ہوگیا کہ ہزاروں بے گناہ عوام موت کی نیند سلادیئے گئے۔ ان کی عزت و آبرو، مال و دولت غرضیکہ سب کچھ لوٹ لیا گیا اور اس طرح وادیٔ سندھ کے کئی خوبصورت، پُررونق شہر جن میں فتح باغ، جوکن، بدین، چھاچھرو اور ناصرپور قابل ذکر ہیں، سب نذر آتش کردیئے گئے اور اب ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا!"

گدّو فقیر نے پھر ایک لمبی سانس لیکر چاروں طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ "آج فتح باغ کی خوبصورتی کا کوئی تصور نہیں کرسکتا۔ کسی زمانے میں یہ مقام سندھ کا نہایت مشہور صنعتی مرکز تھا۔ اس کی خوشحالی، دلکشی، سرسبز باغات، رسیلے پھل، مہکتے ہوئے پھول اور مصنوعات دُور دُور تک مشہور تھیں۔ اس زمانے میں دریائے سندھ، جو اب یہاں سے دس کوس پر ہے، شہر کے دامن سے لپٹ کر بہا کرتا تھا۔ دریا کے کنارے مال بردار کشتیاں لنگر انداز رہتی تھیں جن کے ذریعہ یہاں کی بنی ہوئی سینکڑوں چیزیں دور دور مقامات کو بھیجی جاتی تھیں۔ تجارتی مرکز ہونے کی وجہ سے لوگ بڑے خوشحال تھے اور پُرامن زندگی بسر کرتے تھے۔ مگر آج اس پُررونق شہر کی بجائے اینٹوں اور ملبے کے ڈھیر رہ گئے ہیں جہاں اب دن کے وقت بھی حسرت برستی ہے۔ یہ ہے شہر فتح باغ کی تباہی کی کہانی!"

اتنا کہکر گدّو سائیں اپنی لاٹھی کا سہارا لیکر کھڑا ہوگیا۔ میں اپنی جگہ خاموش تھا اور میرے ذہن میں چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ میں نے کھڑے ہوکر سامنے نگاہ اٹھاکے دیکھا تو ویرانوں سے پرے دھان کے کھیت لہلہا رہے تھے۔ کہیں کہیں آم کے پُرانے درختوں کے دو چار جھنڈ بھی تھے جن کے گہرے سائے پر حیات آفریں طمانیت اور سکون طاری تھا۔

ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے ایک مسجد کے کھنڈر کی طرف نکل آئے۔ اس کے صدر دروازے کی نصف کمان باقی رہ گئی تھی جو اینٹ اور چونے کے ایک مضبوط ستون کے سہارے کھڑی تھی۔ کمان کا اتنا حصہ نہایت بھڑکیلا تھا اور اس پر چمکیلی ٹائلیں جڑی ہوئی تھیں۔ گدّو نے اس شکستہ کمان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"یہاں اکبری عہد کی ایک یادگار مسجد تھی جس کے ایک سو گنبد تھے۔ میں نے اپنی اٹھتی ہوئی جوانی کے زمانے میں جب اس مسجد کو دیکھا تھا تو یہ تقریباً ٹھیک حالت میں تھی لیکن اب تو یہ بھی زمانے کی چکّی میں پس کر خاک کا ڈھیر بن چکی ہے۔"

گدّو سائیں کا یہ جملہ سنکر مجھے ہسپانیہ کی مسجد قرطبہ یاد آگئی اور علامہ اقبالؒ کی نظم میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ میں نے مسجد کی شکستہ کرسی اور کھنڈر کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا جہاں اب چاروں طرف اینٹوں اور ٹائلوں کے اونچے ٹیلے کے سوا کچھ باقی نہ تھا اور اس کے کھنڈر کے علاوہ کوئی ایسی جگہ نہ تھی جس کے ابھرتے ہوئے نشانات اس کی شان و شوکت کی کہانی دہراسکتے۔ ہر طرف ٹیلے ہی ٹیلے تھے جن پر ریت کی چادریں چڑھی ہوئی تھیں۔

مسجد کے کھنڈر سے ہوتے ہوئے ہم اس ویرانے کی طرف نکل آئے جہاں کسی زمانے میں راجہ بیرپل کا گھر تھا۔ گدّو نے بڑے یقین سے بتلایا کہ اکبر کے نورتنوں میں راجہ بیرپل، تانسین اور ملا دو پیازہ/کمک بھٹ فتح باغ کے دلکش ماحول میں پیدا ہوئے تھے۔ اور یہیں پرورش پائی تھی۔ پھر گھومتے گھماتے

ہم مدفون شہر کی ایک ویران شاہراہ پر نکل آئے جو سنسان ٹیلوں کے بیچوں بیچ سیدھی سپاٹ تقریباً ایک میل تک چلی گئی تھی۔ اسی شاہراہ پر مغل حاکم کی محلسرا تھی جس نے بے رحم حملہ آوروں سے فتح باغ کو بچانے کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی اور خود بھی دوسرے مظلوم انسانوں کی طرح فنا کی گود میں سو گیا تھا!

اس شاہراہ کے درمیان کھڑے ہو کر جب میں نے فتح باغ کے ماضی کا تصور کیا تو جیسے سچ مچ نگاہوں کے سامنے شہر کی خوبصورتیوں کا سماں کھنچ گیا۔ ۱۶۶۰ء سے کچھ پہلے اس شہر کے پُر رونق گلی کوچوں، بازاروں، دلکش باغات، ڈیوڑھیوں اور حویلیوں کی چہل پہل کا خیال آتے ہی مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں جنت کے کسی گوشے میں آگیا ہوں لیکن پھر یکایک ان ویرانوں کو دیکھتے ہی جیسے میرے کان دردناک چیخ پکار سے معمور ہو گئے۔ تلواروں کی کھٹا کھٹ، بندوقوں اور توپوں کی دل ہلا دینے والی آوازوں کے درمیان عورتوں، بچوں اور مردوں کی دردناک آہوں، سسکیوں اور رونے پیٹنے کی درد بھری صداؤں سے زمین و آسمان میں ایک کہرام مچ گیا۔ نگاہوں کے سامنے آگ کے سربلند شعلے رقصاں تھے اور ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے آن کی آن میں ساری دنیا ہوس، لوٹ اور ظلم کی آگ میں جل کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھسم ہو جائے گی۔

اس خیال کے آتے ہی جیسے کسی نے مجھے زور زور سے جھنجھوڑا لیکن جب میں نے گھبرا کر اپنے آس پاس دیکھا تو چاروں طرف خاموشی تھی، ویرانے تھے، اداس ٹیلے کھڑے تھے اور سرسراتی ہوائیں جیسے کوئی گنگنا رہا تھا:

کتنے شب رنگ خیالوں کے منقش محراب
گردشِ وقت کی رفتار سے کجلا سے گئے
کتنے گلنار تصور کے سحر تاب محل
ان حوادث کے گراں تیشوں سے مسمار ہوئے!

کوئی خاموش فضاؤں میں گنگناتا ہوا جیسے میرے قریب سے گزر گیا۔ اب جو میں نے نظر دوڑا کے دیکھا تو گدّو سائیں مجھ سے کافی دور ایک ویرانے کے پاس کھڑا میری راہ تک رہا تھا!

جنّتِ تعبیر

(کورنگی کے کنارے)

اثر جلیلی

کراچی کے نواح میں بے خانماں مہاجرین کی آبادکاری کے لئے کورنگی کے پُرفضا مقام پر نئی اور دلفریب بستی کی تعمیر رفاہی سرگرمیوں کی ایک شاندار مثال ہے اور اس دور کی خبر بھی دیتی ہے جس میں حقیقی آزادی اور جمہوریت کا دور دورہ ہوگا۔ اس نظم میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

زندگی، مسئلۂ قالب و جاں
زندگی، ہمہمۂ سیلِ رواں
زندگی، غلغلۂ تاب و تواں
گرچہ ظاہر میں ہے اک بارِ عظیم
لیکن، ادنیٰ سی نگاہِ غلط انداز سے یہ بارِ گراں
غیرتِ دولتِ کونین بھی بن سکتا ہے۔
بادۂ حُسن و لطافت سے ہو پُر صبح کا رنگین ایاغ،
حجلۂ ناز سے اٹھلا کے چلے
میکدے اپنے جلو میں لے کر
بادۂ کوثر و تسنیم کو چھلکاتی ہوئی
ایک دوشیزۂ پروردۂ آغوشِ جمال
جس کا ہلکا سا اشارہ پا کر
نکہت و رنگ کا سرمایہ لٹا دیں غنچے
اور جنت کے دریچے کھل جائیں
زیبِ دوشِ گُل نورستہ ہو مشکل کا کل
زیست کا بارِ گراں

○

زندگی زمزمہ ساز تمنا بھی ہے
از ازل تا بہ ابد زخمہ و تارِ رگِ ابرِ بہار
آتشیں نغمہ زنِ جلوہ گہہ لیل و نہار۔
یہ حقیقت تری نظروں میں فقط خوابِ پریشاں ہی سہی
لیکن افسونِ نگاہِ غلط انداز سے یہ خوابِ پریشانِ حیات
رشکِ جنّتِ تعبیر بھی ہو جاتا ہے
اعتبارات بدل جاتے ہیں، صدیوں میں سہی
دشت شائستۂ تعمیر بھی ہو جاتا ہے!

★

بولان کی وادیوں میں

رفیق خاور

بولان بھیا بلوچستان۔ ان کا نام سنتے ہی مجھے اپنے ایک بہت ہی قریبی عزیز یاد آتے ہیں جن کی جغرافیہ دانی قابلِ رشک ہے۔ اور جو اچھوتی قسم کی معلومات وہ بہم پہنچاتے ہیں ان سے کون ہے جو محظوظ نہ ہو؟ یقین جانئے آپ ان کو سن کر ملا نصیرالدین کے سب لطیفے بھول جائیں گے۔ مثلاً اگر ان سے یہ پوچھا جائے کہ انڈیمان کہاں ہے، اور کیوں مشہور ہے تو وہ جواب دیں گے انڈیمان کہیں تبت کے شمال میں ایک خاصا بڑا گرم مرطوب علاقہ ہے جہاں ارنا بھینسے ہی ارنا بھینسے پائے جاتے ہیں۔ کوئی گھر ایسا نہیں جہاں ایک دو ارنا بھینسے نہ ہوں۔ اور اپنے اس بیان کو تقویت دینے کے لئے وہ حوالے دیتے ہیں بھی طاق ہیں۔ ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں کہ مشہور جغرافیہ داں ڈڈلے اسٹمپ لکھتا ہے کہ ڈاک یا ٹمر انگلائے کی طرح یہ جانور بھی سواری اور بار برداری کے کام آتا ہے۔ اور جہاں ہاتھی نہیں جا سکتا یہ ۲ نا فانا پہنچ جاتا ہے۔ اس نے لوگوں کو خود اس پہ بیہودہ کس کر سواری کرتے دیکھا ہے۔ یہ بھی اچھا، کہ وہ اکثر بیشتر ڈڈلے اسٹمپ کا حوالہ دیتے ہیں ورنہ اگر وہ:

کیوں نہ دوزخ ہی بھی جنت کو ملالیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

کے مصداق مزید رعب ڈالنے کے لئے بڑے بڑے اپنے جغرافیہ دانوں ادریسیا ابلا نوری وغیرہ کو بھی گواہوں کی فہرست میں شامل کرنا شروع کر دیں تو انہیں کون روک سکتا ہے؟ خیر، جہاں سوال صداقت کا ہے وہاں سوگند اور گواہ کی حاجت ہی کیا ہے۔ اگر ان حضرت سے پوچھا جائے کہ کراچی کہاں ہے اور کیوں مشہور ہے۔ تو وہ فضا میں بازو پھیلا کر ایک خاص سمت میں اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں یہ اس طرف ایک برِعظیم ہے جس کے پایۂ تخت کا نام بھی یہی ہے۔ بہت بڑا شہر ہے۔ اس میں ایک چڑیا گھر، ایک عجائب گھر اور ایک ریڈیو پاکستان ہے۔ ظاہر ہے کہ ریڈیو پاکستان سے ان کی مراد محض ریڈیو ہی ہے، اور چڑیا گھر اور عجائب گھر تو ہر مسائے پہیلا مول، جس شہر کے متعلق بھی، پوچھا جائے ان کا ذکر لازمی ہے۔ لاہور کیوں مشہور ہے؟ اس لئے کہ اس میں ایک چڑیا گھر ہے اور ایک عجائب گھر۔ کراچی کیوں مشہور ہے؟ اس لئے کہ یہاں بھی ایک چڑیا گھر ہے، اور ایک عجائب گھر اور کوئٹہ۔ اب کی ان کا تیر ٹھیک نشانہ پر بیٹھا۔ کوئٹہ بلوچستان میں ہے مگر خود بلوچستان کہاں ہے اور کیوں مشہور ہے؟ ظاہر ہے کہ اس میں چڑیا گھر اور عجائب گھر تو ضرور ہوں گے لیکن بلوچستان، یہ ہے ایشیائے کوچک کے وسط میں ایک بہت بڑا تاریخی ملک بلکہ جزیرہ۔ کسی زمانے میں یہاں اژدہے بہت تھے لیکن انگریزوں نے مشین گنوں سے اڑا دیئے۔ شاید ایک آدھ چڑیا گھر یا عجائب گھر میں یادگار کے طور پہ رکھا ہو۔ بڑا ہی سرسبز و شاداب جنگلاتی علاقہ ہے۔ اور بولان۔ یہ برما کی سرحد پر ایک بہت بڑا درہ ہے جہاں سے چینی ہندوستان میں گھس آتے ہیں۔ ایک بہت ہی دلچسپ اطلاع جس کے اہلِ ذوق پھڑک ہی تو اٹھے، یہ تھی کہ بلوچستان کی سب سے مشہور چیز مرغا ہے۔ جس کے مور جیسے بڑے بڑے چکنے چکنے پر ہوتے ہیں۔ اتفاق سے ہمارے جغرافیہ داں کے اپنے بال بھی کچھ اسی قسم کے تھے۔ اس لئے ہم نے ان کو بھی کسی قدر گستاخی سے اسی نوع میں شمار کر لیا تھا۔ اور مرغ کے لئے "کاک" سے بہتر مرادف اور کیا ہو سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ ان حالات میں کون ہے جسے کوئٹہ، بلوچستان اور بولان میں دلچسپی نہ ہو گی۔ اس لئے ہمیں بھی غائبانہ طور پر ان مقامات کے ساتھ بے حد انس پیدا ہو گیا تھا مگر کہاں ہم کہاں یہ دور دراز مقامات۔ یہاں خواب و خیال تو کیا اس طاؤس مرغ کے پر بھی مل جاتے جو بلوچستان میں عام ہے تو ہم شاید ہی یہاں پہنچ سکتے۔ ہماری معلومات میں اتنا اضافہ ضرور ہوا تھا کہ کوئٹہ میں ایک بہت بڑا زلزلہ آیا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں اور اس کا منظر ایک فلم میں

بھی دیکھا تھا۔ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ بلوچوں کا دیس ہے۔ جن کو سہتی کے محبوب مراد بلوچ اور سسی کے محبوب پنوں نے غیر فانی حیثیت عطا کر دی ہے۔ بلوچ اور ڈاچی والے پنجابی گیتوں کا چہیتا موضوع ہیں۔

ڈاچی دا لیا موڑ مہار وے
تیری ڈاچی دے گل وچ ہار وے
(اے ڈاچی والے! اپنی مہار موڑ دے۔ تیری اونٹنی کے گلے میں ہار)
وے جی اڑیا ڈاچی والڑے نال
(اے میرا دل اونٹنی والے کے ساتھ جا اڑا)
بلوچا ظالما نہ مار سیٹی
(ظالم بلوچ! خدا کے لئے سیٹی نہ مار)

غرض مضبوط، تنو مند، جیالے بلوچوں سے جھنگ سے لے کر سندھ اور کچھ تک کا علاقہ بھرا پڑا ہے۔ تاریخ میں جابجا ان کے بہادرانہ کارناموں کا ذکر آتا ہے اور خود ہماری بلوچ رجمنٹ کے کارہائے نمایاں کس کو معلوم نہیں! اس لئے یہ بے تاب خواہش ہمیشہ دل ہی دل میں پرورش پاتی رہی کہ جب بھی موقع ملے اس اوریا اور اس کے کوہ و صحرا کو دیکھا جائے جو ان کا حقیقی وطن ہے۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ قیام پاکستان نے ان دور دراز علاقوں کا جن کا ذکر ہم تاریخ و جغرافیہ کی کتابوں میں پڑھا کرتے تھے اور عجب نہیں کہ ان کے متعلق خیالی گھوڑے دوڑانے میں اپنے آن عزیزوں سے بھی بازی لے جاتے، اب اس قدر قریب آ گئے ہیں جیسے کسی غیر معمولی طاقت کی دوربین نے معجزہ کر دیا ہو۔ اور یہ امکان بھی پیدا کر دیا ہے کہ ہم پشاور سے اڑیں تو کراچی جا پہنچیں، کراچی سے اٹھیں تو مری جا دھمکیں یا ادھر نہیں تو کوئٹہ، زاہدان کی طرف جا نکلیں۔ یہی احساس تھا جس کے ماتحت ہم نے تہیہ کیا کہ ـــ آؤ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی۔ اور کوئٹہ، بلوچستان، وادی بولان سب کی سیر کو روانہ ہو گئے۔ خواہ یہ سیر زیادہ تر کوئٹہ اور اس کے گرد و نواح کے علاقے مشاہدات ہی پر مشتمل کیوں نہ ہو۔

اگرچہ کراچی اور کوئٹہ میں سینکڑوں میل کا فاصلہ ہے اور سفر کرتے وقت زمین ہے کہ آپ ہی آپ کہیں سے نکلتی ہی چلی آتی ہے لیکن بلوچستان کی ریگستانی فضا کی جھلک سبی سے نظر آنی شروع ہو جاتی ہے۔ جسے وادی بولان کا دروازہ کہتے ہیں۔ خود سبی نامی شہر میں بلوچ سردار میر چاکر خان رند کا قلعہ بلوچوں کی گذشتہ عظمت کا آئینہ دار ہے۔ علاقہ گیا ہے۔ لق و دق صحرا میں ریت کے تودے کے تودے اور ان چھوٹے تودوں میں کچھ کچھ فاصلے پر بڑے بڑے تودے جنہیں پہاڑ کہتے ہیں۔

انہی دنوں باران رحمت کے نزول کا نتیجہ تھا کہ سبی کا روتیا جہنم بھی اعراف نما لگتا تھا۔ اور پھر سبی سے پار ہوتے تو سمجھئے وادئ مہران سے نکل کر وادی بولان میں داخل ہو گئے۔ پہاڑوں کا چپ چاپ سونا سونا ماحول لمحہ بہ لمحہ بڑھتا ہی جاتا ہے۔ اور پیلی پیلی فضا برابر سنہری آنچل پھیلاتے ہی جاتی ہے۔ کیا یہ اس لئے ہے کہ یہاں کی ریت گندمک ملی ہے؟ اس لئے اینٹیں تک زرد ہیں۔ اور ان سے بنی ہوئی چھوٹی بڑی عمارت بھی نظر آتی ہے وہ ایک بڑا سہانا گندنی اور کہیں کتھئی رنگ لئے ہوئے ہے۔ جہاں تھوڑی تھوڑی بوٹیاں اگی ہوں وہاں ہلکی ہلکی ہری ہری جھلک نظر آتی ہے۔

ان سنہری، کتھئی، ہری ہری راہوں اور پہاڑی نالوں کی پتھریلی گذرگاہوں سے ہوتے ہوتے ہم بہت دور ہی نکل آئے۔ آب گم، مچ، سر آب عجیب نام ہیں، مچ یا مچھ بہت پیاری جگہ ہے۔ یہیں سے کوئٹہ اور اس کے گرد و پیش کا حقیقی ماحول جھلکنے لگتا ہے۔ اسقدر صاف ستھری نکھری نکھری فضا۔ وہ مقام جہاں چڑھائی اور بھی بڑھنے لگتی ہے اور سرنگوں پر سرنگیں، چھوٹی لمبی، بے شمار تیزی سے آنے لگتی ہیں۔ ریل ایک بڑا سا اژدہا جیتے جاگتے دو منہ والے سانپ کی طرح کیونکہ اس کے آگے پیچھے دو انجن کوئلہ پھانکتے اور دھواں پھینکتے ہوئے لگے رہتے ہیں، پہاڑوں کے گرد چکر پر چکر کاٹتی ہی جاتی ہے۔ جس طرح ریل کی پٹری چٹانوں کا جگر کاٹ کاٹ کر بنائی گئی ہے وہ واقعی انجینئرنگ کا بہت بڑا کمال ہے۔ چاروں طرف اونچے پہاڑ، کچھ سنگلاخ، کچھ بھر بھرے، بے اندازہ شکلیں اور صورتیں اختیار کرتے ہوئے، سلیٹی، بھوسلے، کتھئی، پیلے ملگجے، کالے بھجنگے۔ جیسے یہ زمین نہیں ایک دیو زاد ہے، کولپور وادی بولان کا بلند ترین ریلوے اسٹیشن ہے اس کی نچان میں ایک نہایت خوشنما بستی، دامن کا یک نما چھوٹے چھوٹے گھروندوں سے بھرا پڑا، اور کہیں پہاڑوں میں کھود کھود کر بڑی استادی سے بنائے ہوئے ٹھکانے یا خانہ بدوشوں کے خیمے ہی خیمے نظر سے

کہیں دور سفید بل کھاتی سڑک کوئلہ کی خوفناک تاریک کانوں میں گھستی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ جہاں زندگی کا پیوند کٹتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

تاریخی جغرافیہ اور نسلوں کے گورکھ دھندوں سے قطع نظر سپیزنڈ نامی جنکشن اسٹیشن سے ایک اور بات بھی ابھرنے لگتی ہے۔ صدہا سال قدیم طرز زندگی۔ کاروانوں پر کارواں چلتے ہوئے۔ خانہ بدوش رہن سہن، اونٹوں کے ذریعہ چھوٹی موٹی کھیتی باڑی، کشتن گذران۔ گدان یعنی خانہ بدوشوں کے چھوٹے چھوٹے جھونپڑے دور دور بکھرے ہوئے کبھی گرینج یعنی سرد زمہریری ہوا اور کبھی لوار یعنی بادِ سموم کے شکار۔ شاید یہ اس بکھرے بکھرے غیر مربوط رہن سہن ہی کا نتیجہ ہے کہ یہاں کی شاعری بھی آزاد ہے۔ یعنی قافیہ و ردیف کی بندشوں سے آزاد۔ ایران جانے والے سپیزنڈ ہی سے زاہدان کا رخ کرتے ہیں۔ اس خطے کا بین الاقوامی محل وقوع یہیں سے واضح ہونا شروع ہو جاتا ہے جیسے ہم روس، افغانستان، مشرقی ترکستان ایران اور اس سے بھی پرے بغداد، انقرہ، روم اور لندن جانے والی شاہراہ پر ہوں۔

زندگی کے ساتھ زبان میں بھی ایک خاص وضع نمایاں ہوتی ہے۔ مِیرآب، آب گم۔ خالص فارسی۔ یہ دو اسٹیشنوں کے نام ہیں۔ "میرآب" کی وجہ تسمیہ یہی ہو سکتی ہے کہ بستی کسی ندی نالے کے کنارے واقع ہوگی۔ وہ ندی نالے جو کبھی تو بالکل خالی نظر آتے ہیں اور کبھی آناً فاناً ایک گونجتا گرجتا اژدہا بن جاتے ہیں۔ "آب گم" شاید کاریز کا دوسرا نام ہو۔ پانی تو ان خشک پہاڑوں میں ہے ہی نایاب۔ اس لئے برسات کا جو پانی جمع ہوتا ہے وہ زیرِ زمین نالیوں سے گھوم گھوم کر کھیتوں تک پہنچایا جاتا ہے۔ اور جہاں جہاں پانی ہو وہ جگہیں باغ و بہار اور گلزار و گلزار بن جاتی ہیں۔ یہ کاریز بڑی دلچسپ چیز ہے ایران میں بھی بکثرت ہیں۔ چنانچہ وہاں کا مشہور بادشاہ بہرام گور گھوڑے سمیت زیرِ زمین دریا میں ڈوب کر مر گیا تھا۔ یہ کاریز تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر کھلے ہوتے ہیں بالکل کنوؤں کی طرح اور ان کے ارد گرد کنوؤں جتنی ہی بڑی کچی مینڈھ باندھ دی جاتی ہے۔

کوئٹہ کے تیور۔ شہری، تہذیبی قدرتی اس کی آمد سے پہلے ہی ابھرنے لگ جاتے ہیں۔ کارخانے، باغات، وادیاں، مکانات۔

کوئٹہ ایک پشتو لفظ کوات سے ماخوذ ہے جس کے معنی قلعہ کے ہیں کہتے ہیں سکندر اعظم کا ایک جرنیل وادی مہران میں داخل ہوا تھا۔ یہ سطح سمندر سے ۵۵۰۰ فٹ بلند ہے۔ کوئٹہ کا ریلوے اسٹیشن بجائے خود شہر کا آئینہ دار ہے۔

آپ آتے ہی پانی کے بڑے بڑے نلکوں پر بکریوں کے گھنگھریالے بالوں جیسے سیاہ ریشے لپٹے پائیں گے۔ یہ جاڑوں کی پیش بندی ہے جب روس سے آنے والی سرد ہوا اور برف باری کے باعث نلکوں کے اندر پانی جم جاتا ہے۔ اور بعض اوقات وہ پھٹ بھی جاتے ہیں جیسا کہ امسال ہوا بھی ہے۔ برف باری کے زمانے میں کوئٹہ کے برف پوش پہاڑوں کا نقشہ دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ مری اور ایبٹ آباد کا حریف۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ گھروں اور گلی کوچوں میں برف ہی برف نظر آتی ہے اور دروازے تک بند ہو جاتے ہیں۔ تب برف کھودنے والے برف کھود کھود کر راستے کھولتے ہیں اور گھروں میں بند لوگوں کو باہر نکلنے کا موقع دیتے ہیں۔ اتنا عرصہ بھنے ہوئے گوشت پر گزارہ ہوتا ہے جسے سجی کہتے ہیں۔

سارا شہر قدرتی طور پر صاف ستھرا ہے۔ نیچی نیچی چھتیں، چھوٹے چھوٹے ڈبلے جیسے گھر، شاذ و نادر کوئی عمارت دومنزلہ یا اونچی۔ اینٹیں تمام پیلی پیلی، گندھک جیسی۔ چاروں طرف پہاڑ ہی پہاڑ اور کوئٹہ ایک خوشنما قلعہ کی طرح ان کے درمیان گھرا ہوا۔

سڑکوں کے دونوں طرف بادام کے پیڑ ہی پیڑ، بیریوں سے بھی زیادہ عام اور جنگلی گلاب کے پودے مہکتے ہوئے پھولوں سے پٹے ہوئے اور باہر نکل جایئے تو یہی گلاب کے پودے انار، سیب، نارنگی، آڑو، گرالو، بہی وغیرہ کے پیڑ جھاڑیوں سے بھی زیادہ۔ گہرے سرخ رنگ کے گدرائے ہوئے سیبوں سے تو سارے پیڑ انگاروں کی طرح لال سرخ گیندوں کا پٹارہ معلوم دیتے ہیں۔ میل ہا میل تک یہی نقشہ اور جہاں یہ نہیں وہاں یلا کی خوشبودار نفیس جھاڑیاں انگور کی بیلیں جا بجا پھیلی ہوئیں اور ان میں ہر قسم کے انگور لگے۔ جتنی گرمی ہو اتنا ہی انگور پکتا اور رسیلا بنتا ہے اور پک کر کھجور کی طرح مٹھاس دیتا ہے۔ سرخ قسم کا بڑا انگور تو نرا شہد لگتا ہے۔ اور اتنا نازک کہ باہر نہیں جا سکتا۔ اورک کی طرف نکل جائیں یا کوئی پینتیس چالیس میل راستے ہی میں رک جائیں، جہاں ایک بہت بڑا

پہاڑی نالہ پتھروں پر زناٹے سے بہتا چلا آتا ہے۔ اور باغیچوں والوں نے پتھروں کو باڑوں سے جکڑ جکڑ کر بند باندھے ہوئے ہیں، تو فضا ایسی خوشگوار معلوم ہوتی ہے جیسے یہ بھی کشمیر کا حصہ ہو۔ چھوٹی چھوٹی نالیوں میں دوڑتا ہوا تیز ٹھنڈا ٹھنڈا پانی خود بخود رگ رگ میں اتر جاتا ہے۔ اور پینے میں بے حد خوش ذائقہ اور مفرح معلوم ہوتا ہے۔ کسانوں نے پانی کے اوپر سے نیچے آنے کا خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ پانی کی پرزور دھار پن چکی کی لٹو جیسی اریب سطح پر ترچھی پڑتی ہے۔ جس سے وہ زور سے گھومنے لگتا ہے۔ اوپر ایک کچے کوٹھے میں چکی نصب ہے جو گھمر گھمر چلتی ہے۔ یہ لٹو جیسا پہیہ تین چار گز لمبے پل نما چھپر کے نیچے ہوتا ہے جس کی دوسری طرف نیچے سے پہیے کو تیزی سے گھومتا دیکھ سکتے ہیں۔ اور ٹھنڈی ٹھنڈی بوندوں کی تیز بوچھاڑ بہت ہی لطف دیتی ہے۔

گرد و پیش کے پہاڑوں کے نت نئے بدلتے ہوئے منظر اور زاویے اور ان کے رنگ ایسے لگتے ہیں جیسے ہم سچ مچ کوئی رنگین فلم دیکھ رہے ہوں۔

اوڑک والی سڑک سے ہٹ کر اونچائی کی طرف کچھ میل کے فاصلے پر ہنّہ نہایت ہی خوش نما حنا جھیل ہے۔ جس کے عین وسط میں ایک چھوٹی سی نہایت دلکش رنگین سی چیز بنائی گئی ہے۔ لوگ کشتیوں میں سوار ہو ہو کر اسے دیکھنے جاتے ہیں۔ یہاں کی عمارتوں کے بالائی حصے ٹین یا لکڑی کے بنائے جاتے ہیں کہ گریں بھی تو زیادہ نقصان نہ دیں۔

کہاں کوئٹہ اور کہاں لاہور یا کراچی جیسی ادبی، فنی، تعلیمی، صحافتی سرگرمیاں لیکن وہاں پہنچتے ہی صاف معلوم ہوتا ہے کہ خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم۔ ان تمام امور میں خصوصاً قیامِ پاکستان کے بعد کوئٹہ بھی دوسرا لاہور یا کراچی ہے۔ آبادی کا کتنا ہی حصہ باہر آنے والوں پر مشتمل ہے۔

زبان و ادب اور صحافت کے لئے بہت ہی خوشگوار فضا موجود ہے۔ مقامی بلوچوں کو اپنے رنگ میں دیکھنا ہو تو داخل میں دیکھئے۔ یہی ان کا ہوٹل ہے اور یہی ان کا کلب جہاں کھانے کے دوران میں گویّے یا سازندے ان کا دل بہلاتے ہیں۔ کبھی کوئی شخص منہ میں چنگ دبا کر بجاتا ہے۔ یہ بڑی چھوٹی سی چیز ہے۔ اسے ہاتھ سے بجاتے ہیں۔ اسی لئے ممکن ہے اس کا نام چنگ پڑ گیا ہو۔ گپ شپ کے ساتھ سیاسی بات چیت بھی ہوتی ہے۔ مثلاً آجکل بھی "نئی کرت" یا بنیادی جمہوریتیں زیرِ بحث ہیں۔ کوئٹہ سے مستونگ تک کہیں چٹیل بنجر زمینوں، خشک پہاڑوں اور کہیں کہیں سرسبز و شاداب جگہوں کا ایک عجیب مجموعہ ہے۔ چنگی چنگی کے قریب سنگِ میل پر لندن کا فاصلہ بھی درج ہے۔ کہیں اسی سمت میں قلعہ سفید بھی ہے۔ غالباً وہی جسے فتح نامہ میں "دژ سفید" کہا گیا ہے اور جس کا محاصرہ سہراب نے کیا تھا۔ مستونگ کے راستے میں سب سے خطرناک وہ مقام ہے جسے "لک پاس" کہتے ہیں۔ یہاں کا "باب المندب" جو یہاں سے بچ کر نکل آیا وہ بہت خوش قسمت ہے۔

مستونگ اس علاقے کا بہت ہی ہرا بھرا، بارونق، ترقی یافتہ اور آباد قصبہ ہے۔ جو برابر ترقی کر رہا ہے۔ مارشل لاء کی برکات یہاں تک بھی آ پہنچی ہیں۔ پچھلے سال میلے کے ساتھ ہی ساتھ یہاں ایک بہت بڑا جرگہ بھی ہوا جو بنیادی جمہوریت کا نہایت عمدہ نمونہ تھا۔ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اردو اس دور افتادہ مقام میں بھی کس قدر مقبول ہے۔ اردو عام طور پر سمجھی ہی نہیں جاتی۔ بلکہ اس کو تعلیم و تدریس اور ادب و صحافت کے لئے بھی برتا جاتا ہے۔ خود زندگی کی طرح یہاں پشتو، بلوچی، سندھی، اور اردو کا سنگم بھی نظر آتا ہے۔ یہ سب کچھ ہے مگر خود وادیٔ بولان کے فرزندوں کا کہنا ہے کہ ان کی تاریخ، ان کی تہذیب، ان کی زندگی کسی مستقل ادارہ میں نہیں بلکہ سینہ بہ سینہ روایات اور داستانوں میں چلی آتی ہے یا پھر ان کی عکاسی عوامی گیتوں میں ہوتی ہے۔ اے کاش کہ! بلوچ خود اس کی نشاندہی کر سکیں۔

اقوامِ متحدہ:

مہاجرین کا عالمی سال

فضل حق قریشی دہلوی

عالمگیر نوعیت کے بعض مسائل پر غور و خوض کرنے اور بین الاقوامی سطح پر ان کو حل کرنے کا طریقہ کچھ عرصے سے مقبول ہو رہا ہے۔ اس ضمن میں اقوامِ متحدہ کے ممبر ملک پیش پیش رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ارضی طبیعیات کا بین الاقوامی سال، جس کی مدت اٹھارہ ماہ تھی، نہایت کامیاب نتائج کے ساتھ حال ہی میں ختم ہوا ہے۔ شاید اسی اندازِ فکر کے بموجب مہاجرین کا عالمی سال منانے کا خیال برطانیہ کے چند نوجوانوں کے دل میں پیدا ہوا جنہیں مہاجرین کی بحالی سے خاص دلچسپی تھی۔

کچھ دن بعد اقوامِ متحدہ کے مہاجر فنڈ کی مجلسِ انتظامیہ کے سامنے یہ خیال ایک تجویز کے پیرائے میں پیش ہوا جسے تبادلۂ خیالات کے بعد ۲۶ ستمبر ۱۹۵۸ء کو منظور کر لیا گیا۔ پھر اقوامِ متحدہ کے دس ممبروں کی تحریک پر یہ موضوع اسی سال ۵ دسمبر کو جنرل اسمبلی کے تیرھویں اجلاس کے سامنے آیا اور ۵۹ موافق، ۹ مخالف اور ۱۰ غیر جانبدار ووٹوں سے منظور ہونے والی ایک نئی قرارداد کے ذریعہ اقوامِ متحدہ اور اس کے مخصوص اداروں کے ممبر ملکوں پر زور ڈالا گیا کہ وہ مہاجرین کا عالمی سال منانے میں پوری طرح تعاون کریں اور دامے، درمے، قدمے، غرض ہر صورت میں اعانت کر کے اس تحریک کو کامیاب بنائیں تاکہ ساری دنیا میں انسان دوستی کے نقطۂ نظر سے جملہ مہاجرین کی زیادہ سے زیادہ امداد اس طرح ہو سکے کہ پھر کوئی مہاجر اپنے آپ کو مہاجر نہ سمجھنے پائے۔

اس تجویز میں اقوامِ متحدہ کے سکریٹری جنرل مسٹر داگ ہامرشولڈ سے بھی درخواست کی گئی کہ وہ مہاجرین کے عالمی سال کو فروغ دینے میں ایسے اقدامات سے کام لیں جو ان کے نزدیک معقول اور مناسب ہوں۔ اس تجویز کے مطابق سال منانے کی کارروائی جون ۱۹۵۹ء سے شروع کی جا چکی ہے۔

مہاجرین کے عالمی سال کی نوعیت، اہمیت اور افادیت کا بھرپور جائزہ لینے سے پہلے ضروری ہے کہ مہاجرین کے مسئلے کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔

مہاجرین کا مسئلہ پچھلے بارہ سال میں صرف پاکستان ہی کے لئے پریشان کن نہیں رہا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ شدت سے ساری دنیا میں اس نے تشویشناک صورت پیدا کر رکھی ہے۔ اسے قومی اور بین الاقوامی انداز میں حل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے لیکن منزل ہر جگہ ابھی دور ہے۔ پاکستان میں یہ مسئلہ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد درپیش ہوا لیکن یورپ اور مشرقِ بعید میں دوسری جنگِ عظیم کے بعد سے اور مشرقِ قریب میں تنازعۂ فلسطین کے بعد سے اپنا رنگ جمائے ہوئے ہے۔

دوسری جنگِ عظیم ختم ہونے کے بعد عالمگیر پیمانے پر تعمیرِ نو کی غرض سے اقوامِ متحدہ کا قیام عمل میں آیا تو اربابِ حل و عقد نے سیاست کے میدان سے ذرا ہٹ کر معاشرت و ثقافت اور انسان دوستی سے تعلق رکھنے والے بہت سے پہلوؤں پر بھی غور کیا اور ترقی کی مناسب تدابیر اختیار کرنے کے لئے چند ایسے ماتحت ادارے قائم کئے جن کے عملی دائرے الگ الگ رکھے گئے۔ ان میں سے ایک ادارہ یورپی مہاجرین سے بھی متعلق تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ لڑائی کے باعث بے گھر ہو جانے والوں کو یا تو وطن واپس بھیجا جائے یا نئے سرے سے نئی سرزمین پر اس طرح بسایا جائے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر کسی کے محتاج نہ رہیں۔ یہ بین الاقوامی ادارۂ مہاجرین اقوامِ متحدہ کے دوسرے مخصوص اداروں میں سے ایک تھا۔ لیکن پھر اقوامِ متحدہ نے اسے براہِ راست اپنے زیرِ انتداب کر لیا اور وہ مہاجرین سے متعلق اقوامِ متحدہ کے ہائی کمشنر کا دفتر کہلانے لگا۔

کچھ عرصے بعد ہنگری کے فسادات رونما ہوئے اور ہزاروں باشندگان ملک وطن چھوڑ کر آسٹریا اور یوگوسلاویہ میں پناہ گزیں ہو گئے۔ مہاجرین کے ہائی کمشنر نے ان کی آبادکاری وغیرہ کا کام بھی اپنے ذمے لیا۔

اس سے بہت پہلے مشرقِ قریب میں اسرائیل کے ہنگاموں اور اس کی ہلاکت آفرینیوں سے تنگ آ کر بہت سے باشندگانِ فلسطین ترکِ وطن کے لئے مجبور ہوئے اور پڑوسی ملکوں میں چلے آئے تھے۔ ان کی آبادکاری اور بحالی کی ذمہ داری بھی اقوامِ متحدہ نے اپنے سر لے لی تھی۔ اس مقصد کے لئے

جو ادارہ قائم ہوا، وہ مہاجرینِ فلسطین سے متعلق اقوامِ متحدہ کا ادارۂ بحالیات و امور یا مختصر الفاظ میں آنروا کہلاتا تھا۔

یہ دونوں ادارے ہنوز قائم ہیں اور تیزی سے کام کر رہے ہیں۔ البتہ کوریا کی تعمیرِ نو سے متعلق اقوامِ متحدہ کا ادارہ (انکرا) کسی نہ کسی طرح اپنا فرض ادا کر کے بند ہو چکا ہے۔

برِصغیر پاک و ہند کی تقسیم کے بعد دونوں حصوں کے کچھ کچھ باشندے ایک علاقے سے ترکِ وطن کر کے دوسرے علاقے میں پہنچ گئے۔ ان کی آبادی کا کام اقوامِ متحدہ کے سپرد نہیں کیا گیا لیکن دونوں جگہ کے مسائل اس کے لئے باعثِ تشویش ضرور رہے۔

ایک اندازے کے مطابق دوسری عالمگیر لڑائی ختم ہونے کے بعد سے تقریباً چار کروڑ مرد عورتیں اور بچے ترکِ وطن کر کے دوسرے علاقوں میں پناہ لیتے رہے۔ ان میں وہ مہاجرین بھی شامل ہیں جو سرزمینِ چین سے ترکِ وطن کر کے ہانگ کانگ اور تائیوان چلے گئے۔ آبادکاری کی انتہائی کوششوں کے باوجود ۱۹۵۸ء کے آخر تک شاید ڈیڑھ کروڑ انسان پھر بھی ساری دنیا میں پناہ گزین کی حیثیت سے عارضی طور پر آباد تھے جبکہ اقوامِ متحدہ نے مذکورہ بالا قرارداد منظور کی تاکہ یہ مرحلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے ان ڈیڑھ کروڑ میں سے بیس لاکھ کے قریب مہاجرین کسی نہ کسی صورت میں اقوامِ متحدہ کی امداد کے محتاج تھے۔

مہاجرین کا عالمی سال شروع کر کے کوشش کی جانے لگی کہ دنیا میں ہر جگہ اس مسئلے پر زیادہ سے زیادہ توجہ دی جائے، حکومتوں، رضاکار اداروں اور عوام سے مزید مالیاتی چندے جمع ہوں اور ایسی صورتیں پیدا ہوں کہ خالص انسان دوستی کی بنیاد پر مہاجرین کا باہمی تبادلہ برضا و رغبت عمل میں آسکے، ان کو دوسرے علاقوں میں الگ آباد کیا جاسکے یا مقامی باشندوں میں مدغم کر دیا جائے۔

اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی اور اس کی تیسری کمیٹی میں بحث تمحیص کے وقت اور پھر قرارداد کے الفاظ میں بات واضح کر دی گئی تھی کہ ہر ملک اپنی ضرورت، امکانات اور وسائل کے بموجب یہ سال منانے میں شریک ہو۔ اس کے ساتھ ہی یہ امید بھی ظاہر کی گئی کہ وہ ملک جن کو بذاتِ خود مسائل مہاجرین کا سامنا نہیں ہے۔ مختلف طریقوں سے اس اسکیم کی حمایت کریں۔ اور حیثیت مہاجرین سے متعلق اقوامِ متحدہ کے اس کنونشن کی توثیق کریں جو ۲۲ راپریل ۱۹۵۴ء سے نافذ ہے۔

اس سال جنرل اسمبلی اور اس کی تیسری کمیٹی میں جو معاشرتی، ثقافتی اور انسان دوستی کے امور سے تعلق رکھتی ہے، مہاجرین کا عالمی سال منائے جانے کا موضوع زیرِ بحث آیا تو مہاجرین کے ہائی کمشنر ڈاکٹر لنٹ نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ ۱۹۵۸ء کے موسمِ خزاں تک یورپ میں ایک لاکھ ساٹھ ہزار غیر آباد مہاجرین ایسے تھے جن کا تعلق ان کے دفتر سے تھا۔ ان میں سے چالیس ہزار اشخاص آسٹریا، وفاقی جمہوریت جرمنی، یونان اور اٹلی کے کیمپوں میں پڑے تھے۔ تاہم نئی کوششوں کی بدولت پچھلے سال نومبر کے شروع میں غیر آباد مہاجرین کی تعداد گھٹ کر ایک لاکھ دس ہزار رہ گئی جبکہ کیمپوں کی آبادی میں بھی اٹھارہ ہزار کی کمی ہو گئی۔

انہوں نے بتایا کہ ہنگری کے مہاجرین میں سے جو مختلف ملکوں میں پناہ گزیں تھے ستر ہزار چھ سو کا رضاکارانہ طور پر تبادلہ ہو چکا ہے۔ اب آسٹریا میں دس ہزار کے قریب باقی ہیں۔ ان میں سے ڈیڑھ ہزار کسی اور ملک میں چلا جانا چاہتے ہیں۔ امید ہے کہ بہت جلد ان میں سے ۸۰۰ ریاست ہائے متحدہ، ۱۹۶ آسٹریلیا، ۱۰۲ کینیڈا، ۷ جنوبی افریقہ، ۲۶ نیوزی لینڈ اور باقی یورپ کے چند دوسرے ملکوں میں چلے جائیں گے۔ جنہوں نے ان کو آباد کرنے کی حامی بھر لی ہے۔

الجزائر کے ایک لاکھ اسی ہزار مہاجرین تیونس اور مراکش میں عارضی طور پر مقیم ہیں۔ ایک خاص فنڈ سے جو مہاجرین سے متعلق اقوامِ متحدہ کے ہائی کمشنر کے ماتحت قائم ہے، ان کی بنیادی ضرورتیں پوری کی جا رہی ہیں۔ ان ضروریات میں بعض اشیائے خوراک، لباس اور کمبل شامل ہیں۔ لیکن اس فنڈ کو قائم رکھنے کے لئے مزید چندے درکار ہیں۔ یہ بھی کوشش کی جا رہی ہے کہ ان مہاجرین کو خود کفیل بنانے کے لئے مناسب تربیت دی جائے تاکہ سیاسی حالات سدھرنے کے بعد ان کے لئے وطن واپس جانے کی صورت پیدا ہو تو نئے سرے سے ان کی آبادکاری میں دقت نہ ہو اور وہ حکومت کے لئے بار نہ بنیں۔

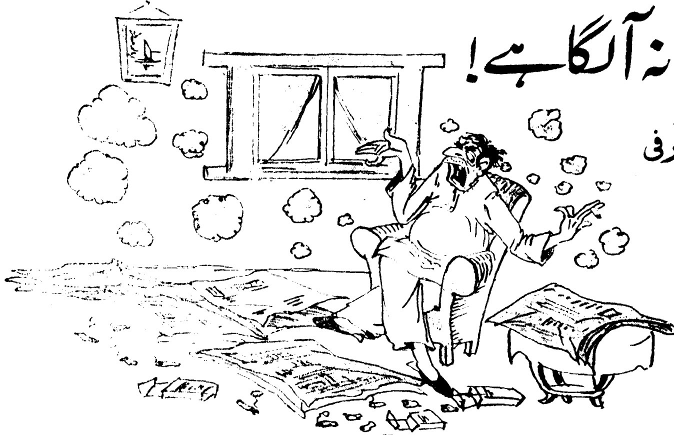
ڈاکٹر لنٹ نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ ۱۹۵۹ء کے لئے بین الاقوامی امداد کا جو حسبِ معمول پروگرام بنایا گیا تھا، اس پر ۴ لاکھ ڈالر خرچ ہوئے تھے، لیکن پوری رقم جمع نہیں ہو سکی۔ اب مہاجرین کے عالمی سال کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو پروگرام ۱۹۶۰ء کا بنایا گیا ہے اس پر ساری دنیا میں ایک کروڑ بیس لاکھ ڈالر خرچ ہونے کا اندازہ ہے۔ اس دوران میں کوشش کی جائیگی کہ یورپ میں مہاجرین کے تمام کیمپ خالی

(باقی صفحہ ۶۴ پر)

فکاھیہ :

کیا زمانہ آلگا ہے!

تسلیم عارفی



بھائیو! زبان نہ کھلواؤ - سچ نہ بلواؤ - کیوں دار پر کھنچواتے ہو - دیکھتے نہیں کیا زمانہ آلگا ہے - وہ بھی زمانہ تھا جب ہر طرف چہل پہل ، ہر سو گہما گہمی تھی - قدم قدم پر خوشیوں کے سوتے پھوٹتے تھے - اب یہ بھی زمانہ ہے کہ .... بھائیو! میں ذرا کھڑکی سے جھانک کر دیکھ لوں ، کوئی ہماری باتیں نہ سن رہا ہو! — دیکھ لیا - اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ابھی تک اپنی امان میں رکھا ہوا ہے - ہاں تو میں کہہ رہا تھا — کیا کہہ رہا تھا - اب تو اتنا بھی ہوش نہیں رہا - توبہ اللہ — کیا زمانہ آ لگا ہے - ہاں تو بھائیو! اس سنہری دور کو یاد کرتا ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے - کیا کیا نیک کام کئے تھے ہم نے - حج مبارک کے نیک فریضہ ہی کو لے لیجئے - ہر سال اپنی نیک کمائی سے حج کا فریضہ ادا کرتے تھے - بیگمات بھی ساتھ ہوتی تھیں - واپسی پر سونے سے لد کر آتی تھیں - کچھ جاہل لوگ اعتراض بھی کرتے تھے - مگر بھائیو! کیا عورتوں کیلئے سونا پہننا ہمارے مذہب میں ناجائز ہے - یہ عین جائز بلکہ واجب ہے - بلکہ میں تو کہوں گا فرض ہے - کیونکہ سونے کے زیور عورتیں نہیں پہنیں گی تو کیا مرد پہنیں گے؟ مگر بھائیو! اب تو آتے جاتے تلاشیاں ہوتی ہیں - تلاشیاں تو پہلے بھی ہوتی تھیں - مگر اب اور جب میں زمین آسمان کا فرق ہے - اگر یہی صورت حال رہی تو ہم جیسے الحاج حج مبارک کا فریضہ ادا کرنا ہی چھوڑ دیں گے - اور روز قیامت اس گناہ عظیم کی تمام تر ذمہ داری موجودہ حکومت کے سر ہوگی - موجودہ حکومت! سبحان اللہ - یہ نئے لوگ نجانے کس مٹی سے بنے ہیں - صرف تنخواہ پر کام کرتے ہیں - معلوم ہوتا ہے یا تو انکے بیوی بچے ہیں ہی نہیں یا پھر یہ انہیں بھوکا ننگا رکھنے پر تلے ہوئے ہیں - بھائیو! اولاد کی محبت بڑی چیز ہے - مگر یہ خاندانی منصوبہ بندی کرنے والے اولاد کی محبت کیا جانیں - یہ تو یہی جانیں کہ زیادہ بچوں کی پیدائش کو روکا جائے - کیونکہ آبادی اگر ملک کے ذرائع پیداوار سے اتنی بڑھ جائے کہ توازن قائم نہ رہ سکے تو

قوم مفلسی اور تباہی کا شکار ہو جاتی ہے - اخبار میں یونہی لکھا تھا۔ حالانکہ بھائیو! حقیقت یہ ہے کہ فوجی حکومت، جسے یہ جاہل قوم انقلابی حکومت، بھی کہتی ہے۔ لوگوں سے صرف تنخواہ پر گذارہ کرانا چاہتی ہے .... ہمارے سنہری دور میں تو یہ مسئلہ کبھی پیدا نہ ہوا - ہم ہر کام کرانے کے بعد مساوات اور اخوت کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے تمام متعلقہ افسران اور کارندوں کو اپنی نیک کمائی میں سے حصہ دیتے رہے - یوں ایک طرح ہم خیرات دینے کا فریضہ بھی ادا کرتے رہے اور



طرہ باز خاں

اللہ - حالات کیا ٹھیک ہوں گے - کیسا زمانہ آ لگا ہے - کب اس پاگل حکومت سے جان چھوٹے گی - پاگل نہیں تو اور کیا - نہ اسے زر و جواہر سے محبت، نہ رشتہداروں کا لحاظ، نہ دوستوں کا پاس - اور تو اور کسی کاروبار میں یہ فوجی لوگ اپنا حصہ تک مقرر نہیں کرتے - کیا پاگلوں کے سر سینگ ہوتے ہیں - بھئی جو اپنے فائدے تک کی نہ سوچے وہ پاگل نہیں تو اور کیا ہے - اسمگلنگ، چلیئے مان لیتے ہیں بری بات ہے - مگر اس جرم میں دوستوں تک کو جیل بھیج دیا - کہاں کی عقلمندی ہے

ثواب دارین بھی ملتا رہا - فوجی حکومت کی منطق ہی نرالی ہے - یعنی یہ کیا تک ہے کہ چیزیں سستی ہو جائیں تو تنخواہ میں گذارہ ہو سکتا ہے - بھئی! چیزیں سستی ہو جائیں گی تو دکاندار غریب ہو جائیں گے - اور اگر دکاندار ہم جیسوں سے سستے داموں خریدیں تو ہمیں نقصان ہو گا - ایک کروڑ کے پچاس لاکھ رہ جائیں گے - پچاس لاکھ کا نقصان! ہائے میرے

بھائیو! تم نے دیکھا ہوگا ان پاگلوں نے ہمارے کیسے کیسے بزرگوں کو ایسی جگہ پہنچا دیا ہے جہاں ہمارا تصور تک نہیں پہنچ سکتا تھا - کسی نے سچ کہا ہے - انقلابات ہیں زمانے کے - اب تو کسی غیر کے سامنے لب تک نہیں ہلا سکتے - آپ کے سامنے اس لئے زبان کھول رہا ہوں کہ آپ بھی میری طرح فلک کج رفتار کے ستائے ہوئے ہیں۔



سلطانیٔ جمہور

اگر ہم ایک دوسرے کے آنسو نہیں پونچھیں گے تو کیا آسمان سے فرشتے اتر کر ہمارے آنسو خشک کرینگے ؟ بھائیو ! آپ سوچ رہے ہونگے کہ فلک کج رفتار کے معنی کیا ہیں ؟ اس لفظ کے معنی تو میں خود بھی نہیں جانتا مگر مجھے یقین ہے کہ میں نے اسکا استعمال صحیح کیا ہے ۔ کیونکہ میں نے اسے دو موقعوں پر استعمال ہوتے سنا ہے ۔ ایک تو اس وقت جب میرے ایک مولوی دوست کو، جو ہوٹل کا مالک تھا ، صفائی کی سہم کے تحت فوجیوں نے جالی لگانے کا حکم دیا تھا۔ اس وقت اسنے آسمان کی طرف دیکھکر یہ لفظ استعمال کیا تھا ۔ اور دوسرا اس وقت جب ایک بہت بڑے افسر کو جو میرا دوست تھا سرکاری ملازمت سے الگ کر دیا گیا تھا ۔ یہ فوجی کام زیادہ چاہتے ہیں ۔ اور باتیں کم ۔ تو بھائیو! اب اگر میرا دل باتیں کرنے کو چاہے ۔ تو کیا کروں ۔ ظاہر ہے ہونٹ سی لوں ۔ منھ کو تالا لگالوں تاکہ اس حکومت کی خوشنودی حاصل کرسکوں ۔ جی ، خوشنودی ۔ دیکھا آپ نے کیا زمانہ آ لگا ہے ۔

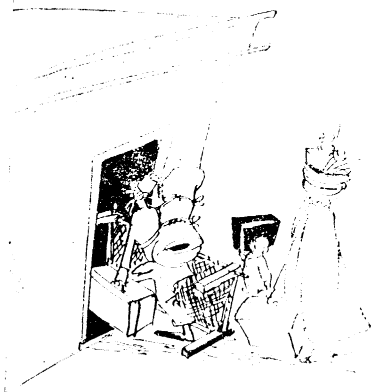


ایں دفتر بے معنی ۔ ۔ ۔ ۔

اللہ تبارک تعالیٰ اُس پرانے زمانے کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے جس میں محکموں کے بڑے بڑے افسر ہم ایسے شریفوں اور رئیسوں کے استقبال کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ اور انتہائی تپاک سے مصافحہ کرتے تھے ۔ دفتر کے کام کاج چھوڑ کر ہماری خاطر مدارات کرتے تھے ۔ مگر اب تو کلرکوں تک کو ایسی ہوا لگی ہے کہ ہمیں پہچاننے کی بھی کوشش نہیں کرتے ۔ اگر ہم سے ایک ذرا سی بھول نہ ہوتی تو یہ جاہل عوام اس فوجی حکومت کو خوش آمدید نہ کہہ سکتے ۔ وہ یہ کہ ہم شریفوں اور رئیسوں کا طبقہ دو تین گروہوں میں بٹ گیا ۔ اور انہوں نے ایک دوسرے سے بڑھکر فائدہ اٹھانے کی خاطر مختلف سیاسی جماعتیں بنا ڈالیں ۔ جو آپس میں جھگڑ پڑیں ۔ اور لوگوں کو بےاطمینانی کے اظہار کا موقع مل گیا ۔ اگر ہم میں اتحاد رہتا تو سیاسی جماعتوں میں بھی اتحاد رہتا ۔ اور یوں ساری عمر یہ کمینے اور بھوکے ننگے لوگ ہم جیسے شریفوں کے سامنے سر اٹھاکر نہ چل سکتے اور فوج کو کبھی موقع نہ ملتا کہ انکی رہائی کیلئے میدان میں اترتے ۔ مگر افسوس ہماری یہ ذرا سی بھول ایک بہت بڑی خطا ثابت ہوئی ۔ جسکا خم — خم — وہ کیا لفظ تھا ۔ ہاں ہاں — خمیازہ ہمیں آج بھگتنا پڑ رہا ہے ۔ مگر بھائیو! غیب کا علم کون

ہم خرما و ہم ثواب!
(حج بیت‌اللہ سے واپسی)





'' سمجھ کر لیجئے . . . . ''

جانتا ہے - عالم الغیب تو بس اللہ ہی کی ذات ہے - لیکن فوج میں ذرا بھی ایمان کی رمق ہوتی تو وہ ہماری صلح کرا دیتی - مگر بھائیو! وہ تو ہمارے خدا واسطے کے دشمن ہیں - ایسے ہم خاندانی شریفوں کا سکھ چین سے رہنا کب گوارہ تھا - بھلا یہ کوئی شرافت ہے کہ زمین کی ملکیت کی حد مقرر کر کے بقیہ ان کمینے اور کنگال کسانوں کے حوالے کر دی جائے جن کے باپ دادا نے بھی کبھی ملکیت کا تصور نہ کیا ہو - جن لوگوں کو ہم سبز باغ دکھاتے تھے اب تو سچ مچ ان باغوں کے مالک بن رہے ہیں - فوجیوں کے کھیل سچ مچ نیارے ہیں - یعنی تیرے نام کی خاطر جو لوگ گھر بار چھوڑ کر پاکستان آئے اور مہاجرین کہلائے انہیں اب آباد کر کے مہاجرین اور انصار کی تمیز ہی ختم کر دی جائیگی - دیکھا بھائیو! مہاجرین کے خلاف کیسی کیسی سازشیں ہو رہی ہیں - گو میں خود انصار ہوں مگر سوچئے تو یوں بھی کسی کو مٹایا جاتا ہے - بھائیو! ایک نئی بات سنی آپ نے - میری مراد بنیادی جمہوریتوں کے قانون سے ہے - آپ حیران نہ ہوں - پہلے میری سمجھ میں بھی کچھ نہ آتا تھا کہ یہ کیا بلا ہے - مگر جیسا کہ آپ کو معلوم ہے مجھے شروع ہی سے علم حاصل کرنے کا شوق رہا ہے - اسلئے معلوم کر ہی لیا کہ اس قانون کے تحت دیہات میں انتخابات ہونگے ، پنچایتیں بنینگی - مگر ہم لوگ انتخابات میں ، جیسی کہ امید ہے ، حصہ نہیں لے سکینگے - صرف غریب اور جاہل دیہاتی اپنے نمائندے چنینگے - اور یوں دیہات کے اکثر ضروری معاملات وہیں طے ہو جایا کرینگے - یعنی آپ سن رہے ہیں - ننگے بھوکے چھوٹے پیمانے پر حکومت کرینگے! ہم شریفوں اور رئیسوں سے پوچھے بغیر اپنے نئے سکول ، ہسپتال اور کھیلوں کے میدان تیار کریں گے - بھائیو! غضب نہ آئے تو کیا آئے - ہر روز ایک نیا اور عجیب تماشہ لگ رہا ہے اس ملک میں - یہ رائٹ لفٹ کرنے والے کیا جانیں کہ سیاست کیا ہے؟ . . . . کیا کہا؟ آپ سمجھائینگے مجھ کو؟ . . . . . عدالت میں لے جا کر؟ تو کیا آپ میرے ہم خیال نہیں ہیں - بھائیو! انہیں کچھ سمجھاؤ - میں تو سمجھا تھا کہ یہ آپ کی طرح میرے ہم خیال ہیں - میری ہی طرح فلک کج رفتار کے ستائے ہوئے ہیں - کیا تمہارے ہوش ٹھکانے لگ جائینگے؟ . . . . یہ میں کیا سن رہا ہوں - توبہ! یا اللہ توبہ - کیا زمانہ آ لگا ہے!!



جانیں تو جانیں
کہاں!
ان فوجیوں نے
تو زمین کا بھی
راضی کر دیا!



طغریٰ : (تیر کمان کا اسلوب : عہد علاء الدین حسین شاہ) باریگرام، مرشد آباد)

مشرقی پاکستان میں خطاطی

اے۔ کے۔ ایم عبد العلیم

قدیم ترین عہد سے خطاطی مسلمانوں کا محبوب فنی شغل رہا ہے۔ مسلم خطاطی دراصل قرآن مجید کی کتابت و تزئین کے ذوق و عقیدہ کی پیداوار ہے۔ مسلمان نہ صرف اس کتاب مقدس کو حفظ کر کے اس کی حفاظت کرتے تھے، بلکہ اس کی جمالیاتی پیشکش کو بھی ایک کار ثواب سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی فنون لطیفہ میں نقاشی سے زیادہ خطاطی کو عروج و قبول حاصل رہا۔ بعض کے نزدیک اسلام میں ذی روح کی تصویر کشی اور صورت گری ممنوع ہے اس لئے شروع ہی سے ذوقِ آرائش و زینت نگاری یا خطاطی کے جوہر نمایاں ہوئے۔ تقویٰ پسند مسلمان فن کاروں نے اپنی صلاحیت اور ذوق جمال کو زیادہ تر اسی کام پر صرف کیا اور یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے اپنے فن کے نمونوں سے ایک چمنستانِ قلم کھلا دیا۔

یوں خطاطی میں جمالیاتی حس کی تسکین کا ویسے بھی سامان موجود تھا کیونکہ عربی اور فارسی حروف کو اقلیدسی اشکال اور ترتیب و آرائش کے خطوط و نقوش میں نفاست کے ساتھ برتا جا سکتا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آہستہ آہستہ، گو غیر محسوس طریقہ پر، اسلامی فنون لطیفہ میں خطاطی کو ایک ممتاز مقام حاصل ہوتا چلا گیا۔ حروف زیادہ تر افقی یا عمودی اشکال میں ہیں۔ اس لئے تجریدی آرائش کے لئے موزوں مسالہ فوراً مل جاتا ہے اور جب ان کی پیچیدہ یا گتھی ہوئی شکلیں ترتیب میں عمودی جائیں تو نت نئے ڈول بنتے چلے جاتے ہیں۔ عمودی حروف سے ڈھانچہ اور ترتیبی آہنگ پیدا کیا جاتا ہے۔ افقی حروف سے توازن اور تسلسل کا نتیجہ مرتب ہونے لگتا ہے۔ بعض حروف کے جوڑ ملانا ضروری ہوتا ہے اس لئے پیچیدہ اشکال بنانے کا رجحان ترقی کرتا رہا۔ قط، شوشہ، دوائر، میدان قلم، اعراب، سطر بندی، بین السطور، بین الفصل نے مل جل کر روپ کا اور ہی جامہ پہنا ہے۔ بعض نمونے ایسے ہوتے ہیں کہ کسی شوشے اور گردشِ قلم کو بھی زوائد میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ کتابتِ حروف میں خوبصورتی کب آنے لگتی ہے اس کا جواب دیتے ہوئے پوپ نے ایک جگہ لکھا ہے:

"اگر حروف و اجزائے حروف خوبی کے ساتھ متوازن ہوں اور ہی کی آ اور لٓ دراز قد ہوں، پٹڑی سیدھی، سطر بندی صحیح اور موٹے باریک، اترتے چڑھتے قط صحیح لگے ہوئے ہوں، عٓ کھلا ہوا اور د۔ نٓ کی طرح نہ دکھائی دے تو ایسی تحریر میں یکسانیت و ہمواری آجاتی ہے اور بین السطور نپا تلا پیدا ہو جاتا ہے، یہی خوبصورتی ہے۔"

خطاطی تمام اسلامی ملکوں میں فروغ پاتی رہی ہے۔ مسلم ہند اور مشرقی پاکستان میں بھی اس ہنر پروری کا دش کی گئی ہے اور نہایت نفیس نمونے اس فن کے پیدا ہوئے ہیں۔ خان بہادر مولوی ظفر حسن نے بجا لکھا ہے کہ اس فن کو ملک ہند میں عروج و ترقی کہیں جا کر مغلوں کے عہد میں حاصل ہوئی۔

مشرقی پاکستان اور خطاطی : اس میں شک نہیں کہ دیگر علوم و فنون کی طرح دہلی ہی خطاطی کا اول مرکز رہا ہے۔ ترک اور پٹھان سلاطین کے عہد میں بالعموم اور مغلیہ سلاطین کے زمانہ میں بالخصوص اس فنِ شریف کو بہت عروج ہوا۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان

دونوں ہی جگہ لوح و قلم کی پرورش بڑے انہماک سے ہوتی رہی [illegible] کی خطاطی کا مطالعہ بجائے اپنی جگہ ایک علیحدہ [illegible] کا محتاج ہے۔ اس جائزہ میں اسی پر نظر ڈالی گئی ہے۔

بنگال میں خطاطی کے بیشتر نمونے زیادہ تر مساجد اور تاریخی [illegible] کی کتبات میں ملتے ہیں۔ جہاں تک میرا علم ہے مشرقی پاکستان میں خطاطی کے موضوع پر کوئی مبسوط کتاب تحریر نہیں ہوئی چند اہم مقالات اور رسالوں میں ان چیزوں کا جستہ جستہ تذکرہ ضرور آتا ہے [illegible] EPIGRAPHIA - INDO - MOSLEM [illegible] ان کتابوں میں شمار [illegible] تاریخ نے بڑی [illegible] اسلامی [illegible] کتبات [illegible] ہیں۔ پاکستان کے اس حصے میں فن خط نے کس طرح نشوونما پائی اور اس کے عہد بہ عہد نمونے کہاں کہاں موجود ہیں ان کا کوئی مبسوط مطالعہ نہ کبھی کیا گیا ہے نہ مواد ہی میسر ہے۔ پھر بھی بعض علمائے تاریخ و آثار نے اس طرف توجہ ضرور کی ہے مثلاً ڈاکٹر اے۔ ایچ۔ دانی نے ۱۵۳۸ء تک کے کتبات بنگالہ کی ایک فہرست مرتب کی ہے۔ لیکن انہوں نے بھی پاکستان کے اس حصہ میں فن تحریر پر کوئی خاص روشنی نہیں ڈالی ہے اور مطالعہ کا یہ پہلو ہنوز تشنہ ہے۔

عجائب خانہ ڈھاکہ کے چند اہم ذخیرے: اس وقت ڈھاکہ کے عجائب خانہ میں مشرقی پاکستان کے کوئی بیس کتبات محفوظ ہیں۔ ان میں سے کوئی چھ الیاس شاہی اور حسین شاہی دور کی یادگار ہیں اور باقی عہد مغلیہ کے۔ "ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال" کے جرنل (۵۲-۱۹۲۲ء) میں ان کتبات کے نمونے طبع ہوتے رہے ہیں۔ نیز "ڈھاکہ ریویو" اور کتاب موسومہ (ANTIQUITIES OF DACCAN) (سید اولاد حسین) میں بھی کچھ نمونے موجود ہیں لیکن ان کتابوں میں بھی فن خطاطی، اس کی خصوصیات اور خوبصورتیوں پر کوئی نظر نہیں ڈالی گئی ہے۔

ضیاء الدین نے اپنی کتاب "اے مونوگراف آن مسلم کیلیگرافی" "A MONOGRAPH ON MUSLIM CALLIGRAPHY" میں مشرقی پاکستان کے فن خط پر بیشک ایک معقول نظر ڈالی ہے۔ مثلاً ایک جگہ وہ لکھتے ہیں: "عہد انگریزی سے قبل بنگال میں آرائشی طغری نگاری کے جو اسلوب نظر آتے ہیں اس کی بہترین مثالیں ہمیں ۱۵ ویں صدی کے مرشد آباد میں نظر آتی ہیں۔" لیکن مشرقی اور مغربی بنگال میں طغری کے علاوہ دیگر خطوں کی پرورش کس طرح بڑے یا ادنیٰ پیمانہ پر ہوتی رہی اس باب میں یہ کتاب بھی خاموش ہے۔ مگر میں اس جائزہ میں یہ بات پیش کرنے کی کوشش کروں گا کہ انگریزوں کی آمد سے پہلے یعنی مشرقی پاکستان کے اسلامی عہد میں صرف طغری کا ہی کام [illegible] تھا بلکہ دوسرے خط مثلاً کوفی، نسخ اور ثلث بھی استعمال کئے جاتے رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ آرائشی خوبی کے لحاظ سے طغری کو زیادہ قبول حاصل رہا اور اس خط کے [illegible] "طغری" کہا جاتا [illegible] کرتا رہا۔ اس عہد میں قرآنی آیات اور غیر تاریخی کتبات میں اسلوب نگارش کچھ زیادہ متفرق [illegible] بلکہ ایک یکسانیت سی ہے۔ کیونکہ قرآن مجید، اور احادیث نبوی [illegible] زیادہ تر "طغری و کوفی" کے ملوان [illegible] کی کتابت قریب قریب ہمیشہ ہی طغری میں دکھائی دیتی ہے۔

قدیم ترین نمونہ ہائے کتابت: کتابت کے سلسلے میں سب سے پرانا نمونہ جو اس وقت ہمارے پاس موجود ہے رکن الدین کیکاؤس (نبیرہ غیاث الدین بلبن) کے عہد (۱۳۰۱-۱۲۹۱ء) کا ہے جو ترہیبی اور گنگارامپور کے کھنڈرات سے دستیاب ہوا ہے۔ رسم عربی ہے اور نسخ کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ شمس الدین الیاس شاہ (۵۷-۱۳۴۲ء) کے عہد کا بس ایک ہی نمونہ دستیاب ہوا ہے۔ یہ نمونہ آج کل کی ایک مسجد سے ملا ہے، یہ عام اینٹ کی بنی ہوئی مسجد ہے اور کلکتہ کے پاس "بنیا پورکور" میں بنی ہوئی ہے۔ یہ کتبہ دو سطروں میں ہے رسم عربی اور خط طغری ہے اور "تحریر" یعنی ارد گرد کی جدول یا حاشیہ کے خط سادہ ہیں۔ اسے بنگالہ کی خطاطی کا بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ حروف کے کھڑے حصوں کو ایسی خوبصورتی کے ساتھ سجا کر مرتب کیا گیا ہے جیسے نیزوں کی قطاریں چلی گئی ہوں۔ سکندر شاہ کے عہد (۱۸ - ۱۳۵۸ء) میں نسخ، ثلث اور کوفی کا رواج بڑھا۔ طغری کو بھی اپنی جگہ مقبولیت حاصل رہی۔ اس وقت بنگال میں خط کوفی کا ایک ہی نمونہ رہ گیا ہے اور وہ مسجد آدینہ میں پایا گیا ہے، جو پانڈوہ کے مقام پر ہے۔ پیش امام کی محراب میں ایک پتھر پر یہ کتبہ کندہ ہے۔ اور قابل دید نمونہ ہے۔ خط کوفی کو قرآن مجید اور سکوں کی کتابت کے لئے عرصہ دراز سے مخصوص رکھا گیا ہے۔ ابتدا میں یہ بالکل سادہ ہوتا تھا۔ مگر بعد کو اس میں پیچیدگی اور طرح اندازی اس طرح کی گئی کہ خط کوفی سے نمائش و زینت اور آرائش و نگارش لطیف کا کام زیادہ لیا جانے لگا۔ اور بارہویں صدی کے پہنچتے پہنچتے خط کوفی ایسی گنجلک تحریر ہو گئی کہ اس کو پڑھنا سوائے

مشاق کاتب و منشی کے اور کسی کے بس کا نہ رہا۔

ہندوستان میں خطِ کوفی کی کمیابی: اس رجحان کے خلاف ایک ردِ عمل بھی ہوا اور ۱۳ ویں صدی عیسوی میں روش بدلنی شروع ہو گئی۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسلامی دنیا سے اس خط کا رواج ہی ختم ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف بنگال بلکہ پورے برصغیر میں خطِ کوفی کے نمائندہ نمونے بہت ہی کمیاب ہیں۔ ہندوستان کی بعض کافی قدیم عمارتوں میں بیشک کچھ نمونے محفوظ رہ گئے ہیں۔ جیسے مسجد قوۃ الاسلام (دہلی: ۱۱۹۱ء) مقبرہ سلطان التتمش (دہلی: ۱۲۳۵ء) اور مسجد اڑھائی دن کا جھونپڑا (اجمیر: ۱۲۰۰ء) مجھے مشرقی اور مغربی پاکستان میں کسی جگہ بھی خطِ کوفی کا کوئی ایسا نمونہ نہیں ملا جسے کوفی کا "عُرفہ اسلوب" کہہ سکتے ہیں۔ اس سلوب میں یہ رعایت رکھی جاتی ہے کہ افقی اور عمودی خطوں کو جھنجے یا جالی کی شکل میں مرتب کرتے چلے جاتے ہیں۔ اسی کا نمونہ گولکنڈہ (دکن) میں دکھائی دیتا ہے (مزار محمد امین۔ ۱۵۹۷ء) اسی طرح کا ایک نمونہ بنگال میں بھی بمقام گنگا رامپور موجود ہے۔ یہ بھی ایک مزار ہے (مولانا عطا شاہ، عہد سکندر شاہ) ۔ اس کتبہ میں بھی چار سطریں قائم کی گئی ہیں۔ رسم عربی اور رواجی ہے۔ خط صاف ثلث ہے۔ یہ نمونہ بڑا ہی نفیس اور پختہ کاری کی اچھوتی مثال ہے اور ابھی تک ثابت و سالم ہے۔

خطِ ثلث میں اینٹ اور تانبے کا نمونہ: جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے جلال الدین محمد شاہ (۱۴۱۰-۳۲ء) کے عہد کا ایک ہی نمونہ دستیاب ہے۔ یہ ایک کتبہ ہے جو ڈھاکہ پاس مندرہ نامی جگہ سے ملا ہے اور اب ڈھاکہ میوزیم میں لا کر رکھ دیا گیا ہے۔ یہ کتبہ پتھر پر ہے۔ رنگ سیاہ ہے۔ ایک رخی کندہ کاری ہے، پشت پر کسی بودھی مورتی کی نمود، مسخ حالت میں، دکھائی دیتی ہے۔ صرف تین سطریں پوری طرح کھدی ہوئی ہیں۔ پانچویں اور چوتھی سطر (جزو اً) پتی کاری کے ذریعہ نمایاں تحریر کی گئی ہیں۔ ڈاکٹر اے۔ ایچ۔ دانی نے ۱۹۵۲ء میں "ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے جرنل میں اسے شائع کرایا تھا اسے نسخ کا نمونہ بتایا گیا ہے لیکن مجھے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے ... ہے۔ وجہ یہ ہے کہ تمام ... جلی میں لکھے گئے ہیں اور ... حروف کے خم و دوائر اور گردش ان کے مقابلہ پر ... جلی ہیں۔ ابو الفضل کا خیال ہے کہ ثلث ایسا خط ہے کہ اس میں ... حصہ دوائر یا نیم دوائر کا ہو

اور یہ خطوط صاف، منقبم ہوں ثلث جلی ہوگا اور نسخ خفی "ثلث میں حروف کی قامت و ہیئت مثلِ خنجر ہوتی ہے بلکہ یوں سمجھئے کہ ثلث ایک تزئینی روش ہے مگر خط فی الاصل نسخ ہی ہے۔

ثلث کا ایک اور نمونہ: ڈھاکہ کی میوزیم میں ایک اور کتبہ بھی محفوظ ہے جو اس شہر کی "ناسی والا گلی" کی کسی مسجد سے حاصل کیا گیا تھا۔ سید اولاد حسین نے اپنی کتاب — NOTES ON THE ANTIQUITIES OF DECCAN میں اس پر نظر ڈالی ہے مگر انہوں نے بھی اس کے فن پر گفتگو نہیں کی ہے۔ کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسجد ناصر الدین محمود شاہ اول (۱۴۵۸ء) کے عہد میں تعمیر ہوئی تھی۔ تحریر دو سطروں میں ہے اور رسم عربی ہے۔ ہر دو سطور کے درمیان افقی تحریری آرائش کی گردشوں میں سے گنبدی دکھائی گئی ہے۔ خط ثلث ہے۔ کتبہ کے دو ٹکڑے ہو چکے ہیں۔ اسی بادشاہ کا ایک اور کتبہ پانڈوا کے مقام پر ملا ہے۔ اس کتبہ میں تیکھے عمودی خطوط کی آرائش بہت بہار دیتی ہے۔ مدقوق حروف کی بیٹھک میں قلم گھٹتا ہوا لگایا گیا ہے۔

رکن الدین باربک شاہ (۱۴۵۹-۷۴ء) کے زمانہ کا ایک کتبہ بشیر ہاٹ میں ملا ہے جو "چوبیس پرگنہ" کا علاقہ ہے۔ کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مجلس اعظم نے ۸۷۰ھ میں کوئی مسجد تعمیر کرائی تھی یہ اس پر نصب تھا۔ کتبہ پر چار سطریں ہیں اور معمولی روش میں بخطِ نسخ لکھی گئی ہیں۔

بنگال میں خطاطی کا دورِ زرّیں: بنگالہ کا بادشاہ علاء الدین حسین شاہ اپنے وقت میں بہت مقبول حکمراں گزرا ہے اور اس کے عہد میں علوم و فنون نے بڑی ترقی کی۔ اس کے دور کو بنگالہ میں خطاطی کا دورِ زرّین کہا جاتا ہے۔ اس بادشاہ کو فنونِ لطیفہ سے خصوصی لگاؤ تھا اور خطاطی کو بطور خاص پسند کرتا تھا۔ بہت سے جرائد میں اس کے عہد کے کتبات شائع بھی ہو چکے ہیں اور انہیں دیکھ کر یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ عہد (۱۴۹۳-۱۵۱۹ء) خطاطی کے عروج کا زمانہ تھا۔

طغریٰ: (مزار محمد امین گولکنڈہ، دکن)

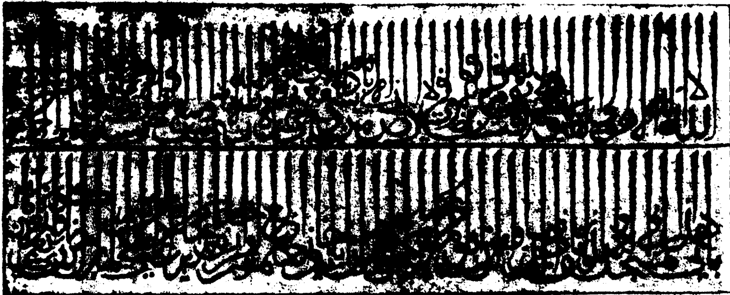
ڈھاکہ کی میوزیم میں ایک اور نادر کتبہ محفوظ ہے۔ یہ حاجی بابا صالح کی مسجد سے ملا تھا۔ یہ مسجد ڈھاکہ کے پاس نرائن گنج میں ہے اور اس جگہ جسے "بندر" کہا جاتا ہے۔ سید اولاد حسین نے اس کتبہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ مگر یہ کس روش میں لکھا گیا ہے اس کی نشان دہی نہیں کی جا سکی ہے۔ کتبہ سے اس بات کا ضرور پتہ چلتا ہے کہ یہ مسجد حاجی بابا صالح نے علاء الدین حسین شاہ کے زمانہ میں تعمیر کرائی تھی چونکہ اس کتبہ کا ایک حصہ ٹوٹ کر گر چکا ہے۔ اس لئے صحیح سنِ تعمیر معلوم نہیں ہو سکتا۔ کتبہ کی زبان عربی ہے اور تحریر کا خط ثلث ہے جسے پیچیدہ آرائش سے مزین کیا گیا ہے حروف کی قامت بلند ہے اور ٹیڑیاں نہایت نفاست کے ساتھ قائم کی گئی ہیں۔ مگر مقابلتہً دائرے کی گردشیں ناقص العمل ہیں۔

فتحِ سلہٹ کا تاریخی کتبہ: "ڈھاکہ ریویو" اور "جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال" ۱۹۱۳ء اور ۱۹۲۲ء میں ایک بہت دلچسپ دو رخہ کتبہ طبع ہوا ہے جو آج کل ڈھاکہ میوزیم میں موجود ہے۔ اس کے خط کا بھی صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکا۔ یہ کتبہ شاہ جلال سلہٹی کے مزار سے حاصل ہوا ہے۔ اور اب تین ٹکڑوں میں ٹوٹ چکا ہے۔ ایک رخ پر جو عبارت درج ہے اس سے سلہٹ کی فتح کا سن معلوم ہو جاتا ہے یعنی یہ کہ مسلمانوں نے ۷۰۳ھ میں فتح کیا جو شمس الدین فیروز شاہ کا عہد تھا۔ خط نسخ ہے اور معمولی، رسم عربی ہے۔ کتبے کے دوسرے رخ کو پڑھنا مشکل ہے کیونکہ تحریر بہت ہی گنجلک ہے اور قلم کو اس طرح گردش دی گئی ہے کہ سرتاسر ایک لہر بنتا چلا گیا ہے اور حروف کی نشست کا سمجھنا یا پہچاننا محال ہو گیا ہے۔ موسم نے اس "پتھر کی لکیر" کو بھی چاٹ لیا ہے!

اب میں کچھ طغریٰ کی بابت کہنا چاہتا ہوں۔ مولوی ظفر حسن کا خیال ہے کہ طغریٰ علیٰحدہ کوئی خط نہیں ہے بلکہ آرائشی نمود ہے جس میں حروف کو اس طرح تانے بانے میں الجھایا جاتا ہے کہ اس کا پڑھنا بڑا مشکل کام ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ کسی بھی روش تحریر کو ایک اچھے ڈھانچہ میں سمو دیا جاتا ہے۔

خطِ طغریٰ کے ابتدائی نمونے: بنگالہ اور مغربی پاکستان وغیرہ میں اس خط کو مغلوں کے عہد سے پہلے بڑا فروغ نصیب ہوا۔ مگر اس بات کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے کہ بنگال میں اس کی مقبولیت کیوں زیادہ ہوئی۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اس خط کو پتھر پر منتقل کرنے کے لئے جن نفاستوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ یہاں قدرتاً موجود ہیں یعنی راج محل کے علاقہ میں پتھر کی چٹانیں۔ یہ پتھر کھدائی کے لئے نرم بھی ہے اور چکنا بھی۔ اس میں دانہ بھی ہوتا ہے جس کی وجہ سے حروف کی نشست بہت خوبصورت آتی ہے۔ یہ پتھر کافی پائیدار بھی ہوتا ہے۔

خطِ طغریٰ کی تین منازل: دورِ مغلیہ سے قبل بنگال میں یہ خط تین منازل سے گذرا۔ دورِ اول میں افقی خطوط تیکھے اور سیدھے تھے اور نیزوں کی باڑھ کی طرح ایستادہ رکھے جاتے تھے۔ انداز نگارش ثلث کا ہے یعنی افقی خطوط میں خم اور نیم دائروں کی گردش شامل ہے دوسرے دور میں ایسا لگتا ہے کہ خاردار نیزوں کا سلسلہ چلا گیا ہے تیسرے دور میں نَ، سَ، شَ، یَ اور بعض دوسرے حروف جو تقریباً مدور ہوتے ہیں، ایک ہی بیٹھک پر لائے گئے۔ یہ خم قوس نما ہوتا تھا بلکہ کمان کی مثال، اوپر کے مستقیم خط ہیں جو نیزوں کی انیاں معلوم ہوتے ہیں، اسی مماثلت کی وجہ سے یہ اسلوب "تیر کمان" کہلایا۔ یہ طغریٰ کا خاص ڈول



طغریٰ: (نفیر کا اسلوب)، (عہدِ علاء الدین حسین شاہ) ساگر دگی، مرشدآباد)

تھا جو بہت مقبول ہوا، بالخصوص خود مختار سلاطین بنگالہ کے عہد میں۔

دکن میں طغریٰ کی روش: بنگالہ کے ساتھ ساتھ دکن میں بھی طغریٰ کو قبول عام حاصل رہا۔ بالخصوص سولہویں صدی میں۔ چنانچہ قطب شاہی حکمراں محمد امین (گولکنڈہ) کے مقبرہ پر سنگی لوح کو دیکھئے (سن ۱۰۰۴ھ)۔ اس کا خط بھی طغریٰ ہے اور بڑا نفیس۔ ایک اور کتبہ حیدرآباد شہر میں ملا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسجد پر نصب تھا اور یہ مسجد ۱۰۳۴ھ میں تعمیر ہوئی تھی۔ اس کا خط بھی طغریٰ ہے۔ میرا خیال ہے کہ دکن کا فن خوشنویسی غالباً بڑی حد تک مشرقی پاکستان کی روش سے متاثر تھا۔ مشرقی پاکستان میں ایک اور روشِ طغریٰ بھی دکھائی دیتی ہے۔ جس کا "نفیر" کی شکل سے تعلق ہے۔ یہ جلال الدین محمد شاہ (سلطان بنگالہ) کے سکوں پر دیکھئے۔ جونپور کے سلاطینِ شرقی نے بھی اس خصوصی روش کو بہت برتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نفیروں کی قطار بندی دور تک چلی گئی ہے۔ یہ عجیب طرز جونپور میں بنگالہ سے پہنچی۔

طغریٰ کے چند اور نادر نمونے: سلہٹ میں ہاٹ کھولہ کے مقام پر ایک مسجد خورشید خاں نے بعہد رکن الدین باربک شاہ (۷۴-۱۴۵۹ء) تعمیر کرائی تھی۔ اس پر ایک سطری کتبہ بزبان عربی ملا ہے۔ خط طغریٰ ہے، مگر خوبصورتی کم ہے۔ لیکن ایک اور کتبہ کلکتہ کی میوزیم میں رکھا ہے۔ جو شمس الدین مظفر شاہ کے عہد کا ہے یعنی (۹۳-۱۴۹۰ء) کا۔ اس نقش میں دو سطریں ہیں۔ زبان عربی ہے۔ ہر سطر کے وسط میں سے ایک افقی خط گزرتا ہے اور روش وہی تیر کمان کی رکھی گئی ہے۔ حسین شاہی خاندان کے دور میں خط طغریٰ میں کچھ اور ہی گل بوٹے لگائے گئے۔ نفاست کے ساتھ باریکی اور پیچیدہ اشکال کی طرف رجحان بڑھ گیا۔ اس کے آگے دیگر خطوط اور طرزیں ماند پڑ گئیں۔ اسی طرح مرشدآباد کے مقام پرمارگرام میں بھی ایک کتبہ ملا ہے یہ علاء الدین شاہ (۱۸-۱۴۹۳ء) کے زمانہ کا تھا۔ یہ بھی ایک مسجد کی تعمیر کو ظاہر کرتا ہے۔ جو کسی امیر ملک عطا نے بنوائی تھی۔ میرا خیال ہے کہ مشرقی پاکستان میں اس سے بہتر طغریٰ کہیں نہیں ہے۔ اس کی طرز بھی تیر کمان کی ہے۔ "ساگرڈگی" نزد مرشدآباد میں علاء الدین حسین شاہ کے زمانہ کا ایک اور کتبہ بھی قابل ذکر ہے۔ اس کی طرز نفیر کی ہے۔ خط بدستورِ قدیم طغریٰ ہی ہے۔ عمودی خطوط ایک جلوس کی طرح بہت سلیقہ اور ستھرائی کے ساتھ مرتب کئے گئے ہیں۔

سلطان ناصر الدین نصرت شاہ کے زمانہ (۳۲-۱۵۱۸ء) کا ایک کتبہ پبنا ضلع کے گاؤں "نیا گرام" میں دستیاب ہوا ہے۔ یہ بھی مسجد کی تعمیر سے متعلق ہے جسے میاں معظم نے تعمیر کرایا تھا۔ دو سطریں ہیں۔ خط طغریٰ ہے۔ بیچ میں سے خط لہریا بناتا ہوا گزرتا ہے۔ قلم بہت معمولی ہے اور فنی آب داری سے عاری ہے۔ اسی بادشاہ کے زمانے کے دوسرے کتبوں میں بڑی نفاست نظر آتی ہے۔ ڈھاکہ کی میوزیم میں سلطان نصرت شاہ کا ایک کتبہ محفوظ ہے جو مشرقی پاکستان کے چند بہترین کتبات میں شمار ہوتا ہے۔ یہ انصار خاں (اشرف پورہ، تھانہ پورپولیس سٹیشن) کے مکان سے دستیاب ہوا تھا۔ کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی ایک مسجد کی تعمیر کے لئے بنا تھا۔ سن تعمیر مسجد ۹۳۰ھ ہے۔ یہ پتھر کی سل سنگ موسیٰ کی ہے۔ اور دو سطروں میں بزبان عربی تحریر ہے۔ خط طغریٰ بیلدار ہے۔ کمان کے ساتھ تیر لگا کر حروف کا ڈول بنایا گیا ہے اور بہت عمدہ نقش تیار ہوا ہے۔ حروف کی قامت، دوائر اور جوڑوں پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ ہر لفظ کے بیچ میں خوبصورت بیلیں لپٹتی ہوئی چلی گئی ہیں۔

یہ بات تعجب کی ہے کہ خود مختار سلاطین بنگالہ کے عہد میں قریب قریب سب کے سب کتبے صرف عربی میں ہیں اور فارسی میں یا عربی فارسی میں ملے جلے، کم ہیں۔ میں تو اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ زبانِ عربی اور علوم عربی کا بنگالہ میں چونکہ بڑا چرچا رہا ہے اس لئے زبان اور خطِ عربی کی طرف رجحان بھی زیادہ رہا ہے۔

خطاطی کے عروج کی کہانی — خلاصہ: مشرقی پاکستان کے علاقے میں خطاطی کے فن کا عروج عہد مغلیہ سے قبل اوج پر رہا۔ مگر مغربی پاکستان کے علاقوں اور شمالی ہند کے دوسرے حصوں میں جو روش تھی اس میں کچھ بہت زیادہ فرق نہ تھا۔ بنگالہ میں تیر کمان اور نفیر کی طرزیں مقبول رہیں۔ دہلی میں جو روش تھی اس کو دیکھئے تو توانائی شکوہ اور شوکت کا احساس ہوتا ہے بنگالہ کی روش میں نفاست اور نادرہ کاری کی طرف میلان زیادہ ہے۔

نستعلیق کی ابتدا: بنگالہ کے مسلمان حکمرانوں نے جب مغلیہ سلاطین کی بالادستی تسلیم کر لی تو بہت سی باتیں بھی اثرانداز ہوئیں۔ خط کے باب میں نستعلیق کا باب اسی وجہ سے شروع ہوا۔ مغربی پاکستان میں نستعلیق کا رواج دورِ مغلیہ سے ہوا اور مشرقی پاکستان بھی اسی اثر کے دائرے میں آگیا۔ پھر تو نستعلیق اتنا چلا کہ دوسرے خط معدوم ہی ہو گئے۔ اکبر کے عہد میں بقول ابوالفضل نستعلیق کو چار چاند لگ گئے۔ ڈھاکہ کی میوزیم میں عہد مغلیہ کے کئی کتبے رکھے ہوئے ہیں مگر یہ خط نسخ میں ہیں۔ ان کی طرزیں دیکھنے سے معلوم ہوتا

ہے کہ دوائر اور قلم کی گردشوں پر خاص زور دیا جاتا تھا۔ نستعلیق خط میں حروف کے دوائر کو بیضوی رکھا جاتا تھا۔ نرائین گنج سے کوئی پانچ میل دور چمپا تالی دیران گنج میں ایک خشتی پل ہے جس پر ایک کتبہ نصب ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لالہ راج مل نے ۱۱۰۲ھ میں تعمیر کرایا تھا یعنی عہد اورنگ زیب میں، چار سطریں ہیں۔ ایک شعر فارسی کا مسلسل چلا گیا ہے۔ روش نستعلیق ہے۔ ایک اور کتبہ بھتی خانہ (ڈھاکہ) کی ایک مسجد میں ملا ہے۔ یہ مسجد ۱۸۹۷ء کے زلزلہ میں تباہ ہو گئی تھی۔ سن تعمیر ۱۱۱۷ھ معلوم ہوتا ہے، عبارت فارسی۔ بانی کا نام مسعود ہے۔ طرز خط نستعلیق ہے۔ مگر معمولی۔ "قدم رسول" کی زیارت گاہ نرائین گنج کے بالمقابل بنی ہوئی ہے۔ اس کی تعمیر غلام نبی خاں نے ۱۱۹۱ھ کرائی۔ اس کا کتبہ بھی قابلِ غور ہے۔ اس زیارت گاہ کی بنا کسی شخص معصوم خاں کابلی نے رکھی تھی۔ اور قدم رسول کا نقش یہاں زیارت گاہ عام ہو گیا۔ سید حسین نے اس کتبہ کی صرف عبارت دینے پر اکتفا کیا ہے۔ زبان فارسی ہے، خط نفیس نستعلیق۔ نستعلیق کا ایک اور نمونہ باقر گنج کی ایک مسجد میں ملا جو سلطان لوری نام کے گاؤں میں واقع تھی۔ اس مسجد کی بنا کسی صاحب غلام محمد نے ڈالی تھی اور یہ ۱۵۱۱ء میں مکمل ہوئی۔ غالباً اس سے بہتر اور نفیس خط نستعلیق پورے مشرقی پاکستان میں کہیں نہیں ملا۔

دور مغلیہ میں نستعلیق کو رواج عام ہوا مگر نسخ بھی نظر سے اوجھل نہ ہوا۔ خود بہادر شاہ ظفر تک کی ایک وصلی خط نسخ میں ملی ہے۔ ملکہ نور جہاں کے اکثر فرامین خط طغریٰ میں لکھے گئے ہیں۔

برصغیر میں بالعموم اور مشرقی پاکستان میں بالخصوص فن خط کی جو روش رہی ہے اس کا مختصر تعارف ان چند سطروں میں پیش کیا گیا۔ اس سے اس بات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سلاطین وقت، امراء اور اشراف وقت نے فنِ خط کو بہت قدر دانی کی نگاہ سے دیکھا اور فنکاروں کی ہمت افزائی کی۔ ان فنکاروں نے اپنے جو جوہر دکھائے ہیں ان سے نہ صرف پرورش لوح و قلم ہوتی رہی ہے بلکہ تاریخ بھی محفوظ ہو گئی ہے۔ اگر یہ کتبے، کتابے اور وصلیاں نہ ہوتیں تو عمارتیں اور احوال و واقعات سب گوشۂ گمنامی میں ہوتے اور ان کی خاموشی کی وجہ سے ان کی تاریخی اہمیت کم ہو جاتی ؎

اک شمع رہ گئی تھی — بقیہ صفحہ ۱۹

ہے۔ باوجودیکہ موضوع کے اعتبار سے ان کی غزلیں بھی اصلاحی اور ملی مضامین کی حامل ہیں اور بعض موقعوں پر وہ خالص فلسفیانہ انداز اختیار کر لیتے ہیں، لیکن انہوں نے غزل کے فطری مزاج اور اس کی روایتی دلکشی اور رکھ رکھاؤ کو حالی کی طرح بڑے فن کارانہ طور پر قائم رکھا ہے۔

ابھی تک کافری سے عقل ایماں تک نہیں پہونچی
کہیں دیر و حرم کے درمیاں معلوم ہوتی ہے

زاہد شعورِ حسن سے بیگانہ ہی رہا
حسنِ نظر نہیں ہے تو حسنِ عمل کہاں

کی مسلماں نے ترقی جو فرنگی بن کر
وہ فرنگی کی ترقی ہے مسلماں کی نہیں

ہر شخص بنا لیتا ہے اخلاق کا معیار
خود اپنے لئے اور زمانے کے لئے اور

ہمت ہے تو پیدا کر فردوس حیاتِ اپنا
بخشی ہوئی جنت سے دوزخ کا عذاب اچھا

مندرجہ بالا اشعار خالصتاً اقبالؒ کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ خصوصاً وہ مسلسل غزل جسے انہوں نے "خطیب سے خطاب" کا عنوان عطا کیا ہے:

ذوقِ ایثار و عمل کا نہ سمجھے ہے نہ مجھے
زیست اس طرح کی زیبا نہ تجھے ہے نہ مجھے

شاید یہ اقبال کی اس نظم کی صدائے بازگشت ہو کر:

ہوس منزلِ لیلیٰ نہ تو داری و نہ من

انہوں نے اپنی غزل کے بارے میں ایک جگہ کہا ہے ؎

تعریف ہو کہ طنز یہ تھا ان کا تبصرہ
پہونچا ئی ہے اسد نے کہاں سے غزل کہاں

اسے شاید ہی تعلّی کہا جا سکے۔ جب بات غزل کی چل نکلی ہے تو آیئے، غزل کے کچھ اور موتی بھی رول لیجئے:

خلافِ موج بھی اکثر اسے رواں پایا
ضرور کشتیٔ دل میں سوار ہے کوئی

دل بے تاب کرے کیوں نہ طوافِ [illegible]
ہے سفر ختم مگر شوقِ سفر باقی ہے

اسی سے بجھتی ہے شمع اور اسی سے روشن ہے
خبر نہیں یہ ہوا دوست ہے کہ دشمن [illegible]

ترکِ الفت کا بہانہ مری حالت سے [illegible]
مشکل اربابِ ہوس کی ہوئی آساں مجھ [illegible]

وہ بوالہوس بھی جنہیں جرأتِ گناہ نہیں [illegible]
اور اب بھی ڈھونڈ رہے ہیں علاجِ تشنہ لبی

آ گیا حضرتِ واعظ کی زباں پر بھی [illegible]
یاد تھے اہلِ محبت کے جو افسانے [illegible]

خیال کو بھی [illegible] سبز نگاہ کرتا [illegible]
مری نظر میں مصورِ گناہ کرتا ہے

حضرتِ ناصح کے چہرے پہ جو ہیں آثارِ کیف
پند ترک مے میں بھی شاید سرورِ بادہ ہے

جو کوئے یار کو جاتے ہیں ہوشیار رہیں
کہ خلد راہ میں پڑتا ہے امتحاں کے لئے

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اسد ملتانی کے کلام میں زبان و بیان کی طلسم کاریاں نظر نہ آئیں گی۔ ان کے کلام میں بیشک جذبی فرسودگی بھی ملیں گی لیکن شدتِ احساس اور خلوصِ مقصد ان کے کلام کی جان ہے جس سے ساری کوتاہیاں خود بخود نظر سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ اپنے ہم وضع پیشروؤں، حالی اور اقبال کی طرح اسد ملتانی کے کلام کا بیشتر حصہ روایتی تفریحی عنصر سے مبرّا ہے۔ ان کی تمام تر کوشش یہی ہوتی ہے کہ کسی طرح ہمارے روحانی اور ذہنی جمود کو دور کر کے زندگی کے صحیح اور صالح عمل کے راستے پر گامزن کر دیں۔ وہ بالطبع صلح جو اور امن پسند ہیں اس لئے ان کے یہاں جوشیلے انقلابی تاثرات کا فقدان ہے۔ وہ "ستائش کی تمنا" اور "صلہ کی پروا" کئے بغیر اپنے حقیقی تاثرات عوام تک پہونچانا چاہتے ہیں اسی لئے وہ ظاہری شاعرانہ طمطراق کو نظر انداز کر کے موضوع کی جزئیات کو بڑے سیدھے سادے انداز میں پیش کر دیتے ہیں۔ وہ سارا زورِ کلام جذبات کی عکاسی پر صرف کرتے ہیں۔

مہاجرین کا عالمی سال — بقیہ صفحہ ۵۲

بقیہ صفحہ ۵۲

کرا دئیے جائیں۔ اس اہم کام کے ساتھ ساتھ ان مہاجرین کی آبادکاری کو ترجیح دی جائیگی جو یورپ سے ترکِ وطن کر کے مشرقِ بعید میں پڑے ہیں۔ ان کی واپسی کے لئے تین ہزار آٹھ سو ویزا تیار کرائے ہیں اور مصارفِ سفر کے لئے ساڑھے بائیس لاکھ ڈالر جمع ہونے ہیں۔

جیسا کہ شروع میں لکھا گیا ہے جنرل اسمبلی نے ۵ دسمبر ۱۹۵۸ء کی قرارداد میں اقوامِ متحدہ کے سکریٹری جنرل سے بھی یہ درخواست کی تھی کہ وہ مہاجرین کے عالمی سال کو فروغ دینے میں ایسے اقدامات سے کام لیں جو ان کے نزدیک معقول اور مناسب ہوں۔ چنانچہ انہوں نے مسٹر کلاڈ ڈی کیموِ لاریا کو اپنا خاص نمائندہ مقرر کر کے ہدایت کی کہ وہ ساری دنیا کا خصوصاً ان ملکوں کا جہاں مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ درپیش ہے، دورہ کرتے ہوئے حکومتوں کو مشورہ دیں کہ وہ عالمی سال میں شریک ہو کر اس دشوار کام کو جلد پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی صورت پیدا کریں۔

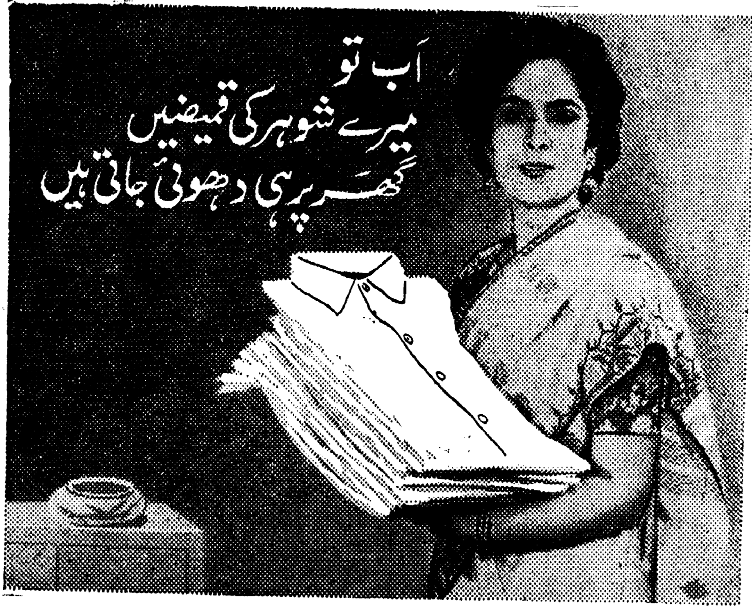
مسٹر کیموِ لاریا اس غرض سے ایشیائی ملکوں کا دورہ کرتے ہوئے پچھلے سال ماہ اگست میں پاکستان میں آئے تھے۔ انہوں نے پاکستان کے وزیرِ خارجہ اور وزارتِ آبادکاری کے اعلیٰ افسروں سے تبادلۂ خیالات کیا۔ ان کو بتایا گیا کہ پاکستان میں یہ مسئلہ کچھ عرصہ پہلے یقیناً دشوار معلوم ہوتا تھا اور کسی طرح اس کا آخری حل نظر نہیں آتا تھا لیکن نئی حکومت نے روزِ اوّل سے اس مسئلے پر خاص توجہ دے رکھی ہے۔ نہایت تیزی سے مکانات تعمیر ہو رہے ہیں اور مہاجرین کی مستقل آبادکاری عمل میں آرہی ہے یہاں تک کہ چند ماہ بعد یہ مسئلہ باقی نہیں رہیگا۔ تاہم ارباب حکومت نے مسٹر کیموِ لاریا کو یہ اختیار بھی دے دیا کہ وہ مہاجرین کے عالمی سال میں پاکستان کی شرکت کا اعلان کر دیں۔

مسٹر کیموِ لاریا دنیا بھر کا دورہ کرنے کے بعد اقوامِ متحدہ کے صدر مقام پر واپس پہنچ گئے ہیں۔ ان کے ایک تازہ ترین اعلان سے پتہ چلتا ہے کہ اس عالمی سال کی تقریب میں چونسٹھ ملک اور پانچ علاقے شرکت کر رہے ہیں۔ ان چونسٹھ ملکوں کے نام یہ ہیں: پاکستان، افغانستان۔ ارجنٹائن۔ آسٹریا۔ آسٹریلیا۔ بلجیئم۔ بولیویا۔ برازیل۔ برما۔ کمبوڈیا۔ کینیڈا۔ سیلون۔ چلی۔ جمہوریتِ چین۔ کولمبیا۔ کوسٹاریکا۔ کیوبا۔ اسرائیل۔ اٹلی۔ جاپان۔ اردن۔ جمہوریت کوریا۔ لے اوس۔ لبنان۔ لائبیریا۔ لکسمبرگ۔ میکسیکو۔ موناکو۔ مراکش۔ نیدرلینڈ۔ ناروے۔ ڈنمارک۔ ڈومنیکن ریپبلک۔ ایکویڈور۔ وفاق ملایا۔ فن لینڈ۔ فرانس۔ وفاقی جمہوریت جرمنی۔ گھانا۔ یونان۔ گواٹی مالا۔ ہائیٹی۔ ہولی سی۔ ہونڈورس۔ آئس لینڈ۔ ایران۔ آئرلینڈ۔ پاناما۔ پیرو۔ فلپین۔ پرتگال۔ سویڈن۔ سوئٹزرلینڈ۔ تھائی لینڈ۔ تیونس۔ ترکی۔ متحدہ عرب جمہوریت۔ برطانیہ۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ۔ اروگوئے۔ وینی زوئیلا۔ جمہوریتِ ویت نام اور یوگوسلاویہ۔ ان کے علاوہ شرکت کرنے والے پانچ علاقوں کے نام برطانوی ہونڈورس۔ گابیا۔ ہانگ کانگ۔ سنٹ لوسیا (ویسٹ انڈیز) اور یوگنڈا ہیں۔

"ماہِ نو" میں مضامین کی اشاعت سے متعلق شرائط

(۱) "ماہِ نو" میں شائع شدہ مضامین کا معاوضہ پیش کیا جائے گا۔
(۲) مضامین بھیجتے وقت مضمون نگار صاحبان "ماہِ نو" کے معیار کا خیال رکھیں اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالہ یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔
(۳) ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر حوالہ جات دینا ضروری ہیں۔
(۴) ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔
(۵) مضمون کے ناقابلِ اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔
(۶) ایڈیٹر کو مسودات میں ترمیم کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔
(۷) مضامین صاف اور خوشخط کاغذ کے ایک طرف تحریر کئے جائیں اور مکمل صاف پتہ درج کیا جائے۔





سنلائٹ سے یہ کِس قدر آسان ہو گیا ہے

سنلائٹ کا نیا جادو اثر جزو کثرت سے جھاگ دیتا ہے جسکی بدولت دھلائی کا کام بہت آسان ہو گیا ہے۔ نہ کسی مشقت کی ضرورت ہے نہ کوٹنے پیٹنے کی، بس معمولی سا کپڑوں کو ملئے اور دیکھئے کہ سنلائٹ انہیں کتنے ستھرے اور عمدہ دھوتا ہے۔
سنلائٹ سو فیصدی خالص صابن ہے اِس لئے اس میں دھلے ہوئے کپڑے زیادہ عرصہ تک چلتے ہیں۔ اس کے بکثرت جھاگ کی بدولت آپ تھوڑے سے سنلائٹ سے بہت سارے کپڑے دھو سکتی ہیں اور اسکا ملائم جھاگ آپکے ہاتھوں کی جلد کو بھی خراب نہیں کرتا



سنلائِٹ صَابن

پٹخے بغیر کپڑوں کو

سفید اور اُجلے

دھوتا ہے!

S.24-195 UD

ماہِ نو

جلد ۱۳ — شمارہ ۸

اگست ۱۹۶۰ء

مدیر: رفیق خاور — نائب مدیر: ظفر قریشی

چندہ سالانہ: پانچ روپے آٹھ آنے — شائع کردہ: ادارۂ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس ۱۸۳۔ کراچی — آٹھ آنے

"انقلاب۔ اے انقلاب"

آفاق حسین آفاق

چودھواں اگست چودھویں بار! مگر اب کی چودھواں اگست اس شکل میں نہیں آیا جس میں یہ مسلسل بارہ سال آتا رہا ہے۔ اپنی تردید اور جمہور کے ذوقِ آزادی کی تضحیک کرتا ہوا، ان بنیادی مقاصد کی نفی کرتا ہوا جن کے لئے ہم نے سالہا سال جد وجہد کی تھی اور ہمارا وطن پاکستان عمل میں آیا تھا۔ اب کی یہ ۲۷ اکتوبر کے روپ میں آیا جس نے ہماری قومی زندگی کا رُخ موڑ دیا۔ وہ حقیقی روپ جس میں اِسے اُس وقت آنا چاہیئے تھا جب کہ آزادی کی سحر طلوع ہوئی۔ مگر قدرت کو شاید یہی منظور تھا کہ ابھی کچھ دیر اور تاریکیٔ شب کا دور دورہ رہے اور یہ سحر ایک مدت بعد طلوع ہو تاکہ یہ اور بھی تابناک ثابت ہو۔ اور جب ظلمات کے بادل چھٹ جائیں تو اس کی تند و تیز روشنی ملک کے گوشے گوشے میں پھیل جائے۔

۱۴ اگست کے ۲۷ اکتوبر کے روپ میں آنے کے معنی کیا تھے؟ یہ کہ آزادی حقیقی معنوں میں آزادی ہو، استقلال صحیح معنوں میں استقلال ہو، حکومت صحیح معنوں میں عوام کی حکومت ہو، قوم صحیح نہج پر اقدام کرے، عروج و ترقی کی راہیں وا ہو جائیں، کاروبارِ ملک درست طور پر انجام پائے، مایوسیاں امیدوں، ناکامیاں کامیابیوں اور تاریکیاں تابناکیوں میں تبدیل ہو جائیں، زندگی مکروہات سے پاک ہو کر تندرست، ہشاش بشاش اور باوقار بنے اور ہر اعتبار سے پاکستان جیسے آزاد اسلامی ملک کے شایانِ شان ہو، وہ حیات جو بندگی میں گھٹ کر جوئے کم آب بن گئی تھی آزادی سے ہم کنار ہو کر بحرِ بیکراں بن جائے۔ ۲۷ اکتوبر کے بعد جو کچھ ہوا وہ درحقیقت اس ۱۴ اگست سے گم شدہ مفہوم و مقصود کی بازیافت، اُس کو روبہ عمل لانے اور اُس کی بیش از پیش توسیع و ترقی کے سوا اور کچھ نہیں۔ اب ۱۴ اگست اور ۲۷ اکتوبر ہمیشہ کے لئے مدغم ہو گئے ہیں۔ اور ہماری تمام قومی تاریخوں کے دھارے ایک ساتھ موجزن ہیں۔ اس لئے آج آزادی کے دن دورِ انقلاب کے تابندہ مقامات پر نظرِ بازگشت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

ہمارے انقلاب نے اِس تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کی ہیں کہ جو بات کل اتنی بڑی معلوم ہوتی تھی آج اتنی ہی چھوٹی معلوم ہوتی ہے۔ چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، ناجائز درآمد برآمد، نفع اندوزی، سیاسی بد دیانتی، بدعنوانی، دفتری بدنظمی و نااہلی، اقتصادی افراتفری، مہاجرین کی زبوں حالی، معاشرتی بے راہ روی، زرعی نظام کی خرابیاں، یہ اور بے شمار اور باتیں زندگی کی پیشانی پر بدنما داغ تھیں۔ اور انہیں جلد از جلد مٹانے کی سر توڑ کوشش کی گئی۔ یہ غیر معمولی باتیں آج کتنی معمولی معلوم ہوتی ہیں! اس لئے کہ انقلاب کی تیز رفتاری اب ان سے کہیں آگے نکل چکی ہے۔ اور یہ اُفق پر نہایت آب و تاب سے جگ مگ کرتے ہوئے ستارے اب دھندلے دھندلے نقطے بن کر نظروں سے اوجھل ہوئے جاتے ہیں۔ ایک حقیقی معنوں میں ترقی پذیر ملک و قوم میں ایسا ہی ہونا چاہیئے ؎

پلٹ کر یہ سرمستِ کیفِ خودی
کہیں اپنا رستہ نہیں دیکھتی

لہٰذا اب ہمیں ان کارہائے نمایاں کو دُہرانے کی ضرورت نہیں جو اب سے پہلے گزر چکے ہیں۔ اگرچہ یہ پاکستان اور انقلابی حکومت کی تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ روشن رہیں گے۔ اب تو ہم ابتدائی مرحلوں سے گزر چکے ہیں اور شاید اِن قصہ ہائے پارینہ کا ذکر ہمارے لبوں پر تبسم لائے بغیر نہ رہ سکے۔ اب ہم زیادہ بنیادی، زیادہ تعمیری، زیادہ ترقیاتی امور کی طرف تیزی سے بڑھ رہے ہیں اور ہماری توجہ ایسے امور، ایسے مقاصد کی تحصیل پر مرکوز ہے جو ہمیں اور ہمارے محبوب وطن کو زندہ تر اور پائندہ تر بننے میں مدد دیں۔ یہی بات کہ ہم

اب حکومت کے گذشتہ کارناموں کو دُھرانا چنداں ضروری خیال نہیں کرتے، اس بات کی دلیل ہے کہ ہماری نظر اب اس کی زیادہ اہم موجودہ سرگرمیوں اور آئندہ مقاصد پر ہے۔ اور وہ نہ اتنے کم ہیں نہ اتنے کم شاندار کہ ہم اُن کو مرکزِ توجہ نہ بنائیں۔ اس وقت جن معاملات پر حکومت اور عوام کی توجہ یکساں طور پر مرکوز ہے، وہ معاشرہ کی اصلاح، تعلیم و قانون کی اصلاح، دستورِ اساسی کی تشکیلِ نو، غذائی خود کفالت، ملک کی ہمہ جہتی صنعتی، زرعی اور اقتصادی ترقی، بنیادی جمہوریتوں اور ترقی دیہات کو بطریقِ احسن معرضِ عمل میں لانا، زرِ مبادلہ میں مسلسل اضافہ، افراطِ زر سے بچاؤ، معاشرتی فلاح و بہبود، صحت و صفائی اور خاندانی منصوبہ بندی ہیں۔ جہاں تک رفاہی اور ترقیاتی کوششوں کا تعلق ہے ان سب سے نمایاں اور بہترین مظہر ایک اور صرف ایک ہے: دوسرا پنجسالہ منصوبہ جو ہر اعتبار سے ایک نہایت اہم اور معرکہ آرا سنگِ میل ہے۔ اور اس سے جو نتائج متصور ہیں ان کی علامات ابھی سے صاف صاف دکھائی دے رہی ہیں۔ اس لئے کہ اس مہتم بالشان منصوبے کے مقاصد ہیں۔ قومی آمدنی میں ۲۰ فیصدی اور صنعتی پیداوار میں ۵۰ فیصدی اضافہ اور ۳۰ لاکھ افراد کو ملازمت کے مواقع بہم پہنچانا۔ ظاہر ہے کہ یہ نتائج کس قدر دور رس ہیں اور جس لگن، جس والہانہ جذبہ کے ساتھ حکومت اس کو جلد از جلد عملی جامہ پہنانے کے درپے ہے، اس کا کوئی جواب نہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم اور حوصلہ افزا بات خود قائدین قوم کا ذہنی رجحان ہے جو کسی بے روح قدامت اور روایت پرستی کے قائل نہیں۔ ان کا نظریہ زندہ، ذی فہم، معاملہ شناس اور زمانے کی رفتار اور تقاضوں کو جاننے والے انسانوں کا رویّہ ہے۔ جو کچھ ہے۔ مذہب، سیاست، قانون، تعلیم — انسان کے لئے، زندگی کے لئے ہے۔ کورانہ تقلید اور پرستاری کے لئے نہیں۔ ہمارے رہنما نظریاتی بھول بھلیوں میں اُلجھنے کی بجائے زندگی کے مسائل اور معاملات سے نبٹنے کی پرخلوص کوشش کرتے ہیں اور قوم میں بھی یہی روح پھونک دینا چاہتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اگر ہمارا مطمع نظر زندگی بسر کرنا ہے اور بطریقِ احسن بسر کرنا ہے، تو اُس کا واحد راستہ وہی ہے جو ہمارے بیدار مغز قائدین اختیار کر رہے ہیں۔ آخر خالی خولی نظریوں اور کتابی باتوں سے کیا حاصل؟

تو شمشیری ز کامِ خود بروں آ
بروں آ از نیامِ خود بروں آ

فوجی روحِ عمل، توانائی اور اثبات کی روح ہے۔ اور اس کی جولانگاہ زندگی کا میدانِ بے پایاں۔ اس لئے قائدین قوم خود بھی اس میدان میں سرگرمِ کار ہونا چاہتے ہیں اور ہمیں بھی اسی میں سرگرمِ عمل دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہمارا مسلک تجرباتی ہے۔ کوئی بات طے شدہ نہیں۔ ناقابلِ تبدیل نہیں۔ تجربہ ہمارا سب سے بڑا ممد و معاون اور مشیر ہے۔ اگر اس سے یہ ظاہر ہو کہ کوئی بات ہمارے لئے موزوں نہیں تو اسے بلا تامل مسترد کر دینا چاہئے۔ اگر ہماری ہم مذہب اقوام ہماری طرف دستِ تعاون نہیں بڑھاتیں یا ہمارے مقاصد اور ہماری قومیت کے خلاف ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم محض ایک آدرش کے پورا ہونے کے خواب دیکھتے رہیں اور خود کو کمزور سے کمزور تر کرتے چلے جائیں۔ ہم کیوں نہ پہلے اپنی قومیت کو مستحکم کریں تاکہ دوسری قومیں ہمارے تعاون کی خواہاں ہوں۔ آج جب پیکارِ حیات شدید سے شدید تر ہوتی چلی جا رہی ہے، ہمیں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی اور بھی ضرورت ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم اپنی خودی کو مستحکم کریں اور وہ اثباتی مشرب اختیار کریں جس کی ہمارے بیدار مغز قائدین، خصوصاً صدرِ پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نشاندہی کر رہے ہیں۔

★

کِرنوں کی راہ

سید ضمیر جعفری

یہ نظم ان شمعوں میں سے ہے جو شوق و شعور کی مدد سے وقت کے ہاتھ پہ کبھی کبھی جلتی ہیں۔ اور وہ کبھی ایک ہی رات میں ایہ کیفیت لئے ہوئے کہ: جلتی ہیں تو ان کی لَو پر صدیاں آگے چلتی ہیں۔ یعنی این طفلِ یک شبہ رہِ صد سالہ می رود۔ ہمیں مسرت ہے کہ یہ نئی شمع ایک نئے علائی نے نئے غالب سے روشن کروائی ہے جس نے "دورِ نو" کی ننھی معصوم کرن کی طرح ایماو اشارہ کی تابانیوں سے کتنے ہی شمس و قمر ایجاد کئے ہیں۔ یہ تابانیاں ایسی ہیں جنہیں شوق و شعور کی نظر ہی سے دیکھنا موزوں ہے۔ مدیر

خوابوں نے جو پھول چُنے تھے اُن پھولوں کو رنگ ملا
جذبے گھُل کر گیت بنے، گیتوں کو سجل آہنگ ملا
من کے چُپ چُپ رستے سندر چاپوں سے آباد ہوئے
اک معصوم کرن سے کتنے شمس و قمر ایجاد ہوئے
ریشم سی گلرنگ امیدیں جاگ اٹھیں ارمانوں میں
چاہت کا رس لے کر خوشبو پھیل گئی ویرانوں میں
شامیں اپنی نرم ملاحت میں یکسر رعنائی ہیں
صبحیں اپنا سارا سونا چوٹی پر لے آئی ہیں
ذہن چمکتا پانی ہے اَن دیکھی روشن جھیلوں کا
فکر نکھرتا جوبن ہے شاداب سنہرے ٹیلوں کا
چمکے چمکے موتی لمحے رنگ افروز خیالوں کے
دمکے دمکے کندن چہرے خوش خوش جینے والوں کے
وقت کے ہاتھ پہ شوق و شعور کی شمعیں کب کب جلتی ہیں
جلتی ہیں تو ان کی لَو پر صدیاں آگے چلتی ہیں

"سنتے ہیں کہ بہاراں ہے"

جمیل نقوی

ابر آتا تھا، برستا تھا گزر جاتا تھا
لذت درد سے احساس کو بھر جاتا تھا
بیٹھ جاتا تھا جو نم ہو کے فضاؤں کا غبار
چہرۂ گردشِ حالات نکھر جاتا تھا
پھر وہی تند بگولے تھے، وہی بادِ سموم
پھر سے شیرازۂ گلزار بکھر جاتا تھا

اس سے پہلے بھی کئی بار ہوا ہے ایسا
ابر آیا تھا برستا ہوا بے تابی سے
وائے بر حسنِ نظارا کہ خلافِ فطرت
باغ محروم رہا رنگ سے شادابی سے
گدگدایا تو بہت بادِ صبا نے لیکن
لالہ و گل کبھی جاگے نہ گراں خوابی سے

اور بڑھ جاتا تھا سہمے ہوئے سبزہ کا جمود
ہو کے رہ جاتا تھا معدوم بہاروں کا وجود
سادگی روپ دکھاتی نہ تھی تا حدِ نظر
اور ہو جاتی تھی دھندلی رخِ گلشن کی نمود
کچھ اس انداز سے آتی تھیں صدائیں پیہم
جیسے دم توڑنے لگتا ہو ہواؤں کا سرود

لیکن اس بار کچھ اس شان سے برسی ہے گھٹا
جس طرح فرطِ مسرت سے کوئی رونے لگے
روبرو دیکھ کے سلمائے تصور کا جمال
گردِ غم آئینۂ دل سے کوئی دھونے لگے
جس طرح مل کے برسنے لگیں ساون بھادوں
خس و خاشاک کی تقدیر چمن ہونے لگے

یک بیک سارے گلستاں کی فضا جاگ اٹھی
شاخِ گل جاگ اٹھی، سرو و سمن جاگ اٹھے
یوں چلی بادِ صبا ٹوٹ گئی مہرِ سکوت
دشت و در جاگ اٹھے، کوہ و دمن جاگ اٹھے
مژدہ اے اہلِ جنوں فصلِ بہار آ پہنچی
لے کے انگڑائی جوانانِ چمن جاگ اٹھے

ہماری قومی شاعری کے نئے تیور

رفعت جاوید

زندگی کے مد وجزر کے ساتھ شعر وادب میں بھی اُتار چڑھاؤ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اور شاعری تو خاص جذبات کی زبان ہے۔ پھر زندگی میں جو ہیجان پیدا ہوں وہ شاعری پر کیسے اپنا اثر نہیں چھوڑیں گے۔ کبھی ہنگامی، کبھی دیر پا۔ یہ ضروری نہیں کہ سیاسی شاعری بالعموم سطحی یا ہنگامی ثابت ہو۔ اس میں شاعروں کی صلاحیتوں کو بھی کافی دخل ہوتا ہے۔ ممکن ہے کوئی معمولی واقعہ کسی شاعر کی شعلہ نوائی سے اس طرح چمک اٹھے کہ ہم اس میں ایک نئی شان محسوس کریں۔ یا بڑے سے بڑا واقعہ بھی بالکل معمولی معلوم ہو۔ شبلی کی شاعری زیادہ تر سیاسیات میں ڈوبی ہوئی ہے۔ خواہ وہ ملکی ہوں یا بین الاقوامی۔ لیکن اس کی دلچسپی آج بھی برقرار ہے۔ کیونکہ اس میں شبلی کے دل زندہ کی حرارت اور ہنگامہ آرائی کارفرما ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ "اے ترک اے مجسمۂ کبریائے حق" یا حادثۂ کانپور پر ولولہ انگیز نظمیں آج بھی ہمارے دلوں کو تڑپاتی اور روحوں کو گرماتی نہیں؟ اقبال نے کتنے ہی ہنگامی موضوعات پر قلم اٹھایا۔ کشمیر، وطن، قومی ترانے، حادثۂ شہید گنج، طرابلس، ہنگامۂ بلقان، فاطمہ، شفاخانۂ حجاز وغیرہ وغیرہ۔ لیکن وہ آج بھی اسی طرح مقبول اور تر وتازہ ہیں جس طرح وہ پہلے تھے۔ اور ایسے شاہکاروں کی حیثیت رکھتے ہیں جو شاعری کے لئے ہمیشہ سامان ناز رہیں گے۔ مغربی شعرا میں شیلے اور بائرن کی آتشیں روحوں نے عام سیاسی واقعات کو حسن جاوداں عطا کر دیا۔ ٹنی سن نے ایک معمولی جنگی حادثے کو اس گرم جوشی کے ساتھ پیش کیا کہ اس کی نظم آج تک ایک یادگار حیثیت رکھتی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد ہماری زندگی بھی غیر معمولی واقعات اور ہنگاموں سے خالی نہیں رہی۔ فسادات، المیۂ کشمیر، سقوط حیدرآباد، قیام جمہوریہ اور ان سب سے بڑھ کر موجودہ انقلاب۔ یہ سب ایسے موضوعات میں جن سے دل و دماغ گوناگوں جذبات واحساسات کی جولانگاہ بن جاتے ہیں اور ان میں شعر وفن کی نمود کے بڑے وسیع امکانات ہیں۔ ہمارے شاعروں نے ان حالات وواقعات سے اثر پذیری کا کافی ثبوت دیا ہے۔ مگر شاید شعری صلاحیتوں کا زیادہ وسیع اور بلند تر اظہار کسی ایسے دور کا منتظر تھا جس میں وہ آشوب، وہ پریشاں حالی، وہ خلفشار نہ ہو جو سالہا سال علمی وادبی جوہروں کے پنپنے اور شعر وادب کے پروان چڑھنے میں سد راہ رہا۔ ہمارے موجودہ انقلاب سے یکایک ایک خوشگوار تبدیلی رونما ہوئی۔ محرومیوں اور مایوسیوں کے دَل بادل دور ہو گئے، گھٹا ٹوپ فضا نکھر گئی اور حقیقی آزادی واستقلال کی پُرکیف روشنی سے نگاہیں ایک نئی تازگی، فرحت اور جِلا محسوس کرنے لگیں۔ اس روشن فضا کا اثر لازم تھا۔ چنانچہ اس دور کے طلوع ہوتے ہی شاعری میں بھی ایک نئی آب و تاب پیدا ہوئی۔ اپنے اردگرد ایک نیا ماحول پاکر شاعروں نے بھی اپنے دل میں ایک چمک، ایک نیا ولولہ، ایک نئی ترنگ محسوس کی۔ ان کا حسنِ طبع یک بیک پوری شدت سے نمایاں ہوا۔ دل کی تپش کے ساتھ طبیعت کے جوہر بھی چمک اٹھے۔ جن کی جھلک بعض نہایت عمدہ پاروں میں نظر آتی ہے۔ یہ پارے ہماری قومی شاعری میں اسی طرح ممیز ومنفرد حیثیت رکھتے ہیں جس طرح خود دورِ انقلاب رکھتا ہے اور ان کا فن میں بھی خاصہ بلند مقام ہے جو ان کو خصوصی مطالعہ کا مستحق ٹھہراتا ہے۔

ان شہ پاروں کا موضوع ہماری قومی زندگی اور دورِ انقلاب کے چند اہم پہلو ہیں۔ مثلاً خود ۲۷ر اکتوبر کا انقلاب جس نے ہماری ساری زندگی کی کایا پلٹ دی، صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کی مہتم بالشان شخصیت، انقلابی حکومت کے حیرت انگیز کارنامے، بنیادی جمہوریتیں اور قرب عوام کے سلسلہ میں صدر پاکستان کا شاندار دورہ وغیرہ وغیرہ۔ ان میں مشرقی ومغربی پاکستان کا برق رفتار دورہ

خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اپنی قسم کی پہلی مقصدی ریل گاڑی اور ہوائی جہاز میں دورہ کا تصور ہی تخیل کو برانگیختہ کرنے اور اسے پرِ پرواز عطا کرنے کے لئے ایک زبردست تازیانہ ہے۔ یہ ایک ایسا رومانوی اور حرکی قسم کا موضوع ہے جس کے تصور ہی سے روح اہتزاز کرتی ہے۔ اس لئے شعرا کی ذکی الحس طبیعت اس سے شعلہ زن ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اور ایک نہیں متعدد شعرا نے اس نرالی گاڑی اور تاریخی سفر پر اپنے اپنے انداز میں بڑے ہی انوکھے نقوش پیش کئے جن میں شعرا کا جوش و خروش اور والہانہ ذوق و شوق قومی شاعری کے ہنگامی حدود سے باہر نکل کر خالص فن کی دنیا میں داخل ہو گیا ہے۔

جمیل نقوی کی "سیارۂ گیتی خرام"، صہبا اختر کی "صبح در صبح" اور رئیس امروہوی کی "رہ نوردِ شوق" اس موضوع پر وہ نظمیں ہیں جن میں یہ تمام شاعر ادائے خاص سے نکتہ سرا ہوئے ہیں اور شاعری کے کیف و آہنگ، اس کی سطوت میں بہت آگے نکل گئے ہیں۔

ان میں جمیل نقوی کی نظم "سیارۂ گیتی خرام" اپنے طمطراق آمیز عنوان ہی سے ممیز نظر آتی ہے اور

خیز و صوتِ خود بہ آہنگِ رجز تبدیل کن
آتشے در سینہ داری در نوا تحلیل کن

کی مصداق۔ اس کے ہر ہر مصرع پر سمندِ شوق عناں گسیختہ دریا کہیں جیسے۔ کا گمان ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ حقیقی جذبہ و جوش جس سے شاعر کا ذہن دورِ انقلاب کی ہنگامہ آفرینی اور صدر پاکستان کی شانِ جلالی سے شعلہ بداماں ہوا، اس نے اس کلام میں شعلے ہی شعلے اور کوندے ہی کوندے بھر دیئے ہیں۔ ایک مردِ جری کی جیدؔ صاعقہ بار شخصیت نے اس کی طبیعت میں اس قدر ولولہ پیدا کر دیا ہے کہ وہ جوش و خروش اور فخر و مباہات سے بے قابو ہوا جاتا ہے۔ اور اس کی آواز بلند اور پاٹ دار ہوتے ہوئے اِس للکار اس نعرۂ پُرجوش تک پہنچ جاتی ہے کہ

جب قسم کھاتے ہیں مردانِ جری کے سامنے
ہاتھ اپنا قبضۂ شمشیر پر رکھتے ہیں ہم

اور یہ ایسی آواز ہے جو دیر تک ہمارے دل و دماغ کی پہنائیوں میں گونجتی رہتی ہے۔ جہاں تک ہیئت و بیان اور فکر و انداز کا تعلق ہے، یہ سب "طلوعِ اسلام"، "خضرِ راہ" اور "شمع و شاعر" ہی سے ابھرے ہیں۔ اور ان سے بے نیاز بھی کیسے رہا جا سکتا ہے؟ اس لئے نظم کی دو تہیں ہیں —— زیریں اور بالائی۔ زیریں رَو اقبال کی دین ہے اور بالائی شاعر کی اپنی ترنگ اور اپج کا نتیجہ۔ یہ زیریں رَو ہی ہے جس کی جھلکیاں ان اشعار میں دکھائی دیتی ہیں:-

زمزمے سلطانیٔ جمہور کے گاتی ہوئی
یوں چلی ہے ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی

اقبال: آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی

آؤ مل کر اک جہانِ تازہ تر پیدا کریں
بطنِ شب سے ایک تابندہ سحر پیدا کریں

اقبال۔ ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے

آج پھر بیدار ہے چشمِ تقاضائے حیات
آج پھر حاصل ہے احساسِ غمِ دل کو ثبات

اقبال بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیامِ کائنات

منزلِ صبحِ بہاراں پر نظر رکھتے ہیں ہم
ہر قدم پہلے قدم سے تیز تر رکھتے ہیں ہم

اقبال عشق کی آشفتگی نے کر دیا صحرا جسے
مشتِ خاک ایسی نہاں زیرِ قبا رکھتا ہوں میں

مگر جب شاعر جذبہ و جوش کے عالم میں اس سطح سے اٹھ جاتا ہے تو اس کا لب و لہجہ، اس کی آن بان، کر و فر تمام تر اس کا اپنا ہو جاتا ہے۔ اور اس کی نوائے شعلہ تاب سے وہ تیور جھلکتے ہیں جو اس میں انفرادی شان پیدا کر دیتے ہیں اور وہ خالص تخلیق کے عالم میں پہنچ جاتا ہے اور جو کچھ وہ کہتا ہے اس میں ایک نیا اقبال نوا پیرا معلوم ہوتا ہے جس نے دور مابعد کے اثرات و رجحانات سے نئی جوت جگائی ہے۔ اور ان میں اپنی طرف سے بھی نمایاں اضافہ کیا ہے۔ نئے وطن کے نئے ماحول اور اس کا رچا ہوا احساس قدم قدم پر دامنگیرِ نظر ہے۔

جس سے خالص پاکستانی ادب کی وضع صاف نمایاں ہے

لہلہاتی کھیتیوں کو بخشتی حسن دوام
وادئ مہرآن کے ذروں کو چمکاتی ہوئی
پنجند کی نقرئی لہروں سے موتی رولتی
راوی و جہلم کی موجیں رقص میں لاتی ہوئی
سینۂ آب رواں پر ڈولتی مستانہ وار
سرزمین ریشۂ زریں کو لچکاتی ہوئی
چائے کے باغوں کے ڈھلوانوں کے زیر و بم کیساتھ
بھینی بھینی خوشبوؤں کو اور پھیلاتی ہوئی
دھان کے کھیتوں کی ہریالی پہ نظریں ڈالتی
سبز پرچم کے تقدس کی قسم کھاتی ہوئی

خط کشیدہ حصوں کی نفاست و نزاکت اور ان کے ساتھ ہی ساتھ اصلیت کا بھرپور رچاؤ پوری طرح نمایاں ہے۔ اور پھر دھان کے کھیتوں اور سبز پرچم کی مناسبت تو کتنی ہی رعنائیاں اور باریکیاں اپنے دامن میں لئے ہوئے۔ ساکن اور متحرک تشبیہوں دونوں کی پُرکاریوں سے مالامال۔ شاعر کا جذبہ اس کی والہیت اس سے زیادہ اور کیا ہوگی۔

اے نقیب حریت، اے داعی امن و سلام
اے نفیرِ انقلاب، اے دشمنِ کہنہ نظام
اے نسیم جانفزا، اے کاشف رازِ چمن
اے صبا رفتار قاصد، اے سفیر تیز گام
اے سریع السیر پیکر، اے نشانِ اتحاد
اے امیدِ قوم، اے سیارۂ گیتی خرام

ایک بار پھر خط کشیدہ حصوں کی دوہری معنویت کس قدر لطف دیتی ہے کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ

تیرے پرتو سے چراغاں اتحاد شرق و غرب
تیرے جلووں سے فروزاں اعتبار صبح و شام

بددیانت سیاست دانوں اور رہزنانِ قوم کا پردہ کس خوش اسلوبی سے چاک کیا گیا ہے:

بے کسی کی دھند میں لپٹے ہوئے ماہ و نجوم
بے بسی کی ظلمتوں میں بجھ رہا تھا آفتاب
سازشوں پر ناز تھا ارباب حل و عقد کو
شاطری تھی مدرسوں میں جزوِ تعلیمی نصاب

"ثانئ آئینۂ دانش" تھا ہر عزت مآب

سابقہ تاریخ کے حوالے اور عہد رفتہ کی طرف پُرمعنی اشارے شاعر کے وسیع علمی پس منظر اور ظرف و آگہی کی خبر دیتے ہیں جیساکہ "ثانئ آئینۂ دانش" اور "آج پھر ہشیار ہیں کہنہ حریفانِ ثبات" سے ظاہر ہے۔

یہی جذبہ شروع سے آخر تک ہے۔ یہ وہ جذبہ ہے جو دورا نقلاب اور اُس کے آتش نہاد موسس و سربراہ، فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں سے آج پاکستان کے ہر ہر فرد کے دل میں بے اندازہ ولولہ و جوش اور احساسِ فخر پیدا کر رہا ہے اور ہماری قومیت — ہماری بازیافتہ قومیت — کو شعلۂ جوالہ بنا دیتا ہے۔

دوسرے حدی خوان انقلاب، رئیس امروہوی کا فکر بھی روایت ہی سے ابھرتا ہے۔ وہی "ساقی نامہ" کا مانوس پیرایہ جو اس کی طبیعت میں اس طرح رچا ہوا ہے کہ اس کے بغیر اس کی طباعی اور کسی شکل میں راہ نہیں پاتی۔ تاہم وہ ایک امتیازی رنگ ضرور پیدا کر لیتی ہے۔ وہ محض شاعری نہیں کرتا۔ اس کی نظر آسمان سے زیادہ زمین پر رہتی ہے۔ یہی ہرے بھرے کھیت، یہی ریت کے تودے، یہی سنگلاخ چٹانیں، یہی لوگ باگ اور دنیا کی عام چہل پہل۔ وہ زندگی ہی کے سینے سے رنگ لے کر اس کی ہو بہو تصویر کھینچتا ہے اور ہمیں اس کے قدرتی حسن سے متاثر کرتا ہے۔ مشرقی پاکستان ہو یا مغربی، اس کا قلم ان ہی کا سچا نقشہ پیش کرنے میں دلچسپی لیتا ہے۔ اور حقیقی سفر کو بھی رومانوی بنا دیتا ہے۔ ایسے کہ سفر کی اہمیت اور دلآویزی بھی نمایاں ہو جائے اور رہ نوردِ شوق، صدر پاکستان کی اولوالعزمی اور حسنِ مقصد بھی آشکارا ہو جائے۔

یہ سلمائے بنگال و پنجاب و سندھ
یہ دنیائے بنگال و پنجاب و سندھ
وہ بنگال، وہ مشرقی ارض پاک
وہ رنگین خطہ، وہ گلپوش خاک

ندی پر کنول جیسے پانی میں آگ !
مچھیروں کے گیت اور لہروں کے راگ
کناروں پہ گھر، کشتیوں پر جماؤ
وہ مانجھی، وہ موجیں، وہ چپّو، وہ ناؤ
وہ پانی میں بجتے ہوئے جل ترنگ
فضاؤں میں وہ بدلیاں رنگ رنگ
نظر کا فروغ اور دل کا فراغ
وہ دھانوں کے کھیت اور چائے کے باغ
وہ نازک سے بوٹے وہ سندر سے بن
خداداد گلزار، خودرو چمن
سماں ایسا پیارا کہ جی لوٹ پوٹ
وہ دریا کی چادر وہ سبزے کی گوٹ
ادھر ارضِ بنگالۂ دل نشیں
ادھر سندھ و جہلم کی یہ سرزمیں
یہ خطہ کراچی سے کاغان تک
یہ دنیا کہ خیبر سے بولان تک
کہیں دشت و کہسار، بنجر اجاڑ
کہیں سبز و شاداب، جنگل پہاڑ
مناظر کی جنت کی شہزادیاں
وہ کشمیر کی لالہ رخ وادیاں
روش قسم قسم اور مفہوم ایک
زبانیں کئی اور مفہوم ایک

جو مشرق سے مغرب ہم احساس ہے
بہت دور، تاہم بہت پاس ہے

دیکھئے مشرق و مغرب کی دوری کے باوجود قرب اور کثرت کے باوجود وحدت کس خوش اسلوبی سے واضح کی گئی ہے پہلے اور نئے حالات کا موازنہ، ان کی ہو بہو کیفیت اس سے بہتر اور کیا ہوگی۔

اندھیرے دبے پاؤں جانے لگے
اُجالے وہ آنے، وہ آنے لگے

اور نئے دور اور اس کے سربراہ کا حیرت انگیز معجزہ۔

بھلا کنجِ عزلت میں رکھا ہے خاک
خوشا صدر کا دورۂ ارضِ پاک
ترقی کا پردہ کشا دورِ نو
خوشا دورِ نو، خوشا دورِ نو

ایک بار پھر چشمِ نظارہ بیں گھومتی گھومتی اپنا رخ بدلتی ہے اور ہم ایک نوجوان صورت سیماب مضطرب ــــ صہبا اختر سے دوچار ہوتے ہیں۔ اس کی دنیا ہی اور ہے، ذوق ہی اور ہے۔ وہ جانتا ہی نہیں کہ روایت کیا ہے۔ اس نے اپنی ہی راہ تراشی ہے، اپنے ہی نئے نئے پیچ و خم کھاتے ہوئے افق ہی افق بنائے ہیں، اپنی ہی دھنک پیدا کر کے اس کی لہر در لہر قوسوں کو نئے نئے رنگوں سے آراستہ کیا ہے۔ وہ الفاظ، بیان، ہئیت، ہر چیز کو حسن کے رنگ میں دیکھتا ہے۔ اور ایک جبلی، ایک موروثی اداکار ــــ وہ مشہور اداکار ماسٹر رحمت کا فرزند ہے۔ کے مخصوص ڈرامائی لب و لہجہ، حرکات و سکنات کے ساتھ شاعری میں بھی طمطراق پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وجدانی احساس کی لہر یا اُپج اُسے لانبی لانبی بحروں کی طرف لے جاتی ہے۔ اور نظم بہ عنوان "صبح در صبح" میں تو بحر چلتی نہیں رہتی ہے، جیسے بحر نہیں ریل ہو۔ بل پیچ کھاتی، بڑھتی، لپکتی۔ اس کی رفتار والہانہ ہے، مجذوبانہ ہے۔ شاعر ایک خالص ندرت پسند جدید شاعر کی طرح عنوان سے لے کر الفاظ، اسلوب، تصور، پیرایہ اور تکنیک تک اپج ہی اپج کا قائل ہے، اس لئے اس کا تعلق خاصان فن کے اس زمرے سے ہے جس میں ڈاکٹر خالد، جعفر طاہر، عبدالعزیز خالد اور ــــ اگر ان کا تذکرہ بے محل نہ ہو ــــ رفیق خاور[1] شامل ہیں۔ اس نے مکتبۂ شعر کا مایہ الامتیاز کیا ہے؟ ــــ ایسا نرالا پن جو شاعری کا پیرایہ ہی بدل دے اور ذوق و فن میں اور ہی ادا پیدا کر دے۔ چنانچہ دیکھئے اسی موضوع پر دوسری دو نظموں کے برعکس صہبا اختر نے اس کو کس طرح نبھایا ہے۔ اس نے خلاف توقع

---

[1] ذوقِ فکرِ غالب را بردہ ز انجمن بیروں
با ظہوری و صائب محوِ ہم زبانی ہاست (مدیر)

رات سے بات شروع کی ہے۔ خالص جدید انداز ـــــ اور یوں قاری کو فریب دیتے ہوئے اپنے موضوع ۔ صدر پاکستان کے دورۂ شرق و غرب ـــــ کی طرف آیا ہے ـــــ اس طرح ساری نظم میں براعت ہی براعت ہے۔ اس تاریخی سفر کا آغاز رات ہی کو ہوا تھا۔ اس لئے شاعر کو بہانہ ہاتھ آیا کہ وہ یہ اچھوتا پیرایہ اختیار کرے۔ اور سیدھے سپاٹ پیرائے کی بے لطفی سے بچے۔ قبل ازیں بھی اس شاعر نے جو قومی اور دوسری نظمیں لکھی ہیں ان میں یہی بانکپن اور خوش وضعی نمایاں ہے۔ رات کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے اس کا مدھر روپ ملاحظہ ہو جس سے "صبح در صبح" کا شاید ہی گمان ہو اور یہی پہلے نہاں پھر عیاں تضاد و مناسبت اس میں بڑے تیکھے تیور پیدا کر دیتی ہے پہلا ہی لفظ روایت پر ضرب کاری ہے ـــــ آبشارانہ ـــــ اور یہ آبشار یوں جھرتا ہے:

آبشارانہ ستاروں کے شرر کار ضیا بار جزیروں سے گذرتی ہوئی رات
کبھی کرنوں کے سمندر میں رواں اور کبھی چاند کے ساحل پہ ٹھہرتی ہوئی رات
ہر نفس نیلمیں آفاق کے ہر طاق میں اک شمع کی مانند پگھلتی ہوئی رات
کبھی اک پھول کی پلکوں میں سمٹتی کبھی اک شاخ کی بانہوں میں لچکتی ہوئی رات
چوڑیوں کی طرح بجتی کبھی اک شوخ کی پازیب کی مانند چھنکتی ہوئی رات

اب دیکھئے آبشار کس طرح گریز کرتا ہے:

کوئی دیکھے تو ذرا انجم و مہتاب کے زینوں سے سوئے خاک اترتی ہوئی رات
ہالۂ نور کبھی دائرۂ رقص کبھی سلسلۂ رنگ بدلتی ہوئی رات
نو عروسانہ نئی صبح کی آغوش میں خود گرمیٔ انفاس سے ڈھلتی ہوئی رات

ہالہ، دائرہ، سلسلہ ـــــ جیسے لچھوں اور مرغولوں کا سلسلہ آپ ہی آپ بڑھتا ہی چلا جائے۔ رات کے دن میں ڈھلنے کی توجیہ کتنی خوب ہے! رات کے طلسمی اندھیرے کے بعد صبح کا افسوں:

صبح افسانہ و افسوں کا بکھرنے لگا ہر شہر سبازآدیہ جادو جیسے
پاک جمہوریہ، مصروفِ سفر صندلی رنگوں میں خراماں کوئی آہو جیسے
دور تک پھیلے ہوئے سر دگھنے سبز درختوں کی تگ و تاز کا پر کیف سماں
صورت بادِ پریشان کسی ساحرۂ خواب کے بکھرے ہوئے گیسو جیسے
ناوک انداز شعاعوں کا ہر اک ناوکِ زرکار رہا دل میں ترازو جیسے
گاؤں گاؤں میں نئی دھوپ، نئی چھاؤں، نئے روپ کے ہنستے ہوئے سنگم لوٹے
قریۂ شہد زباں، کوئے نگاراں میں بیک وقت اڑی ایک سی خوشبو جیسے

دم بدم غرفۂ آلام سے صد بامۂ خورشید کے رقاص اجالوں کا طلوع

اور اس کے بعد:

یہ ہمہ رنگ زمیں جیسے کسی خواب کے از رنگ کے بکھرے ہوئے رنگیں اوراق
یہ طلسم زاد فضا جس کے فسوں کار تبسم کے اثر سے دلِ آذر دھڑکے
شاخ بر شاخ بہ ہر لغزشِ امواجِ صبا بادۂ شبنم کے کٹورے چھلکے
دیکھ کر قافلۂ عزم کی آغوش میں صد حلقہ بگوشانِ محبت کا ہجوم
خیر مقدم کے لئے وادیٔ مہران کے ذرات میں سوئے ہوئے سورج چمکے

آخری بند اُن اترے چڑھے سروں، ان گھلی ملی دھنوں، ان البیلی لے کاریوں اور ان کے ساتھ موضوع کے چند در چند پہلوؤں کو کس طرح سمیٹ لیتا ہے جیسے یہ سب ایک طلسمی ساز ینہ ہو:

راوی راوی مرے احساس کے طوفان بہ ہر دشتِ مغیلاں مری آہوں کے خرام
اس مسافت میں ترے ساتھ رہیں مجھ سے وطن دوست فقیروں کی دعائیں بنکر
صبح در صبح شعاعوں کے حنا رنگ شرارے نو ستاروں کے دیئے شام بہ شام
ارضِ مہران سے تا وادیٔ کاغان فروزاں ہیں ہر اک دست حنائی میں چراغ
صورتِ برق سجانے لگی بنگال کی ہر زلف کو مشاطۂ خورشید خرام
تیرے ہونٹوں پہ ہمہ وقت محبت کے تر و تازہ کنول گلشنِ جمہور کے نام
حرفِ آغاز ہے یہ پاک سفر اور ابھی دور بہت دور ہے اس کا انجام
اے مسافر ترا مقسوم نہ راحت نہ کسی سایۂ دیوارِ چمن میں آرام

دیکھئے شاعر نے کس حیا بجدستی سے مغربی پاکستان کا دامن مشرقی پاکستان سے ملایا ہے۔ اور "محبت کے تر و تازہ کنول" میں سب "سرِ دلبراں" بیان کر دیا ہے۔

ان تین پُر کار نظموں کے باوجود اس موضوع کی گنجائشیں ختم نہیں ہوئیں۔ کوئی اور شاعر اس لے کو بڑھا کر مشرقی و مغربی پاکستان کی ساری زندگی اور صحرا و کوہسار، دریا و سبزہ زار کی رنگا رنگ، نظر نواز رعنائیوں کو اس میں سمو کر ایک شاندار "نقشی کا تھرمالٹھ"[1] (زرکار لحاف) تیار کر سکتا تھا۔ ہمارے شاعروں نے اس لحاظ سے ایک زریں موقع کھو دیا ہے۔

مگر خوش قسمتی سے ایک اور زریں موقع ہے، جہاں وضاحت

ل : جسیم الدین کی مشہور داستانی نظم:
FIELD OF THE EMBROIDERED QUILT

کے ساتھ موجود نہ تھا لیکن شاعرانہ فکر نے اسے از خود پیدا کر لیا، ضرور فائدہ اٹھایا گیا اور بہت خوش اسلوبی سے۔ دیارِ پاک کی ایک شاعرہ، عاصمہ حسین نے جس کی نظم "پاک سی حرفی" ہماری قومی شاعری ہی نہیں، تمام اردو شاعری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک ایسا غیر فانی شاہکار جو "عاصمہ شاعرہ برق نفس" کو شاعرات میں بلند ترین مقام پر فائز کرتا ہے۔ "پاک سی حرفی" نہ صرف اردو میں ایک نہایت عمدہ صنف کا اضافہ کرتی ہے بلکہ اس کا نہایت کامیابی اور خوش اسلوبی سے حق بھی ادا کرتی ہے۔ اس کا ٹھاٹھ، اس کا تجمل، اس کی گھن گرج اور لفظ لفظ، مصرع مصرع سے چھلکتی ہوئی، امڈتی ہوئی شعریت اس کو دورِ انقلاب، اس کی فتوحات، اور جلیل القدر سربراہ ملت، فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کی عظمت و جلال کا مجلّٰی آئینہ بنا دیتی ہے۔ اور شعری عظمت حقیقتاً ظاہری عظمت کی حریف بن جاتی ہے۔ وہی بات۔ عجم زندہ کردم بہ این پارسی!

اس صنف کو حال ہی میں ایک شاعر، مختار صدیقی نے بھی اپنایا ہے۔ لیکن دونوں نقوش میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ عاصمہ کی نظم شاعری کا ایک بھرپور چھلکتا ہوا پیمانہ ہی نہیں — "چھلکتا ہوا میخانہ" ہے۔ ہر لفظ دو آتشہ سہ آتشہ۔ حسن اتفاق سے جو صنف اختیار کی گئی ہے وہ اس قدر لچکدار ہے کہ کسی وقت بھی متلاشی روشنی کا رخ کسی طرف بھی موڑا جا سکتا ہے اور اسے کسی بھی لفظ یا موضوع پر مرکوز کیا جا سکتا ہے۔ اور ایک ہی شعشہ میں بھرپور کیفیت سامنے آجاتی ہے۔ اس طرح شاعرہ دورِ انقلاب کے ہر ہر پہلو کو اس طرح اجاگر کر سکتی ہے کہ ساتھ ہی ساتھ شاعری کا بھی پورا پورا حق ادا ہو جائے۔ معاصر واقعات کی طرف لطیف اشاروں کے ساتھ جن سے شاعرہ کی اپنے ماحول اور زندگی سے لگاؤ ظاہر ہوتا ہے۔ فن کی باریکیوں پر بھی گہری نظر ہے

یہ دھرتی اجلی اجلی سی، یہ دھرتی سبز نشان اپنی

"اجلی" اور "سبز نشان"۔ ہمارے سفید و سبز پرچم کی ہو بہو تصویر اور اتنی لطیف و برجستہ، بغیر اس کا ذکر کئے، اشارۃً۔ اس بند میں: قوم و ملت اور شاعری کی فصل بہاراں کا اہتمام دیکھئے:

ف — فصل بہاراں آ بھی چکی اور مہکی ہر ہر پھلواری
ہریالی ہی ہریالی سے لہکی مہکی کیاری کیاری

کیا کامنی کامنی ہر شے ہے، کیا ہر صورت پیاری پیاری
ہر بوٹا قوس قزح دیبا کی طرح، ہر ڈالی ہے ناری ناری

اس پہ لطف یہ ہے کہ قوس قزح دیبا کا نام اسی بند میں آیا ہے جو ق سے شروع ہوتا ہے۔ اس طرح شاعرہ کی اچھوتی کاریگری نے سارے بند کو جڑاؤ ہار بنا دیا ہے۔

صرف یہی نہیں، کئی اور بند ایسے ہیں جن پر شاعری کی بے پناہ چھوٹ پڑتی ہے۔ اور ایک چکا چوند کا عالم پیدا کرتی ہے:

ث۔ ثابت اور سیار سبھی تاثیر میں ہم آہنگ ہوئے
اور قدر و قضا کے ہاتھوں میں طاؤس و بربط و چنگ ہوئے
یوں قوسِ قزح در قوسِ قزح آکاش پہ رنگ ہی رنگ ہوئے
نظارگیانِ ارض و سما اس رنگِ فسوں سے دنگ ہوئے

ش۔ شوق ہے اس کا بے پایاں، ہر گام پہ اور ہی منزل ہے
جہاں نیل گگن ساگر سے ملے کیا اس کی نظر میں وہ ساحل ہے
جس میں ہے نہ منزل نے ساحل، وہ نگری اس ہی کا دل ہے
بجلی ہے کہ بادل یا دل ہے، دیپک ہے کہ محفل محفل ہے

ذیل کے بند سے یوں لگتا ہے جیسے کوئی تیز رو پہاڑی نالہ قدم قدم پر بڑی خوبصورتی سے آبشار ہی آبشار بناتا چلا آ رہا ہو:

ط: طریق نئے، افکار نئے، انداز نئے، اشغال نئے
سانچے میں خلوص کے ڈھالے ہوئے اقوال نئے اعمال نئے
اوصاف نئے، اطوار نئے، اذکار نئے، احوال نئے
آفاق نئے، اعماق نئے، آکاش نئے، پاتال نئے

ف کے بند کی طلسم کاریاں ہم دیکھ چکے ہیں۔ ق، گ کے بند اس سے بھی زیادہ شعریت میں رچے بسے ہیں:

ق: قمقمے نور کے روشن ہیں، یہ روشنیاں ہی روشنیاں
بادل کی قبا میں جھومتی ہیں کیا جل پریاں ہی جل پریاں
یہ نور کی مینائیں ہیں یا ہیں رس بھریاں ہی رس بھریاں
اور ترچھی ٹیڑھی کرنوں سے یہ گل بیاں ہی گل بیاں

گ: گلوں کی موہنی رت آئی، کلیاں ابھریں کنواری کنواری
اس پیاری رت میں ہر بستی من کو لاگے پیاری پیاری
کیا کامنی کامنی بوٹیاں ہیں کھیتوں سے اٹھی ناری ناری
وہ پیراہن لاچہ لاچہ، شیشہ آنچل ساری ساری

(باقی صفحہ ۲۹ پر)

ستارے[1] افشاں افشاں

احمد ندیم قاسمی

عمر بھر جلنے کا اتنا تو صلہ پائیں گے ہم
بجھتے بجھتے چند شمعیں تو جلا جائیں گے ہم

آج کے دن کا بدل کیا ہو گا
کل ہی سوچیں گے کہ کل کیا ہو گا

تم دیے ہو جو لرزتے ہو صبا کے ڈر سے
ہم ستارے ہیں جو طوفاں سے گزر جاتے ہیں

اب تجھ سا کوئی کہیں نہیں ہے
اب تیرا فراق بھی حسیں ہے

مجھے قسم ہے مری شانِ آدمیت کی
فریب دے نہ سکوں گا، فریب کھائے تو ہیں

تہذیب کے طاق پر ہمیشہ
جلتے ہیں چراغ مفلسی کے

اہرمن بن کے بھی دیکھا ہے کہ انساں کا ضمیر
نور ہی نور ہے، شعلے کا کہیں نام نہیں

تاریخ کو تقدیر سمجھنے والو
تاریخ تو تخلیق ہے انسانوں کی

یہ گزرتے ہوئے پل ہیں کہ تری آنکھیں ہیں
دن ہے آنسو کی طرح، رات ہے کاجل کی سی

ہر طرف پھوٹتی پو کو دیکھو
ڈوبتے چاند کا ماتم نہ کرو

آتشِ عشق جلاؤ کہ سفر ہے دشوار
راہ میں کتنے عقیدوں کا گھنا جنگل ہے

تخلیق کے ذوقِ جاوداں سے
انساں خدا کا ترجماں ہے

[1] "رات، ستارے افشاں افشاں" — مدیر

منارِ ساحل

(بابائے اردو مولوی عبد الحق کی ۹۲ ویں سالگرہ پر اُن کی پُرخلوص خدمات سے متاثر ہو کر)

سعادت نظیر

یہ جورِ گردشِ دوراں! یہ تلخیٔ حالات!
کہاں طلوعِ سحر؟ ہے ابھی اندھیری رات
یہ سہمے سہمے ستارے! یہ سہما سہما جہاں!
ابھی زمیں سے فلک تک ہے ظلمتوں کا سماں
ابھی ہے زلف پریشاں نگارِ اردو کی
کہ بزم ہے ابھی ویراں نگارِ اردو کی
ابھی سحاب میں ہے آفتاب کی منزل
ابھی ہے دور بہت انقلاب کی منزل
تم اے ادب کے پیامی! چراغِ منزل ہو
شبِ سیاہ میں روشن منارِ ساحل ہو
تمہیں تعلقِ خاطر ہے وہ سویروں سے
کہ ہر قدم پہ اُلجھنا پڑا اندھیروں سے
تمہیں سے آج منوّر فضا ہے اردو کی
نظر فروز جہاں میں ضیا ہے اُردو کی
ادب نواز! تمہیں آبروئے فن بھی ہو
تمہیں خود انجمن آرا بھی، انجمن بھی ہو
خلوصِ دل کو ہے نسبت تمہارے کام کے ساتھ
پیامِ جوشِ عمل ہے تمہارے نام کے ساتھ
اُلٹ دو ہاتھ سے اپنے نقاب اردو کا
دکھا دو اہلِ نظر کو شباب اردو کا

جرسِ گل

احمد ظفر

گذر گیا وہ زمانہ کہ ہم زمانے میں
خزاں رسیدہ کبھی غم گزیدہ رہتے تھے
زباں پہ حرفِ تمنا کبھی نہ آتا تھا
گذر رہی تھی جو دل پر نظر سے کہتے تھے

گذر گیا وہ زمانہ کہ جس کے سائے میں
نظر نظر میں ستارے سلگتے رہتے تھے
الاؤ جیسے سلگتا ہو سینۂ گل میں
سحر سحر کے نظارے سلگتے رہتے تھے

گذر گیا وہ زمانہ وہ یاس کی تصویر
اداسیوں کا بسیرا تھا جس کے دامن میں
وہ رات جس سے غمِ زندگی ملا برسوں
وہ رات بھی تھی سویرا تھا جس کے دامن میں

یہی وہ دور ہے جس نے ہمیں پکارا ہے
یہی وہ دور ہے جس کو بہار کہتے ہیں
نگارِ صبحِ طرب بھی یہیں کہیں ہوگی
جو ہم نہیں تو یہ نقش و نگار کہتے ہیں

نظر نظر میں ستارے سلگ رہے تھے جہاں
نفس نفس میں مسرت کے پھول کھلتے ہیں
یہ کس کے ہاتھ میں ترتیبِ گلستاں آئی
روش روش میں چمن کے اصول ملتے ہیں

چراغِ لالہ سے روشن ہیں راستے دل کے
بہارِ حسن بہاراں کو ساتھ لائی ہے
صبا کا راز بھی آخر چمن میں کھل ہی گیا
کلی کلی کی زباں پر وہ بات آئی ہے

لسانیات:

"الف"

سیّد قدرت نقوی

ہماری انقلابی حکومت کے کارہائے نمایاں میں سے ایک زبان و ادب پر خصوصی توجہ ہے۔ چنانچہ عرصہ ہوا وزارتِ تعلیم کی طرف سے "ترقیِ اردو بورڈ" قائم ہوا تھا وہ حکومت کی تائید و معاونت سے بدستور سرگرمِ کار ہے اور سب سے پہلے اس نے جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے وہ ایک مبسوط لغت کی ترتیب ہے۔ بورڈ نے اس کام کو جس نہج پر سرانجام دینے کی کوشش کی ہے اس کی کچھ جھلک اس مضمون میں نظر آتی ہے جو "ماہ نو" کی اشاعت مئی ۱۹۶۰ء میں بروئے کار آیا ہے۔ اور جس میں ابجد کے حرفِ اوّلیں "ا" کے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ یہ کام بجائے خود مستحسن ہے لیکن اتفاق سے جو مواد پیش کیا گیا ہے وہ اس قدر متفرق قسم کا ہے کہ عبارت گنجلک ہو گئی ہے۔ اگر اظہارِ مطالب کے لئے اعداد یا حروفِ تہجی کے ذریعہ ترتیب قائم کی جاتی تو بہتر ہوتا۔

اردو کا زیادہ تر ذخیرۂ الفاظ عربی، فارسی اور ہندی (سنسکرت) کا ہے۔ اسلئے لغت مرتب کرتے وقت ان تینوں زبانوں کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ نیز انگریزی اور ان دوسری زبانوں کو بھی، جن کے کچھ الفاظ ہماری زبان میں منتقل ہوئے ہیں۔

اردو لغت نویسی کی تاریخ کا سلسلہ "خالق باری" سے قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی کتابیں دراصل فارسی کی تحصیل میں آسانی پیدا کرنے کے لئے لکھی گئی تھیں۔ البتہ سراج الدین علی خاں آرزو کی "نوادر الالفاظ" اور مولوی عبدالواسع ہانسوی کی "غرائب اللّغات" اردو لغت کی اولین کتابیں ہیں۔ ان میں اصولِ لغت نویسی پر چنداں عمل نہیں کیا گیا۔ سادہ نثرِ اردو کی طرح لغت نویسی کا کام بھی فورٹ ولیم کالج میں ہوتا رہا۔ جان گلکرسٹ اور فوربس نے لغت مدوّن کئے جو اگرچہ معمولی ہیں مگر بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ شیکسپیر، ٹی پلیٹ اور فالن نے لغت مرتب کر کے شائع کرائے۔ مولوی سید احمد دہلوی نے فالن کی طرز پر ایک لغت مرتب کیا جس کا ایک حصہ پہلے "ارمغانِ دہلی" کے نام سے شائع ہوا، پھر مکمل چار جلدوں میں "فرہنگِ آصفیہ" کے نام سے شائع ہوا۔

"فرہنگِ آصفیہ" کے بعد "نور اللّغات" تیار ہوا اور اس کے بعد "جامع اللّغات" مرتب کیا گیا۔ اسی دوران میں متعدد لغات حسبِ ضرورت مرتب ہوتے رہے۔ ہماری لغت نویسی کی تاریخ کا یہ مجمل سا خاکہ ہے۔ چنانچہ جب کسی سلسلہ میں کچھ کہنا ہوتا ہے تو زیادہ تر انہی تین لغتوں کا نام لیا جاتا ہے۔ لیکن ان میں بھی بعض مقامات محلِ نظر ہیں۔ جہاں مرتبین نے اپنے قیاس سے کام لیا ہے، لغزش کی ہے۔ مثلاً "جامع اللّغات" میں لفظ "آزادہ" کے معنی لکھے ہیں "وہ شخص جسکی رہائی اپنے ہاتھ میں ہو"۔ خیال فرمائیے، یہ کہاں تک درست ہے۔ یا "اِکّا" کے معنی لکھے ہیں: "چھوٹی بہلی یا بگھی یا ٹانگا جس میں ایک گھوڑا جوتا جاتا ہے۔ ایک ہلکی گاڑی جس میں ایک بیل جتا ہوتا ہے"۔ یہ سب حقیقت کے خلاف ہے کیونکہ اوّل تو عام طور پر یکّہ بولا جاتا ہے کہیں کہیں اکّا بھی کہتے ہیں۔ یکّہ یا اکّا ایک مخصوص طرز کا بنا ہوا گھوڑا تانگا ہوتا ہے جو زیادہ تر علی گڑھ اور اس کے قرب و جوار میں رائج ہے۔ دیگر مقامات پر اس کا رواج نہیں رہا۔ بہلی میں دو ہی بیل جوتے جاتے ہیں۔ ایک بیل کی گاڑی باربرداری کے کام آتی ہے، سواری کے لئے استعمال نہیں ہوتی۔ اس کو بیل ٹھیلہ کہتے ہیں۔ یکّہ اور بگھی کا فرق سب کو معلوم ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ لغت نویسی بڑا دشوار کام ہے۔ ہمارے ادب میں سب سے پہلے لغت نویسی کی صحت کی طرف غالب نے توجہ دلائی تھی اور اس سلسلہ میں بعض باتیں بڑے پتے کی بتائی ہیں۔ "اردوئے معلّٰی" اور "عودِ ہندی" میں متعدد خطوط ہیں جن میں لغت نویسی پر اظہارِ خیال ملتا ہے۔ جس کا مطالعہ ضروری ہے۔

ا کا تلفظ ان تمام زبانوں میں جن کا رسم الخط عربی سے لیا گیا ہے اَلِفْ (الف پر زبر، لام کے نیچے زیر، ف ساکن) ہے۔ اس کی دو حیثیتیں ہیں۔
(۱) حرف (۲) لفظ (اسم)

بحیثیت حرف یہ عربی رسم الخط کے حروفِ تہجی کا پہلا حرف ہے جس کی مفرد آواز زبان کو درمیان میں معلق رکھنے اور تالو کے اندرونی ابتدائی حصّہ سے ہوا کے ٹکراؤ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کی مکتوبی شکل خطِ نستعلیق میں

تین قط کے برابر کھڑی لکیر ہے " ا "۔ خط نسخ میں ذرا سا ٹیڑھا پن ہوتا ہے (ا ا) دیگر خطوط میں بھی سیدھی لکیر سے شناخت کیا جاتا ہے۔ یہ مکتوبی شکل عربی رسم الخط سے اردو میں آئی۔ عربی رسم الخط کا سلسلہ قدیم مصری مصوری رسم الخط سے ملتا ہے۔ مصری خط میں بیل کی تصویر بنائی جاتی تھی اور آدا (بیل) کہتے تھے۔ فنیقی رسم الخط میں مصری رسم الخط سے یہ شکل (بیل) یعنی بیل کے سر کی نشانی بعینہٖ اختیار کی گئی۔ فنیقی میں بیل کو الاف کہتے تھے۔ فنیقی سے عبرانی میں آئی اور آلف کہلائی۔ عربی میں الف نام ہوا۔ عبرانی اور عربی شکلیں بدلتی گئیں اور آخری شکل " ا ا " رہ گئی۔ اردو اور فارسی میں " ا " کی سیدھی شکل بن گئی:

بلحاظ آواز دو مستقل حیثیتیں ہیں (۱) متحرک (۲) ساکن۔

متحرک: عربی میں الف متحرک کو ہمزہ کہتے ہیں لیکن اردو میں الف ہی کہلاتا ہے۔ یہ ہمیشہ کسی لفظ کے شروع میں ہوتا ہے جیسے اَب، اِس، اُن وغیرہ۔ درمیان کلمہ میں دو طرح واقع ہوتا ہے (۱) جبکہ دو الف جمع ہو جائیں، پہلا متحرک دوسرا ساکن، جیسے: قرآن، قرأت، مآل، مآثر، مآب، جرأت۔ (۲) جبکہ کسی ایسے کلمہ سے پہلے سابقہ آجائے جو الف سے شروع ہوتا ہو جیسے: بے اثر، لاالہ، خوش ادا، ابن آئی وغیرہ

ساکن: عربی، فارسی، اردو میں آخر و وسط کلمہ میں واقع ہوتا ہے، ابتداء میں نہیں آتا۔ حرف ماقبل کے لئے زبر کے علاوہ اور کوئی حرکت قبول نہیں کرتا جیسے صبا، ادا، جواب، سحاب، شتاب، گھوڑا، پڑاؤ، جاڑا وغیرہ۔

شان صاحب نے اردو املا میں اعراب و حروف علت سے مل کر جن دس علتوں کے لئے الف کا استعمال دکھایا ہے، میرے نزدیک وہ غور طلب ہیں کیونکہ یہ بات ان کی اپنی تحقیقی نہیں ہے۔ ابتداءً کسی لغت نویس نے ضخامت کو بڑھانے کے لئے بہت سی بے تکی باتیں داخل کر دیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ غالباً "جامع اللغات" میں اس کا ذکر دو جگہ ہے۔ درحقیقت یہ دس علتیں ہندی (سنسکرت) حروف [illegible] (اَ، اِ، اُ، اے)۔ ان چار پر علامات کا اضافہ کر کے مزید آٹھ علتیں پیدا کر لیں۔ چونکہ ہماری زبان میں ان علتوں کے لئے الگ الگ کوئی حرف یا علامت نہیں، اس لئے ان کا ذکر بے محل ہے۔ تعجب ہے کہ صاحب "جامع اللغات" نے ہندی کے अं اور अः (اَنگ، اِہ) کو کیوں چھوڑ دیا اور پھر قدیم فارسی (اوستا) میں بھی ان دس علتوں کے علاوہ پانچ علتیں اور ہیں جن میں انگ بھی شامل ہے۔ اسطرح سولہ علتیں بن جاتیں۔ اور سنسکرت اور اوستا سے واقفیت کے اظہار کا موقع بھی اچھا تھا۔ اگر ان تمام علتوں کو قبول کر لیا جائے تو ان کے استعمال کے تمام امور زیر بحث آنے چاہئیں جو بے شمار ہیں۔

اردو زبان، عربی، فارسی اور ہندی سے مل کر بنی ہے، اسلئے اب صرف " ا " کی وہ حیثیت جو ان زبانوں سے اردو میں منتقل ہوئی، بیان کی جاتی ہے۔

عربی:۔ عربی زبان میں اگرچہ الف ساکن ہوتا ہے اور ہمزہ متحرک مگر اردو میں صرف الف ہے اور اس کی املائی اور معنوی صورتیں یہ ہیں (۱) الف متحرک در اول کلمہ جیسے انسان۔ (۲) ساکن در آخر و وسط کلمہ جیسے دعا، ثواب۔ (۳) الف ممدودہ (آ) جیسے آلام۔ (شان صاحب نے " اٰ " جیسے اٰمین لکھا ہے۔ یہ املا صرف عربی سے مخصوص ہے۔ اردو میں اس کا استعمال نہیں۔ نیز اچھا اور برا میں الف ممدودہ نہیں) (۴) الف مقصورہ۔ یہ بشکل " ی " لکھا جاتا ہے۔ ی پر الف کی مختصر شکل بنا دی جاتی ہے۔ جیسے: عیسیٰ، موسیٰ، مصطفیٰ، مرتضیٰ (۵) الف بشکل واؤ جیسے: زکوٰۃ، صلوٰۃ (عربی میں حیوٰۃ ہے مگر اردو میں حیات)۔ یہ عربی میں تعلیلی شکل ہے۔ (۶) عربی الفاظ کے آخر میں دو زبر کے ساتھ نون کی آواز پیدا کرتا ہے جسے تنوین کہتے ہیں۔ مثلاً: فوراً، قطعاً، لازماً، نسلاً بعد نسل (شان صاحب نے نسلاً بعد نسلٍ لکھا ہے حالانکہ آخر میں دو زبر کے ساتھ لام بغیر الف لکھا جاتا ہے اور یہی صحیح ہے۔ اسی طرح دو پیش کے ساتھ جو مثال دی ہے اردو میں اس کا استعمال ہی نہیں۔ (۷) عربی کے الفاظ پر لام کے ساتھ دو طرح استعمال ہوتا ہے (الف) مفرد الفاظ پر استعمال دو طرح ہے (۱) اگر ابتدائی حرف قمری ہوگا تو الف کے ساتھ لام کی آواز بھی نکلے گی جیسے القرآن، الحکیم (۲) اگر ابتدائی حرف شمسی ہوگا تو لام کی آواز نہیں نکلے گی۔ بلکہ اس حرف کو مشدد کر دے گا جیسے التّاریخ، الثّابت، الصّبر وغیرہ۔ تخصیص، تعریف اور حصر وغیرہ کے معنی دیتا ہے (ب) مرکبات میں وصل و اضافت کے لئے استعمال ہوتا ہے، فوق البشر، کتاب اللہ، رسول اللہ، کتاب النحو وغیرہ (۸) عربی الفاظ کے آخر میں بشکل ہمزہ لکھا جاتا ہے مگر اردو میں نہیں لکھا جاتا۔ اب کلیتہً ترک ہے جیسے اعتناءُ (عربی) اعتنا (اردو) (۹) ح اور ہ کے ماقبل زبر کے ساتھ ہوتا ہے۔ زبر اور زیر کے بین بین آواز دیتا ہے۔ یہ خاص اردو لہجہ کا تصرف ہے۔

بلکہ زیر کی آواز واضح ہوتی ہے جیسے: اَحمد، اَحباب، اَہل، اہلیہ۔ ان الفاظ پر زبر ہے مگر آواز زیر کی سی نکلتی ہے۔

شان صاحب نے اس کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے اس کی کوئی سند اور معقول وجہ نظر نہیں آتی۔ ح، ع، ل، ہ کی مثال میں جتنے الفاظ پیش کئے گئے ہیں ان کے زیر اور پیش اصلی ہیں: احسان، احتیاط، اعلان، لااِلٰہ، اہانت، اُحد کا تلفظ عربی اور اردو میں یکساں ہے۔ الف کی وجہ سے ان میں سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ البتہ ح اور ہ ما قبل مفتوح کے لئے اردو تلفظ میں زیر کی سی آواز نکلتی ہے اور یہ آواز دراصل ح اور ہ کے اظہار کا ذریعہ ہوتی ہے جیسے محمود، محبوس، مہجور، محکوم۔ (۱۰) بعض الفاظ پر نصف الف کی صورت میں لکھا جاتا ہے جس کو کھڑا زبر کہتے ہیں جیسے: لٰہذا، الٰہی، اللّٰہ۔ الف کی ہلکی آواز دیتا ہے یعنی زبر سے لمبی اور الف سے کم۔ شان صاحب نے اعلیٰ علّیین، ہٰذا، اِلّا آخرہ میں کھڑے زیر کو بھی اسی ضمن میں لکھا ہے اور یائے معروف کا ہم آواز قرار دیا ہے۔ میرے خیال میں یہ زیر کی ہلکی اشباعی حالت ہے۔ تحریر میں ضرور الف سے مشابہت ہے لیکن اس کو کھڑا زیر ہی کہا جاتا ہے۔ اس کا الف سے کوئی تعلق نہیں۔ اعلیٰ ادنیٰ لیلیٰ عیسیٰ منقّٰی حتّٰی میں بھی الف مقصورہ ہے، کھڑا زیر نہیں کیونکہ یہ شکل ی لکھا جاتا ہے) (۱۱) عربی حروف علت میں شامل ہونے کی وجہ سے زبر کی اشباعی شکل کی نمائندگی کرتا ہے۔ شان صاحب نے اَتین ۔ ا ت ی ن میں شامل ہونے کے سبب عربی الاصل کلمات میں بکثرت موجود ہونا بتایا ہے لیکن کوئی مثال پیش نہیں کی۔ "اتین" علامات مضارع کے مجموعہ کا نام ہے۔ جن میں الف واحد متکلم کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں کوئی لفظ ایسا استعمال نہیں ہوتا جو مضارع واحد متکلم کا صیغہ ہو۔ فارسی کے ابتدائی دور میں اعنی استعمال ہوتا تھا۔ اب اس میں بھی متروک ہے اور یعنی استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں تو یعنی ہی استعمال ہوتا رہا ہے۔ تلمیحاً اگر کوئی لفظ استعمال کیا جائے تو یہ استثنائی حالت ہے جیسے ع دیکھے تو غش کرے ارنی گوئے اوج طور: لفظ ارنی ہماری زبان میں مستقل لفظ کی حیثیت نہیں رکھتا۔ ارنی بھی امر کا صیغہ ہے مضارع کا نہیں۔ لہٰذا "اتین" کے بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔

(۱۲) عربی میں بطور علامت جمع تین طرح استعمال ہوتا ہے۔ (۱) ابتدا میں زیر کے ساتھ جیسے اغذیہ، ادویہ، السنہ (۲) ابتدا میں زبر کے ساتھ وسط میں ساکن جیسے احباب، اخبار، اجناس، ارباب (۳) وسط میں ساکن جیسے براہمہ، برامکہ، مجالس، بستان، بلاد کبھی ت کے ساتھ جیسے حیوانات جمادات، نباتات، کائنات وغیرہ (اپنے ما قبل کو متحرک مفتوح بنا دیتا ہے)۔

(۱۳) بطور علامت فاعل وسط کلمہ میں آتا ہے اور اس کے مابعد زیر کی حرکت آتی ہے فاعل، متفاعل کے وزن پر جیسے: شاعر، مقابل مجاہد، متعارف، متناسب۔

(۱۴) بطور علامت تفضیل ابتدا میں مفتوح جیسے اکبر، اصغر، اشرف

(۱۵) بطور علامت تفضیل آخر میں مونث کے لئے جیسے صغریٰ کبریٰ (عربی میں)، صغرا، کبرا، علیا اردو میں۔

(۱۶) بطور علامت مصدری۔ ابتدا میں زیر کے ساتھ حرف آخر لام سے پہلے ساکن، اِفعال، اِفتعال، اِستفعال کے وزن پر جیسے اِنکار، اقرار، اِقتدار، اِختیار، اِنسداد، اِنحراف، استفادہ، استعارہ وغیرہ۔

(۱۷) اِمالہ (یائے مجہول سے بدلنا) جیسے حوالی سے حویلی، جہاز سے جہیز وغیرہ۔ شان صاحب نے عربی الفاظ میں بطور علامت استفہام استعمال کیا جانا لکھا ہے اور مثال الست بربکم دی ہے لیکن اردو میں یہ علامت استعمال نہیں ہوتی بلکہ یہ پورا جملہ استعمال ہوتا ہے اور تلمیحاً، لہٰذا یہ بیان خالی از تکلف نہیں۔

(۱۸) بطور علامت صفت مشبہ آخر میں جیسے سودا۔ صفرا۔

(۱۹) بطور علامت مبالغہ حرف آخر سے پہلے جیسے طیار، علام، جبار، ستار۔

(۲۰) پیشہ وروں کے نام میں بروزن فعال جیسے بزاز، قصاب، نجار، خطاط، حجام، جراح، فصاد، نساج وغیرہ۔

(۲۱) بطور علامت اسم آلہ حرف آخر سے پہلے بروزن مفعال جیسے مسواک، میزان، مقراض، مضراب وغیرہ۔

(۲۲) بحساب جمل اس کا عدد ایک ہے۔

(۲۳) ابواب زبور میں پہلے باب کا نام اور نشانی۔

(۲۴) علم نجوم میں زیچ اور اسطرلاب میں ایک کی جگہ اس سے کام لیتے ہیں۔

(۲۵) نجوم و ہیئت کی اصطلاح میں برج حمل کو کہتے ہیں۔

فارسی: قدیم فارسی (اوستا) میں الف سے متعلق اعراب و علت کے اظہار کے لیے پندرہ حالتیں اور شکلیں تھیں لیکن موجودہ فارسی میں عربی

کا تتبع کیا گیا ہے اور حرف الف ساکن اور متحرک تسلیم کیا گیا ہے۔ حسب ذیل معنی میں استعمال ہوتا ہے:

(۱) بطور علامت ندا جیسے خدا وندا: ولا، زاہدا ؎

کون کرتا ہے بتوں کے آگے سجدہ زاہدا
سر کو دے دے مار کر توڑیں گے بتخانے کو ہم

آج کل بجز "خداوندا" اور الفاظ کے ساتھ استعمال بمنزلہ متروک ہے۔

(۲) برائے دعا قبل از حرف آخر جیسے باد

(۳) برائے توالی و تکرار جیسے پیاپے، دمادم۔

(۴) برائے غایت و انتہا جیسے سراسر، سراپا

(۵) برائے فاعل جیسے دانا، بینا۔

(۶) برائے اظہار کثرت جیسے خوشا، بسیار

(۷) برائے اتصال جیسے، شباشب۔

(۸) برائے عطف جیسے: شبا روز، تکاپو۔

(۹) برائے اسم کیفیت صفت کے بعد جیسے: گرم سے گرما۔

(۱۰) برائے حاصل مصدر جیسے کشاکش

(۱۱) زاید: سوار سے اسوار۔

(۱۲) برائے اشباع جیسے پیرہن سے پیراہن، دامن سے دامان

(۱۳) برائے قسم جیسے: حقا (ع) حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا۔

(۱۴) برائے ندبہ و تاسف جیسے: واحسرتا، دریغا، و امصیبتا ؎

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریص لذت آزار دیکھ کر

(۱۵) صفت نسبتی میں واؤ سے بدل جاتا ہے جیسے مصطفیٰ سے مصطفوی، مرتضیٰ سے مرتضوی۔ عیسیٰ سے عیسوی۔ کبھی درمیان میں اضافہ کیا جاتا ہے جیسے یمن سے یمانی۔

(۱۶) الفاظ کے شروع سے حذف کر دیا جاتا ہے جیسے اسکندر سے سکندر، ابراہیم سے براہیم۔ انوشیرواں سے نوشیرواں

(۱۷) الف ممدودہ "آ" کو بعض دو الف کا مجموعہ خیال کرتے ہیں۔ علامت مد کو ایک الف کا نشان خیال کرتے ہیں۔

ان کے نزدیک الف اول متحرک اور الف ثانی ساکن ہے چنانچہ قدیم زمانہ میں "اا" دو الف برابر لکھے جاتے تھے بعد کو ایک الف اوپر لگا دیا گیا جس کو مد کہا جانے لگا لیکن قدیم فارسی میں اس کے لئے الگ علامت (س) مقرر تھی۔ اسی طرح ہندی میں بھی اس کی نشانی (आ) اختیار کر رکھی ہے لیکن جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے، قدیم فارسی اور سنسکرت میں بھی یہ دو الف کے برابر ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ قدیم فارسی الف کی شکل (س) تھی۔ اس پر ایک دندانہ کا اضافہ کر کے (سـ) شکل اختیار کر کے "آ" کا کام لیا۔ اسی طرح ہندی میں الف کی آواز کے لئے (अ) شکل ہے۔ اس پر اضافہ کر کے (आ) بنایا اور "آ" کی آواز پیدا کی، لہٰذا یہ کہنا کہ ان دونوں زبانوں میں "آ" الگ حرف ہے، درست نہیں۔ تاریخ گو حضرات متوسطین کے زمانہ تک اسی بنا پر "آ" کے دو عدد شمار کرتے رہے ہیں۔ متاخرین نے اس کو ترک کر دیا۔ لیکن دور حاضر میں بھی اہل فن اس کے حق میں رہے ہیں کہ "آ" کے دو عدد لئے جائیں اور دو الف لکھے جائیں۔ مثلاً صفی لکھنوی ؎

صفی زباں پہ ہے تاریخ آنکھ میں آنسو
"ستارہ ڈوب گیا آسمانِ ہمت کا" (۱۳۲۸ھ)
۱۳۲۸

(۱۸) ضرورت شعری کی وجہ سے الف ساقط ہو جاتا ہے جس کا استعمال اردو میں بھی عام ہے جیسے اگر سے گر، امیر سے میر مثلاً غالب ؎

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

اقبال۔ ع

سالار کارواں ہے میرِ حجاز اپنا

شان صاحب نے خونچہ اور پرچہ کی جو مثالیں دی ہیں ان میں خونچہ عوام کا تلفظ ہے، شرفا کا نہیں۔ پرچہ کی اصل ممکن ہے پارچہ ہو لیکن اب پارچہ اور پرچہ میں بین فرق ہے۔ پارچہ کپڑے کے لیے استعمال ہوتا ہے اور پرچہ کاغذ کے لئے جیسے امتحان کا پرچہ۔ البتہ خاموشی سے خمشی کی اس ضمن میں مثال دی جا سکتی ہے۔

ہندی و اردو: اردو میں ہندی سے براہ راست الف دو حیثیتوں سے آیا۔ ایک تخفیف شدہ صورت میں، دوسرے اصلی حالت میں۔ بعض ایسی شکلیں ہیں جن میں امتیاز کرنا دشوار ہے۔ یہاں وہ امور بیان کئے جاتے ہیں جو عربی فارسی سے تعلق نہیں رکھتے لیکن ان میں ہندی کا عمل ہے یا اردو کا اپنا تصرف ہے۔ الف کے استعمال کی حسب ذیل صورتیں ہیں:

(۱) بطور علامت نفی ابتدا میں جیسے اچھوتا، اٹل۔

(۲) اشباعی حالت یا ہندی (क) ک کا بدل جیسے گھوڑا کتا، بھالا۔

(۳) علامت فاعلی (صفت مشبہ) کے لئے جیسے جھوٹا، بھوکا، کھتیا، لچا، اچکا۔

(۴) برائے حاصل مصدر اسم کے آخر میں جیسے ٹھنڈا، توڑا۔

(۵) اسمائے صوت کے آخر میں جیسے دھما کا۔ جھپا کا۔ کھڑکا۔

(۶) اسمائے صفت کے آخر میں بطور علامت تذکیر جیسے گٹھیلا سجیلا، پتھریلا۔

(۷) اسمائے کیفیت کے بعد جیسے، بچپنا، لڑکپنا، چھٹپنا۔ گنوارپنا۔

(۸) اسمائے ظرف کے آخر سے حذف ہوجاتا ہے۔ جیسے گھوڑ شالا سے گھوڑسال۔ کھنڈسال وغیرہ

(۹) کبھی ابتدا سے حذف ہو جاتا ہے: اکال سے کال۔

(۱۰) اتصال کے لئے جیسے بیچا بیچ، جھڑا جھڑ، دھکا پیل۔

(۱۱) بطور علامت فاعلی بحالت مرکب عددی جیسے ست لڑا، چورا ہا۔ ترا ہا۔ دوپٹا۔

(۱۲) برائے علامت فاعلی وصفی جیسے: مھڑولا، بیڑبولا۔

(۱۳) برائے علامت مفعولی وصفی جیسے گن کٹا۔ نکٹا۔ دل جلا۔ من چلا۔

(۱۴) برائے علامت تصغیر جیسے ٹٹوا، بٹوا، مٹھوا۔

(۱۵) علامت اسم آلہ بحالت تذکیر جیسے بٹیسرا، دومنا۔ ادہ سِرا۔ ادھ منا۔ جھولا، ہنڈولا۔

(۱۶) برائے اتصال تکرار کلمہ کی حالت میں وسط میں جیسے دیکھا دیکھی چلا چل۔

(۱۷) کثرت مبالغہ کے لئے جیسے مارا مارا، دوڑا دوڑا۔

(۱۸) امر کے بعد بڑھا کر حاصل مصدر کے معنی دیتا ہے جیسے رگڑا، جھگڑا، لپکا۔

(۱۹) بڑاپن ظاہر کرنے کے لئے جیسے گھنٹا، مڑکا، ڈولا، کھمبا، آرا۔

(۲۰) برائے علامت تذکیر جاندار و بے جان جیسے، لڑکا گھسیارا، سونا چوٹھا، لٹھا۔

(۲۱) برائے تسلسل وسط میں جیسے موسلا دھار، لگاتار

(۲۲) برائے علامت تانیث (سنسکرت میں) کرشن سے کرشنا، بال سے بالا۔

(۲۳) برائے صفت مشبہ جیسے اچھا، بڑا، اندھا، کالا، گورا گھنا، سوکھا۔

(۲۴) نقل صوت کے تسلسل کے لئے تکرار لفظی میں؛ وسط میں جیسے چھنا چھن، دنادن، چھپا چھپ۔

(۲۵) علامت توصیفی جیسے جوڑا۔

(۲۶) تصغیر کے لئے جیسے بھینا، بٹیا، جوروا، گڑیا، بھیّا۔

(۲۷) تحقیر و طنز کے لئے (بحالت فاعلی) اُچکا، چھوٹا، اٹھائی گیرا۔

(۲۸) تحقیر و طنز کے لئے اسم کے بعد جیسے سسرا، میّا۔

(۲۹) علامت تانیث جیسے چڑیا، کتیا، چوہیا، گدھیا۔ (ہندی پنجابی مؤنث چڑی، کتی، چوہی، گدھی کے بعد الف کا اضافہ کرکے اردو مؤنث بنائی گئی)۔

(۳۰) اسم فاعل کی علامت جیسے راج سے راجا، بے سرا، ایک تارا دوتارا۔

(۳۱) علامت اضافت کے لئے عدد کے ساتھ جیسے پچاسا، سترا، بہترا۔

(۳۲) زاید بھی آتا ہے جیسے آنگن سے انگنا، کنگن سے کنگنا۔

(۳۳) حذف الف ابتدا سے جیسے ادھیلا سے دھیلا، ادھیلی سے دھیلی۔

(۳۴) الف شعر میں آکر ابتدا سے ساقط ہوجاتا ہے لکھا جاتا ہے، مگر پڑھنے میں الف کی آواز نہیں نکلتی اس کو الف وصلی بھی کہتے ہیں جیسے غالب ؎

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں
یارب اس آشفتگی کی داد کس سے چاہیے
آرزو سے ہے شکست آرزو مطلب مجھے

(۳۵) عدد ترتیبی کی علامت کے لئے، ایک، دو، تین، چار اور چھ کے آخر میں جیسے اکا، پہلا، دوسرا، تیسرا، چوتھا، چھٹا (ان میں ہندی تصرف کے بعد یہ شکل بنی ہے) (شاہ آن صاحب۔ نے ک کے ماقبل علامت

واحد قرار دے کر، اکا، اکائی اکہرا مثالیں لکھی ہیں، ان تینوں میں ابتدائی الف علامتی نہیں اصلی ہے۔ نیز اکا میں آخری الف علامت ترتیب قرار دیا جاسکتا ہے۔ اکائی ایک سے نو تک کے مفرد اعداد کو کہتے ہیں۔ اس میں الف وسطی کو علامتی کہہ سکتے ہیں۔ اکہرا عدد ضعفی ہے جس میں ہرا علامت لگائی گئی ہے۔ ان تینوں کے اصول پر دیگر امثلہ یہ ہیں۔ اکا، دکا، دوجا، تیجا، چوکا، چھکا، ستا، اٹھا۔ اکائی، دہائی دس سے ننانوے تک کے ہندسے۔ اکہرا، دوہرا، تہرا، چوہرا۔ اسی طرح ان کا یہ بیان" حاضر یا قریب کی علامت (خصوصاً غائب یا بعید کے بالمقابل) کے اِن (اُن) اِس (اُس) اِتنا (اُتنا) ایں (آں) اِدھر (اُدھر) اِلل لذی نہ اُلل لذی" بھی بے معنی سا ہے کیونکہ ان تمام الفاظ میں الف اصلی ہے۔ صرف حرکات کی تبدیلی سے قریب و بعید کے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں الف نہ علامتی ہے اور نہ اس کے سبب سے معنی میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ لہذا یہ بیان بے محل ہے)۔

(۳۶) مصدر متعدی بالواسطہ اور متعدی المتعدی اور اس سے مشتق اسماء و افعال میں علامت متعدی جیسے اٹھنا سے اٹھانا۔ چلنا سے چلانا۔ کھانا سے کھلانا۔ پڑھنا سے پڑھانا (مصادر) پڑھایا، پڑھاتا ہے (افعال) پڑھانے والا، پڑھاہو (اسما) نیز متعدی بہ دو مفعول و بہ سہ مفعول میں اپنے ماقبل واؤ چاہتا ہے جیسے پڑھوانا، کھلوانا چلوانا۔ (شان صاحب نے اس کو فعل متعدی کی لازمی علامت قرار دیا ہے لیکن مثال نہیں دی۔ یہ متعدی کی لازمی علامت نہیں ہے کیونکہ بعض متعدی مصادر میں الف آتا ہی نہیں جیسے توڑنا، کھونا کھولنا وغیرہ۔ نیز ان کا یہ قول" نیز ان تمام مصادر میں موجود جو بذاتہ متعدی ہیں"۔ درست نہیں کیونکہ لکھنا، پڑھنا، دیکھنا وغیرہ متعدی بنفسہ ہیں جن میں الف کا وجود ثابت نہیں کیا جاسکتا)۔

(۳۷) علامت ماضی: جیسے آیا، لکھا مصدر کا نا دور کرنے کے بعد۔ اگر حرف آخر کوئی حرف علت، ہو تو یا کا اضافہ ورنہ صرف الف بڑھا کر ماضی بنا لیتے ہیں جیسے سویا، دیا، کھایا، لکھا، پڑھا۔ شان صاحب نے افعال معروف و مجہول کی جو تخصیص کی ہے وہ درست نہیں کیونکہ آیا، گیا، سویا، جاگا کی طرح دیکھا، بھالا، سمجھا، بوجھا بھی معروف ہی ہیں، البتہ پہلے الفاظ افعال لازم ہیں اور دوسرے متعدی معروف و مجہول کی تخصیص کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اسی طرح اکو اللہ کا مخفف بتایا ہے اور اس کا سرناموں تعویذوں نقشوں وغیرہ پر لکھا جانا بیان کیا ہے۔ میرے خیال میں یہ اللہ کا مخفف نہیں بلکہ بسم اللہ کی مخفف شکل (ل) ہے۔ بعض حضرات اس پر ۷۸۶ یعنی بسم اللہ کے اعداد بھی بڑھاتے ہیں اور اس طرح (ل ۷۸۶، لـ ۷۸۶) لکھتے ہیں۔

(۳۸) حروف عامل کے اثر سے یائے مجہول سے بدل جاتا ہے جیسے لڑکے نے کہا۔ کنارے پر رکھو، لڑکے سے کہو۔

(۳۹) جمع کی صورت میں جب کہ لفظ فعل لازم کے فاعل یا مبتدا کی حالت میں ہو جیسے لڑکے آئے، بوڑھے گئے، گدھے سست ہیں، کتے تیز ہیں وغیرہ۔

(۴۰) فعل متعدی کے فاعل و مفعول کے آخر سے ساقط ہو جاتا ہے جبکہ وہ اسم جمع کی حالت میں ہو اور حرف عامل اس کے بعد آئے جیسے لڑکوں نے کہا، بوڑھوں نے سنا۔ میں نے بوڑھوں کو سلام کیا۔

(۴۱) جاندار اسما میں واقع ہو تو حالت تانیث میں یائے معروف وغیرہ سے بدل جاتا ہے جیسے بیٹا سے بیٹی، لڑکا سے لڑکی، گھیارا سے گھیارن۔

(۴۲) افعال یا علامات یا حروف میں اگر علامت مذکر کے طور پر ہو تو تانیث میں یائے معروف سے بدل جاتا ہے جیسے کا سے کی، سویا سے سوئی، میرا سے میری۔

(۴۳) کبھی اپنے ماقبل اظہار آواز کے لئے یائے مفتوح چاہتا ہے جیسے اکیاسی، بچیاسی، چھیاسی۔ شان صاحب نے لکھا ہے:

"عوام کے تلفظ میں دو الفاظ کے درمیان کبھی اس کے ساتھ ی کی آواز شامل ہو جاتی ہے مگر غیر فصیح: بھول یائے، دیکھ یاؤ (بھول آئے۔ دیکھ آؤ")۔ ان مثالوں میں یہ اضافہ یقیناً غیر فصیح ہے اور یہ دہلی کے عوام کی بولی ہے۔ نیز نواح دہلی بالخصوص مظفر نگر میں یہ استعمال عام ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ الف اپنے ماقبل اظہار آواز اور روانی کے لئے "ی" چاہتا ہے اور اس کی مثالیں کافی مل سکتی ہیں۔ افعال میں ماضی کے اندر یہ عمل عام ہے جب کہ مصدر کی علامت "نا" کے ماقبل حروف علت (ا و ی) میں سے کوئی حرف بحالت سکون واقع ہو، جس کی آواز حرف ماقبل سے مل کر نکلتی ہو۔ پس الف علامت ماضی داخل کیا جائے تو وہ اپنی آواز بغیر کسی حرف سے ملے ہوئے نہیں دے سکتا۔ اس لئے 'ی' کا اضافہ کرکے ظاہر کرتے ہیں جیسے سونا سے سویا، جگانا سے جگایا۔ دینا سے دیا وغیرہ۔ اکیاسی، بیاسی، بچیاسی چھیاسی، میں بھی یہی عمل جاری ہوا ہے۔ اکیانوے، بچیانوے، چھیانوے

(باقی صفحہ ۳۶ پر)

مہران[1] جوں موجوں

(سُرِ سسّی کے جستہ جستہ پارے)

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ

مترجمہ : عاصم حسین

ہم اس شمارے میں ایک مبسوط مضمون شائع کر رہے ہیں جس میں شاہ بھٹائیؒ کے کلام میں سُر کی ماہیت اور اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سُر ان کے یہاں سُر بھی ہے اور صنف بھی۔ یعنی بیک وقت موسیقی بھی اور شاعری بھی۔ ہیئت کے اعتبار سے یہ غنائیہ، جسے بے قاعدہ اوڈ (IRREGULAR ODE) کہہ سکتے ہیں، اور ڈرامہ کا ایسا منفرد مجموعہ ہے جس میں تنوّع اور لچک کی بے حد گنجائش ہے۔ اکثر غنائیے ایک طرح کے "ڈرامائی مانولاگ" ہیں اور کہیں شاعر خود یا سامعین کورس کا کردار ادا کرتے ہیں۔ شاعر کسی وقت کوئی دھن یا موضوع بڑی بے تکلفی سے چھیڑ سکتا ہے، یا داستان کی جھلکیاں پیش کر سکتا ہے لیکن اس طرح کہ داستان پھر بھی نظروں سے اوجھل رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صنف بہت کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ اور اگر ہم اسے اپنائیں تو اس کے امکانات بہت وسیع ہیں۔ (مدیر)

کر آہ و فغاں، کر آہ و فغاں، مت روک زباں، مت روک زباں
اونٹوں کی قطاروں میں کھوئی، کہیں بھول نہ جائیں تجھے سیّاں
بیکار یونہی بیٹھی ہے کیوں؟

کیا تو نے کبھی یہ پوچھا ہے کس اور گئے ہیں پردیسی؟
کس سمت سدھارے یہ سارے، یہ ہوت[2] کے پیارے ہمراہی؟
پھر وصل کا کیوں ہے یہ ارماں؟

بیٹھی ہے ہاتھ پہ ہاتھ دھرے، کیا طور یہی ہیں پریمی کے؟
جس دل میں لگن ہو پیارے کی بیٹھا رہے اتنی غفلت سے!
ہاں سارے بندھن توڑ بھی دے

ہیں دور وہ تجھ سے، پنّوں سے، وابستہ جو بھنبھور سے ہیں
کیا ان سے تیرا لہنا ہے، جو دور ترے چت چور سے ہیں
ہے پی کے ہاتھ ترا درماں

ہمسایوں کو معلوم نہیں دن بن گئی تیری رات حزیں
تو اپنے من میں جانتی ہے، پریتم سے ہے روشن تیری جبیں
تری آن پیا کے دم سے ہے

بلوچوں سے کاری زخم لگا، سینے میں دل صد چاک ہوا
دن رات سلگتے جیون سے سب تیرا تن من خاک ہوا
اک قہر تھا تیرا سوزِ نہاں

سسّی تھی یہاں، سورج وہاں ... دونوں ہوئے دست بدست رواں
دونوں کے لب تھے گرمِ فغاں

اے کیچ کے باسیو آ جاؤ ... اس بے چاری کو بہلاؤ
جس کے دل میں کتنے گھاؤ

میں کون تمہاری داسی ہوں ... میں پی درشن کی پیاسی ہوں
ٹکڑوں پہ پلی اک باسی ہوں

ہاں آؤ دو لئے غم لاؤ ... کچھ چارۂ وحشت فرماؤ
تسکین کا مژدہ پہنچاؤ

★

آنکھیں تمہاری دیکھتیں چھب گر مرے دلدار کی
جس طرح اس کی دلبری دیکھی ہے میری آنکھ نے
تم کہتیں ہاں ہاں جاؤ بھی ڈھونڈو اسے ڈھونڈو اسے
اور خاک لگتیں چھاننے خود بھی ہر اک کہسار کی

گر دیکھ پاتیں ناریاں مکھڑا مرے دلدار کا
جیسے کہ آنکھوں نے مری دیکھا ہے مکھ جادو بھرا
وہ منہ چھپا کر باہوں میں فریاد کرتیں برملا
تھمتا نہ [illegible]ل خوں بھی اُن [illegible]شم ہائے زار کا

---

[1] دریائے سندھ [2] محبوب یعنی پنّوں

ہاں لب رہیں محوِ فغاں فریاد کر فریاد کر
تا لذّتِ غم بھول کر آسودہ تیرا دل نہ ہو
اِن اشک ہائے آب پر اے بے خبر مائل نہ ہو
آنکھوں سے اشکِ خوں بہا ہر ہر قدم پہ ساہ بھر

ہے یک جہاں تاب و تواں تم میں نہاں صبر و رضا
پہنچا دو ساجن تک مجھے، پہنچا دو پہنچا دو مجھے
جس کو ترستی ہے نگہ وہ روپ دکھلا دو مجھے
رو کے زمانہ جس قدر، ہو اتنی ہی ہمت سوا

دنیا تو اپنے عیش میں دن رات ہے کھوئی ہوئی
اس کو مرے من کی لگی، دکھ درد کی پروا ہی کیا
چھوڑ دا نہیں سوتے ہوئے جو نیند میں سرشار ہیں
جلدی بھی چل، جلدی بھی چل پیچھے سجن کے باوری

ہاں ڈھونڈ لے ہاں ڈھونڈ لے آری کو اپنے ڈھونڈ لے
اٹھ پار کر بھمبھور کی ساری حدیں، کیوں کھو گئی؛
جو قافلے کے ساتھ ہیں ان کو نہیں خدشہ کوئی
میری طرح برباد ہو جو کھیلتا ہے پریت سے

کوئی نہیں ساتھن مری جو دکھ میں میرا ساتھ دے
مل مل کے ہم روئیں بہم، مل مل کے فریادیں کریں
کوئی شریکِ غم نہیں، کوئی نہیں جو دم بھرے
لے جا رہے ہیں قبر تک یہ غم مرے، یہ غم مرے!

★

سید: سید کو اگر پوچھو تو کہے، خوش رہنا اس کا لیکھ نہ تھا

سسی: میں غم کے پیڑ کی کونپل تھی شاید تھا یہی مقسوم مرا
غم ہم سب کی تقدیر میں ہے، غم ڈھیروں غم، انباروں غم
پر میرے غم کے ہیں طور نئے، مرے ساتھ رہے دن رات بہم
مرے سر پہ غموں کا بوجھ لدا، میں اسکو اٹھائے پھرتی ہوں
سب خوشیاں چھوڑ گئیں مجھ کو۔ یونہی عمر بتائے پھرتی ہوں

مرا میت پہاڑی، وہ مجھ کو صحراؤں میں دوڑائے پھرے
مرے تن کو تھکن سے چور کرے، مری ہڈیوں کو چٹخائے پھرے
وہ دیس سے کرے بدیس مجھے، نت نئے دیار دکھائے مجھے
مرے کندھے پہ کپڑے پارہ ہوئے اور ننگے سر سے پھرائے مجھے
اے بہنو کہو ہاں تمہیں کہو بھمبھور میں کیا ہے میرے لئے
اے ماں اس نگری کو تج کر مجھے راہ پہ فوراً ڈال بھی دے
جب میں اور وہ سنگ ہوں گے مرے دل میں بسے گی ہزار خوشی
ہاں ہاں اے ماں، اے سکھ ساجھی سن بات مری سن بات مری!

★

سید: اے پریم کی متوالی! تن من ہے بھسم جس کا
پنّوں سے لگا کر دل مرنے کا کیا سودا
وہ محلوں میں خوشیوں سے بھرپور ترا جیون
شعلوں پہ جلا ڈالا اور راکھ ہوا تن من
وہ لوگ عدو تھے جو محبوب کے ساتھ آئے
سر پہ ترے جُل دے کر طوفانِ بلا لائے
پھر بھی نہ ذرا غم کھا، کب تک وہ رلائیں گے
وہ خوشیوں کے دور اک دن پھر لوٹ کے آئیں گے
بالم ترا آئے گا جوں رن میں سوار آئے
یا فصلِ بہاراں میں سرمست ہزار آئے
ساجن کے بغیر اس کو بھمبھور سے کیا لہنا
پردیس ہے یہ اس کو، بنتا نہیں گھر رہنا
اس راہ چلی جب وہ جس رہ سے گئے ڈاچی
بھمبھور مٹا دل سے، بھمبھور کو وہ بھولی
یہ راہ کٹھن یارب! یہ حالِ خراب اس کا
اے مونسِ بے یاراں، آ اِس کی مدد کو آ

★

سید: کیسے راجن کا دیکھے وہ مکھڑا
تھا یہی اس برہن کا دکھڑا
پریم سے ہار تھک کر گری وہ
ایسی لاگی کہ بے سُدھ ہوئی وہ

★

"ایک نوا پردازِ یگانہ"

ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ

وہ حقیقتہً ایک نوا پرداز یگانہ تھے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی رح جنہیں ان کے عقیدت مند "لال لطیف" کے پیار بھرے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ایک مہتم بالشان شاعر، ایک مہتم بالشان مغنی۔ عظیم و زندۂ جاوید! مگر اس میں شبہ نہیں کہ شاعر عظیم کی حیثیت سے انہیں جو غیر معمولی شہرت و قبولیت حاصل ہوئی ہے اس نے لال لطیف، بہ حیثیت مغنی و موسیقار کی عظمت کو گھٹا دیا ہے۔ درحقیقت ان کے فن میں شاعری اور موسیقی دونوں اس طرح یک جان دو قالب بن گئی ہیں کہ ان کی نظمیں محض کلام موزوں نہیں رہیں بلکہ موسیقی کے بول، نہیں الفاظ کے پردے میں عین موسیقی بن گئی ہیں۔ شعر و نغمہ کی اس دوگونہ داخلی رو کے علاوہ، جو اُن کے کلام معجز نظام میں مضمر آہنگ کے طور پر کارفرما ہے۔ نہ صرف ان کے نقش شاعری بلکہ موسیقی کے اُس مشرب میں بھی جو انہوں نے یادگار چھوڑا، کافی خارجی شہادت موجود ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شاہ بھٹائی رح موسیقی کے ایک نئے سلسلۂ ایک نئی روایت کے بانی تھے۔ جب سے امیر خسرو رح نے ہندوستانی موسیقی میں نظری و عملی دونوں حیثیتوں سے جو انقلاب برپا کیا، شاہ بھٹائی رح موسیقی کی دنیا میں ایک نئی نشاۃ الثانیہ کے مہتم بالشان تصور میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ اندازہ لگانے کے لئے شاہ بھٹائی نے موسیقی کو ترقی دینے میں کیا حصہ لیا، ہمیں اس فن میں اس نئی تحریک پر نظر ڈالنی پڑے گی جو اُن کے عظیم پیشرو، امیر خسرو رح (۱۲۵۵-۱۳۵۰ء) نے جاری کی تھی۔

کافی تحریری مواد اور ماہرانہ تحقیق کے فقدان کی وجہ سے امیر خسرو رح نے نئی موسیقی کی روایت کی داغ بیل ڈالنے میں جو کام کیا ہے، اس کا کما حقہٗ مطالعہ نہیں کیا جا سکا اور نہ اس کا صحیح اندازہ ہی کیا جا سکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے عربی و ایرانی موسیقی اور مقامی ہندوستانی موسیقی کو اس طرح آمیز کیا کہ ایک نئی قومی موسیقی ظہور میں آئی۔ محض نظری بحثیں کرنے کی بجائے انہوں نے سروں، تالوں، لے، راگنیوں اور ساز کاری کے نئے طریقوں کے مظاہرے کئے جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئی ہندوستانی موسیقی بہت جلد ایک حقیقی فن بن گئی۔ ایک زندہ فن جو واقعی برتا جاتا تھا نہ کہ مذہبی پاٹھ جو صرف عبادت خانوں کی چار دیواری تک محدود ہو یا خالی خولی علمی نظریوں کی طرح پُستکوں میں بند ہو۔

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ امیر خسرو رح نے جو دونوں قسم کے سنگیت میں سنجوگ پیدا کیا تھا اس کا تعلق زیادہ تر ٹکسالی فن ہی سے تھا۔ انہوں نے دونوں کلاسیکی سنگیتوں کے بنیادی عناصر کی نئے سرے سے تشریح اور تنظیم و ترتیب کی۔ جہاں تک کلاسیکل فن کے دائرہ سے باہر عوامی فن کا تعلق ہے امیر خسرو رح نے صرف قوالی کی صنف ایجاد کی جس کا مقصد نعتیہ اور مذہبی قسم کے گیت گانا تھا۔

امیر خسرو رح سے کوئی چار سو سال بعد شاہ بھٹائی میدان میں آئے۔ انہی کی طرح وہ ایک بہت بڑے شاعر بھی تھے اور صوفی بھی۔ وہ ایک محب وطن تھے جو عوام کی زبان، سندھی میں لکھنا پسند کرتے تھے اگرچہ درباری زبان فارسی تھی۔ امیر خسرو رح زیادہ تر فارسی ہی کے شاعر تھے گو انہوں نے بھاشا بھی استعمال کی۔ جو عوام کی زبان تھی۔ وہ فی الواقع مقامی الفاظ برتنے میں بڑا لطف محسوس کرتے تھے۔ امیر خسرو کی طرح شاہ بھٹائی نے بھی موسیقی میں ایک نئی تحریک کی بنیاد رکھی۔

معلوم ہوتا ہے شاہ لطیف کو موسیقی کی ہندوستانی روایت، اس کی ابتدا اور بعدہٗ نشوونما کا بخوبی علم تھا۔ سندھ کا قدیم پایۂ تخت ٹھٹھہ، مغلیہ عہد حکومت کے شروع ہی سے موسیقی اور مغنیوں کا مرکز تھا

اُس زمانے میں جب مرکزی حکومت کی عنان اکبر کے ہاتھ میں تھی اور سندھ میں ترخانوں کی حکومت تھی، موسیقی کا ٹھٹھ میں اس قدر رواج تھا کہ ایک مستند روایت کے قول کے مطابق "گھر گھر میٹھی دھنیں اور ڈھولک کی تھاپیں سنائی دیتی تھیں"۔ یہ سلسلہ شاہ بھٹائی کے زمانے تک بھی جاری رہا۔ اور نواب ٹھٹھ کے دربار میں موسیقی کے نئے ذوق اور اسالیب کی صدائے بازگشت سنائی دیتی رہی جن میں دہلی کی نئی طرحیں بھی شامل تھیں۔ امیر خسروؒ کے عہد سے لے کر مغلوں کے عہد تک ہندوستانی موسیقی مسلسل نشو و نما کے باعث انتہائے کمال کو پہنچ چکی تھی۔ اور انہی کے زوال کے ساتھ اس کے زوال کا آغاز بھی ہوا۔ شاہ لطیف نے محمد شاہ (۱۷۱۹ - ۴۸ ء) کا عہد دیکھا تھا۔ جس کے دربار میں شُستہ و رفتہ اور زیادہ پُر تکلف انداز نے ابتدائی زیادہ توانا اور قوی اسالیب کی جگہ لے لی تھی۔ یہاں تک کہ قوالی کی صنف میں بھی یکسانیت کا غلبہ نظر آتا تھا کیونکہ اس نے نئے جوہر اور تیور پیدا کرنے بند کر دے تھے۔

یہ صورتِ حال تھی جب شاہ لطیف نے موسیقی میں ایک نئی تحریک کا آغاز کیا جس کے دو بڑے مقصد تھے (۱) عربی و ایرانی اور ہندوستانی موسیقی کے امتزاج کی ابتدائی بنیادوں پر ازسرِ نو زور دیا جائے اور ابتدائی راگوں کی طرف رجوع کیا جائے جو اس کی توانائی اور نشو و نما کا باعث ہوئے تھے۔ نیز بعد کی اُس پُر تصنع حاشیہ آرائی کو ترک کر دیا جائے جس نے اس کی بے ساختگی اور نشو و نما کا کھوج لگا دیا تھا۔ (۲) کلاسیکی روایت میں جو بالکل بے جان ہو چکی تھی، نئی روح پھونکی جائے۔ اس طرح نہیں کہ اس میں باہر سے نئی دُھنیں داخل کی جائیں بلکہ عوامی موسیقی، لوگوں کی اپنی موسیقی۔ کے نئے سرچشمہ سے نئی چیزوں کا سراغ لگایا جائے۔ اس قسم کے احیائے ثانیہ کے لئے شاہ بھٹائی نے بھٹ شاہ۔ میں ۱۷۴۲ء کے لگ بھگ جب وہ وہاں مستقلاً قیام پذیر ہوئے، موسیقی کے ایک مستقل ادارے کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے ایک نیا ساز ایجاد کیا، نئے انداز میں گانے کے لئے اپنے بعض پیرؤں کو تربیت دی، اپنی اکثر نظموں کو نئے موضوعات یا ابواب کے تحت 'سروں' میں ترتیب دیا اور ہر دُھن کو اُس راگنی سے مخصوص کیا جس میں اس کا گایا جانا مقصود تھا۔ موسیقی سے سکون و آرام کے عالم میں پورا پورا لطف اٹھانے کے لئے رات کا وقت نئے سنگیت کی مشق و ممارست کے لئے منتخب کیا گیا عشاء اور فجر کی نمازوں کے درمیان۔ شاہ بھٹائی کی زندگی کے اگلے دس سالوں میں نئی موسیقی اور اس کے گانے بجانے کا انداز مکمل ہوا اور ان کے خلیفۂ اول تمر کی زیرِ قیادت موسیقاروں کا ایک تربیت یافتہ حلقہ تیار ہوا۔ جنہیں آخر کار یہ ادارہ سپرد کر دیا گیا۔ شاہ کی وفات (۱۷۵۲ء) کے بعد جمعہ سے پہلے کی رات شاہ کے راگ کی رات مقرر ہوئی۔ جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اس ادارے کا سارے علاقے میں موسیقی کے احیا پر بڑا اثر ہوا۔ چنانچہ علاقائی موسیقی پر اس ادارے کا اثر اور اس کا مسلسل جاری رہنا، ہمیں اس کے مطالعے و تجزیہ اور مقصد اور مضمرات کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

سب سے پہلے شاہ نے نئی موسیقی کے لئے ایک نیا ساز ایجاد کیا اور اس کا نام "طنبور" رکھا۔ اس ساز کا انتخاب موسیقی کی ہند و مسلم روایت کے تاریخی تسلسل کے ساتھ موافقت رکھتا ہے کیونکہ یہ ساز پہلے پہل مصر میں ایجاد ہوا تھا اور بعد میں اسے مشرقِ وسطیٰ اور ایران میں اختیار کیا گیا جہاں سے یہ برصغیر میں داخل ہوا۔ ابتدائی عرب مغنی جو ساز استعمال کرتے تھے اس کے چار تار تھے۔ اسی طرح برصغیر کا روایتی ساز بھی "چوتار" کہلایا۔ شاہ نے اپنے نئے ساز کو پنج تار بنایا۔

جہاں تک سروں کی ترتیب کا تعلق ہے، اس کے پانچ تاروں کو یوں چھیڑا جاتا تھا — ایک طرف کے بیرونی تار کو مدھ سپتک کی پنچم پر۔ اس تار کو زبان کہتے تھے۔ یعنی نئے طنبور کی روحِ رواں، اس کی زبان جو دُھنوں کو ادا کرتی ہے۔ اس طرح کھرج کی بجائے پنچم بنیادی سُر قرار پایا۔ یہ اصول ابتدائی عربی و ایرانی روایت کے مطابق تھا۔ چنانچہ آج بھی عربی و ایرانی دھنیں زیادہ اونچی ٹیپ پر گائی جاتی ہیں۔ طنبور کے باقی چار تار دوسری طرف سے چل کر یوں چھیڑے جاتے تھے، پہلا تار جو بلوچی دنبورہ کے مطابق غور کہلاتا ہے۔ مندر سپتک کے سا پر، دوسرا اور تیسرا یعنی جھڑیوں مدھ سپتک" کے سا پر اور چوتھا ٹیپ جو زبان کے ساتھ واقع ہے، تار سپتک کے

سا پر۔

دوسرے، طنبور کا مقصد یہ بھی تھا کہ یہ دف یا ڈھولک کا کام دے۔ جب گانا شروع ہوتا ہے تو نئے سُر یا باب کی دُھن شروع ہی میں الاپی جاتی ہے۔ اور اس کے بعد جب گایا جانے والا حصہ، دائی شروع ہوتا ہے تو طنبور پر دائیں ہاتھ سے ضربیں تال پیدا کرتی ہیں۔ شاہ یہ چاہتے تھے کہ تال کی پیچیدہ تکنیک کو آسان بنایا جائے۔ اس لئے انہوں نے صرف دو بنیادی تالیں اختیار کیں: ڈیڑھی اور دو تالی۔ جن کی سنگت سے ساری دھنیں گائی جاتی ہیں۔ شاہ نے طنبور پر ایک سادہ قسم کی لَے ایجاد کی جسے چھیڑ کہتے ہیں۔ اس میں سُردن یا ابواب کے تحت لکھی ہوئی وائیاں کسی رسمی تال کی سنگت کے بغیر گائی جاتیں۔ اس طرح کی گائکی میں الاپ کی سنگت کسی تال کی ضربوں سے نہ رہی بلکہ دُھن کی اپنی مخصوص لَے سے وابستہ ہوگئی۔ اس سے ہماری توجہ شاہ کی گائکی کی طرف منعطف ہوتی ہے۔

شاہ کے قائم کردہ ادارے میں موسیقی کا جو اسلوب پیدا ہوا، اس کا جائزہ لینے کے لئے کافی تحقیق کی ضرورت ہے۔ شاہ کے کلیات میں، جو "شاہ جو رسالو" کے نام سے مشہور ہے، جو راگ راگنیاں درج ہیں، یا شاہ جی کے راگ کی حیثیت سے آج بھی گائی جارہی ہیں، ان سے ذیل کے نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں:

(۱) موسیقی کے اس نئے ادارے میں کل ۳۶ راگ راگنیاں نئے انداز میں گائے جانے کے لئے منتخب ہوئیں۔ ان میں سے ۳۰ صرف شاہ صاحب کا کلام گانے کے لئے تھیں اور ۶ دوسروں کے کلام کے لئے۔ اس طرح کل ۳۶ راگنیوں کا منتخب کرنا ظاہر کرتا ہے کہ شاہ لطیف کلاسیکی موسیقی کی ۶ راگوں اور ۳۶ راگنیوں کی روایت کو جاری رکھنا چاہتے تھے۔

(۲) ابتدائی عربی و ایرانی روایت کی طرف توجہ دلانے کے لئے ۲ راگ "یمن" اور "حسینی" بھی ان ۳۶ راگ راگنیوں میں شامل کئے گئے۔ "حسینی" عربی راگ داری کے ۱۲ مقامات یا راگوں میں شامل ہے۔ یہی کیفیت یمن کی بھی ہے۔ یہی دونوں راگ، جزواً یا کلاً امیر خسرو نے بھی دوسرے دیسی راگوں کے ساتھ ملا کر نئی راگنیاں بنانے کے لئے استعمال کئے تھے۔ ایمن اور ایمن کلیان دونوں یمن سے اخذ کئے گئے۔ اسی طرح حسینی راگوں کا میل دیسی راگوں سے ہوا۔ امیر خسرو کی انہی مخلوط راگ راگنیوں کو استعمال کرنے کے بعد استادوں نے حسینی کانڑا اور حسینی توڑی ایجاد کی۔ مگر شاہ بھٹائی "پہلے شخص ہیں جنہوں نے دونوں راگوں کے اصلی نام یمن اور حسینی بیان کئے۔ اور انہیں اپنے چیدہ راگ راگنیوں کی فہرست میں شامل کیا۔

(۳) باقی ۳۴ راگنیوں میں سے شاہ نے ۱۷ ہندوستانی کلاسیکی سنگیت سے حاصل کیں۔ اور ۱۷ عوامی سنگیت سے۔ کلاسیکی سنگیت سے چنے ہوئے راگ راگنیاں حسب ذیل تھیں:-

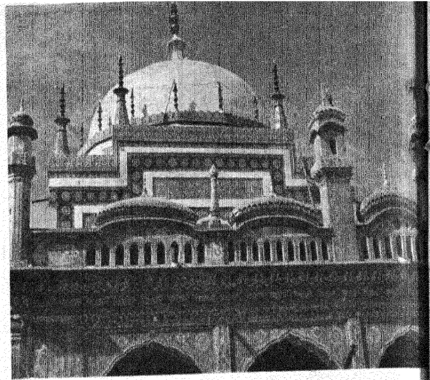
۱۔ کلیان ۲۔ کھمبات (کھماج یا کھمباوتی) ۳۔ سری راگ ۴۔ سوہنی۔ ۵۔ سارنگ ۶۔ کدارا۔ ۷۔ دیسی ۸۔ سورٹھ۔ ۹۔ بروا ہندی (کلاسیکی) ۱۰۔ بروا سندھی ۱۱۔ رام کلی۔ ۱۲۔ بلاول ۱۳۔ آسا ۱۴۔ دھناسری ۱۵۔ پوربی ۱۶۔ کامود ۱۷۔ بسنت۔

شاہ کے اسلوب موسیقی میں ان راگ راگنیوں کا شامل ہونا ظاہر کرتا ہے کہ انہوں نے کلیان۔ بلاول اور کھمبات (کھماج) کو اپنے کلاسیکی یعنی "شدھ" روپ میں برقرار رکھا کیونکہ ان تینوں کا بنیادی ٹھاٹھ ہے اور اس گروہ کی بعض اور راگنیاں بھی انہی میں شامل ہیں۔ لیکن کلاسیکی سنگیت کی باقی ۱۴ راگنیاں اس شکل میں برقرار رکھی گئیں جن میں عوام ان کو برتتے تھے۔ لہٰذا شاہ کے سنگیت میں ان کا جو ڈھنگ ہے وہ ضروری نہیں کلاسیکی سنگیت کے مطابق ہو۔

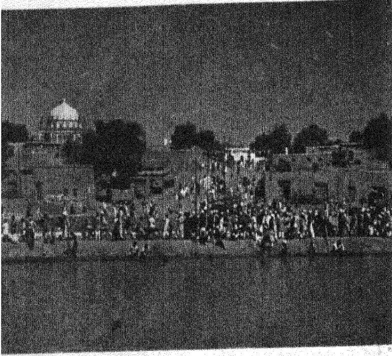
۴ ذیل کی ۱۷ راگنیاں عوامی موسیقی سے ماخوذ ہیں:

۱۔ سامندی (ملاحوں کا گیت) ۲۔ آبری (جو ئے بے آب کا گیت) ۳۔ معذور (معذوروں کا گیت) ۴۔ کوہیاری (پہاڑی علاقوں کا گیت) ۵۔ رانو ۶۔ کھاہوڑی (بنجاروں کا گیت) ۷۔ ریپ (عشق کے بارگراں کا گیت) ۸ لیلا (لیلا چنیسر کے رومان کا گیت) ۹۔ داہر (مناجاتی گیت) ۱۰۔ کپائتی۔ (جولاہہ لڑکی کا گیت) ۱۱۔ پربھاتی (صبح کا گیت) ۱۲۔ گھاتو۔ (ماہر مچھیروں کا گیت) ۱۳۔ سندھ کدارو (شکاری جانوروں شیر اور عقاب کا گیت) ۱۴۔ ماروی (عمر ماروی کے رومان کا گیت) ۱۵۔ ڈھول ماروی (ڈھول مارو کے رومان کا گیت)

لال لطیف



'' مقبروں کی شان حیرت آفریں ہے اسقدر
جنبش مژگاں سے ہے چشم تماشا کوحذر ،،
(روضہ شاہ عبداللطیف بھٹائی رح)



شاہ کے چہیتے عوام (عرس کے میلے پر ہجوم)



آزاد ہاری، جن کی زندگی کے گیت ''لطیف،، گاتا رہا



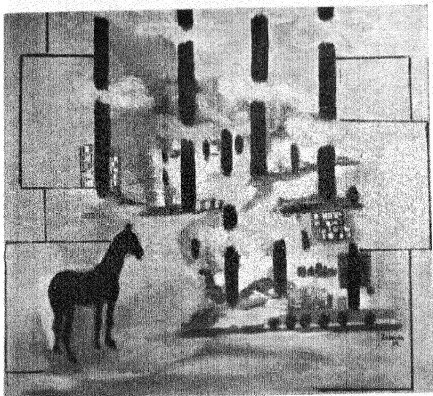
کھیت جاگ اٹھے !



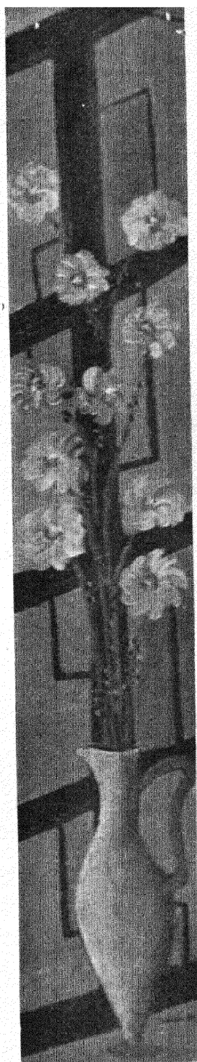
''لطیف،، جی ''لطیف چے تووٹ کمی کانہ،،

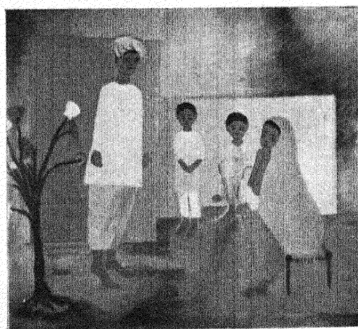
نقش ھائے رنگ رنگ

(زبیدہ آغا)



مشکی گھوڑا





گوٹ

اڑان

جاگا ھے سویرا !



۱۶۔ ہیر (ہیر رانجھا کے رومان کا گیت) ۱۷۔ کریال (کالی مرغابی یا سیہ پیرہن شکاری کا گیت؟)

ان متعدد راگ راگنیوں کے ناموں اور ان کی ترتیب و تالیف کا بسیط جائزہ ابھی باقی ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ان کی اصلی وضع اور اہمیت کیا ہے۔ ان میں سے بعض ضائع ہو چکی ہیں کیونکہ " شاہ جی کے سنگیت" کے تحت پچھلے دو سو سال میں کسی وقت ان کا رواج نہ رہا۔ شاہ جی کے ادارے سے باہر جس واحد راگنی کا سراغ میں لگا سکا ہوں وہ "معذور" ہے جو علاقہ لس بیلا کی مقامی راگنی ہے اور وہاں آج بھی بے حد مقبول ہے۔

شاہ جی کے سنگیت میں جو چیدہ راگ راگنیاں شامل ہیں ان کا انداز پُر معنی بھی ہے اور خیال افروز بھی۔ عوام کے ہر دلعزیز دیسی سنگیت سے اتنے ہی راگ راگنیاں چننا جتنی کلاسیکی ہندستانی سنگیت سے، ظاہر کرتا ہے کہ شاہ جی عوامی سنگیت کا درجہ بلند کرنا اور اس کے لامحدود اور تازہ بہ تازہ نو بنو ذرائع کو کلاسیکی روایت میں نئی روح پھونکنے کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ جو تکنیکی گُروں اور ظاہر پرستی کے غلبہ کی وجہ سے بالکل بے جان ہو چکا تھا اور عوام کے لئے اس میں بالعموم کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔

شاہ لطیف کے اس نئے سنگیت کی روایت نے قدیم سندھ میں موسیقی کی نشوونما پر زبردست اثر ڈالا۔ کلاسیکی راگ راگنیوں میں سے کلیان، سارنگ، کدارو، سورٹھ، آسا، بلاول، دھناسری اور بسنت سارے علاقے میں مقبول ہوئے۔ دوسری طرف اس قسم کی عوامی راگنیاں جیسے کوہیاری، رانو، ڈاہر، اور پربھاتی، جن کا شروع ہی سے ایک مقامی درجہ اور اہمیت تھی، بہت مقبول ہوئیں اور سارے ملک میں گائی جانے لگیں۔ موجودہ زمانے میں ریڈیو پاکستان کے ذریعہ کوہیاری اور رانو کو ساری قوم میں قبول عام حاصل ہوا ہے۔

آخر میں شاہ جی کے ایک اور اہم اقدام کا ذکر بھی لازم ہے۔ جہاں تک راگ راگنیوں کے گانے کا تعلق ہے شاہ صاحب نے ایکانکی گانے کو چھوڑ کر سنگت کو رواج دیا۔ اس سلسلہ میں سنگت کے پانچ چھ آدمیوں کا کام یہ قرار پایا: ایک مُکھی گائک جس کی دوسرے پیروی کریں۔ جوں جوں وائی گاتے

(باقی صفحہ ۴۹ پر)

ہماری قومی شاعری کے نئے تیور؛ — بقیہ صفحہ ۱۵

ترچھی ٹیڑھی کرنوں کے آپس میں خلا ملا سے جو نقشہ پیدا ہوتا ہے اس کی شبیہہ اسی سے ہو سکتی تھی کہ تا حد نگاہ ہزاروں پریمی ایک دوسرے کے گلے میں گوری گوری باہیں ڈالے نظر آئیں جیسے بعض اوقات پردۂ سیمیں پر ایک ہی خوبصورت چہرے کے ہزاروں عکس دکھائی دیتے ہیں۔ "موہنی رت" سے موہنی صورتوں کی طرف بھی اشارہ ہے۔ یہی گُر "کنواری کنواری" میں بھی برتا گیا ہے۔ خود کلیاں بھی کنواری کنواری ہیں اور ان سے مہ پیکر دوشیزاؤں کے جھرمٹ کا بھی تصور پیدا ہوتا ہے۔ دوسرے مصرعے کی زبان کتنی پیاری ہے "کامنی کامنی" میں پھر وہی کائیاں پن جس کا سارے بند میں التزام کیا گیا ہے۔ کامنی کامنی سے ذہن خود بخود البیلی نازنینوں کی طرف جاتا ہے۔ اور "کامنی کامنی بوٹیوں" کا یہ بڑا حسین تصور پیش کیا گیا ہے کہ ان کے جھنڈ کے جھنڈ یوں کھیتوں سے ابھر رہے ہیں جیسے وہ خوبصورت نازنینیں ہوں۔ پھر بعض فلموں میں پیش کیا ہوا وہ دلآویز نقشہ بھی جس میں خوبصورت کھکھلاتی حسیناؤں کے جھرمٹ کے جھرمٹ کھیتوں سے یک بیک اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ خود بوٹیوں کے پیراہن بھی لاچہ لاچہ ہیں اور ان نازنینوں کے بھی۔ اور ان کے براق، شفاف آنچلوں کے لئے "شیشہ" سے بہتر اور کیا لفظ ہوگا — پھر "ساری ساری" کے ساتھ، جن کے "حسن شیشہ ساز" سے کون صاحب ذوق شناسا نہیں؛ یہ نرالا مشاہدہ ایک عورت ہی کی نگاہ کر سکتی تھی جس کی دنیا ہی لاچوں اور شیشہ جارجٹ کی دنیا ہے!

یہ کیفیت، یہ جذبہ، یہ ربودگی، یہ گھن گرج، یہ طنطنہ، یہ سادگی و پرکاری بلاشبہ ہماری شاعری میں ایک سنہری رو پہلی باب کا اضافہ ہے۔ جس سے فکر و فن کے لئے نئی نئی راہیں کھل جاتی ہیں۔ خبر نہیں ان راہوں پر چل کر آگے کیا کیا جلوے فردوس نگاہ بنیں۔ شاعرہ کی طرح اردو کے پرستاروں کی بھی یہی کیفیت ہے کہ:

ع: یا رب! ہزاروں دعائیں مری اور میری ہزاروں امیدیں بھی
مرے دل میں ہزاروں سنہری محل اور ان کی سنہری کلیدیں بھی
مجھے پردۂ غیب سے شام و سحر جاں بخش ہزاروں نویدیں بھی
فیضانِ خدائے پاک سے ہیں مقسوم ہزاروں عیدیں بھی



افسانہ:

ڈوبتا سورج

عنایت اللہ

سورج غروب ہونے میں ذرا سی دیر باقی تھی۔

اس نے اپنے دو منزلہ مکان کی دوسری منزل کی چوتھی سیڑھی پہ پاؤں رکھا تو اسے شدت سے محسوس ہوا کہ اس کے جسم سے عمر کے کئی سال وقت سے پہلے ہی چوس لئے گئے ہیں۔ کمر میں ہلکا ہلکا درد تو عمر کے پچاسویں برس میں ہی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں عمر بھر کا ساتھی بن کے آبیٹھا تھا۔ لیکن آج سیڑھیاں چڑھتے اس نے کمر ٹوٹتی ہوئی محسوس کی۔ دو ہی مہینے گذرے اس نے اپنی تیسری بیوی کو جس کی عمر ابھی بمشکل اکیس برس تھی، کہا تھا کہ ساٹھ برس بھی بھلا کوئی عمر ہوتی ہے، بڑھاپا تو ستر برس کے بعد شروع ہوتا ہے۔ دو مہینے پہلے تک وہ کسقدر مطمئن اور مسرور تھا۔ ساٹھ سالہ پرانا جسم یوں تھا جیسے ابھی ابھی جوانی کا آغاز ختم ہوا ہے۔ ولائتی وسکی نے اس کے دل میں بڑھاپے کا احساس اور خیال کبھی پیدا ہی نہیں ہونے دیا تھا لیکن گذشتہ دو مہینوں میں ایسی ایسی آندھیاں چلیں کہ اس کی جوانی (یا فریب جوانی)، اطمینان، صحت، سکون اور جسم کی رہی سہی قوتیں بھی اڑا لے گئیں۔ وہ اسقدر شکست خوردہ تو کبھی بھی نہ ہوا تھا۔ دوسری جنگِ عظیم میں اس کا جوان بیٹا دور پردیس میں جنگ کی بھینٹ چڑھ گیا تھا تو اس نے یہ صدمہ خندہ پیشانی سے برداشت کر لیا تھا۔ پھر اس کی بیٹی کو اس کے خاوند نے ایسے الزام میں طلاق دے دی تھی جسے سن کر کسی بیٹی کا باپ گاؤں برادری میں سر اونچا کر کے بیٹھ نہیں سکتا لیکن اس کا سر اونچا ہی رہا تھا۔ دو تین برس پہلے وہ الیکشن میں شکست اور چالیس ہزار روپے کے نقصان کو ٹھنڈے پانی کی طرح پی گیا تھا۔ اس نے کیا کیا صدمے برداشت نہیں کئے تھے لیکن اس نئے صدمے نے اسے اس قدر نحیف کر دیا تھا کہ ٹانگیں دو سیڑھیاں چڑھنے سے بھی جواب دے رہی تھیں۔ اس نے دل میں درد کی ٹیس سی محسوس کی اور بصد مشکل چودہ سیڑھیاں چڑھ کے دوسری منزل کی کھلی چھت پہ پہنچ گیا۔

اینٹوں کا یہ سفید مکان بہت اونچا تھا۔ اس نے پچھواڑے کی طرف فصیل پر ہاتھ رکھ کر نیچے دیکھا۔ اس دو منزلہ قلعہ نما مکان کے سائے میں مٹی کے جھونپڑے کچھ اس طرح دکھائی دے رہے تھے جیسے زلزلے کے جھٹکوں میں ایک دوسرے کو سہارا دے رہے ہوں۔ اس قدر بلندی سے یہ مکان اصلی ہیئت سے کہیں زیادہ چھوٹے دکھائی دے رہے تھے۔ مکانوں کی یہ پستی اسے بلندی اور برتری کے نشے سے سرشار کیا کرتی تھی۔ اس بلندی سے ہر گھر کا آنگن صاف دکھائی دیتا تھا۔ اور ان گھروں میں کھیلتے، روتے، ایک دوسرے کو فحش گالیاں دیتے، ننگ دھڑنگ کالے کلوٹے بچے اسے امارت اور شہنشاہی کا احساس دلایا کرتے تھے۔ وہ اکثر دوسری منزل کی چھت پر کھڑا ہو کر ان گھروں کو دیکھا کرتا تھا۔ یہ گاؤں اور اس سے آگے ایک اور گاؤں اس کی اپنی رعایا تھی جہاں اس کا اپنا قانون چلا کرتا تھا۔ آج غروب آفتاب سے ذرا پہلے اس نے فصیل سے جھک کر ان گھروں کو اس طرح دیکھنا شروع کر دیا جیسے انہیں اور ان کے نیم فاقہ کش مکینوں کو ذرا قریب سے دیکھنا چاہتا ہو۔

ان گھروں کی ہر شے، بغیر کواڑوں کے دروازے، اپلوں میں ڈھکی چھپی دیواریں اور ان دیواروں میں رہنے والے انسان بزبان خاموشی پکار پکار کر کہہ رہے تھے "ہم بہت غریب ہیں۔ ہم مزارعے ہیں۔ ہمارا پسینہ مٹی میں مل کر خون بن جاتا ہے اور اس اونچے مکان والے کے جسم میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کے کھیتوں کی ہریالی ہمارے چہروں کی زردی سے قائم ہے۔ ہم نیچ ہیں، ہم کمین ہیں، ہم مزارعے ہیں"

اس نے بڑھیائے ہوئے رگ و ریشے میں آج بھی بادشاہی

کا احساس سرایت کرتا ہوا محسوس کیا لیکن آج یہ احساس بجھا بجھا سا تھا، ملول سا، شکست خوردہ سا احساس۔ مظلوم بیوی کی طرح چوری چھپے آہیں بھرتے ہوئے یہ چھوٹے چھوٹے مکان آج بھی اسی طرح تھے جس طرح ایک مدت پہلے تھے۔ جہاں سے لیپ اکھڑا ہوا تھا اکھڑا ہی ہوا تھا۔ جہاں سے کوئی چھت جھکی ہوئی تھی جھکی ہی ہوئی تھی اور جہاں سے دیوار گر پڑی تھی گری ہی ہوئی تھی۔ ایک عرصہ پہلے بھی اور آج بھی۔ لیکن ان دیواروں کے اندر اور باہر گلیوں میں ایک ریل پیل اور ہما ہمی تھی جو آج تھی، پہلے نہیں ہوا کرتی تھی۔ وہ مزارعے جو دو ماہ پہلے تک شام کو ڈھور ڈنگر کے گوبر پیشاب میں بچھی ہوئی ڈھیلی چارپائیوں پہ ہارے ہوئے زخمی سپاہیوں کی طرح آ گرا کرتے تھے آج اسے اکڑے، تنے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی جھکی ہوئی پیٹھیں سیدھی سیدھی سی نظر آ رہی تھیں۔ دو ہی ماہ پہلے تک وہ گلیوں میں ایک دوسرے کے قریب سے اس طرح گذر جایا کرتے تھے جیسے ایک دوسرے کو جانتے پہچانتے ہی نہ ہوں، جیسے انہوں نے سروں پر منوں بوجھ اٹھایا ہوا ہو لیکن آج وہ ایک دوسرے کو دور سے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

وہ فصیل پر اور جھک گیا۔ اس لئے نہیں کہ وہ خلق کے ان راندے ہوؤں کو ریا اس کے پاؤں تلے کچلے ہوؤں کو اور زیادہ قریب سے دیکھنا چاہتا تھا بلکہ اس لئے کہ کسی انجانے دکھ یا ایسے اجنبی سے درد نے جس کی ٹیس سے وہ کبھی شناسا نہ ہوا تھا اس کی ریڑھ کی ہڈی کو بے جان کر کے رکھ دیا تھا۔ اس نے سینہ فصیل پر رکھ کر جسم کا سارا بوجھ اس پر ڈال دیا۔ اس کے تیزی سے مرجھاتے ہوئے جسم نے جانے کتنے صدمے برداشت کئے تھے لیکن حالات اور ماحول کا یہ وار ایسا بھرپور پڑا کہ اس کے جسم کا جوڑ جوڑ الگ ہو گیا۔ چند ثانئے ہی گذرے ہوں گے کہ وہ کسی عورت کی ہنسی سے چونک اٹھا۔ اس نے گردن کو ذرا سیدھا کیا، پھر ادھر ادھر دیکھا۔ پھر دو نسوانی قہقہے، موسیقیت سے بھرپور، جل ترنگ کی طرح مترنم، آزاد سے قہقہے اس کے قریب سے یوں گذر گئے جیسے زخمی باز کے اوپر سے دو رنگ رنگیلی چڑیاں چہچہاتی ہوئی اڑتی گذر گئی ہوں۔ اس نے دائیں طرف نیچے دیکھا۔ اس کے مزارعے کما لو کی بیوہ اور کنواری بیٹی اپنے صحن میں بیٹھی ایک دوسرے کو جانے کیا کیا باتیں سنا سنا کر ہنس رہی تھیں، اسے پہلی بار معلوم ہوا کہ یہ لوگ بھی ایسی باتیں کر سکتے ہیں جن سے لبوں پہ ہنسی آ سکتی ہے۔ یہ لوگ بھی قہقہے لگا کر ہنس سکتے ہیں اور ان لوگوں کے قہقہوں میں بھی مسرت اور رچاؤ ہوتا ہے۔

"لیکن ... لیکن ....." وہ ایک جھٹکے سے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس نے غصے سے بھر کر سوچا "یہ لوگ پہلے تو یوں نہیں ہنسا کرتے تھے۔ یہ لڑکیاں کس قدر بے حیا ہو گئی ہیں! عورتیں؟ اور وہ بھی مزارعوں کی عورتیں؟ ان کی یہ مجال کہ ان کے قہقہے دور دور تک سنائی دیں؟ ....." اس نے چیخ کی حد تک بلند آواز سے پکارا۔

"اجو!" جب اس کی آواز کے جواب میں کسی نے "حضور" نہ کہا اور اجو نیم خمیدہ ہو کر اس کے سامنے آ کھڑا نہ ہوا تو وہ بجلی کی سرعت سے اس طرح پیچھے گھوما جیسے اجو کی گردن مروڑ کے رکھ دے گا جو بلانے پہ اس کے سامنے آ جھکا تھا لیکن وہاں اجو نہیں تھا۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ وہ وسیع چھت پہ اکیلا تھا۔ شعلہ بھڑک کے بجھ گیا۔ کمر میں درد کی ایک اور ٹیس اٹھی اور اس نے ہاتھ فصیل پہ رکھ دیا۔

کہاں گیا وہ وقت جب وہ اسی چھت پہ چڑھا کرتا تھا تو اس کا منظور نظر مزارع اجو سائے کی طرح اس کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ دوسرا مزارع حقہ اٹھائے ساتھ ہوتا تھا۔ تیسرا آرام کرسی اور چوتھا دو نرم و گداز سرہانے اٹھائے حکم کا منتظر رہتا تھا۔ جب وہ اپنے دیہات کا دورہ کرنے نکلا کرتا تھا تو یہ چاروں مزارعے، دونوں سرہانے، حقہ اور آرام کرسی اس کے ساتھ ساتھ جایا کرتی تھی۔ گاؤں کی لڑکیاں اور عورتیں گھونگھٹ پیچھے پھینک کر اسے سلام کیا کرتی تھیں۔ ایک بار وہ گاؤں میں سے گذر رہا تھا تو ایک مزارع کی نئی نویلی دلہن سامنے سے آ رہی تھی۔ اس نے ایک طرف ہو کر گھونگھٹ نکال لیا تو اس نے آگ بگولا ہو کر حکم دیا تھا "یہ عورتیں مجھے کیا سمجھتی ہیں؟ کمینوں کی یہ مجال کہ مجھ سے پردہ کریں؟ کیا میں لوفر لفنگا ہوں؟" اور اجو نے آگے بڑھ کر اس دلہن کا گھونگھٹ پیچھے پھینک کر ڈانٹ دیا تھا۔ "جن کا دیا کھاتی ہے ان سے منہ چھپاتی ہے؟ ہٹا دے اسے ....."

اور دلہن نظریں جھکائے، شباب سے بھرپور سینے میں جلتے نفرت، انتقام اور بے بسی کی کس قدر تیز آگ کو دباتی، زیور کے ساتھ ساتھ اس طرح گذر گئی تھی جس طرح گلی میں بیٹھے ہوئے کتے کو دیکھ کر ڈرا سہما ہوا بچہ آہستہ آہستہ، دبے پاؤں گذر جاتا ہے۔

"اجو!"

"حضور"

"فضلے نے خوب ہاتھ مارا ہے!" اس نے دلہن کو بھرپور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ "جی حضور! فضلے نے ....." اجو جانے اور کیا کہنے والا تھا کہ اس نے اجو کو ایسی نگاہوں سے دیکھا جنہیں اجو اچھی طرح نہیں، بہت اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اجو نے زیر لب کہا تھا "حضور کی اپنی کھیتیاں ہیں ..... ہی ہی ہی ہی ہی .... جب حکم ہو مائی باپ!" اور اس کی اور اجو کی نگاہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک بات طے کر لی تھی۔ اجو ان "خاموش احکام" کو خوب سمجھتا تھا۔ تاروں بھری راتوں میں اجو نے جانے ایسے کتنے "احکام" کی تعمیل بلاحیل وحجت کی تھی۔

اس کے آسمان میں جانے کتنے تارے ٹوٹ گئے تھے!

لیکن آج وہ اکیلا تھا۔ اس نے مغرب کی طرف دیکھا۔ دور، حد نگاہ سے بھی آگے تک، ہرے بھرے کھیت سمندر کی لہروں کا منظر پیش کر رہے تھے اور جہاں یہ ہریالی آسمان کی نیلاہٹ میں جا ختم ہوتی تھی وہاں سورج غروب ہونے کو اتر رہا تھا۔ دو ہی ماہ پہلے افق سے افق تک پھیلی ہوئی اس ہریالی کا وہ اکیلا مالک تھا۔ اس نے نیچے دیکھا مٹی کے مکانوں میں چہل پہل زیادہ ہو گئی تھی۔ ڈھور ڈنگر واپس آچکے تھے۔ عورتیں گائیں بھینسیں دوھ رہی تھیں۔ دودھ کی دھاروں کا ترنم بچوں کے قہقہوں اور عورتوں کی باتوں میں گھل مل کر ایسے راگ کا تاثر پیدا کر رہا تھا جو دلکش ہونے ہوئے بھی اسے بھلا نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے ان آوازوں سے بھاگ جانے کے لئے غیر ارادی طور پر بائیں طرف دیکھا۔ ایک مکان کے صحن میں اسے اجو اینٹھتا نظر آیا۔ اس سے رہا نہ گیا اور بلند آواز سے اجو کو بلایا۔ پھر دوسری آواز دی جو پہلی سے زیادہ بلند تھی۔ اجو کی بیوی نے ادھر ادھر دیکھا، پھر قلعہ نما دو منزلہ مکان کی چھت کی طرف دیکھا۔ اس دلکش جسم وصورت کی عورت نے ماتھے پہ ہلکا سا شکن ڈالا اور نفرت بھری آہنگی سے اجو کو کہا "تمہیں بلا رہے ہیں .... کوٹھے پر"۔ اجو نے اٹھنے سے پہلے کروٹ بدلی۔ کوٹھے کی طرف دیکھا، آہستہ سے اٹھا اور جوتے پہنے میں شلوار پہننے جتنی دیر لگائی۔ پھر کھڑا ہوا اور انگڑائی لی، پھر اکتاہٹ کی مظہر ایک جماہی لی اور بڑبڑایا "آگیا حضور" کہہ کے ایسی چال سے دروازے کی طرف چلا جس میں ذرہ بھر ضروری پن اور جی حضوری پن نہ تھا۔

اس نے اجو کی ہر حرکت کو دوسری منزل کی بلندی سے دیکھا، اس نے اجو کی بیوی کے تیور بھی دیکھے۔ اس کے سینے سے آگ کا شعلہ اٹھا لیکن یہ شعلہ، جو چند ہی روز پہلے جب اٹھتا تھا تو کسی نہ کسی مزارع یا نوکر کی ننگی پیٹھ اور کندھوں پر اس کے بید کی سرخی مائل نیلی لکیروں میں جا ٹھنڈا ہوتا تھا، آج اس کی اپنی ہی ذات کو جلانے لگ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے دہات کے تمام مزارع اسے بید کی چھڑیوں سے پیٹ رہے ہیں۔ بادشاہت غلاموں کے ہاتھوں بے بس ہوئی جا رہی تھی۔ یہ اجو جو کل تک ایک اشارے پر گیند کی طرح اچھل کر اس کے قدموں میں آگرتا تھا آج اس نے صرف جوتیاں پہننے میں اتنی دیر لگائی تھی اور اس کی جوان سال بیوی جس نے ازدواجیت کی جانے کتنی ہی راتیں اس کے سفید مکان کی تاریکی کی بھینٹ اس طرح چڑھائی تھیں جس طرح کوئی حالات و مصائب کا مارا ہوا، بے بس اور مجبور انسان بت کے قدموں میں اپنے خون کے قطرے قربان کیا کرتا ہے۔ آج اس عورت نے اس کی طرف یوں ماتھا سکیڑ کر دیکھا تھا جیسے کہہ رہی ہو "یہ جبیں جو کل تک تیری دہلیز پر جھکی رہتی تھی، اس کے سوا اب کیا انتقام لے سکتی ہے کہ تجھے دیکھ کر نفرت سے سکڑ جائے"۔

جب اجو نہایت اطمینان سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا اس کے قریب جا پہنچا تو غیر ضروری سے لہجے میں بولا "حضور!" غصے اور عتاب سے اس کی پسلیاں بھی چرچرا اٹھیں۔ اس نے چاہا کہ اس نمک حرام مزارع کو اس بلندی سے نیچے دے پٹخے یا کم از کم اس کے منہ پر تھپڑ ہی مار دے لیکن اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ زمانہ ان کھیتوں کے سبزہ زار سے پرے، بہت دور، جہاں ہر شام سورج غروب ہوتا ہے، جا ڈوبا ہے اور وہ زمانہ اب وہاں سے کبھی نہ ابھر سکے گا جب قانون اور انصاف بھی اس کے ہاتھ میں

اس کے مزارعوں کی طرح بھوکا ننگا اور لاچار تھا۔ اس کے جی میں آئی کہ زبانی ہی اسے ڈانٹ دے لیکن زبان نے بھی ساتھ نہ دیا۔

"حضور نے بلایا تھا؟"

"ہاں!" وہ چونک اٹھا اور آواز میں مخصوص رعب پیدا کرتے ہوئے بولا "اجو! کمالے کی بہو اور لڑکی بہت بے حیا ہو گئی ہیں۔"

"جی حضور!"

"دیکھو کس بے شرمی سے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہی ہیں۔"

"جی حضور!"

"اجو!"

"جی حضور!"

"میرے کسی گاؤں میں کبھی کوئی عورت یوں نہیں ہنسی تھی۔" اس نے اجو کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ پھر اجو کے چہرے کے بدلے ہوئے تاثر کا جائزہ لیتے ہوئے بولا "میرے مزارعوں میں یہ بے شرمی..." وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا کیونکہ اجو اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ مزارع کو ایسی جرأت کبھی ہوئی نہ تھی۔ دو گاؤں اور آٹھ ہزار ایکڑ زرخیز زمین کا واحد مالک، مزارعوں کے اڑتالیس خاندانوں کا بادشاہ ایک مفلس سے مزارع کی نگاہوں کا سامنا نہ کر سکا جیسے ان زرد پیلی آنکھوں نے اسے کہہ دیا ہو "تمہاری فرعونیت نے ان عورتوں میں حیا و شرم رہنے ہی کہاں دی ہے۔" لیکن وہ سنبھل گیا اور بدلے ہوئے لہجے میں بولا "جاؤ، انہیں کہو کہ جوان بہو بیٹیاں یوں نہیں ہنسا کرتیں۔"

"حضور!" اجو نے انکساری سے جواب دیا "کسی کی ہنسی کو میں کیسے روک دوں! کسی کو خوش ہونے سے روکا ہی کیوں جائے حضور؟"

"اجو!" اس نے غصے سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"حضور کا غلام ہوں......" اجو نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا "جوان لڑکیاں یوں ہی ہنسا کرتی ہیں۔ اور مائی باپ! جناب کے مزارعوں کے ہر گھر میں خوشیاں منائی جا رہی ہیں۔ میں آپ کے پاؤں کی جوتی، کیسے کسے ہنسنے سے روکوں گا۔"

"کیوں خوش ہیں سبھی؟" اس نے آواز میں طنز بھر کے پوچھا۔

"یہ خوشی کیا کم ہے حضور!" اجو نے عاجزی سے کہا۔ "کہ سب کو زمینیں مل گئی ہیں جن کے اب وہ آزاد مالک ہیں۔"

"کیا انہیں معلوم ہے کہ یہ زمینیں کل تک میری تھیں؟"

"جی مائی باپ! معلوم ہے۔ شاید اسی لئے وہ خوش ہیں۔"

یہ وار ایسا پڑا کہ وہ بوکھلا گیا۔ اجو نے اس کا نمک حلال کرتے ہوئے اسے سنبھالا دے ہی دیا۔ بولا "سرکار بہت تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ آرام کیجئے۔ شام ہو رہی ہے۔ خدا جناب کا اقبال بلند کرے، پانچ سو ایکڑ زمین بھی تھوڑی نہیں ہوتی۔ اللہ کا دیا بہت ہے۔ شہر میں دو کوٹھیاں کرائے پر چڑھی ہوئی ہیں، کار ہے، ایک بیٹا کپتان دوسرا لفٹیننٹ ہے۔ لاکھوں بنک میں ہوگا......" اجو کے الفاظ اس کے رگ و ریشے میں اعلیٰ قسم کی شراب کے قطروں کی طرح داخل ہونے لگے۔ اس نے اجو کو ایسی نگاہوں سے دیکھا جن میں تحسین اور تشکر کی نمایاں جھلک تھی۔ اجو کہہ رہا تھا "آرام کیجئے سرکار! یہ مزارع کسی کے محسن نہیں ہوتے۔ ابھی تک جناب کی اترن پہنے ہوئے ہیں اور آپ کی زمینوں کے مالک بن کر آپ کے ہی سر پہ ہنس رہے ہیں۔"

اجو کے بولنے کے انداز اور باتوں نے اسے ایک بار پھر جاگیردار اور زمیندار بنا دیا۔ اس کی گردن جو سکڑ چلی تھی اکڑ کر بائیں طرف گھوم گئی۔ اس کی نگاہیں ایک اور گھر کے صحن میں جا گریں۔ اس نے تیزی سے اجو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "سنا ہے اس کمین اشرف نے وہ رشتہ کرنے سے پھر انکار کر دیا ہے؟"

"ہاں حضور!" اجو نے جواب دیا۔ "وہ کہتا ہے کہ لڑکی نقص دار ہے۔"

"حرام خور!" اس نے اپنے مخصوص عتاب آلود لہجے میں کہا۔ "کیا وہ بھول گیا ہے کہ میرے مزارعوں کے رشتے ناطے میری مرضی اور حکم سے طے ہوتے ہیں؟ اسے

اپنی مرضی کرنے کی ہمت کیسے ہوئی؟"

"کہتا ہے میں بے عزتی مول نہیں لونگا..... عزت کا سوال ہے سرکار؟"

ایک مزارع کی حکم عدولی پہ وہ اسقدر برافروختہ ہوا کہ اپنی موجودہ پوزیشن یکسر بھول گیا۔ بولا "کیا وہ بھول گیا ہے کہ میں نے اسے کہا تھا یہ رشتہ اسے کرنا پڑے گا؟ کیا نقص بتاتا ہے اس لڑکی میں؟ اسقدر خوبصورت لڑکی ہے..... اس کتے کو میرے پاس بلاؤ۔ کمین اپنی اصلیت بھول گیا ہے۔ شکر کا کلمہ نہیں پڑھتا کہ روٹی مل رہی ہے اور روتا ہے عزت کو۔ کمین کو بھلا عزت اور غیرت سے کیا واسطہ؟ دوسروں کی چاکری کرنے والوں کی عزت ہوتی ہی کہاں ہے؟"

"حضور خود سیانے ہیں......" اجو نے اسے کچھ یاد دلاتے ہوئے کہا۔ "جب کسی انسان کو اس کی چھینی ہوئی طاقت واپس کرکے اسے آزاد کر دیا جاتا ہے تو اس کی سوئی ہوئی رگیں خود بخود جاگ اٹھتی ہیں۔ وہ کمین شاید اب سرکار کا حکم نہیں مانے گا۔"

"اجو!" اس نے اجو کو حیرت زدہ اور بے چین سی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "تم نے اس طرح کی باتیں پہلے کبھی نہیں کی تھیں۔ اتنے الفاظ کہاں سے لے آئے ہو؟"

"سرکار کے حضور میں بہت کچھ سیکھا ہے جناب!" اجو نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا۔ "ہوں!..... تو وہ آزاد ہو گیا ہے......" اس نے طنز آلود مگر ہارے ہوئے سے لہجے میں کہا۔ "صرف اسلئے کہ حکومت نے اسے بھی میری زمین سے حصہ دے دیا ہے۔ کس نے بتایا ہے اسے کہ وہ اب کمین نہیں رہا؟ حکومت نے اس کی ذات تو نہیں بدلی؟"

"پٹواری منشی نے حضور!" اجو نے جواب دیا۔ "پٹواری سب کو بتا گیا ہے کہ نیا قانون بن گیا ہے جس کی رو سے ان زمینوں کے اب تم مالک ہو———— اب تم کسی زمیندار جاگیردار کے مزارع نہیں ہو......"

"پٹواری نے......" اس نے دانت پیس کر کہا۔ "پٹواری! جس کا سارا خاندان کل تک میرے دانوں پہ پلتا رہا ہے، جس کے بچے ہر عید پر میرے دئے ہوئے کپڑے پہنتے رہے ہیں۔" "لیکن پٹواری منشی اب وہ پٹواری نہیں رہا حضور!" اجو نے کہا۔ "ہم نے اسے پانچ سیر گڑ دیا تھا۔ اس نے نہیں لیا۔ کہتا تھا اب سب کام مفت کیا کروں گا۔ اس نے سب کے نقشے مفت بنا دئے ہیں۔ صرف دودھ پیا تھا اس نے..."

وہ فصیل کے سہارے جھک گیا۔ اس کی آنکھیں لال سُرخ ہوتی چلی گئیں، ہونٹ کپکپائے لیکن کچھ کہہ نہ سکے۔ اسے یوں لگا جیسے ٹانگیں اس کا بوجھ اٹھا نہ سکیں گی۔ اگر اجو بول نہ پڑتا تو شاید وہ کانپ کر گر پڑتا۔

"وہ لڑکی بہت حسین ہے حضور!" اجو نے کہا۔ "ہے تو غریب مزارع کی بیٹی لیکن شکل و صورت سے شہزادی معلوم ہوتی ہے۔ لوگوں نے اس کے ساتھ ایک قصہ جوڑ دیا ہے۔ آپ کے اپنے عشو مزارع کا بیٹا اشرف اس کے ساتھ شادی نہیں کرتا۔"

"گویا وہ لڑکی بدنام ہے؟"

"جی سرکار! ایک آدمی ہے جس کے ساتھ یہ لڑکی..."

"کون ہے وہ آدمی؟" اس نے شکست خوردہ سے غصے سے پوچھا۔

"حضور! جناب کا نمک کھایا ہے۔ کیسے عرض کروں؟ معافی چاہتا ہوں۔" اجو نے نظریں اس کے پاؤں پہ گاڑ دیں۔

"کون ہے وہ؟" اس نے اب کے پورے غصے سے پوچھا۔

"آپ کا بڑا صاحبزادہ......"

جب اس نے اپنے بیٹے کا نام سنا تو اچھل کر سیدھا ہو گیا۔ غصے سے اس کے بچے کھچے دانت بجنے لگے۔ پُرعتاب آواز میں بولا "کیا یہ قصہ سچ ہے اجو؟"

"کسی قصے کا سچا ہونا ضروری نہیں ہوتا سرکار!" اجو نے جواب دیا۔ "قصہ قصہ ہی ہوتا ہے لیکن بدنامی ہو جاتی ہے۔ اور جب ایک قصہ کسی غریب کی بیٹی کے ساتھ جوڑا جاتا ہے تو بغیر کسی ثبوت کے سچ مان لیا جاتا ہے حضور!"

"اجو! تم جاؤ......" اجو جانے لگا تو اس نے کہا۔ "اور سنو! بڑے صاحبزادے کو اوپر بھیجتے جانا۔"

اس کا بڑا بیٹا اکرم خاں ایک مہینے کی چھٹی آیا ہوا تھا۔

جب اجّو چلا گیا تو اس نے دور پرے پیپل کی شاخوں میں نگاہیں گاڑ دیں، پھر وہ پیپل کے اردگرد پھیلے ہوئے خلا میں کھو گیا۔ اُسے یاد آیا کہ تین ہی برس پہلے یہ لڑکی اپنے بھائی اور باپ کے ساتھ اس کے گھر آئی تھی۔ اس کا باپ نوکری کی تلاش میں تھا۔ وہ کھیتی باڑی اور ہل سے ناواقف تھا۔ لیکن اسے نوکری مل ہی گئی تھی۔ اس نے اس مزدور کو ایک اچھی قسم کا جھونپڑا اور پیپل کے ساتھ کی چار ایکڑ زمین دے کر کہا تھا کہ "یہاں کام کرو" اور اس کے ساتھ ایک اور مزارع لگا دیا تھا تاکہ وہ ہل چلانا اور کھیتی باڑی کے دیگر کام سیکھ جائے۔ صرف یہی نہیں، اس نے انہیں ایک گائے بھی دی تھی اور لڑکی کے باپ کو کہا تھا "یہ تمہاری بچی کے لئے ہے۔ بچی کو دودھ پلاتے رہنا اور اسے دھوپ میں باہر نہ نکلنے دینا۔" اس وقت لڑکی کی عمر صرف تیرہ ساڑھے تیرہ برس تھی۔ صنفِ نازک کا تمام تر حسن اور رعنائیاں جیسے اس تیرہ برس کی لڑکی میں سمو دی گئی تھیں۔ مفلسی اور نیم فاقہ کشی بھی اس کے حسن کا کچھ نہ بگاڑ سکی تھی۔

جب اس نے اس مختصر سے خاندان کو نوکری دی تھی اس وقت اجّو اس کے ساتھ تھا۔ لڑکی کے چلے جانے پر اس نے بائیں آنکھ بند کر کے اجّو کو رازداری سے کہا تھا "چیز اچھی ہے اجّو!" اور اجّو نے اس کی ٹانگیں دباتے ہوئے کہا تھا "تین برس اور حضور! سرو کا بوٹا بن جائے گی۔" اور اس کے ہونٹوں کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ایسی مسکراہٹ پھیل گئی تھی جس میں جانے کتنے سرو کے بوٹے مرجھا گئے تھے۔

اور آج وہ تین برس گذرنے کا انتظار کر ہی رہا تھا کہ مزارعوں نے اس کے اپنے ہی بیٹے کو اس لڑکی کے ساتھ وابستہ کر دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ قصہ غلط نہیں ہوگا۔ باپ کے سینے میں بیٹے کے خلاف رقابت کی چنگاری سلگی جسے اس نے اندر ہی اندر بجھا لینے کی سر توڑ کوشش کی۔

"آپ نے بلایا ہے ابا جان؟"

اکرم خاں کی پُرشباب آواز نے اسے پیپل کے اردگرد پھیلے ہوئے خلا میں سے نکال لیا۔ اس نے گھوم کر دیکھا اور اپنے آپ میں آتے ہوئے اکرم سے اس قصے کے متعلق پوچھا۔

"ابا جان! یہ بالکل بے بنیاد ہے۔" اکرم نے اسے بتایا۔ "بات صرف اتنی ہوئی تھی کہ لڑکی میں لڑکیوں والی جھجک نہیں ہے۔ اس روز میں شکار سے لوٹ رہا تھا تو وہ کھیتوں میں میری راہ میں آ گئی۔ ہنستے ہنستے کہنے لگی۔ سرکار جی! کسی روز غریبوں کو بھی شکار کھلا دیجئے نا! ابا جان! وہ معصوم سی لڑکی ہے۔ میں نے اسے ایک تیتر، ایک فاختہ اور دو کبوتر دے دیئے۔ پرسوں میں پھر شکار سے آ رہا تھا تو وہ پھر رستے میں ملی اور بھکاریوں کے انداز سے مسکرائی۔ میں نے اسے چار پانچ پرندے دے دیئے۔ ہاں، ابا جان! اس سے ایک دو روز پہلے میں شام کو گاؤں سے لوٹ رہا تھا تو وہ راستے میں بیٹھی مل گئی۔ اس کے پاؤں میں موچ آ گئی تھی اور اس سے چلا نہیں جاتا تھا۔ میں اسے اپنے پیچھے گھوڑے پر بٹھا لایا تھا۔"

"اور جانتے ہو کہ اس کا نتیجہ کیا نکلا ہے؟"

"جانتا ہوں ابا جان!" اکرم نے کہا "دونوں دیہات کے مزارعوں نے بات کا بتنگڑ بنا دیا ہے اور ایک غلیظ سی کہانی ہر طرف پھیل گئی ہے۔ مجھے اپنی رسوائی کا ڈر نہیں۔ افسوس اس بات پر ہو رہا ہے کہ اس کا منگیتر اشرف اس سے بدظن ہو گیا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ مزارعوں کی ساری برادری نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اس لڑکی کا رشتہ مزارعوں کا کوئی گھر قبول نہیں کرے گا۔ لڑکی کا باپ سو سو آنسو روتا ہے اور میری منتیں کرتا ہے کہ میں لوگوں کو سمجھاؤں۔ میں نے سب کو سمجھانے کی بہت کوشش کی ہے لیکن وہ نہیں مانتے۔ بات کچھ بھی نہیں، لڑکی جس قدر خوبصورت ہے اس سے کہیں زیادہ بھولی بھالی اور پاک ہے، لیکن مزارعے اپنے فیصلے پر قائم ہیں۔"

"کمینوں کی یہ ہمت؟" باپ نے جھنجھلا کر کہا "میں سب کو یہاں بلاؤں گا اور ......"

"لیکن ابا جان!" اکرم نے خود اعتمادی سے کہا "آپ ایسے وقت کی بات کر رہے ہیں جو گذر گیا ہے۔ اب آپ ان مزارعوں کو اپنے فیصلوں اور خواہشوں کا شکار بنا سکتے ہیں۔"

"تو جائیں جہنم میں حرام خور!" اس نے یوں اطمینان سے کہا جیسے اس نے فی الواقع تمام مزارعوں کو جہنم میں پھینک دیا ہو اور

اور ان سے زمینیں چھین کر پھر اپنے قبضے میں کرلی ہوں، بولا "میں جانتا ہوں وہ کتنی کچھ عزت اور غیرت والے ہیں۔ اکرم! غریب آدمی کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔ عزت اور غیرت صرف ہمارے ہاں ہوتی ہی اونچے گھرانوں میں۔ تم اب انہیں کچھ نہ کہو۔ اگر وہ لڑکی تمام عمر کنواری رہتی ہے تو رہنے دو۔ ہمیں کیا؟"

"لیکن اباجان!" اکرم نے کہا۔ "وہ میری وجہ سے بدنام ہوئی ہے۔ اس کی سزا اس اکیلی کو کیوں ملے؟ اگر اس نے جرم کیا ہے تو میں بھی برابر کا مجرم ہوں۔"

"تم ان نمک حراموں میں دلچسپی لینا چھوڑ دو اکرم!" اس نے نصیحتہً کہا۔ "ہمارے پاس کل پانچ سوا ایکڑ اراضی رہ گئی ہے۔ اس کے لئے دیانتدار سے مزارعے تلاش کرلو اور اس لڑکی کے جھنجھٹ میں مت پڑو۔"

"نہیں اباجان!" اکرم نے گہرا سانس لیا اور باپ کے سینے پر نظریں گاڑتے ہوئے بولا "میں اس لڑکی کے ساتھ شادی کررہا ہوں۔"

"کیا کہا تو نے؟" وہ یوں کانپتی ہوئی آواز میں بولا جیسے اسکا قلعہ نما دومنزلہ مکان بنیادوں تک ہل گیا ہو۔

"میں اس کو بیاہ لاؤں گا اباجان!"

"مزارع کی بیٹی کو بیاہ لاؤ گے؟ کمین کی لڑکی کو میری بہو بناؤ گے؟"

"ہاں، اباجان! میری چھٹی کے دس روز باقی ہیں۔ اس کے بھائی اور باپ کے ساتھ میں نے بات طے کرلی ہے، لڑکی بھی رضامند ہے۔ میں اسے ساتھ لے جارہا ہوں۔"

"اکرم!......" وہ غصے میں بولا لیکن کچھ کہہ نہ سکا۔

"اباجان!" اکرم نے کہا۔ "مجھے اس لڑکی سے محبت ہے۔"

اس نے فصیل پر ہاتھ رکھ دیئے اور سر جھکا لیا۔ آج اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ ساٹھ برس جی چکا ہے اور اب بہت بوڑھا ہوگیا ہے اور اس کی تین بیویوں میں سے تیسری کی عمر بمشکل اکیس برس ہے۔ اکرم اسے تھامنے کو آگے بڑھنے لگا تو وہ فصیل پر جھک کر دوہرا ہوگیا اور پھر سیدھا نہ ہوسکا!

سورج غروب ہوچکا تھا!!

"الف" ــــ بقیہ صفحہ ۲۳

کی نوعیت بھی ایسی ہی ہے۔ علاوہ ازیں اگر حروف علت کے علاوہ بھی کہیں ایسے لفظ پر اضافہ کیا جائیگا جہاں حرف آخر الف سے نہ مل سکتا ہو تو 'ی' کا اضافہ کردیں گے مثلاً اسم فاعل ہیں: دھنیا کوسیا، جڑیا، بلیا وغیرہ۔

(۴۴) انگریزی سے آتے ہوئے ان تمام الفاظ کے شروع میں الف مکسور زاید آتا ہے جو (S) سے شروع ہوتے ہیں اور (S) ساکن ہوتا ہے کیونکہ اردو میں کوئی لفظ حرف ساکن سے شروع نہیں آتا۔ اس لئے اظہار آواز کے لئے الف کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ جیسے اسکول، اسٹیشن، اسٹیشنری، اسٹیڈیم، اسپرٹ، اسٹیٹ وغیرہ البتہ اہل پنجاب انگریزی کے ایسے الفاظ میں (S) کی آواز "س" ساکن ہی سے ادا کرتے ہیں جو بولنے اور سننے میں کچھ بھلی نہیں لگتی۔

زیر بحث مضمون میں "بعض اعداد ترتیبی میں (آں کا متبادل)" چھپا ہے۔ میرے خیال میں یہ سہواً ایسا لکھا گیا ہے۔ صاحب مضمون نے "واں" لکھا ہوگا۔ کیونکہ یہ "واں" (جیسے پانچواں ساتواں کا متبادل ہے جس کا ذکر ۳۵ میں ہوا۔

حرف الف کے متعلق امور متذکرہ کے علاوہ اور باتیں بھی بیان کی جاسکتی ہیں۔ متعدد سابقوں اور لاحقوں میں دوسرے حروف کے ساتھ مل کر مختلف معنی پیدا کرتا ہے جنکا بیان بہت طویل ہوجائے گا۔

لفظی حیثیت سے ایک مستقل اسم ہے جس کو "ال ف" کی ردیف میں لکھنا چاہئے۔ اس کے متعدد معنی ہیں اور اس سے مختلف محاورے وجود میں آئے ہیں۔

•

یک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا
فنا تعلیم درسِ بیخودی ہوں اُس زمانے سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

(غالب)

•

لوک کھیل:

اشمان سینا

بنگلا ترجمہ: مسز محمد حسین

اردو ترجمہ: شہاب رفعت

(ایک دن جب اشمان سنگھ سینا بستی نامی گاؤں میں کسی شخص کو گرفتار کرنے جا رہا تھا تو اسے سیتل سنگھ کی بیٹی رام درگا دکھائی دی۔ وہ اس کو دیکھتے ہی اس پر دیوانہ وار عاشق ہو گیا اور بڑی پریشانی کی حالت میں گھر واپس آ کر اپنی داسی سے کہنے لگا:)

اشمان: جانتی ہو آج مجھے کیسا اچرج سماں دکھائی دیا۔

چیری: ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔ آپ کو چھت سے میٹھا گھیا دشکتا دکھائی دیا ہوگا۔

اشمان: ارے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ سچ سچ بتاؤ آج میری آنکھوں نے کس کا جوبن دیکھا؟

چیری: ہاں بھئی سمجھ گئی۔ دریاؤں میں گھڑیال بھی تو ہوتے ہیں۔ تم نے اس کا جوبن دیکھا ہوگا۔

اشمان: اری مجھے یوں کس لئے ستاتی ہے۔ سچ سچ بتا میں نے آج کس کا روپ دیکھا؟

چیری: لو میں اب سمجھی۔ سیتل سنگھ کی بیٹی ہے، رام درگا تم نے اسے دیکھا ہوگا۔

اشمان: ہاں ہاں۔ یہ بتاؤ اب اس سے پھر کیسے ملا جائے۔

چیری: بس جھیل کنارے کدم کے خوشبودار درخت کے نیچے چھپ جاؤ۔ سیتل سنگھ کی بیٹی اپنی سہیلیوں کے ساتھ وہاں اشنان کرنے آئے گی۔ تم اسے وہاں پھر دیکھ سکو گے۔

اشمان: ارے! کیا واقعی؟!

چیری: ہاں ہاں۔ کیوں نہیں!

اشمان: تو پھر لو میں چلا وہ رہی جھیل۔ کدم کی شاخیں بھی تو پڑی لہرا رہی ہیں۔ جب سیتل کی بیٹی وہاں نہلانے آئے گی تو میں پھر اس کے جوبن کی بہار دیکھ سکوں گا۔

(درگا داخل ہوتی ہے)

درگا: اے سکھیو! آؤ چلو جھیل میں نہائیں۔

ایک سہیلی: نہیں میں تمہارے سنگ نہیں جاؤں گی۔

درگا: تمہیں لے ہی کون جا رہا ہے؟!

سہیلی: جانا ہی کون ہے؟

درگا: اسے تو لے جانا ہی کون چاہتا ہے۔

(دونوں مذاق میں ایک دوسرے کو کوسنے دیتی ہیں۔ پھر درگا ایک ایک کرکے باقی سہیلیوں سے التجا کرتی ہے۔ اکثر کسی نہ کسی بنا پر انکار کر دیتی ہیں۔ آخر ایک مان جاتی ہے) بہن، تو نے خوب کہی۔ مجھے گرمی لگ رہی ہے۔ چلو ذرا پانی میں ڈبکی لگا آئیں۔

درگا: تو آؤ چلیں۔

سہیلی: چلو (چلنے لگتی ہے) لو میں تمہارے سنگ چل رہی ہوں۔

درگا: جانتی ہو ہم کہاں جا رہے ہیں جھیل میں اشنان کرنے۔

سہیلی: ہاں ہاں یہ تو جانتی ہوں۔ پر کبھی تم نے جھیل کا کنارہ بھی دیکھا ہے؟

درگا: نہیں، آج تک تو دیکھا نہیں۔

سہیلی: کبھی وہاں گئی بھی ہو؟

درگا: نہیں ابھی تک تو نہیں۔

سہیلی: تو پھر سکھی میں تمہارے ساتھ جھیل میں نہانے نہیں جاؤں گی۔

درگا: کیوں سکھی کیوں نہیں جاؤ گی؟

سہیلی: اسلئے کہ جیٹھ اور اساڑھ کے ان مہینوں میں پتہ ہے کیا ہوتا ہے؟ ندیوں اور [illegible] دریاؤں میں گھڑیال مل جاتے ہیں! اگر کسی گھڑیال نے تمہیں ہڑپ کر لیا تو میں تیری ماں کو کیا منہ دکھاؤں گی؟

درگا: تو پھر کیا کروں سکھی؟

ا؎ ایک عوامی کھیل جو فرید پور، ڈھاکہ اور باریسال (مشرقی پاکستان) میں عام طور پر کھیلا جاتا ہے۔

سہیلی : پہلے اپنی ماں سے جا کر آگیا لو۔ تب میں تمہارے سنگ جھیل کنارے جا سکوں گی۔

درگا : سجنی، تو ذرا ٹھہر۔ میں ماں کی آگیا پوچھ لوں۔

اے ماں، اے ماں، مجھے آشیرواد دینا۔ میں نہانے چلی ہوں۔

ماں : بیٹا رام درگا۔ تجھ پر ایشور کی دیا ہو۔

درگا : ماں مجھے بدا کرو، میں چلی جھیل کی اور ــــ!

ماں : بیٹی تیری تو پانچ چیریاں ہیں۔ انہیں کہو کہ وہ پانی کے گھڑے بھر لائیں۔

درگا : میں روز پانی کے ان پانچ گھڑوں سے نہاتی ہوں جو میری پانچ چیریاں بھر کر لاتی ہیں۔

آج کچھ جی ماندا ہے۔ اسلئے میں خود جا کر جھیل میں اشنان کرنا چاہتی ہوں۔

ماں : اچھا چلی جاؤ۔ پر اپنی پانچوں چیریوں کو تو بلاؤ اور ان کے ساتھ جھیل میں نہا آؤ۔

درگا : رے ماں، میں اپنی پانچوں چیریوں کو ساتھ لئے جاتی ہوں۔

ماں : ٹھیک ہے، مگر جلدی چلی آنا، بیٹا۔

درگا : او سجنی!

(تین آدمی، گھٹی ہوئی آواز میں کھلکھلا پڑتے ہیں) ہی ہی ہی ہی!

درگا : ہے رام! یہ ڈھور ڈنگر کچھ بے چین معلوم ہوتے ہیں۔

ایک آدمی : بی بی! میں بھی تمہارے ساتھ چلوں۔

(درگا پہلے تو اس کی ہنسی اڑاتی ہے مگر پھر ساتھ چلنے دیتی ہے)

دوسرا آدمی : بی بی، میں بھی تمہارے ساتھ چلوں؟

(درگا اسے بھی کچھ چڑاتی ہے مگر اسے بھی ساتھ چلنے دیتی ہے)

تیسرا آدمی : بی بی، میں بھی تمہارے ساتھ چلا چلوں؟

درگا : ہاں ہاں کیوں نہیں۔ تمہیں پورا اختیار ہے۔

(درگا گیت گاتی ہے جس میں وہ اپنی چیریوں اور سہیلیوں کو یہ کہتی ہے کہ وہ اس کے ساتھ گھڑے بھرنے نہ جائیں کیونکہ انہیں خبر بھی نہ ہوگی اور کالا دیو، کنہائی وہیں کہیں گھاٹ میں لگا ہوگا۔ آخر میں کہتی ہے:)

جھیل کے کنارے جہاں ہم اپنے گھڑے بھریں گی، انگریزوں نے وہاں ایک جال بچھا رکھا ہے، پانی کے نل۔ ان پر کالا دیو، کنہائی، سوار دکھائی دے گا۔

درگا : آؤ سہیلیو واپس چلیں۔ ہم جھیل میں نہیں نہائیں گے۔

چیری : مالکن، کیوں نہیں؟ ذرا ٹھہرنا۔ میں ایک ڈبکی لگا لوں۔

(درگا گاتی ہے)

مرے سارے جتن بے کار گئے
چلو آؤ، سکھی، اب لوٹ چلیں
مرے پگ چلنے سے ہار گئے
اک دکھن سمائی نس نس میں
میں گھاٹ نہانے کیا آئی
من کھو گیا کیسے کیا جانیں
چلو آؤ سکھی اب لوٹ چلیں

درگا : چیری ذرا یہ تو بتا تا پانی میں وہ جادو بھری پرچھائیں کیا دیکھ رہی ہوں۔

چیری : اے ہے، جھیل کے پانی میں گھڑیال ہوتا ہے۔ کہیں تجھے اس کی جھلک دکھائی دے گئی ہوگی۔

درگا : اری سچ سچ بتا میں نے یہ ابھی ابھی کس کی جھلک دیکھی؟

چیری : درگا بی بی، آکاش پہ بادل چھائے ہیں۔ میں جانوں تم نے ان کی چھب دیکھی۔

درگا : اری مجھے کیا بنا رہی ہے؟ مجھے بتا، سچ سچ بتا یہ کس کی پرچھائیں ہے؟

چیری : بی بی، دیکھو لو وہ رہا چت چور!

درگا : کیا کہا، کیا کہا؟

چیری : (گاتی ہے):

لو وہ آئے ترے چت چور
ترے چت چور۔ ادھر اس اور
سانوریا سامنے تیرے کھڑا
سنگ پیڑ کدم کے دیکھ جرا
اس پریت نے تیرے نینوں پہ
ان مدھ متوالے نینوں پہ
آتے ہی ڈال دیا سایہ
اک کالے جادو کا سایہ
ترے من میں سمویا اندھیارا

اک بان ترے من پر مارا
تو وہ آئے ترے چِت چور
ترے چِت چور۔ ادھر اس اور

درگا: اے چیری، ذرا جا کر یہ تو پتہ چلا کہ اس انجانے منش کا گھر کہاں ہے۔

چیری: تو میں چلی (تھوڑی دور چل کر) اے پردیسی تیرا گھر کہاں ہے؟

اشمان: میرا گھر ایک انجانے دیس میں ہے۔

چیری: تم کہاں سے آئے ہو؟

اشمان: ایک انجانے دیس سے۔

چیری: کہاں جا رہے ہو؟

اشمان: اسی انجانے دیس کو

چیری: تمہارا نام؟

اشمان: مجھے کہتے ہیں پردیسی

چیری: تو پھر چلتے پھرتے نظر آؤ۔

اشمان: میں یہاں تمہارے بلائے تھوڑا آیا ہوں۔ اور نہ تمہارے کہنے پر چلا جاؤں گا۔ پر وہ میری انمول درگا یوں کہہ دے کہ میں چلا جاؤں تو پھر چلا ہی جاؤں گا۔ ورنہ جان بھی چلی جائے تو جانے کا نام نہ لوں۔

چیری: اچھا تو پردیسی ذرا ٹھہر جا۔ میں اس انمول درگا کی طرف جاتی ہوں (درگا کی طرف جا کر کہتی ہے): سرکار سنتی ہیں؟

درگا: کہو اس انجان کا نام کیا ہے؟

چیری: نام ہے پردیسی۔

درگا: کہاں سے آیا؟

چیری: کسی دیس انجانے سے

درگا: کہاں جا رہا ہے؟

چیری: دیس انجانے کو

درگا: اس سے کہا تھا کہ یہاں سے چلا جائے؟

چیری: کہا تھا۔ کہتا ہے، نہیں جاؤں گا۔ جب تک درگا نہ آئے اور مجھ سے ایک دو باتیں نہ کرے۔ چاہے جان ہی چلی جائے پر وہ یہاں سے نہیں ٹلے گا۔

درگا: پردیسی تیرا گھر کہاں ہے؟

اشمان: میرا گھر — مرا گھر کسی دیس انجانے میں۔

درگا: پھر بھی کہاں سے آئے؟

اشمان: دیس انجانے سے۔

درگا: کدھر چلے؟

اشمان: اسی دیس انجانے کو۔

درگا: نام؟

اشمان: پردیسی!

درگا: تو پھر یہاں سے ٹل جاؤ مگر جانا نہیں۔

اشمان: ہاں ہاں میں بھی تو برابر یہی کہتا چلا آرہا ہوں میں چل تو دوں گا، مگر جاؤں گا نہیں۔

درگا: (گاتی ہے):

چلے جاؤ۔ چلے جاؤ
یونہی بتیاں ناہیں بناؤ
تم ٹھہرے پردیس کے باسی
توسے بات کا ناہیں چاؤ

اشمان: (گاتا ہے):

سچ کہیو چھبیلی ناری
میں جاؤں کہاں تو پہ واری؟
کیسے من میں بھریں آشائیں
انہیں لے کے کہاں ہم جائیں

درگا: (گاتی ہے):

گئیں بھاڑ میں سب آشائیں
بس جائیں، خدا را جائیں

اشمان (گاتا ہے):

میں پیڑ اور تو ہے بیل
رہے اپنا سدا یونہی میل

درگا: (غصے میں):

نہیں جھاڑو کی ہو ریل پیل
تیرا اس کا سدا ہو میل
وہ ہے سامنے راہ تمہاری
کیجے چلنے کی اب تیاری

اشنان : تم جل بَیں جل کی مچھلیا
ایسا میل کہاں بالموا

درگا : ڈنڈا اگر ڈور کا پیر ہے سمجھے
چپ کر کے یہ رستہ لیجے

(اشنان چلا جاتا ہے)

درگا : سنو چیری۔ پردیسی نے کوئی سندیسہ بھی دیا تھا یا نہیں ؟

چیری : درگا، تم نے تو بیچارے کو دھتکار ہی دیا۔ اسلئے وہ چلا گیا۔

درگا : اگر یہ کٹھور نر دُوا نہ ہوتا تو کبھی ایسے گفتگو نہ کرتا۔ میں نے اسے اپنے ہونٹوں سے برا بھلا کہا پر من میں تو پریم ہی کرتی ہوں۔ بتاؤ بتاؤ میرا شیام کہاں گیا ہے ؟

چیری : اے ہے، یہ تم کیا کہہ رہی ہو ؟

درگا : (گاتی ہے) :

کہاں ہے میرا سانوریا
وہ سندر موہن شیام مرا
میں، اک ناری ہوں بلہاری
جیون ہی مرا ہے لاچاری
دھندے دن بھر کے رلائیں مجھے
جیون کے روگ جلائیں مجھے
دکھ جھیلنا سب بیکار مرا
ہے مکھ پہ پسینہ بوجھ بنا
گو شیام مجھے اپنائیں سکھی
یہ لوگ نہ یں دور ہٹائیں سکھی
وہ ہونٹ ان کے کندن جیسے
میں پان سے بھر دوں خوش ہو کے

(چلی جاتی ہے)

شادی

(پنڈت اور اس کی دھرم پتنی باتیں کر رہے ہیں)

دھرم پتنی : پتی دیو، تم کہیں سے کٹھل کی دعوت کھا کر آئے ہو میں اس کی ساری کتھا بتا سکتی ہوں۔

(کٹھل کے متعلق ایک پھکڑ گیت سناتی ہے۔ اور اپنے پتی سے مذاق کرتی ہے جو اس پھل کا بہت ہی شوقین ہے)۔

سوامی، تمہارے پلے بندھ کر مجھے کوئی سُکھ نہ ملا۔

پتی : وہ کیوں ؟ تمہیں میرے پلے بندھ کر کیوں سُکھ نہ ملا؟ بتاؤ جب کبھی میں "فرید پور" کی پینٹھ میں جاتا ہوں تمہارے لئے عمدہ سے عمدہ مچھلی نہیں لاتا ؟ تم اسے پکاتی ہو اور میں تمہیں اس کی ہڈیاں کھانے کو دیتا ہوں۔ جب میں سوتا ہوں تو تمہیں بستر کے نیچے نہیں سونے دیتا ؟ پھر تمہیں میرے پریم کا اور کیا ثبوت چاہیئے ؟

دھرم پتنی : پتی دیو، جب سے تمہارے پلے بندھی ہوں میں نے کبھی بھات کے ساتھ مچھلی نہیں کھائی۔

پتی : جانتی نہیں۔ ہم لوگ کھشتری بامن ہیں۔ اگر میں مچھلی پکڑنے کی بنسی کو چھو بھی لوں تو جات چلی جائے۔ اگر جال کو ہات لگاؤں تو جات باہر۔ پھر تمہیں مچھلی کیسے کھلاؤں۔

دھرم پتنی : یہ کیا تھا تمہارے کندھوں پر ؟

پتی : چھتری۔

دھرم پتنی : تو اسی سے کوئی مچھلی مار لاؤ۔

پتی : مچھلی لاؤں، کیسے ہی لاؤں ؟

ایک شخص : دیکھئے صاحب۔ میں بتاؤں ترکیب، تب ہی آپ مچھلی پکڑ لیں گے۔

پتی : سنو ! دیوی جی !

دھرم پتنی : کیا کہا پتی دیو؟

پتی : یہ لو، یہ لو ! مچھلیاں ہی مچھلیاں۔ کچھ پڑوسیوں کو دے دو۔ کچھ ملنے جلنے والوں کو کچھ رشتہ داروں کو۔ پورے سات دن کا سامان اور جی بھر کر کھاؤ۔

دھرم پتنی : ہے پتی دیو، یہ تم نے کتنی مچھلیاں پکڑ لیں۔

پتی : ارے کچھ نہ پوچھو۔ ایک بھی پکڑنا دشوار ہے، تم اتنی مانگتی ہو۔

دھرم پتنی : کونسی مچھلی ہے یہ ؟

پتی : بھیڑا مچھلی۔

دھرم پتنی : وہ کیسی مچھلی ہوتی ہے ؟

پتی : جو ملی سو لے آیا۔

دھرم پتنی : (سہیلی سے) سنا میرے پتی دیو کیا کہہ رہے ہیں ؟

سہیلی : کیا کہتے ہیں؟

دھرم پتنی: کہتے ہیں- وہ کچھ مچھلی لائے ہیں- کچھ پڑوسیوں کو دیدو- کچھ ملنے جلنے والوں کو- کچھ رشتہ داروں کو- پورے سات دن کے لئے جمع کر لو اور خوب جی بھر کر کھاؤ-

سہیلی : نہیں تمہارے پتی دیو نے ٹھیک نہیں کہا- تم تو کھشتری بامن ہو- اگر تم نے مچھلی کھائی تو خوب موٹی ہو جاؤ گی- پھر تمہارے لئے دروازے سے نکلنا مشکل ہو جائے گا- اور تمہارے پتی دیو بھلا کب تمہاری طرف دیکھیں گے-

دھرم پتنی: تو تم کو دیکھنا شروع کر دیں گے!

سہیلی : ناں، ناں، ناں، تم کو پیار سے نہیں دیکھیں گے-

پتی : ارے پھر لگیں جھگڑنے- لاؤ اس مچھلی کو بیچ آئیں- بس ایک دھیلے میں فرید پور کی منڈی میں بیچ دوں گا- اور اس سے دھان خرید دوں گا- تم دونوں اسے میرے لئے پکا کر رکھو- مچھلی کھانے اور موٹا بننے کی فکر میں گھلی جا رہی ہیں- لو میں یہ مچھلی کیلوں کے جھنڈ میں چھوڑنے جا رہا ہوں-

دھرم پتنی: (صلح صفائی کے انداز میں) پتی دیو! لوٹ آؤ، لوٹ آؤ-

پتی : تمہیں نے جھگڑا شروع کیا تھا-

دھرم پتنی: میرے بھائیوں سے پوچھو جنہوں نے پہلے یہ جھگڑا چھیڑا-

پتی : بھائیو، کہو یہ جھگڑا کس نے چھیڑا؟

ایک شخص: ہم نے تو پہلے مرد ہی کو بولتے سنا

پتی : سبھی عورتوں ہی کی طرفداری کرتے ہیں-

دھرم پتنی: پتی دیو، آپ تو کس کام کے لئے آئے تھے؟ اب جائیے نا- بھگتائیے اسے-

پتی : کونسا کام؟

دھرم پتنی : ارے اشمان سنگھ کے بیاہ کی شبھ گھڑی بیتی جا رہی ہے- جاؤ نا، منتر پڑھو-

پتی : چل چل- کیا مطلب ہے؟ کیا بھالا مار کر رہے گی؟

دھرم پتنی: نہیں نہیں، پتی دیو "سنگھ" نہیں "سینگ"! میں تو سنگھ کہہ رہی ہوں سنگھ!

پتی : بھگوان! تیری کرپا ہے --- ! اب میں تیار ہوں- پہ ایک چٹائی لا دو-

دھرم پتنی: یہ لو-

پتی : کتنی ہیں؟

دھرم پتنی: دو-

پتی : ارے یہ نہیں- یہ تو ٹیڑھی میڑھی ہے- اس سے کام نہیں چلے گا-

دھرم پتنی: تو پھر یہ لو-

پتی : کتنی ہیں؟

دھرم پتنی: بس ایک ہے ایک، مگر ہے بہت بڑھیا-

پتی : بھئی واہ! تو ذرا ناچ ہو جائے --- !

(بیوی ناچتی ہے) بہت کچھ ہنسی ٹھٹھول کے بعد پنڈت جی چٹائی پر براجمان ہو جاتے ہیں-

پتی : دیوی جی، بھوجن تیار ہے؟

دھرم پتنی: چاول کہاں رکھے ہیں-

پتی : ارے جلدی جلدی لاؤ نا- گرما گرم-

دھرم پتنی: گھر میں چاول ہی نہیں- پھر بھی میں گرما گرم کھانا پکا کر لاؤں کہاں سے- ہوں، بھول کھاؤ گے بھول؟

ایک شخص: ارے کل تم سودا لینے بازار نہیں گئی تھیں- اور تین روٹیاں لائی تھیں-

دھرم پتنی: ہاں لائی تو تھی-

پتی : تو پھر وہی اپنے پتی دیو کو کھلا دو-

دھرم پتنی: پتی دیو، کل تم بازار نہیں گئے تھے کیا؟

پتی : ہاں گیا تھا-

دھرم پتنی: تم تین روٹیاں لائے تھے- ڈھائی میں نے کھالیں، باقی آدھی پڑی ہے-

پتی : کون چٹ کر گیا انھیں؟

دھرم پتنی: رام رے رام! گھر میں بس دو ہی تو دَم ہیں- ایک نر سوتم، ایک ناری سوہیں- آدھی تیری آدھی تیری، لاؤ؟!

پتی : ارے بھائیو، اپنی بیوی کی بچی ہوئی آدھی روٹی کیوں نہ کھائی جائے- لاؤ بیوی جی آدھی روٹی ہی لے آؤ-

دھرم پتنی: پتی دیو، میرے ہاتھ شل ہیں-

پتی : ہاتھوں میں بل نہیں تو پھر کیسے ہی دے دو --- تو یہاں تک

نوبت پہنچ گئی ہے۔ میں جو تیرے باپ کی برابر ہوں تو مجھے پاؤں سے روندتی دے گی! ٹھہر!

(ڈنڈا لے کر پیچھے دوڑتا ہے)

ایک عورت: ارے صاحب، اتنے غصے میں کیوں ہو؟

پتی: یہ پتی ورتا نہیں رہی۔ پاپن ہے پاپن۔

عورت: تو پاپ کیسے ٹھیک ہو؟

پتی: میرے پاؤں دھو کر بالوں سے پونچھے، تبھی اس کا پاپ چھوٹ سکتا ہے۔

عورت: بی بی، اپنے پاپ کا پرائشچت کرو۔

دھرم پتنی: پتی دیو، کون کہتا ہے، میں پاپن ہوں؟

پتی: کہتا کون۔ میں کہتا ہوں، تم پاپن ہو۔

دھرم پتنی: اس کا اپائے کیسے کروں؟

پتی: میرے پاؤں اپنے بالوں سے پونچھو۔

دھرم پتنی: اس سے میرا پاپ دور ہو جائے گا؟

پتی: پتہ نہیں ہو، نہ ہو۔ تمہاری چودہ پشتیں نرک میں جلیں گی۔

دھرم پتنی: میری بلا سے، جلنے دو، نہیں۔

پتی: یاد رکھو۔ اس سے تمہارا گناہ معاف ہو جائے گا۔

(دھرم پتنی اپنے بالوں سے پتی دیو کے پاؤں پونچھنے لگتی ہے)

پتی: (اچھل کر کھڑا ہو جاتا ہے) واہ واہ خوب چُل دیا!

دھرم پتنی: کیا بات ہے؟

پتی: میرے پاؤں پر مٹی پڑی تھی۔ من کے من بلکہ ٹن کے ٹن۔ آپ سب گواہ رہئے، اس نے اپنے بالوں سے میرے پاؤں پونچھے ہیں۔

دھرم پتنی: ہے رام! تم نے اتنے لوگوں کے سامنے رسوا کیا (گھونسہ تانتی ہے)۔

عورت: ارے رے رے۔ آپ جھگڑ کیوں رہے ہیں۔

پتی: میں تو لگا تھا اپنی بیوی کو مارنے، اُلٹا خود ہی پٹ گیا۔

عورت: ایسی بیوی کو نکال باہر کرو۔

پتی: بے شک پھر میرا کھانا کون پکائے گا؟

عورت: میں۔

پتی: تو لو۔ میں ابھی اسے نکال باہر کرتا ہوں چل، بیوی چل یہاں سے نکل۔

دھرم پتنی: تمہارا کھانا پکانے؟

پتی: یہی تو اتنی دیر سے تجھ سے کہہ رہا ہوں۔ کیا سمجھتی ہو تم مجھے اب اپنا کھانا پکوانے کے لئے تمہاری کوئی ضرورت ہے، جا، جا اپنے چچیا خسر کے پاس نہیں تو چچا کے پاس کسی کے بھی پاس چلی جا۔ میرا آخری فیصلہ ہے۔

دھرم پتنی: اور میں نہیں جاؤں گی۔ میرا بھی فیصلہ اٹل ہے۔

پتی: پر کھاؤ گی کیا؟

دھرم پتنی: کھاتی کیا رس گلے۔ میٹھے میٹھے۔

پتی: رس گلے کھائے گی۔ لے رس گلہ! (ڈنڈا لے کر پیچھے بھاگتا ہے) لوگو، میں نے اپنی بیوی کو نکال باہر کیا۔ اب اپنا جنیو توڑ ڈالا اور گیا یا کاشی چلا جاؤں گا۔ ہائے ہائے یہ بھی میں کیسے کروں اب تو ایک اور بیوی بھی ہاتھ آ رہی ہے۔ مگر بھائیو تم میں سے کوئی اس کا نام بھی جانتا ہے؟

ایک شخص: ہاں ہاں وہ لکشمی کی ماں ہے۔

پتی: تمہارے بہنوئی نے تمہارا ہاتھ مجھے دے دیا لکشمی کی ماں اب آؤ میرے ساتھ۔

عورت: چل، چل میں تیرے جیسے کبڑے کے ساتھ کیوں آؤں۔

پتی: تو پھر مجھے میری بیوی ہی لوٹا دو۔ اس نے تو مجھے کبھی کبڑا نہیں کہا تھا۔

لکشمی کی ماں: جو میں کہوں تم وہی کہتے جاؤ تو تمہاری بیوی واپس آجائے گی۔ بولو "اے بیوی میں پرارتھنا کرتا ہوں ......"

پتی: نہیں نہیں۔ وہ اس طرح کبھی واپس نہیں آئے گی......

لکشمی کی ماں: بولو "اے بیوی واپس آجا۔ میں تمہارے پاؤں پڑتا ہوں"

پتی: اے بیوی، آ میرے پاؤں پڑ۔

لکشمی کی ماں: اچھا۔ یہی رٹ لگائے رکھیں تو وہ کبھی نہیں آئیگی۔ لو میں چلی۔

پتی: جاؤ جاؤ۔ وہ میری بیوی ہے اور میرے کہنے پر ضرور آجائیگی۔ اے بیوی واپس آجا۔ آجا۔

دھرم پتنی: نہیں میں تمہارے ساتھ گھر نہیں جاؤں گی۔

پتی : اگر تم میرے گھر میں داخل نہیں ہونا چاہتی تو آنگن ہی میں آ جاؤ۔ میں تمہارے پاؤں پڑتا ہوں تم نہیں آؤ گی تو میں اپنا "پیتا" توڑ پھوڑ کر گیا، کاشی چلا جاؤں گا۔ لو میں نے جنیو توڑ ڈالا یہ، لو، یہ رہا!

(جنیو توڑنے کی آواز)

دھرم پتنی : ہے رام، رام، مت توڑو مت توڑو!

پتی : پیاری۔

دھرم پتنی : پتی دیو، اُس کام کا بھی دھیان ہے جس کے لئے تم آئے تھے؟ اشنان کے بیاہ کی شبھ گھڑی آن لگی ہے۔ منتر پڑھنے ہیں۔

پتی : تو پھر لاؤ نا دولھا دلھن کو۔

دھرم پتنی : یہ رہا دولھا، یہ رہی دلھن۔

پتی : اچھا تو تم یہاں بیٹھو۔ اور تم یہاں۔ او ہو اشنان سنگھ نے داڑھی بھی نہیں منڈوائی۔ بلاؤ مادھو کو۔ اس کی داڑھی مونڈے۔

(مادھو نائی داخل ہوتا ہے)

مادھو : یہ رہا مادھو کا بیٹا۔ قینچی، موچنا اور ایک کھنڈا استرا لئے۔

(داڑھی مونڈنا شروع کرتا ہے)

(سب گاتے ہیں)

اے بھیّا نائی۔ کر دے صفائی

کر دے صفائی

اے بھیّا نائی

یہ تیرا استرا۔ ہے رام، مونڈے کیا

کُند اس کی دھار ہے

بیڑا ہی پار ہے!

آیا کہاں سے یہ۔ سارے جہاں سے یہ

استرے ہی استرے

ٹوکرے کے ٹوکرے

تیری بہن کو جا۔ اک چور لے اُڑا۔۔۔!

ہو گئی صفائی

اے بھیّا نائی

نائی : کیا کہہ رہے ہو، کیا کہہ رہے ہو؟ کوئی میری بہن کو لے اُڑا! تو پھر میں اس مردوے کی داڑھی کیوں مونڈوں؟

سب : ارے ٹھہر! ٹھہر! مت جا! ۔

(نائی پھر مونڈنے بیٹھ جاتا ہے)

اے بھیّا نائی، کر دے صفائی

پیچھے کسی نے تیری، جورو اُڑائی

نائی : ارے یہ کیا! کوئی میری جورو کو لے اُڑا تو پھر میں صفائی کر چکا!

سب : ارے ٹھہر، ٹھہر، مت جا، بھیّا نائی اب تو سنجوگ کی شبھ گھڑی آن لگی ہے۔

(نائی پھر بیٹھ جاتا ہے)

اے بھیّا نائی۔ جب تم یہاں بھیجے

اک لنگوٹی اپنے سنگ لے دے کے لائے تھے

اب دیا ہے رام کی جوڑا ملا تجھے

جوڑا یہ ٹھاٹھ کا پہنے آن بان سے

کس دھوم دھام سے تم یہاں سے چل پڑے

اے بھیّا نائی

(نائی چلا جاتا ہے)

پتی : مجھے نیا مٹی کا لگن چاہیئے۔

دولھا : نیا مٹی کا لگن بیاہ کی ریت کے لئے۔ جاؤ سری رام پال کمہار کو بلا لاؤ۔ کہاں ہے وہ۔

(پال آتا ہے اور گاتا ہے)

پال : کس نے بلایا۔ سری رام پال کو بھائیو بتاؤ مجھے بھائیو بتاؤ بیساکھ میں مرا چاک گھومتا ہے کب۔ شاستروں میں ہے لکھا۔

"چیت پوجا" چیت، چیت کے ہی ماس میں ہوا کیے

چاک کے تلے تو ہیں رشو جی برا جمان

نرم نرم مٹی کو ہیں ہر دم دبا رہے

سارے بھائی بیوی کے ہیں سرگباش ہو چکے

پھر یہ گیلی مٹی کون گوندھ کر بنائے گا

گیلی مٹی میری ہے، خود ہی گوندھ لاؤں گا

اس میں لاج کچھ نہیں۔ ایک بات اور بھی

مجھ کو یاد آ رہی ہے۔ یہ بھی سن لو بھائیو

ایک دن اندھیرے میں۔ میری بیوی باپ رے!

مجھ کو بھول چوک سے "باپو جی" پکار اٹھی!

دھرم پتنی: پنڈت جی اب اشمان سنگھ کی رِیت توادا کیجیے۔

پنڈت: ہے، ہے، پیتل رانگ، کیکڑم تیرگوم

دھرم پتنی: پنڈت جی یہ کیا۔ ٹھیک ٹھیک منتر گائیے نا۔

پتی: اچھا۔ یونہی سہی۔ کہو:

میں نے آموں کے پیڑ سے ڈنڈا باندھا!
تمہاری دھوم دھام سے سہاگ رِیت ادا ہو گئی
آموں کے پیڑ کی چوٹی سے باندھی ہوئی کنڈی سے
میں نے تم دونوں کو جھوٹ یا سچ بیاہ دیا!

دھرم پتنی: پنڈت جی بیاہ سچ جھوٹ پر کیسے ہو سکتا ہے۔

پتی: اے بیوی، اشمان سنگھ رام درگا کو بیاہ کر گھر سے وہاں لیجائیگا جہاں وہ کام کاج کرتا ہے۔ رام درگا کے ساتھ اس کا بندھن زیادہ کڑا نہیں ہونا چاہیئے۔ میں نے اس بندھن کو ذرا ڈھیلا چھوڑ دیا ہے۔ وہ آزادی سے گاؤں کے کھیتوں میں گھوم پھر سکتی ہے۔

دھرم پتنی: اچھا پنڈت جی اب ذرا سچے منتر بول بھی ہو جائیں۔

پتی: اچھا تو بولو:

کیلوں اور دھانوں کی ڈھیریوں پہ ڈھیریاں
اک پٹاری میں یہاں دھڑا دھڑ بکھیر دو
لاؤ میرے ہاتھوں پر دھن کی خوب ورشا ہو
ان پہ سونے چاندی کی ٹکیاں دھرے چلو
جلدی جلدی تاکہ میں اپنے گھر چلا چلوں

دھرم پتنی: کیا یہ دھن ابھی چاہیئے؟

پتی: کیا اس دیوی کو اس مردوے کے پاس گروی نہیں رکھا جا سکتا؟

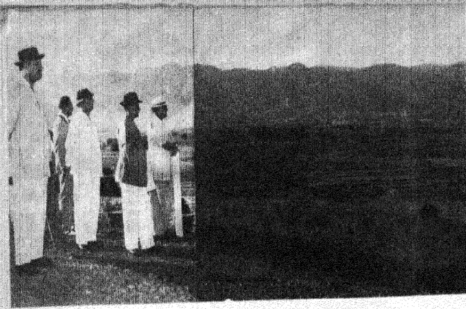
دھرم پتنی: ارے پتی دیو کہاں بھاگ چلے؟!

پتی: اِدھر، گنیش کی ماں کا پھوڑا چیرنے!

(پردہ)

منزل منزل ۔ ۔ ۔

(پاکستان دور انقلاب میں)



نیا دارالحکومت : اسلام آباد

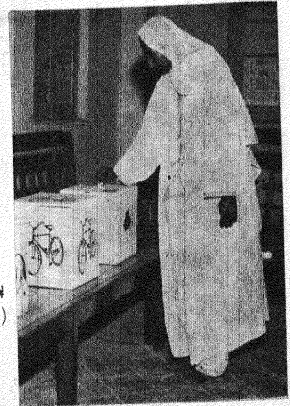


"آ تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے"

(دوسرے پنجسالہ منصوبہ ترقی پر صدر پاکستان کا نشریہ)



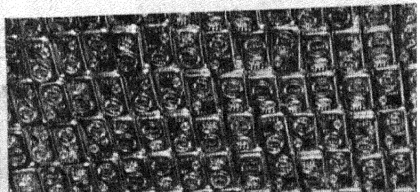
ہردلعزیز صدر پاکستان : (ایک عظیم الشان اجتماع ، (چاٹگام)



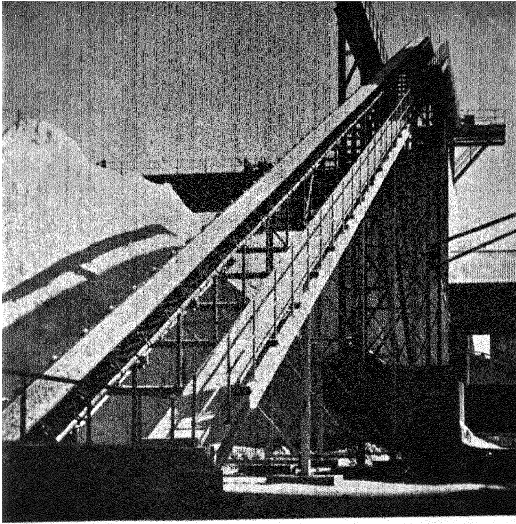
پاکستان کی نئی اساس (بنیادی جمہوریتیں)



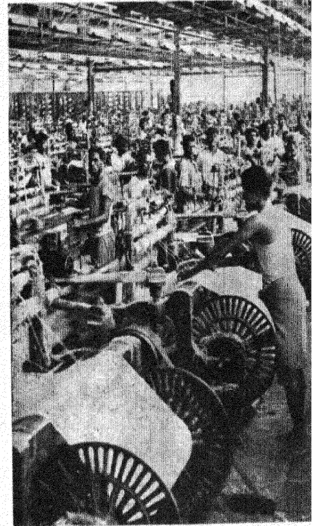
پوشیدہ خزانہ : (ناجائز در آمد کی ہوئی دولت کی بازیافت)



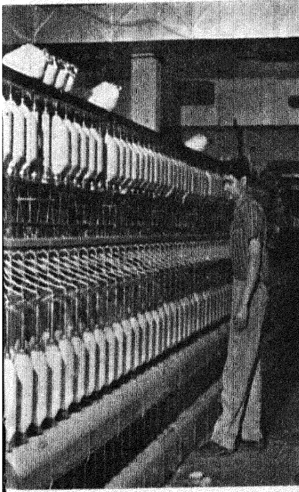
۰۰۰ گام بہ گام



تعمیراتی سامان میں اضافہ (سیمنٹ سازی)

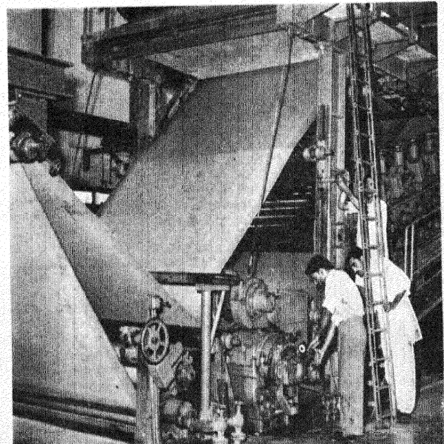


خام پٹ سن سے تیار مال تک



ہر ایک کے لئے اور کپڑا، ارزاں کپڑا

کاغذ کی روز افزوں تیاری



غزل

سراج الدین ظفر

نہیں کہ ہیں نگہِ جستجو نہیں رکھتا
یہاں جو اصلِ نمو ہے نمو نہیں رکھتا

پلا شراب کہ یہ عالمِ کشادہ محیط
کشادگیٔ محیطِ سبو نہیں رکھتا

قریب آ کہ فرح بخش ہی سہی یہ سماں
تری طرح نفسِ مشک بو نہیں رکھتا

ہمارے جام سے چھلکا ہے ناگہاں ہرات
وہ ایک نور جو قیدِ نمو نہیں رکھتا

دبے رہو ابھی اے خاکِ رہ کے خورشیدو
یہاں کوئی نگہِ جستجو نہیں رکھتا

جہانِ راز کی اے پیرِ مدرسہ تجھ کو
خبر ہو کیا کہ قدح روبرو نہیں رکھتا

گل و سبو بھی مری جستجو کی راہیں ہیں
میں ایک زاویۂ جستجو نہیں رکھتا

کوئی ہزار کرے دعوئے صفا لیکن
صفائے شاہدِ آئینہ رو نہیں رکھتا

نہ سی لبادۂ رنداں میں چاک رسوائی
یہ جامہ ہمتِ ضربِ رفو نہیں رکھتا

سکوتِ خلوتِ شب ایک جنسِ ناطق ہے
یہ اور شے ہے سرِ گفتگو نہیں رکھتا

سبو اٹھا کہ فلک خود شکارِ گردش ہے
حسابِ گردشِ جام و سبو نہیں رکھتا

ترے جمال کو آئینہ کچھ بیاں تو کرے
غریب حوصلۂ گفتگو نہیں رکھتا

غزال اور بھی کچھ ہیں مرے تعاقب میں
دل ایک سو ہے نظر ایک سو نہیں رکھتا

تری قبا ہے سلامت کہ کوئی میری طرح
شعورِ تجزیۂ رنگ و بو نہیں رکھتا

غزالِ شہر کی تسخیر مجھ سے سیکھ لے شیخ!
یہ ہے وہ ایک کرامت جو تو نہیں رکھتا

وہ سامنے ہوں تو میں اپنے شوقِ بے حد کو
بحدِ دائرۂ گفتگو نہیں رکھتا

یہ کون ہے جو سراپردۂ رگِ جاں سے
پکارتا ہے مجھے اور نمو نہیں رکھتا

ظفرؔ ہنر پہ نہ اترا کہ اس زمانے میں
گہر بھی، ہو تو کوئی آبرو نہیں رکھتا

دگرگوں ہے جہاں......؟

(غزل کی شکل میں دورِ حاضر پر اندیشہ ہائے گوناگوں)

مشتاق مبارک

وداعِ شب ہے، فسونِ ظلمت سحر کے سانچے میں ڈھل رہا ہے
زمانہ خوابِ گراں سے جاگے زمانہ کروٹ بدل رہا ہے

یہ واقعہ ہے کہ آدمی کی مہ و ثریا پہ ہیں نگاہیں
یہ تجربہ ہے نظامِ عالم ترے اشاروں پہ چل رہا ہے

نئے جہاں کے نئے تقاضوں کا ہم کو پیغام دینے والو!
نئے تقاضوں کے زیرِ داماں مہیب طوفان پل رہا ہے

عجب نہیں ہے جو قلبِ گیتی سے خوں ابلنے لگے کسی دن
یہ دور وہ ہے کہ ذہنِ انساں عجیب راہوں پہ چل رہا ہے

یہ اضطرابِ سکوں نما بھی کشاکشِ زندگی ہے شاید
وہ سامنے ہیں نظر کے اب تک نہ جانے دل کیوں مچل رہا ہے

طلوعِ مہرِ مبیں سے مطلب، عجیب ہے میکدے کی ہر شب
بہ فیضِ حسن و شبابِ ساقی چراغ محفل میں جل رہا ہے

یہ دورِ برق و شرار و آہن بظاہر اک حشرِ نو ہے لیکن
مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے مزاجِ دوراں سنبھل رہا ہے

جو رنگ و نسل و وطن کا کوہِ گراں ہے انسانیت کا دشمن
حرارتِ سعیِ آدمی سے وہ موم بن کر پگھل رہا ہے

بلندیِ علم و آگہی نے بدل دئے زاویے نظر کے
کھٹک رہا تھا جو قلبِ گیتی میں اب وہ کانٹا نکل رہا ہے

ہمارا پیغام ہے محبت زمانے بھر کے لئے مبارکؔ
اسی پہ اپنا عمل رہے گا اسی پہ اپنا عمل رہا ہے

غزل

مشفق خواجہ

کبھی پیغامِ سکوں تیری نظر نے نہ دیا
زندگی چھین لی اس طرح کہ مرنے نہ دیا

تھی بہارِ گلِ جلوہ کہ ہوا کا جھونکا
جس نے دامن نگہِ شوق کا بھرنے نہ دیا

دی جس احساس نے مرنے کی تمنا ہم کو
اسی احساس کی رعنائی نے مرنے نہ دیا

جانے کیا قصۂ غم تھا کہ نظر نے تیری
بھولنے بھی نہ دیا، یاد بھی کرنے نہ دیا

منزلیں اور بھی تھیں کوئے ملامت کے سوا
مگر آشفتہ مزاجی نے ٹھہرنے نہ دیا

وادیِ عشق میں امید بھی تھی یاس بھی تھی
مژدۂ منزل کا کسی راہگذر نے نہ دیا

عمر بھر ایک تمنائے سکوں نے مشفقؔ
دل کی بے تابی کا اندازہ بھی کرنے نہ دیا

فن:

زبیدہ آغا کی مصوّری

(نئے نقوش کی روشنی میں)

الطاف گوہر

زبیدہ آغا کا شمار اُن فن کاروں میں ہے جو پاکستان کی جدید فنی تحریک میں پیش پیش رہے ہیں۔ اُن کی تصاویر سب سے پہلے پاکستانی نقاشی کی اولیں نمائش منعقدہ کراچی (۱۹۴۹ء) میں پیش کی گئیں اور خاصی بحث انگیز ثابت ہوئیں۔ ان کی تصاویر کی تازہ ترین نمائش سال رواں میں ۱۴۔ ۲۳ جنوری کو منعقد ہوئی جس سے ان کی تخلیقات کا اثر بحیثیت ایک فنی پیشرو کے پوری طرح بروئے کار آیا۔ (مدیر)

قدرت نے زبیدہ آغا کو نقاشی کے لیے شدید جوہر عطا کئے ہیں جو اسے کبھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتے۔ آج سے تین سال پہلے جب سے صرف اس ہی کی تصاویر پر مشتمل ایک نمائش ترتیب دی گئی تھی، وہ برابر بڑی ہی تن دہی سے تصویر کشی میں معروف رہی ہے۔ اور اس کی کاوش نت نئے روپ ڈھالنے اور اصنام خیالی تراشنے میں محو ہے جس کا نتیجہ خاصے کے چند نقش ہائے رنگ رنگ ہیں۔ اب تک کوئی تیس مرقعات تیار ہو چکے ہیں جن میں موضوع اور اسلوب و الوان کا تنوع دیدنی ہے۔ ان میں "تجریدیات" بھی ہیں "ترتیبیں" بھی اور "لوک جھلکیاں" بھی، "مناظر فطرت" بھی ہیں اور "اسٹل لائف" بھی۔ پاکستان کی اس آخری قومی نمائش مصوری میں جو ۱۹۵۹ کے اوائل میں ترتیب دی گئی تھی، زبیدہ کے کئی نقوش پیش کئے گئے تھے۔ اور اس میں ججوں نے فن شناسی کا ایسا ثبوت دیا تھا جو ہمیشہ یادگار رہے گا۔

فن کی تغیر پذیر دنیا میں روایتی ججوں کا شعار ہمیشہ یہ رہا ہے کہ جب ان کے سامنے کوئی ایسی چیز آئے جس میں اپج پائی جائے تو وہ اس سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ چنانچہ اس نمائش میں بھی ججوں نے حسب عادت ایک بہت ہی اہم تصویر کو گمنام گوشے میں پھینک دیا۔ اس لئے کہ وہ ایک تجریدی نقش تھا۔ اور ان کی نظر میں اِس کی حیثیت اس کے سوا اور کچھ نہ تھی کہ کنواس پر یونہی چند کاواک لکیریں کھینچ دی گئی تھیں۔

مگر تجریدی فن کا یہ نمونہ زیادہ دیر اس گوشے میں نہ پڑا رہا۔ کیونکہ جونہی جج صاحبان باہر نکلے کوئی شخص وہاں آ نکلا جس نے یہ تصویر خرید لی۔ اس لئے کہ اسے یہ نقش "خوبصورت" معلوم ہوا۔ اور تب سے وہ فن کار سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے کہ اس میں کیا بات پیش کی گئی ہے۔ جواب ملا "کچھ بھی نہیں۔ یہ تو محض ایک تجریدی نقش ہے اور بس"۔ یہ ایسا جواب ہے جو کسی بھی نقاد کو کچھ بھونچکا کر دیگا، اسے بوکھلا دے گا۔ مگر فن کار تو ناقدین کو ہمیشہ سٹپٹاتے اور چکراتے ہی رہے ہیں۔ نیٹشے کا یہ قول آپ کو یاد ہو گا:

"رسمیت کے خلاف جد و جہد میں فن کار
عموماً اس عزم بالجزم سے سرشار رہے ہیں کہ —
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی!"

ججوں کی رائے سے کوئی اثر لئے بغیر زبیدہ برابر انتہائی والہانہ سرگرمی شوق کے ساتھ نقش پر نقش بناتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اس نے اس انداز میں تجریدی، تعمیراتی وضع کے چھ اور نقش بنا ڈالے۔

ان نقوش میں یہ چار بنیادی رنگ برتے گئے ہیں: نیلا، شنگرفی، سیاہ اور کرومی پیلا۔ اور انہیں بڑی ہی چابکدستی سے آمیز کرتے ہوئے ہر ہر نقش کو ایک نمایاں انفرادیت عطا کی گئی ہے۔ اس قسم کا اولین نقش غالباً سب سے سادہ اور کفایت آمیز تھا۔ فن کار نے اس قسم کی بنیادی ہیئت میں جو امکانات مضمر تھے، ان کو بھانپ لیا اور پھر اس میں رد و بدل کر کے ایسے ہی اور نقوش میں اپنے عمیق ترین احساسات کی ترجمانی کی۔

اس قسم کا واحد نقش جس میں دانستہ آرائش سے کام لیا گیا ہے، "سویرا" ہے ایک ایسا نقش جس میں دوسری طرحوں کی سخت گیر سنجیدگی سے ایک خوشگوار اور فرحت افزا گریز نظر آتی ہے۔ خبر نہیں اس نقش میں فن کار کی نگاہیں کیا تلاش کر رہی ہیں یا وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔ کیا آپ نے کبھی اندھیارے میں افق پر روشنی کی لانبی لانبی اجلی اجلی لکیریں دیکھی ہیں؛ — بے آواز، خوش خرام۔ پتہ نہیں یہ کہاں سے ابھرتی ہیں، پھوٹتی ہیں۔ آپس میں گھل مل کر ابھرتی ہیں اور اس طرح اجالوں اندھیروں کا ایک عجیب تانا بانا تیار کرتی ہیں۔ شاید آپ کو یاد ہو، پچھلی جنگ عظیم میں وہ گھنے گھنیرے کہ غبار آلود آکاش پر وہ کچھ ڈھونڈتی ڈھونڈتی پُرفسوں روشنی، جیسے تاریک فضا پر تاب ناک بازو لہرا رہے ہوں۔ چنانچہ اس نقش میں بھی یہ تیکھی تیکھی، روشن لکیریں کس قدر بے پناہ قوت کے ساتھ کنواس پر تاریکی کی سنگین سلاوں، بھاری بھرکم کنڈوں اور زنجیروں سے؛ جو ایک بے روح میکانکی دور کی نحوست آمیز نشانیاں ہیں، رکے بغیر آگے ہی بڑھتے ہی جاتی ہیں۔ جہاں تک مکانات اور اشجار کا تعلق ہے، یوں لگتا ہے جیسے یہ نورانی ہوائیاں سیاہ دھبوں پر بڑی حد تک غالب آچکی ہیں، اگرچہ یہ کھڑکیاں ابھی تک بند ہیں اور دروازوں کے کواڑ بڑی سختی سے بھڑے ہوئے ہیں۔ پھر بھی شگوفے صاف کھلے نظر آتے ہیں۔ دراصل یہی بند کھڑکیاں، یہی اندھیاروں کے دبیز غلاف میں لپٹی ہوئی خالی خولی دیواریں اور مکانات ہی ہیں جو ان تجریدی طرحوں میں گہری تاثراتی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ اس نقش کی تہہ میں یہ جذبہ کارفرما نظر آتا ہے کہ تاریکی کے ہر منظر کو ملیامیٹ کر دو۔ اور یہ نور کی کرنیں ان تمام تاریک گھروں کے گوشے گوشے کو رنگ و کیف کی لہروں سے معمور کردیں۔ دراصل یہی شدید کشمکش، یہی امید اور طول امل ہے جو ان تمام نقوش میں قوت اور بھرپور معنویت پیدا کر دیتا ہے۔

ان نقوش سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ فن کار نے اپنے جیتے جاگتے، لاشعوری تجربہ کو رام کرنے کے لئے کس قدر ضبط سے کام لیا ہے اور اپنی انفعالیت کو اس میں راہ نہیں پانے دیا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس کا یہ تجربہ کس قدر شدید، بے پناہ ہیجان سے لبریز ہو گا کہ اس کے قابو سے باہر نکلتا جائے۔ اس نے محض جذباتیت کی بڑی بے دردی سے بیخ کنی کر دی ہے۔ ٹیپ ٹاپ کو بالکل محو کر دیا ہے اور ایک ایسی چیز پیدا کی ہے جو بڑی سنجیدہ ہے، محض نقش نہیں۔

ان نقوش کے علاوہ نمائش میں "مرکب تصویریں" تین تھیں: دیوار۔ ایک ترتیب اور گائے۔ پہلے دو نقوش میں بھی یہی امید و امل کے احساسات کارفرما ہیں۔ دیوار میں ہرے بھرے درخت کہیں دور ایک گوشے میں ہیں، وسط میں ٹھوس بلاک بائیں طرف دروازہ۔ اگرچہ یہ ہریاول سے گھرا ہوا ہے۔ پھر بھی ہیچ ایک بھیانک تیرگی چھائی ہوئی ہے۔ کالی سیاہ بھاری بھاری چھت کے سائے میں ایک دیوار کے سرخ کنارے کی بس جھپک سی ہی دکھائی دیتی ہے۔ اسی طرح دوسری تصویر "ایک ترتیب" میں غالب عنصر گہری سنگین سیاہی ہی ہے۔ جس کے گرد شاخیں اس بے چارگی سے لہراتی معلوم ہوتی ہیں کہ ان کو دیکھ کر ترس آتا ہے۔ تیسری تصویر "گائے" ایک پرسکون، تسکین بخش ترتیب، ہر رنگ اور رنگ کا ہر روپ جیسے چاندنی میں ڈوبا ہوا۔ ایسے کہ گائے کے نکھرے نکھرے بشرے سے سارا گاؤں بڑا ہی خوش و خرم اور آسودہ معلوم ہوتا ہے۔

چند سال ہوئے زبیدہ نے ایک نقش بنایا تھا "جنگل میں گاؤں" ایک نیا نقش "پیڑوں پر شگوفوں کی بہار" اسی کا بدلا ہوا روپ ہے۔ مگر بہت ہی خوش رنگ، بہت ہی سہانا۔ اسی طرح کے دو نقوش اور بھی ہیں — "پتہ" اور "میلے کی اور" — "پتہ" یوں سمجھئے رنگوں کا طلسم ہے۔ جو دیکھتے ہی دل کو لبھا لیتا ہے۔ آپ کے سامنے اندھیرے اجالے کا ایک گھومتا پھرتا چکر ہے اور اس کے بیچ ایک آوارہ پتہ یوں آرام سے بیٹھا ہے جیسے وہ اس تمام ہلچل کا مرکز ہے۔ اچل، انند! ان سب سے خوش نما ہے "میلہ کی اور" جس میں بہار اور شگوفے اور کھلتے ہوئے رنگ سب مل کر ایک سیل رواں کا روپ دھا لیتے ہیں۔ سیدھے سادے لوگوں کا تانتا بندھا ہے جو بہار کی مست کن رت میں اپنے اندر ایک ترنگ محسوس کرتے ہوئے، اس امڈتے ہوئے سیلاب رنگ میں بہتے ہوئے، بہکے ہوئے آگے ہی بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

ان ہی کے ساتھ منظر نگاری کے بھی سات نمونے ہیں۔

ان میں سب سے نمایاں "پانیوں کی تہہ میں" ہے جس میں آتشی نیلے، عنبر، شنگرفی اور کالے رنگوں کو بالکل اور ہی انداز میں سمویا گیا ہے - اور یوں لگتا ہے جیسے کسی جالی کے تلے نظروں سے اوجھل لہروں کے ساتھ ساتھ ساری چیزیں رِستی چلی جاتی ہیں۔

کچھ نقشے دیہات کے بھی ہیں - ان میں سے ایک "گاؤں کا نظارہ" سے مشرقی پاکستان کی فضا ہماری نظروں میں گھوم جاتی ہے - ان میں جو انسانی پتلے پیش کئے گئے ہیں وہ اپنی جگہ بڑے اداس اداس پس منظر کے سامنے کچھ زیادہ ہی سپاٹ اور کاغذی سے لگتے ہیں اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ نقاش کے ذہن پر ان لوگوں کی کھوکھلی زندگی کا خیال سوار ہے - وہ زندگی جسے کونے میں رکھے ہوئے چند پھول رنگ روپ بدلنے میں کوئی مدد نہیں دیتے۔

"اسٹل لائف" کے مرقعات میں "اڑان" سب پر بھاری ہے - وہ نرم و ملائم بھوسلا گلدان پھولوں کے ساتھ یوں نظر آتا ہے جیسے کوئی ملائم ملائم بھورا بھورا پرندہ اڑنے کے لئے پر تول رہا ہو - نقش اور موضوع کی مناسبت سے تختۂ تصویر کی لمبوتری تراش کا تصور بھی بڑی ہی خوبصورتی سے کیا گیا ہے - اور خیال کو ادا کرنے کے لئے بھی قلم کاری کا بڑی استادی سے حق ادا کیا گیا ہے -

اس سے ظاہر ہے کہ زبیدہ آغا نے اپنے محسوسات کی ترجمانی کے لئے ایک زبان پیدا کر لی ہے - جو ممکن ہے اسے غیر فانی بنا دے - یہ زبان اس کے وجدان کی چھاپ بھی لئے ہوئے ہے اور اس کے احساسات سے گہری مناسبت بھی رکھتی ہے - یہ وہ بات ہے جس نے اس کے نقوش میں ایک ایسی خاصیت پیدا کر دی ہے جس سے انسانی دلچسپی جھلکتی ہے - اس کی تخلیقات کسی الگ تھلگ خیالی دنیا میں نہیں بستیں - بلکہ وہ زندگی کا جزو ہیں اور اپنے گرد و پیش کی دنیا سے وابستہ ہیں - اس کا ہر مرقع زندگی ہی میں رسا بسا ہوا ہے نہ کہ اس سے حاصل کیا گیا ہے - خواہ یہ کوئی تجریدی نقش ہو یا ترتیب، گاؤں کا منظر ہو یا اسٹل لائف - بند کھڑکیاں، اندھیرا، رواں دواں روشنی یا خالی ڈھنڈار مکان، وہ سب اسی جیتی جاگتی دنیا سے اچک لئے گئے ہیں - ہر تصویر میں جو بھی چیز ہے اس کا نقش اس طرح مرتب کیا گیا ہے کہ اس کے ربط اور توازن کا رشتہ نہ صرف اس کی اندرونی دنیا - فضا، موضوع، اشیا وغیرہ —— سے استوار ہے بلکہ کنواس کے ارد گرد اور اس سے باہر جو دنیا واقع ہے، اس کے ساتھ بھی پورا پورا ربط اور مناسبت موجود ہے ⁂ (ترجمہ)

★

ایک نوا پرداز یگانہ :—— بقیہ صفحہ ۲۹

وقت نے آگے بڑھتی جاتی، آدھی ٹولی تار سپتک کے سُر الاپتی اور آدھی مندر سپتک کے - اس طرح اونچے نیچے سپتکوں کے سُروں کے خلا ملانے سے تالیفی موسیقی کا اثر پیدا ہوا جو برصغیر پاک و ہند میں اس وضع کا سنگیت وجود میں آنے کی پہلی مثال ہے -

غرض شاہ جی نے ایک نیا ساز اور سنگیت کا نیا اسلوب ایجاد کیا - انہوں نے کلاسیکی اور عوامی موسیقی کے میل سے سنگیت کی ایک نئی روایت کی بنیاد رکھی - موسیقی میں ایک نئی روح پھونکنے اور ایک خالص پاکستانی موسیقی پیدا کرنے کے لئے ہمیں شاہ جی کے نقش قدم پر چلنا لازم ہے - ہندوستانی موسیقی کی ہند اسلامی روایت کو عوامی سنگیت کے اپنانے اور اس میں جگہ دینے سے ایک نئی زندگی اور قوت پیدا کی جا سکتی ہے - جہاں تک علاقائی عوامی موسیقی کا تعلق ہے پاکستان کا ذخیرہ غالباً تمام ملکوں سے زیادہ ہے - اور یہ ایک ایسا اچھوتا ذخیرہ ہے جو کسی ثقافتی ادارہ کے ذریعہ قومی پیمانے پر بروئے کار لایا جانے کا منتظر ہے ⁂

نقد و نظر

م - خ

سر سید احمد خاں

از : ڈاکٹر مولوی عبدالحق
ناشر: انجمن ترقی اردو پاکستان۔ کراچی
صفحات (۱۹۶)، قیمت ۴ روپے

جدید تحریک اور رقائدین ملت کے سرخیل، سر سید احمد خاں مرحوم کی شخصیت زندہ و باقی ہے۔ اور ان کا فیضان ـــ قومی، مذہبی، سیاسی، معاشرتی، فکری، علمی و ادبی۔ ایک فیض جاری ہے۔ کیونکہ ہماری موجودہ زندگی اور ترقی یافتہ رجحان تمام تر ان ہی کا ظہور اور انہی کے دل زندہ کا کرشمہ ہے۔" ذہنی انقلاب کے سب سے بڑے داعی اور نقیب" کے حالات و افکار کا تذکرہ کچھ بابائے اردو ہی کے قلم سے موزوں تھا۔ جنہیں مدتوں ان کی صحبت میں رہنے اور حالات و واقعات کو بچشم خود دیکھنے کا موقع ملا۔ بلاشبہ ہمارا ۲۷ر اکتوبر کا انقلاب "تکملہ ہے اس ذہنی انقلاب کا، جس کے اولین محرک اس برصغیر میں سر سید احمد خاں تھے۔" لہٰذا قومی نشاۃ الثانیہ کے اس بانی مبانی کا تذکرہ پاکستان کے موجودہ تاریخی دور کے ساتھ خاص مناسبت رکھتا ہے۔ اور پھر جس ذوق و شوق سے ان کے حالات بیان کئے گئے ہیں اس سے داستان کا لطف دوبالا ہو گیا ہے۔ بے شک "تصویر جس قدر بڑی شاندار اور نفیس ہوتی ہے، اسی قدر اسے پیچھے ہٹ کر دیکھنا پڑتا ہے۔" اور اس کتاب میں جو سر سید کی مبسوط یا باقاعدہ سوانح عمری نہیں اور نہ ان کے کارہائے نمایاں پر مشتمل ہے، تصویر کے خط و خال کو پیچھے ہٹ کر ہی دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور اس کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہے۔

انگاروں کے گیت
ذہن اور انقلاب

از : حسن شہیر
ناشر: کتابستان الٰہ آباد
صفحات: ۱۰۴، ۱۴۴
قیمت : ۲/۸، ۳ روپے

ان دونوں کتابوں کو پڑھ کر جن میں کوئی پانچ سال کا فصل ہے، انسان سوچنے لگ جاتا ہے کہ ان کا منبع و مخرج جنوں ہے یا ہوش۔ ساتھ ہی وہ ایک کشمکش رد و قبول میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے۔ کبھی یہ خیال کہ "انگاروں کے گیت" واقعی دہکتے ہوئے انگارے یا بھڑکتے ہوئے دیپ نہ ہوں۔ اور کبھی اس کے برعکس۔ دوسرے ہی لمحے خوابوں کا یہ محل چکنا چور ہو جاتا ہے۔ جیسے یہ فریب نظر کے سوا اور کچھ نہیں۔ شاعر شعور اور لاشعور کے سنگم پر کھڑا نظر آتا ہے جیسے وہ کوئی سرریلیسٹ شاعر ہو۔ بادی النظر میں غالب، ڈاکٹر خالد، راشد اور فیض کا مخلوط پیکر جس میں اپنے بھی تیور جھلکتے ہیں، لیکن غور سے دیکھنے پر ایک سیمیائی ہیولیٰ، ایک بکھرا ہوا تاروں کا غبار۔ اگر یہ پریشان جوہر منظم شکل اختیار کر لیں تو! مگر یہ توقع پوری نہیں ہوتی اور معنی فی البطن شاعر کی طرح شاعر فی البطن تصور ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہر قدم پر ایک بڑی توقع اور پھر ـــ یعنی چہ؟ ـــ 'شعاعِ تیرہ'، 'پرِ تُو تاب'، 'نور کے دریا خواب کے ہلکے'، 'پھیلے ہوئے ندی کے چشمے'، 'ہوا کا یہ لہکتا ہے سحاب' (؟!) ہر کہیں حواس در حواس کا التباس بہت دور پہنچا ہوا ـــ ستم ظریفی اور بے تکے پن کی حدیں پار کرتا ہوا۔ مگر سلجھی ہوئی صورت میں یہ انداز لئے :

کہ ساغر بلب آفتاب آچکا ہے،
چلتے سانس، دھڑکتی نبضیں، ڈھلتی شام،
ان گنت گلابی بات، مسکرائے خوشبوں کے،
بانہوں کے گل افشاں محراب،
ایک طوفان کا فانوس بجھا،
سبک حیا پوش سرد ایواں

نظموں کے آہنگ اور ترتیب کی بھی یہی کیفیت ہے۔ پہلے یہ احساس کہ شاعر نے آہنگ میں ایک ہی اپج پیدا کر دی مگر

جلد ہی کر کرا پن:

فانوس کا دل بجھا بجھا سا
صبر و وفا کا ایک کا سا

ہم چاہتے ہیں کاش! شاعر کی یہ جسارت کامیاب ہوتی اور آہنگ میں اجتہاد کا دروازہ کھل جاتا۔ مگر ایسا ہوتا نہیں۔ شاعر کا انداز سب سے زیادہ ڈاکٹر خالد سے ملتا جلتا ہے جن کی شاعری اس جسارت آمیز اجتہاد کا بڑا سلجھا ہوا نمونہ ہے۔ مگر 'ابتدائیہ' میں اس کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ مزید تعجب یہ ہے کہ الٰہ آباد کی سند بھی اس مجموعہ میں ساقط نظر آتی ہے:

'ٹمٹمائی سی شمع'، 'نئے چراغوں کی آبیاری'، 'حیات کُن'، 'اُس کے ہونے میں کوئی دریغ نہیں'، 'مفید بخش'، 'جذبی کی نظمیں و نیز غزلیں'، 'شدید غم ابھر آتے .... اُن کی پرورش نہیں کرتی'۔ 'دشنگرف کا رنگ کی آمیزش دیں گے'۔ 'ایسے خطوط کھینچتا ہے جو .... ہو'۔ 'حیات بینی'، 'کئی خیال .... اعانت کرتا ہے'۔ بایں ہمہ شاعر کا انداز بیان اس بات کی کھلی تردید ہے کہ شاعری بہرحال روایت ہی سے ابھرتی ہے۔ بعض اوقات یہ اس سے بے نیاز بھی ہو سکتی ہے۔ ایک اور بوالعجبی۔ شاعر پہنچنا عوام تک چاہتا ہے لیکن سو فیصدی خواص کی زبان سے!

یہ عوام کا مسئلہ ہمیں "ترقی پسند" شہیر کی طرف لے آتا ہے۔ جس نے اپنی تازہ تصنیف "ذہن اور انقلاب" میں اپنا نظری و فنی منشور پیش کیا ہے۔ اور "اندیشہ ہائے افلاکی" کو "اندیشہ ہائے خاکی" میں تبدیل کیا ہے۔ یہ اردو میں "سیاسی ہمہ اوست" کے نظریہ کی روشنی میں فکری و ادبی تعمیر کی اولیں کوشش ہے۔ جدید ذہن ماورا سے اس ٹھوس مادی زمین میں شاید زیادہ آسودگی محسوس کرے۔ اور اس سے ممکن ہے کئی ذہنی چکروں سے نجات مل جائے مگر بدقسمتی سے کوئی نظریہ بھی بظاہر نہایت مقبول ہونے کے باوجود کُلّی حق نہیں ہوتا۔ صرف اس کا نیا پن ہمیں بہکا دیتا ہے۔ شاعری ہو یا کوئی اور فن، اس کی کسی تصور سے وابستگی قطعاً ضروری نہیں۔ اس کی حیثیت تو آلۂ کار کی ہے۔ جس سے کوئی بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ۔ کسی نظریئے سے وابستگی وہ غلطی ہے جس کا افلاطون سے لے کر اب تک اعادہ ہوتا رہا ہے۔ مثال کے طور پر اس نظم کا "مادّی نقطۂ نگاہ" سے کیا تعلق ہے اور عظیم شاعری کسی نظریئے پر کیسے موقوف ہے:

جھلک، خیال کے بہتے ہوئے درخشاں ساز
خلائے نور میں ڈوبی ہوئی مری آواز

شاعری تاثر اور شعری تصور (CONCEPT) سے حقیقی شاعری بھی بنتی ہے اور بڑی شاعری بھی۔ خواہ یہ تاثر و تصور کچھ ہوں۔ فاسقانہ یا عارفانہ۔ اگر ہمیں شاعری میں اجتہاد کرنا ہے تو زندگی اور نظریات میں انقلاب برپا کرنے کی بجائے اپنے تصور کو بدلنے اور بلند تر کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

چراغِ فکر: از من موہن تلخ

ناشر: مکتبۂ قصر اردو۔ دہلی

صفحات ۱۶۰، قیمت ۲ روپے

اس شاعر کے سلسلے میں بھی وہی تصورِ فن کا سوال پیدا ہوتا ہے جسے اس نے اپنے معیار میں شامل نہیں کیا۔ مسئلہ صرف جذبے، مفہوم، الفاظ، لب و لہجہ، بڑائی، غم و خوشی اور وسعت مطالعہ ہی سے حل نہیں ہو جاتا۔ ہمیں شاعری سے یہ سب باتیں یا جذباتی تسکین، فلسفہ، سماجی شعور، نظریۂ حیات اور آفاقی یا ہنگامی قدریں وغیرہ تلاش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بلکہ یہ دیکھنا ہے کہ شاعر کا تصور کیا ہے، اس نے کس سطح پر شاعری کی ہے، اس کا اٹھان کیا ہے، اس نے کیا نئے تیور پیدا کئے ہیں، اس کا کلام کتنا تہہ دار ہے، اس میں کتنا رچاؤ ہے، اس کی فنی وسعت کیا ہے۔ اس میں کتنی نیریت ہے وغیرہ وغیرہ۔ آج کل کا ترقی یافتہ نقاد جس کے سامنے عالمی معیار فن ہے، کسی خاصے کی تخلیق ہی سے متاثر ہو سکتا ہے۔ اور اگر وہ شاعر کی جگہ اپنے ٹھوس معیار کو کام میں لائے تو شاعر کو اس کی کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیئے۔ کوئی شخص ہمیں زندگی یا شاعری کی دنیا سے باہر نہیں دھکیلتا۔ بلکہ ہم خود ہی دھکیلتے ہیں۔ ناظر کو اس سے بھی سروکار نہیں کہ شاعر نے زندگی میں ایک بھیانک خلا محسوس کیا اور اس کی عکاسی کی۔ اسے تو صرف شاعری سے سروکار ہے کہ اس کی کیا کیفیت ہے،

کیا مقام ہے۔ "چراغِ فکر" میں ایک حد تک شعری کیف تسلیم، مگر دوسری
اہم خصوصیات کا اندازہ تو مجاز، فراق، جذبی، جوش یا شور بلکہ فیض
اور راشد سے بھی نہیں ہوگا - زیادہ عظیم افراد سے ہوگا جن کا انداز
کہیں زیادہ جدید ہو - اب نہ وہ تصور مقبول رہا ہے نہ پہلے جن سے
شاعر کا شعور ابھرا ہے - اس کا نتیجہ ظاہر ہے - البتہ شاعر نے جن
احساسات کا تذکرہ کیا ہے اور اس کی شخصیت کا تصور اس کی
شاعری سے ضرور ابھرتا ہے ؏

۷ راکتوبر
ماہنامہ، کراچی
مدیر: واحد پرتاب گڈھی
ملنے کا پتہ: ۲۱۵/۴ مارٹن روڈ کراچی
قیمت فی شمارہ سات آنے

"۷ راکتوبر" سے مراد ۷ راکتوبر ہے، ہے جس سے انقلاب کی
خوشگوار یادیں وابستہ ہیں اور جس سے ہماری تاریخ کے سب سے
ترقی یافتہ، عہد آفریں دور کا آغاز ہوا ہے - جیسا کہ فاضل نگراں نے
خود ہی صراحت کی ہے ؎ کیسے نہ ہو دل کش و حسیں اکتوبر
ہے قلعۂ عزم آہنیں اکتوبر
میداں میں جب آئے تھے محمد ایوب"
راغب! تھی دراصل "ساتویں اکتوبر"

یہ رسالہ جو حضرت جوش ملیح آبادی کی سرپرستی اور حکیم راغب مرادآبادی
کی نگرانی میں جاری ہوا ہے - علمی، ادبی اور قومی ترقی کے بلند مقاصد
کے لئے وقف ہے ؎ یہ آغاز ہمیں ایک اچھے انجام کی خبر دیتا ہے ؏

شاہِ شہیداں
ناشر: ادارۂ ذہن جدید ۹۸ نیو کلاتھ مارکیٹ - کراچی -
صفحات ۱۳۴

وہ تشنگی جو سید الشہدا حسینؓ ابن علیؓ کے واقعۂ شہادت
کے متعلق ہر شخص محسوس کرتا ہے، اس سانحۂ الم کے متعلق برابر تحقیق و
تدقیق کی محرک رہی ہے - نامور مصری مصنف، عباس محمود العقاد،
نے اس موضوع پر ایک مبسوط محققانہ کتاب سپردِ قلم کی ہے جس میں
اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے اسباب و
محرکات کو واضح کیا گیا ہے - اور شروع سے لے کر آخر تک واقعات
کی تفصیل پیش کرنے کے علاوہ فریقین کے رویہ اور موقف کی توضیح
بھی کی گئی ہے - خصوصاً شہیدؓ کربلا اور یزید کے کرداروں کو
پوری طرح اجاگر کیا گیا ہے -

اس کتاب کا ترجمہ جناب عطا حسین مدیر "الوعی" نے اس
خوش اسلوبی سے کیا ہے گویا یہ ان کی اپنی کاوشِ فکر کا نتیجہ ہو، امید
ہے وہ اس سلسلۂ فیض کو اسی ذوق و شوق سے جاری رکھیں گے ؏

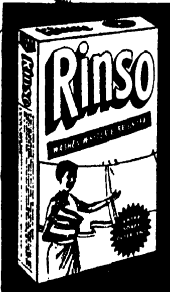
تحدید نسل
مرتبہ مولانا شاہ محمد جعفر ندوی پھلواری
ناشر - ادارۂ ثقافت اسلامیہ - لاہور
صفحات ۷۵، قیمت ۱۲

اردو میں اپنے موضوع، ضبط ولادت اور خاندانی منصوبہ
بندی، پر اس اولیں مجموعۂ مضامین (جسے شاہ محمد جعفر ندوی
جیسے روشن خیال ماہر دینیات نے ترتیب دیا ہے) کی ایک
نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں دو ممتاز مصری علما،
البہی الخولی اور خالد محمد خالد، کے نہایت فاضلانہ مضامین
بھی شامل ہیں - جو صریحاً ان کی آزاد اور بے لاگ تحقیق پر مبنی
ہیں - اور اسی لئے وقیع اور قابل قبول بھی ہیں - ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم
مرحوم جیسے وسیع النظر مفکر، پرستار اسلام اور فاضل اجل کے
عقلی و نقلی حقائق و بصائر پر مبنی ارشادات بجائے خود اہم
ہیں اور سند کا درجہ رکھتے ہیں - فاضل مرتب کے اپنے تین
مضامین اور پیش لفظ بھی ان کی مخصوص بالغ نظری اور
ترقی یافتہ رجحان کے آئینہ دار ہیں - جس کی روح اعلائے
کلمۃ الحق ہے -

اتنے جلیل القدر ارباب فکر و نظر کا اتفاق رائے
یقیناً ہمیں ضبط تولید کے مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنے اور
ان کے نتائج تحقیق کو قبول کرنے پر آمادہ کرتا ہے - اس کتاب
کی توضیحات کی روشنی میں ہمیں خاندانی منصوبہ بندی کی
تحریک پر لبیک کہنے اور اس کو کامیاب بنانے کی جدوجہد
میں ذرا بھی تامل نہیں ہونا چاہئے ؏

★

رِنسو پاؤڈر کپڑے سفید برّاق دھوتا ہے!



جی ہاں! رِنسو آپ کے کپڑوں میں ایک خاص چمک پیدا کر دیتا ہے۔ اِس کا استعمال نہایت آسان ہے۔ **آپ بے فکر سوتے رہیں رِنسو اپنا کام کرتا رہے گا!**

اپنے کپڑوں کو رِنسو کے کثیر جھاگ میں ڈال کر رات بھر کیلئے چھوڑ دیجئے اور صبح اچھی طرح نچوڑ لیجئے۔ آپ اپنے کپڑے شاندار طور سے صاف پائیں گے۔ رات بھر میں رِنسو کے جھاگ خاموشی اور خوبی سے آپ کے کپڑوں سے تمام میل کچیل نکال دیتے ہیں۔

رِنسو بڑے گھرانوں میں کپڑے دھونے کیلئے نہایت موزوں، اور کم خرچ ہے۔ یہ سفید و رنگین، سوتی اور اُونی ہر قسم کے کپڑوں کیلئے کیسا مفید ہے! یاد رکھئے! رِنسو سے دُھلائی آسان دُھلائی ہے!

آج ہی ایک پیکٹ خریدیئے

R.S-195 UD

طنز و مزاح :

"بہت نکلے مرے ارماں ....!"

صہبا اختر



کارٹون : ریحان

قلی نے چلتے چلتے ریل کے ایک ڈبے کو اس طرح سونگھا جس طرح سونگھنے ریگستان میں پانی کا سرچشمہ تلاش کرتے ہیں ۔ ریل کے تمام ڈبوں کے طواف کے بعد بالکل آخری ڈبے میں سر چھپانے کی تو کیا البتہ پیر ٹکانے کی جگہ ضرور مل گئی ۔ قلی سامان پٹک کر جاچکا تھا اور میرا سامان کچھ میرے سر پر اور کچھ پیروں پر ابھی تک موجود تھا ۔ اس ڈبے میں جہاں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی لوگ منوں کے حساب سے سامان لیکر موجود تھے ۔ ہر شخص ایک دوسرے کو ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے صرف وہ اس کے سفر کی مصیبت کا باعث تھا ۔ لیکن اس بے سر و سامانی کی فضا میں بھی صرف ایک مولانا قسم کے صاحب مع اپنی بیگم اور آٹھ بچوں کے پوری دو برتھوں پر قابض تھے اور وہ سارے ڈبے سے بے تعلق ہوکر صرف کھڑکی سے جھانکنے میں مصروف تھے یا اپنی کرکٹ الیون کی تربیت میں ۔ کسی بھی بچے کے ہلنے سے ان کا سارا جسم مع لمبی داڑھی کے ہل جاتا تھا ۔ انہیں ہر لمحہ صرف اس بات کا خدشہ تھا کہ کہیں ان کی الاٹ شدہ برتھ پر کوئی دوسرا قابض نہ ہو جائے ۔ کاک ٹیل برقعے میں ان کی بیگم پوری برتھ پر دراز تھیں اور ان کے اوپر، تلے اوپر کے بچے سوار تھے ۔

خدا خدا کر کے گاڑی کو حرکت ہوئی اور اس حرکت کے ساتھ ھی ایک بزرگ کی زبان کو بھی حرکت ہوئی ۔ "مولانا' مولانا صاحب!" لیکن مولانا اس طرح خاموش تھے جیسے ان سے خطاب کرنے والا یہاں کوئی نہیں ہو سکتا ۔ جیسے وہ ریل کے ڈبے میں نہیں بلکہ اپنی ذاتی لانچ پر سوار تھے ۔

آخر وہ بزرگ اپنا سا منہ لے کر چپ ہوگئے لیکن ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک پنجابی نما صاحب نے ان بزرگ کی داد رسی کے خیال سے ھانگ لگائی : "مولانا! سنو اے کی کہندے نے" ۔ مولانا نے آخر اس گرجدار آواز سے مرعوب ہوتے ہوئے کہا : "فرمائیے" ۔ وہ بزرگ مولانا سے مایوس ہو چکے تھے ، اسطرح کھل اٹھے جیسے انہیں کوئی کھویا ہوا خزانہ ھاتھ آگیا ہو ۔ ان بزرگ نے آواز میں مزید شیرینی پیدا کرتے ہوئے پوچھا "آپ کہاں تک تشریف لے جا رہے ہیں"؟

"لاہور" ، مولانا نے خشک لہجے میں جواب دیا اور خاموش ہوگئے ۔

"مگر سنیئے" ، لیکن مولانا اپنی طرف سے معاملہ ختم کر چکے تھے ۔

وہ بزرگ پھر منمنائے ۔ لیکن مولانا نے پھر سنی ان سنی کردی ۔ آس پاس کے مسافر بھی اس مکالماتی کوشش کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے ۔ لوگوں کی نظروں کی اھمیت بھانپ کر وہ بزرگ جھلا کر بولے "میاں سنتے ہو کہ نہیں؟"

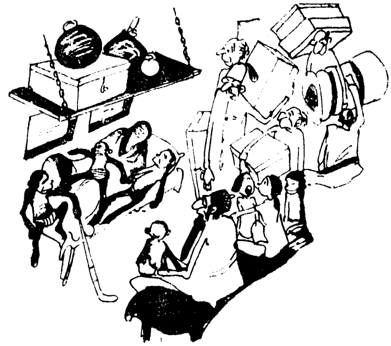
مولانا نے آخر کروٹ لی ۔ "فرمائیے، کیا بات ہے؟"

''بات یہ ہے کہ ذرا اپنی اہلیہ محترمہ کو بستر سے اٹھا کر بٹھائیے - اور اپنے ساتھ بچوں کو بھی اس برتھ پر بٹھا دیجئے - دوسری برتھ پر دوسرے مسافروں کے لئے بھی تھوڑی سی جگہ پیدا کر دیجئے -،، ان بزرگ نے ایک ہی سانس میں حرف مطلب بیان کر ڈالا -

مولانا بولے '' میری بیوی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے - رہا بچوں کا معاملہ تو وہ میرے پاس بیٹھے ہیں اور بیٹھے رہینگے - ،،

'' مگر یہ تو مردانہ ڈبہ ہے - آپ نے اپنی اہلیہ کو زنانہ ڈبے میں کیوں نہیں بٹھایا؟ ،،

'' نہیں بٹھایا - آپ سے مطلب ،،؟ مولانا نے برابر کی جھلاہٹ سے جواب دیا -



الاٹ بنام . . . .

''ایک تو درجن بھر بچے ساتھ ہیں - اس پر بیگم صاحبہ کو بھی ہمارے سر پر مسلط کر دیا ہے - آخر آپ کو دوسرے لوگوں کی سہولت کا بھی خیال ہونا چاہئے - ،، بزرگ بولے -

''ارے صاحب، انہیں سہولت کا خیال ہوتا تو درجن بھر بچے پیدا ہی کیوں کراتے ،، کسی دل جلے نے ٹکڑا لگایا -

'' یہ درجن بھر بچے میرے ہیں، آپکے نہیں - ان کا پالنے والا خدا ہے، آپ نہیں - ان سے راحت یا تکلیف مجھے ہوتی ہے ، آپ کو نہیں - آپ کو یہ ناگوار کیوں گذر رہے ہیں؟ ،، مولانا نے اپنے مقدس چہرے پر جلال پیدا کرتے ہوئے کہا -

'' ٹھیک ہے ،، دل جلے نے مسکراتے ہوئے کہا '' لیکن فی الحال آپ کی اس فوج ظفر موج سے



فوج ظفر موج

تو سارا ڈبہ پریشان ہے - اور آپ کو تو خیر کوئی تکلیف نہیں - مگر آپکی بیگم........''

بیگم نے کراہتے ہوئے کروٹ بدلی اور ان کے اوپر پڑا ہوا چھوٹا بچہ جھٹکے سے نیچے آن پڑا - مولانا گھبراہٹ میں جھکے تو ان کے زانو سے لگا ہوا بچہ بھی گر گیا - دونوں بچوں نے ابھی رونا شروع ہی کیا تھا کہ دوسرے چھوٹے بچے بھی سا - رے - گا - ما کے کورس میں شریک ہوگئے - مولانا نے جلدی سے چھوٹے بچے کو دوبارہ بیوی پر دے پٹخا - دوسرے کو اٹھا کر گود میں لے لیا - اور بقیہ کو ڈانٹنا ڈپٹنا شروع کر دیا - دوسرے بچے تو سہم کر چپ ہوگئے مگر چھوٹا بچہ اب بھی شدت سے رو رہا تھا اور مولانا اس ننھی سی جان کو بری طرح کوس رہے تھے - ساتھ ہی بیگم کو بھی چند خطابات سے سرفراز فرما رہے تھے - آخر برقع میں لپٹے ہوئے جسم کو خفیف سی حرکت ہوئی - برقعے سے دو سوکھے ہوئے ہاتھ باہر نکلے اور بچہ کو برقعے میں گھسیٹ لے گئے -

اس چیخ پکار سے ڈبے کے لوگ خاموش ہو چکے تھے - شاید بچوں کے خیال سے وہ بزرگ سیٹ کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے اور وہ دل جلے صاحب بھی اپنی مسکراہٹوں کو سمیٹ کر کونے میں دبک چکے تھے - مولانا کی ہیئت کذائی پر ترس کھا کر آخر ایک نیم حکیم قسم کے صاحب آگے بڑھے اور انہوں نے روتے ہوئے بچے کو گود میں اٹھا لیا - مولانا نے پہلے تو ان نئے ہمدرد کو بھی شبہ کی نظروں

سے دیکھا - لیکن ان صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ کو دیکھتے ہوئے کسی مزاحمت کا خیال ترک کر دیا -

آخر مولانا کی رگ حمیت بھی پھڑکی - انہوں نے ایک بچہ کو اور اپنی گود میں بٹھا لیا اور ان صاحب کے لئے جگہ خالی کر دی - ''آئیے تشریف رکھئیے،، مولانا نے کہا -

'' نہیں نہیں - آپ آرام سے بیٹھے رہیں ،، دوسرے صاحب نے جواب دیا -

رسمی تکلفات کے بعد نئے صاحب سیٹ پر براجمان ہو چکے تھے - اور وہ بزرگ اس مجرب نسخے کے بروقت یاد نہ آنے پر شرمندہ تھے -

'' کب سے علیل ہیں آپکی اہلیہ ؟ ،،

'' جی گذشتہ تین سال سے ،، -

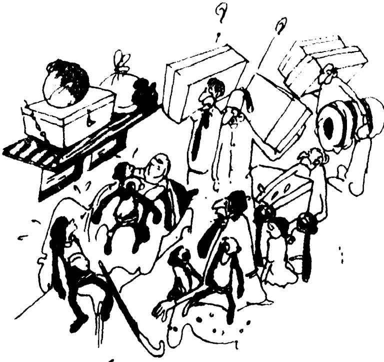
نئے صاحب نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا : '' دیکھئے میں ڈاکٹر تو نہیں ہوں البتہ ڈاکٹروں کے ساتھ بہت رہ چکا ہوں - مجھے آپکی اہلیہ کی طبیعت زیادہ خراب معلوم ہوتی ہے، انہیں ایسی حالت میں سفر نہ کرنا چاہئیے تھا - اور آپکے بچوں کی صحت بھی کچھ اچھی نہیں معلوم ہوتی - ،،

'' جی ہاں '' مولانا نے جواب دیا - '' مولا کی مرضی ،، -

'' جی مولا کی مرضی میں تو کوئی شک نہیں لیکن آپ اپنی مرضی کے مالک خود بھی تو ہیں - معاف کیجئیے گا آپکی آمدنی کتنی ہے ؟ '' '' آمدنی کب ہے - جناب ! ایک مدرسہ کھول رکھا ہے - چند بچوں کو پڑھاتا ہوں اور بس - دال دلیہ پورا ہو ہی جاتا ہے ،، -

'' خوب ! مختصر سی آمدنی میں اتنا بڑا خاندان ! آپ کی ہمت قابل داد ہے ،، - یہ جملہ سن کر مولانا اس طرح مسکرائے جیسے انہیں رستم زماں کا خطاب مل گیا ہو - لیکن مولانا نے اپنی مسکراہٹ کو دباتے ہوئے کہا '' جی یہ تو سب نیلی چھتری والے کی دین ہے - اس میں بشر کیا کر سکتا ہے ؟ ،،

'' جی بشر کیا نہیں کر سکتا ؟ آخر خاندانی شیرازہ بندی بھی تو کوئی چیز ہے - وہی جسے خاندانی منصوبہ بندی بھی کہتے ہیں ،، - خاندانی منصوبہ بندی کا نام سن کر مولانا اس طرح اچکے جیسے انہیں کسی بچھو نے کاٹ لیا ہو - ''لاحول ولاقوۃ ! آپ کیا کہہ رہے ہیں ؟ خاندانی منصوبہ بندی نہ کہئیے نسل کشی کہئیے - قدرت کے کاموں میں دخل در معقولات ! ،، مولانا کے ہونٹوں سے کف جاری تھے -



کورس !

'' مگر مولانا - آپکی بیوی کی صحت، آپکی معاشی حالت اور ملکی وسائل کی کمی - یہ تمام باتیں اس بات کی گواہ ہیں کہ آپ فکر سلیم کے بجائے بے بنیاد جذبات سے کام لے رہے ہیں - ،،

'' میری بیوی کی صحت اور میرے معاشی حالات سب قسمت کے کھیل ہیں اور ملکی وسائل کی ذمہ داری حکومت پر ہے، مجھ پر نہیں - بیوی کی صحت کیلئے میں تبدیلئی آب و ہوا کر رہا ہوں - انشاءاللہ تعالیٰ ٹھیک ہو جائیگی ،، -

'' آپ کو یہ خیال کتنے دن کے بعد آیا ہے ؟ میرا مطلب ہے کتنے دن ہو گئے آپکی شادی خانہ آبادی کو ؟ ،،

'' گیارہ سال ،، مولانا نے دولہا کی طرح شرماتے ہوئے کہا -

'' ہوں ! گیارہ سال کے بعد ---- آٹھ بچے ساتھ لے کر ---- آپ آب و ہوا کے ذریعے تریاق حاصل کرنے چلے ہیں ؟ افسوس آپ نے . . . . ،،

مولانا نے جیسے یہ بات نہیں سنی - وہ مسکرا کر بولے - ''جی اب بھی بیگم امید سے ہیں ــــ انشاءاللہ اگلے چاند تک ـــ''

ابھی یہ جملہ ختم ہی ہوا تھا کہ کسی نے آواز دی ''ٹی ٹی آگیا'' -

مولانا ٹی ٹی کا نام سنکر ایکدم گھبرا کر اٹھے- ''کدھر؟'' مولانا نے بے ساختہ کہا -

''وہ رہا'' ٹی ٹی ڈبے کے آخری کونے پر چیکنگ میں مصروف تھا - مولانا نے اپنے بچے جلدی جلدی اٹھا کر بیوی پر ڈالنا شروع کردیئے- اور اپنے نیچے سے لحاف اٹھا کر بچوں سمیت بیوی کو ڈھانپ دیا - مولانا کے پاس دو بڑے بچے بیٹھے رہ گئے تھے - باقی چھ بچے بیوی کے ساتھ تلے اوپر لحاف میں دبک چکے تھے - اور وہ اس طرح خوش تھے جیسے مولانا نے پہلے ہی یہ ترکیب انہیں حفظ کرادی تھی - بچوں کے تڑپڑ اوپر گرنے سے بیوی نے ایک زور کی چیخ ماری اور چپ ہوگئی- مولانا کے چہرے کا رنگ اڑ رہا تھا - انہوں نے گھبرا کر انہیں بزرگ کو آواز دی کہ ذرا آپ میرے پاس آکر بیٹھ جائیے - خالی جگہ دیکھ کر ٹی ٹی کو شبہ ہوگا اور ساتھ والے صاحب سے بولے کہ ''میں غریب آدمی ہوں، میرے پاس صرف تین ٹکٹ ہیں - آپ حضرات ذرا خیال رکھئیے گا''-

وہ بزرگ آگے بڑھے - انہوں نے نیم ہمدردانہ لہجے میں کہا ''آپ فکر نہ کریں - ہم کچھ نہیں کہینگے''- غربت کا نام سن کر مسافروں کی قدرتی ہمدردی عود کر آئی تھی اور وہ سب ٹی ٹی کے آنے کے منتظر تھے- دفعتاً گاڑی جھٹکا کھا کر رک گئی - کسی بلا ٹکٹ مسافر نے چھلانگ لگا دی تھی - ٹی ٹی گاڑی سے اتر چکا تھا - بھاگنے والا ہاتھ آیا یا نہیں، اسکا پتہ نہیں - لیکن ڈبے میں ٹی ٹی دوبارہ داخل نہیں ہوا - مولانا نے اطمنان کی سانس لیکر مسکراتے ہوئے بیوی کے اوپر سے لحاف اٹھایا - بچوں کو کہا ''اترآؤ سالو!'' چھوٹے بچے کے ہاتھ سے بیوی کی نقاب چہرے سے ہٹ گئی تھی - مولانا نے جھک کر بیوی کو ٹی ٹی کے چلے جانے کا مژدہ سنانا چاہا - وہ ابھی جھکے ہی تھے کہ انہوں نے اسطرح پلٹا کھایا جیسے انہیں بجلی کا کرنٹ لگا ہو- انکے حلق سے خوفناک آواز نکلی: ''میری بیوی! میری بیوی!''- لوگ ایک دم جھپٹے اور پھر ٹھٹک کر رہ گئے - زرد آم کی طرح ستے ہوئے چہرے کی دو بے رونق آنکھیں آسمان کی طرف تک رہی تھیں - مولانا کی آنکھ سے دو آنسو گرے - اور پھر خشک ہوگئے -

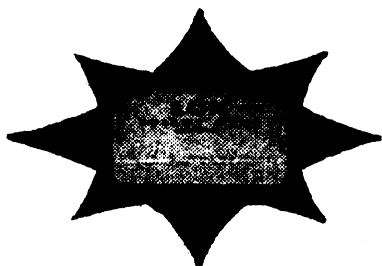
لوگ بےپردگی کے خیال سے مایوسی کے ساتھ اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے تھےاور توبہ و استغفار کر رہے تھے - ہر شخص تصویر غم بنا بیٹھا تھا - مولانا کے ہاتھ آہستہ آہستہ شیروانی کی جیب میں گئے- انہوں نے جیب سے ایک خط نکالا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا - لیکن وہ خط ہوا کے دباؤ سے میرے پاس آگرا - میں نے مولانا کی نظر بچا کر وہ خط کھولا - یہ ان کے کسی مرید کا تھا - اس نے لکھا تھا: شادی کی بات پکی ہوگئی ہے مگر شرط یہ ہے کہ شاہ صاحب اپنی پہلی بیوی کو مع بچوں کے میکے چھوڑ آئیں یا اسے طلاق دے دیں - بیوی اور بچوں کی موجودگی میں لڑکی والے شادی کرنے پر تیار نہیں -

میں نے خط پڑھ کر مولانا کی طرف کنکھیوں سے دیکھا - وہ مطمئن بیٹھے تھے - نئی شادی اور شاید نئے بچوں کے خیال سے!



سر ورق: میلہ کی طرف

رنگین نقش: زبیدہ آغا



"ماہِ نو" کے لئے

غیر طلبیدہ مضامین

- غیر طلبیدہ مضامینِ نظم ونثر صرف اس حالت میں واپس کئے جائیں گے جب کہ ان کے ساتھ ڈاک کے مناسب ٹکٹ روانہ کئے گئے ہوں۔
- مسترد مضامین کے سلسلے میں غیر ضروری خط و کتابت کرنے سے ادارہ کو معذور سمجھا جائے۔
- ایک ہفتہ تک اطلاع موصول نہ ہونے پر مرسلہ مضامین ناقابلِ اشاعت تصور کئے جائیں۔
- ادارہ ڈاک میں کسی مسودے کے گم ہو جانے کا ذمہ دار نہیں۔

(ادارہ)


MEDIUM
CAPSTAN
Navy Cut
CIGARETTES
W.D. & H.O. WILLS,
BRISTOL & LONDON.
10 CIGARETTES
CAPSTAN

جلد ۱۳



شمارہ ۹

ستمبر ۱۹۶۰ء

مدیر: رفیق خاور

نائب مدیر: ظفر قریشی

چندہ سالانہ
پانچ روپے آٹھ آنے

شائع کردہ:
ادارۂ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس ۱۸۳۔ کراچی

فی کاپی
آٹھ آنے

آفتابِ بامِ شرق*

لارڈ پیٹرک سپینس

میں واقعی اسے بہت بڑا اعزاز خیال کرتا ہوں کہ آج قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کے یومِ پیدائش کے موقع پر آپ نے مجھے سرکردہ مقرر کی حیثیت سے مدعو کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر محمد علی جناح نہ ہوتے اور اُس وضع کے انسان نہ ہوتے جو وہ تھے تو پاکستان کبھی وجود میں نہ آتا۔ اسلئے میں خیال کرتا ہوں کہ آپ میں سے جو لوگ پاکستان سے محبت کرتے اور اسی کے لئے جیتے ہیں ان کے لئے، نیز ہم میں سے ان لوگوں کے لئے جو ایک ایسے پُرعظمت انسان کو تعریف کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ جو تاریخ کے عظیم ترین واقعات میں سے ایک کا باعث ہوا ہے، مناسب ہے کہ وہ کبھی کبھی آپس میں مل بیٹھیں۔ اور اس کی تعظیم و تکریم کے لئے اس کی سالگرہ یا یومِ پیدائش سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا ہے؟ ممکن ہے آپ یہ پوچھیں میں مسٹر جناح کی یاد میں تقریر کرنے کی ذمہ داری کیوں قبول کر رہا ہوں؟ میں ان کے متعلق کیا جانتا ہوں؟ میں ان سے کیسے روشناس ہوا اور کس حد تک تاکہ یہ تقریر محض سیاسی نہ بن کر رہ جائے (کیونکہ ایک ایسے شخص کے لئے جو برصغیر میں اعلیٰ ترین عدالتی عہدے پر فائز رہا ہو، یہ بالکل نامناسب ہوگا) بلکہ ایک ذاتی تقریر ہی رہے۔ اسلئے کہ مجھے نہ صرف مسٹر جناح کو جاننے کا موقع ملا بلکہ میں نے ان کو جاننے پر پسند بھی کیا، انکی تعظیم کی۔ اور آج آپ کے سامنے بعض ان مواقع کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جب میری اُن سے ملاقات ہوئی اور بعض معاملات میں سروکار بھی رہا۔

آپ کو یاد ہوگا کہ میں ۱۹۴۵ء میں ہندوستان کے فیڈرل کورٹ میں چیف جسٹس کے منصب پر فائز ہو کر گیا تھا۔ اس وقت کانگرسی لیڈر اپنے ہی قول کے مطابق "طوعاً و کرہاً بہ کارسرکار ماخوذ" ہو گئے تھے۔ یعنی انہیں بہار کے ۱۹۴۲ء میں آشوب و فساد کے بعد یونہی اضطراری طور پر چن لیا گیا تھا اور خود کانگرس کے اندر بھی کافی خلفشار تھا۔ اور یہ خلفشار اس وقت تک ناگزیر رہا جب تک مہاتما گاندھی ۱۹۴۵ء کے اوائل گرما میں جیل سے رہا ہو کر نہیں آ گئے۔ اس دوران میں مسٹر جناح بکل نجنت تھے۔ اُدھر نواب زادہ لیاقت علی اور ان کی بیگم صاحبہ دہلی میں مقیم تھے اور میری سکونت کے ابتدائی سالوں اور مہینوں میں سیاسی صورتِ حال کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ سیاسی جماعتوں کی لگاتار کشمکش کے باعث بدترین درجہ تک پہنچ چکی تھی۔ مسٹر جناح اور لیاقت علی بڑی ہی تن دہی سے مسلم لیگ کی تنظیم و استحکام کی کوشش کر رہے تھے اور ہندوستان کے مسلمانوں کے آئندہ صورتِ حالات کو اس نظر سے دیکھنے کی سعی کر رہے تھے جس سے وہ خود دیکھتے تھے۔ مگر، جیسا کہ ظاہر ہے مجھے مسٹر جناح کی سیاسی جد و جہد سے کوئی واسطہ نہ تھا اور نہ میں ان سے زیادہ واقف ہی تھا۔

اچھا اب ہمارے روابط کی طرف آیئے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں مسٹر جناح بھی میری ہی طرح انگلستان کے سند یافتہ بیرسٹر تھے۔ انہوں نے بھی وہی تربیت پائی تھی اور بیرسٹری کی روایات، نظم و ضبط اور اخلاقی رویّہ کا وہی درس حاصل کیا تھا جو ہم سب کے رگ و ریشہ میں شروع ہی سے رچ بس گیا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ اپنی زندگی کے ایک دور (۱۹۳۱-۳۵ء) میں ہندوستان سے مایوس ہو کر لندن آئے ہوئے تھے تاکہ وہ پریوی کونسل میں پریکٹس کریں۔ ان دنوں میں نے یقیناً ان کا چرچا سنا تھا۔ اس نوجوان

---

* "آفتابے یختم برشامِ شرق"

خاکِ مشرق پر چمک جائے مثالِ آفتاب   تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے   (اقبال)

(غیر منقسم ہندوستان کی فیڈرل کورٹ کے آخری چیف جسٹس لارڈ پیٹرک سپینس نے یہ تقریر لندن میں قائدِ اعظم کے یومِ پیدائش کی اس تقریب میں کی تھی جو پاکستان سوسائٹی، لندن اور پاکستان سٹوڈنٹس فیڈریشن (برطانیہ) کے زیرِ اہتمام جنوری میں منعقد ہوئی تھی)

ہندوستانی بیرسٹر کا چرچا جس نے پریوی کونسل میں دفعتہً بڑی تیزی سے بیرسٹروں کی صفِ اوّل میں نام پیدا کر لیا تھا۔ اور مسٹر جناح نے بھی از راہِ کرم فرمایا تھا کہ انہوں نے بھی اسی زمانہ میں "چانسری" کے ایک نوجوان بیرسٹر کی حیثیت سے میرا چرچا بھی سنا تھا۔ مگر یہ ایک ہی پیشہ کی مشترکہ دلچسپیاں ہی تھیں جن کے باعث میرا مسٹر جناح سے پہلی بار تعارف ہوا۔ میری اہلیہ اور میں مسٹر اور بیگم لیاقت علی سے بھی ملے تھے۔ ہم نے انھیں پسند کیا تھا۔ اور ایک دوسرے کے یہاں آتے جاتے تھے۔ بلکہ ان دونوں کے ساتھ برج بھی کھیلتے رہے۔

انہی کی وساطت سے ہمیں اپریل ۴۴ء میں چیدہ اصحاب پر مشتمل ایک چھوٹی سی دعوت میں مدعو کیا گیا جس میں ہمیں مسٹر اور مس جناح سے ملاقات کرنی تھی۔ ایک بڑی ہی اہم صحبت۔ خیر، میری اہلیہ، میں، میرا بیٹا اور داماد سب لیاقت علی خاں کے ہاں گئے۔ اس موقع پر تین چار اور بھی مہمان تھے۔ جن میں سے ایک سر کلاڈ آکنلک، کمانڈر انچیف بھی تھے۔ جب میں نے حال ہی میں اپنی ڈائری پر نظر ڈال کر دیکھا کہ میں نے اپریل ۴۴ء کے اس دن کی دعوت کے سلسلہ میں کیا لکھا تھا تو یہ الفاظ دکھائی دئے کہ سر کلاڈ آکنلک بھی اس صحبت میں شامل تھے اور میں نے مسٹر جناح کے ساتھ کوئی خاص بات چیت نہیں کی تھی بلکہ سارا وقت "آک" ہی ان سے گفتگو کرتے رہے تھے۔ آپ میں سے جو اصحاب "آک" کو جانتے ہیں، اور میں تو ان کو خوب جانتا ہے۔ محسوس کریں گے کہ ضرور ایسا ہی ہوا ہوگا۔ یادداشت بالکل صحیح ہے۔ گو مجھے بلاشبہ مسٹر جناح کے ساتھ اس پہلی ملاقات سے مایوس ہوئی پھر بھی ان کی شخصیت نے ہم پر گہرا اثر چھوڑا۔ جیسا کہ وہ سب ملنے والوں پر پہلی ہی بار، جب وہ خوش طبعی کے عالم میں ہوں، ایسا اثر چھوڑتے تھے جو دل و دماغ سے کبھی محو نہیں ہو سکتا۔ ان کی دراز قامتی، انتہائی نفیس لباس، خط و خال کی رعنائی اور وہ انتہائی خوش خلقی جس سے وہ دعوت میں سب کے ساتھ پیش آئے، ان کی بدولت انہوں نے جو تاثر پیدا کیا اس سے بہتر تاثر شاید ہی کوئی پیدا کر سکتا۔

واضح رہے کہ میں نے مسٹر جناح کے بارے میں ہمیشہ اچھی باتیں ہی نہیں سنی تھیں۔ میں سب سے زیادہ ان کی خوش خلقی کا ذکر کروں گا۔ جو تقریباً پاسِ ادب کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ اور میری یادداشت میں ہمیشہ محفوظ رہی ہے۔ میں ہمیشہ یہی محسوس کرتا رہا ہوں کہ ان کے برتاؤ میں واقعی خلوص کار فرما تھا۔ اس سے میرے دل میں بہت ہی عزت افزائی کا احساس پیدا ہوا۔ مگر مجھے ہمیشہ یہی یقین رہا ہے کہ یہ انگلستان کے پیشۂ بیرسٹری کے آداب شائستگی اور ان لوگوں کے بارے میں ہمارے مشترکہ احساس ہی کا نتیجہ ہے جو انگریزی قانون کے تحت اعلیٰ عدالتی مراتب تک رسا ہوئے۔ بہرحال ہماری باہمی شناسائی کے تمام عرصہ میں مسٹر جناح میرے ساتھ بڑے ہی مسحور کن پاسِ ادب سے پیش آتے رہے۔ اس بات نے، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، میرے دل میں بہت ہی عزت افزائی کا احساس پیدا کیا۔ اور یہی غالباً — سچ پوچھئے تو مجھے اس کا بدرجۂ اولیٰ وثوق ہے — ہماری ایک دوسرے کے لئے بڑھتی ہوئی عزت و توقیر بلکہ دلی محبت کا باعث ہوا جبکہ ہمیں ایک دوسرے کو قدرے پُرشور سیاسی زمانے کے دوران ذرا بہتر طور پر جاننے کا موقع ملتا رہا۔

بے شک اس پہلی ملاقات کے بعد ہمیں دہلی میں ۴۵-۱۹۴۴ء کے دوران وقتاً فوقتاً ملنے کا اتفاق ہوتا ہی رہا۔ بلکہ کبھی کبھار ۱۹۴۶ء میں بھی — ان کی رہائش گاہ پر۔ اب بھی میں اس مکان تک تقریباً آنکھیں بند کئے ہی پہنچ سکتا ہوں۔ اگرچہ میں یہ ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتا کہ وہ کن کن سڑکوں کے سنگم پر واقع ہے۔ ہماری اور لوگوں کے یہاں بھی ملاقات ہوتی رہی میرے اپنے گھر ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ چیف جسٹس کی حیثیت سے میں بڑی احتیاط برتتا تھا کہ دونوں بڑی سیاسی جماعتوں کے سربراہوں سے نجی طور پر زیادہ کھلے بندوں نہ ملا کروں۔ اگر پبلک کو یہ پتہ چل جاتا کہ چیف جسٹس کسی سیاسی جماعت کے لیڈر کو اپنے گھر دعوت دے رہا ہے تو یہ اچھا نہ ہوتا۔ مگر ہم دونوں اکثر ملتے ہی رہے۔ اور پھر وہ یادگار موقع آیا جس کا میں قبل ازیں آپ کے پیشروؤں سے بھی ذکر کر چکا ہوں۔ اس واقعے کی یاد میرے دل میں ہمیشہ محفوظ رہے گی۔ یہ ایک اتفاقی ملاقات تھی۔ میری اہلیہ اور میں دہلی کے ایک سینما میں گئے ہوئے تھے سینما کے آخر میں دو باکس تھے۔ باقی سب سے الگ۔ ایک تو ہمیں ملا اور دوسرا مسٹر اور مس جناح کو۔ جونہی مسٹر جناح نے ہمیں آتے دیکھا، انہوں نے تجویز کیا کہ مس جناح میری اہلیہ کے پاس بیٹھیں اور میں ان کے ساتھ۔ چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا۔ ہم دونوں اکٹھے بیٹھے۔ فلم بڑی لمبی تھی۔ اور مسٹر جناح نے کوئی دو گھنٹہ مجھ پر جرح کی۔ جو موضوعات انہوں نے اس مقصد کیلئے چنے وہ یہ تھے کہ پاکستان قائم ہونے کی صورت میں دستور، نظم و نسق اور عدلیہ میں کیا کیا تبدیلیاں ضروری ہوں گی۔ مجھے بعض بہت ہی مشکل اور ذرا ٹیڑھے سوالات کا جواب دینا پڑا۔ جیسا کہ آپ بخوبی تصور کر سکتے

ہیں۔ تاہم میں نے ان کا جواب دینے کی پوری پوری کوشش کی۔ اور میں مسٹر جناح کے ذہن کی تیراقی اور تیزی سے بے حد متاثر ہوا۔ ذرا بھی کسی سوال کا چلتا ہوا جواب دیا اور انہوں نے جھٹ مجھے پکڑا اور سوال در سوال کرتے چلے گئے۔ سب سے بڑھ کر یہ بات تھی کہ وہ ہر معاملہ کی تہ تک عملی انداز سے پہنچنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کا مقصود ایک اور صرف ایک ہی تھا: اگر پاکستان کو قائم ہونا ہے تو اس کے راستے میں کیا رکاوٹیں آسکتی ہیں۔ وہ بس اتنا ہی جاننا چاہتے تھے۔ اور اس کے لئے ظاہر ہے ان کا یہ مفروضہ ہوگا کہ میں ممالک عالم کے دستوروں سے آگاہ ہوں گا۔ نیز یہ کہ عدلیہ اور اس کے عوائد سمیہ کیا ہیں، مجھے ان کا بھی پتہ ہوگا۔ مزید براں میں اپنی زندگی کے گزشتہ طویل دور میں کئی طرح کے انتظامی مسائل سے دو چار بھی ہوا تھا۔ بہر کیف واقعہ صرف اس قدر ہے کہ صرف یہی اور حقیقی معنوں میں صرف ایک یہی ایسی سنجیدہ گفتگو تھی جس کا مجھے عین تقسیم کے دن تک اتفاق ہوا۔ میری جناح کے ساتھ وکلائے انگلستان میں سے بعض پرانے دوستوں اور حریفوں کے متعلق بھی کافی بے تکلف گفتگو رہی۔ خاص طور پر ان بزرگوں کے بارے میں جو مسٹر جناح کی وکالت کے زمانے میں پریوی کونسل کی عدالتی کمیٹی کے اراکین تھے۔ اور وہ ان کے سامنے پیش ہوتے تھے۔ مسٹر جناح اس زمانے کا بڑے فخر سے ذکر کرتے تھے۔ اس دور کے قصے بے کم و کاست سنا کر مزے لیا کرتے تھے۔ میں چاہتا ہوں۔ کیونکہ اور سب لوگ سیاست داں وغیرہ تو مسٹر جناح کے متعلق بات چیت کرتے ہی ہیں۔ گو وکلا شاذ و نادر ہی ان کا تذکرہ کرتے ہیں۔ کہ ایک وکیل کی حیثیت سے آپ کو یہ ذہن نشین کرا دوں کہ وہ زمانہ ۳۵-۱۹۳۱ء، اس معرکہ آرا انسان کی زندگی کا سب سے مہتم بالشان دور تھا۔ مسٹر جناح نے لندن میں کبھی پریکٹس نہیں کی تھی۔ لیکن جہاں تک ہمارے ملک کا تعلق ہے کسی نے ان کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ ممکن ہے بعض نے ان کا سیاست داں کی حیثیت سے تذکرہ سنا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ پریوی کونسل کے جہاں دیدہ اراکین ان کو کہیں زیادہ شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے۔

جب وہ ۱۹۳۱ء کے اوائل میں انگلستان آئے تو انہوں نے ہیمپٹیڈ میں ایک گھر کرایہ پر لیا۔ "کنگز بینچ واک" میں اپنا دفترِ وکالت قائم کر کے پریکٹس شروع کر دی۔ میں نے اسی ہی ہفتہ کے آغاز میں پریوی کونسل کی مسلوں پر نظر ڈالی جن میں مسٹر جناح بحیثیت وکیل پیش ہوئے تھے جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، انہوں نے مئی یا جون ۱۹۳۱ء میں گھر کرایہ پر لیا تھا۔ ان کا پہلا رپورٹ شدہ کیس اکتوبر و نومبر ۱۹۳۴ء کا ہے اور ۱۹۳۵ء میں وہ ہندوستان واپس چلے گئے۔ ان دونوں تاریخوں کے درمیان ان کا نام اپیل کے کچھ نہیں تو کوئی سولہ سترہ کیسوں میں نظر آتا ہے جو پریوی کونسل کے سامنے پیش ہوئے تھے۔ آپ میں سے جو لوگ وکالت پیشہ نہیں وہ نہیں جان سکتے کہ اس بات کی اہمیت کیا ہے۔ اس سلسلہ میں بے شک انہیں بمبئی کے پرانے مؤکلوں کی طرف سے بھی کافی تقویت ملی مگر انہوں نے میرا خیال ہے، دنیا کی سب سے کڑی جانچ کرنے والی عدلیہ میں اپنا نام پیدا کر ہی لیا۔ اور اس عدلیہ کا ذکرِ خیر میں نے اس امریکی نمائندہ کا پورا پورا پاسِ خاطر کرتے ہوئے، جو اس وقت یہاں تشریف رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ امریکہ کی عدالت ہائے عالیہ کا احترام بجا لاتے ہوئے، کیا ہے۔ میرا خیال ہے پریوی کونسل سب سے زیادہ کڑی مبصر واقع ہوئی ہے۔ ویسے یہ عدالت بڑی شفیق اور خلیق ہے لیکن معاملات کی جانچ پرکھ میں بے انتہا سخت ہے اور کوئی شخص بھی، جو اوّل درجہ کی ذہانت کا مالک، حق وکالت ادا کرنے کا غیر معمولی اہل، اور سب سے بڑھ کر، بلا کا دقیقہ رس، زیرک اور منجھا ہوا نہ ہو، اتنے تھوڑے عرصہ میں اس قدر شاندار پریکٹس پیدا نہیں کر سکتا، جتنی کہ مسٹر جناح نے پریوی کونسل میں پیدا کر لی تھی۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا مجھے قطعی یقین ہو چکا تھا کہ جس دور کو میں اپنا دور کہتا ہوں وہ اس میں ایک نہایت ہی معرکہ آرا شخصیت تھے۔ گو وہ عمر میں مجھ سے دس بارہ سال بڑے ہی تھے۔

۱۹۴۶ء کے بعد مجھے ان سے ملنے کا کم ہی موقع ملا۔ اور ملا بھی تو بس اس وقت جب ہندوستان میں ہمارے قیام کے آخری دن تھے۔ جولائی ۴۷ء میں ایک رائل کمیشن کلکتہ میں انتقالِ اختیارات کی کارروائی مکمل کر رہا تھا۔ میں اس کمیشن کا صدر تھا جو اگست ۱۹۴۶ء کے فسادات کلکتہ کی تحقیقات کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ مگر ظاہر ہے کہ اب تقسیم کے باعث اس کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔ چنانچہ ۱۳ جولائی ۴۷ء کو صبح ناشتہ کے وقت ہم نے کلکتہ کا ایک مشہور اخبار اٹھا کر دیکھا تو اس میں یہ جلی سرخی نظر پڑی کہ دونوں مملکتوں کے مابین منقسم صوبوں کے اثاثہ جات اور واجبات کا تصفیہ کرنے کے لئے ایک ثالثی عدالت قائم ہونے والی ہے جس کا صدر مجھے تجویز کیا گیا ہے۔ اب دیکھئے تو اس خبر سے ہمارے کنبہ کو عجب دھچکا سا لگا کیونکہ ہم لوگ تو اگست ۴۷ء میں وطن جانے کا انتظام کئے بیٹھے تھے۔

اور یہ اس بارے میں پہلی اطلاع تھی کہ میں مجوزہ عدالت کا صدر ہوں گا۔
بہرحال ہم نے اپنا رختِ سفر تو باندھ لیا اور دہلی واپس چلے گئے۔ جب ہم منگل کی شام کو وہاں پہنچے تو وائسرائے کے ایک اے ڈی سی کانگ تشریف لائے اور انہوں نے مجھے اس سرکاری مراسلے کی نقل حوالہ کی جو ایک ہفتہ پہلے مجھے روانہ کیا جا چکا تھا مگر ملا نہیں تھا۔ اخبار دن تک وہ بیشک پہنچ چکا تھا۔ افراتفری کے زمانے میں ایسی باتیں، خبر نہیں کیسے، ہو ہی جاتی ہیں۔ بہرکیف مجھے اگلے دن "تقسیم کونسل" کے اراکین سے ملنے کے لئے وائسرائے کے یہاں جانا تھا۔ وہاں پہنچنے پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ چند منٹ گفتگو رہی جنہوں نے مجھے بتایا کہ ماجرا کیا ہے اور ہدایت کی کہ میں مسٹر جناح سے ملوں جو ایک دوسرے کمرے میں تشریف فرما تھے۔
ظاہر تھا کہ میرے صدر ہونے کی تجویز انہوں نے ہی کی ہوگی۔ وہ جانتے تھے کہ جو انتظامات ہو رہے ہیں ان کے ماتحت میں چاہوں تو ہندوستان میں بحیثیت چیف جسٹس رہ سکتا ہوں۔ انہوں نے مجھے ذاتی طور پر ملنے کی اسلئے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ مجھے ایک خاص بات ذہن نشین کرانا چاہتے تھے، یہ کہ گو وہ مجھے ثالثی عدالت کا صدر دیکھنا چاہتے ہیں لیکن اگر میرا ہندوستان کی آئندہ عدالتِ عالیہ کے ساتھ کوئی تعلق رہا تو انہیں کسی صورت میں بھی میرا ثالثی عدالت کا صدر ہونا قبول نہ ہوگا۔ انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ میں نے وائسرائے کو تین ہفتے پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ سارے ہندوستان کا چیف جسٹس رہنے کے بعد اب مجھے دونوں میں سے کسی ایک مملکت کا بھی چیف جسٹس ہونا معقول نہیں معلوم ہوتا۔ اس لئے ایسی کسی پیشکش کو قبول نہ کرسکوں گا۔ جونہی میں نے ان کو یہ بات بتائی راہ سے ساری مشکلات فوراً دور ہوگئیں۔ پھر ان سنگین مسائل کے بارے میں جن کا ثالثی عدالت کو فیصلہ کرنا ہوگا یا اس کے فیصلہ کی سعی کرنا ہوگی، ہماری دوسری طویل طویل گفتگو ہوئی۔ ایک بار پھر ان مسائل کے سلسلہ میں جن کے متعلق وہ جانتے تھے کہ ضرور بالضرور پیدا ہوں گے مجھے اُس عملی فراست کا زبردست احساس ہوا جس سے وہ ان مسائل کی طرف اعتنا کرتے تھے۔ اس وقت کوئی شخص جس کا مسٹر جناح کے ساتھ کسی معاملہ میں بھی سروکار رہا ہو، ان کی شخصیت کے اس پہلو کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ شخص انتہائی زیرک، عملی فراست کا حامل اور حقیقت شناسی کے جوہر سے متصف ہے۔ مسٹر جناح کو پیش آنے والی دشواریوں کے متعلق کبھی کوئی مغالطہ نہیں ہوا، انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ تقسیم کے باعث دونوں مملکتوں میں کیسے کیسے بے حد دشوار مسائل پیدا ہوں گے۔

یہ میری مسٹر جناح کے ساتھ آخری گفتگو تھی۔ بے شک ۴۸-۱۹۴۷ء کے اواخر میں ثالثی عدالت قائم ہو جانے کے بعد مجھے ان سے مراسلت کرنی پڑی اور میرا آخری خط مارچ ۴۸ء کے تصفیہ کے بعد ہی لکھا گیا۔ سب کو ایک مہینہ کی مہلت دی گئی تھی کہ وہ تصفیہ کے کسی جزو کی دوبارہ سماعت کا مطالبہ کریں۔ اسلئے میں نے مسٹر نہرو اور مسٹر جناح کو لکھا کہ اس ماہ کے دوران جب کہ طرفین تصفیہ کا جائزہ لینے میں منہمک ہوں گے میں اور میری اہلیہ ذرا نانار تھلو رتیو ہو آئیں۔ کیونکہ وہاں بھی کچھ مسائل درپیش تھے یعنی یہ کہ میری شادی شدہ بیٹی اور اس کا شوہر اپنے جھگڑے نبٹا رہے تھے۔ مسٹر جناح نے جواب میں جو خط خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر مجھے بھیجا وہ میری بڑی ہی عزیز اشیائے گراں بہا میں شامل ہے۔ ہمارے باہمی تعلقات کا سب سے خوشگوار تکملہ۔ کیونکہ اس وقت میرے دل میں ان کے لئے تکریم ہی نہیں بلکہ ان کی ذات سے قریب قریب انس پیدا ہو چکا تھا۔ بے شک میں جانتا ہوں کہ بہت لوگ ایسے بھی ہیں جن کا تاثر مسٹر جناح کے بارے میں کہیں مختلف ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ بہت سئے دئے رہتے تھے، یہ کہ ان سے نبٹنا کارے دارد تھا، بلکہ بعض تو ان پر کج خلق اور کڑوے ہونے تک کا الزام لگاتے ہیں۔ مگر حضرات! شاید آپ اس بات کو مانیں کہ بعض اوقات جب آپ کسی بڑے درجہ پر پہنچ جائیں تو آپ کو بعض ایسے کڑے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہی ہے جن سے نبٹنا بہت دشوار ہوتا ہے تا وقتیکہ آپ اُن تجویزوں کو جو آپ کے سامنے پیش کی جا رہی ہوں رد نہ کر دیں۔ اور جب میں ان تمام باتوں پر جو ادھر ادھر سے ۴۷-۱۹۴۶ء کے حالات کے متعلق سننے میں آئیں، پھر نظر ڈالتا ہوں اور یہ پوری طرح محسوس کرتا ہوں کہ اگر مسٹر جناح پاکستان کے سلسلہ میں شخصی طور پر وہ محکم اور اٹل رویہ اختیار نہ کرتے جو انہوں نے ۴۷-۱۹۴۶ء میں اختیار کیا اور جن پر وہ اڑے رہے تو، جیسا کہ میں شروع میں کہہ چکا ہوں، کوئی پاکستان (کم از کم ۴۷ء میں، یا ممکن ہے آج تک) وجود میں ہی نہ آتا۔ اگر کسی شخص کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس نے کسی قوم کو ایک خودمختار مملکت سے بہرہ ور کیا تو وہ مسٹر جناح تھے۔ اس جد وجہد نے اُن کی صحت کو گھن لگا دیا۔ ان کی صحت یوں بھی میرے اُن کے ۱۹۴۴ء میں ملنے سے پہلے بھی خراب تھی۔

(باقی صفحہ ۶۰ پر)

ایک اور سنگِ میل

(قائداعظمؒ کے مزار کی تعمیر)

احسان ملک

ایک ایسی ہستی جو ہم سب کو یکساں طور پر محبوب ہے، جس کی محبت روز بروز بڑھتی ہی چلی جاتی ہے، جس کی یاد ہمارے دلوں میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہے۔ یہ ہمارے بابائے ملت محمد علی جناحؒ کے سوا اور کون ہوسکتے ہیں؟ وہ جن کی تمام زندگی قوم ہی کی بے لوث خدمت اور رہنمائی کے لئے وقف رہی جنہوں نے "می رسد مردے کہ زنجیرِ غلاماں بشکند" کے مصداق ہمیں لگ بھگ دو سو سال کی غلامی سے نجات دلائی اور اپنی ان تھک کوششوں سے آزادی کے خواب کی بہت ہی دلنشیں تعبیر کی۔ پاکستان۔ یہ ایک ایسا فیضان ہے جسے ہم کبھی فراموش نہیں کرسکتے۔

یہی احساس تھا جس کی بنا پر ہم نے انہیں "قائداعظمؒ" کہا۔ اور جب پاکستان قائم ہوگیا تو "بابائے ملت" کے محبت بھرے نام سے یاد کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہمارا چہیتا قائد اور بابائے ملت قیامِ پاکستان کے تھوڑی ہی دیر بعد ہم سے رخصت ہوگیا تو ہمارے دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی کہ ایک ایسی یادگار قائم کریں جو اُن کے شایانِ شان ہو۔ جو بیک وقت ہماری دلی محبت کی آئینہ دار بھی ہو اور بابائے ملت کی مہتم بالشان شخصیت کی علامت بھی۔ مقام مسرت ہے کہ یہ خواہش انتہائی ناساز حالات کے باوجود ہمارے دلوں میں برقرار رہی اور کسی موزوں و مناسب پیرایہ میں نمود کے لئے بے تاب۔ جو لوگ بابائے ملت کی محبت اور جذبۂ حبِ وطن سے سرشار ہیں انہیں یہ شکایت ضرور ہوسکتی ہے کہ اس یادگار کی عملی تشکیل اتنا عرصہ منت کشِ انتظار کیوں رہی۔ اور وہ - آہ امیدِ محبت کی بر آئی نہ کبھی - کے گلہ مند رہے۔

یہ ہماری قوم کی سنتِ حسنہ رہی ہے کہ کسی یادگار کی شکل میں ہم اپنے بزرگوں کا نام زندہ رکھیں۔ اور پھر قائداعظم۔ بابائے ملت جیسی شخصیت ـــ ہمارا محسنِ اعظم، ہمارا ناخدائے قوم، ہمارا پہلا بانئ انقلاب، موجودہ انقلابِ عظیم کا پیشرو اور نقیب۔ اس لئے یہ اور بھی لازم تھا کہ اُن کی ایک نہایت عمدہ یادگار قائم کی جائے اور بہت جلد۔ ہمارا موجودہ دورِ انقلاب و ترقی جس کی روح تمام تر بابائے ملت ہی کی روح ہے، اس کام کے لئے بے حد موزوں تھا۔ اور یہ ایک عجیب خداساز اتفاق ہے کہ اس کی تکمیل کی صورت اسی دور ہی میں پیدا ہوئی۔ یوں تو بابائے ملت کی ستمبر ۱۹۴۸ء میں وفات کے فوراً ہی بعد اُن کے مزار پر مقبرہ تعمیر کرنے کی تجویز پیش کی گئی تھی لیکن بدقسمتی

★

"آج ہم اس امانت کو پورا کر رہے ہیں جس کا بوجھ بارہ برس سے ساری قوم کے سر پر تھا۔ قائداعظم کا مقبرہ تعمیر کرنے میں تاخیر ایک ایسے رہنما کے ساتھ احسان فراموشی تھی جس نے سر دھڑ کی بازی لگا کر پاکستان کے اُس خواب کو روشناسِ تعبیر کیا جو مادی وسائل اور روحانی نصب العین کے اعتبار سے سارے عالمِ اسلام میں اپنی مثال آپ ہے۔"

"پاکستان کے علاوہ قائداعظمؒ نے ہمارے لئے جو ورثہ چھوڑا ہے اس میں سب سے زیادہ درجہ ان کے کردار، بصیرت، سیاست اور تدبر کو حاصل ہے۔ دنیا کی تاریخ میں ایسے بہت کم لیڈر گزرے ہیں جنہوں نے ایک مکمل طور پر منتشر اور پسماندہ قوم کی تنظیم کر کے اسے اتنے تھوڑے عرصے میں ایک بہت بڑے ملک کا مالک بنا دیا ہو۔ آج ہم جس آزاد فضا میں سانس لے رہے ہیں اور ترقی کی جو نئی نئی شاہراہیں ہمارے سامنے کھل رہی ہیں، یہ اسی مردِ مجاہد کی سرتوڑ کوشش اور محنت کا نتیجہ ہیں۔ آیئے ہم سب مل کر خدا کے حضور میں دعا کریں کہ وہ ہمیں قائداعظم کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور اُن کی سی دیانت داری، خلوص اور حب الوطنی کو ہمارے لئے مشعلِ راہ بنائے۔"

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، صدرِ پاکستان
تقریبِ سنگِ اساس، مقبرہ قائداعظم
کراچی: ۳۱ جولائی ۱۹۶۰ء

★

سے گیارہ سال کا طویل عرصہ بے کار منصوبہ بندی اور بحث و مباحثہ ہی میں گزر گیا۔ اور اس کی عملی تشکیل منت پذیرِ صبحِ فردا ہی رہی۔

شکر ہے کہ انقلابی حکومت نے عنانِ اختیار سنبھالتے ہی اس ملی فریضہ پر توجہ دی۔ اور اِس ذوق و شوق، اِس عزم بالجزم، اس تیز رفتاری کے ساتھ کہ تھوڑے ہی عرصہ میں مقبرہ کا ایک نیا ڈیزائن تیار ہوگیا۔ نہایت اچھوتا، نہایت شاندار — اور اس طرح کم از کم ماڈل کی حد تک ہمارا دیرینہ قومی خواب پورا ہوگیا۔ اور یہ ذوق و شوق کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوگیا۔ اس نے ایسی تیز رفتاری سے ایک اور اہم بنیادی مرحلہ بھی طے کر لیا ہے۔ مقبرہ کی تاسیس۔ چنانچہ صدر پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے ۳۱ جولائی کو اس کا سنگِ بنیاد بھی رکھ دیا اور اس تاریخی عمارت کی باقاعدہ تعمیر شروع ہوگئی۔ یہ کامیابی واقعی باعث مسرت ہے اور اس پر جتنا بھی فخر کیا جاسکے کم ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ساری کارروائی کم سے کم وقت میں سرانجام پائی ہے جو بجائے خود کارگزاری کی ایک نادر مثال ہے۔ بلاشبہ اس یادگار مقبرہ کی تعمیر ہماری قومی تعمیرات کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اس سے ہماری قابل فخر یادگاروں میں ایک اور مہتم بالشان اضافہ ہوگا۔ عروس البلاد کراچی کے لئے ایک اور سامانِ زینت۔

وہ خوش قسمت شخص جسے مقبرہ کا ڈیزائن تیار کرنے کا شرف حاصل ہے، مسٹر یحییٰ مرچنٹ ہیں۔ ان کا تیار کردہ ڈیزائن متعدد نمونوں میں سے بہترین تصور کیا گیا اور اب ماڈل سے بڑی تیزی کے ساتھ حقیقی صورت اختیار کرے گا۔ اس ڈیزائن کے سلسلے میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صدر پاکستان نے تقریب سنگ اساس کے موقع پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ :۔

"دوسری خوبیوں کے علاوہ مسٹر یحییٰ مرچنٹ کے انتخاب میں دو باتوں کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے۔ ایک تو یہ کہ مسٹر مرچنٹ بمبئی میں قائد اعظم کی زیر نگرانی کام کر چکے ہیں اور قائد اعظم کو ان کا کام پسند تھا۔ دوسرے محترمہ مس فاطمہ جناح کو بھی مسٹر یحییٰ مرچنٹ کی قابلیت پر پورا اعتماد ہے اور انہوں نے ان کے ڈیزائن کو پسند فرمایا ہے"۔

اس ڈیزائن کے تیار کرنے میں کتنی ہی باتوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے جن کو پیش نظر رکھنا لازمی تھا۔ اول یہ کہ ڈیزائن ہماری روایات سے ہم آہنگ ہو۔ یہ اُس سلسلے کو جاری رکھے جو ہمارے یہاں سالہا سال سے جاری ہے۔ اور اس میں اضافے کرے تو ایسے جو پرانی وضع میں نئی طرح پیدا کردیں۔ اور پرانے پیالوں میں نئی شراب بھر دیں۔ منظور شدہ ڈیزائن میں یہی خوبی نظر آتی ہے۔ قدیم و جدید کا ایک حسین امتزاج۔ چنانچہ اس میں رعنائی کے ساتھ شان طرحداری، سادگی کے ساتھ پرکاری اور جمال کے ساتھ جلال کا عنصر نمایاں ہے۔ وہ نفاست، وہ بلندی، وہ شکوہ، وہ حسن ذوق جو خاص فیضان ہی سے پیدا ہوسکتے ہیں، سب اس جدت کی خبر دیتے ہیں، جو مقبرہ کو جنت نگاہ بناتے ہوئے زندۂ جاوید بھی بنا دے۔ اور انسان بے اختیار کہہ اٹھے کہ :۔

ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

یہی نہیں بلکہ حسن و رعنائی کے ساتھ ناظر کے دل پر عظمت و جلال کا نقش بھی ثبت ہو۔ اس سے صاحبِ مقبرہ کی عظیم الشان ہستی کا جبروت بھی منعکس ہو، وہی جسے صدر پاکستان نے مقبرہ کا سنگِ بنیاد رکھتے وقت "قائد اعظم کی اولوالعزمی اور کردار بلند" قرار دیا ہے۔ بلاشبہ اگر فن اس مقصد اعلیٰ کی برجستہ عکاسی نہیں کرتا تو وہ بے کار ہے۔

عظیم الشان تاریخی شخصیتوں میں قدرتی طور پر رعب و جلال پایا جاتا ہے۔ اگر تیمور کے مقبرے پر یہ رقم نہ بھی ہو۔ "شہنشاہ دوراں سلطان جہاں پناہ صاحب سیف تیمور بادشاہ فاتح عالم" پھر بھی اس کی قہرمانیت سے زائر پر دبدبہ طاری ہو جاتا ہے۔ قائد اعظم کے مقبرے میں بھی کچھ ایسے ہی جلال کے آثار نظر آتے ہیں۔ مگر دبدبے کے ساتھ شانِ کرم لئے ہوئے۔ کیونکہ وہ ایک مملکت کے بانی و خالق اور قائد اعظم ہی نہیں بلکہ بابائے ملت بھی ہیں۔

مقبرے کی تعمیر میں مسلمانوں کی تعمیری روایات کا ایک اور طرح بھی التزام کیا گیا ہے۔ جس طرح جہانگیر، شاہ جہاں اور دیگر سلاطین و امرا کے مقبروں کے گرداگرد نہایت عالی شان اور خوشنما باغات ہوتے ہیں، اسی طرح بابائے ملت کے مقبرہ کے گرد بھی ۳۰ ایکڑ کے رقبہ میں ایک نہایت شاندار باغ لگایا جائے گا جس میں نشالامار اور دیگر قدیم مغلیہ باغات کی طرح کئی تختے، پھلواریاں، روشیں، فوارے اور خیابان ہوں گے۔ یہ خوش آئند اور دلفریب

باقی صفحہ ۵۷ پر

حریفِ مہر و ماہ

(صدرِ پاکستان کے حالیہ ارشاد سے متاثر ہو کر کہ ہم قائدِ اعظم کے نقشِ قدم پر چلیں اور ان کے اوصافِ حمیدہ کو شمعِ راہ بنائیں)

مشتاق مبارک

چراغِ راہ تھا روشن نہ راہ بر کوئی
بھٹک رہا تھا اندھیروں میں کارواں اپنا
ہر ایک گام پہ ہمت شکن اندھیرے تھے
یہ واقعہ ہے کہ دشمن تھا اک جہاں اپنا

ہماری راہ میں غیروں کے ساتھ اپنے بھی
بچھا رہے تھے وہ کانٹے کہ الاماں کہیئے
قلم کو تابِ رقم ہے نہ ہمتِ اظہار
جگر فگار ہے ۔ کیسے یہ داستاں کہیئے

ترے نثار، تری سعی و رہبری پہ نثار
اینِ مملکتِ نو بنا دیا تو نے
قدم قدم پہ جہاں ہے بہارِ آزادی
نشاطِ دل کا وہ گلشن کھلا دیا تو نے

محمد اور علیؓ ان پہ جان و دل قربان
انہیں کے ربط سے روشن ہوا ہے نام ترا
انہیں کا فیض انہیں کا ہے التفات کہ آج
حریفِ اوجِ مہ و مہر ہے مقام ترا

ترے چمن کا وہ خوش فکر پاسباں[۱] ہے آج
بچا لیا ہے تباہی سے یہ چمن جس نے
جسے خیال ہے اک اک گلِ شگفتہ کا
سکھا دیا ہمیں جینے کا بھی چلن جس نے

ہم آج اس کی قیادت میں بڑھ رہے ہیں جسے
ملا خراجِ قیادت کا اک زمانے سے
ملی ہے دولتِ فکر و عمل جسے بخدا
بہ فیضِ سرورِ دیں غیب کے خزانے سے

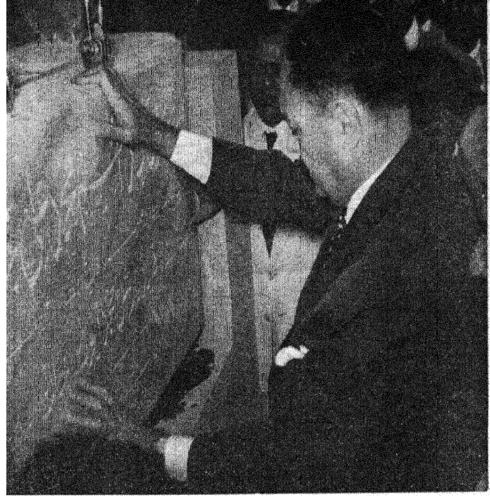
ترے مزارِ مقدس پہ کھا رہے ہیں قسم
رہیں گے تیری امانت کے پاسباں ہم لوگ
ہمیں جہاں میں یونہی سربلند رہنا ہے
جھکیں گے اب نہ کبھی زیرِ آسماں ہم لوگ

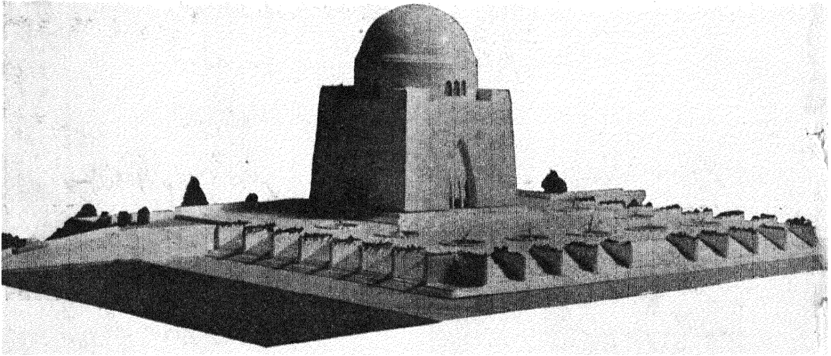
[۱] صدرِ پاکستان

مزار قائد اعظمؒ
کا
سنگ بنیاد

(۳۱ جولائی ۱۹۶۰ء)

صدر پاکستان
فیلڈ مارشل محمد ایوب خان





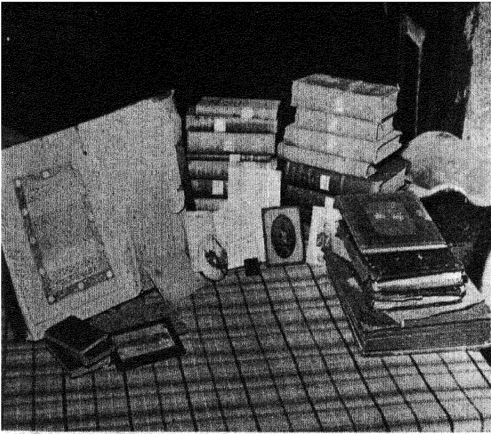
مزار (حقیقت منتظر)
(حسن خیال : یحییٰ مرچنٹ)



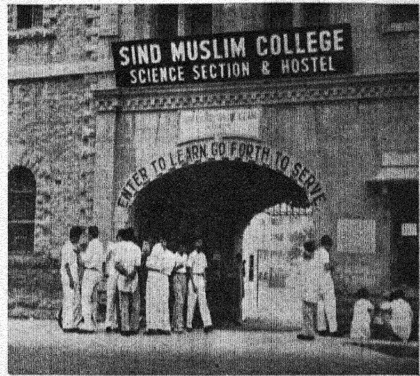
سنگ بنیاد



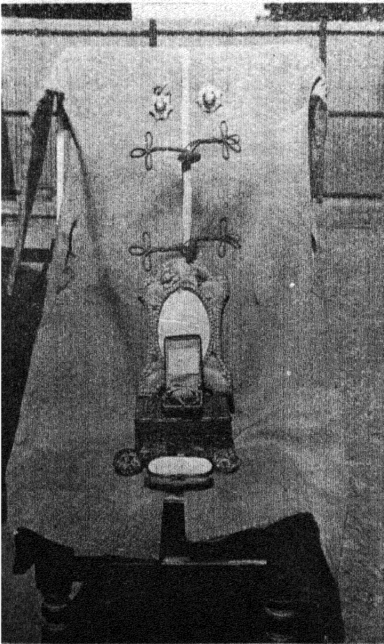
خان بہادر حسن علی آفندی مرحوم بانی سندھ
مدرستہ الاسلام کراچی(۷۵ سالہ پلاٹینم جوبلی ستمبر ۱۹۶۰ء)



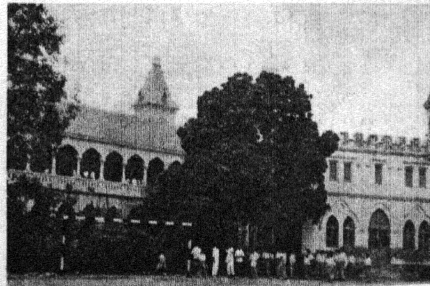
مرحوم کا علمی خزانہ



عظمتوں کا گہوارہ: وہ تاریخی مدرسہ جہاں قائداعظم نے تعلیم پائی



خلعت و تمغۂ مجیدی



"صہبائے آبگینہ گداز"

(قائد اعظمؒ اور حسن علی آفندی، بانیٔ سندھ مدرسہ، کراچی کی یاد میں)

احسن منیر

نور کے پیکر جہاں اندر جہاں یاد آگئے
جلوہ ہائے کہکشاں در کہکشاں یاد آگئے

گل بداماں روز ہائے دلنشیں یاد آگئے
خلد ساماں دور ہائے دلستاں یاد آگئے

وہ بہاریں جو بہارِ تازہ تر پیدا کریں
اُن بہاروں کے فسوں پرورنشاں یاد آگئے

تھے خیاباں در خیاباں جن کے نغمے کیف یار
وہ نوازنِ آشیاں در آشیاں یاد آگئے

جن کے سینوں میں نہاں تھا اک جہانِ التہاب
وہ حریفِ سوزشِ برق تپاں یاد آگئے

ریت کے ذرات سے بن کر حریف آفتاب
جو ہوئے سارے جہاں میں ضوفشاں یاد آگئے

شرق سے تا غرب یکسر جگمگا اُٹھے اُفق
برقِ بے تابِ جہانِ خاوراں یاد آگئے

اس زمیں کے سینۂ تاریک سے اُبھرے ہوئے
وہ تجلّی در تجلّی آسماں یاد آگئے

آتشیں جم، آتشیں مے، آتشیں جامِ رحیق
آتشیں مغ، آتشیں پیرِ مغاں یاد آگئے

وادیٔ مہران کے دریائے موج انگیز کو
کر گئے جو ایک بحرِ بیکراں یاد آگئے

مدرسے کی چار دیواری سے ہوکر سربلند
جو نکل آئے تھے وہ سرورواں یاد آگئے

جن میں تھے تخلیق ارضِ پاک کے جوہر نہاں
آج وہ خلد آشیاں جنت مکاں یاد آگئے

قائد اعظمؒ وہ مینار بلند آتشیں
اس کے شعلے آسماں در آسماں یاد آگئے

پیکر جہد و عمل، احیائے ملّت کے نقیب
وہ حسن، معمار دورِ پاستاں یاد آگئے

وہ در و دیوار، وہ جلوے چراغ اندر چراغ
وہ مکینانِ دیار جاوداں یاد آگئے

پھونک دی تھی اک نئی جاں پیکرِ یخ بستہ میں
پھر وہی جادو اثر، آتش بیاں یاد آگئے

وہ فسانے جن کی رنگینی ہے سحرِ جاوداں
داستاں در داستاں در داستاں یاد آگئے

وہ دمِ آہنگ پرور وہ نفس آتش فشاں
کارواں در کارواں در کارواں یاد آگئے

"... مگر یہ دریا* کے پار ہوگا"

سید فیضی

جھیل مانسرور کی چھاتی سے پھوٹنے والا ایک ننھا سا چشمہ اٹکھیلیاں کرتا، پہاڑوں سے ٹکراتا، سنگریزوں سے سر پھوڑتا ہوا میدان کی جانب بڑھتا نظر آتا ہے۔ اسے سندھو ندی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ حیدرآباد پہنچتے پہنچتے اس کی مضطرب موجیں تند و تیز ہو جاتی ہیں، اس کے پھیلے سمٹتے ہوئے کنارے کف آلود دکھائی دیتے ہیں۔ اور ایک ابدی سرمستی سے ہمکنار ہو کر اُس کے ہنستے ہوئے لبوں پر بہار آفریں زمزمے ناچ اٹھتے ہیں:

"میں سندھو ہوں۔ مہران ہوں۔ اٹک میرا نام ہے۔ مجھے
جہلم کہتے ہیں۔ راوی اور چناب کا خطاب دیتے ہیں۔ لیکن میں
سندھو ہوں ــــ سب سے بڑا سندھو!"

میری ناچتی ہوئی لہریں ماضی کا آئینہ ہیں۔ حال کو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں اور مستقبل کی غوطہ زنی بھی میرے لئے مشکل نہیں ہے۔ میں بھی کاروانِ حیات کے ساتھ ساتھ چلتا ہوں، ایک تازہ دم مسافر کی طرح چہرے پر عزم کی شگفتگی لئے۔ نشیب و فراز سے واقف، عروج و زوال کا تماشہ بیں۔ بظاہر ژولیدہ و سن رسیدہ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ طوطیٔ ہزار داستان کی طرح آج بھی میرے ہونٹوں سے جوانی کے نغمے بکھرتے ہیں، میرا شباب شیب آشنا نہیں۔ میں کب سے ہوں اور کب تک رہوں گا، مجھے خود بھی معلوم نہیں۔ ہاں! میری ان آنکھوں نے زندگی کے تماشے دیکھے ہیں، اپنی اسی وادی میں سمہ اور سومرا کا اقتدار آزمایا ہے۔ کلہوڑوں کا عروج بھی میری نگاہوں میں چھپا ہوا نہیں اور میروں کی تاجداری تو کل کی بات ہے۔

میر مراد علی خاں کی بادشاہی کے دن تھے۔ حیدرآباد سولہ سنگھار کئے دلہن کی طرح جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ میرے کنارے ابھی تک بلشیوں کے قدم سے ناآشنا تھے کہ شومیٔ بخت سے میروں نے ۱۸۳۲ء میں حکومت برطانیہ سے ایک معاہدہ کر لیا جس کی رُو سے انگریزوں کو اپنے ذاتی مفاد کے لئے مجھے استعمال کرنے کی اجازت مل گئی۔ یہیں سے میری بدنصیبی کا دور شروع ہوتا ہے۔ میرے چہرے پر افسردگی کے گھنے بادل چھا جاتے ہیں۔ میری آزاد منش طبیعت پر چوٹ پڑتی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میری اس بدقسمتی کو بھانپ کر ایک سر پھرے محبِ وطن نے کہا تھا:

"افسوس! آج سندھ ہمارے ہاتھوں سے نکل
گیا۔ اب انگریز نے اس کا رستہ دیکھ لیا ہے!"

یہ الفاظ میرے کانوں میں پڑ چکے تھے۔ میں علیحدہ پریشان تھا۔ اور انگریز کی ریشہ دوانیوں سے میروں کی طاقت علیحدہ زوال آشنا ہو رہی تھی۔ بڑے بڑے خاندان پریشان حال تھے۔ انقلابِ زمانہ کے شاکی! لیکن وہ وقت ہی ایسا تھا اور جب حالات دگرگوں ہونے لگتے ہیں تو پھر ناخن تدبیر بھی گرہ کشائی نہیں کرتا۔ میری آنکھیں گواہ ہیں کہ اسی حیدرآباد کے ایک مقتدر خاندان کا ایک فرد میرے گھاٹ پر لکڑیاں لادنے اور مسافروں کو آر پار لے جانے کا کام کیا کرتا تھا۔ عزم و عمل کے اس مجسمے کو پندرہ روپے ماہانہ مزدوری ملا کرتی تھی جس سے وہ اپنے کنبہ والوں کا پیٹ پالتا تھا۔ علم و دانش کی یہ بیقدری میں نے کاہے کو دیکھی تھی! میاں محمد حسین اخوند کے گھرانے کا یہ چشم و چراغ حسن علی ــــ مجبور تھا کہ گردشِ وقت کے ہاتھوں آوارہ و سرگرداں پھرے۔ پندرہ روپے اور اتنے بڑے گھر کی کفالت! میں حیران تھا کہ اس دنیا میں کیا کچھ نہیں ہوتا، لیکن میری نگاہیں اس باہمت نوجوان کے مستقبل کا اندازہ کر چکی تھیں۔ کوٹری تک پھیلا ہوا میرا دامن زیادہ عرصے تک اس آہنیں عزم کے انسان کو اپنی طرف متوجہ نہ رکھ سکا۔ اب وہ نوشہرو ڈویژن کے ڈپٹی کلکٹر کے دفتر میں ملازمت اختیار کر چکا تھا۔ مجھے افسوس تھا کہ میرا ایک باغیرت فرزند مجھ سے خفا ہو کر چلا گیا ہے، میری کوششیں اُسے واپس لانے میں لگی رہیں اور وہ اپنی خداداد ذہانت کی وجہ سے تحصیل علم کے مدارج طے کرتا رہا۔ میری کوشش غالب تھی، میرے جذبوں

---

* سفینۂ برگِ گل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا کے پار ہوگا ــ اقبال

میں خلوص تھا شاید اسی لئے حسن علی کو پھر میرے ہی کناروں پر دریائی بیڑے کے منتظم و مہتمم کی حیثیت سے واپس آنا پڑا ؎

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں
شرطِ اوّل قدم آن است کہ مجنوں باشی

بدیشی لوگوں میں نیک نفس بھی ہوا کرتے ہیں اور اُس وقت تو قحط الرجال کا زمانہ بھی نہیں تھا۔ ڈلٹن صاحب بھی اسی طرح کے ایک نیک نفس انسان تھے۔ وہ کراچی کے جج مقرر ہو کر آئے تھے۔ کراچی پہنچنے کے لیے انہوں نے دریائی بیڑے کے ذریعے مجھے پار کیا تھا اور اسی دوران میں وہ حسن علی کی اعلیٰ انتظامی قابلیت اور مدبّرانہ صلاحیت سے بھی متاثر ہوئے تھے۔ انہوں نے میرے اس فرزند کو مجھ سے جدا تو کر دیا لیکن میں خوش ہوں کہ یہ جدائی اُس کی ناموری کا سبب ٹھہری۔ اب وہ کراچی کی ضلع کچہری میں ایک سررشتے دار اور مترجم کی حیثیت سے مامور تھا۔ میری آنکھیں پھر بھی اُس کے تعاقب میں لگی رہیں۔ کیونکہ اس کا عروج میری شہرت کا باعث تھا، اُس کی ناموری میں سندھ کی ناموری پنہاں تھی۔ اسی لئے بحیرۂ عرب میں مدغم ہونے کے لئے جاتے جاتے میں آنکھ بھر کر کراچی کا جائزہ بھی لے لیا کرتا تھا۔ یہی میرے لئے سرمایۂ مسرت تھا۔ اور آج بھی ہے۔

ضلع کچہری کے در و دیوار سے پوچھئے تو آج بھی حسن علی کی کارکردگی ان کے لئے حسین یادوں کا خزانہ بنی ہوئی ہے۔ وکیلوں کی آزادانہ زندگی اور اُن کے معزز پیشے کا احترام حسن علی کو مسحور کر چکا تھا اور اُس کے دل میں بھی وکیل بننے کی تمنا انگڑائیاں لے رہی تھی۔ چنانچہ شب و روز کی محنت سے اُس نے اتنی قانونی استعداد بہم پہنچالی کہ مسٹر ڈلٹن نے امتحان لئے بغیر وکالت کی سند عطا کر دی۔ ایک مسلمان کا اس طرح وکالت پیشہ ہو جانا اغیار کی نگاہوں میں تو کھٹکتا رہا لیکن دیکھا جائے تو سندھی مسلمانوں کی سربلندی کا دور یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ حسن علی کی قانونی قابلیت اور مہارت نے اُسے نہ صرف کراچی بلکہ پورے سندھ سے متعارف کروا دیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمانوں کی تعلیمی حالت بے حد سقیم تھی۔ مذہبی حلقوں کی طرف سے نہ صرف انگریزی عملداری بلکہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی بھی سخت مخالفت ہوتی تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیمی اعتبار سے سندھی مسلمان پست تر ہوتے گئے اور دوسری قوموں کے افراد آگے بڑھتے گئے۔ حسن علی نے مسلمانوں کی اسی ذہنیت کا بغور جائزہ لیا۔ دکھے ہوئے دل سے ان کی زبوں حالی پر سوچ بچار کیا اور انہیں قعرِ مذلّت سے نکالنے کے لئے سندھ میں ایک "انجمنِ اسلام" کی طرح ڈال دی۔ تاکہ قوم کا یہ بکھرا ہوا شیرازہ ایک متحدہ پلیٹ فارم پر جمع ہو سکے اور باہمی مشاورت سے اپنی فلاح و بہبود کے ذرائع ڈھونڈ سکے۔ یہی وہ انجمن ہے جس نے آگے چل کر مسلمانانِ سندھ میں تعلیمی، سیاسی اور ثقافتی شعور پیدا کیا اور اسی کے زیرِ اہتمام ۱۸۸۵ء میں سندھ مدرسۃ الاسلام کی بنیاد پڑی۔

حسن علی کی ہمت و کارکردگی کا یہ مظہر جو آج کراچی کی ایک مشہور شاہراہ فریئر روڈ کے پہلو میں روشنی کا مینار بن کر استادہ ہے ساٹھ ستر سال پہلے ایک کاروانسرائے تھی جہاں بلوچستان کے اطراف سے تجارتی قافلے آکر ٹھہرا کرتے تھے۔ تھکے ہارے مسافروں کو یہاں سکون حاصل ہوتا تھا۔ وہ اپنے مال و متاع کا یہاں جائزہ لیا کرتے تھے اور چند روز ستانے کے بعد پھر ایک نئے عزم اور نئے ولولے کے ساتھ اپنا راستہ اختیار کرتے تھے۔ آج نصف صدی گذر جانے کے بعد بھی طلبِ سکون و عافیت یہاں کا شعار ہے۔ ہنر و دانش کی مال و متاع کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ شاہراہِ حیات پر قدم رکھنے والے مسافر علمی تحصیل کے لئے یہاں آتے ہیں۔ اور زیورِ تربیت سے آراستہ ہو کر نکلتے ہیں۔ مدعا وہی ہے لیکن پیرایۂ اظہار مختلف ہے اور یہ اس لئے کہ حسن علی نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر اس ویران و غیر آباد کارواں سرائے کو سندھی مسلمانوں کی علمی تحصیل کا مرکز بنانے کے لئے حاصل کر لیا تھا۔ سب سے پہلے یہاں اقامت گاہ اور مسجد تعمیر ہوئی۔ اس کے بعد ہائی اسکول کی مرکزی عمارت آہستہ آہستہ تکمیل کو پہنچی۔ یوں تو ۱۸۸۵ء میں ہی مدرسۃ الاسلام باقاعدہ طور پر شروع ہو چکا تھا اور مولوی عمر الدین ایم اے یہاں کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے تھے۔ لیکن تھوڑا عرصہ گذرنے پر ہی پنجاب گورنمنٹ نے مولوی صاحب موصوف کی خدمات واپس لے لیں اور اس طرح ترقی و تکامل کے وہ مدارج اسے حاصل نہ ہو سکے جو مولوی صاحب کے زیرِ ہدایت تجویز ہوئے تھے۔ سندھ مدرسے کی انتظامی باگ ڈور اب مرزا صادق علی کے ہاتھوں میں تھی جنہیں سندھ کے پہلے مسلمان گریجویٹ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس کے بعد حسن علی کے بڑے صاحبزادے ولی محمد (جو گورنمنٹ ہائی اسکول شکارپور کے ہیڈ ماسٹر تھے۔) کی آزمودہ کاری نے عنانِ اختیار سنبھالی۔ وہ ۱۸۸۷ء سے ۱۸۹۶ء تک برابر دس سال سندھی مسلمانوں کی تعلیمی خدمات میں منہمک رہے۔

اسی دوران میں مدرسہ بورڈ کی تجویز کے مطابق ایک انگریز مسٹر پرسی ہائیڈ کو یہاں کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ مدرسۃ العلوم علیگڈھ کی شہرت اُس وقت اندرونِ ملک میں دور دور تک پھیل چکی تھی سندھی مسلمانوں کا بھی یہ تقاضا تھا کہ کراچی میں مدرسۃ الاسلام کی تعلیم علیگڈھ کے طریقوں

پر ہی ہوتا کہ یہاں کے مسلمان طالب علم جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے خواہاں ہیں یہیں اپنی علمی ضروریات کی تکمیل کر سکیں اور انہیں علیگڈھ جا کر تعلیم حاصل کرنے اور زیادہ مصارف برداشت کرنے کی زحمت نہ اٹھانا پڑے۔ چنانچہ علیگڈھ کے مشہور استاد مسٹر وائینس کو سندھ مدرسۃ الاسلام کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ مسٹر وائینس کو سندھی مسلمان طالب علموں کی تعلیم سے غیر معمولی دلچسپی اور شغف تھا۔ انہی کی رہنمائی میں اس تعلیمی ادارے نے سندھ کے مسلمانوں میں تعلیم کی اشاعت کا کام بڑی تندہی سے سرانجام دیا اور سچ پوچھیئے تو اس ادارے کے لئے سب سے بڑا فخر یہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ کے محبوب، بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح نے بھی اسی چہار دیواری میں اپنی ذات کو زیورِ علم سے آراستہ کیا۔

قائد اعظم کے علاوہ سندھ کے جتنے سربرآوردہ اور پڑھے لکھے مسلمان نظر آتے ہیں، اُن سب نے اسی درسگاہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی ہے اور یہیں کی اقامت گاہوں سے تربیت پا کر نکلے ہیں۔ بلکہ کھیل کے میدان میں بھی اس کے بعض افراد حنیف، غلام محمد وغیرہ۔ پیش پیش رہے اور انہوں نے کرکٹ کے بے نظیر کھلاڑیوں کی حیثیت سے عالمی شہرت حاصل کی۔

سرزمین سندھ کا یہ نامور فرزند جسے سندھ کا سرسید کہنا زیادہ موزوں اور مناسب ہوگا، اپنی زندگی کے آخری لمحات تک اس تعلیمی ادارے کو اپنے خونِ جگر سے سینچتا رہا۔ ایک قومی ولولے اور بے پناہ ذوق و شوق کے تحت اُس نے اس چمنستانِ علم کی آبیاری کی، اپنے ہاتھوں سے اس کی روش روش کو نکھارا، اس کی نوک پلک سنوارنے کے لئے گداگری بھی اختیار کی اور مستقل آمدنی کے ذرائع بھی مہیا کئے۔ اندرونِ ملک کا دور دراز سفر برداشت کیا، زمینداروں، اور متمول لوگوں کو اپنا ہم خیال بنایا، اپنوں کے طعنے سہے غیروں کے کچوکے برداشت کئے لیکن کیا مجال کہ پائے استقامت میں ذرا بھی لغزش آئے۔ عمرِ عزیز کے جو بارہ تیرہ سال بچ رہے تھے وہ بھی اس قومی کام کی نذر ہوئے۔ یہ ان شبانہ روز کی محنتوں ہی کا نتیجہ تھا کہ کراچی کی زمین میں ایک ایسا نقش قائم ہو گیا جو زمانے کی رفتار کے ساتھ روز بروز محکم اور روشن تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ بڑی مسرت کی بات ہے کہ سندھ کے مسلمانوں نے اپنے اس مخلص راہنما کی خدمات کو عزت و تحسین کی نگاہوں سے دیکھا اور بلدیہ کراچی کے لئے بہ اتفاق رائے اسے اپنے ایک معزز رکن کی حیثیت سے نامزد کیا۔ ۱۸۹۱ء میں سندھ کے وڈیروں اور جاگیرداروں کی طرف سے گورنر بمبئی کی کونسل میں رکنیت کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ حکومت برطانیہ نے خان بہادر کے خطاب سے نوازا۔ اور ہندوستان میں ترکی کی سفارت کرنے کے عوض سلطان ترکی کی جانب سے ۱۸۸۹ء میں ایک تمغہ اور "آفندی" کا جلیل القدر خطاب بھی عطا ہوا۔

یہ واقعہ ہے کہ حسن علی آفندی نے مسلمانوں کی صرف تعلیمی خدمات ہی انجام نہیں دیں بلکہ ان کے سیاسی اور معاشرتی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ ایک روشن دل و دماغ رکھنے والے مسلمان کی طرح حسن علی آفندی کی یہ دلی آرزو تھی کہ وہ مسلمانوں کو فلاح و ترقی کے راستہ پر ڈال دے اور اس ضمن میں جو بھی کارہائے نمایاں اُس نے سرانجام دیئے ہیں، وہ تاریخی صفحات میں اُسے ایک مستقل اور باعزت جگہ دلوانے میں کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ کراچی کی موجودہ آب رسانی کے پورے نظام اور گندے پانی کی نکاسی کی اسکیم میں حسن علی آفندی کے قیمتی مشوروں اور تجاویز کو بہت دخل ہے۔ اس کے علاوہ کراچی میں لڑکوں اور بچیوں کے لئے مخصوص قسم کے مدارس کا قیام، بلدیہ میں مسلمانوں کی مزید نمائندگی، اور وقف علی الاولاد کے قانون کا رواج، یہ سب اقدامات حسن علی کی کوشش و ہمت ہی کے شرمندۂ احسان ہیں۔

ملتِ اسلامیہ کی خدمت کرنے والا یہ دل و دماغ اب بوڑھا ہو چکا تھا۔ ۶۵ سال کی مسلسل جد و جہد آرام کی متلاشی تھی۔ چنانچہ ۲۰ اگست ۱۸۹۵ء کو ابدی طور پر آرام کرنے کا بلاوا آ پہنچا جس پر لبیک کہتے ہوئے یہ جواں ہمت بوڑھا حیدرآباد میں اپنے ہی باغ کے ایک گوشے میں آرام کی نیند سو گیا ؎

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے — سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

غور کیا جائے تو حسن علی آفندی کی عظمت و ناموری کا راز قوم و وطن کی بے لوث خدمت میں مضمر ہے۔ اور یہی جذبہ تھا جس نے اس کے ایک ہونہار فرزند کو تمام برِصغیر میں مسلمانوں کی سربلندی و آزادی کا پرچم بلند کرنے کی تحریک دلائی۔ اور یہ پھر اسی جذبہ کی مسلسل کارفرمائی تھی جس نے صدر پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کو آمادہ کیا کہ وہ انقلاب کی حقیقی روح کو بروئے کار لائے۔ اور ایک نئے دورِ عروج و ترقی کی بنیاد رکھے جس میں جمہور کا بول بالا ہو۔ اُس کی قائم کردہ یادگار "سندھ مدرسۃ الاسلام" کی پیشانی آج بھی ان مقدس حروف سے جگمگا رہی ہے:

"تحصیلِ علم کے لئے یہاں آؤ اور خدمتِ قوم کا جذبہ لیکر جاؤ"

یہی وہ سنہری الفاظ ہیں جن سے اس مدرسہ کی ساری تاریخ مرتب ہوتی ہے اور نگاہیں ایک ایسے روشن مستقبل سے دوچار ہوتی

(باقی صفحہ ۶۱ پر)

رپورتاژ:

عظمتوں کا گہوارہ

(سندھ مدرستہ الاسلام)

عارف حجازی

کئی دنوں سے جو سرمئی بادل آسمان پر منڈلا رہے تھے آخر ایک روز منہ اندھیرے ہی سے برسنے لگے۔ پھر دن نکلتے نکلتے اچھی خاصی بارش ہونے لگی۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی مگر بس کے اڈے تک پہنچتے پہنچتے کافی بھیگ چکا تھا پھر بھی مجھے بارش کے چھینٹے بڑے اچھے معلوم ہو رہے تھے۔ اس پر ہوا کی ہلکی پھلکی لہریں تو مجھ پر اور ہی کیفیت پیدا کر رہی تھیں۔ سر سے پاؤں تک ایک تازگی اور شگفتگی عود کر آئی تھی۔ جیسے کسی بے آب درخت کی جڑوں کو پانی ملنے پر ہری ہری نازک کونپلیں نکل آتی ہیں اور رفتہ رفتہ اس پر ہریالی ہی ہریالی چھا جاتی ہے۔ مجھے اس وقت ایسا لگا جیسے میری زندگی میں پھر بہار آگئی ہے اور میں بس کے اڈے پر کھڑا سندھ مدرسہ جانے والی بس کا انتظار کرنے لگا۔ اس وقت میرا ماحول بڑا سہانا تھا جیسے یہ میری ہی خوشگوار دلی کیفیت کا عکس ہو۔ اس لئے کہ میرے ذہن میں عظمتوں کے گہوارے، "سندھ مدرسہ" ہی کا تصور بسا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر میں بس آگئی اور میں لپک کر اس میں سوار ہو گیا۔ ہاں میں بصد شوق اسی مدرسہ کی طرف جا رہا تھا۔ وادیٔ سندھ کے مسلمانوں کی سیاسی و تعلیمی جدوجہد کا ماحصل، اسلامی تہذیب و تمدن اور عظمتوں کا مرکز، اور علم و ادب کا گہوارہ جس کا مقصد گھر گھر علم کی روشنی پہنچانا تھا۔

یہ کوئی ایک سو سولہ برس پہلے کی بات ہے جب ابھی اہلِ فرنگ نے اس علاقہ پر قبضہ کر کے اسے بمبئی کے صوبے سے ملحق کر دیا تھا۔ اس زمانے میں کراچی ہی کیا سارے صوبہ پر جہالت چھائی ہوئی تھی۔ سندھی زبان کا رسم الخط فارسی تھا اور اکثر آوازوں کے اظہار سے قاصر۔ اس لئے عربی رسم الخط اختیار کرنے کی تجویز ہوئی۔ عدالتوں کی زبان فارسی تھی ۱۸۵۱ء میں سر بارٹل فریئر نے تمام سرکاری عہدیداروں کا ٹھیٹھ سندھی میں امتحان پاس کرنا لازمی قرار دیا۔ اس کے بعد کپتان برٹن نے سندھی کو عربی رسم الخط میں رائج کرنے کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارباب اختیار سے منظوری لی۔

اس مقصد کو کامیاب بنانے کے لئے دس ہزار روپے کی منظوری دی گئی۔ اور ساتھ ہی سر ہیر دایلیس کی نگرانی میں ماہرین لسانیات کی ایک جماعت نے عربی کے اُنتیس حروف میں اور اضافہ کر کے باون حروف پر مشتمل سندھی زبان کی تشکیل کی اور ۱۸۵۳ء میں پہلی دفعہ سندھی عربی رسم الخط میں چھاپی گئی۔

جب یہ اہم کام انجام پا چکا تو کپتان رتھ بارن، کلکٹر حیدرآباد نے تعلیم کو عام کرنے کی کوشش کی۔ پھر کپتان پریڈی کلکٹر کراچی نے اپنے نجی خرچ سے "کراچی فری اسکول" کی بنیاد رکھی اور اسے مقامی لوگوں کی ایک کمیٹی کے سپرد اس شرط پر کیا کہ نصابِ تعلیم عیسائی مذہب کی تبلیغ اور بائبل کی نشر و اشاعت پر مبنی ہو۔ چنانچہ اسی شرط کی بنا پر یہ اسکول چرچ مشن سوسائٹی کے حوالے کر دیا گیا جو اب تک "چرچ مشن اسکول کراچی" کے نام سے جاری ہے۔ یہ وادیٔ سندھ کا سب سے پہلا اور قدیم فرنگی اسکول ہے۔ اس کے بعد "نرائن جگن ناتھ ودیا ہائی اسکول کراچی" قائم ہوا۔

یہ وہ دور تھا جب سابقہ سندھ کراچی اور شکارپور کی دو کلکٹریوں میں بٹا ہوا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد ۱۸۷۲ء کے لگ بھگ حیدرآباد اور شکارپور میں ہائی اسکول جاری کئے گئے جہاں صرف غیر مسلموں ہی کو داخل کیا جاتا تھا۔ مسلمانوں کو قصداً تعلیم سے دور رکھا گیا جس کا نتیجہ ہوا کہ وہ مسلمان جو کبھی علم و ہنر میں یکتا تھے۔ اور حکمرانوں کی حیثیت سے صوبے پر چھائے ہوئے تھے، نئے نظام حکومت اور دوسرے سرکاری شعبوں میں اَن پڑھ اور جاہل رہنے کے سبب اقلیتوں کے مقابلے میں پیچھے رہ گئے۔ سندھی مسلمانوں کے انحطاط کا یہ دور بڑا پُر آشوب تھا لیکن جب ایک صاحبِ فہم و دانش، شیدائے قوم و وطن، روشن دماغ عالی ہمت اور علم دوست کی نگاہ لیے محابا اٹھی تو تنزل اور جمود کے بادل چھٹنے لگے۔ جہالت کے تیرہ و تار ریگزار سے خان بہادر حسن علی آفندی بے مجیدی، علم و ہنر کی شمع لیکر نکلے، مگر فرسودہ ذہنوں اور آنکھوں کو یہ روش ناگوار معلوم ہوئی۔ ان پر

قدامت پرست ملاؤں کا ایسا غلبہ تھا کہ وہ انگریزی زبان کا سیکھنا پڑھنا اور مغربی علم و ہنر کو حاصل کرنا عیب ہی نہیں "گناہ عظیم" تصور کرتے تھے۔ ان تمام مشکلات کے باوجود حسن علی آفندی رح نے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ انہیں بھی ابتدا میں ویسے ہی حالات سے گزرنا پڑا جن سے کہیں زیادہ وسیع پیمانہ پر سر سید احمد خانؒ کو گزرنا پڑا تھا۔ لیکن آخر کار انہیں اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی اور سر سید احمد خانؒ کے نقش قدم پر چل کر انہوں نے ۱۸۸۴ء میں "سندھ محمڈن ایسوسی ایشن" قائم کی۔ پھر سندھ میں مسلمانوں کو تعلیمی سہولتیں مہیا کرنے کی غرض سے "سندھ مدرسہ بورڈ" کی تشکیل کی جس میں یہ تجویز منظور کی گئی کہ ایک ایسا اسکول قائم کیا جائے جس میں دینی و دنیاوی دونوں کی تعلیم کا انتظام ہو۔

سندھ مدرسہ بورڈ کا قیام ایک روشن مستقبل کی علامت تھی۔ صوبہ سندھ میں یہ اپنی طرز کا اولین ادارہ تھا جس کے پہلے صدر خود خان بہادر تھے۔ ان کے علاوہ بورڈ کے بارہ "۱۲" اراکین تھے۔ اس طرح یہ بورڈ تیرہ "۱۳" افراد پر مشتمل تھا۔ اس کے قیام کے بعد خان بہادر علی گڑھ تشریف لے گئے اور واپسی پر مدرسہ قائم کرنے کی اسکیم پر پوری توجہ دینا شروع کر دی۔ اس اہم کام کے لئے کثیر رقم کی ضرورت تھی۔ مدرسہ کی عمارت تعمیر کرنے کے لئے، استاد فراہم کرنے کے لئے، ضروری ساز و سامان مہیا کرنے کے لئے۔ مگر انہوں نے ہمت نہ ہاری اور حصول مقصد کے لئے برابر انتھک کوشش کرتے تھے۔ بڑے بڑے جاگیرداروں اور لوگوں سے اپیل کرنے کے باوجود ناکامی ہوئی۔ اس نازک موقع پر نظام حیدرآباد اور نواب جوناگڑھ نے فراخدلی سے کام لیا۔ اور دونوں کی فوری امداد نے تھوڑی بہت راہ ہموار کر دی۔ نظام دکن نے چار ہزار روپے اور نواب جوناگڑھ نے دس ہزار روپیہ دیئے تو اسکول کے آغاز کی صورت پیدا ہوئی۔ چنانچہ سندھ مدرسہ بورڈ نے بولٹن مارکیٹ کے مشرق میں میریٹ روڈ پر ایک عمارت، جس میں اب پرنسس ہوٹل ہے، کرایہ پر لی۔

اس کے باوجود ان طالب علموں کی رہائش کا انتظام باقی تھا جو صوبہ کے دور دراز علاقوں سے تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ ایک دن جب خان بہادر کچہری سے گھر واپس آ رہے تھے تو "سرائے قافلہ" کے سامنے سے ان کا گزر ہوا جو فریئر روڈ پر موجودہ ریلوے اسٹیشن کے شمال میں واقع تھی۔ انہوں نے دیکھا اس کے عالی شان دروازہ کی چوٹی پر چاند تارہ کھدا ہوا ہے۔ چاند تارے کی کشش کچھ ایسی تھی کہ وہ چند لمحے رک گئے اور اس جگہ کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ عمارت طالب علموں کی رہائش کے لئے بہت موزوں ہوگی۔ چنانچہ بڑی دوڑ دھوپ کے بعد انہوں نے میونسپلٹی کے حکام، مسٹر جیمز گرانٹ اور انجینئر جیمز سٹریچن سے اس سرائے کی عمارت ۷۵ روپے ماہوار کرایہ پر حاصل کر لی۔ "سرائے قافلہ" اس علاقے میں بڑی اہمیت رکھتی تھی جہاں برسوں سے بیرونی تاجر اور مسافر آکر ٹھہرا کرتے تھے۔ اس کے وسیع اور عریض گوداموں میں انواع و اقسام کا سامان رکھا جاتا تھا اور اندرون ملک میں بیرونی اشیا کو پھیلایا جاتا تھا۔ ریل نکل آنے پر یہ جگہ بالکل اجڑ گئی تھی۔ اس کی مرکزی حیثیت ختم ہو گئی تھی اور یہ خالی پڑی رہتی تھی۔ جب سندھ مدرسہ بورڈ نے اسے کرایہ پر لے لیا تو اس کا عالم ہی بدل گیا۔ وہ سرائے کی بجائے طالبعلموں کی جائے رہائش بن گئی۔ اور اس کا ستارہ پوری طرح چمک اٹھا۔

اس کام سے فرصت پانے کے بعد استادوں کا مسئلہ پیش آیا جو سب سے زیادہ کٹھن تھا۔ اچھے اور پڑھے لکھے مسلمان استادوں کا سارے صوبے میں جیسے قحط تھا اور یہ مسئلہ مدرسہ کے بانی کے لئے درد سر بن چکا تھا۔ لیکن اس کی جوہر شناس نگاہوں نے دور دراز سے اچھے استادوں کو تلاش کر کے جمع کیا اور ان جملہ مراحل کو طے کرنے کے بعد ۱۳ اگست ۱۸۸۵ء کو اسکول کی عمارت میں ایک اجتماع ہوا جس میں صرف ۳۷ افراد تھے۔ اس مبارک تقریب پر حسن علی آفندی نے مغربی تعلیم اور جدید سائنسی اور علمی رجحانات پر ایک بصیرت افروز تقریر کی۔ یہ ان کی پہلی تقریر تھی جو تاریخی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ سیاسی حیثیت سے بھی بڑی اہم تھی۔ اس کے بعد جامعۂ پنجاب کے ایک ڈبل گریجویٹ، مسٹر عمر الدین کو مدرسہ کا پرنسپل مقرر کرنے کا اعلان کیا گیا۔ اس طرح ملت اسلامیہ کی یہ جدید درسگاہ ریگزار سندھ میں ظہور پذیر ہوئی۔ بانیٔ مدرسہ کے فرزند خان بہادر ولی محمد حسن مرحوم کے دس سالہ عہد میں اس نے حیرت انگیز ترقی کی۔ اور اس کی بنیادیں مضبوط سے مضبوط تر ہو گئیں۔ ولی محمد حسن کے ہونہار شاگردوں میں قائد اعظم محمد علی جناحؒ بھی تھے جنہیں ان کی وفات پر بے حد صدمہ ہوا۔ اسی درسگاہ سے نہ جانے کتنے طالب علم فیضاب ہوئے جن میں سر شاہنواز بھٹو، اے۔ کے بروہی اور شمس العلماء ڈاکٹر داؤد پوتا مرحوم کے نام سر فہرست ہیں جو بلا لحاظ اس درسگاہ کے آخری سب سے بڑے معمار شمار کئے جاتے ہیں۔ ۱۸۹۷ء کی ابتدا میں خان بہادر قادر داد خاں نے خیرپور دربار سے پانچ ہزار روپے اس شرط پر منظور کرائے کہ مدرسہ کا پرنسپل برطانوی باشندہ ہو۔ اس شرط کے مطابق سر پرسی ہائیڈ، جو آکسفورڈ کے گریجوئیٹ تھے، اس عہدے پر مقرر کئے گئے۔ یہ وہی صاحب تھے جنہوں نے تالپوری خاندان کے

نوجوانوں کے لئے تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا۔ تالپور ہاؤس (پرنسپل کا بنگلہ) اس کے لئے وقف تھا۔ ان کے بعد پروفیسر وائنز کے عہد میں اور بھی خوشگوار تبدیلیاں ہوئیں۔ یعنی "سردار ہاؤس" "حسن علی ہاؤس" اور "خیر پور ہاؤس" تعمیر ہوئے اولڈ بوائز ایسوسی ایشن قائم ہوئی۔ مدرسہ کا ایک جریدہ "سندھ مدرسہ کرانیکل" کے نام سے جاری ہوا علمی مباحثہ کی سوسائٹی ڈیوٹی شاپ، حسن علی کلب، تالپور کلب اور وائنز یونین کلب بنائی گئی منگل اور جمعرات کے دن" بورڈنگ ہاؤس ڈرل" کا انتظام کیا گیا۔ کمشنر سندھ اور کلکٹر کراچی کے توسط سے مسٹر وائنز نے مدرسہ کے معیار کو اتنا بلند کر دیا کہ اس کے فارغ التحصیل طالب علموں کو سرکاری ملازمتوں میں ترجیح دی جانے لگی۔

پروفیسر وائنز کے زمانے میں" سندھ مدرسہ" سارے صوبے میں بہت مقبول ہو چکا تھا اور بعد آنے والے لوگوں کے لئے راہیں ہموار ہو چکی تھیں شمس العلماء ڈاکٹر پوٹا کے زمانے میں طالب علموں کی تعداد ساڑھے چار سو تک پہنچ گئی تھی ۱۹۲۹ء میں میٹرک کے ۲۷ طلباء میں سے ۲۳ کامیاب ہوئے مدرسہ کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا۔ جب ان کامیاب طلباء میں سے ایک کو" فرینک سوٹرز" کا وظیفہ بھی ملا۔

سندھ مدرسہ کی اس تاریخ کو اپنے ذہن میں لئے ہوئے جب میں بس سے اترا تو بارش تھم چکی تھی۔ میرے سامنے وہی کماندار دروازہ تھا جس پر آج بھی چاند تارا اسی طرح منقش ہے۔ اور یہ الفاظ بھی انگریزی میں درج ہیں:

ENTER TO LEARN GO FORTH TO SERVE

"ملّت اسلامیہ کا یہ نشان آج بھی تاریخی عظمتوں کی یاد تازہ کرتا ہے"۔ میں نے دل میں کہا اور اس تاریخی سرائے کے دروازے سے اندر داخل ہو کر وسیع و عریض میدان میں قدم رکھا جس کے شمال مشرق میں پچھلی صدی کی دو منزلہ عمارت (بورڈنگ ہاؤس) کھڑی تھی، اور مغربی گوشے کے اس وسیع میدان میں جہاں کبھی "سرائے قافلہ" میں ٹھہرنے والے مسافروں کے اونٹ اور گاڑیاں کھڑی رہا کرتی تھیں۔ گاڑی بان رات کے سحر آگیں سکوت میں سندھی کافیاں اور ملہاریں سنایا کرتے تھے۔ یا اپنے سفر کے عجیب قصے بیان کرتے تھے۔ ملت اسلامی کی شاندار درس گاہ "سندھ مدرسہ" کی دو منزلہ عمارت کھڑی عظمت رفتہ کی یاد دلا رہی تھی۔

میں ٹہلتا ہوا اس عمارت کی پشت پر جا پہنچا جہاں نیم کے گھنے درخت کھڑے ہیں اور عمارت کے دائیں بائیں دو مسجدیں بنی ہیں۔ سرسری نظر سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا پچھلے راستہ سے مدرسہ کے اندر داخل ہوا جس کے چھوٹے سے مربع صحن میں مخملیں سبزہ بچھا ہوا تھا۔ کیاریوں میں شگفتہ رنگ برنگ پھولوں کے پودے مسکرا رہے تھے۔ بارش سے سبزے اور پھولوں کا حسن زیادہ پُر کشش ہو گیا تھا۔ اس وقت اتنے حصہ میں ایک پُر معنی سکوت طاری تھا نیچے کے بڑے بڑے وسیع دالانوں میں بھی وہی خاموشی تھی۔ چند کمروں کے دروازے مقفل تھے۔ اگر کوئی شے اس وقت متحرک تھی تو وہ دلفریب صحن کا فوارہ تھا جو پانی کے لچھے بنا بنا کے اُچھال رہا تھا ـــــ یا صحن کے دونوں مغربی کونوں میں پام کے سربلند درخت جن کی چھتریوں پر جھونکے ناچ رہے تھے۔ میں اس پُر سکوت ماحول میں کھڑا اس یادگار عمارت کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر اس کے وسیع و عریض دالانوں کا چکر کاٹ کر جنوبی دالانوں میں داخل ہوا جو سُونا پڑا تھا۔ اس کے نصف حصہ میں سائنسی آلات میزوں پر رکھے ہوئے تھے۔ دوسرے حصے میں آرٹ سیکشن تھا۔ جہاں استاد کی میز اور کرسی رکھی ہوئی تھی۔ اس کے پیچھے دیوار میں ایک کتبہ پر" جوناگڑھ ہال" تحریر تھا۔ نیچے اس حصے کی چاروں سمتوں میں چھ بڑے بڑے کلاس روم بنے ہوئے ہیں۔ میں ان خاموش کمروں میں جھانکتا ہوا مغرب کے جنوبی زینہ کی طرف نکل آیا جو اوپر کی منزل کو جاتا ہے۔

پہلا زینہ چڑھتے ہی مدرسہ کے بنیادی پتھر پر نظر پڑی۔ جسے ۱۴ نومبر ۱۸۸۷ء میں وائسرائے لارڈ ڈفرن نے نصب کیا تھا اس عمارت کی تکمیل سنہ ۱۸۹۰ء میں ہوئی تھی۔ اور اس پر ایک لاکھ نوے ہزار ایک سو اٹھاسی روپے ساڑھے دس آنے خرچ ہوئے تھے۔ اب میں دوسرا زینہ طے کر کے اوپر کی منزل پر پہنچا۔ وہی ایک ہی طرز کے چھ چھ کمرے، زینہ ختم ہوتے ہی الٹے ہاتھ پر ریڈنگ روم اور مدرسہ کا دفتر۔ سیدھے ہاتھ پر پرنسپل کا کمرہ۔ میں نے اوپر کی چاروں اطراف کا چکر کاٹا۔ مشرقی سمت کے کمروں میں کلاسیں جاری تھیں اور وہ لڑکے پڑھ رہے تھے جنہیں آگے چل کر تقدیر ملت کو سنوارنا ہے۔ اپنے وقت کے حسن علی آفندی، داؤد پوتہ وغیرہ۔ دیکھتے ہی پاکستان کے مستقبل کا سماں

آنکھوں میں پھر گیا۔ اسی خوشگوار تصور کو دل میں لئے شمالی زینے سے نیچے اترا اور جنوب میں پرنسپل کے بنگلے کے سامنے سے گزرتا ہوا پھر سرائے قافلہ والے میدان میں نکل آیا۔ جہاں اب چار بورڈنگ ہاؤس ہیں۔ "سردار ہاؤس" جسے سردار یعقوب خاں نے بنوایا تھا۔ "خیرپور ہاؤس" جو شیخ محمد ابراہیم کی یادگار ہے۔ جنوب میں "تالپور ہاؤس" جہاں کسی زمانے میں تالپور رئیس زادے طالب علمی کے دوران رہا کرتے تھے اور حسن علی ہاؤس ان عمارتوں کے علاوہ سینی ٹوریم کی عمارت بھی نظر آئی جسے اولڈ بوائز نے چندے سے تعمیر کرایا تھا۔ اس فضا میں مجھے چلتے پھرتے یوں لگتا تھا جیسے میں ایک پُراسرار فضا میں گھوم رہا ہوں اور اِدھر اُدھر چلتے پھرتے طلباء سے وہ منظر نگاہوں میں پھر گیا جب ہمارے قائداعظمؒ ایک طالب کی حیثیت سے اس درس گاہ میں چلا پھرا کرتے تھے۔ وہ "مادرِ علمی" جسے انہوں نے مرتے دم بھی فراموش نہ کیا اور اپنی وصیت میں اس کے لئے اپنی جائداد کا ایک وسیع حصہ نامزد کیا۔ اور سچ پوچھا جائے تو اب جب کہ جامعہ علی گڑھ ان کے ورثہ کی حقدار نہیں رہی اور پشاور یونیورسٹی نے بھی اپنے حصہ کا مطالبہ نہیں کیا، ان کی یہی محبوب درسگاہ اس تمام ورثے کی حقدار ٹھہرتی ہے۔ ساری کی ساری درس گاہ اپنی ملحقہ عمارتوں کے ساتھ عہدِ رفتہ کی تاریخ کا نقشہ ہی نہیں بلکہ ایک پُرعظمت منظر بھی پیش کر رہی تھی کھیل کے وسیع و عریض میدان میں کھڑے ہو کر جب میں نے پُروقار عمارات کا نظارہ کیا تو میرے کانوں میں ہوا کی ہلکی ہلکی لہروں کے ساتھ جیسے کوئی گنگناتا ہوا گزر گیا:

یہ مدرسہ، یہ ثقافت کا کہنہ سال دیار
ہمارے واسطے اب بھی ہے روشنی کا منار

نجوم و ماہ اسی آسماں سے گزرے ہیں
نہ جانے قافلے کتنے یہاں سے گزرے ہیں

اس انجمن میں عجب اہتمام ملتا ہے
اسی میں قائدِ اعظمؒ کا نام ملتا ہے

نیا شعور یہ دیتا رہے دماغوں کو
روش روش پہ جلاتا رہے چراغوں کو

★

قافلۂ شوق

اسد ملتانی (مرحوم)

(یہ نظم ایک یادگار حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اسد ملتانی مرحوم نے اسکو راولپنڈی جاتے وقت ٹرین میں لکھا تھا۔ افسوس ہے کہ یہ سفرِ شوق ان کا آخری سفر ثابت ہوا!! — مدیر)

پنڈی کی طرف قافلۂ شوق رواں ہے
اس وقت کششِ کافِ کراچی کی کہاں ہے

دِل اِک نئے ماحول کی جانب ہے گریزاں
گو فرقتِ احباب طبیعت پہ گراں ہے

کہسار کے دامن میں ہے اک وادیٔ سرسبز
فطرت کے مناظر سے سرورِ دل و جاں ہے

گرمی میں عجب کیا ہے جو دِلّی کی جھلک ہو
کچھ موسمِ سرما میں تو شملے کا سماں ہے

ہر چند کہ یہ شہر رہا فوج کا مسکن
اس شہر سے رنگِ مدنیت بھی عیاں ہے

اغیار کی تقلید پہ نازاں ہیں مسلماں
اور نقل ترقی پہ ترقی کا گماں ہے

مسلم کا جہاں ہم پہ عیاں ہو نہیں سکتا
جب تک کہ نگاہوں میں جہانِ دگراں ہے

ادبی مسائل :

موضوع زیرِ بحث: پاکستانی ادب کی تشکیل

وحید الحسن ہاشمی

یہ مقالہ محض آپ کے نوٹ کی وجہ سے روانہ کر رہا ہوں۔ عالی صاحب نے اپنے مضمون میں چند خاموش ادیبوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اسی سے متاثر ہو کر یہ تحریر لکھی گئی ہے۔ آپ کی آزادیِ فکر سے امید کرتا ہوں کہ اس کی اشاعت میں پس و پیش نہ فرمائیں گے۔

یہ مضمون نامکمل ہے۔ دوسری قسط میں "پاکستانی ادب کے بنیادی تصورات اور اس کے خدوخال" پر بحث ہے۔ (وحید الحسن)

ہماری دعوت خلوص ہی پر مبنی تھی اور ہمیں مسرت ہے کہ آپ اس کو قبول کر کے "خاموش ادیبوں" کے زمرہ میں شامل نہیں رہے۔

"ماہِ نو" ان سب لوگوں کا رسالہ ہے جو علم و ادب اور قومی و آفاقی مسائل سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور ہر شخص کو سرگرمیٔ عمل کے لئے جولاں گاہ مہیا کرتا ہے۔ تاکہ ہم باہم مل کر اپنے ادب و فن اور فکر و خیال کو ہمدوشِ ثریا کردیں۔ امید ہے یہ توضیح ہمارے دوسرے "خاموش ادیبوں" کو بھی اس کام میں شریک ہونے کی دعوت دے گی۔ (مدیر)

یہ بات اب مقولہ کی حد تک پہنچ گئی ہے کہ اگر کسی ملک کا ارتقاء، اس کی سوسائٹی کی حالت، اس کے رہنے سہنے والوں کی زندگی کی نفسیات کی جھلک دیکھنی ہو تو اس ملک کے ادب پر ایک سرسری سی نگاہ ڈالنی چاہیئے۔ اسی اچٹتی ہوئی نگاہ میں اس ملک کی تمام کیفیتیں، قوم کے تمام احساسات اور ملت کے تمام جذبات سمٹ کر سامنے آجائیں گے۔ اگر یہ مقولہ دنیا کے بیشتر ممالک پر صادق آتا ہے تو پاکستان کی ثقافتی، مذہبی اور سیاسی قدروں کو اسی ملک کے ادب سے کیوں نہ پرکھا جائے؟

اگر ہم اپنے چند سالہ ادب پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ بارہ سال کے عرصہ میں پاکستان کن کن راہوں سے گزرا، اسے کن کن مسائل سے دوچار ہونا پڑا، اس کے داخلی و خارجی حالات کیا تھے اور اس سے بڑھ کر پاکستانیوں نے کس صبر و تحمل اور با اختیار مجبوری سے یہ دن کاٹے، انہوں نے کن کن مصائب کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا اور ایسے وقت میں جب اپنے پرائے سب بیگانے ہو گئے تھے، بھائیوں بھائیوں کی لوٹ کھسوٹ، زر اندوزی، آرام طلبی اور زیادہ نفع کی توقع ایسے مسائل تھے جن کا صحیح خاکہ ہمارے ادب میں مل سکتا ہے۔ منٹو کے افسانے ہوں یا ایم اسلم کے ناول، شیر افضل کی غزلیں ہوں یا مجید لاہوری کے طنزیہ مضامین، ان سب کا ایک ہی رخ، ایک ہی مقصد تھا۔ معاشرے کی صحیح عکاسی۔ اور اس میں کلام نہیں کہ ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے وقت کی صحیح عکاسی اور زمانے کی ہو بہو تصویر ہمارے سامنے پیش کردی۔ اب جب کوئی نقاد یہ سوال اٹھاتا ہے کہ پاکستانی ادب کیا ہے؟ آیا پاکستانی ادب ہے بھی کچھ یا نہیں؟ کیا ادب مقصدی ہوتا ہے اور اگر پاکستانی ادب مقصدی ہے تو اس کا مقصد کیا ہے؟ تو انسان حیران رہ جاتا ہے۔ اور جب ہمیں ان سوالات کا تسلی بخش جواب نہیں ملتا تو ہم مایوس سے ہو جاتے ہیں۔ اور اپنے کھرے سکے کو بھی کھوٹا سمجھ کر اپنی ہی قوم اور اپنے ہی ملک کو کوسنے لگتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ جب کوئی اردو شعر پنجابی، بنگالی، اودھی اور دکنی نہیں ہوتا تو آپ ادب پر ہندوستانی اور پاکستانی، مشرقی اور مغربی کی چھاپ کیوں لگانے کے خواہاں ہیں؟ کیا ادب ایسی چیز ہے جس پر چھاپ لگائی جا سکتی ہے؟ کیا ادب اور انسانیت ایک ہی تصویر کے دو رُخ نہیں؟ کیا ادب اور تاریخ کی ارتقائی منازل ایک ہی

پھول کے دو نام نہیں؛ کیا ادب اور فطرت ایک ہی ہیرے کے دو ترشے ہوئے پہلو نہیں۔ پھر آپ ادب کو مکان کی حدود میں مقید کیوں کرتے ہیں؟ اگر آپ کا مقصد تہذیبی ارتقا اور مختلف زبانوں کے عروج و زوال سے ہے تو پاکستانی ادب کا تصور بغیر اسلامی حیات کے قابلِ التفات نہیں ہوسکتا۔ اس کی معمولی سی مثال اردو زبان کی ترویج و ترقی ہے۔ اگرچہ اردو ادب ہندوستان ہی میں پھلا پھولا اور اسی کی فضا میں پروان چڑھا۔ لیکن معنوی حیثیت سے یہ ہندوستانی مسلمانوں کی ثقافت کا آئینہ ہے جس میں ملکی خصوصیات کے ساتھ ساتھ اسلامی تصورات رچے بسے ہوئے ہیں۔ اردو کی اسی معنوی وقعت کے سبب ایک گروہ خائف ہوا اور اس نے اب ہندوستان میں جس مقصدی ادب کا پرچار شروع کیا ہے، وہ دراصل اردو دشمنی کا نتیجہ نہیں بلکہ اسلامی تخیلات کا ردِ عمل ہے۔

اگر ہم پاکستانی ادب کی تشکیل چاہتے ہیں تو ہمارے لئے پاکستان کی تشکیل کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ تاریخی اعتبار سے پاکستان کا قیام اقلیت ہونے کے سبب مسلمانوں کی زیردستی اور سیاسی و معاشی زبوں حالی کے باعث زیادہ اور مذہبی سبب سے کم عمل میں آیا۔ یہی وجہ ہے کہ نسیم حجازی اور اسی قسم کے دیگر لکھنے والوں کو چھوڑ کر پاکستانی ادب کا کل سرمایہ سیاسیات اور معاشیات پر مبنی ہے۔ اس عنوان کے تحت فسادات، ہجرت، تجارت، رشوت، غمِ روزگار، اعزہ کا غم اور نتیجہ میں کائنات کا غم، غرض زندگی کی مکمل تصویر ہمارے ادب میں ملتی ہے۔ لیکن حقیقت میں ہم اسے ادب کم تاثر زیادہ کہیں گے۔ اور پھر پاکستانی ادب کی جدید اصطلاح تو اس ادب کے ساتھ اور مضحکہ خیز ہے۔ کیونکہ ادب اس قدر سستا اور سطحی نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی بنیاد مستقل مسائلِ حیات پر ہوتی ہے۔ وہ جذبات و احساسات کے ان پہلوؤں کی ترجمانی کرتا ہے جو مستقل اور دیرپا ہوتے ہیں۔ ادب حسن کی جھلک نہیں بلکہ خود حسن ہے۔ وہ پھول کی خوشبو نہیں بلکہ خود پھول ہے۔ ہنگامی حالات اور وقتی سیلاب کے تاثرات کا بیان، ادب کی منزل کی طرف رہنمائی تو ہے لیکن ادب نہیں۔ زندگی کا ایک مکمل نظام، حسیات کی ایک جاودانی کیفیت، فطرت کی آغوش میں پلا ہوا انسانی ارتقا کا راز، اور زمین و زماں کا پائیدار، جاندار اور باکار تصور، ادب کی روح ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے فانی ہے اور ادب غیر فانی ہے۔

پاکستانی ادب کی تشکیل کے سلسلے میں ہم زندگی کے ان سوتوں کو فراموش کر دیتے ہیں اور کھوکھلے[1] نعروں کی پیدا کردہ تخلیق کو ادب سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنے عمل اور کردار کا محاسبہ کریں۔ اگر ہم عملی اور علمی دنیا میں سرخرو ہوسکتے ہیں تو وہی عکس ہمارا ادب پیش کرے گا، وہی پرتو ہمارے شعروں پر پڑے گا۔ اور وہی جمال ہماری طرزِ تحریر سے نمایاں ہوگا۔

اس سلسلے میں ایک مشکل اور بھی ہے۔ ہم نے انگریزوں کی تقلیدی قومیت کا ہیولیٰ اور اس کا خمیر وطنیت سے تیار کیا ہے لیکن اسلامی تصورِ حیات میں وطنیت کو اضافی درجہ دیا گیا ہے اور قوم کی تشکیل مذہب سے کی گئی ہے۔ بعض ادیبوں کا خیال ہے کہ پاکستان کی بقا مذہب سے وابستہ ہے۔ اس لئے پاکستانی ادب ہی اسلامی اسپرٹ اور ایمانی شعور کا پرتو ہونا چاہیئے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مغربی پاکستان میں اردو ادب اور مشرقی پاکستان میں بنگلہ ادب ممکن ہے ہندوستانی اردو اور بنگالی ادب سے صورت میں مشابہ نہ ہو لیکن سیرت میں دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ مذہبی عقائد کے اعتبار سے دونوں مقامات کے لوگ ہم خیال ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عباس حسین، کرشن چندر، خواجہ عباس، اور بیدی پاکستان میں اتنے ہی معروف ہیں جتنے ممتاز حسن، ندیم اور انتظار حسین۔ اسی طرح جگر، شفیق، فراق، منظر، سردار اور دیگر شعرا پاکستان میں اسی قدر عزت و احترام سے دیکھے جاتے ہیں جس قدر عدم، احسان، عابد تبسم اور فیض۔

اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے مندرجہ بالا تصورِ زندگی

---

[1] : اس سلسلے میں آذر کا وہ افسانہ ملاحظہ ہو جو اسی شمارہ میں شائع ہوا ہے۔ (مدیر)

سے قطع نظر کرلیں اور پاکستانی قوم کی بنیاد وطنیت ہی پر تسلیم کریں تو بھی صورت حالات میں کسی تبدیلی کا امکان نہیں۔ ادیب ہو یا شاعر اپنے ماحول سے متاثر ضرور ہوگا کل تک شاعر درباری قصیدے لکھ کر انعام و اکرام پاتا تھا، آج وہ جنگی ترانے گا گا کر پاکستانی ادب کا سب سے بڑا خیر خواہ نظر آئے گا۔ لیکن نہ کل کا درباری ادب ادب تھا نہ آج کا جنگی ادب ادب۔

ہمارے بعض نوجوان نقادوں کا خیال ہے کہ وہ شاعر یا ادیب جن کا شعور دور آزادی سے پہلے ہی پختہ ہوچکا تھا، اب ان سے پاکستانی ادب کے تشکیل کی امید لاحاصل ہے کیونکہ ان کی نظر محدود اور خیالات کی دنیا مخصوص ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں اغیار کی نظر سے اور جو کچھ سوچتے ہیں بیرونی محرکات کے ذریعہ۔ وہ ایک ایسے دریا کی مانند ہیں جس میں روانی تو ہے سیلاب نہیں، بہاؤ تو ہے تڑپ نہیں، کشادگی تو ہے جذبات کی ہلچل اور تجسس کا طوفان نہیں۔ وہ گلستان سے بہار کے جانے کا تو ماتم کر لیتے ہیں لیکن بہار کی تلاش نہیں کرسکتے۔ اس کے برعکس پاکستانی نوجوان ادیب موسم بہار کی رخصت پہ گریاں نہیں ہوتا بلکہ اپنے عزم و استقلال سے بہار کو پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے ؎

فسردہ ہونے سے حاصل چلو تلاش کریں
کہیں تو ہوں گی بہاریں جو گلستاں میں نہیں (شہرت)

لیکن ایک فن کار کا دوسرے فن کاروں کو یوں نام دینا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اگر اس کی مراد اس شعر سے یہ ہے کہ ایسے خیالات صرف نوجوان پاکستانی شعرا ہی کے ہوسکتے ہیں، تو یہ اس کی خام خیالی ہے۔

مجھے ۴۸ء میں ایک ضعیف مہاجر سے کراچی میں ملنے کا اتفاق ہوا جس کا تمام اثاثہ جل کر خاک ہوگیا تھا۔ جب میں نے افسوس کرتے ہوئے ان سے کہا کہ قبلہ آپ کا تو بڑا نقصان ہوا۔ سارا گھر ہی راکھ کا ڈھیر ہوگیا تو وہ نہایت مطمئن اور تیقن بھرے لہجہ میں بولے ؎

بلا سے جلا آشیانہ ہمارا
چمن میں تو چاروں طرف روشنی ہے

یہ ضبط، یہ اطمینان، یہ اظہار خوشی اور یہ ایثار کا جذبہ مجھے آج تک نہیں بھولتا۔

یہ حقیقت ہے کہ کچھ پاکستانی نوجوانوں نے اس منزل کی طرف قدم بڑھایا ہے اور ان کا یہ اخلاص حوصلہ افزائی کے لائق ہے۔ ہمیں پختہ یقین ہے کہ ان کے ہاتھوں پاکستانی ادب کی تشکیل اور پاکستان کا استحکام سرانجام پائے گا۔

ایک مشکل یہ بھی ہے کہ گو پاکستان کی انتظامی مشینری ایک ہے لیکن بعض رہن سہن کے امور میں قدرتی طور پر کچھ فرق ہے۔ ان حالات میں ایک متجانس اور جامع قسم کے پاکستانی ادب کی تشکیل میں کچھ رکاوٹیں ہیں۔ لیکن یہ کوئی فکر کی بات نہیں۔ جب ضمیر انسانی بیدار ہوجاتا ہے تو قوم اور قومی ادب کی تشکیل کے راستے خود بخود کھل جاتے ہیں۔ ضرورت بحثوں میں الجھنے کی نہیں بلکہ نظریاتی اتحاد اور یکجہتی کی ہے۔ چنانچہ اسی کی بدولت ہمارے کتنے ہی فرق دور ہوچکے ہیں اور دونوں حصوں کی ظاہری و باطنی زندگی قریب سے قریب تر ہوتی چلی جارہی ہے۔

آخر میں عالی صاحب کے اس جملے پر بحث کرنا چاہتا ہوں کہ "اچھا ادب لازماً مقصدی ہوتا ہے اور اس سے مراد انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی مسرت ہے"۔ اول تو مقصدی ادب خود محتاج تعارف ہے کیونکہ مقصدی ادب ناسخ۔ رجب علی۔ اور نسیم تو پیدا کرسکتا ہے۔ آتش، میر امن اور میر حسن پیدا کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔

دوسرے زندگی محض مسرت کا نام نہیں۔ مسرت کوشی درحقیقت زندگی کے حقائق سے گریز اور لطف حیات سے فرار ہے۔ اگر زندگی فقط ہنسی خوشی اور قہقہوں سے عبارت ہوتی تو ملٹن "پیراڈائز لاسٹ" نہ لکھتا، فردوسی کا شاہنامہ، انیس کے مراثی، اور شیکسپیر کا "ہملٹ" نہ مقصدی ادب ہیں نہ انسانی مسرت، اور قہقہوں کی تصویر، بلکہ ان میں زندگی کا چلن اور دل کی دھڑکن دونوں ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ شاعر یا ادیب کسی ایک جذبے سے انسانیت کی کتنی خدمت کرسکتا ہے۔ لہذا نصب العین خدمت ہے نہ کہ مسرت۔

آج روزِ وصال فانی ہے
موت سے ہو رہے ہیں راز و نیاز

پنچم کے بعد

(الاپ)

جعفر طاہر

ہفت آہنگ، ہفت کشور، ایک ہی مضمون ہے۔ "چہار درویش" کے بعد ہمارا مغنی آتش نفس سات اور کشوروں کے نغمے ترتیب دے رہا ہے — صد سرگم، سمپورن۔ یہ نغمہ کشورِ ششم کا ابتدائیہ ہے جس کا روپ انوپ ہم میں سے کس کے ذہن میں رچا بسا ہوا نہیں؟ اس الاپ میں مغربی پاکستان کے البیلے کوی نے سندر بن کے سندر دیس کا سماں اسی کی سندرتا میں کھینچا ہے۔ (مدیر)

اف! یہ گمکارتی گھنگھور گھٹائیں کاری
بال بکھرائے ہوئے برہ کی ماری ساری
آج رنواس کے سب توڑ کے بندھن نکلیں
پدمنی رانیاں بن بن کے برو گن نکلیں
گوپیاں گنگا کنارے یہ دوارے دوارے
ناچتی پائلوں کی دھن یہ بلاتی ہیں کسے؟
ڈھونڈتی پھرتی ہیں کس شیام کو سندر بن میں؟
چہچہاتے ہوئے روحوں کے پکھیرو، پنچھی
اپسراؤں کے ٹھکانے کہیں چھتنا روں میں
روپ کی دھوپ، یہ پرکاش، انوکھا پرتاپ
رینگتے ناگ، جواں شیر، یہ وحشی چیتے!
سر جھکائے ہوئے ہاتھی کہیں پانی پیتے
زندگی موت کے سائے میں ہنسے جاتی ہے
سیگوں ندیاں، پھولوں سے مہکتی جھیلیں
نیل سر، قاز، بطیں، ہنس، ہزاروں سرخاب
سندری بن ہے جو دیکھو تو ندھوبن کا جواب
یہ گرجتا، یہ اڈتا، یہ برستا بادل!
دامنی[1] جیسے کوئی چلبلی، الھڑ ناری
تیلیاں توڑ کے چلمن کی ہنسے جاتی ہو
آج تو میگھ پتی اور طرح ہی برسے
نہ کوئی پیت کا مارا ترسے

[1] بجلی (بنگلا)

ہائے سالی[1] کا نے آنکھوں میں لگایا کاجل
مد بھرے نینوں کی رہ رہ کے چھلکتی مدرا
قہقہے، گیت، خوشی، رنگ، کویتا، آہا!
ناچتے پیڑ، ہرے کنج، مہکتے رمنے
کھوئی کھوئی ہوئی خوابوں میں یہ سرشار زمیں
کوئی البیلا گوری دیکھ رہا ہو سپنے
میری دھرتی تو بنی بیٹھی ہے دلہن جس کو
بیاہنے آیا ہے ساون کا رنگیلا راجہ
رنگ میں ڈوب کے آئے ہیں براتی سارے
مونگئے صافے لپیٹے ہیں سروں سے بادر[2]
شبز ڈولی[3] کوئی کاندھے لیا[4] جائے دیکھو
پیچھے پیچھے کوئی دیتا چلا جاتا ہے دھنی[5]
"بولو مومن اللہ اکبر
بولو مومن اللہ اکبر
بولو مومن یا نبیؐ، اللہ اکبر
یا رسول اللہ!"
جھومتے جھنڈ، حسیں کنڈ، طلسمی باغات
یہ جزیرے، یہ چشم زار[6]، کنول پریوں کے
پھول بن ہائے، یہ استھان سجل پریوں کے
سانوری، گوری، سگن روپ، سناری ساری

سبز کیلوں سے گزر اب تو ابھرنے لگا چاند
جاگ جاگ اٹھی ہیں سرگوشیاں ارمانوں کی
کنمنانے لگیں وہ چاہتیں، پل پل، چھن چھن
کھول کر اپنی برس گانٹھ کوئی برہا گی
مغلئی دور کے کھنڈرات میں ہے آ بیٹھی
تھام کر ایک ستوں ٹوٹ کے گانے لاگی:

"نشیتھے جائیو، پھولو بنے ہے بھومرا
نشیتھے جائیو پھولو بنے
جالائے چندیر دباتی
جیگے رودرشاراراتی گو
رات کی چپ میں پھول بن ملیو رے بھومرے
رات کی چپ میں پھول بن آئیو رے.....
چندا کا دیپ جلا کے رکھوں
ساری رات رو رو کاٹوں

[1] سالی (بنگلا)
[2] بادل
[3] سبز ڈولی [4] لیا جائے (بنگلا)
[5] مشرقی پاکستان میں دھنی یعنی برات میں ایک نقیب یہ آواز بلند پکارتا جاتا ہے ویسے باجے گاجے حرام تصور کئے جاتے ہیں۔
[6] میرے نزدیک یہ ترکیب جائز ہے۔ (کوی)
اب یہ روشِ خاص شاید عام ہو جائے (مدیر)

کوئیبو کتھا شیشر وشتے ، ہے بھومرا
جودی داگھائے پوڑی
شیپنیر و پتھ دھوری گو
نیر لو چڑنے جائیو ـــ ہے بھومرا
نیشتھے جائیو پھولو بنے ، ہے بھومرا
تو مارگان جنیو بھانگے نا
امار گھوم جنیو بھانگے نا
ڈالیر گھوم جنیو بھانگے نا
نیشتھے جائیو پھولو بنے ،

ہے بھومرا
نیشتھے جائیو پھولو بنے "

گرتی اوس کی بوندیاں ـــ اپنا دکھڑا ان کو سناؤں
یَد ے مجھے نیند آجائے اور میں
سپنوں کے پگ پہ بڑھتی جاؤں
تو دبے پاؤں آکے ملیو رے بھومرے
پھول بن میں چپ چاپ رات میں
تیری تانوں کا تانتا نہ بند ہو
میری نندیا اچاٹ ہو نہ بھومرے
پھولوں کی انکھڑیاں بھی کھلنے نہ پائیں
ٹہنیاں سوکھی سوکھی جاگ ناہیں جائیں
بس ہنسی گھات سے سُونی رات میں
پھول بن میں ملنے آئیو رے بھومرے) *

---

* ترجمہ، ادارہ

تھم گیا شور مچاتا ہوا بَنگپ ساگر[1]
پنکھ پھیلائے ہوئے پریوں کے جی، ڈول گئے
چاند چپ چاپ کھڑا سُنتا رہا ، روتا رہا
اور ایسے میں کہیں دُور کنارِ دریا
نوجواں مانجھی نے فرقت کا گلہ چھیڑ دیا
یہ لرزتے ہوئے، بڑھتے ہوئے غم کے سائے
ہائے یہ بنسری کی درد میں ڈوبی آواز
گیت کے ساتھ یہ روتی ہوئی جنگل کی ہوا
سانولے سُر میں گِلہ : "پیت کرے نہ کوئے"[2]
جانے کے روز ہوئے گھر سے وہ نِکلا ہوگا
گیت کی لے میں دھڑکتی ہیں کتھائیں کتنی
اشک بھر آئے ، لگا ڈوبنے جی دریا کا

جانے کس باڑی[3] میں رہتی ہے چہیتا اس کی
وہ پدم لوچنی ، گج گامنی ، نٹ کھٹ پیاری
وہ مسکتی ہوئی چولی ، وہ ملائم ساری
ہائے وہ قامتِ موزوں ، وہ سلونا مکھڑا
بانکی چتون ، وہ کنول نین ، مرگیلے[4] مخمور
داستاں داستاں پھیلے ہوئے لانبے گیسو
رات کا جاگتا انگڑائیاں لیتا جادو

[1] خلیج بنگالہ

[2] دوہہ :
گر میں ایسا جانتی پیت کئے دُکھ ہوئے
نگر ڈھنڈورا پیٹتی پریت کرے نہ کوئے

[3] گاؤں

[4] بمعنی قاتل (جھنگ کا مقامی لفظ)

پاؤں رکھتی ہے جہاں پھول برس جاتے ہیں
جوت ماتھے پہ جوانی کی جگاتی بیندی
راستہ مانجھی کو رہ رہ کے دکھاتی بیندی
چپکے چپکے یہ بلاتی بیندی:
"نیّا باندھو رے کنارِ دریا"

اس طرف پدما کی لہریں، وہی بھیگا ہوا جال
الّی سا، تاپلا، روئی، کوئی چنگری کا تل[1]
بھات کس طرح پکائے گی مری حسن آرا
ڈولتے من کی یہ ساتھی، یہ پرانی نوکا[2]

کھو گیا بانسوں کے جنگل میں جواں چاند کہیں
دور پورب میں وہ لو صبح کا تارا چمکا
ناچتی لہروں سے دو پھول سی باہیں ابھریں
اک چکا چوند ہوئی چوڑیاں چمکیں، چھنکیں
سطحِ دریا پہ وہ ہنستا ہوا چہرا ابھرا
ہاتھ پھیلائے تو پتوار کا پھرتا سایا

ہر طرف اب تو انناس کی خوشبو پھیلی
ناریل نیند سے جاگے کہیں کوکل[3] بولی
آرہی ہے کسی باڑی سے اذاں کی آواز
بیڑی سُلگاؤں ذرا کش تو لگاؤں دو چار
جانے سوئی بھی ہے شب بھر کہ نہیں حسن آرا
ہو معجّم[4]! ہو معجّم! ارے بھیّا بھیّا!
ناؤ کا لارے کنارے کہ پڑھیں مل کے نماز
حسن آرا بھی اٹھی ہوگی عبادت کے لئے
تخت پر بیٹھ گئی ہوگی تلاوت کے لئے
اشک آنکھوں میں تو ہونٹوں پہ وہی ایک دعا
جس کو دُہراتے ہوئے کتنے ہی دن بیت گئے:
"اے خدا خیر سے مانجھی مرا اب گھر آئے
اب جو تالاب پہ جاتی ہوں تو جی ڈر جائے
اے خدا ___

[1] یہاں کی مچھلیوں کی مشہور اقسام
[2] کشتی
[3] مشرقی پاکستان کا مرغِ سحر خیز
[4] اے معظم

افسانہ :

کوفی ہاؤس میں دو نقّاد

انور

"ڈیئر خاور

یہ عجیب سا افسانہ ہے۔ اس میں پہلا پیراگراف سات فولسکیپ صفحوں کا ہے اور ہر پیراگراف ایک کردار کی گفتگو۔ پہلا کردار نون سٹوپ بولنے کا عادی ہے۔ اس نے میرے افسانے کو عجیب ہیئت دے دی ہے۔

میرا خیال ہے بڑے نقّاد اس افسانے کو افسانہ کہنے سے احتراز کریں گے۔ لیکن یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ افسانے کی حدود کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اور پھر افسانہ نگار وقت کے مسائل سے متأثر کیوں نہ ہو؟

اچھا!"

"بڑے نقّاد!" —— یہ تو بڑی بات ہوئی۔ تاہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ یہ افسانہ ضرور ہے اور نئے انداز کا۔ بشرطیکہ آپ بھی اسی طرح کافی ہاؤس میں اکیلے نہ رہ جائیں! "خیالات کی آزادی" بہرحال آپ بھی نہیں چھینیں گے۔ (مدیر)

ایک ثبوت تو ہمارے ادب کے زوال کا یہ ہے کہ اس میں غزل دوبارہ زندہ ہوگئی ہے۔ دوسرا ثبوت شرر کے تاریخی ناول کا احیاء ہے۔ ان دونوں ثبوتوں کو تقویت پہنچانے کے لئے علّامہ چِین بجبیں چرپاکوٹی کے کلام کے تازہ مجموعے کا ذکر ضروری ہے جس کا نام انہوں نے "دوڑ پیچھے کی طرف" رکھا ہے۔ یہ گرانقدر تصنیف "دوڑ پیچھے کی طرف" ہمارے زمانے کی ایک نمائندہ تخلیق ہے۔ اس سے یہ نظریہ حتمی طور پر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ ہمارے ادب میں قطعاً جمود نہیں ہے۔ اس میں باقاعدہ حرکت موجود ہے۔ یا شاید یہ بے قاعدہ حرکت ہے۔ یعنی ہمارا ادب آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے کو دوڑ رہا ہے۔ اور ہم ادب کی دوڑ میں ایک سو سال کے ہینڈیکیپ کے ساتھ پیچھے کھڑے کر دئے گئے ہیں، لیکن یہ بڑا گمراہ کن جملہ ہے۔ "پیچھے کھڑے کر دئے گئے ہیں۔" اس پر رجعت پسندی کا الزام لگ سکتا ہے۔ اور اس میں سے جمود کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ حالانکہ علّامہ چِین بجبیں چرپاکوٹی کی غیر فانی تصنیف "دوڑ پیچھے کی طرف" میں جمود کا نام و نشان نہیں۔ اس میں حرکت ہے، بلکہ دوڑ ہے، بلکہ دوڑ دھوپ ہے۔ لیکن آج مجھے ایک اور سطح پر گفتگو کرنی ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ادب میں زوال کے جراثیم پیدا ہو گئے ہیں، ہماری غزل کے اشعار اور ہمارے تاریخی ناول ہمارے ادبی زوال کے جراثیم ہیں جو ہماری زندگی کے ہر شعبے میں سرایت کر گئے ہیں۔ غزل کے جراثیم نہایت مہلک ہیں۔ غزل کے جراثیم جب کسی دفتر میں، جس کی چوکھٹ پر "بغیر اجازت اندر آنا منع ہے۔" لکھا ہوتا ہے، بغیر اجازت داخل ہو جاتے ہیں۔ تو تمام کلرک اور ان کا انچارج غزل کے الہام کا الیکٹرک شوک محسوس کرتے ہیں۔ اور دفتر میں فائلوں کے پاس مرصّع غزلوں کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ غزل کے جراثیم زیادہ تر دفتروں پر حملہ کرتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے اکثر غزل گو شعرا دفتروں میں کام کرتے ہیں۔ اور غزل گو شاعر جتنا بڑا افسر ہوگا اتنا ہی بڑا وہ غزل گو شاعر ہوگا۔ اب میں ایک بہت اہم بات کہنے والا ہوں۔ میں اپنی اس بات کو اس لئے اہم کہتا ہوں کہ یہ میری برسوں کی ریسرچ کا نتیجہ ہے۔ یہ میری اپنی تحقیق ہے، میری اپنی ڈسکوری ہے۔ میرا نظریہ ہے کہ اس ملک میں غزل کے احیاء کا ذمہ دار لارڈ میکالے ہے۔ پچھلی صدی میں لارڈ میکالے نے ہندوستان کے لئے ایک ایسا طریقۂ تعلیم وضع کیا تھا جس سے وقت کی حکومت کے لئے کلرک مہیا کرنا مقصود تھا۔ چنانچہ اب ہندوستان اور پاکستان میں انسان پیدا نہیں ہوتے ہیں۔ اور کلرک ایک ایسا جانور ہے جس کے خیالات میں تسلسل

نہیں ہوتا۔ چڑیا گھر میں موسیقی ہوتی ہے، معنے نہیں ہوتے۔ ہمارا شاعر بیک وقت ایک شاعر، ایک کلرک اور ایک مشین ہوتا ہے۔ وہ لغات سے خوبصورت الفاظ نکال کر ردیف اور قافیئے کی مشین میں ڈال دیتا ہے اور اس سے ایک خوبصورت شعر برآمد کر لیتا ہے۔ شعر خوبصورت ہونا چاہیئے اس کو معنی خیز ہونے کی ضرورت نہیں۔ غزل کے اشعار مرصّع ہونے چاہئیں، ان میں تسلسل کی ضرورت نہیں۔ یہ نکتہ میں نے حال ہی میں ایک پاکستانی پکچر سے اخذ کیا ہے۔ اس پاکستانی پکچر کا مورل یہ تھا کہ ہیروئن خوبصورت ہونی چاہیئے۔ چاہے وہ اَن پڑھ، غلیظ اور بدتمیز دیہاتن ہو۔ اس فلم میں ایک زمیندار کا اکلوتا لڑکا جو امریکہ سے تعلیم حاصل کرکے واپس آیا ہے، اپنے باپ کی چالیس ہزار ایکڑ زمین کا دورہ کرتے ہوئے ایک رات اتفاق سے راستہ بھول کر اپنے مزارعوں کے ایک گاؤں میں جا نکلتا ہے۔ وہاں اُسے ایک ماہی گیر اپنی جھونپڑی میں پناہ دیتا ہے۔ اس لئے ماہی گیر کی اکلوتی لڑکی زمیندار کے اکلوتے لڑکے کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ فلمی محبت میں خوبصورتی کے علاوہ ہیرو اور ہیروئن کا اکلوتا ہونا بھی بہت ضروری ہے تاکہ وہ گھر میں اکیلے بیٹھے بیٹھے تنہائی کے احساس سے اسقدر اکتائے ہوئے ہوں کہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہی محبت کی آگ میں الٹی چھلانگ لگا دیں۔ چنانچہ ماہی گیر کی لڑکی ہیرو کو گاؤں کے پاس پرانے آسیب زدہ کھنڈرات میں، جہاں رات کو اُلو بولتے ہیں اور گیدڑ چیختے ہیں، لے جاتی ہے۔ اس رات وہاں نہ کوئی اُلو تھا اور نہ کوئی گیدڑ، کیونکہ میوزک ڈائرکٹر نے وہاں ایک سو پچاس آدمیوں کے آرکسٹرا کا انتظام کیا ہوا تھا۔ ماہی گیر کی لڑکی کا گانا سن کر اور ناچ دیکھ کر ہیرو نہ صرف اُلوؤں اور گیدڑوں کو بھول گیا بلکہ اپنی منگیتر کو بھی بھول گیا۔ ہیرو کی منگیتر ایک بہت بڑے کارخانے کے مالک کی لڑکی تھی، انگلستان کی تعلیم یافتہ، مہذب اور موڈرن۔ ماہی گیر کی لڑکی بڑی جاہل اور بے وقوف تھی۔ وہ زمیندار کو جمعدار اور علی تبتّاک کہتی تھی۔ ہیرو بیچارہ پُرتکلف زندگی کا عادی تھا۔ اس نے ہیروئن کی باتوں کو حسن کی سادگی اور الّھڑپن سمجھ کے قبول کر لیا۔ میں نے اپنی تحقیق کے سلسلے میں یہ معلوم کرنے کی بہت کوشش کی کہ غریب ماہی گیر کی اس سادہ اور الّھڑ لڑکی نے شانتی نکیتن سٹینڈرڈ کا ناچ اور گانا کہاں سے سیکھا اور اس نے کالج کی لڑکیوں کی طرح کپڑے پہننے اور بال بنانے کی ٹریننگ کہاں سے لی۔ لیکن میں ناکام رہا۔ غریب ماہی گیر کی اس سادہ اور الّھڑ لڑکی نے اپنی پیشانی پر زلفوں کے بچھو بنائے ہوئے تھے۔ اور اس نے گلاب کے پھولوں والے ڈیزائن کی ریشمیں قمیض پہنی ہوئی تھی جو اس کے جسم پر اس قدر چپکی اور پھنسی ہوئی تھی کہ اس نے اس کے تندرست دیہاتی جسم کو چھپانے کی بجائے زیادہ نمایاں اور زیادہ ملائم کر دیا تھا اور اس میں گلاب کے پھول اُگ لئے تھے جن کی وجہ سے اس کو دیکھے جانے کو ہی جی چاہتا تھا۔ چنانچہ ہیرو نے کھنڈرات سے لوٹتے ہی اپنے باپ کے سامنے جا کر یہ اعلان کر دیا کہ وہ اپنی امیر منگیتر کو چھوڑ کر اس ماہی گیر کی غریب لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ یہ سن کر باپ فوراً فرش پر گر پڑا اور چلا چلا کر اپنی حرکتِ قلب کو بند ہونے کی دعوت دینے لگا۔ اس لئے بیچارہ ہیرو ماہی گیر کی غریب لڑکی سے بے وفائی کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اور یہ سب کچھ ماہی گیر کی لڑکی کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا جو اپنا گاؤں چھوڑ کر زمیندار کے ہاں آ کر ملازم ہو گئی تھی۔ اس کو اپنا گاؤں چھوڑنا پڑا کیونکہ جب اس کے باپ کو معلوم ہوا کہ اس کی بیٹی زمیندار کے لڑکے کی محبت میں مبتلا ہو گئی ہے تو اس صدمے کی تاب نہ لا کر ہیضے سے انتقال کر گیا۔ اب یہ غریب اور یتیم لڑکی اپنا گاؤں چھوڑ کر اپنے محبوب کی تلاش میں چل پڑی اور اسی کے گھر میں جا کر نوکرانی بن گئی۔ اب قسمت کی یا ڈائرکشن کی ستم ظریفی دیکھئے کہ وہ تو ہیرو کو پہچان لیتی ہے۔ لیکن ہیرو اس کو نہیں پہچانتا۔ اس سے اس کے دل کو بڑا صدمہ پہنچا اور جب اُس کی آنکھوں کے سامنے اس کا محبوب اپنے باپ کی جان بچانے کے لئے اس سے بے وفائی کر کے اپنی منگیتر سے شادی کرنے پر رضامند ہو گیا تو وہ فوراً گانے لگی اور گا گا کر اور رو رو کر خدا کو اپنی مدد کے لئے پکارنے لگی۔ چنانچہ قدرت کو اس مظلوم لڑکی پر رحم آ گیا۔ عین اس وقت ریڈیو پر زرعی اصلاحات کا اعلان ہوتا ہے۔ زمیندار غریب ہو جاتا ہے، ہیرو کی منگیتر ایک مفلس لڑکے کے ساتھ شادی سے انکار کر دیتی ہے۔ آخر میں ڈائرکٹر نے بڑی چابکدستی سے ہیرو اور ہیروئن کی ازدواجی زندگی کا ایک سین دیا ہے۔ دونوں دن بھر کی مزدوری کے بعد اپنی جھونپڑی میں اپنے تیرہ بچوں کے درمیان بیٹھے خاندانی منصوبہ بندی پر بحث کر رہے ہیں۔—

میں نے ادب کے زوال کی بحث کے سلسلے میں اس فلمی کہانی کا ذکر ضروری سمجھا کیونکہ یہ فلمی کہانی ایک نامور ادیب نے لکھی ہے۔ جو ایک دفتر میں کلرک ہے اور ایک بلند پایہ غزل گو شاعر ہے۔ مجھے ایک دفعہ کوفی ہاؤس میں اس بلند پایہ غزل گو شاعر نے کہا تھا، شاعر کا مشن حسن کی تلاش ہے، معنوں کی تلاش نہیں۔ چنانچہ وہ اس فلمی کہانی کے لئے حسن کی تلاش میں

ہے) اور واقعات بھی اجنبی ہوتے ہیں۔ پڑھتے پڑھتے ہم یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ یہ ناول کسی ترکی یا مصری ناول کا ترجمہ ہے۔ پھر یکا یک نعرۂ تکبیر بلند ہوتا ہے۔ ہماری آنکھیں کھل جاتی ہیں اور ہم اپنے ملک میں واپس آجاتے ہیں اور ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناول غیر ملکی زبانوں کے ترجمے نہیں ہیں بلکہ ہمارے ہی ادیبوں کی گرانقدر تصنیفیں ہیں۔ کیونکہ عربی، مصری اور ترکی ناولوں میں نعرے نہیں ہوتے۔ ان میں نعرہ بازی سے کام نہیں لیا جاتا۔ نعرہ بازی سے صرف ہمارے ملک میں کام لیا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں دو طبقوں نے نعروں سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ سیاستدانوں کے طبقے نے اور تاریخی ناول نگاروں کے طبقے نے۔ انقلابی حکومت سے پہلے سیاستدانوں کا طبقہ پبلک جلسوں میں بھوک، بیکاری، افلاس، جہالت، رشوت ستانی، چور بازاری اور سمگلنگ کو نیست و نابود کر دینے کے بلند بانگ دعوے اور دعوے کرتے تھے تو عوام اونچے اونچے نعروں سے فلک میں شگاف کر دیتے تھے۔ اور جب عوام مکمل طور پر فلک میں شگاف کرنے میں لگ جاتے تھے تو سیاستداں اطمینان سے رشوت ستانی، چور بازاری اور سمگلنگ میں مشغول ہو جاتے تھے۔ انقلابی حکومت نے آخر سادہ لوح عوام کو ان کے جذبات کا ناجائز فائدہ اٹھانے والے سیاستدانوں کے شکنجے سے نکال لیا۔ لیکن سیاستدانوں کا طبقہ تو ایک جرائم پیشہ طبقہ تھا۔ تاریخی ناول نگار جرائم پیشہ نہیں ہیں۔ وہ تو نعروں سے اپنی آمدنی میں تھوڑا سا اضافہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ تو نعروں سے غیر مانوس ماحول کو مانوس بنانا چاہتے ہیں۔ غیر ملکی کرداروں کو ملکی رنگ دینے کے لئے وہ اور بھی طریقے استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً اٹھارہویں صدی کا ہیرو عربی لباس میں ہوگا، اس کے بال مغربی انداز میں کٹے ہوں گے اور اس نے شیو کیا ہوگا۔ اور جنگ کے میدان میں اس نے برجس پہنی ہوگی اور پاؤں میں پیٹنٹ لیدر کے ویلنگٹن شوز ہوں گے اور پنڈلیوں پر چمکدار گارڈ چڑھائے ہوں گے۔ اس طرح ہیرو بڑی آسانی سے دشمن کے دس ہزار سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ اور پھر کامیابی کے نشے میں ایک لمبی تان کے ساتھ نعرۂ تکبیر بلند کرتا ہے۔ اس کے سپاہی بھی کامیابی کے نشے میں ایک لمبی تان کے ساتھ نعرۂ تکبیر بلند کرتا ہے۔ اس کے سپاہی بھی کامیابی کے نشے میں چور اپنے سردار کا جواب فلک شگاف نعروں سے دیتے ہیں۔ لیکن معلوم نہیں کیوں میں ان تاریخی ناولوں کے ولولہ انگیز نعروں کو سن کر اداس ہو جاتا ہوں۔ یہ نعرے میرے خون میں ہیجان پیدا کرنے کی بجائے مجھے اپنے ایک بچپن کے واقعے کی یاد دلا دیتے ہیں: میرے ابا مجھے ایک دن اپنے ساتھ شکار پر لے گئے۔ رات کو تنبو میں جب گیدڑوں کے چیخنے کی آوازیں آئیں، تو میں ڈر گیا۔ میرے ابا میرا دل بہلانے کے لئے میرے ساتھ باتیں کرنے لگے: جانتے ہو یہ گیدڑ کیا کہتے ہیں؟ میں نے کہا: نہیں۔ ابا نے بتایا: جب بہت سے گیدڑ ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں تو ایک گیدڑ ایک لمبی چیخ مار کر کہتا ہے: پدرم سلطان بود۔ دوسرے گیدڑ اس کے جواب میں چھوٹی چھوٹی چیخوں میں جلدی جلدی کہتے ہیں: تُرا چہ! تُرا چہ! تُرا چہ۔ اور جب مجھے یہ واقعہ یاد آجاتا ہے تو میں بہت اداس ہو جاتا ہوں —— میں نے شروع میں کہا تھا کہ تاریخی ناول کے احیاء نے ہمارے ادب کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اس نے ہمارے ملک اور سوسائٹی کو بڑے بڑے ادیبوں سے محروم کر دیا ہے۔ کیونکہ تاریخی ناول نگار بڑی بلند پایہ ادبی صلاحیتوں کے ادیب ہیں جو اتفاقاً ایک زیادہ زرخیز راستے پر چل پڑے ہیں۔ اگر ان کی خیبر شکن نظر ہمارے ملکی مسائل پر مرکوز رہتی تو آج ہماری لائبریریاں ادب عالیہ سے بھری ہوتیں۔ اس وقت ہماری لائبریریوں میں آدھی سے زیادہ الماریاں تاریخی ناولوں سے بھری پڑی ہیں۔ یہ ہم سب کے لئے بڑا افسوس کا مقام ہے۔ لیکن میرے لئے یہ مقام صرف افسوس کا ہی نہیں بلکہ رونے کا مقام ہے کیونکہ میری لائبریری میں بھی آدھی سے زیادہ کتابیں تاریخی ناول ہیں۔ میری بیگم میری لائبریری کو نامکمل کہہ کر ہمیشہ مجھ سے لڑتی رہتی تھی۔ آج صبح میں نے دیکھا کہ اس نے میری لائبریری میں سے لیو ٹالسٹائی، چارلس ڈکنز اور ایمیل زولا کے تمام سیٹ نکال کر کباڑیے کی دکان پر پہنچا دئے ہیں اور ان کی جگہ اردو کے تاریخی ناول سجا دئے ہیں ——

آخر ادب کیا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے؟ ادب ایک بہت بڑی آنکھ ہے جس کا کام ہمارے حال کو خوردبین کے نیچے رکھ کر اس کا مطالعہ کرنا ہے اور ہمیں اپنے مستقبل کی تعمیر کے لئے تیار کرنا ہے۔ ادب کا ماضی سے کوئی تعلق نہیں، ماضی سے تاریخ کا تعلق ہوتا ہے۔ تاریخ ادب نہیں اور ادب تاریخ نہیں۔ وہ زندہ، جاندار، متحرک شے جس کو زندگی کہتے ہیں مستقبل کی طرف سفر کر رہی ہے۔ ماضی کی مسحور کن داستانوں سے اس کی رفتار سست مت کرو۔ ماضی کے

بہادرانہ کارناموں سے ہیروشیما میں ہماری کوئی مدد نہیں کی۔ ماضی حال کو جنم دے کر مر چکا ہے۔ اس کے مردہ جسم میں جان ڈالنے کی کوشش مت کرو۔ اس کا مردہ جسم اب کبھی زندہ نہیں ہوگا۔ حال سے مستقبل پیدا کرو۔ تمہاری منزل مستقبل میں ہے۔

دیکھو! یہ وعظ بند کرو۔ نہیں تو میں اٹھ کر چلا جاؤں گا۔

میں نے سرسری سا سوال کیا تھا۔ تم نے ایک پورا لیکچر پلا دیا۔ آدھے گھنٹے سے نون سٹوپ بول رہے ہو۔ کوفی پیتے پیتے تنگ آ گیا ہوں۔ یہ چوتھی پیالی ہے۔

اور جب تم دو دو گھنٹے نون سٹوپ بولتے ہو اس بغیر کوفی، بغیر چائے پیئے مشورہ دو۔ میں ان باتوں کو ایک مضمون کی شکل میں کسی ادبی رسالے میں شائع کرنا چاہتا ہوں۔

اور بت شکن محمود غزنوی کا نامکمل چھوڑا ہوا کام مکمل کرنا چاہتے ہو۔ لیکن یہ بت بہت مضبوط ہیں۔ یہ بت پرست بڑے سخت جان ہیں۔ میرا خیال ہے تم یہ بت نہیں توڑ سکو گے۔

اور کوئی میرا ناک توڑ دے گا۔

میرا ناک نہیں، میری ناک۔ تم جیسے ٹوٹی پھوٹی اُردو بولنے والے بڑے بڑے ادبی بتوں کو توڑنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ دیکھو ہم نقّاد ہیں۔ اگر ہم ہی غلط اردو بولیں گے تو زبان کی اصلاح کون کرے گا؟

زبان ایک بت ہے جو ٹوٹ چکا ہے۔ اردو زبان کی ٹکسالیں جو دلّی اور لکھنؤ میں قائم تھیں بند ہو چکی ہیں۔ ان کے بند ہونے سے کافی عرصہ پہلے ان میں انحطاط کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ ان کی دیسی دقیانوسی مشینیں صرف ایسے الفاظ مہیا کرتی تھیں جو محض مقامی ضرورتوں کے لئے کافی تھے۔ وہ دیسی دقیانوسی مشینیں بڑھتے ہوئے بین الاقوامی تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتی تھیں۔ اس لئے ہماری زبان کی ایک ٹکسال لاہور میں قائم ہوئی جس میں مغربی ملکوں سے موڈرن مشینری منگوا کر نصب کی گئی۔ اس ٹکسال میں بنے ہوئے الفاظ زیادہ وسیع معنوں سے مزیّن تھے اور ہمارے نئے مسائل کے حل میں ہماری زیادہ مدد کر سکتے تھے۔ اس نئے ادبی مرکز نے ہماری زبان کو بڑی وسعت دی اور ہم کو ہماری پرانی کرم خوردہ کلاسیکل کتابوں کے بے سود مطالعے سے آزاد کر کے ہماری توجہ مغربی علوم کے خزانوں پر مرکوز کر دی۔ اس نئے ادبی مرکز نے ہمیں بڑے بڑے ادیبوں کے علاوہ علامہ اقبال جیسا عظیم شاعر بھی عطا کیا۔ دلّی اور لکھنؤ نے ایک مدت تک علامہ اقبال کی عظمت اور دوسرے ادیبوں کی اہمیت سے انکار کیا۔ ان کا اعتراض تھا کہ ماں کے خالص دودھ سے پروان چڑھی ہوئی زبان کی موجودگی میں یونیورسٹی کے مصنوعی دودھ سے پلی ہوئی زبان بڑے ادیب کیسے پیدا کر سکتی ہے۔ لیکن آخر علامہ اقبال کو قومی شاعر اور دوسرے ادیبوں کی اہمیت کو تسلیم کر لیا گیا اور زبان کا بت ٹوٹ گیا۔ اب زبان ادیب کو پیدا نہیں کرتی، ادیب زبان کو پیدا کرتا ہے۔ اب ہم زبان کے غلام نہیں، زبان ہماری کنیز ہے۔ اب موضوع، اسلوب اور عالمی مشاہدہ زبان سے زیادہ اہم ہیں۔ اب ہماری نظر زبان کی غلطیوں کی بجائے موضوع کی جدت، اسلوب کی جاذبیت اور مشاہدے کی وسعت کی طرف جاتی ہے۔ غلطی سب کرتے ہیں۔ ادیب بھی غلطی کرتا ہے، زبان بھی غلطی کرتی ہے۔ اگر زبان ادیب سے پوچھ سکتی ہے کہ ناک کو مذکر کیوں استعمال کیا گیا ہے تو ادیب بھی زبان سے پوچھ سکتا ہے کہ ناک کو مؤنث کیوں استعمال کیا جاتا ہے؟ کیا زبان بتا سکتی ہے کہ ماتھا کیوں مذکر ہے اور پیشانی کیوں مؤنث ہے؟ لکھنؤ کیوں مذکر ہے اور دلّی کیوں مؤنث ہے؟ اور رتھ اور سالن اور فکر کیوں خواجہ سراؤں کے خاندان میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ناک کو محض اس بنا پر مؤنث استعمال کرنا کہ یہ اردو زبان کی روایت میں شامل ہے، کافی نہیں۔ کیونکہ ناک کو مذکر استعمال کرنا پنجابی زبان کی روایت میں شامل ہے۔ اور ناک میں اس کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ مرد کے ناک کی طرف دیکھئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلوان لنگوٹا باندھ کر اکھاڑے میں نکل آیا ہے اور ابھی اپنے دشمن کو پچھاڑ دے گا۔ عورت کے ناک کو دیکھئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرمے، غازے اور لپ سٹک کی حفاظت کے لئے چوکیدار دونالی بندوق لئے کھڑا ہے۔ اور وہ دشمن کو دیکھ کر ابھی آدم بو آدم بو کا شور مچا دے گا۔ اس طرح ناک مرد کی عزّت اور عورت کی عصمت کا محافظ ہے اور محاورہ ناک کٹ گئی نہیں ہونا چاہیئے بلکہ ناک کٹ گیا ہونا

چاہیئے۔ اگر آپ دھمکی دینے کے لئے کہتے ہیں: میں تمہاری ناک توڑ دوں گا۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے آپ عورت پر ہاتھ اٹھا رہے ہیں اور اگر کہا جائے: میں تمہارا ناک توڑ دوں گا۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی مرد سے مقابلہ ہے اور محمود غزنوی بت توڑنے کی مہم پر نکلا ہے۔

بہر کیف میں زبان کے معاملے میں تم سے کوئی سمجھوتہ نہیں کروں گا۔

میں بھی زبان کے معاملے میں تم سے کوئی سمجھوتہ نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے تو تم سے مشورہ مانگا تھا کہ کیا یہ خیالات میں ایک مضمون کی صورت میں پریس کو دے دوں؟

میرا تجربہ کہتا ہے کہ یہ تمہارے لئے مفید نہ ہوگا۔ میں نے ایک دفعہ غزل اور غزل گو شعرا کے خلاف ایک مضمون شائع کر دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے ابھی تک کہیں ملازمت نہیں ملی۔ ہر انٹرویو بورڈ میں آدھے سے زیادہ غزل گو شعرا ہوتے ہیں اور میرا نام سن کر اور میری شکل دیکھ کر فوراً مجھے کمرے سے باہر نکال دیتے ہیں۔

اس نے تمہیں بزدل بنا دیا ہے۔ تم نے حالات سے شکست کھا لی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ میں نے حالات سے شکست کھا لی ہے لیکن مجھے بزدل نہیں کہا جا سکتا۔

تم بزدل ہو۔ مجھے یاد ہے کہ تم نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے ایک پرائیویٹ اجتماع میں سعادت حسن منٹو کی افسانہ نگاری کے خلاف ایک بڑا معرکہ آرا مضمون پڑھا تھا۔ تم نے کہا تھا کہ منٹو کی تحریریں میں ادب کی دلکشی نہیں ہے بلکہ پورنوگرافی کی دلکشی ہے۔ پورنوگرافی ایک عریاں تحریر ہوتی ہے جس کا مقصد پڑھنے والے کے سفلی جنسی جذبات کو اکسانا اور اُن کو تسکین پہنچانا ہوتا ہے۔ پورنوگرافی میں پڑھنے والے کے لئے بے پناہ جاذبیت ہوتی ہے اور وہ پورنوگرافی کے مصنفوں اور ان کی عریاں تحریروں کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ پچھلی جنگ کے دوران میں محاذ پر سپاہیوں کی جنسی بھوک کی تسکین کے لئے پن اپ گرلز کے نام سے نیم عریاں عورتوں کی تصویریں اور ننگی جنسی تحریریں رواج پا گئی تھیں جس کا ادب پر بھی اثر ہوا۔ منٹو نے اس انسانی کمزوری کا فائدہ اٹھایا۔ جب اس پر جنسی بے ادبی کی بنا پر چند مقدمے قائم ہو گئے اور سزائیں مل گئیں تو وہ جنس کا جینئس بن گیا۔ اور اس نے جنس کو اپنا مستقل موضوع بنا لیا۔ اور اس کے افسانے امراض مخصوصہ زنانہ و مردانہ کے اشتہاروں کی طرح پڑھے جانے لگے۔ یہاں سے اس کی بیمار ذہنیت کا آغاز ہوتا ہے۔ یہاں سے اس کا ادب غیر صحت مند ہو جاتا ہے اور وہ ہمارے نوجوانوں کے لئے بہت بھاری خطرہ بن جاتا ہے۔ اس نے ہمارے نوجوان ادیبوں میں ایک گھٹیا جنسی رجحان پیدا کر دیا ہے اور وہ سستی اور فوری شہرت کے لئے کم درجے کا غیر صحتمند ادب پیدا کر رہے ہیں ــــ اس مضمون کو سننے کے بعد میں تمہارا مداح ہو گیا تھا۔ میں نے تمہیں مبارکباد دی تھی اور کہا تھا تم بہت بڑے نقاد ہو۔ اس مضمون نے واقعی مجھے تمہارا معتقد بنا دیا تھا کیونکہ منٹو کے متعلق میرا بھی یہی نظریہ ہے لیکن پچھلے سال میں نے ایک ادبی اجتماع میں منٹو ڈے پر تمہیں تقریر کرتے سنا میں حیران رہ گیا۔ تم نے کہا منٹو ایک عظیم افسانہ نگار تھا۔ اس سے بڑا افسانہ نگار نہ کبھی پیدا ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ تم نے ایک گھنٹہ تک تقریر کی۔ سب منٹو کا قصیدہ ــــ یہ کایا پلٹ بزدلی نہیں تو اور کیا ہے؟

او بیوقوف، اس ادبی اجتماع کی مجلس عاملہ نے مجھے اس تقریر کے لئے ایک سو روپے ادا کئے تھے۔ میں ایک انٹرویو بورڈ کے دفتر سے دھکے کھا کر باہر نکلا تھا کہ یہ مجلس عاملہ ایک سو روپے کا نوٹ لے کر میری خدمت میں حاضر ہوئی۔ میں نے جلدی سے نوٹ لے کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ مجھے منٹو پر تقریر کرنی ہے۔ اب اگر میں منٹو ڈے پر منٹو کا قصیدہ نہ کہتا تو کیا کرتا؟

تو تم نے ایک سو روپے میں اپنے آپ کو بیچ دیا۔

اگر میں اپنے آپ کو نہ بیچتا تو کیا اپنی بیوی کو بیچتا؟ اپنے بچوں کو بیچتا؟ میری ایک عدد بیوی ہے اور چار بچے ہیں۔

اور یہ نرگس جمال کون ہے جس کو تم نے ایک مضمون میں ہماری تمام ادیب خواتین سے بڑا ادیب کہا ہے۔

وہ ایک ریسرچ سکالر ہے جو میری مدد سے ڈاکٹریٹ کے لئے تھیسس لکھ رہی ہے۔

کس موضوع پر؟

مجھ پر۔

تو یہ ہمارے ملک کی سب سے عظیم ادیبہ تم پر ریسرچ کر رہی ہے؟

جی ہاں

پھر تو وہ واقعی عظیم ہے

یقیناً

پچھلے دنوں میں نے تمہارا ایک اور مضمون دیکھا۔ اس میں تم نے ایک معمولی افسانہ نگار کو ہمارے ملک کا سب سے بڑا افسانہ نگار کہا ہے۔ اس ادیب کا تم نے کبھی نوٹس نہیں لیا تھا اور اس کے تھرڈ ریٹ ہونے کا کئی دفعہ مجھ سے تذکرہ کیا تھا۔ اب وہ یکبارگی ہمارا سب سے بڑا افسانہ نگار کیسے ہوگیا؟

دردِ گردہ سے!

دردِ گردہ! کیا مطلب؟

مجھے پچھلے سال سے دردِ گردہ کی شکایت ہے۔ اس کو پچھلے چالیس سال سے دردِ گردہ کی شکایت ہے۔ میں اوپریشن سے ڈرتا ہوں۔ وہ بھی اوپریشن سے ڈرتا ہے۔ اس نے دردِ گردہ کا بہت قریب سے مطالعہ کیا ہے۔ اور اس کے پاس دردِ گردہ کے تین ہزار نسخے ہیں۔ وہ مجھے نسخہ نہیں دیتا، دوا دے دیتا ہے۔ یہ مضمون میں نے اس سے دردِ گردہ کا نسخہ حاصل کرنے کے لئے لکھا ہے۔

اس مضمون کے آخر میں تم نے لکھا ہے: اے برِصغیر کے نامور نقادو! کیا تم نے اس افسانہ نگار کو پڑھا ہے؟ اگر نہیں پڑھا تو پڑھو!

یہ اس نے خود لکھا ہے۔ میں دردِ گردہ سے چیخ رہا تھا، وہ میرے لئے دوا لایا اور کہنے لگا یہ جملے اپنے مضمون کے آخر میں لکھ کر یہ دوا کھالو۔ اللہ شافی ہے۔ میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔

اور وہ لڑکی کون تھی جو کل تمہارے ساتھ صدر میں گھوم رہی تھی؟

وہ نرگس جمال ہے

جو تم پر ریسرچ کر رہی ہے؟

ہاں

اور تم اس کے بارے میں ریسرچ کر رہے ہو۔

نہیں۔

افواہ گرم ہے کہ نرگس جمال تم سے شادی کرنا چاہتی ہے۔

ہاں، وہ شادی کے معاملے میں ایک عام لڑکی ہے۔ اس کا بھی خیال ہے کہ شادی محبت کا آغاز ہے۔ وہ بہت قریب سے میرا مطالعہ کرنا چاہتی ہے تاکہ اس کے تھیسس میں حقیقت کا رنگ پیدا ہوجائے۔

تم اس سے شادی کرنا چاہتے ہو؟

نہیں۔ میرا خیال ہے شادی محبت کا آغاز نہیں، شادی محبت کا انجام ہے۔ میں ایک تجربہ کار شادی شدہ آدمی ہوں۔ شادی ایک بہت مہنگی ہوبی ہے۔ مجھ میں تو ایک شادی کی بھی توفیق نہیں۔ دوسری شادی کی غلطی مجھ سے کیسے ہوسکتی ہے؟

تمہیں نرگس جمال سے محبت ہے؟

ہاں

تم اس سے محبت بھی کرتے ہو اور شادی کی ذمہ داریوں سے بھی گھبراتے ہو۔ کیا یہ خود غرضی نہیں ہے؟

شادی ایک جسمانی ضرورت ہے۔ محبت ایک دماغی ضرورت ہے۔ جب نرگس جمال دماغی ضرورت کی حدوں سے نکل کر جسمانی ضرورت کی شدت محسوس کرے گی تو میں اس کی کسی اچھی سی جگہ شادی کردوں گا۔

دیکھو، تمہارا محبت کا فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔

محبت ایک آگ ہے جس کا تعلق آرٹ کے مقدس مندر کی آگ سے ہے۔ یہ آگ آرٹ کے مقدس مندر کی آگ کو زندہ رکھتی ہے۔ یہ آگ ڈانٹے، گوئٹے اور عمر خیام سے آرٹ کے بڑے بڑے شاہکار پیدا کرواتی ہے۔ یہ محبت انسان کو بڑے بڑے کاموں پر آمادہ کرتی ہے

اور گدھے کے سینگ! تو اپنی بیوی کی محبت سے یہ کام کیوں نہیں لیتا؟

بیوی کی محبت انسان کو بڑے کاموں پر آمادہ نہیں کرتی۔ بیوی کی محبت انسان کو چھوٹے کاموں پر آمادہ کرتی ہے۔ مثلاً جھاڑو دینا، پودوں کو پانی دینا، بازار سے سبزی اور گوشت لانا وغیرہ وغیرہ!

میں آج سے تم کو ایک نقاد کی حیثیت سے تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہوں۔ تم بددیانت، بزدل، بے ایمان اور بداخلاق انسان ہو۔

خنجر سرحدی سے ملنے کے بعد تم بھی مجھ جیسے ہو جاؤ گے۔ خنجر سرحدی تمہارے خون کا پیاسا ہے۔ وہ تمہیں ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔

کیوں؟ میں نے خنجر سرحدی کا کیا بگاڑا ہے؟

وہ کہتا ہے تم نے ایک ریویو میں اس کے کلام کے تازہ مجموعے کا مذاق اڑایا ہے۔

کیا نام ہے اس کے کلام کے مجموعے کا؟

"خواب، اونٹ اور تربوز"

ہاں۔ خنجر سرحدی نے اپنی کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے:

خواب انسان کی شعوری اور لاشعوری خیالات کی نمائندگی کرتا ہے۔ اونٹ انسان کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ اور تربوز انسان کے دماغ کا سمبل ہے جس میں تربوز کا گودا بھرا ہوا ہے۔ اپنے دیباچے کے آخر میں اس نے لکھا ہے: کاش آج فرائڈ اور میرا جی زندہ ہوتے ۔۔۔ ذرا غور کرو زمانہ کتنا آگے بڑھ گیا ہے۔ اس وقت تمام انسانیت یکزبان ہو کر کہہ رہی ہے: کاش آج ہیروشیما کے شہید زندہ ہوتے! وہ خنجر سرحدی کہہ رہا ہے: کاش آج فرائڈ اور میرا جی زندہ ہوتے۔

وہ خنجر سرحدی آ رہا ہے۔

کہاں؟

آپ نے میری کتاب پر ریویو لکھا ہے؟

ہیلو، خنجر سرحدی صاحب "تشریف رکھئے"

آپ نے میری کتاب پر ریویو لکھا ہے؟

جی ہاں۔

میں تمہارا ناک توڑ دوں گا۔

ناک حاضر ہے،

تم بڑے بد دیانت ہو تم انتہا کے بے ایمان ہو۔

آپ مجھ سے میرے خیالات کی آزادی نہیں چھین سکتے۔

میں تمہارا ناک تو توڑ سکتا ہوں۔

کوفی ہاؤس خالی ہو گیا ہے۔ نکسیر کے خون سے نقاد کے کپڑے بھیگ گئے ہیں۔ وہ اپنے سر کو ہاتھوں میں تھامے ہوئے، میز پر کہنیاں ٹکائے اکیلا بیٹھا ہے۔ کوفی ہاؤس کے دروازے بند ہو رہے ہیں ؎

انتظار

طاہرہ کاظمی

خرد کی بات گئی دل کی بات باقی ہے
اب انتظار کی بس ایک رات باقی ہے

یہ خوابناک اندھیرے یہ بھیگی بھیگی فضا
یہ سرسراتی ہوئی شوخ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
یہ شب کے پھول مہکتے زمین کے تارے
چمک کے صبح کو بن جائیں گے یہ انگارے
یہ نغمہ ریز خموشی کنارِ جوئے پُر آب
ہوا کے دوش پہ موجوں کا دھیما دھیما رباب

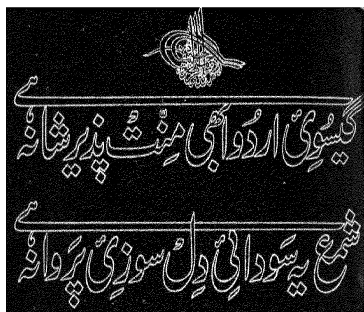
بہت لطیف تصور، بہت حسین خیال
رُخِ حبیب کی تنویر صُبحِ نو کا جمال
ہر اک نظارے میں جیسے خمار کا جادو
صبا کا رقصِ فراواں ہے یا رمِ آہو
اُلجھ گیا کہیں شاخوں میں پچھلی رات کا چاند
تری جبیں کے اُجالوں سے جیسے ہو کر ماند

حیات راہ کے سب در سنوار آئی ہے
بہت قریب سے بوئے نگار آئی ہے

خط میں حسن کاری (۱)

(وضع نو — مضمون: صفحہ ۵۳)

خطاط: عبدالمجید

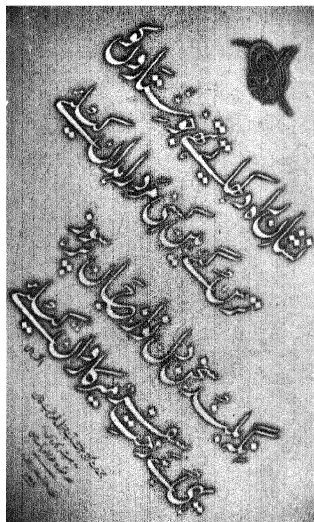


قطعہ

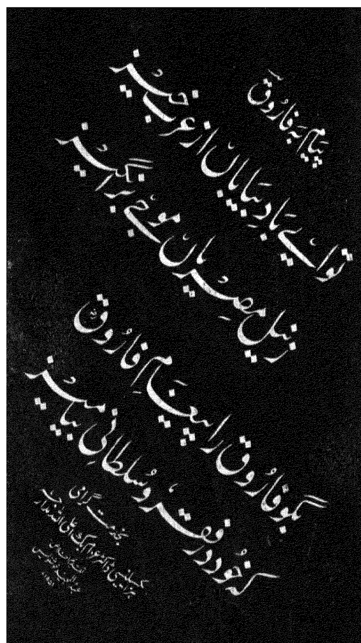


طغریٰ

" میر کارواں کے لئے "



پیام اور پیکر

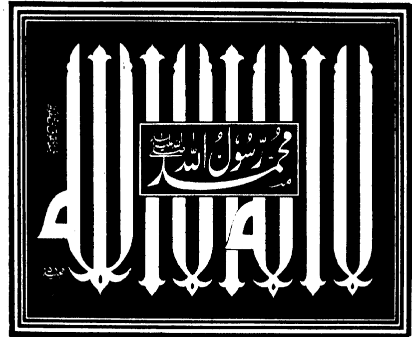


خط میں حسن کاری :

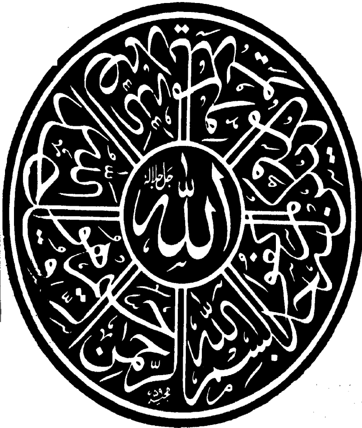
(۲)



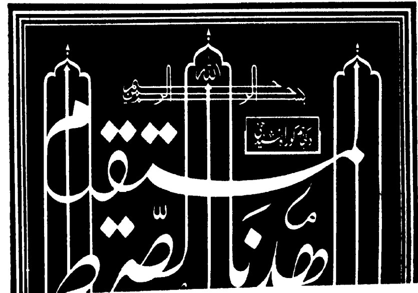
نسخ اور نستعلیق



ترتیب



گردش قلم



خط مستقیم

افسانہ

گاؤں کا شاعر

غلام الثقلین نقوی

میرے گاؤں کا نام ڈھولن ہے۔ یہ چھوٹا سا گاؤں ہے۔ اس کی زمین چھ چھ سات سات گھماؤں کی ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اِس لئے اس کا ہر آدمی چوہدری ہے۔

میرے گاؤں کی تین چیزیں مشہور ہیں:

میں ... سب سے پہلے اپنا ہی نام کیوں نہ لوں ...

اگرچہ اپنے منہ میاں مٹھو بننا کسی شرع میں جائز نہیں۔ پھر بھی میں گاؤں کی تین مشہور چیزوں میں سے نمبر ایک ضرور ہوں کیونکہ میں نے گل بہار کے پرائمری سکول کے آخری امتحان میں وظیفہ حاصل کیا، دیناپور کے قصبے سے مڈل کا امتحان پاس کیا، رینگ رینگ کر اپنے گاؤں سے بیس میل دور شہر جا پہنچا، دو سال کے بعد میٹرک کے امتحان میں بھی کامیاب ہو گیا۔ ٹائپ سیکھا اور ایک فرم میں، جو بینڈ کا سامان تیار کرتی ہے، ملازم ہو گیا۔ اب میں بیک وقت فرم کا اسٹور کیپر اور سیلزمین ہوں۔ اکثر فرم کے سفری ایجنٹ کی حیثیت سے دورہ بھی کرتا ہوں۔ میں نے بہت سے شہروں کی سیر کر لی ہے۔ گاؤں کو مجھ پر ناز ہے۔ میں نے اپنا نام بھی ڈی۔ ایم ناز رکھ لیا ہے۔

دوسرے نمبر پر گاؤں کے شاعر کا نام لوں یا زینی کا؟ میں مدت سے سوچ رہا ہوں۔ ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر پایا فیصلہ آپ کر لیجئے۔ میں تو گاؤں کے شاعر اور زینی کا نام اکٹھا ہی لوں گا۔ زینی سے پہلے ڈھولن ایک پُرسکون گاؤں تھا۔ ایک گدلا سا جوہڑ جس کے پانی میں کوئی لہر نہ تھی۔ زینی ایک کنکر بن کر پانیوں میں گری، حلقے اور دائرے بنے، پانی میں ہلچل ہوئی، لہریں کناروں کے ساتھ ٹکرائیں، سینکڑوں سورج پانی کے ایک ایک حلقے میں زندہ ہو کر چمکے۔ اتنے شرارے پھوٹے کہ آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ بہاروں کے قافلے آئے، پرندے چہچہائے، خوشبوؤں کے طوفان بکھرے، رنگ اور آہنگ گلے مل گئے۔

زینی نے ڈھولن کی زمین سے جنم لیا تھا، پر اُس کی جوانی آسمانوں سے اتری تھی یا کوئل کی ایک کوک نے جنم اختیار کر لیا تھا۔ بے چین، مضطرب، تڑپتا پھڑکتا جسم، جس میں بجلیوں کی کوندتی ساونتا کی گھٹاؤں کا بے قرار ترنم اور چھما چھم برستی ہوئی بوندیوں کا ملہار راگ تھا اور گاؤں کا شاعر تو گویا اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ دو ٹوٹے ہوئے تارے جو صدیوں سے ایک دوسرے کی راہ دیکھ رہے تھے نہ جانے کب ملے، پر جب گاؤں نے آنکھیں کھولیں تو یہ معجزہ رونما ہو چکا تھا۔

یہ ذکر بھی ذرا قبل از وقت ہے۔ گاؤں کا شاعر چار بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا! کچھ عجیب بات ہے کہ دھیدو[1] سب بھائیوں سے چھوٹا ہوتا ہے اور وہ بھائیوں کا لاڈلا بھی ہوتا ہے۔ سب سے بڑی بھابی اُسے اپنا پلیٹھی[2] کا بیٹا سمجھتی ہے لیکن سب سے چھوٹی بھابی نہ جانے کیوں اُس سے خار کھاتی ہے۔ سب سے چھوٹی بھابی، جس کے سہاگ میں ابھی دوشیزگی کی خوشبو ہوتی ہے، ہاتھوں پر ابھی تک حنا کی سرخیاں باقی ہوتی ہیں۔ انگلیوں میں گنے کی پختہ پوروں کا رس ہوتا ہے۔ ابھی برتن مانجھ مانجھ کر اور اُپلے تھاپ تھاپ کر یہ پورے سخت اور کھردرے نہیں ہوتے، ابھی چوڑیوں کی جھنکار میں جوانی کے کچّے پکے نغمے ہوتے ہیں۔ چھوٹی بھابیاں اپنے سب سے چھوٹے دیور سے شائد اِس لئے جلتی ہیں کہ اُن کا بَر سب سے چھوٹا کیوں نہیں کہ رات رات بھر اُسے کنوئیں پر نہ رہنا پڑے یا گرم دوپہروں کو جب سائے سمٹ کر تنوں سے لپٹ جاتے ہیں، وہ کھیتوں میں کام کرنے کی بجائے اُس کی جوانی کے ٹھنڈے سائے تلے کیوں نہ آ بیٹھے اور پھر رات کی خنکیوں میں جب ہوا رہ رہ کر ٹھنڈے سانسوں کا خنک مرہم تقسیم کر سکتی ہے وہ کھیتوں میں

۱؎ رانجھے کا اصلی نام۔ ۲؎ سب سے پہلا بیٹا۔

پانی کیوں لگائے اور کیاریوں میں ؟ لیاں کیوں باندھے۔ یہ کام تو دیور کا ہونا چاہئے۔ اُس لفنگے مسٹنڈے دیور کا جو دن چڑھے چوپال میں پھڑ جما کر بیٹھتا ہے تو گئی رات تک یاروں کی محفل میں بانسری بجاتا رہتا ہے، داستانیں کہتا اور سنتا ہے۔ آدھی رات کو گھر آتا ہے، بے سُدھ ہو کر سوتا ہے تو دن چڑھے اٹھتا ہے۔ باسی روٹی پر تازہ مکھن رکھ کر کھاتا ہے۔ گاڑھی لسی کے ٹھنڈے میٹھے کٹورے پی کر ڈکار لیتا ہے اور نئی نویلی بھابی سے کہتا ہے " بھابی! آج دوپہر کی روٹی میں اتنا گھی ڈالنا کہ بس مزا آجائے۔ ہاں "۔

" تیرے لئے گھی کہاں سے لاؤں اتنا؟" سب سے چھوٹی بھابی نے آنکھیں جھکا کر کہا۔" تھان پر کون سی بھوریاں[لہ] باندھ رکھی ہیں تو نے ؟"

"یہ بات تیری زبان سے پہلی بار سنی اور تیرے منہ سے کچھ اچھی بھی نہیں لگی بھابی!"

" کیوں بے؟" بھابی نے مہین آواز میں چمک کر پوچھا۔

" بھابیاں تو بڑی بہنوں کے آنچل کا ٹھنڈا سایہ ہوتی ہیں۔ ماں زندہ ہوتی تو اتنی کڑوی بات نہ کہتی "۔

" لو، میں نے اتنی کڑوی بات کہہ دی کہ تجھے اچھو آ گیا۔ تُو تو پہلے ہی سے بھرا بیٹھا تھا" چھوٹی بھابی نے اپنی اوڑھنی کے رنگین پلو سے آنکھیں پونچھ کر کہا۔

سب سے بڑی بھابی نے آ کر کہا " کیوں ری! جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے تیرے بیاہ کو اور تو ابھی سے اس گھر کی مالک بن بیٹھی۔ واہ جی واہ! یہ اِتا سا تھا جب خدا بخشے، اس کی ماں فوت ہوگئی۔ بچوں کی طرح پالا ہے اسے آج تک۔ جا بھیّا جا کنوئیں پر۔ تیرے لئے گھی میں گوندھ کر وہ روٹی پکاؤنگی کہ ہونٹ چاٹتا رہے گا"۔ دھنیدو نے چھوٹی سی نئی نویلی بھابی کو جو اس کی ہم عمر بھی تھی، چھیڑنے کی غرض سے کہا" بھابی! تیری زبان سے تو دودھ شہد کی نہریں بہنی چاہئے تھیں، تو بھی سے زہر ٹپکانے لگ پڑی"۔

اس رات نئے بیاہے ہوئے بھائی کے کان میں نئی نویلی دُلہن نے کچھ سرگوشی کی۔ کاجل لگی آنکھوں میں نیر چھلکا کر کچھ کہا مہندی لگے ہاتھوں سے اوڑھنی کا پلو بار بار آنکھوں کی طرف لپکا۔ سہاگ کی تانہ اور رنگین چوڑیاں چھنکیں۔ صبح جب بھائی کنوئیں پر جانے لگا تو دھنیدو ابھی تک سویا ہوا تھا۔ اُس نے جھنجوڑ کر اُسے جگایا۔" کیوں بے تاجے! تو ہر وقت سوتا ہی رہے گا، یا کچھ کام بھی کرے گا؟" تاجے نے کروٹ بدلی۔ بھائی جو اُس سے صرف تین سال بڑا تھا غصّے میں آ کر چنگھاڑا " اٹھ! سارے جہان کی نیند کا ٹھیکہ تو نے لے رکھا ہے کیا؟" تاجے نے اٹھ کر آنکھیں ملیں۔ گھُور گھُور کر دیکھا۔ ابھی تو صبح کا اندھیرا ابھی دور نہ ہوا تھا۔ اُس نے حیران ہو کر پوچھا۔" اکبر! کیا بات ہے؟"

" بات کیا ہے! کنوئیں پر چل۔ گھی میں گوندھی ہوئی روٹیاں کھانی ہیں تو کام کرنا پڑے گا۔"

" ہوں!" تاجے نے یکایک جاگ کر کہا۔" تو بھابی نے تیرے کانوں میں زہر ٹپکا دیا؟"

" زہر!" بھائی نے ہونٹ بھینچ کر کہا" تو دنیا بھر سے نیارا تو نہیں۔ اس دنیا کی ریت ہے، جو کرے گا کھائے گا"۔

اُس دن تاجا منہ اندھیرے کنوئیں پر پہنچا تو سب سے بڑے بھائی نے حیران ہو کر پوچھا" آج تو نے منہ اندھیرے اٹھنے کی ہمت کیسے کر لی؟"

" اکبر نے کہا تھا جو کرے گا وہ کھائے گا"۔

" اکبر نے؟"

" کوئی بات نہیں بھیّا! نئی نویلی بھابی کا سہاگ ابھی نیا نویلا ہے۔ چار دن کی موج ہے۔ آج سے اکبر کی جگہ میں کام کیا کروں گا"۔

" اکبر کون ہوتا ہے تجھے کچھ کہنے والا؟ جا، جا کر موج میلہ کر۔ تیرے دن ابھی کھیلنے کودنے کے ہیں"۔

" نہیں بھیا! میں تو آج سے رات کو بھی کنوئیں پر رہا کروں گا۔ اکبر رات کو ہمیشہ گھر سویا کرے گا" تاجے نے تھوڑا سا فخر کر کہا۔ اور بڑا بھائی ہنس پڑا۔" تیری بات بھی سچ ہے۔ چل اکبر کو بھی چار دن موج میلہ کر لینے دو"۔

لہ: بھورے رنگ کی بھینسیں۔

ایک رات جب میں گاؤں آیا تو گاؤں تنہا اور اداس معلوم ہوا۔ میرا راستہ چوپال میں سے ہوکر گزرتا تھا۔ اور چوپال ویرانوں کی طرح سنسان تھا۔ میں یعنی ڈی۔ ایم۔ ناز بھی کچھ اداس اور طول سا ہو گیا۔ میں تو گاؤں میں محبت اور گرمی کی تلاش میں آیا کرتا ہوں۔ ہمیشہ دو مہینے مسلسل شہر میں رہ کر جی بھی اکتا جایا کرتا ہے۔ یہ تو عین فطرت ہے۔ خیر! اُس رات میں سیدھا گھر چلا گیا۔ صبح تاجے کے کنوئیں پر جا پہنچا۔ تاجا میلا سا تہمد باندھے بیلوں کے لئے چارا کتر رہا تھا۔ اُس نے مجھے دیکھا تو مسکرانے لگا۔ میں نے پوچھا "اوئے تاجے! کیا بات ہے؟"

"کیا بات ہے دینے! چارہ کتر رہا ہوں" تاجے کو کیا پتہ کہ میں دین محمد سے ڈی۔ ایم ناز بن چکا ہوں۔

"یہ تو مجھے بھی نظر آرہا ہے۔ رات چوپال بھوتوں کا مسکن بنا ہوا تھا"

"اکبر کی نئی نئی شادی ہوئی ہے نا"

"پھر اس کا چوپال سے کیا تعلق؟"

"تیری عقل گھاس چرنے گئی ہے دینے! اکبر کو چند دن موج میلہ کرنے کی مہلت دے رہا ہوں"

"دیکھ تاجے! مجھے دینا مت کہا کر۔ میرا پورا نام دین محمد ہے اور آج کل میں ڈی۔ ایم۔ ناز کے نام سے مشہور ہوں"۔ میں نے منہ لٹکا کر کہا۔

"جاجا!" تاجے نے خوب کھل کر قہقہہ لگایا۔" ڈی۔ ایم ناز... یہ رعب کسی اور پہ ڈالنا۔ میں تو اُس دینے کو جانتا ہوں جو میرا لنگوٹیا ہے۔ ڈی۔ ایم ناز..." میں نے بات کاٹ لی۔ اگر میں بات نہ کاٹتا تو شاید تاجا ڈی۔ ایم ناز کو ایک عدد گالی سے بھی نواز دیتا۔

"ذرا بھائی سے پوچھ لے تو چل گاؤں میں۔ میں بھی تو دو گھڑیاں موج میلہ کرلوں۔ پھر میں تیرے لئے ایک بڑی اچھی چیز بھی لایا ہوں"۔

"دیکھوں تو بھلا"۔

"وہ تو گاؤں میں ہے"۔

"میں گاؤں نہیں جاؤں گا۔ میں چار دن اور چار راتوں سے گاؤں نہیں گیا"۔

"آج میرے لئے چل۔ کہو تو میں خود تیرے بھائی سے پوچھ لوں"۔ اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وحیدو لاڈلے بھی ہوتے ہیں اور ضدی بھی۔ اگر وہ کسی بات پہ اڑ جائیں تو لاکھ منتیں کرو نہیں مانتے۔ میں ناراض ہو کر اٹھنے ہی والا تھا کہ اُس نے بڑی محبت سے میرا بازو پکڑ کر پھر مجھے بٹھا لیا۔ اُس نے سب سے چھوٹی بھابی کے طعنوں مہنوں کا ذکر کیا اور پھر اکبر کی خشونت کا جس نے اُس کے دل پر چھریاں چلا دی تھیں۔ اُس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ میں باوجود تخلص کے شاعر نہیں، لیکن تاجا تخلص نہ ہونے کے باوجود شاعر ہے کیونکہ وہ بہت حساس ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا اُس کے دل پر بڑا اثر ہوتا ہے اور پھر وہ اپنے دل کی کیفیات کو اس شدت سے پیش کرتا ہے کہ اس کی ایک ایک بات شعر معلوم ہوتی ہے۔ اسی لئے تو میں اسے شاعر کہتا ہوں۔ گاؤں کا شاعر، جو وحیدو بھی ہوتا ہے، اس رات میری خاطر چوپال میں آ ہی گیا۔ احمد نے الغوزے بجائے شرفو نے مرزا صاحباں سنایا۔ تاجا بانسری کی لے پہ خوب خوب چہکا۔ میں نے پنجابی کے ایک نئے شاعر دائم کا کلام سنایا۔ گانے بجانے کے بعد داستانوں کا دور چلا۔ کچھ جگ بیتیاں، کچھ آپ بیتیاں۔ جوان دلوں کی دھڑکنوں کے افسانے۔ گندم، باجرے مکی اور کماد کے کھیتوں میں سے بل کھانے والی پگڈنڈیوں پہ بکھری ہوئی کہانیاں جو آنکھوں کے راستے دل میں داخل ہوئیں اور روح میں رچ کر ہونٹوں پہ آگئیں۔ جب رات بھیگ گئی تو میں نے اپنی ڈب سے وہ تحفہ نکالا جس کا وعدہ تاجے سے کنوئیں پر کر آیا تھا۔ یہ آبنوس کی بنی ہوئی بانسری تھی جو کاریگر نے میری فرمائش پر بنائی تھی۔ تاجا اندھیرے میں اسے دیکھتا رہا اور اس پہ ہاتھ پھیر پھیر کر اسے پیار کرتا رہا۔

صبح میں شہر جانے کے لئے اٹھا تو سورج ابھی نہیں نکلا تھا۔ ماں مجھ سے پہلے اٹھ چکی تھیں۔ دودھ بلو کر تازہ مکھن نکال چکی تھیں۔ مکھن میں تلے ہوئے پراٹھے دہی سے کھائے۔ اور تازہ لسی کے دو کٹورے پی کر گھر سے نکل آیا۔ اندھیرا مبہم

کے سوئے سوئے دھلے دھلے اُجالے میں بدل چکا تھا۔ اور ہر گھر سے گھمک گھوں دودھ بلونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ گلی کے ایک نکڑ پر میں نے زینی کو دیکھا اور پہچان نہ سکا۔ پہچانتا کیسے؟ زینی کی ایک مدھ ماتی نگاہ پر گلی کا ایک ایک موڑ پھول پھلیاں بن گیا تھا۔ روشن صبح کا چہرہ بجلیوں کے ہالۂ نور میں دمکتا ہوا ہیرا تھا کہ اُس پر نگاہ نہ ٹکتی تھی اور زینی صبح کی رانی تھی کہ شبنم کا شہد پی کر اُٹھی تھی، اور یکایک پروان چڑھ گئی تھی۔ کلی کھِل کر پھول بن چکی تھی اور جنک کی آواز خاموش فضاؤں میں نغمے کی طرح منتشر تھی۔ میں ایک لمحے کے لئے ٹھٹکا اور صدیوں تک گردشِ دوراں میں چکر لگاتا رہا۔

میں، ڈی۔ ایم ناز ڈھولن گاؤں کی زینی کی ایک اُچٹتی ہوئی مست الست نگاہ پہ دینا بن چکا تھا۔

کسی نے میرے کانوں میں چیخ کر کہا "دینے او دینے!"

میں نے ذرا سا چڑ کر کہا "میں ڈی۔ ایم ناز ہوں"۔

"ڈھولن گاؤں میں تو صرف دینا ہے"۔

"میں دینا ہوں۔ مجھے دینا ہی کہو۔ میں ڈی۔ ایم ناز بن کر کیا کروں گا؟ اگر ڈھولن مجھے دینے کی حیثیت سے قبول کرلے تو میں ڈی۔ ایم ناز پر سو لعنت بھیجنے کو تیار ہوں"۔

تب ڈھولن کی گلیوں نے مجھے آزاد کر دیا۔ پھول پھلیوں کے جالے ٹوٹ گئے۔ میں نے شہر کی طرف قدم بڑھایا۔ ڈھولن درختوں کے ایک جھنڈ کے پیچھے نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ لیکن زینی ہر سڑک کی ہر موڑ پر مجھے ملی۔ درختوں کے ہر جھنڈ کے پیچھے سے آنکلی۔ کبھی ایک کرن کی تھرکتی ہوئی چلبلاہٹ میں زندہ ہوئی کبھی بلبل کی ایک تان میں چونک کر جاگی، کبھی گھاس کا جنگلی پھول بن کر جھومی، کبھی نسیم صبح کا ایک مست جھونکا بن کر آئی۔ شہر پہنچ کر بھی زینی نے میرا ساتھ نہ چھوڑا۔ میں کئی دنوں تک دینے سے ڈی۔ ایم ناز بننے کی جرأت نہ کرسکا۔

فرم کے اسسٹنٹ منیجر نے ایک دن مجھے اپنے کمرے میں بلا کر کہا۔ "مسٹر ڈی۔ ایم ناز"۔

"جناب!" میں نے ادب سے جھک کر جواب دیا۔

"میرا نام۔ ۔"

"کرسی پر بیٹھئے"۔ اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ہم آپ کے کام سے بہت خوش ہیں"۔ میں شکریہ ادا کرنے کی جرأت بھی نہ کرسکا۔ "ہم منیجر صاحب سے بات کریں گے۔ شاید آپ کو تنخواہ میں کچھ ترقی مل جائے"۔ میں نے اسسٹنٹ منیجر صاحب کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت کرلی۔ دو ننھی ننھی آنکھیں دور کسی کنوئیں کی تہہ میں چمک رہی تھیں اور بُلڈاگ کے سے چہرے پر چیچک کے گڑھے تھے۔ پہلوانوں جیسا مضبوط جسم بڑی پاٹ دار آواز۔ اسسٹنٹ منیجر صاحب کا سارے کارخانے پر رعب تھا۔ میں شکریہ کیا ادا کرتا، تھر تھر کانپ رہا تھا۔

جب میں اسسٹنٹ منیجر کے کمرے سے باہر نکلا تو گنجے کلرک نے جو مجھ سے سینیئر تھا بڑے تپاک سے میرے ساتھ ہاتھ ملایا۔ میں حیران ہوگیا تو اُس نے مجھے پاس کی کرسی پر بٹھا کر پوچھا۔

"اسسٹنٹ منیجر صاحب سے کیا بات ہوئی؟"

"وہ میرے کام سے بہت خوش ہیں"۔

"بس؟"

"نہیں۔ ترقی کے لئے سفارش کرنے کا وعدہ بھی کرتے ہیں"۔

"مبارک باد! لیکن... کوئی شرط پیش کی انہوں نے؟"

"نہیں تو"

"پھر انتظار کیجئے۔ ترقی ملنے سے پہلے..." اُس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ میں نے پوچھا۔ "ترقی ملنے سے پہلے کوئی شرط پیش کی جاتی ہے اور وہ شرط کیا ہے؟"

"آپ شادی شدہ تو نہیں؟"

"نہیں"

"مبارک باد! آپ کے پیشرو یعنی جس کی جگہ پر آپ یہاں آئے ہیں، صرف اسی وجہ سے ترقی سے محروم ہوگئے بلکہ نوکری سے بھی نکالے گئے کہ وہ شادی شدہ تھے"۔

"میں نہیں سمجھا"۔

"بھائی! اسسٹنٹ منیجر صاحب کے ہاں خدا کے فضل سے لڑکیوں کی کھیپ کی کھیپ ہے۔ وہ آپ کو دامادی

کا فخر بخشنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ خوش نہیں؟" میں خوش تو کیا ہوتا البتہ میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ کرسی ہنڈولے کی طرح گھومی اور مجھے چکر آگئے۔ زینی نے طنز بھری مسکراہٹ سے کہا۔ "اتنی سی اوقات پر عشق کرنے چلے تھے؟ واہ!"

اور میں دوسرے ہی دن پندرہ روز کے دورے پر نکل گیا۔ قریہ قریہ گھومتا رہا لیکن سفر کے ہر موڑ پر زینی مجھے ملتی رہی اور اسسٹنٹ منیجر کا بلڈاگ سا چہرہ گھور کر اسے بھگا دیتا۔

دورہ ختم کرنے کے بعد میں گاؤں گیا تو حسبِ معمول رات کا وقت تھا۔ میرا گاؤں تنہا اور اداس تھا۔ کیونکہ چوپال خالی تھا۔ اور سائیں سائیں کر رہا تھا۔ میں نے تاجے کے دروازے پر آواز دی تو تاجے کی بڑی بھابی نے کہا۔ "دین محمد کیا کام ہے؟"

"تاجا کہاں ہے؟"

"گھر میں تو نہیں ہے۔"

"پھر کنوئیں پر ہوگا۔"

"نجانے۔ کیا پتہ؟ دینے! تاجے کو کچھ کر دیا ہے اس کلموہی ڈائن نے۔"

"کون کلموہی؟"

"وہی اکبر کی لگائی... ڈائن... طعنے مہنے مار کر سینہ چھلنی کر دیا ہے میرے سوہنے ویر کا۔"

"اب کہاں رہتا ہے وہ؟"

"کیا بتاؤں۔ خود اسی سے پوچھ لینا۔" میں گھر چلا گیا۔ ماں سے مل کر اور دو لقمے کھا کر تاجے کی تلاش میں نکل گیا۔ تاجا کنوئیں پر بھی نہیں تھا۔ میں مایوس ہو کر لوٹا تو مائی کے ٹبے کی طرف سے بانسری کی آواز آئی۔ اس ٹبے کے تصور ہی سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کے ارد گرد کیکر اور بیری کے درختوں کے جھنڈ تھے۔ بچپن سے سنتے آئے تھے کہ یہ جگہ پکی ہے۔ یہاں چڑیلوں کا ڈیرا ہے۔ تپتی دوپہر کو اور آدھی رات کو سنسان خاموشیوں میں اس طرف کا رخ کرنا بھی دل گردے کا کام تھا۔ اب کچھ عرصے سے اس پر ایک سائیں کا ڈیرا تھا اور تاجے کی بانسری کی آواز اسی طرف سے آ رہی تھی۔ میں نے رات کے اندھیرے میں اس طرف قدم بڑھایا تو جی دہلا۔ جھنڈ سے باہر کھڑے ہو کر میں نے کانپتی ہوئی آواز میں پکارا "تاجے!" دوسری تیسری پکار پر تاجے نے جواب دیا۔ "کون؟"

"میں ہوں دین محمد۔"

"دینے!" تاجے نے کہا۔ "تم آگے آجاؤ گے یا میں تمہارے پاس آجاؤں؟"

"تمہیں آجاؤ۔" کچھ عرصے کے بعد تاجا اندھیرے میں یوں نکلا جیسے کوئی اسرار۔ گھپ اندھیرے میں اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ بولا۔ "ڈر گئے کیا؟"

"ہاں تاجے! تو بھوتوں کے ڈیرے میں کیوں آگیا؟"

"سائیں مستانے سے ملنے آگیا تھا۔ اس کی فرمائش پر بانسری بجا رہا تھا۔"

"پگلے! کہیں کان پھڑوا مندرے پہن کسی بالناتھ کا چیلہ تو بننے کا خیال نہیں؟"

"کیا پتہ دینے!" تاجے نے آہ بھر کر کہا۔ اس کی آواز میں بڑی گمبھیرتا تھی۔ جیسے روح کی پاتال سے نکلی ہو۔

"کیوں چھوٹی بھابی کے طعنوں مہنوں نے..." میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ ہوا کا ایک جھونکا بیری اور کیکر کے درختوں میں سے سرسراتا ہوا گزر گیا۔ میں نے گھپ اندھیرے کو لرزتا ہوا محسوس کیا۔ ایک انجانی آواز نے بڑی دبی زبان سے میرے کان میں کوئی سرگوشی کی۔ میں اس کا مطلب تو نہ پا سکا، پر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ "تاجے! چل گاؤں چلیں۔ چوپال میں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔" پگڈنڈی کا کوئی موڑ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ اندھیرا گہرا تھا۔ اور راستے میں تاجے نے پوچھا۔ "دینے! رانجھا تخت ہزارہ چھوڑ کر جھنگ سیالاں کیوں آیا تھا؟"

"تو مجھ سے پوچھتا ہے؟ رانجھا ہیر سے ملنے آیا تھا۔"

"نہیں دینے! بھابیوں نے اسے طعنے دیئے۔ اگر بھابیاں اسے طعنوں کے تیر نہ مارتیں تو وہ ساری عمر تخت ہزارے میں بانسری بجا بجا کر بتا دیتا۔"

"ڈھولن کے رانجھے!" میں نے ذرا چک کر کہا۔ "تو چھناں (چناب) پار کر کے کس جھنگ سیالاں میں جائے گا۔"

"دینے،" تاجے نے میرے بازو پر ہاتھ کی گرفت

سخت کرتے ہوئے کہا۔ " اوئے ! میں نے تو کب کا چھناں پار کر لیا ہے "۔

میرے تن بدن میں ایک سرسراہٹ سی پیدا ہوئی۔ ایک برفیلا جھونک میرے جسم کو پار کر گیا۔ میں نے جی کڑا کر کے پوچھا۔

" چھناں پار تو نے کسی ہیر کو بھی پایا، یا پھولوں کی سیج ۔۔۔؟ میں بات پوری نہ کر سکا۔

" دینے! تیری دی ہوئی بانسری کے ایک نغمے نے ہیر کو جنم دیا۔ ہیر چھناں کے اُس پار کھڑی تھی۔ ڈھولن کی ایک گلی میں رانجھا تھا، دوسری کے ایک موڑ پر ہیر، اُس کے انتظار میں کھڑی تھی "۔

" پھر؟" میں نے ذرا گھبرا کر پوچھا۔

" رانجھا چھناں پار کر گیا "۔

" تیری ہیر کون ہے؟" میری آواز لرز رہی تھی۔

" زینی "۔ ایک تیر میرے سینے میں پیوست ہو گیا۔ میں نے خون کے سمندر میں ڈوب کر ہاتھ پاؤں مارے پر میں لہروں کے جبڑوں سے بچ کر نہ نکل سکا۔ صبح کے اُجالے اور اندھیرے میں مَیں نے گلی کے اُس موڑ پر زینی کو دیکھا۔ زینی کی آنکھوں میں صبح کی روشنی تھی۔ صبح کے تارے کا لرزتا ہوا کیف تھا۔ خنک ہوا کا شہد سے بھرا رَس تھا پَر میں جو ڈھولن کا دینا ہوں اور ڈھولن سے باہر ڈی۔ ایم ناز ہوں نجانے پھر دینا کیوں نہ بن سکا۔ زینی کی وہ نظر جو مجھے ڈی ایم ناز سے دینا بنا گئی تھی پھر مجھے وہ کایا کلپ عطا نہ کر سکی۔ میں نے اس صبح اِس ایک نظر کے سہارے نیلے آسمانوں کی سیر کر لی تھی، آج یہی نظر مجھے پاتال کی دلدل میں لے گئی تھی۔

دینے سے ڈی۔ ایم ناز بننا کتنا آسان تھا۔

ڈی۔ ایم ناز سے دینا بننے کے لئے تو کسی زینی کی نگاہِ کیمیا گر کی ضرورت تھی۔ اِس ایک نگاہ سے گاؤں کا دھیدو ڈھولن کا رانجھا بن چکا تھا۔ شاید ڈھولن کا دینا جو شہر کا ڈی۔ ایم ناز تھا۔ بانسری ہاتھ میں لے کر مائی کے تھڑے پر سائیں مستانے سے جوگ لینے کو تیار نہ ہوتا۔ یہ تو کسی سر پھرے کا کام تھا۔

جب میں گاؤں سے شہر جا رہا تھا تو زینی نے پھر میرے ساتھ آنکھ مچولی کھیلی۔ وہ مجھے ہر موڑ پر ملی۔ ہر گھنے درخت کے پیچھے سے نکل کر سامنے آموجود ہوئی۔ میرا دل بھر آیا۔ میری آنکھیں روئیں۔ پھر میں نے سوچا، ہیریں قربانی دیئے بغیر نہیں ملا کرتیں۔ ہاں! کھیڑے اپنی دولت اور طاقت کے زور پر انہیں رانجھوں سے چھین لے جایا کرتے ہیں۔ میں اگر ڈھولن کا رانجھا نہیں بن سکتا تو کھیڑا ضرور بن سکتا ہوں۔ میں میٹرک پاس ہوں اور ایک سو بیس روپے تنخواہ پاتا ہوں۔ میں اگر ذرا سا اشارہ بھی کر دوں تو زینی کا ڈولا اپنے ہاں لا سکتا ہوں۔ سوچ کے اِس مرحلے پر میں نے ایک ٹنڈ منڈ درخت کے ساتھ ٹیک لگا لی، آنکھیں میچ لیں۔ اور دنیا میں اندھیرا چھا گیا۔ زینی ایک خشک پتے کی طرح راکھ ہو گئی۔ زندگی ہرے بھرے پتوں کا لباس اُتار کر ٹنڈ منڈ ہو گئی۔ اور ننگ دھڑنگ وحشی بھتنوں کا ناچ ناچنے لگی۔" دینے ! تو اپنے دوست، گاؤں کے شاعر تاجے سے، جو کبھی دھیدو تھا اور اب رانجھا، بن چکا ہے، کھیڑوں کا خونی کھیل نہیں کھیل سکتا"۔ شہر پہنچ کر میں نے اسسٹنٹ مینجر صاحب کے ہاں ایک شام چائے پینے کا وعدہ کر لیا۔ گنجا کلرک مکاری سے مسکرا کر کہنے لگا۔ " لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا "۔ اور چند دنوں کے بعد میں نے دو تین ترقیاں حاصل کر لیں اور اسسٹنٹ مینجر صاحب مجھے ہونے والا داماد سمجھ کر مسٹر ڈی۔ ایم ناز سے صرف "ناز بیٹا" اور "برخوردار" کے القابات سے نوازنے لگے۔

چوپال پھر تنہا، خالی اور اُداس تھا! میرا دل سیسے کا بے جان ٹکڑا بن گیا۔ میں تاجے کے گھر نہ گیا۔ میں نے مائی کے تھڑے کا رخ بھی نہ کیا۔ گلی کے ایک موڑ پر شرفو ملا۔ اس نے کہا "چودھری دین محمد! اب تو زندگی میں مزا نہیں رہا"۔

" کیوں کیا ہوا؟"

" تاجے نے چوپال میں آنا بالکل چھوڑ دیا ہے "۔

" تاجے کو کسی باؤلے کتے نے کاٹ کھایا ہے؟"

" چودھری ! تجھے پتہ نہیں وہ تو سائیں مستانے کا چیلا بن چکا ہے۔ دن رات اس کے پاس رہتا ہے۔ رات ہوتے ہی بانسری کو منہ

لگاتا ہے اور وچھوڑے (فراق) کے گیت گاتا رہتا ہے۔"

"کیوں؟ وچھوڑا کیسا؟"

"چوہدری! تاجے نے رانجھے کا روپ بھر لیا ہے۔"

"اُسے کوئی ہیر بھی ملی؟" میں نے جان بوجھ کر بھولا بنتے ہوئے پوچھا۔

"بھولے بادشاہو! ہیر کے بغیر بھی کوئی تاجا رانجھا بنتا ہے، بھلا۔ وہ زینی جو ہے نا ...... بند کلی کی باس کی طرح گاؤں کی نظروں سے اوجھل تھی پھر جب بند کلی کھلی تو سب سے پہلے تاجا اس کلی کا بھنورا بنا۔"

"شرفو! کیا پتہ! نظر کا تیر پہلے کس کے سینے میں پیوست ہوا" میں نے آہ روک کر کہا۔

"پر چوہدری! اب تو دُنیا جان گئی ہے کہ ہیر کون ہے اور رانجھا کون؟"

"ہاں! ہاں! تاجے کو رانجھے کا سوانگ بھرنے کی کیا ضرورت تھی۔ زینی کون سی محلوں کی رانی ہے کہ تاجے کی کٹیا میں نہ آسکتی تھی۔"

"کیا بتاؤں چوہدری! تاجا بھی کچھ عجیب بادشاہ بندہ ہے۔ اپنے عشق کو مشک بنا کر پھیلایا ڈھولن گاؤں میں۔ اب بچے بچے کی زبان پر اس کا قصہ ہے۔ زینی کے بھائیوں نے کہا ہے زینی کو کنوئیں میں پھینک دیں گے پر اس کا ڈولا تاجے کے گھر نہیں جائے گا۔"

"کیوں؟" میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا

"چوہدری! دنیا والوں کو پیار کرنے والوں سے اللہ واسطے کا بیر ہوتا ہے اور اب تو تاجے اور زینی کا قصہ چاروں کھونٹ بکھر گیا ہے۔ کوئی وارث شاہ اس کو بھی لے اڑے گا۔"

اندھیرا گہرا ہو گیا تو گھر اپنی آمد کی اطلاع دے کر میں تاجے کے کنوئیں پر چلا گیا۔ تاجے کا بڑا بھائی کنوئیں پر موجود تھا۔ میں نے کہا۔

"بھیّا! تاجے کو کیا ہو گیا ہے؟ مائی کے ٹبے پر سائیں مستانے کے پاس ڈیرا لگا کر بیٹھ گیا ہے۔ زینی کون سی جھناں پار کی شہزادی تھی کہ تاجے کو جوگ لینا پڑا۔ تو زینی کے گھر والوں کے پاس جا اپنی برادری کے لوگ ہی تو ہیں۔"

تاجے کے بھائی نے ایک دو لمحے سوچ کر کہا "دین محمد! لوگ کہتے ہیں تاجے نے ڈھولن کی خاک اڑائی ہے۔ رانجھے تو باہر سے آتے ہیں۔ کوئی اُن کا سنگی ساتھی نہیں ہوتا، پر اپنے گاؤں کو رانجھے کو لوگ کیا کہیں۔ میں کل زینی کے باپ کے پاس جاؤں گا۔ میرا جی کہتا ہے وہ نہیں مانیں گے اور زینی کے گھر والے مان گئے تو تاجا نہیں ملنے گا۔"

"وہ کیوں بھا؟ تاجا بھلا کیوں نہ ملنے گا؟"

"دین محمد! کچھ لوگوں کی رگ دُنیا جہان سے نیاری ہوتی ہے۔ تاجے کو زینی جو یوں سستے داموں مل گئی تو اس کا پیار ڈال سے ٹوٹے ہوئے پھول کی طرح مرجھا جائے گا۔ کچھ لوگ پھول کو ٹہنی سے توڑ لیتے ہیں۔ کوئی سر پھرا ایسا بھی ہوتا ہے جو شاخ کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہتا ہے۔ کلی چٹکتی ہے پھول بنتی ہے۔ مرجھاتی ہے اور پھر خاک ہو کر خاک میں مل جاتی ہے پر یہ لوگ بلبل کی طرح گاتے گاتے خود بھی اس کے ساتھ خاک میں مل جاتے ہیں۔" تاجے کے بھائی کی آواز میں غم لرز رہا تھا۔ میرے بدن میں جھرجھری سی آئی۔ میرے کان میں ایک چونکی ہوئی آواز نے کہا "ڈی۔ ایم تاز! تجھے کیا پتہ کہ رانجھے کس مٹی سے بنے ہوتے ہیں۔ تو تو مٹی کا کیڑا ہے، پر لگا کر نیلی فضاؤں میں اُڑنا کیا جانے؟"

"بھا! تو نے سچ کہا" ڈھولن کے دینے نے بڑی دھیمی آواز میں کہا۔

"میں کل صبح زینی کے باپ کے پاس جاؤں گا۔ دین محمد! تو تاجے سے مل۔ پھر دیکھ کیا بنتا ہے۔"

میں علی الصبح اُٹھا۔ ابھی مرغ نے اذان بھی نہ دی تھی۔ مائی کے ٹبے پر سوئی سوئی سنسان خاموشیوں کا راج تھا۔ درخت سوئے ہوئے تھے۔ درختوں کے جھنڈ کا گہرا سایہ سویا ہوا تھا، مجھے مائی کے ٹبے سے ڈر لگا۔ میں درختوں کے جھنڈ میں سے گزرا تو نیچی ٹہنیاں میرے سر سے ٹکرا کر اوس کے ٹھنڈے چھینٹے دے گئیں اور پھر ایک جگہ جہاں گھاس کا گیلا فرش تھا۔ میں نے تاجے اور زینی کو دیکھا جو ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈالے ایک درخت سے ٹیک لگا کر سو رہے تھے۔ تاجے کی بانسری ایک طرف گھاس پر پڑی تھی۔ میں ٹھٹک کر دو قدم دور کھڑا ہو گیا۔ دو قدم کے فاصلے پر معصومیت نے ایک پاکیزہ حصار کھینچ دیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر میں نے دو قدم اور بڑھائے تو جل جاؤں گا۔ بھسم ہو کر راکھ ہو جاؤں گا۔ میں دبے پاؤں لوٹ آیا۔ میرے پاؤں کی اگر ذرا سی بھی چاپ آئی تو تقدس کی وادی بھک سے اڑ جائے گی۔ پیار اور سپنوں کے سنہری جال ٹوٹ جائیں گے۔ دھنک تڑخ کر زمین پر آ رہے گی اور میں جھنڈ سے دور ہٹ کر پگڈنڈی کے ایک موڑ پر بیٹھ گیا

یکایک مرغ نے دور کہیں اذان دی۔ جادو ٹوٹ گیا۔ درختوں کی پھننگیں لہرائیں۔ مشرق کا اندھیرا لرزا اور اجالوں کے مدھم دیئے روشن ہوئے اور پھر زینی ایک سائے کی طرح میرے پاس سے گزر گئی!۔

میں نے کہا "تاجے! یہ تو نے کیا سوانگ بھر لیا؟ رانجھے نے اس وقت جوگ لیا جب ہیر کا ڈولا کھیڑوں کے ہاں پہنچ گیا تھا۔"

"دینے! رانجھے اپنے زمانے کے راٹھ ہوتے ہیں۔ جوگ تو نکے من کی موج ہے۔ جب چاہا لے لیا۔"

میں نے ذرا غصے میں آکر کہا "تاجے! تو ہیر رانجھے کا ڈرامہ کھیل رہا ہے یا پیار کی منزلیں طے کر رہا ہے، اس سے کچھ سروکار نہیں لیکن تو نے ڈھولن کی عزت مٹی میں ملا دی ہے۔"

"میں کسی ڈھولن کی مٹی کا کیڑا نہیں، تو کس ڈھولن کا قصہ لے بیٹھا ہے؟"

"تو ایک اشارہ کر دیتا تو زینی کا ڈولا تیرے گھر آ پہنچتا۔ زینی کون سے محلوں کی رانی تھی؟"

"محلوں کی رانی! وہ تو دنیا جہان کی رانی ہے۔ میرے دل سے پوچھ دینے! اس میں کس کا راج ہے۔"

"زینی تیرے دل کی رانی ہے پر وہ ڈھولن کی عزت بھی تو ہے۔"

"دینے!" تاجے نے ذرا سختی سے کہا "میں بھی ڈھولن کی عزت میں تمہارا ساجھی ہوں۔"

"پھر یہ رات کے اندھیرے میں تاجے اور زینی کا درختوں کے جھنڈ میں ملنا اور ایک دوسرے کے . . . . ." ڈی۔ ایم ناز اپنی بس بھری بات پوری نہ کر سکا۔ تاجے نے اس کے گلے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"تو میرے سچے پیار کی ہتک کر رہا ہے کیدو!"

ڈی۔ ایم ناز کی آنکھیں ابل آئیں۔ تاجے نے اس کے گلے پر سے ہاتھ اٹھا لیا۔ میں نے کہا "تاجے! یہ بات تیرے دینے نے نہیں کہی تھی۔ یہ تو ڈی۔ ایم ناز کے دل کا کیچڑ تھا جو اس کے ہونٹوں پر آ گیا!"

"تیرے ڈی۔ ایم ناز کی . . . . ." تاجے نے ہونٹوں پر آئی ہوئی گالی نگل کر کہا۔ "دینے! جب تو ڈھولن میں آیا کرے تو ڈی۔ ایم ناز کو وہیں شہر کی گندی نالیوں میں چھوڑ آیا کر۔"

زینی کے بھائیوں نے تاجے کے بڑے بھائی کی سخت بے عزتی کی۔ تاجے کے بھائی نے سر جھکا کر سب کچھ سہہ لیا۔ زینی کے باپ نے کہا "اوئے! تو اب آیا ہے جب میری اجلی پگڑی خاک میں مل چکی ہے۔ جا! اب زینی کا بیاہ کسی چمار سے ہوگا۔ وہ تیرے گھر نہیں جائے گی۔" پنچایت میں بھی اسے بری بری باتیں سننا پڑیں۔ میرا جی دکھا، پر میں کس کھیت کی مولی تھا۔ زینی پر کڑے پہرے بٹھا دئے گئے اور راتی کے ٹبے پر تاجا بانسری بجا بجا کر زینی کو بلاتا رہا۔ پر ستاروں کی روشنی میں زینی اپنے آنگن میں پڑی بانسری کی لے پر نیر بہاتی رہی اور آسمان سے شبنم کی بوندیں گرتی رہیں۔ یہ ستاروں کے آنسو!

میں اگلے دن شہر جانے کے لئے صبح سویرے گھر سے نکلا۔ گاؤں حسبِ معمول سویا ہوا تھا اور بیدار بھی۔ گھمک گھوں مدھانیاں دہی سے مکھن جدا کر رہی تھیں۔ گلی کی نکڑ پر مجھے زینی ملی۔ آج اس کی ایک نگاہِ غلط انداز نے مجھے بگولا بن کر نہ اڑایا۔ میں نسیمِ صبح کے اس جھونکے کی طرح بجھ کر رہ گیا جس کے راستہ ریت کے ایک تودے نے روک لیا ہو۔ آج زینی کی نگاہوں میں الھڑ دوشیزگی کا بولتا ہوا جادو نہیں تھا اور پھر یہ نگاہیں کچھ بھی تو نہ تھیں۔ میں ان نگاہوں کی کیفیت بیان نہیں کر سکتا کیونکہ یہ زمین پر تھیں لیکن آسمان سے بھی ان کا رشتہ قائم تھا۔ پیار کے اس مرحلے پر زینی کا جسم اس کی روح سے علیحدہ معلوم نہ ہوا۔ زینی کا جسم جس نے پیار کا نغمہ سنا تھا اور اس نغمے کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا اور اب جسم اور روح میں کوئی امتیاز باقی نہ رہا تھا۔ مجھے تو زینی کا انگ انگ تاجے کی بانسری کا نغمہ محسوس ہوا جیسے میرے کان سن رہے تھے اور جو میری روح میں رچ رہا تھا اور کثافتیں ڈھل ڈھل کر صاف ہو رہی تھیں۔ ایک لمحے کے بعد کانپ کر میں نے شہر کی راہ لی۔

ڈھولن جو اندھیرے میں ہمیشہ اداس اور تنہا معلوم ہوتا تھا آج راکھ کی طرح بجھا بجھا لگ رہا تھا۔ کوئی دیا بھی تو روشن نہ تھا۔ چوپال سائیں سائیں کر رہا تھا۔ میں نے شرفو کے گھر جا کر آواز دی۔ شرفو باہر آیا تو میں نے پوچھا "شرفو! آج تو گاؤں مفلس کی دئے کی طرح سرِ شام ہی سے بجھ کر رہ گیا ہے جیسے اس کی روح نکل گئی ہو۔"

"ہاں چوہدری! گاؤں کی روح نکل گئی ہے۔"

"کیوں؟"

"زینی چلی گئی۔"

"تاجا اسے لے کر......"

"نہیں بھولے بادشاہ! تاجے کے ساتھ نہیں.... اپنے سسرال میں.... ڈھول تاشے اور نفیریوں کے ساتھ......"

"اور ڈھولن کا رانجھا بانسری بجاتا رہا۔"

"نہیں چوہدری! رانجھے نے ڈھولن کی عزت پر اپنے پیار کو بھینٹ چڑھا دیا۔ بیاہ کی رات زینی سہیلیوں کے جھرمٹ سے نکل کر اور سب کی آنکھوں میں دھول ڈال کرمائی کے ٹبے پر جا پہنچی۔ زینی کے بھائیوں نے چھوی ٹوکے ہاتھ میں لے لئے پر گاؤں کے بڑے بوڑھوں نے کہا۔ دیکھو! ڈھولن کی عزت خاک میں نہ ملاؤ"۔ تاجے کا بڑا بھائی مائی کے ٹبے پر گیا۔ اس نے اپنی پگڑی تاجے کے پاؤں پر رکھ دی اور کہا" تاجے! یہ پگڑی تیرے بھائی کی نہیں ڈھولن کے سارے گاؤں کی ہے۔ اس کی لاج رکھ لے۔" میں نے شرفو کی پوری بات نہ سنی، پاگلوں کی طرح بھاگا، ٹھوکریں کھاتا، کانٹوں سے اُلجھتا، گرتا پڑتا مائی کے ٹبے پر پہنچا۔ میں نے دور ہی سے آواز دے کر تاجے کو بلایا۔ تاجے نے میرے بازو پہ ہاتھ رکھ کر کہا" کیوں دینے! تو مجھے زہر میں بجھے تیر مارنے آیا ہوگا۔"

"ہاں! رانجھے کے بچے! تو نے ڈھولن کی لاج تو رکھ لی پر ڈھولن کے پھول کو غیروں کے ہاتھ میں دے دیا کہ وہ اُسے مسل کر ہوا میں بکھیر دیں۔"

تاجے نے میرے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے کہا" بس، بس، سانپ کے بچے! جا اپنی گندی نالی میں ڈوب مر۔ تو کیا جانے پیار کی ریت کیا ہوتی ہے؟"

سائیں مستانہ تاجے کی آواز سن کر اپنی کٹیا سے نکل آیا۔ اس کے ہاتھ میں بھنگ گھوٹنے کا ڈنڈا تھا۔ اس نے ڈنڈا ہوا میں لہرا کر کہا۔ "جا جا، دنیا کے کتے! تو میرے ملنگ کو بہلانے پھسلانے آیا ہے۔"

"سائیں بادشاہ! یہ تو میرا دوست دینا ہے۔" تاجے نے کہا لیکن اس کا ہاتھ بدستور میرے منہ پر تھا۔ میں نے غصے سے بھرائی ہوئی گھٹی گھٹی آواز میں کہا" زینی کو منجدھار میں دھکا دے کر تو خود کنارے پر کھڑا ہوگیا۔ تاجے! کہ اس کے ڈوبنے کا تماشا دیکھے؟ زینی تو ڈھولن کی روح تھی۔ روح نکل گئی۔ اب ڈھولن اپنی عزت کا خالی ڈھول پیٹتا رہے۔"

اور پھر میرا غصہ جلتے پھنکتے آنسوؤں کا دھارا بن گیا۔ شاید ایک قطرہ تاجے کے ہاتھ پر گرا۔ اچانک وہ میرے درد سے واقف ہوگیا۔ اس نے چونک کر اپنا ہاتھ میرے منہ سے ہٹا لیا، پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا" دینے! ایسا لگتا ہے جیسے تو بھی پیار کی ریت جانتا ہے.... مجھے معاف کر دے دینے!.... پہلے تو میں نے جوگ کا سوانگ بھرا تھا۔ اب میں کان پھڑوا مندرے پہن سچ مچ جوگ لے لوں گا۔"

ـــ غیر طلبیدہ مضامینِ نظم ونثر صرف اس حالت میں واپس کئے جائیں گے جب کہ اُن کے ساتھ ڈاک کے مناسب ٹکٹ روانہ کئے گئے ہوں۔

ـــ مسترد مضامین کے سلسلے میں غیر ضروری خط وکتابت کرنے سے ادارہ کو معذور سمجھا جائے۔

ـــ ایک ہفتہ تک اطلاع موصول نہ ہونے پر مرسلہ مضامین ناقابلِ اشاعت تصور کئے جائیں۔

ـــ ادارہ ڈاک میں کسی مسودے کے گم ہوجانے کا ذمہ دار نہیں۔

(ادارہ)

اب ؛ ـــــ بقیہ صفحہ ۵۰

اب کیا تھا (مہ: اب کیا تھا آپے سے باہر ہوگئے)

اب نہ تب۔ وغیرہ

مخففات

فت = فتحہ	سک = سکون	ظ = ظرف
ف = فعل	ح = حرف	ہ = نظم
ف = فقرہ	کؒ = کلیات	د = دیوان
ص = صفحہ	مہ = مثال، بمن مرتب*	

* آکسفورڈ نیو انگلش ڈکشنری کی طرح ہر لفظ کے ہر مفہوم کی مثال مختلف ادوار سے پیش کی گئی ہے، مگر سنین کی ترتیب برعکس رکھی گئی ہے تاکہ جدید تر مثال پہلے آئے۔

لسانیات:

آب

شان الحق حقی

وزارت تعلیم کا قائم کردہ ترقی اردو بورڈ اردو کی ایک کلاں لغت بڑی آکسفورڈ ڈکشنری کے نمونے اور پیمانے پر تیار کر رہا ہے۔ اِس وقت یہ وسیع مہم فراہمیٔ الفاظ و اسناد کی منزل میں ہے۔ یہ ایک جامع تالیف ہوگی جس میں معنی کے ساتھ اردو ادب میں ہر لفظ کے استعمال کی تاریخ وار مثالیں اور اصول و اشتقاق بھی درج ہوں گے۔ ماہ نو کے سابقہ شمارے میں حرفِ ا کی تشریح نمونۃً پیش کی گئی تھی۔ اِس بار حقی صاحب نے جو بورڈ کے سیکریٹری ہیں لفظ آب کی تشریح ماہ نو کے لیے مرتب کی ہے جس سے اردو کی مطلوبہ و مجوّزہ لغت کی نوعیت کا اندازہ ہوگا۔ سابقہ تشریح کی طرح یہ بھی حقی صاحب کی ذاتی کاوش ہے، بورڈ کا تصفیہ شدہ مسودہ نہیں۔ (مدیر)

آب (فت ا سک ب) ظرف، تابع ف

۱۔ بطور ظرف مراد عموماً زمانۂ حال (الف) ماضی کے خلاف یا بالمقابل

(۱۹۲۱ء) ؎ نظرِ لطف و کرم یار کی آب وہ نہ رہی
پہلے اک بات جو بھتی پیا کی آب وہ نہ رہی
اکبر، ک اول ص۱۷

(۱۹۱۴) ؎ قوم میں جیسا حال ہے اب
آدمیوں کا کال نہ تھا
حالی د ص ۱۷

(۱۸۶۲) ؎ اب جو لکھتا ہے وہ یہ کلمے کو لکھتا تھا کبھی
دیکھو تو اس بت مغرور کا پہلا کاغذ
ظفر، ک اول

(۱۷۱۳) ؎ کہاں اب پائیے ایسا شہنشاہ
مکمل اکمل و کامل دل آگاہ
جعفر زٹلی ک

(۱۶۷۲) ؎ دکن کا کہن شعر اب بے عدد
لگے کہنہ تقویم مانند رد
نصرتی، گلشن عشق ص ۲۱۹

(ب) یا مستقبل کے برخلاف

(۱۹۰۲) ؎ اب تو بے قدر سمجھتے ہو خفا رہتے ہو
جانِ جاں یاد کروگے جو گزر جائیں گے
داغ ک ص

(۱۸۰۱) ف تجھے صبح نکال لوں گا پر اب اِن کے سامنے گرد
حیدری، آرائش م ص۱۲۴

(۱۷۸۶) ؎
یہ کس کو خبر ہے اب کے بچھڑے
کیا جانئے اس سے کب ملیں گے
میر حسن د

(۱۶۴۹) ؎ چمن میں دل کے اب نیناں تھے پانی باندھا نجواں کا
جو لیا وے پھول ہور پھل بار حاجت کا درخت اپنا
غواصی، ک ص ۳۲

(ج) یا ماضی و مستقبل دونوں کے بالمقابل، محض زمانۂ حال۔

(۱۹۱۰) ف: اب تو دنیا میں آگ لگی ہوئی ہے۔ آزاد، دربار اکبری ص ۴۲۵

(۱۸۶۲) ؎ ہمیں ساغر بادہ کے دینے میں اب کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب
کہ یہ عہد نشاط یہ دور طرب نہ رہے گا جہاں میں سدا نہ رہا
ظفر، ک اول ص ۱۲

(۱۶۹۹) ے یار اب ہے سو کچھ عجب ہے رے
اب جو سب ہے سو کچھ عجب ہے رے
تجری، ک ص ۲۱۶

(۱۶۳۴) ف: اگر گیان ہے تو سمجھ اب کچھ وجہی "سب رس" ص ۲۴

۲- (الف) اِس زمانے میں، اِس دور میں، اِن دنوں، آجکل - زمانۂ حال کے ساتھ استمرار و تسلسل کے معنی رکھتا ہے۔

(۱۹۴۸) ے اے آرزو کیسی دنیا اُلٹ گئی ہے
وہ دوستوں میں اب ہے شیوہ جو تھا عدو کا
فغانِ آرزو - ص ۸۰

(۱۸۰۳) ف: اب اس بستی میں بیکس واقع ہوا ہوں اور تم میرے دین دنیا کے باپ ہو۔ میرامّن ص ۲۳۷

(۱۶۸۲) ے کہاں اب منوچہر ہے راج وال
حکومت ہے اس کی بڑی آج دال
فائز د ص ۱۱۴

(ب) فی الوقت، سرِدست، موجودہ صورتِ حالت کیفیت میں۔

(۱۸۷۴) ع: پر اب تو مجھے جان کی، اصغر کی پڑی ہے
انیس، مراثی اول ص ۱۶

(۱۸۱۰) ے جرأت اب بند ہے تنخواہ تو یوں کہتے ہیں
کہ خدا دیوے نہ جب تک تو سلیمان کب دے
جرأت. ک

(۱۶۳۴) ے کھینچا ہے دل کو عشق نے اب دل کوں کچھ چارا نہیں
عاشق کوں کوئی کیتا رکھے کس تے رہن ہارا نہیں
وجہی سب رس ص ۴

(۱۶۷۲) ے رکھن اِنا موس و عزت کوں تو بچ
بڑا اسب تے اب عقل و ہمت کوں تو بچ
نصرتی گلشن عشق ص ۲۵

(ج) اس نوبت، اس مرحلے پر، یہاں پہنچ کر۔
(کہاوت) اب پچھتائے کیا ہوئے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

(۱۹۳۷) ے ہوش میں آجاؤ مضطر ہو چکا خواب شباب
اب تو جاگو صبح پیری کی اذاں ہونے لگی
مضطر خیرآبادی - بہارستان ص ۲۵

(۱۸۶۹) ے اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا
غالب

(۱۷۴۴) ے زندگی کی دل کوں اب امید نئیں
جب سے تیرے عشق کی لاگی ہے پھانس
ولی ک۔

(۱۶۷۲) ے یو سن بات ہوئی پھر کے رنجیدہ دل
کہی اب کریں آؤ یک شرط مل
نصرتی گ ع ص ۷۰

(د) اِس وقت، اِس لمحے، اِس دم

(۱۸۶۹) ے مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر
غالب د ص ۱۰۴

(۱۸۳۰) ے ہم تو ہو جائیں اُس سے اب گستاخ
ہونے دے گا مگر وہ کب گستاخ نظیر اکبرآبادی ک

(۱۸۱۰) ے ایک مدت تھی آج کل پہ بات
اب ہوئی صبح اب ہوئی ہے رات
میر ک اول

(۱۶۱۱) ے عشرت منجے ولا اب جوں خضر جم جلا اب
پیالے مدن پلا اب آیا ہنگام ساقی
قلی قطب شاہ ک ص ۱۰۳

(س) (کنایتہً) اِس زندگی میں، اِس دنیا میں، موت سے پہلے پہلے۔

(۱۸۵۴) ے اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے
ذوق ص ۸۴

(۱۸۰۳) ے عاقبت کی خبر خدا جانے
اب تو آرام سے گذرتی ہے
آفتاب، نادرات

(۱۶۳۴) ف: اگر گیان ہے تو سمجھ اب کچھ
وجہی سب رس ص ۲۴

۳۔ ظ۔ بمعنیٰ استقبال (الف) مستقبل قریب میں، بہت جلد، کوئی دم میں، ذرا کی ذرا میں، دیکھتے دیکھتے، فوراً، ترت، جھٹ پٹ۔

(۱۹۰۵) ؎ نہ آیا نامہ بر اب تک گیا تھا کہہ کے اب آیا
الٰہی کیا ستم ٹوٹا خدایا کیا غضب آیا
داغ ص ۹

(۱۸۹۶) ؎ مرغان باغ کس لئے گھبرائے جاتے ہیں
اب دیکھیے بہار کے دن آئے جاتے ہیں
وحید، انتخاب

(۱۸۱۰) ؎ اے عدم ہونے والو تم تو چلو
ہم بھی اب کوئی دم کو آتے ہیں
میر، ک دوم ص ۸۵

(۱۶۱۹) ؎ سوا دڈائینی ہے کہ آتی ہے اب
یو دریا میں اندکار اس کا ہے سب
غواصی، سیف الملوک ص ۶۹

(ب) آئندہ، اِس دم سے، اِس وقت کے بعد، لمحۂ موجودہ سے مدت غیر معینہ تک۔

(۱۹۴۸) ؎ دل گیا یوں کہ اب نہ آئے گا
خیر بہتر ہوا ٹھکانے لگا
فغان آرزو ص ۶۴

(۱۸۶۱) ؎ بت خانۂ چیں ہی ترا گھر
مومن نے تو اب نہ آئیں گے ہم

(۱۸۷۴) ؎ اب دیکھیے ان مرا شام و سحر کون رکھے گا
پردیس میں اب ان کی خبر کون رکھے گا
انیس مراثی اول ص ۱۴۱

(۱۸۱۰) ؎ ہوا رنگیں یہ ہے تو توت وقت ہے ظلم
نماز چھوڑ دیں اب کوئی دن گناہ کریں
میر، ک اول ص ۷۷

(۱۸۵۳) ؎ وفا سے میں نے بھی اب ہاتھ اٹھایا
قسم ہے مجھکو اپنے بے وفا کی
خواجہ وزیر ص ۲۰۳

(۱۶۷۲) ؎ وہ آوے تلک رہ تو خوش حال اب
کریں گے سبب جوں ہے تیرا طلب
نصرتی ک، ع ص ۳۴

(ج) مکرر، دوبارہ، پھر کر، اگلی بار، اِس کے بعد

(۱۹۴۸) ؎ عاجزی کی حد ہوئی ڈرتے سے نہ اے دل کام لے
وہ چھڑائیں اب جو دامن تو گریباں تھام لے
فغان آرزو ص ۱۸۱

(۱۸۱۳) ؎ معین ہے اب ساعتِ سعد کل
بس اب کل کرو روشن آ کر محل
مرزا جان طپش

(۱۸۶۴) ؎ مری جان رنج گھٹائیے قدم آگے اب نہ بڑھائیے
نسیم دہلوی ص ۳۴

(۱۶۷۲) ؎ سنو اب چندر سین کی بات ہے
کھلے بخت سو تس عجب دھات ہے
نصرتی گلشن ع ص ۲۰۰

۴۔ ظ بمفہوم ماضی قریب: تھوڑی دیر، تھوڑے عرصے یا کچھ دن پہلے، ذرا دیر ہوئی (مقابلے یا مبالغے کے طور پر)

(۱۹۴۵) ؎ آدم سے بھی پہلے گذرے آدم
یہ آدم ابو البشر تو اب تھا
ناداں دہلوی

(۱۹۱۲) ف: چار مہینے بعد تو تم ماں کے گھر سے اب آٹھ دن ہوئے کہ آئی ہو۔ نذیر احمد، مرآۃ ص ۲۷

(۱۹۴۸) ؎ دیدۂ کم سے نہ دیکھو اور خود بیں جیسا زمانہ ویسی بات
خوئے نیاز تو اب ڈالی ہے، ورنہ سراپا ناز تھے ہم
فغان آرزو ص ۱۱۷

(۱۸۵۳) ؎ لگا کر اب لہو داخل ہوئے ہیں سب شہیدوں میں
صنم میں ہوں قتیل ابروئے خمدار برسوں سے
خواجہ وزیر

۵۔ کسی خاص وقت، موقعے، مرحلے پر یا صورت میں۔

(۱۹۲۶) ف: اب یہاں انہوں نے نئی فوج بھرتی کرنا شروع کی۔
شرر، مشرقی تمدن ص ۶۳

(۱۹۱۰) ف: اب یہ عالم ہوگیا کہ امرائے دربار تو بالائے طاق رہے، وہی صدر مفتی الممالک تھے جنہوں نے جشن نوروزی میں بادۂ گلرنگ کا جام لے کر پیا۔ آزاد۔ دربار اک ص ۱۱۳

(۱۶۸۲) سے ولے اب جو تھا میں مرے دھیان میں
کہا یو جنا ور مرے کان میں
فائز، روح افزا ۹۳

۶۔ اتنی دیر میں، اتنی تاخیر سے، اتنا کچھ ہو جانے، حد گذر جانے پر، اپنے وقت کے بعد: م: آپ کو اب خبر ہوئی؟
کیوں جی اب آئے ہو؟

(۱۹۳۲) جو آپ بھی نہ تکلیف فرمائیے گا
تو بس ہاتھ ملتے ہی رہ جائیے گا
جگر، ش ط ص ۱۶۹

(۱۸۵۳) سے وزیر اب تا کجا یہ بت پرستی
کسی دن تو بھلا یاد خدا کر
خواجہ وزیر، دفتر فصاحت ص ۸۰

(۱۶۱۱) سے تم یاد تھے ہوا ہے مو مو ہنے مو تن[1]
اب نا کریں تم ہم پہ ہو رکیب کریں رعایت
قلی قطب شاہ ک ص ۲۷۰

۷۔ بطور ظرف مکاں (شاذ) یہاں، یہیں، اس جگہ، اس سے آگے کا مفہوم رکھتا ہے: م: ایک باب ختم ہوا، اب دو صفحے غائب ہیں۔ یہیں ٹھہر جاؤ، اب غیر علاقہ ہے۔ یہ دو گز ہوا، یہ چار گز، اب کاٹ دو۔

(۱۸۷۴) سے اب یاں سے رقم کرتا ہے یوں راوی صادق
انیس، مراثی اول ص ۹۶

(۱۸۱۳) سے کھلنے کو جو ہے طلسم تقدیر
اب خامے نے یوں کیا ہے تحریر
مرزا جان طپش

۸۔ بطور تمیز یا تابع فعل (الف) جب، تب، کب، نیز، پھر، تو کی ضد، جواب یا جزا: م: اب یہ کہتے ہو جب یہ

[1] میرا تن چیونٹی کی طرح بال برابر رہ گیا ہے۔

کہتے تھے۔ اب اعتبار ہے نہ تب تھا یا!
اب بولو تو جانیں۔ اب ہے پھر نہ ہوگا۔

(۱۹۱۴) سے اے شعر راہ راست پہ تو جب کہ پڑ گیا
اب راہ کے نہ دیکھ نشیب و فراز تو
حالی، د ص ۱۸

(۱۸۳۰) سے جب یار کے ہم یار تھے اب یار ہے پنکھا
نظیر ک

(۱۷۴۴) سے زندگی کی دل کوں اب امید نئیں
جب سے تیرے عشق کی لاگی ہے پھانس
دلی

(ب) دلیل یا مشاہدے کا نتیجہ بیان کرنے کے لئے پس، لہٰذا، اس لئے، اس بنا پر، چنانچہ کا مرادف۔

(۱۹۴۸) سے مرا سجدہ سہو میں پڑ گیا اب اسے قضا کہوں یا ادا
تری یاد نے یہ ستم کیا کہ ستایا آ کے نماز میں
فغان آرزو ص ۱۰

(۱۹۱۰) ف: اب تم خیال کرو کہ دربار کی طرف سے اُسکے اصل خیالات کیا تھے جو یہ فقرہ قلم سے ٹپکا۔ آزاد، دربار اک ص ۶۰۵

(۱۸۷۴) سے پھولوں سے آج بھر گیا دامانِ کربلا
بس اب نوین بہشت ہے بستانِ کربلا
انیس، مراثی اول

(۱۸۵۳) سے آپ کرامت کیجئے اب معجزے دکھلائیے
خضر خط، رخسار یوسف، لب مسیحا ہوگیا
خواجہ وزیر، دف

(۱۸۵۳) سے باغ سے تشبیہہ دیتے ہیں گل رخسار کو
اب عوض طوطی کے بلبل کہتے خط یار کو
ایضاً ص ۱۴۸

(۱۴۹۶) سے کہنے تجھ سیر سہاگ الہ کا چھڑ ریا سہارا
اب کیوں سیر سہا دے دو جام کو نا ہیں تھارا
شمس العشاق، خوش نامہ

۹۔ حرف زائد: (الف) جو خلاصۂ کلام، یا بیان میں تسلسل رکھنے کے لئے بولا یا لکھا جاتا ہے۔ م: اب دو پہلے

ہی روٹھے ہوئے تھے ؛ اب ہم ٹھہرے سیلانی۔

(۱۹۲۶) ف : اب رہا طبلہ۔ یہ اگرچہ لَے کے لئے بہت ضروری چیز ہے مگر اس قسم کی کسی چیز کا پتہ دیگر ممالک کی پرانی قوموں میں نہیں چلتا۔ شرر۔ مشرقی تمدن ص ۔ ۱۸۹

(۱۹۱۴) ے اب چاہو استاد گنو
یا ہمیں تم سمجھو یکتا حالی۔ د ص ۔ ۱۸

(۱۷۸۶) ے اس اندھیر کو کیا لکھوں اب میں آہ
قلم کے نکلتے ہیں آنسو سیاہ
میر حسن، س ب ص ۔ ۱۵۳

(۱۸۱۰) ے صاحب جاہ و شوکت و اقبال
اک ازاں جملہ اب سکندر تھا
میر ک اول

(ب) یا قائل کرنے کے لئے (بطور استفہام، مراد : مانے یا نہ مانے ؟ بس چپ ہو جاؤ۔ م : اب بولو تمہارا کیا علاج ؛ اب کہئے ؟ یہ بھی کر دکھایا۔ اب ؟

(ج) یا مفاہمت منانے، قصہ کوتاہ کرنے کے لئے
مراد : بس ختم کرو۔ م : اب جانے بھی دو ؛ اب آ بھی جاؤ ؛ اب نہیں ؛ اب ہاں ہو چکا۔

(۱۸۷۴) ے گردن میں ہاتھ ڈال کے حضرت نے یہ کہا
لو اب اٹھا لو تیغ و سپر، تم پہ میں فدا
انیس، اول

(۱۸۷۱) ے اب کوئی اس میں کیا دلیل کرے
جس کو چاہے خدا ذلیل کرے
شوق "زہر عشق"

(د) یا اکتاہٹ، بے دلی، ناراضگی کے اظہار میں
م : اب ٹہلیئے ؛ اب کوئی کیا کرے آخر۔

(۱۸۳۹) ے کیا کہئے اور نظیر آگے اب کون سمجھنے والا ہے
نظیر، ک ص ۔ ۸۵۹

(س) یا تنبیہہ، تہدید، دھمکی کے طور پر
(۱۹۱۴) ے چھیڑو نہ تم کہ میرے بھی منہ میں زبان ہے اب
حالی۔ ص ۔ ۷۳

(۱۹۲۶) ے نہیں ان تلوں تیل بس بس چلو
خدا کے لئے اب ہٹو اب ٹلو
شوق قدوائی، قاسم و زہرہ ص ۲۴

(۱۸۰۳) ف۔ اب دیکھو تمہارا کیا حال کرتا ہوں۔ میر امن ب ب ص ۲۳۵

(۱۸۳۰) ے دیا ہمارا اُسے نامہ بر نے جب کاغذ
تو بولا طیش میں آ کر پھر آیا اب کاغذ
نظیر، ک،

[(از برج بھاشا اَبَے، از اَسے وِیر (اسے، اس + دِیہ ذ قسم) ق پراکرت آؤ، دَ آد [illegible] اُپ بھرنش اے وہیں [illegible] اکاپانی اَبَ ؛ بہاری اَبَ ؛ سنسکرت ادھ [illegible] ویدک [illegible] سے کچھی مراد لیا، اِتال ہے جو ولی تک ملتا ہے، مگر اب کے ساتھ ساتھ جو ابتدا ہی سے موجود ہے۔]

مذکورۂ بالا تشریح کے علاوہ حسب ذیل تابعات بھی لائق اندراج و تشریح ہیں :

اب اب کر کے

اب بھی ! (کلمۂ تہدید م : ایک طمانچہ مارا اور کہا کیوں جی اب بھی !)

اب پچھتائے کیا ہوئے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

اب تب ہونا (لب و دم کا معاملہ)

اب تو

اب تو ہوں میں اونی ادنی جب ہوں گی سب سے دونی

اب ستونتی ہو کر بیٹھی جگ کو لگا کے آگ

اب سے دور

اب کھائی تو کھائی اب کھاؤں تو رام دہائی

اب کی (ع : کچھ اب کی بوئے کفن دامنِ بہار میں ہے)

اب کی بات اب کے ساتھ جب کی بات جب کے ساتھ

اب کی بچے تو گھر گھر نچے (گوٹ چوسر کی)

اب کے

(باقی صفحہ ۴۵ پر)

غزل

حشمت فضلی

پی لو کہ دست شعلہ رخاں کی کشیدہ ہے
یہ آتش حیات ابھی نو دمیدہ ہے

تا دور یہ شفق کا بکھرتا حسین رنگ
میری نگارِ شعر کا رنگ پریدہ ہے

ہوگا کسی مسافرِ غم آشنا کا دل
راہوں میں ایک پھول جو دامن دریدہ ہے

سر پر الم کی دھوپ میں سایہ کئے ہوئے
اب اپنی بیکسی کی ردائے پریدہ ہے

تجھ تک نہ جا سکے گی کمند تصورات
تیرا خیال جیسے غزال رمیدہ ہے

اے خضر راہ شوق کوئی اور تذکرہ
صحرائے آرزو کا فسانہ شنیدہ ہے

دیتے ہیں نام جس کو بہشتِ وفا کا لوگ
اپنے لئے وہ جنت ناآفریدہ ہے

فضلی بجھی بجھی ہے حوادث سے شمع دل
بزمِ حیات آج کبیدہ ہے

غزل

شبید الگعراق

یہ بھی خبر نہیں کہ کہاں تھے کہاں ہیں ہم
بس اتنا یاد ہے کہ ترے نغمہ خواں ہیں ہم

تیرے خیال تیری تمنا سے بے خبر
تو ہی بتا کہ کون سی جانب رواں ہیں ہم

راہِ وفا میں یوسفِ بے کارواں سہی
پھر بھی شریکِ دردِ دل دوستاں ہیں ہم

قائم ہیں ہم سے سرو و سمن کی حکایتیں
اے شاہدِ بہار ترے رازداں ہیں ہم

اُن مست انکھڑیوں کا فسانہ غزل ہیں ہم
یوں بھی شریک حلقۂ پیرِ مغاں ہیں ہم

مدھم سہی چراغِ دل و جاں ترے بغیر
پھر بھی جوابِ مہر و مہ و کہکشاں ہیں ہم

ہم کو یقیں ہے ہم ہیں متاعِ گراں بہا
یہ اور بات ہے کہ ابھی رائیگاں ہیں ہم

فن:

خط میں حُسن کاری

مصباح الحق

ہم خطاطی کے سلسلہ میں نسخ اور نستعلیق کا چرچا تو بہت سنتے ہیں بلکہ نستعلیق تو اپنی نفاست، رعنائی اور سجل پن کے لئے ضرب المثل بن چکا ہے۔ اور نستعلیق وضع، نستعلیق خط و خال اکثر سننے میں آتے ہیں۔ جیسے یہ خوبصورتی کی انتہا ہو۔ اسی طرح خطاطی کے بڑے بڑے ماہر استادوں، ابن مقلہ، یاقوت، میر علی تبریزی، سلطان علی مشہدی کا نام بھی بہت سننے میں آتا ہے۔ مگر ہم میں سے جو لوگ خطاط یا صاحب ذوق نہیں ہیں انہیں اس دلآویز فن کی خوبیوں اور باریکیوں کو جاننے کا بہت کم موقع ملتا ہے۔ وہ اس کو زیادہ سے زیادہ خوش نویسی ہی تصور کرتے ہیں اور بس۔ جو اس کو فن کے درجہ سے گرا کر ہنر یا کاریگری کی سطح پر لے آتی ہے۔ حالانکہ ہر صاحب ذوق کی نظر میں اس کا مقام بہت بلند ہے۔ اور وہ اس کے نقطوں، اس کے خطوں، اس کے دائروں، کرسیوں، نت نئی وضعوں اور ترتیبوں میں حسن و کیف کی ایک دنیا پاتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر کسی فن میں حسن کاری ہی حسن کاری ہے، اگر کوئی فن خالص جمال کا مظہر ہے۔ مجرد حسن۔ جس میں کسی دوسرے داخلی و معنوی عنصر کی آمیزش نہ ہو، تو وہ خطاطی ہے۔ وہ متانت، وہ پاکیزگی، وہ منزہ حسن کی پُرکاری، وہ جاذبیت جو اپنے ہی مواد یعنی حروف سے اُبھرتی ہے، ایک عنصری قسم کی خوبصورتی، دیکھنے والوں کو اپنی ارفع و اعلیٰ لطافت سے لبھا لیتی ہے۔ جسے آج کل کی اصطلاح میں ارتفاع یا تہذیب کہتے ہیں۔ اس ضمن میں مجرد حسن کا لفظ بے اختیار زبان پر آگیا۔ اور حق یہ ہے کہ یہی تجرید، یہی محض اسلوب، طرح پیشکش پر نعروں ہی اس فن کی روح و رواں ہے۔ اور اس کو امتیاز بخشتی ہے۔ اس میں ایک پُرتمکیں، پارسایانہ وضع پیدا کرتی ہے۔ جیسے لطافتیں تمام کثافتوں سے معرا ہو کر ایک بلند، پاکیزہ مقام تک پہنچ گئی ہوں۔

اور سچ پوچھئے تو یہ کچھ عجیب بھی نہیں۔ مانا کہ یہ فن ابتدا میں تجریدی نہ تھا۔ اس کی نمود ہم انسانوں کی اس قدرتی خواہش کا نتیجہ ہے کہ ہم ہر بات کو سمجھیں، اس کو تصویر کی شکل میں دیکھیں۔ چنانچہ ہر چیز نے اول اول نقوش کی صورت اختیار کی۔ رفتہ رفتہ یہ نقش حروف بن گئے۔ محض نشان۔ جن میں اپنی ذاتی وضع کے علاوہ تزئین کا کوئی اور پہلو نہ تھا۔ حسن آفرینی کے جو بھی امکانات تھے سو وہ ان حروف ہی کو دلکش پیرائے میں پیش کرنے تک محدود تھے۔

ایک اور بات۔ ایک دلچسپ افتاد۔ قرآن مجید کو دلکش پیرائے میں پیش کرنے سے زیادہ پُرزور خواہش اور کیا ہو سکتی تھی۔ اس سے بہتر اور کونسی چیز ہو سکتی تھی۔ جس پر حسن آفرینی کا طبعی ملکہ عمل کرے اور کس شد و مد سے؟ اس کا اندازہ مسلمانوں کے ذوق و شوق سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ انہیں قرآن نویسی کی شکل میں ایسا فن ہاتھ آیا جس پر وہ اپنا بہترین کمال صرف کر سکتے تھے اور یہ ایک دو نسلوں کی بات نہ تھی بلکہ نسلاً بعد نسلٍ اس کا سلسلہ جاری رہا۔ تمام دنیا میں جہاں کہیں بھی مسلمان تھے ان کے تخلیقی جوہر اس فن پر مرکوز ہو گئے۔ اور یہ صدہا سال کی مشق و ریاض سے کہیں کا کہیں پہنچ گیا۔ آمیزشے کجا گہر پاک او کجا۔ مقدس عبارت کو پیش کرنے کے لئے یہی مناسب تھا کہ خط بھی نہایت پاکیزہ ہو۔ اور اس میں کسی طرح کی بیجا آرائش یا صورت گری سے کام نہ لیا جائے جس سے نقاشی پر طرحداری کا شائبہ بھی پیدا ہو۔ اس لئے زیادہ سے زیادہ زور خط میں حسن پیدا کرنے پر ہی دیا گیا۔ تاکہ یہ سحرِ حلال بن جائے۔ اس کا ایک ہی نتیجہ ہو سکتا تھا۔ تجرید۔ وہ چیز جس کا آج کل مغرب و مشرق میں اس قدر چرچا ہے۔ دنیائے اسلام میں یہ خالص وضعی قسم کا فن صدیوں پہلے وجود میں آ چکا تھا۔ جس کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ جب اہلِ مغرب نے یورپی ممالک میں تعمیر شدہ اسلامی عمارات پر نہایت خوش خط لکھی ہوئی عربی آیات دیکھیں تو انہوں نے ان کو

طغرائی قسم کی گلکاری خیال کیا جسے وہ (ARABESQUE) "عربسک" کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ تمثیل اور تجرید میں کچھ ایسا فرق نہیں۔ جہاں اصلی نوعیت نظر سے پنہاں ہوئی بامعنی چیز محض تجرید بن کر رہ جاتی ہے جس میں وضع و صورت کی رعنائی کے علاوہ اور کسی چیز کو دخل نہیں ہوتا۔ بلاشبہ اگر کسی فن کو خالص اسلامی فن ہونے کا شرف حاصل ہے تو وہ خطاطی ہے۔

اس کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ عربی رسم الخط کے حرف اول کو الفِ تجرید کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کیونکہ یہ وحدتِ حق کا آئینہ دار ہے۔ مگر سچ پوچھیے تو سارے رسم الخط کی یہی کیفیت ہے۔ اسلامی تصوّر جس میں توحید بنیادی حیثیت رکھتی ہے، قدرتی طور پر اس خط میں ظاہر ہوئے بغیر نہ رہ سکا جو اس کی عکاسی کرتا ہے۔ ایک منزہ ہستی، برتر و بالا، مجرد، ماورا، علی الاطلاق، غیب غیب، وجود محض اور وجوب محض جس میں مجاز کا شائبہ تک نہیں۔ تمام تر سامی۔ آریائی دیوی دیوتاؤں کے محسوس پیکر سے کوسوں دور جو کلمۂ توحید میں پوری طرح منعکس ہے۔ وہی سادگی، وہی جلال، وہی بے کیفی، وہی بے رنگی و بے صورتی۔ توحید اور قرآن ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں، اس لئے جو خط ان کی نمائندگی کرتا ہے اُسے بھی ایسا ہی اُلوہی ایسا ہی تجریدی ہونا چاہیئے۔ دونوں کا نادیدہ جلال و جمال رسم الخط میں پوری طرح رچا ہوا۔ بلاغت کی انتہا حسن حرف حرف میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا لیکن ایسے کہ وہ کسی طرح باہر نہ چھلکنے پائے۔

آخر اس حقیقت سے کیسے انکار کیا جاسکتا ہے کہ رنگ، وضع، ہیئت، طرح، ترتیب، بجائے خود دلچسپی کا باعث ہیں۔ انسان نے آنکھ کھولتے ہی یہ ساری چیزیں قدرت میں پائیں اور ان سے ہمیشہ لطف اندوز ہوتا رہا۔ اس کی اپنی بنائی ہوئی چیزوں کی بھی یہی کیفیت ہے۔ جن کا معنی یا کسی اور ایسی ہی گہری بات کے ساتھ کوئی سروکار نہیں۔ یہی چیز فن میں بھی منتقل ہوئے بغیر نہ رہ سکی جس کے لئے رمز و معنی کی شرط ضروری نہیں۔ بلکہ اس سے تو یہ گمان بھی ہوتا ہے کہ کہیں فن کی دلچسپی میں در پردہ انہی عناصر کو دخل نہ ہو۔ جو جمالیاتی، تخئیلی، صناعانہ قدروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ہم بھول کر فنی اثر کا سہرا تمام تر مطلب و معنی کے سر باندھ دیتے ہیں۔ جو لوگ "فن برائے فن" کے قائل ہیں انہیں بظاہر اسی بنیادی حقیقت کا دھندلا دھندلا سا احساس رہا ہے جیسے تجریدی فن بالکل سامنے لے آتا ہے۔ رڈ جر فرائی، ایک جدید نقاد، نے اپنی تصنیف "ویژن اینڈ ڈیزائن" میں کچھ ایسی ہی بات کہی ہے جب وہ یہ کہتا ہے کہ فن ہمارے اعصاب میں توازن، سکون، خاص خاص حرکات و سکنات اور ایسے ہی دوسرے اثرات پیدا کرتا ہے۔ اور ان سب کا "خلق و تکمیل جمال معنوی" سے کوئی تعلق نہیں۔

خیر ہمارے یہاں خطاطی کا رواج ہوا اور خوب ہوا۔ قرآن میں مستقل و مسلسل دلچسپی لازمی تھی۔ اور اس کو اچھی سے اچھی شکل میں محفوظ اور پیش کرنے کا شوق اس فن کے لئے زبردست مہمیز ثابت ہوا۔ یہ محض خوشنویسی ہی نہ تھا بلکہ خطاطی تھا۔ ایک بلند پایہ، برگزیدہ فن۔ جو خطاط کو بھی قابل احترام بنا دیتا تھا۔ چنانچہ ساری کی ساری ملت اجتماعی طور پر اس کی نشو و نما میں شریک ہوئی۔ اہل ہنر پر شام و سحر یہی دُھن سوار تھی۔ اور وہ اس میں بیش از بیش پیشقدمی کرنے لگے۔ اور جیسا کہ ہمیشہ ہوتا چلا آیا ہے رفتہ رفتہ یہ شوق پھیلتا پھیلتا دوسری کتابوں اور تحریروں تک بھی پہنچ گیا۔ اور اس کو ایک عام فن کی طرح ترقی دی جانے لگی۔ جدت طبع نے ایک اسلوب وضع کیا۔ پھر اس پر ترقی ہوئی۔ نوک پلک، تراش خراش، توازن ہر بات کا سلسلہ آگے بڑھا۔ اسلوب پر اسلوب وضع ہوئے۔ ایک روایت بنی۔ اس نے سینکڑوں شاخ و برگ پیدا کئے اور جہاں جہاں یہ روایت یا روایتیں پہنچیں ان میں طرح طرح کے اضافے اور ترقیاں ہوئیں۔ اور ہر ملک، ہر قوم نے ایک نیا ہی انداز پیدا کر دیا۔ سالہا سال ان سب کی قلم کاریاں اور حسن آفرینیاں گلے ملتی رہیں۔ اور ہر باکمال خطاط دوسروں کے ہنر کی جدت طرازیاں کو اپنے فن میں سمو کر اسے جلا دیتا رہا۔ لہذا یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ اگر ہم آج کسی منجھے ہوئے خطاط کے قلم پر نظر ڈالیں تو اس میں اگلے وقتوں کے نہ جانے کس قدر ماہرانِ فن کی ندرت کاریوں کی جھلکیاں دکھائی دیں۔

سچ پوچھیے تو یہ نشو و نما زمانوں زمانوں، ملکوں ملکوں، ایک عجیب و غریب سفر ہے جو انسان انسان اور قوم قوم کے کے ساتھ ایک انوکھی کیفیت پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔ جیسے یہ

ایک بڑی ہی پُر لطف رومانوی داستان ہو۔

ایک زمانہ وہ تھا جب چھاپے کا رواج نہ تھا۔ اس لئے اصل کی بڑی حفاظت اور قدر کی جاتی تھی۔ استادانِ فن کی تحریر کردہ وصلیاں بڑی بڑی گراں قدر قیمتوں پر بہت کوشش اور جستجو سے حاصل کی جاتیں۔ اعلیٰ درجہ کے لوگ اس میں کمال حاصل کرنا باعثِ فخر خیال کرتے تھے۔ اور جہاں ذوق و شوق ہو وہاں اجتہاد کا قدم بھی تیزی سے آگے بڑھتا ہے۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے ایسے مجتہدینِ فن پیدا ہوئے جنہوں نے اس فن کو کہیں کا کہیں پہنچا دیا۔ مجموعی طور پر دورِ قدیم میں خطاطی ساکن ہی رہی۔ رواں دواں نہیں رہی۔ کیونکہ اس دور کی خصوصیت ہی وہی تھی۔

مغربی قوموں کی آمد پر نقشہ بدل گیا۔ جم کر بیٹھے رہنے کی بجائے دوڑنے بھاگنے پر زور ہوا۔ اس لئے خوبصورتی کی بجائے روانی پر زور دیا جانے لگا۔ وہ مضبوط اور مرکوز قسم کی خوبصورتی کم ہونے لگی جس کے پرانے فنکار دلدادہ تھے۔ مشینی دور کی عجلت پسند مگر سستی، دنیا دار روح نے سب کو آن لیا اور جو چیز پہلے ایک شوق، ایک مشغلہ تھی۔ اب ایک کاروبار، ایک پیشہ بن کر رہ گئی۔ جس کو خوش نویسی اور اس سے بھی گر کر کتابت کا نام دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ لاہور، آگرہ، دہلی، لکھنؤ اور حیدرآباد (دکن) جیسے ہنر و فن کے مشہور و معروف مرکزوں میں بھی صفِ اول کے فن کار، صاحبِ طرز اور مجتہدِ فن پیدا ہونے بند ہو گئے۔ الا ماشاء اللہ۔

ساتھ ہی ساتھ نئی فضا کا نیا اثر بھی لازم تھا۔ جو ایک طرف فن کاروں کے تصور اور دوسری طرف خطاطی کے فن کو چپکے ہی چپکے نئی راہوں پر ڈال رہا تھا۔ عالمی فضا، ماحول کے نئے نئے تقاضے، دنیا بھر کے علوم و فنون کی یکجائی، مصوری، عکاسی، طباعت، عمارت سازی، سنگ تراشی وغیرہ کی روز افزوں حیرت انگیز ترقی۔ فن کاروں کا حساس شعور ان سے کیسے غیر متاثر رہ سکتا تھا۔ خطاط اپنے فن میں نئی طرح کی خوبصورتی اور نفاست پیدا کرنے کے لئے ذہن دوڑانے لگے۔ پرانی لکیریں چھوڑ کر ایجاد و اختراع کی نئی راہیں تلاش کرنے کی دُھن پیدا ہوئی۔ بلاک، آفسٹ، ڈرائنگ، کندہ کاری، اشتہار بازی، پینٹنگ وغیرہ نے معاملات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ خطاطی نے اپنا چولا بدلا اور نئے لباس میں جلوہ گر ہونے لگی۔ اس کا لازمی نتیجہ ایک ایسے فن کا ظہور اور ترویج تھی جو خطاطی اور آرٹ کا حسین امتزاج ہو۔ ظاہر ہے کہ رسم الخط کے بنیادی اصول و قواعد میں ترمیم و اصلاح تو بڑے غور و فکر کی بات تھی۔ اور اس کے امکانات آئندہ فن کاروں کی شوخیٔ تصور پر موقوف ہیں۔ لیکن اس آزاد ماحول اور اس کے حیات افروز اثرات کو دیکھتے ہوئے جو قیامِ پاکستان سے پیدا ہوئے، طرزِ نگارش اور معیارِ فن میں نئے تیور پیدا ہونا لازمی ہے۔ خصوصاً موجودہ دورِ انقلاب میں جو فکر و فن کی نشوونما کے لئے مثالی فضا مہیا کرتا ہے۔

دیکھئے، نئے تقاضوں نے کیسے بعض اچھوتے فن پاروں کو جنم دیا ہے جو فن کار میں ایک نئے شعور اور نئے اقدام کی خبر دیتے ہیں۔ سب سے پہلے وہ طغرا دیکھئے جس کو صدر پاکستان سے نسبت کا شرف حاصل ہے۔ یہ نقش اس گرمجوشی ہی سے پیدا ہو سکتا تھا جو ہمارے ہر دلعزیز صدر نے عوام کے دل میں پیدا کی ہے۔ طغرا نویسی کا فن بہت مشکل ہے۔ بیک وقت عبارت کو سمیٹنے اور پھیلانے کی متضاد کوشش، کم سے کم حدود میں فشار، پھر بھی زیادہ سے زیادہ وسعت۔ پیچ در پیچ پھر بھی سادہ اور واضح پیشکش، تصویر نما ہوتے ہوئے بھی محض نقش، خالص خطاطی، جتنے الفاظ زیادہ اتنی ہی طرح پیدا کرنے میں دشواری، خطوط کا حسنِ ترتیب و ترکیب، تصور اور عمل دونوں روایت میں پوری طرح ڈوبے ہوئے، جس کے لئے ہر ہر قلم اور خطاطی میں ہر ہر اضافہ و ترقی یعنی ساری تاریخ پر نظر لازم ہے تاکہ فن کار جس وقت، جو طریقہ چاہے برتے، اور جو اثر چاہے پیدا کرے۔ سب سے بڑھ کر موضوع و مقصد سے پوری پوری مناسبت لازم ہے۔ زیرِ نظر طغرے میں سب سے اہم بات کیا تھی؟ صدرِ پاکستان کی جید اور قد آور شخصیت، اس کا شکوہ۔ طغرے میں یہ دونوں باتیں بڑی خوش اسلوبی سے پیدا کی گئی ہیں۔ نفیس عمودی خطوط نہایت طمطراق سے بلند ہو کر افق کی طرف بڑھتے ہوئے۔ طغرا القاب کی بنیاد سے درجہ بدرجہ نام اور منصب تک پہنچتا ہوا، فیلڈ کا ل اور ایوب اور خان کے دونوں الف تمام حرفوں سے

زیادہ نمایاں، ایک دوسرے کے متوازی، طول میں بتدریج کم ہوتے ہوئے برابر برابر فاصلہ۔ وضع قومی و فوجی مناسبت سے پرچم نما، لہراتے ہوئے آرائش قوسی خطوط پرچم کا تصور دوبالا کرتے اور سربلندی کا احساس ابھارتے۔ 'منصب'، بیضوی خطوط کے آغوش میں بڑی سادگی سے ملفوف۔ عمودی اٹھان کے ساتھ ہی ساتھ اُفقی پھیلاؤ جیسے کسی شاہین نے فضا پر اپنے بڑے بڑے مضبوط پر پھیلا رکھے ہوں۔ اور یہ سارا نقش نیچے انگریزی میں لکھی ہوئی مکمل عبارت کو محیط۔ یہ تمام خصوصیات نقش میں اکملیت بھی پیدا کرتی ہیں اور توازن بھی۔ دوسری طرف متانت میں عظمت ہی عظمت، جلال ہی جلال۔ طغرے میں یوں کردار نگاری کا حق ادا کرنا ایک خالصتاً جدید بات ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہر ایسی تخلیق صاحبِ فن کے لئے ایک داعیہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی بہترین صلاحیتوں کو کام میں لائے۔ اور ایسی طرح پیدا کرے جو بدرجۂ اتم موزوں و مناسب ہو۔ موجودہ آزمائش میں صاحبِ فن بلاشبہ کامیاب رہا ہے۔ نظر اور ہاتھ میں نہایت خوشگوار توازن و تعامل اور ذوق و تخیل کا دلآویز سنجوگ خطاطی کا کمال یہی تو ہے۔ اور یہ سارے اجزا آپس میں شیر و شکر ہو جائیں تو کیا کچھ نتائج نہیں پیدا ہو سکتے۔

یہ پیشکش اس لحاظ سے نسبتاً سادہ ہے کہ اس میں سفید زمین پر سیاہ حروف میں خطاطی کا حق ادا کیا گیا ہے۔ دوسرے طغروں میں زمین سیاہ اور تحریر سفید ہے۔ جو ایک دوسرے کو ابھارتے ہیں خصوصاً سفیدی اس شدت سے اُبھرتی ہے جیسے اُجالا۔ چکا چوند پیدا کرنے والا شوخ اور تیز اُجالا نہیں بلکہ متین، جیسے وہ نورِ محض ہو۔ یہ خصوصیت مذہبی طغروں میں بدرجۂ غایت نمایاں ہے۔ مثلاً وہ کوفی نما طغرا جس میں کلمۂ طیبہ مرقوم ہے۔ اونچے اونچے، اجلے اجلے، جلی خطوط نیچے سے اوپر تک تمام سطح پر چھائے ہوئے جیسے خود ذاتِ باری کائنات پر۔ جلی خطوط یکساں، متوازی جیسے کسی مسجد کے سفید سفید مینار ہواؤں میں بلند، آسمان تک پہنچتے ہوئے۔ ذاتِ الٰہی کی پاکیزگی و جلال لانبے لانبے نورانی خطوط سے آشکارا۔ ڈیزائن کی یکسانیت میں تنوع پیدا کرنے کیلئے وسط اور اخیر میں کوفی وضع ہی کی ہ۔ بعینہٖ وہی بات جو کسی شاعر، شاید سنائی یا خسرو نے بہت دلکش پیرائے میں کہی ہے:-

در الفش ہائے ہویت گرہ

اور ذاتِ باری کی اس تمثیل کے عین قلب میں پیغمبرِ اسلامؐ ایک مستطیل لوح میں نقش ــــ خطِ نستعلیق میں۔ اس طرح جہاں مستطیل لوح سے کوفی خط کے ساتھ مناسبت پیدا ہوتی ہے وہاں خطِ نستعلیق سے موازنہ کا حسن پیدا ہوتا ہے پھر سارے نقش کا انداز تعمیراتی ہے۔ جیسے سنگِ مرمر کے ستون ہی ستون یا کوئی عظیم الشان عمارت سامنے کھڑی ہو۔ یا پھر عمودی دریچوں میں سے نور کا عالم دکھائی دے۔ یا ان دریچوں سے اجالا ہی اجالا اندر آتا دکھائی دے۔ خطاطی فی نفسہٖ سکونی چیز ہے جس سے تعمیراتی وضع پیدا ہونا قدرتی بات ہے۔ تکنیکی اعتبار سے اکثر طغروں کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں قدما کے برعکس قلم کی بجائے پہلے پنسل سے بنیادی خاکہ بنایا گیا ہے۔ یعنی یہ اولاً ڈرائنگ ہے اور پھر خطاطی۔ مکمل نقش نفیس و بیز آرٹ پیپر پہ واٹر پروف انک استعمال کرنے سے تیار ہوتا ہے۔ بہت بڑی بات یہ ہے کہ اصل نقوش سولہ سولہ گنے بڑے ہونے کے باوجود بلاکوں میں مختصر ہو کر بعینہٖ برقرار رہتے ہیں جس طغرے میں کلمۂ طیبہ مرقوم ہے وہ اپنے مضمون کے مطابق نہایت سادہ ہے۔ تقریباً یہی کیفیت "اھدنا الصراط المستقیم" کی ہے۔ جس میں پھر مضمون کی مناسبت سے سادگی نمایاں ہے۔ اور نسخ و نستعلیق دونوں کے حسن کو بڑی کامیابی سے آمیز کیا گیا ہے۔

یہی کیفیت زیادہ وسیع پیمانہ پر "المسلم من سلم" میں دکھائی دیتی ہے جو زیادہ مرکب واقع ہوا ہے۔ اس میں بھی خطاطی، مینار و تعمیر سے ہمکنار معلوم ہوتی ہے خصوصاً اس لئے کہ ہر مینارے کے ساتھ ساتھ چاند تارا بھی موجود ہے۔ خواہ ہم اسے حقیقی کہیں یا علاماتی۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ جن نمونوں پہ اوپر روشنی ڈالی گئی ہے ان میں سے اکثر تاریخی ہیں۔ "مزارِ قائداعظم محمد علی جناح" یادگاری حیثیت رکھتا ہے جیسے کہ آج سے ۱۰۔ ۱۱ سال پہلے بابائے ملت اور دیگر عمائدِ ملت کے مزاروں پر حجری کتبے۔ یا ایوانِ صدر پر "ایران و پاکستان زندہ باد"۔ اور مقبروں سے گزر کر کاغذ پہ پاکستانی نوٹوں کی شکل میں۔ فن ایک ہی ہے صرف اس کے مظاہر مختلف ہیں۔

"قطعات" خطاطی کے مظاہرہ کی ایک اور دلچسپ شکل ہے۔ گھر بار اور کوچہ و بازار کی سجاوٹ کے لئے ایک عام ضرورت

کا جواب۔ علامہ اقبال کا کلام اس کے لئے خاص طور پر موزوں واقع ہوا ہے۔ اور اس نے خطاطوں کو ایک مقبول و مرغوب مواد مہیا کر دیا ہے۔ اُردو زبان کے سلسلہ میں ان کے اس شعر سے زیادہ موزوں چیز اور کیا ہو سکتی تھی کہ ؎

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے ٭ شمع یہ سودائی دلسوزیٔ پروانہ ہے

فن کار نے اردو کالج، کراچی کے لئے یہ شعر چوبیس فٹ لمبی لوح پر تحریر کیا ہے پھر بھی عکس تصویر میں اس کی خوبی و نفاست میں سر مو فرق نہیں آیا۔ ڈاکٹر عزام بے جیسے عالم و فاضل شخص کے لئے جو اقبال کے اس قدر دلدادہ تھے، والیٔ مصر کی خدمت میں کچھ اسی قسم کی پیشکش موزوں تھی جسے قدردان ہاتھوں نے ایوان شاہی کی زینت بنایا۔ پھر ہم اہل پاکستان جس طرح ایک "مرد راہداں" اور "میر کارواں" کے لئے ترس گئے تھے اس سے کون واقف نہیں؟ اس لئے خطاط کی نگاہ اور ایک پوری قوم کا احساس اقبال کے اس ارشاد سے بہتر اور کس چیز تک رسا ہو سکتا تھا جو ابھرے ابھرے حروف والے قطعہ کی زینت ہے اور ہمارے صدر کی ذات گرامی جس کے ہر ہر لفظ کی مصداق ہے ؎

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز ٭ یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لئے

اس "قطعہ" میں ایک خاص ترکیب برتی گئی ہے۔ وہ یہ کہ زمین سبز رکھی گئی ہے اور حروف کے چاروں طرف ائیر و گراف سے نیلا شیڈ دیا گیا ہے۔ حروف کا گروہ سیاہ ہے۔ اس وجہ سے حروف سطح سے ابھرے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ اور بہت خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے کسی مجلیٰ سطح پر دھات سے ابھرواں کام کیا گیا ہو۔ قلم کا انداز نہ پوری طرح عمودی ہے نہ افقی بلکہ دونوں کے بین بین ہے۔ سیدھا بھی اور اریب بھی۔ پھر بیضوی اور شمسی یا آفتابی دائروں سے بھی فن کو چار چاند لگانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی۔ غرض یہ چند نمونے ایسے ہیں جن کے متعلق اکبر مرحوم کے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ

خبر دیتی ہے تحریک ہوا تبدیل موسم کی

اقبال نے درست کہا تھا۔ "معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود"۔ اور ان فن پاروں میں اُس جدید خطاط عبدالمجید کا خونِ جگر پوری طرح موجزن ہے جس نے پاکستان کی دل سے خدمت کی ہے۔ اور جس کی بنا پر خود صدر پاکستان نے اس کو اپنی قدردانی کا شرف بخشا۔ بابائے ملت اور صدر پاکستان دونوں سے بذریعہ فن وابستگی بہت بڑا امتیاز ہے۔ اگر ان کی عظمت انہیں بھی ہم چشموں کی نظر میں "خطاط اعظم" کے درجہ تک لے جائے تو کچھ عجب نہیں۔

خدا کرے نئے موجودہ دور انقلاب کی حیات افروز اور نمو پرور فضا دیگر فنون کی طرح خطاطی کے لئے بھی زیادہ سے زیادہ ساز گار ثابت ہو اور یہ مستقبل میں اور بھی بال و پر پیدا کرے ٭

بقیہ "ایک اور سنگ میل" ص ۱۱

فضا مقبرے کو چار چاند لگا دے گی۔ اور کچھ ویسی ہی کیفیت پیدا کر دے گی جیسے اسلامی فن تعمیر کا شاہکار "تاج محل" پیدا کرتا ہے۔ شاید چاندنی راتوں میں مقبرے کی شفاف و براق عمارت اور گنبد ویسا ہی سماں پیدا کر دیں جس نے حکیم ملت سے یہ کہلوایا تھا کہ :۔

تاج را در زیر مہتابے نگر

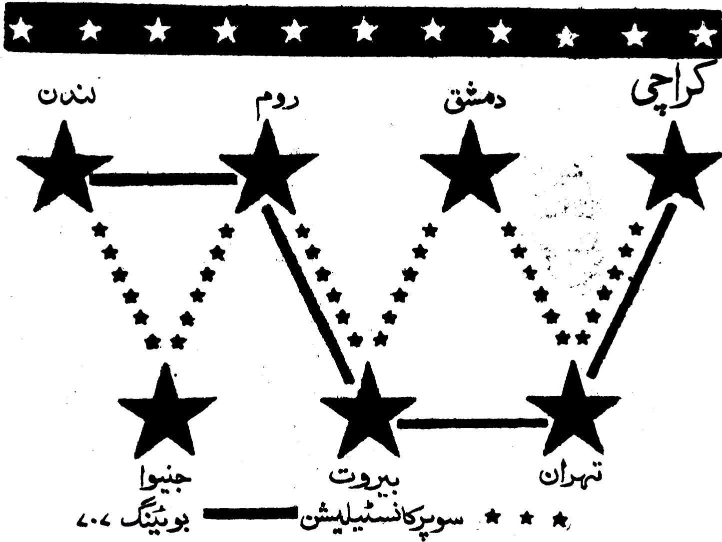
یا یہ کہ :۔

صنعت آزاد مرداں را ببیں

کیونکہ جس دور انقلاب میں یہ مہتم بالشان یادگار تعمیر ہو رہی ہے اس میں بندۂ محکوم نے حقیقی معنوں میں وہ آزادی حاصل کر لی ہے جو اس کا حق تھا اور جس سے ابنائے ملت کو بہرہ ور کرنے کے لئے قائد اعظمؒ نے سر توڑ کوشش کی تھی۔ ایک ایسی کوشش جو ناقابل فراموش ہے۔

ایک اور دلچسپ پہلو بلکہ سابقہ تعمیری روایات پر ایک اہم اضافہ یہ ہے کہ منجملہ دیگر عمارات کے ایک عظیم الشان مسجد بھی تعمیر کی جائے گی جسے عیدین کی نمازوں اور دیگر بڑے بڑے اجتماعات کے لئے کام میں لایا جائے گا۔

بہرحال یہ یادگار تعمیر ہر اعتبار سے ایک نمائندہ حیثیت کی حامل ہو گی۔ وہ ہمارے فن تعمیر اور ذوق جمال کی نمود بھی ہو گی اور قائد اعظم سے ہماری عقیدت اور ان کی خدمات جلیلہ کے اعتراف اور اظہار تشکر کی علامت بھی۔ اور جس طرح خود پاکستان اس کے موسس کی دائمی یادگار رہے اسی طرح یہ علامتی منظر بھی سطح ارض پر ہمیشہ دائم و قائم رہے گا اور دیکھنے والوں کو بانیٔ پاکستان کی عظمت و جلالت کی جھلک پیش کرتا رہے گا ٭


کراچی
دمشق
روم
لندن
جنیوا
بیروت
تہران
بوئینگ ۷۰۷
سوپر کانسٹیلیشن



لائن برانڈ شوز خریدیئے

Lion
BRAND SHOES

عوام کے لئے
کفایتی جوتے



آرام دہ ہونے
کی گارنٹی



تھری فرینڈز شو مینوفیکچرنگ کمپنی کراچی ۔ پاکستان

آفتابِ بامِ شرق: — بقیہ صفحہ ۹

اور آخر میں ان کے لئے پیغامِ مرگ ثابت ہوئی۔ مگر انہوں نے اپنی صحت کا کبھی خیال نہ کیا اور جہدِ کار سے کبھی منہ نہ موڑا جن معاملات و مسائل سے انہیں نبٹنا تھا، اس ہجوم کار کا خیال کیجئے کس قدر مشکل، کتنا کٹھن اور پیچیدہ و جانکاہ — مگر انہوں نے نہ کبھی کام سے منہ موڑا نہ شدائد سے گھبرائے اور بوجوہ احسن جملہ معاملات سے عہدہ برآ ہوتے رہے اور پھر اس اہتمام سے کہ شاید ہی کوئی متنفس ہو جو ان کی دیانتِ نفس پر حرف گیری کر سکے۔ جن لوگوں سے بھی میں دو چار رہا ہوں میں نے ان میں سے کسی کو بھی جناح سے زیادہ کھرا انہیں پایا۔ وہ کسی کو ایک لمحہ کے لئے بھی اس دھوکہ میں نہیں رکھتے تھے کہ ان کا منشاء کیا ہے، وہ چاہتے کیا ہیں اور اس کو پانے کے لئے کیا کریں گے۔ یہ ٹھیک ہے کہ لوگ تھے جو ان کو برا سمجھتے تھے، ان کے مؤقف کو بھی اور طریق حصول کو بھی۔ چنانچہ اسی لئے ان کے بہت سے دشمن بھی پیدا ہوگئے۔ مگر یہ امر کہ وہ ایک بہت بڑے سیاس اور پاکستان کا عزم صمیم لئے ہوئے ایک محکم و جید مدبر تھے، لاشک و ریب ہے۔ اور جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا، اگر جناح نہ ہوتے تو پاکستان ہی نہ ہوتا۔

لہٰذا ایسے موقع پر جب ہم ان کے یومِ پیدائش کی یاد تازہ کرنے کے لئے جمع ہیں، یہ بڑا ضروری ہے کہ اس ہستی کی ان خدماتِ جلیلہ کو خراجِ تحسین پیش کریں جو اُس نے پاکستان کے لئے بہر عنوان انجام دیں :

بقیہ "..مگر یہ دریا کے پار ہوگا" صفحہ ۱۶

ہیں جس میں ایک طرف خلوص و استقامت جلوہ افروز ہے تو دوسری جانب قومی وقار و عظمت کی مسکراتی ہوئی جبینیں عکس انداز ہیں۔ یہ اسی کا فیض ہے کہ آج سندھ مدرسۃ الاسلام کے ٹرسٹ کے تحت دو ہائی اسکول، ایک اقامت گاہ، ایک لڑکیوں کا ہائی اسکول، ایک ڈگری کالج، اور ایک لا رکالج بحسن و خوبی ملک کی تعلیمی ضرورتوں کی کفالت کرنے میں حصہ لے رہے ہیں آزادیٔ وطن کے بعد اب یہ ہمارا اجتماعی فریضہ ہو جاتا ہے کہ حسن علی آفندی کی اس جلائی ہوئی شمع کو نہ صرف روشن ہی رکھیں بلکہ یہ بھی سعی کریں کہ اس کی ضیاء افروزیوں سے ہر طرف اُجالے ہی اُجالے نظر آنے لگیں۔ بہر حال اس مادرِ علمی کا فیضان ایک فیضِ جاری ہے اس پُرشکوہ دریا کی طرح جو صدہا سال سے وادیٔ مہران کی آبیاری کر رہی ہے اور ہر دور میں اُسے تہذیب و تمدن کی دنیا میں نمایاں کرتی رہی ہے +

•

تبصرہ:

ماہنامہ "خاتونِ پاکستان" (صحت نمبر)

مدیر: شفیق بریلوی

ملنے کا پتہ: پوسٹ بکس ۱۱۹۹، صدر، کراچی

قیمت خاص نمبر بارہ آنے

یکے بعد دیگرے کتنے ہی خصوصی شمارے — مارشل لاء نمبر، انقلاب نمبر، یوم پاکستان نمبر اور سب سے آخر "صحت نمبر" زیر نظر ماہنامہ کے کار ہائے نمایاں میں شامل ہیں — ایک مفید، اصلاحی اور معلوماتی سلسلہ کی نہایت اہم کڑیاں جو ہماری قومی زندگی میں مضبوطی و توانائی پیدا کرنے کے لئے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ خواتین کے باوقار نمائندہ کی حیثیت سے اس رسالہ کی خدمات منفرد ہیں۔ جن کی بنا پر آئندہ ہر جہتی حیات افروز سرگرمیوں کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اور موجودہ زمانے میں صحت — انفرادی و اجتماعی — سے زیادہ اور مقدم چیز کیا ہوگی جس کے مختلف پہلوؤں کا رسالے کے آخر الذکر شمارہ مخصوصی میں بڑی خوش اسلوبی سے احاطہ کیا گیا ہے۔ بنا بریں ہم قارئین سے اس کے مطالعہ کی پُرزور سفارش کرتے ہیں۔ (ر - خ)

مسلم بنگالی ادب

(بنگلہ سے ترجمہ)

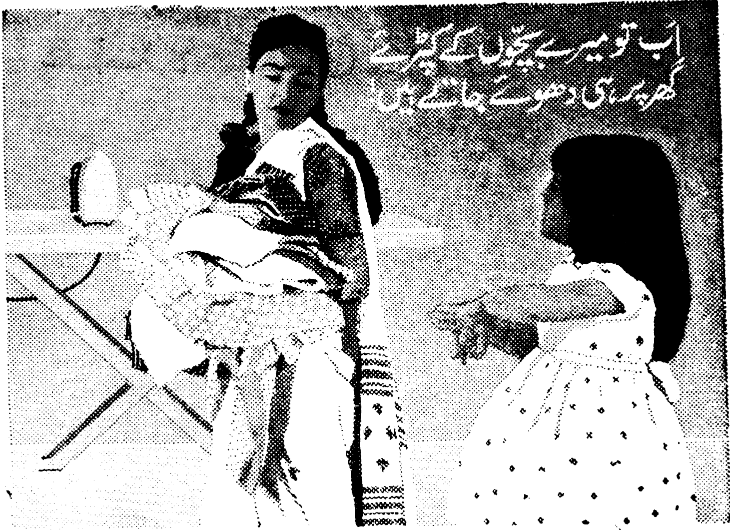
ڈاکٹر انعام الحق ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی

اس کتاب میں بنگالی زبان و ادب کی مکمل تاریخ اور اس کے ثقافتی، ملی و تہذیبی پس منظر کا جائزہ لینے کے بعد بتایا گیا ہے کہ اس زبان کی نشو و نما اور ترقی و تہذیب میں مسلمان حکمرانوں، صوفیا، اہل قلم شعرا اور ادبا نے کسقدر حصہ لیا ہے۔ یہ جائزہ بہت مکمل اور تحقیق و تفصیل کا شاہکار ہے۔ پوری کتاب نفیس اردو ٹائپ میں چھاپی گئی ہے اور مجلد ہے۔ سرورق دیدہ‌زیب اور رنگین۔ ضخامت ۴۰۰ صفحات

قیمت چار روپیہ

علاوہ محصول ڈاک

ادارۂ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی


اب تو میرے بچوں کے کپڑے
گھر پر ہی دھوئے جاتے ہیں


New
SUNLIGHT
SOAP
SUNLIGHT
SOAP

تنقریب انقلاب اکتوبر



جلد ۱۳ شمارہ ۱۰

اکتوبر ۱۹۶۰ء

مدیر: رفیق خاور نائب مدیر: ظفر قریشی

سرورق:

سکھر بیراج

چندہ سالانہ: پانچ روپے آٹھ آنے

شائع کردہ: ادارہ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

فی کاپی: بارہ آنے

بشیر فاروق

شہیدِ صحنِ چمن

تِرے مزارِ مقدس پہ قائدِ ملت
دُرِ نیاز و عقیدت لٹانے آیا ہوں
ہر ایک حرف سے جسکے لہو ٹپکتا ہے
وہ خوں چکیدہ کہانی سنانے آیا ہوں
میں اپنے داغِ دلِ غم زدہ کا سودائی
خود اپنا چاکِ گریباں دکھانے آیا ہوں

شہیدِ قوم و وطن تیری بے گناہی پر
نگاہِ قاتل و تیغِ جفا بھی روتی ہے
چمن میں گریۂ شبنم کا تذکرہ کیا ہے
ترے فراق میں بادِ صبا بھی روتی ہے
شہیدِ صحنِ چمن تیرے خونِ ناحق پر
عروسِ لالۂ رنگیں قبا بھی روتی ہے

کسے خبر تھی کہ اے خضرِ راہ تیرے بعد
دیارِ پاک پہ غالب حریف آئیں گے
جو درس دیتے تھے ملت کو استقامت کا
کسے یقیں تھا قدم اُن کے ڈگمگائیں گے
بہت تھا ناز جنہیں اپنی رہنمائی پر
کسے گماں تھا وہ مستی میں لڑکھڑائیں گے
مرے فسانۂ غم پر لحد کے سینے سے
ندا یہ آئی محبت بھرے قرینے سے

تُلے ہوئے ہیں جو نقشِ وفا مٹانے کو
وہ مثلِ حرفِ غلط خود مٹائے جائیں گے
ضمیر بیچنے والوں کی شان غیرت کے
بڑی خوشی سے جنازے اٹھائے جائیں گے
وہ سر کہ نخوت و دولت سے سربلند ہیں آج
درِ گدائے وفا پر جھکائے جائیں گے
زمانہ آئے گا ٹوٹے گا خواجگی کا فسوں
چراغِ ظلم بالآخر بجھائے جائیں گے[1]

آفتابِ زرنگار

ہو گئی رخصت خزاں عہدِ بہار آ ہی گیا
میکشو مژدہ کہ دورِ خوشگوار آ ہی گیا
تشنہ کاموں کے لئے گردش میں جام آ ہی گئے
بادہ خواروں کیلئے ابرِ بہار آ ہی گیا
مشرقِ افکار پر غالب نہ تاریکی رہے
آسماں پر آفتابِ زرنگار آ ہی گیا
رفتہ رفتہ زخمِ دل کے مندمل ہوتے گئے
آتے آتے بیقراری کو قرار آ ہی گیا
کشتۂ آلام کو حالات راس آ ہی گئے
زادۂ طوفاں کو طوفاں سازگار آ ہی گیا
عظمتِ پارینہ ہاتھ آ ہی گئی کھوئی ہوئی
دستِ ملت میں وہ گم گشتہ وقار آ ہی گیا
ملتفت نظروں سے کیا ساقی نے دیکھا بزم میں
بے پئے میری نگاہوں میں خمار آ ہی گیا
منتظر اک عمر سے جس کا تھا سارا میکدہ
جام لہراتا ہوا وہ بادہ خوار آ ہی گیا
طائرانِ صبح سے کہہ دو کہ نغمے چھیڑ دیں
گلشنِ ہستی میں عہدِ نغمہ بار آ ہی گیا
منزلِ مقصد کو جس کی رہبری پر ناز تھا
لب پہ نام اس خضر کا بے اختیار آ ہی گیا
درد کو جس کی طلب تھی روح کو جسکی تلاش
بے حجابانہ وہ جانِ انتظار آ ہی گیا
عظمتِ فانی پہ جو نازاں تھے آخر انکو بھی
اعتبارِ گردشِ لیل و نہار آ ہی گیا
انقلابِ نو نے چھیڑا اس طرح سازِ غزل
زندگی کو نغمگی کا اعتبار آ ہی گیا

---

[1] یہ چراغ بالآخر انقلاب اکتوبر نے بجھا ہی دیئے اور اُن کے بعد "آفتاب زرنگار" طلوع ہوا جس کی جھلک ہم پہلو پارۂ فن میں نظر آتی ہے۔ (مدیر)

دوسالہ قومی ادب

مغربی پاکستان : رفیق خاور
مشرقی پاکستان : یونس احمر

رفیق خاور :

۲۷ر اکتوبر کو جو آفتاب طلوع ہوا وہ ایک نیا آفتاب تھا۔ انقلاب کے معنی ہی تھے ایک نئے دور کا طلوع جس میں پاکستان حقیقی معنوں میں پاکستان بنے گا اور اس کے ۸ کروڑ باشندے حقیقی معنوں میں آزاد ہوں گے۔ جس طرح ۱۱ سال پہلے وہ بیگانوں سے آزاد ہوئے تھے۔ اسی طرح اب اپنوں کے ہاتھ سے آزاد ہوں گے۔ عوام اور ان کے حقیقی سربراہوں کا دور آئے گا۔ چند خود غرض اور مفاد پرست افراد کی جگہ قوم کا بول بالا ہوگا۔ دبی ہوئی اُمنگیں، دبے ہوئے ارادے، دبے ہوئے مقاصد جاگ اٹھیں گے، حوصلے بلند ہونگے اور رکی ہوئی سرگرمیوں کے سلسلے دوبارہ زور شور سے جاری ہوں گے۔ "تیز قدم بیداریٔ انساں" سے روز افزوں تعمیر و ترقی کے سنہرے دور کا آغاز ہوگا۔ اور وہ خواب جسکی خاطر قیامِ پاکستان کی جدوجہد کی گئی تھی، بے اندازہ قربانیاں دی گئی تھیں، آخر کار شرمندۂ تعبیر ہوگا۔ غلامی کی گھٹی ہوئی مجبور فضا کی بجائے آزادی کی فضا پیدا ہوگی جس سے شعور پیدا ہوگا۔ فکر و عمل کی صلاحیتیں پھر ابھریں گی اور زندگی ہو یا ادب و فن، فکر و احساس ہو یا تخئیل سب اثر پذیر ہوں گے جس سے نہایت دقیع اور دور رس نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ اگر یہ انقلاب عوامی تھا اور عین وقت پر عوام کی خواہش کے مطابق رونما ہوا تو انہوں نے اس کے بارے میں کیا روش اختیار کی۔ وہ اس سے کس طرح اثر پذیر ہوئے۔ خصوصاً ذی شعور طبقہ جو زیادہ باخبر اور بالغ نظر ہوتا ہے۔ شاعر و ادیب، ظاہر ہے، اسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور حساس و ذہین ہونے کی بنا پر نہ صرف اپنے احساسات و خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں بلکہ دوسروں کے تاثرات کی عکاسی کا حق بھی ادا کرتے ہیں۔ قبل ازیں وہ قومی زندگی اور اس کے ہنگاموں سے بڑی حد تک کنارہ کش ہی رہے۔ کچھ زیادہ روشن خیال ہونے کے باعث اور کچھ اس خیال کے تحت کہ شعر و ادب کا منصب مقامی و ہنگامی معاملات سے بالاتر ہے۔ یا پھر اُس بیزاری اور دل برداشتگی کے باعث جس کا ملکی افراتفری اور بدنظمی کے زمانے میں عام دور دورہ ہو چکا تھا۔ جیسے جو کچھ ہو رہا تھا اس سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان کا سروکار ایسے ارفع و اعلیٰ معاملات سے تھا جو حیات و کائنات اور انسان سے تعلق رکھتے تھے۔ کبھی کبھار جب کوئی بڑی شخصیت اُبھرتی، کوئی بڑا واقعہ رونما ہوتا تو بعض ادیب و شاعر اس کی طرف بصد ذوق و شوق اعتنا کر لیتے اور ان کی تخلیقات خاصی دقیع ہوتیں۔ چنانچہ اس دور کی شعری و ادبی پیداوار کافی متنوع ہے۔ اور قومی شاعری میں بھی اس نے خاصا بلند مقام پیدا کیا لیکن بالعموم شعراء و ادبا ملکی و سیاسی ہنگاموں سے دور ہی رہے۔ یا زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ وہ "غمِ دوراں" اور "رہزن" کا گھڑاگ الاپ الاپ کر اپنی تسلی کر لیتے یا کبھی "خزاں میں بہار" کا تصور کر کے خوش ہو لیتے۔ یہ کہنا کہ اس دور میں اچھے لکھنے والے یا اچھا ادب نہیں پیدا ہوا اور ہمارے ادبی سرمایہ میں کوئی اہم اضافہ نہیں ہوا، صحیح نہیں۔

نئے دور کی کیفیت ہی اور ہے۔ ۲۷ر اکتوبر کا انقلاب ایسا ڈرامائی انقلاب تھا جس کے آتے ہی ساری قوم کا رجحان بدل گیا۔ جیسے یہ دن اس کا یوم نجات ہو اور اسے مکمل منشور آزادی مل گیا ہو۔ تمام لوگوں کو پہلی بار اپنائیت کا احساس پیدا ہوا۔ یہ کہ نئی حکومت ان کی اپنی حکومت ہے۔ صحیح معنوں میں عوام کی حکومت' یہ ایک ایسا احساس تھا جس میں خاص و عام سب شریک تھے۔ اور وہ اپنے دل میں ایک وقار، ایک امتیاز، ایک نئی شان محسوس کر رہے تھے۔ ان کا شعور یک بیک چمک اٹھا۔ جیسے ایک نئی کرن نے ان سب کے دل و دماغ میں نئی جوت پیدا کر دی ہو۔ پاکستان کی گیارہ سالہ تاریخ میں پہلی بار شدت سے ایک ہمہ گیر قومی و اجتماعی احساس پیدا ہوا۔ اور کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جو اس احساس سے سرشار نہ ہو۔ اسلئے شعراء و ادبا بھی ایک جذبۂ بے اختیار کے تحت اس رو میں بہہ گئے۔ ایک دو نہیں بلکہ سبھی

جوق در جوق، پوری سنگت کی سنگت۔ جیسے ان کے دل میں والہانہ ذوق شوق کی لہر موجزن ہو گئی ہو۔ کچھ عرصہ بعد "پاکستان رائٹرز گلڈ" کا قیام، گلڈ کے سیکرٹری، قدرت اللہ شہاب کی ادیبوں اور ان کی آزادی کے بارے میں تقریر، صدر پاکستان کا ادیبوں کو منشورِ آزادی، یہ تمام باتیں ایسی تھیں جنہوں نے احساس آزادی اور اس کے ساتھ احساس خودی کو بھی دوبالا کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ بے شمار ادیبوں اور شاعروں نے جلد ہی انقلاب سے غیر معمولی حد تک متاثر ہونے کا ثبوت دیا۔ اور وہ تب سے اب تک برابر ایسا ہی کرتے رہے ہیں، کیونکہ ۲۷ اکتوبر کا انقلاب کوئی تنہا واقعہ نہ تھا جو ایک بار ہوا اور ختم ہو گیا، بلکہ عوام کو ہر اعتبار سے ان کا مرتبہ اور حقوق عطا کرنے کا منصوبہ تھا جس کے لئے تدابیر کا ایک بے پایاں سلسلہ لازم تھا۔ اسی لئے ادبا و شعرا اور ارباب فکر و فن کا تاثر بھی ایسے ہی مستقل و مسلسل رہا۔ قومی زندگی اور ادب و فن کے دھارے پہلی بار زور شور سے ایک ساتھ مل کر بہنے لگے جس کے آثار ہمیں ان کی ہر صنف اور ہر شعبے میں دکھائی دیتے ہیں۔ ایسا نقطۂ روشن جو رفتہ رفتہ کہکشاں در کہکشاں بنتا گیا۔ حکومت کی معارف پروری، ادیب نوازی اور سرپرستیٔ فن نے بلاشبہ ادب و فن کو حیات تازہ ہی عطا نہیں بلکہ ان کے لئے مہمیز ثابت ہوئی ہے۔ دو سال کے مختصر عرصہ میں اس قدر وسیع، دور رس اور نتیجہ خیز اقدامات کا شاندار زنجیرہ کسی بھی حکومت اور قوم کے لئے مایۂ ناز ہو سکتا ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ اس زنجیرے کے بالمقابل ایک ایسا ہی وقیع ادبی، فنی اور ثقافتی زنجیرہ، تا حد نظر بے شمار سنہری کڑیوں کا سلسلہ یا اس اجالے کے پیش نظر جو نئے دورِ انقلاب میں جلوہ نما ہوا ہے، قطار اندر قطار شمعیں، سو بسو، صف بہ صف۔ جیسا کہ غالب نے کہا ہے۔ اور اس ہی کے الفاظ میں، جن سے مستقبل کے پیش نظر گزرگاہِ خیال بھی چراغاں ہے۔

عرض یہ حقیقت ہے کہ دورِ انقلاب کے ساتھ فضا یکلخت چمک اٹھی۔ اور اس کے ساتھ شعرا و ادبا کا ذہن بھی۔ ادھر حالات میں ڈرامائی وضع پیدا ہوئی۔ ادھر شعر و ادب میں بھی ایک متوازی جھلک رونما ہوئی۔ قومی جذبات میں خوب لہر پیدا ہوئی، اور واقعات کی ڈرامائی نوعیت نے انہیں اور بھی مہمیز کیا۔ عوام کے صدر، فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں سے زیادہ متحرک اور جاذب نظر شخصیت اور کون ہو سکتی تھی جو شعرا و ادبا کو تحریک دلائے؟ چنانچہ جہاں قومی شاعری کے جوہر چمک اٹھے وہاں صحافت اور ادب میں بھی نئی جان پڑ گئی، خصوصاً افسانہ، ناول اور رپورتاژ جیسی اصناف میں

جو حالات و واقعات اور اس قسم کے ڈرامائی حالات و واقعات کی عکاسی کے لئے اسی طرح موزوں اور فی الفور اثر پذیر واقع ہوئے ہیں جس طرح شاعر جذبات و احساسات کی ترجمانی کے لئے۔ اکتوبر کا انقلاب۔ عوام کا اپنا انقلاب ـــ انہیں اس قدر محبوب تھا کہ یہ ایک دو ہفتوں میں ہی شعرا کا چہیتا موضوع بن گیا۔ جب وہ اپنے نئے ماحول پر نظر ڈالتے تو جہاں پہلے تاریکی ہی تاریکی تھی وہاں روشنی ہی روشنی نظر آتی اور جہاں پہلے محرومی و بے چارگی اور جبر و استبداد کا دور دورہ تھا وہاں آزادی ہی آزادی دکھائی دیتی۔ صہبا اختر کی نظم "طوفانِ نیل" ایک تاریخی مثال کے ضمن میں پاکستان کی غلامی و آزادی کا ماجرا پیش کرتی ہے۔ اور ایسے پیرائے میں جس سے ندرت نمایاں ہے۔

یہ طوفانی لے یہیں نہیں رک گئی بلکہ اور بھی آگے بڑھی۔ یہاں تک کہ یہ ملک کے کتنے ہی نامور شعرا کو اپنی رو میں بہا لے گئی۔ جن میں سے بعض صف اوّل کے شعرا ہیں مثلاً ابوالاثر حفیظ، اسد ملتانی، سید ضمیر جعفری، قیوم نظر، قتیل شفائی، آغا صادق نے آزادی کو "سازِ صدا آہنگ" قرار دیا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اس نئے دور میں سب نے آزادی کی "سریلی دھن پر ساز بجائے" ہیں۔ ابوالاثر حفیظ انقلاب کے سربراہ، محمد ایوب خاں، کی حرکی روح سے متاثر ہو کر فوجی دھن میں نغمہ سرا ہوئے "شاہنامۂ اسلام" کی مانوس لَے "صبح صادق" میں پھر ابھری۔ احسان دانش نے پرانے پیمانوں میں انقلاب کی نئی شراب پیش کی۔ اس کے ہمنواؤں میں شورش کاشمیری، قیوم نظر ـــ حمید نسیم اور محشر بدایونی بھی ہیں۔ انہی کے ساتھ فیروز الدین فیروز، فیروز نظر اور رفیعہ جمال رعنا کی نئی آوازیں بھی ابھریں۔ نظر حیدرآبادی (جس نے قومی نظموں کا ایک پورا مجموعہ ترتیب دیا ہے) نے بعض نظموں میں دورِ استبداد اور دورِ انقلاب کا بڑا خوش اسلوبی سے موازنہ کیا ہے۔

ہمایوں (؟) بخت مجرم تخت آرائے حکومت تھے
لٹیروں کو بھی ملت کا نگہباں ہم نے دیکھا ہے
خدا کا شکر اب وہ رسم اندازِ کہن بدلی!
نئے ساقی نے بنیادِ بساطِ انجمن بدلی
کچھ اس انداز سے تقدیرِ اہلِ علم و فن بدلی
کہ اختر ہر سخنور کا فروزاں ہم نے دیکھا ہے

اسد ملتانی نے ۲۷ اکتوبر کا کس شوق سے خیر مقدم کیا ہے:۔

زمینداروں کی بھی جاتی رہی سب آسمانداری ÷ کہ وارث بن گئے وارث، وڈیروں پہ عتاب آیا

ضمیر جعفری نے ایک مستقل مجموعہ "لہو ترنگ" جس کی [illegible] پاکستان نے خاص طور پر قدر دانی کی اور متعدد منظومات کے علاوہ اپنے مخصوص فکاہیہ انداز میں بدلے ہوئے حالات کا نقشہ "زندگی کی جھلکیاں" میں پیش کیا ہے۔

پرانے جادہ پیماؤں کے ساتھ کئی نئے رہ نورد بھی سرگرم سفر نظر آتے ہیں۔ منظر اکبر آبادی، صادق نسیم، حمایت علی شاعر وغیرہ۔ آخر الذکر نے انقلاب پر بکثرت نظمیں لکھی ہیں، جن میں خاصی شعریت ہے۔

عاصمہ حسین ایک نئی شاعرہ ہے جو اس سے پہلے بھی اردو شاعری کو متعدد جواہر پارے عطا کر چکی ہے۔ دورِ انقلاب میں اس کی دو نظمیں "پھر آئی بہار تازہ" اور "پاک سی حرفی" نمایاں وقار کی حامل ہیں۔

جعفر طاہر نے انقلاب کے متعلق دو خاصے کی چیزیں پیش کی ہیں "ستارۂ انقلاب" اور "پنجم کے بعد" جو مشرقی پاکستان کا بہت ہی دلفریب مرقع ہے۔ ان دونوں نظموں کی بھرپور شعریت کا اندازہ بسیط مطالعہ ہی سے ممکن ہے۔

دورِ انقلاب کی عکاسی میں صہبا اختر کو بھی کافی دخل ہے جس نے متعدد نظموں "تیرگی سے روشنی تک" "مرگ خواجہ" "پرانی حویلی" "صبح دلآویز" اور "صبح در صبح" میں شاعری کو خاصے بلند مقام پر پہنچایا ہے۔

انقلاب کا ہر بڑھتا ہوا قدم شاعروں کے لئے ایک پرزور دعوت ثابت ہوا۔ اور بنیادی جمہوریت کے سلسلہ میں سربراہِ قوم فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کا تاریخی دورۂ مشرقی و مغربی پاکستان واقعی شاعروں کے لئے ایک قومی محرک ثابت ہوا۔ اس سلسلہ میں "صبح در صبح" (صہبا اختر)، "رہ نوردِ شوق" (رئیس امروہوی) اور "سیارۂ گیتی خرام" (جمیل نقوی) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں جن کا شمار ہماری بہترین قومی منظومات میں ہے۔ جمیل نقوی، صہبا اختر، سید فیضی اور عبد الرؤف عروج وہ شاعر ہیں جو انقلاب سے خاص طور پر متاثر ہوئے ہیں اور انہوں نے ایسے نقوش پیش کئے ہیں جن کی فنی حیثیت خاصی بلند ہے۔

ان کے علاوہ کئی شاعر اور بھی ہیں جو وقتاً فوقتاً انقلاب پر قلم اٹھاتے رہے ہیں اور قابل قدر نقوش پیش کرتے رہے ہیں۔ مثلاً باقی صدیقی، احمد ظفر، بشیر فاروق، اثر جلیلی ـــ محمد صادق شاذ اور مشتاق مبارک۔

اس سے پہلے شاعر و ادیب خصوصاً افسانہ نویس ہمیشہ مقصدی تحریروں سے گریز کرتے تھے۔ انقلاب نے کچھ ایسی فضا پیدا کر دی جس سے وہ خود بخود ایسی تخلیقات کی طرف مائل ہو گئے۔ غالباً یہ انقلاب کی ڈرامائی نوعیت کا نتیجہ تھا یا اس واقعیت کا جو اسکے باعث پیدا ہوئی۔ چنانچہ آج بھی اس موضوع پر برابر اعلیٰ درجے کی نظمیں اور افسانے لکھے جا رہے ہیں۔ شعرا کی طرح کئی ممتاز افسانہ نگار بھی اس سے کچھ کم متاثر نہیں ہوئے۔

سب سے پہلا ممتاز افسانہ نگار جس نے نئے حالات پر قلم اٹھایا "انور" تھا۔ اسکے سابقہ مجموعوں "منزل کی طرف" اور "آگ کے آغوش میں" سے صاف ظاہر ہے کہ دورِ انقلاب نے اسکے افسانوں میں کس قدر تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ "کمند" "ڈوب ڈوب کے ابھری ناؤ" "کوفی ہاؤس میں دو نقاد" ایسے افسانے ہیں جو انقلاب ہی نہیں فن کے سلسلہ میں بھی منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔

عنایت اللہ ایک اور افسانہ نگار ہے جسکے ذہن پر انقلاب ہی انقلاب چھایا ہوا ہے۔ اور اس نے افسانہ نویسی کی وہبی صلاحیت اور ذاتی تجربہ و مشاہدہ کی بنا پر متعدد افسانے "آئینہ" "ڈوبتا سورج" اور "پو پھیپائی کی آخری رات" لکھے ہیں جن میں انقلاب سے پہلے اور بعد کا زمانہ یوں قریب آ جاتے ہیں جیسے ہم انہیں کسی بڑی طاقتور دوربین سے دیکھ رہے ہوں۔ یہی کیفیت زیادہ وسیع پیمانے پر اسکے دو غیر مطبوعہ ناولوں "طاہرہ بیٹی" اور "ایک شہر ہزار افسانے" میں نظر آتی ہے۔

واقعیت کے ہمہ گیر اثر سے احمد ندیم قاسمی بھی متاثر ہوا ہے۔ اس نے "اصول کی خاطر" میں کسانوں کی بدلی ہوئی دنیا کا نہایت عمدہ نقشہ پیش کیا ہے۔ ایک اور مشاق افسانہ نویس، ابو سعید قریشی نے بھی یہی اثر قبول کرتے ہوئے چند افسانے لکھے ہیں۔ "چودھری" میں آزادیٔ جمہور کی جھلک بخوبی نمایاں ہے۔

انقلاب سے متعلق افسانے لکھنے کا عام رجحان ایک نئے افسانہ نگار محمد عمر میمن کے متعدد افسانوں میں بھی منعکس ہے۔ جس نے "کالے میگھا پانی دے" اور "غنچے چٹکے آدھی رات" میں دو بڑے ہی عمدہ مطالعے پیش کئے ہیں۔

شوکت تھانوی جیسے ممتاز صحافی نے بھی ڈگر سے ہٹ کر ایک دو چیزیں ادبی رنگ میں پیش کی ہیں اور اپنے مخصوص چٹخارے دار پیرائے میں "میرا پیارا بھتیجہ" اور "تشخیص مرض"۔

یونس احمر کی بدولت ہمیں مشرقی پاکستان میں زرعی اصلاحات کے انقلاب آفریں اثر کی جھلک "جب دھان کے خوشے لہرائے" میں نظر آتی ہے۔

جمیل الدین عالی انقلاب سے پہلے محض شاعر تھا۔ انقلاب نے اس میں بھی ایک نئی روح پیدا کر دی ہے۔ چنانچہ "پاکستان رائٹرز گلڈ" قائم کرکے ادیبوں اور شاعروں کو جگانے کے علاوہ اس نے "نئی کرن" میں انقلاب کا نقشہ بھی پیش کیا ہے۔ جو خاصا دلچسپ ہے اور اس کی داد کچھ اسی پیرائے میں دی جا سکتی تھی جو ابن انشا نے اپنے پر لطف اسکٹ "کتے کا کاٹا" میں اختیار کیا ہے۔ ابن انشا نے خود بھی "طرے باز خاں سے نیک محمد تک" میں زرعی اصلاحات اور بنیادی جمہوریتوں پر ایک نہایت شگفتہ مضمون لکھا ہے۔

ایک اور نامور ادیب، شاہد احمد دہلوی بھی اس سلسلے میں پیچھے نہیں رہا۔ اس نے بنیادی جمہوریتوں کے متعلق اپنے تاثرات ایک دلچسپ مضمون کی شکل میں پیش کئے ہیں۔

ممتاز مفتی جیسا ماہر فن بھی اس معاملہ میں اپنے نامور معاصروں کا ہمنوا رہا ہے۔ اس کے بنیادی جمہوریتوں اور جمہوریہ اسپیشل پر مضمون ادیبوں کے عام تاثر کی عکاسی کرتے ہیں جس کی جھلک رضا ہمدانی کے ایک رپورتاژ میں بھی نظر آتی ہے۔

ان سب سے بڑھ کر بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے بھی انقلاب اور اس کے مایۂ ناز سربراہ کا ذکر سنہری الفاظ میں کیا ہے۔ جو کچھ انہی کی زبان سے لطف دیتے ہیں۔

بہار کی ولولہ آفریں روح بعض اور زندہ دل گرم جوش ادیبوں کو بھی گدگدائے بغیر نہیں رہ سکی، مثلاً منظور عارف، تسلیم عارفی، احسان ملک۔ خوشی و خرمی کی جو لہر دورِ انقلاب میں نظر آتی ہے، اس نے ان نوجوانوں کی طبیعتوں میں ایک نئی ترنگ پیدا کر دی ہے۔ اس لئے ان کی تحریروں میں بھی ایک خاص شگفتگی نظر آتی ہے اور قلم میں ایک نیا انداز خرام۔

اگر ان گوناگوں مظاہر کے ساتھ، جو خالصاً قومی ہیں، علمی و ادبی مظاہر بھی شامل کر لئے جائیں جو کمیت و کیفیت کسی اعتبار سے بھی کم وقیع نہیں مثلاً ڈاکٹر سید عبداللہ کی تنقیدی تصانیف، عبدالعزیز خالد کے متعدد شعری مجموعے، غلام عباس کی "جاڑے کی چاندنی"، غلام الثقلین نقوی کے مقامی رنگ میں ڈوبے ہوئے اچھوتے افسانے، صادق حسین کے تر و تازہ افسانوی نقوش۔ اور متعدد رسائل و جرائد "صحیفہ"، نقوش، نیا دور، ادب لطیف، افکار اور ماہِ نو کی علمی و ادبی پیشکشیں تو ان سے دورِ انقلاب کی سرگرمیوں کا ایک خاصا بلند درجہ قائم ہوتا ہے۔ اور ابھی ان کا سلسلہ جاری ہے۔ اگر یہی کیفیت رہی تو ہم تھوڑے ہی عرصہ میں شعر و ادب کے ایک زریں دور کی توقع کر سکتے ہیں +

یونس احمر

انقلاب جب بھی، جس ملک میں اور جس دور میں بھی آیا اس کے اثرات انسانی معاشرے کے علاوہ شعر و ادب میں بھی نمودار ہوئے۔ ادب براہ راست انقلاب سے متاثر ہوتا رہا ہے۔ خواہ یہ انقلاب اپنے دامن میں خوش آیند زندگی کے گلہائے رنگا رنگ لیکر آئے یا تباہی و بربادی کے لاؤ لشکر۔ لیکن چونکہ حیاتِ انسانی اس انقلاب کے لئے چشم براہ رہتی ہے اور اس کے لئے مسلسل جد و جہد کرتی ہے جس کے پاؤں کے گھنگروؤں سے امن، خوش حالی، ترقی اور سلامتی کے نغمے برستے ہیں، اسلئے ادب اس انقلاب کا خیر مقدم کرتا ہے۔ اردو ادب کی طرح بنگالی ادب بھی تحریک پاکستان سے متاثر ہوا۔ ۴۷ء سے لیکر ۵۲ء تک کے بنگالی ادب کا خصوصاً مطالعہ کیجئے تو اس پانچ سال کے قلیل عرصے میں اچھا خاصا وہ مواد مل جائے گا جس کا تعلق تحریک پاکستان یا تحریک آزادی سے ہے۔ شاعروں نے نظمیں کہیں اور گیت لکھے، افسانہ نگاروں نے کہانیاں لکھیں، مضمون نگاروں نے مضامین قلمبند کئے۔ اور پھر ۴۷ء کے بعد سے اکتوبر ۵۸ء تک کا ادب پڑھا جائے تو آپ کے مطالعے میں بیک وقت کئی چیزیں آئیں گی۔ کبھی امیدوں کے دئے جگمگاتے ہیں پھر ٹمٹمانے لگتے ہیں، کبھی مایوسیاں سر اٹھاتی ہیں اور در و دیوار سے نالہ و شیون سنائی دیتے ہیں۔ کبھی زندگی شبِ تار کا لبادہ اوڑھ کر موت کا رقص پیش کرنے لگتی ہے کبھی دھان کے لہلہاتے کھیتوں اور ندیوں کی سیمیں لہروں سے شادمانی و مسرت کے گیت بلند ہوتے ہیں اور آنسوؤں کے مینہ برساتے ہیں، کبھی کال پڑتا ہے، کبھی ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری کی وبائیں نازل کی جاتی ہیں۔ آرام اور چین، سکھ اور امن، مسرت و شادمانی کہیں نہیں۔ ملاحوں کے گیتوں کی اڑان آبِ رواں کی سبک سجل لہروں کو چھو کر اوپر نہیں اٹھتی ہے۔ کاشتکار نئی فصل کی تقریب دھوم دھام سے نہیں مناتے ہیں — وہ جانتے ہیں کہ ان کی محنتوں کا پھل ان کے لئے نہیں کسی اور کے لئے ہے۔ مسلسل افراط و تفریط اور لوٹ کھسوٹ نے ان کے حوصلوں کو شکست دیدی ہے۔

لیکن اکتوبر ۵۸ء کے انقلاب کے بعد سے جہاں ہمارے معاشرے میں نمایاں اور خوشگوار تبدیلی آئی وہاں ادب کی ہر صنف بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ بنگالی ادب پر خصوصاً اس انقلاب کا گہرا اثر پڑا ہے۔ اس سلسلے میں جسیم الدین کے ایک گیت کا ترجمہ درج ذیل ہے جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ شاعر کے دل میں کیسا جذبہ پروان چڑھ رہا ہے اور اس کے احساسات کے افق پر کس آفتاب کی ضیا پاشی ہو رہی ہے:

وہ لوگ جو میرے اپنے ہیں،
وہ لوگ جو میرے دل اور روح ہیں
وہ لوگ جو میرے وطن کے انسان ہیں
میں ان ہی کو سوچ سمجھ کر ووٹ دوں گا
بازار میں تو انسانوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے رہتے ہیں
پر دل کو جن سے لگاؤ ہے ان کی تعداد دو ایک سے زیادہ نہیں۔
ان کو بآسانی پہچان نہیں سکتے۔
گھر بنانے کے لئے ایسا مزدور چاہیئے جو اپنے ہنر میں پختہ ہو

دریا عبور کرنے کے لئے ایسا مانجھی چاہیئے جو جوار بھاٹا کی خبر رکھتا ہو۔
وطن کی خدمت کے لئے ویسے تو صدہا افراد اپنے آپ کو پیش کریں گے۔
لیکن ان میں صرف دو چار ہی بے لوث اور ایماندار ہوں گے۔
ان ہی کو سوچ سمجھ کر ووٹ دونگا!
جو اپنے قول و فعل میں واقعی پختہ ہیں
وہی ہمارے معاشرے کی ناؤ کے پتوار کو اپنے ہاتھوں میں لیں گے۔
ان ہی کو سوچ سمجھ کر ووٹ دوں گا!
بھائیو، جس کا جو کام ہے وہ اسی کو زیب دیتا ہے،
بڑھئی چھپر نہیں بنا سکتا اور نہ چھپر بنانے والا بڑھئی کا کام کر سکتا ہے۔
جو جس کام کے لئے بنا ہے میں اس کو وہی کام سونپوں گا۔
ایسا ہی انسان طوفان اور آندھی میں دریا پار کر سکتا ہے۔
ایسے ہی لوگوں کو سوچ سمجھ کر ووٹ دونگا!

جسیم الدین کے اس گیت میں مشرقی پاکستان کے تمام افراد کی آواز گونج رہی ہے۔ اب یہ لوگ اُن سیاست دانوں سے دھوکا نہیں کھا سکتے جنہوں نے ان کے کھیتوں کو بار ہا ویران کیا ہے اور جو مصنوعی کال پیدا کر کے ان کی زندگیاں برباد کرتے رہے ہیں۔ ان کے ہونٹوں کے وہ راگ جن میں کبھی حیات افروز جذبے پروان چڑھتے تھے مردہ ہو چکے تھے۔ ان کے دلوں کی ترنگیں دھواں بن کر فضا میں کھو گئی تھیں۔ ان کی دلہنوں کی نازک کلائیاں چوڑیوں سے خالی ہو چکی تھیں۔ ان کے بچے ننگ دھڑنگ رہتے تھے۔ جسیم الدین اس کال کوٹھڑی سے نکل کر آزاد فضا میں سانس لیتا ہے اور اپنے ہموطنوں سے مخاطب ہوتا ہے:۔

وہ لوگ جو میرے اپنے ہیں،
وہ لوگ جو میرے دل اور روح ہیں،
میں ان ہی کو ووٹ دوں گا

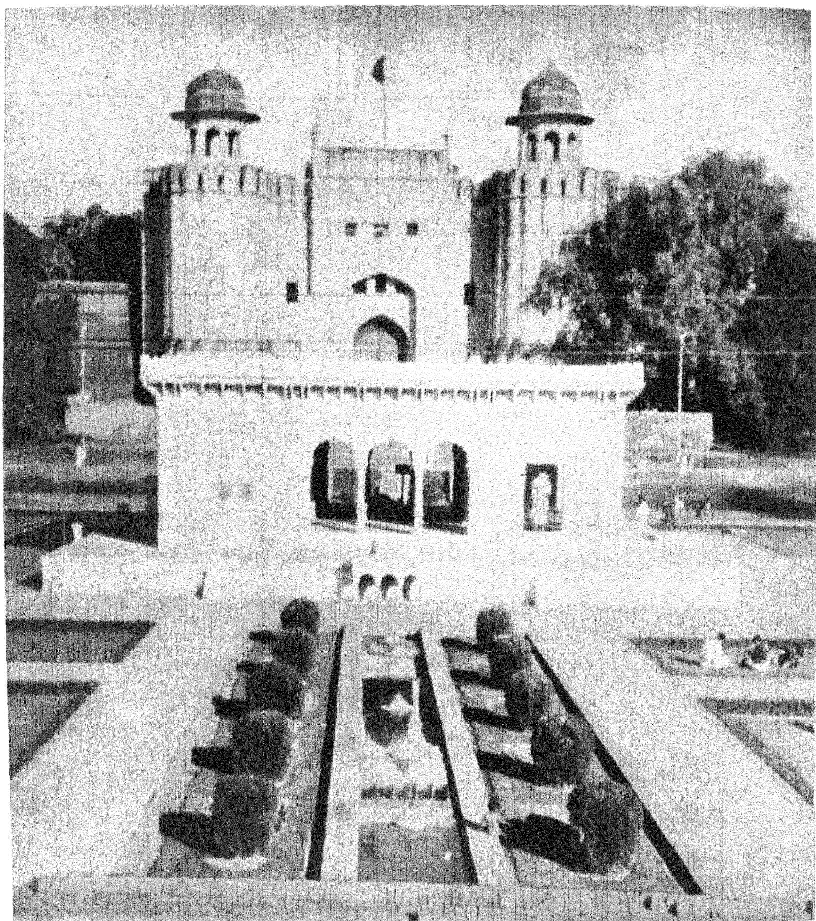
مشرقی پاکستان کا ایک اور حساس شاعر فرخ احمد بھی اپنے ہموطنوں کو للکارتا ہے:۔

میرے ہموطنو، میرے دوستو ہشیار!
ایسے رہنما کا ہرگز انتخاب نہ کرو
جس نے قوم کے مستقبل کی پروا نہ کی
جس نے ملک کی قسمت کو روند ڈالا
جس کا کھیل محض خود غرضی رہا ہے
جس نے قوم کی امیدوں کے گلاب مسل ڈالے
جس نے سروں پہ دُکھوں کے بادل لہرائے
جس کی وجہ سے گھر گھر فریادیں گونجنے لگیں
جس نے ملک کو تباہ و برباد کر ڈالا۔
جس نے پاؤں میں موت کی بیڑیاں پہنا دیں
میر جعفر اور میرن کا دوست
جس نے موقع پا کر خنجر سے وار کیا اور کلیجہ نکال دیا!

یہ اس فرخ احمد کا انتباہ ہے جس نے پاکستان بننے سے پہلے بھی "سات سمندر کے مانجھی" جیسی معرکہ آرا نظم لکھ کر قوم کو بیدار کیا تھا۔ اس نے ہمیشہ اپنی آتش نوائی سے بنگال کے مسلمانوں کی سرد رگوں میں گرم لہو دوڑایا ہے۔ آزادی کے بعد بھی جب تھوڑی مدت کے لئے ترقی و کمال کا آفتاب اپنی کرنیں پھیلا کر گہنا گیا تو اس کے احساسات اُسے برابر جھنجھوڑتے رہے۔ وہ اپنی آنکھوں سے اس خونیں تماشہ کو دیکھتا رہا جس نے اس کے ملک کو کنگال بنا دیا تھا۔ وہ ان آوازوں کو سنتا رہا جن میں فریب کاریاں تھیں ـــــ اور وہ دل ہی دل میں کڑھتا رہا لیکن اب جبکہ انقلاب اکتوبر کی وجہ سے بدلیاں چھٹ گئی ہیں اور ترقی و کمال کا آفتاب ضوافشاں ہے، وہ ببانگ دہل اپنے ہموطنوں کو اُن رہنماؤں سے ہشیار کر رہا ہے جنہوں نے اُن کی ہر تمنا کو روند ڈالا تھا۔

ایک اور شاعر اظہر الاسلام کے ہونٹوں پر یہ گیت لہرا رہا ہے:۔

آج میں اپنی زندگی کے سارے دکھ درد بھول چکا ہوں۔
آج کائنات کتنی حسین نظر آ رہی ہے،
دکھ کی شبِ تار آ بھی جائے تو میں صبحِ صادق یا نورِ مہتاب کی خواہش کروں گا!
اب چار دن اور آنسوؤں کی برکھا کیوں ہو؟
دکھوں کی جتنی ندیاں ہیں میں ان سب کو عبور کر جاؤں گا،
میں دھرتی پہ بیٹھ کر ایسے نغمے بکھیروں گا جن میں خوشی و مسرت



شاہی قلعہ (لاہور): ہمارے شاندار ماضی کا آئینہ دار رنگین عکس : اسماعیل صدیقی

کی چبکا رہوا!

آج میرے من کے بن میں خواب کی جیت چوری پری آئی ہے،
جو لے گئی ہے مجھ کو خواب سے جگا کر خاموش تنہائی میں!
اس نے دکھ درد بھلا کر سکھ کے چراغ جلا ڈالے ہیں
اور اب وہ میرے ساتھ مستی و سرخوشی میں رقص کناں ہے!

شاعری کے علاوہ افسانوی ادب پر بھی انقلاب اکتوبر کا خاصہ اثر ہے۔ کمال بن مہتاب کے افسانہ "پیغامِ امن" کے چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے:

"حصول آزادی کے بعد بھی چند برسوں تک احمد علی فوج میں ملازمت کرتا رہا۔ اس کے بعد میعاد پوری ہوگئی تو اس نے چائے کی دکان کھول لی۔ دکان چھوٹی سی تھی مگر احمد علی اُسے صاف ستھرا رکھتا تھا۔ ڈائیننگ ٹیبل پر دیس بدیس کے اخبار و رسائل بھی ہوتے"۔

"سڑکوں کی بتیاں جلادی گئی ہیں۔ لوگوں کی آمد و رفت اب بھی کم نہیں ہوئی ہے لیکن سیاسی جماعتوں کے دفتروں میں تالے پڑجانے سے عوام کے اندر کچھ خوف و ہراس پایا جاتا ہے۔ بوڑھے سرکاری کلرک امین اور اس کے بیکار گریجویٹ لڑکے اکبر کے دلوں میں امیدوں کے بلبلے بنتے ہیں اور ٹوٹتے جاتے ہیں۔"

"کیا زندگی میں ایک بار پھر عزائم بیدار ہونگے؟"

"اس سے پہلے بھی اختیارات ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتے رہے ہیں لیکن عوام کی زبوں حالی میں کوئی فرق نہ آیا۔ تبدیلی جتنی بار بھی ہوئی، اندھیرا اور گہرا ہوتا گیا۔ محلوں کے کنگورے بلند ہوتے گئے، کٹیاؤں کی دیواریں گرتی گئیں۔ باپ اپنی کنواری بیٹی کے لئے ساڑی خرید نہ سکا، معصوم نے دوسال پہلے جس کے ساتھ عہد و پیمان کئے تھے وہ ایفا نہ ہوسکے"۔

"ہاشم علی نے گورساہا کی دکان سے بھنا ہوا چاول خریدا تھا، اس کو پھانکتے پھانکتے اس نے دل ہی دل میں سوال کیا ——" اس زندگی کا بھی کوئی مقصد ہے؟"

"مقصد؟" احمد علی کو ہنسی آگئی تھی ——" ہاں اس کا بھی ایک مقصد ہے —— بھیڑ بکریوں کی طرح اپنی زندگی کو گھسیٹتے رہو"۔

"آپ ہنستے ہیں؟"

"اور کیا کروں گا۔ آجکل آنسو جو نہیں آتے"۔

کاؤنٹر سے اٹھا کر احمد علی نے ریڈیو سیٹ کو ٹیبل پر رکھ دیا تاکہ تمام لوگ اطمینان سے سن سکیں۔ یکایک انقلاب کے ایک عظیم رہنما کی آواز گونج اٹھی۔

بھائیو! اس بار آپ کی فوج آپ کی خدمت کے لئے میدان میں آئی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ ملک تباہ ہوچکا تھا۔ بھوک، بدحالی، لوٹ مار........"۔

"میں آپ کی فوجوں کی طرف سے آپ لوگوں کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی ساری پریشانیاں دور ہوجائیں گی...."۔

ہاں عوام یہی چاہتے تھے!

یہ آواز احمد علی کیبن سے لیکر گلی کوچوں، سڑکوں، گاؤں شہروں میں گونجتی رہی اور رات کے آسمان کی چھاتی چیرتی رہی۔

احمد علی نے امید و یقین کی سانس لی "ہاں فوجی بات کے بھی دھنی ہوتے ہیں"۔

غرض بنگالی ادب کی ہر صنف انقلاب اکتوبر سے بہت متاثر نظر آتی ہے۔ اس کا اثر ڈراموں اور اسٹیج پر بھی پڑا ہے۔ دوسال کے عرصے میں مشرقی پاکستان کے مختلف علاقوں میں جو ڈرامے اسٹیج کئے گئے ہیں ان کا بنیادی تخیل انقلاب اکتوبر ہی رہا ہے ●

جگر مرحوم

اس شاعرِ عظیم غزل گو کی موت پر

ہر اک دلِ فگار پہ غم کا نشان ہے
کیسے کہیں نہ مرگِ جگر پر تمام ہائے
(۲۶)
مرگِ جگر یہ مرگِ غزل کا گمان ہے

(۱۹۳۴)

(۲۶ + ۱۹۳۴ = ۱۹۶۰ء) (خاور)

بحث، پاکستانی ادب کی تشکیل

(۲)

خیال مینائی

ادب کا مقصد کیا ہے؟ وہ قوموں کے عروج و زوال کی داستان ہے یا الحمرا اور آرٹ کونسل کے حسن و جمال کی تصویر؟ نامور شعرا مثلاً کالی داس، شیکسپیئر، گوئٹے، استفلانے میلارمے، امراء القیس، حافظ شیرازی، صباح الدین علی، علامہ اقبال اور قاضی نذر الاسلام میں سے کس کس کے فن میں وطنیت جلوہ گر ہے؟ اور کیا آج کے ایٹم اور میزائیل کے دور میں جبکہ ساری دنیا سمٹ کر ایک بن گئی ہے، ملکی و قومی ادب کی تشکیل ممکن ہے؟

ادب زندگی کا عکاس ہے اور زندگی ادب کو تخلیقی مواد فراہم کرتی ہے لیکن بڑا ادب پیدا کرنے کے لئے فن کار کو خود سے محبت کرنا لازم ہے۔ اپنے آپ کو غایتِ تخلیق سمجھ کر۔ کامیٹن کے یہ الفاظ ہماری بڑی رہنمائی کرتے ہیں کہ جس چیز کی یہاں ضرورت ہے وہ خلاق تخیل ہے۔

ادب کے متعلق یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ اس کا مقصد فلاح و عافیت ہے۔ مشیت نے کہا کہ اجالا ہو۔ . . اور وہ ہو گیا! عوام حیات کا سر چشمہ ہیں اور ادب اس سر چشمہ کی نرم و نازک سی وہ موج ہے جو زندگی آمیز بھی ہے اور زندگی آموز بھی۔ افلاطون نے اس کی اس طرح وضاحت کی ہے کہ شاعر بلا شبہ پرواز کی اہلیت رکھنے والی ایک انتہائی لطیف برگزیدہ ہستی ہے۔ وہ اس وقت تک کسی ایسی چیز کو جسے شاعری کا نام دیا جا سکے معرضِ وجود میں نہیں لا سکتا جب تک کہ اس پر وجد طاری نہ ہو جائے۔ یا یوں کہئے جب تک وہ جذبہ کا شکار نہ ہو جائے۔ استدلال کی موجودگی میں اس کے لئے شعر گوئی ناممکن ہے۔" خونِ جگر کے بغیر شاعرِ مشرق کے الفاظ میں سچا اور تخلیقی ادب پیدا نہیں ہو سکتا۔

عاؔلی نے لکھا ہے کہ "پاکستان کے ابتدائی زمانے میں تو بے شک اچھا اور اعلیٰ مقصدی ادب آپ ہی آپ پیدا ہوا لیکن اس کے بعد لکھنے والے یا تھک گئے یا بھٹک گئے ـــ" مجھے اس سے اختلاف ہے۔ میری رائے میں پاکستان بننے کے فوراً بعد جن ادیبوں کے فن پارے منظرِ عام پر آئے انہوں نے اچھا اور مقصدی ادب کم اور المیا اہرن برگ کے خوابوں کی تعبیر میں ہنگامی اور اخباری ادب زیادہ پیدا کیا۔ اس دور کے شاعروں میں میراجی، فیض، احمد ندیم قاسمی، حفیظ ہوشیار پوری، شور علیگ، مجید امجد، مختار صدیقی، جعفر طاہر، عدم، قتیل شفائی، ظہیر کاشمیری، سید فیضی، راشد اور عارف عبد المتین وہ شاعر ہیں جو پاکستان کے حصے میں آئے یا انہوں نے اس خطۂ زمین کو اپنا وطن بنایا۔ اس دور کے لکھنے والوں نے آزادی کی جو تصویر کھینچی ہے وہ حد درجہ بھیانک ہے۔ یاسیت کے یہ امام آزادی کا خیر مقدم یہ کہہ کر ہی کرتے رہے کہ۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے یہ میری محنت کا حاصل نہیں ہے۔ عارف عبد المتین نے اس دور میں جو نظمیں لکھی ہیں ان میں نہ جذبہ ہے نہ تاثر، نہ سادگی ہے اور نہ آفاقیت۔ لیکن جس ادب کو اچھا اور تخلیقی کہا گیا ہے اس کی دو[1] مثالیں تحریر کرتا ہوں:

"ہوا کا تیز اور تند جھونکا ہے سخت ناداں
پلٹ کے اک بار بھی نہ دیکھا
افق سے خورشیدِ زندگی سرخ پرچموں کی حسین چھاؤں میں بڑھ رہا ہے
یہ موت کی اژدھا صفت انجمن ابھی جگمگا اٹھے گی،
ذرا نہ سوچا
یہ شمعِ ہستی تو اپنا کارِ عظیم انجام دے چکی ہے
تمام شب جھلملا چکی ہے
اسے بجھانے سے فائدہ کیا۔ خرامِ خورشیدِ زندگی تو نہ رک سکے گا"

اس کا موضوع ظاہر ہے۔ اس میں اہلِ پاکستان کو یہ مژدۂ نو سنایا گیا ہے کہ ان کا کارواں اشتراکیت کی آغوش میں رواں دواں ہے اور صرف اسی پر منحصر نہیں، شاعر نے اپنی ایک اور نظم میں صاف صاف کہہ دیا

---

[1] اس معیار پر بے شمار نظمیں پوری اترتی ہیں بلکہ ان کا درجہ ان سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ دوسرا پارہ خصوصیت سے بہت معمولی ہے۔ (مدیر)

کہ اس دور کا سب سے بڑا قائد اور رہبر کون ہے جو مرنے کے بعد بھی زندہ ہے اور ملک کے عوام کی برابر رہنمائی کر رہا ہے:۔

"عظیم باپ ترے واسطے ترے فرزند
عقیدتوں کے شفق رنگ پھول لائے ہیں
نجانے کون سا احساس ضوفشاں ہے کہ دل
اُبھرتے چاند کے مانند جگمگائے ہیں"

"عظیم باپ" کا اشارہ بابائے ملت کی طرف نہیں بلکہ ایک غیر ملکی بزرگ کی طرف ہے پھر اس ادب کو سچا، بڑا اور تخلیقی ادب کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے؛ میری رائے میں علامہ اقبالؒ کے بعد اردو شاعری میں آج تک ہمہ گیر، سچا اور بڑا ادب تخلیق نہیں ہوا ہے۔

رہا یہ سوال کہ پاکستان بننے کے بعد لکھنے والے تھک گئے اور ادب میں جمود آگیا۔ یہ بات کسی حد تک صحیح ہو سکتی ہے لیکن اس میں بھی اختلاف کے پہلو مضمر ہیں۔ پاکستان کے قیام سے پہلے ہم جس معاشرہ میں زندگی گذار رہے تھے وہ ایک نمو پذیر اور ترقی پسند دارہ تھا۔ آزادی اور حریت کی جو روح علی برادران نے ملتِ اسلامیہ کے جسدِ مردہ میں پھونکی تھی، اس میں قائدِ اعظم اور شاعرِ مشرق کی صلاحیتوں نے برگ و بار پیدا کئے۔ اسی طرح آزادی کی شدید ضرورت کا احساس غیر مسلم عوام کی روحوں میں اتر چکا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو ادب میں ایک طرف آزادی، مساوات، حریت اور غیر ملکی سامراج سے ٹکرانے کی قوت جڑ پکڑنے لگی تو دوسری طرف سر سیدؒ، حالیؒ، شبلیؒ اور اقبالؒ کی پیروی میں ادب کی ہر صنف ترقی کی عظیم شاہراہ پر گامزن ہو گئی۔ اس سلسلہ میں جامعہ عثمانیہ، دار الترجمہ حیدرآباد، دار المصنفین اعظم گڑھ، ندوہ، علیگڈھ، لکھنؤ، اور لاہور کی ادبی درسگاہیں مشعلِ راہ ثابت ہوئیں اور چند سالوں ہی میں اردو ادب مالا مال ہو گیا۔ یہ زندگی رواں دواں تھی کہ قیامِ پاکستان کا اعلان ہوا اور ادب تقسیم ہو کر موت کی آغوش میں چلا گیا۔ ادیبوں کے تھکنے اور بھٹک جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ نئے ملک میں زندگی کے نئے تقاضے تھے لیکن معاشی ابتری نے ادیبوں کی تخلیقی صلاحیت ہی کو نہیں خود ان کو مع ان کے متعلقین کے بھی نگل لیا۔ اب مستقبل میں کوئی آثارِ کہن کا متلاشی ان قدیم مقبروں کا کھوج لگائے گا تو اسے اردو ادیبوں کی گلی سڑی لاشیں فلم کمپنیوں کے ملبے اور نشر گاہوں کے اجڑے مزاروں کی خاک سے لالہ و گل کی شکل میں نمایاں ہوتی نظر آئیں گی اور ادبی مؤرخ یہ کہہ کر خاموش ہو جائے گا کہ:

اے گل بتو خورسندم تو بوئے کسے داری

حالی نے ادب کی مقصدیت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اچھا ادب لازماً مقصدی ادب ہوتا ہے اور مقصدیت ایک غرض، ایک اسکیم، ایک تحریک، ایک آدرش یا کسی بھی اکائی کا نام نہیں بلکہ مقصدیت سے مراد ہے انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی مسرت ـــ" یعنی ادب ایک تحریک بھی ہے اور آدرش بھی۔ اور جب بھی اردو ادب میں کسی تحریک کی عکاسی اور کسی آدرش کی روشنی نظر آئے گی وہ ادب خاص ملکی ادب ہوگا۔ اس سے انکار نہیں کہ ادب میں مقصدیت ہونا چاہئے لیکن اس نظریہ سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ ادب کو اقوامِ متحدہ کا منشور ہونا چاہئے۔" ہر اعلیٰ درجے کے فن کار کی نظر میں حقیقت کی بدلتی ہوئی شانیں ہوتی ہے۔ اس لئے اس کو کسی ایسے بندھے ٹکے اصول کا پابند نہیں کیا جا سکتا جو کسی عارضی، سیاسی یا سماجی مصلحت کا نتیجہ ہو۔ اگر ادیب کے لئے چند مخصوص اصولوں کی پیروی ضروری قرار دیدی جائے تو اعلیٰ اور مقصدی ادب کبھی تخلیق نہیں ہو سکتا۔ اسٹالن کے روس میں وہ ادیب جو ایک عرصہ تک سرمایہ داری اور سامراج کے خلاف جد و جہد کرتے رہے تھے، احتساب کے دور میں یا خاموش رہے یا پھر ان کی تحریریں اخباری خاکے بن کر رہ گئے۔ عظیم روس میں پاسترناک کا حسرتناک انجام دیدۂ بینا کے لئے درسِ عبرت ہے۔ ڈاکٹر ژواگو ایک ناول ہی نہیں، ایک ادبی محضر ہے جس پر پاسترناک نے اپنے خون سے دستخط کئے ہیں۔ روس کے ادبی جمود کو دیکھتے ہوئے یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ تخلیق کا کارنامہ صرف آزاد فضاؤں ہی میں انجام پذیر ہو سکتا ہے۔ اس موقع پر ہمیں ڈاکٹر یوسف حسین کے یہ الفاظ بھی یاد رکھنے چاہئیں کہ "ادب کو یقیناً سماج سے بے تعلق نہیں ہونا چاہئے لیکن اگر کسی سماج میں فن کار کو پوری آزادی میسر نہیں تو وہ جمالیاتی قدروں کی تخلیق نہیں کر سکتا۔"

پاکستان میں خاص پاکستانی، یا زیادہ موزوں الفاظ میں، ملکی ادب آج سے سالہا سال قبل تخلیق ہوا ہے جو ہمارا مقدس ورثہ ہے۔ وارث شاہ، بلھے شاہ، شاہ عبد اللطیف بھٹائی، علامہ اقبال، حسیم الدین اور نذر الاسلام کا کلام خاص ملکی کلام ہے جس میں چناب اور جہلم کی روانی بھی ہے۔ پدما اور میگھنا کا ابھار بھی ہے اور مہران کی طغیانیاں بھی ـــ اردو ادب

(باقی صفحہ ۹۹ پر)

فکاهیه:

"مسدّس بدحالی"

(انقلاب ملی اکتوبر ۱۹۵۸ء سے پہلے کی جھلک، ایک طویل نظم کے چند پارے)

سیّد ضمیر جعفری

سیاست کا ہر پہلواں لڑ رہا تھا
یہاں لڑ رہا تھا، وہاں لڑ رہا تھا
بیاں کے مقابل بیاں لڑ رہا تھا
حسابِ دلِ دوستاں لڑ رہا تھا
ستارہ نظر مہ جبیں لڑ رہے تھے
سرِ عام پردہ نشیں لڑ رہے تھے

مقاصد کو زیر و زبر کر کے لڑنا
نتائج سے قطعِ نظر کر کے لڑنا
سنان و تبر تیز کر کر کے لڑنا
"اگر" کر کے لڑنا "مگر" کر کے لڑنا
گماں پر لڑائی، یقیں پر لڑائی
جہاں ٹھن گئی بس وہیں پر لڑائی

مزاجوں میں یوں لیڈری آ گئی تھی
کہ ہر گھر کی اپنی الگ پارٹی تھی
کوئی "شیر" تھا تو کوئی "لومڑی" تھی
یہی اپنی لے دے کے "انڈسٹری" تھی
نہ منزل نہ جادہ نہ کوئی ارادہ
رضا کار کم اور لیڈر زیادہ!

مکیں گم شدہ تھے، مکاں لڑ رہے تھے
زمیں چپ مگر آسماں لڑ رہے تھے
لڑائی تھی مقصود، ہاں لڑ رہے تھے
کہاں لڑنے والے کہاں لڑ رہے تھے
فسادات کی سرخیاں اور بھی ہیں
"مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں"

وہ لیڈر بیانات برسانے والے
مرادیں بھتیجوں کی بر لانے والے
بہر کار بیوپار فرمانے والے
بٹیریں وزارت کی تھمیانے والے
بیاباں کو صحنِ چمن جانتے تھے
قیادت کو خوراکِ تن جانتے تھے

تعصب کا فتنہ ہوا پا رہا تھا
تغلّب کا پرچم کھلا جا رہا تھا
اجالا، اندھیرے سے شرما رہا تھا
کہ سورج نکلتے ہی گہنا رہا تھا
جو روندا کئے خاور و باختر کو
وہ پھر خیر سے لوٹ آئے تھے گھر کو!

مکانوں سے نکلے دکانوں کے جھگڑے
ملوں نے بُنے کارخانوں کے جھگڑے
بیانوں، زبانوں، ترانوں کے جھگڑے
فسانوں پہ ہم داستانوں کے جھگڑے
قناتوں پہ اور شامیانے پہ جھگڑا
وہ جھگڑا کہ ہر دانے دانے پہ جھگڑا

کوئی "نرم ریشے" کے کھلیان میں گم
کوئی "گرم گیہوں" کے گھمسان میں گم
کوئی اپنے شہروں کے رومان میں گم
کوئی اپنی نہروں کے طوفان میں گم
یہ احوال اقران و امثال کا تھا
"قبیلے قبیلے کا بُت اک جدا تھا"

کوئی اپنے کلچر کو شلوار سمجھے
کوئی اپنی ساڑھی کو شہکار سمجھے
کوئی اپنی ٹوپی کو سردار سمجھے
کوئی اپنے طرّے کو طرّار سمجھے
عجب کیا اگر قافلہ کھو گیا تھا
حدی خوان، کوہان پر سو گیا تھا!

ستاروں کا کارواں

شجاع احمد زیبا

کچھ عرصہ پہلے ہمارے سامنے محض ایک شمعوں کی قطار تھی۔ اب یہ قطار ستاروں کا کارواں بن چکی ہے۔ جو بجھتے ہی دیکھتے دیکھتے خبر نہیں کہاں کا کہاں پہنچ گیا ہے۔ بس روشنیوں کا ایک سلسلہ جو برابر آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اور افق پر نئی نئی تابانیوں کی خبر دیتا ہے۔ اس لئے کہ آج ہمارا ستارۂ ملت پوری طرح روشن ہے۔ وہ ظلم ناروا اور مفلوکی و بدحالی کی تہہ بہ تہہ، توبہ تو تاریکیاں، وہ "سیہ باطن اندھیرے" جو بداندیش سیاست دانوں کی شکل میں مشرق و مغرب پر چھائے ہوئے تھے، دور ہو گئے اور ان کی جگہ تابناک ستاروں نے لے لی ـــ انقلابی حکومت کے کارہائے نمایاں، رفاہی اصلاحات، حیات افروز ہنگاموں اور بے پناہ سرگرمیوں کے ستارے جو اپنی روز افزوں آب و تاب کے ساتھ دیار پاک کی پیشانی کا نور بن کر جگمگا رہے ہیں۔

یہ ہے دوش و امروز کا فرق۔ دوش تاریکیوں کا سیل بے کراں۔ امروز روشنی کا بحر بے پایاں۔ کل کا پاکستان حقیقی معنوں میں پاکستان ہی نہ تھا۔ چہ جائیکہ ہم اسے "اپنا" پاکستان کہہ سکتے۔ یہ تو دوسروں کا وطن تھا، غیروں کا وطن، بیگانوں کا وطن! ان خود غرض، مفاد پرست جونکوں کا وطن جو قوم کا خونِ حیات چوس رہی تھیں، جو اپنے ہوتے ہوئے بھی بیگانوں سے بدتر بن چکے تھے۔ اور جن کی قوم دشمن سرگرمیوں نے ملک کو تباہی کے کنارے لا کھڑا کیا تھا۔

بلاشبہ اگر ہماری خوش قسمتی سے، ۲۷ اکتوبر کا معرکہ آرا انقلاب بر وقت رونما نہ ہوتا تو وہ دیار پاک جسے قائد اعظم جیسی برگزیدہ ہستی اپنی ان تھک جد و جہد سے وجود میں لائی تھی، جس کی خاک کو شہید ملتؒ نے اپنے خون سے سینچا تھا، جس کے لئے ہزارہا انسانوں نے جان و مال کی بے اندازہ قربانیاں دی تھیں، جس کے لئے وہ آفات و مصائب کے بھڑکتے ہوئے جہنم میں سے گزرے تھے، خبر نہیں کہاں ناپید ہو جاتا۔ اور ڈھونڈنے والی نگاہیں صفحۂ روزگار پر اس کا نام و نشان بھی نہ پاتیں۔

یہ انقلاب اکتوبر ہی کا معجزہ تھا کہ ہمارا ملک برقرار رہا۔ اور ہم آج آزاد قوموں میں اپنے ستارۂ روشن پر نازکناں ہیں۔

پچھلے چند سال تاریخ عالم میں کتنے ہی ملکوں کو آزادی کی فضا میں ابھرتا دیکھ چکے ہیں۔ ایسے ممالک جو ایشیاء، افریقہ اور دنیا کے دوسرے حصوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ ان سب کو ان مسائل سے دوچار ہونا پڑا ہے جو آزادی کے لئے لازم ہیں مثلاً اپنے آپ کو سنبھالنا، اپنے قدموں پر کھڑے ہونا، اپنی ضروریات کو پورا کرنا، اپنی اقتصادی حیثیت کو استوار کرنا۔ ایسے ملکوں کو لامحالہ نئے تقاضوں سے نبٹتے ہوئے اپنے معاملات کو نئے سانچے میں ڈھالنا پڑتا ہے۔ رفتار زمانہ سے ہم آہنگی پیدا کر کے حالات کو سازگار بنانا پڑتا ہے۔ تب کہیں جا کر اس کی سیاسی و اقتصادی زندگی مستحکم بنیادوں پر قائم ہوتی ہے۔

اس طرح حالات سے رو براہ ہونے کے لئے نوزائیدہ مملکتوں کو وہ تمام تدبیریں کام میں لانا پڑتی ہیں جو نظم و نسق، سرانجام امور اور مضبوطی و استحکام کے لئے ضروری ہیں۔ غلامی اور آزادی کی زندگی میں بے انتہا فرق ہے، ایک بُعد المشرقین۔ چونکہ لوگ بالطبع آزادی کے مفہوم و اہمیت سے ناآشنا اور اس کی ذمہ داریوں سے بے خبر ہوتے ہیں۔ اور ان کی پروا نہیں کرتے اس لئے وہ آزادی کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ ان کے ادنیٰ جذبات ابھر آتے ہیں اور وہ من مانی کرنے پر تل جاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ خود غرضی، نفسانفسی، شورہ پشتی، لاابالیانہ پن، افراتفری اور فتنہ و فساد کے سوا اور کچھ نہیں۔ ایک طرف شدید جذبۂ حب وطن اور دوسری طرف قوم و ملک کے بل پر ناجائز نفع میں ہاتھ رنگنے کا جنون۔ ایک طرف افراط دوسری طرف تفریط، اور جب ان میں ٹکر ہو جائے تو کہیں اندھا دھند دھڑے بندی اور کہیں طرح طرح کے بگاڑ۔ اور ان کا نتیجہ۔ شور و شر، ہڑبونگ، بحران پہ بحران!

پاکستان بھی مدت تک انہی پُر آشوب حالات سے دوچار رہا۔ اس کی کشتی طوفان کے تباہ کن تھپیڑوں میں ڈگمگاتی رہی اور کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اس کا انجام کیا ہو گا۔ حالات خود ہی پکار پکار کر انقلاب کو دعوت دے رہے تھے۔

اور وہ آکر ہی رہا۔ اکتوبر ۵۸ء کا انقلاب ان تمام خرابیوں کا جواب بھی تھا اور سدِ باب بھی، اسے سابقہ دستور کو منسوخ کر کے مارشل لا کا نفاذ کرتے ہی بن پڑی۔ قوم کی آسیں امیدیں ٹوٹ چکی تھیں حکومت نیز سلائے پس و پیش منڈلا رہے تھے۔ قومی قیادت بالکل بیکار ہو چکی تھی۔ ابھی قیامِ پاکستان کو دو ہی سال گزرے تھے کہ بانیٔ پاکستان محمد علی جناح جیسا جید قائد رخصت ہوگیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد قائدِ ملت بھی پیکِ اجل کی چیرہ دستی کا نشانہ بن گئے۔ اور کوئی ایسا پرخلوص، ایسا باوقار رہنما میدان میں نہ رہا جو ملک و قوم کی رہنمائی کا حق ادا کرسکے۔ وہ لوگ جن کے سینے حب الوطنی کے نور سے روشن تھے، رخصت ہوگئے اور ان کی جگہ خود غرض، جاہ پرست سیاست دانوں نے لے لی۔ اس لئے ترقی کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ ملک ہر اعتبار سے گرتا ہی چلا گیا۔ وزیر پر وزیر آتا اور، یا تو چار دن خوب اونچی ہواؤں میں پرواز کر لیتا یا بالکل لاچار اور بے دست و پا ہو کر ہتھیار ڈال دیتا۔ حکومت پر حکومت آتی اور من مانی کرتی یا وزیروں کی طرح مجبور ہو کر جگہ خالی کر دیتی۔ کوئی کابینہ بھی تو ایسی نہ تھی جسے عوام، مجالس قانون ساز یا کسی اور جماعت کا اعتماد اور تائید حاصل ہوتی۔ قومی نمائندوں کا یہ حال تھا کہ جب جی چاہتا کوئی شرم یا عار محسوس کئے بغیر پہلو میں ایک پارٹی کو چھوڑ کر دوسری میں شامل ہو جاتے۔ اور محض ذاتی اغراض کی خاطر۔ ادھر صوبائی مناقشات نے خرابیوں کو اور بھی ہوا دی۔ ادھر ایک وزارت قائم ہوتی اور ادھر اس کا چراغ گل ہو جاتا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ جون ۵۸ء میں انقلاب سے تھوڑا ہی عرصہ پہلے صرف مشرقی پاکستان ہی میں سات دن کے اندر اندر تین وزارتیں آئیں اور چلی گئیں۔ دنیا حیران تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔ آخر اس بیہودگی کی کوئی حد بھی ہے؟ لیکن ظاہر اس کی کوئی حد نہ تھی۔ اس لئے اس صوبہ میں دو ماہ گورنر کا راج رہا۔ جونہی یہ ہٹا اور ستمبر ۵۸ء میں مجلس قانون ساز کا اجلاس منعقد ہوا، ایوان میں لڑائی بھڑائی تک نوبت پہنچی جس میں نائب اسپیکر جان سے مارا گیا۔

اصل میں بات یہ تھی کہ سیاست دانوں کا اخلاق بالکل گر چکا تھا۔ وہ پرلے درجے کے بددیانت اور خود غرض ہو چکے تھے۔ مرکز ہو یا صوبے ساری سیاسی جماعتوں میں بری طرح نا اتفاقی پیدا ہو چکی تھی جس کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ مملکت کی بنیاد متزلزل ہو جائے۔ ان روح فرسا حالات کے باوجود کسی کو ہوش نہ آیا اور وہی تباہ کن کھیل جاری رہا۔ سیلاب جنوں بڑھتا ہی چلا گیا اور یہ صاف نظر آرہا تھا کہ اگر ہواؤں کے تھپیڑوں نے اس بلبلہ کو نہ پھوڑا تو یہ جلد ہی خود بخود پھوٹ جائے گا۔ کیونکہ ملک کے سیاسی و اقتصادی دیوالیہ پن کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا تھا۔ اس طوفان بدتمیزی میں جمہور تو بیکسو رہے باہر کے لوگ بھی پاکستان کی طرف سے بالکل مایوس ہو چکے تھے اور یہی بات:

چال ہے مجھ ناتواں کی مرغِ بسمل کی تڑپ
ہر قدم پر ہے یقیں یاں رہ گیا واں رہ گیا

خیال کیجئے۔ وہ ملک جو کبھی غذائی حیثیت سے خود کفیل ہی نہیں ایشیا کا اناج گھر مشہور تھا، اب دوسروں کا دست نگر تھا۔ اور اسے سالانہ ۴۵ کروڑ روپے کی بھاری قیمت دوسروں کو ادا کرنی پڑتی تھی ---! زراعتی زمینیں سیم اور تھور کی وجہ سے برابر بے کار اور بانجھ ہوتی چلی جا رہی تھیں، نت نئی حکومتیں نت نئے ترقیاتی منصوبے اور وہ بھی خسارے کے میزانیوں کے بل بوتے پر۔ نتیجہ --- افراطِ زر کا جاں کاہ مرض اور دن بدن بڑھتی ہوئی قیمتیں، جو عوام کے لئے بلائے جاں ثابت ہو رہی تھیں۔

ادھر زرِ مبادلہ کا بھی برا حال تھا۔ پچھلے چند سالوں میں محفوظات خطرناک حد تک گر گئے تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ ناجائز درآمد برآمد اور چور بازاری کا بازار بری طرح گرم تھا اور خود خداوندانِ حکومت جن کا کام یہ تھا کہ وہ ان خرابیوں کا سدِ باب کریں ناجائز دولت پیدا کرنے کے لئے ہر طرح کی قوم دشمن، تباہ کن سرگرمیوں میں حصہ لے رہے تھے اور بے تحاشا نفع میں ہاتھ رنگ رہے تھے۔ ان کی کیفیت بالکل ویسی ہی تھی جیسی انقلاب سے پہلے شہنشاہ فرانس کی۔ ان کے دل جانتے تھے اور ان کے ہونٹوں پر یہی الفاظ آ آ کر رہ جاتے تھے:

"سیلابِ بلا میرے بعد!"

مدعا یہ کہ ملک بھر میں وسیع پیمانے پر جو خرابیاں پھیلی ہوئی تھیں ان سے سارا نظام بگڑ چکا تھا۔ ملکی معیشت اور بھی خستہ و خراب ہوگئی۔ اس کے روگ اور بھی بڑھ گئے۔ ادھر تقریباً ایک کروڑ بے خانماں لوگ تھے جن کو بسانے کا مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہوا تھا۔ ان میں سے اکثر بری طرح گلی کوچوں، جھگیوں، بوسیدہ کیمپوں یہاں تک کہ فٹ پاتھوں پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر زندگی بسر کر رہے تھے۔ چند روزہ حکومتیں آتیں اور نت نئے سبز باغ دکھا دکھا کر وقتی سہارا ہوں کی جھولیاں بھر بھر کر چلی جاتیں۔ بغرض ہر جا کی حالت زار راج نیتاؤں کی بے حسی، بے پروائی، بے دردی اور چار دن کھونٹ پھیلے ہوئے نراج کی جو کتھائیں ہم پچھلے زمانوں میں سنتے آئے ہیں، اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور انتہائی مایوسی و حرماں نصیبی کے عالم میں گھبرا گھبرا کر یہی پکار پکار اٹھے: یا الٰہی! اب کیا ہو گا؟ اب کیا ہو گا؟ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا تھا کہ ہم ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعائیں

مانگیں اور آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھیں کہ شاید ۔ مردے از غیب برون آید و کارے بکند ۔ کے مصداق کوئی فرشتۂ نجات آجائے۔ بالفاظ دیگر ایک بروقت انقلاب کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں رہا تھا۔ یہ احساس خاص عام سب کے دل میں جاگزیں تھا۔ اسی لئے جنرل محمد ایوب خاں نے (جواب فیلڈ مارشل کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہیں) ۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو فرمایا تھا کہ "ایک اچھے محکم ملک کو مضحکہ خیز بنادیا گیا ہے۔ اگر موجودہ بدنظمی و انتشار کو جاری رہنے دیا جاتا تو تاریخ ہمیں کبھی معاف نہ کرتی۔"

چنانچہ ہمارے اس عظیم نجات دہندہ نے صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ وہ ملک میں ایک تندرست اور خوشگوار صورتِ حالات پیدا کرکے رہیں گے وہ ساری خرابیوں کا قلع قمع کر دیں گے اور دیارِ پاک کو صحیح معنوں میں دیارِ پاک بنا کر رہیں گے۔ یہ ایک جری سپاہی کا عزم بالجزم تھا۔ اور اس نے اس شاندار نصب العین کو عملی جامہ پہنا کر چھوڑا۔

ہماری انقلابی حکومت کے کارنامے واقعی حیرت انگیز ہیں، جیسے کسی زبردست ساحر نے بے آب و گیاہ صحرا میں راتوں رات ایک عظیم الشان محل کھڑا کر دیا ہو۔ حکومت نے عنانِ اختیار سنبھالتے ہی عوام میں اعتماد پیدا کر لیا۔ اور بڑے ہی جرأت مندانہ تعمیری اقدامات سے خوش آیند توقعات کی ایک دنیا پیدا کر دی۔ خاص و عام میں مسرت و شادمانی کی لہر دوڑ گئی۔ پہلی بار انہیں ایسی حکومت میسر آئی جو ان کی اپنی حکومت تھی۔ اور آناً فاناً ایسا انقلاب رونما ہوا جس کا دامن دنیا کے دوسرے انقلابوں کی طرح کشت و خون کے ناگوار واقعات سے داغدار نہیں۔ ایک خاموش پُرسکون انقلاب۔ تمام ملک میں زندگی اسی طرح رواں دواں رہی۔ وہی رونق، وہی چہل پہل۔ وہی ہماہمی۔ قومی اصلاح اور تعمیر و ترقی پر کمر بستہ ہو کر حکومت نے نظم و نسق کو درست کرنے کی فوری تدابیر اختیار کیں۔ اس کی وضع بڑی حد تک سول ہی رہی۔ اور اس میں فوج کو بہت کم دخل انداز ہونے دیا گیا۔ نااہل اور بددیانت عناصر جڑ سے اکھاڑ پھینکے گئے اور دفتری زندگی کو پوری طرح پاک و صاف کر دیا گیا۔ زندگی کے ہر شعبہ میں وہی ضبط، وہی تحمل، وہی بردباری۔ یہ تھا نئی حکومت کا شیوۂ خاص اس کا طرۂ امتیاز۔ اس کا حقیقی مدعا ایک اور صرف ایک تھا: ملی زندگی کی تطہیر، اس کی اصلاح اور اس کے ساتھ ہی ساتھ روز افزوں تعمیر و ترقی کی شاہراہ پر ڈال دینا تاکہ بالآخر ایسے جمہوری نظام کے لئے راستہ ہموار ہو جائے جو قومی مزاج، قومی تقاضوں اور ملکی حالات کے سب سے زیادہ موزوں ہو۔

اس جذبہ و شوق کے نتائج کس قدر خوشگوار، کس قدر شاندار ثابت ہوئے، اس کا اندازہ ہم پچھلے دو سالوں میں کر چکے ہیں۔ ایک مستعد اور متحرک حکومت کی حیثیت سے اس کے اقدامات کی رفتار اس قدر تیز رہی ہے کہ ہماری نگاہوں کے لئے ان کا ساتھ دینا ہی مشکل معلوم ہوتا ہے۔ عام ضرورت کی چیزوں کے نرخ فوراً گر گئے۔ چور بازاری، نفع اندوزی رات بھر ہی میں عنقا ہو گئی۔ بات یہ ہے کہ بڑے ہی وسیع پیمانے پر ناجائز درآمد برآمد کے باعث پاکستان کو درآمدی اشیا کے لئے بے انتہا زرِ مبادلہ خرچ کرنا پڑتا تھا۔ نئی حکومت نے جس مقدار میں ناجائز درآمد شدہ اشیا، غلہ اور سونے کی بازیافت کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ چنانچہ ہم میں سے کسے یاد نہیں کہ کس طرح انقلاب کے پہلے ہی چند دنوں میں دو ٹن سونا سمندر سے برآمد کیا گیا۔ تاجروں اور بیوپاریوں نے خود ہی ذخیرہ شدہ غلہ اور درآمد شدہ اشیا کا اعلان کر دیا، برسوں کے واجب الادا ٹیکس اور مخفی آمدنیوں کا سراغ لگا کر خزانہ میں تقریباً ۲۴ کروڑ روپے کا اضافہ کیا گیا۔

یہ تو خیر ابتدائی معرکے تھے۔ مگر سب سے مہتم بالشان معرکہ جو تاریخ میں ایک عہد آفریں واقعہ کی حیثیت سے ہمیشہ یادگار رہے گا، زرعی اصلاحات ہیں۔ یہ وہ بنیادی قسم کی اصلاحات ہیں جن کے نتائج بہت ہی وسیع اور دور رس ہیں اور جو ہمارے معاشرے میں ایک انقلاب عظیم برپا کر دیں گی۔ ان کا بنیادی مقصد تو ہے زرعی پیداوار کو بڑھانا۔ اور وہ اسی طرح ممکن ہے کہ سرے سے ملک کی زرعی معیشت ہی کا ڈھانچہ بدل دیا جائے۔ وہ جو بڑے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کا راج تھا اسے ختم کر دیا جائے۔ اور کاشت کاروں کو ملکیتی حقوق دے کر زمین اور اس کی پیداوار سے دلچسپی پیدا کی جائے۔ اس طرح نہ تو زمیندار بیچارے محنت مشقت کرنے والے مزارعوں کو اپنے پاؤں تلے روند سکیں گے اور نہ ان کا خون چوس سکیں گے۔ کسان اپنی زمین، اپنی پیداوار اور اپنی قسمت کا مالک آپ ہوگا۔ ان شاندار اصلاحات کے ساتھ ناجائز درآمد برآمد، ذخیرہ اندوزی، نفع اندوزی، چور بازاری اور بددیانتی کے خلاف ایک بے پناہ جہاد کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

اور وہ افراطِ زر کا موذی مرض۔ اس کو دور کرنے کے لئے

بھی بڑے منظم طریق سے قدم اٹھایا گیا اور بڑی احتیاط سے منصوبہ بندی کی گئی۔ کیونکہ طلب و رسد میں جو شدید عدم توازن پیدا ہوتا ہے اس کا ضروری اشیاء پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ نئی حکومت اپنے پیشروؤں کی طرح خسارے کے میزانیوں پر تھوڑا اُدھار کھائے بیٹھی تھی۔ اس کمزور سہارے کی بجائے اس نے اخراجات کو قابو میں لانے پر زور دیا جس سے فاضل ادائیگیوں کا وہ زبردست بوجھ جو ستمبر ۵۸ء تک ۸۹ کروڑ روپے کی حد تک پہنچ چکا تھا منفی کی بجائے مثبت بن گیا۔ یعنی ۱۹۵۸ء کے آخری ربع میں زرِمبادلہ کی بچت ۵ کروڑ ۶۷ لاکھ روپے کی حد تک پہنچ گئی! اسی طرح سونے، ڈالر اور پونڈ کے محفوظات بھی جون ۵۹ء تک ۷۲،۶۲ کروڑ روپے سے ۱۰۴ کروڑ روپے تک جا پہنچے۔ اس طرح کہاں تو ہم روز بروز لڑھکتے ہوئے نیچے ہی نیچے چلے جا رہے تھے، اور کہاں ایک دم اونچا ہی اونچا جانے لگے۔

صنعتی ترقی کی رفتار بھی اسی طرح تیز رہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان دو سالوں کے مختصر عرصہ میں پاکستان کئی باتوں میں خود کفیل ہو چکا ہے جنوری ۵۹ء کی بات ہے کہ ایک برآمدی بونس اسکیم جاری کی گئی جس سے نہ صرف پاکستانی برآمدات کی مقدار میں اضافہ ہوا۔ بلکہ ان کی فہرست میں بعض اور چیزیں بھی شامل ہو گئیں۔ اس طرح زیرِ بحث اسکیم میں جو برآمدات شامل ہیں ان کی مالیت جہاں ۱۹۵۸ء میں ۱۲ کروڑ روپے تھی وہاں ۱۹۵۹ء میں ۱۵ کروڑ روپے بن گئی۔ بذریعہ لائسنس درآمد ہونے والی اشیاء کی تعداد بھی کافی بڑھ گئی ہے۔ اور ان کے ساتھ ہی ملک میں چھوٹی دستکاریوں کی ترقی کے لئے بھی زیادہ اہتمام کیا گیا ہے۔

بے خانماں مہاجر۔ ہماری قوم کے لختِ جگر۔ جب سے پاکستان قائم ہوا ہے تب سے گلیوں کوچوں میں مارے مارے پھرتے۔ ان پر توجہ سے بہتر کام اور کیا ہو سکتا تھا۔ اور نئی حکومت تو تمام تر عوام کی اپنی ہی حکومت تھی۔ ان ہی کے لئے، انہی کی رفاہ و بہبود کی خاطر۔ اس لئے اس نے اپنا پہلا کام یہی قرار دیا۔ مہاجرین کی آباد کاری چنانچہ ان کو فی الفور بسانے کے لئے دن رات لگا کر، چالیس ہزار کوارٹرز تعمیر کرنے کا تہیہ کیا گیا اور پانچ ماہ کے اندر اندر ۱۵ ہزار کوارٹرز تیار بھی ہو گئے۔ اتنے بڑے کام کے لئے اتنی کم مدت تصور ہی میں نہیں آسکتی۔ لیکن ہماری انقلابی حکومت نے جس کے سربراہوں کی رگ و پے میں بجلی ہی بجلی بھری تھی، یہ کام کر کے دکھا دیا اور پچھلے اگست تک اس میں ۲۵ ہزار خاندان بھی لا کر آباد کر دیئے۔

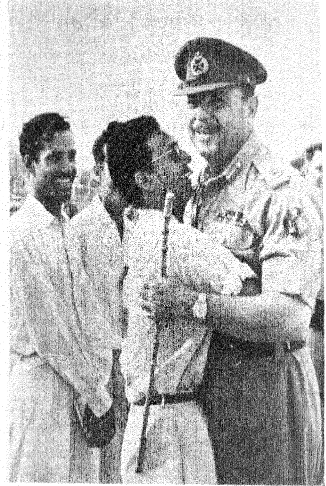
ایک بہت بڑی مہم تھی معاشرتی رفاہ و بہبود۔ جس کا قوم کی ترقی و تعمیر کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اس کے پیشِ نظر معاشرتی مسائل کو حل کرنے اور مناسب تدابیر اختیار کرنے کے لئے وزارت معاشرتی بہبود قائم کی گئی۔ جس کا ایک بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ ملک میں روز بروز بے تحاشا بڑھتی ہوئی آبادی کی روک تھام کی جائے۔ اس سلسلہ میں صحت عامہ کی خدمات کو بہتر بنانے پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ اور ایسے علاقوں میں جہاں آبادی بڑی گنجان ہے، ہزاروں لوگوں کو ٹیکے لگائے گئے۔ ہسپتالوں کے بندوبست، مریضوں کی دیکھ بھال اور دواؤں کی بہم رسی جو قبل ازیں مریضوں کو بالعموم میسر نہیں آتی تھیں۔ یہ سب باتیں ملی زندگی کو بہتر بنانے کی واضح علامات ہیں جنہوں نے بہت عمدہ نتائج پیدا کئے ہیں۔

کوئی ترقی، کوئی تعمیری پروگرام کوئی تدبیر چھان بین اور تحقیق کے بغیر ممکن نہیں تعلیم ہو یا صحت، خوراک ہو یا زراعت، محنت ہو یا قانون۔ ان سب کے لئے ضروری معلومات بہم پہنچانا ضروری ہے۔ ملی زندگی کا کوئی شعبہ نہ تھا جو انقلابی حکومت کی تیز بیں اور ہمہ بیں نگاہوں سے مستور رہا ہو۔ چنانچہ بڑی تیزی سے بے شمار کمیشن قائم کئے گئے۔ اسی تیزی سے ان کی رپورٹیں پیش بھی کی گئیں۔ اور ان کی سفارشات کو جلد از جلد عملی جامہ بھی پہنا دیا گیا۔ اس سلسلے میں ایک معرکہ آرا اقدام ملک کی آئندہ ترقی کے لئے ۶۵-۱۹۶۰ تک دوسرا پنجسالہ منصوبہ ہے جس کا مقصد قومی آمدنی کو ۲۰ فیصدی، اور صنعتی پیداوار کو ۵۰ فیصدی بڑھا کر ۳۰ لاکھ لوگوں کو روزگار مہیا کرنا ہے۔

ظاہر ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ حکومت بھی مستعد و کارگزار عمال اور عملے کے بغیر قوم و ملک کی خاطر خواہ خدمت انجام نہیں دے سکتی۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر انقلابی حکومت نے دفتری نظام میں ایک نئی روح پھونکنے کا ارادہ کیا جس کے معنی تھے بیک وقت اصلاح بھی اور یہ بھی کہ مستعدیٔ کارکردگی اور کردار کے معیار کو بلند تر کیا جائے۔ دفتری نظام کو حکومت کے ارادوں اور منصوبوں کو بروئے کار لانے میں جو دخل ہوتا ہے محتاجِ بیان نہیں۔ اور حق یہ ہے کہ جب سے پاکستان قائم ہوا ہے، دفتری ملازمین نے کاروبارِ ملک کو سرانجام دینے میں نمایاں حصہ لیا ہے لیکن رفتہ رفتہ دفتری نظام بھی کافی مضمحل اور ناقص ہو چکا تھا۔ سیاست دانوں نے اسے اپنی مذموم خواہشوں اور نامبارک ارادوں کا آلۂ کار بنا کر بہت پست، ناکارہ اور بددیانت بنا دیا تھا۔ اس لئے



قبیلہ ”ترین“ کے سردار کی حیثیت سے دستار بندی



پیکر خلوص

معمار انقلاب

”دیدۂ بینائے قوم“

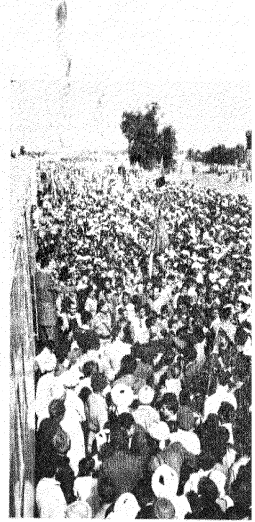


صدر پاکستان اور ڈاکٹر خالد بن سعید، ایک پاکستانی استاد سیاسیات و نظم و نسق، برنزوک یونیورسٹی، کنیڈا

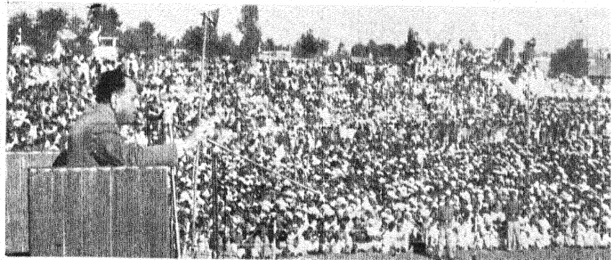








صدر اور عوام



صدر پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کو عوام اور ان کی بہبود کے مسائل کے ساتھ شروع ہی سے دلچسپی رہی ہے۔ اس لئے وہ بیحد مقبول و ہردلعزیز ہیں اور جہاں جہاں پہنچتے ہیں لوگ ان کا نہایت گرمجوشی سے خیرمقدم کرتے ہیں



تعمیر و ترقی کے سلسلہ میں کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اس آلۂ کار کو درست کرنے اور اسے تیز تر و مفید تر بنانے کی ضرورت تھی۔ لہذا، جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، اس مقصد کے لئے چھان بین کرنے والی کمیٹیاں قائم کی گئیں جنہوں نے تھوڑے ہی عرصے میں دفتری نظام کو خس و خاشاک سے پاک کر کے نہایت مستعد اور کارگزار بنا دیا۔ اس سلسلہ میں کسی کی رو رعایت نہیں کی گئی۔ اور جو لوگ بد دیانت یا نااہل تھے، خواہ وہ اعلیٰ عہدیدار ہوں یا کوئی اور، ان کے خلاف بڑی سختی سے قدم اٹھایا گیا۔ اس کے برعکس جو لوگ لائق، دیانتدار، مستعد اور کارگزار تھے ان سے کوئی مواخذہ نہیں کیا گیا اور ان کی پوری پوری حوصلہ افزائی کی گئی تاکہ وہ اور بھی ذوق و شوق اور خلوص کے ساتھ ملک و قوم کی خدمت سرانجام دینے میں منہمک ہو جائیں۔ ایک عرصہ کی مسلسل کوششوں کے بعد اب دفتری نظام اس قدر سلجھ گیا ہے کہ تاخیر، سستی، کوتاہی اور غفلت کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔

ملی زندگی کو کماحقہٗ صحت و تندرستی سے روشناس کرانے کے لئے سیاسی جماعتوں اور سیاست پیشہ افراد پر بھی توجہ لازم تھی چنانچہ پہلی ضرب فتنہ انگیز اور تفرقہ پرداز سیاسی جماعتوں پر پڑی جنہوں نے ملکی فضا اور قومی زندگی میں زہر گھول دیا تھا۔ پھر پیشہ ور سیاسی شعبدہ بازوں کی خبر لی گئی۔ اور ان کے خلاف باقاعدہ قانونی کارروائی کی گئی تاکہ ان کا زہریلا مواد کہیں پھر ہماری ملی زندگی کے رگ و پے میں سرایت نہ کر جائے۔

انقلابی حکومت کا سب سے بڑا مطمح نظر جو اس کی تمام سرگرمیوں اور اقدامات کا منتہا ہے، قوم کو صحیح معنوں میں جمہوری نظام اور اس کی برکات سے روشناس کرانا ہے تاکہ ہر شخص حقیقی معنوں میں آزاد ہو اور ایک آزاد شہری کی حیثیت سے ایک آزاد مملکت میں حصہ لے سکے۔ اسی بنا پر دسمبر ۱۹۵۹ء میں "بنیادی جمہوریتوں" کے عظیم الشان نظام کی بنیاد ڈالی گئی۔ جو درحقیقت بھرپور اور مکمل قسم کی جمہوریت کو بروئے کار لانے کا پیش خیمہ ہے۔ اس پانچ منزلہ نظام جمہوریت کی وضع و ہیئت کچھ یوں ہوگی:

دیہی یونین کونسلیں، تحصیل یا تھانوں کی کونسلیں، ضلع کونسلیں، ڈویژنل کونسلیں اور ان سب کے اوپر مشاورتی کونسلیں۔ ان کونسلوں میں نمائندگی کی صورت یہ ہے کہ ہر یونین کونسل اپنے صدر آپ چنے گی جو خود بخود اگلی کونسل کے اراکین بن جائیں گے۔

اسی کے ساتھ دستور کا معاملہ بھی وابستہ ہے جس کی تدوین ملی زندگی اور ملی نظام کی شیرازہ بندی کے لئے بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بغیر ہم ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اور ہمارے اقدامات کو قوم کی متفقہ قبولیت کا جواز حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی بنا پر انتخاب و الکشن آرڈر ۱۹۶۰ء جاری کیا گیا جس کی تمہید میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ عوام کی مرضی معلوم کرنے کے بعد صدر دستور مرتب کرے گا۔ اس آرڈر کے مطابق الکشن کمیشن کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ خفیہ بیلٹ کے ذریعہ ووٹ دیئے جانے کا بندوبست کرے۔ اس طرح صدر پاکستان نے ۱۴ فروری ۱۹۶۰ء کو بنیادی جمہوریتوں کے نئے منتخب شدہ ۸۰ ہزار اراکین کے اعتماد کا ووٹ حاصل کیا۔ تقریباً ۶ر۹۵ ووٹ صدر ہی کے حق میں تھے۔ جو چار سال کی مدت کے لئے صدر پاکستان منتخب ہوئے اور ان پر یہ ذمہ داری عاید کی گئی کہ وہ ملک کے لئے ایک دستور ترتیب دیں۔ چنانچہ اس کے فوراً ہی بعد ایک دستور کمیشن کے تقرر کا اعلان کر دیا گیا جو اس وقت مصروف کار ہے۔

ملی زندگی میں نئی روح پھونکنے کے لئے ایک اور اقدام بھی اشد ضروری تھا۔ ایک ایسا ادارہ کا قیام جو ایک دیدۂ بینا کا کام دے۔ جو حالات و واقعات کا جائزہ لے حکومت اور قوم دونوں کے دل و دماغ کی حیثیت سے کام کرے اور ہر جہتی تعمیر و ترقی کے مسائل پر غور و خوض کرے اور ملی زندگی کے ہر پہلو معاشری، اقتصادی، ذہنی، ثقافتی، کو مہمیز کرے۔ ادارہ قومی تعمیر و تشکیل نو اسی مقصد کے تحت وجود میں آیا۔ اور ایک عرصہ سے ملت ساز تدابیر اور تعمیری و تخلیقی سرگرمیوں کو فروغ دینے اور مفید و سازگار عناصر کی حوصلہ افزائی میں مصروف ہے جس سے ہم نہایت کارآمد نتائج کی توقع کر سکتے ہیں۔

تو یہ ہے دو سال کے مختصر سے عرصہ کی کارگزاری۔ صرف دو سال جو کسی ملک کی زندگی میں کوئی بھی حیثیت نہیں رکھتے خصوصاً ایک نئے ملک کی زندگی میں جس کے حالات اس قدر بگڑ چکے تھے۔ اتنی بوقلموں کارگزاری، اتنے گوناگوں معرکہ آرا اقدامات جن کا شمار ہی مشکل ہے کسی بھی حکومت کے لئے مایۂ ناز ہو سکتے ہیں۔ ہماری انقلابی حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے بہت ہی آڑے وقت پر عنان کار سنبھالی اور نہ صرف قوم کو تباہ ہونے سے بچا لیا۔ بلکہ اس کو بڑی تیزی سے تعمیر و ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہونے میں مدد دی۔ ایسے کہ اس کا راستہ زمینی نہیں آسمانی معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایک کہکشاں ہے چمکتے ہوئے ستاروں کا ایک طول طویل سلسلہ تا حد نظر پھیلا ہوا جس سے دیکھنے والی نگاہیں خیرہ ہو جائیں تو کچھ عجب نہیں۔ اور ابھی نہ جانے زمان و مکاں میں ایسے بے شمار ستارے اور بھی ہیں! اور بھی روشن اور بھی پُر جلال اور ان کا نظر افروز سلسلہ دیکھ کر ہم بڑے ناز سے کہہ سکیں گے یہ ہے پاکستان کی قسمت کی روشن لکیر جو روز بروز بڑھتی ہی چلی جائے گی — پاکستان پائندہ باد!

صدر پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان زندہ باد!!

قبائلی علاقوں میں تعلیمی سرگرمیاں

علی ناصر زیدی

کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ قبائلیوں کو کسی قسم کی تعلیمی سہولتیں حاصل نہیں تھیں اور ان پر مفت کا یہ الزام تھا کہ وہ پڑھنے لکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ انگریزی حکومت نے سیاسی وجوہ کی بنا پر اس علاقے کو ہر قسم کی تعلیمی و ثقافتی سہولتوں سے محروم رکھا اور کچھ ایسی فضا قائم رکھی جس میں یہاں کے باشندے محض اپنے ماضی پر فخر کرتے رہے۔ انہوں نے بیسویں صدی میں رہنے کے باوجود اس کی ہمہ گیر سرگرمیوں سے کوئی تعلق نہ رکھا۔ ان کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ غریب، پس ماندہ اور پریشاں حال رہے۔

جب آزادی کا سورج سرحد کی پہاڑیوں پر اُبھرا تو اس نے اپنی زریں کرنوں سے اس تمام علاقے کی تاریکی کو دور کر دیا۔ جن لوگوں کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ وہ دماغی صلاحیتوں سے بے بہرہ ہیں اور کسی صورت اعلیٰ تعلیم سے مستفید نہیں ہو سکتے، وہی چند ہی سال کے عرصے میں علم و دانش کی راہوں پر کہیں سے کہیں نکل گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ جب کوئی قبائلی باشندہ پشتو بولتا بولتا یکایک اردو یا انگریزی بولنے لگتا ہے تو یقین نہیں آتا کہ یہ شخص اُس علاقے سے تعلق رکھتا ہے جس کے متعلق انگریز نے یہ مشہور کر رکھا تھا کہ اسے تمدن سے کوئی واسطہ نہیں، وہاں تو دن دہاڑے قتل ہو جاتا ہے، آپ اُدھر سے گذر نہیں سکتے۔ واقعی مردِ مومن کی نگاہ سے تقدیریں بدل جاتی ہیں۔

قبائلی علاقوں میں ریاست دیر، سوات، چترال، مالاکنڈ ایجنسی، جنوبی اور شمالی وزیرستان، کرم ایجنسی، خیبر ایجنسی، مہمند ایجنسی اور کوہستانِ ہزارہ کے کچھ علاقے شامل ہیں۔ اضلاعِ پشاور، کوہاٹ، بنوں اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں سے جو سرحدی علاقے متعلق ہیں وہ بھی قبائلی علاقہ ہی میں شمار ہوتے ہیں اور ان سب کا مجموعی رقبہ خاصا بڑا ہو جاتا ہے۔ اس کی آبادی تیس لاکھ افراد پر مشتمل ہے۔

حصولِ آزادی کے بعد حکومت پاکستان نے قبائلی علاقوں کی ترقی کی طرف توجہ دی۔ ترقی کا پہلا زینہ تعلیم ہے۔ یہاں کے باشندوں کی پسماندگی کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ ان میں تعلیم نہیں تھی۔ سب سے زیادہ مشکل یہی تھی کہ ان لوگوں میں جدید تعلیم کے خلاف ایک قسم کا جذبۂ نفرت پایا جاتا تھا۔ اس لئے کہ وہ فرنگی سے نفرت کرتے تھے اور جدید تعلیم کو اس کی میراث تصور کرتے تھے۔

خدا خدا کر کے وہ صورت ختم ہوئی اور قبائلیوں کو محسوس ہوا کہ اب وہ صحیح معنوں میں آزاد ہیں، یہ سب ان کا ملک، ان کا وطن ہے اور یہ ان کی اپنی حکومت ہے جسے اسلامی طرز پر چلایا جائے گا۔ انہوں نے تعلیمی سہولتوں کو خوش آمدید کہا اور اپنے دیہاتوں، قصبات اور شہروں میں محکمۂ تعلیم کے ساتھ پورا تعاون کیا۔ جہاں کہیں ممکن ہو سکا اسکولوں کی تعمیر میں بھی مدد دی اور ضرورت پڑی تو اس مقصد کے لئے زمین وغیرہ مہیا کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔

اگست ۴۷ء سے پہلے یہاں اسکول نہ ہونے کے برابر تھے، اس لئے سب سے پہلے ابتدائی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ جہاں پرائمری اسکول نہیں تھے وہاں ایسے اسکول کھولے گئے، جہاں پرائمری تھے انہیں مڈل اسکولوں میں تبدیل کیا گیا اور جہاں مڈل اسکول کام کر رہے تھے انہیں ہائی اسکول کے درجے تک پہنچایا گیا۔ اگست ۴۷ء سے پہلے پورے قبائلی علاقے کی تعلیم پر صرف ایک لاکھ بارہ ہزار روپے سالانہ صرف کئے جاتے تھے لیکن گزشتہ بارہ تیرہ سال کے عرصے میں یہ خرچ پچیس گنا ہو گیا ہے۔ اس سے آپ کو حکومت کی مساعی اور دلچسپی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ موجودہ حکومت یہاں کے باشندوں کو پاکستان کی باقی آبادی کے مقابلے میں کسی صورت پیچھے نہیں دیکھنا چاہتی۔ اب پورے قبائلی علاقے میں تعلیمی درسگاہوں کا ایک جال پھیلا ہوا ہے۔

۱۹۴۷ء سے اب تک قبائلی علاقوں میں اسکولوں کی تعداد تقریباً سات گنی ہوگئی ہے۔ اب وآنا، گنی کرم اور رلدھا میں ہائی اسکول موجود ہیں۔ یہ قصبات جنوبی وزیرستان میں واقع ہیں۔ اسی طرح شمالی وزیرستان کے مقام میران شاہ میں بھی ایک ہائی اسکول ہے۔ کرم ایجنسی میں پاراچنار اور صلی زئی نامی مقامات پر ایسے ہی اسکول کام کر رہے ہیں۔ خیبر ایجنسی میں جمرود اور لنڈی کوتل میں ہائی اسکول موجود ہیں مہمند علاقے میں شب قدر، مالاکنڈ ایجنسی میں درگئی اور تھانہ، کوہاٹ کے سرحدی علاقے میں ہرآدم خیل اور کوہستانِ ہزارہ میں اگی میٹرک تک ہر قسم کی تعلیمی سہولتیں فراہم کرتے ہیں۔

چونکہ اس زمانہ میں علمی تعلیم کے ساتھ ساتھ فنی تربیت نہایت ضروری ہے اس لئے حکومت لنڈی کوتل، تھانہ، پاراچنار اور وانا کے اسکولوں میں ٹیکنیکل تعلیم کے انتظام پر بھی غور کر رہی ہے۔ اس مقصد کے لئے میٹرک کے نصاب میں ضروری ترمیمیں کی جائیں گی۔

مڈل جماعتوں اور میٹرک تک تو تعلیم کے اخراجات کا بار والدین کسی نہ کسی صورت برداشت کر ہی لیتے ہیں کیونکہ بچے گھر پر ہی رہتے ہیں اور ان کے کھانے پینے اور کپڑے لتے پر کچھ زیادہ خرچ نہیں آتا۔ جہاں تک کتابوں کا تعلق ہے، محکمۂ تعلیم آٹھویں تک تمام اسکولوں میں کتابیں بھی مفت تقسیم کرتا ہے۔ اس طرح سکول کی تعلیم کسی نہ کسی طرح مکمل ہو جاتی ہے لیکن جب کالج کی تعلیم شروع ہوتی ہے تو بہت سے والدین کو مشکل پیش آتی ہے کیونکہ اس مقصد کے لئے طلباء کو اپنا وطن چھوڑ کر دوسرے شہروں کا رُخ کرنا پڑتا ہے اور اس طرح اخراجات میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے۔

حکومت اس صورتِ حال سے آگاہ تھی لہٰذا اس نے قبائلی طلباء کے لئے ڈھائی لاکھ روپے کے وظائف دینے کا فیصلہ کیا۔ اس رقم میں مزید ایک لاکھ روپے کا اضافہ زیرِ غور ہے، یہ وظائف مستحق طلبا کو آٹھ روپے ماہوار سے ایک سو بیس روپے ماہوار تک دیئے جاتے ہیں تاکہ وہ ملک کی مختلف درسگاہوں میں اپنی تعلیم مکمل کر سکیں۔ انجینئرنگ، میڈیکل اور ایم اے یا ایم ایس سی میں پڑھنے والے طلباء کو سو روپے ماہوار وظیفہ دیا جاتا ہے۔ کمال ہے کہ جس علاقے کے مرد حصولِ تعلیم کے لئے مشکل سے باہر نکلتے تھے وہاں کی لڑکیاں اب ایم اے اور ایم بی بی ایس وغیرہ میں پڑھ رہی ہیں!

قبائلی علاقوں کے طلباء زراعت کا مطالعہ بھی کر رہے ہیں۔ ان میں کچھ ایسے لڑکے بھی شامل ہیں جو زمیندار گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنی زمینوں کو ترقی دیں اور جدید سائنسی ذرائع سے پیداوار میں اضافہ کریں۔ مردان اور چارسدہ کا علاقہ بڑا زرخیز ہے۔ یہاں تمباکو اور نیشکر خوب پیدا ہوتا ہے اور اگر کوشش کی جائے تو ان فصلوں کو مزید بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

تمام قبائلی باشندے تعلیم کی اہمیت سے آگاہ ہو چکے ہیں اور آئے دن حکومت سے تقاضہ کرتے رہتے ہیں کہ ان کے دیہاتوں اور قصبات میں مزید اسکول اور کالج کھولے جائیں چنانچہ پاراچنار میں ایک انٹرمیڈیٹ کالج کھول دیا گیا جس میں سائنس بھی پڑھائی جاتی ہے۔ مالاکنڈ ایجنسی میں تھانہ نامی مقام پر بھی ایسا ہی ایک کالج کھولا جائے گا۔ وہاں کے باشندوں کو اس کی ضرورت ہے۔

قبائلیوں میں زنانہ تعلیم بھی مقبول ہوتی جا رہی ہے، ۱۹۴۷ء میں پاراچنار میں لڑکیوں کے لئے صرف ایک پرائمری اسکول تھا لیکن اب تھانہ میں ایک زنانہ مڈل اسکول، پاراچنار، میران شاہ اور شاہ کوٹ میں ایک ایک مڈل اسکول اور دوسری ایجنسیوں میں پندرہ پرائمری اسکول لڑکیوں کو تعلیم دے رہے ہیں۔

اس پورے علاقے کی تاریخ میں پہلی مرتبہ جمرود اور لنڈی کوتل میں لڑکیوں کے لئے اسکول کھولے گئے ہیں۔ عوام ان کی اہمیت اور افادیت سے آگاہ ہوتے جا رہے ہیں اور ان میں اپنی بچیوں کو زیورِ علم سے آراستہ کرنے کا شوق بڑھ رہا ہے۔ اب وہاں تقریباً ایک ہزار لڑکیاں حکومت کی فراہم کردہ تعلیمی سہولتوں سے فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ خوش قسمتی سے ان اسکولوں کے لئے استانیاں بھی مل گئی ہیں۔

تمام قبائلی ریاستوں میں تعلیمی اعتبار سے سوات سب سے زیادہ ترقی کر رہا ہے۔ اس کی حدود میں تقریباً ایک سو اسّی تعلیمی درسگاہیں موجود ہیں۔ سیدو شریف میں جدید طرز کا ایک ڈگری کالج ہے جہاں سائنس کی تعلیم کا بھی مکمل انتظام ہے۔ ریاست میں آٹھ ہائی اسکول ہیں جن میں ایک لڑکیوں کے لئے ہے، دس مڈل سکول ہیں اور باقی ابتدائی مدارس۔ ان کے علاوہ سوات میں دو دینی درسگاہیں بھی ہیں جن میں فقہ، حدیث اور قرآنِ پاک کی تعلیم دی

جاتی ہے۔

اسی طرح چترال میں بھی تعلیم کو عام کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ دروش اور چترال میں دو ہائی اسکول ہیں جہاں ڈرائنگ اور سائنس کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ یہاں لڑکیوں کے لئے بھی پرائمری اسکول موجود ہیں۔ چھوٹے مقامات پر ابتدائی مدارس کام کر رہے ہیں۔ ان کے علاوہ ریاست میں مزید ہائی اسکول اور پرائمری اسکول کھولنے کی کوشش کی جا رہی ہے کیونکہ طلبا کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے، کافرستان میں بھی ایک پرائمری اسکول کھولا جا چکا ہے۔ یہ علاقہ اپنے قدرتی مناظر کے لئے مشہور ہے۔ ریاست امب اور دربند میں بھی کئی ہائی اسکول موجود ہیں۔

قبائلی علاقوں میں تعلیم کی نگرانی کے لئے علیحدہ ایک نائب ناظم تعلیمات مقرر ہے جس کا دفتر پشاور میں ہے۔ اس کی مدد کے لئے چھ نائب انسپکٹر آف اسکولز مقرر ہیں، ان میں ایک خاتون بھی ہیں جو زنانہ درسگاہوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔ یہ تمام نگراں مالاکنڈ، پشاور، خیبر، پاراچنار، میراں شاہ اور وانا میں رہتے ہیں اور اپنے اپنے علاقوں کے اسکولوں کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

تعلیم کے علاوہ حکومت جسمانی تربیت پر بھی زور دے رہی ہے۔ ہر سال ٹورنامنٹ اور کھیلوں کے مقابلوں پر پانچ ہزار روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔ سکاؤٹنگ پر بھی توجہ دی جا رہی ہے۔ نئے اسکولوں کی تعمیر پر ہزاروں روپیہ خرچ کیا جا رہا ہے — ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں محمود ہوسٹل تعمیر کیا گیا ہے۔ اسی طرح قبائلی علاقوں کے طلبا کے لئے پشاور یونیورسٹی میں ایک علیحدہ ہوسٹل بنایا گیا ہے۔

ان کاموں پر ہزاروں لاکھوں روپیہ صرف ہوتا ہے۔ ہمارے ذرائع اور وسائل محدود ہیں۔ اس کے باوجود حکومت بڑی فراخدلی سے یہاں تعلیمی سہولتیں عام کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اسی مقصد کے پیش نظر پشاور یونیورسٹی کا قیام بھی عمل میں آیا جو ایک جدید طرز کی اعلیٰ درسگاہ ہے اور جداگانہ تذکرہ چاہتی ہے۔

موجودہ حکومت جس طرح عوام کی اپنی حکومت ہوتے ہوئے ان کی رفاہ و بہبود اور ترقی کی خواہاں ہے اور فوجی روح سے سرشار ہونے کی بنا پر سراپا عمل، سراپا حرکت اور سراپا اقدام ہے

(باقی صفحہ ۹۹ پر)

"از جفائے دہ خدایاں ......!"

ارمان دہلوی

موجودہ انقلاب سے پہلے زبوں حالات نے جو عام بددلی اور یاس و ناامیدی کی فضا پیدا کر دی تھی اس کا عکس ایک شاعر کے درج ذیل تاثرات میں نظر آئے گا مگر ساتھ ہی یہ یقین بھی تھا کہ پاپ کی ناؤ آخر کار ڈوب کے رہے گی۔ اور وہ ۲۷ اکتوبر کے انقلاب کے ساتھ واقعی ڈوب کر رہی۔ (مدیر)

وہ قوم جس نے ابھرنا چاہا ابھر چکی ہے، ابھر رہی ہے
وہ ایک ہم ہیں کہ سوچتے ہیں "گزر رہی ہے، گزر رہی ہے"

خرابیاں ہوں ہزار کیا غم، مٹیں تو مٹ جائیں ہو چکا کیا
ہم اپنی اس بے حسی کے صدقے جو اپنی حد سے گزر رہی ہے

عجب سی تصویر بن گئے ہیں ہمارے نقش و نگارِ ہستی
ستم ہے پھر اس پہ خود فریبی جو رنگ پر رنگ بھر رہی ہے

ستم گروں کی جفائیں مظلومیت سے اک دن پناہ لیں گی
وہ بالیقیں ڈوب کر رہے گی جو پاپ کی ناؤ بھر رہی ہے

بچا سکو تو بچا لو اب بھی وگرنہ پھر حشر تک دوبارہ
وہ آدمیت نہ سانس لے گی جو آج بے موت مر رہی ہے

ہزار کوشش میں اہلِ دانش لگے ہیں مگر ہم وہی ہیں ارماں
وہ ایک ہم ہیں کہ جو نہ سدھرے اگرچہ دنیا سدھر رہی ہے

نقشِ پائے رہرواں

اگر دورِ انقلاب کے ایک شاعر کا یہ قول صحیح ہے کہ "وقت کے ہاتھ پہ شوق و شعور کی شمعیں کب کب جلتی ہیں" تو اس کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ — "جلتی ہیں تو ان کی لَو پر صدیاں آگے چلتی ہیں"۔ اور اس میں صدیوں نے فی الحقیقت بہت تیزی سے آگے چلنا شروع کر دیا ہے۔ اور جس طرح شوق و شعور کی شمعوں نے زندگی کے اور شعبوں میں اپنا اثر دکھایا ہے، اُسی طرح ادب میں بھی ایک نئی حرارت، نئی روشنی پیدا کر دی ہے جس کی کچھ جھلک ہمارے قومی ادب کے غیر معمولی فروغ میں دکھائی دیتی ہے کہ ایک کے بعد دوسری شمع برابر روشن ہوتی چلی جاتی ہے۔ قیسی رامپوری کا ناول "اُجالا" قدسیہ بانو کا ناولٹ "پروا"۔ تمنائی کی "تین سو پینسٹھ دن"۔ سراج رضوی کی "آفتاب تازہ" اور "نوائے پاک" (طبع ثانی) چند اور کتابیں ہیں جن میں دورِ انقلاب کا نمایاں پرتو ہے۔ اب انقلاب اکتوبر کی دوسری سالگرہ پھر شعراء و ادباء کے دلوں میں ولولۂ تازہ پیدا کر رہی ہے جس سے ہمیں اپنے ملی ادب میں اور بھی ہماہمی اور وقیع تر اضافوں کی توقع ہونی چاہئے۔

شوق و شعور جوں جوں قدم آگے بڑھاتے جاتے ہیں زندگی کے ہر میدان میں کچھ نقوش بھی چھوڑتے جاتے ہیں۔ کچھ ریت پر ہلکے ہلکے نشان جنہیں موجِ ہوا جلد ہی مٹا دیتی ہے اور کچھ ایسے جو زیادہ پائدار ثابت ہوتے ہیں۔ دورِ انقلاب میں بھی یہی کیفیت نظر آتی ہے۔ سب سے بڑی دلچسپی کی بات یہ ہے کہ ادب، فکر، فن کے سلسلے ماند نہیں پڑے بلکہ پہلے سے کہیں زیادہ سازگار فضا پاکر کچھ اور چمک اٹھے ہیں خصوصاً فن کی رَو خاصی تیز ہوگئی ہے۔ اور فکر میں بھی آفاقی روشن خیالی کی طرف میلان بڑھتا جا رہا ہے، جیسا کہ صدر پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے ارشادات سے ظاہر ہے۔

ادب ایک زیادہ حساس اور اثرپذیر چیز ہے، اس لئے یہ نئے رجحانات کا بہتر عکس پیش کرتا ہے۔ ممکن ہے دو سال کی مختصر مدت۔ اور وہ ہماری ملی تاریخ کے پچھلے گیارہ سال کی مدت کے سامنے ہے ہی کیا! — رجحانات کے عملی طور پر صورت پذیر ہونے کے لئے ناکافی ہوں۔ پھر بھی اُن سے ہوا کا رُخ ضرور معلوم ہو جاتا ہے۔ گوناگوں، ہر جہتی علمی، ادبی، ثقافتی، سرگرمیوں، ذہنی بحث و پیزاد نئے تصورات و اقدار کی نمود کی حد تک دورِ انقلاب کسی طرح کمتر نہیں رہا۔ پیداوار کم و بیش اتنی ہی تیز، اتنی ہی کثیر رہی ہے جتنی پہلے تھی اور قومی ادب ہی نہیں تخلیقی ادب میں بھی، جو زیادہ وقیع اور پائدار ہوتا ہے اور حیات ملیہ کا حاصل تصور کیا جاتا ہے، بعض کاوشیں خاصی بلند ہیں۔ اور اپنی مخصوص نوعیت سے آئندہ زیادہ جسارت آمیز کوششوں کی خبر دیتی ہیں۔ ہمارے دور کے یہ علمی، لسانی، ادبی اور فکری نقوش درحقیقت "نقشِ پائے رہرواں" ہیں جن سے ہمارے دور کی امتیازی خصوصیات کا سراغ ملتا ہے اور ان کا جائزہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

اس سلسلے میں ہماری نظر سب سے پہلے ڈاکٹر سید عبداللہ کی "نقدِ میر" پر پڑتی ہے جس پر انقلابی حکومت کی قدرداں و تحسین آمیز نظرِ انتخاب پہلے ہی پڑ چکی ہے۔ اس میں نقاد کا مخصوص عالمانہ و محققانہ اندازِ تنقید اپنی پوری بلندی پر ہے۔ تنقید شواہد پر مبنی ہے۔ اس لئے اس میں محاکماتی ہونے کی کوشش نمایاں ہے۔ یہ بات یقیناً انکشاف کی حیثیت رکھتی ہے کہ میر کسی زمانہ میں وہ میر نہ تھا جو بعد میں "خدائے سخن" بن گیا۔ اور اپنے حساب کے مطابق شاعری کی مکمل اکائی تھا۔ زیادہ کڑی جانچ پر یہ احساس باقی رہ جاتا ہے کہ شاعر کو تنقید کی کسوٹی پر پوری طرح نہیں کسا گیا۔

"مقاماتِ اقبال" میں اسی کارآزمودہ قلم کی جولانی ایک جدید شاعر پر وقفِ عمل نظر آتی ہے۔ کتاب میں جہاں نقاد نے اقبال کے افکار و کلام کے بعض نادر گوشے اُجاگر کئے ہیں وہاں اُس برتر سطح سے نظر نہیں ڈال سکا جو پوری طرح "آزادِ خود" کی خبر دے۔ اقبال کے فکر و فن میں مستعار عنصر کتنا ہے اور ان پر کتنا اثر ڈالتا ہے، کیا ان کے تصورِ "خود" اور صوفیا کے تصورِ روح میں کوئی فرق تھا؟ کیا فنا کے معنی حقیقۃً و کلیتہً "فنائے ذات" تھے؟ کیا صوفیا کا نقطۂ نظر واقعی منفیاتی تھا؟ اور پھر اقبال کے کلام و فن کا زیادہ "دقتِ نظر" سے جائزہ۔ ان وجوہ کی بنا پر ناظرِ اقبال سے قریب و دور کے مرحلے ہی میں رہ جاتا ہے۔

سید عابد علی عابد کی "تلمیحاتِ اقبال" ایک اور انداز سے ہمیں شاعر کے قریب تر لانے کی کوشش ہے۔ فکر و نظر، تحقیق اور وسیع علمی پس منظر اس نقاد کا بھی طرۂ امتیاز ہے۔ اس کی کاوش تلمیحات کی تہیں کھود کھود کر ان کی بنیاد تک پہنچنے میں مدد دیتی ہے۔

اصولِ تنقید پر ایک جدید تصنیف کی ضرورت مدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ حسنِ اتفاق سے یہ ضرورت بھی دورِ انقلاب ہی میں پوری ہوئی ہے۔ سید صاحب نے اپنی ضخیم کتاب "اصولِ انتقادیات" میں اس اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ جس سے اُمید ہے فکر و نظر کی راہوں کو روشن تر کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔

وہ ادبی جوالا مُکھی محمد حسن عسکری ایک عرصہ خاموش رہنے کے بعد پھر جاگا ہے۔ اور ماہنامہ "سات رنگ" کے لئے بالالتزام لکھ رہا ہے، یہ ماہنامہ، جو جدید رجحانات کا عکاس ہے، عسکری کے ساتھ بعض نئی آوازیں بھی لئے ہوئے ہے۔ عسکری کی بازگشت اور یہ نئی آوازیں کہیں نئے، بدلتے ہوئے ماحول ہی کا نتیجہ تو نہیں!

انقلاب کے چند ہی ماہ بعد اصلاح وتجدید کے ناگزیر تقاضے ایک مضمون "اُردو ادب کی تشکیلِ نو" پر منتج ہوئے جسے بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے ادبی و ذہنی انقلاب کا پیش خیمہ قرار دیا۔ اس مضمون پر انجمن ترقی اردو پاکستان کے رسالہ "قومی زبان" میں تقریباً اُسی وقت سے تمام برصغیر کے اہل الرائے میں بحث ونظر کا سلسلہ جاری ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ مضمون میں جو سوال اٹھائے گئے تھے وہ بہت ہی بنیادی نوعیت کے تھے۔ اور وہ اب بھی باقی ہیں۔ ان کا حل تلاش کرنا اس لئے ضروری ہے کہ ہماری آئندہ ہر گونہ ترقی کا دارومدار اسی پر ہے خواہ اس کا تعلق زندگی سے ہو یا ادب وفن سے۔ اس مضمون کی تہہ میں جو بنیادی احساس کارفرما تھا وہ بدقسمتی سے محسوس نہیں کیا گیا۔ ہر صنفِ ادب میں سب سے اہم سوال ہے: اُس کی اٹھان، اس کا تصور۔ ایک ہی بات کئی سطحوں پر پیش کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا سوال محض ادائیگی کا نہیں، ادائیگی کی سطح کا ہے، لکھنے والے کے اعلیٰ یا ادنیٰ تصور کا ہے، پیشکش کی معمولی یا غیر معمولی اُٹھان کا ہے۔ لہٰذا جس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ادب اور تنقید کی اٹھان کو بلند کرنے کے لئے کیا کرنا چاہئے، اس کے لئے کیا تدابیر ضروری ہیں۔ آئندہ ہماری کوششیں اس بنیادی بات کو توضیح کے لئے وقف ہونی چاہئیں۔

شاعری میں بعض رہرؤوں کے قدم خاصے تیز بھی رہے ہیں اور بھاری بھی۔ "سرودِ رفتہ"۔ "سلومی"۔ "غزل الغزلات"۔ "زنجیرِ رمِ آہو"۔ پے در پے نئے نئے قدم، تیز تیز، سراپا رمِ آہو جسے شاید ہی زنجیر کیا جا سکے۔ اور پھر "زرداغِ دل" جیسی ضخیم تصنیف کے بعد! اگر کسی دور کی ہماہمی کا اندازہ شعراء وادبا کی والہانہ سرگرمی سے لگایا جا سکتا ہے تو عبدالعزیز خالد کی یہ مسلسل کاوشیں اس کا بین ثبوت ہیں۔ شعری وفنی خصوصیات سے قطع نظر جس نفاست اور خوش سلیقگی سے ان شعری مرقعات کو پیش کیا گیا ہے۔ وہ طباعت میں ایک نئے ذوق کی خبر دیتی ہیں۔ اگر قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک مقامی ومحلی رؤوں کے ساتھ ساتھ آفاقی دھارے بھی موجود رہے ہیں جو روز بروز زیادہ گمبھیر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور ایک نئے شعور کی خبر دیتے ہیں، تو خالد، جعفر طاہر، عاصم حسین، شہاب رفعت اور اختر حسن جیسے شاعروں میں ان کی خاص جھلک دکھائی دے گی۔ اگرچہ ان کے ساتھ ساتھ راشد، فیض، ڈاکٹر خالد، مختار صدیقی، یوسف ظفر، احمد ندیم قاسمی، ابن انشا، ضیا جالندھری اور سیف الدین سیف جیسے ہم وضع شاعر بھی بدستور دورِ انقلاب کی ادبی سرگرمیوں میں شریک ہیں۔

کہنہ مشق شاعروں میں جو بدستور غزل کی راہ پر گامزن ہیں، سید آل رضا کا نام قابلِ ذکر ہے جن کا مجموعۂ کلام "غزلِ معلیٰ" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے کو اردوئے معلیٰ کے ساتھ کتنی ہی بیّن مناسبتیں ہیں۔

جن شاعروں نے غزل ہی کے ساز کو اپنایا ہے اور اس کے ذریعے اپنے تاثرات کی ترجمانی کی ہے ان میں سے ایک شہرت بخاری ہے جس کا مجموعۂ کلام ابھی ابھی منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس کے ساتھ اس کے بے شمار ہمنوا اور بھی ہیں۔ عدم، عابد، قتیل شفائی، عارف عبدالمتین وغیرہ۔

منیر نیازی چھوٹی چھوٹی نظموں کا شاعر ہے جس نے "تیز ہوا اور تنہا پھول" میں ایک نہیں کئی پھول پیش کئے ہیں۔ اس مجموعہ کی بعض نظموں میں ایک خاص فضا اور پُراسرار سی وضع جھلکتی ہے، جو ایک نرالی خصوصیت ہے۔

حبیب جالب کا مجموعۂ "برگِ آوارہ" شاعر کے لعینہٖ حسبِ حال ہے۔ اور شاعر ہی نہیں اپنی دھرتی سے بچھڑے ہوئے کئی بے خانماں انسانوں کی علامت ہے جو بدقسمتی سے گلیوں گلیوں مارے مارے پھرتے رہے ہیں۔ جالب میں ان ہی لوگوں کا تلخ احساس نوا پاتا ہے جو کبھی کبھی سنک کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔

اختر حسن کا سرمایہ اچھوتا تخیل، اچھوتا بیان، اور رچا ہوا نازک احساس ہے۔ ان سے وہ ایک عجیب انفعالی وتاثراتی دنیا تعمیر کرتا ہے، جسے آپ چاہیں تو تحت الشعور کی بوالعجب دنیا کہہ لیں۔ اس کے ترکش کے تیر ظاہر ہے، ایما واشارہ، کنایہ وتمثیل ہی ہو سکتے ہیں جو اس دنیا کی عکاسی کا حق ادا کر سکیں۔

ایسے ہی ایک اور شاعر، مادھو، کا بھی آج کل چرچا ہو رہا ہے۔ گو ابھی ان میں کوئی ایسے نکھرے ہوئے تیور نظر نہیں آتے۔

"آتشِ خنداں" کے مصنف لبیب تیموری مرحوم دورِ کہن کے ان نمائندوں میں سے تھے جنہوں نے دیارِ پاک کا خواب دیکھا اور یہاں پہنچ کر اسی کی بہاریں آغوش میں سو گئے! ان کی ایک پوری نظم پاکستان اور کراچی کے بارے میں پیشگوئی کی حیثیت رکھتی ہے۔

پیچ وخم کھاتی ہوئی راہوں سے ہوتے ہوئے ہم بالآخر "مینائے غزل" اور "حرفِ جنوں" تک پہنچ جاتے ہیں۔ "مینائے غزل" نے بعض صحافتی محفلوں میں ایک عرصہ ہنگامہ برپا کئے رکھا۔ وہ صلاحیتیں جو اس مجموعہ میں ابھر نہیں سکی تھیں "حرفِ جنوں" میں پوری طرح ابھر کر دو آتشہ بن گئی ہیں۔ دونوں مجموعوں میں دورِ انقلاب کی بھرپور وقعیت نمایاں ہے۔ شاعر کے نزدیک تصوریت اور واقعیت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ اس لئے وہ آسمان کو بھی کھینچ کر زمین پر لے آتا ہے۔ اور سیاسی ومعاشرتی ذوق وشوق کو شاعری میں سمو دیتا ہے مگر اس طرح کہ شاعری کا پہلو غالب ہے۔

بشیر فاروقی کے شعور کی طرح اس کی شاعری بھی دورِ حاضر کے شر خیز پس منظر سے ابھرتی ہے اور اپنے دامن میں فکر و احساس کے وہ تمام دنبالے لئے ہوئے جو نیرنگیٔ حوادث اور حالات و ظروف کی تہ سے کارواں در کارواں اٹھ اٹھ کر حساس انسانوں کے دل و دماغ پر چھاتے رہے ہیں۔

شوکت صدیقی کے ضخیم واقعاتی ناول "خدا کی بستی" میں معاشرہ کی یک رخہ تصویر کھینچ کر یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہی اس کی صحیح تصویر ہے۔ ایسے ناولوں میں زندگی، کردار، واقعات، جزئیات اور پلاٹ قصداً ایسے چنے جاتے ہیں جن سے مطلوبہ نتیجہ اخذ کیا جا سکے لیکن یہ کبھی یقین انگیز نہیں ہو سکتے۔ ان حدود کے تحت "خدا کی بستی" خاصا دلچسپ اور کامیاب ناول ہے۔ اس میں ناول نویسی کے وہ سارے گُر بڑی چابکدستی سے برتے گئے ہیں جن سے دلچسپی آخری وقت تک برقرار رہتی ہے۔ یہ اُس دور کا بہت عبرتناک مرقع ہے جس نے دورِ انقلاب سے پہلے "خدا کی بستی" — پاکستان — کو جہنم بنا رکھا تھا۔

قرۃ العین حیدر، مزاج، ذہنیت، تصور، اسلوب، فن ہر اعتبار سے شوکت صدیقی کی ضد ہے۔ ایک تمام تر ذہنیاتی، دوسرا بالکل واقعاتی۔ شوکت صدیقی زندگی کو عام چلتی پھرتی سطح پر دیکھتا ہے۔ قرۃ العین اس سے بلند رہ کر زمان و مکاں کے پورے گھیر اور اپنے تصور کی روشنی میں دیکھتی ہے۔ ایک بے پایاں پھیلا ہوا سلسلہ۔ ایک آگ کا دریا۔ بناتا بگاڑتا، نت نئے سانچوں میں ڈھالتا۔ اس کی داستان تاریخ یا وقت کے لامتناہی بہاؤ کا دوسرا نام ہے۔ سوال یہی پیدا ہو گا کہ ہم اسے ناول کہیں یا تاریخ یا سیلانِ وقت۔ بہرحال یہ زندگی کا بھرپور مرقع ضرور ہے۔ تمام تر خواص کا ناول۔ اس کا تصور اونچا، عالمانہ، آفاقی سطح پر کیا گیا ہے۔ اور اس کے مطابق جدید ترین رجحانات میں رچی ہوئی تکنیک بھی اپنائی گئی ہے۔

ایسے ناول کو اسی سطح ہی سے دیکھنا مناسب ہے جس پر وہ لکھا گیا ہے۔ ایسا ادب اور ادیب ہمیشہ مقامی حدود اور رسوم و قیود سے بالاتر ہوتے ہیں۔ اس بات کا سہرا دورِ انقلاب ہی کے سر رہے گا کہ اس میں ایک ایسا منفرد قسم کا ناول لکھا گیا ہے۔

قدسیہ بانو کا ناولٹ "پروا" ایک پر لطف انقلابی رومان ہے۔ جو دورِ انقلاب کی ساحرانہ کشش کا ایک اور دلچسپ پہلو ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے دورِ انقلاب ہی میں قلم اٹھایا اور اسی میں اپنے دھرتی میں ڈوبے ہوئے افسانے تحریر کئے ہیں۔ اس کے ناول "تلاش بہاراں" نے کم از کم ضخامت کے اعتبار سے "آگ کے دریا" کو بھی مات کر دیا ہے۔ الطاف فاطمہ کا ناول "نشانِ محفل" دورِ انقلاب کی افسانوی پیداوار میں ایک اور اہم اضافہ ہے۔

پرانی لکھنے والیوں میں ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، اور جیلانی بانو کا شغف دورِ انقلاب میں بھی برابر قائم رہا ہے۔

افسانوں کے مجموعوں میں دو قابلِ ذکر ہیں "رنگ حنا" اور "جاڑے کی چاندنی"۔ پہلے مجموعے کے متعلق کچھ کہنا تحصیلِ حاصل ہے۔ کیونکہ ہم سب اس کے مصنف، احمد ندیم قاسمی کے جوہروں اور اندازِ افسانہ نگاری سے بخوبی واقف ہیں۔ اس مجموعے میں ایک منجھا ہوا، ہر سو خرام قلم ہر کہیں اپنے مخصوص تیور دکھاتا ہے۔ دو حالیہ افسانوں "ہذا من فضل ربی" اور "گھر سے گھر تک" میں اٹھکھیلیاں کرتے جس طرح "قصہ" بیان کیا گیا ہے وہ احمد ندیم قاسمی ہی کا حصہ ہے۔

"جاڑے کی چاندنی" غلام عباس کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے جس کا نام مصنف کی افتادِ مزاج کے ساتھ گہری مناسبت رکھتا ہے۔ جاڑے اور چاندنی — خنک، سیمیائی، ٹھہرے ٹھہرے۔ لہٰذا افسانوں میں ایک حکیمانہ وضع ہے۔ زیادہ تر یہی احساس غالب رہتا ہے کہ افسانے جستہ جستہ مشاہدات ہیں۔ جہاں بعض افسانوں میں اچانک انجام کی تکنیک کامیاب نظر آتی ہے وہاں بہت سے افسانوں میں واقعہ و فسانہ کے امتیاز کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ بعض افسانوں کی تکنیک اس لئے بحث انگیز ثابت ہو سکتی ہے کہ ان میں مقررہ نتیجہ تک پہنچنے کے لئے واقعات التزاماً ترتیب دیئے گئے ہیں۔ بہرحال ان افسانوں میں ایک مشاق، دیدہ ور فن کار کی ذہانت ضرور کارفرما ہے۔

سیر و سیاحت سے متعلق ایک تصنیف "یورپ نامہ" ہے جس میں حکیم محمد سعید دہلوی صاحب، بانی ہمدرد دواخانہ (پاکستان) نے اپنے سیر و سفر کے نقوش اس انداز سے قلمبند کئے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے ہم انہیں بچشم خود دیکھ رہے ہیں۔ ایسے سفرنامے، جو معلومات کا ذخیرہ ہوتے ہوئے ادبی حیثیت سے بھی وقیع ہوں اور خاص پاکستان کے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ملی افادہ کی غرض سے ترتیب دیئے گئے ہوں، ذہنی اُفق کی توسیع کے لئے نہایت اہم اور کارآمد ہیں۔ یہ لفظاً و معناً نقوش پائے رہرواں ہیں جو دوسروں کے لئے حکمت ہی کی اصطلاح میں، سرمۂ بینش ثابت ہوں گے۔

دورِ انقلاب کی سرگرمیوں کا ایک اہم پہلو سائنس جیسی اہم چیز پر توجہ ہے، ایک نوجوان مصنف ایم۔ ایچ۔ مسعود بیٹ نے "ایٹم سے ایٹم بم تک" کے عنوان سے ایک فاضلانہ کتاب لکھی ہے جسے بابائے اردو نے بڑی تحسین کی نظر سے دیکھا ہے۔

ایسی ہی ایک اور اہم علمی تصنیف "صحت کی کہانی ایک ڈاکٹر کی زبانی" ہے۔ جس کا مصنف ڈاکٹر ہوتے ہوئے ایک نامور افسانہ نگار بھی ہے۔ ڈاکٹر محمد نصیر الدین احمد۔ اسی لئے اس کے ہاتھوں میں صحت کی کہانی واقعی ایک دلآویز کہانی معلوم ہوتی ہے۔

اور جہاں تک نظر دوڑائی جائے ایسے نقوش دستیاب ہوتے ہی جاتے ہیں، نئے نئے راہرو پرانے رہرووں کے ساتھ مل کر اپنے نقش چھوڑتے جاتے ہیں۔ ہر نیا سال اپنے ساتھ ایسے کتنے ہی نقوش لائے گا اور یہ سلسلہ روز بروز اور بھی روشن ہوتا جائے گا۔

آزاد کا سفرِ ترکستان

آغا محمد اشرف

ہم آغا صاحب کے مضمون کو بجنسہٖ پیش کر رہے ہیں۔ "از تاک بادہ گیرم و در ساغر افگنم"۔ ڈاکٹر صادق کو اس مضمون کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، اور وہ آئندہ شمارہ میں اس کے متعلق اظہار خیال فرمائیں گے۔ (مدیر)

جولائی ۱۹۶۰ء کے "ماہ نو" میں ڈاکٹر محمد صادق صاحب کا مضمون "آزاد بہ حیثیت انشاء پرداز" میری نظر سے گذرا۔ اس کے تعارفی نوٹ میں مدیر ماہ نو کا یہ عجیب دعویٰ دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ:

"آزاد کے سفر ایران کا مقصد سیر و سیاحت نہ تھا، سیاست تھا، اس پر موصوف (ڈاکٹر صادق) کا ایک مضمون ماہ نو جنوری ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا تھا۔"

جب ماہ نو کے جنوری ۱۹۵۸ء کے شمارے میں ڈاکٹر صادق کا مضمون بعنوان "آزاد کا سفر ایران" پڑھا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ کیونکہ مضمون کی پہلی ہی سطر میں ڈاکٹر صادق نے ٹھوکر کھائی ہے۔ فرماتے ہیں:

"مولانا محمد حسین آزاد دو دفعہ ایران گئے۔ پہلی بار غالباً ۱۸۶۵ء اور دوسری دفعہ ۱۸۸۵ء میں۔"

اگر یہ بیان کسی طالب علم کا ہوتا تو قابل اعتنا نہیں تھا لیکن یہ تحریر ایک ایسے شخص کی ہے کہ جسے پنجاب یونیورسٹی سے آزاد کی علمی زندگی پر مقالہ لکھنے کے صلے میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند ملی ہے۔ اس لئے میں اس مبحث پر روشنی ڈالنی ضروری سمجھتا ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ آزاد نے ایران کا سفر اپنی زندگی میں صرف ایک مرتبہ کیا تھا۔ اور وہ ۱۸۸۵ء میں صرف علمی اور ادبی مقاصد کے پیش نظر ایران گئے تھے۔ ۱۸۶۵ء میں ایک پولیٹیکل مشن کے ساتھ آزاد نے وسط ایشیا میں اسلامی ریاستوں کی سیاحت کی تھی۔ لیکن جس علاقے کی آزاد نے ۱۸۶۵ء میں سیاحت کی تھی اسے کوئی شخص ایران نہیں کہتا۔ بلکہ صدیوں سے یہ ترکستان کہلاتا چلا آیا ہے۔ ڈاکٹر صادق نے سعدی کا یہ شعر ضرور پڑھا ہوگا:

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی
کیں راہ کہ تو میروی بترکستان است

آزاد کی وسط ایشیا کی سیاحت کا مفصل حال میں نے انڈیا آفس کی رپورٹوں سے اخذ کرکے حال ہی میں "انیسویں صدی میں وسط ایشیا کی سیاحت" کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس کتاب سے آزاد کے سفر ترکستان کے حالات پہلی مرتبہ اس تفصیل سے شائقین کے سامنے آئے ہیں۔

ڈاکٹر صادق اور مدیر ماہ نو نے ایران اور ترکستان کو ایک ہی علاقہ سمجھنے میں ایک بنیادی غلطی کی ہے۔ حالانکہ آج تک مشرق اور مغرب کے جغرافیہ دانوں نے کبھی ترکستان کو ایران نہیں کہا۔ دسویں صدی عیسوی میں فردوسی نے پہلی بار اس علاقے کو "توران" کا نام دیا تھا۔ اس سے پہلے عرب جغرافیہ داں ہمیشہ اس سرزمین کو ماوراءالنہر کا علاقہ کہتے رہے۔ اور ایران اور ماوراءالنہر کی سرحد جیحوں کو قرار دیا۔ بابر نے بھی اپنی تزک میں اس علاقے کو ماوراءالنہر کے نام سے منسوب کیا ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ آزاد نے ترکستان کی سیاحت کیوں کی تھی۔ اس کے متعلق اس وقت یہ کہنا کافی ہے کہ انیسویں صدی کے آغاز میں زار روس کے لشکر روس کی سرحد سے نکل کر جنوب کی جانب حرکت کر رہے تھے۔ اور ترکستان کی اسلامی ریاستیں، بخارا، سمرقند اور خیوہ کو روسیوں کی طرف سے خطرہ پیدا ہو چلا تھا۔ انگریز خوب جانتے تھے کہ اگر روسی سیلاب کو جنوب کی طرف بڑھنے سے نہ روکا گیا تو ایک دن یہ طوفان افغانستان کو روندتا ہوا ہندوستان کی شمال مغربی سرحدوں سے ٹکرانے لگے گا۔ طاقت ور ملک کمزور ہمسایوں

پر حملہ کرنے کا ہمیشہ کوئی عذر تلاش کر لیتے ہیں۔ چنانچہ روس نے بھی ترکستان کی اسلامی ریاستوں کی طرف بڑھنے کا یہ حیلہ تراشا تھا کہ روسی سوداگر جب اس علاقے سے گزرتے ہیں تو اُن کے جان و مال کی حفاظت کوئی نہیں کرتا۔ ترکمان قبیلے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ اور سمرقند اور بخارا کے بازاروں میں روسی باشندوں کو غلام بنا کر فروخت کیا جاتا ہے۔

انگریزوں نے روسیوں کے اس عذر کی کاٹ کے لئے ترکستان کے امیروں اور حاکموں کو ہزار سمجھایا کہ اپنے علاقوں کا بندوبست اور نظم و نسق بہتر بنا لیں مگر ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ بلکہ الٹا انگریز ایلچیوں کو پکڑ پکڑ کر بند کر ڈالا۔ ترکستان کی ریاستوں میں اُس وقت طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ اور خانہ جنگی کا بازار اس قدر گرم تھا کہ مقامی امیر کسی کی بات سننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ چنانچہ روسیوں نے انیسویں صدی کے نصفِ اول میں قزاقستان پر قبضہ کر لیا۔ اور خیوہ۔ بخارا۔ سمرقند اور خوقند کے علاقوں پر فوج کشی شروع کر دی۔

۱۸۶۵ء میں ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ جان لارنس کے ایما پر پنجاب کے لفٹنٹ گورنر سر ڈانلڈ میکلوڈ نے ترکستان کے حالات معلوم کرنے کے لئے ایک سیاسی مشن بھیجا تھا۔ اس کے لیڈر پنڈت من پھول[1] تھے جو اُن دنوں لفٹنٹ گورنر پنجاب کے میر منشی تھے اور قدیم دلی کالج میں عربی اور انگریزی کی تعلیم حاصل کر چکے تھے۔ اُن کے ہمراہ آزاد اور پشاور کے منشی فیض بخش گئے تھے۔ ایک اور شخص کرم چند نندرام جو غالباً شکارپور سندھ کا رہنے والا اور ذات کا سنار تھا، پنڈت من پھول کے نجی ملازم کی حیثیت سے اس مشن کے ہمرکاب گیا تھا۔

اس مشن کے ممبروں کو چونکہ خفیہ طور پر ترکستان بھیجا جا رہا تھا اس لئے بنظر احتیاط ان کے نام بھی بدل دیئے گئے تھے۔ مثلاً پنڈت من پھول، بھائی دیوان سنگھ مہاجن بن گئے۔ آزاد نے بہار الدین کا نام اختیار کیا اور ایک طالب علم کی حیثیت سے سفر میں شریک ہوئے۔ منشی فیض بخش کا نام غلام ربانی تجویز ہوا اور یہ ایک افغان تاجر کے لباس میں سفر پر روانہ ہوئے۔ البتہ کرم چند نے اپنا نام نہیں بدلا تھا۔

آزاد نے سفر ترکستان کا ذکر سخندان فارس اور دربار اکبری میں بار بار کیا ہے۔ اور ان حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ اگرچہ اس سفر کی غایت سیاسی تھی، لیکن آزاد کو جہاں موقعہ ملتا تھا تاریخ، فلالوجی اور ادب کے نکتے جمع کرتے جاتے تھے۔

آزاد نے ایران کا سفر اس کے ۲۰ سال بعد ستمبر ۱۸۸۵ء میں کیا تھا اور تقریباً گیارہ مہینے بعد جولائی ۱۸۸۶ء میں قندھار اور کوئٹے کے راستے لاہور واپس آئے تھے۔ ڈاکٹر صادق کا یہ کہنا کہ آزاد کے سفر ایران کا مقصد سیاست تھا، واقعات کے خلاف ہے۔ اور آزاد سے سراسر بے انصافی ہے۔ سیر ایران کے نام سے اس سفر کی روداد چھپ چکی ہے۔ اس کے شروع میں وہ لیکچر شائع ہوا ہے جو سفر ایران کے بعد آزاد نے لاہور کے ایک جلسے میں دیا تھا۔ اور جسے سننے کے لئے دور دور سے آزاد کے پرستار لاہور آئے تھے۔ اس لیکچر سے معلوم ہوتا ہے کہ سفر ایران آزاد نے ان مقاصد کے لئے کیا تھا:۔

لاہور میں کوئی ایسا کتب خانہ موجود نہیں تھا کہ جہاں سے علم کے پیاسے ادبی ذوق کی تسکین کرتے۔ آزاد خود فرماتے ہیں:

> " ہر وقت ایک نہ ایک کتاب کی ضرورت ہوتی تھی اور یونیورسٹی کسی کو کوئی کتاب نہ دیتی تھی۔۔۔۔ بعض دفعہ ہر روز ایک نہ ایک کتاب کی ضرورت ہوتی تھی، وہ بھی نہ ملتی تھی۔"

آزاد کے والد مولوی محمد باقر کا دلی کا کتب خانہ ۱۸۵۷ء میں تباہ ہو چکا تھا۔ آزاد کی دلی آرزو تھی کہ لاہور میں بھی ایک ایسا کتب خانہ قائم کریں کہ جہاں نایاب کتابوں کے ذخیرے جمع ہو جائیں۔ اسی لیکچر میں آزاد نے اس تمنا کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

> " ایک کتب خانہ نظرگاہِ خاص و عام میں آراستہ کروں، اور جس قدر ممکن ہو ہر فن کی کتابیں اس میں رکھوں کہ کسی بد دماغ سے التجا کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔"

سفر ایران کی دوسری وجہ یہ تھی کہ آزاد کی چند تصانیف کے مسودے غیر مکمل پڑے تھے۔ اور آزاد ان کی تکمیل کے لئے ایران کے ادیبوں اور فاضلوں سے مشورہ کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ سخندانِ فارس، اور قندِ پارسی اور آموزگارِ پارسی اسی سفر کی یادگار رہیں۔ آزاد کا ارادہ

(باقی صفحہ ۱۰۰ پر)

---

[1] :۔ ڈاکٹر صادق نے اپنے مضمون میں اس مشن کا لیڈر ڈاکٹر جی۔ ڈبلیو۔ لائٹنر کو لکھا ہے۔ جو گورنمنٹ کالج کے پرنسپل تھے۔ مگر یہ بیان درست نہیں۔ انڈیا آفس کی رپورٹ سے اس بیان کی حقیقت معلوم ہو سکتی ہے۔

"رحمتِ عامِ خضر"

آفاق حسین آفاق

اس شمارہ کے سرورق پر سکھر بیراج کی جو تصویر پیش کی گئی ہے، وہ اُس بے بہا چیز کی علامت ہے جسے ہم آزادی کے بعد بٹوارے کے باعث، ایک حد تک کھو چکے تھے۔ پانی جس پر مغربی پاکستان کی شادابی و خوشحالی کا دارومدار ہے۔ اور جو آبادیوں کی طرح دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ انقلابی حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس کی بدولت یہ کھوئی ہوئی نعمت "آب رفتہ بجو ئے" کے مصداق ہمیں پھر ہاتھ آگئی ہے۔ کیسے ؟ اس کی کیفیت درج ذیل مضمون میں ملاحظہ فرمائیے۔ (مدیر)

بہت عرصہ کی بات ہے جب آزادی کا دور دورہ ہوا اور اسکے یمن قدم سے آبادیوں کی طرح دریا بھی تقسیم ہو گئے۔ کچھ دریا اُدھر ہو گئے اور کچھ اِدھر! اور نعمت آب بھی تقسیم ہو گئی تو اس پر ہمارے افسانہ نگار منٹو مرحوم، کو اپنا افسانہ "یزید" لکھنے کی ضرورت پیش آئی اور اس نے کہا دیکھیں یہ نعمت ہمیں کون واپس دلواتا ہے۔ اسی طرح ایک شاعر بھی پکار اٹھا تھا کہ

نعمت آب بھی تقسیم ہوئی   رحمتِ عامِ خضر کب ہو گی ؟

اب ہمارے "افسانہ نگار" اور ہمارے شاعر، دونوں کو ان کا جواب مل گیا ہے۔ افلاک سے آخر نالوں کا جواب آ ہی گیا ہے اور وہ چیز جس کی خواب و خیال میں بھی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ رحمت خضر اب فی الحقیقت عام ہو گئی ہے۔ سننے کو ہم یہی سنا کرتے تھے کہ پیاسا چشمے کی طرف جاتا ہے۔ چشمہ پیاسے کی طرف نہیں آتا۔ لیکن اب کے خود چشمہ ہی ہمارے پاس آگیا ہے۔ نہریں اور نہروں کا پانی جو ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ طاس سندھ کے دریاؤں کے معاہدہ کی صورت میں خود ہی چل کر ہمارے پاس پہنچ گیا ہے۔ نگر نگر، قریہ قریہ، گاؤں گاؤں، بستی بستی اور گھر گھر۔ اس سے بڑھ کر ہماری خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے۔

نہری پانی کا یہ قضیہ کچھ پاکستان کی گھٹی ہی میں پڑ گیا تھا یعنی یہ صورت خرابی کی اس کی تعمیر ہی میں مضمر تھی۔ کیونکہ جن حالات کے تحت اور جن ہاتھوں سے تقسیم کی کارروائی عمل میں آئی ہو انہیں نے اِدھر کی دھرتی اُدھر اور اِدھر کے دریا اُدھر کر دیئے اور اس کے ساتھ اس شاندار نظام آبپاشی کا بہت سا حصہ بھی جو گزشتہ سو سال کی مسلسل جدوجہد سے تیار کیا گیا تھا، پاکستان کے کوئی چار کروڑ انسانوں کا سہارا "جو کم و بیش ۳ کروڑ ایکڑ زمین کو سیراب کرتا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان ان دریاؤں سے محروم ہو گیا جو اس کے ہونے چاہئیں تھے۔ جو اس علاقے کے لئے رگ جاں کی حیثیت رکھتے تھے اور آبپاشی و زراعت کا دارومدار انہیں پر تھا۔ ان دریاؤں اور ان کے نظام آبپاشی کے بغیر مغربی پاکستان، جو بڑی حد تک بنجر علاقہ ہے اور اس میں بارش بھی کم ہی ہوتی ہے، بالکل صحرا بن جاتا ہے۔ یہ نہ ہو تو انسان اور زمینیں پانی جیسی ضروری اور زندگی بخش چیز سے محروم ہو جائیں۔ دریاؤں کے علاوہ پاکستان ان علاقوں سے بھی محروم ہو گیا جن میں ان کے منبعے واقع تھے ان علاقوں اور دریاؤں پر ہندوستان کا پورا پورا قابو تھا اور وہ جیسے چاہتا ان کو استعمال میں لاتا۔ اور ضرورت پڑے تو دریاؤں پر بند باندھ کر پاکستان پہنچنے سے روک بھی دے جیسا کہ فی الحقیقت ہوا بھی۔ اپریل ۱۹۴۸ء میں تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ہندوستان نے تمام نہروں کا پانی بند کر دیا اور پاکستان کو ہزارہا انسانوں، حیوانوں اور فصلوں کے نقصان کا سامنا کرنا پڑا جس کا نتیجہ ایک شدید تنازعہ کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا؟ شومئ قسمت سے

انتقال اختیارات کی عجلت میں نظام آبپاشی کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا لہٰذا اہل پاکستان کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ رہا تھا کہ یا تو غم و غصہ اور غیظ و غضب سے کام لیا جائے یا ان دریاؤں اور علاقوں کی بازیافت کے لئے جنگ برپا کی جائے جس کے خدشے اور مضرات ظاہر ہیں۔ تیرہ سال یہی کشمکش کا عالم رہا۔ جنگ و جدل کے سوا اس سنگین قضیہ کا کوئی حل دکھائی نہیں دیتا تھا۔ پاکستان ہندوستان کے خلاف شکایات کا دفتر اور غیظ و غضب کا طوفان لئے بیٹھا تھا اور ہندوستان پاکستان کے خلاف، زندگی کا کوئی میدان ایسا نہ تھا، خواہ وہ تعلقات خارجہ ہوں یا دفاع، اقتصادیات ہوں یا تجارت و صنعت جس میں یہ کشیدگی نہ پائی جائے۔ اور اس کے باعث بین الاقوامی سیاست میں بھی گوناگوں پیچیدگیاں دکھائی دیتی تھیں۔ پاکستان کے لئے صرف ایک ہی راستہ کھلا تھا کہ وہ اسے بین الاقوامی اہمیت کا معاملہ قرار دے۔ اور یہ کہے کہ اس کا بین الملی قانون و انصاف کے مطابق فیصلہ ہونا چاہیئے۔ چنانچہ جب براہ راست حکومت ہندوستان سے گفت و شنید بے کار ثابت ہوئی تو پاکستان نے بین الاقوامی عدالت ہی کی طرف رجوع کیا۔ مگر مدتوں اس کا کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ جب ایک عرصہ اسی طرح سیاسی بنا پر حل تلاش کرنے کی کوششیں لاحاصل نظر آنے لگیں تو ارباب فہم کوئی اور مصالحانہ تلاش کرنے کی تدبیر کرنے لگے، اتفاق سے ایسے معاملات کے ایک ماہر، مسٹر ڈیوڈ ای للینتھال نے جو امریکہ کی مشہور ٹینیسی ویلی اتھارٹی کے سابق صدر تھے، ایک بڑی عمدہ تجویز پیش کی کہ کیوں نہ ہندوستان و پاکستان کے ماہرین مشترکہ بنیاد پر وسائل آب کا ایک عظیم الشان ہمہ گیر تعمیری منصوبہ تیار کریں بشرطیکہ عالمی بنک اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے عملی امداد کی حامی بھرے۔ عالمی بنک کے صدر، مسٹر یوجین بی بلیک، نے کہا کہ اس صورت میں دونوں ملک بنک کے توسل سے طاس سندھ کے پانی کا مسئلہ حل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ دونوں ملکوں نے مارچ ۱۹۵۲ء میں اس کی تجاویز قبول کر لیں۔ اور اس باب میں مزید کارروائیوں کا سلسلہ زور و شور سے شروع ہو گیا۔ رفتہ رفتہ فریقین کے لئے تسلی بخش معاہدہ کے امکانات اسقدر وسیع ہو گئے کہ پاکستان نے جون ۱۹۵۹ء میں عالمی بنک کی تجاویز کے مطابق واپڈا یعنی واٹر اینڈ پاور ڈویلپمنٹ اتھارٹی نامی ادارہ طاس سندھ کے آبی وسائل کی ترقی کے لئے قائم کر دیا۔ یہ اس تبدیلیٔ نظر کا نتیجہ ۔ یا گاندھی جی کے الفاظ میں اسے "دل کی تبدیلی" تصور کر لیجیے۔ کہ دونوں ملکوں کے سربراہوں نے حال ہی میں ایک مشترکہ اعلامیہ شائع کرنا قرین مصلحت سمجھا جس میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ اگر ہم کشمکش کو دور کر کے اپنی صلاحیتوں کو ہمسایوں جیسے دوستانہ تعاون و تعامل پیدا کرنے کے لئے وقف کر دیں تو یہ دونوں ملکوں کو ان کی بنیادی معاشری و اقتصادی ترقی میں بہت مدد دے گا۔ یہی احساس اور بدلا ہوا رویہ تھا جس کے تحت طاس سندھ کے پانی کے پرانے قضیہ پر بھی توجہ مبذول ہوئی جس میں باہمی مفاہمت اور دوستانہ تعاون کے مظاہرے اور ترقی کا خاصا امکان نظر آتا تھا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں یہ لائحہ عمل طے ہوا کہ دونوں ملکوں کے وزراء اور کمیٹیاں وغیرہ مختلف امور، مثلاً سرحدی تنازعوں، جائداد منقولہ، سائنس و ٹکنالوجی منصوبہ جات اور توسیع تجارت کے لئے وقتاً فوقتاً ملا کریں۔ اس خوشگوار سلسلۂ تعلقات نے طاس سندھ کے پانی کے بارے میں گفت و شنید اور مفاہمت کیلئے زمین ہموار کر دی۔ دولت مشترکہ نیز دونوں ملکوں کے بین الاقوامی خیر خواہوں اور سب سے بڑھ کر خود پاکستان کے دانشمند و معاملہ فہم مدبرین نے تعلقات کو خوشگوار بنانے میں نمایاں حصہ لیا۔ ہندوستان نے بھی حالات کی نزاکت کے پیش نظر صلاح کاری اسی میں دیکھی اور اس کا نتیجہ دونوں ملکوں کے مابین نہری پانی سے متعلق تاریخی معاہدہ ہے۔

ظاہر ہے کہ اس معاہدہ میں دونوں ملکوں کی بنیادی رقابت، سیاسی اختلافات اور گوناگوں متنازعہ فیہ امور کے علاوہ کتنی ہی اور دشواریاں سد راہ تھیں۔ اسی لئے گو یہ قضیہ واشنگٹن میں عالمی بنک کے سامنے فیصلہ کے لئے سالہا سال پیش رہا پھر بھی کوئی نتیجہ مرتب نہ ہو سکا۔ آخر بنک اور خیر خواہ ممالک کی اخلاق و عملی امداد سے ایک ایسے معاہدہ کے لئے زمین تیار ہو ہی گئی جو فریقین کے لئے تسلی بخش بھی ہو اور مفید بھی۔

معاہدہ کے لئے سب سے مقدم ایک سازگار فضا تھی۔ یہ ہمارے یہاں انقلابی حکومت کے برسر اقتدار آنے پر خود بخود پیدا ہو گئی کیونکہ اس سے ملک کا وقار بدرجہا بڑھ گیا اور ہندوستان ہی نہیں تمام ممالک نے محسوس کیا کہ اب ان کا سروکار ایسی حکومت سے ہے جو مضبوط و طاقتور ہی نہیں بلکہ سب سے اپنا لوہا منوا سکتی ہے۔ اور معاہدوں کو پورا کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ صدر پاکستان کی متحرک مہتم بالشان

شخصیت کا رعب وداب، فوجی جبروت، شدید واقعیت پسندی، دھڑلے سے جرأت مندانہ اقدام، انسان دوستی اور ڈنکے کی چوٹ صاف سیدھی بات کہدینا۔ یہ سب باتیں خوب کارگر ثابت ہوئیں۔

گفت و شنید کے دوران کئی بار پیالہ ہونٹوں تک پہنچتے پہنچتے رہ گیا۔ آخر میں جب معاہدہ تقریباً مکمل ہوگیا تو صرف دو دشواریاں باقی رہ گئیں: ہندوستان مصر تھا کہ مقبوضہ کشمیر کو جہلم اور چناب کے کچھ پانی کے استعمال کا حق دیا جائے۔ مگر وہ پاکستان کی اُس ضرورت کو ذرا بھی حد تک پورا کرنے کے لئے تیار نہ تھا جو اُسے عبوری دور میں مشرقی دریاؤں سے برابر پانی بہم پہنچائے جانے کے سلسلہ میں پیش آتی تھی۔ یہ عبوری دور وہ تھا جب کہ ہندوستان کا تو اُن مشرقی دریاؤں کے پانی پر مکمل اختیار ہوگا لیکن پانی حاصل کرنے کے لئے مناسب بندوبست (متبادل تعمیرات) نہ ہونے کے باعث پاکستان کو لازماً شدید نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔

پہلی مشکل تو یوں دور ہوگئی کہ پاکستان نے مقبوضہ کشمیر کے پاکستان آنے والے پانی کا کچھ حصہ استعمال کرنا منظور کر لیا۔

معاہدہ کی رو سے تین مشرقی دریا۔ راوی، بیاس اور ستلج ہندوستان کے حصے میں آئے ہیں اور سندھ، جہلم اور چناب پاکستان کے حصے میں۔ ان دریاؤں پر دونوں ملکوں کا اپنا اپنا کلی اختیار ہوگا۔ لیکن اس شرط پر کہ دس یا دو تین سال زیادہ کے عبوری دور میں جبکہ پاکستان مشرقی دریاؤں کے لئے متبادل تعمیرات تیار کر رہا ہوگا، ہندوستان اپنے دریاؤں سے پاکستان کو پانی بہم پہنچاتا رہے گا۔ پاکستانی دریاؤں کے سلسلہ میں ہندوستان پابند ہے کہ وہ ان میں پاکستان کے لئے پانی آنے دے تاکہ وہ اسے کسی روک یا بندش کے بغیر کام میں لاسکے۔ ہندوستان کو بھی دریاؤں کا کچھ پانی استعمال کرنے کا حق ہوگا۔

معاہدہ میں پاکستان کے لئے متبادل انتظامات تسلیم کئے گئے ہیں۔ جو ۷ لنک نہروں، ۱۵ ایبراجوں، دو بڑے ذخیرہ بندوں ٹیوب ویلز اور نکاسی نظام پر مشتمل ہوں گے۔ ان کے بعد ہمیں مشرقی دریاؤں کے پانی کی ضرورت نہیں رہے گی۔ پاکستان ان پر تقریباً ۸۰ کروڑ روپے صرف کرے گا۔ اب تک پانی کو ذخیرہ کرنے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اس لئے پانی کی مقدار موسم بہ موسم گھٹتی بڑھتی رہتی تھی نئے انتظامات سے پانی برابر ملتا رہیگا۔ ایک بند دریائے جہلم پر منگلا کے قریب باندھا جائیگا اور پانی نکلنے کی راہیں مسدود کرنے کیلئے چار چھوٹے چھوٹے بند بھی۔ منگلا بند دنیا کے سب سے بڑے بندوں میں شمار ہوگا۔ دوسرا بند تربیلا کے قریب باندھا جائے گا۔ دونوں میں علی الترتیب ۵۴ لاکھ اور ۱۰ لاکھ ایکڑ فٹ پانی ذخیرہ کرنے کی گنجائش ہوگی۔

اس سے ظاہر ہے کہ یہ منصوبہ، جو نوع انسان کی تاریخ میں اپنی قسم کا سب سے بڑا منصوبہ ہے، کس قدر عظیم الشان ہوگا۔ اس پر ۱۵ ارب روپے لاگت کا اندازہ ہے جن میں سے تقریباً ۱۴ ارب پاکستان کی متبادل تعمیرات پر صرف ہوں گے۔ اندازہ ہے کہ اس منصوبہ کے مطابق پاکستان کے حصے میں آنے والے دریاؤں کو ۱۳۶ کروڑ ایکڑ فٹ پانی ملے گا۔ جن میں سے ۶۰ لاکھ کو مقبوضہ کشمیر میں صرف کے لئے وضع کرتے ہوئے ۱۳ کروڑ پاکستان کے لئے باقی رہ جائیں گے۔

منصوبے پر اخراجات کے لئے پانی کے معاہدہ کے ساتھ ہی "معاہدہ ترقیاتی فنڈ" بھی ہوا جس پر امریکہ، کئی اور ممتاز ممالک اور عالمی بنک کے نمائندوں نے بھی دستخط کئے۔ اور اخراجات کی کفالت کا اقرار کیا۔ منصوبے کی تکمیل کے لئے ماہرین اور کاریگروں کی ضرورت بھی لازم ہے۔ یہ کام واپڈا کے سپرد کیا گیا ہے۔ جو ہر قسم کے بیرونی ماہرین اور کاریگروں کی خدمات حاصل کرے گا۔

اس سلسلہ میں ایک بہت بڑا مسئلہ کشمیر کا ہے۔ منصوبے کو عملی جامہ پہنانے اور پانی کے تحفظ کے لئے چناب پر مقبوضہ کشمیر میں بند تعمیر کرنا ضروری ہے۔ صدر پاکستان نے بالکل بجا کہا ہے کہ اب جب کہ پاکستان کے پاس صرف تین دریا رہ گئے ہیں کشمیر کو حاصل کرنے کی ضرورت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ معاہدہ میں ایک خصوصی شق یہ ہے کہ اس سے نہ ہندوستان کا کشمیر پر بالواسطہ یا بلاواسطہ دعویٰ تسلیم کیا جانا لازم آتا ہے نہ یہ کسی طرح قضیۂ کشمیر پر اثر انداز ہوگا۔

معاہدے کے کئی روشن پہلو ہیں۔ متبادل تعمیرات اور لنک نہروں کی تکمیل سے پاکستان کو اتنا پانی مل سکے گا جس سے پانی کی موجودہ قلت ہی دور نہیں ہوگی بلکہ اور نئے نئے علاقوں کو ترقی دینے کے لئے بھی خاصی مقدار میں پانی مہیا کیا جاسکے گا۔ اس معاہدہ سے ہم آبپاشی کے معاملہ میں ہندوستان کے کنٹرول سے پوری طرح آزاد ہوجائیں گے۔ دریاؤں کو آپس میں ملانا یوں بھی پانی کے بہتر اور زیادہ مقدار میں استعمال کے لئے ضروری اور مفید تھا۔ اس طرح پانی کو استعمال کرنے کا ایک مستقل اور معقول ذریعہ ہاتھ آجائے گا۔ مقبوضہ کشمیر میں ہندوستان کا دریائے چناب پر محدود



معاهدہ پر دستخط کرنے سے پہلے، صدر پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، کا ایک اجتماع خاص سے خطاب جس میں امریکہ، کنیڈا، برطانیہ، جرمنی، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے نمائندے بھی شامل تھے



معاہدۂ آب سندھ

(ستمبر ۱۹۶۰ء)



صدر پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان (وسط میں)
شری جواہر لال نہرو، وزیر اعظم ہندوستان (بائیں طرف)
مسٹر ڈبلیو اے۔ بی۔ ایلف، نائب صدر عالمی بنک (دائیں طرف)

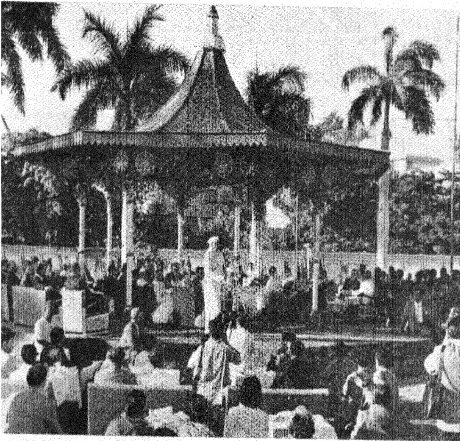


کراچی کے ہوائی اڈے پر سلامی

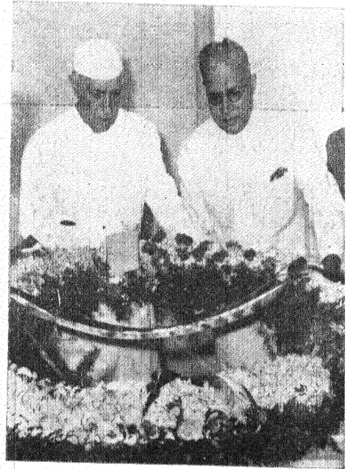


صدر پاکستان کے ساتھ ہوائی اڈے سے شہر میں آمد

شری جواہر لال نہرو کی پاکستان میں آمد



کراچی میں ایک استقبالیہ



مزار قائد اعظم رح پر

کنٹرول ہوگا۔ ایک عام سال میں دونوں ذخیرہ بندوں کا کچھ پانی موجودہ کاموں کے علاوہ ترقیاتی مقاصد اور کلری علاقوں کی بازیافت کے لئے بھی دستیاب ہوسکے گا جنہیں اس کی اشد ضرورت ہے۔ دونوں بندوں کی تعمیر سے سیلابوں کی بہتر روک تھام ہوسکے گی جو آئے دن اس قدر تباہی کا باعث ہوتے ہیں۔ منصوبے کے پہلے مرحلے میں وادیٔ ستلج کی نہروں کو پہلے سے زیادہ پانی مل سکے گا اور دوسرے میں اتنا پانی کہ شاید اس سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔

منگلا بند سے ۳ لاکھ ۰۰ ہزار کلو واٹ بجلی حاصل ہوگی اور تربیلا بند سے اس سے بھی زیادہ، جس سے ملک کو صنعتی و زراعتی ترقی میں بڑی مدد ملے گی۔ پانچ کروڑ ڈالر کے صرف سے جو ٹیوب ویل لگیں گے ان سے کلر زدہ علاقہ دوبارہ قابل کاشت ہوسکے گا۔ دریائے سندھ کے مغربی طاس کے بعض بنجر علاقے چشمہ بیراج سے پانی ملنے پر قابل کاشت بن سکیں گے۔

یہ تو تھے اس تمغے کے ہنر ہی ہنر۔ ان کے برخلاف کچھ عیب بھی ہیں اور بہت واضح۔ اب پاکستان کو صرف تین دریاؤں پر قناعت کرنا ہوگی اور تین مشرقی دریاؤں کے پانی سے دستبردار ہونے پر پانی کی مقدار میں کمی کے باعث کافی نقصان ہوگا۔ پانی مغربی دریاؤں سے بڑے لمبے فاصلوں سے لانا پڑے گا جس سے یہ کافی ضائع ہوجائے گا۔ نہروں کو سیلابوں سے نقصان کا خطرہ بھی رہے گا۔ کیونکہ اتنے وسیع پیمانے پر پانی کا رخ بدلنے سے پانی میں کمی واقع ہوگی۔ جن جن علاقوں سے یہ نہریں گزریں گی ان کے سیم زدہ ہوجانے کا اندیشہ ہے۔ آبی ذخیرے تیار ہوتے ہی خراب بھی ہونے لگ جاتے ہیں۔ دونوں بندوں پر ریت کی تہہ جم جم کر انکی عمر کم کردیتی ہے۔

ایسے پیچیدہ عظیم منصوبے کی تکمیل، جس کی کوئی مثال ہی موجود نہیں، ہمارے ملک کے محدود تکنیکی ماہرین، کاریگروں اور ساز و سامان کے وسائل پر مسلسل ۱۰ سال بڑا ہی شدید بوجھ ڈالے گی۔ اور ہمیں لا محالہ بے شمار بیرونی ٹکنیکل ماہرین، مزدوروں اور کاریگروں کی خدمات بھی حاصل کرنی پڑیں گی۔ تھوڑی ہی مدت میں باہر کا تقریباً دو سو ارب روپیہ قرض و امداد کی صورت میں پاکستان آئے گا جس سے پاکستانی سکے کی قوتِ خرید کم ہوجانے کا احتمال ہے۔ ساتھ ہی عام استعمال کی چیزیں کم ہوجانے کا اندیشہ بھی ہے۔ چیزوں کی مانگ بڑھے گی اور وہ تمام چکر شروع ہوجائیں گے جو افراطِ زر کے ساتھ پیدا ہوا کرتے ہیں۔ اسکے معنے ہوں گے چڑھتی قیمتیں، بڑھتی گرانی اور بڑھتی بے چینی۔ اسی صورتِ حال کی پیش بندی کے لئے حکومت نے اس عبوری دور کے لئے ۲۰ کروڑ ڈالر کی اشیائے صرف درآمد کرنے کا فیصلہ کیا ہے لیکن ظاہر ہے صرف اس ہی طرح یہ مشکل حل نہیں ہوسکے گی۔ اس میں تمام قوم کی مشترکہ سعی و کوشش کی ضرورت ہے۔

یہ معاہدہ کچھ دینے کچھ لینے کے اصول پر سمجھوتہ ہے۔ جن حالات سے دونوں ملک دوچار تھے، ان کے پیش نظر اتنا ہی ممکن بھی تھا۔ اس عقدۂ دشوار کو حل کرنے کی کوئی صورت ہی نہ تھی۔ اگر یہ سلسلۂ حالات جاری رہتا تو پاکستان پانی سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوجاتا۔ معاہدہ کے مطابق ہماری نہروں میں مغربی و مشرقی دریاؤں سے پانی کی بہم رسانی کی موجودہ مقدار برقرار رہے گی۔ یہ بہت بڑی کامیابی نہ سہی مگر اتنا تو ہے کہ اب ہم حالات اور روز افزوں ضرورتوں کو دیکھتے ہوئے اپنے نظام آبپاشی کو اور بہتر بنانے کی کوشش کرسکیں گے۔ معاہدہ نے ایک بڑا ہی وسیع اور پیچیدہ مسئلہ حل کردیا ہے۔ جس پر لاکھوں انسانوں کی زندگی اور معیشت کا دارومدار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں ملکوں کی اقتصادی بہبود اور باہمی خوشگوار تعلقات کے لئے اس دیرینہ مسئلے کا حل تلاش کرنا لازمی ہوگیا تھا جو بارہ سال سے مسلسل ہمارے اعصاب پر سوار تھا۔ جیسا کہ صدر پاکستان نے ارشاد فرمایا ہے یہ کوئی مثالی حل تو نہیں۔ اور ایسے حل، سچ پوچھئے تو دستیاب بھی کہاں ہوتے ہیں؟ لیکن حالات کے تحت اس سے بہتر حل ممکن ہی نہ تھا۔ کیونکہ بیشتر حالات ہمارے خلاف تھے۔ لہٰذا یہ بات ہمارے لئے یقیناً بڑی دلجمعی کا باعث ہے کہ ایک بڑی ناگوار صورتِ حال سے مفر پیدا ہوگیا ہے۔

اب جب کہ دونوں ملکوں میں سمجھوتہ ہوگیا ہے دیگر امور میں بھی زیادہ خوشگوار تعلقات کی بنیاد پڑ گئی ہے۔ اس طرح تعاون کی جو روح پیدا ہوگئی ہے وہ دونوں کے نزاعی مسئلوں کو نبٹانے میں ممد و معاون ثابت ہوگی اور ایک نئے خوشگوار دور کا آغاز ہوسکے گا ٭

ایک خاتون پیکر تراش ۔ مس نویرہ احمد

رفعت جاوید

تو کہے بت خانۂ آذر کھلا ——— پچھلے دنوں کچھ یہی کیفیت ڈھاکہ کی ایک نمائشِ فن میں دکھائی دی جس میں مشرقی پاکستان کی ایک پیکر تراش مس نویرہ احمد کے کوئی پچھتر چیدہ فن پارے پیش کئے گئے اور اس طرح ایک ایسا فنی مظاہرہ ہوا جو صرف فنونِ لطیفہ کی تاریخ ہی میں نہیں بلکہ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں بھی یادگار رہے گا۔

اور یہ "دورِ انقلاب" کے سلسلۂ واقعات کی بھی ایک اہم کڑی ہے۔ ایک اور سنگ میل جو ہمیں بہت کچھ دعوتِ فکر دیتا ہے۔ ہمارا ذہن قدرتی طور پر سوچنے لگ جاتا ہے۔ ہم سوچتے ہیں آج ہم نے اپنی سرزمین کا ایک مدتوں کا کھویا ہوا فن پھر پا لیا ہے۔ جس نے ہمارے یہاں ہزارہا سال پہلے اس قدر ترقی کی تھی کہ "گندھارا آرٹ" صدیاں گذر جانے کے باوجود اتنا ہی شہرۂ آفاق ہے جتنا یونان کا مایۂ ناز فن پیکر تراشی۔ دونوں کی وضع منفرد ہے، دونوں اپنے اپنے انداز میں یکتا خیال کئے جاتے ہیں۔ کسے معلوم تھا کہ صدہا سال کے بعد اس فن کی روح پھر جاگ اٹھے گی۔ پیکر تراشی کا شاندار فن پھر اس خطۂ پاک میں ابھرے گا اور ایک نئے، خالصاً جدید پیرایہ میں، جو فن کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ تصور کیا جائے گا۔ اس لحاظ سے تاریخ نے یقیناً اپنے آپ کو دہرایا ہے۔ مگر ایسے کہ فن کا سلسلہ کچھ اور آگے بڑھا ہے۔ مشرق مغرب، قدیم جدید کی روحیں نئے رنگ سے آمیز ہوئی ہیں جس کا نتیجہ اس نوعمر مگر فنی حیثیت سے پختہ کار خاتون کے فنی شہ پارے ہیں۔

ہمیں قدرتی طور پر یہ بھی خیال آتا ہے: کیا یہ کہیں "دورِ انقلاب" ہی کا کرشمہ تو نہیں؟ یہ زندگی، ہلچل، آزادی، بیداری، ذوق و شوق، ہنر و فن کی قدر دانی، اربابِ ہنر کی حوصلہ افزائی۔ یہ سب اگر براہِ راست تخلیق کے محرک نہیں تو تخلیقی جوہروں کو ابھرنے، نشو و نما پانے کا موقع تو ضرور مہیا کرتے ہیں۔ کام کا آغاز بے شک بہت پہلے ہو چکا تھا لیکن یہ درجۂ کمال تک پہنچ کر منظرِ عام پر ابھی آیا ہے۔ اور اس کی قدر دانی بھی اب ہی کی گئی ہے۔ کیونکہ مشرقی پاکستان کے گورنر، جنرل اعظم خاں نے، مس نویرہ احمد کے تراشیدہ پیکروں کی نمائش کا افتتاح سینٹرل پبلک لائبریری ڈھاکہ میں کرتے ہوئے فن کار کو دس ہزار روپے کا انعام دیا اور مرکزی حکومت نے بھی اس جوہرِ قابل کی بحالیٔ صحت کے لئے تین ہزار روپے سے زائد رقم ارزانی کی۔ یہ نمائش دس دن جاری رہی۔ اور اب مغربی پاکستان میں بھی ایک ایسی ہی نمائش کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ جو پھر اپنی نوعیت کی اولیں نمائش ہو گی۔

جیسا کہ پیچھے بیان کیا گیا ہے، نویرہ نے ایک سوئے ہوئے فن کو پھر سے جگایا ہے لیکن نئے انداز میں۔ وہ کئی دوسرے پیکر تراشوں کے ساتھ بجا طور پر کہہ سکتی ہے: اک نئے دور کے فن کار رہے ہیں ہم۔ کیونکہ اس نے اپنے فن کے متعلق تمام ذریعوں، روایتوں، طریقوں سے جو کچھ حاصل ہو سکتا تھا، حاصل کیا ہے۔ زندگی بھر کی مسلسل تلاش، تحقیق، تجربہ، مشاہدہ، سب سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اور اسے اپنے فن میں سمو دیا ہے۔ اس کی بدولت اپنے فن کو ایک مخصوص وضع عطا کی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر اپنے گرد و پیش سے اثر ہی نہیں لیا بلکہ اپنے فن کو اس ہی سے ابھارا بھی ہے، اس کے سانچے میں ڈھال کر دیکھا ہے۔ اس طرح کہ وہ گھل مل کر ایک ہو جائیں۔ اس کے فن پارے محض فن پارے ہی نہیں ۔۔ اردگرد کی دنیا سے جدا۔ بلکہ اس ہی کا حصہ ہیں۔ جیسے وہ بالکل قدرت یا زندگی کے سینے ہی سے ابھرے ہوں۔ اور ان کے ساتھ اس طرح میل کھاتے ہیں کہ ان سے قطعاً جدا معلوم نہیں ہوتے۔ ہم انہیں دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ قدرت یا زندگی کی حدیں کہاں ختم ہو گئیں اور فن کی حد کہاں سے شروع ہوئی۔ وہ تو بس ایک ساتھ موجود ہیں۔ ایک جان دو قالب۔ جیسے فن پارے حیات و ماحول کے ہی برگ و بار ہوں۔

یہ بات یونہی نہیں پیدا ہو گئی۔ یہ تو فن کار کے من کی دھرتی سے ویسے ہی ابھری ہے جیسے بیج سے پودا۔ دیکھئے، نویرہ اس بارے میں

کہتی ہے :

"ہم پیکر تراشوں کو تو یہ کرنا چاہیے کہ شہروں، ہسپتالوں،
مکانوں، کارخانوں کے خاکے تیار کرنے میں حصہ لیں۔ بلکہ
جہاں کہیں لوگ رہتے سہتے یا کام کاج کرتے ہیں وہاں
جو بھی جگہ ملے، اس کو آراستہ کریں۔"

یہ محض بات ہی نہیں۔ یونہی بے دھیانی میں کہی ہوئی یہ بڑی پتے کی بات ہے اور بہت دور جاتی ہے۔ فن کار کا مدعا یہ ہے کہ ان فن پاروں کو محض فن پارے مت سمجھو۔ میکانکی جمالیاتی پیکرانِ خیالی۔ جو خلوت کدۂ دل سے اُبھر ہوں یا گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر سوچے اور الگ تھلگ بیٹھ کر تراشے گئے ہوں۔ نہیں، ان کی حیثیت مختلف ہے۔ یہ جاندار ہیں۔ نباتیاتی، حیاتیاتی۔ یہ بنائے نہیں گئے، بن گئے ہیں۔ دل کی کسی سرسری اوپری لہر میں بہہ کر نہیں بلکہ ایک چیز دور دروں میں ڈوب کر ابھارے گئے ہیں۔ یہ من میں ڈوب کے خودی کا سراغ پالینے ہی سے بنے ہیں۔ ساری دنیا پر آنکھیں کھول کر، اس میں گھوم پھر کر، چھان بین کر کے، ڈھونڈ ڈھانڈ کر۔ فن کار کو محض پیکر تراش ہی نہیں ہونا چاہیے بلکہ جیتا جاگتا انسان ہونا چاہیے۔ ایک معمار، جو ایک طرف معاشرہ میں حصہ لے اور دوسری طرف شہروں اور آبادیوں کو موزوں و مناسب پیکروں سے آراستہ کرے۔ بالفاظ دیگر انفس اور آفاق دونوں اس کی سرگرمیوں کا مرکز و محور ہیں۔ خلوت بھی اور جلوت بھی، جماعت بھی اور ماحول بھی۔ یہی وجہ ہے کہ نویرہ — اس صنمِ صنم تراش —— جو خود بھی زندہ ہے اور اس کے صنم بھی جیتے جاگتے ہیں۔ کے پیکر جہاں بھی رکھ دیے گئے ہیں، اپنے ماحول سے بیگانے یا کٹے کٹے محسوس نہیں ہوتے۔ وہ بالکل ایسے ہی لگتے ہیں جیسے پھولوں میں تتلیاں۔

دوسرے یہ بڑے بڑے شہر آباد کرنے، ان کو آراستہ کرنے، نوآبادیاں تعمیر کرنے، ان کو سجانے کا جذبہ بھی تو یونہی نہیں پیدا ہو گیا۔ اس کی تہہ میں "دورِ انقلاب" کا حیات افروز اثر اور کورنگی، محمد نگر جیسی بستیاں بسانے کی حقیقی مثالیں کارفرما نہیں تو اور کیا ہے؟

ایک مغربی ناظر نے نویرہ کے تراشے ہوئے پیکر دیکھ کر کہا تھا، اور بہت بجا کہا تھا، کہ اس کے فن پاروں کی سب سے اہم خصوصیت ہے: ان کی "عضوی نوعیت"۔ اس پر غور کیا جائے تو کتنے ہی پہلو نکلتے ہیں۔ یعنی جہاں تک اس کے ممتاز فن پاروں کا تعلق ہے فن کار کا اپنے اردگرد کی جیتی جاگتی دنیا سے ربط ہے۔ اور وہ بعض اوقات ان سے فیضان حاصل کرتی ہے۔ مثلاً وہ پیکر لیجئے: "ایک گائے، دو آدمی"۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ کوئی پیکر نہیں عمارت کھڑی ہے۔ یہ کھلی فضا کے لئے بنایا گیا ہے۔ ڈھاکہ کے ایک صنعت کار کے گھر کے بیرونی حصہ کے لئے۔ اور یہ اس فضا کے ساتھ ایسا گھل مل گیا ہے کہ اس کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ نویرہ جب بھی کوئی پیکر بناتی ہے، اس کے اردگرد کی ساری فضا، سارا نقشہ بھانپ لیتی ہے۔ اور پھر جیسے کوئی معمار ہوا، روشنی، سایہ کا لحاظ کرتے ہوئے عمارت کا نقشہ تیار کرتا ہے، اس طرح نویرہ پیکر بناتی ہے۔ اس میں مناسب جگہوں پر دھوپ چھاؤں کے لئے سوراخ یا خلا رکھتی ہے اور پیکر بالکل ایسا لگتا ہے جیسے خشکی پر گھونگھے ہی گھونگھے یا اسفنج اُگ رہے ہوں۔ "اُگنے" کا لفظ ان پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ اور جس طرح گھونگھے اور اسفنج سمندر کی تہہ کا لازمی جزو ہوتے ہیں، اسی طرح یہ پیکر بھی فضا کے جگر گوشے معلوم ہوتے ہیں۔ اگر فطرت کل ہے تو وہ جزو ہیں۔ اور جزو و کل میں پورا پورا ربط و ضبط ہے۔

ایسے فن پاروں پر عمارات کا گمان نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا؟ ان میں پیکر تراشی اور عمارت سازی کے فن ایک دوسرے سے گھل مل رہے۔ وہ اس لئے نہیں بنائے گئے کہ انہیں اٹھا کر گھروں کی چاردیواری میں رکھ دیا جائے یا وہ کسی ڈرائنگ روم، نمائش یا عجائب گھر کی زینت بن جائیں۔ محض پتلے ہی پتلے! وہ جاندار ہیں، نمو پذیر ہیں۔ وہ تو جبھی اچھے لگتے ہیں کہ انہیں کھلی جگہ، باغوں یا تفریح گاہوں میں رکھا جائے۔"

یہ سنتے ہی آپ کا ذہن کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ موئن جو ڈرو کی طرف جسے بنانے والوں نے کچھ ایسے ہی احساس سے سرشار ہو کر بنایا تھا۔ تاریخ کے سبھی بڑے بڑے دوروں میں یہی ہوتا ہے۔ یہ پیکر کوئی کھلونے نہیں ہوں گے۔ ان کے تصور اور تکنیک میں بہت پھیلاؤ ہے۔ ان سے ذہن ایک ہی جگہ پر مرکوز نہیں ہو جاتا بلکہ پھیل جاتا ہے۔ اور بڑے بڑے شہروں، خیابانوں، سیرگاہوں کا تصور کرتا ہے۔ جیسے کسی کیمرے کے سوراخ میں سے باہر کی ایک دنیا یکدم کھنچ کر چلی آتی ہے۔ موجودہ زندگی اور دنیا کی پہنائی نے فن کاروں کے ذہن میں بھی بے حد پھیلاؤ پیدا کر دیا ہے۔ چنانچہ پیکر تراشی جیسا جامد، پابگل فن بھی اپنے اندر ایک نئی وسعت محسوس کرتا ہے۔ اور اس میں ایک عالمگیر شان پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ آفاقیت کا احساس ایک نئی بات ہے۔ نویرہ اس احساس کی ایک

بہت بڑی پیشرو ہے۔ یہ خوبی اس کے فن میں یونہی نہیں پیدا ہوگئی۔ اسکی اپنے فن سے لگن اسے دور دور لے گئی۔ اس کی زندگی فن کے لئے گھومنے پھرنے کی زندگی رہی ہے اور اس کا نتیجہ "باطنی دید"۔ شروع ہی سے نویرہ اپنی طبیعت کے اشارہ پر کام کرنے کی خواہاں رہی ہے۔ اس نے ایک پیکر تراش بننے کی ٹھان لی۔ چٹ گاؤں کا ایک متوسط کھاتا پیتا گھرانہ۔ نویرہ اسی میں پیدا ہوئی۔ اسے بچپن ہی سے بڑے خوبصورت پیکر تراشنے کا شوق تھا۔ بڑوں کو یہ صنم تراشی پسند نہ تھی۔ وہ ڈھاکہ کے آرٹ اسکول میں داخل ہوکر رہی۔ پھر باہر جانے کی ٹھان لی۔ اور ۱۹۵۰ء میں یورپ چلی گئی اور لندن پہنچتے ہی "بیام سکول آف آرٹس" میں داخلہ لے لیا۔ لندن میں اس نے ڈاکٹر کارل موگل اور مشہور پیکر تراش جیکب ایپسٹین سے فن کے رموز سیکھے اور پیکر تراشی میں "نیشنل ڈپلوما ان ڈیزائن" حاصل کیا۔ لندن سے پیرس، اٹلی وغیرہ چند ہی قدم تھے۔ چنانچہ اس نے اپنا بہت سا وقت انہی مقامات میں گزارا۔

ڈھاکہ واپس آکر اس نے لگاتار مشق شروع کر دی۔ اسی دوران میں وہ چوبیں پیکر تراشی سیکھنے رنگون بھی گئی۔ اور کچھ نئے تصورات لے کر آئی۔ یہ گوناگوں مشاہدہ و تجربہ صرف اس لئے تھا کہ وہ اپنی "نظر" پیدا کرے۔ اور اسے فن کے ذریعہ دوسروں تک پہنچائے۔

اس کے فن پاروں کی نمائش جسے اس نے "INNER GAZE" کا نام دیا ہے۔ اور جو "نظر" ہی کے مترادف ہے، اسی عرفان کو فنی سانچے میں ڈھالنے کا نتیجہ ہے۔ اس نے شہرت کا آسان اور سستا طریقہ پسند نہیں کیا۔ بلکہ گہری تلاش، مشاہدہ اور تجربہ کا کٹھن راستہ اختیار کیا۔ اور آخر کار کامیاب ثابت ہوئی۔ اس کے فن پارے اسی نظر کے آئینہ دار ہیں۔ اسی لئے یہ فن پارے زیادہ وقیع اور پائیدار بھی ہیں۔

نمائش میں نویرہ نے اپنی آٹھ سالہ سرگرمیوں کا حاصل پیکروں کی شکل میں پیش کیا۔ اس کی نظر ہمیشہ اپنے گرد و پیش کی زندگی پر مرکوز رہی ہے۔ شہر ہوں یا دیہات یا قدرت کی کھلی فضا۔ اس نے ہر کہیں لوگوں کے رہن سہن، دکھ درد اور قدرت کی دھوپ چھاؤں، سب کو بغور دیکھا ہے۔ اور ان سے اپنے خیالات کی دنیا تعمیر کرنے، اپنے تصورات کے پیکر تراشنے کی کوشش کی ہے۔

نویرہ جانتی ہے کہ نظر ہی سب کچھ نہیں۔ "نظر" کو پیش کرنے کی مہم بھی خاص کٹھن ہے۔ چنانچہ وہ فن کے اس پہلو پر بھی برابر توجہ دیتی

(باقی صفحہ ۱۰۱ پر)

تاروں پہ کمند

سلمیٰ تصدق حسین

اے وطن، میرے وطن اے میرے خوابوں کے جہاں
اپنی الفت کا ملیگا ہر کہیں تجھ کو نشاں

تیری طاقت میں ہے پوشیدہ ہماری زندگی
تیرا استحکام بخشے گا ہمیں پائندگی

اپنا مقصد ہے پرستاری تری شام و سحر
خونِ دل سے سینچ دیں باغِ وطن کا ہر شجر

منجمد خوں قوم کا پھر ہوگیا سرگرمِ کار
اے خوشا یہ جاں فزا تبدیلیٔ لیل و نہار!

تیرے میدانوں پہ صحراؤں پہ چھائی چاندنی
تیرے شہروں اور شہراہوں میں آئی زندگی

ہوگئے ہیں اہلِ پاکستاں جہاں میں سربلند
بےگماں وہ ایک دن تاروں پہ ڈالیں گے کمند!

تازہ افق تازہ سحر

ناہید نوا

سورج کی زرّیں کماں سے
تیر ہزاروں لانبے لانبے
پَن لچکیلے، پَو چمکیلے
چاروں جانب چھوٹ پڑے ہیں
تیر بھٹکتے جہاں بھی جائیں
غول کے غول ہیں آگے آگے
جگمگ کرتے تیر سُنہرے
پر پھیلاتے بڑھتے جائیں
اِدھر اڑان اور اُدھر رسائی
سامنے سیسے کی قدغن ہے
ٹوپ پہ ٹوپ گھٹائیں چھائی
دیو سیہ پیکر دیوانے
تیر پہ تیر آئے بڑھ بڑھ کر
خیمے خیمے آگیں آگیں
تیرہ و تار گھٹائیں چمکیں
پل پل روپ پہ روپ اُجاگر
ہنستی دھرتی ہنستا امبر
ہنستی دھوپ اور ہنستے بن بن
تازہ سفر اور تازہ حضر ہے

اندھیارے کے کوہِ گراں سے
تیر کہاں، بھالے ہی بھالے
پتلے پتلے تیز نکیلے
جیسے اُجالے ٹوٹ پڑے ہیں
اوپر نیچے آگ لگائیں
دل بادل جیسے جھڑ لاگے
نیل گگن پر جوت کے لہرے
ہر ہر ڈھال میں گڑتے جائیں
کیا اونچان اور کیا اترائی
اندھیاروں کا کجلی بن ہے
موج پہ چڑھتی موج دُھنوؤں کی
کالے کالے خیمے تانے
پھیلاتے اک آگ برابر
شعلے کریں آکاش سے باتیں
کالی گھٹائیں لَو دے اُٹھیں
دم دم دھوپ پہ دھوپ اجاگر
ہنستے صحرا ہنستے ساگر
ہنستے روپ اور ہنستا جیون
تازہ جہاں اور تازہ نظر ہے

ایک فصیلِ بے پایاں سے
لال بھبوکا بان اگن کے
لال گُلال اور پیلے پیلے
لاوے کنڈ سے پھوٹ پڑے ہیں
چاروں جانب جوت جگائیں
تیر اُن میں یا اُجلے دھاگے؟
چر کے جن کے گہرے گہرے
پربت پربت چڑھتے جائیں
پردے باندھ کے تیز چڑھائی
گھور سیاہی کی چلمن ہے
پیچ پہ پیچ جٹائیں پھیلی
کجلے جن کے تانے بانے
ہر سایہ ہوا نور کا پیکر
لاکھ بجھائیں اور بھی بھڑکیں
ٹوپ بنے فانوس بلوریں
چھن چھن روپ انوپ اجاگر
ہنستے ذرّے ہنستے جوہر
ہنستے سروپ اور ہنستے آنگن
تازہ افق ہے تازہ سحر ہے

طنز و مزاح:

طلسم دورِ فلک نے دکھائے ہیں کیا کیا!

اے۔ ڈی اظہر

رازِ محرمانہ!

جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا، یہی تو ہے رازِ محرمانہ
جو اسکے پھر ہتھکنڈے چلائیگا اس کا لائیگا پھر زمانہ
یہ اسکی توبہ عبید زاکاں کی گربہ سے مختلف نہیں ہے
وہی ہے انداز اسکے گننے کا اپنی تسبیح دانہ دانہ
ہر ایک سے آشنا ہے لیکن جدا جدا راہ و رسم اسکی
کسی کا راکب، کسی کا مرکب، کسی کو عبرت کا تازیانہ
نہیں جو وہ شاملِ تماشا تو اس میں کوئی عجب نہیں ہے
کہ پتلیوں کے نچانے والے یہ فعل کرتے ہیں غائبانہ
نئے شگوفے کے خبط میں نیند بھی حرام اسکی ہو گئی ہے
ہر اک کو معلوم ہو گیا ہے کہ اسکی چالیں تھیں شاطرانہ
کوئی نہیں اسکی مانتا ہے، یہ بات وہ خوب جانتا ہے
کہ راز اسکا عیاں ہے سب پر کرے تو اب کیا کرے بہانہ
وہ سوچ میں روز و شب ہے اسکی کہ اب نیا گل ہیں کیا کھلاؤں
کہ آشنا ہو چکا ہے اب تو مرے خم و پیچ سے زمانہ
زمین اسکی، مکان اسکے، بڑے بڑے آستان اسکے
ہریان دکھاووں کے بل پہ اب بھی نمائشیں اسکی خسروانہ (۱۲ مارچ ۵۰ء)

جہانِ این و آں:

ہیں فعل وزیروں کے جو سب مصلحت آموز
افسر کا رویّہ ہے یہاں اور وہاں اور
عہدے کے لئے رنگ بدلتا ہے ہزاروں
ہر رنگ میں اس کا ہے عیاں اور نہاں اور
آتے ہیں خوشامد کے بھی ڈھنگ اس کو نرالے
جتنا ہے وہ نااہل بڑھے گا وہ یہاں اور
اُس دل کی ہوس سرحدِ تسکیں سے پرے ہے
جس کی ہوئی دن رات صدا "اور بھی ہاں اور"
ہر بات پہ میری وہ خفا ہونے لگے ہیں
اس عمر میں لاؤں گا کہاں سے میں زباں اور
تھا دل میں کہ تعمیر میں ہے حصہ مرا بھی
وہ کہتے ہیں ورثے میں ملا ہم کو جہاں اور
آزاد ہیں، فریاد کی اب داد کہاں ہے
آزاد کو یہ خوب ملا سازِ فغاں اور
القصہ اگرچہ وہ یہیں رہتے ہیں دونوں
افسر کا جہاں اور ہے اظہر کا جہاں اور (۱۵ مارچ ۵۰ء)

یادِ ماضی!

خود تو دنیا میں چل سکے نہ کبھی	اب ہیں اس سوچ میں کہ نام چلے
ان کا برہم ہے اب نظام تو کیا	چند دن تو انہی کے نام چلے

زورِ بازو:

یوں تن اکڑ کے ہانک رہے ہیں وہ لیگ کو
گویا وہ چل رہی ہو بس اک اُن کے زور سے
جیسے کہ سائیکل سے کوئی چین اُتار کر
پیدل چلا رہا ہو بڑے زور شور سے (۲۲ ستمبر ۵۸ء)

"یاد آتے ہیں!"

مجھے جب وہ سیاست باز رہبر یاد آتے ہیں
تو جھٹ یورپ کے نوسرباز دلبر یاد آتے ہیں
کراچی سے اٹھا دارالخلافہ ہمنشیں لیکن
مجھے اب تک وہاں کے سارے منظر یاد آتے ہیں

تعارف:

ناطق مکرانی

عبدالصمد سربازی

مرزا غالب کا ہمعصر، ان کا دوست اور فارسی میں ان کا ہم شعار، جس کی یاد دونوں کے متعدد خطوط سے تازہ ہے۔ اس کی شخصیت کس کے لئے دلچسپی کا باعث نہیں ہوگی؟ اس کی زندگی اور کلام کا مطالعہ ــــ

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

دیار پاک کے ہر علاقے نے اس کے ثقافتی ورثہ کو فروغ دینے میں کچھ نہ کچھ حصہ لیا ہے۔ مکران کا پہاڑی ریگستانی ساحلی علاقہ جو پاکستان اور ایران دونوں میں شامل ہے علم و فن کی شاہراہوں سے دور ہٹا ہوا اور وادیٔ مہران کے تہذیبی مرکزوں۔ ٹھٹھہ، حیدرآباد، سیوہن ــ سے دور، بادی النظر میں شعر و ادب کے فروغ کے لئے کچھ ایسا موزوں معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن ادب و فن کا جو ذوق ہمارے یہاں ہمیشہ عام رہا ہے۔ وہ اس شورہ زار میں بھی شاعری کے پھول کھلائے بغیر نہ رہ سکا۔ آخر وہ علاقہ جو سسی پنوں کی پیار محبت کی داستان سے متعلق ہو، وہ اس رنگین چیز سے کیسے محروم رہ سکتا تھا۔ یہ وہی علاقہ ہے جہاں سے جواں سال مسلمان سپہ سالار محمد بن قاسم کی فوجوں نے کوچ کیا تھا اور آگے بڑھ کر تمام وادیٔ مہران کو زیر نگیں کر کے سارے علاقے پر اسلام کا پرچم لہرا دیا تھا۔ اس لئے یہ اور بھی ہماری دلچسپی کا باعث بن جاتا ہے۔ یہی خاک تھی۔ سسی کی بے تاب محبت کے باعث رومان ہی رومان اور محمد بن قاسم کی غیر فانی یادوں سے لبریز، جس سے دیار پاک کی دیرینہ ثقافت کا ایک جلیل القدر مظہر اور فارسی کا ایک بڑا خوشنوا شاعر پیدا ہوا۔ وہی جس کے متعلق جہانگیر کے ملک الشعراء طالب آملی جیسے مردِ نکتہ داں نے کہا تھا:

صبا از نکہتِ گلہائے باغ فکرتِ ناطق   بگیر دل تازہ روحِ بلبلِ گلزارِ آمل را

یہ پیکرِ شعر و سخن جس کا "بلبلِ گلزارِ آمل" بھی مشتاق تھا، مکران ہی کا ایک جوہر قابل تھا۔ گل محمد خاں ناطق۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شاہانِ ہند کی فیاضی کا شہرہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اور ایران کے بڑے بڑے نامور شعرا۔ عرفی، نظیری، طالب آملی، مرزا صائب وغیرہم بھی ان مہتم بالشان مسلمان شہنشاہوں کی بے دریغ بخششوں کا حال سن سن کر برِصغیر پاک و ہندوستان میں کھنچے چلے آتے تھے اور اپنے وطنِ مالوف سے رختِ سفر باندھ کر ان کے درباروں میں رسائی حاصل کرنا اپنی تمناؤں کی معراج تصور کرتے تھے۔ اسی لئے صائب جیسے شاعر خوشنوا نے کہا تھا کہ ؎

ہمچو عزمِ سفرِ ہند کہ در دل باشد
رقصِ سودائے تو در ہیچ سرے نیست کہ نیست

چنانچہ اربابِ کمال جوق در جوق ان شہنشاہانِ "سخنور نواز"[لـه] کی بارگاہ میں آتے تھے اور اپنے کمال فن کی بدولت نہ صرف شاہی انعامات سے دامن مراد بھرتے تھے بلکہ گوناگوں اعزاز و اکرام اور جاہ و منصب سے فیضیاب ہوتے تھے۔

انہی شاعرانِ شیریں نوا میں سے ایک ناطق بھی تھا۔ تیرھویں صدی ہجری یعنی سولہویں عیسوی کا بذلہ سنج، لغز گو شاعر جس کا دل بھی "رقصِ سودا" سے بیگانہ نہ رہ سکا۔ بمصداق حافظ شیراز ؎

سخندانی و خوش خوانی نمی ورزند در شیراز
بیا حافظ کہ ما خود را بہ ملکِ دیگر اندازیم

وہ اپنے وطن عزیز، مکران کو چھوڑ کر اسی مرجع خواص و عوام

لـه: "شاہِ سخن سرائے سخنور نواز را ......" غالب

کی طرف روانہ ہوا۔ ذرائع واسبابِ سفر کی کمی کے باوجود دشوار گزار راستوں سے خدا جانے کن مصیبتوں کا سامنا کرتا ہوا پہلے دہلی پہنچا۔ اور پھر لکھنؤ جہاں وہ کئی برس رہا۔ اور اپنے جوہر دکھائے۔

اُن دنوں اودھ میں محمد علی شاہ اور واجد علی شاہ کا دور تھا۔ چنانچہ ناطق نے شاہان اودھ اور دیگر اراکین دولت۔ نواب امین الدولہ، قطب الدولہ، شرف الدولہ، مدبر الدولہ وغیرہم کی تعریف میں قصائد لکھے۔ انہیں اپنے عہد کے شعراء میں امتیاز حاصل تھا۔ چنانچہ تمام اراکین دولت اور اعیانِ سلطنت ان کو مسلم الثبوت استادوں میں شمار کرتے تھے۔ اور ان سے فرمائشی قصائد و قطعات لکھوا کر دادِ سخن دیتے تھے۔ انہیں قصائد کے علاوہ دیگر اصناف شعر پر بھی دسترس تھی۔ اس لئے وہ اپنے کلام میں امیر خسرو جیسے نامور شاعر کا تذکرہ بھی اس بے تکلفی سے کرتے ہیں گویا وہ انہی کے زمرہ میں شامل ہوں ؎

ناطق بیا کہ از نئے کلک تو تنگ تنگ
شکر بہ کام طوطیٔ ہندوستاں کنم

اور یہی کیفیت غالبؔ کی ہے جن کے وہ معاصر بھی تھے اور جیسا کہ ان کے بعض خطوط سے معلوم ہوتا ہے ہمسر بھی مگر بڑے ادب اور پاس و لحاظ سے اپنی سخن شناسی اور ان کی مرتبہ شناسی کا حق ادا کرتے ہوئے۔

یہ وہی صاحب ہیں جنہوں نے غالبؔ کی مثنوی "درد و داغ" کے ایک شعر پر بڑی دلچسپ اور پتے کی بات کہی ہے۔ ایسی کہ خود شاعر نے اسے بڑی خوشی سے قبول کیا اور اس شعر میں مناسب تبدیلی کی۔ ورنہ غالبؔ کہاں اور فارسی کے بارے میں کسی کی رائے کی برداشت کہاں۔ غالبؔ نے اس مثنوی میں ایک دلچسپ کہانی بیان کی ہے کہ کس طرح ایک عورت کی یہ دعا قبول ہوئی کہ وہ پھر سے جوان ہو جائے۔ جوان ہوتے ہی اس کے تیور بدل گئے اور اس نے اپنے شوہر کو دھتکار دیا: مہر حق صحبت و الفت شکست مرگ بر خسارۂ ہمت شکست چنانچہ شوہر نے اس کی بیوفائی سے آزردہ ہو کر بد دعا کی اور وہ سؤرنی بن گئی:

خوک شد و پنجہ زدن ساز کرد
با سرو رُو عربدہ آغاز کرد

اس پہ ناطقؔ نے مرزا غالبؔ کو دوستانہ طور پر ایک پُر لطف خط لکھا جس میں بڑے دردانگیز پیرائے میں اپنے احوال بیان کرنے کے بعد یہ لکھا تھا کہ:

"کاتب لفظے بصورت پنجہ بقلم داد است آیا ایں چہ لفظ است چہ اگر فی نفس الامر پنجہ باشد پس خوک سم دارد نہ پنجہ۔ و اگر مجانست خطی با پنجہ دارد با آنکہ نزد شعراء اطلاق سم و پنجہ بہ محل ہمدیگر جائز الاستعمال است۔ پس اعلام باید فرمود تا پے بہ حقیقت آں بردہ باشم"۔

غالبؔ کی سلیم الطبعی اور حق پرستی کی داد دینا چاہئے کہ انہوں نے اس تبصرہ کی معقولیت محسوس کی اور پہلا مصرع یوں بدل ڈالا۔

خوک شد و بدنفسی ساز کرد

بدقسمتی سے ناطق کا زمانہ برصغیر میں مسلمان سلطنتوں کے انتہائی انحطاط و زوال کا زمانہ تھا۔ مغل فرمانرواؤں کا دور گزر چکا تھا۔ اس لئے نہ قند فارسی کی وہ گرم بازاری رہی تھی نہ اس کے قدرداں باقی تھے۔

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

بنابریں لکھنؤ میں ناطق کی غربت سے زنگ آلود تیغ جوہر دار کی کوئی قدردانی نہ کی گئی۔ جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں۔

تیغ صد گنج بہائیم ولے بے قدریم
کز ہنر در تہ زنگار ربود جوہر ما

جو امیدیں لے کر وہ لکھنؤ کے شاہی دربار میں پہنچے تھے وہ خاک میں مل گئیں۔ کوئی دانۂ امید سرسبز اور پائدار نہ ہوا۔ چنانچہ ان کا یہ قول غالباً اسی ہی کی طرف اشارہ ہے:

صد رہش در گزر خضر نشاندیم ولے
از سیہ بختیٔ ما سبز نشد دانۂ ما

میرزا ناطقؔ نے فارسی میں مختلف لوگوں کے نام کتنے ہی خطوط لکھے ہیں اور ان میں سے بعض میں اپنی بے قدری اور تنگدستی کی شکایت کی ہے۔ میرزا غالبؔ کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

"کما بیش دہ سال میگذرد کہ زمیں گیر ایں دیار میباشم اما طرفہ گیہائے کہ از وضع ایں دیاریاں دیدم ہیچ کافر نبیناد از خواص و عوام ایں مخلوق کمتر کسے بودہ باشد کہ نسبت تعارف اسمی یا جسمی با من درست نکردہ باشد بلکہ از بدایت ورود

تا حال بزعم خود از جرگ اساتذۂ مسلم الثبوتم بعد ابرام از من ربودہ بدستانہا می سرایند۔ و نیز ہیچ نوابے و نائبے دریں سرکار بہ سرکار رسیا مدہ کہ سلسلہ جنبانیٔ ناخن بندی و سپاس وستائشم بہ فضل و کمالے کہ ندارم بحضور بادشاہِ وقت خود نکردہ باشد و لیکن با اینہمہ آشتی کہ در دہلی بہ کاسہ داشتم دارم۔"

کہیں یہ مرزا غالب کو خط لکھتے ہوئے انہی کا مشرب تو اختیار نہیں کیا گیا کیونکہ خطوط میں احباب کو اپنا دکھڑا سنانے کا طریقہ غالب ہی نے اختیار کیا تھا۔ اس خط کے برعکس وہ ایک اور مکتوب میں دہلی اور وہاں کے قدر دانوں کی توصیف فرماتے ہیں:

" دلم از صیاد منشانِ اینجا مانند مرغ آشیاں گم کردہ ماند کہ نہ صبح قرارے دارد نہ بہ شام آرامے۔ وحشیانہ دریں خرابہ بسر می بریم و بکمال بے لطفی میزیم۔ کلاں ترانِ اینجا با اینہمہ تعارف و مجتہا غیر ازیں کہ بہ واہ واہ نوازند و در تیہ اساتذۂ نامداد سنجند بدیعے در عایتے نمی آیند۔ در مسلک سلوک قدمی نمیگذارند۔ دہلی درحق ما صد درجہ رجحان بریں دیار ناپرساں داشت۔ یارانِ قدرشناس با اینہمہ کوتاہ دستی دربارۂ ما ید طولیٰ داشتند و بہ زر قدر دان کالائے کاسدم بودند۔۔۔۔"

مرزا غالب کے "تقاضائے بیہودۂ مے فروش" اور دوسرے قرضخواہوں کے ابرام کو سامنے رکھئے اور ناطق کی ان سطور پر نظر ڈالئے:-

"یک طرف تلاش مایحتاج یومیہ و یک طرف تقاضائے بیہودۂ قرضہ خواہاں خاصہ ابرام گدایانہ صاحبخانہ کہ چند ماہ کرایہ بذمۂ فقیر دارد۔"

پھر غالب کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:-

ہفت سال است کہ با یکدگر آویختہ ایم
من و غاصب چو سرِ رشتۂ شمع و دمِ گاز

آہ از عربدہ پردازیٔ بخت سرکش
داد از خانہ براندازیٔ چرخِ کجباز

اور پھر ناطق کے یہ الفاظ:-

"یازدہ سال میگذرد کہ بفرمائش مربیاں صدہا نظم و نثر پرداختم و بغیر حرماں چیزے دیگر نیندوختم"

صاف ظاہر ہے کہ غالب کی نظم و نثر، خط نویسی کے انداز اور لب و لہجہ کا ناطق پر گہرا اثر ہے۔ اور اُن کے شعر کے شعر اور جملے کے جملے اس یگانۂ روزگار کا پرتو ہیں، یہاں تک کہ مماثلت اس درجہ تک پہنچ جاتی ہے: "دیروز دیگ و چمچہ و آفتابہ کہ باقیماندۂ دولت لکھنؤ بود، آں ہم بفروختن رفتند"۔ یہ ایک الگ موضوع ہے جو دلچسپی سے خالی نہیں اور بسیط مطالعہ کے لائق ہے۔

ناطق نے اپنی ناقدردانی کو بری طرح محسوس کرکے منفی مگر بڑے بدیع پیرایہ میں اس کی شکایت کی ہے:-

ناطق از خجلتِ کم قیمتیٔ خویش بدہر
آب شد بار دگر گوہر یک دانۂ ما

اپنے ناگفتہ بہ حالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

ناطق نشد بجز کفنے حاصلم بدہر
آں ہم بہ مزدِ گورکنی گورکن گرفت

مرزا غالب زیادہ رند مزاج اور زندہ دل تھے، اس لئے انہوں نے اپنی تنگدستی کی داد بڑی خوش طبعی سے یوں دی ہے:-

صرف بہائے مے ہوئے آلاتِ میکشی
تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

ان ناسازگار حالات کے علاوہ اہل و عیال کی جدائی الگ رلاتی رہی اور ساتھ ہی ساتھ یاران وطن کی یاد ستاتی رہی:

گاہ در نالہ ام از دردِ گرفتاریٔ خویش
گاہ در گریہ ام از فرقتِ اطفال و عیال
اے عزیزانِ وطن دست بشوئید از من
کشتۂ ہندم و سبزانِ گلابی پوشش

اس عالم میں وطن عزیز کو یاد کرکے بادِ صبا کے ذریعہ خاکِ مکران کو سلام پہنچاتے ہیں:

صبا از جانب ناطق سلامے خاکِ مکراں را
کہ من چوں غنچۂ دل در گلشنِ ہندوستاں بستم

اور دل کو خوش رکھنے "کو کبھی کبھی اپنی بڑائی سے مکران کا نام بلند کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں":

فردِ مشہور کند نام وطن را ناطق
بایزید ایں ہمہ جا گفتہ کہ بسطامی ہست

اس غریب الوطن کو دوبارہ آب و ہوائے دیار نصیب نہ ہوئی۔ اور نہ عیال و اطفال اور عزیزوں کا دیدار۔ اس غم و الم، ہجر و فراق اور سوز و گداز کی حالت میں داعیٔ اجل کو لبیک کہتے ہوئے ۱۲۹۴ھ میں جان بحق تسلیم کی۔ "ناطق مکرانی گل محمد خاں" تاریخ وفات ہے۔ ان کے شاگرد رشید، جواہر سنگھ جوہر، نے اس سال ان کا جو کچھ کلام دستیاب ہو سکا، اس کو کتاب کی شکل میں ترتیب دے کر اسم تاریخی "جوہر معظم" رکھا۔ یہ مجموعہ نولکشور میں ۱۲۹۷ھ میں طبع ہوا۔ اس طرح شاگرد نے ان کی جملہ اصناف کلام — قصیدہ، غزل، رباعی، مخمس، مسدس، مثنوی وغیرہ — کو تو جمع کر دیا لیکن افسوس ہے ان کے حالاتِ زندگی پر کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ یعنی وہ کب پیدا ہوئے، ان کے والد کون تھے، کس خاندان سے تعلق رکھتے تھے، کس سے اور کہاں علوم کی تحصیل کی، مکران کے کس شہر سے تعلق رکھتے تھے، کیونکہ مکران ایک وسیع علاقہ ہے جس میں سیکڑوں شہر اور بستیاں ہیں۔ اور اب اس کا کچھ حصہ پاکستان میں ہے اور کچھ ایران میں۔ وہاں سے کب ہجرت کر کے ہندوستان آئے، دہلی میں کتنا عرصہ رہے، وہاں سے لکھنؤ کب پہنچے، کتنے سال وہاں رہے اور کس حالت میں رہے، ممکن ہے آئندہ کسی اور جگہ اس کمی کی تلافی ہو سکے۔

ظاہر ہے کہ ہماری دلچسپی زیادہ شاعر کے کلام سے ہے اس نالہ و فریاد کو دیکھتے ہوئے جس کا ذکر اوپر آیا ہے، خیال ہوتا ہے کہ اس شاعر کا سارا کلام اسی سے پُر ہوگا۔ مگر معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ایسے اشعار کہیں کہیں ہی نظر آتے ہیں۔ جیسے غزلوں میں عموماً ہوتا ہے۔ اور پھر اس کا کلام غالب ہی کے فارسی کلام کی ہلکی کشید ہے۔ جیسے وہ دانستہ یا نادانستہ اسی کے رنگ میں بہنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اور اس کا نتیجہ کلامِ غالب منفی غالب ہو — اسی سے ملتی جلتی زبان، طرز، اسلوب، پیرائے۔ یہاں تک کہ بہت سی غزلوں کی زمینیں بھی وہی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ مشابہتیں ملاحظہ کیجئے:۔

غالب : تلخابۂ سرجوشِ گدازِ نفس است ایں
ناطق : یک قطرہ ز زہرابِ گدازِ نفس است ایں
غالب : در کشورِ بیدادِ تو فرمانِ قضا نیست
ناطق : در کشورِ بیدادِ تو سودا برضا نیست
غالب : بر قند نہ بر شہد نشینند مگس ما
ناطق : بر شربت دینار نچسپید مگس ما
غالب : داغم از پردۂ دل رو بہ قفا می آید
ناطق : نگہ از چشم تو ہم رو بہ قفا می آید

دوسری زمینیں : کو برد۔ بسمل افتادہ است۔

ان امور کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہم غالب کی فارسی شاعری کو آسان اور سلیس شکل میں دیکھ رہے ہیں۔ جس سے اس کی عظمت تو پیدا نہیں ہوتی لیکن جھلک ضرور نظر آتی ہے۔ اس بنا پر یہ بھی گمان ہوتا ہے کہ کہیں پریشانی احوال کا ذکر بھی غالب ہی کے رنگ میں رنگے جانے کا نتیجہ نہ ہو۔ اور یہ بڑی حد تک درست بھی معلوم ہوتا ہے۔ چند اور مثالیں اس گمان کو یقین کی حد تک لے جاتی ہیں۔

غالب : فرو کند نفسِ سردِ من جہنم را
ناطق : ز آہِ ما سرد شود گرمیٔ ہنگامۂ حشر

توالیٔ اضافات : حدیث لذتِ لعلِ حلاوت دستگاہِ او

غالب : دمید دانہ و بالید و آشیاں گہ شد
در انتظارِ ہما دام چیدہ ام بنگر
ناطق : گذشت موسم و رفتند ہمرہان و ہنوز
سفینۂ منِ مسکیں بہ ساحل افتادست
غالب : نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے
ناطق : گر چہ بلبل کلبۂ از خار و خس باشد مرا
کشتنی باشم اگر گلشن ہوس باشد مرا
کے میسر می شود مرغانِ باغ خلد را
ایں فراغت ہا کہ در کنج قفس باشد مرا

تیور : ع فارغ از آفتِ ما باش کہ ما خصمِ خودیم
سے : رفتم بسوئے کعبہ ز کوئے بتاں ولے
حسرت دوید از پے و دامانِ من گرفت
سے : تنہا نہ شمع ہر کہ درآید بہ محفلت
روئے تو دید شیوۂ صفت سوختن گرفت

گفتم کہ شد ذوقِ عمت گفت تو بردی
گفتم کہ چہ شد زخمِ دلت گفت عدو برد
کم کن سخن از کوثر و تسنیم کہ نتواں
از دل ہوسِ بادہ بسرچشمہ و جو برد
یاد آنکہ بہ لب خندہ و با چرب زبانی
اُو برد دل از ناطق و ناطق دل از او برد
آبحیوان و ہلاہل اگر آری بہ برم
آں بکام تو فرو ریزم و ایں نوش کنم

اور غمِ ہستی کی ترجمانی میں تو وہ تمام فارسی شاعروں سے زیادہ غالب سے قریب ہے اور خود بھی نمایاں امتیاز رکھتا ہے۔ اس نے اس سلسلے میں خاصے مضامین بھی پیدا کئے ہیں اور اسالیب بھی:

در کفِ خویش پئے کشتنِ خود شمشیرم
پیچ و تابے کہ خورد از غمِ اُو جوہرِ ما
فارغ از آفتِ ما باش کہ با خصمِ خودیم
زآہنِ تیشۂ فرہاد بود خنجرِ ما
تا بکے از سختِ جانی نیم بسمل زیستن
می زنم ایں بار بر تیغے کہ بس باشد مرا
(میں بھی رک رک کے نہ مرتا جو جفا کے بدلے
دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس) غالب
صوتِ بلبل طرب آرد بہ گلستاں چہ روم
بہ کہ در کلبۂ خود نالۂ خود گوش کنم
جرس بنالہ ندانم مقلدِ دل کیست
کہ ناقہ بے خود و لیلیٰ زمحمل افتاد است
غم ز دولتِ بیدادِ دلبراں ناطق
بہ شادیٔ ہمہ عالم مقابل افتاد است

ان تمام اشعار سے یہ دو رُباعیاں زیادہ پُرسوز ہیں اور ناطق کے اندوہناک تجربۂ زندگی کا حاصل:۔

در لبستہ بخانہ اندروں می گریم
تا پے نبرد کسے کہ چوں می گریم
دور از لبِ میگونِ تو مانندِ کباب
می سوزم و بے نالم و خوں می گریم

عمریست کہ تیرِ چرخ را آماجم
بر تارکِ افلاک فلاکت تاجم
یک شمہ زمفلسیٔ خود شرح دہم
چندانکہ خدا غنی است من محتاجم

دوسری رباعی کے مصرعِ ثانی میں پھر غالب ہی کی گونج سنائی دیتی ہے:۔

شاہیم زبانہ افسر، داغ اورنگ

بےکسی کے عوالم میں وہ اپنی یوں تسلی کر لیتا ہے:۔

نیست غم ناطق نباشد گر کسِ من ہیچکس
بےکسی تا ہست کئے پروائے کس باشد مرا

ان امور سے قطعِ نظر ناطق نے بعض بڑے اچھوتے خیالات کی ترجمانی بھی کی ہے:

دار سیدیم بجائے من و ناطق در عشق
کہ بود بلبل و پروانہ نصیحت گرِ ما
صورت چو معنوی ست بنازش نیاز نیست
بت بے کرشمہ دل زکفِ برہمن گرفت
یاد آنکہ گر از دل نگہش تیر برآورد
نشتر برگِ جانِ من آں غمزہ فرو برد

اس لحاظ سے وہ غزل جس کی زمین "میاں بستم۔ فغاں بستم" ہے سب سے نمایاں ہے کیونکہ اس میں ایک جسارت آمیز احساس نے مسلسل جذبہ کی صورت اختیار کر لی ہے۔ یہاں تک کہ ایک شعر میں سلسلہ اقبال کی "مشکل کشی جفا طلبی" تک جا پہنچتا ہے:

نخواہد ہمتم محرومیٔ کس گو بود دشمن
پئے آگاہیٔ رہزن جرس بر کارواں بستم
شبِ وصل است مشب تا نہ انجامد بہ کوتاہی
بخورشیدِ جہاں افروز راہِ کارواں بستم

اور وہ شعر جس سے یہ جرأت آمیز سلسلۂ فکر انتہا تک پہنچ گیا ہے یہ ہے:۔

بشاخِ گل نشیمن ساختن بر بلبل ارزانی
کہ من در چنگلِ شہبازِ خوں ریزہ آشیاں بستم

اس سے ظاہر ہے کہ ناطق کا شمار ان منفرد شعرا میں نہیں جو

باقی صفحہ پر

اُردو یونی ورسٹی

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

یہ ہمارے ملک کی بدنصیبی ہے کہ ابتدا سے جدید تعلیم کا ڈول کچھ ایسا پڑا کہ جو فوائد اس سے مرتب ہو سکتے تھے وہ نہ ہوئے، اور بعض اعتبار سے جو نقصان اس سے پہنچے، ان کی تلافی اب تک نہ ہو سکی غیر زبان کا سیکھنا نہ تو کوئی بری بات ہے، اور نہ کچھ زیادہ مشکل، بلکہ ایک لحاظ سے مستحسن ہے۔ بقول گوئٹے کے کہ جو صرف اپنی ہی زبان جانتا ہے، وہ کوئی زبان نہیں جانتا لیکن جب ہر مضمون اور علم کا سیکھنا کسی ایسی غیر زبان کے ذریعے لازم قرار دیا جائے، جو بالکل اجنبی ہے، تو وہ ایک عذاب ہو جاتا ہے۔ قوائے جسمانی و ذہنی مضمحل ہو جاتے ہیں، اور جدت و جودت مفقود ہو جاتی ہے۔ ایک قوت تو خود زبان سیکھنے کی ہے اور دوسری اس کے ذریعے سے مضمون سمجھنے کی، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ تو زبان پر پوری قدرت حاصل ہوتی ہے اور نہ مضمون پر، اور وقت دُگنا بلکہ کئی گنا زیادہ صرف ہوتا ہے، اور عمر کا سب سے عزیز حصہ اس الجھن میں بے کار جاتا ہے۔ دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا ملک ہوگا جو اس مخمصے میں مبتلا ہو۔

دوسرا بڑا عیب یہ ہے کہ انتہائی تعلیم تک ہر مضمون انگریزی زبان اور انگریزی یا دوسرے یورپی مصنفین کی لکھی ہوئی کتابوں کے ذریعے پڑھنے سے طلبہ کے طرزِ فکر و خیال پر بڑا اثر پڑتا ہے اور غیر محسوس طور پر وہ اسی رنگ میں رنگ جاتے ہیں، نقالی اور تقلید غالب آجاتی ہے۔ اس ذہنی نکبت کی وجہ سے وہ بے لاگ غور و فکر سے قاصر رہتے ہیں۔ اور ان میں اور ان کے ماحول میں مغائرت پیدا ہو جاتی ہے، جو قومی ترقی اور نشو و نما کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ اسی باطنی کیفیت کا اثر ظاہر پر بھی پڑتا ہے۔ خیالات اور جذبات ادا کرنے کے لئے زبان ایسی ضروری ہے جیسے انسانی زندگی کے لئے آکسیجن۔ زبان کے ہر ہر لفظ اور جملے میں قومی روایات، تہذیب و تمدن کے شعار اور ذہنی، روحانی تجربے پیوست ہوتے ہیں۔ قوم کی ذہنیت میں اور اس کی زبان میں ایک خاص تعلق ہوتا ہے۔ یہ تعلق غیر زبان سے پیدا نہیں ہوتا۔ ہماری جدید تعلیم نے ہمیں اس سے بہت کچھ محروم کر دیا ہے۔ انگریزی طرزِ بیان اور طرزِ خیال اور انگریزی لفظوں اور جملوں کی ساخت اور ترکیب ہمارے تعلیم یافتہ گروہ کے دل و دماغ میں ایسی رچ جاتی ہے، کہ جب وہ کسی خیال کو ادا کرتے ہیں تو وہ ہماری زبان اور زبان والوں کے لئے اجنبی ہوتا ہے۔ اس سے لطف حاصل کرنا تو درکنار بعض وقت اس کا سمجھنا بھی دشوار ہے اور حسنِ بیان جو ادب کی جان ہے، پیدا نہیں ہوتے پاتا کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ایک صدی کی تعلیم کے بعد بھی ہم اس قابل نہیں ہوئے کہ ان علوم اور فنون کو جو ہم نے انگریزی زبان کے ذریعے حاصل کئے۔ اس ڈھنگ سے اپنی زبان میں منتقل کر سکیں کہ اہلِ ملک ان سے مستفید ہو سکیں۔

یہ علم گونگے کا گڑ ہو گیا ہے۔ تعلیم سے جو یہ منشا تھا کہ اس سے علم کی روشنی ملک میں پھیلے گی اور جو لوگ یونی ورسٹیوں اور کالجوں سے پڑھ پڑھ کر نکلیں گے، وہ اپنی معلومات سے اہلِ وطن کو نہال کر دیں گے، پورا نہیں ہوا۔ ایک ایسے ملک کے لئے جو علم میں پسماندہ بھی ہے اور مفلس بھی ایک اجنبی زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دینا نہایت مضرت رساں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم کی رفتار بہت سست ہے، سالہا سال کی تعلیم کے بعد بھی اب تک پورے ایک فی صدی اشخاص بھی یونی ورسٹیوں کی تعلیم سے بہرہ مند نہیں ہوئے۔ اگر یہ تعلیم اپنی زبان کے ذریعے سے دی جاتی، اور اس میں علوم و فنون کی کتابیں تالیف و ترجمہ کی جاتیں تو دوسرے فوائد کے سوا اُن آزاد مدارس کو بھی بہت کچھ فائدہ پہنچتا جو سررشتہ تعلیم کے قواعد یا کسی یونی ورسٹی کے نصاب کے پابند نہیں۔ ان میں سے بہت سی کتابیں ان کے نصاب تعلیم میں داخل ہو جاتیں اور وہ بغیر کثیر مصارف کے جو یونی ورسٹیوں کی تعلیم میں برداشت کرنے پڑتے ہیں، متمتع ہوتے۔ علاوہ اس کے وہ اشخاص جو بہ وجہ عدم استطاعت یا دوسری مجبوریوں سے اعلا تعلیم حاصل نہ کر سکے ان علمی کتابوں کو اپنی زبان میں پڑھ کر بہت کچھ فائدہ حاصل کرتے۔ اہلِ ملک کو ان فوائد سے اس لئے محروم رہنا پڑا کہ تعلیم غیر اور اجنبی زبان میں

دی جاتی ہے۔ اردو کو اعلا درجوں میں ذریعۂ تعلیم بنانے یعنی اردو یونی ورسٹی کا خیال سب سے پہلے ہماری قوم کے عالی دماغ مصلح سر سید احمد کو ہوا، جبکہ انہوں نے ۱۸۶۷ء میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی طرف سے جس کے وہ بانی اور آنریری لائف سکریٹری تھے، اس بارے میں ایک عرض داشت گورنمنٹ آف انڈیا میں پیش کی۔ اس عرض داشت میں سر سید نے اس تجویز کی ضرورت اور اہمیت کو صاف اور سادہ زبان میں نہایت مدلل طور پر بیان کیا ہے، اور اس امر پر خاص طور پر زور دیا ہے کہ جب تک جدید علوم ہمیں ہماری زبان میں نہ پڑھائے جائیں گے ہماری تعلیم ناقص، ناکافی اور غیر موثر رہے گی۔ یہ عرض داشت ایسوسی ایشن کے ممبروں کے دستخط سے جس میں ہندو مسلمان سب شریک تھے، ہز ایکسی لنسی وائسرائے و گورنر جنرل آف انڈیا ان کونسل کی خدمت میں پیش کی گئی اور اس بارے میں گورنمنٹ آف انڈیا سے مراسلت بھی ہوتی رہی۔ وزیر ہند نے بھی اس خیال کو پسند کیا۔ اخبارات میں بھی کچھ دنوں تک اس پر بحث رہی لیکن افسوس ہے کہ اس وقت حالات کچھ ایسے تھے کہ یہ اہم تجویز جس میں ہندوستان اور خاص کر مسلمانانِ ہند کی علمی اور تہذیبی ترقی کے شاندار اور وقیع امکانات مضمر تھے عمل میں نہ آسکی۔ اس وقت اس پرانی بحث کا چھیڑنا لاحاصل ہے کہ اردو میں یہ صلاحیت ہے یا نہیں کہ وہ اعلا تعلیم کا ذریعہ ہوسکے، جب کہ اس نے سوا سو برس قبل بھی اپنی اس صلاحیت کا حیرت انگیز ثبوت دیا تھا۔ پرنسپل کارگل اپنی سالانہ رپورٹ دہلی کالج بابت ۱۸۵۲ء میں لکھتے ہیں کہ:

"مشرقی شعبے کے طالب علم اپنے مغربی شعبے والے حریف سے سائنس میں کہیں بڑھے ہوئے ہیں"...

آگے چل کر پرنسپل موصوف اسی رپورٹ میں تحریر فرماتے ہیں:-

"حال ہی میں اس کالج کا معائنہ کرنے کئی اصحاب تشریف لائے جن میں نہایت ذہین اور طباع افسرانِ فوج، مشنری اور تعلیمی مسائل کا عملی تجربہ رکھنے والے اصحاب تھے۔ انہوں نے مشرقی شعبے کے طلبہ کا امتحان لیا اور ان سے علم نجوم، سائنس اور مذہبی اور عام اخلاقی مسائل پر گفتگو کی، اور انہوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ اس شعبے میں یقیناً ترقی ہوئی ہے اور مختصر یہ کہ اس طرح کا نظامِ تعلیم ہندوستان بھر میں کہیں اور نہیں ہے۔"

کالج کی مجلس ترجمہ نے تقریباً سوا سو کتابیں مختلف علوم و فنون پر تالیف و ترجمہ کیں، اور علمی اصطلاحات کے ترجمے کے لئے ایسے اچھے قواعد وضع کئے جو اب بھی کارآمد ہوسکتے ہیں۔ اگر یہ کالج قائم رہتا اور حالاتِ زمانہ کے مطابق اس میں ضروری ترقی ہوتی رہتی تو یہی سب سے پہلی اردو یونی ورسٹی ہوتی اور یہ ہمارا بڑا شاندار کارنامہ ہوتا۔ لیکن ۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد دِلّی صوبۂ پنجاب میں داخل کر دی گئی، اور کالج توڑ دیا گیا۔ اور طرح سالہا سال کی محنت اور آئندہ امیدوں پر پانی پھر گیا۔

دہلی کالج کے تقریباً اسّی سال بعد حیدرآباد دکن میں عثمانیہ یونی ورسٹی قائم ہوئی جس میں تمام علوم و فنون کا ذریعۂ تعلیم اردو تھی۔ اس یونی ورسٹی سے متعلق شعبۂ تصنیف، تالیف و ترجمہ کی بدولت علوم و فنون کی صدہا کتابیں تالیف یا ترجمہ کر کے شائع کی گئیں اور ہزاروں علمی اصطلاحات وضع کرلی گئیں۔ ایم ایس سی، انجینیری، ڈاکٹری اور جدید نظری اور تجربی علوم کے سارے شعبے قائم کئے گئے۔ تیس سال تک تعلیم کامیابی سے جاری رہی۔

سب سے زیادہ مشکل مسئلہ ڈاکٹری تعلیم کا تھا لیکن عثمانیہ یونی ورسٹی کے تحت ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کے درجوں میں بھی اردو ہی کے ذریعے سے تعلیم دی جاتی تھی اور لندن کے "رائل کالج آف سرجنس" کے ایک وفد نے جامعہ عثمانیہ کی ڈاکٹری تعلیم کا معیار جانچنے اور جدید فن طب پر اردو کی کتابیں معائنہ کرنے کے بعد اپنے کالج کی مجلسِ اعلا کو یہ رپورٹ دی کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے تحت ڈاکٹری تعلیم کا معقول اور تسلی بخش انتظام ہے اور پھر وفد کی اس رپورٹ کی بنا پر انگلستان کے سب سے بڑے طبی ادارے نے بھی جامعہ عثمانیہ کی ڈاکٹری کی ڈگریوں کے تسلیم کرنے کا فیصلہ کیا۔

سائنس کی طرح معاشیات کو بھی ایک مشکل مضمون سمجھا جاتا ہے، اور اس مضمون میں بھی عثمانیہ یونی ورسٹی کے طلبہ کے جوابات کا معیار ملک کی دوسری یونی ورسٹیوں کے [illegible] کے معیار سے، جنہوں نے انگریزی میں تعلیم حاصل کی تھی، نسبتاً بہتر رہا۔ چنانچہ اس کا اعتراف ہندوستان بھر کے کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے شعبۂ معاشیات کے [illegible]تذہ کی کانفرنس منعقدہ لاہور (سنہ ۱۹۴۲ء) میں کیا گیا۔

غرض کہ اردو میں سوا سو سال پہلے بھی اعلیٰ درجوں میں ذریعۂ

تعلیم بننے کی صلاحیت تھی، اور عثمانیہ یونی ورسٹی حیدرآباد میں بھی تیس سال تک ادب، سائنس، معاشیات، قانون، طب اور جملہ نظری و تجربی علوم کی تعلیم اردو کے ذریعے سے کامیابی سے دی جاتی رہی۔

عثمانیہ یونی ورسٹی میں اردو ذریعہ تعلیم کی اہمیت اور افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی ہندستانی یونی ورسٹیوں کے اربابِ اختیار نے بعض سیاسی مصلحتوں اور ناگزیر مجبوریوں کی بناء پر اپنی یونی ورسٹیوں میں انگریزی زبان کو بدستور ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے باقی رکھا لیکن چوں کہ عثمانیہ یونی ورسٹی کی تجویز اس کے منصوبے اور پھر اس کے قیام کے ہر ہر مرحلے پر مشورتی اور عملی طور پر میں اس سے وابستہ رہا تھا، اس لئے جب انجمن ترقی اردو ہند کا دفتر اورنگ آباد سے دِلّی منتقل ہوا تو میں نے ۱۹۳۶ء میں ایک کُل ہند انجمن ترقی اردو کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کیا اور پھر اس کانفرنس میں اتفاق رائے سے ذیل کی تجویز منظور ہوئی:

”جامعہ عثمانیہ کے تجربے کو مدنظر رکھتے ہوئے اِس کانفرنس کی رائے میں بہت ضروری ہے کہ کم از کم دہلی، پنجاب، لکھنؤ، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، الہ آباد اور پٹنہ یونی ورسٹی میں جلد سے جلد اعلا تعلیم کا ذریعہ اُردو قرار دیا جائے۔“

کانفرنس کے ختم ہونے کے بعد میں نے مذکورۂ بالا تجویز کے سلسلے میں متعلقہ یونی ورسٹیوں کے اربابِ اختیار سے خط و کتابت شروع کی، لیکن یہ زمانہ سخت سیاسی خلفشار کا تھا، اور دوسری عالم گیر جنگ کی وجہ سے حالات حد درجہ غیر یقینی ہو گئے تھے، اس لئے اس مہم میں کامیابی کی صورت نہ پیدا ہو سکی۔ یہ عجیب بات ہے کہ اگرچہ اصولی طور پر سب اس کا اعتراف کرتے تھے کہ تعلیم کے ہر مرحلے پر ملکی زبان کو ہی ذریعۂ تعلیم ہونا چاہئے اور یہ بھی مانتے تھے کہ جامعہ عثمانیہ نے اُردو ذریعہ تعلیم کو آزما کر بڑی اچھی مثال قائم کر دی ہے، لیکن پہل کرنے کو کوئی تیار نہ تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے طے کیا کہ انجمن ترقی اُردو ہند کے اہتمام و انتظام میں برطانوی ہند کے کسی موزوں مقام پر ایک اُردو یونی ورسٹی قائم کی جائے، چنانچہ ۲۰ جنوری ۱۹۴۰ء کو تیسری کُل ہند انجمن ترقی اُردو کانفرنس ناگپور کے کھلے اجلاس میں اُردو یونی ورسٹی کے قیام کے سلسلے میں اتفاق رائے سے تجویز پاس ہوئی۔ یہ کوئی وقتی اور ہنگامی تجویز نہ تھی بلکہ بہت پہلے سے اچھی طرح سوچ سمجھ کر اور متعلقہ اصحاب کی رائے و مشورے کے بعد مرتب ہوئی اور کانفرنس میں منظوری کے لئے پیش کی گئی تھی . . .

اُردو یونی ورسٹی کے قیام کی اس اہم اور تاریخی تجویز کا ملک کے طول و عرض میں بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا۔ خطوط، مراسلات اور نجی مکتوبات کے ذریعے ہر خیال اور طبقے کے لوگوں نے امداد و اعانت کا یقین دلایا۔ ناگپور کانفرنس کی شرکت سے دِلّی واپس آنے پر میں نے ایک روز قائد اعظم محمد علی جناحؒ کو اپنے ساتھ دوپہر کا کھانا کھانے کی زحمت دی۔ قائد اعظمؒ نے بکمال مہربانی میری دعوت قبول فرمائی۔ کھانے پر جہاں قومی تعمیر کے مختلف مسائل پر گفتگو ہوئی، مجوزہ اُردو یونی ورسٹی کا بھی ذکر آیا۔ اور قائد اعظمؒ نے اس سے بڑی دلچسپی اور ہمدردی کا اظہار فرمایا۔ اس کے چند دن بعد وہ علی گڈھ تشریف لے گئے۔ وہاں مسلم یونی ورسٹی اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی جانب سے اُن کی خدمت میں ایک سپاس نامہ پیش کیا گیا۔ اس سپاس نامہ میں بھی مجوزہ اُردو یونی ورسٹی کے بارے میں دِلّی کی مذکورہ بالا گفتگو کا حوالہ موجود ہے۔ سپاس نامہ کے آخری الفاظ یہ تھے:

”ہم جناب کی توجہ وقت اور ملک کی اہم ضرورت کی طرف مبذول کرانا ضروری سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق سکریٹری انجمن ترقی اُردو ہند کی حالیہ ملاقات اُردو یونی ورسٹی کی اسکیم سے آپ کی ہمدردی اور دلچسپی کو دیکھنے کے بعد ملتمس خدمت ہیں کہ اگر آپ نے اس یونی ورسٹی کے قیام میں جب کہ جامعہ عثمانیہ کا عملی تجربہ ہمارے سامنے ہے۔ انجمن ترقی اُردو کی مدد فرمائی تو نہ صرف جلد از جلد یونی ورسٹی قائم ہو جائے گی بلکہ ہماری دوسری درسگاہیں بھی ہندوستان کی قومی زبان کے اس حق کو ماننے پر مجبور ہوں گی۔“

اسی سال (۱۹۴۰ء) صوبہ جات متحدہ کے سابق ڈائرکٹر تعلیمات اور مشہور ماہر تعلیم خان بہادر سید اسد اللہ کاظمی نے لکھیم پور ایجوکیشنل کانفرنس میں اپنا خطبۂ صدارت ارشاد فرماتے ہوئے مجوزہ اردو یونی ورسٹی کی اسکیم کو اُردو کی تقدیر بدلنے کے نسخے سے تعبیر کیا اور کہا کہ:

" وقت کی نبض شناسی اور اُردو کی جامعیت کا اظہار و احساس اس تجویز سے زیادہ بہتر نہیں ہوسکتا، جو ڈاکٹر صاحب موصوف (عبدالحق) نے شمالی ہند میں ایک اُردو یونی ورسٹی کے قیام کے تخیل کی صورت میں پیش کی ہے۔

"اس یونی ورسٹی کا قیام محض اُردو ہی کی ترقی کا باعث نہیں ہوگا۔ بلکہ ہمارے ذہن کو اُن قیود سے نجات دلانے والا ہوگا جو اس پر اس وجہ سے مسلط ہو کر رہ گئی ہیں کہ ہم نے اب تک مختلف علوم محض انگریزی زبان ہی میں پڑھے اور سیکھے ہیں۔"

چند دنوں ہی میں اُردو یونی ورسٹی کے قیام کی اس تجویز کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوگئی۔ ملک کے ہر گوشے سے اُس کے قیام کے امکانات اور دوسری تفصیلات پر خیالات ظاہر کئے گئے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ بعض ہمدردوں نے اس سوال پر غور کرنا شروع کر دیا کہ یہ یونی ورسٹی کہاں قائم کی جائے۔ چنانچہ الٰہ آباد کے ایک مراسلہ نگار نے ڈان دہلی (اپریل ۱۹۴۴ء) میں اس خیال کا اظہار کیا کہ:

" یہ یونی ورسٹی کراچی میں قائم کی جائے،
کیونکہ دہلی اور اُس کے نواح میں کئی یونی ورسٹیاں
پہلے سے موجود ہیں۔"

اس سلسلے میں، میں یہاں سابق سندھ کے ایک سماجی کارکن اور ماہر تعلیم مسٹر واسوانی کے ایک خط کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ جو جون ۱۹۳۹ء کے سندھ آبزرور کراچی میں چھپا تھا۔ اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ الٰہ آباد کے مراسلہ نگار نے ۱۹۴۴ء میں کراچی میں جس اردو یونی ورسٹی کے قیام کی تجویز پیش کی، اس سے پانچ برس پہلے ایک دوراندیش ہندو نے سندھ اور کراچی میں اُردو کے ذریعے سے تعلیم دینے کے روشن امکان پر کس خوبی اور عمدگی سے نظر ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

" فارسی کی طرح اس (اردو) میں لطافت اور نزاکت ہے،
اور اس کے ادب میں روز افزوں ترقی ہو رہی ہے۔

" حیدرآباد دکن میں جہاں تعلیم اردو کے ذریعے سے ہوتی ہے اس نے ثابت کر دیا کہ سائنس اور ادب کی تعلیم کے لئے دیسی زبان میں کسی طرح کی کوئی رکاوٹ نہیں۔ اگر یہ صورت حالات ہے تو پھر سندھ میں کیوں نہیں حیدرآباد دکن کی طرح اُردو ذریعۂ تعلیم بنایا جاتا ....

میرا تو خیال ہے کہ اُردو زبان میں ایک قدرتی لوچ اور لطافت ہے اور اگر یہ ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں داخل کی گئی تو یہ ہمارے طلبا کی دماغی نشوونما میں مدد کرنے کے ساتھ ہی عمدہ ادبی چیزیں پیدا کرنے میں اُن کی بہت ہمت افزائی کرے گی۔"

اُردو یونیورسٹی کی تجویز کی جس طرح تائید و حمایت کی گئی تھی اس کو دیکھتے ہوئے مجھے پورا یقین تھا کہ شمالی ہندوستان میں یہ یونی ورسٹی قائم ہو کر رہے گی۔ لیکن اس کے بعد ہی بدلتے ہوئے سیاسی حالات نے اتنا موقع نہ دیا کہ یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا، یہاں تک کہ نوبت تقسیم ملک تک پہنچ گئی اور سارے ارادے دل کے دل ہی میں رہ گئے۔ لیکن اس کے باوجود ابھی امید کی ایک کرن باقی تھی اور بجھی ہوئی راکھ میں ایک چنگاری روشن تھی کہ اگر ہندوستان میں ناگپور کی تجویز عمل میں نہ آسکی تو پاکستان میں تو اُسے عمل میں لانے میں کوئی دشواری نہ پیش آئے گی۔ کیوں کہ اصولی طور پر یہ حقیقت تسلیم کی جاچکی تھی کہ پاکستان کی قومی، تعلیمی اور سرکاری زبان اُردو ہوگی۔ ممکن ہے آپ یہ کہیں کہ مجھے تو اُردو کا روگ لگ گیا ہے اور مجھے خواہ مخواہ موقع ہو یا نہ ہو، ہر جگہ اُردو ہی اُردو نظر آتی ہے۔ آپ کو حق ہے، میرے بارے میں جو رائے بھی قائم کریں۔ کوئی روکنے والا اور ٹوکنے والا نہیں، لیکن اس کو کیا کیجیے گا کہ سات سمندر پار لندن میں ۸ جولائی ۱۹۴۷ء کو مشہور انگریز عالم اور مستشرق پروفیسر اے آربیری نے اسی خیال کا اظہار خود قائد اعظمؒ کی موجودگی میں کیا تھا۔ جب کہ انھیں پاکستان ایسوسی ایشن کی طرف سے اسی دن رات کے کھانے پر مدعو کیا گیا تھا اور جس دن لندن میں مقیم تمام مسلم وزرا، سفیر اور دیگر سیاسی نمائندے موجود تھے۔ پروفیسر صاحب نے اُردو زبان و ادب پر اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا:

" اُردو اب پاکستان کی سرکاری، تعلیمی
و عدالتی زبان کا درجہ حاصل کر رہی ہے۔"

اپنی تقریر کے آخر میں انھوں نے یہ بھی کہا کہ:

" اُردو ادب کا شمار اب دنیا کے عظیم ترین
اعلیٰ ترین ادبیات میں ہوگا۔"

بہرحال یہ حقیقت ہے کہ نہ صرف اس برعظیم پاک و ہند بلکہ غیر ممالک کے ممتاز اصحاب فکر و نظر بھی یہ یقین رکھتے تھے کہ اُردو اور صرف اُردو پاکستان کی قومی، تعلیمی اور سرکاری زبان ہوگی، اس لئے اگر میں یہ سوچتا تھا کہ تقسیم ملک کی وجہ سے ناگ پور کانفرنس کی

اُردو یونی ورسٹی کے قیام کی جو تجویز خوابِ پریشاں بن کر رہ گئی، وہ یہاں کراچی میں ضرور بارآور ہوگی، تو اس کے لئے میں کس طرح قابلِ مواخذہ ہوں۔

عربی کی ایک مشہور مثل ہے کہ کسی چیز کی محبت انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتی ہے۔ مجھے اُردو سے محبت ہے اور مجھے اعتراف ہے کہ یہ محبت جنون کی حد تک ہے، لیکن اسی کے ساتھ میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اُردو سے میری وابستگی کا یہ سلسلہ پوری قوم کی تہذیب، ثقافت، تصورات و نظریات اور اُس کے عزائم اور حوصلوں سے ملتا ہے اور کون ایسا بدبخت ہے، جسے اپنی قومی روایات اور تہذیبی اقدار سے محبت نہ ہوگی۔

جب میں نے دلّی میں قائدِ اعظمؒ سے اُردو یونی ورسٹی کے قیام کے بارے میں گفتگو کی تھی تو اُنھوں نے اُس سے بڑی دلچسپی اور ہمدردی کا اظہار کیا تھا اور مجھے قوی اُمید تھی کہ میں ان کی امداد و اعانت سے کراچی میں اُردو یونی ورسٹی کے قائم کرنے میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا لیکن اس وقت خدا کو یہ منظور نہ تھا۔ قائدِ اعظمؒ ہم سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہو گئے۔ اور اُن کے بعد ہماری بدنصیبی سے زبان کا طے شدہ مسئلہ پھر ایک نزاعی مسئلہ بن گیا اور پھر خود غرض اور مفاد پرست سیاست کاروں کی بدولت اُس نے ایک "فتنہ بیدار" کی شکل اختیار کر لی، لیکن میں اس وقت بھی مایوس نہ ہوا اور میں نے اللہ کا نام لے کر اسی کراچی میں انجمن ترقی اُردو پاکستان کے زیرِ اہتمام اُردو کالج قائم کیا، جو خدا کے فضل و کرم سے اب بھی کامیابی سے چل رہا ہے اور جس میں بی۔ اے۔ بی۔ ایس سی۔ بی کام اور ایل ایل۔ بی تک اُردو کے ذریعہ سے تعلیم دی جاتی ہے۔ اور اب سے چند سال پہلے ایم۔ اے کی تعلیم بھی اس میں اُردو کے ذریعہ دی جاتی تھی۔

موجودہ انقلابی حکومت کے مقرر کردہ تعلیمی کمیشن نے بھی انجمن کے اُردو کالج میں قومی زبان کے ذریعہ تعلیم دینے کے کامیاب تجربے کا اعتراف کیا ہے اور اس خیال کا بھی اظہار کیا ہے کہ یہ تجربہ جاری رہنا چاہئے۔ پچھلی حکومتوں کے دوران میں پاکستان کی بنیادی قدریں کس طرح پامال کی گئیں اب اُس کا ذکر عبث اور لاحاصل ہے۔ اگر کچھ دن اور یہی صورتِ حال جاری رہتی تو خدا ہی جانے ہمارا کیا حشر ہوتا۔ مگر خدا کا کرم ہمارے شاملِ حال ہوا اور ہمیں غلط کار اور مفاد پرست سیاست کاروں سے نجات ملی اور پہلی بار زبان کے بارے میں بھی نسبتہً ایک واضح اور معین نقطۂ نظر اختیار کیا گیا اور تعلیمی کمیشن کی بدولت کم سے کم مغربی پاکستان کی حد تک یہ تسلیم کر لیا گیا کہ آئندہ ہائی اسکول کے درجے تک اُردو لازمی ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے رائج کی جائے گی اور پھر رفتہ رفتہ پندرہ سال کے اندر اُردو ہی کو ذریعۂ تعلیم بنا دیا جائے گا۔

پندرہ سال کی مدت بہت زیادہ ہے۔ کم سے کم میں تو اتنے دنوں انتظار نہیں کر سکتا۔ جب کہ ایک صدی قبل دلی کالج میں ادب اور سائنس کی تعلیم اُردو کے ذریعہ سے دی جاتی تھی اور جب کہ عثمانیہ یونی ورسٹی کی درخشاں مثال ہمارے سامنے ہے اور ضرورت کے مطابق ہر علم و فن میں نصابی کتابوں کا ذخیرہ بھی اُردو میں موجود ہے تو پھر ہم پندرہ سال کیوں انتظار کریں۔ اُردو میں تعلیم کا جو تجربہ سوا سو سال پہلے دلّی کالج میں کیا گیا اور عثمانیہ یونی ورسٹی کے ہر شعبے میں، ۳۰ سال تک بڑی کامیابی سے جاری رہا، آخر آج اُس کی کامیابی میں کیوں شکوک و شبہات ہیں؟

انگریزی ذریعۂ تعلیم کی لعنت صرف برِ عظیم پاک و ہند میں ہے ورنہ فن لینڈ، ڈنمارک وغیرہ جیسے چھوٹے چھوٹے ملکوں میں تمام علوم اور سائنس کی تعلیم ملکی زبانوں میں دی جاتی ہے۔

سب سے سبق آموز مثال اسرائیل کی ہے جہاں کی یونی ورسٹی کے تمام مدارج میں جملہ علوم و فنون اور سائنس کا ذریعۂ تعلیم عبرانی ہے۔ جو صدیوں سے مردہ ہو چکی تھی اور اب دفتر، عدالت کاروبار میں ہر جگہ رائج کر دی گئی ہے۔ اور کسی کی مجال نہیں کہ وہاں عبرانی کے سوا کوئی دوسری زبان استعمال کرے۔ اور تو اور انڈونیشیا جیسے حال میں آزادی ملی، وہاں تعلیم اور دوسرے کاروبار سب اپنی زبان میں ہوتے ہیں، اور سابق آقاؤں کی زبان ولندیزی کو ملک بدر کر دیا گیا۔

میں نے دہلی کالج، سید احمد خاں کی مجوزہ ورنیکلر یونی ورسٹی کی مثالیں اور ان کے بارے میں برِ عظیم اور غیر ممالک کے ماہرینِ تعلیم کی رایوں کے مختصر اقتباسات صرف اس لئے پیش کئے کہ وہ کرم فرما بھی اپنے موقف پر نظرِ ثانی کریں، جو اب تک بدقسمتی سے انگریزی ذریعۂ تعلیم کی، افادیت کو ایک عقیدے کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں۔ میں نے اس کتابچے میں غیر مسلم ماہرینِ تعلیم کی رائیں خاص طور پر اس لئے درج کی ہیں کہ ان کے متعلق یہ شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ اُردو ذریعۂ تعلیم کے تجربے کی کامیابی کا اعتراف اُن کی "اندھی" اُردو دوستی کا رہینِ منت ہے۔ اس کے خلاف واقعہ یہ ہے کہ ان میں ایک آدھ کو چھوڑ کر کسی کی مادری زبان اُردو نہیں اور اس لئے انھوں نے عثمانیہ یونی ورسٹی میں اُردو ذریعۂ تعلیم کے

بارے میں جو رائیں ظاہر کی ہیں وہ انتہائی بے لاگ اور غیر جانب دارانہ ہیں اس کے بعد بھی اگر اعلا درجوں میں اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے لئے ہمیں ابھی اور پندرہ سال کی ضرورت ہے تو پھر ہماری یہ "وضع داری" اور "سلامت روی" قابلِ رحم ہے۔ لیکن میں انتظار نہیں کرسکتا۔ اور ایک مسلمہ حقیقت کو عمل میں لانے کے لئے پندرہ سال اور غیر یقینی اور تذبذب کے عالم میں نہیں رہنا چاہتا — اور اللہ کے نام سے ازسرِ نو، اُردو یونی ورسٹی کی زندگی بخش اور روح پرور مہم نئے جوش اور ولولوں سے شروع کرتا ہوں۔

یہ سچ ہے کہ میں اپنی عمر کی نوّے منزلیں طے کرچکا ہوں لیکن میرے ارادے اب بھی جوان ہیں اور میرا عزم و حوصلہ اب بھی زندگی کی حرارت سے سرشار ہے۔ میرے سامنے ایک مقصد ہے اور اُس مقصد کی تکمیل ہی میری زندگی کا حاصل ہے اور وہ مقصد ہے جلد سے کراچی میں ایک چارٹرڈ اُردو یونی ورسٹی کا قیام! مجھے تو اس مقصد کو لے کر آگے بڑھنا ہے اور اس یقین و اعتماد کے ساتھ کہ میرے اہلِ وطن، بچّے، طالب علم، جوان، بوڑھے، شہری، دیہاتی، زمیندار، سرمایہ دار، صنعت کار، کاشت کار، تاجر، دست کار، امیر، غریب اور چھوٹے بڑے سب میرا ساتھ دیں گے۔

اس سوال کے طے ہوجانے کے بعد کہ کراچی میں اُردو یونی ورسٹی کا قیام وقت کا ایک اہم تقاضہ ہے، ایک دوسرا سوال بھی سامنے آتا ہے کہ یونی ورسٹی کے قیام کے لئے رقم کہاں سے آئے گی اور کس طرح فراہم کی جائے گی! میں نے سید احمد خاں کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا ہے اور فیض حاصل کیا۔ لیکن افسوس کہ میں اُن سے چندہ مانگنے کا گُر نہ سیکھ سکا، جس کا خمیازہ آج تک بھگت رہا ہوں۔ مجھے مجوزہ اُردو یونی ورسٹی کے لئے سردست صرف پچاس پچپن لاکھ روپوں کی ضرورت ہے۔ یہ رقم بہت بڑی نہیں۔ صرف کراچی کے دردمند اور مخیّر اصحاب اس رقم کو بڑی آسانی سے فراہم کرسکتے ہیں لیکن میری یہ کوتاہی ہے کہ مجھے مانگنے کا ڈھنگ نہیں آتا۔ مگر اس کے باوجود ہاتھ پھیلائے بغیر چارہ بھی نہیں۔ اس لئے میں اپنے ہم وطنوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ میری دست گیری کریں، مجھے سہارا دیں اور اُردو یونی ورسٹی کے قیام میں میری مدد کرکے مجھے ایک نئی زندگی عطا کریں۔ میں اب زندگی کی اس منزل میں ہوں جہاں کام سے زیادہ آرام

(باقی صفحہ ۹۷ پر)

"تابہ شیشۂ حلبی"

(انقلابِ اکتوبر سے متأثر ہو کر)

چودھری فضل حق

تمنّاؤں کے خوں میں غرقِ صبحوں سے نہ گھبراؤ
صدا دو ابنِ آدم کے جنوں کے کاروانوں کو
طلسمِ بیدلی نے اس سے پہلے بھی سراب آسا
ہزاروں عافیت کے آسرے لے کر حباب آسا
یہ چاہا ہے کہ طوفاں اس طرح بدنام ہوجائیں
کہ موجیں بازوؤں پر اک کھلا الزام ہوجائیں
مگر روشن رہی ہے آرزوؤں آفتاب آسا
کہ جیسے تیرگی کا قلبِ ویراں جگمگاتا ہو
گلستاں بن کے کھلتا ہے تمنّاؤں کا خوں اکثر
چمن کو پھونک دیتا ہے، الم دیدہ جنوں اکثر
ہیں المیئے بشر کی داستاں کے سارے شہپارے
گہر پرور صدف عظمت کے گلشن خیز گہوارے
خوشی ہے نام جس کا، ایک اندازِ تفکر ہے
مٹا سکتے ہیں جس کو حادثے، لمحے، نہ سیّارے
فریبِ آگہی سے ہے غمِ دنیائے دوں اکثر
یہ رازِ غم کُشا کشہائے بیتابی کو سمجھا دو
کمالِ آرزو کو ہے شکستِ آرزو لازم
جمالِ گل کو ہے نوخیز کلیوں کا لہو لازم
سبک رفتار خواہش سے، حقائق کی گرانی تک
طلوعِ شوقِ منزل سے، فرازِ کامرانی تک
نہ جانے کتنے ارمانوں کا خوں دے کر پہنچتی ہے
حیاتِ خستۂ غم، اک مقامِ شادمانی تک
نیازِ بندگی کو اشکِ غم سے ہے وضو لازم
مئے غم پی کے اٹھو اور غمِ دوراں پہ چھا جاؤ

پھر چراغِ لالہ سے....[1]

(شہیدِ ملتؒ اور انقلاب اکتوبر)

شہاب رفعت

آج پھر پیکرِ بے جاں میں ہے ہیجانِ نمو
آج پھر دوڑا اٹھا میرے رگ و پے میں لہو
پھر ہوا درد کی لذت سے شناسا پہلو
آج کہ انجام بھی تھا
آج ہی آغاز بھی ہے
آج ہی تارِ رگِ جاں ٹوٹا
آج ہی غلغلۂ نغمگیٔ ساز بھی ہے
آج پھر پیکرِ آسودۂ خاک
اُٹھ گئے سرگرمِ خرام اور خود افراز بھی ہے
پھر غزل خواں ہے حیات
پھر لبِ زخم ہوئے زمزمہ خواں
زندگی کے لئے جو بادِ سموم
بڑھ کے عفریت صفت خانہ برانداز ہوئی
شش جہت روحِ نمو بن کے چمن ساز ہوئی
جاگ اُٹھا خواب سے اس طرح بہاراں کا طلسم
رہ گئی دور کہیں مردنیٔ زردیٔ خزاں
انہیں ایام میں سویا تھا سرِ خاک کوئی
انہیں ایام میں جاگ اٹھا ہے اک مردِ جری
قُم باذنی کی صدا کیا آئی
جیسے وہ پیکرِ خوابیدہ ہی دھیرے دھیرے
اس طرح اُٹھے کہ پھر اس پہ کسی موسیا ہی کا گماں

قوم کا بختِ جواں

بارہا دیکھے تھے ان آنکھوں نے
خواب جن سے چمنستاں کی فضائیں شاداب
خواب۔ روبائے فسوں، سحر نگاہ
شرق تا غرب ہمہ رنگ ہو معمورۂ پاک
جیسے صحرا و بیابان میں کہیں "کھل سم سم" سے
ایک پھیلا ہوا جادو کا نگر جاگ اٹھے
لیکن افسوس! یہ خوابوں کے فسوں کا محل
کبھی تخئیل کے پردوں سے نہ باہر آئے
دیکھتے دیکھتے پتھرا گئیں آنکھیں ان کو
خواب تھے، خواب رہے!
بندِ آنکھوں کے نہاں خانوں میں!!
آج ہیں بستۂ فتراک یہ خوابوں کے غزال
رونقِ چشمِ تماشا ہے تب و تابِ جمال
ڈھل گیا مرمریں سانچے میں یہ افسانۂ سحر
صد جہاں کیف در آغوش فلک تاب محل
ایک پیکر کی شکست۔ ایک محل کی تعمیر

آج اک غلغلہ پھر گنبدِ افلاک میں ہے
آج پھر اخترِ تقدیر چمک اٹھا ہے

آج پھر کوندتے ہیں حشر بداماں جلوے
آج پھر سینۂ ہستی میں ہے اک تازہ لگن
آج پہلو میں ہے انگارہ صفت قلبِ تپاں
آج رگ رگ میں ہے پھر خونِ شفق رنگ رواں
آج پھر قافلۂ زیست ہوا برق عناں
پھر سوئے چرخ لپک اٹھی ہے شعلوں کی زباں
آج گلنار شراروں سے ہوا نیل گگن
ان گنت تاروں سے آراستہ یہ سقفِ کہن
کہ ہیں تا دور رسا محلوں کے پُر نور کلس
دیپ ہی دیپ ہیں، بلور کے روشن روشن
قطرے ہی قطرے جمی نقطہ بہ نقطہ سرِ طور
ناچتی پھرتی ہو جیسے کوئی تراق کرن
نیلا امبر ہے کہ سیاروں سے بھر پور انگن
یاد کمتا ہوا ایک شیش محل، قصرِ بلور
قدرتی سحر سے جگمگ کوئی کاشانۂ نور
سرنگوں ہو کے سرافراز ہے ملت کا حصار
مر کے بھی زندۂ جاوید ہے اک سینہ فگار
وقفِ تعمیرِ شب و روز یگانہ معمار
ایک معمارِ جواں ۔۔ رو کشِ تابندہ منار
عقل حیراں ہے کہ یہ معجزۂ جائے بہار
عشق شاداں کہ نہیں خونِ شہیداں بیکار

---

[1] شہیدِ چمن لالہ خونیں کفن۔ (اقبالؒ)

غزل

احمد ندیم قاسمی

کون جگ میں ترا ہمسر دیکھے
کوئی اِس دُھند میں کیونکر دیکھے

عمر بھر ایک ترا دھیان رہا
یوں تو مہر و مہ و اختر دیکھے

آنکھ صرف آنکھ ہے، آئینہ نہیں
جو تجھے سامنے پا کر دیکھے

تیرے جاتے ہی یہ محسوس ہوا
عمر گزری تجھے پل بھر دیکھے

دور ہی دور سُلگنے والے
کاش تو پاس بھی آ کر دیکھے

ہم تو تھے حُسن کے تاریخ نگار
ہم نے قیصر نہ سکندر دیکھے

لوگ ماضی کے دھوئیں میں ڈوبے
ہم نے گیسوئے معنبر دیکھے

نظر آئے انہیں سبزے میں بھی سانپ
ہم نے پتھر بھی ثمر ور دیکھے

انہیں جسموں سے بتوں نے جھانکا
ہم نے ترشے ہوئے پیکر دیکھے

انہیں دریاؤں نے پیاسا مارا
ہم نے آنکھوں میں سمندر دیکھے

کون غالب سا ہنر ور ہے ندیم
سیکڑوں یوں تو سخن ور دیکھے

انقلاباتِ اُمم

(قرآن اور تاریخ کی روشنی میں)

عطاء اللہ پالوی

قرآن جا بجا تاریخ پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ بلاشبہ تاریخ کو سائنس کے درجہ پر فائز کرنے والا قرآن مجید ہی ہے۔ واقعات سے استنباطِ نتائج اس ہی کی حکمت تھی۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے۔ سب سے پہلے قرآن ہی نے اس بات کو بطور اصول سمجھایا، "ہم ان ہی ایام کو لوگوں کے درمیان الٹتے پلٹتے رہتے ہیں" (۳:۱۴۰)

قصصِ قرآنی کا ہر ٹکڑا عبرت اور موعظت کا حامل ہے، بالخصوص بنی اسرائیل کی کہانی جس سے اقوام و ملل کے عروج و زوال کی پوری کیفیت اور وجوہ معلوم ہوتی ہیں۔

فسادِ آدمیت کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے تین وجوہ متواتر نظر آتی ہیں: ملوکیت کا استبداد، برہمنیت کی فریب کاریاں اور سرمایہ داری کا شکنجہ۔ ان تینوں نے الگ الگ، اور جہاں مصالح متقاضی تھے مشترک طور پر انسانیت کو برابر اپنی چیرہ دستی کا شکار رہنایا۔ چنانچہ مصر کی تاریخ میں بھی عناصرِ ثلاثہ کارفرما نظر آتے ہیں۔ فرعون مجسمہ ہے ملوکیت اور استبداد کا۔ ہامان علامت ہے برہمنیت کی ابلیسی حرکتوں اور روباہ بازیوں کی اور قارون سرمایہ داری کی جملہ لعنتوں کا آئینہ دار ہے۔ یہ نام شخصی نہیں بلکہ لقب ہیں اور قرآن نے ان کو نمائندے بنا کر بات واضح کی ہے۔ اگر قرآن شخصی نام دیتا تو عمومیت کا اعجاز قائم نہ رہتا۔ فرعون، ہامان اور قارون ہر ملک اور دور میں پیدا ہوتا رہیگا اور یہ انسانیت پر مسلط ہو کر ان کے لئے عرصۂ حیات تنگ کرتے رہیں گے۔ جب لوگ ان کی قہرمانیت سے تنگ آ جائیں گے تو نجات کی راہیں تلاش کریں گے۔

افراد کا دور ختم ہو چکا۔ اب جماعتیں ان تینوں رُوپوں میں نظر آتی ہیں اور جب ان کی لعنت انسانیت کو دکھ کے انتہائی درجہ تک پہنچا دیتی ہے تو کسی نجات دہندہ کا منظر پر آ جانا اللہ کی سنت ہے اور وہ اسے بھیجکر رہتا ہے۔ چنانچہ مصر کے دورِ استبداد میں حضرت موسیٰؑ مبعوث ہوئے۔

اب چونکہ جماعتیں مسلط ہیں اس لئے تبدیلی بھی جماعتی اور تنظیمی نوعیت کی ہوتی ہے۔ اسے "انقلاب" کے نئے نام سے یاد کیا جاتا ہے مگر نوعیت وہی ہے۔ یعنی نجات دہندہ کا آنا مقدر ہے۔

دنیا میں انقلاب ہر وقت آتے رہے ہیں مگر موجودہ صدی کے دو انقلاب ناقابلِ فراموش ہیں:

(۱) انقلاب روس (۱۹۱۸ء) جس کا بانی لینن تھا۔ یہ انقلاب خونی انقلاب تھا اور اس کی بنا انکارِ ذات یعنی دہریت پر تھی۔ (۲) پاکستان کا پُرامن اور دوررس انقلاب (۱۹۵۸ء) جس کے مؤسس ایوب ہیں اور خداترسی اور خداپرستی جذبۂ انقلاب تھا۔

اشتراکیت کے انقلاب میں تین منفی محرک تھے۔ تاج، سرمایہ اور مذہب کی نفی۔ لیکن اگر ارتقائے انسان کے تاریخی ادوار (شکار، گلہ بانی اور زراعت و سلطنت) پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہی آخری دور اس کا سب سے بڑا اور سخت دور تھا جس نے انسانیت کو بری طرح کچل دیا۔ تاج کے گرد امراء، وزراء، طاقت، سرمایہ اور دسیسہ کار جماعتوں کا ایک گروہ ہوتا ہے جو مل جل کر انسانیت کو نرغے میں لے لیتا ہے اور اپنی ہوسِ جاہ و ثروت کو تسکین دیتا ہے۔ سارے ملک کی محنت اکارت جاتی ہے اور اس کے ثمر شیریں کسی کام نہیں آتے کیونکہ تاج اور اس کے حواریوں کی طاغوتی قوتیں انہیں عوام تک پہنچنے نہیں دیتیں۔ اس کا دنیاوی و مادّی نقصان ہی نہیں ہوتا بلکہ دین بھی ان "ظلوم و جہول" کا شکار بننے لگتا ہے۔ اسلام نے سب سے پہلے ملوکیت اور برہمنیت کے دو بت اپنی ضربت کاری سے پاش پاش کر دئے تھے مگر افسوس! خود مسلمانوں ہی کے ہاتھوں یہ دونوں بت پھر اپنے استھانوں پر لا بٹھلائے گئے اور انہوں نے اس کے نتائج بھی خوب بھگتے۔ شکر ہے کہ اب یہ دور ختم ہو رہا ہے۔ سرمایہ داروں کے نمونے ــــ نوابی، جاگیرداری، زمینداری، طبقۂ امراء، خانقاہی



جدید پارچات پر قدیم نقش و نگار
(دستی قلمکاری کا ایک اچھوتا نمونہ)

نقاش : ڈوروتھی حبیب

دام تزویر ــــ سب مکڑی کے کمزور تانے بانے ثابت ہو رہے ہیں اور نئے نظام کی ید اللّٰہی ضرب سے نہیں بچ سکتے۔

عالمی انقلاب کی تاریخ میں جہاں اور باتیں دلچسپ اور غور طلب ہیں وہاں چالیس کا عدد اور اکتوبر کا مہینہ بھی ہے۔ مثلاً روس اور پاکستان کے انقلاب میں صرف چالیس برس کا فصل ہے۔ وہاں بھی اکتوبر میں انقلاب آیا، یہاں بھی اکتوبر براہِ نجات بنکر آیا۔ ۴۰ کے عدد کی دیگر خصوصیات بھی دلچسپ ہیں۔

۴۰ کے عدد سے قرآن کی ابتدا ہوتی ہے (الٓمٓ : ۴۰) (مقدمہ کو چھوڑ کر) قرآن نے انسان کی جوانی کی عمر چالیس سال بتائی ہے۔ فرمایا گیا: "جبکہ وہ پوری جوانی کو پہنچا اور چالیس سال کا ہو گیا" (۱۵/۴۶)۔ قرآن کی اس بات کو اب جدید علمائے اخلاق و نفسیات بھی تسلیم کر رہے ہیں۔ بلکہ مزاج ملل کے شناسا تو اس کا اطلاق ملتوں اور قوموں کے حق میں بھی کرتے ہیں۔ قوموں کو بھی جوانی پر آتے آتے یعنی قوائے مضمحل کو عزم و عمل کی راہ پر لانے میں چالیس سال لگتے ہیں۔ یاد کرو وہ زمانہ کہ موسیٰ نے بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دلانے کی دعوت دی اور کہا چلو فلسطین پر قبضہ کر لو مگر قوم دوں ہمتی کا شکار تھی، افراد ملت اضمحلال و انتشار میں مبتلا تھے۔ اس لئے انہوں نے جواب دیا "تو تم جاؤ اور تمہارا خدا بھی جائے۔ تم دونوں ہی لڑنا بھڑنا ہم یہیں ٹھہرتے ہیں" (۲۴/۵)۔ مگر ــــ ربِ جلیل کا فیصلہ ہوا "اب چالیس برس تک وہ ملک ان پر حرام کر دیا گیا۔ یہ اسی بیابان میں پڑے رہیں" (۲۶/۵)۔ چالیس سال کے تعمیری دور کے بعد ان میں وہ جسارت اور علو ہمت پیدا ہو گیا تھا جو اُن سے یہ کہلوا سکا: "ہم تھوڑے ہیں تو گھبرانا کیا ہے۔ کتنی ہی چھوٹی چھوٹی جماعتیں ہوئی ہیں جو بڑی بڑی جماعتوں پر خدا کے حکم سے غالب آئی ہیں۔ اللہ تو صابروں کے ساتھ ہے" (۲۴۹/۲)۔ حضرت موسیٰ نے چلّہ کشی بھی چالیس ہی دن کی تھی "اُسکے پروردگار کے حضور آنے کی میعاد چالیس راتوں کی تھی" (۱۴۲/۷)۔ اسی ضمن میں اگر آپ دیگر تاریخی شواہد و حقائق کی طرف رجوع کریں تو چالیس کے عدد کی جھلک نظر آئے گی اور کسی نہ کسی انقلابی کروٹ یا انقلابی ہستی کے ظہور و عدم کی طرف ذہن کو منتقل کرے گی۔ چند ایک چیدہ حقائق دلچسپی سے خالی نہیں:

۱۔ بقول توراۃ جب نوحؑ کا طوفان آیا تو بارش چالیس روز تک جاری رہی۔ جب چالیس دن گذر گئے تو ان کی نجات دہندہ کشتی چالیس روز کے بعد کوہ ارارات پر پڑی ملی۔

۲۔ ایلیا نبی چالیس دن تک بھوکے رہے۔

۳۔ حضرت یعقوبؑ کی نعش کو مسالہ لگانے میں چالیس روز صرف ہوئے۔

۴۔ حضرت یعقوبؑ نے الیسین کو جو گائیں تحفۃً بھیجی تھیں ان کی تعداد بھی ۴۰ تھی۔

۵۔ گولیات نے اسرائیلی فوجوں کا مقابلہ ۴۰ دن تک کیا۔

۶۔ نینوا کو توبہ کے لئے چالیس دن کی مدت دی گئی تھی۔

۷۔ حضرت موسیٰؑ کو ان کی ولادت کے چالیس دن بعد معبد میں پیش کیا گیا تھا۔

۸۔ حضرت مسیحؑ نے چالیس دن کا روزہ رکھا، صلیب پانے کے بعد ۴۰ گھنٹے تک ان کی نعش لٹکی رہی۔

۹۔ ہندوؤں میں عقیدہ ہے کہ بچے کی نال کاٹ کر چالیس دن اس کی ماں کے سرہانے رکھی جائے۔

۱۰۔ ویدک علاج میں کایا کلپ کا طریقہ چالیس دن کی مہلت چاہتا ہے۔

۱۱۔ زرتشت نے چالیس سال کی ریاضت کے بعد تبلیغ شروع کی۔

۱۲۔ اس صدی کے چالیسویں سال تحریک پاکستان نے لاہور کی سرزمین پر جنم لیا (مارچ ۱۹۴۰ء)

۱۳۔ حضورؐ کو بھی عمر کے چالیسویں سال بعثت سے سرفراز فرمایا گیا۔

اب اکتوبر کے تواتر کی مثالیں لیجئے:

۱۔ انقلاب روس

۲۔ انقلاب پاکستان

۳۔ انقلاب عظیم بغداد (خلیفہ امین الرشید کے قتل کے بعد عرب حکمرانی، عجمی اقتدار میں آگئی (۸۱۳ء)

۴۔ خلجی حکومت کا انقلاب۔ نصیر الدین شجاعت خاں کو قتل کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا (۱۵۰۰ء)

۵۔ انگریزوں نے بکسر کی لڑائی میں شجاع الدولہ کو شکست دی اور حکومت پر قبضہ جا بیٹھے (۱۷۶۴ء)۔

۶۔ مرہٹوں نے بیدار بخت کو بھگا کر دہلی کے تخت پر تسلط جما لیا۔ (۱۷۸۸ء)

۷۔ الاسکا میں انقلاب آیا اور امریکہ اس پر قابض ہوگیا (۱۷۹۹ء)

اکتوبر میں چند بڑی ہستیوں کی پیدائش، اموات اور عروج:

۱۔ خلیفہ مہدی کا تخت پر آنا (۷۷۵ء)

۲۔ اکبر کی وفات، جہانگیر کا سریر آرائے سلطنت ہونا (۱۶۰۵ء)

۳۔ بہادر شاہ قطب الدین اوّل شاہ دہلی کی پیدائش ۱۶۴۳ء

۴۔ بہادر شاہ ظفر کی پیدائش (۱۷۷۵ء)۔ تخت سے اترنے اور قید ہونے کا بھی یہی مہینہ ہے (۱۸۵۷ء)

۵۔ سر سیدؒ، ولادت (۱۸۱۷ء)

۶۔ گاندھی جی: ولادت (۱۸۶۹ء)

۷۔ آئزن ہاور: ولادت (۱۸۹۰ء)

۸۔ ۱۸ ویں عباسی خلیفہ، المقتدر باللہ کا قتل (۹۳۲ء)

۹۔ خواجہ حسن بصریؒ: وفات (۷۲۶ء)

۱۰۔ حضرت بابا فریدؒ گنج شکر: وفات (۱۲۶۵ء)

۱۱۔ تخت نشینی جہانگیر (۱۶۔ اکتوبر ۱۶۰۵ء)

۱۲۔ نواب غازی الدین حیدر، نواب اودھ کا اعلان بادشاہی (۱۹ / اکتوبر ۱۸۱۹ء)

۱۳۔ تلسی داس (نامور ہندی شاعر)؛ پیدائش (۱۲ / اکتوبر ۱۵۳۲ء) وفات بھی اسی مہینہ میں واقع ہوئی ۔ ۲۴ / اکتوبر ۱۶۲۳ء)

۱۴۔ لیاقت علی خاں (پیدائش یکم اکتوبر ۱۸۹۵ء)، وفات (۱۶ / اکتوبر ۱۹۵۱ء)

۱۵۔ پاکستان میں اعلان انقلاب نو (۷ / اکتوبر ۱۹۵۸ء)

۱۶۔ استحکام انقلاب بہ قیادت عظمیٰ) جنرل (اب فیلڈ مارشل) محمد ایوب خاں ۲۷ / اکتوبر ۱۹۵۸ء)

انقلاب پاکستان زندہ باد!

اکتوبر پائندہ باد!



وہی برچھی جگر کے پار ہے آج، جس سے قبل ازیں ہمارے دل و جگر بارہا زخمی ہو چکے ہیں۔ آج جگر جیسے یگانۂ روزگار استادِ فن کے سانحۂ ارتحال سے اس کی شدت اور بھی زیادہ ہے کیونکہ وہ اُس محفل کی یادگار تھے جس نے ہمیں حسرت موہانی، اصغر، فانی، عظمت اللہ جیسے گہر ہائے گراں مایہ عطا کئے تھے۔ جن کی تابانی میں اندازِ کہن بھی، نو بھی ہے۔ آج پھر ایک اور رشکِ عرفی و فخرِ طالب کے راہیٔ عدم ہونے پر بے اختیار یہ الفاظ لبوں پر آتے ہیں:

ایک عالی دماغ تھا نہ رہا
ایک روشن چراغ تھا نہ رہا

یہ شمارہ تکمیل کے جملہ مراحل طے کر چکا تھا کہ یہ افسوسناک خبر موصول ہوئی۔ ہم اگلے شمارہ میں مرحوم پر ایک سیر حاصل مضمون شائع کر رہے ہیں۔

●

(مطبوعہ نومبر ۱۹۵۷ء)

جگر

کراچی: ۱۷ ستمبر ۱۹۵۷ء

(پیدائش، مراد آباد: ۱۸۹۰ء
وفات، گونڈہ: ۱۹۶۰ء)

افسانہ

"پومپیائی" کی آخری رات

عنایت اللہ

بادشاہ نے درباریوں کو نظر بھر کر دیکھا۔ یوں جیسے انہیں پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ ان جی حضوریوں کو وہ ہر لمحہ دیکھا کرتا تھا اور جانے کب سے دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ وہ انہیں اپنی بے تکی سی باتوں پر بھی داد و تحسین سے لبریز قہقہے لگاتے سنا کرتا تھا اور انہیں اپنے حضور جھکتے بھی دیکھا کرتا تھا۔ بسا اوقات اس نے اپنے آپ کو سرکس کے مسخروں کے نرغے میں گھرا ہوا پایا تھا۔ اور کئی بار محسوس کیا تھا جیسے اُس کا اپنا وجود اسی مسخرے پن کا ایک اہم حصّہ ہے۔ لیکن اپنے ہی سینے سے ایک آواز نے ابھر کر اُسے سنبھالا دے دیا۔ "یہی مسخرے تیری قوت ہیں، یہی مسخرہ پن تیری طاقت ہے۔ ان عناصر کو بکھرنے نہ دینا۔" مگر آج کی رات اُس نے ان عناصر کو یوں دیکھا جیسے کوئی طاقت، ان عناصر سے زیادہ قوی، انہیں بکھیر رہی ہے۔

اور یہ تھی بھی حقیقت کہ یہ عناصر اُسے آج آخری بار نظر آ رہے تھے۔ اس نے اپنی ہستی میں زلزلے کا ہلکا سا جھٹکا محسوس کیا۔ اُس نے چونک کر چھت سے لٹکتے ہوئے فانوس کو دیکھا۔ فانوس ساکن تھا، پردے ساکن تھے، کسی دروازے کی زنجیر بھی نہیں ہلی تھی، کسی درباری کے چہرے کے تاثر میں ذرہ بھر تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس نے سوچا یہ زلزلہ نہیں تھا۔ زلزلہ آتا بھی تو حیران کن نہ ہوتا۔ کیونکہ پومپیائی زلزلوں کا شہر تھا۔ آتش فشاں پہاڑ کی چوٹی موت کی اٹل حقیقت کی طرح اس شہر پر جھکی رہتی تھی۔ یہ چوٹی گلی سڑی لاشوں کی بو، بھوکی ننگی رعایا کی آہیں، مظلوموں کی فریادیں، لوٹی ہوئی دولت پہ لٹی ہوئی عصمتوں کی ہچکیاں اور ملک کے مفلوج قانون کی سسکیاں دھوئیں کی صورت اگلتی رہتی تھی۔ اور یہ دھواں کالے کالے بادل بن کر سارے شہر اور تمام ملک پہ منڈلایا کرتے تھے۔ بادشاہ انہی بادلوں کے سائے میں راج کرتا تھا اور یہ سرکتے رینگتے ہوئے گھنے سائے جب اس کے محلوں کے اوپر سے گذرا کرتے تو اس کے سینے میں شہنشاہی کے احساس کے ساتھ خدائی کا ہلکا ہلکا سا خمار بھی پیدا ہونے لگتا تھا۔

آج رات جب اس نے اپنے آپ میں ہلکا سا جھٹکا محسوس کیا تو ڈر سا گیا جیسے پہاڑ کی چوٹی سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کی موج نے پہاڑ کی کوکھ میں رک کر پہاڑ کو ہی ہلا دیا ہے۔ بادشاہ کو احساس تھا کہ یہ غبار کسی بھی لمحہ لاوا بن کر، اُسے، اس کے محلوں، اس کے درباریوں اور اس کی خدائی کو ہمیشہ کے لئے دفن کر سکتا ہے۔

اس نے درباریوں کو پھر دیکھا جیسے انہیں پھر کبھی نہ دیکھ سکے گا، جیسے آتش فشاں پہاڑ کا لال سرخ لاوا انہیں اپنے ساتھ بہائے لئے جا رہا ہے، اور ایک ایک کو دفن کرتا جا رہا ہے۔ بادشاہ کے سامنے درباریوں کی صورتیں دھندلانے لگیں۔ پھر ہر چہرے میں اُسے اپنے خدو خال دکھائی دینے لگے۔ اُس نے نگاہیں کسی اور طرف کر لینا چاہیں۔ اُسے یوں لگا جیسے پہاڑ کا دھواں اس کے سینے میں منتقل ہو گیا ہے اور اُسے نکلنے کی راہ نہیں مل رہی۔ وہ درباریوں سے ہر بات کہہ دیا کرتا تھا۔ لیکن آج کی بات وہ کسی سے بھی نہ کہہ سکا۔ یہ بات وہ اپنے آپ سے بھی چھپا لینا چاہتا تھا۔ شطرنج کا منجھا ہوا کھلاڑی آج خود مہرہ بن گیا تھا، جیسے کسی غیبی قوت نے اُسے اس خانے سے اٹھا کر اُس خانے میں رکھ دیا تھا۔ مہرہ پٹ رہا تھا۔

اس نے درباریوں کو رخصت کیا اور باہر نکل آیا۔ اس کے محل کے باغیچے میں اس کے چند امیر اور وزیر بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ وہ ستون کا سہارا لے کے رک گیا اور ان مے نوشوں کے شراب آلود قہقہے سننے لگ گیا۔ یہ امیر وزیر بظاہر انسان تھے، لیکن بادشاہ کے ہاتھ میں ان کی حیثیت شطرنج کے مہروں سے زیادہ نہ تھی۔ گذشتہ چند برسوں سے وہ ان مہروں کو بساط پہ چلا رہا تھا، مار رہا تھا۔ اس خانے سے اُس میں، اُس سے اِس میں۔ اور ہر بار جیت اُسی کی ہوتی تھی۔ آٹھ کروڑ کھلاڑیوں میں سے کوئی ایک بھی اس کے مقابلے میں جم نہیں سکا تھا۔ ایک طرف آٹھ کروڑ کھلاڑی دوسری طرف وہ اکیلا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ آگ سے کھیل رہا ہے اور آتش فشاں پہاڑ سے بازی لگائے ہوئے ہے لیکن اس کے مہرے کبھی غلط خانے میں گئے ہی نہیں تھے۔

آج وہ ایسی چال چل گیا تھا کہ مات سامنے کھڑی نظر آ رہی تھی اور چال واپس نہیں ہو سکتی تھی۔ ستون کے ساتھ کھڑے اس نے باغیچے میں

اپنے ہنستے کھیلتے مہروں کو دیکھا اور اُسے تلخ سا خیال آیا کہ یہ تو پٹے ہوئے مہرے ہیں۔ اب انہیں سینے سے لگا رکھنے سے کیا حاصل۔ پھر بھی وہ کوئی نئی چال سوچنے لگ گیا۔ اُس نے اپنے پٹے ہوئے مہروں پہ نگاہ دوڑائی اور خالی خانوں کو گہری نظر سے دیکھا۔ بساط پہ اُسے دو مہرے ایسے نظر آئے جو اس کی چال میں نئی سی جان ڈال سکتے تھے۔ اُس نے دماغ پر اس طرح زور دیا جیسے لیموں نچوڑ رہا ہو۔ وہ گرد و پیش سے بے خبر ہو ہی رہا تھا کہ بے ہنگم قہقہوں نے اُسے چونکا دیا۔ وہ ستون کا سہارا چھوڑ کر باغیچے میں جا پہنچا اور شراب میں بدمست وزیروں کو کہا: "تم اب جاتے کیوں نہیں! چلے جاؤ"

وزیر ہنسے پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ سب کی نگاہیں ایک دوسرے سے کچھ پوچھ رہی تھیں۔ انہوں نے بادشاہ کو ہر کیفیت میں دیکھا تھا غصّے میں جلال میں چال چلتے، چال جیتتے، بھوکی ننگی رعایا کی آہ و بکا سنتے، تقریر لکھواتے، تقریر کرتے، رعایا کو وعدے دیتے، وعدوں کو توڑتے، تحفے تحائف قبول کرتے، دوروں پہ جاتے، شاہی سواری میں بیٹھے ہوئے۔ لیکن آج اس کے چہرے پہ جو اکثر بے تاثر رہتا تھا، وہ ایسا تاثر دیکھ رہے تھے جو انہوں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

اس نے پھر کہا: "تم لوگ چلے جاؤ" اور خود ملکہ کے کمرے کی طرف چل پڑا۔

ملکہ قدِ آدم آئینے کے سامنے بیٹھی اپنے بالوں، شکل و صورت اور جسم کا جائزہ لے رہی تھی۔ یوں تو وہ ہر روز اور ہر رات اپنے آپ کو دیکھا کرتی تھی لیکن آج رات اُسے اپنا حُسن کچھ زیادہ ہی نکھرا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ملکہ اپنا سابق خاوند اور شباب کہیں اور ہی چھوڑ آئی تھی اور حسن اور حسن کی تمام رعنائیاں بھی (قدرتی اور مصنوعی) اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ اس کی جوانی وہیں رہ گئی تھی جہاں اس کا خاوند کمانڈر تھا۔ وہ اس وقت بھی کمانڈر ہی تھا جب وہ پہلے خاوند کو چھوڑ کر پہلے اس کی آغوش اور پھر عقد میں آئی تھی اور آج بھی وہ کمانڈر ہی تھا جبکہ وہ ایک ملک کی ملکہ بن چکی تھی۔ آج رات وہ آئینے میں اپنی گزری ہوئی اور گزرتی ہوئی زندگی کو دیکھ رہی تھی لمحہ بہ لمحہ، لحظہ بہ لحظہ۔ اُس نے بھرپور انگڑائی لی۔ اُس نے محسوس کیا کہ اس کے جسم میں وہ اکڑاؤ اور انگڑائی میں وہ ہڈیاں توڑ دینے والی بات نہیں رہی۔ پھر بھی اُس نے جسم کے بچے تلے نشیب و فراز اور دراز قد کو دیکھ کر انگڑائی میں وہ بات پیدا کر ہی لی جو اس کی جوانی کی پہلی انگڑائی میں خود بخود پیدا ہو گئی تھی۔ اُس نے مغرب کے ایک ماہر گیسو آرا کے ہاتھ کے کٹے ہوئے اپنے ریشمی بالوں پر ہاتھ پھیرا آہستہ آہستہ، مبادا کوئی بال جگہ سے بے جگہ ہو جائے یا کوئی سفید بال جو ماہر کی دستبرد سے بچ گیا تھا، سیاہی مائل بھورے بالوں سے باہر نکل آئے۔ بالوں کی ملائمت نے اُسے مخمور سا کر دیا۔ اور وہ اپنے آپ پر رشک کرنے لگی۔

"ہے کوئی عورت جو مجھ جیسی خوش نصیب ہو؟" اس نے سوچا جب جی میں آئی شادی کر لی جب جی میں آئی محبت کر لی۔ ایک عہدہ دار سے کمانڈر اور کمانڈر سے اُس ملک کے ایسے آدمی سے جس کے سر پہ بال ہما کا سایہ تھا۔ وہ عام عورت سے کس قدر مختلف اور بلند و برتر تھی جو زندگی میں صرف ایک بار محبت کرتی ہے۔ ملکہ نے شادی بھی کی، محبت بھی کی، شادی کسی سے، محبت کسی سے۔ امرا و وزرا کی بیگمیں دوسرے ملکوں سے سرخی پوڈر اور لپ سٹک منگوا کر رعایا کو فریب دیا کرتی تھیں اور ملکہ اپنے ملک کی رعایا کے خون سے گالوں اور ہونٹوں کو لال سرخ بنا لیا کرتی تھی۔ دوسری بیگمیں برج، رمی اور ریسیں کھیلتی تھیں اور ملکہ رعایا کے جذبات سے کھیلا کرتی تھی۔ روم کے بادشاہ نیرو نے شہر جلا کے رباب بجائی تھی۔ اس ملکہ نے آٹھ کروڑ دل جلا کے مغربی ناچ ناچا تھا۔ وہ صرف آٹھ کروڑ فریب خوردہ انسانوں کی حکمران نہیں تھی بلکہ ان کے حکمراں کی بھی حکمراں تھی۔

آئینے کے سامنے بیٹھے اُسے وہ وقت یاد آیا جب ایک روز ایک اجنبی صورت مرد، سیاہ فام، مریل سا مرد، اس کے حضور میں سربسجدہ ہوا تھا۔ اور اس کے قدموں میں تیس ہزار روپے کی مالیت کا ہار پیش کیا تھا تو اس نے سونے کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا۔

" اس قدر دلکش سونا میں نے آج پہلی بار دیکھا ہے۔ یہ سونا کہاں سے آیا ہے؟"

اجنبی نے دست بستہ عرض کی تھی۔ " جان بخشی ملکۂ عالم! تاجدار کا قانون اس سونے کی راہ میں حائل ہے۔ آپ کا غلام ایسے سونے کی کشتیاں بھر بھر کر قدموں میں پیش کر سکتا ہے۔" اور ملکہ نے بادشاہ کو کہا تھا۔ " وہ قانون توڑ دو جو اس سونے کی راہ میں حائل ہے۔" اور تاجدار نے حکم دیا تھا۔ "میرا قانون سمندر میں ڈبو دو اور کھجوروں سے لدی ہوئی اُن کشتیوں کا رستہ صاف کر دو۔ جن میں سونا چھپا ہوا ہے۔" اور سمندر نے قانون کو نگل کر سونے کی اینٹیں اگلنا شروع کر دی تھیں۔ ملک کی سب سے بڑی بندرگاہ میں دن دہاڑے سونے سے لدے ہوئے جہاز آنے لگے اور چرس اور افیون سے بھر بھر کر جانے لگے۔ پھر ملک میں آٹا مہنگا ہونے لگا۔

تاجدار نے اعلان کیا۔ "میں اناج سستا کر دوں گا" اور اناج ناپید ہو گیا۔

تاجدار نے اعلان کیا "میں کپڑا سستا کر دوں گا" اور رعایا ننگی ہونے لگی۔

تاجدار نے اعلان کیا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں" اور وعدے ٹوٹ گئے۔

تاجدار نے اعلان کیا۔ "میں نے پرانا قانون توڑ کر نیا قانون بنا دیا ہے" اور دن دہاڑے ڈاکے پڑنے لگے۔

ملکہ نے تیس ہزار کا ہار پہن کر عورتوں کو کہا۔ "میں تمہاری محافظ ہوں"۔ اور شہر میں قحبہ خانے کھل گئے۔

ملکہ کو آئینے میں کیا کچھ نظر نہ آیا۔ وہ آج کی رات بہت ہی مسرور تھی۔ جانے اُسے کیا یاد آنے لگا تھا کہ اس کے عقب میں تاجدار کے قدموں کی آہٹ نے یادوں اور خیالوں کا تسلسل توڑ ڈالا۔ اُس نے گھوم کے نہ دیکھا۔ اپنے عکس کے پیچھے بڑھتے ہوئے عکس کو دیکھنے لگ گئی۔ اُس عکس کے چہرے پر تذبذب اور اضطراب کے آثار دیکھ کر وہ تیزی سے گھومی۔ اٹھی اور حیرت زدہ ہو کے بولی۔ "کیوں؟ آپ پریشان سے دکھائی دے رہے ہیں؟"

"ہاں، ملکہ"! بادشاہ نے کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے کہا: "معلوم ہوتا ہے میں مات کھا رہا ہوں ...." اُس کے لب و لہجے پر اداسی غالب تھی۔ "اپنی چلی ہوئی چال پہ مجھے شک سا ہو رہا ہے۔ کاش! یہ چال واپس ہو جائے"۔

"آپ تو بلا وجہ پریشان ہو رہے ہیں" ملکہ نے اس کے قریب جاتے ہوئے کہا۔ "میری نظر میں آپ کی یہ چال بہترین چال ہے۔ آپ نے جس مہرے پہ ہاتھ رکھا ہے وہ ...."

لیکن بادشاہ کھڑکی کے پردے ہٹا کر سامنے کھجور کے پتوں میں سے دور پرے جھانک رہا تھا۔ جہاں اُسے پوتمپیائی کا آتش فشاں پہاڑ نظر آ رہا تھا۔ وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔

"میرے دل کی ملکہ! سوچا تھا کہ میں نے اُس چوٹی کا منہ بند کر دیا ہے۔ وہ چوٹی جو شب و روز دھواں اگلتی رہتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے اُس کا منہ اور زیادہ کھل گیا ہے۔ جانے .... جانے کیوں؟" وہ اور زیادہ اداس ہو گیا۔ ملکہ کا چہرہ بھی سرخی پوڈر کی تہہ کے نیچے مرجھا سا گیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "جانے کیوں محسوس ہو رہا ہے کہ آج رات یہ پہاڑ مہیب دھماکے سے پھٹ جائے گا، زلزلہ آئے گا، ہمارے محل زمین سے مل جائیں گے اور لاوا ان پر گہری گھنی تہہ جما دے گا۔"

"نہیں تاجدار! یوں کبھی نہ ہو گا"

"خدا کبھی یوں نہ کرے لیکن...." اس کی آواز جو ڈوب چلی تھی ذرا سا ابھری: "لیکن جانے کون مجھے کہہ رہا ہے کہ آج رات یہ پہاڑ پھٹ جائے گا۔ میرے محلات لاوے میں دب جائیں گے۔ ہماری رعایا محفوظ رہے گی اور جب لاوا ٹھنڈا ہو کر جم جائے گا تو رعایا اپنی ہڈیوں پر نئی بستی آباد کرے گی اور کہے گی۔ 'ہم نے بادشاہ اور ملکہ کی لاشوں پر بستی آباد کی ہے'۔ میری ملکہ، میری روح بےچین نہ ہو گی کیا؟ اگر...." بادشاہ چپ ہو گیا اور ذرا سے توقف کے بعد انوکھے سے لہجے میں بولا۔ "اگر یہ پہاڑ پھٹ کر ہم پہ آ پڑا تو تم جاگ تو نہ جاؤ گی؟ بولو ملکہ! میرا ساتھ دو گی؟ میرے ساتھ مرو گی؟"

ملکہ نے لطیف سی ہنسی ہنس کر اُسے اپنے ساتھ لگا لیا، جیسے ماں ڈرے ہوئے بچے کو سینے سے لگا لیتی ہے۔ تاجدار کا دل بے قاعدگی سے دھڑک رہا تھا۔ اُس نے عمر خوردہ گال ملکہ کے بالوں پہ رکھ دیا۔ بالوں کے گداز نے اسے ذرا سا سکون دیا لیکن ملکہ نے اپنا سر ہٹا لیا۔ مبادا کوئی سفید بال باہر نکل آئے یا کوئی بال جگہ سے بے جگہ ہو جائے۔

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ؟" ملکہ نے اسے پیار سے کہا۔ "آپ ہمیشہ تاجدار رہے ہیں اور ہمیشہ تاجدار رہیں گے۔ جس مہرے پہ آپ نے ہاتھ رکھا ہے وہ آپ کی بازی کا محافظ ہے۔ چال خوب ہے ....." ملکہ نے لپک کر کھڑکی کا پردہ گرا دیا اور کہا۔ "اُس پہاڑ کی طرف نہ دیکھئے تاجدار! وہ بے ضرر سا دھواں ہے۔ آپ کی جاہل رعایا کی آہوں، فریادوں اور بھوکے ننگے انسانوں کی سسکیوں کے سوا اس میں کچھ بھی نہیں"۔

"لیکن یہ دھواں شام تک سفید تھا، اب سیاہ ہو رہا ہے۔ ذرا دیکھو ملکہ! چاندنی میں دھواں کس قدر سیاہ ہو رہا ہے۔ میری حکمرانی خطرے میں ہے، میری راجدھانی شاید آج رات ...." وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ بڑھیایا ہوا چہرہ اور زیادہ مرجھا گیا۔

"آپ کی فوجیں تو آج رات ویسے ہی تیار ہیں ..." ملکہ نے اُسے سنبھالا دیا۔ "اگر زلزلہ آ گیا تو وہ سب سے پہلے ہمیں بچائیں گی"۔

"نہیں" تاجدار اور گھبرا کر بولا۔ "فوجوں کا نام نہ لو۔ میں نے انہیں خود بلایا ہے اور انہیں بیدار رہنے کا حکم دیا ہے۔ لیکن .... لیکن .... ملکہ! جب فوجیں بیدار ہو جاتی ہیں تو بادشاہی ابدی نیند سو جایا کرتی ہے۔ تم ٹھیک کہتی ہو فوج میرے حکم سے راجدھانی کا محاصرہ کئے ہوئے ہے مگر فوج کا کماندار ...." تاجدار جیسے اندر ہی اندر لرز گیا ہو۔ بولا۔ "لیکن کماندار شاید وقت پہ ...."

"کماندار؟" ملکہ نے زیر لب کہا اور ہنس دی۔ اُس نے یوں خلاؤں میں دیکھا جیسے اپنی فوج کے کماندار کو دیکھ رہی ہو۔ اس نے اس طرح انگڑائی لی جس طرح قلوپطرہ نے انیٹنی کو دیکھ کر انگڑائی لی تھی مگر ملکہ کی انگڑائی ختم ہونے

سے پہلے ہی سکڑ گئی اور چہرے کا تاثر بدل گیا۔ اُسے تلخ سا خیال آیا کہ وہ قلو پطرہ نہیں۔ وہ اس حقیقت سے آگاہ تھی کہ یہ کماندار پومپیائی پہ جھکے ہوئے آتش فشاں پہاڑ سے زیادہ خوفناک اور قوی ہے۔ اسکی چوٹیوں سے بہتا ہوا لاوا عیش و گناہ کی آغوش میں آباد بستیوں کو چشم زدن میں زمین کی تہوں میں روپوش کر سکتا ہے۔

بادشاہ اداس ہوتا چلا گیا۔ وہ ٹہلتا ٹہلتا قدِ آدم آئینے کے سامنے آکھڑا ہوا۔ اُس نے اپنے عکس کو دیکھا۔ جانے کس نے عکس کے کپڑے اتار کر اُسے برہنہ کر دیا پھر اس کی کھال بھی اُتر گئی اور اُس کا ننگ دھڑنگ ضمیر اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ بادشاہ گھبرا اٹھا۔ اپنے ضمیر کا سامنا کرنے کی اس میں تاب نہ تھی۔ وہ لڑکھڑایا۔ اگر ملکہ اُسے سہارا نہ دیتی تو شاید وہ گر پڑتا۔ اُس نے ملکہ کے لال سرخ ہونٹوں اور لال گلابی رخساروں کو دیکھا تو اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ اس لالی، اس سرخی اور گلابی رنگ میں اس کی رعایا کا خون رچا ہوا ہے۔ اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ ملکہ اس پر جھک گئی۔ بادشاہ نے بند پلکوں کے دھندلکے میں اپنی رعایا کو دیکھا۔ اُسے بہت کچھ نظر آیا لیکن بہت کچھ نظر نہ آسکا۔ اُسے عذرا نظر نہ آئی۔

عذرا پومپیائی کے ایک کونے میں ایک متوسط درجہ کے مکان کے بند کمرے میں بیٹھی زندگی کا آخری خط لکھ رہی تھی۔ اس کے ماں باپ اور بھائی سو گئے تھے۔ نوجوان اور حسین عذرا کے جسم اور چہرے مہرے میں قدرت نے اپنی تمام تر رعنائیاں سمو دی تھیں اور یہ رعنائیاں آج رات اُسے موت سے ہمکنار کر رہی تھیں۔ وہ رو بھی رہی تھی اور خوش بھی تھی۔ رو اس لئے رہی تھی کہ اُسے اپنے محبوب سے نوچا جا رہا تھا۔ اور خوش اس لئے کہ اُسے ایک پناہ گاہ مل گئی تھی ــــ موت، خودکشی!

وہ لکھ رہی تھی:

"میرے محبوب! اپنے وعدوں کی قسم! آج تمہاری محبت پہ قربان ہو رہی ہوں۔ آج وہ پھر آیا تھا۔ سیدھا میرے کمرے میں آیا اور بولا میری دو اور کشتیاں سونا لے کے گودی میں پہنچ گئی ہیں۔ کہتا تھا عذرا! آؤ اور اپنا سونا سنبھال لو۔ میں تمہارے بغیر جی نہ سکوں گا۔ میں نے آج پھر اس کے منہ پہ تھوک دیا ہے لیکن میرے والد اور بھائیوں نے اس سے پکا وعدہ کر لیا ہے کہ دو چار روز بعد میری شادی اس کے ساتھ کر دی جائے گی۔ میرے محبوب! تم تو جانتے ہی ہو کہ سونے کا یہ زمیں دوز سوداگر پانچ نوجوان لڑکیوں کی زندگیاں تباہ کر چکا ہے۔ میں چھٹی ہوں۔ پانچ والدین اپنی بیٹیوں کو سونے کی اینٹوں پہ قربان کر چکے ہیں۔ وہ بوڑھا ہے اور اس پر دولت کا نشہ سوار ہے۔

کاش! میں تمہارے ساتھ بھاگ جاتی مگر اب میں قید ہو گئی ہوں۔ مجھ پر پہرے بٹھا کر مجھے باہر جانے سے روک دیا گیا ہے۔ میرے ماں باپ اور بھائیوں کی آنکھوں اور عقل پر سونے کے پردے پڑ گئے ہیں....

کاش! میں اس قدر حسین نہ ہوتی۔ کاش مجھے تم سے محبت نہ ہوتی۔ میرے محبوب! ایک رات میں تو کوئی انقلاب نہیں آئے گا۔ پومپیائی کا پہاڑ آج رات تو نہیں پھٹے گا۔ ہمارے ملک کا مرا ہوا قانون آج رات تو زندہ نہیں ہو سکے گا۔ انصاف بھی مر گیا ہے۔ گھر والوں نے مجھے سونے کے اس سوداگر کے لئے قید کر لیا ہے لیکن میں بھاگ رہی ہوں۔ میں صرف کل دن کا انتظار کروں گی۔ میری ایک سہیلی نے مجھے بہت تیز زہر لا دینے کا وعدہ کیا ہے۔ کل صبح وہ زہر لا رہی ہے اور جب یہ خط تم تک پہنچے گا میں خدا کے حضور میں پہنچ چکی ہوں گی۔

رات آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی اور عذرا تیزی سے لکھتی جا رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اکیلی نہیں۔ جانے اس جیسی کتنی حسین اور کنواری جوانیاں سونے کی بھینٹ چڑھا دی گئی ہیں اور چڑھائی جا رہی ہیں۔ اُس نے آنسو پونچھے اور بے تابی سے دعا کی۔ "اے زلزلوں کے دیوتا! اس پہاڑ کو آج ہی رات پھاڑ دے اور پومپیائی کو غرق کر دے۔ اے آگ کے دیوتا! اس قدر آگ برسا کہ سونا پانی بن کر بہہ جائے"۔ اس کی دعا جلی ہوئی طویل آہ کا دھواں بن کر پہاڑ کی چوٹی سے اٹھتے ہوئے دھوئیں میں جا ملی اور تحلیل ہو گئی۔

عذرا نے ماں باپ کو کہہ دیا تھا کہ وہ دولت کی دہلیز پہ قربان نہیں ہو گی۔ سونے کا بوڑھا سوداگر اس کے اعلان سے آگاہ تھا۔ آج رات وہ عذرا کے ہاں آیا تو عذرا نے اس کی بے عزتی بھی کی اور سب کے سامنے کہہ دیا تھا۔ "بڑے میاں! میری لاش سے ہی بیاہ رچاؤ گے۔ جیتے جی تمہاری بیوی نہ بنوں گی"۔ اور بوڑھے سوداگر نے چیلنج قبول کرتے ہوئے فیصلہ کر لیا کہ گو ــــ عذرا کے ماں باپ نے ہاں کر دی ہے۔ پھر بھی کیا بھروسہ۔ اس کے علاوہ وہ عذرا کو بتانا چاہتا تھا کہ وہ اسے زندہ اٹھا لے جا سکتا ہے۔

اُس نے اپنے محل نما مکان میں جا کر بشیرے کی طرف پیغام بھیجا۔ بشیرا بادشاہ نہیں تھا، وزیر نہیں تھا، منصف اور قاضی نہیں تھا۔ کوتوال اور قانون بھی نہیں تھا، وہ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی پومپیائی کا قوی ترین انسان تھا۔ کیونکہ وہ

بادشاہ اور اس کے وزیروں کا گہرا دوست تھا اور اُن کی ہر مشکل کے وقت مدد کیا کرتا تھا۔ اس کا گروہ اِدھر کا سونا اُدھر کی چرس، یہاں کی افیون اور وہاں کی لڑکیاں اس کے امیروں وزیروں اور اہل کاروں میں برابر تقسیم کیا کرتا تھا۔ ایک بار بادشاہ اس پر اس قدر خوش ہوا کہ اُسے بے دریغ انعام دینے کا فیصلہ کر لیا۔ بادشاہ نے سوچا زر و جواہرات اور جاگیروں میں انعام کوئی بات نہیں ہوتی۔ آخر کار بادشاہ نے اپنے قانون کو توڑ کر قانون کے قیمتی ٹکڑے بشیرے کو انعام میں دے دیئے جو اُس نے اپنے گروہ میں تقسیم کر دیئے۔ ٹوٹے ہوئے قانون کے ان ٹکڑوں میں دیو کے بالوں والی طاقت تھی جنہیں ہاتھ میں لے کے رگڑو تو دیو حاضر ہو جاتا ہے اور ہر حکم بجالاتا ہے۔ بشیرے اور اس کے گروہ نے ان ٹکڑوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ جہاں کہیں ان کے آدمی کسی لڑکی یا بچے کو اغوا کرتے یا ڈاکہ ڈالتے یا جیب کاٹتے یا دنگا فساد کرتے یا سرِ عام کسی کو قتل کرتے یا کسی کے گھر میں گھس کر بہو بیٹیوں کو بے آبرو کرتے یا شمال سے چرس اور جنوب سے لڑکیاں سمگل کرتے یا مغرب سے سونا اور مشرق سے کپڑا لاتے، پکڑے جاتے تو وہ انعام میں ملے ہوئے قانون کے ایک ٹکڑے کو ہاتھ میں لے کے ذرا سا رگڑتے اور قانون کے محافظ اندھے ہو جاتے ہتھکڑیاں ٹوٹ جاتیں۔

عذرا کے امیدوار سونے کے سوداگر نے بشیرے کو بلا کر کہا آج شام کچھ روز میں آئے ہوئے سونے میں سے چوتھائی حصہ اُس کا ہوگا۔ اگر وہ عذرا کو آج ہی رات اٹھا لائے۔ بشیرے نے جواب دیا۔ "سودا منظور ہے لیکن کام کل رات ہوگا کیونکہ آج رات شمال سے میرا اپنا مال آرہا ہے۔ بہت سارے آدمی اُدھر مصروف ہیں۔ اور بہت سے ایک ہارے ہوئے وزیر کے گھر چلے گئے ہیں۔ اس کی پارٹی کا کل جلسہ ہو رہا ہے جس میں یہ وزیر تقریر کر رہا ہے۔ اسے میرے آدمیوں کی ضرورت ہے۔ کیونکہ وہاں نعرے لگانے والا کوئی نہیں اور اس وزیر نے چند روز ہوئے ایک حریف پارٹی کے جلسے میں فساد برپا کروایا تھا۔ اب وہ پارٹی اس کے جلسے کو خراب کرنے کا اعلان کر چکی ہے"

"دو آدمی دے دو" سوداگر نے کہا۔ "دو ہی کافی ہیں۔"

"آج میں اکیلا ہوں۔" بشیرے نے کہا۔ "چار آدمی ایک سیٹھ کے گھر ڈکیتی کے لئے جا رہے ہیں۔ اس سیٹھ نے انتخابات میں ہمارا آدمی ہرا دیا تھا۔"

"بشیرے دوست! صرف دو آدمی۔" سوداگر نے منت کی

"جناب کل پہ چھوڑ دیجئے۔" بشیرے نے تسلی دی۔ "میرے پاس صرف دو آدمی ہیں۔ وہ سو رہے ہیں۔ کل وہ پردہ زنانہ کالج سے ایک لڑکی کو اٹھائیں گے، ایک عہدہ دار کے ساتھ سودا طے ہو گیا ہے۔"

"تم خود ہی میرا کام کر دو بشیرے۔" سوداگر نے التجا کی۔

"میں خود بھی نہیں جا سکتا۔" بشیرے نے کہا۔ "میں اس وقت پندرہ بیس چھوٹے چھوٹے لڑکوں کو جیب تراشی اور اٹھائی گیری کی ٹریننگ دیا کرتا ہوں، وہ آنے ہی والے ہیں۔"

عذرا نے خط ختم کر کے لفافے میں بند کیا اور گہری نیند سو گئی۔ موت کی آغوش کے تصور نے اس کے تھکے ہوئے اعصاب کو سہلا دیا تھا۔ اُسے امید تھی کہ صبح ہی صبح اس کی سہیلی زہر لے آئے گی اور وہ خودکشی کر کے سونے کے بوڑھے سوداگر سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو جائے گی۔

"تو پھر کل ضرور" سوداگر نے بشیرے سے ہاتھ ملایا۔

"پہلے کبھی وعدہ خلافی ہوئی ہے؟" بشیرے نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ "آپ کا گروہ مال سمیت پکڑا گیا تھا تو میں متعلقہ وزیر کے پاس جا کر انہیں چھڑوا نہیں لایا تھا؟ جاپانی روڈ کی بہترین چیز آپ کو کوڑیوں کے دام نہیں دلوائی تھی؟ آپ چوتھی بار حج سے واپس آئے تھے تو میرے آدمیوں نے آپ کا مال صحیح سلامت آپ کے اڈے پر نہیں پہنچا دیا تھا؟ آپ کی تیسری بیوی آپ جیسے ایک 'حاجی' کے ساتھ بھاگ گئی تھی تو میرے آدمی دونوں کو اغوا کر کے نہیں لے آئے تھے؟ بادشاہ تک آپ کا سلام اور تحفہ نہیں پہنچا دیا تھا؟ پھر آپ کیوں فکر کرتے ہیں؟ عذرا کل رات آپ کے قبضہ میں ہوگی۔ اور ہمارا مال...."

"اپنا مال پیشگی لے لو بشیرے! سمگلر ہوں بے ایمان نہیں ہوں۔"

بشیرا چلا گیا تو سوداگر نے شراب کی ٹھنڈی یخ بوتل نکال کر جام بھرا اور منہ سے لگا لیا۔ شراب کی بو میں اُسے عذرا کے کنوارے بالوں کی بھینی بھینی خوشبو آنے لگی۔

جب جام ہونٹوں سے الگ ہوا تو ملکہ نے لپک کر جام تھام لیا۔ بادشاہ نے رومال سے ہونٹ پونچھے۔ اُسے سکون سا محسوس ہوا۔ ملکہ کے گدرائے جسم اور شراب کی بُو نے اُسے سنبھال ہی لیا۔ ملکہ نے ایک اور جام بھر کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ بولی۔ "آپ کی یہ چال بہترین چال ہے۔"

بادشاہ دو حصوں میں بٹ گیا۔ وہ خوش تھا کہ اُس نے وہ چال چلی ہے کہ اس کی بادشاہی ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئی ہے۔ اور متفکر اس لئے تھا کہ یہ شہ چال اُسے بساط پر سر کے بل ہی نہ پٹخ دے۔ اس کے سامنے دو حقائق کھڑے تھے جو اس کی شہنشاہیت پر مہیب خطرہ بن کر لٹکتے رہتے تھے۔ ایک آتش فشاں پہاڑ جس کی چوٹی سے ابل ابل کر نکلتا ہوا دھواں آج رات سیاہ اور گھنا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اور دوسرا اس کی فوجوں کا کمانڈر جو پہاڑ سے زیادہ خوفناک تھا۔

اُس نے ایک سے محفوظ رہنے کے لئے دوسرے کو بیدار کیا تھا مگر خدشہ تھا کہ دونوں ہی بیدار نہ ہو جائیں۔

پوہمپیائی کے پہاڑ سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کے بادل محلوں اور جھونپڑیوں کے اوپر سے گذرتے جا رہے تھے۔ آج رات اس دھوئیں میں جو بدبو اور سڑاند تھی وہ پہلے سے کہیں زیادہ تھی۔ جب یہ گلا سڑا دھواں اصغری کے جھونپڑے کے اوپر سے گزرا تو تعفن میں اضافہ ہو گیا کیونکہ اصغری کی بے بس آہ و زاری اور کچلی ہوئی نسائیت کی ہچکیاں اس میں شامل ہو گئی تھیں۔ اصغری کا خاوند اصغری کو دو بچے دے کر خود قید خانے میں مر گیا تھا مگر اس لئے نہیں گیا تھا کہ وہ اس قدر بزدل اور کم ہمت تھا بلکہ اس لئے کہ اسے کسی ایسے جرم میں پھانس لیا گیا تھا کہ جو ایک درباری کے رشتہ دار نے کیا تھا۔ اور بھوکے ننگے انصاف کے پیٹ میں اصغری کے بےگناہ خاوند کو جھونک دیا گیا تھا۔ وہ رسوائی اور بے انصافی کے صدمے کی تاب نہ لاتے ہوئے قید خانے میں ہی مر گیا تھا۔ اصغری کے دونوں بچے بیمار تھے۔ گھر میں روٹی نہ پانی نہ پیسہ! اصغری جوان بھی تھی اور خوش شکل بھی۔ جوان نہ بھی ہوتی تو یہ بدنصیبی کیا کم تھی کہ وہ عورت تھی، بے بس اور مجبور عورت۔ اُس نے بیمار بچوں کے سرہانے بیٹھے اور ان کا سر دباتے تین راتیں گزار دی تھیں۔ آج تیسری رات بڑے بچے کی حالت بگڑ رہی تھی۔ "ماں! کچھ دے دو۔ بھوک لگی ہے" ـــ بچے کی کراہتی ہوئی آواز اُسے یوں سنائی دی جیسے موت کی وادی میں کوئی دور بہت نیچے بھولا بھٹکا تھکا ہارا مسافر "پانی پانی" پکار رہا ہو۔

اصغری کے آنسو نکل آئے۔ چولھے پرسوں سے ٹھنڈے پڑے تھے اور اصغری کا دل جل رہا تھا۔ اُس کے ذہن میں کئی بار آئی ہوئی، ہر بار دھکیلی ہوئی بات ایک بار پھر آ گئی۔ "تمہارا کیا جائے گا۔ جسم محنت مشقت کے لئے ہوتا ہے، یہ بھی تو محنت ہی ہے۔ دو چار روپے ہاتھ آجائیں گے" اور اصغری جو ہر بار اس گھناؤنے خیال پہ جھینپ جایا کرتی تھی آج رات سنجیدگی سے سوچنے لگ گئی۔ اُسے پڑوسن کے خاوند کا خیال آیا جو دائم المریض تھی اور اس کا خاوند اصغری کو بھوکی پیاسی نگاہوں سے دیکھا کرتا تھا۔ اصغری نے آج رات بیمار بچوں کے سرہانے بیٹھے فیصلہ کر لیا کہ وہ کل صبح ہی اُسے کہے گی۔ "مجھے یوں نہ دیکھا کرو۔ میری جھگی میں آجانا اور پانچ سات روپے لیتے آنا" ساتھ ہی اُسے پسے ہوئے مرچ مصالحے کے سوداگر کا خیال آگیا جو پسی ہوئی سرخ مرچوں میں ملانے کے لئے غریب اور نادار عورتوں سے اینٹیں پسوایا کرتا تھا۔ ایک روز وہ اس کے پاس ملازمت کے لئے گئی تھی تو سوداگر نے اُسے مسکرا کر کہا تھا:

"تمہیں کام نہ دیں تو اور کسے دیں گے۔ اُس طرف چلو، میں آتا ہوں"۔ اور وہ گودام کے اُس کونے کی طرف چل پڑی تھی جہاں چار پانچ نادار سی عورتیں اس کی طرف دیکھ دیکھ کر دکھیاری سی ہنسی ہنس رہی تھیں اور اینٹیں پیس پیس کر پسی ہوئی لال مرچوں میں ملا رہی تھیں۔ سوداگر نے اُسے ایک اور کمرے کی طرف اشارہ کر کے آنکھ مار کر کہا تھا۔

"اری پگلی! پہلے اس طرف چلو نا!" اور وہ وہاں سے بھاگ آئی تھی۔

پھر اُسے پپیتوں کے بیجوں کا بھی خیال آیا۔ اُسے معلوم ہوا تھا کہ کالی مرچوں میں ملانے کے لئے دکاندار پپیتے کے خشک بیج خریدتے ہیں۔ ایک روز وہ دن بھر فٹ پاتھوں پر بیج چنتی رہی تھی لیکن دکاندار کے پاس گئی تو اُس نے اس کا ہاتھ دبا کر کہا تھا۔ "تم تو ان بیجوں کے بغیر ہی آجاتیں۔ تمہاری جوانی کی قسم! منہ مانگے دام دیتا"۔ اور اصغری ایسی بدحواس ہو کے بھاگی تھی کہ پپیتے کے بیج سڑک پہ بکھر گئے تھے، جنہیں دکاندار کے چھوکروں نے چن کر کالی مرچوں میں ملا لیا تھا۔

اُسے کوے پکڑنے کا بھی خیال آیا۔ وہ جانتی تھی کہ جھونپڑیوں کی اس بستی کے دو آدمی کوے پکڑ کر اُنہیں ذبح کرتے ہیں اور بال و پر صاف کر کے چار چھ آنے فی پرندہ مقامی ہوٹلوں میں بیچ آتے ہیں اور ہوٹلوں والے انہیں بھونے ہوئے چوزے اور تیتر کے نام پر اڑھائی تین روپے فی پرندہ لوگوں کو کھلا دیتے ہیں۔ مگر اصغری کے لئے کوے پکڑنا آسان نہ تھا۔

جھگیوں کے قریب خوردہ مکینوں سے وہ سنتی رہتی تھی کہ اس ملک کے مچھندر کس کس طرح روٹی کما رہے ہیں۔ اُسے کسی نے مشورہ دیا کہ بڑے بڑے ہوٹلوں کی استعمال شدہ چائے پتی چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں اور چائے فروشوں کے ہاں بکتی ہے لیکن اس روزگار کی راہ میں بھی اس کی نسائیت اور ایک بڑے ہوٹل کے بیرے کی پیاسی نگاہیں حائل ہو گئی تھیں۔ آج رات تو وہ اس قدر شکست خوردہ ہو چکی تھی کہ وہ انہی رال ٹپکاتے مردوں کی پناہ میں چلے جانے کے متعلق سوچنے لگ گئی۔

دیا ٹمٹمایا اور بجھ گیا۔ جھونپڑے میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ اصغری کے ذہن میں وہ اندھی گلیاں آگئیں جن کے قصے سن کر وہ ان لڑکیوں اور عورتوں کے متعلق سوچا کرتی تھی جو ان گلیوں میں گم ہو جاتی ہیں۔ اُس نے سوچا وہ اسی کی طرح بے بس عورتیں ہوں گی جو کسمپرسی کے عالم میں بھٹکتی ہوئی انہی اندھیری پناہ گاہوں میں جا چھپی ہوں گی۔ آج رات اُس نے اپنے آپ کو ان گلیوں کے اندھیروں میں بھٹکتا ہوا پایا۔ جانے کس نے اس کے سینے سے ہی اٹھ کے کہا "کاش! کوئی مجھے انہی گلیوں کی راہ دکھا دے۔ شاید بچوں کے لئے دواؤں اور روٹیوں کے پیسے مل جائیں" وہ انہی گلیوں میں خیالوں ہی خیالوں میں گھوم ہی رہی تھی کہ ایک موڑ پر اُسے اپنا مرحوم شوہر دکھائی دیا ـــ خاوند کی بھٹکتی ہوئی روح، اس کا مظلوم پیار! اصغری کے سینے میں عورت بیدار ہو گئی۔ وہ یکبارگی اٹھ بیٹھی جیسے کسی عظیم خطرے کے مقابلے میں جم گئی ہو۔ اُس نے جھونپڑی

دورِ انقلاب

(ایک تمثیلی پیشکش   نقش : صادقین)





سحر سے پہلے:
" انسان ہر کہیں آزاد پیدا ہوتا ہے لیکن وہ ہر جگہ پابہ زنجیر ہے!" روسو
انقلاب اکتوبر سے پہلے پاکستان میں بھی جمہور پابہ زنجیر تھے۔



طلوعِ سحر:
تیز تر صنعتی ترقی



بیش از بیش فروغ تعلیم



ترقی نسواں



دورِ عدل



نئی نسل ، نئی روح



پنج گوشہ ستارۂ سحر (بنیادی جمہوریت)



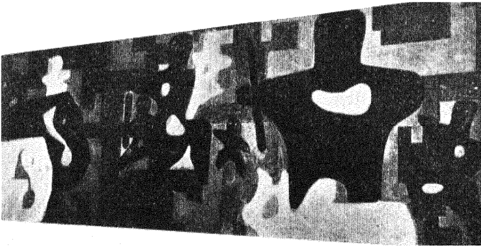
" عالم تمام مطلع انوار ہو گیا!"

خاتون پیکر تراش مس نویرہ احمد

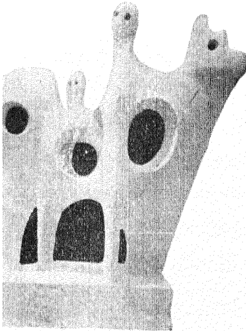
پچھلے دنوں ڈھاکہ میں پاکستان کی پہلی خاتون پیکر تراش، مس نویرہ احمد کے تراشے ہوئے متعدد فنی پیکروں کی نمائش منعقد ہوئی جو ملک میں اپنی نوعیت کی پہلی نمائش تھی

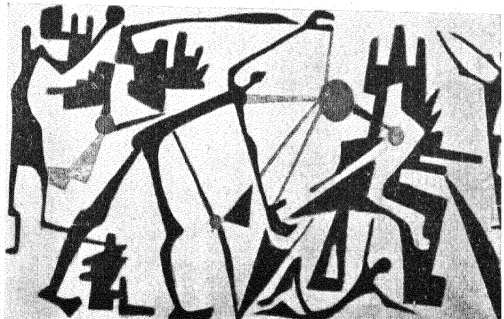


فنکار اور اس کا سٹوڈیو



سنگ تراشی کا نفیس کام (مرکزی پبلک لائبریری ڈھاکہ)





ہیئت تراشی کی نئی وضع

کے اندھیرے میں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور چلا کر کہا۔ "یا خدا! آج ہی رات اس آگ اگلتے پہاڑ کو پھاڑ دے۔ جلا کے راکھ کر دے پوتمیپائی کو۔ یہ دکھیاری بچوں سمیت تیرے حضور میں آنا چاہتی ہے۔ یا اللہ! یہ تیرے بچے ہیں۔ انہیں سنبھال لے"۔ اور اس کی آواز ہچکیوں میں دب گئی۔

اُس نے خوفناک دھماکہ سنا، پھر دل ہلا دینے والی گرج جیسے پوتمیپائی پہ جھکے ہوئے پہاڑ کا سینہ پھٹ رہا ہو اور چٹانوں کے وزنی پتھر لڑھکتے چلے آرہے ہوں لیکن یہ دھماکہ اور یہ گرج کراہتی ہوئی ایک نحیف آواز میں سمٹ آئی۔ "ماں! روٹی نہیں تو پانی ہی دے دے، مر رہا ہوں"۔

اصغری نے بھاگ کر گھڑے کو الٹا کیا۔ گھڑا خالی تھا۔ صراحی بھی خالی تھی۔ اُس شام نل پر اُسے ایک میل لمبی قطار میں آخری جگہ ملی تھی اور نل صرف دو گھڑے پانی اگل کر شوں شپ شش شول اور سُوں سُوں کر کے ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا تھا۔ اصغری نے دیکھا تھا (اور یوں ہر صبح اور ہر شام ہوتا تھا) کہ دو گھڑے بیک وقت نل کی طرف بڑھے تھے لیکن بھرا ایک بھی نہ جا سکا تھا کیونکہ دونوں گھڑے والے باری پہ لڑ پڑے تھے اور پانی کسی کے بھی حصے میں نہ آیا تھا۔ نل کا پانی بہہ گیا تھا خون کے قطرے بہہ گئے تھے۔ اصغری نے ایک بار پھر گھڑے کو الٹا کیا لیکن پانی کی ایک بوند نہ ملی۔

سونے کے سوداگر نے بوتل کو جام میں الٹا کیا تو جام بھر گیا اور اُس نے منہ سے لگا لیا۔

اصغری نے ایک بار پھر صراحی اٹھائی، ہلائی اور جھنجھوڑی لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

بادشاہ نے جام خالی کیا تو ملکہ نے پھر بھر دیا۔

بچے نے پھر ہچکی لی ۔۔۔ "ماں! ایک گھونٹ پانی"

بادشاہ کے باغیچے میں شراب کی خالی اور آدھی بوتلیں بکھری ہوئی تھیں، وزیر جا چکے تھے۔ رات لطف سے زیادہ گزر چکی تھی۔

اونچے اونچے محلات اور چوڑی چوڑی سڑکوں کے اس شہر کے سائے میں میں ان گنت جھونپڑے، خشک گھاس پھونس، مٹی اور ریت کے جھونپڑے، ایک دوسرے کے سہارے ایستادہ سرگوشیاں کر رہے تھے۔ امیروں، وزیروں کے محلات گہری نیند سو رہے تھے اور ان کے شراب میں نہائے ہوئے خراٹے پانی کی بوند کو ترستے انسانوں کی سسکیوں میں تحلیل ہو رہے تھے۔

"زمین ذرا سی کانپی نہیں تھی؟" مٹی کی ایک جھگی نے دوسرے سے پوچھا۔

"شاید..." دوسری جھگی نے جواب۔ "شاید ہوا کا یہ جھونکا زیادہ تیز تھا"۔

"چپ رہو ذرا..." کچھ پرے گھاس پھونس کا ایک جھونپڑا بولا۔ "آوازیں سنو! جیسے پہاڑ سے پتھر لڑھک رہے ہیں"۔

"نہیں بھائی! یہ سمندر کا شور ہے"۔

"اکتوبر کے مہینے میں سمندر میں اتنا جوش کہاں۔ لہریں سو رہی ہیں"۔

"معلوم ہوتا ہے جیسے پہاڑ پھٹ رہا ہے۔ آگ اگل رہا ہے۔ دیکھنا ذرا"۔

"میں کیسے دیکھوں؟" جھگی نے جواب دیا "میرے آگے اتنا اونچا مکان کھڑا ہے کہ پہاڑ نظر نہیں آرہا"۔

"یہ کیا ہے؟" ایک اور جھونپڑے نے چونک کر کہا۔ "یہ فوج تو نہیں؟"

"ہاں، یہ فوج ہی ہے"۔ گدلے پانی میں ایستادہ ایک اور جھونپڑا وثوق سے بولا۔ "یہ فوج ہے۔ شاید بادشاہ نے بلائی ہے"۔

"کیوں بلائی ہوگی بھلا؟"

"بادشاہوں کی مرضی۔ نیند نہیں آتی ہوگی تو دل بہلانے کے لئے فوج بلائی ہوگی"۔ جھگی نے کہا۔

"ایک نظر دیکھے گا تو نیند آجائے گی"۔

"کہیں ہمیں اکھاڑ دینے کو تو فوج نہیں آئی؟" ننھی سی جھونپڑی نے تیز ہوا سے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"یہ بھی ممکن ہے۔ شاید کسی امیر نے محل بنانے کے لئے جگہ مانگی ہوگی"۔

"اور بادشاہ نے یہ جگہ دان کر دی ہوگی"۔

"دیکھا نہیں تھا کہ اُس روز اس طرف والے جھونپڑے گرا دیئے گئے ہیں اور اس جگہ امیروں، وزیروں کی بیگموں نے جانے کیا تماشہ یا بازار یا شاید نمائش لگائی ہے؟"

"ہم کب تک اس غلیظ پانی میں کھڑے رہیں گے؟" ایک جھونپڑی نے پوچھا۔

"جب تک ہماری چھتوں تلے سونے والے زندہ ہیں"۔ ایک عمر رسیدہ جھونپڑے نے جواب دیا۔

"وہ کب تک زندہ رہیں گے؟"

"جب تک ان میں مشقت اور فاقہ کشی کی تاب ہے"۔

"کیا کوئی ایسا قانون ہے جس کے تحت جھگی جھونپڑوں کو گرا کر ان پر محل کھڑے کر دیئے جاتے ہیں؟"

"تم کیا سمجھتے ہو، ہمارے ارد گرد، ہمارے اندر اور باہر جو کچھ ہو رہا ہے وہ کسی قانون کے تحت ہو رہا ہے؟"

"سنا ہے یہاں بھی قانون ہوا کرتا تھا۔"

"وہ بادشاہ اور اس کے وزیروں نے انعام و اکرام میں تقسیم کر دیا ہے۔"

"کن میں؟"

"جو اُن کے جلسے جلوسوں میں نعرے لگاتے ہیں۔ اور دنگا فساد کرتے ہیں۔"

"وہ کون لوگ ہیں؟"

"جو راتوں کو چوری چکاری اور ہر طرح کا گناہ کرتے ہیں" معمر جھونپڑے نے کہا اور چونک کر بولا۔ "چپ ہو جاؤ ذرا۔ یہ فوج سڑک پہ رک کیوں گئی ہے؟ وہ دیکھو فوجی ٹولیوں میں بکھر گئے ہیں۔"

"ہاں! وہ بکھر گئے ہیں" جھگی نے آہستہ سے کہا۔ "وہ دیکھو چند فوجی بندوقیں سنبھالے چوک میں کھڑے ہو گئے ہیں۔"

"شاید کوئی خطرہ ہے۔"

"شاید رات زلزلہ آنے والا ہے۔ بادشاہ کو ہر خطرے کا پہلے سے علم ہو جاتا ہے۔"

"دیکھو ملکہ!" بادشاہ نے کھڑکی میں جا کے دیکھا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "وہ آ گئے ہیں۔ میرا کمانڈر آ رہا ہے۔ میں اسے باہر ہی ملتا ہوں۔"

"آپ پھر گھبرا گئے ہیں؟" ملکہ نے بادشاہ کو پیار سے کہا۔ "فوج کو آپ ہی نے تو بلایا ہے۔ کمانڈر کو حکم دیجئے کہ پومپیائی کو ہر خطرے سے محفوظ کرے۔ پہاڑ پھٹنے کی صورت میں لاوے کو شہر سے باہر ہی روک لے یا کم از کم محل تک نہ آنے دے۔"

بادشاہ نے حکم دینا چاہا لیکن اس کا حکم لرز سا رہا تھا۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ عذرا اور اصغری کی جگر پاش دعائیں ہزاروں لاکھوں عذراؤں اور صغریوں کی فریاد بن کر خدا کے حضور میں پہنچ چکی ہیں۔ لکھوکھا بیمار اور پانی کی بوندوں کو ترستے بچوں کی پیاسی سسکیاں عرش کا سینہ چاک کر چکی ہیں۔ سونے کے زمین دوز سوداگر اور لٹیرے کے گروہ کے گناہوں کے بوجھ سے آسمان جھک آیا ہے۔ آج کی رات ابلیس سو گیا ہے۔ پھانسی پہ چڑھنے والے بے گناہوں کی روحیں آج رات پومپیائی پہ منڈلا رہی ہیں اور قید خانوں میں بند ہزاروں بیگناہ محبوسین کا واویلا خدا نے سن لیا ہے۔ کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں اور گڑھوں میں مرتے ہوئے سینکڑوں نوزائیدہ بچوں کی روحیں خدا کے حضور میں کھیل رہی ہیں۔

وہ بچے آج رات سوئے بھی نہیں۔

پومپیائی کی آخری رات کے بطن سے سحر جنم لے رہی تھی کہ آتش فشاں پہاڑ دھماکوں کا تسلسل بن گیا۔ جلتا بھنتا اور جلاتا بھونتا ہوا لاوا شہر کی طرف بہنے لگا جیسے اُبلتے ہوئے سمندر کا رُخ کسی نے شہر کی طرف موڑ دیا ہے۔ تپتی ہوئی چٹانیں اور بڑے بڑے وزنی پتھر بہے چلے آ رہے تھے۔ پتھر چلے آ رہے تھے، لاریوں میں، ٹرکوں میں، جیپوں میں، بکتر بند گاڑیوں میں، ٹینکوں میں، پیدل بھی، موٹر سائیکلوں پر بھی۔ پومپیائی کے محلات بنیادوں سے اکھڑنے لگے، جھونپڑے دبک کے بیٹھ گئے۔ سمندر ساحل کو چھوڑ کے پیچھے ہٹ گیا۔ سونے کے زمین دوز سوداگروں نے اینٹیں اٹھا کر تہہ خانوں کا رُخ کیا لیکن چٹانوں نے سرک کر تہہ خانوں کے منہ بند کر دیئے۔

اونگھتے ہوئے ستاروں نے دیکھا کہ پومپیائی کا وہ شہر جہاں کی راتیں جاگتی تھیں اور دن اونگھتے تھے زمین میں روپوش ہوتا چلا جا رہا تھا۔ لاوا بہتا چلا آ رہا تھا۔ اور شہر یُوں آسمان کی نظروں سے اوجھل ہوتا جا رہا تھا جیسے کوئی کسی غلط لفظ پر سیاہی پھیر رہا ہو۔ جب سورج نکلا تو اُسے زمین پر پومپیائی نظر نہ آیا۔ آتش فشاں پہاڑ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ رات اس نے تمام تر دھواں اور سینے کا غبار اگل دیا تھا اور آج پہلی بار اطمینان کی نیند سو رہا تھا۔ پومپیائی اور اس کے گناہوں کو ہمیشہ کی نیند سلا کر۔

جب سورج کی کرنیں اس ٹھنڈے لاوے پر بکھرنے لگیں جس کی تہوں میں ایک شہر روپوش ہو گیا تھا تو کرنیں سہم کے ایک طرف ہو گئیں کیونکہ لاوے میں حرکت ہو رہی تھی جیسے ریت میں دبا ہوا کوئی انسان باہر نکلنے کی کوشش کر رہا ہو یا جیسے بند تابوت کے اندر لاش باہر نکلنے کو ہاتھ پاؤں مار رہی ہو۔

کرنیں ایک طرف ہو گئیں۔ سورج جہاں تھا وہیں رک گیا۔ معجزہ رونما ہو رہا تھا۔ مٹی کی کوکھ میں سے انسان جنم لے رہا تھا۔

سورج نے دیکھا، فضا میں اڑتے پرندوں نے دیکھا، مغرب کی ہواؤں نے دیکھا اور تمام دنیا نے دیکھا کہ زمین پہ جما ہوا یخ بستہ لاوا جگہ جگہ سے پھٹنے لگا اور اس میں سے ایک بستی سر نکالنے لگی۔ چند ہی لمحوں بعد بستی ابھر کر زمین پہ آ گئی۔ یہ عذرا اور اصغری کی بستی تھی۔ یہ انسانوں کی بستی تھی جن کی مظلوم فریادیں، خاموش آہیں، بہہ بہہ کے خشک ہوتے ہوئے آنسو، لوٹی ہوئی دولت پہ لٹی ہوئی عصمتوں کی پکار، سونے کی سیج پر قربان ہونے والیوں کے بَین آتش فشاں پہاڑ میں جل جل کر، دھواں دھار بن بن کے پومپیائی پہ دھاڑتے اور پھیلتے رہتے تھے۔ یہ نئی بستی جو لاوے میں سے ابھری تھی پومپیائی کی ہی مانند تھی، وہی گہما گہمی

(باقی صفحہ ۸۶ پر)

بنگلا افسانہ:

آتشِ خاموش!

عبد الغفار چودھری
مترجم: احمد سعدی

وہ عجیب و غریب فطرت کا آدمی تھا۔ کشادہ چہرہ، جوان اور تنومند، ایسا کہ جی چاہتا تو یونہی پانچ سات آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا۔ لیکن وہ بہت کم باتیں کرتا اور کرتا تو اتنے زور سے کہ معلوم ہوتا اس کے لہجے میں ذرا بھی لوچ نہیں اور اس کی باتوں کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا تو جس طرح بلی کے نرم پنجے سے جس طرح تیز اور نوکیلے ناخن باہر نکل آتے ہیں اسی طرح اس کی سنجیدگی کے پردے میں سویا ہوا وحشی انسان جاگ اٹھے گا۔ اس کی باتوں میں نغمگی۔ پیار یا محبت کا شائبہ تک نہ تھا۔ بچوں کے ساتھ جس لہجے میں باتیں کرتا بڑوں کے ساتھ بھی اسی لہجے میں گفتگو کرتا۔ اس کے لہجے سے نہ تو کوئی خوف ظاہر ہوتا تھا نہ عقیدت۔ اسی لئے اس کی باتوں سے اس کے مزاج کو سمجھنا بہت مشکل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تمام لوگ اس سے کھنچے کھنچے رہتے تھے۔

بڑے زمیندار جلیل میاں تو صاف لفظوں میں کہتے "یہ آدمی چنڈال ہے یا کیا ہے۔ لوگوں کے ساتھ ان کے حسب مرتبہ باتیں کرنا تو جانتا ہی نہیں۔ دل چاہتا ہے کسی دن اسے خوب مزہ چکھاؤں پھر سوچتا ہوں رہنے دو غریب نیچ ذات کا آدمی ہی تو ہے۔"

گاؤں کے لوگ بھی حیرانی سے سوچتے اس آدمی کی آواز میں ذرا بھی لوچ لچک نہیں — آواز کے ساتھ تو دل کا براہ راست بڑا گہرا تعلق ہے۔ دکھ کے احساس سے آواز بھرا جاتی ہے۔ خوف سے کانپ اٹھتی ہے اور خوشی میں ولولہ آمیز ہو جاتی ہے۔ لیکن سورج کی آواز اتنی بڑی حقیقت کو جھٹلا رہی تھی۔

وہ جلیبیاں بیچتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بلا کی پھرتی تھی۔ کوئی دکان وکان نہ تھی۔ ہاٹ میں ایک جھونپڑی کے اندر مٹی کے چولہے پر کڑھائی چڑھا کر جلیبیاں تلتا تھا اور وہیں صبح یا شام لگنے والے بازار میں بیچ دیتا تھا۔ لوگ کہتے تھے اتنی اچھی جلیبیاں شہر کے حلوائی بھی تیار نہ کر سکتے تھے۔

مگر اس کی جلیبیوں کی خوبیوں کے معترف خریدار بھی جب آ کر اس سے پوچھتے:

"مٹھائی کا کیا دام ہے بھائی" تو وہ کرخت لہجے میں جواب دیتا "دو روپیہ سیر"۔

"کچھ کم نہیں کرو گے"

"نہیں" — اس کے بعد وہ کوئی بات نہ کرتا۔

اور کبھی کبھی جب شہر میں زیادہ داموں پر خرید کر مٹھائی کھانے والا خریدار آ کر اس سے پوچھتا "تمہاری جلیبیاں تو تازہ معلوم ہوتی ہیں، خوشبو بھی سوندھی سوندھی ہے۔ ڈھائی روپے سیر کے بھاؤ سے دو تو آدھ سیر دے دو" شہر کے نامی حلوائیوں کے مقررہ بھاؤ سے وہ کچھ کم کر کے ہی کہتا۔

سورج سر ہلاتے ہوئے جواب دیتا "نہیں صاحب دو روپیہ سیر کے حساب سے آدھ سیر کا دام ایک روپیہ دیجئے"۔

شہری خریدار حیران ہو کر پوچھتا "کیا کہا، دو روپیہ؟ پھر اس کے معنی یہ ہوئے کہ تمہاری مٹھائی اچھی نہیں۔ چاول کے آٹے اور چنیا بادام کے تیل سے تیار کی ہے، کیوں؟"

سورج کڑھائی میں کرچھل ہلاتے ہوئے کہتا "یقین ہو تو لیجئے نہیں تو نہ لیجئے میں ایمان نہیں بیچتا"۔

اس کی کرخت آواز سے خریدار کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہتی۔

اسی لئے زبان سے نہ کہنے کے باوجود بہت سے لوگ اس سے خوف کھاتے تھے۔ یہاں تک کہ زمیندار جلیل میاں تک اس سے ڈرتے تھے۔ اس کے علاوہ اس کا ڈیل ڈول منہا تھو بھی تو ایسا ویسا نہ تھا۔ اگر وہ چاہتا تو کسی کی ہڈی پسلی توڑ کر رکھ دیتا۔ اور پھر تھانہ پولیس جو کچھ بھی ہو تو وہ بیک بات کی۔

سورج کا باپ گاؤں کا مشہور مستری تھا لیکن بہت دن ہوئے

اس کا انتقال ہو چکا تھا۔ اب گھر میں ایک وہ تھا اور ایک اس کی بیوہ ماں اس کے علاوہ دنیا میں اس کا کوئی بھی نہ تھا۔ اس کے گھر میں جو ناریل کے پیڑ تھے ان سے ڈاب اور ناریل توڑ کر کچھ خود کھاتا اور کچھ بازار میں بیچ دیتا۔ دھان کا کھیت اس نے بٹائی پر دے دیا تھا اور خود جلیبیاں تلتا تھا۔ اس کے علاوہ نہ تو وہ کوئی اور کام کرتا نہ کسی کے پھٹے میں پیر اڑاتا۔ اور نہ کسی کی پرواکرتا اسی لئے کچھ لوگ اس سے مذاق کرتے ہوئے اسے "گلیوں کا کنہیا" کہتے تھے۔

لیکن کنہیا کی فطرت میں اس صنف کے لئے ناپسندیدگی ہی ناپسندیدگی تھی۔ پسند کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دی تھی۔ لڑکیوں کے معاملہ میں وہ بالکل بے نیاز، بے حس اور سرد مہر واقع ہوا تھا۔ اس کی ماں کچھ عرصے تک بہو کا منہ دیکھنے کی خواہش ظاہر کرتے ہوئے بکتی جھکتی رہی لیکن جب اسے یقین ہو گیا کہ پتھر میں جونک نہیں لگ سکتی تو وہ تھک ہار کر خاموش بیٹھ رہی تھی۔

لیکن یہی سورج ایک دن خود چراغ میجی کے یہاں پہنچ گیا۔ میجی ظہر کی نماز پڑھ کر بیٹھا اپنا کرتا رفو کر رہا تھا۔ جسے وہ جمعہ کی نماز یا دوسرے کام کاج کے وقت پہنا کرتا تھا۔ سورج کو دیکھ کر اس نے کہا کیا بات ہے کہیں راستہ تو نہیں بھول گئے۔

"نہیں" سورج نے سر ہلا کر دہلیز کے ایک کونے میں بیٹھتے ہوئے کہا:۔

"تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں چچا"۔

"باتیں — بیٹھو بیٹھو۔ کہو کیا بات ہے؟"

"تمہیں ایک رشتہ طے کرنا ہوگا"۔

"شادی — کس کی — تمہاری؟"

"ہاں"۔

میجی یکایک زور سے ہنس پڑا۔ "کٹھ بڑھئی بھی جس درخت میں ٹھونگ مار کر کوئی اندازہ نہ لگا سکا کہ اس درخت کی لکڑی کیسی ہے، تو یہ سخت پیڑ کس کو دیکھ کر اتنا نرم ہو گیا ہے بھتیجے"۔

سورج نے آنکھیں جھکائے بغیر جواب دیا "لطیف چاکلادار کی لڑکی زیتون کو تم نے دیکھا ہے"۔

"زیتون! ستیاناس!" میجی دنگ رہ گیا۔

سورج نے بھنوئیں سکیڑ کر پوچھا "تم ڈر کیوں گئے"۔

میجی تھوڑی دیر سوئی کی نوک کو تکتا رہا۔ پھر بولا "یہ زیتون کا خیال چھوڑ دو۔ میں اسی گاؤں کا اگوا ہوں۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے جلیل میاں خود زیتون سے شادی کرنے کا منصوبہ بنائے ہوئے ہیں۔ لطیف چاکلادار غریب آدمی ہے اسے راضی کر کے لڑکی سے رشتہ کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔

"مگر جلیل میاں تو بوڑھے آدمی ہیں" سورج نے سر جھٹک کر کہا "ان کی تین بیویاں بھی موجود ہیں"۔

"پر بڑے آدمیوں کو تین چار شادیاں کرنے سے کون روک سکتا ہے"۔

"کم از کم تم کہہ کر تو دیکھو۔ انہیں کچھ خرچ نہیں کرنا پڑے گا۔ سب میں پورا کر دوں گا"۔

میجی نے پھر کرتا رفو کرتے ہوئے کہا۔ اگوا کو کہنے میں کیا حرج ہے لیکن مجھے یقین نہیں ہے کہ میں تم سے انعام لے لوں گا"۔

اتنی دیر میں سورج وہاں سے جا چکا تھا۔

چاند نکلنے سے پہلے آسمان کا رنگ کیسا ہوتا ہے۔ دکھن کی طرف سے ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے چلتے ہیں اور طلوع ہوتے ہوئے چاند کی خوبصورتی آسمان سے دن بھر کی اداسی کا رنگ پونچھ کر حیرت انگیز خوبصورتی بکھیرتی ہے، ٹھیک اسی طرح ایک دن ہاٹ سے واپس لوٹتے ہوئے راستے میں سپاری کے پتے سے گھرے ہوئے تالاب کے کنارے زیتون کو دیکھ کر سورج کے تمام جسم میں برقی لہر سی دوڑ گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی ایک انجانی سی ترنگ حسن کی جھلک اس کے چہرے کی سختی پر آہستہ آہستہ موجوں کی طرح چھا گئی تھی۔ جلیبی تلتے وقت اس دن کھولتے ہوئے تیل میں بار بار وہی چہرہ ابھر آتا تھا۔ لیکن انسان کا دل بھی کتنا عجیب ہے۔ سورج جیسے آدمی نے زیتون سے شادی کرنے کی پیشکش کی۔ یہ سن کر بھی جلیل میاں نے نہ تو پریشانی ظاہر کی نہ خفگی بلکہ بڑے خوبصورت انداز میں دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولے "ٹھیک ہے۔ اتنے دنوں بعد اس چنڈال کا دل دماغ کچھ بدلا ہے"۔

اس کے بعد انھوں نے کھسیا کر اپنے گماشتہ کو بلایا اور اسے سامنے کھڑا دیکھ کر ہنس کر بولے "تمہیں معلوم ہوا کچھ، امین الدی"۔

امین الدی نے معاملہ کی نوعیت کو سمجھتے ہوئے کہا "چیونٹی کو پر

نکلے حضور۔" ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ تم لوگ نیک کام میں رکاوٹ مت ڈالو۔ صرف لطیف چاکلا دار کو بلا لاؤ۔ بے چارا غریب آدمی ہے اس خوشی کے موقع پر اسے دو چار روپے ملنے چاہئیں۔ آہا! اس کی لڑکی کیلے ہے پری ہے پری! بغیر پروں کے پری!" جملہ پورا کرنے کے بعد خود کو سنبھال کر وہ اس طرح ہنسے جیسے وہ طنز کر رہے ہوں۔

چراغ میمی خوشی سے ناچتا ہوا اپنے لمبے کرتے کو سمیٹتے سورج کی دہلیز پر چڑھا اور بولا "میٹھی کھلی کھلاؤ بھائی لو بیٹیا چاکلا دار ایک ہی بات میں راضی ہو گیا۔ لیکن ایک شرط ہے۔"

سورج کی ماں پان لگا رہی تھی۔ سورج نے داؤ[1] سے سپاری کاٹتے ہوئے پوچھا "کیا؟"

"نقد پانچ سو روپیہ، یکمشت ساس سسر کو نذرانہ دینا ہوگا۔"

"نذرانہ! کیا سمجھے؟ چاکلا دار نے کہا اس کی دس پانچ نہیں صرف ایک لڑکی ہے۔ وہ بھی خدا کے فضل سے صورت شکل میں کوئی ایسی گئی گذری نہیں۔ اچھا داماد بغیر ڈھونڈے بہت ملتا ہے۔ تم جب اتنا اصرار کرتے ہو تو پانچ سو روپیہ دے کر ساس سسر کا منہ میٹھا کرانا ہوگا۔"

سورج نے اسی طرح دھیمے لہجے میں جواب دیا "بہت اچھا۔"

میمی سے بھی زیادہ حیرت زدہ ہو کر اس کی ماں نے اس کی طرف دیکھا لیکن پھر خود کو سنبھال لیا۔ وہ کچھ نہیں بولی۔ پتھر کے بت کی طرح خاموش رہنے والے لڑکے نے خود ہی شادی کا خیال ظاہر کر دیا۔ اگر اس نے روپے کی بات اٹھائی تو کون جانے وہ پھر پہلے کی طرح پتھر کا بت نہ بن جائے۔

لیکن سورج نے اس بات کو ذرا بھی اہمیت نہ دی چھ مہینے کے وعدہ پر پانچ سو روپیہ قرض لے کر اسے ادا کرنے میں کتنی دیر لگے گی۔ گھر میں جو پیڑ تھے ان کے پھلوں اور بٹائی کی زمین کی پیداوار سے گھر کا خرچ چل جائیگا۔ اور روزانہ جلیبیاں تل کر ان کی آمدنی سے چھ ماہ میں روپیہ ادا کر دینا کوئی بڑی بات نہیں۔ ٹھیک ہے۔ زیتون کے گھر آنے پر گھر کا خرچ بڑھ جائے گا۔ بڑھنے دو۔ روزی دینے والا خدا ہے۔ جس نے پیدا کیا ہے وہی روزی میں بھی ترقی دے گا۔"

وہ چلچلاتی ہوئی دھوپ کی کبھی پروا نہیں کرتا تھا۔ آج بھی اسکے جسم پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ کام ناگ کے پیڑ کے نیچے جہاں روز دوپہر کو پتوں کا سایہ رہتا تھا اور وہ کبھی کبھی جلیبیوں کا بوجھ سر سے اتار کر آرام کرتا تھا آج وہ وہاں بھی نہیں رکا۔ درخت کے پتے یادِ الٰہی میں بے خبر کسی فقیر کی طرح بے حس و حرکت ہو چکے تھے۔ دھوپ کی شدت سے زمین تپ گئی تھی لیکن سورج نے جلیل میاں کی بیٹھک میں پہنچ کر اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھا اور قمیض کا بٹن کھول کر ہاتھ سے پنکھا کرنے لگا۔

جلیل میاں دھیرے سے مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آہا! بیٹھو! بیٹھو! ڈاب[1] کاٹ کر دوں۔"

خبر نہیں سورج کو حیرت ہوئی یا نہیں اس نے کہا "جانے دیجئے میں آپ سے پانچ سو روپیہ قرض مانگنے آیا ہوں۔ چھ مہینے میں ادا کر دوں گا۔"

جلیل میاں نے اپنی طنز یہ مسکراہٹ گڑگڑی کے پیچھے چھپالی۔

"پانچ سو روپیہ قرض مگر معاملہ کیا ہے شادی بیاہ کرو گے کیا؟"

"جی لطیف چاکلا دار کی لڑکی زیتون سے۔"

"الحمدللہ بیاہ شادی کے کام سے خدا بھی خوش ہوتا ہے۔ آدمی گناہ سے بچتا ہے اس کام کے لئے بھلا میں پانچ سو روپیہ دینے پر راضی نہیں ہوں گا۔ کیا کہتے ہو ا— تم جانتے ہی ہو کہ شادی کرنے سے آدمی کا ایمان سلامت رہتا ہے۔"

اس کے بعد انہوں نے فوراً آواز دی "امین الدی!"

امین الدی (امین الدین) کے سامنے آجانے پر وہ بولے "تم نے کچھ سنا۔ سورج کی شادی ہو رہی ہے۔ اسے پانچ سو روپیہ ابھی گن کر دے دو۔"

امین الدی نے حیرت سے پوچھا لیکن کچھ بھی تو نظر نہیں آتا کوئی بندھک[2]۔ زمین، جائداد، یا گھر کا گہنا، زیور!"۔

میں نے کیا کہا! نہیں سنا!" جلیل میاں کو یکایک غصہ آگیا۔

"بیاہ شادی کا معاملہ ہے تم جاؤ۔"

امین الدی کے واپس آتے ہی انہوں نے اپنے سامنے پڑے ہوئے ایک چھوٹے سے بکس سے ایک موٹا سا کھرکھراتا ہوا کاغذ نکالا اور بولے "تم نے جتنا روپیہ لیا ہے اس جگہ لکھ کر دستخط کر دو۔ روپیہ پیسہ کا معاملہ ہے۔ تم تو سمجھتے ہی ہو اصولی کام کرنا اچھا ہوتا ہے۔"

---

[1] داؤ = بڑا چھرا۔

[1] ڈاب = کچا ناریل جس کا پانی یہاں کا مقامی مشروب ہے جیسے مغربی پاکستان میں لسی۔ (مدیر) [2] بندھک = ضامن

سورج نے سر ہلا دیا" یہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دستخط وستخط مجھے نہیں آتا۔ جو کچھ لکھنا ہو خود ہی لکھ لیں۔"

جلیل میاں پھر دھیرے سے مسکرائے" اچھی بات ہے۔ جب تم خود کہتے ہو تو ایسا ہی سہی۔" کاغذ پر دو تین سطریں لکھ کر انہوں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور کہا:

" ہاتھ ادھر لاؤ" انگوٹھے پر اچھی طرح سیاہی مل کر انہوں نے اس کے انگوٹھے کا نشان کاغذ پر لے لیا۔ پھر بولے" اب جاؤ۔ لیکن شادی میں مجھے ضرور بلانا۔"

اگر سورج کو حیرت کے اظہار کی عادت ہوتی تو شاید اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہتی لیکن چونکہ اس کی فطرت ہی میں یہ بات نہ تھی اس لئے اس کا اس پر زیادہ اثر نہ ہوا۔ جلیل میاں نے ذرا سا کہنے پر اسے پانچ سو روپئے نکال کر دے دئیے اس کے متعلق سوچنے کا اسے موقع ہی نہیں ملا۔ سورج روپیہ دیکھتے ہی سب کچھ بھول گیا۔ یہاں تک کہ اسے اپنے انگوٹھے کا نشان لگانے کی اہمیت کا بھی کوئی خیال نہ رہا۔ وہ ناممکن کو ممکن بنانے ہی تو آیا تھا۔ اس نے سوچا تھا اگر رضامند نہ ہونگے تو اپنی زمین گروی رکھ دے گا۔

سورج کے چلے جانے پر جلیل میاں ہنسے" امین الدی!"

امین الدی کے چہرے پر ہلکی سی جنبش ہوئی۔ جلیل میاں نے انگوٹھے کا نشان لگا ہوا کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا" معاملہ سمجھ رہے ہو تم۔ تمہارے سوا میں کسی دوسرے پر اعتماد نہیں کرتا۔ چاول کے بھوسہ میں اس کا کاغذ کو اچھی طرح دبا کر رکھ دو تاکہ پانچ ہی دن میں پانچ سال کا پرانا معلوم ہو۔ سمجھ گئے تم معاملہ؟"

امین الدی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا" نہیں۔"

جلیل میاں کو یکایک غصہ آگیا" تمہاری سمجھ میں کیوں آئے گا۔ پھر بھی ہر جگہ کہتے پھرو گے کہ میں زمینداری کے کام سے واقف ہوں اور زمیندار کے سررشتہ کا نائب ہوں۔ چھی اچھی[1]! تمہارے بال کیا دھوپ میں سفید ہوئے ہیں؟"

مگر جلیل میاں اپنا لہجہ تبدیل کر کے ہنسے اور کہنے لگے" میں اگر چاہتا تو زیتون سے دھوم دھام سے بھی شادی رچا سکتا تھا مگر اب میں صرف نکاح کی رسم چپ چاپ ادا کروں گا۔ کیسے۔؟ اسے دیکھنے کے لئے ذرا ٹھہرے رہو۔ یوں اچھا ہی ہوا کہ اس کی شادی سورج سے ہو گئی ورنہ گاؤں والے لمبی چوڑی باتیں بناتے۔ مجھے پہلی تین بیویوں کا طعنہ دیتے۔ مگر میں اب جو نکاح کروں گا تو لوگ بس یہ سمجھیں گے کہ میں نے اس پر رحم کھا کر اپنے قدموں میں پناہ دی ہے۔ یوں ابھی میری عمر ہی کیا ہوئی ہے جو خدا کی مرضی ہوتی ہے وہ بات ہو کر رہتی ہے۔ اس میں مَیں اور تم کیا کر سکتے ہیں؟!"

زیتون بھی سورج کے دل کی گہرائی کی تھاہ نہ پا سکی۔ اس کے بازوؤں میں بے پناہ قوت تھی۔ لیکن اس کا چہرہ بالکل پتھر کی طرح جذبات سے عاری تھا۔ خوبصورت نقش و نگار سے آراستہ بستر پر بچھی ہوئی گدڑی پر چاندنی کرچی کے پیڑ سے چھن چھن کر پڑ رہی تھی۔ رات کے آخری سمے، شب بھر جاگنے والی چڑیا بول رہی تھی" بو کو تھا، کُو، بو کو تھا، کُو۔"

مگر زیتون کو عجب انسان سے واسطہ پڑا تھا۔ چہرہ مثل پتھر کے ہر جذبہ سے خالی، ہر احساس سے ناآشنا۔ ایک کرخت بے حس خشک بے پروا چہرہ۔ بازوؤں کی پوری قوت سے وہ اسے اپنے آغوش میں خود پناہ دیتا مگر لب و چشم نہ محبت کے پیامی بنتے نہ چہرہ سے پریم رس کی دھار پھوٹتی نہ میٹھے بول منہ سے نکلتے۔ دلنوازی و دل ستانی کیا چیز ہوتی ہے وہ بے حس تودۂ سنگ اس سے بالکل عاری دکھائی دیتا تھا۔ زیتون حیران تھی کہ اس جیسے انسان سے نباہ کیسے ہوگا۔ اس بت سے وہ زندگی کس طرح نبھائیگی۔

دھوپ کرچی کے پیڑ سے چھن چھن کر کمرے میں جھانک رہی تھی۔ مرغیاں ٹاپے سے باہر نکل کر کٹ کٹ کٹ کر رہی تھیں، بطخیں دانے پانی کے لئے چیخ رہی تھیں۔ یہ تالاب میں نہانے کا وقت تھا لیکن آج سورج بستر چھوڑ کر اٹھنے کو تیار نہ تھا، ہر روز وہ مرغ کی بانگ سے قبل ہی اٹھ جاتا تھا۔ زیتون کا حجاب اب تک ختم نہیں ہوا تھا مگر وہ ماں سے بھی کچھ نہ کہہ سکتی تھی۔ آخر بڑی مشکل سے اس نے سورج کے قریب آکر اسے جگایا" یہ کیا؟ اٹھو گے نہیں بہت دن چڑھ آیا ہے۔"

" اب سویرے اٹھنے کی کوئی ضرورت نہیں" سورج نے سیدھا سادا جواب دیا" چینی کا پرمٹ بند ہو گیا ہے" زیتون نے پریشان ہو کر پوچھا" کینو؟" (کیوں؟)۔

---

[1] چھی اچھی! حرف تضحیک و تنفر

"جلیل میاں کی مرضی۔ مجھ سے کہہ رہے تھے ملک میں چینی کی بڑی قلت ہے۔ اسی لئے حکومت نے ہم لوگوں کا پرمٹ بند کر دینے کا حکم دے دیا ہے۔ اب فی آدمی کے حساب سے راشن کارڈ پر جو کچھ بھی ملے۔"

زیتون کی پریشانی ختم نہ ہوئی۔ اس نے پوچھا "پھر ہم لوگوں کا کیا ہوگا؟" اس وقت تک اس کا حجاب ختم ہو چکا تھا۔

"اب کیا ہوگا؟" سورج کی سرد آواز سنائی دی۔ گڑ کی جلیبیاں آج کل کوئی نہیں کھاتا۔ چینی کی کمی کی وجہ سے اب جلیبیاں نہ بنا سکوں گا۔ لیکن میں نے سنا ہے یہ سب زمیندار کی شرارت ہے۔ حکومت کا حکم وکم کچھ نہیں ہے۔ وہ مجھے نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ اس معاملہ کے سچ جھوٹ کا پتہ چل جائے گا۔ پھر میں سالے کے پوت کو دیکھ لوں گا۔"

تمام باتیں وہ بغیر کسی جوش اور غصہ کے یوں کہہ گیا جیسے وہ زیتون کو "بدیع الجمال" کی پوتھی پڑھ کر سنا رہا ہو۔ صرف تھوڑی دیر تک اس کی کرخت آواز گونجتی رہی۔

لیکن وہ جلیل زمیندار کو نہ دیکھ سکا۔ دو ماہ بعد ہی سورج کے نام عدالت سے سمن آگیا۔ سورج نے دو سال قبل جلیل میاں سے ایک ہزار روپیہ قرض لیا تھا۔ اس کی ادائیگی نہ ہونے کی وجہ سے جلیل میاں نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ روپیہ قسطوں میں ادا کرنے کی شرط تھی۔ لیکن آج تک اس نے ایک قسط بھی ادا نہ کر کے دستاویز کی شرائط کی خلاف ورزی کی تھی۔ یہ بات اتنی حیرت انگیز تھی کہ سورج کے پتھر جیسے سخت چہرے پر بھی اس کی جھلک صاف دکھائی دے رہی تھی اور زیتون اس سے بھی زیادہ حیران ہو کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

سورج کی زمین میں نئے دھان کی فصل یوں تیار کھڑی تھی جیسے کہہ رہی ہو فصل کاٹنے کا موسم آگیا ہے۔ کرنوں کی طرح سنہری، ہوا کی لہروں کی طرح مست اور چاند کی چاندنی کی طرح خوبصورت دھان کے پودے لہرا رہے تھے۔ یہ دھان اوکھلی میں کوٹا جائے گا اس میں سے چاول نکلے گا چاول میں دودھ اور چینی ملا کر میٹھا پکایا جائے گا سب اسے کھائیں گے دھان کے خوشے اور اس کے بھوسے میں مرغیاں چاول کے ٹوٹے دانے تلاش کرتی پھریں گی لیکن نگاہوں کے سامنے یہ سب کچھ بھی نہ ہوگا۔ اگر عدالت کی طرف سے ڈگری ہو گئی تو جلیل میاں قرض کے نام پر تمام فصل کاٹ لیں گے گھر کی چیزیں قرق ہوں گی اور اس کے بعد فاقہ کشی کی ایک طویل مدت کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ جلیبیوں کی دکان ختم ہو ہی چکی ہے۔

دھان کی فصل بھی ہاتھ نہ آئیگی۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ اور غصہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ سورج جلیل میاں کی بیٹھک کی طرف چل پڑا۔

"آپ نے یہ کیا کیا ـــ اتنی بڑی بے ایمانی!"

"روپیہ لے کر تم انکار کر رہے ہو میرے پاس تمہارے انگوٹھے کا نشان لگا ہوا کاغذ موجود ہے اس کے گواہ بھی ہیں پورا پورا ثبوت موجود ہے۔"

"ثبوت کہاں ہے میں نے تو ہزار روپیہ نہیں لیا ہے۔ صرف پانچ سو روپیہ لیا ہے۔ وہ بھی چھ مہینے کے وعدہ پر۔" جلیل میاں کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ "آنکھیں لال کرنے سے کچھ نہ ہوگا میاں، اب اگر تم مجھے جان سے بھی مار دو تو عدالت تو بند نہ ہوگی۔ جو کچھ ہونا ہے ہو کر رہے گا۔ بہتر ہے اپنا غصہ ٹھنڈا کرو، سنو۔"

"کہئے۔"

جلیل میاں نے سورج کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کھینچ لیا۔ پھر دھیرے سے مسکرائے "دماغ ٹھنڈا کرو۔ تم نے زیتون سے شادی کر لی ہے۔ اس لڑکی میں جو بھی خوبی ہے اس کا تم اتنے دنوں میں اندازہ کر چکے ہو گے بہت دنوں سے میں خود اس سے شادی کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ تم میری راہ میں آگئے، خیر۔ تم بھی آدمی ہو۔ تمہارا جو پچھلا ہو چکا۔ اب یہ کہہ کر کہ تمہاری بیوی کا چال چلن ٹھیک نہیں یا ایسا ہی کوئی الزام لگا کر اسے طلاق دے دو۔ یہ بات تمہارے اور میرے درمیان ہی رہے گی۔ میں تمہارا معاملہ صاف کر دوں گا۔"

نفرت اور بے پناہ غصہ سے سورج کے پتھر جیسے سخت چہرے پر بھی اساڑھ کے آسمان کا رنگ چھا گیا جسے دیکھ کر جلیل میاں بھی سہم کر رک گئے۔ آہستہ سے بولے "ماتھا[۱] ٹھانڈا کورو۔ میری بات پر غور کر کے دیکھو۔ ورنہ دوسرا طریقہ تو موجود ہے ہی۔ اس وقت مجھے کون روکے گا؟"

دوسرے طریقہ کے معنی جیل اور سورج جیل جانے کے بعد...

اپنی حیرانی کو کم کرنے کی کوشش کئے بغیر سورج نے پوچھا "میری بیاہتا بیوی سے آپ نکاح کریں گے؟"

جلیل میاں ہنس پڑے "تمہاری بیاہتا بیوی! سب یہی کہیں گے کہ تم جاتے وقت بیوی کے کھانے کپڑے کے خیال سے پریشان ہو کر

۱؎ ماتھا = سر۔ ٹھانڈا = ٹھنڈا۔ کورو = کرو۔ "سر ٹھنڈا کرو" یعنی غصہ تھوک دو۔

اسے تین طلاق دے گئے ہو۔ اس کے گواہ ہوں گے۔ ثبوت . . . . ."
وہ اپنا جملہ پورا نہ کرسکے۔ ایک زور دار تھپڑ تڑاق سے ان کے گال پر پڑا اور قبل اس کے کہ جلیل میاں سنبھلیں اور آمین الدی چیختا ہوا وہاں تک پہنچے سورج بیٹھک سے باہر جا چکا تھا۔

زندہ رہنا ہوگا جیسے بھی ہو اسے زندہ رہنا ہوگا شیطان کے ساتھ شیطانی کر کے بے ایمانوں کے ساتھ مناسب کارروائی کر کے زندہ رہنا ہی ہوگا۔ سورج جیسے پاگل ہو چکا تھا۔ غم، غصہ، نفرت، حیرت اور خوف کے ملے جلے جذبات کا ایک طوفان اس کے سینے میں ابل پڑا۔ اس کے چہرہ کا رنگ ہر لمحہ بدل رہا تھا۔

زیتون گھر کے باہر کھڑی ہوئی تھی شوہر کو دیکھتے ہی وہ بے اختیار رونے لگی۔ بولی میں سب جانتی ہوں۔ مجھ سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ تم مجھے چھوڑ دو۔ تمہاری دہائی ہے! میرے لئے اپنا مان، اپنی عزت، گھر دوار، زمین جائداد کیوں گنوا رہے ہو؟

اس کے ساتھ ہی ایک زور دار تھپڑ اس کے گال پر بھی آ کر پڑا۔ زیتون نے بڑی مشکل سے اپنا چہرہ اٹھایا اور دیکھا کہ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی دو آنکھیں اسے دیکھ رہی تھیں جن میں ناقابل برداشت غصہ، بے پناہ نفرت اور درد و غم کی بے اندازہ پرچھائیاں جھلک رہی تھیں۔

کتنے حیرت کی بات تھی۔ پتھر جیسے بے حس اور بے جان چہرے پر آج یکایک اتنی حرارت کہاں سے آ گئی تھی۔ کیا اس کے چہرے کا سنگین سکوت، وہ ظاہری بے حسی اسی دن کے لئے بیدار ہونے کو مچل رہی تھی؟ اس پتھر کو آج کس احساس نے روح دے دی تھی؟ حیرت کے مارے زیتون کو اپنا رونا تک یاد نہ رہا! ✽

★

بنتِ شیر

شیر افضل جعفری

شیر افضل کی زبان اس کی اپنی زبان ہے۔ ایک آزاد، مست الست ملنگ کی زبان۔ جو کسی بات، کسی اصول کی پروا نہیں کرتا۔ "اردوئے معلّٰی" سے کوسوں دور! ایک نئی زبان، نئی فضا، نئے مزاج، نئے تخیل کی طرف! اگر ہم اسے قبول کریں تو لامحالہ اس کی زبان کو بھی قبول کرنا پڑے گا۔ (مدیر)

یہ نوبہار زندگی
دَہی کی روح ناب ہے

یہ جام جام انگبیں
طہور کا جواب ہے

یہ جھانولوں میں نور کا
رُکا رُکا چناب ہے

یہ رشکِ آبِ نارِیل
یہ غیرتِ گلاب ہے

دلوں کے ریگ زار کا
یہ موتیا سحاب ہے

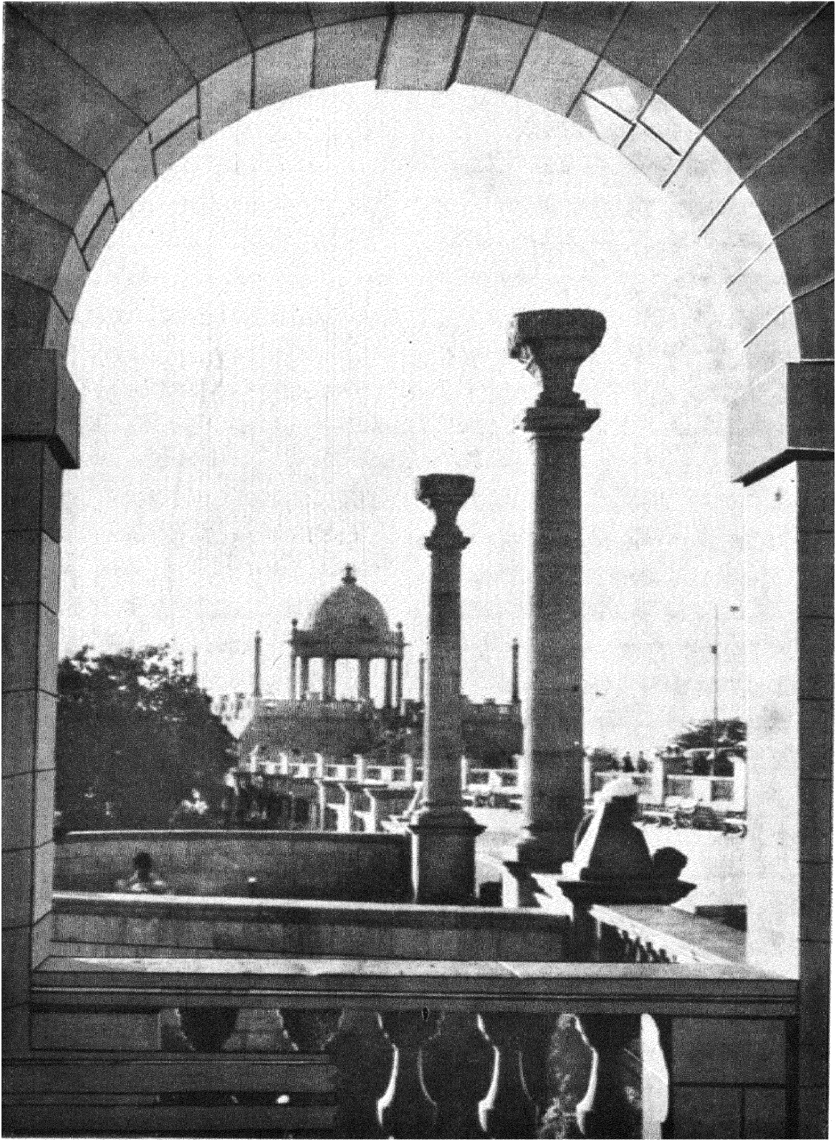
خمار کی اُجل پری
جوانیوں کا خواب ہے

کرن کی پور پور کی
یہ نور نور راب ہے

بدن میں اس کی بوند بھی
سمندرِ شباب ہے

یہ کیوڑے کی چاندنی
یہ حُسن کی جناب ہے

یہ بنتِ شیر جھنگ کے
ملنگ کی شراب ہے



یہ کیسا طلسمی دریچہ کھلا ہے ؟
نیا عالم خلدوش رونما ہے

رنگین عکس : تشبیہہ الحسن

افسانہ:

ماضی کے جزیرے

محمد عمر میمن

آج شام بھی اِیلفی جوان تھی، کسی عروسِ نو کی مانند لجائی لجائی سی، شرمائی شرمائی سی، زرق برق!

چہل پہل بڑھ چکی تھی۔ اس حسین وقت تمہیں وہاں کتنے ہی شوخ، سرسراتے آنچل مل جائیں گے۔ شنیل، ایوننگ اِن پیرس، مسچیف کی تیز خوشبوؤں میں بسے ہوئے ملبوس۔ اور جب تم ان کے پاس سے گزرو گے تو بے اختیار تمہارے قدم کچھ عجیب اضطراری انداز میں ان کے تعاقب میں چل نکلیں گے۔ اور اس وقت تمہاری حالت اس ذرے کے اس ذرے سے مشابہ ہوگی جو غیر ارادی طور پر دیوانہ وار مقناطیس کی جانب لپکتا ہے۔

وہ بہت دھیمے قدموں سے جارہا تھا۔ یہاں تک کہ شام ڈوب گئی۔ ایک موڑ پر اچانک اس کی نظریں اٹھیں اور کسی پر جھک گئیں۔ کیا یہ حقیقت ہے یا کوئی خواب؟ کیا وہ کسی الف لیلوی کردار کی طرح طویل نیند سے تو آج بیدار نہیں ہوا؟

"نجمہ!" وہ حیرت، مسرت، اور اچنبھے کے ملے جلے احساس سے مغلوب ہو کر دل ہی دل میں بڑبڑایا۔ تین سال بیت گئے، تین طویل سال۔ تین برساتیں، تین خزائیں۔ اور آج اچانک یوں چلتے چلتے، نجمہ اسے کسی موڑ پر یکلخت مل جائے گی، اسے اس کا گمان بھی نہ تھا۔

اس نے دیکھا وہ اب بھی جوان تھی، خوبصورت تھی، آج بھی اس کی آنکھوں میں جھانک کر ایک فرحت بخش ٹھنڈک کا احساس ہوتا تھا۔ اور آج بھی اس کے جسم کے حسین اور تیکھے خطوط کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا۔ روئے زمین پر وہ خالق کائنات کی مکمل ترین تخلیق ہے۔ جس کے عنبریں آنچل کے سائے میں اس کا فن خود اپنی اس حسین تکمیل کو دیکھ کر حیرت زدہ سا ہے۔ لیکن ان طویل تین سالوں میں وہ خود کس قدر بدل گیا تھا۔ اتنا کہ اگر کوئی اتنی مدت گزرنے کے بعد اسے دیکھتا تو پہچان نہ سکتا!

وہ چلتا رہا، اس کے قدموں کے پیچھے پیچھے۔ زندگی اور شام لوگ اور ایلفی سب جوان تھے۔ یکایک اسے محسوس ہوا وہ کہاں چلا آیا ہے۔ اس گرم محفل میں وہ اپنے کو انتہائی مضمحل محسوس کرنے لگا۔ وہ ایک نیم روشن سا گوشہ تھا جہاں اس نے اپنی آواز میں مسرت پیدا کرتے ہوئے دھیمے سے پکارا۔ "نجمہ!"

وہ چلتے چلتے یکلخت یوں رک گئی جیسے اس کے اس فعل میں ارادے کو کوئی دخل نہ تھا۔ وہ مڑی، ایک طائرانہ سی نظر لوگوں پر ڈالی۔ لیکن آنے والے لوگوں میں اپنا شناسا کوئی بھی نہ مل سکا، کوئی بھی تو نہیں۔ چند لمحات کے لئے وہ وہیں ٹھہر گئی، لیکن بے سود۔

وہ چلنے کا ارادہ کر ہی رہی تھی کہ کسی مانوس سے لہجے میں اُسے سنائی دیا۔ "نجمہ"

وہ پھر بھی نہ پہچان سکی۔ تب اس نے آگے بڑھ کر کچھ مسرت، کچھ حسرت سے کہا، "تو کیا سچ مچ مجھے نہیں پہچان سکیں؟"

"نہیں" وہ مخاطب کی جانب بے یقینی سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "نہیں"

"میں — راہی"

"تم!" کسی قدر بے یقینی سے اس نے کہا۔

"ہاں، میں ہی!"

"لیکن وہ تو ایسا نہ تھا" وہ جیسے اپنے آپ سے بولی۔ "تم راہی ہو؟"

اس کی آواز میں اس کا تمام تر اضطراب چھلک رہا تھا۔ بھلا یہ شخص کیونکر راہی ہو سکتا ہے! راہی تو بہت خوبصورت تھا، جوان تھا۔ اس کی آنکھیں کتنی گہری اور چمکیلی تھیں۔ لیکن، لیکن یہ تو گدلائی ہوئی آنکھیں ہیں۔ اس نے بڑی بے اطمینانی اور عدم تیقن سے اس کی جانب دیکھا۔ بھلا وہ کیونکر اس انسان کو راہی سمجھ لیتی جس کے کپڑے میلے تھے، اور جس کی صورت ... اسے خواہ مخواہ قحط کا شکار معلوم ہوا وہ چہرہ — پھر اچانک اس کے تصور کے ریشمیں پردوں پر اب سے تین سال قبل کے

رآہی کی صورت ابھرنے لگی۔ خد و خال تو وہی تھے۔ لیکن گزرتے ہوئے وقت کی شدت نے انہیں کھملا دیا تھا۔ اور آواز۔۔۔ وہ تو بالکل رآہی کی سی تھی۔ جب اس نے اس چہرے میں اپنے رآہی کو تلاش کر لیا تو وہ بولی۔

"لیکن تم یہاں کہاں؟"

"کیوں؟ کیا ہوا؟ یہ ایلفی ہے نجمہ! یہاں کے آداب کے خلاف ہے، کسی سے یہ پوچھنا۔ اور تم، لیکن یہاں کیسے؟ اور ہاں، تم لاہور سے کب آئیں؟"

"پرسوں" وہ اپنی آنکھوں کے ارغوانی پیمانوں کو ذرا سا چھلکاتے ہوئے بولی۔

"کیا تم محض چند لمحات کے لئے میرے ساتھ کسی پرسکون سے گوشے میں چل سکو گی؟"

"کیوں؟"

"مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔۔۔"

"تمہیں معلوم ہے میں شادی شدہ ہوں"۔

"ہاں، یہ تو مجھے اب سے تین سال پہلے بھی معلوم تھا"۔ وہ بڑی بے پروائی سے بولا۔

"میں تمہارے ساتھ نہ جا سکوں گی"

اس کی آواز میں بلا کا ٹھہراؤ تھا اور چہرہ جذبات سے بالکل عاری۔

"شاید تم نہ بھولی ہوگی، اب سے صرف چند سال قبل میری ہر خواہش تمہارے نزدیک نہایت اہم ہوا کرتی تھی۔ آج میں اسی بنا پر تم سے اس بات کا خواہاں ہوں کہ تم میرے ساتھ کسی خاموش سے گوشے میں چلو"

"وہ دن!" اس نے ایک آہ بھری۔ "میں تم سے التجا کرتی ہوں انہیں بھول جاؤ۔ یوں سمجھو وہ دن تمہاری زندگی میں کبھی آئے ہی نہ تھے۔ بھول جاؤ کہ ہم کبھی آپس میں ملے بھی تھے" وہ کچھ اس طرح بولی جیسے رآہی نے ان دنوں کا حوالہ دیکر کوئی بہت ہی اندوہناک کہانی یاد دلا دی ہو۔

"مگر یہ کیسے ممکن ہے جب کہ تم اچھی طرح جانتی ہو ایک زمانے میں ہم ایک دوسرے کو والہانہ چاہتے تھے"

"وہ ماضی تھا۔ اب حال اور مستقبل کی باتیں کرو۔ حال بہت ٹھوس حقیقت ہے، اس میں ماضی کی باتوں کا گزر ممکن نہیں۔ اور پھر شادی شدہ ہونے کی حیثیت سے میرے لئے مفید ہوگا کہ میں اپنے ماضی کی تمام یادوں کو اپنے ذہن سے کھرچ دوں۔ ان کاشانوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مقفل کردوں جن سے ماضی کے نکل آنے کا امکان ہو"۔ اس کی آواز میں اضطراب تھا اور اسے اپنا حلق سوکھتا محسوس ہوا۔

"نجمہ! میں تم سے محبت نہیں مانگنے آیا، جو شادی سے قبل تمہیں مجھ سے تھی۔ میں تو صرف اس کا متمنی ہوں کہ اپنے چند لمحات مجھے دیدو"۔

"چلو یوں ہی سہی" وہ اس کی خواہش کے آگے آخر کار جھک ہی گئی۔ لیکن اس کے جوان چہرے پر جو چند لکیریں ابھر آئی تھیں وہ برابر اس بات کی غمازی کر رہی تھیں کہ وہ یہ سب اپنی مرضی کے خلاف کر رہی ہے

دھیمے دھیمے وہ چلتے رہے۔ شام جوان تھی لوگ مسرور تھے لیکن وہ مضمحل تھا۔ وہ سوچ رہی تھی، لوگ جب ایک جوان، خوبصورت عورت کو ایک میلے اور گندے کپڑوں میں ملبوس جوان کے ساتھ دیکھیں گے تو کیا خیال کریں گے، لیکن وہ مجبور تھی۔ اسے یہ بھی تو احساس تھا کہ اب سے چند سال پہلے یہی شخص اس کی امیدوں کا سہارا تھا، اس کی زندگی تھا، وہ اس سے والہانہ محبت کرتی تھی، اس نے اس کے ہمراہ مستقبل کے کتنے ہی سپنے سہانے دیکھے تھے۔ اور اپنی شادی کے بعد وہ زندگی کے کسی لمحے میں بھی اپنے شوہر سے خوش نہیں ہو سکی تھی۔ وہ اسے اپنی شادی شدہ زندگی میں بھی برابر ہر لمحہ یاد کرتی رہی تھی۔ اور آج جب قسمت کے ان دیکھے راستوں پر چلتے چلتے اچانک ایک موڑ پر اسے اپنی زندگی مل گئی ہے تو وہ اسے یونہی کیسے چھوڑ دے؟ نہیں، یہ کسی طرح ممکن نہیں۔ اور وہ اپنی ظاہری حالت سے بے خبر اس کے ہمراہ دنیا سے بیگانہ چلتی رہی، چلتی رہی۔

انہوں نے آہستہ سے اس تنہا پرسکون فیملی روم کے پردے سرکائے اور اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ کیفے میں آوازوں کا شور تھا۔ کچھ دھیمے کچھ اونچے لہجہ میں باتیں کر رہے تھے وہاں کتنی ہی آوازیں تھیں۔ نقرئی، مدھم، پیاری پیاری، تیز، نرم!

لیکن وہ ان آوازوں میں بھی، ان سے بے خبر، ایک دوسرے کو مسلسل دیکھے جا رہے تھے۔

"نجمہ"

"ہوں، میں سن رہی ہوں۔ بولو، تم رک کیوں گئے؟ تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟ تمہیں تو مجھ سے بہت کچھ کہنا ہے نا"۔ وہ یوں بولی جیسے اس کی آواز بہت دور سے آرہی تھی۔ ماضی کے گم گشتہ جزیروں سے۔

اس کا ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اور ان تمام خیالات کا سلسلہ ایک واحد شخص پر آ کر ختم ہو رہا تھا ــــــ راہی!

"نجمہ! مجھے یہ افسوس نہیں کہ تمہیں حاصل نہ کر سکا۔ اس کے باوجود مجھے تم سے اتنا ہی پوچھنا ہے، کہ جب تم مجھ سے محبت کرتی تھیں۔" وہ بہت ہی مدہم لہجہ میں ٹھہر ٹھہر کر بولا، اور نجمہ کا جی چاہا وہ چیخ کر کہدے۔

"راہی! مجھے تو یہی غم، یہی افسوس، یہی دکھ ہے۔ کاش تم مجھے حاصل کر لیتے۔ دیکھو تو، میں آج بھی غم اندوہ کی جیتی جاگتی تصویر ہوں" لیکن وہ کچھ بھی تو نہ کہہ سکی۔ بلکہ بڑے ہی استہزائیہ لہجہ میں مسکراتے ہوئے بولی۔

"کیا کہا! میں تم سے محبت کرتی تھی؟ دیوانے نہ بنو راہی"

"اپنے جذبات کو دبانے کی کوشش نہ کرو نجمہ! ہاں تمہیں مجھ سے محبت تھی"

اس کے چہرے پر ناگواری اور بے چینی کی علامات ابھر آئیں۔

اس نے اپنے ہونٹوں کو بھینچ لیا اور کہا۔

"نہیں، ہرگز نہیں"

"نہیں، تمہیں مجھ سے محبت تھی۔ مجھ سے صاف کہہ دو نجمہ، تمہیں مجھ سے محبت تھی۔ میں نے کہا نا، مجھے اس کا افسوس نہیں کہ میں تمہیں حاصل نہ کر سکا۔ لیکن اب زندگی کی طویل اور تھکا دینے والی، افسردگیاں اور اداسیاں لق و دق صحراؤں کی مانند میرے آگے مجھے نگل جانے کو منہ پھاڑے کھڑی ہیں۔ اور اگر تم مجھے اس کا یقین دلا دو کہ تمہیں مجھ سے محبت تھی تو شاید اس اعتراف کے سہارے میں اپنی زندگی کو ان مایوسیوں میں بھی بسر کر لوں"

وہ کچھ بھی نہ بولی۔ وہ خاموش تھی۔ لیکن اس کے چہرے کے نقوش اس کا ثبوت تھے کہ اندر ہی اندر وہ کسی بات کا فیصلہ کر رہی ہے۔

"نجمہ!" وہ کچھ اس طرح بولا کہ اس کی آواز نجمہ کے دل میں دور تک اترتی ہی چلی گئی، اسے ایک جھرجھری سی آئی۔ اور وہ یکبارگی پھر اپنے خیالات کے طویل سلسلوں میں کھو گئی۔

"تم کچھ بھی نہیں بولتیں؟"

"کیا" وہ ایک دم چونک کر بولی۔ اور پھر بڑی حقارت اور نفرت سے کہا۔

"نہیں، میں نے تم سے کبھی محبت نہیں کی، مجھے تم سے زندگی کے ہر لمحے میں شدید ترین نفرت رہی ہے، نفرت! اور وہ ہمدردی تھی محض ہمدردی جسے تم نے محبت نام دے لیا ہے"۔ لیکن اپنی آواز کا کھوکھلاپن اس سے بھی مخفی نہ رہ سکا۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ وہ اسے ساکت و صامت گھورتا ہی رہا مسلسل! یہ سب اس کی امیدوں کے خلاف کیسے ہو گیا؟ کیسے ہو گیا یہ سب؟ اس کا دل بڑی شدت سے اس کے سینے میں دھڑکنے لگا۔ اسے اپنے حلق میں کانٹے سے چبھتے محسوس ہوئے۔

"تو تمہیں مجھ سے محبت نہ تھی؟"

"نہیں، ہرگز نہیں" اس کی آواز بھرا گئی اور اس کے چہرے کی ساری مصنوعی کرختگی بھی اس کے اندرونی جذبات کو نہ چھپا سکی۔ اسے ایک کسک، ایک چبھن سی محسوس ہوئی۔ اور جب اس نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہ اسے دور خلاؤں میں گھورتی معلوم ہوئی۔ کیا اسے راہی سے محبت نہ تھی؟ لیکن کتنی ہی بار اس نے کسی کی خواہش کی تھی۔ وہ کون تھا۔ بارہا وہ باورچی خانے میں چولھے کے قریب بیٹھے بیٹھے کہیں کھو جاتی تھی۔ کس کے خیال میں؟ وہ کون تھا؟ اور کتنی ہی بار یوں بھی ہوا تھا۔ اس کی اس وارفتگی کو دیکھ کر اس کے شوہر نے بے اختیار پوچھا تھا۔ "کیوں؟ کون یاد آ رہا ہے تمہیں؟" اور وہ چونک کر جواب دیتی۔ "کوئی بھی تو نہیں"۔ اور کتنی ہی بار اس کے یوں کھو کھو جانے پر اس کے شوہر نے شدت سے سوچا تھا، شاید اس نے نجمہ سے شادی کر کے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے۔ ایک ایسی لڑکی سے شادی کا کیا فائدہ جو کسی دوسرے کو چاہتی ہے۔ اپنی تمام تر روح کے ساتھ، اپنے دل کی تمام گہرائیوں کے ساتھ۔ لیکن وہ کون تھا۔ اور کتنی ہی بار ننھی ڈیزی کے لئے نٹنگ کرتے وقت وہ ایک دم نٹنگ چھوڑ کر سلائیوں اور اُون کو انگلیوں میں پھنسائے، گم سم سی، پہروں سامنے کھیلتی ہوئی ننھی ڈیزی کے نرم نرم خد و خال میں کسی گہری آنکھوں، بھرے بھرے چہرے والے اجنبی کا عکس تلاش کرنے لگتی۔ کتنی ہی بار اپنے سامنے اپنے شوہر کو بیٹھے دیکھ کر کتنی شدت سے اس اجنبی کی تمنا کی تھی۔ کاش اس کے شوہر کی جگہ وہ اجنبی ہوتا! اور بعض اوقات جب اس کے شوہر کے تنو مند ہاتھوں کا ہالہ اس کے اپنے نازک بدن کے گرد سخت ہو جاتا تو وہ اس لمس اور اس میٹھے میٹھے درد کی لذت، سرور اور نشے میں بے اختیار شدت سے چاہتی کاش! یہ ہاتھ، یہ بانہیں، اس اجنبی کی ہوتیں! پھر وہ اجنبی کون تھا، وہ جو اس کی زندگی میں بڑے دبے قدموں سے چپکے سے چلا آیا تھا۔

"تو تم اس کا اقرار نہیں کرو گی؟" وہ بڑی مشکل سے صرف اسی قدر کہہ سکا۔

"کس طرح، جبکہ میں نے تم سے کبھی محبت ہی نہیں کی۔ تم بزدل ہو، بے جان، بے حس پتھر ہو، میں ایک پتھر سے کس طرح محبت کر سکتی ہوں؟" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ایک سرد مسکراہٹ جو اس نے اس اجنبی سے اپنے جذبات کو پوشیدہ رکھنے کے لئے زبردستی اپنے ہونٹوں پر پھیلالی تھی۔

تب وہ دھیمے سے اٹھا۔ آخری بار بھرپور نظروں سے چند لمحات کے لئے اسے دیکھتا رہا۔ اور پھر تیزی سے فیملی روم کے مخملیں پردے سرکاتا ہوا باہر نکل گیا۔

بڑی شدت سے اس کا دل دھڑکا، تڑپا۔ لیکن اجنبی تو جا چکا تھا۔ اسے محسوس ہوا ایک پھانس سی اس کے دل میں کھٹک رہی ہے۔

وہ سوچتی ہی رہی، اس کے چاروں طرف کتنی ہی آوازوں کا ایک جال سا بنا ہوا تھا۔ لیکن اس اجنبی کی آواز ان میں کہاں تھی۔ وہ ان سے بے خبر اپنے خیالات میں غرق رہی۔ اس نے اپنا سر میز پر رکھ دیا اور دل سے کہا: دنیا بہت سونی ہے۔

اس کا ذہن حال کی دبیز رداکو چوری چوری سرکاتے ہوئے برسوں پہلے ماضی کے جزیروں میں پہنچ گیا جب "وہ" اس کی زندگی کا سب کچھ تھا۔ اور جب اس کی شادی ہوئی تھی۔ تب بھی وہ اسے نہ بھول سکی تھی۔ جیون کے سفر میں چند راہی ایسے بھی ملتے ہیں جو محض چند لمحات کے قرب کے بعد صرف چند یادیں ہی دے کر چلے جاتے ہیں اور لوگ بھٹکی ہوئی روحوں کی طرح زندگی کی ان گزرگاہوں پر چلنے والے ہمسفروں کے نقوش ہی تلاش کرتے کرتے اپنی زندگی بتا دیتے ہیں۔ لیکن اس کا راہی اس کا ہمسفر تو لوٹ بھی آیا تھا۔ پھر کیوں اس نے اسے اپنانے سے انکار کر دیا۔ وہ جس کی تلاش میں وہ بہت دور تک نکل آئی تھی؛ اور جب ایک شام وہ اچانک اسے ایک موڑ پر مل گیا تو اس نے اسے پہچاننے سے ہی انکار کر دیا! یہ کیسی محبت تھی؟ لیکن اسے تو اس سے نفرت تھی! اس نے اب سے چند لمحات پیشتر ہی اس نفرت کا اعتراف کیا تھا۔ نہیں، نہیں۔ وہ تو ان طویل پچھتاؤوں کا اثر تھا، جو زندگی نے اسے اس اجنبی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا کر کے دئے تھے، اور اس افسردگی اور ان پچھتاووں نے مل جل کر اس کے احساس میں زہر گھول دیا تھا۔

شاید وہ یونہی، خاموش خاموش، تنہا تنہا اس سے محبت کئے جائیگی کتنی ہی بار اس نے اپنی گھائل روح کو تسکین دینے کے لئے اُسے بھول جانا چاہا تھا۔ لیکن وہ اسے بھول نہ سکی تھی، وہ گہرا زخم تو اپنی تمام تر کسک اور چبھن کے ساتھ اس کے دل میں موجود تھا۔ سالہا سال یوں ہی گزر جائیں گے، دھیمے دھیمے، ہولے ہولے۔ لیکن وہ اس اجنبی کو نہ بھول سکے گی۔ وہ آگ جو ہمیشہ اس کے دل میں اپنی پوری تندی کے ساتھ فروزاں رہی تھی اب بھی رہے گی۔ اور بھرے بھرے جسم والے چمکیلی گہری آنکھوں والے اس انسان کی شبیہہ اس کے ذہن سے لمحہ بھر بھی جدا نہ ہو سکے گی۔

اس نے اپنا سر میز سے اٹھایا۔ اس امید میں کہ وہ اب بھی اس کے سامنے بیٹھا اسے گہری گہری نظروں سے گھور رہا ہوگا۔ لیکن اسے یاد آیا۔ اب سے چند لمحات پیشتر ہی وہ جا چکا تھا۔ ٹوٹے دل اور زخمی مسکراہٹ کے ساتھ!

وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور طشتری میں پڑے بل پر چند نوٹ کانپتے ہاتھوں سے رکھتے ہوئے کیفے سے باہر نکل آئی۔ سڑک پر گزرتی ہوئی ٹیکسی کو ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ وہ ایک قدم بھی نہ چل سکتی تھی۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ اس کا دل بھاری تھا اور اس کی روح شدت سے جل رہی تھی۔

ٹیکسی بڑی تیزی سے اپنے پیچھے جوان شام کے جھرمٹ میں سجی ہوئی جوان ایلفی کو اس کی تمام روشنیوں اور رعنائیوں کے ساتھ چھوڑتی چلی جا رہی تھی۔

اور — ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے اس کی روح شدت سے پکار اٹھی "راہی"

مدت کے رکے ہوئے صبر و ضبط کے بند اپنی پوری شدت سے چرچرا کر ٹوٹ گئے۔ اس نے رومال اپنی آنکھوں پر رکھ لیا، جو اعتراف کے آنسوؤں سے تر تھیں اور سوچا، کاش! اعتراف کے آنسو "اس" کی موجودگی ہی میں نکل آئے ہوتے!

★

مشرقی پاکستان:

دیارِ رنگ

ثروت خاں

گرمی پورے شباب پر تھی۔ سارا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ اُمس کی وجہ سے ایک ایسی بے چینی محسوس ہو رہی تھی کہ کسی کل چین نہیں تھا۔ کچھ دیر کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا پھر ریڈیو لگا دیا۔ کان میں میٹھی میٹھی آواز آنا شروع ہوئی۔ مشرقی پاکستان کے ملاح کا گیت ہو رہا تھا۔ میں سوچنے لگا:

"آخر بنگالی گانوں میں اتنی لطافت کیوں
ہوتی ہے کہ انسان زبان سمجھے بغیر ان سے لطف
اٹھانے لگتا ہے۔ کیا بنگلہ زبان اور موسیقی ایک
ہی چیز کے دو نام ہیں؟"

اس سے پہلے بھی بار ہا میرے ذہن میں یہ خیال آیا۔ اور میں اس پر غور کرتا رہا۔ پھر گانے ہی پر کیا موقوف، بنگالی شاعری بھی لطیف ہوتی ہے۔ صرف بنگلہ لب و لہجہ ہی رسیلا نہیں ہوتا۔ بنگلہ شاعر کا تخیل بھی رسیلا ہوتا ہے۔

میں ابھی اسی سوچ میں تھا کہ موسم میں اچانک تبدیلی ہونا شروع ہو گئی۔ فضا گرد آلود ہو گئی، ہوا کے تیز جھکڑ چلنے لگے، دور سے بادل اُمڈتے نظر آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی اور چند لمحوں میں بادل برس پڑے۔ بارش کی رم جھم، ٹھنڈی ہوا، اور فضا کی خنکی نے موسم بالکل بدل دیا۔ اب بے چینی کی جگہ فرحت اور تازگی نے لے لی جسم میں ایک نئی جان آ گئی، خوابیدہ آرزوئیں بیدار ہو گئیں۔ طبیعت کی جولانی اور سرمستی کہہ رہی تھی:

یارو رباب اٹھاؤ کہ بوندوں کی تال پر
مدحِ شرابِ کہنہ و حسنِ جواں کریں

موسم کی اس تبدیلی نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا کہ مشرقی پاکستان کے باشندوں کی طبیعت اور ان کی شاعری اور ادب میں لطافت اور شیرینی کا غلبہ کیوں ہے۔ جس سرزمین میں ہر طرف لہلہاتے کھیت ہوں، باغ ہوں، جنگل ہوں، بل کھاتے دریا ہوں، جہاں گھٹائیں جھوم جھوم کر آتی ہوں، دریاؤں میں کشتیاں اور آسمان پر ابرِ خراماں کے سفینے ہوں، وہاں کے لوگوں کی طبیعت میں رنگینی اور لطافت نہ ہوگی تو اور کن میں ہوگی؟

مشرقی پاکستان کے موسم اور مناظر نے وہاں کے باشندوں کے دل و دماغ کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ دنیا میں ایسے ملک کم ملیں گے جہاں کے باشندوں کی طبیعت پر اپنے ملک کے مناظر اور ماحول کی معجزانہ سحر کاریوں کا اتنا گہرا اثر ہوا ہو۔

مشرقی پاکستان کے متعلق بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال پختہ ہو گیا ہے کہ گو اس سرسبز و شاداب خطہ میں قدرت کی رعنائیوں اور مناظر کی کمی نہیں لیکن ان میں تنوع کا فقدان ہے۔ ہر جگہ ایک ہی قسم کا نظارہ دیکھ کر دل جلد ہی سیر ہو جاتا ہے۔

یہ بات وہی لوگ کہہ سکتے ہیں جنہوں نے مشرقی پاکستان کے صرف ان علاقوں کو دیکھا ہے جہاں آمد و رفت کی سہولتیں ہیں۔ اگر وہ عام راستوں سے ہٹ کر "خلوت کوہ و بیاباں" کا رخ کرتے تو معلوم ہوتا کہ پاکستان کے اس دلفریب خطہ میں کس قدر تنوع ہے۔ سندربن کے ساحلی جنگل، چاٹگام کا پہاڑی علاقہ، کوکس بازار کا طویل دلفریب ساحل، سلہٹ کی اونچی نیچی پہاڑیاں اور چائے کے باغات، اور میمن سنگھ میں مادھو پور کا جنگل، ایسے مقامات ہیں جہاں تنوع اور دلکشی کا پورا پورا سامان فراہم ہے۔

مشرقی پاکستان کی سب سے بڑی دلکشی وہاں کے دریا ہیں۔ یہ دریا کہیں وسیع میدانوں اور کھیتوں میں سے ہو کر گزرتے ہیں اور کہیں جنگلات میں سے۔ بعض جگہ دریا پہاڑوں اور تنگ گھاٹیوں سے بھی گزرتے ہیں جہاں ان کی دلکشی دوبالا ہو جاتی ہے۔

عہدِ عباسی میں بصرہ کا علاقہ نہروں کی کثرت کی وجہ سے ضرب المثل بن گیا تھا کہا جاتا ہے کہ "یہاں ہر تیر پرتاب کے فاصلہ پر ایک نہر موجود تھی"۔ ممکن ہے بصرہ کے علاقہ میں نہروں کی اس کثرت کے متعلق مبالغہ سے کام لیا گیا ہو لیکن مشرقی پاکستان کے ایک بڑے حصے کے متعلق یہ کہنا کہ وہاں قدم قدم پر ندی نالے موجود ہیں قطعی مبالغہ نہیں۔ بصرہ کے علاقہ میں نہروں کا شمار ایک لاکھ بیس ہزار تک کیا گیا تھا۔ اب یہ کام موجودہ جغرافیہ والوں کا ہے کہ وہ مشرقی پاکستان کے ندی نالوں کی صحیح تعداد کا تعین کریں۔

اس صوبہ کے سب سے بڑے دریا برہمپترا اور گنگا ہیں۔ چاٹگام کے دریاؤں کے علاوہ باقی تمام دریا یا تو ان ہی دونوں دریاؤں میں مل جاتے ہیں یا ان ہی کی شاخیں ہیں۔ برہمپترا اور گنگا کے دو بڑے دھارے بھی گوالندو کے مقام پر ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں اور اس طرح ایک نیا دریا "پدما" وجود میں آتا ہے۔ دنیا کے دو عظیم دریاؤں کا پانی یکجا ہو جانے کے بعد "پدما" میں پانی کی مقدار بہت زیادہ ہو جاتی ہے اور دریا کا پاٹ دو میل تک پھیل جاتا ہے۔ ساٹھ ستر میل بہنے کے بعد چاندپور کے قریب ایک اور بڑا دریا میگھنا، آسام اور سلہٹ کے معاون دریاؤں کا پانی لے کر پدما سے آملتا ہے۔ اس طرح وہ عظیم دھارا ظہور میں آتا ہے جو پانی کی فراوانی کے لحاظ سے شاید دنیا کا سب سے بڑا دریا ہے۔ میگھنا چاندپور کے قریب دریا سے زیادہ سمندر معلوم ہوتا ہے۔ یہاں اس کا عرض آٹھ میل ہے۔ دریائے سندھ جس قدر پانی سمندر میں لاتا ہے میگھنا کے آخری حصہ میں پانی کی مقدار اس سے چار گنا زیادہ ہوتی ہے۔

چاندپور کے بعد میگھنا کا پانی چھ سات شاخوں میں تقسیم ہو کر ایک سو اکسٹھ میل کے بعد سمندر میں مل جاتا ہے۔ میگھنا کی طرح برہمپترا اور گنگا کا پانی بھی بے شمار شاخوں میں تقسیم ہو کر، دو ڈھائی سو میل بہنے کے بعد خلیج بنگال میں جا گرتا ہے۔ اور اس طرح وہ ڈیلٹا وجود میں آتا ہے جو دنیا کا سب سے بڑا ڈیلٹا ہے۔

برہمپترا اور گنگا جب مشرقی پاکستان کی حدود میں داخل ہوتے ہیں تو ان کا پاٹ معاونوں کی وجہ سے بہت چوڑا ہو جاتا ہے اور جگہ جگہ جزیرے بن گئے ہیں۔ یہ جزیرے آباد ہیں اور ان میں کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ ان کی وجہ سے دریاؤں کی دلکشی میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔ ان میں سب سے بڑے وہ جزیرے ہیں جو میگھنا کی شاخوں سے وجود میں آئے ہیں۔ ان میں دکھن شاہباز پور کا جزیرہ تقریباً چھ سو مربع میل اور سندویپ کا جزیرہ ۲۵۸ مربع میل میں پھیلا ہوا ہے۔

مشرقی پاکستان کی بیشتر دریاؤں میں پانی کی کثرت کی وجہ سے دن رات کشتیاں اور اسٹیمر چلتے رہتے ہیں۔ ان میں مسافر بھی سفر کرتے رہتے ہیں اور ملک کی ضرورت کا سامان بھی ادھر سے ادھر پہنچایا جاتا ہے۔ صوبہ کے نظامِ مواصلات میں ریلوں اور سڑکوں سے زیادہ، ان دریاؤں کو اہمیت حاصل ہے۔

معاشی زندگی میں ان دریاؤں کو جو اہمیت حاصل ہے وہ اپنی جگہ ہے لیکن ان کی وجہ سے یہاں کے قدرتی مناظر میں ایک ایسی دلکشی پیدا ہو گئی ہے جو شاید ساری دنیا میں صرف مشرقی پاکستان ہی سے مخصوص ہے۔ تا حدِ نظر پھیلے ہوئے لہلہاتے کھیت اور جنگل، بل کھاتے ہوئے دریا، سطحِ آب پر کشتیوں کی روانی، مانجھیوں اور ملاحوں کے پرسوز گیت، اور ٹھنڈی چاندنی راتیں ایک ایسا ماحول پیدا کر دیتی ہیں جس نے غور و فکر کرنے والوں کے لئے ہمیشہ مہمیز کا کام کیا ہے۔ ٹیگور[1] کی شاعری کو اسی ماحول نے جنم دیا اور جسیم الدین بھی اسی قدرتی ماحول کی پیداوار ہے۔ مشرقی پاکستان کے باشندوں کی طبیعت میں جو رنگینی، ان کے گیتوں میں جو مٹھاس اور ان کی شاعری میں جو دلکشی ہے وہ بڑی حد تک اسی ماحول کی پیداوار ہے۔

مشرقی پاکستان کے قابلِ دید مقامات میں "سندربن" منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ یہ جنگل دریائے گنگا اور پدما کے ڈیلٹے کے جنوبی حصہ میں واقع ہیں اور تقریباً چار ہزار مربع میل میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کا ایک تہائی حصہ بھارت میں ہے اور دو تہائی مشرقی پاکستان میں۔ ضلع کھلنا میں دو ہزار مربع میل اور ضلع باقر گنج میں آٹھ سو مربع میل۔ یہاں سندری نام کا درخت کثرت سے ہوتا ہے جس کی وجہ سے ان جنگلات کا نام "سندربن" پڑ گیا ہے۔ بعض مقاموں پر جنگل اتنے گھنے ہیں کہ سورج کی شعاعیں بھی زمین تک نہیں پہنچ سکتیں۔ جنگل کی سطح کہیں سمندر کی سطح سے کافی بلند ہے اور کہیں اتنی نیچی کہ جب

له ؛ ٹیگور نے اگرچہ رہائش کلکتہ میں اختیار کر لی تھی لیکن ان کا بچپن مشرقی پاکستان کے ماحول میں گزرا اور ایک جگہ انہوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ ان کو شاعر بنانے میں یہاں کے قدرتی مناظر کو بڑا دخل ہے۔

سمندر چڑھتا ہے تو ہر طرف پانی پھیل جاتا ہے اور اترتا ہے تو اپنے ساتھ تمام گھاس پوس کو بہا لے جاتا ہے۔ اس موقع پر کشتی میں سفر کرنے والے درختوں کے نیچے سے زمین کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیکھ سکتے ہیں۔ زمین پر سبزہ اور اس پر درختوں کے تنے ہزاروں ستونوں کی طرح بڑا دلکش منظر پیش کرتے ہیں۔ "سندری" پیڑوں کی جڑوں سے نکلے ہوئے کانٹے اتنے سخت اور گھنے ہوتے ہیں کہ شکاریوں کے لئے جنگل میں زیادہ دور تک جانا آسان نہیں۔ خود شیر کو بھی ان کانٹوں کی وجہ سے نقل و حرکت میں بڑی مشکل پیش آتی ہے۔

سندر بن اپنی دلکشی اور انفرادیت کے لحاظ سے مظاہر قدرت کا ایسا نمونہ ہے جس پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ ایک پاکستانی سیاح نے ان الفاظ میں سندر بن کا بڑا جامع نقشہ کھینچا ہے:

"سندر بن جنگلی جانوروں کا دلپسند مامن ہے اور ایک ایسی حسین جگہ ہے جو سیاحوں اور فن کاروں کے دیکھنے اور محسوس کرنے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ ماہر حیوانات، ماہر نباتات اور فن کاروں کا دارالعلوم ہے۔ میں نے دنیا میں جو حسین ترین مقام دیکھے ہیں ان میں ایک سندر بن بھی ہے۔ یورپ کے ڈیر پارکوں (DEER PARK) سے یہ جگہ زیادہ حسین ہے۔ جنگلوں کی کھاڑیاں اور سانپ کی طرح بل کھاتے آبی راستے یونان کی آراستہ و پیراستہ نہروں سے زیادہ اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ زمین کے وہ خوبصورت مخروطی ٹکڑے جو خلیج بنگال میں دور تک چلے گئے ہیں اور جن کے نام ٹائگر پوائنٹ، منکی پوائنٹ (MONKEY POINT) اور ہیرن پوائنٹ (HERON POINT) ہیں کسی مشہور فن کار کی ڈرائنگ معلوم ہوتے ہیں۔ ان مقاموں کو مذکورہ بالا نام اس لئے دیئے گئے ہیں کہ وہاں شیروں، اور بندروں وغیرہ کی کثرت ہے۔ سندر بن کے جنگلوں کا جب ان میں سے گزرنے والی کھاڑیوں میں عکس پڑتا ہے تو بڑا ہی حسین منظر سامنے آجاتا ہے۔ ان جنگلوں میں ہرنیوں کا اپنے بچوں کو لئے پھرنا، شیر کا شان بے نیازی سے ٹہلنا اور مگرمچھوں کا ریت پر لوٹنا ایسے مناظر ہیں جو عام ہیں۔"

سندر بن کے مظاہر قدرت میں وہ آوازیں بھی ہیں جو "باریسال کی توپوں" کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ آوازیں بارش کے زمانہ میں دریائی کے پانی اور مد و جزر کی موجوں کے "ٹکراؤ" سے پیدا ہوتی ہیں اور شہر باریسال تک میں سنی جا سکتی ہیں۔

جنگلوں میں اس علاقہ کے قدیم اور اصلی باشندے اب بھی موجود ہیں اور مسافر کشتیوں سے جاتے ہوئے دور فاصلہ پر ان کے گھر اور گاؤں دیکھ سکتے ہیں۔

سندر بن جنگلی جانوروں کا بہت بڑا مرکز ہے۔ بنگال کے مشہور شیر (TIGER) کا وطن یہی سندر بن ہے۔ کالے ناگ اور اژدھوں کی کثرت ہے۔ شکار کے عام جانوروں میں چیتل، ہرن، اور سانبھر وغیرہ عام ہیں۔ بندر بھی بہت پائے جاتے ہیں۔ "ٹنکونا" نامی جزیرہ، جو ایک کشادہ دریا کے درمیان واقع ہے، ہر قسم کے جانوروں کا بہترین مامن ہے۔ اس کے قریب ہی جزائر "جاپھا" ہیں جو بنگال کے رائل ٹائگر کا گھر ہے اور جہاں ہرن اور شیر ساتھ ساتھ دیکھے جا سکتے ہیں۔

سندر بن کے جنگل پاکستان کی ملکی معیشت میں بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ کھلنا کا اخباری کاغذ ان ہی جنگلوں کی ایک لکڑی گیوا سے تیار کیا جاتا ہے۔ سندری لکڑی مکانوں، کشتیوں اور چھتری کے دستے بنانے میں کام آتی ہے

چند سال قبل تک آمد و رفت کی سہولتیں نہ ہونے سے سندر بن ارض ممنوعہ کی حیثیت رکھتا تھا لیکن جب سے اس کے شمالی کنارہ پر چالنا کا بندرگاہ قائم ہو گیا ہے جہازوں اور کشتیوں کی آمد و رفت بڑھ گئی ہے اور اگرچہ سیاحوں کے لئے جنگلوں میں ٹھہرنے کا کوئی انتظام نہیں پھر بھی وہ مشرقی پاکستان کے دوسرے حصوں سے چالنا آتے جاتے ہوئے ان عظیم جنگلوں کے درمیان سے گزر سکتے ہیں اور یہاں کے مناظر سے بہت کچھ لطف اٹھا سکتے ہیں۔

سندر بن کا موسم معتدل ہے۔ اپریل سے ستمبر تک اوسط درجۂ حرارت ۸۳ اور ۸۵ درجہ کے درمیان رہتا ہے۔ سردیوں میں درجۂ حرارت ۷۶ تک گر جاتا ہے۔ بارش کا اوسط ۸۳ انچ سالانہ ہے۔

آیئے، اب ہم ایک اور عظیم الشان جنگل کی سیر کریں یا ڈھوپور

کا جنگل جو تقریباً چار سو مربع میل پھیلا ہوا ہے۔ یہ ضلع ڈھاکہ کی شمالی سرحد سے شروع ہوتا ہے اور شہر میمن سنگھ کے قریب ختم ہو جاتا ہے۔ جنوب سے شمال کی طرف ۴۵ میل لمبا اور مشرق سے مغرب کی طرف چھ سے سو میل تک چوڑا ہے جنگل کی سطح گرد و نواح کے میدانوں سے ۴۰ فٹ تک بلند ہے۔ اس بلندی کی وجہ سے یہ علاقہ ہر قسم کے سیلابوں سے محفوظ رہتا ہے۔

مادھو پور کا جنگل اپنی ساخت میں سندر بن سے قطعی مختلف ہے اور اپنی دلکشی میں منفرد۔ اس جنگل کے وہ حصے خاص طور پر بڑے حسین ہیں جہاں پانی اور لکھیا ندیاں گہری گہری گھاٹیوں میں سے گذرتی ہیں جن کے دونوں جانب بلندیوں پر گھنے جنگل ہیں۔ یہاں سندر بن کی طرح جھاڑیاں نہیں بلکہ لمبے لمبے درخت ہیں جن کے نیچے گھاس کی کثرت ہے۔ یہ جنگل ہمالیہ کی ترائی کے جنگلوں سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس میں شیر اور تیندوے پائے جاتے ہیں لیکن ان کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔ ہرن، چیتل، سانبھر اور جنگلی سؤر وغیرہ بھی پائے جاتے ہیں۔

اگرچہ ضلع میمن سنگھ میں سب سے دلکش مقام یہی جنگل ہے لیکن شمالی سرحد پر "سوسنگ" کی پہاڑیاں بھی اپنے اندر کچھ کم دلکشی نہیں رکھتیں۔ یہ گھنے خاردار جنگلوں سے پٹی پڑی ہیں۔ شیر اور جنگلی سؤروں کے علاوہ ہاتھیوں کی بھی کثرت ہے۔ اور سلہٹ! اس کی ہری بھری فضا میں بھی ایک عجیب کیفیت ہے۔ ضلع سلہٹ مشرقی پاکستان کے ان حصوں میں سے ہے جو قدرتی ساخت کے لحاظ سے دوسرے حصوں سے کسی قدر مختلف ہیں۔ نیچی نیچی پہاڑیاں جن میں جنوب کی ایک پہاڑی گیارہ سو فٹ بلند ہے اور جھیلوں کی کثرت اس ضلع کی امتیازی خصوصیت ہیں۔ جھیلوں کی کثرت کی وجہ سے اگر ہم سلہٹ کو "جھیلوں کا ضلع" کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ یہ جھیلیں اگرچہ دلدلی نوعیت کی ہیں۔ لیکن ان میں مچھلیوں اور آبی جانور کی کثرت ہے، اور کشتی رانی کی جا سکتی ہے۔ اگر ان جھیلوں کو سیر و سیاحت کے نقطۂ نظر سے ترقی دی جائے تو ان میں بڑی دلکشی پیدا کی جا سکتی ہے۔

سلہٹ کو اپنے چائے کے باغوں پر ناز ہے۔ جو اس میں انفرادی شان پیدا کرتے ہیں یہ باغ جو پہاڑوں کی ڈھلانوں پر واقع ہیں اپنے اندر ایسی دلکشی رکھتے ہیں جو عام باغوں اور کھیتوں میں نہیں پائی جاتی۔ یہ باغ ۴، ہزار ایکڑ میں پھیلے ہوئے ہیں۔

پھر سلہٹ کی بے مثل نارنگیاں جن کے باغ ہر طرف میدانوں اور ڈھلانوں پر پھیلے نظر آتے ہیں کیا کم دلکش ہیں؟ جب نارنگی کے پیڑوں میں پھول آتا ہے تو ساری فضا بھینی بھینی خوشبو سے مہک اٹھتی ہے اور جب نارنگیاں پک جاتی ہیں تو ان کا منظر جنت نگاہ کا کام کرتا ہے۔

سلہٹ کے بعض حصوں میں گرم پانی کے چشمے بھی پائے جاتے ہیں۔

چاٹگام کا علاقہ مشرقی پاکستان کا کشمیر یا سوئٹزرلینڈ ہے۔ اگر پاکستان کے مشرقی بازو میں چاٹگام کے سوا اور کوئی خوش منظر جگہ نہ ہوتی تو بھی یہاں کے باشندے اس ضلع کے مناظر پر بجا طور پر فخر کر سکتے تھے۔

چاٹگام کا علاقہ ضلع چاٹگام اور چاٹگام کے پہاڑی علاقہ پر مشتمل ہے مجموعی رقبہ ۷½ ہزار مربع میل اور آبادی ۲۶ لاکھ ہے۔ پاکستان کا یہ خطۂ جنت نظیر ویلز کے برابر، شمالی آئرلینڈ سے بڑا اور مشہورِ عالم لبنان کے دوگنے سے زیادہ وسیع ہے۔ وادیٔ کشمیر بھی جہاں سری نگر، بارہ مولا، گلمرگ، پہلگام اور کلگام جیسے خوش منظر مقامات اور ڈل جیسی حسین جھیل موجود ہے، رقبہ میں چاٹگام ہی کے برابر ہے سوئٹزرلینڈ کا رقبہ چاٹگام سے صرف دوچند ہے۔ اگرچہ یہاں برف پوش پہاڑ نہیں ہیں لیکن یہ کمی موجیں مارتے ہوئے سمندر اور حسین ساحل نے ایک حد تک پوری کر دی ہے۔

سندر بن اور مادھو پور کے جنگل اور سلہٹ اور میمن سنگھ کے مناظر جن خصوصیات کے حامل ہیں چاٹگام کا پہاڑی علاقہ ان سے قطعی مختلف خصوصیات رکھتا ہے۔ پورے علاقہ میں ندیوں اور پہاڑوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ پہاڑ گھنے جنگلوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ اور عمودی ساخت کی وجہ سے ان پر چکردار پگڈنڈیوں کے ذریعہ ہی چڑھا جا سکتا ہے جو جنگلوں میں سے ہو کر گذرتی ہیں۔ لیکن یہ پہاڑ زیادہ بلند نہیں۔ ان کی سب سے اونچی چوٹی کیوک راڈانگ ہے۔ جس کی بلندی چار ہزار ۳۴ فٹ ہے۔ یعنی ایبٹ آباد کے برابر۔

فینی، کرنا پھلی، سنگو اور ماتا موہاری یہاں کی خاص خاص ندیاں ہیں۔ پہاڑی علاقہ میں یہ ندیاں قدم قدم پر پیچ و خم کھاتی ہوئی پہاڑوں کے درمیان سے گذرتی ہیں۔ ان میں کشتی رانی کرنے والوں کو ایسے ایسے خوبصورت مناظر دکھائی دیتے ہیں جو

پورے پاکستان میں کسی دوسری جگہ نظر نہیں آتے ۔

پہاڑوں میں متعدد خوبصورت جھیلیں اور تالاب ہیں۔

ان میں راما کری تانگ پہاڑی کے مشرق میں ایک نہایت حسین پہاڑی جھیل واقع ہے۔ یہ جھیل ایک میل لمبی اور دو فرلانگ چوڑی ہے اس میں مہاشیر قسم کی مچھلیوں کی کثرت ہے۔ جب اس جھیل تک سڑک بن جائے گی اور مسافروں کو سہولتیں میسر آجائیں گی تو یہ جگہ صوبہ میں سیر و سیاحت کے مقبول ترین مرکزوں میں شمار ہونے لگے گی۔

پہاڑی علاقوں میں کئی قسم کے بانس ہوتے ہیں اور طرح طرح کی جڑی بوٹیوں کی کثرت ہے۔ یہاں ایک خاص قسم کی گھاس ہوتی ہے جو چھپر ڈالنے کے کام آتی ہے۔ کرنافلی کا کارخانہ یہاں کے بانسوں ہی سے کاغذ تیار کرتا ہے ۔

پہاڑی علاقے کے جنگلوں میں ہاتھی، شیر، تیندوے اور ریچھوں کی کثرت ہے۔ جنگلی بھینسا بھی پایا جاتا ہے۔ سانبھر اور چیتل بھی عام ہیں۔

پہاڑی علاقے کا موسم ٹھنڈا ہوتا ہے۔ بارش کا اوسط ۹۴ انچ ہے۔ دسمبر اور جنوری میں بارش نہیں ہوتی۔ فروری سے مئی تک ۱۹ انچ بارش ہوتی ہے، پھر جون سے اگست تک ہر ماہ اوسطاً ۱۸ انچ بارش ہوتی ہے ستمبر میں گیارہ انچ اکتوبر میں سات اور نومبر میں دو انچ کا اوسط ہے۔

کرنافلی کا عظیم منصوبہ اسی علاقہ میں زیر تکمیل ہے۔ اس منصوبہ کے تحت اس شہر چاٹگام سے ۵۳ میل دور کپتائی کے مقام پر، جہاں دریائے کرنافلی ایک گھاٹی سے گزرتا ہے۔ اس گھاٹی کی شمالی چوٹی چودہ سو فٹ اور جنوبی ساڑھے آٹھ سو فٹ بلند ہے۔ ایک بند بنایا جا رہا ہے یہ بند ایک ہزار آٹھ فٹ لمبا اور ایک سو ترپن فٹ اونچا ہوگا۔ اس سے ایک عظیم الشان جھیل وجود میں آجائے گی جس سے یہاں کی دلکشی میں اور بھی اضافہ ہوگا۔

چاٹگام کے پہاڑی علاقہ کا رقبہ پانچ ہزار مربع میل اور آبادی دو لاکھ ، ۸ ہزار ہے۔

پہاڑی علاقہ کے مغرب میں خلیج بنگال کے ساحل کے ساتھ ساتھ جو پٹی چلی گئی ہے وہ ضلع چاٹگام ہے۔ پہاڑی علاقے اور یہاں کے مناظر میں فرق یہ ہے کہ پہاڑی علاقہ میں ہر طرف پہاڑیاں ہی پہاڑیاں ہیں لیکن یہاں وسیع میدان اور لہلہاتے کھیت بھی ہیں اور سمندر کا کنارہ بھی۔

شمال سے جنوب تک ضلع کا طول ایک سو ۶۶ میل ہے عرض شمال میں ۲۶ میل ہے اور جنوب میں صرف چار میل ۔

یہاں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ نیچی پہاڑیوں کا ایک سلسلہ ایک دوسرے اور سمندر کے متوازی چلا گیا ہے۔ یہ پہاڑیاں انتہائی سرسبز اور شاداب ہیں اور ان کے درمیان وسیع شاداب میدان ہیں۔ جن میں جگہ جگہ چھالیا، بانس کے اونچے اونچے پیڑ اور بل کھاتی ہوئی ندیاں بڑا ہی دلکش منظر پیش کرتی ہیں۔ پہاڑیوں پر شیر، ہاتھی، جنگلی بھینسے اور جنگلی بلی وغیرہ کی کثرت ہے۔

ضلع چاٹگام میں پہاڑی علاقہ کے مقابلہ میں زیادہ بارش ہوتی ہے۔ پورے ضلع بارش کا اوسط ایک سو گیارہ انچ سالانہ ہے شہر چاٹگام میں ایک سو پانچ انچ اور کوکس بازار میں ایک سو چالیس انچ۔ مئی سے اکتوبر تک شدید بارش ہوتی ہے ۔

ضلع چاٹگام کا سب سے دلکش مقام "کوکس بازار" ہے۔ یہ جگہ شہر چاٹگام سے اسی میل جنوب میں واقع ہے۔ یہاں کا ساحل جو ۷۵ میل لمبا ہے دنیا کے بہترین ساحلوں میں شمار ہوتا ہے۔

کوکس بازار کے مناظر بڑے ہی دلکش ہیں۔ ساحل پر چھالیا اور ناریل کے لمبے لمبے نازک پیڑ، سامنے سمندر، پیچھے سرسبز و شاداب پہاڑیوں کا سلسلہ ایسا سماں پیدا کر دیتا ہے جس کی مثال پورے پاکستان میں نہیں ملتی۔ اس کا ساحل اپنے قدرتی مناظر کے لحاظ سے فلوریڈا کے ساحل سے کہیں زیادہ حسین اور فرانس اور اٹلی کے ساحل "ریویرا" سے کسی طرح کم خوب صورت نہیں۔

آج کل کوکس بازار کو مشرقی پاکستان میں سیر و سیاحت کا سب سے بڑا مرکز بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اس سلسلہ میں بہت کچھ کام ہو بھی چکا ہے۔ چاٹگام سے کوکس بازار تک پختہ سڑک اور متعدد پل مکمل ہو چکے ہیں۔ ریسٹ ہاؤس اور متعدد دوسری اقامت گاہیں بن چکی ہیں اور وہ دن دور نہیں، جب مغربی پاکستان تک کے سیاح تفریح کرنے اور قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے ہر سال ہزاروں کی تعداد میں "کوکس بازار" جایا کریں گے +



غزل

اختر احسن

یہ دشتِ دل کہ اُسی داغ کا فسوں ہے سب

یہ خواہش و غمِ دل کا سرنگوں ہے سب

کدھر ہے شورشِ غم اور کہاں ہے وحشتِ درد

یہ آہ و نالہ تہہ گنبدِ جنوں ہے سب

یہ لالہ زارِ تمنّا، یہ ساحلِ غمِ دل

یہ عکس و منظرِ جاں رہنِ جوئے خوں ہے سب

رہا جو آتشِ پنہاں تو رشکِ لالہ رہا

بہا جو سیلِ غمِ دل تو آبگوں ہے سب

مزارِ حسرتِ دل ہے سپیدۂ غمِ صبح

دراز دستیٔ شب سے سحر زبوں ہے سب

بکھری ہے یوں گلِ جاں کے جگر میں تاریکی

نظر کا منظرِ آشفتہ خوں بخوں ہے سب

غزل

شہزاد احمد

جوں جوں قدم بڑھائے ہیں جنگل گھنا ہوا
اب سر پہ تیرگی کا ہے پردہ تنا ہوا

پتھر نہ پھینک، دیکھ ذرا احتیاط کر
ہے سطحِ آب پر کوئی چہرہ بنا ہوا

پھرتے رہے ہیں سایۂ غم کی تلاش میں
مدّت کے بعد اپنی طرف جھانکنا ہوا

یا دیں تو کیا ہیں اس میں نہیں خون کی رمق
نکلا ہے میری آنکھ سے پانی چھنا ہوا

پہلے تو تھیں حریفوں سے زور آزمائیاں
اب کے تو اپنے آپ سے ہی سامنا ہوا

گر ہے مسافروں کی یہی پاشکستگی
چلنا بھی آپ اپنے قدم ناپنا ہوا

صحرائے یاس میں کوئی تصویر بھی نہیں
دیکھیں گے کس کو ہم نے اگر دیکھنا ہوا

کاٹی کسی کی بات تو ٹھہرے گناہگار
رہنا خموش اپنی زباں کاٹنا ہوا

اپنے نصیب میں نہ ہوئی لذّتِ سحر
جب سر پہ دھوپ آئی تو پھر جاگنا ہوا

جب خاک ہی بدن ہے مرا خاک زندگی
پھر خاک چاٹنا تو لہو چاٹنا ہوا

موجود جو بھی ہے وہ مری دسترس میں ہے
تو کون تھا کہ تجھ سے نہ میں آشنا ہوا

دشتِ طلب میں شبنمِ احساس کا خیال
پتھر سے زندگی کی دعا مانگنا ہوا

شہزاد آرزو کے دریچے نہ بند کر
کیسے نکل سکے گا اگر بھاگنا ہوا

مقامات :

کراچی : نیا رُوپ

(دورِ انقلاب میں)

اسلم قریشی

کراچی نے جس طرح ہمارے دیکھتے دیکھتے خوب سے خوب تر کے چند در چند مرحلے طے کئے ہیں وہ ایک طلسم سے کم نہیں، جیسے یکلخت الف لیلہ کی کوئی بہت ہی رومانی داستان، کوئی بڑا ہی رنگین ورق نظر کے سامنے آموجود ہوا ہو۔ یا جیسے میر کو پردیس میں اپنی دِلّی کے گلی کوچے اوراقِ مصور نظر آئے تھے اور جو شکل نظر آئی تھی تصویر نظر آئی تھی ——— وہی طمطراق، وہی زیبِ ایوان و در، وہی شانِ دل آویزی جو کسی عروس البلاد کو اسم بامسمیٰ بناتی ہے۔ نفاست و آرائش کا وہی عالم جو شاعر کے تصور کو جمال، مصور کے مُوقلم کو رنگینیٔ آذر کو حُسنِ تراش عطا کرتا ہے ——— ایک خیال، ایک خوابِ بیداری، اور صرف یہی نہیں، یہ بننے سنورنے، جمیل سے جمیل تر ہونے اور روپ نکھارنے کا سلسلہ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ نگار بندوں کی طرح برابر روز بروز، لمحہ بہ لمحہ آگے ہی بڑھتا ہوا، فزوں تر، خوب تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

یہ روشنیوں کا شہر، رعنائیوں کا شہر، رنگ، رس، روپ کا نگر، ہلچل، عمل، رفتار، سرجوشی اور سرگرمیٔ حیات کا گہوارہ، جسے میں نے دِلّی، لکھنؤ، حیدرآباد دے کر حاصل کیا ہے۔ بابائے ملت رح کا جنم بوم، ان کی تعلیم و تربیت کا شہر، ان کی سرگرمیوں کا شہر، ان کی کامرانیوں کا شہر، اُن کی بازگشت کا شہر اور اُن کی آخری آرام گاہ بھی ہے۔ اسی لئے ہم سب کو اس کے ساتھ شروع ہی سے محبت رہی ہے، گویا پاکستان ایک محیط ہے اور وہ اس کا مرکز ——— دیارِ پاک کا پہلا دارالحکومت، خطۂ پاک کا شہرِ اوّل۔ اب اگر وہ دارالحکومت نہیں رہا تو کیا ہے، اس کی سرتاجی اور زینت میں کوئی فرق نہیں آئیگا۔ بلکہ اس کا روپ اور نکھرتا ہی چلا جائے گا۔ ہم نے اس کے بام و در سجانے کے لئے اس کے حسن کی آرائش کے لئے، اس کے گیسوؤں کو نئی تب و تاب دینے کے لئے جو کوششیں شروع کر رکھی ہیں وہ اسے واقعی بلادِ پاک کی عروسِ نو بنا رہی ہیں۔

اگر ہم پہلے اُس کراچی کو ——— آج سے تیرہ برس پہلے کے کراچی کو ——— سامنے رکھ کر اس کراچی کو دیکھیں جو نئی شان سے ابھر رہا ہے، ابھر چکا ہے اور ابھرتا رہے گا، تو ہم حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ماضی میں مچھیروں کی بستی۔ پھر اس کی جُون پلٹتی رہی اور سوا سو سال میں ۳ لاکھ کی آبادی پر پہنچی مگر اب یہ پاکستان کا سب سے بڑا شہر ہے۔ رونق، خوبصورتی، نئی نئی بستیاں، سجے سجے بازار، ہر جگہ دامن کش۔ کلفٹن ہے تو جانفزا۔ آئیلفی ہے تو نظر نواز، بندر روڈ، صدر، ناظم آباد، لالہ زار، آگے بڑھیں تو بستیاں ہی بستیاں۔ ویرانے اب گل بداماں روشوں اور بستیوں میں تبدیل ہو چکے ہیں، گویا رنگینیٔ آب و ہوا سے کوئی گلاب کا پھول تو بہ تو اوراق کی شکل میں مسکرا پڑا ہو، کوئی کلی کھل اٹھی ہو۔ لال انگارہ، سراپا رنگ و بو، جیسے سرخ سرخ دیپوں کی چکریاں ہی چکریاں، جنور ہی جنور، جگ مگ جگ مگ کر رہے ہوں!

دورِ انقلاب سے پہلے دیارِ پاک اور اس کا "شہرِ اول" کراچی بھی ہماری قومی بدحالی و ادبار کے بُرے دن دیکھ چکا ہے ——— مگر اب بُرے دنوں کا اس اچھے سمے ذکر کرنا تحصیل حاصل ہے، مفاد پرست اس طرح کھُل کھیلے اور اس طرح من مانی کی کہ قوم بنجاروں کی قوم بن کر رہ گئی۔ شہر کیا تھا جھگیوں، جھونپڑیوں اور عفونت و مزبلہ کا مجموعہ، سیاسی بد دیانتوں اور بے عملوں کے جو لچھن تھے وہ چھوٹے پیمانے پر اس دارِ حکومت میں بھی ظاہر ہوتے ——— کارپوریشنوں اور میونسپلٹیوں کی انتظامی مشینری تو ویسے ہی خاص شہرت کی مالک رہی ہے، مگر سنا تھا کراچی کارپوریشن پورے برصغیر میں بہترین کارگزار ادارہ تھی اور شہر صفائی، ستھرائی، نک سے سُکھ درست ہونے میں مثال مانا جاتا تھا، مگر برا ہو دھڑے بندی کا، مفاد پرستی، سہل انگاری، اور بے توجہی بے عملی کا۔ کہ اس نے اس دلہن کا سارا روپ سنگھار نوچ لیا۔ صحت و صفائی کا اہتمام تو کیا کرتے یہ لوگ، شہر کے "منتخب نمائندے" ایک غول تھا مفاد پرست اور موقع پرست لوگوں کا جنہیں نہ شہر سے دلچسپی تھی نہ اہلِ شہر سے۔ معمولی بنیادی احساسِ شہریت تک ان لوگوں میں نہ تھا۔ معقول سے معقول تجویز کو کھٹائی میں ڈال دینا ان کے معمولی ہتھکنڈے تھے ——— کوئی سڑک

ایسی نہ تھی جو ٹوٹی پھوٹی، حادثوں کا مرکز نہ ہو۔ پارک تھے تو گنجے، بے برگ و بار۔ بیماریوں نے اگر اس شہر کو خاص طور پر تاک رکھا تھا تو خلاف توقع نہ تھا۔ حد یہ کہ جو تفریح گاہیں ہمیں بطور ورثہ ملیں یہ لوگ ایسے کپوت ثابت ہوئے کہ ان کی آرائش میں اضافہ کرنا تو کجا اپنی بےعملی و بداعمالی سے انہیں بھی خرابوں میں تبدیل کر دیا۔ ایسی کسی جگہ بھی آدمی نکل جاتا اُداسی، بےلطفی اور بےرنگی سے اکتا جاتا۔ مکروہ نظاروں میں اضافہ کرنے کے لئے غلیظ جھگیوں کا سلسلہ۔ ان کے مکینوں سے بےپروائی کا کھلا ثبوت تھیں۔ فٹ پاتھ پر ہجوم بےہنگام میلے چیکٹ چیتھڑے لگائے لوگ ٹاٹ کے بوسیدہ پردوں کے پیچھے رہتے تھے۔ جب ان سڑکوں پر سے غیر ملکی سیاح اور مہمانان عزیز گزرتے ہوں گے تو پاکستان کا کیا تصور و تاثر لے کر جاتے ہوں گے؟ حد یہاں تک پہنچی تھی کہ عین ایوانِ قانون ساز کی پشت پر بھینسوں کی گندی بستی، بدبودار نالہ اور غلیظ و مکروہ جھونپڑیوں کا سلسلہ چلا گیا تھا جسے اس عمارت پر سے دیکھنے والے ضرور دیکھتے ہوں گے اور پاکستان کے دارالحکومت کے متعلق کیا خیال کرتے ہوں گے!

شکر ہے قائدِ اعظمؒ کا یہ مولد زیادہ عرصہ تک اس درگت کا شکار نہ رہا اور عوام اپنے طور پر بہت کچھ کرتے رہے۔ کراچی پھر بھی ترقی کرتا رہا اور انقلاب کا جیسے منتظر ہی تھا۔ جیسے ہی یہ دورِ جاں بخش طلوع ہوا اس کے چہرے پر پھر رونق کی روشنی چمک اٹھی، پھر خونِ حیات کی لکیریں ابھر آئیں۔

کراچی کے لئے تو مارشل لا رخاص طور پر داروئے حیات ثابت ہوا۔ لوگ اپنی ذمہ داریاں پھر جان گئے، احساسِ شہریت پھر بیدار ہو گیا۔ بستیاں صاف ستھری بننے لگیں۔ غلاظت کے ڈھیر جبراً اٹھوا دیئے گئے۔ ہر شخص کے احساس کو نئی توانائی ملی۔ غافلوں کو تنبیہہ ہوئی۔ ادھر دورِ نو نے مہاجرین کو ستھرے ذیلی شہر بنا کر دیئے فٹ پاتھ صاف ستھرے ہونے لگے کارپوریشن کو "منتخب نمائندوں" کے بوجھ سے "سبکدوش" کر دیا گیا۔ گویا خس بھی کم ہوا اور جہان بھی پاک ہوا۔

کارپوریشن پر سے جب یہ کابوس ہٹ گیا تو اس کے کارپردازوں کو بھی کام کرنے کے لئے آزادی کا سانس لینا نصیب ہوا۔ ممبروں کی تُو تُو میں میں، خوشامد، بددیانتی کے کرتوتوں سے نجات ملی۔ آرائشِ بلدہ کا کام نئے ولولے سے شروع ہو گیا۔ ادھر ادارۂ ترقیاتِ کراچی نے کام سنبھال لیا ـــ غرض ایک نیا کراچی ابھرنے لگا ـــ جیسے کوئی تیتری ہو، خوبصورت، شوخ رنگ۔

اب پرانے نظام کا منحوس سایہ چونکہ اٹھ چکا ہے اور بنیادی جمہوریتوں کے نمائندے برسرِ عمل ہیں، جنہیں عوام نے اپنی مرضی سے چنا ہے۔ "پارٹی لیبل" کے لوث سے اب ان کا ضمیر آزاد و پاک ہے، اس لئے وہ خیر کو خیر اور شر کو شر ہی کہیں گے۔ اب اس دیار کی بنیادی ضرورتوں۔ صحت، صفائی، روشنی، آرائش کا اہتمام نو نئے سانچے میں ڈھلنا شروع ہو چکا ہے۔

اور یہ سب کام دورِ انقلاب کے صرف دو سال میں ہوا ہے ـــ اتنی قلیل مدت میں شہر کو بہتر بنانے کی تجویزیں تکمیل کے مراحل بھی طے کر چکیں، بلکہ کاروانِ شوق اور ذوقِ عمل ابھی ہمیں آگے ہی لئے جا رہا ہے۔ مثلاً طویل المیعاد منصوبوں میں ایک تجویز یہ ہے کہ کلفٹن کی ساحلی تفریح گاہ کو ایک نمونہ کا چمن زار بنا دیں۔ چنانچہ کلفٹن کے پانی کے ساتھ دور تک دیوار بنائی جائے گی اور اس کے ساتھ ایک میرین ڈرائیو یا ساحلی شاہراہ تعمیر کی جائے گی جس کے ساتھ عالیشان خوبصورت عمارتوں کا سلسلہ، باغات نفیس پارک اور عوامی تفریح گاہیں ہوں گی۔

کلفٹن کی زینت کاری کے علاوہ شہر کے قلب میں "جہانگیر پارک" کو ایک نفیس تفریح گاہ بنایا جا رہا ہے۔ چنانچہ تمام ریتیلے میدان میں جسے "جہانگیر پارک" کہا جاتا تھا، نرم دُوب اُگ آئی ہے۔ وسط میں ایک حوض تعمیر ہو رہا ہے جس میں بڑا خوبصورت فوارہ رقص کیا کرے گا۔ اور اس حوض میں بطیں تیرتی رہا کریں گی۔ چاروں طرف بلند و بالا اشجار اور خوبصورت روشنیوں والے قمقمے لگے ہوں گے۔ غرض قلبِ شہر میں یہ پارک اب واقعی ایک بڑا نفیس مقامِ راحت بن جائے گا۔

کراچی کی سڑکوں کو چوڑا کرنے اور اسے بڑھتی ہوئی ٹریفک کے لئے بہتر اور محفوظ بنانے کا کام جاری ہے۔ جابجا گھاس کے تکون بنائے گئے ہیں ـــ پرانی نمائش کے سامنے جو خوبصورت مثلثی باغیچہ بنا ہوا ہے وہ بھی بہت عمدہ سیرگاہ بن چکا ہے۔ سڑکوں کے دونوں جانب شجرکاری ہو رہی ہے اور بہت جلد یہاں کی سڑکیں سایہ دار درختوں سے بڑی آراستہ اور نظر فریب ہو جائیں گی۔ اور اب سے چند سال پہلے کراچی کی سڑکوں پر گرد و غبار کے جو مرغولے اڑ اڑ کر ہمارے پھیپھڑوں کو خراب کیا کرتے تھے وہ سب ختم ہو جائیں گے۔

غرض اس وقت کراچی میں ہر طرف تزئین و آرائشِ شہری کا چرچا ہے۔ یعنی گلشن کا بندوبست دوسری ہی طرح ہو رہا ہے منجملہ اور کئی خوبصورت اضافوں کے جو انقلاب اکتوبر کے بعد نظر آتے

یہاں دو فواروں کا جو حال ہی میں تعمیر ہوئے ہیں، ذکر کرنا بیجا نہ ہوگا۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ گرم ممالک میں خنکی، راحت اور آسودگی کا جو بھی شہری بندوبست کیا جائے وہ اس جگہ کے رہنے والوں کے لئے گویا ایک نوید جانفزا ہوتی ہے۔ اس میں پانی کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ پانی کو اگر نفاست اور سلیقہ کے ساتھ آبشار یا فوارہ کی مانند حرکت میں لایا جائے تو نظارہ بڑا پُر کیف، ماحول بڑا راحت فزا اور فضا میں بڑی سکون بخش بن جاتی ہیں۔ سردست دو فوارے تعمیر ہو چکے ہیں اور تجویز ہے کہ تقریباً ایک درجن ایسے فوارے اور نصب کئے جائیں گے۔

فوارے ہمارے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہیں۔ ہمارے فنِ تعمیر کے جو نفیس نمونے اس وقت موجود ہیں اُن میں آبی روشیں بنانے اور حوض و فوارے کی آرائش آج بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ نئے عہد میں فواروں کی تعمیر جدید صناعی اور مُہندسی کے بھی کچھ تقاضے کرتی ہے اور نئے ماحول میں نئے اوضاع کے فواروں سے فرحتِ زندگی اور نفاستِ تصور کے اور ہی نقشے ذہن میں آتے ہیں۔

فواروں کی تعمیر میں بھی صناعی ڈیزائین کی اُپج کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ فواروں کے دو مقصد ہوتے ہیں۔ تعمیراتی اشکال کی خوبصورتی کا نمونہ ہونا اور آبِ رواں کے رقص اور جست وخیز کا بھی ایسا نمونہ ہونا جو حُسن اور تجمل دونوں کا امتزاج ہو۔

آج کل کراچی میں ان دونوں فواروں کی تنصیب و تعمیر کا بڑا چرچا ہے۔ اونچے درجے کے نقادوں کی بات تو چھوڑ دیجئے۔ وہ ان میں عیب جوئی کرتے ہیں مگر ویسے آپ دیکھیں تو یہ فن اور صناعی کے بہت اچھے نمونے ہیں۔ ایک تو ڈرگ روڈ جب شہر کی بونس روڈ سے آکر ملتی ہے، اس کے چورستے پر واقع ہے یہ بہت ہی نفیس اور خوبصورت فوارہ تو نہیں کہا جا سکتا مگر بناوٹ اور آبِ رواں کی جست وخیز نے اسے جاذبِ توجہ بنا دیا ہے۔ فوارہ مدوّر تعمیر کیا گیا ہے۔ کنکریٹ کا ایک رُبع دائرہ قائم کر کے چار تنگ گہرے زینے نیچے اتارے گئے ہیں۔ زینوں پر رنگ برنگے شیشوں سے مرصع کاری کی گئی ہے اور پشت پر سے "نیون لائٹ" کی چھوٹ ڈالنے کا انتظام کیا گیا ہے اور بڑا اچھا نظارہ پیش کرتا ہے۔ کنکریٹ کے مدوّر تودہ سے پانی کی تیز رو پھوار چھوٹتی ہے اور زینوں پر سے بہتی ہوئی گزر جاتی ہے۔ پھر نیچے پانی جمع رہنے کا جو خزانہ ہے، اس میں نیچے پہنچ جاتی ہے، یہ بھی مدوّر وضع کا بنایا گیا ہے۔

فوارے کی نالیاں او پر عمودی حالت میں ہیں اور پوری تعمیر کو ایک سادہ مگر پُرکار اور خوبصورت نفیس ڈیزائین کا حامل بنا دیتی ہیں۔

دوسرا فوارہ ایوانِ صدر پاکستان کے سامنے وکٹوریہ روڈ اور میولاک روڈ کے چورستے پر بنا ہوا ہے۔ اسے موسیقی کی علامت سے متصف کیا گیا ہے اور "گانے والا فوارہ" کہلاتا ہے۔ اور بربط کی شکل ہے۔ اکثر اس میں سے ٹیپ ریکارڈ کئے ہوئے نغمے (جس کی مشین دہیں کہیں فوارے میں لگائی گئی ہے) پانی کی بارش کے ساتھ عجب لطف پیدا کرتے ہیں۔ گویا جنتِ نگاہ اور فردوسِ گوش دونوں ناظر کے لئے مہیا کر دیئے گئے ہیں۔ حوض کا مرمریں کٹہرا بنایا گیا ہے اور ہلال کی شکل کا ہے۔ پھر بربط کی شکل کی وضع نصب کی گئی ہے اور ہلال کے بیچ میں نجم کا تصور ڈیزائین سے بخوبی ہویدا ہے۔ ڈیزائین کی ایک خوبی اقلیدسی اشکال کی صحت و صفائی بھی ہے جس وقت رات کو رنگ برنگی پوشیدہ روشنیاں اس فوارہ کے قلب سے اپنا جلوہ بکھیرتی ہوئی نظر آتی ہیں تو آدمی خوابناک دنیا میں کھو جاتا ہے۔ جو اس نور و رنگ، روانیٔ آب اور موسیقی کی مدھر آبشار کے ملنے جلنے سے پیدا ہوتی اور جو اس پر چھا جاتی ہے۔

ان فواروں کی تنصیب کے سلسلے میں بعض لوگوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ان کی خوبصورتی اور فرحت افزا کیفیت کو دیکھنے کے لئے لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے اور وہ قدرتی ہے مگر انہیں بہت مصروف سڑکوں کے عین وسط میں لگا دیا گیا ہے۔ اس لئے ٹریفک میں گڑبڑ ہوتی ہے اور حادثات کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لئے ان فواروں کو اگر قلبِ شہر میں لگانا ہی ہے تو مصروف سڑکوں سے ہٹا بچا کر ایسی جانب کسی حصے میں بنانا چاہیئے جہاں ٹریفک کی زیادتی کی وجہ سے گڑبڑ نہ ہو اور پبلک کی حفاظت کا اہتمام نظر سے اوجھل نہ رہے۔ آئندہ جو فوارے بنائے جائیں انہیں نصب کرنے وقت اس بات کا خیال رکھنا بہتر ہوگا۔ علاوہ ازیں ڈیزائنوں کے سلسلے میں بھی ہمیں کئی باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ مغلوں کی آرائشی جدت طرازی اور نفاست اوضاع کا بھی ہمارے ہاں اثر ہونا چاہیئے تاکہ ہمارے ماضی اور ثقافتی ورثہ کا پرتو اس طرح جلوہ ریز رہے کہ "نشاط باغ" اور "شالامار" کی سکون بخش فضائیں اور تعمیراتی نفاست و اسلوب کی روشن نشانیاں جدت پسندی اور نئے ذوقِ آرائش میں غلو کی نذر نہ ہو جائیں۔ اور جب ہم

کراچی کو ایک نیا ساز و آہنگ دے رہے ہیں، تو ارباب حل و عقد کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ ان چند معروضات کو بھی اپنے فنی مظاہرات میں سامنے رکھیں اور کراچی کو نئے دور میں جو نئے بال و پر مل رہے ہیں اور اس کی مشاطگی کا جو نیا اسلوب اختیار کیا جا رہا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں ہماری آزادہ روی اور ثقافتی رجحان دونوں کا ایک حسین و صحت ور امتزاج بن جائے جس سے کراچی کے باشندے بھی اپنے ذوق نظر کا سامان فراہم کریں اور بیرونی سیاح بھی اس کی ایک شگفتہ و دلنشیں یاد لیکر یہاں سے جائیں۔

مقام مسرت ہے کہ مزار قائد کے سلسلے میں ایک ماہر فن کے مشورے کے مطابق ابھی مناسب ترمیمات کرکے جو مزار قائد کے شایان شان ہوں، اس جگہ ایک دل کشا باغ عامہ بنا دیا جائے گا جس میں مسجد و عیدگاہ کی ایک شاندار مسجد بھی یہاں روحانی تسکین کا موجب و مخزن ہوگی اور خوبصورت باغ اور روشیں بھی آنکھوں کو نور بخشیں گی۔

ادھر ڈرگ روڈ پر "قومی پارک" بنانے کی تجویز مکمل ہو چکی ہے جو قدرتی ماحول میں حیوانات اور نباتات کے نادر نمونوں کا ایک اور طلسم زار ہوگا۔ اب سارے شہر میں نئی آرام دہ بسیں چل پڑی ہیں اور ان میں اضافہ ہو رہا ہے۔ سرکلر ریلوے سارے طول و عرض کراچی کو اپنے آغوش میں لے کر شہر کی خوبصورتی اور صلاحیت کار میں مزید اضافہ کا باعث ہوگی۔ یہ ریلوے بہت جلد تعمیر کی منزلیں شروع کرنے والی ہے۔

یہ ذکر تشنہ رہ جائے گا اگر میں شہر کی ایک بالکل نئی، اچھوتی نفیس الوضع عمارت آپ کو نہ دکھاؤں۔ میرا مطلب ہے آرٹ کونسل کی عمارت سے جو ایوان صدر کے نزدیک ہی بڑی خوبصورت عمارت ہے۔ ہنر و فن کو قوم کی زندگی میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ یہ اس کے ذوق کی علامت بھی ہیں اور اس کے احساس جمال کو جلا بھی دیتے ہیں ــــ قمر ہاؤس، محمدی ہاؤس، پولیس کا صدر دفتر، انجمن بین الاقوامی تعلقات وغیرہ کی عمارات بھی صورت گری، صناعی و تعمیراتی ذوق کی بہت اچھی نمود ہیں مگر مصوروں، نقاشوں، رقاصوں اور فنون لطیفہ کے دلدادگان کی تسکین ذہنی کے لئے جو عمارت سطح ارض پر نمودار ہوئی ہے وہ اس ادارہ کی مناسبت اور تلازمہ کی رُوکش ہے۔ اس کے نگار در و ایوان کی جدید کیفیت دیدنی ہے اور ہونی بھی چاہئے کیوں کہ یہ عمارت نہ ہو تو گویا دلھن کے ماتھے پہ جھومر نہ ہو۔ یہ گہوارۂ فنون لطیفہ ہے، یونانی پارتھینان کی طرح ان کی پرورشگاہ بھی، سامان نمود بھی اور ایک علامت بھی۔ شاید اس کے بغیر کراچی کا نیا روپ بجھا بجھا سا رہتا، فضا روکھی روکھی سی نظر آتی۔ آرٹس کونسل کی عمارت سے صرف ایک ضرورت ہی پوری نہیں ہوئی بلکہ عروس البلاد کو ایک گوہر آبدار بھی مل گیا۔ اور جب اس کی تجویز کردہ "قومی تھیٹر" کی عظیم و رفیع عمارت بھی بن جائے گی تو کراچی کی شان دلآویزی میں اور بھی چار چاند لگ جائیں گے +

●

تبصرہ:

" ارض پاک کے افق پر یوں تو سورج روز ہی چمکتا ہے لیکن ۲۷ر اکتوبر ۱۹۵۸ء کو چمکنے والے سورج کی آب و تاب اور شان ہی نرالی تھی۔ اس کی پہلی کرن ہم آٹھ کروڑ باشندوں کے لئے اپنے دامن میں بے پناہ خوشیوں کے خزانے لے آئی۔ ہم تباہ حال اور زندہ درگور لاشوں کے لئے حیات نو اور حیات جاوداں کا پیغام لے آئی۔ انقلاب آیا ــ! انقلاب عظیم ــ!!

جس قسم کا انقلاب ہمارا مورخ لکھے گا۔ وہ اپنی نوعیت کا واحد اور ڈرامائی انقلاب ہے۔ اس بار ہماری تقدیر کے افق پر ایوب نامی ایک درخشاں ستارہ نمودار ہوا ہے۔ ہماری بگڑی ہوئی تقدیر کو سنوارنے اور بدلنے کے لئے یہ کیا کم ہے کہ جمہوریت کے نام پر جمہور کو لوٹنے والے اور بے وقوف بنانے والے جادوگروں کی سحرکاری کو نیست و نابود کرکے ملک میں ایک نئی طرز کی حکومت حکومت قائم کر دی گئی۔"

"مجلۂ قانون" سندھ مسلم لا کالج۔ کراچی کے "گردوپیش" سے یہ اقتباس اُس تأثر کا آئینہ ہے جو ۲۷ر اکتوبر کے انقلاب اور انقلابی حکومت کے متعلق بالعموم محسوس کیا جاتا ہے۔ اور مجلہ مذکور کا زیر نظر سالانہ نمبر بڑے سلیقے سے ترتیب دیا گیا ہے، اسی خوشگوار فضا کی عکاسی کرتا ہے جو انقلاب سے پیدا ہوئی۔ اور اس کے ساتھ طلبہ کی زندہ دلی اور والہانہ ذوق شوق کا آئینہ دار بھی ہے

●

اقوامِ متحدہ کی فنّی امداد اور پاکستان

فضل حق قریشی دہلوی

پہلی جنگِ عظیم کی طرح دوسری جنگِ عظیم ختم ہونے کے بعد بھی بین الاقوامی نوعیت کے بعض مسائل حل کرنے اور بعض قضیوں کو طے کرنے کے لئے ایک عالمی انجمن قائم کرنے کی ضرورت بری طرح محسوس کی گئی، خاص طور پر اس لئے بھی کہ سیاسی تعلقات میں کشیدگیاں اور الجھنیں پیدا ہو جانے کے علاوہ اقتصادی اور معاشرتی نظام کے شیرازے بھی پہلے کی بہ نسبت زیادہ بری طرح بکھر گئے تھے اور انہیں نئے سرے سے مربوط کرنا اور مستحکم و استوار رکھنا لازمی ہو گیا تھا۔ چنانچہ اقوام متحدہ کے نام سے جس کے اراکین کی تعداد شروع میں پچپن تھی اور بڑھتے بڑھتے اب بیاسی ہو گئی ہے اور شاید یہ سال ختم ہونے سے پہلے نوّے ہو جائے، ایک عالمی انجمن کی بنیاد رکھ دی گئی جو ۱۹۴۵ء سے اب تک قائم ہے اور روز بروز زیادہ مقبول ہوتی جا رہی ہے۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ اس کے زیر ایوان سیاسی مذاکرات کے کے علاوہ اقتصادی اور معاشرتی ترقیوں کے موضوعات کو زیادہ اہمیت کے ساتھ مدِ نظر رکھا گیا ہے، کیونکہ سب نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ اقتصادی اور معاشرتی بدحالی کی صورت میں جبکہ غربت و افلاس، دکھ بیماری اور جہالت و ناخواندگی کا مذموم چکر چلتا ہی رہتا ہے، سیاسی تعلقات کی فضا بھی کبھی خوشگوار نہیں رہ سکتی۔

اقتصادی اور معاشرتی حالات کو سدھارنے کے لئے سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں اور پس ماندہ ملکوں کے درمیان رابطہ قائم کیا جائے اور اول الذکر سے فنی اور مالی امداد لے کر موخر الذکر کو پروان چڑھایا جائے۔ چنانچہ اقوام متحدہ کے چارٹر کی تمہید میں واضح طور پر درج کیا گیا ہے کہ بہتر معیارِ زندگی کو بلند کرنے کی ہر ممکن صورت پیدا کی جائے گی۔ اسی خیال اور نصب العین کے پیشِ نظر فنی امداد کا توسیعی پروگرام قائم ہے جس کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی یا سلامتی کونسل میں کسی سیاسی مسئلے پر کبھی کبھی اختلافِ رائے ہو جاتا ہے اور کونسل میں تو ویٹو کے استعمال تک کی نوبت آ جاتی ہے لیکن فنی امداد کے موضوع پر بیشتر فیصلے اتفاقِ رائے سے ہوتے ہیں۔

اقوام متحدہ اور اس کے مخصوص اداروں کے اصل پروگراموں کے اخراجات ان کے مستقل میزانیوں سے پورے کئے جاتے ہیں لیکن اس کے برعکس فنی امداد کے توسیعی پروگرام کے لئے ایک علیحدہ خاص فنڈ ہے جس میں ہر سال حکومتوں کے رضاکارانہ چندے جمع کئے جاتے ہیں۔ اس پروگرام کی افادیت و اہمیت کا اندازہ اس طرح بھی ہوتا ہے کہ اس کے تحت امداد دینے اور امداد پانے میں وہ حکومتیں بھی شامل ہوتی ہیں جو کسی وجہ سے اب تک اقوام متحدہ کی رکن بھی نہیں بن سکی ہیں۔

فنی امداد خود ملکوں کی درخواست پر دی جاتی ہے اور ہر ملک کا الگ الگ لحاظ رکھتے ہوئے امداد کی نوعیت کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ فنی امداد کے ادارے کے ذریعہ اقتصادی ترقی، منصوبہ بندی، معاشرتی فلاح و بہبود، حفظانِ صحت، فروغِ تعلیم اور سرکاری نظام کی بہتری سے متعلق مختلف قسم کی امداد دی جاتی ہے۔

فنی امداد کی مختلف نوعیتیں ہیں۔ سب سے اہم قسم یہ ہے کہ پس ماندہ ملکوں کی حکومتوں کو ماہرین کی خدمات دی جائیں تاکہ وہ اپنے وسائل و ذرائع کو ترقی دینے میں اپنے منصوبوں پر خود عمل کرنے کے لائق ہو جائیں۔ ماہرین تنہا یا جماعتوں کی صورت میں بھیجے جاتے ہیں اور ان کی خاص قابلیت کے لحاظ سے ان کو دنیا کے ہر حصے سے منتخب کیا جاتا ہے۔

امداد کی ایک اور صورت یہ ہے کہ پس ماندہ ملکوں کے باشندوں کو وظیفے دئے جائیں تاکہ انہیں غیر ملکوں میں جا کر تربیت پانے کے موقعے ملیں اور پھر وطن واپس آ کر اپنی صلاحیتوں سے اپنے اپنے ملک کو فائدہ پہنچائیں۔

طبقاتی اعتبار سے پس ماندہ ملکوں میں علمی اجتماعوں، تربیتی مرکزوں اور کارخانوں کی ابتدا کا کام بھی کیا جاتا ہے۔ فنی امداد کی مد میں کچھ سامان بھی فراہم کرنے کی صورت پیدا کی جاتی ہے لیکن اس کی مقدار قلیل ہوتی ہے کیونکہ وہ سامان زیادہ تر ماہرین کے کام میں سہولتیں

بہم پہنچانے کے لئے دیا جاتا ہے۔

فنی امداد کا توسیعی پروگرام قیام پاکستان سے قبل ہی وجود میں آچکا تھا، اس لئے پاکستان بنتے ہی اس کا سلسلہ اس نئی مملکت میں شروع ہوگیا اور جس طرح خود حکومت کے ارباب حل و عقد کو ہر کام نئے سرے سے کرنا پڑا تھا، توسیعی پروگرام کے ماتحت بھی ہر منصوبے کی ابتدا پہلی منزل سے کرنی پڑی۔ اسی لئے یہاں کاموں کی نوعیت بالکل مختلف رہی ہے۔ مثلاً آبی وسائل کی ترقی کو لیجئے۔ خاص طور پر کراچی کے علاقے میں چند ماہرین نے سرکاری محکمۂ آب رسانی کے ساتھ مل کر تقریباً دو سال تک تحقیقات کا کام جاری رکھا اور نتائج تحقیقات کو عملی جامہ پہنایا جس کی وجہ سے کراچی میں پانی کی جو بے پناہ قلت تھی، بتدریج دور ہوگئی اور اب نئی نئی بستیاں قائم ہوتے رہنے کے باوجود ہر علاقے میں پانی ضرورت کے مطابق پہنچ جاتا ہے۔ ماہرین نے کراچی کے نزدیک زیر زمین پانی کا کھوج لگانے کے بعد کنوئیں کھدوائے، پائپ لائن ڈالنے اور پمپ نصب کرانے میں ہر لحاظ سے تعاون کیا۔

سابق صوبہ سرحد کے علاقے میں ماہرین نے بادلوں سے مصنوعی طور پر بارش برسانے کے کامیاب تجربے کئے لیکن فی الحال ان کو اس لئے عمل میں نہیں لایا جا رہا کہ ان پر لاگت بہت آتی ہے۔ اگر کوئی سستا نسخہ دریافت کر لیا گیا تو شاید اس پر عمل کیا جائے گا۔

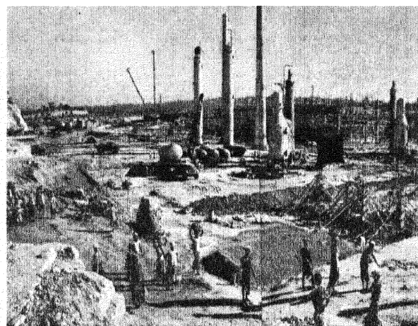
پاکستان میں اقوام متحدہ کے ماہرین نے برقی قوت کی ترقی میں بھی مدد دی ہے۔ پنسلین اور ڈی ڈی ٹی کی تیاری کے کارخانے قائم کرائے ہیں۔ کاغذ، پٹ سن، شکر، جہاز سازی اور پارچہ بافی وغیرہ کے کارخانوں کو ترقی دینے میں مشورے دئے ہیں۔ لاسلکی مواصلات کے نظام کو فروغ دیا ہے۔ ٹیلی فون ایکسچینج کے منصوبے تیار کرائے ہیں، ٹیلی فون کے تار بچھائے ہیں۔ پانی کا ذخیرہ جمع کرنے اور سیلاب کی مصیبت سے بچانے کے لئے بند تعمیر کرائے ہیں اور مناسب تدابیر معلوم کی ہیں۔ امدادِ باہمی کی انجمنیں قائم کی ہیں۔ مزدوروں کے جائزے لئے ہیں۔ نرسنگ اور دوسرے پیشوں کی تربیت کا انتظام کیا ہے۔ زراعتی اور صنعتی پیداوار میں اضافے کے طریقوں پر غور کیا ہے۔ مزدوروں کی حالت سدھارنے میں مدد دی ہے۔ معاشرتی فلاح و بہبود اور جمعیتی ترقی کا خیال رکھا ہے۔ زرعی مشینوں کے استعمال کو رواج دیا ہے۔ مویشیوں اور پرندوں کی پرورش اور ان کی بیماریوں کی روک تھام میں مدد دی ہے۔ ملک بھر میں بہت سی عام بیماریوں، خصوصاً دق، ہیضہ، ملیریا، چیچک اور جذام وغیرہ کے اسپتال کی کوششوں میں ہاتھ بٹایا ہے۔ ٹڈی دَل سے محفوظ رہنے کی صورتیں پیدا کی ہیں۔ جنگلات کو ترقی اور بنیادی تعلیم کو فروغ دینے میں ہر ممکن کوشش کی ہے۔

دوسرے پسماندہ ملکوں کی طرح پاکستان میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے اور اس لئے سرکاری افسر، وزرائے کابینہ اور غیر ملکی ماہرین یکساں طور پر اس سوال کا حل تلاش کر رہے تھے کہ کس کام کو کہاں سے شروع کیا جائے اور کسے کس پر ترجیح دی جائے۔ لہٰذا غور و فکر کی الجھنوں میں پڑنے کی بجائے آسان ترکیب یہی نظر آئی کہ صحت و تندرستی، تعلیم و تربیت اور زراعت و صنعت کے کاموں کو بالکل ابتدائی منزل سے اور بیک وقت شروع کیا جائے اور اسی لئے نہ ترجیح کا سوال باقی رہا اور نہ منزل کا۔ ضرورت ہے کہ ان میں سے بعض کاموں کو کسی قدر تفصیل کی روشنی میں جانچا جائے۔

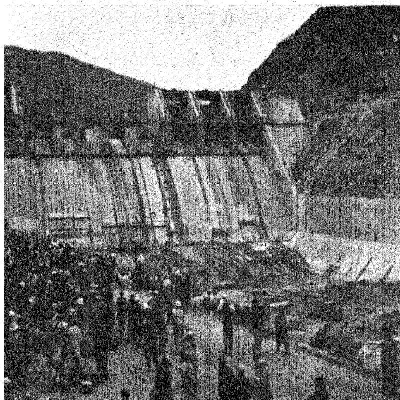
عالمی ادارۂ صحت، اقوام متحدہ کے بچوں کے فنڈ (یونی سیف) اور حکومتِ پاکستان کی مشترکہ امداد سے ڈھاکہ اور کراچی میں تپ دق کی روک تھام اور اس کام کے کرنے والوں کی تربیت کے مرکز اور پھر ان کے ماتحت دونوں بازوؤں کے مختلف اضلاع میں ضمنی مرکز قائم کئے گئے۔ شروع میں جو ماہرین نامزد کئے گئے تھے، اپنی اپنی خدمات انجام دے کر جا چکے ہیں۔ اور اپنے فرائض مقامی طور پر تربیت پانے والوں کے سپرد کر گئے ہیں۔ ان مرکزوں میں فنی ضرورت کے عام سامان کے علاوہ ایکس رے کی مشینیں بھی لگائی گئی ہیں جو یونی سیف کی طرف سے پیش ہوئی ہیں۔ ان مرکزوں اور ضمنی مرکزوں نیز گشتی شفاخانوں کے ذریعے دونوں صوبوں کے ہر چھوٹے بڑے شہر، قصبے اور گاؤں میں مریضوں کا معائنہ ہوا، بی سی جی کے ٹیکے لگائے گئے اور علاج کی مناسب تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔ ڈھاکہ میں تپ دق کی روک تھام کا مرکز اس لحاظ سے بھی ایک منفرد ادارہ ہے کہ عالمی ادارۂ صحت اور یونی سیف سے وظیفے پانے والے غیر ملکوں کے ڈاکٹر اور نرسیں یہاں آکر مزید مہارت حاصل کرتی ہیں اور اس طرح اسے بین الاقوامی حیثیت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔

منازل ترقی

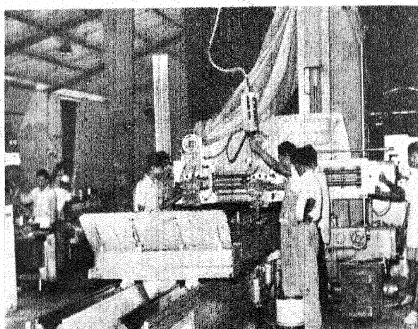
(نیا دور)



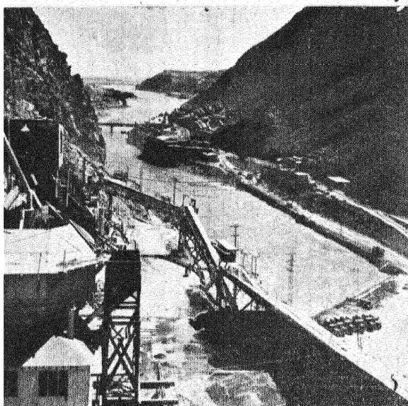
کارخانہ کیمیاوی کھاد (فینچو گنج، مشرقی پاکستان)



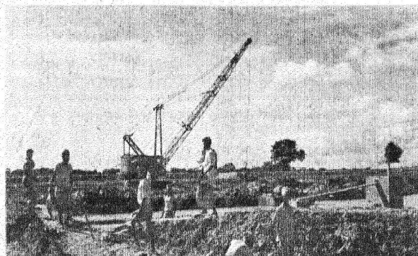
منصوبۂ ورسک (مغربی پاکستان)
جو نصف سے زیادہ مکمل ہو چکا ہے



جہاز سازی کا وسیع پیمانہ پر اہتمام
(کھلنا شپ یارڈ: مشرقی پاکستان)



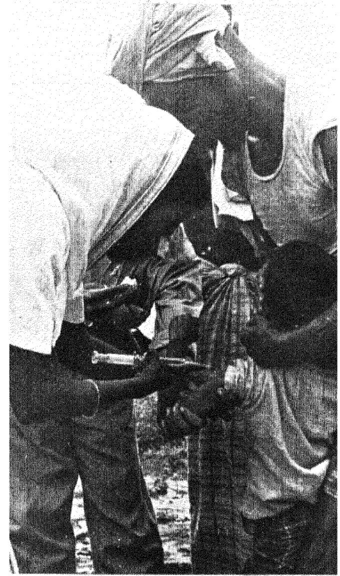
آبپاشی و برقابی قوت کا عظیم الشان منصوبہ
ورسک: مغربی پاکستان

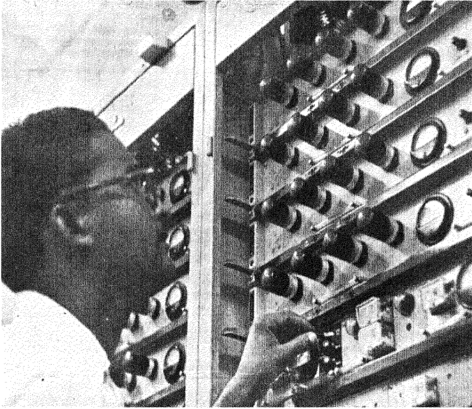


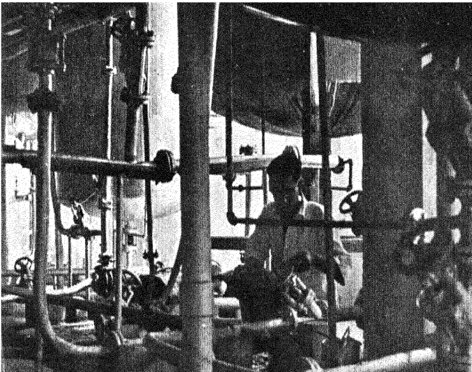
اقوام متحدہ اور پاکستان

(فنی امداد)









۱ : سیلاب زدگاں کی طبی امداد

۲ : تربیتی مرکز ریلوے (لاہور)

۳ : بین الاقوامی لاسلکی مواصلات

۴ : ڈی-ڈی-ٹی کا کارخانہ (نوشہرہ)

اسی طرح اس ریلوے ٹریننگ سنٹر کو بھی بین الاقوامی حیثیت حاصل ہے جو اقوام متحدہ کی فنی امداد کے ادارے نے ۳ اپریل ۱۹۵۴ء کو لاہور کے والٹن کیمپ میں قائم کیا تھا اور اب حکومتِ پاکستان کے سپرد کیا جا چکا ہے۔ برطانوی ریلوں کے ایک مشہور سگنل انجنیئر، مسٹر فریڈرک گوس کو اس طبقاتی تربیتی مرکز میں پرنسپل لیکچرار کی حیثیت سے نامزد کیا گیا تھا جو اب بھی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس عرصے میں ریلوں کے کام اور نظام سے متعلق کئی نصاب ختم ہو چکے ہیں۔ ہر ایک کی مدت تین ماہ سے کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ اس میں پاکستان کے علاوہ بھارت، برما، کمبوڈیا، سیلون، چین (تائیوان) جمہوریہ کوریا اور تھائی لینڈ کے ریلوے افسران شامل ہوتے ہیں۔ اس مرکز کے لئے ضروری سامان اور آلات برطانیہ، فرانس، جاپان بلجیم اور نیدرلینڈز نے تحفتہً پیش کئے تھے۔ مرکز کے ساز و سامان میں فنی آلات کے علاوہ اس موضوع پر تازہ ترین مطبوعات، قواعد و ضوابط کی کتابیں، رسالے، بڑے سائز کے فوٹو، فلم اور سلائڈ شامل ہیں تاکہ طلباء کو ہر بات کے سمجھنے میں پوری سہولت حاصل ہو سکے۔

دنیا کے بہت سے ملکوں کی طرح پاکستان میں بھی ملیریا کی وبا عام ہے۔ لاکھوں انسان ہر سال اس موذی مرض میں مبتلا ہوتے اور ہزاروں فوت ہو جاتے ہیں اور بچنے والے بھی اتنے کمزور ہو جاتے ہیں کہ عرصے تک کسی کام کاج کے لائق نہیں رہتے۔ اس زمانے میں ڈی ڈی ٹی کو سب سے زیادہ حیرت انگیز مچھر مار دوا تسلیم کیا گیا ہے۔ اگرچہ کئی مقامات پر ملیریا پھیلانے والے مچھروں میں اس سفوف سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے تاہم اس کا نعم البدل جب تک دریافت نہ ہو، اسی کو غنیمت سمجھا جا سکتا ہے۔ عالمی ادارۂ صحت اور یونی سیف نے اقوام متحدہ کی ممبر حکومتوں کے تعاون سے متعدد ملکوں میں ڈی ڈی ٹی بنانے کے کارخانے قائم کئے ہیں جن میں پاکستان بھی شامل ہے۔ ہمارے ملک میں نوشہرہ کے مقام پر اس کارخانے کا افتتاح ۲ اپریل ۱۹۵۵ء کو ہوا تھا۔ اس وقت سے وہ سو فیصدی تناسب کا تقریباً سات سو ٹن سفوف ہر سال تیار کر رہا ہے جو مچھر مارنے کی موجودہ مہموں کے لئے فی الحال کافی ہے۔ آئندہ اس کو وسیع کرنے کا امکان موجود ہے۔ اسی طرح پنسلین بنانے کا کارخانہ بھی قائم ہو رہا ہے۔ اس دوا کے استعمال سے کئی فاسد بیماریوں کا انسداد ہو سکتا ہے۔ دونوں کارخانے پاکستان کی صنعتی ترقی کے ادارے (پی آئی ڈی سی) کے زیر اہتمام کام کر رہے ہیں۔ پنسلین کے انجکشن بھی ملک کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کافی مقدار میں تیار ہو رہے ہیں۔ پاکستان کے اسی ادارے کے زیر اہتمام اب حال ہی میں یونی سیف نے دودھ خشک کرنے اور اس کا سفوف بنانے والے ایک کارخانے کے قیام کی ذمہ داری لی ہے تاکہ ملک میں، خصوصاً کراچی شہر میں تازہ دودھ دستیاب ہونے کی جو دشواری ہے اس کا نعم البدل کسی طرح پیدا کیا جا سکے۔

پاکستان میں یونی سیف کی خدمات کا سلسلہ اتنا وسیع ہے کہ ایشیا کے امداد پانے والے ملکوں میں اس کا نمبر تیسرا ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا منصوبوں کے علاوہ یہ فنڈ بچوں کے لئے فالتو غذا کے طور پر دودھ کا سفوف برابر فراہم کرتا رہا ہے جو مدرسوں اور شفاخانوں کے ذریعہ مستحق بچوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس عالمی ادارۂ صحت کے تعاون سے پاکستان کے شہروں اور دیہی علاقوں میں زچگی اور صحتِ اطفال کے کئی سو مرکز قائم کرنے کے لئے ہر قسم کا ضروری سامان فراہم کیا گیا ہے۔ ان مرکزوں کو ادویہ، سامانِ خوراک اور صابن بھی دیا جاتا ہے۔ تقسیم برصغیر کے بعد سے صحتی عملے میں جو زبردست کمی محسوس کی جا رہی تھی، اس کے پیش نظر کراچی، لاہور، پشاور اور ڈھاکہ میں تربیتی اسکول قائم کر کے پاکستانی نرسوں، دائیوں اور ہیلتھ وزیٹروں کو اعلیٰ تربیت دی جا رہی ہے۔ تقسیم کے وقت زچگی کے چار اسپتال کراچی، کوئٹہ، پشاور اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں ڈفرن ٹرسٹ کے ماتحت قائم تھے، یونی سیف نے ان اسپتالوں کو بھی جدید طبی سامان فراہم کیا ہے تاکہ وہ زمانے کی رفتار کے ساتھ باقاعدہ کام کر سکیں۔ کراچی میں بچوں کے لئے اپنی قسم کا پہلا اسپتال قائم کیا ہے جس کے لئے پلنگوں سے لے کر ضروری آلات تک فراہم کئے گئے ہیں۔ اس شفاخانے میں جسمانی اعتبار سے معذور بچوں کا علاج معالجہ ہوتا ہے۔

آج سے تیرہ سال پہلے پاکستان میں برقی قوت کی کمی تھی۔ بہت سے بڑے بڑے شہروں کے بعض علاقے بھی گھپ اندھیرے میں تھے اور صنعتی ترقی کے لئے اس کا استعمال تو بہت ہی محدود تھا۔ اقوام متحدہ نے فوراً اس قوت کے وسائل کو ترقی دینے کے لئے اپنے

ماہرین بھیج کر دور رس منصوبے بنوائے۔ دریاؤں کے تیز دھارے اس مقصد کے لئے نعمت ثابت ہوئے۔ چنانچہ اس وقت ملک کے دونوں حصوں میں برقابی کی پیداوار کو جو ترقی نصیب ہوئی ہے اس میں اقوامِ متحدہ کا زبردست ہاتھ ہے۔ اگر اس اشد ضرورت کی طرف توجہ نہ دی جاتی تو خود اقوامِ متحدہ کے قائم کردہ بہت سے کارخانے حرکت میں نہیں آ سکتے تھے۔

ترقی و توسیع کا خواہ کوئی بھی منصوبہ ہو اسے عمل میں لانے کے لئے روپے کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ معقول سرمائے کے بغیر کوئی کام بحسن و خوبی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ اس مقصد کے لئے اقوامِ متحدہ نے ایک طرف پس ماندہ ملکوں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی بچت میں اضافہ کریں، سرمائے کو بہتر طریقے پر صرف کریں اور ٹیکس وصول کرنے کا نظام سدھاریں۔ دوسری طرف خود اس نے قرضوں کی صورت میں سرمایہ فراہم کرنے کا انتظام کیا۔ چنانچہ پاکستان کو بھی اب تک عالمی بنک اور بین الاقوامی مالیاتی ادارے سے مختلف کاموں کے لئے متعدد قرضے مل چکے ہیں اور زرِ مبادلہ کی سہولتیں بھی فراہم کی گئی ہیں۔ اس کے بغیر غیر ملکوں سے ضروری سامان خریدنا ممکن ہی نہیں تھا۔ چنانچہ ریلوں کی ترقی، زرعی آلات کی خریداری، سوئی گیس کی پائپ لائن کی تنصیب، کراچی میں بجلی کے کارخانے کی تعمیر، کرنافلی پیپر ملز کی توسیع وغیرہ کے لئے قرضے ملے ہیں۔

مذکورہ بالا اور ان جیسے بہت سے کاموں کے پروگرام حکومت نے بڑی احتیاط سے مرتب کرائے تھے اور اس طرح جو کام اب تک ہوئے ہیں، ان کو قابلِ تحسین کہا جا سکتا ہے۔ کچھ پایۂ تکمیل کو پہنچ گئے ہیں اور باقی کا سلسلہ جاری ہے اور جب تک وہ ختم ہوں، نئے سلسلے شروع ہوتے رہیں گے۔ بعض کاموں کی رفتار بہت ہی سست رہی لیکن اس کے سوا چارۂ کار نہیں تھا کیونکہ جب غربت، ناخواندگی اور بیماری جیسے دشمنوں کے خلاف جدوجہد کرنی ہو تو کوئی مہم آسانی سے سر نہیں ہو سکتی۔

بقیہ "پومپیائی کی آخری رات" صـ۶۳

وہی ہماہمی لیکن اب یہ گہماگہمی اور ہماہمی محکوم نہیں تھی، غلام نہیں تھی، مظلوم اور سہمی ہوئی نہیں تھی۔ آزاد تھی۔ اس میں زندگی کا رچاؤ اور رکھ رکھاؤ تھا۔ ٹوٹے ہوئے قانون کے ٹکڑے یکجا ہو گئے تھے۔ ڈوبا ہوا انصاف ابھر آیا تھا۔ قیدخانوں نے منہ کھول دیئے اور بے گناہوں کو اگلنا اور گناہگاروں کو نگلنا شروع کر دیا۔ اس نگلی جانے والی قطار میں سونے کا سوداگر اور لٹیرے کا گروہ پیش پیش تھا۔ ہر طرف انصاف کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔

عذراؤں کے خودکشی کے ارادے لاوے میں دب گئے۔ ان میں سے نئی امیدوں اور نئے ولولوں نے جنم لیا۔

اصغریوں کے گھڑے پانی سے بھر گئے۔

کراہتے ہوئے ننگ دھڑنگ بچے گلیوں میں کھیلنے کودنے لگ گئے۔

مرچ مصالحے کی بوریاں جن میں پسی ہوئی اینٹیں زیادہ اور مرچیں کم تھیں بازاروں میں بکھر گئیں۔ گودام سربمہر ہو گئے۔

جھونپڑے گرے، پانی سے باہر نکل آئے اور سپید سپید پختہ مکان بن گئے۔

اندھی گلیاں لاوے سے ابھر نہ سکیں۔

مرجھائے ہوئے چہرے کھل اٹھے۔

بادشاہ وہی تھا۔ اس کے محلات کی اونچائی وہی تھی لیکن اس اونچائی میں جو نیچ پن ہوا کرتا تھا وہ دور زمین کی تہہ میں دب گیا۔

کماندار نے رعایا کو کہا۔ "میں نے ٹوٹا ہوا قانون جوڑ دیا ہے۔ میں نے انصاف کو یکساں تقسیم کر دیا ہے۔"

بادشاہ نے رعایا کو کہا۔ "میں نے تمہیں نئی زندگی دی ہے۔ اب غدار لیڈروں کو چاہئے کہ وہ خود ہی اس ملک سے نکل جائیں۔"

اور تیسری صبح پہلا شخص جو ملک سے نکلا وہ بادشاہ خود تھا! +

اُردو یونی ورسٹی" بقیہ صہ ۴۹

بقیہ صہ ۴۹

کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اُردو یونیورسٹی کا قیام اب میری زندگی کا مشن ہے اور اس مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ چاہے مجھے اس سے کتنی ہی تکلیف کیوں نہ پہنچے۔ کراچی میں اُردو یونی ورسٹی بن کر رہے گی۔ یہ خود قضاء قدر کا منشا ہے سوال صرف دیر سویر کا ہے۔ اگر آپ نے میری مدد کی اور یونی ورسٹی کے قیام کے وسائل و اسباب مہیا کردیئے تو یہ جلد بن جائے گی اور میری زندگی میں بن جائے گی۔

مجھے اعتراف ہے کہ مجھے مانگنا نہیں آتا لیکن پھر بھی اپنا دستِ سوال آپ کے سامنے پھیلا دیا ہے۔ اب میرے بوڑھے ہاتھوں کی لاج آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ابھی میرا سوال اپنے ملک کے عوام سے ہے جن سے ملک کی عزت اور طاقت سب کچھ ہے۔ جب عوام میری جھولی بھر دیں گے تو یہ دست سوال حکومت کی طرف بھی بڑھے گا اور مجھے یقین ہے کہ پھر حکومت بھی اپنا حصّہ فیاضی اور فراخ دلی سے ادا کرے گی۔

یہ میرا عہد ہے کہ جب تک قلم میں طاقت اور زبان میں سکت ہے اردو یونی ورسٹی کی اس پاک مہم کو جاری رکھوں گا۔ ملک کے چپے چپے کا دورہ کروں گا اور سب سے اپنا دردِ دل بیان کرونگا کیونکہ یہ میرا ایمان ہے کہ نونہالانِ قوم کی دماغی و ذہنی نشوونما اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ تعلیم کا ذریعہ اُن کی اپنی قومی زبان نہ ہوگی ؎

دست از طلب ندارم تا کامِ من برآید
یا جاں رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

(ملخّص)

* * *

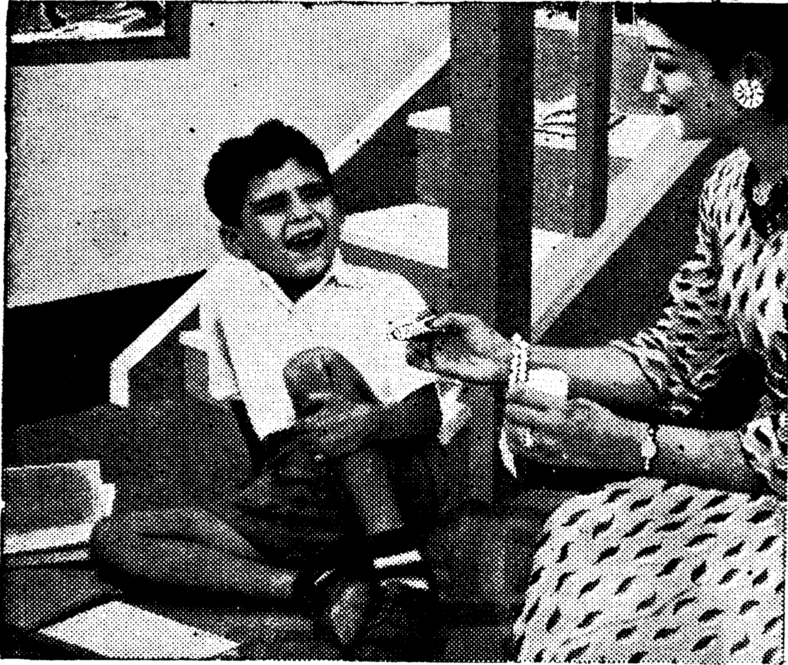
مسلم بنگالی ادب

(بنگلہ سے ترجمہ)

ڈاکٹر انعام الحق ایم اے پی ایچ ڈی

اس کتاب میں بنگالی زبان و ادب کی مکمل تاریخ اور اس کے ثقافتی و ملی و تہذیبی پس منظر کا جائزہ لینے کے بعد بتایا گیا ہے کہ اس زبان کی نشو و نما اور ترقی و تہذیب میں مسلمان حکمرانوں، صوفیاء، اہل قلم، شعراء اور ادباء نے کسقدر حصہ لیا ہے - یہ جائزہ بہت مکمل اور تحقیق و تفصیل کا شاہکار ہے - پوری کتاب نفیس اردو ٹائپ میں چھاپی گئی ہے اور مجلد ہے - سرورق دیدہ زیب اور رنگین - ضخامت ۴۰۰ صفحات - قیمت چار روپے علاوہ محصول ڈاک -

ادارۂ مطبوعات پاکستان - پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی



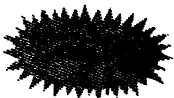

MEDIUM
CAPSTAN
Navy Cut
W.D. & H.O. WILLS
BRISTOL & LONDON
CAPSTAN
پیجئے اور لطف اٹھایئے

سرف کپڑے





اور



دھوتا ہے!

سرف جدید کیمیاوی اجزاء کی موجودگی کی وجہ سے سرف میں کپڑے صاف کرنے کی زیادہ صلاحیت ہے۔ اسی لئے یہ نیا پاؤڈر آپ کے کپڑوں سے میل کا ذرہ ذرہ الگ کر دیتا ہے، اور انہیں نہایت سفید اور اُجلا دھوتا ہے۔

سرف سے دُھلائی نہایت آسان ہے۔ محنت و مشقت کی کوئی ضرورت نہیں۔ سرف کے کثیر، طاقتور جھاگ نہایت خوبی سے جھٹ پٹ آپ کے کپڑے دھو دیتے ہیں۔

سرف کو گھر بھر کی دُھلائی مثلاً قمیضیں، فراکیں، ساڑھیاں، تولئے وغیرہ کیلئے استعمال کیجئے۔ سرف گھر پر کپڑے دھونے اور بہترین نتائج حاصل کرنیکا سب سے آسان طریقہ ہے۔ یہ واشنگ مشینوں کیلئے بھی نہایت موزوں پاؤڈر ہے۔

ایسی سفید دُھلائی آپ نے کبھی نہیں دیکھی





سرف استعمال کیجئے اور اپنے گھر کی دُھلائی پر ناز کیجئے!

سرف کپڑے زیادہ سفید اور جلد تر دھوتا ہے!

ہر
صورت
میں
آپ کی
جیت



۵ لاکھ بونڈ کے ہر سلسلہ پر
۵۰ ہزار کے انعامات
۲۰۰۰۰ روپے کا ایک انعام
۷،۵۰۰ روپے کا ایک انعام
۲،۵۰۰ روپے کا ایک انعام
۱،۰۰۰ روپے کے تین انعامات
۵۰۰ روپے کے دس انعامات
۱۰۰ روپے کے ایک سو بیس انعامات

بیش قرار انعام کے مواقع اور روپیہ ہر صورت میں محفوظ

قومی انعامی بونڈ



سال میں چار مرتبہ
یکم جنوری، یکم اپریل، یکم جولائی اور یکم اکتوبر کو قرعہ اندازی ہوگی۔ خریدنے کے چھ مہینے بعد سے ہر بونڈ ہر سہ ماہی قرعہ اندازی میں شامل کیا جائے گا بشرطیکہ بھنا نہ لیا گیا ہو۔ اگر آپ کا نمبر نکل آئے تو ۲۰۰۰۰ روپے تک کا کوئی انعام مل سکتا ہے۔ رقم بہرحال محفوظ رہتی ہے اور جب چاہیں واپس لے سکتے ہیں

انعامی بونڈ یکم اکتوبر سنہ ۱۹۶۰ء سے جاری ہوں گے

انعامی بونڈ اسٹیٹ بینک آف پاکستان یا اس کے نامزد کردہ بینکوں سے مل سکتے ہیں۔

DAFP/3-60

پاکستانی ادب کی تشکیل بقیہ صہ ۱۵

میں ابھی ہندوستانیت ہے، دلّی اور لکھنؤ کے دبستانِ شاعری کی آواز میں اردو کے جدید شعراء کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ میر اور غالب عظیم شاعر تھے لیکن ان کی شاعری میں ہندوستانیت جلوہ گر ہے۔ آج کا ہمارا ملکی ادب ہندوستانیت سے جدا ہو کر خاص پاکستانی ہونا چاہئے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب اردو کے ادیب اور شاعر پاکستان کی علاقائی زبانوں کے ادب اور ان کی روایات کے سدا بہار پھولوں کو اردو کے دامن میں ٹانکنا شروع کریں۔ اس طرح جو ادب تخلیق ہوگا وہ پاکستانی ادب ہوگا۔ یہ کام ہفتوں اور مہینوں کا نہیں، اس میں کئی سال لگیں گے۔ اُڑ جہنے به جگر جمع کن و رنگ بروں آ" کے بعد وہ ادب پیدا ہوگا جس کو ہم اپنا ادب کہہ سکیں :

تنقیحات برائے بحث:

۱۔ ادب کیا ہے؟ کیا اس کا کوئی خاص مقصد ہے یا ہو سکتا ہے؟ کیا یہ مقصد فلاح و عافیت یا انفرادی و اجتماعی مسرت ہے؟

۲۔ کیا جدید حیرت انگیز سائنسی ترقیات نے انسانی فطرت اور زندگی میں کوئی بنیادی تبدیلی پیدا کر دی ہے یا کر سکتی ہے جس سے ادب میں بھی انقلاب لازم آئے؟

۳۔ کیا ادب، عوام اور زندگی میں واقعی کوئی بنیادی تعلق ہے؟

۴۔ کیا محدود ملکی احساس اور اعلیٰ ادب باہم دست و گریباں ہیں؟ کیا ادب قومی خصائص سے پُر ہوتے ہوئے بلند پایہ اور آفاقی نہیں ہو سکتا؟

۵۔ ادب اور مقصد کہاں تک آپس میں ہم آہنگ ہو سکتے ہیں؟

۶۔ شعر و ادب کے حقیقی معنوں میں تخلیقی اور معیاری ہونے کی علامت کیا ہے؟ کیا ہم نے اس نقطۂ نظر سے پاکستانی ادب کا بھرپور جائزہ لینے کی کوشش کی ہے؟ کیا وہ واقعی جمود کا شکار رہے؟

۷۔ اگر ادب سماج سے لاتعلق رہا ہو تو کیا وہ ادب نہیں ہوگا؟

۸۔ پاکستانی ادب کے نشوونما و ارتقا کی صحیح نہج کیا ہے؟ کیا ہمارے ادب کو ہندوستانیت سے جدا ہو کر خاص پاکستانی ہونا چاہئے؟ (ادیب)

قبائلی علاقوں میں تعلیمی سرگرمیاں — بقیہ صفحہ ۲۴

اس کی وجہ سے اپنے پیشرؤوں سے کہیں زیادہ مستعدی اور ذوق و شوق سے قبائلی علاقہ میں تعلیم کا سلسلہ آگے بڑھانے میں کوشاں ہے۔ تاکہ قبائلی علاقوں میں زیادہ سے زیادہ ذہنی بیداری پیدا ہو، ترقی کی رفتار اور تیز ہو اور سرحد کے جری لوگ قوم و وطن کی ہر جہتی پیشرفت میں بیش از بیش حصہ لیں۔ حکومت کی اس روز افزوں دلچسپی اور مستعدی کے پیش نظر بجا طور پر بہترین نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے اور قبائلی علاقوں کا مستقبل بہت ہی روشن نظر آتا ہے :

آزاد کا سفر ترکستان ــــ بقیہ صفحہ ۲۹

فارسی زبان کی ایک لغت تیار کرنے کا بھی تھا۔ مگر یہ منصوبہ پورا نہیں ہو سکا۔ کئی سال بعد لغتِ آزاد کے نام سے جو مختصر سا رسالہ شائع ہوا تھا۔ یہ اسی اسکیم کا غالباً نقشِ اول تھا کہ جسے مکمل کرنے کی انہیں فرصت نہیں ملی۔

سفرِ ایران کے اخراجات اور نایاب کتابوں کی خرید کے لئے آزاد نے اپنی قلیل تنخواہ (گورنمنٹ کالج سے انہیں ڈیڑھ سو ماہوار ملتا تھا) میں سے دس ہزار روپے کی رقم پس انداز کی اور اسے لاہور کے مشہور رئیس نواب نوازش علی خاں قزلباش کو دیکر ان سے ایران کے تجارتی خانوں کے نام کی ہنڈیاں لے لیں۔ آزاد کراچی اور بوشہر کے راستے ایران گئے تھے۔ اور شیراز، طہران، اصفہان، مشہد اور ہمدان میں جن جن علماء اور فضلاء سے ملے تھے ان کا حال ہمیں سیرِ ایران میں ملتا ہے۔ یہ سفر نامہ انیسویں صدی کے آخری ربع میں ایران کی علمی اور ادبی زندگی کا نہایت دلچسپ اور پُر از معلومات خاکہ ہے کہ جسے آزاد کے جادو نگار قلم نے تیار کیا ہے۔

ایران کی سیاحت کے بعد آزاد نے لاہور میں دلی دروازے کے باہر درگاہ شاہ محمد غوث صاحب کے عقب میں کتب خانہ آزاد تعمیر کیا اور جب تک صحت نے ساتھ دیا یہ صبح شام باقاعدگی سے کتب خانے جاتے رہے۔ کتب خانۂ آزاد کے دروازے طالب علموں کے لئے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ اور اس سے طلباء کی ایک کثیر تعداد مستفید ہوتی تھی۔ جب آزاد کی صحت نے جواب دے دیا تو کتب خانہ بند کر دیا گیا۔ اور جنوری ۱۹۱۰ء میں آزاد کی وفات کے بعد ان کے فرزند آغا محمد ابراہیم صاحب نے تمام کتب خانہ پنجاب یونیورسٹی پبلک لائبریری کے حوالے کر دیا۔ تاکہ جس مقصد کے لئے آزاد نے اسے قائم کیا تھا یہ پورا ہوتا رہے۔ آج بھی یہ بیش قیمت ادبی ذخیرہ "آزاد کولیکشن" کے نام سے پنجاب یونیورسٹی کی زینت ہے۔

مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں ڈاکٹر صادق کا یہ کہنا کہ آزاد کے سفر ایران کی غایت سیاسی تھی، آزاد سے بے حد ناانصافی ہے۔

★

بقیہ "ناطق مکرانی" صفحہ ۴۳

صاحبِ طرز یا مجتہد ہوں۔ اسے مقلد بھی نہیں کہا جا سکتا، اگرچہ اس کا سہل اور سادہ انداز ایک طرف مسعود سعد سلمان اور امیر خسروؒ اور دوسری طرف شیخ علی حزیں کی خبر دیتا ہے۔ اور پھر اکبری دور کے رومانوی شعرا کی جھلکیاں لئے ہوئے غالب میں اس طرح ڈوبا ہوا ہے کہ وہ دوسرا غالب معلوم ہوتا ہے۔ نہ وہ بڑا شاعر ہے نہ کچھ ایسا باکمال۔ پھر بھی اس میں کچھ بات ضرور ہے۔ شاید وہ "دستہ دستہ غالب" تو نہیں۔ مگر "جستہ جستہ" ضرور ہے۔ ہمیں اس پر ایک چھوٹے غالب کا گمان ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی شاعری اپنی قدامت، رسمیت اور محض غزل گوئی کے باوجود دلچسپی سے خالی نہیں۔ وہ ایسا شاعر نہیں جس پر ہم نگاہِ غلط انداز ڈالتے ہوئے بے توجہی سے گزر جائیں۔ یہی کیفیت اس کی غالب نما خطوط کی بھی ہے۔ غالباً اس لئے معاصرین ان کو اساتذہ میں شمار کرتے تھے۔ بقائے دوام کے لئے اتنا امتیاز بھی کافی ہے۔

ناطق مکرانی اپنے خیاباں کا واحد پھول نہیں۔ مکران اور بلوچستان کی خاک سے سیکڑوں علماءِ کرام و مشایخ عظام، شعرائے نکتہ سنج و بذلہ گو، دلیرانِ نبرد آزما و جنگجو، بہادرانِ شمشیر زن و شیر برانِ صف شکن، اسخیاء حاتم مثال و کریمانِ نیکو خیال، عاشقانِ پاک باز و عارفانِ محرمِ راز، زاہدانِ خلوت گزیں و مردانِ خدا پرست و حق بیں پیدا ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض آسمانِ مکران و بلوچستان پر ستارہ وار درخشاں ہیں اور بعض گمنامی کی حالت میں دنیا سے چل بسے بقول سعدی۔

بس نامور بزیرِ زمیں دفن کردہ اند
کز ہستیش بزیرِ زمیں یک نشاں نماند

مگر ناطق مکرانی کی حد تک نام بھی باقی ہے۔ اور نشان بھی۔ اس کی پُر لطف شاعری اور دلچسپ مکاتیب سے ہم دیارِ پاک کے اُس قابلِ قدر ورثہ کا سراغ پاتے ہیں جس نے فارسی ادب کی "بہارِ عجم" کے مقابلہ میں "بہارِ ہند" کو جنم دیا تھا۔ اور جس پر ہمیں آج بھی ناز ہے۔

ایک خاتون پیکر تراش — بقیہ صفحہ ۳۶

رہی ہے۔ جو بجائے خود تلاش و تجربہ کی ایک طویل مگر دلچسپ داستان ہے ظاہر ہے تاثر کا اظہار مادی ذریعہ کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ جیسے بھی وسیلے اختیار کئے جائیں، ویسے ہی مسئلے اور دشواریاں بھی پیدا ہوں گی۔ یورپ میں وہ پنڈول اور دھاتوں سے زندگی ہی کے نقش پیش کرتی رہی۔ جس قسم کے خیالی تصور تجرید میں کام آتے ہیں وہ ان سے دور ہی رہی۔ وطن واپس آکر اس نے سیمنٹ سے کام لینا شروع کیا۔ یہ ایسا کٹا ذریعہ ہے جو فن کار کو اپنے تابع کر لیتا ہے۔ نویرہ نے یکلخت اپنی روش بدل ڈالی۔ اور حقیقت نگاری کی بجائے تجرید کی طرف چلی آئی۔ اس کے ساتھ موضوعات بھی بدل گئے۔ اس سلسلہ میں اپنے دیس کی گڑیوں کھلونوں پر نظر گئی۔ اور اس نے سیمنٹ اور مرمر کی مخلوط، دو بُعد کی چیزیں بنانی شروع کیں۔ موضوع بھی اس کے سامنے ہی تھا۔ مشرقی پاکستان کی دیہی زندگی۔

یہی روش چوبیں پیکر تراشی میں بھی اختیار کی گئی۔ اس میں فن کار کی کوشش یہ تھی کہ لکڑی میں سنگ تراشی کی سی کیفیت پیدا ہو۔ اس نے روایتی اوضاع و اشکال میں روایت کی بجائے تازگی و جدت ہی پر زور دیا ہے تاکہ ذوق و فن کے تقاضے ہمیشہ بالاتر رہیں اور وہ خونِ جگر سے اپنے نقوش میں رنگِ دوام پیدا کرے۔ اس کوشش میں وہ بڑی کامیاب رہی ہے۔ جس کا باعث اس کی قدرتی سوجھ بوجھ، سلیقہ، نظم ضبط اور سب سے بڑھ کر وہ "نظر" ہے جو ایک طویل عرصہ کی جہد و ریاضت سے پیدا ہوئی ہے اور وہ زندگی جس کا احساس فن کار کی رگ رگ میں رچا ہوا ہے۔ "سنگی پیرہن" پہننے کے باوجود اس کے پیکر گرم ہیں، جاندار ہیں۔

آخر میں ایک بار پھر اس خوش گوار فضا کی طرف اشارہ کر دینا بیجا نہ ہوگا جس نے "دورِ انقلاب" میں ادیبوں، شاعروں اور دوسرے فن کاروں کے حوصلے بڑھا دئے ہیں۔ اور وہ اپنے اپنے طور پر ادب و فن کو چار چاند لگانے کی سر توڑ کوشش کر رہے ہیں۔ نویرہ نے اپنے ملک میں ایک شاندار نظیر ہی نہیں قائم کی بلکہ ایک نئے فن کی داغ بیل ڈال کر نئی تخلیقی سرگرمیوں کا دروازہ بھی کھول دیا ہے۔ اور آئندہ بھی امید ہے کہ ان فنی کوششوں کا دائرہ روز بروز وسیع سے وسیع تر ہو کر نئی نئی ترقیات کی نشاندہی کرے گا۔

"ماہِ نو" میں مضامین کی اشاعت سے متعلق شرائط

(۱) "ماہِ نو" میں شائع شدہ مضامین کا معاوضہ پیش کیا جائے گا۔

(۲) مضامین بھیجتے وقت مضمون نگار صاحبان "ماہِ نو" کے معیار کا خیال رکھیں اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالہ یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔

(۳) ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر حوالہ جات دینا ضروری ہیں۔

(۴) ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔

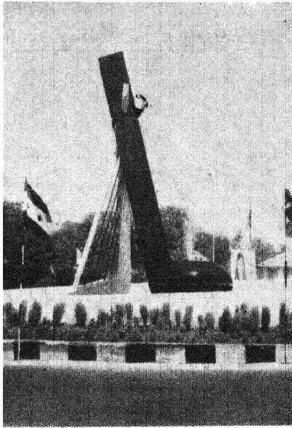
(۵) مضمون کے ناقابل اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

(۶) ایڈیٹر مسودات میں ترمیم کرنے کا مجاز ہوگا۔ مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

(۷) مضامین صاف اور خوشخط کاغذ کے ایک طرف تحریر کئے جائیں اور مکمل صاف پتہ درج کیا جائے۔

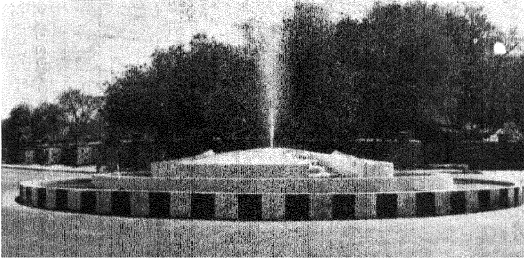

سب ایک دوسرے
سے پوچھتے ہیں!
"کہیے مزاج کیسا ہے؟"
یہی وہ الفاظ ہیں جو ملاقات کے وقت سب سے پہلے زبان پر
آتے ہیں۔ مگر کیا سچ مچ اس کا جواب ہمیشہ درست اور حسبِ دلخواہ
ہوتا ہے؟ صحت کی طرف تھوڑی سی توجہ ہماری بہت سی عام
شکایات کا خاتمہ کرسکتی ہے۔
ماء اللحم کا استعمال خصوصاً اس موسم میں ہماری صحت اور توانائی کی
ضمانت ہے جدید طبی تحقیق کی مدد سے اس کے خواص اور خوبی کو کمال تک پہنچا دیا
گیا ہے اور اب یہ ہر لحاظ سے ایک مکمل اور مؤثر ٹانک بن گیا ہے جو
صحت اور شباب کو قائم رکھتا ہے۔
ماءُ اللحم دو آتشہ
ہمدرد
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان کراچی - ڈھاکہ - لاہور - چاٹگام

ساز آب : سرود آفرینِ نو





چوراہوں کی زینت : خوبصورت فوارہ



کراچی : نیا روپ

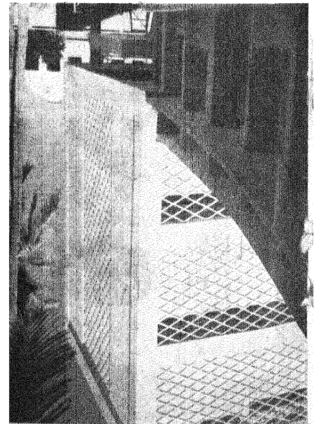
(نیا دور)

موج آب و رنگ



کاشانۂ فن :
(آرٹس کاؤنسل کی
عمارت کا روکار

صدر دروازہ آرٹس کاؤنسل



ادارۂ مطبوعات پاکستان ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳، کراچی نے شائع کیا ۔
مطبوعہ مشہور آفسٹ لیتھو پریس، مکلوڈ روڈ، کراچی — مدیر : رفیق خاور